فتاویٰ

حافظ ثناء اللہ مدنی

کتاب الطہارۃ کتاب الصلاۃ

جمع وترتیب، تبویب وتخریج:

حافظ عبدالرؤف خان

عبدالقدوس السلفی

مکتبۃ انصار السنۃ النبویۃ لاہور

کتاب الطہارۃ اور کتاب الصلوٰۃ پر مشتمل

"الاعتصام" اور "محدث" کے فتاویٰ جات

فتاویٰ

حافظ ثناء اللہ مدنی

جمع و ترتیب، تبویب و تخریج:

حافظ عبدالرؤف خان، عبدالقدوس السلفی

نام کتاب

فتاویٰ
حافظ ثناء اللہ مدنی

جمع و ترتیب، تبویب و تخریج : ــــــ حافظ عبدالرؤف خان، عبدالقدوس السلفی

اشاعت ــــــ اکتوبر 2016ء

ناشر ــــــ مکتبۃ انصار السنۃ النبویۃ لاہور

مطبع
ثوبان نعمان پرنٹنگ پریس، لاہور
0300-8661763

ملنے کے پتے

① مکتبہ اسلامیہ

لاہور: بادیہ حلیمہ سینٹر غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور 042-37244973 - 37232369

فیصل آباد: بیسمنٹ سمٹ بینک بالمقابل شیل پٹرول پمپ کوتوالی روڈ، فیصل آباد 041-2631204 - 2641204

/maktabaislamia1 maktabaislamiapk@gmail.com

② حافظ صہیب انور مدنی C-476 پاک عرب فیروز پور روڈ لاہور، موبائل نمبر: 0306-3348710

③ حافظ عبدالرؤف خان مکان نمبر1، گلی نمبر3، نیو یونین پارک سمن آباد لاہور/ 78 چوہدری کالونی سمن آباد لاہور
موبائل: 0334-4382195

④ جامعہ عائشہ صدیقہ للبنات سرحالی کلاں ضلع قصور

انتساب

محترم والدین اور

شیخی العظیم علامة الدهر مجتهد العصر

حافظ عبداللہ محدث روپڑی

کے نام

جن کا مقام فتویٰ نویسی میں

سند کی حیثیت رکھتا ہے۔

رحمهم اللہ تعالیٰ

فہرست

۱. كتاب الطهارة

پانیوں کی نجاست وتطہیر کے احکام ومسائل

حیض، نفاس اور استحاضہ کے خون کے احکام

منی، مذی کے متعلق احکام ومسائل

حرام، مأکول اللحم اور مردہ جانوروں کے گوبر و پیشاب کے احکام ومسائل

فطری امور (سنن الفطرة) کے متعلق احکام و مسائل

بیت الخلا اور قضائے حاجت کے متعلق احکام و مسائل

ابواب الوضوء

مسواک کے احکام و مسائل

وضو کے احکام و مسائل

وضوء کے بعد امور کے متعلق احکام و مسائل

تیمّم کے احکام و مسائل

موزوں اور جرابوں پر مسح کے احکام و مسائل

نواقضِ وضوء

وضوء توڑنے والے امور کے متعلق احکام و مسائل

غسل جنابت اور عام غسل کے متعلق احکام و مسائل

۲۔ کتاب المساجد

مختلف مساجد میں نماز پڑھنے کا ثواب

مساجد کی مخصوص جگہوں کے احکام

مواضع الصلوٰۃ

قبر والی مساجد میں نماز پڑھنا

چھوٹے بچوں کا مساجد میں آنا

۲۔ کتاب الصلوٰۃ

فرض نمازوں کے لیے اذان، عام اذان اور مؤذن کے متعلق احکام

فجر کی پہلی اذان وغیرہ کے احکام

اذان الجمعہ

ابواب الصلوٰۃ

آدابِ نماز

اوقاتِ نماز

سترہ کے احکام و مسائل

حالتِ نماز کے متعلق مسائل

ننگے سر نماز پڑھنا

حالتِ نماز میں سلام کا جواب دینا

حالتِ نماز میں ممنوع اور مشروع اعمال

آدابِ جماعت و امامت (شروط صلاۃ)

آدابِ جماعت

باجماعت نماز کے لیے صف بندی کرنا

نماز کے لیے اقامت یعنی تکبیر کہنا

امامت کے آداب وشروط

نابالغ بچے کی امامت

پنجگانہ فرض نمازوں کے احکام ومسائل

قیام کے احکام ومسائل

نماز کے لیے نیت کرنا

تعوذ اور تسمیہ کے مسائل

سینے پر ہاتھ باندھنا

فاتحہ خلف الامام کا حکم

مقتدی اور امام کا آمین کہنا

امام کا بعض آیات پڑھنا اور مقتدی کا آیات کا جواب دینا

امام کا مخصوص دنوں میں مخصوص سورتوں کی تلاوت کرنا اور مقتدی کا فاتحہ کے علاوہ دیگر سورتیں پڑھنا

مسئلہ رفع الیدین کے احکام و مسائل

رکوع و بعد از رکوع اور رکعات کے احکام

رکوع کے بعد "سمع اللہ......" اور "ربنا ولک......" کہنے میں امام اور مقتدی کے احکام

رکوع کے بعد سینے پر ہاتھ باندھنا

رکوعِ تعظیمی اور سجدۂ تعظیمی کے احکام

سجود کی اقسام اور ان کے احکام

فرض نمازوں کے سجود

سجود السہو (نماز میں بھول جانے کے سجدے)

سجدۂ تلاوت کے احکام ومسائل

دو سجدوں کے درمیانی امور

جلسۂ استراحت

دوسری رکعت کے لیے کھڑے ہونے کی کیفیت

تشہد کے احکام و مسائل

قعدۂ اولیٰ میں درود واذکار

قعدۂ اخیرہ میں درود واذکار

نماز کے بعد اذکار و وظائف

فرض نماز کے بعد اور دیگر مواقع پر اجتماعی دعا

مسبوق نمازی کے متعلق احکام

قضاء نمازوں کے احکام ومسائل

عورت اور مرد کی نماز کے احکام

نفل نمازیں وسنن مؤکدات

فجر کی سنتیں

نمازِ تراویح کے احکام و مسائل

صلوٰۃ التہجد (تہجد کی نماز)

صلوٰۃ الوتر اور قنوتِ نازلہ

دعائے قنوت کا بیان

سببی نمازیں اور غیر سببی نمازیں

صلوٰۃ الاِستخارۃ

تحیۃ المسجد

صلوٰۃ الاستسقاء) نمازِ استسقاء

صلوٰۃ الحاجۃ

صلوٰۃ الاشراق (نمازِ اشراق)

صلوٰۃ التسبیح

صلوٰۃ القصر (قصر نماز)

نمازِ قصر کی مدت

کتنی مسافت پر نمازِ قصر کی ابتداء ہوگی؟

دو نمازیں جمع کرکے پڑھنا

صلوٰۃ الجمعہ اور خطبۃ الجمعہ کے متعلق احکام و مسائل

صلوٰۃ العیدین

صدقہ فطر کے بعض مسائل

صلوٰۃ الجنائز (نمازِ جنازہ)

غائبانہ نمازِ جنازہ

صاحب کتاب کے بارے میں حافظ عبدالرشید اظہر رحمہ اللہ کے تاثرات

زیر نظر مجموعہ شیخ الحدیث والفقہ، استاذ العلماء والعالم الفقیہ الاصولی النظار محترم المقام حافظ ثناء اللہ مدنی بن عیسیٰ حفظہ اللہ کے ان فتاویٰ پر مشتمل ہے جو سالہا سال سے ملکی رسائل وجرائد میں چھپ رہے ہیں۔ خصوصاً ہفت روزہ ''الاعتصام'' لاہور میں۔ موصوف کی شخصیت جہاں تدریس حدیث وفقہ میں اپنا ایک خاص مقام رکھتی ہے وہاں آپ افتاء وارشاد میں بھی خصوصاً اہل حدیث حلقوں میں مرجع کی حیثیت حاصل کر چکے ہیں۔ (متعنا اللہ بطول حیاتہ) موصوف نے از اول تا آخر علوم متداولہ کی جملہ کتب حضرت العلام مجتہد العصر حافظ محمد عبداللہ محدث روپڑی رحمہ اللہ سے پڑھیں، پھر اعلیٰ تعلیم کے لئے ''جامعہ اسلامیہ'' مدینہ منورہ تشریف لے گئے۔ جہاں ان کو ایسے نادر روزگار اساتذۂ کرام سے کسب فیض کا موقع ملا جو کم ہی کسی سعادت مند کو میسر آتا ہے۔

دور حاضر میں پورے عالم اسلام میں جن لوگوں کا نام اور کام لوحِ اعزاز و اکرام پر جلی حروف سے ثبت ہے وہ پانچ اساطین واعلام علم ودعوت ہیں:

- حافظ عبداللہ محدث روپڑی رحمہ اللہ (متوفی ۱۳۸۴ھ الموافق ۱۹۶۴ء)
- الشیخ محمد الامین الشنقیطی رحمہ اللہ (متوفی ۱۳۹۳ھ الموافق ۱۹۷۴ء)
- حافظ محمد محدث گوندلوی رحمہ اللہ (متوفی ۱۴۰۵ھ الموافق ۱۹۸۵ء)
- الشیخ عبدالعزیز بن باز رحمہ اللہ (متوفی ۱۴۲۰ھ (محرم) الموافق ۱۹۹۹ء (مئی)
- الشیخ محمد ناصر الدین البانی رحمہ اللہ (متوفی ۱۴۲۰ھ (جمادی ثانیہ) الموافق ۱۹۹۹ء (اکتوبر)

ان میں سے اول الذکر تفقہ فی الدین اور مجتہدانہ بصیرت میں اپنی مثال آپ تھے۔ ثانی الذکر تفسیر القرآن بالقرآن اور فہم علوم القرآن میں بے نظیر ملکہ رکھتے تھے، ثالث الذکر علمی گہرائی، زہد وتقویٰ اور کثرت تلامذہ میں یکتائے رزگار تھے، رابع الذکر خدمت دین، اعتدال ومروت، فقہی استدلال اور احکام

شریعت کے باہمی ربط میں امامت کا درجہ رکھتے تھے اور آخرالذکر معرفت حدیث وعلوم حدیث، تصحیح وتضعیف اور نقد رجال وعلل حدیث میں سند کی حیثیت رکھتے تھے، اور عصر حاضر میں جرح وتعدیل کے باب میں ان کا کلام قول فیصل ہے۔ ان سب کی مشترکہ خصوصیت یہ ہے کہ ہر حال میں درس وتدریس کتاب وسنت اور تعلیم وتربیتِ امت میں مشغول رہے اور کبھی بھی اس منصب شریف سے منقطع نہیں ہوئے، رحمہم اللہ تعالیٰ. صاحب کتاب حافظ صاحب ممدوح کو ان سب سے تحصیلِ علم کا شرف حاصل ہے۔ ایسی عظیم الشان سعادت بھی کم خوش نصیبوں کو ہی حاصل ہوتی ہے۔

﴿ واتقو الله ويعلمكم الله .﴾ (القرآن)

جیسے ان سب کا پَرتَو موصوف میں نظر آتا ہے توقع کی جاسکتی ہے کہ ان کا یہ مجموعۂ فتاویٰ ان جملہ خصوصیات کا آئینہ دار ہوگا، ان شاء اللہ. جبکہ ان کے ذاتی اوصاف اور شخصی محاسن اس پر مستزاد ہیں، دینی قدریں اور شرعی حدود و قیود مانع ہیں ورنہ موصوف کی شخصیت کے بارے میں کہنے اور لکھنے کو بہت کچھ ہے۔ اللہ تعالیٰ انہیں اجرِ جزیل سے نوازے، ان کے علم وعمل اور عمر میں برکت فرمائے!! آمین!

یہ چند سطور بھی نوک قلم پر اس لئے آگئی ہیں کہ یہ رسم دنیا ہے اور آداب الفت ومحبت بھی، حق اخوت ہے اور ان کی خدمات کے اعتراف کا تقاضا بھی۔ ورنہ ممدوح محترم تعارف کے محتاج ہیں نہ تعریف کے شائق، آنجناب اللہ کی توفیق اور اس کے فضل وکرم سے مدح وستائش سے بے نیاز اور خدمت دین کے جذبہ سے مالامال ہیں، درس وتدریس اور نشر واشاعت قرآن وسنت اور فتویٰ نویسی میں ان کی خدمات کا دائرہ بحمد اللہ بہت وسیع ہو چکا ہے، ان سطور کا مقصد صرف یہ ہے کہ قارئین کرام کا شوق مطالعہ فزوں سے فزوں تر ہو اور ان کی دین سمجھنے اور سیکھنے کی تڑپ کے لئے مہمیز کا کام دیں۔

والله من وراء القصد .

ربنا تقبل منا إنك أنت السميع العليم .

ڈاکٹر حافظ عبدالرشید اظہر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ

اسلام آباد

۱۷ ذی القعدہ ۱۴۲۳ھ ...... ۲۱ جنوری ۲۰۰۳م

تقدیم

منصب افتاء کی اہمیت، تقاضے اور اس میں اہل حدیث کا امتیاز

از...... حافظ صلاح الدین یوسف حفظہ اللہ

فَتْوٰی کے معنی (جسے فُتْیَا بھی کہا جاتا ہے) اظہارِ رائے اور وضاحت کرنے کے ہیں، لیکن شرعی اصطلاح میں اس سے مراد وہ وضاحت ہوتی ہے جس میں کسی پیش آمدہ مسئلہ، واقعہ یا اِشکال کی بابت شرعی حکم بیان کیا جاتا ہے۔ گویا شریعت کی روشنی میں کسی اشکال کا حل پیش کرنا، کسی مسئلے کی وضاحت کرنا اور کسی واقعے کی بابت جواز یا عدمِ جواز کی تشریح کرنا ''فتویٰ'' کہلاتا ہے۔

عہدِ رسالت میں صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے سامنے کوئی ایسا واقعہ یا اشکال پیش آتا، جس کی بابت ان کو شریعت کا حکم معلوم نہ ہوتا، تو صحابہ رضی اللہ عنہم رسول اللہ ﷺ سے استفسار کرتے، تب اللہ تعالیٰ قرآنِ مجید میں اس کی وضاحت فرما دیتا یا وحیٔ الٰہی کی روشنی میں رسول اللہ ﷺ اس کا جواب عنایت فرما دیتے۔

اس اعتبار سے کہا جا سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ بھی مفتی ہے اور رسول اللہ ﷺ بھی صاحب افتاء تھے۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کی بابت یہ الفاظ موجود ہیں: ﴿اَللّٰهُ يُفْتِيْكُمْ فِيْهِنَّ﴾ (النساء:۱۲۷) ''اللہ تعالیٰ تمھیں ان عورتوں کے بارے میں فتویٰ دیتا ہے (جن کی بابت تم نے استفسار کیا ہے)'' ﴿اَللّٰهُ يُفْتِيْكُمْ فِي الْكَلٰلَةِ﴾ (النساء:۱۷٦) ''اللہ تمھیں کلالہ کے بارے میں فتویٰ دیتا ہے۔'' اور رسول اللہ ﷺ نے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے پوچھنے پر بہت سے احکام و مسائل بیان فرمائے، یہ گویا نبی ﷺ کے فتوے ہوئے۔ یہ فتوے احادیث کی کتابوں میں محفوظ ہیں۔

اس تفصیل سے چند باتیں واضح ہوتی ہیں:

۱۔ مفتی کو قرآنی احکام کا بھی پورا علم ہونا چاہیے اور ذخیرۂ احادیث پر بھی اس کی نظر گہری اور وسیع ہونی چاہیے، علاوہ ازیں اسے مجتہدانہ بصیرت بھی حاصل ہو، تاکہ ہر پیش آمدہ مسئلے کا حل وہ قرآن و حدیث

کی روشنی میں پیش کر سکے، کوئی نص صریح نہ ہو تو قرآن وحدیث کے نظائر کو سامنے رکھتے ہوئے اس کی حلت وحرمت اور جواز وعدم جواز کا فیصلہ کر سکے۔

۲۔ وہ کسی حالت میں بھی قرآن وحدیث اور ان کے نظائر سے صرفِ نظر کر کے محض آرائے رجال اور اقوال ائمہ کی روشنی میں فتویٰ نہ دے، کیونکہ وہ کسی خاص فقہ یا امام کا نمائندہ نہیں، بلکہ وہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے منصب افتاء کا جانشین ہے، جس کا تقاضا یہ ہے کہ اس کا فتویٰ صرف اور صرف اللہ ورسول کے بتائے ہوئے احکام اور شریعت کے اصول وضوابط کے دائرے میں ہو، نہ کہ اس سے متجاوز ہو۔

۳۔ مفتی کے اندر فقہی جمود نہیں، بلکہ فقہی توسع ہو، کیونکہ نئے نئے مسائل میں عوام کو سہولت اسی وقت مل سکتی ہے جب مفتی فقہی جمود سے پاک اور اسلاف کے علمی ذخیرے سے بلا تعصب استفادہ کرنے کا قائل ہو۔ ورنہ وہ قرآن وحدیث کی نصوص کو بھی نظر انداز یا ان کی دور از کار تاویل کرے گا اور عوام کی سہولت کی بھی اسے پرواہ نہ ہوگی۔ یوں وہ اپنے فتویٰ میں اَوفق بالکتاب والسنۃ کا اہتمام کرے گا اور نہ ارفق بالناس ہی کا۔ جب کہ یہ منصب ان دونوں ہی باتوں کا متقاضی ہے۔

علمائے اہل حدیث کا امتیاز:

الحمد للہ علمائے اہل حدیث کے فتاویٰ مذکورہ خصوصیات اور منہج محدثین ہی کے حامل ہوتے ہیں، کیونکہ انہی کی تدریسی، تبلیغی اور علمی خدمات کے نتیجے میں برصغیر پاک و ہند میں فقہی وتقلیدی جمود ٹوٹا اور عمل بالحدیث کو فروغ حاصل ہوا، اس لیے اہل حدیث میں شخصیت پرستی ہے نہ اکابر پرستی اور نہ ہی کسی ایک فقہ کی پابندی پر زور۔ ان کے عوام بھی کسی مسئلے میں علماء کی طرف رجوع کرتے ہیں تو اس سے ان کا مقصد صرف قرآن وحدیث کی روشنی میں اس کا حل معلوم کرنا ہوتا ہے اور علماء بھی اپنی فہم کی حد تک سوال کا جواب دیتے وقت قرآن وحدیث کے دائرے سے تجاوز نہیں کرتے۔ بنابریں منصب افتاء کی اہمیت کو صرف علمائے اہل حدیث ہی سمجھتے اور اس کے تقاضوں کو بھی وہی ادا کرتے ہیں۔ كَثَّرَ اللّٰهُ سَوَادَهُمْ.

یہی وجہ ہے کہ محدثین اور ان کے فکر وعمل کے وارث عاملین بالحدیث کے علاوہ، سب ہی گروہ حدیثِ رسول کو اُس طرح شرح صدر کے ساتھ قبول کرتے ہیں، نہ قبول کرنے کے لیے تیار ہی ہیں، جس طرح کہ اس کے ماخذِ شریعت ہونے کا تقاضا ہے، جب کہ صحیح گروہ وہی ہو سکتا ہے جو احادیثِ صحیحہ کو ذہنی تحفظ کے

بغیر قبول کرے اور اس پر عمل کرے۔

واقعہ یہ ہے کہ اگر حدیث واقعی ماخذِ شریعت ہے، یعنی اسے تشریعی اور تقنینی حیثیت حاصل ہے (اور بلاشبہ اسے یہ مقام اور حیثیت حاصل ہے) تو پھر ہر فرقے کا اپنے ذہنی تحفظات اور مخصوص فقہی استنباطات واجتہادات کو اہمیت دینا اور حدیث کو بہ لطائف الحیل نظر انداز کردینا یا کسی نہ کسی خوش نما خانہ ساز اصول کے ذریعے سے اسے مسترد کردینا، اسے کس طرح مستحسن قرار دیا جا سکتا ہے؟ یا کس طرح اسے حدیثِ رسول کو ماننا تسلیم کیا جا سکتا ہے؟

حدیثِ رسول کو ماخذِ شریعت ماننے کا مطلب اور تقاضا تو یہ ہے کہ جو حدیث، محدثانہ اصولِ جرح وتعدیل کی روشنی میں صحیح قرار پائے، اسے مان لیا جائے اور جو ضعیف قرار پائے، اسے ناقابل استدلال تسلیم کیا جائے۔ محدثین کا یہی اصول اور منہج ہے اور یہی منہج یا طرزِ فکر وعمل امتِ مسلمہ کے باہمی اختلافات کے ختم یا کم سے کم کرنے کا واحد طریقہ یا اس کا ضامن ہے۔ اس کے برعکس رویہ کہ صحتِ سند کے باوجود اپنی ہی یا کسی مخصوص فقہی رائے ہی کو ماننا اور ضعفِ سند کے باوجود ضعیف حدیث ہی کو ترجیح دینا، اسے نہ حدیثِ رسول کو ماننا ہی تسلیم کیا جا سکتا ہے اور نہ اس طریقے سے فقہی اختلافات اور حزبی تعصبات کا خاتمہ ہی ممکن ہے، جب کہ ضرورت اس بات کی ہے کہ مسلمان متحد ہوں، فکر وعمل کی یک جہتی ان کے اندر پیدا ہو اور دشمن کے مقابلے میں وہ بنیانِ مرصوص بن جائیں۔ اور ایسا ہونا فقہی وحزبی اختلافات وتعصّبات کی شدت ختم ہوئے بغیر ممکن نہیں۔

غیر محدثانہ روش اور اس کے نقصانات:

یہ غیر محدثانہ ردیہ، جس نے امتِ واحدہ کو ٹکڑوں میں تقسیم کردیا ہے، کن لوگوں نے اپنایا ہوا ہے؟ اور کیوں اپنایا ہوا ہے؟ اور اسے چھوڑنے کے لیے وہ تیار کیوں نہیں ہیں؟ ان تینوں سوالوں کا جواب واضح ہے:

۱۔ یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے محدثین کی روش سے انحراف کیا ہے جو خالص اور ٹھیٹھ اسلام کی آئینہ دار اور «مَا أَنَا عَلَيْهِ وَ أَصْحَابِيْ» کی مصداق تھی اور ہے۔

۲۔ انھوں نے ایسا کیوں کیا؟ اس لیے کہ انھوں نے اپنے آپ کو کسی ایک فقہی مذہب سے وابستہ کرلیا جس کا اللہ نے اور اللہ کے رسول ﷺ نے قطعاً حکم نہیں دیا۔ اتباع کے بجائے، انھوں نے ابتداع (اپنی طرف سے شریعت سازی) کا اور اطاعت کے بجائے تقلید کا راستہ اختیار کیا۔

اتباع کیا ہے اور ابتداع کیا؟

اتباع کا مطلب ہے، اللہ کے رسول ﷺ کے پیچھے لگنا، کیونکہ صرف وہی اللہ کا نمائندہ ہے، اللہ نے اسی کے اتباع کا حکم دیا ہے۔ اور ابتداع یہ ہے کہ اس اتباعِ رسول سے تجاوز کر کے اپنی طرف سے کسی چیز کو واجب قرار دینا، جیسے کسی نہ کسی امام کی تقلید یا خودساختہ فقہ کی پابندی کو لازم سمجھنا اور لازم قرار دینا۔ امتیوں کو تو اتباع کا حکم ہے نہ کہ ابتداع کا۔ اور اطاعت کا مطلب بھی صرف ﴿مَا أَنْزَلَ اللّٰهُ﴾ (اللہ کی نازل کردہ باتوں) کا ماننا ہے۔ ہم اللہ کے رسول کی اطاعت واتباع بھی اسی لیے کرتے ہیں کہ اللہ نے اپنی اطاعت کے ساتھ اپنے رسول کی بھی غیر مشروط اطاعت کا حکم دیا ہے۔ غیر مشروط اطاعت کا یہ حق صرف اللہ کے رسول ﷺ کا ہے، مخلوق میں سے کسی اور کو یہ حق حاصل نہیں۔ اسی لیے اللہ نے اپنے رسول کی اطاعت کو اپنی اطاعت قرار دیا ہے۔

﴿مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ﴾ (النساء:٤/ ٨٠)

''جس نے رسول کی اطاعت کی بلاشبہ اس نے اللہ کی اطاعت کی۔''

یہ بلند مقام اللہ کے رسول کے علاوہ کسی اور کو حاصل ہے؟ نہیں، یقیناً نہیں۔ اور اللہ نے اپنے رسول کو یہ بلند مقام اس لیے دیا ہے کہ وہ اللہ کا نمائندہ ہے۔ علاوہ ازیں اللہ تعالیٰ اس کی براہِ راست حفاظت ونگرانی بھی فرماتا ہے اور اسے راہِ راست (صراطِ مستقیم) سے اِدھر اُدھر نہیں ہونے دیتا۔ (دیکھئے سورۃ الاسراء: ١٧/ ٧٣، ٧٤ و نحوها من الایات) یہ مقامِ عصمت بھی اللہ کے رسول کے علاوہ کسی کو حاصل نہیں۔ ائمہ کی تقلید کو لازم قرار دینے والے کیا یہ دعویٰ کر سکتے ہیں کہ ان کے امام کو یہ مقامِ عصمت حاصل ہے؟ اس کی رائے میں غلطی کا امکان نہیں ہے؟ اس کا ہر قول اور ہر اجتہاد صحیح ہے؟ یقیناً کوئی شخص یہ دعویٰ نہیں کر سکتا۔ اگر ایسا ہے اور یقیناً ایسا ہی ہے، تو پھر ہر مسئلے میں کسی ایک ہی شخص کی بات کو بلا دلیل ماننے کو لازم قرار دینا، (جسے اصطلاحاً اور عرفاً تقلید کہا جاتا ہے) کیا یہ اس کے لیے غیر مشروط اطاعت کا حق تسلیم کروانا اور اسے مقامِ عصمت پر فائز کرنا نہیں ہے؟

٣۔ یہاں سے اس تیسرے سوال کا جواب، کہ یہ حضرات یہ روش چھوڑنے کے لیے کیوں تیار نہیں؟ سامنے آجاتا ہے اور وہ یہ ہے کہ گویا اپنی زبانوں سے عصمتِ ائمہ کا اظہار یا دعویٰ نہیں کرتے لیکن عملاً صورت حال یہی ہے کہ انھوں نے ائمۂ کرام کو ائمۂ معصومین کا درجہ دے رکھا ہے۔ اپنے امام کی ہر بات کو ﴿مَا أَنْزَلَ اللّٰهُ﴾ کی طرح بالکل اس سے بھی بڑھ کر تسلیم کرتے ہیں اور اپنی خودساختہ فقہوں کے

مقابلے میں حدیث رسول سے اعراض وگریز، ان کا وطیرہ اور شیوۂ گفتار ہے۔

ان کا یہ طرزِ عمل وفکر محدثین کے منہج ومسلک سے یکسر مختلف ہے، شیوۂ مسلمانی کے برعکس ہے اور امت کی فکری وحدت ویک جہتی کو سب سے زیادہ نقصان پہنچانے والا ہے۔

ان حضرات کے بارے میں ہماری بات کوئی مفروضہ یا واہمہ نہیں، ایک حقیقتِ واقعہ ہے، شک وشبہ سے بالا ہے اور روزِ روشن کی طرح واضح ہے۔ جس کا مشاہدہ صدیوں سے ہو رہا ہے اور ہر دور کے اہل علم نے اس کا اظہار کیا ہے۔

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ جن کی بابت یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ اہل تقلید سے کوئی مخاصمت رکھتے تھے، بلکہ پاک وہند کے وابستگانِ تقلید تو اپنے آپ کو مسند ولی اللہ ہی کے جانشین اور فکر ولی اللہ کے وارث سمجھتے ہیں۔ شاہ صاحب نے اپنی کتابوں میں متعدد جگہ اہل تقلید کے مذکورہ رویے پر سخت تنقید کی ہے اور اسے اتباع رسول کے تقاضوں سے صریح انحراف اور ائمۂ کرام کو معصوم ماننے کے مترادف قرار دیا ہے۔ اس کی تفصیل شاہ صاحب کی کتابوں "التفهيمات الالهية، حجة الله البالغة، اور العقد الجيد وغیرہ میں ملاحظہ کی جا سکتی ہے۔ اہل تقلید کے اس رویے کے بارے میں خود اکابر علمائے احناف نے بھی اسی قسم کے تأثرات کا اظہار کیا ہے۔

اہل علم ان سے باخبر ہیں تاہم یہاں مولانا اشرف علی تھانوی مرحوم کے بھی دو اقتباسات پیش کرنے مناسب معلوم ہوتے ہیں، ان میں انھوں نے اہل تقلید کے اس رویے کا اعتراف بھی کیا ہے اور اس پر سخت افسوس کا اظہار بھی۔ مولانا تھانوی اپنے ایک مکتوب میں، جو انھوں نے مولانا رشید احمد گنگوہی مرحوم کے نام تحریر کیا، لکھتے ہیں:

"اکثر مقلدین عوام بلکہ خواص اس قدر جامد ہوتے ہیں کہ اگر قولِ مجتہد کے خلاف کوئی آیت یا حدیث کان میں پڑتی ہے (تو) اُن کے قلب میں انشراح وانبساط نہیں رہتا بلکہ اوّل استنکار قلب میں پیدا ہوتا ہے پھر تاویل کی فکر ہوتی ہے خواہ کتنی ہی بعید ہو اور خواہ دوسری دلیل قوی اُس کے معارض ہو بلکہ مجتہد کی دلیل اس مسئلہ میں بہ جز قیاس کے کچھ بھی نہ ہو بلکہ خود اپنے دل میں اُس تاویل کی وقعت نہ ہو مگر نصرت مذہب کے لیے تاویل ضروری سمجھتے ہیں۔ دل یہ نہیں مانتا کہ قول مجتہد کو چھوڑ کر حدیث صحیح صریح پر عمل کر لیں۔ بعض سنن مختلف فیہا مثلاً آمین بالجہر وغیرہ پر حرب وضرب کی نوبت آجاتی ہے۔ اور قرونِ ثلاثہ میں اس کا شیوع بھی نہ ہوا تھا بلکہ كَيْفَمَا

اتَّفَقَ جس سے چاہا مسئلہ دریافت کرلیا اگر چہ اس امر پر اجماع نقل کیا گیا ہے کہ مذاہب اربعہ کو چھوڑ کر مذہب خامس مستحدث کرنا جائز نہیں، یعنی جو مسئلہ چاروں مذہبوں کے خلاف ہو اُس پر عمل جائز نہیں کہ حق دائر و منحصر ان چار میں ہے مگر اس پر بھی کوئی دلیل نہیں کیونکہ اہل ظاہر ہر زمانہ میں رہے اور یہ بھی نہیں کہ سب اہل ہویٰ ہوں، وہ اس اتفاق سے علیحدہ رہے۔ دوسرے اگر اجماع ثابت بھی ہو جاوے مگر تقلید شخصی پر تو کبھی اجماع بھی نہیں ہوا۔''①

اس مکتوب میں اس سے قبل مولانا تھانوی نے یہ لکھا ہے، یہ بھی بڑا قابل عبرت ہے، لکھتے ہیں:

''تقلید شخصی کہ عوام میں شائع ہو رہی ہے اور وہ اس کو علماً اور عملاً اس قدر ضروری سمجھتے ہیں کہ تارکِ تقلید سے، گو کہ اس کے تمام عقائد موافق کتاب و سنت کے ہوں، اس قدر بغض و نفرت رکھتے ہیں کہ تارکین صلاۃ فساق و فجار سے بھی نہیں رکھتے اور خواص کا عمل و فتویٰ وجوب اس کا مؤید ہے۔''②

مولانا تھانوی ایک اور مقام پر تقلید و عدم تقلید کے موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''بعض مقلدین نے اپنے ائمہ کو معصوم عن الخطا و مصیب وجوباً و مفروض الاطاعت تصور کر کے عزم بالجزم کیا، کہ خواہ کیسی ہی حدیث صحیح مخالف قول امام کے ہو اور مستند قول امام کا بہ جز قیاس امرِ دیگر نہ ہو، پھر بھی بہت سی علل و خلل حدیث میں پیدا کر کے، یا اس کی تاویل بعید کر کے حدیث کو رد کریں گے اور قول امام کو نہ چھوڑیں گے۔ ایسی تقلید حرام اور مصداق قولہ تعالیٰ ﴿اِتَّخَذُوْا أَحْبَارَهُمْ وَ رُهْبَانَهُمْ أَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ﴾ اور خلاف وصیت ائمہ مرحومین کے ہے۔''③

اس قسم کی تقلید جامد کو، جس کا تذکرہ مذکورہ اقتباسات میں کیا گیا ہے، مولانا محمود الحسن نے بھی کفر سے تعبیر کیا ہے۔ چنانچہ وہ ''ایضاح الادلہ'' میں تقلید کے اثبات پر گفتگو کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''تمام نصوص ردّ تقلید سے اُس تقلید کا بُطلان ثابت ہوتا ہے کہ جو تقلید بہ مقابلہ تقلید احکامِ خدا اور رسولِ خدا ہو اور ان کے اتباع کو اتباع احکامِ الٰہی پر ترجیح دے۔ سو پہلے کہہ چکا ہوں کہ اس تقلید

① تذکرة الرشید: ۱/۱۳۱، ادارہ اسلامیات، لاہور: ۱۹۸۶ء
② حوالہ مذکور و صفحۂ مذکور
③ إمداد الفتاوی: ۵/۲۹۷، مکتبہ دار العلوم کراچی، طبع جدید، ۲۰۰٤ء

کے مردود وممنوع، بلکہ کفر ہونے میں کس کو کلام ہے؟''[1]

اقتداء واتباع تو ناگزیر ہے لیکن زیر بحث تقلید اس سے قطعاً مختلف ہے:

ان اقتباسات سے یہ تو واضح ہے کہ کسی امام کی اس انداز سے تقلید کرنا کہ صحیح اور واضح حدیث کے سامنے آجانے کے بعد بھی قولِ امام ہی کو ترجیح دینا اور اس کے مقابلے میں صحیح حدیث کو چھوڑ دینا ممنوع، حرام ﴿اِتَّخَذُوْا أَحْبَارَهُمْ وَ رُهْبٰنَهُمْ أَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ﴾ کا مصداق اور بقول صاحبِ ''ایضاح الادلہ'' کفر ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ مروجہ تقلید اس سے مختلف ہے یا وہ اِسی ذیل میں آتی ہے جس کی مذمت وحرمت پر سب کا اتفاق ہے؟

اہل تقلید کا دعویٰ ہے کہ ہمارا وہی طریقہ ہے جو عہد صحابہ وتابعین میں تھا، یعنی جس شخص کو مسئلے کا علم نہ ہوتا تھا، وہ کسی بھی صاحب علم سے دریافت کر لیتا تھا۔ تین سو سال سے زیادہ عرصے تک یہی طریقہ رائج تھا، یہ طریقہ ظاہر بات ہے بالکل صحیح بھی ہے اور ناگزیر بھی۔ کیونکہ ہر شخص تو ماہر شریعت نہیں ہوسکتا، لہٰذا ضروری ہے کہ بے خبر شخص، باخبر شخص سے پوچھے۔ بے علم عالم سے دریافت کرے اور کم علم والا اپنے سے زیادہ علم رکھنے والے کی طرف رجوع کرے۔ یہ معاملہ شریعت ہی کے ساتھ خاص نہیں، ہر علم وفن کا معاملہ یہی ہے۔ شرعی مسائل واحکام معلوم کرنے کا بھی یہی طریقہ ہے اور عوام کے لیے اس کے بغیر چارہ نہیں ہے۔ لیکن اس میں دو باتیں ضروری ہیں اور صحابہ وتابعین کے زمانے میں ان دونوں باتوں کا پورا اہتمام موجود تھا۔

۱۔ پوچھنے والا صرف اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے احکام پوچھتا تھا، اِس کے علاوہ اس کے ذہن میں کچھ اور نہیں ہوتا تھا۔

۲۔ بتانے والا بھی اپنے علم کی حد تک اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے احکام ہی بتلاتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اگر اسے اس مسئلے کا علم نہ ہوتا، تو وہ سائل کو کسی اور کی طرف بھیج دیتا، یا اپنی سمجھ کے مطابق بتلاتا، پھر اسے اس کے مطابق حدیث مل جاتی تو خوش ہوتا کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے منہ سے صحیح بات نکلوائی۔ اور اگر اسے اس کے خلاف حدیث مل جاتی، تو فوراً اپنی بات سے رجوع کر لیتا۔

خیر القرون کا یہی طریقہ شاہ ولی اللہ نے پوری تفصیل سے ''حجۃ اللہ البالغہ'' اور اپنی بعض دیگر کتابوں میں بیان کیا ہے حتی کہ مولانا اشرف علی تھانوی نے بھی ''امداد الفتاویٰ'' (ج:۵، ص:۲۹۴۔۳۰۰) میں اس کی

---

[1] ایضاح الادلہ، ص:۱۱۳، مطبوعہ ایچ ایم سعید کمپنی کراچی، ۱۹۹۹ء اور اضافہ شدہ مع حاشیۂ جدیدہ ایڈیشن کا صفحہ:۲۲۳، مطبوعہ قدیمی کتب خانہ کراچی

بابت یہی تفصیل بیان کی ہے۔

اس طریقے کو اصطلاحی طور پر تقلید نہیں کہا جاتا، کیونکہ تقلید کی تعریف اس پر صادق نہیں آتی۔تقلید تو کسی کی بات کو بغیر دلیل کے ماننے کا نام ہے۔ علاوہ ازیں اس میں یہ بات بھی داخل ہے کہ ماننے والا (مقلِّد) مُقلَّد (امام وغیرہ) سے دلیل کا مطالبہ نہیں کرسکتا، جب کہ ایک عام شخص جب کسی عالم سے کوئی مسئلہ پوچھتا ہے یا کسی مفتی سے فتویٰ طلب کرتا ہے تو اس کے پیش نظر اللہ اور اس کے رسول کا حکم معلوم کرنا ہوتا ہے، اسی لیے وہ اس کی دلیل بھی، بہ وقت ضرورت، پوچھ لیتا ہے اور پوچھ سکتا ہے، یا اس کی بتلائی ہوئی دلیل سے اس کی تشفی نہیں ہوتی تو وہ کسی اور عالم یا مفتی سے پوچھ لیتا ہے۔اس طریقے میں عالم اور مفتی بھی قرآن وحدیث کی روشنی ہی میں مسئلے کی وضاحت کرتا ہے، کسی مخصوص فقہ کو سامنے نہیں رکھتا۔

یہ طریقہ اقتدا اور اتباع کہلاتا ہے کیونکہ اس میں اصل جذبہ اللہ اور اس کے رسول کے احکام کی پیروی کرنے کا ہوتا ہے۔ چوتھی صدی ہجری سے پہلے تک تمام مسلمان عوام وخواص، جاہل و عالم اسی طریقے پر کاربند تھے۔لیکن جب چوتھی صدی میں فقہی مذاہب کو فروغ حاصل ہوا اور محدثین اور اُن کے ہم مسلک لوگوں کے علاوہ دوسروں نے اپنے آپ کو کسی نہ کسی مذہب سے وابستہ کرلیا تو مذکورہ طریقہ صرف محدثین اور ان کی روش پر چلنے والوں تک محدود ہوگیا اور دوسروں کے ہاں ایک مخصوص فقہ کی پابندی ضروری ہوگئی اور ان کے عوام وخواص سب ہی نے صحابہ وتابعین کے طریقے کو چھوڑ دیا اور تقلید کو واجب قرار دے دیا۔جس کا مطلب ہی یہ تھا اور ہے کہ اب براہِ راست قرآن وحدیث سے اخذِ مسائل کی ضرورت نہیں حتی کہ علماء ومفتیان بھی اپنے عوام کو قرآن وحدیث کے مطابق مسائل بتلانے کے پابند نہیں۔ وہ پابند ہیں تو صرف اس بات کے کہ ان کی مخصوص فقہ میں کیا درج ہے، اس کی روشنی میں یہ جائز ہے یا ناجائز؟ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے عوام کو احادیث کی کتابوں کے مطالعے سے روکتے ہیں اور کئی مفتی حضرات تو اس حد تک جسارت کرتے ہیں کہ اسے گمراہی قرار دیتے ہیں۔

افتراقِ امت کا باعث تقلید حرام ہے، نہ کہ علماء کی پیروی:

افتراقِ امت کے المیے کا اصل نقطۂ آغاز بھی یہی ہے ورنہ قرآن وحدیث کے فہم وتعبیر کا یا اجتہاد واستنباط کا کچھ نہ کچھ اختلاف تو صحابہ وتابعین میں بھی تھا۔یہ اختلاف محدثین کے درمیان بھی تھا اور ان کے مسلک ومنہج کے پیروکار عاملین بالحدیث کے درمیان بھی ہے لیکن یہ اختلاف فہم وتعبیر کا ہے یا استنباط واجتہاد کا

یا پھر اس کا مبنیٰ حدیث کی صحت وضعف کا اختلاف ہے، جیسے صحابہ میں اختلاف کی ایک وجہ کسی حدیث سے بے خبری یا اس کے نسخ یا عدم نسخ سے لاعلمی بھی تھی۔ یہ اختلاف افتراقِ امت کا باعث نہیں، اسی لیے صحابہ و تابعین کا دور، اختلافات کے باوجود، فرقہ بندیوں سے پاک تھا۔

بنابریں اہل تقلید کا یہ دعویٰ کہ ہماری تقلید وہ نہیں جس کو ممنوع اور حرام کہا گیا ہے بلکہ ہمارا طریقہ تو وہی ہے جو صحابہ و تابعین کا تھا، کس طرح درست قرار دیا جا سکتا ہے، جب کہ دونوں طریقے فکر و منہج سے لے کر مقصد و مدعا تک ایک دوسرے سے یکسر مختلف ہیں؟ اور ان کے درمیان اتنی وسیع خلیج حائل ہے کہ جس کا پاٹنا بظاہر نہایت مشکل ہے۔﴿إِلَّا أَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ﴾ اس دعوے کے ردّ میں یا دونوں نقطہ ہائے نظر کے فرق و اختلاف پر بہت کچھ کہا جا سکتا ہے اور تقلید کے وہ نمونے بھی پیش کیے جا سکتے ہیں، جن میں فقہ کے مقابلے میں صحیح احادیث کو نظر انداز کیا گیا ہے یا ان میں دور از کار تاویلیں کی گئی ہیں۔ لیکن ہمارا مقصد چونکہ اختلافات کی خلیج کو، جو پہلے ہی ناقابل عبور بنی ہوئی ہے، وسیع کرنا نہیں ہے، ﴿ وَاللّٰهُ عَلٰى مَا نَقُوْلُ وَكِيْلٌ ﴾ اس لیے اس پر گفتگو کرنے کے بجائے ہم «اَلدِّيْنُ النَّصِيْحَةُ» (دین خیر خواہی کا نام ہے) کے طور پر اختلافات کی شدّت کو ختم کرنے کے لیے چند گزارشات پیش کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔ علماء سے تو ہمیں یہ امید بہت کم ہے کہ وہ سنجیدگی سے ان پر غور فرمائیں گے، تاہم عوام سے ہم یہ استدعا ضرور کریں گے کہ وہ ان پہلوؤں پر غور کریں اور اس کی روشنی میں فیصلہ کریں کہ وہ اب تک جس راہ پر چلتے آئے ہیں وہ واقعی صحیح ہے؟ یا اس کا رُخ بدلنے کی ضرورت ہے؟ حدیث کی کتاب کا مطالعہ کرتے وقت اگر عوام میں یہ احساس اُجاگر ہو جائے اور غور و فکر کا داعیہ اور جذبہ پیدا ہو جائے اور اس کے ساتھ ساتھ صراطِ مستقیم کی اللہ تعالیٰ سے دعا اور اس کی طلبِ صادق بھی ان کے اندر ہو، تو یقیناً اللہ تعالیٰ مدد فرمائے گا۔ بقولِ علامہ اقبالؒ

ہم تو مائل بہ کرم ہیں ، کوئی سائل ہی نہیں
راہ دکھلائیں کسے ، راہروِ منزل ہی نہیں

قابلِ غور و فکر پہلو:

۱۔ اللہ کا نازل کردہ دین ایک ہی ہے اور وہ اسلام اور صرف اسلام ہے۔

﴿إِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْإِسْلَامُ ﴾ (آل عمران:۳/ ۱۹)

﴿ وَ مَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ وَ هُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ﴾ (آل عمران:۳/ ۸۵)

اس دین کو اللہ تعالیٰ نے یا اللہ کے رسول نے ''مذاہب'' میں تقسیم نہیں فرمایا، بلکہ اس ایک دین ہی کو مل کر مضبوطی سے تھامنے کا حکم دیا اور جدا جدا ہونے سے منع فرمایا ہے:

﴿وَ اعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّ لَا تَفَرَّقُوْا وَ اذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖۤ اِخْوَانًا وَ كُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ﴾(ال عمرٰن:۳/ ۱۰۳)

اور اپنے رسول کے ذریعے سے بھی اعلان کروایا:

﴿وَ اَنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْمًا فَاتَّبِعُوْهُ وَ لَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيْلِهٖ ذٰلِكُمْ وَصّٰكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ﴾ (الأنعام:٦/ ١٥٤)

''یہ میرا سیدھا راستہ ہے، تم اسی کی پیروی کرو، اور کئی راستوں کے پیچھے مت لگو، وہ تمھیں اس سیدھے راستے سے پلٹا دیں گے۔''

۲۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے متعدد مقامات پر تَفَرُّق سے روکا ہے، جس کا مطلب فرقوں اور گروہوں میں بٹ جانا ہے اور فقہی مذاہب میں منقسم ہوجانا بھی اس سے خارج نہیں ہے۔ علاوہ ازیں نبی ﷺ نے بھی ایک ہی راستے پر چلنے کی تلقین فرمائی ہے اور دوسرے تمام راستوں کو غلط قرار دیا ہے۔ اس اعتبار سے حق کا راستہ ایک ہی ہوسکتا ہے نہ کہ متعدد۔ عقل و نقل کے اعتبار سے متعدد راستے بہ یک وقت کس طرح ''حق'' ہوسکتے ہیں۔ قرآن تو کہتا ہے:

﴿ فَمَاذَا بَعْدَ الْحَقِّ اِلَّا الضَّلٰلُ ﴾ (یونس :١٠/ ٣٢)

''حق ایک ہی ہے، باقی سب گمراہی۔''

۳۔ یہ دین اسلام یا صراطِ مستقیم کیا ہے؟ اور کہاں ہے؟ یہ قرآنِ مجید اور نبی ﷺ کی احادیث کا نام ہے۔ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا:

« تَرَكْتُ فِيْكُمْ أَمْرَيْنِ لَنْ تَضِلُّوْا مَا تَمَسَّكْتُمْ بِهِمَا ، كِتَابَ اللّٰهِ وَ سُنَّةَ نَبِيِّهِ »[1]

''میں تمہارے اندر دو چیزیں چھوڑ چلا ہوں، تم جب تک اِن دونوں کو تھامے رہو گے، ہرگز گمراہ نہیں ہو گے، ایک اللہ کی کتاب اور دوسری اس کے نبی کی سنت۔''

۴۔ یہ دین، سابقہ دینوں کی طرح غیر محفوظ نہیں رہا چونکہ قیامت تک آنے والے انسانوں کے لیے یہی

[1] موطأ امام مالك، كتاب القدر، حديث:٣

دین راہِ نجات ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس کی حفاظت کا بھی ذمہ لیا اور فرمایا:

﴿ اِنَّا نَحۡنُ نَزَّلۡنَا الذِّکۡرَ وَ اِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوۡنَ ﴾ (الحجر: ۱۵/ ۹)

''ہم ہی نے اس ''الذکر'' کو اتارا ہے اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں۔''

﴿الذکر﴾ سے مراد قرآن مجید ہے، جو محفوظ ہے، اِس میں کسی قسم کا تغیر نہیں ہوا ہے اور نہ آئندہ ہی ہو سکے گا اور چونکہ حدیثِ رسول کے بغیر اس کو سمجھنا اور اس پر عمل کرنا ممکن نہیں تھا، اس لیے اس کی حفاظت کے مفہوم میں حدیث کی حفاظت بھی شامل ہے۔ چنانچہ حدیث کی حفاظت کے لیے اللہ تعالیٰ نے محدثین کا گروہ پیدا فرمایا جس نے بے مثال کاوش و محنت سے حدیث کی حفاظت کا عظیم الشان کام سرانجام دیا، اس لیے اس دین کا ماخذ صرف اور صرف قرآنِ کریم اور احادیث صحیحہ ہیں اور ان کو سمجھنے کے لیے کسی بھی فقہی کتاب کی ضرورت نہیں، البتہ صحابہ کرام کا منہج اور ان کی تعبیرات کی پابندی ضروری ہے۔

۵۔ ائمۂ کرام میں سے کسی نے بھی یہ نہیں کہا کہ ان کی بات حرفِ آخر ہے بلکہ اس کے برعکس انھوں نے یہ کہا ہے کہ ان سے بھی غلطی ہو سکتی ہے۔ اس لیے انھوں نے اس امر کی بھی تاکید کی ہے کہ ان کے قول کے مقابلے میں صحیح حدیث آجائے، تو ہماری بات کو چھوڑ دینا اور حدیث پر عمل کرنا۔ علاوہ ازیں خود ان کا بھی کئی باتوں میں رجوع ثابت ہے۔ اور بعض مسائل میں ان کے شاگردوں کی بھی یہ صراحت موجود ہے کہ یہ حدیث ہمارے استاد اور امام کے سامنے نہیں تھی، اس لیے انھوں نے اس کے برعکس رائے اختیار کی اگر انھیں یہ حدیث مل جاتی، تو وہ یقیناً اپنی رائے سے رجوع کر لیتے۔ ائمہ کے دور میں احادیث کی جمع و تدوین اور ان کی جانچ پرکھ کا وہ کام نہیں ہوا تھا جو کتب ستہ اور دیگر کتابوں کے مؤلفین نے کیا، اس لیے ان کے سامنے بطورِ خاص اِمام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے سامنے احادیث کے یہ مجموعے نہیں تھے، اس لیے وہ تو اپنی غلطی پر معذور بلکہ مأجور ہی ہوں گے۔ لیکن احادیث صحیحہ کے مجموعے مرتب و مدوّن ہو جانے کے بعد، حدیث کے مقابلے میں، کسی فقہی رائے پر اصرار کرنے اور مختلف انداز سے حدیثوں کو مسترد کرنے کا کیا جواز ہے؟

۶۔ ان ائمہ کے شاگردانِ رشید نے بہت سے مسائل میں اپنے امام اور استاذ سے اختلاف کیا ہے۔ قاضی ابو یوسف اور امام محمد دونوں اِمام ابوحنیفہ کے سب سے اہم شاگرد ہیں۔ انھوں نے اپنے امام سے فروع ہی میں نہیں، اصول میں بھی اختلاف کیا ہے۔ اور اختلاف بھی چند ایک مسائل ہی میں نہیں بلکہ دو تہائی ($\frac{2}{3}$) مسائل میں کیا ہے۔ اگر وہ امام صاحب سے اتنے اختلاف کے باوجود مقلد کے مقلد ہی ہیں، تو

بعد کے لوگ بھی اگر دلائل کی بنیاد پر ایسا کریں گے، تو اسے کون غیر معقول یا امام کے مذہب سے خروج قرار دے سکتا ہے؟

اس اختلاف کی اور بھی کئی مثالیں ہیں۔ ان میں ایک اور نہایت نمایاں مثال مولانا عبدالحئ لکھنوی حنفی کی ہے۔ انھوں نے فقہ کے مقابلے میں احادیث کو ترجیح دیتے ہوئے بیسیوں مسائل میں محدثین کے مسلک کو راجح قرار دے کر انھیں اختیار کیا ہے جس کی تفصیل ہمارے فاضل دوست مولانا ارشاد الحق اثری حفظہ اللہ (فیصل آباد) کی تالیف ''مسلک احناف اور مولانا عبدالحئ لکھنوی'' میں ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔ بلکہ مولانا اشرف علی تھانوی اور ان کے ہم عصر علمائے دیوبند نے بھی زوجۂ مفقود الخبر اور بعض دیگر صورتوں میں فقہ حنفی کو چھوڑ کر فقہ مالکی کی رائے کو اختیار کیا ہے۔ (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو، الحیلة الناجزة ،تالیف مولانا اشرف علی تھانوی)

بلکہ اس کتاب کے نئے ایڈیشن میں حرفِ آغاز کے عنوان سے مولانا تقی عثمانی صاحب کا دیباچہ ہے، اس میں ان کا بھی یہ اعتراف موجود ہے:

> ''ایسی خواتین جنھوں نے نکاح کے وقت تفویض طلاق کے طریقے کو اختیار نہ کیا ہو، اگر بعد میں کسی شدید مجبوری کے تحت شوہر سے گلوخلاصی حاصل کرنا چاہیں، مثلاً شوہر اتنا ظالم ہو کہ نہ نفقہ دیتا ہو نہ آباد کرتا ہو۔ یا وہ پاگل ہو جائے یا مفقود الخبر ہو جائے یا نامرد ہو اور از خود طلاق یا خلع پر آمادہ نہ ہو، تو اصل حنفی مسلک میں ایسی عورتوں کے لیے شدید مشکلات ہیں، خاص طور پر اُن مقامات پر جہاں شریعت کے مطابق فیصلے کرنے والا کوئی قاضی موجود نہ ہو، ایسی عورتوں کے لیے اصل حنفی مسلک میں شوہر سے رہائی کی کوئی صورت نہیں ہے...... حضرت حکیم الامت (مولانا تھانوی) قدس سرہ نے ایسے بیشتر مسائل میں مالکی مذہب کے مطابق فتوی دیا ہے۔''[1]

اس میں یہ بھی صراحت ہے کہ (متحدہ) ہندوستان کے علماء نے بھی مولانا تھانوی کی تصدیق و تائید فرمائی۔

مثال کے طور پر زوجۂ مفقود الخبر کے متعلق فقہ مالکی کے مطابق یہ موقف اختیار کیا گیا ہے کہ وہ عدالتی فیصلے کے بعد چار سال انتظار کرے اور اس کے بعد چار مہینے ۱۰ دن عدت گزار کے دوسری جگہ نکاح کرلے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی انھوں نے یہ بھی فرمایا ہے کہ مرافعہ (عدالتی چارہ جوئی) کے بعد مزید انتظار کی صورت میں اگر عورت اندیشۂ ابتلاء ظاہر کرے اور اس نے ایک عرصۂ دراز تک مفقود کا انتظار کرنے کے بعد مجبور ہو کر

---

[1] الحیلة الناجزة، ص: ۹۔۱۰، دار الاشاعت، کراچی

اس حالت میں درخواست دی ہو جب کہ صبر سے عاجز آ گئی ہو، تو اس صورت میں اس کی بھی گنجائش ہے کہ مذہب مالکیہ کے موافق چار سال کی میعاد میں تخفیف کردی جائے، کیونکہ جب عورت کے ابتلا کا شدید اندیشہ ہو تو ان (مالکیوں) کے نزدیک کم ازکم ایک سال صبر کے بعد تفریق جائز ہے۔ ①

ایک اور حنفی عالم ڈاکٹر تنزیل الرحمٰن (سابق چیئرمین اسلامی نظریاتی کونسل) نے اس سے بھی کم مدت کے اندر، یعنی فی الفور عدالت کو نکاح فسخ کرکے دوسری جگہ شادی کرنے کی اجازت دی ہے۔ چنانچہ وہ ایک سال کے قول کو (چار سال کے مقابلے میں) موجودہ زمانے کے لحاظ سے ترجیح دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''مگر لازم ہے کہ مزید ایک سال انتظار کا حکم اس صورت میں دیا جائے گا جب کہ عورت کے پاس ایک سال کے نفقے کا انتظام موجود ہو۔ بصورتِ دیگر عدالت، بعد ثبوت مفقود الخبری، بوجہ مفقود الخبری شوہر وعدم موجودگی نفقہ، فی الفور نکاح فسخ کرنے کی مجاز ہوگی۔'' ②

ایک مجلس کی تین طلاقوں کا مسئلہ بھی اہل حدیث واحناف کے مابین ایک اہم مسئلہ ہے لیکن اس میں بھی متعدد علمائے احناف نے اہل حدیث کے نقطۂ نظر کو اپنایا ہے اور دوسروں کو بھی اس کے اپنانے کی تلقین کی ہے جیسے مولانا سعید احمد اکبر آبادی مدیر ''برہان'' دہلی، مولانا عبدالحلیم قاسمی (بانی جامعہ حنفیہ گلبرگ، لاہور) مولانا حسین علی واں بھچراں، پیر کرم شاہ ازہری وغیرھم ہیں۔ اور ایسے بھی متعدد علماء ہیں جنھوں نے بہ وقت ضرورت (یعنی ناگزیر حالات میں) مجلس واحد کی تین طلاقوں کو ایک طلاق شمار کرکے رجوع کرنے کا فتویٰ دیا ہے جیسے مفتی کفایت اللہ دہلوی اور مولانا عبدالحئی لکھنوی وغیرہ۔ (دیکھیے ''کفایت المفتی'' اور ''فتاویٰ مولانا عبدالحئی لکھنوی'') اور ایسے بھی ہیں جو خود تو فتویٰ دینے سے گریز کرتے ہیں لیکن بعض خصوصی حالات میں وہ اپنے خاص مریدوں یا متعلقین کو مشورہ دیتے ہیں کہ وہ کسی اہل حدیث عالم سے فتوی حاصل کرکے رجوع کرلیں۔ بعض اور مسائل میں بھی اس قسم کی مثالیں موجود ہیں جیسے مولانا سعید احمد اکبر آبادی کی مثال سطورِ بالا میں گزری ہے۔ یہ مولانا انور شاہ کشمیری کے ارشد تلامذہ میں سے ہیں، اس کے باوجود انھوں نے فقہ حنفی کے بہت سے مسائل کو چھوڑ کر دوسری رائے اختیار کی۔ علاوہ ازیں انھوں نے حدیث کے بارے میں بعض علمائے احناف کی روش پر بھی سخت تنقید کی اور اسے محدثین کا استخفاف، ان کی سعی وکاوش پر پانی پھیرنے اور منکرینِ حدیث کی ہم نوائی سے تعبیر کیا۔ (اس کی تفصیل راقم کے مضمون ''مولانا سعید احمد اکبر

① الحیلۃ الناجزۃ، ص: ۷۱

② مجموعۂ قوانین اسلام: ۲/ ۷۰۱

آبادی اور ان کا فقہی توسّع'' میں ملاحظہ کی جا سکتی ہے، جو ان کے وفات کے بعد لکھا گیا تھا اور اُس وقت ''الاعتصام''، ''میثاق'' اور ''محدث'' بنارس (بھارت) وغیرہ میں شائع ہوا تھا۔

اس تقلید کو آخر کیا کہا جائے؟:

جب اس قسم کی مثالیں موجود ہیں جو یقیناً مستحسن بھی ہیں اور وقت کی ضرورت بھی اور سب سے بڑھ کر نصوصِ شریعت کا اقتضاء بھی۔ تو پھر اس کے برعکس فقہی جمود کی یہ مثالیں ناقابل یقین لگتی ہیں جو بعض اکابر کی طرف سے سامنے آئی ہیں۔ لیکن چونکہ وہ ان کی کتابوں میں موجود ہیں، اس لیے انھیں جھٹلانا بھی ممکن نہیں ہے جیسے مثال کے طور پر مولانا محمود الحسن صاحب، جن کو شیخ الہند کہا جاتا ہے، فرماتے ہیں:

« اَلْحَقُّ وَالْاِنْصَافُ أَنَّ التَّرْجِيْحَ لِلشَّافِعِيِّ فِي هٰذِهِ الْمَسْئَلَةِ وَ نَحْنُ مُقَلِّدُوْنَ يَجِبُ عَلَيْنَا تَقْلِيْدُ اِمَامِنَا أَبِيْ حَنِيْفَةَ »[1]

''حق و انصاف کی بات یہی ہے کہ (احادیث ونصوص کے اعتبار سے اس مسئلۂ خیارِ مجلس) میں اِمام شافعی کی رائے کو ترجیح حاصل ہے۔ لیکن ہم مقلِّد ہیں، ہم پر اپنے امام ابوحنیفہ، کی تقلید ہی واجب ہے۔''

اِسی ذیل میں بعض وہ تبدیلیاں بھی آتی ہیں جو نصوص حدیث میں محض اس لیے کی گئی ہیں کہ ان کے معمول بہ مسائل کا اثبات ہو سکے جیسے مسند حمیدی میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث ہے جو اثبات رفع الیدین میں واضح ہے، لیکن الفاظ کے معمولی ردّ و بدل سے اسے عدم رفع الیدین کی دلیل بنا دیا گیا ہے۔ اسی طرح مصنَّف ابن أبی شیبہ کی ایک روایت اور سنن ابوداؤد کی ایک روایت میں کیا گیا۔ ان کی تفصیل بہ وقت ضرورت پیش کی جا سکتی ہے۔

حتی کہ تقلیدی جمود کا یہ نقشہ بھی سامنے آیا کہ اثباتِ تقلید کے جوش میں قرآن مجید کی ایک آیت میں ﴿وَ اِلٰی اُولِی الْأَمْرِ مِنْكُمْ﴾ کا اضافہ کر دیا گیا۔ اسے کتابت کی غلطی اس لیے نہیں سمجھا جا سکتا کہ استدلال کی ساری بنیاد ہی اس اضافی ٹکڑے پر ہے۔[2]

ایک اور صاحب نے قرآن مجید کی ایک آیت میں لفظی و معنوی تصرف کر کے عدم رفع الیدین کو ''ثابت'' کر دکھایا ہے۔ (ملاحظہ ہو ''تحقیق مسئلہ رفع الیدین، از ابومعاویہ صفدر جالندھری، ابوحنیفہ اکیڈمی،

---

[1] التقریر الترمذی، ص: ۴۹، مکتبۃ رحمانیہ، لاہور

[2] ایضاح الادلۃ، ص: ۲۱۶، ۲۱۵

فقیر والی، ضلع بہاول نگر، تاریخ اشاعت درج نہیں)

آج اُس فقہی توسُّع کی ضرورت ہے جس کی بعض مثالیں مولانا عبدالحیٔ لکھنوی وغیرہ کے طرزِ عمل میں ملتی ہیں، جس میں نصوصِ شریعت کی بالادستی قائم رہتی ہے، نہ کہ اس فقہی جمود کی جس کی کچھ مثالیں عرض کی گئی ہیں جس کے عدم جواز میں کوئی اختلاف نہیں، بلکہ ان کی اپنی صراحت کے مطابق اس میں کفر تک کا اندیشہ پایا جاتا ہے۔ علمائے اسلام اور مفتیانِ دینِ متین کو کون سی راہ اختیار کرنی چاہیے یا ان کا منصبِ عظیم کس راہ کو اپنانے کا تقاضا کرتا ہے؟ اس کی وضاحت یا فیصلہ کوئی مشکل امر نہیں۔

﴿ فَاَیُّ الْفَرِیْقَیْنِ اَحَقُّ بِالْاَمْنِ اِنْ کُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ﴾ (الأنعام:٦/ ٨١)

''دونوں فریقوں میں سے کون امن و سلامتی کا زیادہ مستحق ہے، اگر تم علم رکھتے ہو؟''

امن و سلامتی کی راہ وہی ہے جس کی نشاندہی ہم نے بالکل آغاز میں کی تھی جو امت مسلمہ کی وحدت کی ضامن بھی ہے اور فقہی اختلافات و حزبی تعصّبات کے خاتمے یا کم از کم اس کی شدت کو کم کرنے کا واحد ذریعہ بھی۔ اور یہ محدثین کی راہ ہے، کسی ذہنی تحفظ کے بغیر عمل بالحدیث کی راہ ہے، فقہی جمود کے بجائے فقہی توسُّع کی راہ ہے اور ہر صورت میں نصوصِ شریعت کی برتری کو ماننے اور قائم رکھنے کی راہ ہے اور اس کے خطوط حسب ذیل ہیں:

محدثین کا مسلک و منہج:

ا۔ پہلا اصول: حدیث کی صحت وضعف کی تحقیق میں سند کو بنیادی اہمیت حاصل ہے:

« لَو لَا الِاسْنَادُ لَقَالَ مَنْ شَاءَ مَا شَاءَ »[1]

''سند کو تسلیم نہ کیا جائے تو پھر ہر شخص جو چاہے، کہہ سکتا ہے۔''

سند ہی غیر صحیح روایات کو جانچنے کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔ اس بنیاد سے روایات صحیح قرار دینے کے تمام چور دروازے بند ہو جاتے ہیں۔

اہل تقلید کا رویہ:

اہل تقلید کا رویہ اس کے برعکس ہے، وہ ردّ حدیث کے لیے کئی طریقے اختیار کرتے ہیں، مثلاً کہا جاتا ہے:

- فلاں امام نے جو بات کہی ہے، آخر ان کے سامنے بھی تو کوئی حدیث ہوگی؟

[1] مقدمة صحيح مسلم، ص:١١

- یا اُن کے دَور تک اس حدیث کی سند میں کوئی راوی ضعیف، متروک اور کذاب نہیں ہوگا۔
- یا حدیث کی صحت وضعف ایک اجتہادی امر ہے۔ اس لیے ایک مجتہد نے جس حدیث سے استدلال کیا ہے، چاہے وہ ضعیف بلکہ موضوع ہی ہو، اس کا استدلال صحیح ہے۔ کسی دوسرے مجتہد کو اس کی بات کو ردّ کرنے کا حق نہیں ہے۔
- یا روایت تو ضعیف یا موضوع (من گھڑت، یعنی بے سند) ہے، لیکن اسے تَلَقِّی بِالْقَبُوْل کا درجہ حاصل ہے۔ جیسے «أَوَّلُ مَا خَلَقَ اللّٰهُ نُوْرِی» یا «لَوْلَاكَ لَمَا خَلَقْتُ الْأَفْلَاكَ» جیسی بے سند بنائی ہوئی حدیثیں ہیں۔ یہ دونوں من گھڑت روایات بریلوی حضرات ہی نہیں، علمائے دیو بند بھی اپنی کتابوں میں لکھتے اور اپنے وعظ وتقریر میں بیان کرتے ہیں۔
- یا حسن ظن کی بنیاد پر مرسل روایات کو صحیح تسلیم کرنا۔
- یا ''درایت'' کے خلاف ہونے کا دعویٰ کر کے روایت کو ردّ کر دینا۔
- یا اپنے خود ساختہ اصولوں کی روشنی میں صحیح احادیث کو ردّ کر دینا، جس پر شاہ ولی اللہ اور شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہما نے بھی احتجاج کیا ہے۔
- یا (بہ زعم خویش) یہ دعویٰ کر کے کہ فلاں حدیث قرآن کے معارض ہے، حدیث کو ردّ کر دینا۔ (جب کہ کوئی صحیح حدیث قرآن کے معارض نہیں)
- یا حدیثِ آحاد کو نظر انداز کرنا۔
- یا غیر فقیہ راوی (صحابی) کی روایت قیاس کے خلاف ہوگی، تو نامقبول ہوگی۔

اور اس قسم کے دیگر طریقے یا اصول، جن کے ذریعے سے صحیح حدیث کو بلا تامل ردّ کر دیا جاتا ہے اور ضعیف، مرسل حتی کہ موضوع حدیث تک کو قبول کر لیا جاتا ہے۔ یہ محدثین کے مسلک ومنہج کے خلاف یا بہ الفاظ دیگر، ثابت شدہ نصوص حدیث کو مسترد کرنے یا غیر ثابت شدہ بات کو شریعت باور کرانے کی مذموم سعی ہے۔ جس کے ہوتے ہوئے کبھی نصوصِ شریعت کی بالادستی قائم نہیں ہوسکتی اور نہ اختلافات کا خاتمہ ہی ممکن ہے۔ علاوہ ازیں یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ان چور دروازوں کا کوئی تعلق امام ابوحنیفہ سے نہیں ہے۔ یہ سب بعد کے لوگوں کی ایجاد ہے۔ ان میں سے کوئی ایک اصول بھی امام ابوحنیفہ سے ثابت نہیں کیا جاسکتا۔ گویا محدثین کی روش کو اپنانا امام صاحب کی تقلید کے منافی نہیں ہے۔

②۔ دوسرا وصف:

محدثین کا دوسرا وصف، اَمانت اور دیانت کا اہتمام ہے۔ انھوں نے احادیث کی جمع وتدوین میں بھی کمال دیانت کا مظاہرہ کیا ہے۔ اور جرح وتعدیل کے اصولوں کو استعمال کر کے احادیث کا رتبہ متعین کرنے میں بھی انھوں نے کسی ذہنی تحفظ کا مظاہرہ کیا ہے، نہ کسی حزبی وفقہی تعصب کا۔

اہل تقلید کا رویہ:

اہل تقلید میں اِس کی بھی کمی ہے۔ اس کی بہت سی مثالیں دی جا سکتی ہیں، لیکن یہاں ہم صرف چار مثالیں پیش کریں گے، دو علمائے دیوبند کی، تیسری بریلوی حضرات کی یہ دونوں ہی امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے مقلد کہلاتے ہیں۔ چوتھی مثال دونوں میں قدر مشترک کی حیثیت رکھتی ہے۔

پہلی مثال: خواتین نماز کس طرح پڑھیں؟ یعنی وہ رکوع سجدہ کس طرح کریں؟ ہاتھ کہاں باندھیں؟ رفع الیدین کس طرح کریں؟ عورتوں کی بابت کسی بھی صحیح حدیث میں ان امور کی وضاحت نہیں ملتی، اس لیے وہ نبی ﷺ کے فرمان: « صَلُّوْا كَمَا رَأَيْتُمُوْنِيْ أُصَلِّيْ »[1] ''تم اس طرح نماز پڑھو، جس طرح تم نے مجھے نماز پڑھتے ہوئے دیکھا ہے۔'' کے عموم میں شامل ہوں گی اور مذکورہ سارے کام مردوں ہی کی طرح سرانجام دیں گی۔ لیکن علمائے احناف کہتے ہیں کہ مرد اور عورت کی نماز میں فرق ہے۔ مثلاً وہ کہتے ہیں کہ عورت ہاتھ سینے پر باندھے (جب کہ مرد ناف کے نیچے) عورت ہاتھ باندھتے، یعنی تکبیر تحریمہ کے وقت اپنے ہاتھ کندھوں تک اُٹھائے (جب کہ مرد کانوں کی لَو کو ہاتھ لگائے) عورت سجدہ بالکل سمٹ کر اور زمین سے چمٹ کر کرے، جب کہ سجدے میں مردوں کی کہنیاں اور بازو زمین سے اُٹھے ہونے چاہئیں۔ اِسی طرح کچھ اور فرق بھی بتلائے جاتے ہیں (ہم نے اختصار کی خاطر موٹی موٹی باتیں بیان کی ہیں۔) ''خواتین کا طریقۂ نماز'' تالیف مولانا عبدالرؤف سکھروی ہمارے سامنے ہے، اِس میں ان فروق کو بیان کرنے کے لیے احادیث کے نام سے کئی احادیث بیان کی گئی ہیں لیکن ان میں سے کوئی ایک حدیث بھی صحیح نہیں ہے اور ستم ظریفی کی انتہا ہے یا امانت و دیانت کے فقدان کا یہ حال ہے کہ ان بیان کردہ احادیث میں السنن الکبریٰ للبیهقی کی دو روایات بھی ہیں۔ جن کو درج کر کے امام بیہقی نے لکھا ہے «لَا يحتج بأمثالهما» ''یہ روایات اتنی ضعیف ہیں کہ ان جیسی روایات سے استدلال نہیں کیا جا سکتا۔'' لیکن مذکورہ

---

[1] صحيح البخاری، الأذان، باب الأذان للمسافرين إذا كانوا جماعة......، رقم:٦٣١

کتاب کے مؤلف نے ان الفاظ کو تو نقل نہیں کیا، البتہ دونوں ناقابل استدلال روایات کو اپنے استدلال میں پیش کیا ہے۔ یہی حال دیگر روایات کا ہے جو انھوں نے پیش کی ہیں۔ فإلی اللّٰہ المشتکی۔ (مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو، راقم کی کتاب ''کیا عورتوں کا طریقۂ نماز مردوں سے مختلف ہے؟'')

دوسری مثال: علمائے احناف کے چوٹی کے عالم مولانا احمد علی سہارنپوری کی ہے جن کا حاشیۂ صحیح بخاری متداول ہے۔ انھوں نے حدیث «إِذَا أُقِيْمَتِ الصَّلَاةُ فَلَا صَلَاةَ اِلَّا الْمَكْتُوْبَةَ»① جسے امام بخاری نے ترجمة الباب (الصَّلَاة، باب:۳۸) میں ذکر کیا ہے۔ اس کے حاشیے میں سنن بیہقی کے حوالے سے یہی حدیث (اذا اقیمت الصلاۃ......الحدیث) نقل کی ہے، اس میں اِلَّا رَكْعَتَيِ الْفَجْرِ کے الفاظ کا اضافہ ہے یعنی ''فرض نماز کی تکبیر ہو جانے کے بعد کوئی نماز نہیں، البتہ فجر کی دو رکعتیں (سنتیں) پڑھنا جائز ہے۔'' حالانکہ امام بیہقی رحمہ اللہ نے اس اضافے کی بابت صراحت کی ہے کہ ''یہ اضافہ (البتہ فجر کی دو سنتیں پڑھنا جائز ہے) بے اصل ہے'' و هذه الزيادة لا أصل لها. اور لکھتے ہیں کہ اس اضافے کو بیان کرنے والے حجاج بن نصیر اور عباد بن کثیر ہیں اور یہ دونوں راوی ضعیف ہیں۔② اس کے باوجود ایک صحیح حدیث کو ردّ کرنے اور اپنے خلافِ حدیث رواج کو صحیح باور کرانے کے لیے صحیح بخاری کے فاضل محشی نے اس بے اصل اضافے کو حدیث رسول کہہ کر بیان کیا ہے۔ (صحیح البخاری:۱/۱۹۷، طبع نور محمد) انا للہ وانا الیہ راجعون۔

یہ بات بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگی کہ صحیح بخاری کا یہ حاشیہ آج سے تقریباً سوا سو سال قبل جب چھپ کر پہلی مرتبہ منظر عام پر آیا تھا تو شیخ الکل میاں نذیر حسین محدث دہلوی رحمہ اللہ نے ایک مکتوب کے ذریعے سے اس کوتاہی یا بدیانتی کی طرف توجہ دلائی تھی، لیکن اس کی اصلاح نہیں کی گئی۔ اور صحیح بخاری کے عربی حاشیے میں یہ بے اصل حدیث، حدیث رسول کے نام سے اب تک موجود ہے۔ میاں نذیر حسین محدث دہلوی کا یہ مکتوب جو عربی میں ہے، کتاب «أعلام أهل العصر» (تالیف مولانا شمس الحق ڈیانوی) میں موجود ہے۔ فإلی اللّٰہ المشتکی۔ غالباً اسی بے بنیاد روایت کی بنیاد پر عام مسجدوں میں فجر کی جماعت کے دوران میں لوگ بے دھڑک سنتیں پڑھ رہے ہوتے ہیں اور حدیثِ رسول (نماز کی تکبیر ہو جانے کے بعد فرض نماز کے علاوہ کوئی نماز نہیں) (صحیح مسلم) کی خلاف ورزی کی جاتی اور ﴿وَ اِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَ اَنْصِتُوْا﴾ (الأعراف:۷/۲۰۴) ''جب قرآن پڑھا جا رہا ہو، تو تم کان لگا کر سنو اور خاموش رہو۔'' کا ذرا لحاظ نہیں کیا

① صحيح مسلم، بَابُ كَرَاهَةِ الشُّرُوعِ فِي نَافِلَةٍ بَعْدَ شُرُوعِ الْمُؤَذِّنِ، رقم: ۷۱۰

② السنن الكبرىٰ للبيهقي: ۴/۴۸۳، طبع قديم

جاتا۔ اور علماء یہ منظر روزانہ اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں، لیکن فقہی جمود نے ان کی آنکھوں پر پٹیاں باندھی ہیں۔

تیسری مثال: بریلوی حضرات کے ہاں رواج ہے کہ نمازِ جنازہ کے فوراً بعد میت کے اردگرد کھڑے ہو کر سب ہاتھ اٹھا کر دعا مانگتے ہیں، اِس کو وہ بہت ضروری سمجھتے ہیں۔ دلیل کیا ہے؟ نبی ﷺ کی حدیث ہے: «إِذَا صَلَّيْتُمْ عَلَى الْمَيِّتِ فَأَخْلِصُوْا لَهُ الدُّعَاءَ»[1] ''اس کا صحیح ترجمہ تو یہ ہے کہ جب تم میت کی نمازِ جنازہ پڑھنے لگو، تو اخلاص کے ساتھ اس کے لیے (مغفرت کی) دعا کرو۔ جیسے قرآن مجید میں ہے:

﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا قُمْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ فَاغْسِلُوْا وُجُوْهَكُمْ ﴾ (المائدۃ:٥/ ٦)

''اے ایمان والو! جب تم نماز کے لیے کھڑے ہونے لگو، تو وضو کرو۔''

لیکن بریلوی حضرات إِذَا صَلَّيْتُمْ عَلَى ...... کا ترجمہ کرتے ہیں: ''جب تم نماز پڑھ چکو تو......'' اور اس طرح ترجمے میں بددیانتی کا ارتکاب کرکے جنازے کے بعد دعا مانگنے کے اپنے غیر مسنون عمل کا جواز ثابت کرتے ہیں، حالانکہ اگر یہ ترجمہ صحیح ہے تو پھر ان کو وضوء بھی نماز کھڑے ہونے کے بعد ہی کرنا چاہیے، نہ کہ نماز سے پہلے۔ جیسا کہ

﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا قُمْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ فَاغْسِلُوْا وُجُوْهَكُمْ ﴾ (المائدۃ:٥/ ٦)

کا ترجمہ بریلوی استدلال کے مطابق کرنے کا اقتضاء ہے۔

چوتھی مثال: یہی حال ان احادیث کی صحت وضعف کے معاملے میں ہے جو اختلافی مسائل میں مدارِ بحث بنتی ہیں۔ ان میں نہایت بے خوفی کے ساتھ امانت و دیانت کا خون کرکے ثقہ راویوں کو ضعیف اور ضعیف راویوں کو ثقہ ثابت کرنے پر زورِ صرف کیا جاتا ہے، جس کی تفصیل التنكيل بما في تأنيب الكوثري من الأباطيل (عربی) تالیف شیخ عبدالرحمٰن بن یحییٰ یمانی میں ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔ اس میں ایک لطیفہ یہ بھی ہوتا ہے کہ ایک راوی اپنی کسی من پسند روایت میں ہوتا ہے، تو اسے اس وقت ثقہ باور کرایا جاتا ہے اور وہی راوی جب اس روایت میں آتا ہے جس سے دوسرا فریق استدلال کرتا ہے، تو وہ ضعیف قرار پاجاتا ہے۔ ایک اور لطیفہ یہ ہوتا ہے، کہ ایک حدیث میں دو تین باتیں ہوتی ہیں، ان میں سے کوئی ایک بات تو قبول کر لی جاتی ہے کہ اس سے ان کے کسی فقہی مسئلے کا اثبات ہوتا ہے اور دوسری باتیں رد کر دی جاتی ہیں کیونکہ وہ فریق مخالف کے موافق ہوتی ہیں، حالانکہ حدیث ایک ہے، سند ایک ہے، اگر وہ حدیث صحیح ہے تو اس میں بیان

[1] سنن أبي داؤد،الجنائز، باب الدعاء للميت، رقم:٣١٩٩

کردہ ساری ہی باتیں صحیح ہیں، ان میں سے کسی بات کو مان لینا اور بعض کو نہ ماننا، اسے کون معقول طرزِ عمل قرار دے سکتا ہے؟ اسی طرح اگر وہ ضعیف ہے، تب بھی معاملہ ایسا ہی ہے، اس کی ساری ہی باتیں ناقابل تسلیم ہونی چاہئیں اس کا کوئی ایک جز قابل استدلال نہیں ہو سکتا۔

یہ لطائف ہمارے فقہی جدل و مناظرہ میں عام ہیں۔ ظاہر بات ہے، امانت و دیانت کی موجودگی میں اس کا امکان ہے، نہ جواز ہی ہے۔

③۔ محدثین کا تیسرا وصف:

محدثین کے منہج کی تیسری نمایاں خوبی جمع و تطبیق کا اہتمام ہے۔ بعض روایات میں جو ظاہری تعارض نظر آتا ہے، اس کے حل کے لیے محدثین حسب ذیل طریقے اختیار کرتے ہیں:

۱۔ سند کے اعتبار سے اگر ایک روایت صحیح ہے اور دوسری ضعیف، تو صحیح السند روایت کو وہ قبول کر لیتے اور ضعیف کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔

۲۔ اگر سند کے اعتبار سے دونوں صحیح ہوتی ہیں، لیکن درجۂ صحت میں ایک کو دوسری پر کسی وجہ سے برتری حاصل ہوتی ہے، تو وہ راجح قرار پاتی ہے۔ جیسے ایک روایت سنن کی ہے، جب کہ دوسری متفق علیہ یا صحیح بخاری یا صحیح مسلم کی ہے تو یہ دوسری قسم کی روایات صحت کے اعتبار سے سنن اربعہ کی روایات سے فائق ہیں۔ ان کو سنن کی روایات پر ترجیح حاصل ہوگی۔

۳۔ بعض متعارض روایات میں قرائن سے تقدیم و تاخیر کا علم بھی ہو جاتا ہے۔ وہاں مؤخر روایت کو ناسخ اور مقدم روایت کو منسوخ تسلیم کر لیا جاتا ہے۔

۴۔ جہاں تقدیم و تاخیر کا علم بھی نہ ہو اور صحت کے لحاظ سے بھی دونوں یکساں ہوں، تو محدثین دونوں روایات کا ایسا محمل اور مفہوم بیان کرتے ہیں، جس سے ان کا ظاہری تعارض دور ہو جاتا ہے، اس کو جمع و تطبیق سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

جیسے مزارعت کی احادیث ہیں، بعض سے مزارعت کا جواز ثابت ہوتا ہے، بعض سے ممانعت۔ محدثین نے کہا: ممانعت کا تعلق ان صورتوں سے ہے جن میں کسی ایک فریق پر ظلم و زیادتی کا امکان ہے، اور جن میں ایسی صورت نہ ہو، وہاں جواز ہے۔

اس طرح کئی اور احادیث ہیں جن میں کسی میں نہی ہے، تو کسی میں جواز ہے۔ یہاں محدثین نہی کو نہی

تنزیہی قرار دیتے ہیں، یعنی اس کام کو نہ کرنا بہتر ہے، تاہم کسی موقعے پر اسے کر لیا جائے تو اس کا جواز ہے، جیسے کھڑے ہو کر پانی پینے کی ممانعت کی روایات بھی ہیں اور جواز کی بھی۔ اس میں بھی تطبیق یہی ہے۔ کہ بیٹھ کر پانی پینا بہتر ہے، تاہم کھڑے ہو کر پینا بھی جائز ہے۔ وعلی ھذا القیاس اسی طرح کی دیگر روایات ہیں۔

اہل تقلید کا رویہ:

اس کے برعکس منہج محدثین سے انحراف کرنے والے جمع و تطبیق کے معاملے میں بھی بہت سے گھپلے کرتے ہیں، وہ حدیث کو اہمیت دینے کے بجائے فقہی اقوال و آراء کو اہمیت دیتے ہوئے بعض متعارض روایات میں خلافِ واقعہ ناسخ و منسوخ کا فیصلہ کرتے ہیں، جیسے بعض لوگ کہتے ہیں کہ رفع الیدین کی احادیث منسوخ ہیں، اور رفع الیدین نہ کرنے کی احادیث ناسخ ہیں، جب کہ اِس کی کوئی معقول دلیل ان کے پاس نہیں ہے حتی کہ مولانا انور شاہ کشمیری نے بھی اس دعوے کی نفی کی ہے۔ لیکن اپنے عوام کو مطمئن کرنے کے لیے اس قسم کے دعوے ان کی طرف سے عام ہیں۔ اور بعض ستم ظریف تو یہاں تک کہہ دیتے ہیں کہ ابتداء میں رفع الیدین کا حکم اس لیے دیا گیا تھا کہ لوگ اپنی بغلوں میں بت چھپا کر لے آیا کرتے تھے۔ جب بتوں کی یہ محبت ختم ہو گئی، تو رفع الیدین کا حکم بھی منسوخ ہو گیا۔

﴿مَا لَهُمْ بِهِ مِنْ عِلْمٍ وَّ لَا لِاٰبَآئِهِمْ كَبُرَتْ كَلِمَةً تَخْرُجُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ اِنْ يَّقُوْلُوْنَ اِلَّا كَذِبًا﴾ (الکھف:۱۸/ ۵)

یا محدثین کرام کی اس طرح توہین کرتے ہیں کہ محدثین تو محض عطار (دوا فروش) تھے، جس طرح ایک عطار اپنی دکان پر ہر طرح کی جڑی بوٹیاں رکھتا ہے، لیکن وہ ان کے خواص اور تاثیرات سے لاعلم ہوتا ہے۔ ان کے خواص و تاثیرات سے ایک طبیب حاذق ہی واقف ہوتا ہے۔ مجتہدین یا فقہاء کی حیثیت بھی طبیب حاذق کی طرح ہے۔ ایک فقیہ ہی نے یہ فیصلہ کرنا ہے کہ محدثین نے اپنی دکان (احادیث کے مجموعوں) میں جو (نعوذ باللہ) ہر طرح کی جڑی بوٹیاں (احادیث) جمع کر لی ہیں۔ ان میں سے کون سی حدیث کو لینا ہے اور کس کو ترک کرنا ہے؟ یعنی تطبیق و ترجیح یا اخذ و ترک کا فیصلہ نقد و تحقیق حدیث کے مسلمہ اصولوں کی روشنی میں نہیں، بلکہ فقیہ نے اپنی فقاہت کی روشنی میں کرنا ہے۔ اور یہ فقاہت ایک مخصوص عینک کا نام ہے۔ ہری عینک والے کو ہر چیز ہری، کالی عینک والے کو کالی اور لال عینک والے کو لال نظر آتی ہے۔ چنانچہ حنفی فقیہ کا استدلال کچھ ہوتا ہے، شافعی فقیہ کا کچھ، و ھلم جرا اس لیے کہ ان سب کی عینکیں الگ الگ رنگ کی

ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اسلام کی تعبیر

شد پریشان خواب من ز کثرت تعبیر ھا

کی آئینہ دار بن جاتی ہے۔ محدثین کی صاف شفاف، بے غبار اور بے آمیز عینک کوئی استعمال نہیں کرتا، جس میں ہر چیز اپنی صحیح اور اصلی شکل میں نظر آتی ہے۔

طبیب حاذق کی یہ حذاقت یا فقیہ کی یہ فقاہت ہی یا الگ الگ رنگ کی یہ عینکیں ہی افتراقِ امت کے المیے کا سب سے بڑا سبب ہے، اس لیے جب تک محدثین کے منہج و مسلک کو اختیار نہیں کیا جائے گا، اس افتراق کا سدِ باب ممکن نہیں ہے۔

محدثین کرام رحمہم اللہ کو فقاہت سے عاری محض ایک عطار کہنا، اِسی طرح خلافِ واقعہ اوران کی توہین ہے، جیسے نورالانوار اور اصول الشاشی وغیرہ میں حضرت ابوہریرہ اور حضرت انس رضی اللہ عنہما جیسے صحابہ کو غیر فقیہ قرار دینا خلافِ واقعہ اوران کی توہین ہے۔ اور یہ دونوں ہی باتیں انکارِ حدیث کے چور دروازے ہیں۔ مذکورہ صحابہ کو غیرفقیہ قرار دینے سے مقصود بھی ان کی بیان کردہ روایات سے جان چھڑانا اور اپنے قیاس ورائے کو ترجیح دینا ہے۔ اسی طرح محدثین کو عطار کہنے سے مقصود بھی ان کی جمع کردہ حدیثوں کے مقابلے میں فقہاء کی موشگافیوں کو اختیار کرنا ہے، حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ مذکورہ صحابی غیر فقیہ تھے، نہ محدثین کرام ہی فقاہت سے عاری تھے۔ ان کی فقاہت تو ابواب بندی (تراجم) ہی سے واضح ہو جاتی ہے۔ بالخصوص امام بخاری رحمہ اللہ کی فقاہت تو ان کے ایک ایک ترجمۃ الباب سے نمایاں ہے۔ اِسی لیے کہا جاتا ہے، « فِقْهُ الْبُخَارِيِّ فِي تَرَاجِمِهِ » ''امام بخاری کی فقاہت ان کے تراجم میں ہے۔'' تاریخ اسلام کے ایسے بے مثال فقیہ کو محض عطار کہنا، ایک ایسی شوخ چشمانہ جسارت ہے جس کا حوصلہ ایسے ہی لوگ کر سکتے ہیں جن کے دلوں میں حدیث کی عظمت کے بجائے فقیہانہ قیل وقال کا احترام زیادہ ہے۔ سبحٰنك هذا بهتان عظيم

بہرحال بات ہو رہی تھی محدثین کرام کے جمع وتطبیق کے اصولوں کی۔ اگر ان اصولوں کو ان مسائل میں بھی اختیار کرلیا جائے جو فریقین کے درمیان ما بہ النزاع ہیں، تو بہت سے نزاعات کا خاتمہ ہوسکتا ہے۔ اور اگر محدثین کی مذکورہ تینوں امتیازی خصوصیات ہی کو اپنا لیا جائے، جن کی وضاحت کی گئی ہے تو بیشتر اختلافات کا خاتمہ ممکن ہے۔ اختلافات کی بنیاد، حدیث کے بارے میں نقطۂ نظر کا فرق ہی ہے۔ جب تک نقطۂ نظر کا یہ فرق ختم نہیں ہوگا، اور حدیث کی عظمت کو اس طرح تسلیم نہیں کیا جائے گا جس طرح کہ اس کا حق ہے، اور احادیثِ صحیحہ کو کسی بھی عنوان، حیلے یا وضعی اصولوں سے ردّ کرنے کا طریقہ نہیں چھوڑا جائے گا، جن کی بابت

پورے یقین واذعان سے ہمارا دعویٰ ہے کہ اِمام ابوحنیفہ کا ان اصولوں سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔ اس وقت تک اختلافات کا خاتمہ تو کجا، ان کی شدّت کو کم بھی نہیں کیا جا سکتا۔

اہل حدیث کا طرزِ عمل اور عند اللہ باز پرس کا احساس:

جہاں تک اہل حدیث کا تعلق ہے، الحمد للہ وہ اللہ عزوجل کو گواہ بنا کر کہہ سکتے ہیں کہ وہ حدیث کی صحت وضعف کا فیصلہ کرنے میں کسی حزبی تعصب اور جانب داری کا مظاہرہ نہیں کرتے، اپنے ذہنی تحفظات کو سامنے نہیں رکھتے اور اپنے خاندان اور ماحول کے اثرات کو اس پر اثر انداز نہیں ہونے دیتے، بلکہ پوری امانت ودیانت سے نقد وتحقیق کے محدثانہ اصول ہی کی روشنی میں احادیث کو جانچتے اور پرکھتے ہیں اور پھر انہی مسائل کا اثبات یا ان کی اَرجحیت کا فیصلہ کرتے ہیں جو احادیثِ صحیحہ کا اقتضاء ہے۔ احادیث کو توڑ مروڑ کر ان کی دُور از کار تاویل کرنا، یا صحیح حدیث کو ضعیف اور ضعیف حدیث کو صحیح ثابت کرنا، یا بلا دلیل کسی حدیث کو ناسخ یا منسوخ قرار دینا، یہ سب طریقے اہل حدیث کے نزدیک دجل وتلبیس اور کتمانِ حق کی ذیل میں آتے ہیں۔ وہ ان سے اللہ کی پناہ مانگتے ہیں اور دوسروں کو بھی پورے اعتماد اور اذعان سے یہ یقیناً دلاتے ہیں کہ ان کا دامن ان تمام چابک دستیوں سے یکسر پاک ہے۔ محدثانہ اصول کے انطباق میں ان سے غلطی ہو سکتی ہے۔ معلومات میں کمی یا ان تک عدم رسائی کی وجہ سے غلطی ہوسکتی ہے، فہم واستنباط میں ان سے غلطی ہوسکتی ہے لیکن ان کوتاہیوں میں الحمد للہ کسی قسم کی بددیانتی کا عنصر شامل نہیں ہے، مسلکی پس منظر کا دخل نہیں ہے، کسی اور جذبے اور مفاد کی اس میں کارفرمائی نہیں ہے۔ وَاللّٰهُ عَلٰى مَا نَقُوْلُ وَكِيْلٌ.

برصغیر پاک وہند میں علمائے اہل حدیث کی خدمات:

پاک وہند میں جب عمل بالحدیث کا جذبہ عام ہوا تو عوام بھی بکثرت علمائے اہل حدیث کی طرف رجوع کرنے لگے اور علماء نے بھی اپنی مسئولیت اور ذمے داری کا احساس کرتے ہوئے اس فرض کو خوب ادا کیا۔ لیکن المیہ یہ ہوا کہ اس وقت ان فتاویٰ کو سنبھال کر رکھنے کا خصوصی اہتمام نہیں کیا گیا۔ اس لیے ان کا ایک بہت بڑا حصہ محفوظ نہ رہ سکا۔ جیسے شیخ الکل میاں نذیر حسین محدث دہلوی رحمہ اللہ کی بابت ان کے ایک فاضل شاگرد مولانا سید عبدالحیٰ (سابق ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ) کی قابل قدر کتاب ''نزھۃ الخواطر'' میں ہے:

« أَمَّا الْفَتَاوَي الْمُتَفَرِّقَةُ الَّتِيْ شَاعَتْ فِي الْبِلَادِ فَلَا تَكَادُ أَنْ تُحْصَرَ وَظَنِّيْ أَنَّهَا لَوْ

جُمِعَتْ لَبَلَغَتْ إِلٰى مُجَلَّدَاتٍ ضِخَامٍ » ①

’’انکے صرف وہ متفرق فتاویٰ ہی جو مختلف شہروں میں پھیلے ہوئے تھے، حیطۂ شمار سے باہر ہیں۔ میرے خیال کے مطابق اگر وہ جمع کیے جاتے تو کئی ضخیم جلدیں بنتیں۔‘‘

میاں صاحب رحمہ اللہ کی وفات کے بعد یہ احساس ہوا، تو پھر اس کی طرف کچھ توجہ دی گئی، اور انھیں جمع اور مرتب کر کے فتاویٰ نذیریہ کے نام سے دو جلدوں میں دہلی سے شائع کیا گیا، جو بعد میں حضرت الاستاذ مولانا محمد عطاء اللہ حنیف رحمہ اللہ کی مساعی کے نتیجے میں اہل حدیث اکادمی لاہور کی طرف سے دوبارہ تین جلدوں میں شائع ہوا۔ لیکن یہ شائع شدہ فتوے بہت قلیل حصہ ہیں، بہ نسبت ان فتووں کے جو انھوں نے تحریر فرمائے۔ اسی طرح دوسرے علمائے اہل حدیث کی علمی کاوشوں اور فتووں کا حشر ہوا، ان کا ریکارڈ رکھا گیا نہ ان کی وفات کے بعد انھیں جمع کرنے کی کوئی کوشش کی گئی، نتیجتاً بہت سی علمی و قیمتی تحریرات و دستاویزات دست برد زمانہ کی نذر ہو گئیں۔

ہمارے (ماضی قریب) کے اکابر علماء میں بھی اگرچہ متعدد علماء فتویٰ نویسی کے میدان میں نمایاں رہے، لیکن ان میں دو شخصیتیں نہایت ممتاز اور سرفہرست ہیں: ایک صاحب مرعاۃ المفاتیح مولانا عبید اللہ رحمانی مبارکپوری (متوفی ۱۹۹۰ء) اور دوسرے مجتہد العصر حافظ عبداللہ محدث روپڑی (متوفی ۲۰ اگست ۱۹۶۴ء) رحمہما اللہ تقسیم ملک کے بعد اوّل الذکر بھارت ہی میں مقیم رہے، جب کہ ثانی الذکر روپڑ (انبالہ ضلع، مشرقی پنجاب) سے لاہور آ گئے۔ یہ دونوں ہی یگانۂ عصر شخصیتیں تھیں، علم و عمل کے بحر بیکراں، مجتہدانہ ذوق وصلاحیت سے بہرہ ور اور تحقیق و تدقیق کے ذروۂ علیا پر فائز۔ بنا بریں دونوں ہی عوام و خواص کے مرجع اور تحقیق و افتاء کی مسند کے صدر نشین رہے۔ حضرت محدث روپڑی کے فتاویٰ ان کی وفات کے بعد ان کے شاگرد رشید مولانا ابوالسلام محمد صدیق (سرگودھا) رحمہ اللہ نے مرتب کر کے ’’فتاویٰ اہل حدیث‘‘ کے نام سے شائع کر دیے تھے، جس سے اہل علم و تحقیق خوب استفادہ کرتے ہیں۔ اور اب محدث مبارکپوری کے فتاویٰ اور تحقیقی مقالات بھی جہاں تک مل سکے یا مرتب ہو سکے، دو جلدوں میں شائع ہو گئے ہیں، باقی کی تلاش اور ترتیب کا کام جاری ہے۔ اللہ کرے وہ بھی جلد منظر عام پر آ جائیں تاکہ یہ بیش قیمت علمی ورثہ بھی محفوظ ہو جائے۔ اسی طرح استاذ الاساتذہ حضرت حافظ عبداللہ غازی پوری رحمہ اللہ کے فتووں کا ایک مجموعہ مولانا عبدالرحمن مبارکپوری نے جمع و مرتب کیا تھا لیکن ابھی تک غیر مطبوعہ تھا، الحمد للہ وہ بھی پوری ایک صدی کے بعد زیور طباعت سے

① نزهة الخواطر: ۸/ ۵۰۰، طبع جدید، حیدر آباد دکن، ۱۹۷۰ء

آراستہ ہو کر منظر عام پر آ گیا ہے۔ مولانا عبدالرحمن مبارکپوری صاحبِ ''تحفۃ الاحوذی'' کا مجموعۂ فتاویٰ بھی الحمد للہ ایک عرصہ دراز کے بعد تحقیق و تخریج کے ساتھ شائع ہو گیا ہے۔ اور عنقریب ''فتاویٰ غزنویہ'' بھی ان شاء اللہ منظر عام پر آنے والا ہے جس میں حضرت الامام مولانا عبدالجبار غزنوی اور ان کے دو صاحبزادگان گرامی قدر مولانا سید محمد داؤد غزنوی اور مولانا عبدالواحد غزنوی رحمہم اللہ کے فتاوے ہوں گے پہلے فتاویٰ غزنوی ایک مختصر سی جلد میں شائع ہوئے تھے جس میں صرف مولانا عبدالجبار غزنوی کے فتاوے تھے، اب وہ بالکل نایاب ہے۔ اب یہ ایڈیشن تین غزنوی اکابر کے فتوؤں کا مجموعہ ہو گا۔ اسی طرح ''مقالات وفتاویٰ مولانا شمس الحق ڈیانوی'' بھی یکجا شائع ہوئے ہیں۔ فللہ الحمد۔

اور یہ مآثر سلف کے پروانے اور ان کے احیاء کے لیے دیوانے شیخ خالد المطیری اور شیخ عارف جاوید محمدی الکویت اور ان کے معاون خصوصی حافظ شاہد محمود (گوجرانوالہ) اور ان کے رفقائے کار کی مساعیٔ حسنہ کا نتیجہ ہے۔ تقبل اللہ جھودھم۔

اسی طرح شیخ الحدیث حافظ عبدالمنان نور پوری رحمہ اللہ (متوفی ۳ ربیع الثانی ۱۴۳۳ھ بمطابق ۲۶ فروری ۲۰۱۲ء) ہیں، ان کے فتاوی ''احکام و مسائل'' کے عنوان سے ان کی زندگی میں دو ضخیم جلدوں میں شائع ہوئے تھے، مزید دو جلدوں کا مواد جمع و ترتیب کے مراحل میں تھا جو ناشر کی سستی یا عدم توجہی کی وجہ سے تا حال شائع نہیں ہو سکے۔ حالانکہ وہ بھی ان کی زندگی ہی میں شائع ہو سکتے تھے۔ بہر حال مَا شَاءَ اللّٰهُ كَانَ وَ مَا لَمْ يَشَاْءْ لَمْ يَكُنْ یہ فتاوے بھی بڑی اہمیت کے حامل، حافظ صاحب رحمہ اللہ کے علوم قرآن و حدیث کے گہرے مطالعے اور استحضار کے مظہر اور مجتہدانہ بصیرت کے غماز ہیں۔ ناشر اور مرتب کو اللہ تعالیٰ توفیق دے کہ وہ اس علمی سرمایے کو جلد از جلد منظر عام پر لا سکیں، یا ان کی اشاعت کسی اور ادارے کے سپرد کر دیں۔

مولانا حافظ عبدالستار الحماد شیخ الحدیث، شارح صحیح بخاری (اردو) حفظہ اللہ ان کے فتاوے سالہا سال سے مرکزی جمعیت اہل حدیث کے ترجمان ہفت روزہ اہل حدیث لاہور میں شائع ہوتے آ رہے ہیں۔ یہ فتاوے بھی اور صاحب فتویٰ بھی ان تمام مذکورہ خوبیوں اور اعلیٰ علمی صلاحیتوں کے حامل ہیں جو مذکورہ علمائے اہل حدیث کا امتیاز رہے ہیں۔ ان کے مطبوعہ فتاوے ''فتاویٰ اصحاب الحدیث'' کے نام سے چار جلدوں میں مکتبہ اسلامیہ لاہور کے زیر اہتمام شائع ہو چکے ہیں۔ امید ہے کہ مزید پر بھی کام جاری ہو گا۔

شیخ الحدیث مفتی عبید اللہ عفیف حفظہ اللہ بھی موجودہ مفتیانِ کرام میں ایک ممتاز حیثیت کے حامل ہیں، ان کے فتاوے بھی تحقیقی اور مفصل ہوتے ہیں۔ ان کے فتاوے کا ایک مجموعہ ''فتاویٰ محمدی'' کے نام سے کئی سال

قبل شائع ہوا تھا، اس کی دیگر جلدیں بھی ناشر کی بے اعتنائی کا شکار ہیں۔ وفقھم اللہ تعالیٰ

مولانا مبشر احمد ربانی حفظہ اللہ ہیں، یہ بھی تحقیق کے نہایت اعلیٰ ذوق سے بہرہ ور ہیں اور ان کے فتاوے بھی اس کے مظہر اور مذکورہ کتب فتاویٰ کی خصوصیت کے حامل ہیں۔ ان کے فتووں کا مجموعہ بھی احکام و مسائل کے عنوان سے تین جلدوں میں مطبوعہ اور دستیاب ہیں۔

مولانا حافظ زبیر علی زئی رحمہ اللہ ہماری ماضی قریب کی ایک اہم علمی شخصیت تھی، موصوف بالخصوص فن اسماء الرجال اور تحقیق حدیث کے ذوق میں نہایت ممتاز مقام کے حامل تھے۔ ماہنامہ ''الحدیث'' حضرو ضلع اٹک میں ان کے علمی و تحقیقی مقالات اور فتاوے شائع ہوتے تھے۔ یہ مقالات (چھ جلدوں میں) اور فتاوے۔ فتاویٰ علمیہ، المعروف توضیح الاحکام۔ (دو جلدوں میں) مکتبہ اسلامیہ اردو بازار لاہور کی طرف سے شائع ہو گئے ہیں جس پر مولانا سرور عاصم صاحب اہل علم کی طرف سے شکریے اور قدر افزائی کے مستحق ہیں۔ جزاہ اللہ احسن الجزاء عن الاسلام والمسلمین۔

مولانا عبدالقادر عارف حصاروی بھی ہماری جماعت کے ایک محقق عالم تھے۔ ان کے مقالات جماعتی جرائد و مجلات میں شائع ہوتے رہے اور وہ اخبارات ہی تک محدود تھے۔ اللہ تعالیٰ نے شیخ الحدیث مولانا محمد یوسف راجووال رحمہ اللہ کو توفیق دی کہ انھوں نے مولانا ابراہیم خلیل حفظہ اللہ (حجرہ شاہ مقیم) کے ذریعے سے ان کو جمع اور مرتب کروا کے سات جلدوں میں شائع کروا دیے۔ یہ بھی ان دونوں بزرگوں کی ایک عظیم علمی و مسلکی خدمت ہے۔ یہ بھی اہل علم کی طرف سے شکریے اور قدر افزائی کے مستحق ہیں۔ جزاہم اللہ احسن الجزاء

ان کے علاوہ بھی جماعت کے رسائل و جرائد میں جماعت کے دیگر اہل علم اور اہل تحقیق کے فتوے الحمد للہ شائع ہو رہے ہیں۔ اور علمائے اہلحدیث کے علمی و تحقیقی ذوق کے مظہر ہیں۔ جیسے مثلاً: مفتی عبدالخالق صاحب (دارالسلام) مفتی عبدالرحمٰن عابد (جماعۃ الدعوۃ) شیخ الحدیث حافظ محمد سلیم کراچی اور دیگر مفتیان کرام (جیسے مفتی محمد ادریس بن مولانا عبدالقہار رحمہما اللہ کراچی وغیرہ) ہیں۔ استقصاء مقصود نہیں۔ صرف چند نمایاں اسمائے گرامی کے نام ذکر کیے گئے ہیں۔ (حفظہم اللہ)

شیخ الحدیث حافظ ثناء اللہ مدنی حفظہ اللہ:

ہمارے ممدوح شیخ الحدیث مولانا حافظ ثناء اللہ مدنی حفظہ اللہ بھی (جن کا مجموعۂ فتاویٰ اس وقت زیر نظر ہے) اسی سلسلۃ الذہب کی ایک کڑی اور اسلاف کی علمی و عملی روایات کے حامل ہیں، علم و فضل میں نمایاں، زہد و تقویٰ میں ممتاز، سادگی اور تواضع کے پیکر اور اجتہاد و تفقہ کی صلاحیتوں سے بہرہ ور۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں پہلے

حضرت محدث روپڑی رحمہ اللہ سے کسب فیض کی سعادت سے نوازا، اس کے بعد جامعہ اسلامیہ (مدینہ منورہ) میں محدث عصر شیخ البانی، محقق دوراں شیخ ابن باز مفتیٔ اعظم سعودی عرب اور عظیم مفسر شیخ محمد امین الشنقیطی (صاحب تفسیر أضواء البیان) (رحمہم اللہ) جیسے اساطین علم اور اصحاب علم وفضل کے سامنے زانوئے ادب طے کرنے کا موقع دیا، جس سے ان کی علمی صلاحیتوں میں اضافہ اور تحقیقی ذوق میں مزید نکھار پیدا ہوا۔

ایں سعادت بزورِ بازو نیست

تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

چنانچہ وہ ایک عرصے سے جہاں ایک طرف شیخ الحدیث کے منصب پر فائز ہیں تو دوسری طرف اپنے بے مثال اساتذہ کی طرح مسندِ افتاء کے بھی صدر نشیں ہیں۔ اپنے فتاوی کے ذریعے سے وہ اہل حدیث کی اس علمی روایت کو بھی قائم رکھے ہوئے ہیں جس کا ذکر گزشتہ سطور میں ہوا اور اس مشن کو بھی آگے بڑھا رہے ہیں جو ہمیشہ علمائے اہل حدیث کے پیش نظر رہا، یعنی عمل بالحدیث کے جذبے کا فروغ واحیاء، اور یہی مشن ان کی تدریسی، دعوتی وتبلیغی، علمی وتحقیقی اور تصنیفی وتالیفی خدمات کا محور ومرکز رہا اور ہے۔ تَقَبَّلَ اللّٰهُ جُهُوْدَهُمْ وَ جَعَلَ مَسَاعِيَهُمْ مَشْكُوْرًا

حافظ صاحب کے یہ فتاویٰ ربع صدی سے زیادہ عرصے سے ہفت روزہ ''الاعتصام'' میں نہایت پابندی سے شائع ہو رہے ہیں جن سے عوام وخواص مستفید ہوتے رہے اور ہو رہے ہیں۔ اب انہی فتووں کو مرتب کرکے شائع کیا جا رہا ہے۔ جس سے یقیناً ان کی افادیت کا دائرہ بھی وسیع ہوگا اور ان کی محفوظیت بھی یقینی۔ کیونکہ اخبار یا رسالہ چاہے وہ کتنا بھی وقیع ہو اُس کے قارئین کا حلقہ مخصوص اور محدود ہی ہوتا ہے۔ اور اسی طرح اس کی زندگی بھی چند روزہ ہی ہوتی ہے، جب کہ کتاب کا معاملہ اس کے برعکس ہے، وہ ہر صاحب ذوق اور ضرورت مند جب چاہے خرید سکتا ہے، اور کتاب کی زندگی بھی دیرپا اور مستقل ہوتی ہے۔

اللہ تعالیٰ حافظ صاحب حفظہ اللہ کی زندگی میں برکت عطا فرمائے اور انہیں صحت وعافیت سے رکھے اور قرآن وحدیث کے اس سرچشمۂ صافی کو تادیر جاری رکھے! تاکہ تشنگانِ علم وتحقیق اس سے سیراب اور فیض یاب ہوتے رہیں۔ وَ يَرْحَمُ اللّٰهُ عَبْدًا قَالَ آمِيْنًا.

اخی الفاضل حافظ عبدالشکور حفظہ اللہ (فاضل جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ، مبعوث فی الباکستان) بھی تمام اہل علم کی طرف سے شکریے اور قدر افزائی کے مستحق ہیں جنھوں نے اخبارات کی فائلوں سے یہ لولوئے متناثرہ اور معارف منتشرہ جمع کیے اور سات سال کی محنت شاقہ کے بعد انھیں مرتب کرکے اس کی پہلی جلد آج سے تقریباً

۱۵ سال قبل شائع کی تھی، جو یقیناً ایک عظیم الشان دینی، علمی اور مسلکی خدمت تھی۔ لیکن معلوم نہیں کن وجوہات کی بناء پر مزید جلدیں منظر عام پر نہیں آ رہیں۔ حالانکہ حافظ صاحب ﷾ کا اصرار اور خواہش تھی کہ وہ بھی جلد از جلد شائع ہوں اور جماعت کے عوام و خواص بھی ان کے بے چینی سے منتظر تھے۔

مدت مدید کے انتظار کے بعد بالآخر حضرت حافظ صاحب ﷾ نے اس کی اشاعت کا خود بیڑا اٹھایا ہے۔ اور کتاب ہذا کی جمع و ترتیب، تبویب و تخریج کی ذمہ داری اپنے تلمیذ حافظ عبدالرؤف خاں اور عبدالقدوس السّلفی کے سپرد کی۔ اللہ کرے حافظ صاحب کے بقیہ فتاویٰ جلد از جلد مرتب ہو کر شائع ہو جائیں تاکہ اخبارات کے صفحات میں مدفون علوم و معارف کا یہ بیش قیمت گنجینہ اور تحقیق و تدقیق کا یہ نادر خزینہ مکمل شکل میں منظر عام پر آ سکے۔ وَ یَرْحَمُ اللّٰهُ عَبْدًا قَالَ آمِیْنا.

صلاح الدین یوسف

رمضان المبارک ۱۴۳۷ھ۔ جون ۲۰۱۶ء

عرض مؤلف

اِنَّ الْحَمْدَلِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَ نُصَلِّيْ عَلٰى رَسُوْلِهِ الْكَرِيْمِ اَمَّا بَعْدُ!

اس سے قبل میرے فتاویٰ کی پہلی جلد محترم حافظ عبدالشکور بن علم الدین شائع کر چکے ہیں۔ جزاہ اللہ خیراً اب دوسری جلد بھی موصوف تیار کر رہے ہیں لیکن جلد ھذا میں مزید فتوے (جو کہ ماہنامہ محدث لاہور میں شائع شدہ ہیں) کا اضافہ کیا گیا ہے۔ میں اسے اپنے تلمیذ حافظ عبدالرؤف خان بن عبدالوکیل خان اور عبدالقدوس السلفی کی معاونت سے نئی ترتیب کے ساتھ شائع کر رہا ہوں۔ جو کتاب الطھارۃ، کتاب المساجد اور کتاب الصلوٰۃ پر مشتمل ہے۔ جزاھما اللہ احسن الجزاء

اور میں حافظ صلاح الدین یوسف حفظہ اللہ کا شکر گزار ہوں کہ انھوں نے کتاب ہذا کا مفصل مقدمہ لکھ کر چار چاند لگا دیے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کے علم و عمل میں برکت فرمائے اور تادیر ان سے دینِ حنیف کی خدمت لیتا رہے اور ان کی تحریرات کو مقامِ قبولیت سے نوازے۔ آمین

اور ہمارے وہ مخلص احباب جو اس کتاب کی اشاعت میں مادی اور معنوی تعاون فرما رہے ہیں، اللہ تعالیٰ ان کی مساعی جمیلہ کو قبول فرمائے۔ آمین۔

ثناء اللہ بن عیسیٰ خان المدنی

۱۲ رمضان المبارک ۱۴۳۷ ہجری بمطابق ۱۸ جون ۲۰۱۶

۱۔ کتاب الطہارۃ

پانیوں کی نجاست وتطہیر کے احکام ومسائل

پانی والی ٹینکی میں چھپکلی مرجائے یا حلال وحرام جانور بیٹ کر جائے تو کیا پانی ناپاک ہوگا؟

(سوال) پانی کی ٹینکی ہے جس میں قریباً دو اڑھائی من پانی ہوتا ہے۔ پانی اس میں جاری رہتا ہے مثلاً موٹر کے پائپ سے پانی داخل ہوتا ہے، ادھر سے خارج بھی ہوتا رہتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ اگر اس ٹینکی میں چھپکلی گر جائے زندہ یا مردہ یا اس پانی میں جانور حلال یا حرام بیٹ کردیں تو کیا اس پانی کو استعمال کیا جا سکتا ہے؟

(جواب) ایسی صورت میں ٹینکی سے پانی نکال کر اسے صاف کر لینا چاہیے۔ پانی اصلاً پاک ہے دو طرح سے نجس ہوتا ہے: ① نجاست کی وجہ سے اس کا رنگ، بو، مزہ بدل جائے، تو وہ پلید ہو جاتا ہے، خواہ تھوڑا ہو یا بہت۔ ② اندازاً پانچ مشک سے اس کی مقدار کم ہو تو نجاست کے پڑنے سے پلید ہو جاتا ہے خواہ رنگ، بو، مزہ بدلے یا نہ بدلے۔

اور پانی میں پاک شے پڑنے سے بعض دفعہ اس کا نام اور ہو جاتا ہے مثلاً: شربت یا عرق یا لسی وغیرہ، تو اس سے وضو اور غسل نہیں ہوگا۔ ہاں اگر پانی کا نام نہ بدلے جیسے کنویں میں پتے گرنے سے رنگ، بو، مزہ بدل جاتا ہے مگر اس کا نام پانی ہی رہتا ہے تو اس سے وضو غسل وغیرہ درست ہے۔ یہی حکم پانی میں حلال جانور گرنے کا ہے۔

خون نہ بہنے والے جانور کا پانی میں مرنے کے بعد اس میں وضوء کرنا کیسا ہے؟

(سوال) کھانے پینے کی چیز میں کوئی ایسا جانور گر کر مر جائے جس میں ایسا خون نہیں ہے کہ چوٹ لگنے سے بہنے لگے، ایسی چیز کے کھانے پینے یا ایسے پانی سے وضو کرنے کے بارے میں کیا حکم ہے؟

(جواب) کھانے پینے کی اشیاء اور صاف پانی وغیرہ میں گر کر اگر ایسا جانور مر جائے جس میں بہنے والا خون

نہیں تو وہ شے پاک ہے۔ اور ایسے پانی سے وضو ہوسکتا ہے۔

سبل السلام (۱/۱۲۰) میں ہے:

« ثُمَّ عَدَی هٰذَا الحُکمُ اِلٰی کُلِّ مَا لَا نَفسَ لَهٗ سَائِلَةٌ کَالنَحلَةِ، وَالزَّنبُورِ، وَالعَنکَبُوتِ، وَاَشبَاهُ ذَالِكَ.»

پانی کی نجاست کے متعلق امام مالک کے مسلک کو ترجیح ہوگی یا امام شافعی کے؟

سوال پانی کی نجاست کے بارے میں ترجیح امام مالک کے مذہب کو ہے یا امام شافعی کے مذہب قُلَّتَین کو؟

جواب مسئلہ ہذا میں اہل علم کا سخت اختلاف ہے۔ پہلے گروہ کا استدلال احادیث کے عمومات سے ہے جب کہ دوسری حدیث میں قلتین (پانچ مشکیزوں) کی قید موجود ہے۔ مطلق کو مقید پر محمول کرنا اصول کا معروف قاعدہ ہے۔ لہٰذا ترجیح دوسرے مسلک کو ہے۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو! ''تحفۃ الاحوذی'' اور نیل الأوطار وغیرہ۔

ہمارے شیخ محدث روپڑی رحمہ اللہ نے بھی اسی مسلک کو راجح قرار دیا۔ ملاحظہ ہو فتاویٰ اہلِ حدیث: ۱/۲۳۴

مسجد میں کتا پیشاب کر جائے تو کیا کرنا چاہیے؟

سوال عہد نبوی میں کتے مسجد نبوی میں پیشاب کرتے تھے لیکن اسے دھویا کیوں نہیں جاتا تھا؟

جواب اس حدیث میں ابتدائی حالت یعنی اصل اباحت (جواز) کا بیان ہے۔ اس کے بعد پھر مسجدوں کی تکریم وتطہیر کا حکم ہوا۔ (فتح الباری :۱/ ۲۷۹)

دودھ پیتے بچی یا بچے کے پیشاب کا کیا حکم ہے؟

سوال حدیث پاک کی رُو سے ایک بچے (لڑکے) کا پیشاب اس کے ایام رضاعت کے دوران کپڑے پر لگ جائے تو اس جگہ کپڑے پر پانی کے چھینٹے لگا دینے سے نماز کے لیے پاک ہو جاتا ہے۔ کیا اسی دوران چند ایک ذیلی صورتوں میں بھی جواز ہے؟

۱۔ بچہ صرف اپنی ماں کا دودھ پیتا ہو یا کسی اور خاتون کا بھی؟

۲۔ بچہ اگر اپنی ماں کے دودھ کی مدت پوری نہ ہوسکنے کی وجہ سے چوپائے کا دودھ بھی پیتا ہو؟

۳۔ بچہ اپنی ماں کے دودھ کے ساتھ ساتھ دیگر خوراک (گندم چاول وغیرہ) بھی کھاتا ہو؟

۴۔ بچے کو اس کی ماں کے دودھ نہ ہونے کی وجہ سے دیگر خوراک ہی کھلائی جاتی ہو؟

۵۔ صرف ماں کے دودھ پر گزارا کرنے والی بچی؟

(جواب) ا۔جونسی عورت کا بھی دودھ پی لے حکم ایک جیسا ہے چھینٹے لگانے چاہئیں۔

۲۔ چھینٹے کافی ہیں احتیاطاً کپڑا دھولیا جائے۔

۳۔ بایں صورت کپڑے کو دھونا ضروری ہے۔

۴۔ کپڑے کو دھونا چاہیے۔

۵۔ بچی کا پیشاب ہر صورت میں دھونا چاہیے۔

بال نوچنے سے نکلنے والے سفید مادے کا کیا حکم ہے؟

(سوال) بال نوچا یا اکھیڑا جائے تو اس کے سرے پر سفید مادہ لگا ہوتا ہے۔کیا بعض اہل علم کا اسے ناپاک کہنا درست ہے؟

(جواب) اس کے ناپاک ہونے کی کوئی دلیل یا تصریح میری نظر سے نہیں گزری۔

قے، دُکھتی آنکھ کا پانی اور پیپ رِسنے کی صورت میں وضوء اور نماز کا کیا حکم ہے؟

(سوال) قے، دکھتی آنکھ کا پانی، زخم سے رِسنے والا پانی جو کبھی سفید اور کبھی ہلکی سی سرخی لیے ہوتا ہے اور پیپ وغیرہ کیا یہ چیزیں ناپاک اور پلید ہیں یا نمازی کے لیے ان اشیاء میں کوئی حرج نہیں؟

(جواب) صرف طبعی کراہت ہے ان چیزوں کے ناپاک ہونے کی شرعی کوئی دلیل نہیں۔

پانی میں پیشاب کے چھینٹے پڑنے کے بعد اس سے وضوء ہو جائے گا؟

(سوال) ایک دن بجلی نہیں آرہی تھی۔ اس وجہ سے مسجد کی ٹینکی میں پانی نہ بھرا جاسکا اور پانی ختم ہوگیا۔ٹب میں پانی ڈال کر کچھ لوگوں نے مسجد کی چھت پر وضو کیا اور کچھ نے ابھی کرنا تھا کہ اوپر بنی ہوئی ٹینکی کے پاس بلی نے پیشاب کردیا۔ پیشاب کے ایک دو چھینٹے ٹب میں بھی گر گئے۔ امام صاحب نے اسی پانی سے وضو کر کے نماز پڑھائی۔سب لوگ کہہ رہے تھے کہ امام صاحب کا وضو نہیں ہوا کیونکہ پانی پلید ہوگیا تھا۔ جب کہ امام صاحب کا کہنا ہے کہ ایک دو قطرے پڑنے سے پانی پلید نہیں ہوتا۔کیا امام صاحب کا وضو درست ہے، اور ان کے پیچھے نماز پڑھنا ٹھیک ہے؟

(جواب) یاد رہے کہ اصلاً پانی پاک ہی ہے، یہ دو طرح سے پلید ہوتا ہے:

① ......نجاست کی وجہ سے اس کا رنگ، بو، مزا بدل جائے۔

② ......اندازاً پانچ مشکیزوں یعنی پانچ من سے اس کی مقدار کم ہو۔

بصورتِ دیگر پانی نجس نہیں ہوتا۔ موجودہ پانی کا اندازہ آپ بہتر طور پر کر سکتے ہیں کہ وہ کتنی مقدار میں تھا، پھر اس کے مطابق حکم لگے گا۔

امام صاحب کا بھی فرض ہے کہ مسئلہ کی رُو سے مقتدیوں کو مطمئن کریں اور مقتدیوں کی بھی ذمہ داری ہے کہ بے بنیاد شکوک وشبہات کا شکار نہ ہوں، تاکہ باہمی اعتماد سے ''اقامت صلوٰۃ'' کا فریضہ صحیح معنوں میں ادا کر سکیں۔

کسی چیز یا جگہ سے نجاست دھونے کی تعداد:

سوال کسی چیز یا جگہ سے نجاست دھونے کے بعد بعض فقہاء اسے سات بار مزید دھونا ضروری قرار دیتے ہیں۔ نجاست دھونے کے بعد کتنی بار مزید دھونا چاہیے؟

جواب: ازالۂ نجاست کے لیے ماسوائے کتے کے شرع میں کوئی عدد معین نہیں۔ مقصود صفائی ہے۔ جب وہ حاصل ہو جائے تو درست ہے۔ ''مسند احمد'' میں ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی روایت میں ہے:

« اَلغَسلُ مِنَ البَولِ مَرَّةً. وَالغَسلُ مِنَ الاَنَابَةِ مَرَّةً » (الفتح الربانی:٢/ ١٩٨)

ابو داؤد (بَابُ فِي الغُسلِ مِنَ الجَنَابَةِ) کے مطابق اور بدوی کے پیشاب پر آپ ﷺ نے جو ڈول بہانے کا حکم دیا، کسی عدد کا ذکر نہیں کیا۔ جن فقہاء نے سات کا عدد ضروری قرار دیا ہے۔ انہوں نے ''ولوغ کلب" (کتے کے منہ ڈالنے) پر قیاس کیا ہے اور اس سلسلہ میں ابن عمر رضی اللہ عنہما کی ایک روایت بھی ہے، جو المغنی (١/٧٥) میں بیان ہوئی ہے۔ لیکن راجح مسلک پہلا ہے۔

احتلام زدہ کپڑے کہاں تک دھوئے جائیں؟ آیا صرف دھونے سے نماز ہو جائے گی؟

سوال اگر آدمی ایک مقام سے دوسرے مقام یعنی اپنے کسی عزیز رشتے دار کے گھر جاتا ہے اور اس کے جسم پر کپڑوں کا ایک ہی جوڑا ہو جو کہ اس نے پہنا ہوا ہے اور دو یوم قیام کرنا ہے اور نماز بھی لازمی پڑھنی ہے۔ رات اس کو احتلام ہو جاتا ہے جب کہ اس کے پاس مزید کپڑے نہیں ہیں اور کپڑے مانگنے سے بھی شرمندگی محسوس کرتا ہے۔ ایسی حالت میں وہ کیا کرے گا؟ کیا انہی کپڑوں کو جہاں نجاست لگی ہوئی ہے دھوئے گا؟ اور کتنا دھوئے گا؟ آیا کہ دھونے سے نماز ہو جائے گی؟

جواب ایسے شخص کو چاہیے کہ مَنی تَر ہونے کی صورت میں اس مقام کو دھو ڈالے۔ اور خشکی کی صورت میں اس کو کپڑے سے کھرچ لے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ میں مَنی کو رسول اللہ ﷺ کے کپڑے سے دھو ڈالتی تھی اور آپ ﷺ (اس کپڑے میں) نماز پڑھنے تشریف لے جاتے تھے، اور دھونے کا نشان کپڑے پر ہوتا تھا۔[1]

دورانِ غسل لٹکے ہوئے کپڑوں پر پڑنے والے چھینٹوں کا حکم:

سوال جنبی آدمی کے جسم سے دورانِ غسل جو چھینٹے اُٹھتے ہیں، کیا یہ کپڑوں میں لگ کر انھیں ناپاک کر دیتے ہیں یعنی کپڑے ناپاک ہو جاتے ہیں؟

جواب بایں صورت کپڑے ناپاک نہیں ہوتے۔ البتہ مس نجاست (پلیدی کے لگنے) کا اندیشہ ہو تو احتیاط دھونے میں ہے۔

حیض، نفاس اور استحاضہ کے خون کے احکام

کتنی عمر میں بلوغت کی عمر تسلیم کی جائے گی؟

سوال بلوغ کی کوئی بھی علامت ظاہر نہ ہو تو علامہ ابن حزم رحمہ اللہ کے مطابق اٹھارہ سال کی عمر میں آدمی بالغ ہوتا ہے۔ (المحلّٰی) امام شافعی رحمہ اللہ وغیرہ نے جن احادیثِ جہاد سے پندرہ سال مدت بلوغ مراد لی ہے وہ صحیح نہیں۔ (المحلّٰی) کیا علامہ ابن حزم رحمہ اللہ کا اٹھارہ سال والا دعویٰ ثابت ہے؟

جواب امام ابن حزم رحمہ اللہ کا نظریہ مرجوح ہے۔ راجح بات وہی ہے جس کو امام شافعی نے اختیار کیا ہے بلکہ جمہور اہل علم کا مسلک بھی یہی ہے۔ قصہ ابن عمر رضی اللہ عنہما پر اعتماد کرتے ہوئے خلیفۂ راشد عمر بن عبد العزیز نے فرمایا تھا:

"أَنَّ هٰذَا هُوَ الحَدُّ بَيْنَ الصَّغِيرِ وَالكَبِيرِ" یعنی پندرہ سال عمر سے چھوٹے اور بڑے میں امتیاز ہوتا ہے اس بناء پر انھوں نے اپنے عمال کو لکھا تھا کہ جو پندرہ سال عمر کو پہنچ جائے اس کی تنخواہ دیوانِ لشکر میں مقرر کردیں۔ اوائل کی عادت تھی کہ عطاء میں وہ مقاتلین وغیرہم میں فرق کرتے تھے۔[2]

---

[1] صحيح البخاري، بَابُ غَسْلِ المَنِيِّ وَفَرْكِهِ، وَغَسْلِ مَا يُصِيبُ مِنَ المَرْأَةِ، رقم: ٢٣٠، صحيح مسلم، بَابُ حُكْمِ الْمَنِيِّ، رقم: ٢٨٩

[2] فتح الباري: ٥/٢٧٨

حیض اور نفاس کی مدت کتنی ہے؟

سوال "المحلّٰی" (اُردو) جلد دوم "كتاب الحيض والاستحاضة" میں ہے کہ ثقہ راوی نے اسے خبر دی کہ ایک عورت کو سترہ دن حیض آیا کرتا تھا امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ہم نے زیادہ سے زیادہ مدت سترہ دن ہی سنی ہے۔ آل ماجشون کی عورتوں کی بابت روایت ہے کہ ان کو سترہ دن حیض آتا تھا۔(ص:۹۷) کیا یہ روایات صحیح ہیں؟

نیز امام ابن حزم رحمہ اللہ آگے چل کر فرماتے ہیں، نفاس کی مدت سات دن سے زیادہ نہیں۔ پھر اس باب کے آخر میں یعنی تقریبا تین صفحے بعد لکھتے ہیں: ''اس کی مدت اور حکم سب حیض کی طرح ہے'' حالانکہ آپ رحمہ اللہ ''حیض سترہ دن تک'' کے قائل تھے۔ ان کے اقوال میں تضاد ہے! ازراہِ کرم دور فرما دیں؟

جواب اصل بات یہ ہے کہ امام ابن حزم رحمہ اللہ کے نزدیک اکثر مدتِ حیض و نفاس کے بارے میں کوئی روایت مرفوع متصل بسندِ صحیح ثابت نہیں ہو سکی۔ دونوں کے احکام چونکہ ایک جیسے ہیں اس لیے عادۃً مدتِ حیض کا اعتبار کر کے نفاس کی مدت سات دن قرار دی ہے پھر بعض عورتوں کے افعال و تجربات کی بناء پر اکثر مدتِ حیض سترہ دن کے قائل ہو گئے، لیکن مدتِ نفاس کو عادت پر برقرار رکھا۔ باعثِ تعجب یہ ہے کہ جن آثار پر انھوں نے اعتماد کیا وہ بھی محلِ نظر ہیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

« قَدْ رُوِيَ مِن طَرِيقِ عَبدِ الرَّحمٰنِ بنِ سَعدِيٍّ اَنَّ الثِّقَةَ أَخبَرَهُ......» الخ(۳۷۶/۱)

اہل علم کے ہاں یہ بات معروف ہے کہ لفظ ''رُوِيَ'' بصیغہ مجہول اس اثر کے ضعف کی طرف اشارہ ہے۔ نیز لفظ "الثقة" سے راجح مسلک کے مطابق روایت قابلِ اعتماد نہیں ٹھہرتی جب تک راوی کے نام کی تصریح نہ ہو۔ پھر اس کا حجت ہونا کیونکر ضروری ہے۔ پھر امام احمد رحمہ اللہ سے مروی اثر بھی بصیغۂ مجہول ہے۔ مزید آنکہ امام احمد رحمہ اللہ سے مشہور روایت پندرہ دن کی ہے سترہ کی نہیں۔ ملاحظہ ہو! مغنی لابن قدامة مع الشرح الكبير (۲۲٤/۱) اگرچہ بسندِ صحیح یہ مدت بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت نہیں۔ ملاحظہ ہو! التلخیص الحبیر (۲۳۲/۱)

واضح ہو کہ حیض ماہواری کے خون کا نام ہے، جب کہ استحاضہ بیماری کا خون ہے، جو رَگ پھٹنے سے آتا ہے اس کی کوئی حد بندی نہیں۔ اس اعتبار سے عورتوں کی تین قسمیں ہیں۔

۱۔ مستحاضہ معتادہ چاہے ممیّزہ ہو یا غیر ممیّزہ۔

(یعنی استحاضہ عادت بن چکا ہے، خونوں میں امتیاز کے قابل ہو یا نہ ہو۔)

یہ عورت ایام حیض میں اپنی عادت کی طرف رجوع کرے، حدیث میں ہے:

« اُمکُثِي قَدرَ مَا کَانَت تَحبِسُكِ .»①

۲۔ مبتدأۃ ممیّزہ'' جو ابتداء سے خون میں امتیاز کر سکے۔ یہ تمیز پر عمل کرے، حدیث میں ہے:

« إِذَا کَانَ دَمُ الحَیضَةِ فَإِنَّهُ أَسوَدُ .»②

یعنی'' خون کے رنگ کو دیکھ کر فیصلہ کرے کونسا خون ہے؟

۳۔ عادت اور تمیز دونوں مفقود ہوں اس کے ایامِ حیض چھ یا سات دن ہیں۔ جس طرح حضرت حمنہ رضی اللہ عنہا کی روایت میں ہے۔(العون:۱/ ۱۱۷)

اور نفاس اس خون کو کہا جاتا ہے جو ولادت کے وقت آتا ہے۔ صحیح بات یہ ہے کہ اس کی اکثر مدت چالیس دن ہے اور اس سے قبل جب بھی طہارت حاصل ہو، عورت غسل کے بعد نماز شروع کردے۔ اس بارے میں وارد روایت کو علامہ البانی نے "إرواء الغلیل" میں حسن قرار دیا۔(۱/۲۲۶)

اور صاحب ''سبل السلام'' فرماتے ہیں:« فَهٰذِهِ الأَحَادِیثُ یَعضُدُ بَعضُهَا بَعضًا .» (۱/۱۰۵)

''یہ تمام احادیث ایک دوسری کو تقویت دیتی ہیں۔''

نیز امام ترمذی رحمہ اللہ اپنی جامع میں فرماتے ہیں:

« وَ قَد أَجمَعَ أَهلُ العِلمِ مِن أَصحَابِ النَّبِيِّ ﷺ وَالتَّابِعِینَ، وَ مَن بَعدِهِم، عَلٰی أَنَّ النُّفَسَاءَ تَدَعُ الصَّلٰوةَ أَربَعِینَ یَومًا إِلَّا أَن تَرَی الطُّهرَ قَبلَ ذٰلِكَ، فَإِنَّهَا تَغتَسِلُ وَ تُصَلِّي. فَإِذَا رَأَتِ الدَمَ بَعدَ الأَربَعِینَ. فَإِنَّ أَکثَرَ أَهلِ العِلمِ قَالُوا: لَا تَدَعُ الصَّلٰوةَ بَعدَ الأَربَعِینَ. وَ هُوَ قَولُ أَکثَرِ الفُقَهَاءِ.» (عون المعبود:۱/۱۲۳)

صحابہ، تابعین اور ان کے بعد کے اہل علم کا اس بات پر اجماع ہے کہ نفاس والی عورت چالیس دن تک نماز چھوڑے رکھے، اِلّا یہ کہ اس سے پہلے ہی اسے طہر (پاکی) نظر آجائے۔ چنانچہ (ایسی صورت میں) وہ غسل کرے گی اور نماز پڑھے گی۔ البتہ اگر چالیس دن کے بعد بھی اسے خون نظر آتا رہے تو پھر چالیس دن کے بعد وہ نماز نہیں چھوڑے گی اور یہی اکثر فقہاء کا مذہب ہے۔''

---

① صحیح مسلم، بَابُ المُستَحَاضَةِ وَغَسلِهَا وَصَلَاتِهَا، رقم:۳۳٤

② سنن أبي داؤد، بَابُ مَن قَالَ إِذَا أَقبَلَتِ الحَیضَةُ تَدَعُ الصَّلَاةَ، رقم:۲۸٦

جس عورت کو ایام یاد نہ ہوں اور مسلسل ایک سال سے خون جاری ہو اس کا کیا حکم؟

سوال ایک عورت کو حیض کا خون تقریباً ایک سال سے جاری ہے اور اس کو گذشتہ عادت بھی یاد نہیں۔ وہ مہینہ میں کتنے دن نماز چھوڑے؟ غسل کرے یا صرف وضو کرے؟ ایسے ہی وہ رمضان کے سارے روزے رکھے یا کچھ چھوڑے؟

جس عورت کی عادت اور تمیز مفقود ہو، وہ نماز روزہ کس طرح ادا کرے؟

جواب ایامِ عادت کے اعتبار سے عورتوں کی متعدد اقسام ہیں:

۱۔ مستحاضہ: ماہواری کی عادت والی، خون کی پہچان کر سکتی ہو یا نہ کر سکتی ہو۔ اس کو معروف عادت کی طرف لوٹایا جائے گا چنانچہ صحیح مسلم میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی حدیث میں ہے:

«امْكُثِي قَدْرَ مَا كَانَتْ تَحْبِسُكِ حَيْضَتُكِ»[1] ''ایامِ حیض کے بقدر انتظار کر۔''

۲۔ وہ عورت جو ابتدا ہی میں خون کی پہچان کرے، وہ پہچان کے مطابق عمل کرے گی۔ حدیث میں ہے:

«إِذَا كَانَ دَمُ الْحَيْضَةِ فَإِنَّهُ أَسْوَدُ يُعْرَفُ »[2]

''جب حیض کا خون آئے تو وہ سیاہ بدبودار ہوتا ہے اور پہچانا جاتا ہے۔''

۳۔ اور وہ عورت جس کی عادت اور پہچان دونوں مفقود ہوں۔

اس کے ایام ماہواری غالب عورتوں کی عادت کی بنا پر چھ سات دن شمار ہوں گے۔ حدیث ہے:

حضرت حمنہ نے جب اللہ کے رسول ﷺ سے کہا کہ مجھے بہت زیادہ خون آتا ہے تو آپ نے فرمایا: ''تو اپنے آپ کو چھ، سات دن تک حائض سمجھ، پھر غسل کر اور جب تو اپنے آپ کو پاک صاف سمجھ لے تو نماز، روزہ یا روز نماز ادا کر، تجھے یہ کافی ہے۔ اور جس طرح حیض وطہر کے اوقات میں کرتی ہیں، تو ہر ماہ اسی طرح کیا کر'' (عون المعبود: ۱/۱۱۷)[3]

مسئولہ عورت کا تعلق چونکہ تیسری قسم سے ہے، لہٰذا یہ عورت ہر ماہ چھ یا سات دن نماز چھوڑ کر غسل کے بعد نماز پڑھنی شروع کر دیا کرے اور جن دنوں میں نماز چھوڑے گی، ان میں روزہ بھی نہیں رکھے گی کیونکہ یہ دن حیض کے شمار ہوں گے۔

[1] صحيح مسلم، بَابُ الْمُسْتَحَاضَةِ وَغَسْلِهَا وَصَلَاتِهَا، رقم: ٣٣٤

[2] سنن أبي داؤد، بَابُ مَنْ قَالَ إِذَا أَقْبَلَتِ الْحَيْضَةُ تَدَعُ الصَّلَاةَ، رقم: ٢٨٦

[3] سنن أبي داؤد، بَابُ مَنْ قَالَ إِذَا أَقْبَلَتِ الْحَيْضَةُ تَدَعُ الصَّلَاةَ، رقم: ٢٨٧

سرخ رنگ کے خون کا حکم کیا ہے؟

(سوال) مجھے ہر ماہ چھے دن سرخ رنگ کا خون آتا ہے، اور کبھی کبھار عادت سے دو چار دن زائد، زائد خون کا رنگ بھی سرخ ہی ہوتا ہے۔ اس حالت میں نماز بارے کیا حکم ہے؟

(جواب) محترمہ ایسی حالت کو رگِ عاذل کے پھٹنے کے ساتھ نبی ﷺ نے شیطانی چوکا قرار دیا ہے۔ بایں صورت حضرت حمنہ بنت جحش رضی اللہ عنہا کے واقعہ کی بناء پر آپ کے لیے شرعی حکم یہ ہے کہ عام عورتوں کی عادت کی بناء پر چھ سات دن ماہواری کے شمار کرلیا کریں۔ باقی ایام میں باقاعدہ بعد از طہارت نماز پڑھا کریں۔ اس کی مزید تفصیل سبل السلام (۱/۴/۷۳) میں دیکھی جاسکتی ہے۔

کیا سیاہی مائل خون حیض کا خون ہے؟

(سوال) ایک عورت کو باقاعدگی سے ہر مہینے میں تقریباً تین چار دن ماہواری آتی ہے۔ مگر بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ماہواری ہونے کے چند دن بعد دوبارہ سیاہ رنگ کا خون ایک دن آتا رہتا ہے۔ خلافِ عادت اس سیاہی مائل خون آنے پر اُسے نماز، روزہ ادا کرنا چاہیے یا نہیں؟

(جواب) سیاہی مائل سرخ خون حیض کا خون ہے۔ اس صورت میں نماز چھوڑ دینی چاہیے۔ چنانچہ حدیث میں ہے۔ «اِنَّ دَمَ الحَیضِ اَسوَدُ یُعرَفُ.» [1]

ماہواری کا خون مہینے میں ایک سے زیادہ دفعہ بھی آسکتا ہے۔ چنانچہ امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی ''صحیح'' میں ان الفاظ میں باب قائم کیا ہے: ''بَابُ اِذَا حَاضَت فِی شَھرٍ ثَلَاثَ حِیَضٍ......'' ''یعنی اگر عورت کو ایک مہینے میں تین حیض آجائیں تو؟'' پھر دلائل سے اس بات کو ثابت کیا ہے۔

کیا سرخ، پیلا یا مٹیالے رنگ کا خون حیض کا حون ہوگا؟

(سوال) حیض کے دنوں میں سرخ پیلا یا مٹیالا خون خارج ہو تو اسے حیض سمجھا جائے گا یا صرف کالا خون ہی حیض خیال کیا جائے گا؟

(جواب) حیض کے دنوں میں یہ خون حیض ہی سمجھا جائے گا۔ [2]

[1] سنن النسائی، بَابُ الْفَرْقِ بَیْنَ دَمِ الْحَیْضِ وَالِاسْتِحَاضَةِ، رقم:۳۶۳، سنن أبی داؤد، بَابُ مَنْ قَالَ إِذَا أَقْبَلَتِ الْحَیْضَةُ تَدَعُ الصَّلَاةَ، رقم:۲۸۶

[2] صحیح البخاری، بَابُ إِقْبَالِ الْمَحِیضِ وَإِدْبَارِهِ

سرخ، پیلا یا مٹیالا خون اگر ایام حیض کے علاوہ جاری ہو تو......؟

سوال حیض کے دنوں کے سوا اور دنوں میں سرخ پیلا یا مٹیالا خون آئے تو وہ حیض ہوگا یا نہیں؟

جواب یہ حیض نہیں ہوگا۔ ①

مقررہ عادت کے بعد بھی اسی رنگ کا کالا خون آئے تو کیا وہ حیض کا خون ہوگا؟

سوال حیض کی مقررہ عادت کے بعد بھی اسی رنگ کا کالا خون آتا رہے تو اسے حیض سمجھیں یا بیماری؟

جواب حیض کا خون عادت سے زیادہ بھی آسکتا ہے۔ مثلاً: کسی عورت کی عادت چھ یا سات دن ہو پھر بڑھ کر آٹھ، نو، دس یا گیارہ دن ہو جائے تو یہ تمام مدت حیض کی مدت شمار ہوگی۔ وہ اس تمام عرصے میں پاک ہونے تک نماز نہ پڑھے کیونکہ نبی ﷺ نے مدت حیض کی کوئی حد متعین نہیں فرمائی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَ يَسْئَلُونَكَ عَنِ الْمَحِيضِ قُلْ هُوَ اَذًى﴾ (البقرہ: ۲۲۲)

''آپ سے حیض کے بارے میں سوال کرتے ہیں۔ فرما دیجئے کہ وہ ناپاک ہے۔''

تو جب تک حیض کا خون باقی رہے گا عورت اپنی اس حالت پر ہی رہے گی حتیٰ کہ وہ پاک ہو جائے تو غسل کرے اور نماز پڑھے۔ اگر آئندہ ماہ یہ عادت پہلے ماہ سے کم ہوگئی تو وہ پاک ہونے پر غسل کرے اگرچہ اس نے پہلی مدت پوری نہ کی ہو۔ اس بارے میں اہم بات یہ ہے کہ عورت جب تک حائضہ رہے گی نماز نہیں پڑھے گی حیض گزشتہ مدت سے کم ہو یا زیادہ یا کہ برابر، وہ جب بھی پاک ہو نماز پڑھ لے۔ (فتاویٰ خواتین ص ۹۵)

پاک ہونے کے بعد بھی اگر خون نظر آجائے تو؟

سوال کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین اس مسئلہ میں کہ زینب کو ابتدا ہی سے ایامِ حیض کے سات یوم تھے، مگر صورت اس کی یہ رہی کہ پاکی کے بعد غسل کرکے وہ نماز پڑھنے لگتی، تو پھر خون آجاتا، صرف ایک دفعہ دکھلا کر بند ہو جاتا، پھر غسل کرکے نماز پڑھتی۔ اب ایسی صورت ہوگئی ہے کہ چار روز خون آکر بند ہوگیا تو غسل کرکے نماز پڑھنے لگتی، پھر پانچویں روز خون جاری ہوگیا، ایسی حالت میں اب زینب کیا کرے۔ نماز ادا کرے، یا قضاء کرے؟ قرآن وحدیث کے موافق جو حکم ہو بیان فرما کر عنداللہ ماجور ہوں۔

جواب الجواب وھو الموفق للصدق والصواب۔ صورتِ مسئولہ میں واضح ہو کہ زینب کے

① صحیح البخاری، بَابُ الصُّفْرَةِ وَالْكُدْرَةِ فِي غَيْرِ أَيَّامِ الْحَيْضِ، رقم: ۳۲۶

جو ایامِ ماہواری آتے تھے ان میں اگر اس کے خون کا ظہور ہوا، یعنی خون آ جائے تو وہ حیض ہی میں شمار ہوگا، اور یہ بند ہو جانا بوجہ کسی عارضہ کے ہے۔ زینب خون جاری رہنے کے وقت نماز نہ پڑھے، وہ اس کا حیض ہے جب کہ یہ خون اس کے ایامِ ماہواری میں آیا ہے۔ ہاں اگر خون ایام ماہواری کے علاوہ نظر آئے تو وہ استحاضہ، بیماری ہے۔ اس میں وہ نماز پڑھے، قضاء وغیرہ کوئی نہیں۔

« وَ جَاءَ فِي الحَدِيث...... فَإِذَا أَقبَلَتِ الحَيضَةُ فَدَعِي الصَّلٰوۃَ وَ إِذَا أَدبَرَت فَاغتَسِلِي وَصَلِّي .»[1]

یعنی ''فرمایا آنحضرت ﷺ نے کہ جب عورت کو حیض آئے (اس کے ماہواری کے ایام میں) تو وہ نماز چھوڑ دے اور جب وہ ایام گزر جائیں تو وہ غسل کرے اور نماز پڑھے۔ عورتیں اپنے خونِ حیض کو خوب پہچانتی ہیں اور خونِ حیض و خونِ استحاضہ میں باعتبارِ رنگ و بو وغیرہ بھی فرق ہے۔''

حیض کے خاتمے پر، غسل سے قبل مباشرت کرنا؟

سوال سورۃ البقرہ کی آیت ۲۲۲ یہ ہے: ﴿وَلَا تَقْرَبُوهُنَّ حَتَّىٰ يَطْهُرْنَ﴾ یعنی حیض سے پاک ہو جانے کے بعد وطی کی اجازت دی گئی ہے۔ اس آیت کی رو سے کیا غسل کے بغیر مباشرت حرام ہے، جیسا کہ اکثر اسلاف اسی کے قائل ہیں یا پاک ہونے کا مطلب محض خونِ حیض کا بند ہو جانا ہے، اگرچہ عورت نے غسل نہ بھی کیا ہو؟ (حافظ عبداللہ سلفی، ملتان روڈ، لاہور)

جواب جمہور اہل علم کا مسلک یہی ہے کہ انقطاعِ حیض کے بعد غسل سے فراغت کے بعد ہی بیوی سے وطی حلال ہوتی ہے۔ تاہم بعض سلف نے بایں صورت مخصوص مقام کو دھونے یا وضو وغیرہ کی صورت میں بھی وطی حلال قرار دی ہے۔ فقیہ ابن قدامہ نے المغنی: ۱۴۲۰) میں قرآنی الفاظ (فَإِذَا تَطَهَّرْنَ) کی تفسیر ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یوں نقل کی ہے: یعنی إذا اغتسلن ''جب عورت غسل کر لے۔'' اگرچہ حافظ ابن حزم رحمہ اللہ نے المُحلّٰی ۱ / ۲۵۶ ، ۳۵۷) میں دوسرا مسلک اختیار کیا ہے اور علامہ البانی رحمہ اللہ نے بھی آداب الزفاف (صفحہ ۴۸) میں اسی مسلک کو دلائل سے قریب تر قرار دیا ہے لیکن میرے نزدیک جمہور کا مسلک راجح ہے۔ احادیث فاطمہ بنتِ ابی حبیش وغیرہ جو اس بارے میں صریح ہیں، سے بھی اسی امر کی تائید ہوتی ہے۔ دوسرا مذہب اضطراری حالت پر محمول ہوگا۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

اور امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا یہ قول کہ دس روز سے پہلے اگر عورت حیض سے پاک ہو جائے تو غسل کے بعد

[1] صحیح البخاری، بَابُ إِذَا رَأَتِ المُستَحَاضَةُ الطُّهرَ، رقم: ۳۳۱

وطی کا جواز ہے اور اگر دس روز کے بعد فارغ ہو تو بلا غسل بھی وطی جائز ہے، حافظ ابن حزم رحمہ اللہ اور مفسر قرطبی رحمہ اللہ نے اس کو بلا دلیل قرار دیا ہے جس کی کوئی معقول وجہ نہیں۔

اگر زمانۂ حمل میں بھی ایام ماہواری جاری ہوں تو ایسی حالت میں نماز ادا کرے یا قضاء؟

سوال مریم کو زمانہ حمل میں بھی ہر ماہ ایام ماہواری برابر جاری رہے۔ ایسی حالت میں نماز کو ادا کرے یا قضاء کرے؟ از روئے شریعت بیان فرما کر عنداللہ ماجور ہوں۔

جواب مریم کو اگر حمل کی مدت میں برابر ایامِ ماہواری آتے ہیں تو وہ اس کا خونِ حیض ہے، بعض اوقات حمل کی حالت میں رحم کا منہ کھل جاتا ہے۔ وہ نماز نہ پڑھے جب تک کہ اس کے ایام ماہواری میں خون آتا ہے۔ چنانچہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ حاملہ عورت اگر خون دیکھے تو نماز چھوڑ دے۔

« عَنْ عَائِشَةَ زَوجِ النَّبِیِّ ﷺ قَالَت فِی المَرأَةِ الحَامِلِ تَرَی الدَّمَ أَنَّهَا تَدَعُ الصَّلٰوةَ.» [1]

یہی مذہب امام مالک رحمہ اللہ اور شافعی رحمہ اللہ کا ہے۔ لیکن حنفیہ حاملہ کے خون کو حیض قرار نہیں دیتے، یہ ان کا اجتہاد ہے۔ احتیاط اسی میں ہے کہ جب ایامِ ماہواری میں یہ خون جاری ہے تو اس کو حیض ہی شمار کیا جائے، حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے اثر سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ والعلم عنداللہ

قُرُوْء سے مراد حیض ہے یا طہر؟

سوال سورۃ البقرہ کی آیت ۲۲۸ میں قروء سے مراد حیض ہے یا طہر؟ حنفیہ و حنابلہ نیز مالکیہ کے نزدیک بھی راجح قول یہی ہے کہ یہاں قروء سے مراد حیض ہے۔ خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بھی اسی کے قائل ہیں۔

جواب اس بارے میں سلف کا اختلاف ہے کہ یہاں قروء سے مراد حیض ہے یا طہر؟ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا ایک گروہ اس بات کا قائل ہے کہ قروء بمعنی طہر ہے اور امام مالک رحمہ اللہ اور امام شافعی رحمہ اللہ کا بھی یہی مذہب ہے۔ جبکہ دوسری طرف خلفائے اربعہ رضی اللہ عنہم اور کثیر تعداد صحابہ رضی اللہ عنہم اور تابعین رحمہم اللہ کا یہ قول ہے کہ قروء سے مراد حیض ہے۔ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا بھی یہی مذہب ہے اور احمد رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اکابر صحابہ رضی اللہ عنہم اسی کے قائل ہیں کہ قروء بمعنی حیض ہے۔ لغوی طور پر لفظ قروء مشترک المعنی ہے اور علمائے لسان عرب اور فقہائے

---

[1] مؤطا امام ابن مالك ، كتاب الطهارة، باب جامع الحيضة، رقم: ١٩٣

عظام کا اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ قرء کے معنی حیض اور طہر دونوں ہیں۔ جولوگ اس بات کے قائل ہیں کہ آیتِ قرآنی میں قرء سے مراد حیض ہے، ان کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ نبی ﷺ نے فاطمہ بنت ابی حبیش سے فرمایا تھا: «دَعِي الصَّلَاةَ أَيَّامَ أَقْرَائِكِ» ① یعنی ''ایامِ حیض میں نماز ترک کردیا کرو۔'' اس سے یہ بات متعین ہوجاتی ہے کہ یہاں قروء سے مراد حیض ہے۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو: الشرح المُقنع علی زاد المستقنع: ۱۰۶۶۱ اورنیل الاوطار: ۶۳۰۸۔

سورۃ البقرۃ آیت ۲۲۸ میں ''قروء'' (قرء) سے مراد حیض ہے یا طہر؟

سوال سورۃ البقرۃ آیت ۲۲۸ میں ''قروء'' (قرء) سے مراد حیض ہے یا طہر؟

(حنفیہ وحنابلہ کے نزدیک نیز مالکیہ کے نزدیک بھی قابلِ ترجیح قول یہی ہے کہ یہاں قرء سے مراد حیض ہے اور خلفائے راشدین وحضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم بھی اسی کے قائل ہیں۔)

جواب اس بارے میں سلف کا اختلاف ہے کہ یہاں ''قرء'' سے مراد حیض ہے یا طہر۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا ایک گروہ اس بات کا قائل ہے کہ ''قرء'' بمعنی طہر ہے۔ امام مالک رحمہ اللہ اور امام شافعی رحمہ اللہ کا بھی یہی مذہب ہے جب کہ دوسری طرف خلفائے اربعہ اور کثیر تعداد صحابہ رضی اللہ عنہم اور تابعین رحمہم اللہ کا یہ قول ہے کہ ''قرء'' سے مراد حیض ہے۔ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا بھی یہی مذہب ہے اور احمد رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اکابر صحابہ اس کے قائل ہیں کہ ''قرء'' بمعنی حیض ہے۔ لغوی طور پر لفظ ''قرء'' مشترک المعنی ہے اور علمائے لسان عرب اور فقہائے عظام کا اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ ''قرء'' کے معنی حیض اور طہر دونوں ہیں۔ جولوگ اس بات کے قائل ہیں کہ آیتِ قرآنی میں ''قروٗ'' سے مراد حیض ہے ان کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ نبی ﷺ نے فاطمہ بنت اَبی حبیش سے فرمایا تھا کہ ''دَعِي الصَّلٰوةَ أَيَّامَ أَقْرَائِكِ'' ② یعنی ''ایامِ حیض میں نماز ترک کردیا کرو۔'' اس سے یہ بات متعین ہوجاتی ہے کہ یہاں ''قروٗ'' سے مراد حیض ہے۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو! الشرح الممتع علی زاد المستقنع (۱۰/ ۶۶۱) اور نیل الأوطار (۶/ ۳۰۸)

کیا حیض ختم ہوجانے کے باوجود غسل کرنے تک عدت برقرار رہتی ہے؟

سوال کیا خون حیض بند ہونے کے بعد جب تک عورت غسل نہ کرلے، عدت پوری نہیں ہوتی اور خاوند کو

① سنن الدارقطني، كِتَابُ الْحَيْضِ، بَابُ مَا فِي الْمَسْحِ عَلَى الْخُفَّيْنِ مِنْ غَيْرِ تَوْقِيتٍ، رقم: ۸۲۲
② سنن الدارقطني، كِتَابُ الْحَيْضِ، بَابُ مَا فِي الْمَسْحِ عَلَى الْخُفَّيْنِ مِنْ غَيْرِ تَوْقِيتٍ، رقم: ۸۲۲

رجوع کا حق رہتا ہے، اگر چہ کئی سال تک وہ غسل نہ کرے؟ کیا حنابلہ کا یہ موقف صحیح ہے یا حیض ختم ہوتے ہی غسل کیے بغیر ہی حق رجوع جاتا رہتا ہے؟

جواب اس بارے میں فقیہ ابن قدامہ رحمہ اللہ نے (المغنی ۱/۲۰۴) میں ابن حامد سے دو روایتیں ذکر کی ہیں۔ ایک یہی جس کا ذکر سوال میں ہے اور دوسری روایت یہ ہے کہ انقطاعِ دم سے ہی عدت پوری ہو جاتی ہے۔ اُنہوں نے پہلی روایت کو اختیار کیا ہے کیونکہ اکابر صحابہؓ کا مسلک یہی ہے، لیکن ترجیح دوسری روایت کو معلوم ہوتی ہے کیونکہ نصِ قرآنی کے مطابق تین قروء مکمل ہو چکے ہیں، اسی لئے تو غسل واجب ہوا ہے اور نماز روزہ بھی واجب ہو گیا۔ واللہ تعالیٰ اعلم!

ایام حیض کے بعد غسل نہ کرنے پر حق رجوع برقرار رہتا ہے کہ ختم ہو جاتا ہے؟

سوال خونِ حیض بند ہونے کے بعد جب تک عورت غسل نہ کرے، عدت پوری نہیں ہوتی اور خاوند کو رجوع کا حق رہتا ہے، اگر چہ کئی سال تک وہ غسل نہ کرے۔ کیا حنابلہ کا یہ مذہب صحیح ہے یا حیض ختم ہوتے ہی غسل کیے بغیر ہی حق رجوع جاتا رہتا ہے۔

جواب اس بارے میں فقیہ ابن قدامہ رحمہ اللہ نے ''المغنی'' (۲۰۴/۱۱) میں ابن حامد سے دو روایتیں نقل کی ہیں۔ ایک یہی جس کا ذکر صورتِ سوال میں ہے، اور دوسری روایت یہ ہے کہ مجرد انقطاعِ دم سے عدت پوری ہو جاتی ہے۔ انھوں نے پہلی روایت کو اختیار کیا ہے۔ کیونکہ اکابر صحابہ رضی اللہ عنہم کا مسلک یہی ہے۔ لیکن ترجیح دوسری روایت کو معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ نصِ قرآنی کے تین ''قروء'' مکمل ہو چکے ہیں اسی لیے تو غسل واجب ہوا ہے اور نماز روزہ بھی واجب ہو گیا۔ (واللہ تعالیٰ اعلم)

حیض کی بے قاعدگی کی صورت میں عدت کا شمار؟

سوال جس عورت کو وقفے وقفے سے کئی ماہ تک مسلسل خون جاری رہے اور ایامِ حیض کی مدت مقرر کرنا محال ہو جائے، وہ کتنے ماہ تک عدت میں رہے گی؟ ایسے ہی اگر عادتِ حیض بے قاعدہ ہو تو اس کی عدت کتنے ماہ خیال کی جائے؟

جواب ایسی عورت تین ماہ تک عدت میں رہے گی۔ سنن ابن ماجہ میں حمنہ بنت جحش کی حدیث سے یہ مسئلہ ماخوذ ہے۔ باب ماجاء فی البکر إذا ابتدءت مستحاضة او كان لها ايام حيض فنسيتها۔ اس بارے میں امام احمد رحمہ اللہ سے دو روایتیں ہیں: اوّل الذکر کے مطابق یہی تین ماہ اور دوسری روایت میں ایسی عورت ایک سال عدت گزارے۔ (تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو المغنی: ۱۱۲۱۹)

(سوال) اگر مندرجہ بالا کیفیت عادت والی عورت کی ہوجائے تو کیا وہ پرانی عادت کے مطابق عدت پوری کرے؟ (حافظ عبداللہ سلفی، مدرّس مدرسۃ التوحید، لاہور)

(جواب) ایسی عورت سابقہ عادت کے مطابق عدت گزارے۔ حدیثِ اُمّ سلمہ میں ہے:

« دَعِي قَدْرَ الْأَيَّامِ وَاللَّيَالِي الَّتِي كُنْتِ تَحِيضِينَ » [1]

حیض یا طہر کے آغاز میں دی جانے والی طلاق پر عدت

(سوال) حیض جاری ہوئے لحظہ ہی ہوا تھا کہ مرد نے طلاق دے دی۔ یہ حیض عدت میں شمار ہوگا یا نہیں؟

(جواب) یہ حیض عدت میں شمار نہیں ہوگا، جیسا کہ ''المغنی'' کے متن میں ہے:

« فعدتها ثلاث حيض غير الحيضة التي طلقها فيها » (۱۱/۱۹۷)

''عورت کی عدت تین حیض ہے، ماسوائے اس حیض کے جس میں اسے طلاق دی گئی۔''

(سوال) ایک آدمی نے طہر میں طلاق دی اور چند منٹ بعد ہی حیض جاری ہوگیا تو یہ طہر عدت میں شمار ہوگا یا نہیں؟

(جواب) راجح مسلک کے مطابق عدت کا شمار حیض سے ہے، نہ کہ طہر سے اور جن لوگوں کے نزدیک عدت کا شمار طہر سے ہے، ان کے ہاں اس طہر کا شمار ہونا چاہئے۔

عدت کے خاتمے کے لئے حیض کا کس قدر خون آنا ضروری ہے؟

(سوال) عدت کے سلسلے میں حیض قرار دینے اور عدت میں شمار کرنے کے لئے کس قدر خون آنا ضروری ہے؟ یاد رہے مالکیہ کے نزدیک جب تک خون دن یا رات کے کسی قدر حصے میں نہ آئے اور شافعیہ وحنابلہ کے نزدیک جب تک خون ایک دن اور ایک رات یعنی ۲۴ گھنٹے تک نہ رہے، اسے عدت کے معاملے میں حیض قرار نہیں دیا جاسکتا۔

(جواب) واضح ہو کہ کم از کم حیض کے بارے میں کوئی صحیح حدیث وارد نہیں۔ لہٰذا سرخی مائل سیاہ خون حیض کا ہی خون ہے، چاہے تھوڑا ہو یا زیادہ۔ یہ عدت میں مؤثر ہوگا، اگرچہ فقہاء کے مذاہب مختلف ہیں۔ صحت کے قریب بات وہی ہے جو پہلے ہم نے ذکر کردی ہے۔ واللہ اعلم

دو حیضوں کا درمیانی وقفہ (عرصۂ طہر) کتنے دن کا ہوتا ہے؟

(سوال) دو حیضوں کے درمیان کا وقت عرصۂ طہر یعنی پاکی کا زمانہ کہلاتا ہے۔ حنابلہ کے نزدیک دو حیضوں

[1] سنن ابن ماجه، بَابُ مَا جَاءَ فِي الْمُسْتَحَاضَةِ الَّتِي قَدْ عَدَّتْ ...... ، رقم:٦٢٣

کے درمیان پاک رہنے کی کم سے کم مدت تیرہ دن ہے اور مقلدین ائمہ ثلاثہ کے نزدیک کم سے کم مدت پندرہ یوم ہے۔ عام طور پر حیض سے پاک ہونے کے تقریباً ۲۰، ۲۱ دن بعد دوسرا حیض شروع ہوتا ہے۔ درمیان کے یہ ۲۰، ۲۱ دن طہر کا زمانہ کہلاتا ہے۔ بعض وجوہات کی بناء پر حیض دو چار دن پہلے یا لیٹ بھی ہو جاتا ہے۔

احادیث و آثار کی روشنی میں کتنے دن بعد خون دکھائی دے تو اسے حیض کہیں گے ورنہ کسی بیماری کا خون قرار دے کر نماز اور روزہ سے نہ روکیں گے۔ طبی اعتبار سے بیس اکیس دن پاکی کا عرصہ ہوتا ہے۔ جو دو چار دن زیادہ یا کم ہوسکتا ہے۔ مثال کے طور پر کوئی عورت پاک ہونے کے ایک ہفتے بعد پھر خون دیکھے تو کیا یہ حیض نہیں سمجھا جائے گا۔ ویسے بھی خلافِ عادت آیا ہو تو کیا حکم ہے؟ اور ایسی عورت جسے ہر بار ہفتے بعد خون دکھائی دے تو صحیح بخاری میں حضرت علی کا واقعہ ہے کہ ایک عورت کو ایک مہینے میں تین دفعہ حیض آ گیا تو انھوں نے کہا طلاق واقع ہوگئی۔ اگر کسی عورت کو ایک مہینے میں تین دفعہ حیض آنے کی عادت نہیں تو اُسے حیض نہیں کہا جا سکتا کیونکہ اس کی پہلی عادت کا بھی لحاظ کیا جائے گا۔ اس بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

جواب عام حالات میں عورتوں کو حیض کا خون ایک ماہ میں ایک دفعہ آتا ہے لیکن بعض دفعہ ایک ماہ میں متعدد دفعہ بھی آ سکتا ہے۔ چنانچہ صحیح بخاری کے ترجمۃ الباب میں ہے:

«بَابُ إِذَا حَاضَت فِی شَهرٍ ثَلَاثَةَ حِیضٍ ، وَ مَا یُصَدَّقُ النِّسَاءُ فِی الحَیضِ، وَالحَملِ فِیمَا یُمکِنُ مِنَ الحَیضِ لِقَولِ اللّٰهِ تَعَالٰی ﴿وَ لَا یَحِلُّ لَهُنَّ اَن یَکتُمنَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ فِی أَرحَامِهِنَّ﴾ یُذکَرُ عَن عَلِیٍّ وَ شُرَیحٍ اَنَّ امرَأَةً جَاءَ ت بِبَیِّنَةٍ مِن بِطَانَةِ اَهلِهَا مِمَّن یُرضٰی دِینُهٗ اَنَّهَا حَاضَت ثَلَاثًا فِی شَهرٍ صُدِّقَت. وَ قَالَ عَطَاءٌ : أَقرَاؤُهَا مَا کَانَت . وَ بِهٖ قَالَ اِبرَاهِیمُ. وَ قَالَ عَطَاءٌ: اَلحَیضُ یَومٌ اِلٰی خَمسَ عَشرَةَ . وَ قَالَ مُعتَمِرٌ عَن أَبِیهِ ، سَأَلتُ ابنَ سِیرِینَ عَنِ المَرأَةِ تَرَی الدَّمَ بَعدَ قُرُوْءِ هَا بِخَمسَةِ اَیَّامٍ . قَالَ : النِّسَاءُ أَعلَمُ بِذٰلِكَ»

''جب عورت کو ایک ماہ میں تین بار حیض آ جائے (تو اس کا کیا حکم ہے) اور وہ اُمور جن میں بسلسلہ حیض اور حمل عورتوں کی تصدیق ممکن ہے (اور جہاں ناممکن ہو وہاں تصدیق نہیں ہوسکتی) اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کی بناء پر کہ اگر وہ اللہ اور روزِ قیامت پر ایمان رکھتی ہیں تو ان کے لیے جائز نہیں کہ اللہ نے جو کچھ ان کے شکم میں پیدا کیا ہے اس کو چھپائیں۔ یعنی عورت کے لیے حلال نہیں کہ شوہر سے حیض یا حمل کو چھپائے رکھے کیونکہ انقضاء عدت (عدت کے خاتمہ) کا

دارومدار اسی پر ہے۔ آیت ہذا میں اس امر کی راہنمائی ہے کہ ممکنہ امور میں عورت کے دعویٰ کی تصدیق ہوگی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور قاضی شریح رحمہ اللہ سے منقول ہے کہ اگر عورت اپنے اہل میں سے خواص اور دینی اعتبار سے پسندیدہ گواہ لے کر آتی ہے کہ اس کو مہینہ میں تین دفعہ حیض آیا ہے تو اس کی بات کو سچا سمجھا جائے گا۔ عطاء نے کہا کہ حیض میں عورت کی عادت کا اعتبار ہوگا اور ابراہیم نخعی رحمہ اللہ کا بھی یہی قول ہے اور عطاء نے کہا کہ حیض کا زمانہ ایک سے لے کر پندرہ دن تک ہے اور معتمر نے اپنے باپ سلیمان تیمی سے بیان کیا ہے کہ میں نے ابن سیرین سے اس عورت کے بارے میں دریافت کیا جسے حیض کے پانچ روز بعد خون آتا ہے۔ جواباً فرمایا:

''عورتوں کو اس بات کا زیادہ علم ہے۔''

مقصد یہ ہے کہ وہ اپنی عادت اور خون کے لیے رنگ دیکھ کر اس کے مطابق عمل کریں گی، پھر قصۂ فاطمہ بنت حُبیش سے مصنف کا استدلال ہے کہ یہاں معاملہ عورت کی عادت اور دیانت وامانت پر چھوڑا گیا ہے۔ لہٰذا اگر واقعاتی طور پر تصدیق ہو جائے کہ حیض کے چند یوم بعد آمدہ خون بھی حیض ہی ہے تو وہ حیض ہی شمار ہوگا، ورنہ وہ دمِ استحاضہ ہوگا، جس میں عورت حکماً طاہر ہوتی ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا مشارٌ الیہ قصہ ''صحیح بخاری'' کی مسندات (سند والی روایات) میں نہیں بلکہ ''ترجمۃ الباب'' میں ہے جس کی وضاحت پہلے ہو چکی ہے۔ اس واقعہ کی مزید تفصیل امام دارمی رحمہ اللہ نے ذکر کی ہے کہ ایک مطلقہ کو مہینے میں تین دفعہ حیض آیا تو قاضی شریح نے اس کو عدت سے فارغ قرار دیا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فعلِ ہذا مستحسن سمجھا۔ (فتح الباری: ۱/۴۲۵)

کیا نفاس والی عورت کے لیے چالیس دن مکمل کرنا لازمی ہیں؟

سوال کیا نفاس کے چالیس دن مکمل کرنے لازمی ہیں یا خون بند ہونے کے بعد عورت غسل کر کے نماز پڑھ سکتی ہے؟

جواب چالیس دن سے قبل نفاس کا خون بند ہونے پر عورت طہارت کے فوراً بعد نماز شروع کر دے اور رمضان کے روزے رکھے اور وہ خاوند کے لیے بھی حلال ہے۔ اگر چالیس دنوں کے دوران خون دوبارہ آنا شروع ہو جائے تو اس پر نماز اور روزہ چھوڑنا واجب ہوگا۔ علماء کے صحیح ترین قول کی رُو سے خاوند کی قربت اختیار کرنا بھی ممنوع ہو جائے گی۔ ایسی عورت پاک ہونے یا چالیس دن کی مدت پوری کرنے تک نفاس والی عورت کا حکم رکھتی ہے۔ البتہ اگر چالیس دن کے بعد بھی خون جاری رہتا ہے (اور خون کا رنگ بھی تبدیل ہو

گیا ہے) تو ایسا خون فاسد ہوگا اس کے لیے وہ نماز روزہ نہیں چھوڑ سکتی اور مستحاضہ کی طرح خاوند کے لیے بھی حلال ہے۔

کیا خون پاک ہوتا ہے؟ کیا اسے دھوئے بغیر انہی کپڑوں میں نماز پڑھ سکتے ہیں؟

سوال کپڑے پر خون لگا ہو تو کیا خون دھوئے بغیر ان کپڑوں میں نماز پڑھ سکتے ہیں؟۔ ''محدث'' لاہور (جلد:٦، شمارہ:٦) میں مولانا عزیز زبیدی صاحب نے خون کی طہارت ثابت کی ہے۔ کیا راجح مذہب کے مطابق خون پاک ہے؟

جواب راجح مسلک کے مطابق خون پاک ہے ''صحیح بخاری'' میں امام بخاری رحمہ اللہ کا مسلک بھی یہی ہے۔ ملاحظہ ہو! بَابُ مَن لَم یَرَ الوُضُوءَ اِلَّا مِنَ المَخرَجَین کپڑوں پر طاہر خون لگا ہو تو نماز پڑھی جا سکتی ہے۔'' تاہم ماہواری یا نفاس وغیرہ کا خون ناپاک ہے۔ (صحیح البخاری، باب غسل الدم)

کیا حائضہ عورت کے لیے اس کے استعمال شدہ کپڑے کو دھونا ضروری ہے؟

سوال کیا حائضہ عورت کے لیے اس کے استعمال شدہ کپڑے کو دھونا ضروری ہے؟

جواب حالتِ حیض میں استعمال شدہ کپڑا اگر عورت اپنے استعمال میں لانا چاہتی ہے تو دھونا ضروری ہے اور اگر استعمال میں لانا مقصود نہ ہو تو دھونا ضروری نہیں۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

« وَ فِیهِ جَوَازُ تَركِ النَّجَاسَةِ فِی الثَّوبِ عِندَ عَدَمِ الحَاجَةِ اِلٰی تَطهِیرِہٖ.» [1]

کیا حائضہ عورت قبرستان جا سکتی ہے؟

سوال کیا حائضہ عورت قبرستان جا سکتی ہے؟ برائے مہربانی مفصل جواب دیں۔

جواب اصلاً عورت کے قبرستان جانے کی اجازت کے متعلق اہل علم کا اختلاف ہے۔ صحیح بات یہ ہے کہ اس کی اجازت ہے بشرطیکہ وہاں جزع فزع کا اظہار نہ کرے اور کثرت سے نہ جائے۔ ''صحیح بخاری'' وغیرہ میں حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا گزر ایک ایسی عورت کے پاس سے ہوا جو قبر پر بیٹھی رو رہی تھی۔ آپ ﷺ نے اسے اللہ سے ڈرنے اور صبر کرنے کی تلقین کی۔ اگر عورت کے لیے یہاں آنا ناجائز ہوتا تو آپ ﷺ اس کو روک دیتے۔ آپ کا نہ روکنا جواز ہی کی دلیل ہے۔

نیز صحیح مسلم وغیرہ میں ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا کہ جب قبرستان

[1] فتح الباری: ١/ ٤١١

میں جاؤں تو کون سی دعاء پڑھوں؟ تو آپ ﷺ نے دعاء کی تعلیم دی۔ اس میں بھی جانے کے جواز کی دلیل ہے، حائضہ اور طاہرہ کا کوئی فرق نہیں۔

نفاس یا حیض والی عورت قرآنِ پاک کو چھو سکتی ہے؟

(سوال) کیا فرماتے ہیں علمائے دین مسئلہ ہذا میں کہ کیا نفاس والی یا حائضہ عورت قرآن پاک کو ہاتھ لگائے بغیر تلاوت کر سکتی ہے یا نہیں یا زبانی تلاوت کر سکتی ہے اور اگر تلاوت کے دوران سجدہ آ جائے تو کیا سجدہ کر سکتی ہے؟ وضاحت فرمائیں۔

(جواب) حالت حیض یا نفاس میں عورت زبانی قرآن پڑھ سکتی ہے۔ حدیث میں ہے:

«كَانَ يَذْكُرُ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ اَحْيَانِهٖ.» [1]

نبی ﷺ ہر حالت میں اللہ کی یاد میں مصروف رہتے۔ لفظ ''ذکر'' عام ہے جو قرآن اور غیرِ قرآن سب کو شامل ہے۔ اس سلسلہ میں امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی ''صحیح'' کے باب «تَقضِی الحَائِضُ المَنَاسِكَ كُلَّهَا اِلَّا الطَّوَافَ بِالبَيتِ.» کے تحت کئی ایک دلائل جمع کیے ہیں، جو ملاحظہ کیے جا سکتے ہیں، اور عدمِ جواز کی روایات متکلم فیہا (ان میں کلام کیا گیا ہے) ہیں۔ اس کے باوجود اس حالت میں قرآن پڑھنا کراہت سے خالی نہیں۔ اس لیے کہ حدیث میں ہے کہ ایک دفعہ بحالت پیشاب کسی نے آپ ﷺ کو سلام کہا، تو آپ ﷺ نے فراغت کے بعد وضو کر کے جواب دیا اور ساتھ فرمایا: میں نے درست نہ سمجھا کہ بلا طہارت جواب دوں۔[2] جب حدثِ اصغر کی حالت میں جواب دینا مکروہ ہے تو پھر بحالتِ حیض یا جنابت قرآن پڑھنا بطریقِ اُولیٰ مکروہ ہوگا۔ تلاوت کی صورت میں سجدۂ تلاوت بھی ہو سکتا ہے۔ ممانعت صرف نماز پڑھنے کی ہے نہ کہ سجدہ کرنے کی، یہ ایک جزوی حالت ہے، اس پر نماز کا اطلاق نہیں ہوتا، ویسے بھی سجدۂ تلاوت کے لیے طہارت شرط نہیں۔ بلکہ امام ابن حزم تو قبلہ رُخ ہونا بھی ضروری نہیں سمجھتے۔

ایام ماہواری میں شعبۂ حفظ کی طالبات منزل سبق، سبقی اور پارہ کیسے سنائیں؟

(سوال) کیا ایام ماہواری میں شعبۂ حفظ کی طالبات منزل سبق، سبقی اور پارہ سنا سکتی ہیں؟

[1] صحیح مسلم، بَابُ ذِكرِ اللهِ تَعَالٰی فِی حَالِ الجَنَابَةِ وَغَيرِهَا، رقم:۳۷۳، بحواله فتح الباری: ۱/ ۴۰۸، سنن ابن ماجه، رقم:۳۰۲

[2] سنن ابوداؤد، بَابُ أَيَرُدُّ السَّلَامَ وَهُوَ يَبُولُ، رقم:۱۷

جواب امام بخاری، طبری، ابن المنذر اور داؤد رحمہم اللہ اس بات کے قائل ہیں کہ جنبی اور حائضہ عورت کے لیے تلاوتِ قرآن جائز ہے۔ ان کے استدلالات میں سے درج ذیل روایات ہیں۔ صحیح بخاری میں حدیث عائشہ رضی اللہ عنہا میں ہے:

« فَافعَلِي مَا يَفعَلُ الحَاجُّ غَيرَ اَن لَا تَطُوفِي بِالبَيتِ حَتّٰى تَطهُرِي .»[1]

یعنی ''اے عائشہ رضی اللہ عنہا تو وہی کام کر جو حاجی لوگ کرتے ہیں۔ ماسوائے بیت اللہ کے طواف کے یہاں تک کہ تو حیض سے پاک ہوجائے۔''

وجہ استدلال یہ ہے کہ یہاں اعمالِ حج سے صرف طواف کو مستثنیٰ کیا ہے جو مخصوص قسم کی نماز ہے اور اعمالِ حج ذکر، تلبیہ اور دعاء پر مشتمل ہیں جس کے عموم میں تلاوتِ قرآن بھی داخل ہے۔ اس طرح حائضہ کا تلاوت کرنا ثابت ہوگیا۔ جب حائضہ تلاوت کرسکتی ہے تو جنبی انسان کا معاملہ تو اس سے ہلکا ہے، لہٰذا وہ بھی تلاوت کرسکتا ہے۔ نیز ''صحیح مسلم'' میں حدیث ہے۔ « كَانَ يَذكُرُ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ أَحيَانِهِ »[2]

یعنی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ نبی اکرم ﷺ ہر حالت میں اللہ کا ذکر کرتے تھے۔ اس کے عموم سے استدلال ہے کہ لفظ ذکر قرآن وغیرہ سب کو شامل ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ حفظ کی طالبات ماہواری کے ایام میں قرآن پڑھ سکتی ہیں لیکن یاد رہے مَسِ مصحف ناجائز ہے۔ ''صحیح بخاری'' کے ''ترجمۃ الباب'' میں ہے:

« وَ كَانَ أَبُو وَائِلٍ يُرسِلُ خَادِمَتَهٗ ، وَ هِيَ حَائِضٌ اِلٰى اَبِي رَزِين فَتَأتِيهِ بِالمُصحَف فَتُمسِكُهُ بِعَلَاقَتِه .»

ایامِ مخصوصہ عورت میں بغیر چھوئے زبانی یا کپڑے سے پکڑ کر قرآن کی تلاوت کرسکتی ہے؟

سوال کیا خواتین مخصوص ایام میں بغیر چھوئے زبانی یا کپڑے سے پکڑ کر قرآن کی تلاوت کرسکتی ہیں؟

جواب صحیح قول کے مطابق ایامِ مخصوصہ میں عورت قرآن کو ہاتھ لگائے بغیر تلاوت کرسکتی ہے۔ ممانعت کی کوئی صحیح صریح نص موجود نہیں ہے۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: فتاویٰ برائے خواتین، ص: ۹۰۔

حالتِ حیض میں معلّمہ اور طالبات قرآن مجید کی تعلیم و تعلّم کیسے کرسکتی ہیں؟

سوال کیا حیض کی حالت میں معلّمہ قرآن مجید کا ترجمہ اور حدیث پڑھا سکتی ہے؟ احتیاط کس چیز میں ہے

[1] صحیح البخاری، بَابٌ: تَقضِي الحَائِضُ المَنَاسِكَ كُلَّهَا إِلَّا الطَّوَافَ بِالبَيتِ، رقم: ۳۰۵

[2] صحیح مسلم، بَابُ ذِكرِ اللّٰهِ تَعَالٰى فِي حَالِ الجَنَابَةِ وَغَيرِهَا ، رقم: ۳۷۳، بحوالہ فتح الباری: ۱/۴۰۸، سنن ابن ماجہ، رقم: ۳۰۲

اور طالبات اس حالت میں کیا کریں؟

جواب حیض کی حالت میں معلّمہ قرآن مجید کا ترجمہ اور حدیث پڑھا سکتی ہے۔ بشرطیکہ قرآن کریم کو ہاتھ نہ لگائے اور طالبات کا بھی یہی حکم ہے۔ حالتِ حیض میں وہ ہاتھ لگائے بغیر قرآن مجید پڑھ سکتی ہیں جب کہ کتب احادیث پڑھنے کا بھی جواز ہے۔ حدیث میں ہے:

« كَانَ يَذكُرُ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ اَحيَانِهٖ.»[1]

یعنی ''نبی ﷺ ہر حالت میں اللہ کا ذکر کرتے تھے۔''

کیا مخصوص ایام میں معلّمہ قرآن مجید کا ترجمہ اور حدیث وغیرہ دینی علوم پڑھا سکتی ہے؟

سوال کیا مخصوص ایام میں معلّمہ قرآن مجید کا ترجمہ اور حدیث وغیرہ دینی علوم پڑھا سکتی ہے؟

جواب حیض والی عورت قرآن کا ترجمہ اور حدیث پڑھا سکتی ہے بشرطیکہ قرآن کو ہاتھ نہ لگائے۔

ایام حیض میں عورت قرآن کریم کی تلاوت کر سکتی ہے یا نہیں؟

سوال ایام حیض میں عورت قرآن کریم کی تلاوت کر سکتی ہے یا نہیں؟ وہ لڑکی جو حفظ القرآن کی طالبہ ہو اس کے لیے کہاں تک رعایت ہے اور اس کا قرآن وسنت میں کیا ثبوت ہے؟

جواب صحیح مسلک کے مطابق حائضہ عورت کے لیے قرآن مجید کی تلاوت کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ قرآن کو ہاتھ لگائے بغیر زبانی طور پر پڑھ سکتی ہے۔

حیض کی مدت چونکہ کئی دنوں پر محیط ہوتی ہے لہٰذا طالبہ غیر طالبہ سب کے لیے تلاوت کو جائز قرار دیا گیا ہے تاکہ وہ اسے بھول نہ جائے اور تلاوت کلام کے ثواب سے محروم نہ رہے۔

منی، مذی کے متعلق احکام ومسائل

مَنی پاک ہے یا ناپاک؟

سوال ''بلوغ المرام'' میں ایک حدیث نظر سے گزری جس کا متن کچھ یوں ہے:

''حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا روایت کرتی ہیں کہ نبی ﷺ (کپڑے پر لگی ہوئی) مَنی دھویا کرتے تھے پھر اسی کپڑے کو زیبِ تن فرما کر نماز پڑھ لیتے تھے اور میں دھونے کے نشان کو اور اثر کو صاف طور پر

[1] صحيح مسلم، بَابُ ذِكرِ اللهِ تَعَالَى فِي حَالِ الجَنَابَةِ وَغَيرِهَا ،رقم:٣٧٣، و ايضًا

(اپنی آنکھوں سے) دیکھتی تھی۔''[1]

اور مسلم کی روایت میں ہے رسول اللہ ﷺ کے کپڑے سے مَنی کو کھرچ دیا کرتی تھی پھر آپ ﷺ اسی کپڑے میں نماز ادا فرماتے تھے۔[2]

مسلم ہی کی روایت ہے کہ جب مَنی خشک ہو جاتی تو میں اپنے ناخن سے اسے کھرچ کر کپڑے سے اتار دیتی۔[3] اس حدیث کی تخریج میں یہ لکھا ہے کہ مَنی کو مطلقاً کپڑے سے دھونا واجب نہیں خواہ خشک ہو یا تر بلکہ جب کہ وہ خشک ہو اتنا ہی کافی ہے کہ اسے صاف کردے ہاتھ یا کپڑے کے ٹکڑے سے۔ علامہ شوکانی رحمہ اللہ نے نیل الأوطار میں کہا ہے کہ مَنی کو دھو کر ہاتھ کے ساتھ صاف کرکے وغیرہ طریقوں سے زائل کرنا ثابت ہے۔ اس مسئلہ میں اختلاف ہے کہ انسان کا مادہ منویہ پاک ہے یا ناپاک۔ ایک گروہ کا کہنا ہے کہ یہ لعاب دہن کی طرف پاک ہے۔ اس نظریہ کی تائید میں امام شافعی، امام احمد رحمہ اللہ ائمہ میں سے اور صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے حضرت علی، سعد بن وقاص، حضرت ابن عمر اور ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہم شامل ہیں۔ جب کہ دوسرے نظریے کی تائید ائمہ میں سے امام مالک اور امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ نے کی ہے۔ دونوں مکتبِ فکر کے پاس دلائل ہیں۔

آپ سے اس مسئلہ کی وضاحت ہے تاکہ کسی ایک نقطہ پر ذہن کو مرکوز کیا جا سکے۔

جواب مَنی پاک ہے یا ناپاک؟ اس سلسلہ میں وارد متعارض روایات کو ائمہ کرام نے مختلف انداز میں تطبیق دی ہے۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ رقم طراز ہیں، مَنی کو دھونے اور کھرچنے کی روایات میں تعارض نہیں جو لوگ مَنی کی طہارت کے قائل ہیں ان کے ہاں وجہ جمع واضح ہے۔ مَنی کا دھونا واجب نہیں استحباب نظافت پر محمول ہے۔ یہ امام شافعی، احمد اور اصحابِ حدیث کا طریقہ کار ہے۔

اس طرح جو لوگ اس کی نجاست کے قائل ہیں ان کے نزدیک وجہِ جمع یوں ہے۔ جس حدیث میں مَنی کو دھونے کا ذکر ہے یہ محمول ہے اس صورت پر کہ مَنی تر ہو اور کھرچنا اس صورت میں ہے جب کہ وہ خشک ہو، یہ حنفیہ کا طریقہ ہے۔ لیکن پہلا طریقہ زیادہ راجح ہے، کیونکہ اس صورت میں حدیث اور قیاس

[1] صحیح البخاری، بَابُ غَسْلِ المَنِیِّ وَفَرْکِهِ، وَغَسْلِ مَا یُصِیبُ مِنَ المَرْأَةِ، رقم:۲۳۰، صحیح مسلم، بَابُ حُکْمِ الْمَنِیِّ، رقم:۲۸۹

[2] صحیح مسلم، بَابُ حُکْمِ الْمَنِیِّ، رقم:۲۸۸

[3] صحیح مسلم، بَابُ حُکْمِ الْمَنِیِّ، رقم:۲۸۹

دونوں پر عمل ہو جاتا ہے، کیونکہ اگر یہ نجس ہے تو قیاس کا تقاضا یہ ہے کہ اس کا دھونا واجب ہو، صرف کھرچنا کافی نہیں ہونا چاہیے۔ جس طرح کہ خون وغیرہ کا دھونا ضروری ہے، اور وہ لوگ بلاعفو ورعایت لہو کو صرف کھرچنا کافی نہیں سمجھتے۔

دوسرے طریقہ کی تردید ابن خزیمہ رحمہ اللہ کی روایت سے ہوتی ہے جس کو دوسرے طریق سے عائشہ رضی اللہ عنہا سے بیان کیا ہے۔ حضرت عائشہ گھاس کی جڑ سے مَنی کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے کپڑے سے اتارتی تھیں، اور خشک کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے کپڑے سے کھرچ دیتی تھیں۔ پھر آپ اس میں نماز پڑھ لیتے۔[1] یہ حدیث دونوں حالتوں میں ترکِ غسل کو متضمن (شامل) ہے۔ اور مالک رحمہ اللہ کے ہاں تو کھرچنا ویسے ہی غیر معروف ہے۔ وہ فرماتے ہیں دیگر نجاسات کی طرح اس کا دھونا بھی واجب ہے۔ لیکن کھرچنے کی حدیث ان کے خلاف دلیل ہے۔ پھر حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے صحیح مسلم اور ترمذی کی روایات سے ان کے خلاف حجت قائم کی ہے، اور سب سے واضح ابن خزیمہ کی روایت ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا آپ کے کپڑے سے مَنی کھرچ دیتی تھیں۔ پھر آپ اس میں نماز پڑھ لیتے۔[2]

اگر یہ فرض کرلیا جائے کہ اس بارے میں کوئی شے وارد نہیں تو حدیث الباب میں کوئی شے ایسی نہیں جو مَنی کی نجاست پر دال ہو۔ کیونکہ مَنی کو دھونا محض فعل ہے، اور فعل وجوب پر دلالت نہیں کرتا۔[3]

نیز حنفیہ کے مُسلَّمہ بزرگ امام طحاوی رحمہ اللہ بسندہ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں کہ مَنی کی بابت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال ہوا کہ کپڑے کو لگ جائے تو کیا کرے؟ فرمایا: کہ مَنی رینٹ یعنی سینڈھ اور تھوک کے بمنزلہ ہے، اور تجھے صرف اس کا لیر (کپڑا) یا گھاس اذخر سے پونچھنا کافی ہے۔ بحوالہ: نیل الأوطار۔

اس سے معلوم ہوا راجح مسلک ان لوگوں کا ہے جو مَنی کی طہارت کے قائل ہیں۔ مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو! ''فتح الباری'' وغیرہ۔

کپڑے پر لگی خشک یا تر منی کا کیا حکم:

سوال علقمہ رحمہ اللہ اور اسود رحمہ اللہ سے روایت ہے کہ ایک شخص حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس اُترا صبح کو اپنا کپڑا دھونے لگا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہا کہ تجھے کافی تھا اگر مَنی تو نے دیکھی تو صرف اتنا مقام دھو ڈالتا اور جو

① صحیح ابن خزیمه،بَابُ سَلْتِ الْمَنِيِّ مِنَ الثَّوْبِ بِالْإِذْخِرِ إِذَا كَانَ رَطْبًا،رقم:۲۹٤

② صحیح ابن خزیمه، بَابُ ذِكْرِ الدَّلِيلِ عَلَى أَنَّ الْمَنِيَّ لَيْسَ بِنَجِسٍ، وَالرُّخْصَةُ فِي فَرْكِهِ ......الخ، رقم: ۲۹۰

③ فتح الباری: ۱/ ۳۳۲

نہیں دیکھی تو پانی گرداگرد چھڑک دیتا۔ میں تو رسول اللہ ﷺ کے کپڑے سے مَنی چھیل ڈالتی۔ یعنی کھرچ ڈالتی۔ پھر آپ اس کپڑے کو پہن کر نماز پڑھتے۔ [1]

اس حدیث کے فوائد میں علامہ وحید الزمان نے فرمایا کہ علامہ نووی رحمہ اللہ نے کہا۔ علماء نے اختلاف کیا ہے۔ آدمی کی مَنی میں امام مالک اور امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا مذہب ہے کہ وہ نجس ہے اور بہت سے علماء اس طرف گئے ہیں کہ مَنی پاک ہے اور یہی مروی ہے حضرت علی، حضرت عمر اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہم سے اور یہی مذہب ہے امام احمد رحمہ اللہ اور امام شافعی رحمہ اللہ اور اہلِ حدیث کا۔

آپ سے گزارش ہے کہ مَنی پاک ہے یا ناپاک؟ اس بارے میں قرآن و حدیث کی روشنی میں مفصل جواب دیں۔

جواب دلائل کی رُو سے قوی مسلک یہ ہے کہ مَنی پاک ہے جس طرح کہ صحیح احادیث میں مصرح (واضح) ہے۔ حنفیہ کے مسلمہ بزرگ طحاوی رحمہ اللہ، ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں۔ یعنی "منی کی بابت رسول اللہ ﷺ سے سوال ہوا کہ کپڑے کو لگ جائے تو کیا کرے؟ فرمایا: مَنی بلغم یعنی سینڈھ اور تھوک کے بمنزلہ (کی طرح) ہے۔ تو تجھے صرف اس کا لیر (کپڑا) یا گھاس اذخر سے پونچھنا کافی ہے۔

ملاحظہ ہو "المنتقیٰ، مَعَ نَیلُ الاَوطَار" ظاہر ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی تخلیق کا عنصر ناپاک نہیں ہوسکتا ہے اس سے بھی معلوم ہوا کہ مَنی پاک ہے۔

مذی لگے کپڑے تبدیل کیے جائیں یا چھینٹے مار لینا کافی ہے؟

سوال مذی نکلنے پر وضو فرض ہو جاتا ہے۔ جن کپڑوں پر یہ قطرے لگے ہوں انہیں تبدیل کیا جائے یا بغیر دھوئے پانی کے صرف چھینٹے پر اکتفا کیا جائے؟

جواب اس مسئلے میں اہل علم کا اختلاف ہے۔ امام شافعیؒ اور امام اسحاق بن راہویہ رحمہما اللہ کپڑے دھونے کے قائل ہیں۔ جب کہ بعض علماء کہتے ہیں کہ صرف چھینٹے لگانا ہی کافی ہے۔ چنانچہ امام احمد رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ پانی کے چھینٹے لگانا کافی ہے۔

امام شوکانی رحمہ اللہ نے نیل الأوطار میں اسی بات کو ترجیح دی ہے کہ صرف چھینٹے کافی ہیں، کپڑا دھونے کی ضرورت نہیں۔ [2]

---

[1] صحیح مسلم، بَابُ حُکمِ المَنِیِّ، رقم: ۲۸۸

[2] عون المعبود: ۱/ ۸۵

مرد اور عورت کی منی یا مذی کو دھونے کا حکم:

(سوال) صحیح مسلم (۱/ ۱۵۵) میں ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا: "یَغسِلُ مَا اَصَابَہٗ مِنَ المَرأَۃِ" عورت سے جو رطوبت لگی ہوا سے دھولے۔ بخاری میں بھی دھونے کا حکم ہے۔ کیا عورت اور مرد دونوں کی مذی ناپاک ہے؟ اور اگر کپڑے پر لگ جائے تو کیا دونوں کی مذی پر پانی چھڑک دینا کافی ہے یا صرف مرد کی مذی پر کافی ہے؟

(جواب) مشارٌ الیہ روایت کا تعلق اس زمانہ سے ہے جب کہ وجوبِ غسل کے لیے انزال شرط تھا، لیکن بعد میں مجرد دخول (صرف دخول) کی وجہ سے غسلِ جنابت واجب قرار پایا۔ اس حدیث میں مذی کا مسئلہ زیرِ بحث نہیں، ویسے فی نفسہٖ خروجِ مذی سے صرف وضو کرنا چاہیے، غسل کی ضرورت نہیں۔ مذی چاہے مرد کی ہو یا عورت کی دونوں کا حکم ایک جیسا ہے، اور کپڑے کا دھونا محض حصولِ نظافت کے لیے ہے۔

حرام ہمأ کول اللحم اور مردہ جانوروں کے گوبر و پیشاب کے احکام و مسائل

کیا ہر مردہ جانور نجس ہے یا صرف حرام جانور یا پلید جانور ہی نجس ہوتے ہیں؟

(سوال) کیا ہر طرح کا مرا ہوا جانور نجس ہے یا صرف حرام جانور یا پلید جانور ہی نجس ہوتے ہیں؟

(جواب) جو جانور اپنی موت مر جائیں وہ سب حرام ہیں خواہ ان کا تعلق ایسے جانوروں سے ہو جن کا گوشت کھانا حلال ہے۔

بھینس اور گھوڑے کے پیشاب کے چھینٹے یا گوبر لگے کپڑوں میں نماز کا پڑھنا کیسا ہے؟

(سوال) ہمارے کپڑوں پر کبھی گوبر لگا ہوتا ہے اور کبھی بھینس یا گھوڑے کے پیشاب کے چھینٹے پڑ جاتے ہیں، کپڑے تبدیل کرنا ممکن نہیں ہوتا۔ کیا ان کپڑوں میں نماز پڑھ لینا درست ہے؟

(جواب) راجح مسلک کے مطابق "مأ کول اللحم" (جس کا گوشت کھایا جائے) جانوروں کے پیشاب اور گوبر پاک ہیں۔ اس طرح صحیح مسلک کے مطابق گھوڑا بھی حلال ہے۔ اس کا حکم بھی یہی ہے۔ لہٰذا پیشاب اور گوبر آلود کپڑوں میں نماز پڑھی جا سکتی ہے؟ صحیح البخاری میں حدیث ہے:

« كَانَ يُصَلِّي فِي مَرَابِضِ الغَنَمِ قَبْلَ أَنْ يُبْنَى المَسْجِدُ »[1]

[1] صحيح البخاری، بَابُ أَبْوَالِ الإِبِلِ، وَالدَّوَابِّ، وَالغَنَمِ وَمَرَابِضِهَا، رقم: ٢٣٤

''مسجد تعمیر ہونے سے پہلے نبی کریم ﷺ بکریوں کے بارے میں نماز کی ادائیگی فرمایا کرتے تھے۔''

اسی طرح حدیث ہے:« صَلُّوا فِی مَرَابِضِ الغَنَمِ.»[1]

یعنی'' بکریوں کے باڑے میں نماز پڑھ لو۔''

اس سے معلوم ہوا کہ ''ماکول اللحم'' چار پائے کا گوبر اور پیشاب پاک ہے۔گھوڑے کے بارے حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

« وَرَخَّصَ فِی لُحُومِ الخَیلِ.» ''نبی ﷺ نے گھوڑے کے گوشت کی اجازت دی ہے۔''[2]

تفصیل کے لیے ''فتح الباری''(۶۴۹/۹) ملاحظہ فرمائیں!

پاخانے کی راکھ پاک ہے یا پلید؟

سوال ناپاک شے مثلاً پاخانہ وغیرہ جل کر راکھ ہو جائے تو وہ راکھ پاک ہے یا پلید؟

جواب پاخانے وغیرہ ناپاک چیزوں کی راکھ نجس (پلید) ہے۔کیونکہ اصل نجس ہے،جس طرح شراب کے مختلف ادویہ وغیرہ میں حل کر لینے کے باوجود وہ نجس (پلید)ہی رہتی ہے۔

ناپاک چیز کا دھواں پاک ہے یا ناپاک؟

سوال ناپاک شے کا دھواں پاک ہے یا نہیں؟ نیز ناپاک تیل مسجد میں جلایا جا سکتا ہے یا نہیں؟

جواب ناپاک شے کا دھواں ناپاک نہیں۔امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے اپنے ''فتاوی'' میں مسئلہ ہذا کو بڑی تفصیل سے لکھا ہے۔

حاصل اس کا یہ ہے کہ نجس شے کے دھوئیں سے کوئی دوسری چیز نجس نہیں ہوتی۔اس کی مثال ایسی ہے جیسے نمک کی کان میں گدھا پڑ جائے اور وہ نمک ہو جائے تو اب اس کا حکم گدھے کا نہیں ہوگا،ٹھیک اسی طرح نجس شے کے دھوئیں کو سمجھ لینا چاہیے۔اور اس کی تائید میں نجس تیل چراغ میں جلانا صحابہ رضی اللہ عنہم سے منقول ہے،حالانکہ اس کا دھواں اندر پھیلتا ہے،اور ہر چیز پر اثر انداز ہوتا ہے۔البتہ نجس تیل مسجد میں نہیں جلانا چاہیے۔امام مالک رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ نجس تیل سے چراغ جلایا جا سکتا ہے۔لیکن مسجدوں کے علاوہ۔[3]

---

[1] سنن ابن ماجه،بَابُ الصَّلَاةِ فِي أَعْطَانِ الْإِبِلِ، وَمُرَاحِ الْغَنَمِ،رقم:۷۶۹

[2] صحيح البخاری، بَابُ لُحُومِ الخَيْلِ، رقم: ۵۵۲۰

[3] زادالمعاد: ۲۴۲/۴

فطری امور (سنن الفطرۃ) کے متعلق احکام ومسائل

ناخن کاٹنے کا مسنون طریقہ کیا ہے؟

سوال ناخن کاٹنے کا مسنون طریقہ کیا ہے؟

جواب امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''مستحب یہ ہے کہ پاؤں سے پہلے ہاتھوں کے ناخن اتارے جائیں۔ دائیں ہاتھ کی شہادت والی انگلی سے شروع کرکے چھوٹی انگلی کی طرف آئے پھر انگوٹھے کا ناخن اتارے پھر بائیں ہاتھ کی چھوٹی انگلی سے شروع کرکے آخر تک اتار دے۔ پھر دائیں پاؤں کی چھوٹی انگلی سے شروع کرے اور بائیں پاؤں کی چھوٹی انگلی پر ختم کرے۔''[1]

واضح ہو کہ یہ تفصیل کسی حدیث سے معلوم نہیں ہوسکی تاہم آپ ﷺ کی عادتِ مبارک تھی کہ پسندیدہ کام دائیں طرف سے شروع کرتے اور اس کے برخلاف بائیں طرف سے۔ (نیل الاوطار، سبل السلام)

کیا عورت اپنے ناخن انتالیس دن تک بڑھا سکتی ہے؟

سوال لڑکیوں میں آج کل ناخن بڑھانے کا فیشن ہے جب کہ ہر جمعہ کو ناخن کترنا سنتِ رسول اللہ ﷺ ہے۔ لڑکیوں کو بڑھے ہوئے ناخنوں سے کراہت کیسے دلائی جائے؟ جواز یہ نکالتی ہیں کہ ۴۰ دن سے زیادہ بڑھانے حرام ہیں۔ اس لیے اتنے دن بڑھا کر کترلو تو کوئی حرج نہیں۔ وضاحت فرمائیں۔

جواب ناخن لمبے کرنا اصلاً یورپ کی فاسق وفاجر عورتوں کی قبیح عادت ہے، جو مسلمان عورتوں میں سرایت کرچکی ہے۔ اس سے اجتناب انتہائی ضروری ہے حدیث میں ہے:

« مَن تَشَبَّهَ بِقَومٍ فَهُوَ مِنهُم.»[2]

''جو کسی قوم کی مشابہت اختیار کرتا ہے وہ ان سے بن جاتا ہے۔'' (لَا حَولَ وَ لَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ)

فعل ہذا فطرت سلیمہ کے خلاف ہے۔ ﴿فِطرَةَ اللّٰهِ الَّتِي فَطَرَ النَّاسَ عَلَيهَا﴾ (الروم:۳۰) نبی ﷺ نے فرمایا: پانچ چیزیں فطرت یعنی سنتِ انبیاء سے ہیں جن کی اقتداء کا ہمیں حکم دیا گیا ہے ان سے ایک «تَقلِيمُ الاَظفَارِ» ہے یعنی ناخن اتارنا اور دوسری روایت میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

---

[1] نیل الاوطار:۱/۱۲٤

[2] سنن ابی داؤد، بَابٌ فِي لُبسِ الشُّهرَةِ، رقم:٤٠٣١

« وَقَّتَ لَنَا رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ فِي قَصِّ الشَّارِبِ وَ تَقلِيمِ الاَظفَارِ وَ نَتفِ الاِبِطِ وَ حَلقِ العَانَةِ اَن لَا نَترُكَ اَكثَرَ مِن اَربَعِينَ لَيلَةً.» [1]

''رسول اللہ ﷺ نے مونچھوں کو کاٹنے اور ناخن اُتارنے اور بغلوں کے بال اکھاڑنے اور زیرِ ناف بال مونڈنے کے بارے میں وقت مقرر فرمایا ہے کہ چالیس راتوں سے زائد ہم ان کو نہ چھوڑیں۔''

امام شوکانی رحمہ اللہ نے اس بات پر زور دیا ہے کہ چالیس دن سے زائد ان اُمور کو چھوڑنا نہیں چاہیے۔ [2]

علامہ البانی رحمہ اللہ نے بھی ''آداب الزفاف'' میں اس توجیہ (وضاحت) کو اختیار کیا ہے۔ اس اعتبار سے لڑکیوں کی بات درست ہے، بشرطیکہ اس کے سہارے مطلقاً بڑھانے کا جواز نہ پیدا کر لیا جائے۔ پھر جمعہ کو کترنے والی روایت بھی پیشِ نظر رہنی چاہیے، نہ کہ صرف جانبِ واحد کو ہی دیکھا جائے۔ (كتاب زينة المرأة ، ص:١٦٤)

فعل ہذا فاسق و فاجر کفار عورتوں کی بُری عادت ہے۔ یہ کہہ کر ان کو نفرت دلائی جائے۔ نیز آخرت میں اللہ تعالیٰ کے وعدے اور وعید ان کو یاد دلائے جائیں۔

زیرِ ناف بالوں کے لیے صفائی کا طریقہ، اوزار اور کتنے عرصے بعد کاٹیں؟

سوال زیرِ ناف بالوں کو کتنے عرصے بعد کاٹنا چاہیے؟ نیز کن طریقوں سے یا کن اشیاء سے ان بالوں کو ختم کرنا چاہیے؟، نیز عورتوں کے متعلق بھی ذرا سی روشنی ڈال دیں کہ وہ کتنے عرصہ بعد بال صاف کر سکتی ہیں یا کس طریقے سے جائز ہے۔ اس کے علاوہ بغلوں کے بالوں کے متعلق بھی لکھ دیں کہ ان کو کتنے عرصہ بعد صاف کرنا ہوگا؟

جواب بلا تفریق مرد و زن چالیس دن کی مدت کے اندر اندر حسبِ ضرورت زیرِ ناف بالوں کو مونڈنا یا صاف کرنا چاہیے۔ اس کے بعد تساہل کرنے والے کا فعل سنت کے خلاف شمار ہوگا۔ امام شوکانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: صفائی کا جونسا طریقہ اختیار کر لیا جائے گا درست ہے۔ چاہے مونڈنا یا کاٹنا ہو یا اکھیڑنا یا پاؤڈر وغیرہ کا استعمال۔ البتہ امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ مونڈنا افضل ہے۔ غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ نصِ حدیث (حدیث کے الفاظ) میں لفظ حلق (مونڈنا) استعمال ہوا ہے۔ لہٰذا حتی المقدور مونڈنے کو اختیار کرنا چاہیے۔

---

[1] صحيح مسلم، بَابُ خِصَالِ الفِطرَةِ، رقم: ٢٥٨، سنن ابن ماجه، بَابُ الفِطرَةِ، رقم: ٢٩٥

[2] نيل الأوطار: ١/١٢٥

طبی طور پر بھی اس میں کئی فوائد اربابِ فن (اطباء) کے ہاں مقرر ہیں۔ جب کہ دیگر بعض طریقوں میں قوتِ باہ کے مانند (مردانہ قوت کمزور) پڑنے کا اندیشہ ہے۔

بالوں کے محل کی صفائی کے بارے میں حدیث میں لفظ "العانة" وارد ہوا ہے۔ اس کی تشریح میں امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: « اَلمُرَادُ بِالعَانَةِ: اَلشَّعرُ فَوقَ ذَکَرِ الرَّجُلِ، وَ حَوَالَیهِ۔ وَ کَذٰلِكَ الشَّعرُ الَّذِی حَولَ فَرجِ المَرأَةِ.»[1]

یعنی عانہ سے مراد وہ بال ہیں جو مرد کے عضوِ تناسل کے اوپر اوراس کے گرد ہوتے ہیں۔ اسی طرح عورت کی شرمگاہ کے وہ بال جواس کے اردگرد ہیں۔

ابو العباس بن سریج رحمہ اللہ کا کہنا ہے کہ "العانة" وہ بال ہیں جو پُشت پر اُگتے ہیں۔ امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اس حدیث کے مجموعے کا ماحصل یہ ہے کہ وہ بال جو ''قُبُل'' اور ''دُبر'' کے اوپر اور اردگرد اُگتے ہیں، اُن تمام کا مونڈنا مستحب ہے۔

جواباً: امام شوکانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: لفظ "إستحداد" سے مقصود اگر "العانة" کا مونڈنا ہے جس طرح کہ نووی رحمہ اللہ نے بیان کیا ہے تو اس صورت میں اس بات کی دلیل نہیں ہوگی کہ ''دُبر'' پر اُگے بالوں کو مونڈنا بھی سنت ہے۔ اگر چہ حلق (مونڈنا) بذریعہ اُسترا ہی کیوں نہ ہو، جس طرح کہ ''قاموس'' میں ہے۔ بلا ریب لفظ "إستحداد" لفظ "العانة" سے زیادہ عام ہے۔ لیکن صحیح مسلم وغیرہ کی حدیث "عَشرٌ مِّنَ الفِطرَةِ" میں "إستحداد" کے بجائے "حلق العانة" کے لفظ وارد ہیں۔ اس سے مطلق "إستحداد" کی وضاحت ہوگئی جو حدیث "خَمسٌ مِن الفطرة" میں ہے۔ بہر صورت یہ کہنا کہ ''دُبُر'' کے بالوں کا حلق سنت یا مستحب ہے، دعویٰ بلا دلیل ہے۔ نبی ﷺ کے فعل یا کسی ایک صحابی کے عمل سے معلوم نہیں ہو سکا کہ انھوں نے ''دُبُر'' کے بالوں کو مونڈا ہو۔ نیل الأوطار (١/ ١٢٤)

فوقیت (بہتری) کے اعتبار سے جو حکم زیرِ ناف کے بالوں کا ہے وہی بغلوں کے بالوں کا بھی ہے۔ یعنی وقفہ چالیس یوم سے زائد نہیں ہونا چاہیے۔ دونوں چیزوں کا تذکرہ ایک ہی حدیث میں ہے، تاہم دونوں میں فرق یہ ہے کہ حدیث میں زیرِ ناف کے بالوں کو مونڈنے کی تصریح (وضاحت) ہے، جب کہ بغلوں کے بالوں کو اکھیڑنے کی نص وارد (موجود) ہے۔ لہٰذا بغلوں کے بال اکھیڑنے کا اہتمام ہونا چاہیے۔ بأمرِ مجبوری ''حلق'' بھی ممکن ہے، اس لیے کہ مقصود صفائی کا حصول ہے۔

---

[1] نیل الأوطار: ١/ ١٢٣

یونس بن عبدالاعلی رحمہ اللہ کا بیان ہے:

« دَخَلتُ إِلَى الشَّافِعِيّ رَحِمَهُ اللّٰه، وَ عِندَهُ المُزِينُ يَحلِقُ إِبطَهُ . فَقَالَ الشَّافِعِيُّ: عَلِمتُ أَنَّ السُّنَّةَ النَّتفُ، وَلٰكِن لَا أَقوىٰ عَلَى الوَجعِ.» ①

اگر کوئی زیر ناف بال چالیس دن کے اندر نہ اتار سکے تو؟

سوال زیر ناف بال اگر کوئی چالیس دن کے اندر نہ اتار سکے تو اس کا کفارہ کیا ہے؟

جواب کوتاہی پر اللہ رب العزت کی بارگاہ میں معافی کی درخواست ضروری کرنی چاہیے۔ اس کے علاوہ کوئی کفارہ نہیں۔

زیر ناف بال مونڈنے کتنی تاخیر کی جا سکتی ہے، اور ان کی مقدار کہاں تک ہے؟

سوال کیا حکم ہے قرآن وحدیث وسنت رسول اللہ ﷺ کا اس مسئلہ کے اندر کہ زیر ناف بال مونڈنا واجب ہیں یا سنت اور ان کے مونڈنے میں کتنی تاخیر کی جا سکتی ہے، اور ان کی مقدار کہاں تک ہے؟ بعض لوگ ناف سے شروع کر کے گھٹنوں تک مونڈتے ہیں۔ کیا اس طرح کرنا صحیح ہے؟ اگر نہیں تو پھر سنتِ مصطفیٰ ﷺ کی روشنی میں باحوالہ جواب مرحمت فرمائیں۔

جواب نیل الأوطار میں ہے « وَ هُوَ سُنَّة بالإتفاق» (١/١٢٣)

یعنی ''زیرِ ناف بال مونڈنا بالاتفاق سنت ہے۔'' ②

بال مونڈنے میں چالیس روز تک تاخیر ہو سکتی ہے۔ حدیث میں ہے:

« أن لَا نَترُكَ أَكثَرَ مِن أَربَعِينَ لَيلَةً. » ③

امام نووی فرماتے ہیں:

« مَعنَاهُ: تَركًا نَتجَاوَزُ بِهِ أَربَعِينَ، لِأَنَّهُ وُقِّتَ لَهُم التَّركُ أَربَعِينَ. قَالَ: وَالمُختَارُ أَنَّهُ يُضبَطُ بِالحَاجَةِ وَالطُّولِ فَإِذَا طَالَ حَلَقَ. اِنتَهٰى . قُلتُ : بَلِ المُختَارُ أَنَّهُ يَضبَطُ بِالاَربَعِينَ الَّتِى ضَبَطَ بِهَا رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ فَلَا يَجُوزُ تَجَاوُزُهَا وَ لَا يُعَدُّ، مُخَالِفًا لِلسُّنَّةِ مِن تَركِ القَصِّ، وَ نَحوِهِ، بُعدَ الطُّولِ إِلَى اِنتِهَاءِ تِلكَ الغَايَةِ .» ④

① نیل الاوطار: ١/١٢٤ ② تیسیر العلام: ١/ ٦٩

③ صحیح مسلم، بَابُ خِصَالِ الفِطرَةِ، رقم: ٢٥٨

④ نیل الأوطار: ١/ ١٢٥

مرد اور عورت کے مخصوص مقام کے اوپر اور اس کے اردگرد سے بال مونڈنے چاہئیں۔ امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: « اَلْمُرَادُ بِالعَانَةِ: الشَّعرَ فَوقَ الذَّکَرِ، وَ حَوَالِیهِ، وَ کَذَالِكَ الشَّعرُ الَّذِی حَولَ فَرجِ المَرأَةِ. » اس کے علاوہ سنت سے ثابت نہیں۔

زیر ناف بال مونڈنے کی مدت اور حد بندی؟

(سوال) زیر ناف بال مونڈنا واجب ہیں یا سنت؟ اور ان کے مونڈنے میں کتنی تاخیر کی جاسکتی ہے اور ان کی مقدار کہاں تک ہے؟ (محمد صفدر محمدی، فیصل آباد)

(جواب) الجواب بعون الوہاب: نیل الاوطار میں ہے: وهو سنة بالاتفاق (۱/۱۲۳)

یعنی زیر ناف بال مونڈنا بالاتفاق سنت ہے۔ [1] بال مونڈنے میں چالیس روز تک تاخیر ہوسکتی ہے۔ حدیث میں ہے: « أَن لَّا نَترُكَ أَكثَرَ مِن أَربَعِينَ لَيلَةً. » [2]

امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

معناه تركا لانتجاوز به اربعين لا انه وقت لهم الترك اربعين قال والمختار انه يضبط بالحاجة والطول فإذا طال حلق، انتهى۔ قلت بل المختار انه يضبط بالاربعين التى ضبط بها رسول الله ﷺ فلا يجوز تجاوزها ولا يعد مخالفا للسنة من تركه القص ونحوه بعد الطول إلى انتهاء تلك الغاية [3]

اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ ہمیں چالیس دن سے زیادہ تاخیر نہیں کرنا چاہیے، اس کا یہ مطلب نہیں کہ آپ نے چالیس دن کی میعاد مقرر کر دی ہے۔

اُنہوں نے کہا کہ راجح بات یہ ہے کہ یہ معاملہ انسانی ضرورت اور بالوں کی طوالت پر منحصر ہے، جب زیادہ لمبے ہو جائیں تو منڈوا دینا چاہیے، میرے (شوکانی رحمہ اللہ) خیال میں راجح بات یہ ہے کہ چالیس دن کی حد متعین ہے جس کو رسول اللہ ﷺ نے مقرر فرما دیا ہے، لہٰذا اس سے تجاوز کرنا درست نہیں ہے، اگر کوئی شخص بال زیادہ لمبے ہو جانے کے باوجود عرصہ چالیس دن تک تاخیر کر لیتا ہے تو وہ مخالفِ سنت شمار نہیں ہوتا۔''

مرد اور عورت کو مخصوص مقام کے اوپر اور اس کے اردگرد سے بال مونڈنے چاہئیں۔

امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

---

[1] تیسیر العلام: ۱/ ۶۹
[2] صحیح مسلم، بَابُ خِصَالِ الفِطرَةِ، رقم: ۲۵۸، سنن ابن ماجه، بَابُ الفِطرَةِ، رقم: ۲۹۵
[3] نیل الاوطار: ۱/ ۱۲۵

«المراد بالعانة:الشعر فوق الذكر وحواليه وكذلك الشعر الذى حول فرج المراة »

''اس سے مراد وہ بال ہیں جو مرد کے عضو کے اوپر اور اس کے ارد گرد ہیں، ایسے ہی وہ بال جو عورت کی شرمگاہ کے اردگرد ہوں۔'' اس کے علاوہ بال مونڈنا شریعت میں ثابت نہیں۔

زیرناف بالوں کی صفائی کے لیے حداور مدت نیز معذور اور مریض شخص کیا کرے؟

سوال شرعاً حکم ہے کہ زیرِ ناف بال ایک ماہ کے اندر اندر ہر ماہ صاف کیے جائیں۔ اس میں تشریح طلب درج ذیل مسائل ہیں مہربانی فرما کر ازروئے شریعت وضاحت فرمادیں۔

۱۔ زیرِ ناف سے مراد ہے کہ بال ٹھیک ناف سے لے کر خادوں سے نیچے تک کا حصہ صاف کیا جائے۔ کیا خادوں کے بال بھی صاف ہوں۔ زیرِ ناف کی عملاً حد کیا ہوگی؟

۲۔ ایک بوڑھا آدمی جس کے ہاتھ کانپتے ہوں۔ خطرہ ہے کہ وہ صفائی کرتے وقت زخم لگا بیٹھے گا۔ اس کی بابت کیا حکم ہے؟

۳۔ شوگر کا مریض ہے۔ خدانخواستہ صفائی سے زخم لگا بیٹھتا ہے اس کی بابت شرعاً کیا حکم ہوگا؟

۴۔ کتنے عرصہ کے اندر بالوں کی صفائی ضروری ہے؟

جواب صحیح احادیث میں زیرِ ناف بالوں کی صفائی کو پیدائشی سُنتوں میں سے شمار کیا گیا ہے۔ روایات میں اس کے لیے لفظ ''الإستحداد'' (لوہے کو استعمال کرنا یعنی استرا یا سیفٹی وغیرہ) اور ''العانة'' وارد ہوا ہے۔ امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں ''العانة'' سے مراد وہ بال ہیں جو آدمی کے آلۂ تناسل کے اُوپر اور اس کے گرد ہوتے ہیں۔ اور اسی طرح وہ بال جو عورت کی شرمگاہ پر ہوتے ہیں۔ ابن سریج نے کہا ہے کہ یہ وہ بال ہیں جو انسانی حلقہ دُبر پر اُگتے ہیں۔ امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اس کا ماحصل یہ ہے کہ قُبل اور دُبُر اور ان کے گرد بالوں کو مونڈنا مستحب ہے۔ علامہ شوکانی رحمہ اللہ کا کہنا ہے کہ اگر استحداد بمعنیٰ ''العانہ'' ہو جس طرح کہ نووی نے کہا ہے تو بایں صورت دُبر پر اُگنے والے بالوں کو مونڈنے کی سنیت ثابت نہیں ہوتی۔ اگرچہ لوہا سے مونڈنا ''حلق العانہ'' سے عام ہے جس طرح ''قاموس'' میں ہے، لیکن صحیح مسلم وغیرہ میں ''الإستحداد'' کے بجائے حدیث ''دس چیزیں فطرت سے ہیں۔'' میں ''حَلقُ العَانة'' کو شمار کیا گیا ہے۔ اس سے إستحداد کے اس اطلاق کی وضاحت ہوتی ہے جو حدیث ''پانچ چیزیں فطرت سے ہیں'' میں وارد ہے۔ اس سے اس دعویٰ کی صداقت ظاہر نہیں ہوتی کہ دُبر کے بال مونڈنے سنت ہیں یا مستحب ہیں، الا یہ کہ وہاں کوئی دلیل ہو۔

ہمیں اس بات کا علم نہیں ہوسکا کہ نبی ﷺ یا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے کسی نے دُبر کے بال مونڈے ہوں۔ نیل الأوطار (۱/۱۲۳۔۱۲۴) اس تشریح سے واضح ہوگیا کہ خادوں اور خصیتین وغیرہ پر موجود بالوں کو بھی صاف کرنا چاہیے۔البتہ ناف کے نیچے کی متصل حد شاید اس میں شامل نہ ہو۔

۲۔ بوڑھا یا کمزور آدمی جس کے ہاتھ کانپتے ہوں ان کے لیے یہ ہے کہ وہ پوڈر وغیرہ استعمال کر سکتے ہیں۔ امام نووی رحمہ اللہ نے اس کے جواز کی تصریح کی ہے۔

۳۔ شوگر کا مریض بھی پوڈر کو استعمال میں لائے۔ امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اسی طرح بال کترے یا اکھاڑے بھی جاسکتے ہیں اگرچہ افضل مونڈنا ہے۔

۴۔ زیرِ ناف بالوں کی صفائی کا وقفہ چالیس دن سے زیادہ نہیں ہونا چاہیے۔اس سے پہلے حسبِ ضرورت صفائی ہوسکتی ہے۔حدیث میں ہے: «أَن لَّا نَترُكَ أَكثَرَ مِن أَربَعِينَ لَيلَةً.»[1]

زیرناف بال کہاں سے کہاں تک اتارے جائیں؟

سوال بال ناف کے انتہائی نیچے سے اتارے جائیں گے یا کچھ جگہ چھوڑ کر، نیز بال اتارنے کی حد کیا ہے یعنی کہاں سے کہاں تک اتارے جائیں گے؟

جواب بال شرمگاہ کے اُوپر اور قرب وجوار سے اتارنے کی بھی اجازت ہے۔حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

« فَحَصَلَ مِن مَجمُوعِ هٰذَا، اِستِحبَابُ حَلقِ جَمِيعِ مَا عَلَى القُبُلِ وَالدُّبُرِ وَحَولِهِمَا.»[2]

”یعنی مجموعہ دلائل کا خلاصہ یہ ہے کہ قُبل اور دُبر (یعنی آگے اور پیچھے) دونوں (طرف) سے (مکمل) بال صاف کرنا مستحب ہے۔“

زیرناف بالوں کی صفائی کی حدود کیا ہیں؟

سوال زیرناف بالوں کی صفائی کا کیا حکم ہے؟ بال کہاں تک صاف کرنے چاہییں؟ کیا فضلہ کے مخرج کے گرد بال صاف کرنے جائز ہیں؟

جواب زیرناف بالوں کا صاف کرنا ضروری ہے،شرمگاہ کے اوپر اور قرب وجوار سے صفائی کی جائے،اسی طرح عورت کی شرم گاہ کے گرد بالوں کی صفائی بھی ضروری ہے۔امام نووی فرماتے ہیں: آگے پیچھے اور ان

---

[1] صحيح مسلم،بَابُ خِصَالِ الفِطرَةِ، رقم:٢٥٨،سنن ابن ماجه،بَابُ الفِطرَةِ،رقم:٢٩٥

[2] فتح الباری:١٠/٣٤٣

کے گرد صفائی کرنا مستحب ہے۔ اسی طرح فتح الباری میں ہے: دُبر کے گرد بالوں کو صاف کرنا جائز ہے۔(۳۴۳/۱۰)

لیکن امام شوکانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: دبر کے بالوں کی صفائی سنت سے ثابت نہیں۔(تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: نیل الاوطار:۱/۱۲۴)

زیر ناف بال اتارتے وقت اگر کہیں بال رہ جائیں تو اس کا کفارہ دینا پڑے گا؟

سوال اگر زیرِ ناف بال اتارتے وقت کوشش کے باوجود کوئی بال رہ جائے تو کیا اس کا کوئی کفارہ ہے؟

جواب صرف توبہ واستغفار کافی ہے۔

کیا زیر ناف بالوں کی صفائی کے بعد نہانا یا غسل کرنا فرض ہے؟

سوال کیا موئے زیرِ ناف اتارنے کے بعد نہانا یا غسل کرنا فرض ہے؟ یہ بات ہمارے گاؤں میں عام ہوگئی ہے۔شریعتِ اسلامیہ کے مطابق اس کی تھوڑی سی تفصیل اور اس کی آخری حد بیان کردیں۔

جواب بایں صورت غسل کرنا نہ فرض ہے نہ واجب۔ کیونکہ فعل ہذا کا شمار غسل کے واجبات میں نہیں۔ یہ آدمی کی مرضی پر منحصر ہے جیسا مناسب سمجھے کرسکتا ہے۔موئے زیرِ ناف اتارنے کی آخری حد چالیس دن ہے۔

کیا عورت بغلوں اور زیر ناف بال اُسترے سے صاف کرسکتی ہے؟

سوال عورت کے لیے بغلوں اور زیرِ ناف بالوں کو استرے سے صاف کرنا کیا جائز ہے اور کم از کم کتنی مدت کے بعد صاف کرنا ضروری ہے؟

جواب زیرِ ناف بالوں کی صفائی کے لیے عورت اُسترا استعمال کرسکتی ہے۔حدیث میں ہے:

«وَتَستَحِدُّ المُغِيبَةُ.» [1]

''جس عورت کا شوہر غیر حاضر ہے،اور اس کے سفر سے آنے کی امید ہے وہ اُسترا استعمال کرے۔''

دوسری حدیث میں ہے کہ پانچ خصلتیں فطرت سے ہیں۔ ان سے ایک ''الاِستحداد'' (لوہا استعمال کرنا) ہے۔ امام شوکانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ زیرِ ناف بالوں کی صفائی کے لیے لوہے (یعنی استرا وغیرہ) کو استعمال کرنا بالاِ تفاق سنت ہے۔ البتہ بالوں کو اکھاڑنا، پاؤڈر استعمال کرنا اور انہیں کترانا سب درست ہے۔

---

[1] صحیح البخاری ،بَابُ طَلَبِ الوَلَدِ،رقم:٥٢٤٥

امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ افضل یہ ہے کہ بالوں کو مونڈا جائے، خواہ مرد ہو یا عورت۔ (نیل الأوطار: ۱/۱۲۳)

بال مونڈنے کا وقفہ چالیس روز سے زیادہ نہیں ہونا چاہیے۔ اس سے پہلے جب ضرورت محسوس ہو کہ بال بڑھنے لگے ہیں تو حسبِ حاجت ان کو مونڈ دینا چاہیے حدیث میں ہے:

« أَن لَّا نَترُكُ اَكثَرَ مِن اَربَعِينَ لَيلَةً.» (نیل الأوطار: ۱/ ۱۲۵ ـ بحوالہ احمد، الترمذی، النسائی، ابوداؤد) ①

بغلوں کے بالوں میں اصل یہ ہے کہ ان کو اکھاڑا جائے کیونکہ حدیث میں لفظ ''نتف الإبط'' آیا ہے اور اگر یہ ممکن نہ ہو تو مونڈنا بھی جائز ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ مونڈا کرتے تھے، ان سے سوال ہوا کہ سنت تو اکھاڑنا ہے۔ جواباً فرمایا: « لٰكِن لَا اَقوٰى عَلَى الوَجَعِ.» یعنی تکلیف کی وجہ سے میں اکھاڑ نہیں سکتا۔ ②

کیا عورت کو زیرِ ناف صفائی کے لیے لوہے کی چیز (اُسترا وغیرہ) استعمال کرسکتی ہے؟

سوال عورت کو زیرِ ناف صفائی کے لیے لوہے کی چیز (اُسترا وغیرہ) استعمال کرنا جائز ہے؟

جواب زیرِ ناف بالوں کی صفائی کے لیے لوہے کی چیز اُسترے وغیرہ کا استعمال کرسکتی ہے بلکہ اصل یہی ہے۔ حدیث میں ہے: « وَ تَستَحِدُّ المَغِيبَةُ.» ②

مصنوعی اشیاء پوڈر کا استعمال بسا اوقات نقصان کا سبب بن جاتا ہے، مگر اس کے جواز میں شک نہیں۔

سوال کیا عورت لوہے کی چیز بلیڈ یا استرا زیرِ ناف بالوں کے لیے استعمال کرسکتی ہے؟ «حَلقُ العَانَةِ» اور «اَلاِستِحدَاد» کی روشنی میں وضاحت فرمائیں۔

جواب حافظ ابن حجر رحمہ اللہ اَلاستِحدَاد کی تشریح میں رقمطراز ہیں:

« اَلمُرَادُ بِهِ اِستِعمَالُ المُوسٰى فِي حَلقِ الشَّعرِ مِن مَكَانٍ مَخصُوصٍ مِنَ الجَسدِ.» ④

یعنی جسم کے مخصوص مقام سے بالوں کی صفائی کے لیے استرا استعمال کرنا مراد ہے۔

اور نسائی کی روایت میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ اور انس رضی اللہ عنہ کی حدیث میں اس کی تعبیر «حَلقُ العَانَةِ،

---

① صحیح مسلم، بَابُ خِصَالِ الفِطرَةِ، رقم: ۲۵۸، سنن ابن ماجہ، بَابُ الفِطرَةِ، رقم: ۲۹۵، سنن النسائی، التَّوقِيتُ فِي ذٰلِكَ، رقم: ۱٤

② نیل الأوطار: ۱/ ۱۲٤

③ صحیح البخاری، بَابُ تَستَحِدُّ المُغِيبَةُ وَتَمتَشِطُ الشَّعِثَةُ، رقم: ۵۲٤۷

④ فتح الباری: ۱۰/ ۳٤۳

(زیرناف بال مونڈنا) کے ساتھ کی گئی ہے۔ نیز ''صحیح مسلم'' میں حضرت عائشہ اور انس رضی اللہ عنہما کی روایات میں بھی ایسی ہی تعبیر ہے۔ امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

« اَلْمُرَادُ بِالْعَانَةِ: الشَّعرُ الَّذِی فَوقَ ذَکَرِ الرَّجُلِ وَ حَوَالَیهِ ، وَ کَذَا الشَّعرُ الَّذِی حَوَالَی فَرجِ المَرأَةِ .»

یعنی «اَلْعَانَةُ» سے مراد وہ بال ہیں جو مرد کے ذکر (شرم گاہ) کے گرد ہوتے ہیں، اور اس طرح وہ بال جو عورت کی شرمگاہ کے گرد ہوتے ہیں۔ ان پر بھی «اَلْعَانَةِ» کا اطلاق ہوتا ہے۔ امام نووی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ «شَعرُ العَانَةِ» کے بارے میں مرد اور عورت کے لیے صفائی کا مسنون طریقہ یہ ہے کہ بالوں کو استرے سے مونڈھا جائے۔ چنانچہ صحیح حدیث میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رات کے وقت سفر سے واپس عورتوں کے پاس مت آؤ۔ یہاں تک کہ پراگندہ حالت والی کنگھی کرلے اور شوہر کو غیر حاضر پانے والی زیرِ ناف بال صاف کرلے۔ اصل سنت ہر اس چیز سے ادا ہو جائے گی جس سے بالوں کی صفائی حاصل ہو جائے۔ مطلب یہ ہے کہ لوہے اور غیر لوہے سب کا استعمال جائز ہے۔ بشرطیکہ صفائی حاصل ہو جائے کیونکہ اصل مقصد یہی ہے آلات کو محض ثانوی حیثیت حاصل ہے۔

عورت کا لوہے کی چیز بلیڈ یا استرا زیرِ ناف بالوں کے لیے استعمال کرنا:

سوال کیا عورت لوہے کی چیز بلیڈ یا استرا زیرِ ناف بالوں کے لیے استعمال کرسکتی ہے؟ «حَلقُ العَانَةِ» اور «اَلاِستِحدَاد» کی روشنی میں وضاحت فرمائیں۔

جواب حافظ ابن حجر رحمہ اللہ اَلاِستِحدَاد کی تشریح میں رقمطراز ہیں:

« اَلْمُرَادُ بِهِ اِستِعمَالُ المُوسٰی فِی حَلقِ الشَّعرِ مِن مَکَانٍ مَخصُوصٍ مِنَ الجَسدِ.»[1]

یعنی جسم کے مخصوص مقام سے بالوں کی صفائی کے لیے استرا استعمال کرنا مراد ہے۔

اور نسائی کی روایت میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ اور انس رضی اللہ عنہ کی حدیث میں اس کی تعبیر «حَلقُ العَانَةِ» (زیرناف بال مونڈنا) کے ساتھ کی گئی ہے۔ نیز ''صحیح مسلم'' میں حضرت عائشہ اور انس رضی اللہ عنہما کی روایات میں بھی ایسی ہی تعبیر ہے۔ امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: « اَلْمُرَادُ بِالْعَانَةِ: الشَّعرُ الَّذِی فَوقَ ذَکَرِ الرَّجُلِ وَ حَوَالَیهِ ، وَ کَذَا الشَّعرُ الَّذِی حَوَالَی فَرجِ المَرأَةِ .»

[1] فتح الباری: ۱۰/۳۴۳

یعنی اَلعَانَةُ سے مراد وہ بال ہیں جو مرد کے ذکر (شرم گاہ) کے گرد ہوتے ہیں، اور اس طرح وہ بال جو عورت کی شرمگاہ کے گرد ہوتے ہیں۔"

ان پر بھی اَلعَانَةِ کا اطلاق ہوتا ہے۔ امام نووی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ «شَعرُ العَانَةِ» کے بارے میں مرد اور عورت کے لیے صفائی کا مسنون طریقہ یہ ہے کہ بالوں کو استرے سے مونڈھا جائے۔ چنانچہ صحیح حدیث میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رات کے وقت سفر سے واپس عورتوں کے پاس مت آؤ۔ یہاں تک کہ پراگندہ حالت والی کنگھی کر لے اور شوہر کو غیر حاضر پانے والی زیرِ ناف بال صاف کر لے۔ اصل سنت ہر اس چیز سے ادا ہو جائے گی جس سے بالوں کی صفائی حاصل ہو جائے۔ مطلب یہ ہے کہ لوہے اور غیر لوہے سب کا استعمال جائز ہے۔ بشرطیکہ صفائی حاصل ہو جائے کیونکہ اصل مقصد یہی ہے: آلات کو محض ثانوی حیثیت حاصل ہے۔

بیت الخلا اور قضائے حاجت کے متعلق احکام و مسائل

جب اذان ہو رہی ہو تو قضائے حاجت کے لیے ننگے سر یا ننگے پاؤں جانا کیسا ہے؟

سوال جب اذان ہو رہی ہو تو قضائے حاجت کے لیے جا سکتے ہیں کہ نہیں اور ننگے سر اور ننگے پاؤں جانا جائز ہے کہ نہیں؟

جواب قضائے حاجت کی خاطر جب نماز کو مؤخر کیا جا سکتا ہے، تو بوقتِ اذان بیت الخلاء جانے میں بھی کوئی حرج نہیں۔

دراصل یہ ہر آدمی کی ایک اضطراری حالت ہے جس کے لیے کوئی وقت مقرر نہیں۔ «سُبحَانَ مَن تَنَزَّهَ عَنِ العَجزِ» نیز محل نجاست ننگے پاؤں جانے سے احتیاط کرنا چاہیے، کیونکہ طہارت و پاکیزگی عبادت کی قبولیت میں اوّلین شرط ہے۔ اور جہاں تک تعلق ہے ایسے مقامات میں ننگے سر جانے کا، سو اس میں کوئی حرج معلوم نہیں ہوتا۔ واللہ اعلم بالصواب۔

اذان کے دوران بیت الخلا یا استنجا خانہ جانے کا کیا حکم ہے؟

سوال اذان کے دوران بیت الخلا جانے کا کیا حکم ہے؟ جبکہ اذان کے کلمات کا جواب بھی دینا ہو اور اگر انتظار کرے تو بیت الخلا اور وضو سے فراغت تک جماعت گذر جانے کا ڈر ہو، خصوصاً نمازِ مغرب میں؟

جواب دورانِ اذان آدمی بیت الخلا میں جا سکتا ہے لیکن وہاں اذان کا جواب دینا منع ہے کیونکہ نجس مقام ہے۔ایسی حالت میں تو نماز مؤخر ہو جاتی ہے چہ جائیکہ آدمی اذان کا جواب دینے کیلئے رُکا رہے۔

کیا بیت الخلا سَر ڈھانپ کر جانا سنت سے ثابت ہے؟

سوال کیا یہ سنت سے ثابت ہے کہ بیت الخلا سَر ڈھانپ کر جانا چاہیے؟

جواب سر ڈھانپ کر بیت الخلاء جانا سنت سے ثابت نہیں۔''مغنی ابن قدامہ'' کی طرف رجوع فرمائیں!

کیا خواتین کے لیے ضروری ہے کہ بیت الخلاء جاتے ہوئے سَر ڈھانپ کر جائیں؟

سوال خواتین جب لیٹرین جائیں تو کیا سَر ڈھانپ کر جانا ضروری ہے؟

جواب حدیث «اَلْمَرأَةُ عَورَةٌ»[1] ''عورت پردہ ہے۔'' کا تقاضا ہے کہ ہر وقت حتی المقدور پردے کا اہتمام کیا جائے۔

فقیہ ابن قدامہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''قضائے حاجت کے آداب سے ہے کہ آدمی سَر ڈھانپ کر حاجت والی جگہ میں داخل ہو۔ یہ بات حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ موجودہ حالت چونکہ سَتر کو کھولنے کی ہے۔حیاء کا تقاضا ہے کہ سَر ڈھانپا ہو۔''[2]

مشترکہ غسل خانہ اور بیت الخلاء میں وضوء کا کیا حکم ہے؟

سوال ماہنامہ محدث مارچ ۲۰۰۰ء میں آپ کا ایک فتویٰ شائع ہوا ہے جو مشترکہ غسل خانہ اور بیت الخلاء میں وضو کے متعلق ہے۔آپ کے ارشاد کردہ جواب کی روشنی میں مندرجہ ذیل امور کے متعلق مزید رہنمائی درکار ہے۔

۱۔ ایسے غسل خانے میں بیت الخلاء کے دخول کی دعاء کہاں پڑھی جائے گی اور اسی طرح بیت الخلاء سے نکلنے کی دعاء کہاں ہو گی؟

۲۔ ایسے وقت میں ایک آدمی وضو یا غسل میں مصروف ہو اور اسے حاجت پیش آجائے تو پھر دعاء کہاں پڑھے گا اور اس سے فراغت کے بعد وضو کے لیے بسم اللہ کہاں پڑھے گا؟

۳۔ کیا دل میں بسم اللہ یا ادعیہ ماثورہ پڑھ لینے سے ''عمل'' مرتب ہو گا؟ اور کیا ان کا زبان سے پڑھنا

---

[1] سنن الترمذی، ، رقم:۱۱۷۳ ، باسناد صحیح ، صحیح ابن خزیمہ ، بَابُ اخْتِیَارِ صَلَاةِ الْمَرْأَةِ فِی بَیْتِهَا عَلَی صَلَاتِهَا فِی الْمَسْجِدِ......الخ ، رقم:۱٦۸۵

[2] المغنی:۱/۲۲٦

مسنون نہیں اور اگر دل میں پڑھ لینا کافی ہے تو اس کی دلیل ضرور ارشاد فرمائیں۔

(جواب) بیت الخلاء سے باہر نکل کر دعاء پڑھ لے پھر داخل ہو کر وضو کرے اور بیت الخلاء سے فراغت کی دعاء بھی باہر آ کر پڑھے یا پھر دل ہی دل میں پڑھ لے۔

۲۔ ایسی اضطراری حالت میں بھی دعاء باہر آ کر پڑھے اور حاجت سے فراغت کے بعد باہر آ کر وضو کے لیے ''بسم اللہ'' پڑھ کر پھر داخل ہو جائے۔

۳۔ دل کا مصمم ارادہ شریعت میں قابلِ اعتبار سمجھا گیا ہے، اور اس پر جزاء مرتب ہوتی ہے۔ قرآن میں ہے: ﴿اِنَّ الَّذِینَ یُحِبُّونَ اَن تَشِیعَ الفَاحِشَةَ﴾ (النور:۱۹) دوسری جگہ ہے: ﴿اِجتَنِبُوا کَثِیرًا مِّنَ الظَّنِّ﴾ (الحجرات:۱۲) تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو! فتح الباری (۱۱/ ۳۲۷)

زبان سے پڑھنا اس وقت مسنون ہے جب آدمی پاکیزہ مقام پر ہو۔

مشترکہ غسل خانہ اور بیت الخلاء میں بسم اللہ پڑھنے کا حکم:

(سوال) موجودہ رہائشی مکانوں میں جو غسل خانہ اور بیت الخلاء مشترکہ بنائے جاتے ہیں، بظاہر بیت الخلاء صاف ستھرے نظر آتے ہیں کیا ان بیت الخلاء والے غسل خانوں میں وضو کیا جا سکتا ہے؟ اگر جواب اثبات میں ہو تو بسم اللہ پڑھنے کا کیا حکم ہے؟

(جواب) مشترکہ غسل خانہ اور بیت الخلاء میں وضو کرنا جائز ہے، لیکن وہاں ''بسم اللہ'' نہیں پڑھنی چاہیے۔ داخل ہونے سے پہلے بہ نیت وضو بسم اللہ پڑھ لے یا قضائے حاجت سے فراغت کے بعد باہر آ جائے اور بسم اللہ پڑھ کے واپس جا کر وضو کرے۔ سعودی عرب کے شیخ ابن عثیمین کا فتویٰ ہے کہ دل میں پڑھ لے بہ آوازِ بلند نہ پڑھے۔ فرماتے ہیں:

«اَلتَّسمِیَّةُ اِذَا کَانَ الاِنسَانُ فِی الحَمَّامِ تَکُونُ بِقَلبِہٖ، وَ لَا یَنطِقُ بِھَا بِلِسَانِہٖ.»[1]

''جب انسان بیت الخلاء میں ہو تو بسم اللہ دل میں ہی پڑھے، زبان سے اس کو ادا نہ کرے۔''

(سوال) موجودہ دور میں بیت الخلاء اور غسل خانہ اکٹھے ہی بنائے جاتے ہیں، اسی میں رفعِ حاجت کے بعد وہیں پر وضو کرنا یا غسلِ جنابت کرنا ہو تو کیا ''بسم اللہ'' پڑھنا ہوگی جب کہ وہیں پر بیت الخلاء بھی ہے؟

(جواب) بایں صورت بیت الخلاء میں داخل ہونے سے پہلے ''بسم اللہ'' پڑھے لے یا پھر وضو کرنے سے پہلے

---

[1] فتاویٰ اسلامیہ: ۱/ ۲۱۹

باہر آکر ''بسم اللہ'' پڑھ کر واپس چلا جائے یا دل ہی دل میں پڑھ لے۔ سب صورتوں کا بالترتیب جواز معلوم ہوتا ہے۔ اصل اسلامی طریقہ کار یہ ہے کہ دونوں مقاموں کو جدا جدا بنایا جائے۔ قصہ ابن عباس رضی اللہ عنہما ''وَضعُ المَاءِ عِندَ الخَلَاءِ'' میں اس امر کی واضح دلیل ہے۔ مروجہ ہیئت (حالت) استعماری سازش ہے، جس سے اجتناب کی فکر کرنی چاہیے۔

بیت الخلاء کے لیے دعا داخلے سے پہلے یا حاجت کے لیے بیٹھتے وقت؟

سوال بیت الخلاء میں دعاء داخلہ سے پہلے پڑھنا ہوگی یا حاجت کے لیے بیٹھتے وقت زمین کے قریب پہنچ کر؟

جواب لیٹرین میں داخل ہونے سے پہلے دعاء پڑھی جائے۔ اور اگر آدمی کھلی فضا یا جنگل میں ہو تو کپڑا اٹھانے سے پہلے دعاء پڑھ لینی چاہیے۔

غسل خانے میں ننگا آدمی وضوء سے پہلے ''بسم اللہ'' یا وضو کے بعد کی دعا پڑھ سکتا ہے؟

سوال غسل کرتے وقت آدمی ننگا ہوتا ہے اس حالت میں وہ نماز کے لیے وضو کرتا ہے تو وضوء سے پہلے ''بسم اللہ'' پڑھ سکتا ہے؟ یا کپڑے اتارنے سے پہلے پڑھے جب کہ وہ جنبی ہوتا ہے؟ اسی طرح کلمہ شہادت اسی حالت میں پڑھ سکتا ہے یا کپڑے پہن کر پڑھے؟

جواب آدمی کو چاہیے کہ اس حالت میں حمام میں داخل ہونے سے پہلے ''بسم اللہ'' پڑھ لے فراغت کے بعد باہر آکر کلمہ شہادت پڑھ لے۔ جنابت کے وضوء سے ہی نماز پڑھی جا سکتی ہے بشرطیکہ بحالتِ غسل ہاتھ قُبل اور دبر پر نہ لگے۔ ورنہ دوبارہ وضو کرنا ہوگا۔

لیٹرین کا رخ کس طرف ہونا چاہیے؟

سوال میرے بھائیوں نے لیٹرین بنائی مستری نے اس کا رُخ شمالاً جنوباً کی بجائے شرقاً غرباً کر دیا، اگر منہ مشرق کی طرف کر کے بیٹھتے ہیں تو پیٹھ قبلہ کی طرف ہوتی ہے اور اگر منہ قبلہ کی طرف کرتے ہیں تو پیٹھ مشرق کی طرف۔ مستری نے کہا کہ شمال کی طرف چونکہ قطب ستارا ہے اس لیے اس طرف منہ یا پیٹھ کرنا گناہ ہے یہ لیٹرین چھت کے نیچے ہے کیا اسے گرا کر سمت درست کرنا ضروری ہے یا ایسے ہی جائز ہے؟

جواب مسئلہ ہذا میں اہل علم کا سخت اختلاف ہے۔ شارحینِ حدیث نے متعدد اقوال نقل کیے ہیں۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ، علامہ صنعانی اور علامہ سندھی رحمہما اللہ کا رجحان اس طرف ہے، کہ صحراء میں قضائے حاجت کے وقت استقبال (منہ کرنا) اور استدبار (پیٹھ کرنا) قبلہ مطلقاً ناجائز ہے اور غیر صحراء (عمارت/ لیٹرین) میں

مطلقاً جائز ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے بھی ''صحیح بخاری'' میں اسی مسلک کو اختیار کیا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

« بَابُ لَا تَستَقبِلُ القِبلَةَ بِغَائِطٍ اَو بَولٍ اِلَّا عِندَ البِنَاءِ جِدَارًا اَو نَحوَهُ.»

یہ استثناء ابن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث سے مستفاد ہے۔ ابن عمر رضی اللہ عنہما نے کہا کہ ایک روز میں حفصہ (رضی اللہ عنہا) کے گھر کی چھت پر چڑھا۔ دیکھتا ہوں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم بیت الخلاء میں دو اینٹوں پر بیٹھے ''بیت المقدس'' کی طرف رُخ کیے ہوئے تھے۔ ظاہر ہے کہ مدینہ کی طرف کے اعتبار سے اس وقت آپ کی پیٹھ کعبہ کی طرف تھی۔ [1]

اور جابر رضی اللہ عنہ کی روایت جو ''مسند احمد'' اور ''سنن ابی داؤد'' وغیرہ میں ہے، اس میں استقبال کے جواز کی تصریح ہے۔ اس طرح ممانعت اور جواز کے مختلف دلائل پر عمل بھی ہو جاتا ہے بجائے اس کے کہ ایک کو چھوڑ دیا جائے۔ راوی حدیث ابن عمر رضی اللہ عنہما کا اپنا عمل بھی اسی کے مطابق تھا۔

صاحب ''المرعاۃ'' اور کئی ایک علماء مطلقاً عدمِ جواز کے قائل ہیں۔ ان میں سے امام ابن حزم، ابن قیم، شوکانی، علامہ عبد الرحمٰن مبارک پوری رحمہم اللہ ہیں۔ مذکورہ بالا دلائل کی رو سے میرا رجحان پہلے مسلک کی طرف ہے۔ لہٰذا لیٹرین کا رُخ جو مشرق اور مغرب کی طرف بن گیا ہے اسے اپنی حالت پر رہنے دیں، بدلنے کی ضرورت نہیں۔ قطب تارے کا کوئی مسئلہ نہیں۔ یہ محض خرافات میں سے ہے۔ شرع میں اس کا کوئی اصل نہیں۔

کیا پاکٹ سائز قرآن مجید جیب میں رکھ کر بیت الخلاء جانا جائز ہے؟

سوال پاکٹ سائز قرآنِ پاک جیب میں رکھ کر کوئی شخص رفعِ حاجت کے لیے بیت الخلاء میں جا سکتا ہے یا نہیں؟

جواب قرآن مجید باہر رکھ کر بیت الخلاء میں داخل ہونا چاہیے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ذکر سے منقوش (جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا نام نقش تھا) انگوٹھی کو اتار کر بیت الخلاء میں داخل ہوتے۔ [2]

''سبل السلام'' کے مذکورہ صفحہ میں ہے:

« وَدَلِيلٌ عَلٰى تَبعِيدِ مَا فِيهِ ذِكرُ اللّٰهِ عِندَ قَضَاءِ الحَاجَةِ. وَ قَالَ بَعضُهُم : يَحرُمُ إِدخَالُ المُصحَفِ الخَلَاءَ لِغَيرِ ضُرُورَةٍ.»

---

[1] صحیح البخاری، بَابُ مَن تَبَرَّزَ عَلٰى لَبِنَتَينِ، رقم: ۱۴۵

[2] صحیح البخاری، باب غسل الأعقاب، سبل السلام: ۷۲/۱۰

یعنی ''قضائے حاجت کے موقع پر اللہ کے ذکر والی شے کو اتار کر دور رکھنا چاہیے اور بعض اہل علم نے کہا بلاضرورت قرآن مجید کو بیت الخلاء میں داخل کرنا حرام ہے۔''

دائمی مسافر کے لیے جیب میں قرآن کریم رکھنے کا حکم:

سوال دائمی مسافر قرآنِ کریم کو اپنی جیب میں رکھ سکتا ہے لیکن اگر سفر میں پیشاب وغیرہ کی حاجت پیش آجائے اور جیب سے نکال کر رکھنے کی کوئی صورت نہ ہو تو پھر کیا کرے یا اضطرار میں جیب سے نکالنا یاد ہی نہ رہے؟

جواب حسب المقدور بحالتِ سفر قرآن جیب سے نکال کر قضاء حاجت کے لئے جانا چاہئے، اضطراری حالت میں جیب وغیرہ میں بھی چھپایا جاسکتا ہے۔

ابواب الوضوء

مسواک کے احکام و مسائل

مسواک کرنے کا مسنون طریقہ کیا ہے؟

(سوال) مسواک کرنے کا مسنون طریقہ کیا ہے؟ اس کا سائز، پکڑنے کا طریقہ اور دانتوں پر ملنے کی پوری کیفیت جو سنت سے ثابت ہو تفصیل کے ساتھ بتا دیں۔

مسواک کے آداب کے حوالے سے ایک مضمون میں پڑھا تھا کہ

۱۔ مسواک کرنے کے بعد مسواک کو اگر دھویا نہ جائے تو شیطان مسواک کرتا ہے۔

۲۔ مسواک ایک بالشت سے زیادہ لمبی نہیں ہونی چاہیے ورنہ شیطان اس پر سوار ہوتا ہے۔

۳۔ مسواک پوری مٹھی میں پکڑ کر نہ کی جائے تو اس سے بواسیر پیدا ہو جاتی ہے۔

۴۔ مسواک لیٹ کر نہ کی جائے کیونکہ اس سے تلی بڑھ جاتی ہے۔

۵۔ مسواک زمین یا میز پر افقی شکل میں نہ رکھی جائے، اس طرح لٹا کر رکھنے سے جنون کا خوف ہے۔

سوال یہ ہے کہ کیا یہ آداب قرآن و حدیث سے ثابت ہیں؟

(جواب) استعمال کے بعد مسواک کو دھونا ضروری نہیں۔ مذکورہ شیطانی عمل کا کسی روایت میں ذکر نہیں، مسواک کے لیے بالشت کی شرط ثابت نہیں، مٹھی میں پکڑ کر مسواک کرنے کی کہیں ممانعت نہیں، مسواک کو میز وغیرہ پر رکھنے میں کوئی حرج نہیں، کوئی بیماری لاحق نہیں ہوتی۔ مذکورہ آداب خود ساختہ ہیں۔ قرآن و حدیث سے ثابت نہیں۔

مسواک کا سائز اور پکڑنے کا طریقہ:

(سوال) مسواک کرنے کا مسنون طریقہ کیا ہے؟ اس کا سائز، پکڑنے کا طریقہ اور دانتوں میں کرنے کی پوری کیفیت ذکر فرمائیں۔ (ابو عمار کراچی)

(جواب) مسواک لمبائی میں زبان کے مختلف اطراف پر ہونی چاہیے اور چوڑائی میں اسے دانتوں پر مسواک

کرنا مسنون ہے۔مسواک اس آلے کا نام ہے جس کو دانتوں پر پھیرا جاتا ہے۔شرع میں لمبائی چوڑائی کی کوئی حد مقرر نہیں، جیسے ممکن ہو پکڑ لے۔امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ مستحب یہ ہے کہ مسواک وَن کے درخت کی ہو اور یہ بھی مستحب ہے کہ منہ کی دائیں جانب میں عرض سے مسواک کا آغاز کیا جائے نہ کہ طول میں تاکہ دانتوں کے گوشت سے خون نکلنے نہ پائے۔[1] مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو۔[2]

اگر آدمی کے دانت ہی نہ ہوں تو مسواک کی سنت کیسے پوری ہوگی؟

سوال اگر کسی وقت آدمی کے پاس مسواک نہ ہو، یا کسی کے منہ میں سرے سے دانت ہی نہ ہوں، یا منہ میں تکلیف ہو تو مسواک کی سنت پر عمل کیسے کیا جائے؟

جواب ایسی صورت میں منہ میں انگلی پھیرنا کافی ہے۔

سوال مسواک کی کیفیت کیا ہونی چاہئے؟ اگر کسی آدمی کے پاس مسواک نہ ہو یا منہ میں سرے سے دانت ہی نہ ہوں یا منہ میں تکلیف ہو تو مسواک کی سنت پر عمل کیسے کریں؟

جواب جو لکڑی منہ میں پھر سکے، وہی کافی ہے مسواک کی کوئی حد بندی نہیں۔ان صورتوں میں منہ میں انگلی پھیر لے، یہی کافی ہے۔

سوال مسواک کرنے کا درست مسنون طریقہ اور مسواک کے سنت سے ثابت فضائل اور فوائد اور اوصاف کیا ہیں؟

جواب مسواک کے لئے بنیادی بات یہ ہے کہ منہ کے طول وعرض میں پھر سکے۔مسواک منہ کے لئے طہارت کا سبب ہے اور پروردگار کی رضامندی کا ذریعہ ہے۔

دانتوں کی صفائی پر چند سوالات

سوال دانت، منہ اور مسوڑھوں کی صفائی مسواک کی بجائے ٹوتھ برش سے کرنا اور اس مقصد کے لئے ٹوتھ پیسٹ کا استعمال شرعی لحاظ سے کیسا ہے؟ کیا اس عمل سے ثواب حاصل ہوگا؟ کیا ٹوتھ برش مسواک کا نعم البدل ہوسکتا ہے اور سنت پر عمل ہو جائے گا؟

جواب اہل علم کی اصطلاح میں مسواک کا اطلاق ہر اس آلے پر ہوتا ہے جس سے دانتوں کی صفائی ہو، چاہے لکڑی ہو یا ٹوتھ برش وغیرہ۔بوقتِ ضرورت صفائی اُنگلی سے بھی ہوسکتی ہے۔[3]

---

[1] عون المعبود:۱/ ۷

[2] المغنی:۱/ ۱۳۳، ۱۳۸

[3] نیل الاوطار:۱/ ۱۲۱

غرضیکہ اس کے لیے کوئی آلہ مخصوص نہیں۔ٹوتھ پیسٹ کے استعمال کا کوئی حرج نہیں بشرطیکہ اجزا میں کوئی حرام شے شامل نہ ہو۔اگر اس فعل کو ثواب کی نیت سے کرتا ہے تو یقیناً اجروثواب ملے گا اور سنت پر عمل بھی ہو جائے گا۔

سوال روزے کی حالت میں پیسٹ (Paste) کے ساتھ دانت برش کرنا کیسا ہے؟ بعض علما کہتے ہیں کہ روزے دار کے منہ کی بو اللہ تعالیٰ کو بہت پیاری ہے (پسند ہے) تو کیا روزے کی حالت میں مسواک برش کا استعمال ترک کر دینا چاہیے؟

جواب روزے کی حالت میں پیسٹ کے ساتھ دانت برش کرنے میں کوئی حرج نہیں۔امام شوکانی نے نیل الاوطار:۱۲۲) میں ان لوگوں کی تردید کی ہے جو بحالتِ روزہ مسواک کے قائل نہیں۔فرماتے ہیں:

« فإن السواك نوع من التطهر المشروع لاجل الرب سبحانه لان مخاطبة العظماء مع طهارة الافواه تعظيم لا شك فيه ولاجله شرع السواك وليس في الخلوف تعظيم ولا إجلال »

''مسواک اللہ کی رضا کی خاطر طہارت و پاکیزگی کی مسنون نوع ہے، کیونکہ بڑوں کے ساتھ ہم کلام ہونے سے پہلے منہ صاف کرنے میں بلاشبہ ان کی تعظیم کا پہلو پایا جاتا ہے۔اس لئے تو مسواک کو مشروع قرار دیا گیا ہے اور بو میں نہ کوئی تعظیم ہے اور نہ عزت واکرام۔''

بحث کے اختتام پر وہ رقم طراز ہیں:« فالحق انه يستحب السواك للصائم اول النهار وآخره وهو مذهب جمهور الائمة » ''حق بات یہ ہے کہ روزے دار کیلئے دن کے پہلے اور آخری حصہ میں مسواک کرنا مستحب ہے اور یہی جمہور ائمہ کا مسلک ہے۔''

روزہ دار کے منہ کی بو کے بارے میں وارد حدیث میں لفظ خلوف سے وہ طبعی ومعنوی بو مراد ہے جو کھانے پینے میں وقفہ پڑ جانے کی وجہ سے لاحق ہوتی ہے، اس کا تعلق عدمِ مسواک سے نہیں۔ویسے بھی بعض روایات میں اس بو کے بارے میں قیامت کے دن کی تصریح ہے:اطيب عندالله يوم القيامة'[1]

گیلی اور سوکھی مسواک کا حکم؟

سوال مسواک کرنے سے روزہ نہیں ٹوٹتا کیا گیلی اور سوکھی مسواک دونوں کا ایک ہی حکم ہے؟

جواب مسواک گیلی ہو یا خشک ہر دو طرح بحالتِ روزہ کرنی جائز ہے۔عامر بن ربیعہ رضی اللہ عنہ کا بیان ہے،

[1] نیل الاوطار:٤/ ٢٢١

میں نے رسول اللہ ﷺ کو بے شمار دفعہ روزے کی حالت میں مسواک کرتے دیکھا ہے۔(احمد، و ابوداؤد)[1]
حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے بھی حدیث ہذا کو حسن قرار دیا ہے۔ یہ حدیث عموم کے اعتبار سے مسواک کی ہر حالت کو شامل ہے، چاہے خشک ہو یا تر۔ اور ''صحیح بخاری'' کے ''ترجمۃ الباب'' میں ہے۔ ابن سیرین نے کہا (روزے کی حالت میں) تر مسواک کا کوئی حرج نہیں۔ کہا گیا اس کا تو ذائقہ ہوتا ہے۔ جواباً فرمایا: پانی کا ذائقہ بھی تو ذائقہ ہے۔ آپ اس سے کلی کرتے ہیں۔

رمضان میں نمازِ ظہر کے بعد مسواک کرنا:

سوال کیا رمضان کے دنوں میں نمازِ ظہر کے بعد مسواک کرنا جائز ہے؟

جواب روزے کی حالت میں مسواک کرنا جائز ہے۔ رمضان میں مسواک ہر وقت کرنی جائز ہے۔ ظہر سے پہلے ہو یا بعد۔ حدیث میں ہے:

« رَأَیتُ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیهِ وَ سَلَّمَ مَا لَا أُحصِی یَتَسَوَّكُ ،وَ هُوَ صَائِمٌ »[2]

''میں نے نبی ﷺ کو دیکھا کہ روزہ کی حالت میں کثرت سے مسواک کرتے۔''

یہ حدیث اپنے عموم کے اعتبار سے سب اوقات کو شامل ہے۔

دانتوں والا برش مسواک کا نعم البدل بن سکتا ہے؟

سوال کیا دانتوں والا برش مسواک کا نعم البدل سمجھا جا سکتا ہے؟

جواب معنی میں مطابقت کی وجہ سے غیر مسواک (یعنی برش وغیرہ) کو مسواک کا قائم مقام قرار دیا جا سکتا ہے۔

وضو کے احکام و مسائل

سوال وضو شروع کرتے وقت کیا پڑھنا چاہیے؟

جواب وضو کے شروع میں «بِسمِ اللّٰهِ» پڑھنی چاہیے۔[3]

اور ''معجم صغیر'' طبرانی میں بروایت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ یہ الفاظ بھی مروی ہیں: « بِسمِ اللّٰهِ وَالحَمدُ لِلّٰهِ»
صاحب ''مجمع الزوائد'' نے اس کو حسن قرار دیا ہے۔ جبکہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ اور ابن طاہر رحمہ اللہ نے اس لو

---

[1] سنن الترمذی، بَابُ مَا جَاءَ فِی السِّوَاكِ لِلصَّائِمِ ،رقم: ۷۲۵، و قال حدیث حسن
[2] سنن الترمذی، بَابُ مَا جَاءَ فِی السِّوَاكِ لِلصَّائِمِ ،رقم: ۷۲۵
[3] سنن النّسائی: باب التسمیة عند الوضوء، رقم: ۷۸

منکر قرار دیا ہے۔[1] البتہ صاحب ''العون'' تکمیل کے قائل ہیں۔ ملاحظہ ہو! عون المعبود (٤/ ٤١٠) لیکن ان کے پیش کردہ دلائل مزید نظر (غور وفکر) کے متقاضی (محتاج) ہیں۔ (والعلم عنداللہ تعالیٰ)

(سوال) حدیث لا صلوٰۃ لمن لا وضوء له کس کتاب میں ہے، اس کا مکمل متن اور اس کی فنی حیثیت کیا ہے؟

(جواب) اس حدیث کا حوالہ کچھ یوں ہے۔ سنن أبی داود و سنن ابن ماجه[2] یہ حدیث شواہد کی بنا پر حسن ہے۔ ملاحظہ ہو کتاب التسمیة، ص:۱۸

(سوال) وضو کے کتنے فرض ہیں۔ کیا پانی صرف منہ تک پہنچایا جائے یا ''نرٹی'' تک؟

(جواب) قطع نظر فرض وسنت کی تفریق کے مکمل وضو اہتمام سے کرنا چاہیے اور پانی پہنچانے میں پورے منہ کا استیعاب (احاطہ) کیا جائے۔

(سوال) وضو کرتے وقت دائیں بازو پر پانی دائیں ہاتھ ہی سے ڈالا جائے یا بائیں سے بھی ڈالا جا سکتا ہے؟

(جواب) مسئلہ ہذا میں وسعت ہے یعنی دونوں طرح جواز ہے۔

(سوال) اہلِ سنت بازو دھوتے وقت چلو میں پانی لیکر کہنی کی طرف بہاتے ہیں۔ شیعہ کہنی کی طرف پانی ڈال کر نیچے کی طرف بہاتے ہیں۔ مسلم شریف میں ہے کہ جب کوئی ہاتھ دھوتا ہے تو انگلیوں سے پانی کے ساتھ گناہ گر جاتے ہیں بازو دھونے کا صحیح طریقہ کیا ہے؟

(جواب) صحیح احادیث میں دونوں ہاتھوں کو ایک سے تین دفعہ تک صرف مکمل دھونے کا بیان ہے۔ مُشارٌ الیہ کیفیت ثابت نہیں۔

وضوء میں ہاتھوں کو کس طرف سے دھویا جائے؟

(سوال) وضو میں ہاتھوں کو کہنیوں سے پہنچوں کی طرف دھویا جائے یا پہنچوں سے کہنیوں کی طرف بعض لوگ کہتے ہیں کہنیوں سے پہنچوں کی طرف دھوئے جائیں وہ یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ وضو سے ہاتھوں کے گناہ پانی کے ساتھ ناخنوں کی طرف سے جھڑ جاتے ہیں اور جو لوگ پہنچوں سے کہنیوں کی طرف دھونے کو کہتے ہیں وہ قرآنِ کریم کی آیت سے استدلال پیش کرتے ہیں۔

---

[1] الفوائد المجموعة للشوکانی تحقیق عبدالرحمن الیمانی رقم۳۲

[2] سنن أبی داؤد، کتاب الطهارة، باب فی التسمیة علی الوضوء، رقم الحدیث:۱۰۱، سنن ابن ماجه، بَابُ مَا جَاءَ فِی التَّسْمِیَةِ فِی الْوُضُوءِ، رقم:۳۹۸

کون سا طریقہ شریعت محمدی میں بہتر ہے یا سنت ہے، اور کون سا طریقہ بدعت ہے؟ کتاب وسنت کی روشنی میں جواب دیں۔

جواب وضو میں ہاتھ پنجوں سے دھونا چاہیے جس طرح کہ شرع میں ثابت ہے۔ مخالفین کی دلیل کا کوئی وزن نہیں کیونکہ وضو کے ذریعہ گناہوں کا جھڑنا معنوی امر ہے جو عقل سے بالاتر شے ہے۔

ہاتھوں اور انگلیوں کا خلال کس وقت کرنا چاہیے؟

سوال وضو میں ہاتھوں کی انگلیوں کا خلال کس وقت کرنا چاہیے، وضو کے شروع میں جب ہاتھ دھوتے ہیں؟ عام طور پر لوگ سر اور کانوں کے مسح کے بعد کرتے ہیں۔ خلال کا طریقہ کیا ہے؟

جواب ہاتھ اور پاؤں کو جب دھویا جائے تو خلال اس وقت ہونا چاہیے۔ ہاتھوں کو چونکہ پہلے دھویا جاتا ہے، اس لیے ان کا خلال پہلے ہونا چاہیے اور پاؤں کو بعد میں دھویا جاتا ہے تو پاؤں کا خلال اس وقت کیا جائے۔

« عَنِ ابنِ عَبَّاسٍ رَضِیَ اللّٰهُ عَنهُمَا اَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: اِذَا تَوَضَّاتَ فَخَلِّل بَینَ اَصَابِعِ یَدَیكَ وَ رِجلَیكَ . » [1]

یہ حدیث حسن درجہ کی ہے۔ خلال چھوٹی انگلی سے ہونا چاہیے۔ مستورد بن شداد کی روایت میں تصریح موجود ہے کہ میں نے رسول اکرم ﷺ کو وضو کرتے ہوئے دیکھا کہ آپ اپنے پاؤں کی انگلیاں چھنگلی سے مَل رہے تھے۔ (”مسند احمد“، ابوداؤد، ترمذی وغیرہ بسند صحیح) [2]

خلال کا طریقہ یہ ہے کہ چھوٹی انگلی کو دو انگلیوں کے درمیان ڈال کر خوب ملا جائے تاکہ درمیانی جگہ خشک نہ رہے۔

سوال کلی کرتے وقت، ناک میں پانی ڈالتے وقت، چہرہ دھوتے وقت، دایاں اور بایاں بازو دھوتے وقت اور پاؤں دھوتے وقت کوئی مسنون دعائیں ہیں، جو پڑھنی چاہئیں؟

جواب وضو میں ہر عضو کو دھوتے وقت کوئی مخصوص ذکر نہیں البتہ ”احیاء علوم الدین“ اور ”غنیۃ الطالبین“ میں ہر عضو کے لئے مخصوص ذکر کی نشاندہی کی ہے لیکن اس کی کوئی اصل نہیں۔ یہ سب خودساختہ اور بناوٹی اَذکار ہیں۔

---

① سنن الترمذی، بَابٌ فِی تَخلِیلِ الأَصَابِعِ ،رقم:۳۹۔ سنن ابن ماجه، بَابُ تَخلِیلِ الأَصَابِعِ ،رقم:۴۴۷

② سنن الترمذی، بَابٌ فِی تَخلِیلِ الأَصَابِعِ ،رقم:۴۰۔ سنن ابن ماجه، بَابُ تَخلِیلِ الأَصَابِعِ ،رقم:۴۴۶

گھنی داڑھی کے خلال کا طریقہ کیا ہے؟

سوال گھنی داڑھی والے کو خلال کس طرح کرنا چاہئے جب کہ جلد تک پانی پہنچانا مشکل امر معلوم ہو؟

جواب داڑھی کے بال میں اُنگلیوں کو داخل کر کے خوب خلال کرنا چاہئے ، جڑوں تک ضرور پانی پہنچانا چاہئے، سخت تاکید ہے۔

سوال وضو کرتے وقت داڑھی کے بال (خلال کرتے ہوئے) خشک رہ جانے پر وضو ناقص ہو جاتا ہے؟ وضو کے آخر میں چھینٹے مارنا کیسا ہے؟ اس مسئلہ پر سختی کرنا کیسا ہے؟

جواب داڑھی کے خلال کا اہتمام ہونا چاہیے۔ لاعلمی میں اللہ معاف کر دے گا۔ ان شاء اللہ۔

سوال وضو کے دوران کانوں کے مسح کے لیے نیا پانی لینا چاہیے یا سَر کا پانی کافی ہے؟

جواب مسئلہ ہذا میں اگرچہ اہل علم کا اختلاف ہے۔ لیکن راجح بات یہ ہے کہ کانوں کے مسح کے لیے نیا پانی لینے کی ضرورت نہیں۔ حدیث میں ہے« اَلْاُذُنَانِ مِنَ الرَّأسِ »[1] کانوں کا تعلق سَر سے ہے۔ حدیث ہذا کے اکثر طُرق اگرچہ ضعیف ہیں، لیکن بعض صحیح ہیں۔ مذکورہ طریق اسی قبیل سے ہے۔ (نصب الرایہ:۱/۱۹۱) اس کے بالمقابل روایت کو علامہ البانی نے شاذ قرار دیا ہے۔[2]

سوال جن کے سَر پر پگڑی ہو، ان کے لیے مسح کا کیا حکم ہے؟

جواب وضو میں پگڑی پر مسح کرنا صحیح احادیث سے ثابت ہے چنانچہ صاحب ''العون'' فرماتے ہیں:

« أَحَادِيثُ الْمَسحِ عَلَى العِمَامَة، أَخرَجَهُ البُخَارِيُّ، وَ مُسلِمٌ ، وَالتِّرمِذِيُّ، وَأَحمَدُ، وَالنَّسَائِيُّ، وَابنُ مَاجَةَ، وَ غَيرُ وَاحِدٍ مِن الأَئِمَّةِ مِن طُرُقٍ قَوِيَّةٍ مُّتَّصِلَةِ الأَسَانِيدِ، وَ ذَهَبَ إِلَيهِ جَمَاعَةٌ مِّنَ السَّلَفِ ، كَمَا عَرَفتَ. وَ قَد ثَبَتَ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ مَوجُودٌ فِي كُتُبِ الأَئِمَّةِ الصِّحَاحِ وَالنَّبِيُّ ﷺ يُبَيِّنُ مِنَ اللّٰهِ تَبَارَكَ وَ تَعَالٰى فَقَط. اِلاجزَاءَ عَلٰى بَعضِ مَا وَرَدَ لِغَيرِ مُوجِبٍ، لَيسَ مِن دَابِ المُنصِفِينَ، بَلِ الحَقُّ جَوَازٌ عَلَى العِمَامَةِ فَقَط .» (۱/۵۶)

اس کا ماحصل یہ ہے کہ پگڑی پر مسح کرنا صحیح احادیث سے ثابت ہے۔ مسح کی تین صورتیں ہیں۔ صرف

---

[1] سنن الدارقطنی،بَابُ مَا رُوِیَ مِنْ قَوْلِ النَّبِیِّ ﷺ اَلْاُذُنَانِ مِنَ الرَّأْسِ ،رقم:۳۲۱،سنن ابن ماجه،بَابُ الْاُذُنَانِ مِنَ الرَّأْسِ،رقم:۴۴۳، سنن أبی داؤد،بَابُ صِفَةِ وُضُوءِ النَّبِیِّ ﷺ، رقم:۱۳۴

[2] الاحادیث الضعیفه:۹۹۵، تلخیص الحبیر:۱/۸۹۔۹۰

سَر پر یا صرف پگڑی پر یا سَر اور پگڑی دونوں پر مسح کرنا۔ یہ تمام صورتیں رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہیں۔ اہلِ انصاف کی عادات سے بالا تر ہے، کہ بعض صورتوں کو لے لیا جائے اور بعض کو ترک کر دیا جائے، بلکہ حق بات یہ ہے کہ صرف پگڑی پر مسح جائز ہے۔

سوال گردن کا مسح جو لوگ وضو میں کرتے ہیں...... کہاں سے دلیل لاتے ہیں؟

جواب وضو میں گردن کے مسح کے بارے میں نبی اکرم ﷺ سے قطعاً قابلِ اعتماد و استناد طریق سے کوئی شے ثابت نہیں۔ علامہ ابن ہمام حنفی نے اس سلسلہ میں وارد بعض روایات کی طرف اشارہ کیا ہے لیکن وہ سخت ضعیف اور نا قابلِ حجت ہیں۔ (فتح القدیر:۱/ ۱۶۔۱۷) پھر حوالہ مذکور کے (ص:۲۳) پر ذکر کرتے ہیں:

« وَ قِيلَ: مَسحُ الرَّقَبَةِ أَيضًا بِدعَةٌ .»

یعنی ''یہ بھی کہا گیا ہے کہ جس طرح گلے کا مسح بدعت ہے اسی طرح گردن کا مسح بھی بدعت ہے۔''

حافظ ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''گردن کے مسح کے بارے میں قطعاً کوئی صحیح حدیث وارد نہیں۔'' (زاد المعاد:۱/ ۱۹۵) مسئلہ ہذا کے بارے میں ایک روایت سنن ابوداؤد (رقم حدیث:۱۳۲) میں ہے جس کے الفاظ یوں ہیں:

« قَالَ رَأَيتُ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ يَمسَحُ رَأسَهُ مَرَّةً وَاحِدَةً، حَتّٰى بَلَغَ القَذَالَ، وَ هُوَ أَوَّلُ القَفَا. وَ قَالَ مُسَدَّدٌ: مَسَحَ رَأسَهُ مِن مُقَدَّمِهٖ إِلٰى مُؤَخَّرِهٖ، حَتّٰى خَرَجَ يَدَيهِ مِن تَحتَ أُذُنَيهِ .» [1]

یعنی میں نے رسول اللہ ﷺ کو ایک دفعہ سَر کا مسح کرتے ہوئے دیکھا۔ حتیٰ کہ آپ گدی کے ابتدائی حصہ تک پہنچ گئے۔ اور مسدد نے اپنی روایت میں بیان کیا کہ آپ نے سَر کے ابتدائی حصہ سے لے کر آخیر تک سَر کا مسح کیا حتیٰ کہ دونوں ہاتھوں کو دونوں کانوں کے نیچے سے نکالا۔

یہ روایت السنن الکبری للبیہقی (۱/ ۶۰) میں بھی ہے۔ امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: یہ حدیث بالاتفاق ضعیف ہے۔ (المجموع:۱/ ۵۰۰) اس کی سند میں لیث بن سلیم قرشی کوفی کے بارے میں امام احمد رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''اس کی حدیث میں اضطراب ہے'' اور ابن حبان رحمہ اللہ نے کہا: ''یہ سندوں کا قلب (سندوں کو الٹ پلٹ) کر دیتا ہے۔ مراسیل کا رفع (مرسل روایات کو مرفوع) کر جاتا تھا، اور ثقات کی طرف وہ احادیث منسوب کرتا تھا جو ان کی نہ ہوتی تھیں۔ یحییٰ قطان، ابن مہدی، ابن معین اور احمد نے اس کو

---

[1] سنن ابی داؤد، بَابُ صِفَةِ وُضُوءِ النَّبِيِّ ﷺ، رقم:۱۳۲

چھوڑ دیا تھا۔

اور نووی رحمہ اللہ نے "تہذیب الأسماء" میں کہا ہے: «إِتَّفَقَ الْعُلَمَاءُ عَلَى ضَعفِهِ» یعنی تمام علماء کا اس کے ضعف پر اتفاق ہے۔ نیز امام نووی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس میں راوی طلحہ کے باپ مصرف اور دادا عمرو بن کعب بھی غیر معروف ہیں۔ ابوداؤد نے کہا: میں نے احمد سے سنا وہ فرماتے تھے: لوگوں نے کہا ابن عیینہ اس حدیث کا انکار کرتے ہوئے کہا کرتے تھے: «أيش طلحة عن أبيه عن جده» یعنی وہ حدیث جس کو طلحہ نے "عن أبيه عن جده" بیان کیا ہے قابلِ اعتماد شئی نہیں۔

صاحب "العون" فرماتے ہیں: "یہ حدیث ضعیف ہونے کے باوجود گردن کے مسح کے استحباب کی دلیل نہیں بنتی، کیونکہ اس حدیث میں تو صرف یہ ہے کہ آپ شروع سے لے کر سَر کے اخیر تک یا گردن کے اخیر تک "عَلَى اِختلاف الروايات" مسح کرتے تھے۔ اس بارے میں تو کلام ہی نہیں۔ اصلی زیرِ بحث مسئلہ تو گردن کا مروّجہ مسح ہے، جو گردن پر اُلٹی انگلیوں سے سَر کے مسح کے بعد لوگ کرتے ہیں۔ گردن کے مسح کی یہ کیفیت کسی بھی صحیح یا حسن حدیث میں ثابت نہیں، بلکہ وہ تمام روایات جو گردن کے مسح کے بارے میں وارد ہیں وہ سب ضعیف ہیں۔ جس طرح کہ بہت سارے اہل علم نے اس کی صراحت کی ہے۔ ان کو قابلِ حجت سمجھنا قطعاً درست نہیں۔ (۱/۴۹۔۵۰)

ابن الہمام رحمہ اللہ نے وائل بن حجر رحمہ اللہ سے بحوالہ ترمذی ایک روایت نقل کی ہے جس میں گردن کے مسح کی صراحت موجود ہے۔ بسیار (بہت زیادہ) تلاش کے باوجود مجھے یہ روایت سنن ترمذی میں مل نہ سکی۔ میں نے سمجھا کہ فقیہ موصوف سے نسبت میں غلطی ہوئی ہے۔ بعد میں جب "عون المعبود" میں دیکھا تو انھوں نے واقعتاً ان کے وہم کی صراحت کی ہے۔ فرماتے ہیں:

« فَهُوَ وَهمٌ مِنهُ لِأَنَّ الحَدِيثَ لَيسَ لَهُ وُجُودٌ فِي التِّرمِذِي.» (۱/۵۰)

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے بھی اس بارے میں وارد اکثر روایات پر عدمِ اعتماد کا اظہار کیا ہے۔ ملاحظہ ہو! التلخیص (۱/۴۳۳)

گردن کے مسح کے بارے میں ایک اور روایت بھی مشہور ہے: «مَسحُ الرَّقبَةِ أَمَانٌ مِنَ الغُلِّ" یعنی گردن کا مسح کرنے والا روزِ جزاء طوق سے محفوظ رہے گا۔ امام نووی رحمہ اللہ نے اس کو من گھڑت قرار دیا ہے۔ "المجموع شرح المهذب" (۱/۴۶۵) اور حافظ عراقی نے بھی اس کو "تخريج الإحياء" (۱/۱۹۵) میں ضعیف قرار دیا ہے۔ قدرے تفصیلی بحث کے لیے ملاحظہ ہو! "سلسلة الأحاديث الضعيفة

للالبانی" (۱/۸۴۔۸۵)

سوال جو لوگ وضو میں گردن کا مسح کرتے ہیں اور اس کا فتویٰ بھی دیتے ہیں؟ کیا وہ اس کی کوئی دلیل پیش کرتے ہیں؟ نیز گردن کے مسح کا کیا حکم ہے؟

جواب وضو میں گردن کا مسح کسی صحیح حدیث سے ثابت نہیں۔ صاحب "عون المعبود" فرماتے ہیں:

« اَلحَدِیث مع ضُعفِهٖ لَا یَدُلُّ عَلَی استِحبَابِ مَسحِ الرَّقبَةِ، لِاَنَّ فِیهِ مَسحَ الرَّاس مِن مُقَدَّمِهٖ اِلٰی مُؤَخِّرِ الرَّأسِ، اَو اِلٰی مُؤَخِرِ العُنُقِ عَلٰی اختِلَافِ الرِّوَایَاتِ. وَ هٰذَا لَیسَ فِیهِ کَلَامٌ. اِنَّمَا الکَلَامُ فِی مَسحِ الرَّقَبَةِ المُعتَادِ بَینَ النَّاسِ اِنَّهُم یَمسَحُونَ الرَّقبَةَ بِظُهُورِ الأَصَابِعِ بَعدَ فَرَاغِهِم عَن مَسحِ الرَّأسِ. وَ هٰذِهِ الکَیفِیَّةُ لَم تَثبُتُ فِی مَسحِ الرَّقبَةِ، لَا مِنَ الحَدِیثِ الصَّحِیحِ، وَ لَا مِنَ الحَسَنِ، بَل مَا رُوِیَ فِی مَسحِ الرَّقبَةِ کُلُّهَا ضُعَافٌ، کَمَا صَرَّحَ بِهٖ غَیرُ وَاحِدٍ مِنَ العُلَمَاءِ. فَلَا یَجُوزُ الِاحتِجَاجُ بِهَا. وَ نَقَلَ الشَّیخُ ابنُ الهَمَامِ مِن حَدِیثِ وَائِلِ بنِ حُجرٍ فِی صِفَةِ وُضُوءِ رَسُولِ اللّٰهِ ﷺ. ثُمَّ مَسحَ عَلٰی رَأسِهٖ ثَلَاثًا، وَ ظَاهِرَ اُذُنَیهِ ثَلَاثًا، وَ ظَاهِرَ رَقبَتِهٖ. اَلحَدِیثُ وَ نَسبَهٗ اِلَی التِّرمَذِیِّ فَهُوَ وَهمٌ مِنهُ. لِاَنَّ الحَدِیثَ لَیسَ لَهٗ وُجُودٌ فِی التِّرمَذِیِّ.»[1]

"حدیث مذکور ضعیف ہونے کے باوجود گردن کے مسح کے مستحب ہونے پر دلالت نہیں کرتی۔ اس میں صرف سَر کے مسح کا ذکر ہے کہ پیشانی کی طرف سے شروع کر کے سَر کے پچھلے حصے تک یا بعض روایات کے مطابق گردن کے آخر تک ہونا چاہیے۔ اس موضوع پر تو کوئی بحث نہیں۔ بحث تو لوگوں میں معروف طریقے پر گردن کے مخصوص مسح کے متعلق ہے کہ وہ سَر اور کانوں کے مسح سے فراغت کے بعد انگلیوں کی پشت سے گردن کا مسح کرتے ہیں۔ جب کہ یہ طریقہ کسی صحیح یا حسن درجے کی حدیث سے ثابت نہیں اس موضوع پر مروی تمام احادیث اہل علم و تحقیق کے مطابق ضعیف ہیں۔ لہٰذا ان سے دلیل لینا درست نہیں۔ ابن الہمام رحمہ اللہ نے ترمذی کے حوالے سے جو روایت پیش کی ہے کہ" آپ ﷺ نے سَر اور کانوں کے ظاہر کا تین دفعہ اور گردن کا (ایک دفعہ) مسح کیا۔" یہ ان کا وہم ہے کیونکہ "ترمذی" میں ایسی کوئی حدیث نہیں۔"

سوال لغت میں غسل سے مراد پانی ڈالنا اور مَلنا ہے (کتاب الفقه علی المذاهب الاربعه للجزیری) کیا ن

[1] عون المعبود: ۱/۴۹ ۵

کریم سے وضو یا غسل میں ملنا ثابت ہے؟ اگر غسل یا وضو میں ہاتھ سے ملے بغیر پانی تمام اعضاء تک پہنچ جائے تو کیا وضو اور غسل درست ہو جائیں گے؟

(جواب) وضو اور غسلِ جنابت میں جملہ اعضا کو دھونے کی تاکید وارد ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''خرابی ہے واسطہ (خشک) ایڑھیوں کے آگ سے، خبردار پورا کرو وضوء۔''[1]

نیز فرمایا: «مَنْ تَرَكَ مَوْضِعَ شَعْرَةٍ مِنْ جَنَابَةٍ لَمْ يُصِبْهَا الْمَاءُ، فُعِلَ بِهَا كَذَا وَكَذَا مِنَ النَّارِ»[2]

''جس نے غسلِ جنابت سے بال برابر جگہ دھوئے بغیر چھوڑ دی (یعنی بال برابر بھی جگہ خشک رہ گئی) تو اس کو ایسا اور ایسا عذاب کیا جائے گا۔''

اگر ملے بغیر بھی اعضاء تر ہو جائیں اور کوئی جگہ خشک نہ رہے پھر بھی درست ہے۔ (فتح الباری: ۱/ ۳۵۹)

دورانِ وضوء سلام کا جواب دینا:

(سوال) بعض لوگ کہتے ہیں کہ وضو کرتے وقت سلام کا جواب بھی نہ دینا چاہیے۔ اس لیے آنے والا وضو کرنے والے کو سلام نہ کرے، کیا یہ مسئلہ خود ساختہ ہے؟

(جواب) وضو کرتے ہوئے ''السلام علیکم'' کا جواب دینا چاہیے۔ کسی حدیث میں نہ سلام کی ممانعت آئی ہے، اور نہ جواب کی۔ نیز جب بحالتِ نماز کسی کو سلام کہنے کا جواز ہے، تو اس حالت میں تو بطریق اولیٰ جواب دینا جائز ہوگا۔

وضوء کے بعد امور کے متعلق احکام و مسائل

(سوال) ایک آدمی کہتا ہے جب تک وضو کے آخر میں پانی کے چھینٹے نہ مارے جائیں۔ وضو ناقص ہوتا ہے؟

(جواب) وضو کے آخر میں چھینٹے لگانے کا صرف جواز ہے واجب نہیں۔ لہٰذا وضو کو ناقص قرار دینا درست طرزِ عمل نہیں۔

(سوال) بعض حضرات کو دیکھا گیا ہے کہ وہ وضو کے بعد چلو میں پانی لے کر اپنی شرمگاہ پر چھینٹے مارتے ہیں

---

[1] صحيح مسلم، بَابُ وُجُوبِ غَسْلِ الرِّجْلَيْنِ بِكَمَالِهِمَا، رقم: ۲٤۱

[2] سنن الدارمي، بَابُ مَنْ تَرَكَ مَوْضِعَ شَعْرَةٍ مِنْ جَنَابَةٍ، رقم: ۷۷۸، سنن أبي داؤد، رقم: ۲٤۹، سنن ابن ماجة، رقم: ۵۹۹

اس کی قرآن و حدیث سے تفصیلی وضاحت فرمادیں۔

جواب احادیث سے جواز ملتا ہے۔

سوال وضو کے بعد کی دعاء یعنی « اَللّٰهُمَّ اجعَلنِی مِنَ التَّوَّابِینَ وَ اجعَلنِی مِنَ المُتَطَهِّرِینَ » ①

اس حدیث کی اسنادی حیثیت درکار ہے۔

جواب سوال میں مذکور دعاء جامع ترمذی میں وارد ہے۔اس کے بارے میں امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

« فِی إِسنَادِهِ إِضطِرَابٌ، وَ لَا یَصِحُّ فِیهِ شَیءٌ کَبِیرٌ.»

جرح ہذا کو نقل کرنے کے بعد حافظ ابن حجر رحمہ اللہ رقمطراز ہیں:

« لٰکِن رِوَایَةَ مُسلِمٍ سَالِمَةٌ مِن هٰذَا الاِعتِرَاضِ. وَالزِّیَادَةُ الَّتِی عِندَهٗ رَوَاهَا البَزَّارُ، وَالطَّبرَانِیُّ فِی «الَاوسَطِ» مِن طَرِیقِ ثَوبَانَ .»

لیکن صحیح مسلم کی روایت اضطراب کے اعتراض سے سلامت ہے اور وہ زیادتی جو ترمذی میں ہے اس کو بزار اور طبرانی نے ''اوسط'' میں ثوبان کے طریق سے بیان کیا ہے۔''

جس کے الفاظ یوں ہیں:

« اَشهَدُ أَن لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰه، وَاَشهَدُ أَنَّ مُحَمَّداً رَّسُولُ اللّٰهِ. اللّٰهُمَّ اجعَلنِی مِنَ التَّوَّابِینَ وَ اجعَلنِی مِنَ المُتَطَهِّرِینَ.» ②

بظاہر حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے امام ترمذی رحمہ اللہ کی جرح کو تسلیم کیا ہے اور دیگر طُرُق کی بناء پر اس کو قابلِ عمل سمجھا ہے،لیکن محقق العصر شیخنا ناصر الدین البانی رحمہ اللہ نے امام ترمذی کی جرح کو ہی ہدفِ تنقید بنایا ہے۔وہ فرماتے ہیں:

« وَ أَعلَّهُ التِرمَذِیُّ بِالاِضطِرَابِ، وَ لَیسَ بِشَیءٍ، فَإِنَّهٗ إِضطِرَابٌ مَرجُوحٌ.» ③

یعنی امام ترمذی نے اس حدیث کو اضطراب کی بناء پر معلول (علت والی) قرار دیا ہے،لیکن یہ قابلِ توجہ شئی نہیں کیونکہ یہ اضطراب مرجوح ہے۔

پھر دیگر شواہد کی بناء پر ''الإرواء'' میں اس کو بلا تردّد قابلِ عمل تسلیم کیا گیا ہے۔اور صحیح سنن ترمذی میں علامہ البانی نے اس کو صحیح کہا ہے۔رقم (۴۸۔۵۵) یہی بات راجح ہے۔ان وجوہ کی بناء پر جن کی علامہ

---

① سنن الترمذی،بَابُ مَا یُقَالُ بَعدَ الوُضُوءِ،رقم:۵۵

② التلخیص،جز:۱،ص:۱۰۱

③ إرواء الغلیل:۱/۱۳۵

موصوف نے نشاندہی کی ہے۔

کیا وضوء کے بعد اعضاء کو کسی کپڑے یا تولیے سے خشک کرنے میں کوئی حرج ہے؟

(سوال) وضو کرنے کے بعد وضو کے اعضاء کپڑے سے خشک کر سکتے ہیں اور پھر وہی کپڑا سر پر باندھ کر نماز ادا کی جا سکتی ہے؟

(جواب) اس طرح کرنے میں کوئی حرج نہیں، ملاحظہ ہو جائزۃ الاحوذی: (۷۳/۱) جب طہارت کے لیے اس کا استعمال جائز ہے تو سر پر باندھنا بطریقِ اولیٰ جائز ہوگا۔

وضوء کے بعد آسمان کی طرف دیکھنا اور انگلی کا اشارہ کرکے کلمہ شہادت پڑھنا جائز ہے؟

(سوال) وضو کرنے کے بعد آسمان کی طرف منہ کر کے یا آسمان کی طرف شہادت کی انگلی اٹھا کر کلمہ شہادت پڑھنے کی کیا شرعی حیثیت ہے؟

(جواب) یہ روایت ضعیف ہے، کیونکہ اس کی سند میں ابوعقیل کا چچا زاد بھائی ضعیف ہے۔ القول المقبول :ص:۱۷۸، صحیح "سنن ابی داؤد": ۱/ ۳۰۲، علامہ البانی

وضوء کے بعد نظر آسمان کی طرف اٹھانے والی حدیث کا حکم کیا ہے؟

(سوال) ''مرعاۃ المفاتیح'' کی غالباً دوسری جلد میں نماز کے باب میں (جس میں وضو کا بیان تھا) ایک حدیث پڑھی تھی کہ وضو کے بعد ایک نظر آسمان کی طرف اٹھا سکتے ہیں جب کلمہ شہادت پڑھا جائے۔ تو کیا وہ حدیث صحیح ہے؟ اس طرح نظر اٹھانا درست ہے؟

(جواب) یہ روایت ضعیف ہے، اس کی سند میں ابوعقیل کا چچا زاد بھائی مجہول ہے۔ ملاحظہ ہو:(کتاب القول المقبول، ص:۱۷۸)

آیت کریمہ ﴿لَا یَمَسُّهٗۤ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ﴾ کا مطلب کیا ہے؟

(سوال) کیا آیت کریمہ ﴿لَا یَمَسُّهٗۤ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ﴾ کی روشنی میں قرآنِ حکیم کو باوضو ہو کر ہی چھونا ضروری ہے۔ تفصیل سے بیان فرمائیں کہ وضو کی شرط کہاں سے لائی گئی؟

ایک شخص سارا دن قرآنِ پاک کی کتابت کرتا ہے، یا جلد سازی کرتا ہے یا اس کی تصحیح کرتا ہے تو کیا وہ صرف عمومی پاکیزگی کی حالت میں یہ سب کچھ کر سکتا ہے یا وضو کرنا بھی ضروری ہے؟

ایک شخص جیب میں ہر وقت قرآنِ حکیم رکھتا ہے وہ دن میں جب چاہتا ہے۔قرآن کی تلاوت شروع کر دیتا ہے۔کیا اس کے لیے بھی وضو کر کے پڑھنا ضروری ہے؟

جواب اہل علم کا اس بارے اختلاف ہے کہ آیت کریمہ ﴿لَا یَمَسُّهٗۤ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ﴾(الواقعۃ:۷۹) سے مراد فرشتے ہیں یا بنی آدم؟ سلف کی ایک جماعت اس بات کی قائل ہے کہ مقصود اس سے فرشتے ہیں۔تفسیر ابن کثیر وغیرہ میں ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہی مروی ہے جب کہ دیگر اہل علم نے اس کا اطلاق بنی آدم علیہ السلام سے لے کر جنابت اور حدثِ اصغر (قضائے حاجت وغیرہ سے بے وضو ہونے) پر کیا ہے۔انہوں نے کہا کہ یہاں خبر بمعنیٰ طلب ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ بے طہارتِ کبریٰ وصغریٰ قرآن کو ہاتھ لگانا جائز نہیں ہے۔

عمرو بن حزم رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے:«اَن لَا یَمَسَّ القُراٰنَ اِلَّا طَاهِرٌ»①

یعنی طہارت کے بغیر قرآن کو مس (چھونا) نہ کیا جائے۔'' اصل یہ ہے کہ مس مصحف کے لیے وضو کا اہتمام ہونا چاہیے لیکن کثرتِ عمل کی بناء پر اہتمام نہ ہو سکے تو پھر کوئی حرج نہیں۔

قرآن مجید میں ہے۔﴿فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ﴾(التغابن:۱۶)

''سو جہاں تک ہو سکے اللہ سے ڈرو''

امام مالک رحمہ اللہ نے بچوں کو وضو کے بغیر قرآن پکڑنے کی اجازت دی ہے۔

بغیر وضو قرآنِ پاک کو چھونا؟

سوال کیا قرآنِ پاک کو بغیر وضو چھونا ناجائز ہے؟

جواب بہتر ہے کہ انسان باوضو ہو۔حدیث میں ہے:

« لَا یَمَسُّ القُراٰنَ اِلَّا طَاهِرٌ.» (رواہ مالك والدارقطنی) ②

مزید وضاحت کے لیے ملاحظہ ہو! (مرعاۃ المفاتیح، ج:۱،ص:۳۰۶ طبع پاکستان)

بغیر وضو قرآنِ پاک پڑھنا؟

سوال بغیر وضو کے آدمی قرآن پاک پڑھ سکتا ہے یا نہیں؟ اگر پڑھ سکتا ہے تو آیت: ﴿لَا یَمَسُّهٗۤ اِلَّا

① سنن الدارمی،بَابُ لَا طَلَاقَ قَبْلَ نِكَاحٍ،رقم:۲۳۱۲،سنن الدارقطنی،بَابٌ فِي نَهْيِ الْمُحْدِثِ عَنْ مَسِّ الْقُرآنِ،رقم:۴۳۷

② سنن الدارمی،بَابُ لَا طَلَاقَ قَبْلَ نِكَاحٍ،رقم:۲۳۱۲،سنن الدارقطنی،بَابٌ فِي نَهْيِ الْمُحْدِثِ عَنْ مَسِّ الْقُرآنِ،رقم:۴۳۷

المُطَهَّرُونَ﴾ کا کیا مفہوم ہے؟ اگر یہ آیت جُنبی کے بارے میں ہے تو دینی مدارس میں قران پاک بچے پڑھتے پڑھتے بار بار پیشاب کرنے کے لیے جاتے ہیں کیا ان پر وضو لازمی ہے؟

جواب ''سنن ابی داؤد'' میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

« وَ لَم يَكُن يَحجُبُهُ، أَو قَالَ: يَحجُزُهُ عَنِ القُرآنِ شَيءٌ لَيسَ الجَنَابَةِ .»①

یعنی ''نبی ﷺ کو جنابت کے ماسوا کوئی چیز قراءتِ قرآن سے مانع نہیں تھی۔''

صاحب ''عون المعبود'' حدیث ھذا کی تشریح کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

« وَالحَدِيثُ يَدُلُّ عَلٰى جَوَازِ القِرَاءَ ةِ لِلمُحدِثِ بِالحَدَثِ الأَصغَرِ. وَهُوَ مَجمَعٌ عَلَيهِ. لَم نَرَ فِيهِ خِلَافًا عَلٰى عَدَمِ الجَوَازِ لِلجُنُبِ. وَ قَد وَرَدَت أَحَادِيثُ فِي تَحرِيمِ قِرَاءَ ةِ القُرأٰنِ لِلجُنُبِ، فِي كُلِّهَا مَقَالٌ ، لٰكِنَّ تَحصُلُ القُوَّةُ بِانضِمَامِ بَعضِهَا بِبَعضٍ لِأَنَّ بَعضَ الطُّرُقِ لَيسَ فِيهِ شَدِيدُ الضُّعفِ، وَ هُوَ يَصلُحُ أَن يَتَمَسَّكَ بِهِ.»

یعنی ''یہ حدیث اس بات پر دال ہے کہ حدثِ اصغر (بے وضوء) کی حالت میں قراءۃ جائز ہے۔ مسئلہ ہذا میں ہمیں کسی کا خلاف معلوم نہیں ہو سکا۔ یہ حدیث اس پر دال ہے کہ جُنبی کے لیے قراءۃ ناجائز ہے۔ کئی ایک احادیث جُنبی کی حرمتِ قراءۃ کے بارے میں وارد ہیں۔ سب میں مقال ہے لیکن بعض کے بعض سے انضمام (ملانے) کی شکل میں قوت حاصل ہوتی ہے۔ کیونکہ بعض طرق میں زیادہ ضعف نہیں۔ وہ لائقِ عمل اور قابلِ تمسک (قابلِ حجت) ہیں۔''

''فتح الباری'' (۱/ ۴۰۸) میں ہے: « وَالحَقُّ أَنَّهُ مِن قَبِيلِ الحَسَنِ يَصلُحُ لِلحُجَّةِ»

یعنی ''حق بات یہ ہے کہ حدیث مذکور حسن کے قبیل سے ہے اور قابلِ حجت ہے۔''

نیز ''صحیح بخاری'' کی تبویب ''بَابُ قِرَاءَ ةِ القُرأٰنِ بَعدَ الحَدَثِ'' وغیرہ میں بھی حدثِ اصغر کی صورت میں بلا وضو جوازِ قراءتِ قرآن کی طرف اشارہ ہے۔

اور آیت کریمہ ﴿لَا يَمَسُّهُ إِلَّا المُطَهَّرُونَ﴾ کی تفسیر میں کئی قول ہیں۔ ایک قول کے مطابق ﴿لَا يَمَسُّهُ إِلَّا المُطَهَّرُونَ﴾ میں ضمیر کا مرجع لوح محفوظ ہے اور جملہ خبریہ ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ ''المُطَهَّرُونَ'' سے مراد بنی آدم ہیں ''ہٗ'' ضمیر کا مرجع مصحف ہے۔ جملہ خبریہ بمعنی ''نہی'' ہے۔ اس دوسری تفسیر کی بناء پر بلا طہارت ''مَسِّ مصحف'' (قرآن کو ہاتھ لگانا) ناجائز ہوگا۔ بہر حال آیت ہذا محتمل

① سنن أبی داؤد، بَابٌ فِی الجُنُبِ يَقرَأُ القُرآنَ، رقم: ۲۲۹

وجہین (دونوں وجوہ کا احتمال رکھتی) ہے۔ مانعین (منع کرنے والے) کا استدلال رسول اللہ ﷺ کی اس چٹھی سے ہے جو عمرو بن حزم رضی اللہ عنہ کو لکھ کر دی تھی جب کہ انھیں اہل یمن کی طرف بھیجا تھا۔ ''دارقطنی'' میں ہے:

«اَنَّ النَّبِیَّ ﷺ کَتَبَ اِلَی الیمنِ کِتَابًا، وَ کَانَ فِیهِ:لَا یَمَسُّ القُرانَ إِلَّا طَاهِرٌ.» [1]

''نبی ﷺ نے اہلِ یمن کو خط لکھا۔ اس میں مذکور تھا صرف طاہر انسان قرآن کو مَس کرے۔''

حدیث ہذا سند کے لحاظ سے اگرچہ متکلم فیہ ہے لیکن حافظ ابن عبدالبر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

« إِنَّهُ أَشبَهَ المُتَوَاتِرِ فِی مَجِیئِهِ لِتَلَقِّی النَّاسِ لَهُ بِالقُبُولِ »

(یہ متواتر کے مشابہ ہے کیونکہ عوام میں اسے درجۂ قبول حاصل ہے) یعقوب بن سفیان کا بیان ہے کہ اس سے زیادہ صحیح خط کا علم مجھے نہیں ہو سکا۔

کیونکہ اصحاب رسول اللہ رضی اللہ عنہم اور تابعین رحمہم اللہ اسی کی طرف رجوع کرتے تھے اور اپنی آراء کو ترک کردیتے۔ نیز عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ اور زہری نے بھی اس خط کی صحت کی شہادت دی ہے۔

علامہ شوکانی رحمہ اللہ ''نیل الأوطار'' (۱/۲۳۶) میں فرماتے ہیں:

« وَالحَدِیثُ یَدُلُّ عَلَی أَنَّهُ لَا یَجُوزُ مَسُّ المُصحَفِ إِلَّا مَن کَانَ طَاهِرًا.»

یعنی حدیث ہذا اس بات پر دال ہے کہ قرآن کو صرف وہی شخص چھو سکتا ہے جو طاہر ہو۔

واضح ہو کہ شرع میں طہارت کے چار اطلاقات ہیں:

① اوّلاً: مومن بمقابلہ کافر۔ قرآن میں ہے: ﴿إِنَّمَا المُشرِکُونَ نَجَسٌ﴾ (مشرکین پلید ہیں) حدیث میں ہے: « اَلمُؤمِنُ لَا یَنجُس » ''مومن نجس (پلید) نہیں ہوتا۔'' [2]

② ثانیاً: حدَثِ اکبر یعنی جنابت وغیرہ سے طہارت حاصل کرنا۔ قرآن میں ہے: ﴿وَ اِن کُنتُم جُنُبًا فَاطَّهَّرُوا﴾

③ ثالثاً: حدثِ اصغر، خروجِ ریح وغیرہ سے وضو کرنا۔ حدیث میں ہے: «دَعهُمَا فَاِنِّی اَدخَلتُهُمَا طَاهِرَتَینِ» [3]

---

① سنن الدارمی، بَابُ لَا طَلَاقَ قَبلَ نِکَاحٍ، رقم: ۲۳۱۲، سنن الدارقطنی، بَابٌ فِی نَهیِ المُحدِثِ عَن مَسِّ القُرآنِ، رقم: ۴۳۷

② صحیح البخاری، بَابٌ: الجُنُبُ یَخرُجُ وَیَمشِی فِی السُّوقِ ...، رقم: ۲۸۵

③ صحیح البخاری، بَابُ إِذَا أَدخَلَ رِجلَیهِ وَهُمَا طَاهِرَتَانِ، رقم: ۲۰۶

④ رابعاً: وہ شخص جس کے بدن پر نجاستِ حسّی ہو حُکمی نہ ہو۔ (مذکورہ آیت کی تفسیر میں) قاضی شوکانی رحمہ اللہ کا کہنا ہے کہ جس کے ہاں مشترک لفظ کا جملہ اس کا (کئی) معانی پر اطلاق جائز ہے۔ اس نے یہاں جمیع معانی پر محمول کیا ہے۔ میری رائے میں مشترک (لفظ) چونکہ مجمل ہے لہٰذا بیان کے بغیر اس پر عمل نہ کیا جائے۔ ''داؤد الظاہری'' کے سوا علماء کا اجماع ہے کہ حدثِ اکبر میں مسِ مصحف ناجائز ہے اور حدثِ اصغر میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، شعبی، ضحاک، زید بن علی اور داؤد رحمہم اللہ جواز کے قائل ہیں انتہی۔ ''مرعاة المفاتیح'' (۱/۳۰۶) میں ہے:

«وَ قَالَ قَاسِمٌ وَ أَكْثَرُ الْفُقَهَاءِ، وَمِنْهُمُ الْأَئِمَّةُ الْأَرْبَعَةُ: لَا يَجُوزُ. قُلْتُ: الْقَوْلُ الرَّاجِحُ عِنْدَنَا هُوَ قَوْلُ أَكْثَرِ الْفُقَهَاءِ. وَ هُوَ الَّذِي يَقْتَضِيهِ تَعْظِيمُ الْقُرْاٰنِ، وَ إِكْرَامُهُ. وَالْمُتَبَادِرُ عَنْ لَفْظِ "طَاهِرٍ" فِي هٰذَا الْحَدِيثِ، وَ هُوَ طَاهِرٌ عَنِ الْحَدَثِ الْأَصْغَرِ: أَيِ الْمُتَوَضِّئُ وَ هُوَ الْفَرْدُ الْكَامِلُ لِلطَّاهِرِ»

یعنی قاسم اور اکثر فقہاء جن میں ائمہ اربعہ بھی شامل ہیں ان کا مسلک ہے کہ حدثِ اصغر کی صورت میں مسِ مصحف ناجائز ہے، اور میں کہتا ہوں کہ ہمارے نزدیک راجح اور مختار قول اکثر فقہاء کا ہے۔ قرآنِ کریم کی تعظیم و تکریم کا تقاضا بھی یہی ہے۔ اس حدیث میں لفظِ طاہر سے مراد متبادر الی الذہن (جو بات فوراً ذہن میں آتی ہے) حدثِ اصغر سے طہارت حاصل کرنا ہے۔ یعنی باوضو ہونا، طاہر کا فرد کامل وہی ہے۔''

بچوں کو بلا وضو قرآن مجید پکڑنے کی امام مالک رحمہ اللہ سے اجازت منقول ہے۔ چنانچہ ''بدایة المجتهد'' (جزء اوّل ص:۴۳) پر ہے:

«وَرَخَّصَ مَالِكٌ لِلصِّبْيَانِ فِي مَسِّ الصُّحُفِ عَلٰى غَيْرِ طُهْرٍ. لِأَنَّهُمْ غَيْرُ مُكَلَّفِينَ.»

یعنی ''امام مالک رحمہ اللہ نے بچوں کو مسِ مصحف کی بلا وضو چھونے کی اجازت دی ہے اس لیے کہ وہ غیر مکلّف ہیں۔''

نیز حدیث میں ہے: «رُفِعَ الْقَلَمُ عَنْ ثَلَاثٍ، وَ عَنِ الصَّبِيِّ حَتّٰى يَحْتَلِمَ»[1]

اس سے معلوم ہوا کہ بچے طہارت کے مکلّف نہیں ہیں۔ بلا وضو قرآن پکڑ سکتے ہیں۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ جنابت میں قرآن مجید کی تلاوت ناجائز ہے، البتہ حدثِ اصغر خروج ریح وغیرہ

[1] سنن ابی داؤد، بَابٌ فِي الْمَجْنُونِ يَسْرِقُ أَوْ يُصِيبُ حَدًّا، رقم: ۴۴۰۱

سے بے وضو ہونے کی صورت میں جائز ہے۔ جیسا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی حدیث اس پر دلالت کرتی ہے اور مسِ مصحف کے سلسلہ میں اَولیٰ اور اَحوَط (بہتر اور اچھا) مسلک یہ ہے کہ چھونے والا باوضو ہو۔ واللہ تعالیٰ أعلم بالصواب.

کیا غسل وضو کے قائم مقام ہوسکتا ہے؟

سوال کیا صرف نہانے سے ہی وضو ہو جاتا ہے؟ جب کہ وضو کی کوئی نیت نہ ہو، نہ ہی غسل کرنا ہو۔ صرف نہانا ہی مقصود ہو۔

جواب جمہور اہل علم کے نزدیک چونکہ وضو میں نیت اور اعضاءِ وضو کو بالترتیب دھونا ضروری ہے۔ لہٰذا صرف غسل یا نہانے سے وضو نہیں ہو گا۔ حدیث میں ہے: «إِنَّمَا الاَعمَالُ بِالنِّيَّاتِ»[1] یعنی اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے۔ اور قرآن میں ہے:

﴿ وَ مَآ اُمِرُوٓا اِلَّا لِيَعبُدُوا اللّٰهَ مُخلِصِينَ لَهُ الدِّينَ ﴾ (البينة:٥)

''اور ان کو تو یہی حکم ہوا تھا کہ اخلاص کے ساتھ اللہ کی عبادت کریں۔''

وجہِ استدلال یہ ہے کہ عبادت میں اخلاص اس وقت تک ناممکن ہے جب تک نیت میں خلوص پیدا نہ ہو۔

سوال اگر غسل سے پہلے یا بعد میں وضو نہ کیا جائے تو کیا غسل ہی نماز کے لیے کافی ہے؟

جواب غسل، وضو کے قائم مقام نہیں ہوسکتا، لہٰذا علیحدہ وضو کرنا ضروری ہے۔

سوال شرح معانی الآثار میں امام طحاوی رحمہ اللہ اذان کے بعد کی دُعا (اللهم رب هذه الدعوة...... الخ) کو اس سند کے ساتھ نقل کرتے ہیں: حدثنا عبد الرحمن بن عمرو الدمشقی قال ثنا علی بن عباس قال ثنا شعیب بن ابی حمزة عن محمد ابن المنکدر عن جابر بن عبدالله الخ (ملاحظہ فرمائیں: کتاب الصلوٰۃ:باب ما یستحب للرجل ان یقوله إذا سمع الاذان، مترجم کتاب کی حدیث نمبر ۸۲۱)

اس روایت میں عبدالرحمٰن بن عمرو دمشقی کے علاوہ باقی سب راوی صحیح بخاری کی روایت کے ہیں۔ اس روایت میں محمد سے پہلے سیدنا کے الفاظ ہیں۔ کیا یہ اضافہ صحیح ہے اور مزید یہ کہ عبدالرحمٰن بن عمرو دمشقی صحاحِ ستہ کی کس کتاب کے راوی ہیں اور ان سے کس باب میں کوئی روایت آئی ہے؟

[1] صحيح البخاري، كَيفَ كَانَ بَدءُ الوَحيِ إِلَى رَسُولِ اللّٰهِ ﷺ؟، رقم:١

جواب شرح معانی الآثار میں مذکورہ حدیث میں سیدنا کا اضافہ شاذ مدرج ہے۔ علامہ البانی فرماتے ہیں:

« وهی شاذة مدرجة ظاهره الإدراج » (إرواء الغليل:۱/۲۶۱)

اس روایت کے راوی عبدالرحمٰن بن عمرو بن عبداللہ بن صفوان النصری ابوزرعہ دمشقی کے بارے میں تقریب میں ہے: ثقة حافظ مصنف یعنی ثقہ حافظ اور صاحبِ تصانیف ہے۔ اور سنن أبو داود[1] میں اس کی روایت موجود ہے۔ ائمہ فن نے اس پر/د (ابوداؤد) کی علامت دی ہے جو اس امر کی واضح دلیل ہے۔

کیا غسل سے پہلے کیا ہوا وضوء نماز کے لیے درست ہے؟

سوال کیا غسل سے پہلے ننگے ہونے کی حالت میں کیا ہوا وضو نماز کے لیے درست ہے؟

جواب حالتِ غسل میں کیا ہوا وضو نماز کے لیے کافی ہوسکتا ہے بشرطیکہ اس کے بعد آدمی قُبل یا دُبر وغیرہ کو مَس نہ کرے۔ حدیث بُسرہ بنت صفوان (رضی اللہ عنہا) میں ہے:

« إِذَا مَسَّ أَحَدُكُم ذَكَرَهُ فَلْيَتَوَضَّأْ.» (رواه مالك، و احمد، وابوداؤد، والترمذی، والنسائی، وابن ماجه، والدارمی)[2]

کیا امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے ۴۰ سال تک عشاء کے وضوء سے نمازِ فجر ادا کی تھی؟

سوال کیا امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے ۴۰ سال تک عشاء کے وضو سے فجر کی نماز ادا کی تھی؟

علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ اپنی شہرۂ آفاق تصنیف "البِدَايَة وَالنِّهَايَة" میں رقمطراز ہیں کہ: ''آپ چالیس سال تک عشاء کے وضوء سے صبح کی نماز ادا کرتے رہے۔ (البداية والنهاية: ۱۰/ ۵٤٦)

جب کہ علامہ ناصر الدین البانی اپنی کتاب ''نمازِ نبوی'' میں فرماتے ہیں: ''امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ چالیس سال تک عشاء کے وضوء سے فجر کی نماز ادا کرتے رہے۔ اس کی کوئی اصل نہیں۔''

اس کے علاوہ علامہ فیروز آبادی نے "الرَّدُّ عَلَى المُعتَرِضِ" میں اس کا تجزیہ پیش کرتے ہوئے اس کو واضح جھوٹ قرار دیا ہے۔ (نمازِ نبوی، ص: ۱۲۵)

جواب امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے بارے میں قصہ ہذا بالکل من گھڑت ہے۔ اس کی کوئی اصل نہیں۔ مولانا عبدالحی مرحوم نے بھی قصہ ہذا کو « إِقَامَةُ الحُجَّة » میں ذکر کیا ہے، لیکن بے بنیاد ہے۔ ویسے بھی انسانی

[1] سنن ابوداود، كتاب الفتن والملاحم، باب فی تعظيم قتل المؤمن ،رقم: ٣٧٢٤

[2] سنن أبي داؤد، بَابُ الْوُضُوءِ مِنْ مَسِّ الذَّكَرِ، رقم: ۱۸۱، سنن الترمذی، بَابُ الْوُضُوءِ مِنْ مَسِّ الذَّكَرِ، رقم: ۸۲، سنن النسائی، بَابُ الْوُضُوءِ مِنْ مَسِّ الذَّكَرِ، رقم: ٤٤٧

ضروریات کے پیشِ نظر اس کا وقوع ناممکنات میں سے ہے۔ نبی ﷺ سے صحیح مسلم وغیرہ میں یہ ثابت ہے کہ آپ نے ایک دفعہ ایک وضو سے پانچ نمازیں ادا کی تھیں۔ اس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے استعجاب (تعجب) کا اظہار کیا تو آپ نے فرمایا کہ میں نے اس فعل کو جان بوجھ کر کیا ہے۔ مقصود امت پر اظہار سہولت تھا۔

حضرت عبد اللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ سے آپ ﷺ نے فرمایا تھا: کہ ''تیری جان کا تجھ پر حق ہے، تیری آنکھ کا تجھ پر حق ہے اور تیرے اہل خانہ کا تجھ پر حق ہے۔ قصہ ہذا اس کے منافی ہے۔ پھر تین وہ اشخاص جن میں سے ایک نے کہا تھا کہ میں ہمیشہ روزہ رکھوں گا، دوسرے نے کہا کہ میں نکاح نہیں کروں گا اور تیسرے نے کہا کہ میں رات بھر نہیں سوؤں گا۔ نبی ﷺ نے ان کے اس عزمِ نیکی کو پسند نہیں فرمایا۔ جواباً فرمایا: میں سب سے زیادہ متقی پرہیز گار ہوں۔ میں سوتا بھی ہوں اور جاگتا بھی۔ روزے رکھتا بھی ہوں اور چھوڑتا بھی۔ اس طرح میں نے کئی نکاح بھی کیے ہیں۔« فَمَن رَغِبَ عَن سُنَّتِي فَلَيسَ مِنِّي »[1]

''جو میرے طریقہ سے بے رغبتی کرے وہ مجھ سے نہیں۔''

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ مختلف فرائض کی ادائیگی کے لیے آپ ﷺ نے اوقاتِ کار کو تقسیم کیا ہوا تھا۔ بفرضِ صحت امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا قصہ صریحاً اس حدیث کے خلاف ہے۔ اس طرح سے کئی قسم کے حقوق کا ضیاع (ضائع ہونا) لازم آتا ہے جو عقل و دانش کے منافی فعل ہے۔

لہٰذا امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے بارے میں ہمارا حسنِ ظن یہ ہے کہ وہ اس قسم کے وضعی اور من گھڑت قصوں سے مبرّا تھے۔ ''علی رؤس الاشہاد'' (واضح طور پر) ان کا اعلان ہے۔

« إِذَا صَحَّ الحَدِيثُ فَهُوَ مَذهَبِي. » (میزان الکبریٰ)

''صحیح حدیث ہی میرا مسلک ہے۔''

توقع ہے کہ اصلاً امام صاحب کا مسلک و عمل بھی اسی کے مطابق ہوگا جو کچھ احادیثِ بالا میں ذکر ہوا ہے۔ (واللہ تعالیٰ أعلم و علمه أتم)

کیا ہر وقت باوضو رہنا اور ہر تحیۃ الوضوء ادا کرنا ضروری ہے؟

سوال ہر وقت باوضو رہنا کیسا ہے؟ کیا ہر وضو کے بعد دو رکعت پڑھنا ضروری ہوں گی؟ اگر کسی وضو کے بعد ''تحیۃ الوضوء'' پڑھے اور کبھی نہ پڑھے تو کیسا ہے تحیۃ الوضوادا نہ کرنے کی صورت میں بھی باوضو رہنا افضل ہے؟

جواب باوضو رہنا باعثِ فضیلت ہے اور وضو کے بعد دو رکعت ادا کرنے کی صرف ترغیب ہے، واجب

[1] صحيح البخاري، بَابُ التَّرغِيبِ فِي النِّكَاحِ، رقم: ٥٠٦٣

نہیں۔ یعنی ''تحیۃ الوضوء'' صرف مستحب ہے۔ کوئی دوسری نماز بھی اس کے قائم مقام ہو جاتی ہے۔ وضو کے بعد اگر دو رکعت نہ بھی پڑھی جائیں تو کوئی حرج نہیں، البتہ حسنِ نیت پر وضو کا ثواب ضرور ملے گا۔

نماز کی فرضیت کا حکم نازل ہونے سے قبل وضوء کا طریقہ کیا تھا؟

سوال یہ بات واضح ہے کہ واقعۂ معراج نبوت کے دسویں سال ہوا، اور شبِ معراج کو ہی نماز کی فرضیت ثابت ہے جب کہ جس سورت میں وضو اور تیمّم کا ذکر ہے وہ سورت (المائدہ) مدنی ہے اس حساب سے نماز کی فرضیت اور وضو کے حکم کے نزول میں تقریباً تین سال کا فرق ہے۔ سوال یہ ہے کہ اس دوران وضو کرنے کا کیا طریقہ رائج تھا؟

جواب وضوء والی آیت کے نزول سے قبل وضو کرنے کا یہی طریقہ تھا۔ اس کے خلاف ثابت نہیں ہو سکا۔ بلکہ پہلی امتوں میں بھی یہی طریقہ رائج تھا۔ فرق صرف اتنا ہے کہ آیۃ الوضو کے بعد یہ فرض متلو بن گیا جب کہ پہلے اس کی یہ حیثیت نہ تھی۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو! (فتح الباری:۱/۲۳۳)

کیا نیل پالش لگی ہو تو وضوء ہو جاتا ہے؟

سوال عموماً یہی سنا ہے کہ نیل پالش لگی ہو تو وضو نہیں ہوتا، وضو نہ ہوا تو نماز نہیں ہوتی۔ لیکن نیا مسئلہ یہ سنا ہے کہ جس طرح دیوار پر پینٹ کیا جائے تو وہ دیوار کا حصہ بن جاتا ہے اسی طرح نیل پالش ناخن پر لگانے سے اس کا حصہ بن جاتی ہے لہٰذا وضو ہو جاتا ہے۔ قرآن و سنت کی روشنی میں وضاحت کریں۔

جواب نیل پالش لگی ہو تو وضو نہیں ہوتا۔ قرآن میں ہے: ﴿فَاغْسِلُوا وُجُوهَكُمْ وَ أَيْدِيَكُمْ﴾ (المائدۃ:٦) ''وضو میں اپنے ہاتھ اور پاؤں کو دھویا کرو۔''

انگلیوں کا خلال اس لیے کیا جاتا ہے کہ تری کا اثر ہر عضو پر مکمل طور پر پہنچ جائے۔ ''صحیح بخاری'' کے ''ترجمۃ الباب'' میں ہے۔ ابنِ سیرین وضو کے وقت انگوٹھی کی جگہ کو دھوتے تھے۔[1] پالش ناخن کو دیوار کے پینٹ پر قیاس کرنا، قیاس مع الفاروق (بے جوڑ قیاس) ہے۔ ظاہر ہے پینٹ کی حیثیت مستقل ہے جب کہ موجودہ عمل وقتی اور عارضی ہے۔

کیا لِپ سٹک لگی ہو تو وضوء ہو جاتا ہے؟

سوال لپ سٹک (سرخی) لگائی ہو تو وضو ہو جاتا ہے یا نہیں؟ کیونکہ لپ سٹک ویزلین یا بالائی کی جگہ استعمال

[1] صحیح البخاری، باب غسل الأعقاب، قبل رقم الحدیث:١٦٥

ہوتی ہے۔فرق صرف اتنا ہے کہ یہ رنگدار ہوتی ہے۔

جواب لپ سٹک (سرخی) لگانے کی صورت میں اگر پانی نیچے تک سرایت نہ کرے تو اتار کر وضو کیا جائے۔ دلائل پہلے گزر چکے۔

وضوء میں پانی کو ضائع کرنے کا کیا حکم ہے؟

سوال سردیوں یا گرمیوں میں مسجد کی ٹونٹیوں میں پانی کا پائپ انتہائی شدید سرد یا گرم ہوتا ہے، ایک آدمی نے وضو کرنا ہو تو ایک لوٹے پانی کے لیے کثیر مقدار میں پانی بہادینا جائز ہے؟

جواب حتی المقدور پانی ضائع کرنے سے بچنا چاہیے، امام بخاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

« وَ كَرِهَ اَهلُ العِلمِ الاِسرَافَ فِيهِ.»

ہلال بن یساف نے کہا:

« كَانَ يُقَالُ: مِنَ الوُضُوءِ اِسرَافٌ وَ لَو كُنتَ عَلٰى شَاطِئِ نَهرٍ.» (فتح الباری:١/ ٣٢٤)

یعنی ''اہل علم نے وضو میں اِسراف (پانی زیادہ بہانے) کو ناپسند کیا ہے، خواہ آدمی نہر کے کنارے پر ہی کیوں نہ ہو۔''

تیمّم کے احکام ومسائل

مکان کی دیواریں مٹی میں گوبر استعمال کر کے لیپی گئی ہوں تو ان پر تیمّم کا کیا حکم ہے؟

سوال دیہات میں عموماً مکان کچے ہوتے ہیں، دیواریں مٹی میں گوبر وغیرہ ملا کر لیپی جاتی ہیں، کیا ان پر تیمّم کیا جاسکتا ہے یا نہیں؟ نیز مٹی صرف ہاتھوں تک محدود ہو یا جہاں ہاتھوں کا ذکر ہے وہ کہنیوں تک اور ہاتھوں کی انگلیوں کا خلال بھی ضروری ہے یا نہ؟

جواب مکان کی لپائی کی صورت مٹی میں ملاوٹ شدہ گوبر اگر تو ''مأکول اللحم'' (حلال) جانور کا ہے تو اس دیوار سے تیمّم ہوسکتا ہے۔اس کا طریقہ کار یہ ہے کہ طہارت کی نیت سے پاک مٹی کا قصد کر کے اسے ہاتھوں اور منہ پر ملنا۔تفصیل اس امر کی یوں ہے کہ صرف ایک دفعہ دونوں ہتھیلیوں کو زمین پر مار کر ان میں پھونک مارے۔پھر دائیں ہاتھ کی ہتھیلی کو بائیں ہاتھ کی پشت پر پھیرے اور بائیں ہاتھ کی ہتھیلی کو دائیں کی پشت پر، پھر دونوں ہاتھوں کو منہ پر مل لے۔بس اتنا ہی کافی ہے۔مزید کسی عمل کی ضرورت نہیں۔''صحیحین'' میں صرف

اسی کیفیت کا ذکر ہے۔دلائل کی رُو سے یہی قابلِ اعتماد ہے۔خلال وغیرہ کی ضرورت نہیں۔

کیا گرد آلود کپڑے پر تیمّم جائز ہے؟

(سوال) جب کوئی کپڑا جو بظاہر ناپاک نہ ہو مگر جس پر گرد کی تہہ جمی ہو یعنی اتنی مٹی لگی ہو کہ ہاتھ مارنے سے دھول اڑے، ایسے کپڑے پر تیمّم جائز ہے کہ نہیں؟

(جواب) گرد آلود کپڑے پر تیمّم جائز ہے کیونکہ مقصود مٹی کا حصول ہے سو وہ حاصل ہے۔

فرضی غسل کی صورت میں باجماعت نماز ادا کرنے کے لیے پانی تلاش کرے یا تیمّم؟

(سوال) آدمی پر جنابت یا احتلام کے باعث غسل فرض ہو گیا لیکن اس کے گھر میں پانی نہیں۔ جبکہ فجر کا وقت ہو چکا ہے۔آیا وہ وضو کر کے نماز باجماعت ادا کرے یا تیمّم کر کے نماز اَدا کرے؟

(جواب) ایسی حالت میں پہلے پانی تلاش کرنا چاہئے اور اگر پانی نہ مل سکے اور نماز کے وقت کے فوت ہونے کا ڈر ہو یا خوف کی وجہ سے پانی تک پہنچنے کی قدرت نہ ہو تو ایسی صورت میں تیمّم کر کے نماز پڑھی جا سکتی ہے، ورنہ نہیں۔صحیح بخاری میں ایک باب کا عنوان یوں ہے:

- « باب التیمم فی الحضر إذا لم یجد الماء وخاف فوت الصلاة وبه قال عطاء»

”مقیم ہونے کی حالت میں جب آدمی کو پانی نہ ملے اور نماز فوت ہونے کا ڈر ہو تو تیمّم کا بیان“

بوجہ مجبوری قرآن مجید کو بے وضو ہاتھ لگانا؟

(سوال) اگر بچوں کو قرآن پڑھانے والا ایسا بیمار ہو کہ ایک فرض نماز (مثلاً چار رکعت) کی ادائیگی سے زیادہ وقت تک باوضو نہ رہ سکتا ہو، اگر وہ بار بار وضو کرے تو دن بھر اسی میں مشغول رہے گا، کیا ایسا شخص مجبوری کی وجہ سے قرآن مجید کو بے وضو ہاتھ لگا سکتا ہے یا نہیں؟

(جواب) اس طرح کے شخص کو معافی مل سکتی ہے کیونکہ اسے مشقت ہوتی ہے۔لیکن وہ تیمّم کر لے، کیونکہ تیمّم میں وضو سے کم وقت لگتا ہے۔اگر پھر بھی مشقت باقی رہے تو کوئی حرج نہیں۔[1]

---

[1] اس میں کوئی شک کی گنجائش نہیں کہ قرآن پڑھنے، پڑھانے اور چھونے کے لیے باوضو ہونا مستحب اور افضل ہے، لیکن وضو کے وجوب پر کوئی صحیح اور صریح دلیل نہیں خواہ آدمی مجبور نہ بھی ہو۔قرآن پڑھنے، پڑھانے یا چھونے کے لیے وضو کے ضروری ہونے پر جن دلائل سے استدلال کیا گیا ہے وہ تمام کے تمام احتمالی ہیں، یقینی اور صریح نہیں۔ واللہ اعلم (محمد شفیق مدنی)

میک اَپ میں دلہن کا وضوء کی بجائے تیمّم کرنا:

(سوال) آج کل دلہن کے میک اپ پر بہت روپیہ خرچ کیا جاتا ہے۔ شادی کے دوران اگر نماز کا وقت ہوجائے تو وضو کرنے کی صورت میں دلہن کا سارا میک اپ خراب ہوجاتا ہے۔ بار بار میک اپ کرنا تو ویسے بھی ممکن نہیں۔ نتیجتاً دلہن نماز ادا نہیں کرتی ان حالات میں فقہ مالکیہ میں دلہن کے لیے رعایت ہے کہ وہ تیمّم کر کے نماز ادا کرے۔ اس بات کو مدنظر رکھتے ہوئے قرآن و حدیث کی روشنی میں جواب سے مستفید فرمائیں۔ شکریہ

(جواب) سورۃ المائدۃ آیت نمبر ٦ میں اللہ رب العزت نے ہر مومن مرد اور عورت کو حکم دیا ہے کہ بوقتِ نماز وضو کریں۔ مرض اور پانی نہ ملنے کی صورت میں تیمّم کی رخصت دی ہے۔ جب کہ یہاں صورت حال یہ ہے کہ پانی موجود ہے محض میک اپ کو محفوظ رکھنے کے لیے تیمّم کرنے کا سوچا جا رہا ہے، جو کسی اعتبار سے درست نہیں۔ بعض فقہاء کی طرف منسوب مسئلہ اس بارے میں مرجوح (قابلِ حجت نہیں) ہے۔ اس پر عمل کی گنجائش نہیں۔

نبی ﷺ نے تنگ جبے سے اپنے بازوؤں کو نکال کر وضو کے لیے دھویا تھا۔[1]

اس سے معلوم ہوا کہ تنگی کے باوجود شرعی احکام کی پابندی ضروری ہے۔ اسی طرح دلہن کا میک اپ اگرچہ خراب ہو جائے۔ پھر بھی وضو کرنا ضروری ہے۔

یاد رہے کہ میک اپ بذاتِ خود اسراف (فضول خرچی) ہے، جو شریعت کی نگاہ میں ایک مذموم امر ہے۔ جس سے بہرصورت بچنا چاہیے۔ قرآن مجید میں ہے:

﴿اِنَّ الْمُبَذِّرِيْنَ كَانُوْٓا اِخْوَانَ الشَّيٰطِيْنِ وَكَانَ الشَّيْطٰنُ لِرَبِّهٖ كَفُوْرًا﴾ (الاسراء: ٢٧)

''فضول خرچی کرنے والے تو شیطان کے بھائی اور شیطان اپنے پروردگار (کی نعمتوں) کا کفر ان (ناشکری) کرنے والا ہے۔''

موزوں اور جرابوں پر مسح کے احکام و مسائل

کیا جرابوں پر مسح کرنا سنت سے ثابت ہے؟

(سوال) کیا جرابوں پر مسح کرنا سنت سے ثابت ہے؟ کیا اس کا کوئی ٹھوس ثبوت ہے۔ اگر ہے تو احناف اس

---

[1] سنن النسائی، بَابُ الْمَسْحِ عَلَى الْخُفَّيْنِ فِي السَّفَرِ، رقم:١٢٥

کی مخالفت کیوں کرتے ہیں؟

(جواب) جرابوں پر مسح کرنا جائز ہے۔ سنن ابی داؤد اور ترمذی وغیرہ میں حدیث ہے:

« عَنِ الْمُغِيرَةِ بنِ شُعبَةَ اَنَّ النَّبِيَّ ﷺ مَسَحَ عَلَى الجَورَبَينِ وَالنَّعلَينِ.»①

''نبی ﷺ نے جرابوں اور جوتوں پر مسح کیا۔''

امام ترمذی رحمہ اللہ نے اس پر ''حسن صحیح'' کا حکم لگایا ہے۔ اس حدیث کے تمام راویوں سے امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی ''صحیح'' میں دلیل لی ہے۔ وہ سب ثقہ ہیں۔ امام ابوداؤد رحمہ اللہ وغیرہ کی علّت غیر مؤثر ہے، کیونکہ اس کی سند صحیح ہے اور اس کے رجال ثقہ ہیں بلکہ اس میں ثقہ راوی کی زیادتی ہے، جو قابلِ قبول ہے۔ اسی بناء پر علامہ البانی رحمہ اللہ نے اس کو صحیح کہا ہے۔

اسی طرح حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے نبی ﷺ سے بیان کیا ہے کہ

« اَنَّهُ مَسَحَ عَلَى الجَورَبَينِ.»② ''آپ ﷺ نے جرابوں پر مسح کیا۔''

اس کی سند حسن درجے کی ہے۔ ملاحظہ ہو! صحیح سنن ابی داوٗد (۵۲/۱)

نیز امام ابوداؤدؒ نے درج ذیل صحابہ کرامؓ سے جرابوں پر مسح کا جواز نقل کیا ہے۔ علی بن ابی طالب، ابن مسعود، براء بن عازب، انس بن مالک، ابو امامہ، سہل بن سعد، عمرو بن حریث، عمر بن خطاب اور ابن عباس (رضی اللہ عنہم) ان کے علاوہ دیگر کئی ایک اہل علم بھی اسی بات کے قائل ہیں اور وہ یہ ہیں: امام احمد بن حنبل، اسحاق بن راہویہ، عبداللہ بن مبارک، سفیان ثوری، عطاء بن ابی رباح، حسن بصری، سعید بن مسیّب اور ابو یوسف (رحمہم اللہ)۔

حنفیہ کی مخالفت محض اپنے مذہبِ امام کی پابندی (تقلید) کی بناء پر اور بلادلیل ہے۔ علامہ جمال الدین قاسمی کی تصنیف ''اَلْمَسحُ عَلَى الجَورَبَينِ'' اس سلسلے میں بڑی مفید تالیف ہے۔ اردو میں اس کا ترجمہ بھی شائع ہو چکا ہے۔

باریک جرابوں پر مسح کرنا:

(سوال) علمائے اہلِ حدیث کے نزدیک جرابوں پر مسح جائز ہے۔ اس لیے یہ حضرات جراب پر مسح کر کے نماز

① سنن أبي داؤد،بَابُ الْمَسحِ عَلَى الْجَورَبَيْنِ،رقم:۱۵۹،سنن الترمذي،بَابٌ فِي الْمَسحِ عَلَى الْجَورَبَيْنِ وَالنَّعلَيْنِ،رقم:۹۹

② سنن أبي داؤد،بَابُ الْمَسحِ عَلَى الْجَورَبَيْنِ،رقم:۱۵۹

پڑھا دیتے ہیں۔سوال یہ ہے کہ اگر امام صاحب نے باریک جراب پر، جسے اتارنا بھی کچھ مشکل نہیں مسح کیا اور نماز پڑھا دی تو کیا مقتدی کی نماز ہو جائے گی۔ نیز یہ کہ جراب پر اگر مسح ہو جاتا ہے تو کیا تمام قسم کی جرابیں جن میں جالی والی جرابیں بھی ہیں، کا حکم ایک جیسا ہے۔اس کا جواب دیں۔دلیل بھی درج کر دیں اور حوالہ جات بھی تحریر فرما دیں۔شکریہ

جواب لغت کی کتاب القاموس میں ہے:اَلْجَورَبُ لَفَافَةُ الرِّجلِ. ’’جراب پاؤں کے غلاف کا نام ہے‘‘

حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ:

« تَوَضَّاءَ النَّبِیُّ ﷺ ، وَ مَسَحَ عَلَی الجَورَبَینِ وَالنَّعلَینِ . قَالَ أَبُو عِیسٰی: هٰذَا حَدِیثٌ حَسَنٌ صَحِیحٌ.» [1]

’’نبی ﷺ نے وضو کیا تو جرابوں اور جوتوں پر مسح کیا۔‘‘

امام ابوعیسیٰ ترمذی رحمہ اللہ نے فرمایا ہے: کہ یہ حدیث حسن صحیح ہے۔

علامہ البانی رحمہ اللہ نے بھی حدیث ہذا کو صحیح قرار دیا ہے۔امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

« وَ هُوَ قَولُ غَیرِ وَاحِدٍ مِن أَهلِ العِلمِ. وَ بِهٖ یَقُولُ سُفیَانُ الثَّورِیُّ، وَ ابنُ المُبَارَكِ وَالشَّافِعِیُّ ، وَأَحمَدُ ، وَ إِسحَاقُ (رحمهم الله اجمعین)، قَالُوا : یُمسَحُ عَلَی الجَورَبَینِ ، وَ اِن لَم تَکُن نَعلَینِ اِذَا کَانَا ثَخِینَینِ.»

یعنی ’’کئی ایک اہل علم کا قول یہی ہے۔سفیان ثوری، عبداللہ بن مبارک، شافعی، احمد اور اسحاق سب اسی بات کے قائل ہیں کہ جرابوں پر مسح کرنا جائز ہے۔ جب وہ موٹی ہوں، خواہ جوتے نہ بھی ہوں۔‘‘

نیز ابو مقاتل سمرقندی رحمہ اللہ کا بیان ہے کہ میں امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے مرض الموت میں ان کے پاس گیا، انہوں نے پانی منگوا کر وضو کیا تو جرابوں پر مسح کیا، پھر فرمایا: آج میں نے ایسا کام کیا ہے جو اس سے پہلے نہیں کیا۔ میں نے جرابوں پر مسح کیا حالانکہ وہ جوتے کی شکل بھی نہیں۔ [2]

معجم طبرانی میں حضرت بلال رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ

---

[1] سنن أبی داؤد،بَابُ الْمَسحِ عَلَی الْجَوْرَبَیْنِ، رقم:١٥٩، سنن الترمذی،بَابٌ فِی الْمَسحِ عَلَی الْجَوْرَبَیْنِ وَالنَّعْلَیْنِ،رقم:٩٩

[2] بحوالہ صحیح ترمذی (٧٤/١)

«كَانَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ يَمسَحُ عَلَى الخُفَّينِ وَالجَورَبَينِ.» [1]

''رسول اللہ ﷺ موزوں اور جرابوں پر مسح کرتے تھے۔''

درایہ میں ہے کہ اس حدیث کے سب راوی ثقہ ہیں۔ نیز حضرت علی، ابن مسعود، براء، انس، ابوامامہ، سہل بن سعد، عمرو بن حدیث، عمر بن خطاب اور ابن عباس رضی اللہ عنہم جرابوں پر مسح کیا کرتے تھے۔ ملاحظہ ہو! مختصر سنن ابی داؤد (۱/۱۲۱)

امام ابن قیم رحمہ اللہ نے ''تہذیب السنن'' (۱/۱۲۲) میں مسئلہ ہذا پر تفصیلی گفتگو کی ہے۔ فرماتے ہیں:

« وَالمَسحُ عَلَيهِمَا قَولُ أَكثَرِ أَهلِ العِلمِ.»

''اکثر اہل علم کا قول یہ ہے کہ جرابوں پر مسح کرنا جائز ہے۔''

امام محمد اور قاضی ابو یوسف (رحمہما اللہ) فرماتے ہیں: جب جرابیں موٹی ہوں، باریک نہ ہوں تو ان پر مسح کرنا جائز ہے۔ (قدوری باب المسح علی الخفین)

ابومسعود انصاری رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ وہ جرابوں پر مسح کرتے تھے۔ بظاہر ہر قسم کی جراب پر مسح کا جواز ہے، موٹی ہو یا باریک کیونکہ لغوی تعریف تمام قسم کی جرابوں پر صادق آتی ہے اور اکثر سلف نے بھی تفریق نہیں کی۔ مذکورہ دلائل سے معلوم ہوا کہ جرابیں پہنے ہوئے امام کی اقتداء میں نماز پڑھنا بلا تردُّد درست ہے۔

پتلی جرابوں پر مسح کرنا ناجائز ہے؟

سوال بعض حضرات پتلی جرابوں پر مسح کو ناجائز قرار دیتے ہیں ان کی شرط ہے کہ جراب اتنی موٹی ہو کہ اُس میں پاؤں نظر نہ آئے۔ کیا یہ درست ہے؟

جواب جرابوں پر مسح مطلقاً جائز ہے۔

جس شے کا نام ''جورب'' ہے اس پر مسح کرنا جائز ہے۔ چاہے موٹی ہو یا باریک۔ لغت میں ''جورب'' کی تعریف ''لَفَافَةُ الرِّجلِ '' یا ''غِشَاءُ القَدَمِ'' ہے تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو! (المسح علی الجوربین جمال الدین قاسمی)

سوال پاؤں دھونے کے بعد مجھے ٹھنڈک محسوس ہوتی رہتی ہے۔ میں نماز فجر کے لیے وضو کرنے کے بعد باریک جرابیں پہن لیتی ہوں اور باقی سارا دن جرابوں پر مسح کرکے نماز ادا کرلیتی ہوں۔ کیا باریک جرابوں

[1] المعجم الکبیر للطبرانی، رقم: ۱۰۶۳

پر مسح جائز ہے؟

(جواب) جرابوں پر مسح کا مطلقاً جواز ہے۔ چاہے موٹی ہوں یا باریک۔ میرے نزدیک راجح بات یہی ہے۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو! میری تالیف (جائزة الاحوذي :١/ ١١٤)

جرابیں کس قدر پھٹی ہوں تو اس پر مسح کرنا جائز نہیں رہتا:

(سوال) جرابیں کس قدر پھٹی ہوں تو اس پر مسح کرنا جائز نہیں۔

(جواب) جرابوں پر مسح کرنا مطلقاً جائز ہے۔ معمولی پھٹی کا کوئی حرج نہیں۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو! (الإيقاع :١/ ٥٤)

احناف کے نزدیک جرابوں پر مسح کرنا:

(سوال) اہلحدیث کے نزدیک جرابوں پر مسح کرنا جائز ہے جب کہ دیوبندی اسے جائز نہیں سمجھتے۔ مولانا ظفر احمد عثمانی صاحب نے "إعلاء السنن" میں جرابوں پر مسح کرنے کو جائز قرار دیا ہے۔ دیوبندی فقہ کی کسی اور کتاب کا حوالہ مطلوب ہے؟

(جواب) حنفی فقہ کی مشہور کتاب ''قدوری'' کے باب "المسح على الخفين" میں امام محمد اور قاضی ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہما سے موٹی جرابوں پر مسح کرنے کا جواز نقل کیا گیا ہے۔

(سوال) دیوبندی حضرات جرابوں پر مسح کرنے کے قائل نہیں ہیں۔ صرف موزوں پر مسح کرنا جائز سمجھتے ہیں اور وہ بھی ان شرائط کے ساتھ کہ موزے جس چیز کے بنے ہوں۔ اگر اُسے پانی لگایا جائے تو پانی دوسری طرف اثر نہ کرے۔ آدمی اگر یہ موزہ پہن کر جوتے کے بغیر دو کلو میٹر چلے تو موزہ نہ پھٹے وغیرہ۔ آیا یہ شرائط کسی حدیث سے اخذ کی گئی ہیں یا حنفی فقہاء کی ایجاد کردہ ہیں؟

(جواب) حنفی فقہاء نے موزوں پر مسح کے لیے جو شرطیں لگائی ہیں۔ شرع میں ان کا کوئی اصل نہیں۔ صحیح بات یہ ہے کہ جرابوں پر مسح جائز ہے۔ مسئلہ ہذا پر علامہ قاسمی کی مستقل تصنیف موجود ہے جس میں دلائل کی روشنی میں جواز بیان ہوا ہے۔

موزوں اور جرابوں پر مسح کی مدت کب شروع ہوگی:

(سوال) موزوں اور جرابوں پر مدتِ مسح کب شروع ہوتی ہے۔ ایک آدمی ظہر کے وقت وضو کر کے موزے

پہنتا ہے اس کی مدتِ مسح وضوٹوٹنے سے شروع ہوگی یا کہ ظہر کی نماز سے؟

(جواب) مسئلہ ہذا میں اہل علم کا راجح مسلک یہ ہے کہ مسح کی مدت وضوٹوٹنے کے بعد پہلے مسح سے شروع ہو گی، کیونکہ نبی ﷺ نے مسح کی مدت مقیم کے لیے ایک دن اور ایک رات جبکہ مسافر کے لیے تین دن اور ان کی راتیں مقرر فرمائی ہیں۔ [1]

مثلاً ایک غیر مسافر شخص نے ظہر کے وقت وضو کیا، پھر ظہر اور عصر کے درمیان بے وضو ہو گیا تو اس کی مدتِ مسح عصر سے شروع ہو کر کل عصر تک ہو گی اور چوتھے روز اسی وقت مسافر کی مدت بھی ختم ہو جائے گی۔

جرابوں پر مسح کا وقت کب شروع ہوگا؟

(سوال) جرابوں پر مسح کے لیے کیا وضو پورا کر کے اسی وقت جرابیں پہن لے یا وہی نماز پڑھ کر بھی جرابیں مسح کے لیے پہن سکتا ہے۔ نیز کس وقت سے جرابوں پر مسح کا وقت شروع ہوگا؟

(جواب) باوضو حالت میں جرابیں کسی وقت بھی پہنی جاسکتی ہیں۔ البتہ مدت مسح اس وقت شروع گی جب وضوٹوٹے گا۔ مقیم کے لیے ایک دن اور ایک رات ہے جب کہ مسافر کے لیے تین دن اور ان کی راتیں ہیں۔ [2]

فجر کے وقت وضو کر کے پہنی ہوئی جرابوں پر باقی تمام نمازوں کے وقت مسح کرنا:

(سوال) اگر صبح کی نماز کے لیے مکمل وضو کر کے جرابیں پہن لی جائیں تو کیا باقی نمازوں میں وضو کرتے وقت جرابوں پر مسح کرنا جائز ہے؟

(جواب) جرابوں یا موزوں پر مسح کی مدت ایک دن اور ایک رات بیان ہوئی ہے، بشرطیکہ آدمی مسافر نہ ہو اور مسافر کے لیے تین دن اور انکی راتیں ہیں۔ [3]

لہٰذا اتنی مدت کے اندر مسح کرنا جائز ہے۔

---

[1] صحیح مسلم، بَابُ التَّوْقِیتِ فِی الْمَسْحِ عَلَى الْخُفَّيْنِ ، رقم:۲۷۶

[2] صحیح مسلم، بَابُ التَّوْقِیتِ فِی الْمَسْحِ عَلَى الْخُفَّيْنِ ، رقم:۲۷۶

[3] صحیح مسلم، بَابُ التَّوْقِیتِ فِی الْمَسْحِ عَلَى الْخُفَّيْنِ ، رقم:۲۷۶

نواقضِ وضوء

وضوء توڑنے والے امور کے متعلق احکام ومسائل

کیا مَنی نکلنے سے وضوٹوٹ جاتا ہے؟

سوال مَنی نکلنے سے وضوٹوٹتا ہے کہ نہیں؟

جواب مَنی کے نکلنے سے وضوٹوٹ جاتا ہے۔ بلکہ غسل کرنا پڑتا ہے۔سنن ترمذی میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا: مذی نکلنے سے وضو(لازم) آتا ہے اور منی نکلنے سے غسل (لازم) آتا ہے۔ ①

جنازہ کوکندھا دینے سے وضوکا ساقط ہوجانا:

سوال کیا جنازہ کوکندھا دینے سے وضوساقط ہوجاتا ہے؟

جواب بایں صورت وضوکرنا چاہیے ایک روایت میں ہے کہ جس نے میت کونہلایا وہ خودنہالے اورجس نے اس کوکندھا دیا اُسے چاہیے کہ وضوبنالے۔گوائمہ نے حدیث ہذا کی صحت پرکلام کیا ہے۔

لیکن امام ابن قیم رحمہ اللہ ''تہذیب السنن'' میں رقمطراز ہیں: کہ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی اس حدیث کے گیارہ طُرق ہیں:

« وَهٰذِهِ الطُّرُقُ تَدُلُّ اَنَّ الحَدِيثَ مَحفُوظٌ.»

''اورکثرت طُرق اس بات کی دلیل ہے کہ حدیث محفوظ ہے۔''

ابن القطان اورامام ابن حزم (رحمہما اللہ) نے ''المحلّٰی" میں اس کی تصحیح کی ہے۔حافظ ابن حجر رحمہ اللہ ''تلخیص'' میں فرماتے ہیں کہ کم ازکم یہ حدیث حسن ہے۔

سوال کیا اونٹ کا گوشت کھانے سے وضوٹوٹ جاتا ہے،تفصیلاً جواب دیں؟

جواب اونٹ کا گوشت کھانے سے وضوٹوٹ جاتا ہے، راجح مسئلہ یہی ہے۔سنن ابوداود میں حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

① سنن الترمذي،بَابُ مَا جَاءَ فِي الْمَنِيِّ وَالْمَذْيِ،رقم:۱۱٤

« سُئِلَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ عَنِ الْوُضُوءِ مِنْ لُحُومِ الْإِبِلِ؟ فَقَالَ تَوَضَّئُوا مِنْهَا » ①

''رسول اللہ ﷺ سے اونٹ کا گوشت کھانے سے وضو کرنے کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا: اس سے وضو کرو۔''

امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: دلیل کے اعتبار سے یہ مسلک زیادہ پختہ ہے، اگرچہ جمہور کا مسلک اس کے خلاف ہے۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو: عون المعبود (۱/۷۲، ۷۳)

غیبت کرنے سے وضوء ٹوٹ جاتا ہے؟

سوال اگر کوئی شخص سردی کی وجہ سے ظہر اور عصر کے لئے ایک ہی وضو کرے، پھر ظہر کی نماز پڑھ کر نکلتے ہی دوستوں کے گلے شکوے شروع کردے تو کیا ایسی صورت میں وضو قائم رہتا ہے؟ (محمد شاہد، حجرہ شاہ مقیم، اوکاڑہ)

جواب وضو قائم ہے۔ ایک وضو سے دو نمازیں یا اس سے زیادہ بھی پڑھی جاسکتی ہیں۔ چنانچہ حدیث ہے کہ

«أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: صَلَّى الصَّلَوَاتِ يَوْمَ الْفَتْحِ بِوُضُوءٍ وَاحِدٍ»②

''نبی ﷺ نے فتح مکہ کے روز تمام نمازیں ایک ہی وضو سے ادا کیں۔''

اسی طرح صحیح بخاری کی روایت ہے کہ

«صَلَّى لَنَا رَسُولُ اللَّهِ ﷺ العَصْرَ، فَلَمَّا صَلَّى دَعَا بِالْأَطْعِمَةِ، فَلَمْ يُؤْتَ إِلَّا بِالسَّوِيقِ، فَأَكَلْنَا وَشَرِبْنَا، ثُمَّ قَامَ النَّبِيُّ ﷺ إِلَى المَغْرِبِ، فَمَضْمَضَ، ثُمَّ صَلَّى لَنَا المَغْرِبَ وَلَمْ يَتَوَضَّأْ»③

''رسول اللہ ﷺ نے عصر کی نماز پڑھی۔ اس کے بعد ستو کھایا پھر مغرب کی نماز پڑھی اور اس کے لیے وضو نہیں کیا۔''

چغلی غیبت بلاشبہ حرام ہے، تاہم اس سے وضو نہیں ٹوٹتا۔

آگ پر پکی ہوئی چیز کھانے سے وضو ٹوٹ جانا:

سوال حدیث میں آیا ہے کہ اگر کوئی چیز آگ پر پکی ہوئی ہے اور وہ آدمی کھا جائے تو اس کا وضو ٹوٹ جاتا

① سنن أبي داود، بَابُ الْوُضُوءِ مِنْ لُحُومِ الْإِبِلِ، رقم: ۱۸۴، سنن ابن ماجه، بَابُ مَا جَاءَ فِي الْوُضُوءِ مِنْ لُحُومِ الْإِبِلِ، رقم: ۴۹۴، صحيح مسلم، بَابُ الْوُضُوءِ مِنْ لُحُومِ الْإِبِلِ، رقم: ۳۶۰

② صحيح مسلم، بَابُ جَوَازِ الصَّلَوَاتِ كُلِّهَا بِوُضُوءٍ وَاحِدٍ، رقم: ۲۷۷

③ صحيح البخاري، بَابُ الْوُضُوءِ مِنْ غَيْرِ حَدَثٍ، رقم: ۲۱۵

ہے۔اور اسی مسئلہ پر بدیع الدین شاہ صاحب بھی صحیح مسلم کے حوالے سے ابن عمر رضی اللہ عنہما کا اثر اپنی کتاب "تمییز الطیب من الخبیث" میں لائے ہیں۔

تو کیا یہ حدیث صحیح ہے یا ضعیف؟ اگر صحیح ہے تو اہلِ حدیث کے ہاں اس حدیث پر عمل کیوں نہیں؟ اگر ضعیف ہے تو براہِ مہربانی اس حدیث اور اثرِ مرجوح نقل کر کے بھیجیں تو آپ کی مہربانی ہوگی یا اس حدیث اور اثر کا مطلب تفصیلاً فرمائیں۔

(جواب) مشارٌ الیہ حدیث تو صحیح ہے لیکن منسوخ ہے۔حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے:

« كَانَ آخِرُ الْأَمْرَيْنِ مِنْ رَسُولِ اللّٰهِ ﷺ تَرْكَ الْوُضُوءِ مِمَّا مَسَّتِ النَّارُ.»①

ملاحظہ ہو! عون المعبود (۱/ ۷٦)

کیا اونٹ کا گوشت کھانے سے وضوء کرنا لازمی ہے؟

(سوال) کیا اونٹ کا گوشت کھانے سے وضوٹوٹ جاتا ہے؟

(جواب) اونٹ کا گوشت کھانے سے وضوٹوٹ جاتا ہے، راجح مسلک یہی ہے۔سنن ابی داؤد میں حضرت البراء بن عازب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ

« سُئِلَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ عَنِ الْوُضُوءِ مِنْ لُحُومِ الْإِبِلِ؟ فَقَالَ تَوَضَّئُوا مِنْهَا »②

"رسول اللہ ﷺ سے اونٹ کے گوشت سے وضوکرنے کے بارے میں سوال ہوا تو آپ ﷺ نے فرمایا: کہ اس سے وضوکیا کرو۔"

امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ دلیل کے اعتبار سے یہ مسلک زیادہ پختہ ہے۔اگرچہ جمہور کا مسلک اس کے خلاف ہے۔تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو! عون المبعود (۱/ ۷۲۔۷۳)

پیشاب کے قطروں کے عارضہ میں مبتلا شخص کا حکم:

(سوال) محترم مجھے پیشاب کے قطرے آنے کا عارضہ ہے۔نماز میں میرے لیے کیا حکم ہے؟ کیا بار بار وضوکرنا پڑے گا یا صرف ایک ہی وضو سے نماز پڑھتا رہوں؟ اور پھر کپڑے کے بارے میں کیا حکم ہے ممکن

---

① سنن ابی داؤد،بَابٌ فِي تَرْكِ الْوُضُوءِ مِمَّا مَسَّتِ النَّارُ،رقم:۱۹۲

② سنن أبي داؤد،بَابُ الْوُضُوءِ مِنْ لُحُومِ الْإِبِلِ،رقم:۱۸٤،سنن ابن ماجه،بَابُ مَا جَاءَ فِي الْوُضُوءِ مِنْ لُحُومِ الْإِبِلِ،رقم:٤۹٤،صحيح مسلم،بَابُ الْوُضُوءِ مِنْ لُحُومِ الْإِبِلِ،رقم:۳٦۰

ہے قطرہ کپڑے سے بھی لگ جاتا ہو۔

(جواب) پیشاب کے قطرہ کی بیماری کی صورت میں حکم یہ ہے کہ ہر نماز کے وقت ایک دفعہ وضو کر لیا کریں کافی ہے۔ جب شرمگاہ کو دھوئیں تو لنگوٹی باندھ لیں تاکہ نجاست پھیل کر کپڑوں اور بدن کو نہ لگے۔ قرآن میں ہے:﴿فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ﴾(التغابن:١٦)، ﴿لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا﴾ (البقرة:٢٨٧)

(سوال) زید کو پیشاب کے بعد پیشاب کے قطرے آتے ہیں باوجود کافی دیر بیت الخلاء میں رہنے کے بعد وضو کرتا ہے اور نماز پڑھتا ہے، سجدے یا رکوع میں ایک آدھ قطرہ پھر پیشاب کا خارج ہوتا صاف محسوس ہوتا ہے تو کیا اب نماز توڑ دے یا جاری رکھے۔ اس کے شرعی احکام کیا ہیں؟

(جواب) جس کو قطروں کی بیماری ہو، اہل علم نے اس کو مستحاضہ پر قیاس کرتے ہوئے کہا ہے کہ ہر نماز کے لیے صرف ایک وضو کافی ہے۔ مزید تردّد (شک) میں پڑنے کی ضرورت نہیں۔

(سوال) جسے پیشاب کے بعد قطرے آتے ہوں، نماز کا وقت شروع ہونے سے پہلے اسی نماز کے لیے وضو کر سکتا ہے یا وقت ہونے کے بعد ہی وضو کرنا درست ہوگا؟

(جواب) وضو کے لیے دخولِ وقت شرط نہیں۔ وقت سے پہلے بھی وضو ہو سکتا ہے۔ حدیث میں ہے:

« ثُمَّ تَوَضَّئِي لِكُلِّ صَلَاةٍ.» ①

(سوال) جس آدمی کو پیشاب کی تکلیف ہونے کے دوران محسوس ہو کہ پیشاب کا قطرہ نکل آیا ہے تو وہ کیا کرے؟ کیا ایسے آدمی کو ہر نماز کے لیے تازہ وضو کرنا چاہیے یا ایک وضو سے کئی نمازیں پڑھ سکتا ہے؟ کپڑے پر پیشاب کا قطرہ لگے گا تو کپڑے کا کیا بنے گا وہ ناپاک ہو جائے گا یا پاک رہے گا؟

(جواب) جس آدمی کو پیشاب کی تکلیف ہو اُسے ہر نماز کے وقت علیحدہ وضو کر لینا چاہیے اور کپڑے کی صفائی کا بھی حتی المقدور خیال رکھا جائے۔ ﴿فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ﴾ (التغابن:١٦) کوشش کے باوجود کی کوتاہی اللہ رب العزت معاف کرنے والا ہے۔

کرسی پر بیٹھے نماز پڑھتے ہوئے شخص کو اونگھ آجائے تو......!

(سوال) کیا کرسی پر بیٹھے بیٹھے قدرے ٹیک لگا کر یا بغیر ٹیک لگائے اونگھ آجانا یا قلیل سے وقت کے لیے خراٹے لینا (بعض اونگھ آتے ہی خراٹے لیتے ہیں) ناقض وضو ہے یا نہیں؟

(جواب) جس نیند سے ہوش وحواس گم ہوں تو صرف اس سے وضو ٹوٹتا ہے۔ سونے کی کیفیت چاہے جونسی

① صحيح البخاري، باب غسل اليوم، رقم:٢٢٨

ہو۔(مرعاۃ المفاتیح:۱/ ۲۳۲)

مرد کے اپنے عضو کو چھونے سے کیا واقعی وضوٹوٹ جاتا ہے؟

سوال مرد کے اپنے عضو کو چھونے سے کیا واقعی وضوٹوٹ جاتا ہے؟جواب مدلّل ہو! ۔

جواب حدیثِ "بسرہ" میں تصریح موجود ہے کہ مسِ ذکر (یعنی شرمگاہ کو چھونا) سے وضوٹوٹ جاتا ہے۔[1] لیکن مراد اس سے یہ ہے کہ بلا پردہ مسِ ذکر ہو۔ (المرعاۃ:۱/ ۲۳۳) مسئلہ ہذا میں جوحکم مرد کا ہے وہی عورت کا بھی ہے۔ چنانچہ مسند احمد اور بیہقی میں حدیث ہے:

« أَيُّمَا رَجُلٍ مَسَّ فَرجَهُ فَلْيَتَوَضَّأْ وَ اَيُّمَا اِمرَأَةٍ مَسَّت فَرجَهَا فَلْيَتَوَضَّأْ.»[2]

امام بخاری نے اس حدیث کوصحیح قرار دیا ہے۔(قالہ الترمذی فی العلل)

مس ذکر پر دوبارہ وضوء کا حکم:

سوال غسل کرنے کا جوطریقہ حدیث شریف میں مذکور ہے اس کے مطابق پہلے وضوکرنا چاہیے۔ پھر یہ حدیث شریف بھی ترمذی کے حوالے سے دیکھی ہے کہ رسول اللہ ﷺ غسل کے بعد وضونہیں فرماتے تھے۔ صابن ملتے وقت اگر ذَکر یا دُبر کو ہاتھ لگ جائے،تو کیا غسل سے فراغت کے بعد دوبارہ وضوکرنا چاہیے؟

جواب اگر کوئی شخص وضو کے بعد غسل کرے تو مس ذَکر(شرمگاہ کا چھونا) یا دُبر کی صورت میں دوبارہ وضوکرنا ہوگا۔ راجح مسلک یہی ہے۔ حدیث میں ہے:

« مَن مَسَّ ذَكَرَهُ فَلَا يُصَلِّي حَتّٰى يَتَوَضَّأَ.» (رواہ اُلخمسۃ)[3]

کیا یہ حدیث صحیح ہے"چادر،شلوار ٹخنوں سے نیچے لٹکانے والے کا وضوءٹوٹ جاتا ہے"؟

سوال درج ذیل احادیث کے بارے میں مکمل تحقیق درکار ہے۔ جزاک اللہ خیراً

حَدَّثَنَا مُوسَى بْنُ إِسْمَاعِيلَ، حَدَّثَنَا أَبَانُ، حَدَّثَنَا يَحْيَى، عَنْ أَبِي جَعْفَرٍ، عَنْ

---

[1] سنن أبی داؤد،بَابُ الْوُضُوءِ مِنْ مَسِّ الذَّكَرِ،رقم:۱۸۱،سنن الترمذی،بَابُ الْوُضُوءِ مِنْ مَسِّ الذَّكَرِ، رقم:۸۲، سنن النسائی، بَابُ الْوُضُوءِ مِنْ مَسِّ الذَّكَرِ،رقم:٤٤٧

[2] سنن الدارقطنی،بَابُ مَا رُوِيَ فِي لَمْسِ الْقُبُلِ وَالدُّبُرِ وَالذَّكَرِ ،رقم: ٥٣٤

[3] سنن الترمذی،رقم:٨٢، بَابُ الْوُضُوءِ مِنْ مَسِّ الذَّكَرِسنن النسائی،بَابُ الْوُضُوءِ مِنْ مَسِّ الذَّكَرِ، رقم:٤٤٧

عَطَاءِ بْنِ يَسَارٍ، عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ، قَالَ :بَيْنَمَا رَجُلٌ يُصَلِّي مُسْبِلًا إِزَارَهُ، فَقَالَ لَهُ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ اذْهَبْ فَتَوَضَّأْ، فَذَهَبَ فَتَوَضَّأَ، ثُمَّ جَاءَ، فَقَالَ :اذْهَبْ فَتَوَضَّأْ، فَقَالَ لَهُ رَجُلٌ :يَا رَسُولَ اللَّهِ، مَا لَكَ أَمَرْتَهُ أَنْ يَتَوَضَّأَ، ثُمَّ سَكَتَّ عَنْهُ، قَالَ :إِنَّهُ كَانَ يُصَلِّي وَهُوَ مُسْبِلٌ إِزَارَهُ، وَإِنَّ اللَّهَ لَا يَقْبَلُ صَلَاةَ رَجُلٍ مُسْبِلٍ »①

امام نووی رحمہ اللہ اپنی کتاب ریاض الصالحین باب۱۱۵، صفة طول القميص والكمّ والإزار وطرف العمامة وتحريم إسبال شيء من ذلك على سبيل الخيلاء وكراهة من غير خيلاء، رقم:۷۹۷ میں مذکورہ حدیث کو بیان کرنے کے بعد لکھتے ہیں: رواه ابوداو د بإسناد صحيح على شرط مسلم مشکوٰۃ المصابیح کی شرح میں علامہ محمد عبدالسلام مبارکپوری رحمہ اللہ مذکورہ حدیث، کتاب الصلوٰۃ:باب الستر کی شرح میں لکھتے ہیں:

(رواه ابوداود) في الصلوٰة واللباس، وفي سنده ابوجعفر وهو رجل من اهل المدينة لايعرف اسمه. قال الحافظ:ابوجعفر المؤذن الانصاري المدني ومن زعم انه محمد بن علي بن الحسين (الباقر) فقد وهم، انتهىٰ

منہاج المسلمین میں مسعود احمد (بی ایس سی) وہ اُمور جن کے وقوع کے بعد دوبارہ وضو کرنا چاہیے۔ میں مذکورہ حدیث کو بیان کرتے ہیں اور لکھتے ہیں:(ابوداؤد، سنده صحيح مرعاة:ج ۲/ ص ۲۰۹)

شیخ حافظ عبدالمنان نور پوری اپنی کتاب احکام و مسائل جلد ا میں کتاب الطہارۃ میں وضو توڑنے والی چیزیں کے بیان میں ابوداؤد کی مذکورہ حدیث کو مرعاۃ المفاتیح کے حوالے سے بیان کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

« ذكره الهيثمي في مجمع الزوائد (ج:۵،ص:۱٤٥) وقال:رواه احمد ورجاله رجال الصحيح.»

چنانچہ مذکورہ تحقیق پر اعتماد کرتے ہوئے میں نے اس حدیث کو صحیح سمجھا اور اپنے مضمون ''Exposing Amkles'' شائع شدہ ''Voice of Islam'' جولائی ۱۹۹۹ء میں ذکر کیا۔ اس حدیث کو اپنی کتاب آئینہ صلوٰۃ النبی ﷺ کے صفحہ ۳۱۷ پر نقل کیا، لیکن میری کتاب کے ایک قاری نے مذکورہ حدیث کے بارے میں کہا کہ یہ حدیث ضعیف ہے۔ چنانچہ میں نے مزید تحقیق کی تو درج ذیل باتیں سامنے آئیں: علامہ ناصر

① سنن ابوداؤد، كتاب الصلوٰة،باب الإسبال في الصلوٰة،رقم:٦٣٨، وكتاب اللباس: باب ماجاء في إسبال الإزار بالفاظ مختلفة،رقم:٤٠٨٦

الدین البانی رحمہ اللہ نے اس حدیث کو ضعیف کہا ہے۔ ملاحظہ فرمائیں: (ضعیف سنن ابی داؤد کتاب الصلوٰۃ باب الإسبال فی الصلوٰۃ: ۱۲٤ ـ ٦٣٨)

کیونکہ اس میں ابوجعفر راوی مجہول ہیں، جیسا کہ علامہ البانی رحمہ اللہ مشکوٰۃ کی کتاب الصلوٰۃ، باب الستر، فصل دوم، رقم: ۷٦١ کے بیان میں لکھتے ہیں:

« فی کتاب الصلوٰۃ رقم:٦٣٨ وفی اللباس رقم: ٤٠٨٦ وإسناده ضعيف، فيه ابوجعفر وعنه يحيىٰ بن ابی كثير وهو الانصاری المدنی المؤذن وهو مجهول كما قال ابن القطان وفی التقريب: انه لين الحديث. قلت: فمن صحّح إسناد الحديث فقد وهم.»

شیخ البانی رحمہ اللہ کی تحقیق پر اعتماد کرتے ہوئے محترم حافظ صلاح الدین یوسف ریاض الصالحین کی تحقیق وتخریج میں لکھتے ہیں: اس روایت سے بعض علما استدلال کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ٹخنوں سے نیچے شلوار، پاجامہ لٹکانے والے کا وضوٹوٹ جاتا ہے، لیکن شیخ البانی رحمہ اللہ نے وضاحت کی ہے کہ اس روایت کی سند کو صحیح قرار دینے والوں کو وہم ہوا ہے کیونکہ اس میں ایک راوی ابوجعفر مدنی مجہول ہے، اس لئے یہ روایت صحیح نہیں ہے۔ چنانچہ شیخ نے اسے ضعیف سنن ابوداؤد میں درج کیا ہے۔ ملاحظہ ہو: ابواب مذکورہ وتخریج مشکوٰۃ ج:۱/ ص ۱۲۳۸، الخ (سائل: محمد شفیق کمبوہ، والٹن لاہور)

جواب یہ حدیث ابوجعفر الانصاری مدنی مؤذن کے مجہول ہونے پر واقعی ضعیف ہے۔ علامہ البانی نے بحوالہ تقریب، مشکوٰۃ کے حاشیہ پر نقل کیا ہے: إنه لين الحديث لیکن یہ الفاظ تقریب میں نہیں ہیں، اس کے نقل کرنے میں موصوف کو وہم ہوا ہے۔ اس سے قبل الاعتصام میں اپنے شائع شدہ فتویٰ میں بھی اس امر کی تصریح کر چکا ہوں۔

سوال حدثنا احمد بن محمد بن ايوب ثنا إبراهيم بن سعد عن محمّد بن إسحٰق عن محمّد بن جعفر بن الزبير عن عروة بن الزبير عن امراة من بنی النجار قالت كان بيتی من اطول بيت كان حول المسجد فكان بلال يؤذن عليه الفجر الخ......(سنن أبوداؤد) [1]

علامہ ناصر الدین البانی رحمہ اللہ نے اس حدیث کو ضعیف سنن ابوداؤد میں نقل نہیں کیا، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک یہ حدیث صحیح ہے، واللہ اعلم۔ البتہ شیخ حافظ عبدالمنان نورپوری اپنی کتاب احکام و

[1] سنن أبي داؤد: كتاب الصلوٰة، باب الاذان فوق المنارة، رقم: ٥١٩

مسائل جلداوّل میں اذان واِقامت کے بیان میں اذان سے قبل الصلوٰۃ والسلام کہنا کے بیان میں مذکورہ حدیث کے بارے میں لکھتے ہیں:

اوّلاً: تو اس لئے کہ اس روایت کی سند کمزور ہے اوراس کمزوری کی دو وجہیں ہیں:

۱۔ اس کی سند میں احمد بن محمد بن ایوب نامی ایک راوی ہیں جن کے متعلق یعقوب بن شیبہ کہتے ہیں: ليس من اصحاب الحديث وإنما كان ورّاقا اور ابواحمد حاکم فرماتے ہیں: ليس بالقوى عندهم نیز یحییٰ بن معین کہتے ہیں: هو كذاب

۲۔ اس کی سند میں محمد بن اسحٰق ہیں جن کے متعلق حافظ ابن حجر رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

« إمام المغازى صدوق يدلس ورمى بالتشيع والقدر »

اُصولِ حدیث کی کتابوں میں ہے کہ مدلس راوی جب تک اپنے شیخ سے سماع کی تصریح نہ کرے، تب تک اس کی روایت قابل قبول نہیں اور مندرجہ بالا روایت محمد بن اسحٰق نے بصیغہ عن بیان کی ہے، اپنے سماع کی تصریح نہیں فرمائی۔ (محمد شفیق کمبوہ، والٹن لاہور)

(جواب) مشار الیہ حدیث موصوف کی صحیح ابوداؤد میں ہے، انہوں نے کافی وافی بحث سے اس کا حسن ہونا ثابت کیا ہے۔ علامہ نورپوری حفظہ اللہ کا حدیث ہذا کو دو وجوہات سے ضعیف قرار دینا محل نظر ہے۔ اوّلاً راوی احمد بن محمد بن ایوب کے بارے میں بعض اصحابِ فن سے صرف جرح نقل کی ہے جبکہ دیانت وامانت اور انصاف کا تقاضا تھا کہ معدلین کی تعدیل بھی ذکر کرتے پھر جرح وتعدیل کے قواعد وضوابط کے مطابق صحت وضعف کا حکم لگاتے۔افسوس کہ ایسا نہیں ہوسکا۔ عثمان دارمی کا بیان ہے کہ امام احمد اور امام علی بن مدینی اس کے متعلق اچھی رائے رکھتے تھے: يحسنان القول فيه۔ ایسے ہی عبداللہ بن احمد اپنے والد سے بیان کرتے ہیں: ما اعلم احدا يدفعه بحجة مجھے علم نہیں کوئی بدلائل اس میں جرح و قدح کرسکتا ہو۔ ابن عدی رحمہ اللہ نے جرح کے باوجود اس کو صالح الحدیث قرار دیا ہے۔ اور ابن حبان نے اس کا تذکرہ ثقات میں کیا ہے۔ ابراہیم الحربی نے کہا: وراق ثقہ ہے، جھوٹ کی تلقین کی صورت میں انکاری ہوتا، یعنی جھوٹ نہیں بولتا تھا۔

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ رقم طراز ہیں کہ امام احمد بن حنبل نے اس کے بارے میں یہ بھی کہا ہے: لا باس به (تهذيب التهذيب: ۱/۶۴) اس کا مطلب یہ ہے کہ چوتھے درجے کا راوی ہے جو بمطابق اصطلاحِ محدثین قابل حجت ہوتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ حافظ موصوف کا رجحان بھی اس کی توثیق کی طرف ہے۔

ان شواہد کی بنا پر علامہ البانی رحمہ اللہ نے اس کو ثقات کے زمرہ میں شمار کیا ہے۔

ثانیاً: محمد بن اسحٰق کی تدلیس کا جواب یہ ہے کہ سیرت ابن ہشام میں ابن اسحٰق کی تحدیث کی تصریح موجود ہے، اس طرح یہ اعتراض بھی رفع ہو جاتا ہے۔ الفاظ یوں ہیں: قال ابن اسحٰق حدثني محمد بن جعفر بن الزبير

ان وجوہات کی بنا پر حافظ ابن حجر، ابن دقیق العید اور شیخ البانی رحمہم اللہ نے اس حدیث کو حسن قرار دیا ہے اور یہی بات راجح ہے۔ جرح و تعدیل کے سلسلہ میں توضیح الافکار کے حواشی پر علامہ محمد محی الدین عبدالحمید رقم طراز ہیں:

واختار شيخ الاسلام تفصيلًا حسنا، فإن كان من جرح مجملًا قد وثقه احد من ائمة هذا الشان لم يقبل الجرح فيه من احد كائنا من كان إلا مفسرًا، لانه قد ثبتتْ له رتبة الثقة فلا يزحزح عنها إلا بامر جلي فإن ائمة هذا الشان لا يوثقون إلامن اعتبروا حاله في دينه ثم في حديثه نقدوه كما ينبغي، وهم ايقظ الناس، فلا ينقض حكم احدهم إلا بامر صريح وإن خلا عن التعديل قبل الجرح فيه غير مفسر إذا صدر من عارف، لانه إذا لم يعدل فهو في حيز المجهول وإعمال قول المجرح فيه اولىٰ من إهماله. انتهى كلامه (٢/١٣٥)

(کس طرح کی جرح قبول ہو گی؟ اس کے بارے میں) شیخ الاسلام ابن حجر رحمہ اللہ نے تفصیل کے پہلو کو اختیار کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اگر کسی راوی کے بارے میں جرح مجمل ہو، لیکن فن حدیث کے کسی امام نے اس راوی کو ثقہ قرار دیا ہے تو اس صورت میں خواہ کوئی بھی ہو، اس راوی پر اس کی مجمل جرح کو قبول نہیں کیا جائے گا، بلکہ اس صورت میں جرح مفسر ہی قابل قبول ہو گی، کیونکہ اس کی ثقاہت ثابت ہو چکی ہے اور کسی واضح امر کے بغیر اس کی ثقاہت کو زائل نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ ائمہ فن نہایت بیدار مغز لوگ تھے۔ وہ کسی شخص کو ثقہ قرار دینے سے پہلے اس کی دینی حالت کا جائزہ لیتے، اس کی حدیث کو اچھی طرح پرکھتے تھے۔ تو اگر ان میں سے کسی نے پوری تحقیق اور چھان بین کے بعد کسی شخص کے ثقہ ہونے کا فیصلہ دیا ہے تو کسی واضح دلیل کے ساتھ ہی اس فیصلہ کو ردّ کیا جا سکتا ہے، البتہ اگر کسی نے اس کی تعدیل نہیں کی تو تب غیر مفسر جرح بھی قبول کر لی جائے گی، بشرطیکہ وہ کسی ماہر فن کی طرف سے ہو کیونکہ جب کسی نے بھی اس کی تعدیل و توثیق نہیں کی تو گویا وہ مجہول ہے اور کسی مجہول شخص پر جرح کرنیوالے کی بات کو قابل عمل قرار دینا اسے متروک اور مہمل

قرار دینے سے زیادہ بہتر ہے۔

شلوار ٹخنوں سے نیچے ہوتو وضوٹوٹ جاتا ہے اور نماز نہیں ہوتی؟

(سوال) کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس حدیث کے بارے میں کہ اگر شلوار ٹخنوں سے نیچے ہوتو وضوٹوٹ جاتا ہے اور نماز نہیں ہوتی؟

بحوالہ: «عَن أَبِي هُرَيرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنهُ قَالَ: رَجُلٌ يُّصَلِّي مُسبِلًا إِزَارَهٗ. إِذ قَالَ لَهٗ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ اِذهَب فَتَوَضَّأ» (أبي داؤد :١/١٠٠، كتاب الصلوٰة باب الإسبال)

(نوٹ) اگر امام کی بھی شلوار ٹخنوں سے نیچے ہوتو کیا مقتدیوں کی نماز ہو جائے گی؟

(جواب) چادر، شلوار اور قمیص وغیرہ کا ٹخنوں سے نیچے لٹکانا بلاشبہ شدید ترین جرائم میں سے ہے۔ تاہم اس سے نماز قطع نہیں ہوتی۔ فقہائے اور محدثین عظام نے کتبِ حدیث کے تراجم وابواب میں اس کو نواقضِ وضو سے شمار نہیں کیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مرض الموت میں ایک نوجوان کو تہ بند لٹکائے دیکھا تو واپس بلا کر فرمایا: اسے اوپر کر! « فَإِنَّهٗ اَنْقٰى لِثَوبِكَ وَاَتقٰى لِرَبِّكَ.»[1]

''اس میں کپڑے کی خوب طہارت وصفائی ہے اور رب کے ہاں تقویٰ اور پرہیز گاری کا باعث ہے۔''

اسی طرح بعض صحیح روایات میں ہے: « مَا اَسفَلَ مِنَ الكَعبَينِ فَهُوَ فِي النَّارِ.»[2]

''کپڑے کا وہ حصہ جو ٹخنوں سے لٹک رہا ہے وہ آگ میں ہے۔''

اس بارے میں جب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اپنی چادر ڈھلکنے کا ذکر کیا تو فرمایا:

« اِنَّكَ لَستَ مِمَّن يَفعَلُهٗ خُيَلَاءِ.» (بخاری بحوالہ مشکوٰۃ ۔کتاب اللباس:٢/٣٧٦)[3]

یعنی ''تو ان لوگوں میں سے نہیں جو فعل ہذا کو تکبر سے کرتے ہیں۔''

رسول اکرم ﷺ اس وقت فرما سکتے تھے کہ اے ابوبکر رضی اللہ عنہ جب کپڑا ٹخنے سے نیچے لٹک رہا ہوتو نماز نہیں ہوتی، وضوٹوٹ جاتا ہے۔ لہٰذا تیرے لئے بھی کپڑا اُوپر رکھنا ضروری ہے۔ اس کے بجائے فرمایا:

---

① صحيح البخاري، كتاب المناقب، بَابُ قِصَّةِ البَيعَةِ، وَالِاتِّفَاقِ ......الخ، رقم: ٣٧٠٠ مع فتح الباري ٧/٦٠

② صحيح البخاري، بَابُ مَا أَسْفَلَ مِنَ الكَعْبَيْنِ فَهُوَ فِي النَّارِ، رقم:٥٧٨٧

③ صحيح البخاري، بَابُ مَنْ جَرَّ إِزَارَهُ مِنْ غَيرِ خُيَلَاءَ، رقم:٥٧٨٤، سنن النسائي، إِسْبَالُ الْإِزَارِ، رقم:٥٣٣٥

«اِنَّكَ لَستَ مِمَّن يَفعَلُهُ خُيَلَاءَ»

اس سے معلوم ہوا کپڑے کا ٹخنے سے نیچے ہونا ناقضِ وضو نہیں۔ اصولِ فقہ کا قاعدہ ہے:

«تَأخِيرُ البَيَانِ عَن وَقتِ الحَاجَةِ لَا يَجُوز»

اور ''طبرانی'' میں روایت ہے رسول اللہ ﷺ نے ایک شخص کو نماز پڑھتے ہوئے دیکھا اس نے کپڑا نیچے لٹکایا ہوا تھا، تو آپ ﷺ نے اس کا کپڑا لپیٹ دیا۔[1] اور سوال میں مذکور حدیث ضعیف ہے۔ اس کی سند میں ایک راوی ابوجعفر ہے۔ اس کے بارے میں حافظ منذری رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

«فِي إِسنَادِهِ أَبُو جَعفَر، وَ هُوَ رَجلٌ مِن أَهلِ المَدِينَةِ لَا يُعرَفُ اِسمُهُ»[2]

یعنی ''اس حدیث کی سند میں اہلِ مدینہ سے ایک آدمی ابوجعفر ہے اس کا نام غیر معروف ہے۔''

اور علامہ شوکانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

«وَ فِي إِسنَادِهِ أَبُو جَعفَرٍ، وَ هُوَ رَجُلٌ مِن أَهلِ المَدِينَةِ لَا يعرف اسمه»[3]

اور علامہ البانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

«وَ إِسنَادُهُ ضَعِيفٌ. فِيهِ اَبُو جَعفَر، وَ عَنهُ يَحيٰى بنُ اَبِى كَثِيرٍ، وَ هُوَ الَانصَارِيُّ، اَلمَدَنِيُّ، المُؤَذِّن، وَ هُوَ مَجهُولٌ، كَمَا قَالَ ابنُ القَطَّان: وَفِي «التَّقرِيب» إِنَّهُ لَيِّنُ الحَدِيثِ. قُلتُ: فَمَن صَحَّحَ إِسنَادَ هٰذَا الحَدِيث فَقَد وَهِمَ»[4]

یعنی ''اس حدیث کی سند ضعیف ہے۔ اس میں راوی ابوجعفر ہے۔ اس سے بیان کرنے والا یحییٰ بن أبی کثیر ہے۔ أبوجعفر انصاری، مدنی، مؤذن ہے، اور وہ مجہول ہے، جس طرح کہ ابن القطان نے کہا ہے۔ اور ''تقریب'' میں ہے کہ اس کی حدیث کمزور ہے۔ علامہ موصوف فرماتے ہیں: میں کہتا ہوں پس جس نے حدیث ہذا کی سند کو صحیح قرار دیا ہے اسے وہم ہوا ہے۔''

واضح رہے حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے ابوجعفر کے لیے جو الفاظ استعمال کیے ہیں وہ یوں ہیں:

« أَبُو جَعفَرٍ، المُؤَذِّنُ » اَلانصَارِيُّ، المَدَنِيُّ، مَقبُولٌ، مِنَ الثَّالِثَةِ وَ مَن زَعَمَ أَنَّهُ

---

(1) المعجم الكبير للطبرانى، رقم:۳۵۳، عون المعبود: ۱/۲۴۳

(2) مختصر سنن أبى داؤد :۱/۳۲۴

(3) نيل الأوطار ۳/۱۱۸

(4) مشكوٰة، ج:۱، ص:۲۳۸

مُحَمَّدُ بنُ عَلِيّ بنِ الحُسَينِ ، فَقَد وَهِمَ.»

معلوم نہیں علامہ موصوف نے ''لین الحدیث'' کی نسبت تقریب کی طرف کیسے کردی ہے جب کہ اس میں یہ الفاظ نہیں ہیں، بلکہ لفظ مقبول ہے۔ جس سے حافظ صاحب کی مراد یہ ہوتی ہے کہ یہ راوی متابعت کی صورت میں مقبول ہے۔ ملاحظہ ہو! "مقدمة التقريب" جب کہ محل بحث مقام پر متابعت مفقود ہے۔ لہٰذا ''ابو جعفر'' راوی ضعیف ٹھہرا۔ اس نظریہ کے برخلاف اس حدیث کے بارے میں امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

« رَوَاهُ أَبُو دَاوُدُ بِإِسنَادٍ صَحِيحٍ عَلٰى شَرطِ مُسلِمٍ»[1]

اس حدیث کو ابوداؤد نے بسند صحیح ذکر کیا ہے جو مسلم کی شرط پر ہے۔

لیکن امام نووی رحمہ اللہ کا یہ دعویٰ محلِ نظر اور بلا دلیل ہے، جب کہ ابوجعفر راوی کی حقیقت منکشف ہو چکی، جس پر اس حدیث کا دارومدار ہے۔

جب دلائل سے یہ بات ثابت ہو چکی کہ چادر وغیرہ کا ٹخنوں سے لٹکنا ناقض وضو نہیں ہے اور نماز ہو جاتی ہے تو امام کی چادر وغیرہ ٹخنوں سے نیچے آنے کی بناء پر مقتدیوں کی نماز میں فرق نہیں آئے گا۔ البتہ امام صاحب کو بطریقِ احسن سمجھانا چاہیے تا کہ آئندہ فعلِ شنیع (برے فعل) کے ارتکاب سے باز رہ کر اپنے کو «اِجعَلُوا أَئِمَّتَكُم خِيَارَكُم»[2] کا صحیح نمونہ ثابت کر سکے۔

شلوار یا پاجامہ لٹکانے پر دوبارہ وضو کرنا:

سوال امیر جماعت المسلمین نے کتاب صلوٰۃ المسلمین (ص:۱۰۰) پر وہ اُمور جن کے وقوع کے بعد دوبارہ وضو کرنا چاہیے'' کے تحت ''شلوار یا پاجامہ لٹکانا'' لکھا ہے، حوالہ دیا ہے:

« بَينَمَا رَجُلٌ يُصَلِّي مُسبِلًا إِزَارَهُ فَقَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ اِذهَب فَتَوَضَّأ.»[3]

الحمد للہ خود تو نماز میں اور نماز کے باہر پاجامہ ٹخنوں سے اوپر رکھنے کا اہتمام کرتا ہوں مگر بعض دفعہ ایسے امام کے پیچھے نماز پڑھتا ہوں جس کے ٹخنے ڈھکے ہوئے ہوتے ہیں۔ کیا میں احتیاطاً یا وجوباً نماز دوبارہ پڑھوں یا نہیں؟ اِسبال کی بھی وضاحت فرمائیں کہ پورے قدم ڈھکے ہوں، یا صرف ٹخنے؟

جواب بلاشبہ چادر شلوار اور قمیص وغیرہ کا ٹخنوں سے نیچے لٹکانا شدید ترین جرائم میں سے ہے۔ تاہم اس

---

① رياض الصالحين، باب صفة طول القميص والكم والأزار

② سنن الدارقطني ،بَابُ تَخفِيفِ القِرَاءَةِ لِحَاجَةٍ ،رقم:۱۸۸۱

③ ابوداؤد. سنده صحيح، مرعاة: ۳/ ۲۰۹

سے نماز قطع (ختم) نہیں ہوتی۔ فقہاء و محدثینِ عظام نے اس کو نواقضِ وضو میں شمار نہیں کیا۔ اس بارے میں وارد مشارٌ الیہ حدیث ضعیف ہے۔ حافظ منذری فرماتے ہیں:

«فِي إِسنَادِهِ أَبُو جَعفَرٍ، وَ هُوَ رَجُلٌ مِن أَهلِ المَدِينَةِ لَا يُعرَفُ اسمُهُ.» ①

یعنی ''اس حدیث کی سند میں اہل مدینہ کا ایک آدمی ہے جس کا نام غیر معروف ہے۔''

اور علامہ شوکانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

« وَ فِي إِسنَادِهِ أَبُو جَعفَرٍ، وَ هُوَ رَجُلٌ مِن أَهلِ المَدِينَةِ لَا يُعرَفُ اسمُهُ.» ②

اور علامہ البانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''اس حدیث کی سند ضعیف ہے۔ اس میں راوی ابوجعفر انصاری ہے۔ اس سے بیان کرنے والا یحییٰ بن ابی کثیر ہے اور ابوجعفر انصاری مدنی مؤذن ہے اور وہ مجہول ہے، جس طرح کہ ابن قطان نے کہا ہے اور ''تقریب'' میں ہے۔: ''اس کی حدیث کمزور ہے۔''

علامہ موصوف فرماتے ہیں: میں کہتا ہوں: پس جس نے حدیث ہذا کو صحیح قرار دیا ہے اسے وہم ہوا ہے۔

معلوم نہیں۔ علامہ موصوف نے ''لین الحدیث'' کی نسبت تقریب کی طرف کیسے کردی جب کہ اس میں یہ الفاظ نہیں ہیں بلکہ لفظ ''مقبول'' ہے جس سے حافظ صاحب کی مراد یہ ہوتی ہے کہ یہ راوی متابعت کی صورت میں مقبول ہے۔ (ملاحظہ ہو: مقدمة التقريب) جبکہ محلِ بحث مقام پر متابعت مفقود ہے لہٰذا ابوجعفر راوی ضعیف ٹھہرا۔ اس نظریہ کے برعکس حدیث ہذا کے بارے میں امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

« رَوَاهُ أَبُودَاوُدَ بِإِسنَادٍ صَحِيحٍ عَلٰى شَرطِ مُسلِمٍ.» ③

یعنی ''اس حدیث کو ابوداود نے بسند صحیح ذکر کیا ہے جو مسلم کی شرط پر ہے۔''

صاحبِ مرعاۃ نے بھی اس عبارت کو نقل کیا ہے، جس کی بناء پر مصنف کتاب صلوٰۃ المسلمین نے اس کو صحیح قرار دیا ہے۔ لیکن امام نووی رحمہ اللہ کا یہ دعویٰ بلا استناد ہے، جو قابلِ اعتماد نہیں۔ جب کہ ابوجعفر راوی کی حقیقت منکشف ہو چکی ہے جس پر اس حدیث کا دارومدار ہے۔

اسبال سے مقصود یہاں یہ ہے کہ ٹخنے ڈھکے ہوں۔ مسئلہ ہذا کے بارے میں میرا ایک تفصیلی فتویٰ بھی

---

① مختصر سنن أبي داؤد: ١/٣٢٤

② نيل الأوطار: ١١٨/٣

③ رياض الصالحين، باب صفة طول القميص

الاعتصام مؤرخہ ۲۳ شعبان ۱۴۱۲ھ میں شائع ہو چکا ہے۔

دورانِ وضوء اگر ہوا خارج ہو جائے:

(سوال) اگر وضو کرتے ہوئے ریح خارج ہو جائے تو کیا وضو جاری رکھا جائے یا نئے سرے سے شروع کیا جائے؟

(جواب) اس حالت میں نئے سرے سے وضو کرنا ہوگا، کیونکہ مکمل طہارت عبادت کی قبولیت کے لئے شرط ہے۔

کیا خون نکلنے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے؟

(سوال) کیا خون نکلنے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے؟

(جواب) دونوں شرم گاہوں کے علاوہ جسم کے کسی حصے سے خون نکلنے سے وضو نہیں ٹوٹتا۔ سنن ابی داؤد میں حدیث ہے کہ ایک صحابی نے نکلتے خون میں نماز ادا کی تھی۔ [باب الوضوء من الدم] اکثر اہل علم کا قول یہی ہے۔ اور یہی حق ہے۔

علامہ صنعانی سبل السلام میں فرماتے ہیں:

« قَالَ الشَّافِعِيُّ، وَ مَالِكٌ، وَ جَمَاعَةٌ مِنَ الصَّحَابَةِ، وَالتَّابِعِينِ : أَنَّ خُرُوجَ الدَّمِ مِنَ البَدَنِ غَيرَ السَبِيلَينِ لَيسَ بِنَاقِضٍ.»

''شافعی، مالک، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعین کی ایک جماعت نے کہا ہے کہ شرم گاہ کے علاوہ بدن سے خون نکلنے سے وضو نہیں ٹوٹتا۔''

تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو! عون المعبود (۱/ ۷۸) امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی ''صحیح'' میں «بَابُ مَن لَم يَرَ الوُضُوءَ إِلَّا مِنَ المَخرَجَينَ مِن القُبُلِ وَالدُّبُرِ» کے تحت دلائل سے اس بات کو ثابت کیا ہے کہ سبیلین کے علاوہ خون نکلنے سے وضو نہیں ٹوٹتا۔

کیا خون نجس ہوتا ہے اور کیا خون بہنے سے وضوء ٹوٹ جاتا ہے؟

(سوال) امام نووی رحمہ اللہ نے شرح مسلم میں لکھا ہے کہ باجماع اہل علم خون نجس ہے۔ علامہ وحید الزمان ''شرح ابن ماجہ'' میں لکھتے ہیں کہ شراب، خون، مردار اگرچہ حرام ہیں لیکن ان کی نجاست ثابت نہیں ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم زخموں سے خون نکلنے کی حالت میں بھی نماز پڑھا کرتے تھے۔ کیا امام نووی کے دعویٰ اجماع کی کوئی دلیل ہے؟

(جواب) اس سے مراد ان کی غالباً دمِ مسفوح (ذبح کے وقت نکلنے والا خون) ہے۔ جس طرح کہ ''سورۃ الانعام'' میں ہے اور وہ خون جو گوشت کے ساتھ لگا ہوتا ہے یہ حرام نہیں۔ امام قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

«اِتَّفَقَ الْعُلَمَاءُ عَلٰی اَنَّ الدَّمَ حَرَامٌ نَجِسٌ لَا یُوکَلُ وَ لَا یُنْتَفَعُ بِہٖ.»①

اہل علم کا اس بات پر اتفاق ہے کہ خون حرام اور نجس ہے۔ نہ اسے کھایا جائے، اور نہ اس سے فائدہ حاصل کیا جائے۔ اس سے مراد بھی دمِ مسفوح ہے۔

علامہ وحید الزمان رحمہ اللہ نے جن اشیاء کی نشاندہی کی ہے ان کی نجاست مختلف فیہ (اختلافی مسائل) مسائل میں سے ہے۔

مثلاً امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک مُردار نجس ہے، جب کہ امام مالک رحمہ اللہ اور امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ طہارت کے قائل ہیں۔ صاحب "بدایة المجتهد" فرماتے ہیں کہ شراب کی بیع کی حرمت اور نجاست پر سب مسلمان متفق ہیں۔ البتہ شراب کی نجاست میں تھوڑا سا اختلاف ہے۔ اس طرح مُردار کے تمام اجزاء جن میں زندگی کی رَمق ہوتی ہے وہ بھی حرام ہیں لیکن خنزیر کے بالوں سے انتفاع حاصل کرنے میں اختلاف ہے۔ ابن القاسم رحمہ اللہ جواز کے قائل ہیں، جب کہ اصبغ فقیہ منع کا۔ اسی طرح دم سائل (بہنے والا خون) حنفیہ کے نزدیک نجس ہے لیکن امام بخاری رحمہ اللہ اس بات کے قائل نہیں۔ حضرت حسن بصری فرماتے ہیں کہ ہمیشہ سے مسلمان اپنے زخموں میں نمازیں پڑھتے رہے جیسے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا خون بہہ رہا تھا انھوں نے اسی حالت میں نماز پڑھ لی۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو! صحیح بخاری: "بَابُ مَنْ لَمْ یَرَ الْوُضُوءَ" اور فتح الباری (۱/۲۸۱)

کیا عورت کا وضو اپنے بچے کا پاخانہ دھونے سے ٹوٹ جائے گا؟

سوال عورت باوضو ہو کر اپنے بچے کا پاخانہ دھوئے تو کیا اس کا وضو ٹوٹ جاتا ہے؟

جواب بچے کا پاخانہ دھونے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے، لہٰذا اس صورت میں دوبارہ وضو کرنا چاہیے۔

فقیہ ابن قدامہ فرماتے ہیں:

« وَلَا فَرقَ بَینَ ذَکَرِ الصَّغِیرِ وَالکَبِیرِ. وَ بِہٖ قَالَ عَطَاءٌ، وَالشَّافِعِیُّ، وَ اَبُو ثَورٍ.»②

"اس مسئلے میں بڑے اور چھوٹے میں کوئی فرق نہیں۔ عطاء شافعی اور ابوثور کا بھی یہی مسلک ہے۔"

پھر فرماتے ہیں کہ ہمارے لیے عمومی حدیث دلیل ہے۔

« مَن مَسَّ الذَّکَرَ فَلیَتَوَضَّأ، وَ لِاَنَّہٗ ذَکَرُ آدَمِيٍّ مُتَّصِلٌ بِہٖ.»

---

① تفسیر قرطبی: ۲/۲۲۱

② المغنی: ۱/ ۲۴۳

''جس کا ہاتھ عضو خاص کو لگ جائے وہ وضو کرے کیونکہ آدمی کا عضو اس سے متصل ہی ہوتا ہے۔''

باوضوء عورت بچے کو دودھ پلانے کے بعد وضوء کرے گی؟

(سوال) عورت بچے کو باوضو دودھ پلائے تو کیا وہ دوبارہ وضو کرے کیونکہ دودھ پلاتے وقت اسے اس طرح لذت محسوس ہوتی ہے، جس طرح مباشرت کے وقت محسوس ہوتی ہے۔

(جواب) جب بحالتِ خون نماز پڑھی جاسکتی ہے تو بحالتِ نماز بچے کو دودھ بھی پلایا جا سکتا ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ کا نظریہ یہی ہے کہ خون نکلنے سے نماز باطل نہیں ہوتی۔ حسن بصری رحمہ اللہ کا قول ہے: مسلمان ہمیشہ سے اپنے زخموں میں نماز پڑھتے رہے ہیں اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے ثابت ہے کہ انھوں نے خون سے بہتے ہوئے زخموں میں نماز ادا کی۔ (1)

دونوں کاموں میں جامع وصف اندرونی حصہ شے کا باہر آنا ہے بایں صورت مباشرت جیسی لذت ہونا محض ادعاء ہے حقیقت سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔

الکحل ملی دواؤں کے استعمال سے وضوء کرنا:

(سوال) ہومیو پیتھک دوائی کی خوراک ایک دو قطرے دی جاتی ہے، اس میں الکحل شامل ہوتی ہے۔ کیا ایک دو قطرے دوا پینے سے وضو ٹوٹ جائے گا؟ کیونکہ شراب پینے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے؟

(جواب) اصلاً ایسی دوائی کا استعمال ہی درست نہیں بصورتِ دیگر احتیاط کا تقاضا ہے کہ وضو کرلیا جائے۔

(سوال) اگر شراب نجس نہیں تو جس دوا میں الکحل شامل ہو نمازی کے بدن پر اس دوا کا مَلنا اور لگے ہونا کوئی شے نہیں اور کوئی حرج نہیں؟

(جواب) راجح مسلک یہ ہے کہ شراب نجس (پلید) ہے کما تقدم۔ الکحل والی دوائی کو نمازی کا اپنے بدن پر مَلنا ناجائز ہے کیونکہ شراب نجس ہے۔

غسل جنابت اور عام غسل کے متعلق احکام و مسائل

(1) فتح الباری: ۱/۲۸۱ فی ترجمۃ الباب : صحیح البخاری، بَابُ مَنْ لَمْ يَرَ الْوُضُوءَ إِلَّا مِنَ الْمَخْرَجَيْنِ: مِنَ الْقُبُلِ وَالدُّبُرِ

قبل از وضوء یا غسل کے لیے کپڑے اتارنے کے بعد بسم اللہ پڑھنا لازمی ہے؟

سوال کیا وضو کرنے سے پہلے "بِسمِ اللّٰہِ" پڑھنا لازم ہے۔ غسلِ جنابت یا عام غسل کے لیے کپڑے اتار دینے کے بعد بسم اللہ پڑھنے کا کیا حکم ہے؟

جواب کوشش کرنی چاہیے کہ کپڑے اتارنے سے پہلے وضو کر لیا جائے۔ کپڑے اتار کر بھی بسم اللہ کا جواز ہے بشرطیکہ جگہ نجس نہ ہو۔ حدیث میں ہے: «یَذکُرُ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ اَحیَانِہٖ»[1]

بصورتِ دیگر دل میں پڑھ لی جائے۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی "صحیح" میں بایں الفاظ باب قائم کیا ہے۔

« بَابُ التَّسمِیَۃِ عَلٰی کُلِّ حَالٍ وَ عِندَ الوَقَاعِ.»

"یعنی تسمیہ ہر حالت میں پڑھنی چاہیے اور جماع کے وقت بھی۔"

پھر دعائے جماع «بِسمِ اللّٰہِ، اَللّٰھُمَّ جَنِّبْنَا الشَّیْطَانَ، وَجَنِّبِ الشَّیْطَانَ مَا رَزَقْتَنَا......»[2] سے اولویت کی بناء پر ان کا استدلال ہے۔ "فتح الباری" میں ہے:

« لٰکِن یُستَفَادُ مِن بَابِ الاَولٰی، لِاَنَّہٗ اِذَا شَرَعَ فِی حَالَۃِ الجِمَاعِ وَ ھِیَ مِمَّا اَمَرَ بِہٖ بِالصَّمتِ فَغَیرُہٗ أَولٰی .»(۲۴۲/۱)

تاہم فتاویٰ اسلامیہ (۲۱۹/۱) میں شیخ ابن عثیمین نے ترجیح اس بات کو دی ہے کہ ایسی حالت میں "بِسمِ اللّٰہِ" صرف دل ہی دل میں پڑھنی چاہیے۔ وجہِ استدلال یہ ہے کہ تسمیہ راجح قول کے مطابق واجبات سے نہیں بلکہ مستحبات سے ہے، لیکن شاہ ولی اللہ صاحب نے "حجۃ اللہ البالغۃ" میں تسمیہ کو رکن یا شرط قرار دیا ہے۔ مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو! (مرعاۃ المفاتیح :۱/۲۷۵_۲۷۶)

غسل جنابت کے لیے پانی میسر نہ ہو تو تیمّم کریں گے؟

سوال جنابت یا احتلام کے باعث غسل فرض ہو گیا۔ لیکن گھر پر پانی نہیں۔ فجر کا وقت ہو چکا ہے، آیا مسجد جا کر وضو کر کے نماز باجماعت ادا کرے یا اکیلا گھر پر تیمّم کر کے نماز ادا کر لے؟

جواب ایسی حالت میں پہلے پانی تلاش کرنا چاہیے۔ اگر پانی نہ مل سکے اور نماز کے وقت کے فوت ہونے کا

---

① صحیح مسلم،بَابُ ذِکرِ اللّٰہِ تَعَالٰی فِی حَالِ الجَنَابَۃِ وَغَیرِھَا ،رقم:۳۷۳، بحوالہ فتح الباری:۴۰۸/۱، سنن ابن ماجہ،رقم:۳۰۲

② صحیح البخاری،بَابُ مَا یَقُولُ إِذَا أَتَی أَھلَہٗ،رقم:۶۳۸۸

ڈر ہو یا خوف کی وجہ سے پانی تک پہنچنے کی قدرت نہ ہو تو تیمّم کر کے نماز پڑھی جاسکتی ہے۔ ورنہ نہیں۔ ''صحیح بخاری'' کی تبویب میں ہے:

« بَابُ التَّیَمُّمِ فِی الحَضَرِ اِذَا لَم یَجِدِ المَاءَ وَ خَافَ فَوتَ الصَّلٰوۃِ وَ بِہٖ قَالَ عَطَاءٌ.»

یعنی حضر میں تیمّم کا جواز تب ہے، جب پانی نہ ملے اور نماز کا وقت گزر جانے کا اندیشہ ہو۔ عطاء بن اَبی رباح کا یہی فتویٰ ہے۔

غسل خانہ میں ننگے نہانا درست ہے یا زیرِ ناف کپڑا ہونا ضروری ہے؟

(سوال) کیا بندہ کا غسل خانہ میں ننگے نہانا درست ہے یا زیرِ ناف کپڑا ہونا ضروری ہے؟

(جواب) ایسی حالت میں ننگا نہانے کا جواز ہے۔ زیرِ ناف کپڑے کی ضرورت نہیں، بلکہ کھلی جگہ میں بھی تنہا ننگا نہایا جاسکتا ہے، اگرچہ پردہ افضل ہے۔ ملاحظہ ہو! ''صحیح بخاری'' کا باب «مَنِ اغتَسَلَ عُریَانًا وَحدَہٗ فِی الخَلوَۃِ »

مریض آدمی جو غسل کی طاقت نہ رکھتا ہو:

(سوال) آدمی اگر بیمار ہو، غسل واجب ہو لیکن بوجہ بیماری وہ غسل کی استطاعت نہیں رکھتا، جب کہ وضو کی استطاعت رکھتا ہے۔ کیا ایسے آدمی کے لیے وضو کافی ہوگا یا کوئی دوسری صورت ہوگی؟

(جواب) غسلِ جنابت سے اگر خوف ناک بیماری میں مبتلا ہونے یا موت کے واقع ہونے کا ڈر ہو تو وضو سے ہی پڑھ سکتا ہے۔ نبی ﷺ نے حضرت عمرو بن العاص کو غزوہ ''ذات السلاسل'' میں امیر مقرر کیا۔ سرد رات میں وہ جنبی ہوگئے۔ غسل کی صورت میں موت کا خطرہ لاحق تھا تو انہوں نے تیمّم کر کے نماز پڑھا دی۔ بعد میں نبی ﷺ نے دریافت کیا تو بطورِ دلیل قرآن کی آیت ﴿وَلَا تَقتُلُوا اَنفُسَکُم اِنَّ اللہَ کَانَ بِکُم رَحِیمًا﴾ پیش کی۔ آپ ﷺ مسکرائے اور کچھ نہیں کہا۔ الغرض جب تیمّم کے ساتھ نماز پڑھی جاسکتی ہے تو وضو کے ساتھ بطریقِ اَولیٰ جائز ہے۔

کیا میاں بیویؔ کے ننگے ہونے سے غسل واجب ہو جائے گا؟

(سوال) جب میاں بیوی دونوں ننگے ہو جائیں تو کیا غسل واجب ہوجاتا ہے؟ حالانکہ انہوں نے مباشرت یا مجامعت نہیں کی؟

(جواب) دخول کے بغیر غسل واجب نہیں ہوتا۔ یعنی جب مرد عورت سے جماع کرے خواہ مَنی کا انزال ہو یا

نہ ہو غسل لازم ہو جاتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

« إِذَا الْتَقَى الْخِتَانُ الْخِتَانَ، فَقَدْ وَجَبَ الْغُسْلُ.» ①

''دونوں (کی) شرم گاہیں آپس میں مل جائیں تو غسل واجب ہو گیا۔''

دوسری حدیث میں ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

« إِذَا جَلَسَ بَيْنَ شُعَبِهَا الْأَرْبَعِ ثُمَّ جَهَدَهَا، فَقَدْ وَجَبَ الْغُسْلُ.» ②

''آدمی جب عورت کے ہاتھ پاؤں کے درمیان بیٹھ جائے۔ پھر اُسے مشقت میں ڈال دے تو غسل واجب ہو گیا۔''

ان دلائل سے معلوم ہوا کہ وجوبِ غسل کے لیے دخول شرط ہے۔

مباشرت کے فوراً بعد عورت کو حیض جاری ہو جانا:

سوال مباشرت کے بعد عورت نے ابھی غسل نہیں کیا اور حیض جاری ہو گیا۔ اب کیا اسے جنابت کا غسل فوراً کرنا چاہیے یا حیض ختم ہونے کے بعد --- یا دونوں کے لئے ایک ہی غسل کافی ہے؟

جواب غسل جنابت ہی غسل جمعہ کے لئے کافی ہے بشرطیکہ اس کی حدود کے اندر، یعنی طلوع فجر کے بعد ہو کیونکہ غسل سے مقصود بدن کی نظافت اور بد بو کا ازالہ ہے، سو وہ حاصل ہے۔

امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی صحیح میں یوں باب قائم کیا: باب فضل الغسل یوم الجمعة اور امام شوکانی رحمہ اللہ الدراری (۴/۱ے) اور نیل الاوطار (۱/۴ے۲) میں جمعہ کے لیے وجوبِ غسل کے قائل ہیں لیکن السیل (۱/۱۲۲) میں انہوں نے وجوب سے رجوع کر کے کہا ہے کہ ''یہ صرف مستحب ہے۔'' جب کہ غسل جنابت بلا اختلاف واجب ہے، لہٰذا غیر واجب کے واجب کے ضمن میں داخل ہونے میں کوئی اشکال نہیں۔

اس حالت میں عورت کے لیے ضروری ہے کہ فوری غسل جنابت کرے اور حیض کا غسل اس وقت کرے گی جب حیض سے فارغ ہو گی، دونوں غسلوں کے احکام شریعت میں بسط و تفصیل سے موجود ہیں ان کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔

حیض، نفاس، اور جنابت غسل کا طریقہ ایک ہی ہے یا مختلف؟

① سنن الكبرىٰ للبيهقى، بَابُ وُجُوبِ الْغُسْلِ بِالْتِقَاءِ الْخِتَانَيْنِ، رقم: ٧٦٦، صحيح مسلم، بَابُ نَسْخِ الْمَاءُ مِنَ الْمَاءِ وَوُجُوبِ الْغُسْلِ بِالْتِقَاءِ الْخِتَانَيْنِ، رقم: ٣٤٩

② صحيح البخارى، بَابٌ: إِذَا الْتَقَى الْخِتَانَانِ، رقم: ٢٩١

(سوال) حیض، نفاس، اور جنابت غسل کا کیا ایک ہی طریقہ ہے؟ اگر مختلف ہے تو احادیث کی روشنی میں بتائیں؟

(جواب) حیض، نفاس اور جنابت کے غسل کا طریقہ قریباً ایک جیسا ہے، البتہ حیض و نفاس کے غسل میں مخصوص مقام کی صفائی کا ازالۂ نجاست کے لیے خصوصی اہتمام ہونا چاہیے۔ بالوں کو کھول کر کنگھی کرنی چاہیے۔ استنجاء کے بعد غسل سے پہلے وضو ہونا چاہیے۔ پانی بالوں کی جڑوں تک پہنچایا جائے، پھر سر میں تین چلو پانی بہایا جائے۔ سر کا خلال پہلے دائیں طرف ہو پھر بائیں طرف سے اور پھر سارے جسم پر پانی بہا دیا جائے۔

چٹیا کی ہوئی عورت کے غسل جنابت کا مسئلہ:

(سوال) اس دور میں جنبی عورت کے بالوں کا مسئلہ ہے جب کہ اس نے چٹیا بھی کی ہو۔

(جواب) سر پر تین دفعہ پانی بہا دینا کافی ہے۔ حدیث اُم سلمہ رضی اللہ عنہا میں ہے:

«إِنَّمَا يَكْفِيكِ أَنْ تَحثِي عَلَى رَأسِكِ ثَلَاثَ حَثَيَاتٍ» رواه الجماعة الا البخاری[1]

''یعنی تیرے لیے یہی کافی ہے کہ سر پر تین چلو بہائے۔''

اگر غسلِ جنابت کیے بغیر موت آجائے تو کیا حکم ہوگا؟

(سوال) اگر آدمی کو رات کو احتلام ہو جائے، سردی کی وجہ سے غسل نہ کر سکے اور اذان کے وقت غسل کرے۔ گرم پانی موجود بھی ہے۔ مثلاً رات کے ۱۲ بجے غسل کی حاجت پیش آئی۔ اذانِ صبح کا وقت ۵:۳۵ ہے۔ بارہ بجے سے پانچ بجے تک کے وقت میں اگر موت آجائے تو آدمی کس حال میں اٹھایا جائے گا؟ پاکی حالت میں یا ناپاکی کی حالت میں؟

(جواب) حالت احتلام میں مرنے والا طاہر اٹھے گا۔ صحیح حدیث میں ہے: «إِنَّ الْمُؤْمِنُ لَا يَنْجُسُ»[2] اصلاً قابلِ اعتبار طہارت عقیدہ کی ہے۔ احتلام کی ناپاکی صرف ظاہری، حکمی اور عارضی ہے، جو غسلِ میت وغیرہ سے زائل ہو جاتی ہے۔ قصۂ حنظلہ رضی اللہ عنہ "غسيل الملائكة" بھی اس کا مؤید (تائید کرنے والا) ہے۔ موت تو انسان کو کسی بھی وقت آسکتی ہے۔ جلدی آئے یا بدیر۔ ویسے بھی شرعاً غسلِ جنابت کو مؤخر کرنے کا جواز ہے۔ صحیح حدیث میں قصۂ ابی ہریرۃ رضی اللہ عنہ اس امر کی واضح دلیل ہے۔ ملاحظہ ہو! ''صحیح بخاری'' وغیرہ۔

---

[1] صحیح مسلم، بَابُ حُكْمِ ضَفَائِرِ الْمُغْتَسِلَةِ، رقم: ۳۳۰، سنن ابن ماجه، بَابُ مَا جَاءَ فِي غَسْلِ النِّسَاءِ مِنَ الْجَنَابَةِ، رقم: ۶۰۳

[2] صحیح البخاری، بَابٌ: الْجُنُبُ يَخْرُجُ وَيَمْشِي فِي السُّوقِ وَغَيْرِهِ، رقم: ۲۸۵

کیا جمعہ کے دن کا غسل، فرضی غسل کی طرح کریں گے؟

(سوال) غسل جنابت فرض ہے تو کیا جمعہ کے دن کا غسل فرضی غسل کی طرح کرنا سنت ہے یا کہ صرف نہالینا کافی ہے؟

(جواب) غسلِ جنابت مخصوص صفت کے ساتھ ہونا چاہیے۔ جس طرح کہ حضرت عائشہ اور میمونہ رضی اللہ عنہما کی روایات میں ''صحیح بخاری'' وغیرہ میں ذکر ہے، اور اگر کسی وقت عام غسل کی طرح اس غسل کو کرلیا جائے تو فرض پھر بھی ادا ہو جائے گا۔ [1] اور بلا جنابتِ غسل عام غسل کی طرح کافی ہے۔

فرضی غسل کی مخصوص دعا:

(سوال) کیا فرضی غسل کی کوئی دعاء ثابت ہے؟

(جواب) فرضی غسل کے لیے کوئی خاص دعاء نہیں، تاہم گندگی صاف کر کے باوضو ہو کر غسلِ جنابت کرنا چاہیے۔ ظاہر ہے کہ وضو کے شروع میں «بِسمِ اللّٰہِ» پڑھی جاتی ہے۔ لہٰذا یہی ذکر کافی سمجھنا چاہیے۔

غسل کے بعد کلمہ پڑھ کر جسم پر پھونک مارنا:

(سوال) کیا غسل کے بعد جسم پر کلمے پڑھ کر پھونکنا جائز ہے اور باتھ روم سے آنے کے بعد ہاتھ پر کلمہ پڑھ کر پھونکنا جائز ہے؟

(جواب) وضو یا غسل کے بعد کلمے پڑھ کر جسم پر پھونکنا کسی حدیث سے ثابت نہیں، اس طرح قضائے حاجت سے فراغت کے بعد ہاتھ پر پڑھ کر پھونکنا بھی ثابت نہیں۔

معتکف کے لیے غسل واجب کے لیے مسجد سے نکلنے کا حکم:

(سوال) اعتکافِ مسنون میں معتکف کے لیے غسلِ واجب کے لیے مسجد سے خروج جائز ہے یا نہیں؟ ۔ ایسے خروج میں اعتکاف پر کیا اثر پڑتا ہے؟ ۔۔۔ آیا سابقہ اعتکاف بھی فاسد ہو جاتا ہے یا محض خروج کے وقت کا؟

(جواب) الجواب بعون الوھاب: شرع میں اعتکاف، مخصوص شخص کا، مخصوص صفت کے ساتھ مسجد میں ٹھہرے رہنے کا نام ہے۔ قرآن مجید میں ﴿وَاَنتُم عٰكِفُونَ فِي المَسٰجِدِ﴾ (ظرفیت) کا تقاضا بھی یہی ہے کہ اعتکاف کے لیے مسجد کا وجود شرط ہے۔ اس بناء پر بلا حاجاتِ ضروریہ (پیشاب پاخانہ، غسلِ جنابت، وضو وغیرہ) مسجد سے نکلنا ناجائز ہے۔

---

[1] فتح الباری: ۱/ ۳۶۰

صحیح بخاری میں ایک باب بایں الفاظ منعقد ہوا "باب غسل المعتکف"

فتح الباری میں «اَی هٰذَا بَابٌ فِی بَیَانِ غُسْلِ الْمُعْتَکِفِ یَعْنِی یَجُوزُ وَلَمْ یَذْکُرِ الْحُکْمَ اِکْتِفَاءً بِمَافِی الْحَدِیْثِ» یعنی "یہ باب اعتکاف بیٹھنے والے کے لیے اعضاء کے دھونے کے جواز کا ہے۔ اور جو کچھ حدیث میں ہے، اسی پر اکتفاء کرتے ہوئے ترجمہ میں حکم بیان نہیں ہوا۔"

عمدۃ القاری میں ہے کہ: "معتکف کے لیے اعضاء کو دھونا جائز ہے۔"

قسطلانی میں برماوی اور کرمانی، دونوں سے نقل کیا گیا ہے کہ "لفظ "غسل" غین کے فتحہ (زبر) کے ساتھ ہے، ضمہ (پیش) کے ساتھ نہیں"۔۔ پھر علامہ قسطلانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: یونینی نسخہ میں ابوذر رضی اللہ عنہ کی روایت میں رفع (پیش) بھی ثابت ہے۔

مولانا وحید الزماں رحمۃ اللہ علیہ نے تیسیر الباری میں تبویب ہذا کا ترجمہ یوں کیا ہے: "اعتکاف والا سر یا بدن دھوسکتا ہے"۔ مصنف نے اس ترجمہ کے تحت جو حدیث نقل کی ہے، اس کے الفاظ یہ ہیں:

« کَانَ النَّبِیُّ ﷺ یُبَاشِرُنِی وَاَنَا حَائِضٌ وَکَانَ یُخْرِجُ رَاْسَهُ مِنَ الْمَسْجِدِ وَهُوَ مُعْتَکِفٌ فَاَغْسِلُهُ وَاَنَا حَائِضٌ.» (۸)

"(حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں:) نبی اکرم ﷺ میرے جسم کے ساتھ جسم لگاتے اور میں حیض والی ہوتی تھی ...... آپ ﷺ اپنا سر مبارک اعتکاف کی حالت میں مسجد سے (گھر اور مسجد کے درمیان ایک کھڑکی میں سے) باہر نکالتے تو میں اسے دھوتی اور میں حیض والی ہوتی تھی"

صحیح بخاری کی ایک دوسری تبویب یوں ہے: «باب الحائض ترجل راس المعتکف»
یعنی "حائضہ عورت کے لیے معتکف کے سر میں کنگھی کرنا جائز ہے۔"

پھر بسندہ حدیث بیان کرتے ہیں:

« کَانَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَ سَلَّمَ یُصْغِی اِلَیَّ رَاْسَهُ وَهُوَ مُجَاوِرٌ فِی الْمَسْجِدِ ، فَاُرَجِّلُهُ وَاَنَا حَائِضٌ.»[1]

(حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں) نبی اکرم ﷺ میری طرف اپنا سر مبارک جھکاتے تو میں آپ ﷺ کو کنگھی کرتی، اس حالت میں کہ میں حائضہ ہوتی تھی۔"

---

(2) صحیح البخاری، بَابُ غُسْلِ الْمُعْتَکِفِ، رقم: ۲۰۳۰، ۲۰۳۱

(1) صحیح البخاری، بَابُ الحَائِضِ تُرَجِّلُ رَأْسَ المُعْتَکِفِ، رقم: ۲۰۲۸

حدیث ہذا کے تحت حافظ ابن حجر رحمہ اللہ رقم طراز ہیں:''اس حدیث میں کنگھی کے ساتھ درج ذیل امور کا بھی جواز ہے۔ صفائی اختیار کرنا، خوشبو لگانا، غسل کرنا، بال منڈانا، زینت اختیار کرنا۔''

ایک تیسری تبویب مصنف نے بایں الفاظ قائم کی ہے:"وَکَانَ لَا یَدْخُلُ الْبَیْتَ اِلَّا لِحَاجَۃٍ" جب کہ صحیح مسلم میں "حاجۃ الانسان" کے الفاظ ہیں۔ امام زہری رحمہ اللہ نے''حاجۃ'' کی تفسیر پیشاب، پاخانہ کے ساتھ کی ہے۔ البتہ دیگر علماء نے بعض اور مستثنیات کا بھی ذکر کیا ہے، اگر چہ وہ مختلف فیہ ہیں۔

المجموع میں ہے:''جائز ہے کہ معتکف اپنا سر اور پاوں مسجد سے باہر نکالے یا طبعی حاجات کے لیے مسجد سے نکلے۔ تو اس حدیث کی بناء پر اعتکاف باطل نہیں ہوگا۔ اور اگر بلا عذر کے مسجد سے نکل گیا تو اعتکاف باطل ہے۔ اس لیے کہ اس نے وہ فعل کیا ہے جو اعتکاف کے منافی ہے، وہ ہے مسجد میں ٹھہرے رہنا''

لیکن جہاں تک محض ٹھنڈک حاصل کرنے کے لیے غسل کا تعلق ہے تو یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ آج تک کسی نے غیر واجب غسل کو مسجد سے نکل کر کرنے کے جواز کا فتویٰ دیا ہو یا وہ اس کا قائل ہو، لہٰذا جواز کی بات ناممکن نظر آتی ہے۔ اگر کوئی ایسا کر گزرے تو اس سلسلہ میں مغنی المحتاج میں تفصیل موجود ہے۔

جس کا ماحصل یہ ہے کہ: اگر یہ اعتکاف نفلی ہے تو اعتکاف کا پہلا جزء باطل نہیں ہوگا۔ اور اگر یہ واجب ہے جس میں تتابع شرط ہے تو یہ باطل ہے، نئے سرے سے پھر اعتکاف کرنا پڑے گا۔ اور اگر وجوب کے باوجود تتابع شرط نہیں تو پہلا اعتکاف باقی ہے۔ واضح رہے کہ مسجد کے اندر رہ کر غسل ٹھنڈک میں کوئی حرج نہیں۔

جس عورت پر غسل واجب ہو اس کا بچے کو دودھ پلانا:

سوال ناپاک عورت جس پر غسل واجب ہے اپنے بچے کو دودھ پلا سکتی ہے یا نہیں؟ اور ناپاک آدمی جس پر غسل واجب ہو وہ بغیر ضرورت کھانا کھا سکتا ہے یا نہیں؟

جواب بہتر یہ ہے کہ ماں بعد از غسلِ جنابت بچے کو دودھ پلائے۔ یہ بات معروف ہے کہ اسلام میں طہارت اور نظافت کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں ہے:

﴿ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ التَّوَّابِينَ وَ يُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِينَ﴾ (البقرۃ:۲۲۲)

اور بامر مجبوری اگر بلا طہارت بھی پلا دیا جائے تو جواز ہے۔ کیونکہ اصل مسلمان میں طہارت ہے۔ صحیح حدیث میں ہے:« إِنَّ الْمُؤْمِنَ لَا يَنْجُسُ »[1]

البتہ جُنبی کے لیے یہ ہے کہ بلا معقول عذر (روزہ وغیرہ کے لیے) طہارت اور غسل کے بغیر کھانا نہ کھائے اور روزہ کی صورت میں کم از کم طہارتِ صُغریٰ (یعنی وضوء) کا اہتمام ہونا چاہیے۔

جنابت کی حالت قرآن کریم کو چھونا یا تلاوت کرنا:

(سوال) جنابت کی حالت میں یا بغیر وضو کے ''قرآن کریم'' کو چھونا یا تلاوت کرنا جائز ہے؟ امام بخاری رحمہ اللہ نے جو جواز نکالا ہے وہ درست ہے کہ نہیں؟

(جواب) بحالتِ جنابت ''قرآن مجید'' کی تلاوت ناجائز ہے۔ اس بارے میں وارد روایات موضوع میں نص ہیں۔ جب کہ امام بخاری رحمہ اللہ کا استدلال عمومی نصوص سے ہے۔ نص بہر صورت عموم پر مقدم ہے۔ ممانعت کی روایات اگرچہ متکلم فیہ (یعنی ان میں اعتراض کیا گیا ہے) لیکن حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے تحسین کا حکم لگایا ہے۔

اور صاحبِ ''تحفۃ الاحوذی'' فرماتے ہیں: روایات میں اگرچہ کلام (اعتراض) ہے لیکن ان کو جمع کرنے سے قوت حاصل ہو جاتی ہے۔ اس بناء پر جمہور اہل علم منع ہونے کے قائل ہیں۔ جبکہ بلا وضو قرآن مجید کی تلاوت جائز ہے، کوئی حرج نہیں۔ جب کہ چھونا بغیر وضو کے ناجائز ہے۔ حدیث میں ہے:

« لَا یَمَسُّ الْقُرْاٰنَ اِلَّا طَاھِرٌ.» [2]

یعنی ''کوئی بلا طہارت قرآن کو مت ہاتھ لگائے۔'' [3]

غسل کے بعد بدن کو تولئے سے پونچھنا:

(سوال) غسل کے بعد بدن کو کپڑے تولئے سے نہ پونچھنا اور وضو کے بعد اعضاء کو تولئے وغیرہ سے خشک کر لینا کوئی شرعی مسئلہ ہے تو واضح کریں؟

---

① صحیح البخاری، بَابٌ: اَلْجُنُبُ یَخْرُجُ وَیَمْشِي فِي السُّوقِ وَغَیْرِہِ، رقم: ۲۸۵

② موطأ امام مالك، الْأَمْرُ بِالْوُضُوءِ لِمَنْ مَسَّ الْقُرْآنَ، رقم: ۲۱۹، سنن الدارقطنی، بَابٌ فِي نَھْيِ الْمُحْدِثِ عَنْ مَسِّ الْقُرْآنِ، رقم: ۴۳۷

③ طاہر (پاک) کے مفہوم میں علماء کا اختلاف ہے، جو علماء بغیر وضو بھی مسِ قرآن (قرآن کو ہاتھ لگانا) کے قائل ہیں۔ ان کے نزدیک طاہر سے مراد مسلمان یا حدثِ اکبر (جنابت) سے پاکی مراد ہے۔ اس لیے یہ علماء اس بات کے قائل ہیں کہ جس طرح بلا وضو تلاوتِ قرآن کریم جائز ہے۔ اسی طرح مسِ قرآن بھی جائز ہے۔ البتہ افضل بات یہی ہے کہ باوضو تلاوت اور مسِ قرآن کیا جائے۔ (صلاح الدین یوسف)

(جواب) غسل اور وضوء کے بعد اعضاء کو خشک کیا جا سکتا ہے۔ منع نہیں، کیونکہ اصل اباحت ہے اور حضرت میمونہ کی جس روایت میں ہے کہ آپ ﷺ کے غسل کے بعد وہ تولیہ لے کر حاضر ہوئی تو آپ ﷺ نے واپس کر دیا، یہ واقعہ خاص ہے۔ قاعدہ مشہور ہے: وقائع الاعیان لا یحتج بها علی العموم خاص واقعات سے عموم پر استدلال کرنا درست نہیں یہاں احتمال ہے، ممکن ہے اس تولیہ میں عدمِ جواز کا کوئی سبب ہو یا آپ جلدی میں ہوں یا وہ پاک صاف نہ ہو یا اس بات سے ڈرے ہوں کہ تولیہ پانی سے خود ہی تر نہ ہو جائے جو غیر مناسب ہے وغیرہ۔

بلکہ غسل کے موقعہ پر حضرت میمونہ کا تولیہ پیش کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ پہلے آپ ﷺ اپنے اعضاء کو خشک کرتے تھے، ورنہ وہ پیش نہ کرتیں۔ نیز سنن ابن ماجہ میں بسندِ حسن حضرت سلمان سے مروی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے وضوء کیا اور صفا کا جبہ جو آپ نے پہنا ہوا تھا، اس سے اپنے چہرے کو صاف کیا۔[1] مزید تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو عون المعبود: ۱/۱۰۱۔

[1] سنن ابن ماجه، بَابُ الْمِنْدِيلِ بَعْدَ الْوُضُوءِ، وَبَعْدَ الْغُسْلِ، رقم: ٤٦٨

۲۔ کتاب المساجد

مختلف مساجد میں نماز پڑھنے کا ثواب

بیت اللہ، مسجد نبوی اور مسجد اقصیٰ میں نماز پڑھنے کا کیا ثواب ہے؟

سوال : بیت اللہ شریف، مسجد نبوی، اور مسجد اقصیٰ میں نماز پڑھنے کا ثواب ایک لاکھ اور پچاس پچاس ہزار بالترتیب بیان کیا جاتا ہے کیا یہ صحیح ہے یا اس سے کم اور زیادہ بھی ثابت ہے؟

جواب : یہ حدیث ضعیف ہے۔ اس کی سند میں راوی ''رزیق ابوعبداللہ الہانی'' مختلف فیہ ہے۔ اس سے بیان کرنے والا ابو الخطاب ''دمشقی'' ہے اور وہ مجہول ہے۔ امام ذہبی ''میزان'' میں فرماتے ہیں:«اِنَّہٗ حَدِیثٌ مُنکَرٌ جِدًّا»،بحوالہ مشکوٰۃ حاشیہ البانی (۱/۲۳۴) ''مرعاۃ المفاتیح'' (۱/۴۹۵)

مساجد میں قرآن کی تلاوت کا ثواب:

سوال : کیا ایسا کسی حدیث سے ثابت ہے کہ مسجد میں قرآن کی ایک آیت پڑھنا ایک اونٹ کے برابر ہے؟

جواب : ہاں! اس موضوع کی روایات صحیح مسلم میں ہیں۔

مساجد کی مخصوص جگہوں کے احکام

مسجد و مدرسہ کی جگہ کو تبدیل کرنا:

سوال : ایک آدمی نے کسی گاؤں کی سڑک پر شہر سے ۵ کلو میٹر جگہ خریدی۔ اس گاؤں سے ۲ فرلانگ کے فاصلہ پر ایک قطعہ اراضی ڈیڑھ کنال اپنی جمع کردہ پونجی (رقم) سے خریدی۔ جس میں سے ایک کنال مدرسہ کے نام وقف کی اور ۱۰ مرلہ اپنے نام کرائی اور ۲ رہائشی کمرے بھی اپنی ذاتی رقم سے تعمیر کرائے اور مدرسہ کی چار دیواری وغیرہ کرائی۔ جس جگہ پر مدرسہ بنایا وہ جگہ غیر آباد ہے۔ اس کے قریب اور کوئی رہائش وغیرہ نہ بن

سکی۔ اس کا پانی بھی صحت کے لیے مضر ہے۔ غیر آباد جگہ ہونے کی وجہ سے اور نزدیک قبرستان ہونے کی وجہ سے مقامی اور اقامتی طلبہ بھی نہ ٹھہرتے اور پھر وسائلِ آمدنی بھی اس قدر نہ ہوئے کہ وہ آدمی اس کو صحیح معنوں میں چلا سکتا۔ اب حالت یہ ہے کہ اس آدمی کا نہ تو کوئی کاروبار ہے اور نہ کوئی اور رہائش گاہ۔ وہ رہائش جو مدرسہ میں بنائی گئی اہل خانہ وہاں رہنے پر رضا مند نہیں کہ پانی مضر اور اس سڑک پر متعدد بار ڈاکے، چوریاں، قتل وغیرہ ہوتے رہے ہیں، اور اب بھی کبھی کبھی یہ سلسلہ چلتا رہتا ہے اور یاد رہے کہ جس آدمی نے یہ جگہ دی اس نے مسجد بھی خود ہی ۵ مرلہ میں بنوا کر دی اور وہ مدرسہ اب بے آباد ہے۔ مدرسہ آباد ہو تو مسجد بھی آباد ہو۔ جمعہ کے لیے بھی حاضری نہیں ہوتی اور مدرسہ چلانے کے لیے نہ تو کوئی فنڈ ہے اور نہ یہ امید ہے کہ فنڈ مل جائے گا۔ جب یہ خرید کی گئی تھی چار ہزار روپے مرلہ خرید کی گئی تھی۔ اب شہر کے قریب کافی آبادی ہے جہاں پر احبابِ جماعت کے ۳۰، ۲۵ گھر آباد ہیں اور وہاں پر مسجد مدرسہ اہلِ حدیث بھی نہیں ہے وہ لوگ مطالبہ کرتے ہیں کہ یہ جگہ فروخت کر دو اور ہماری بستی میں جگہ خرید کر مسجد مدرسہ کا ملبہ وہاں پر لگا دو اور اس تعمیر پر اپنی رہائش بھی بناء لینا۔ اس صورت میں مسجد مدرسہ کی جگہ تبدیل کی جا سکتی ہے یا نہیں؟ پہلی جگہ ایک کنال یا ڈیڑھ کنال تھی۔ وہاں نئی جگہ پر صرف ۵ مرلہ زمین اتنی رقم پر ملے گی۔ جس سے جگہ خرید کی ہوئی ہے وہ کہتا ہے کہ اگر تم مسجد مدرسہ کا ملبہ لے جاؤ تو مجھے کوئی اعتراض نہیں کیونکہ یہاں پر رونق نہیں ہو رہی۔ اس صورت میں کیا کیا جائے۔ مہربانی فرما کر جواب عنایت فرما کر ممنوع فرمائیں۔ عین نوازش ہو گی۔

(جواب): مذکور پلاٹ چونکہ بنام مسجد وغیرہ وقف ہے اور وقف عقد لازم کی قبیل سے ہوتا ہے۔ اس لیے اس کا فسخ ناجائز ہے۔ حدیث میں ہے وقف شے نہ فروخت ہو سکتی ہے اور نہ ہبہ کی جا سکتی ہے اور نہ وراثت میں لی جا سکتی ہے۔ بناء بریں موجود جگہ غیر آباد ہونے کے باوجود وقف ہی رہے گی۔ اب غور طلب بات یہ ہے کہ اس سے فائدہ کس طرح اٹھایا جا سکتا ہے؟ تو فی الحال اس کی مناسب شکل وصورت یہی نظر آتی ہے کہ پلاٹ ہذا کو فروخت کر کے اس کے عوض آبادی میں جگہ خرید کر مسجد وغیرہ تعمیر کی جائے، چاہے وہ حجم میں کم ہو۔ اس سے وقف متاثر نہیں ہوتا۔

صحیح مسلم میں تفصیلی قصہ موجود ہے کہ آپ ﷺ نے بنام کعبہ ہدایا ونذرانوں کی تقسیم وتوزیع کا عزم فرمایا، لیکن نئے مسلمانوں کے حالات کے پیشِ نظر اس کی تعمیل نہ ہو سکی۔

اس سے معلوم ہوا کہ زائد عن الحاجت (ضرورت سے زائد) وقف کو مناسب کارِ خیر میں صرف کیا جا سکتا ہے۔ "کشف القناع عن متن الاقناع" میں ہے۔ امام احمد رحمہ اللہ نے تبدیلیٔ وقف پر اس بات سے

استدلال کیا ہے کہ حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما نے جامع مسجد کھجوروں کے تاجروں سے بدل دی۔ یعنی بدل کر کوفہ میں دوسری جگہ لے گئے۔ نیز حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے شارع عام تنگ ہونے پر مسجد کا کچھ حصہ راستہ میں ڈال دیا۔

مسجد کی جگہ تبدیل کرنا:

(سوال) : ایک کاٹن فیکٹری کے مالک نے اپنے مزدوروں کے لیے تقریباً ڈھائی مرلہ $2\frac{1}{2}$ میں مسجد بنوائی تھی، اس وقت اسے کاٹن فیکٹری کی لیبر اور اس کا عملہ ہی ملحوظِ خاطر تھا۔ اس لیے اس نے فیکٹری کے ایک کونہ میں آبادی سے ہٹ کر الگ ایک مسجد بنوائی۔ اب وہ آدمی اس کاٹن فیکٹری کے پلاٹ بناء کر جگہ فروخت کر رہا ہے۔ اس مسجد کی آباد کاری کے لیے کیا مسجد اسی جگہ رہنی چاہیے یا وہاں سے دوسری جگہ آئندہ جو آبادی ہونیوالی ہے اس میں منتقل کر لی جائے۔ اگر اسی جگہ مسجد رہے تو اس کی آبادی نہ ہونے کی وجہ سے مسجد مذکورہ بے آباد ہوگی۔ بَیِّنُوا تُوجروا۔

(جواب) : بوقتِ ضرورت مسجد دوسری جگہ منتقل ہوسکتی ہے۔ صحیح مسلم میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا: کہ اگر تیری قوم نئی نئی مسلمان نہ ہوئی ہوتی، تو میں بیت اللہ کا خزانہ نکال کر فی سبیل اللہ تقسیم کر دیتا، اور بیت اللہ کا دروازہ زمین کے ساتھ ملا دیتا، اور حجر کا کچھ حصہ بیت اللہ میں داخل کر دیتا۔ [1] بیت اللہ کے خزانہ سے مراد وہ مال ہے، جو لوگ بیت اللہ کی خاطر نذر کیا کرتے تھے۔ جیسے مساجد میں لوگ دیتے ہیں۔ یہ خزانہ بیت اللہ میں اسی طرح دفن تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب دیکھا کہ یہ بیت اللہ کی حاجت سے زائد اور بے کار ہے، تو خیال ہوا کہ اس کو فی سبیل اللہ تقسیم کر دیا جائے۔ لیکن کفار چونکہ نئے نئے مسلمان ہوئے تھے، خطرہ تھا کہ کہیں وہ بدظن نہ ہو جائیں۔ اس لیے چھوڑ دیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ جب وقف کی حالت ایسی ہو جائے کہ ضائع ہوتی نظر آئے تو اس کی کوئی ایسی صورت بنانی چاہیے۔ جس سے وہ ضائع نہ ہو۔

"کشف القناع عن متن الاقناع" (۲/ ۴۷۱) میں ہے کہ امام احمد رحمہ اللہ نے تبدیل وقف پر اس بات سے استدلال کیا ہے کہ حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے جامع مسجد کھجوروں کی تجارت گاہ سے بدل دی۔ یعنی بدل کر کوفہ میں دوسری جگہ لے گئے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ شارع عام تنگ ہوگئی، تو

[1] صحیح مسلم، بَابُ نَقضِ الكَعبَةِ وَبِنَائِهَا، رقم: ۱۳۳۳

انھوں نے مسجد کا کچھ حصہ راستہ میں ڈال دیا۔ ملاحظہ ہو! فتاویٰ ابن تیمیہ (۳/ ۲۸۸)
غرض اس قسم کے تصرُّفات اوقاف اور خیرات میں درست ہیں، جن سے وہ ضائع نہ ہوں، بلکہ بڑھیں یا محفوظ ہو جائیں۔ بلکہ حنفیہ کا بھی آخری فتویٰ اسی پر ہے۔ چنانچہ ردّ المحتار (۳/ ۴۰۷) میں اس کی تصریح کی ہے اور امام محمد رحمہ اللہ نے تو یہاں تک کہہ دیا ہے کہ اگر وقف بے کار ہو جائے، تو اس کے اصل مالک یا وارثوں کی ملک میں ہو جائے گا۔ خلاصہ یہ کہ وقف کی غرض پر مدار ہے۔ حتی الوسع (ممکن حد تک) اس کو ضائع نہ ہونے دیا جائے۔ فتاویٰ اہلِ حدیث (۱/ ۳۲۳۔۳۲۴) بایں صورت مسجد ہذا کو وہاں منتقل کردیا جائے، جہاں نمازوں کے لیے مفید تر ثابت ہو سکے۔

مسجد سے ملحقہ کمروں کو مدرسۃ البنات میں تبدیل کرنا اور مسجد کا فنڈ اس پر خرچ کرنا:

سوال: ہمارے گاؤں میں صرف ایک ہی مسجد ہے، جہاں تمام لوگ اکٹھے نماز پڑھتے ہیں، مسجد کی تعمیر کا کام مکمل ہو چکا ہے۔ بلکہ اضافی دو تین کمرے مسجد کی دائیں طرف، اور اسی طرح ایک کمرہ اور برآمدہ مسجد کی بائیں طرف ہے۔ جس میں بچے ناظرہ قرآن مجید، صبح کی نماز کے بعد گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ پڑھتے ہیں۔ دائیں طرف پر مین گلی، اور مسجد کا مین گیٹ ہے اور اسی طرف کمروں کے آگے خوبصورت پارک بنے ہوئے ہیں۔

اب صورتِ حال یہ ہے کہ گاؤں کی دو تین لڑکیاں مدرسہ سے فارغ التحصیل ہوئی ہیں۔ جن میں عالمہ اور فاضلہ بھی ہیں۔ لڑکیاں ماشاء اللہ کافی ذہین اور خلوص کے ساتھ محنت کرنے والی ہیں۔

فی الوقت وہ بغیر کسی معاوضہ کے گاؤں کی بچیوں کو پڑھا رہی ہیں، اور انتہائی اچھے اثرات مرتب ہو رہے ہیں۔ اب ہمیں یہ مسئلہ درپیش ہے کہ

(۱) کیا مسجد کی بائیں طرف والے کمرے اور برآمدے کو ہم مدرسۃ البنات میں تبدیل کر سکتے ہیں؟
(۲) کیا مسجد کے نام پر جمع شدہ رقم اس تعمیر پر لگائی جاسکتی ہے؟ کیونکہ گاؤں والے مسجد کے نام پر چندہ دیتے ہیں اور مسجد کی تعمیر الحمد لِلّٰہِ مکمل ہے۔ دوسری سرگرمیوں میں لوگ اتنی دلچسپی کا مظاہرہ نہیں کرتے۔ (۳) کیا مسجد کی جمع شدہ رقم سے ان معلمات کی خدمت کی جاسکتی ہے، جو فی الوقت رضائے الٰہی کے لیے پڑھا رہی ہیں۔ بذاتِ خود انھوں نے کچھ مطالبہ نہیں کیا جب کہ مالی لحاظ سے وہ کچھ زیادہ مضبوط بھی نہیں ہیں۔ (۴) بچوں کو ناظرہ قرآن مجید پڑھانے والے حافظ صاحب کی خدمت انہی پیسوں سے کی جا سکتی ہے جب کہ گاؤں والے صرف تنخواہ کے نام پر اتنی زیادہ خدمت نہیں کرتے اور حافظ صاحب کی مالی

حالت بھی انتہائی کمزور ہے کیونکہ وہ مقامی ہیں اور ہم ان کے حالات سے واقف ہیں جب کہ مسجد کے نام پر ہزاروں کے حساب سے رقم جمع ہو جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر دے۔

جواب: (۱) مسجد سے ملحقہ کمروں میں باپردہ صورت میں ''مدرسۃ البنات'' قائم کیا جا سکتا ہے۔ تعمیر مسجد سے مقصود چونکہ ذکرِ الٰہی ہوتا ہے، سو وہ حاصل ہے۔

(۲) مسجد کے لیے جمع شدہ رقم بوقتِ ضرورت تعمیر ہذا پر صرف ہو سکتی ہے۔ صحیح مسلم میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا، کہ آپ نے فرمایا:

«يَا عَائِشَةُ لَوْلَا حِدثَانُ قَومِكِ بِالكُفرِ لَنَقَضتُ البَيتَ حَتَّى أَزِيدَ فِيهِ مِنَ الحِجرِ، فَإِنَّ قَومَكِ قَصَّرُوا فِي البِنَاءِ» [1]

اگر تیری قوم نئی نئی مسلمان نہ ہوئی ہوتی، تو میں بیت اللہ کا خزانہ نکال کر فی سبیل اللہ تقسیم کر دیتا، اور بیت اللہ کا دروازہ زمین کے ساتھ ملا دیتا، اور حجر کا کچھ حصہ بیت اللہ میں داخل کر دیتا۔''

ہمارے شیخ محدث روپڑی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''بیت اللہ کے خزانہ سے مراد وہ مال ہے، جو لوگ بیت اللہ کی خاطر نذر دیا کرتے تھے۔ جیسے مساجد میں لوگ دیتے ہیں۔ یہ خزانہ بیت اللہ میں اسی طرح دفن ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب دیکھا کہ یہ بیت اللہ کی حاجت سے زائد بیکار ہے، تو خیال ہوا کہ اس کو فی سبیل اللہ تقسیم کر دیا جائے۔ لیکن کفار چونکہ نئے نئے مسلمان ہوئے تھے، خطرہ تھا کہ وہ کہیں بدظن نہ ہو جائیں، اس لیے چھوڑ دیا۔'' (فتاویٰ اہلحدیث:۱/۳۲۳)

(۳)، (۴) فی الجملہ مُعلّمین اور مُعلّمات کی تنخواہوں کی ادائیگی بھی اس مد سے ہو سکتی ہے، کیونکہ یہ بھی کارِ خیر کا ایک حصہ ہے۔ اور سابقہ حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ وقف میں تصرُّف ہو سکتا ہے۔

سوا سو سال پرانی مسجد کی جگہ پر مدرسہ تعمیر کرنا:

سوال: ایک خوبصورت مسجد جو سوا سو سال پرانی ہے، رمضان المبارک میں زائد نمازیوں اور مُعتکفین حضرات کی وجہ سے تنگ پڑ جاتی ہے۔ کیا شرعی لحاظ سے یہ جائز ہوگا کہ اِسے گرا کر یا اِسی حالت میں لڑکیوں کے مدرسے میں تبدیل کر دیا جائے اور کسی دوسری جگہ کشادہ اور بڑی مسجد تعمیر کر دی جائے۔ نیز واضح رہے کہ ساتھ ہی مسجد کا ایک مکان بھی موجود ہے جسے گرا کر مسجد میں توسیع بھی کی جا سکتی ہے۔

[1] صحیح مسلم، بَابُ نَقضِ الكَعبَةِ وَبِنَائِهَا، رقم:۱۳۳۳

جواب صورتِ سوال سے ظاہر ہے کہ مسجد میں توسیع کی گنجائش موجود ہے، لہٰذا بہتر یہ ہے کہ اسی جگہ توسیع کر لی جائے، البتہ کسی معقول عارضہ کی بنا پر اس کو تبدیل کرنا بھی جائز ہے۔

چنانچہ کشف القناع عن متن الاقناع میں ہے کہ امام احمد رحمہ اللہ نے تبدیلی وقف پر اس بات سے استدلال کیا ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے کوفہ میں جامع مسجد کا کھجور کے تاجروں سے (کسی دوسری جگہ کے عوض) تبادلہ کر لیا یعنی وہ اسے بدل کر کوفہ میں دوسری جگہ لے گئے۔ اسی طرح فتاویٰ ابن تیمیہ رحمہ اللہ میں ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے شارعِ عام تنگ ہونے کی وجہ سے مسجد کا کچھ حصہ اس میں ملا دیا تھا۔ (۲۸۸/۳) حضرات صحابہ کرامؓ کے یہ تصرفات اس بات کی دلیل ہیں کہ مسجد کو کسی مجبوری کی بنا پر بدلنا جائز ہے۔

مسجد کے نام وقف شدہ زمین کا کیا حکم:

سوال مسجد کے نام وقف شدہ زمین کا کیا حکم ہے؟ جب کہ وقف شدہ جگہ پر مسجد کی تعمیر کی ضرورت نہ رہے۔ آیا وقف شدہ زمین کسی اور نیک کام میں استعمال ہو سکتی ہے یا فروخت کر کے کسی اور جگہ بھی مسجد تعمیر کی جا سکتی ہے؟

جواب وقف شدہ چیز کو وقف ہی رہنا چاہیے، اگر وقف کا مصرف نہ رہے تو دوسرے وقف میں اس کی قیمت کو استعمال کیا جا سکتا ہے یا پھر کسی بھی کارِ خیر میں اس کی قیمت خرچ ہو سکتی ہے۔

اذان و جماعت کا اہتمام کرنے سے جگہ کا حکم:

سوال: میں کرائے کی جگہ پر لکڑی فروخت کرنے کا کام کرتا ہوں اور وہاں ظہر اور عصر کی نماز ہم جماعت سے ادا کرتے ہیں اور اذان کہہ کر جماعت کراتے ہیں۔ ایک دن کسی آدمی نے ہم سے کہا کہ جس طرح آپ اذان کہہ کر جماعت کراتے ہیں اس طرح یہ جگہ مسجد کے لیے مخصوص ہو جائے گی۔

براہ مہربانی ہمیں آگاہ کیا جائے کہ جہاں ہم جماعت کراتے ہیں وہ تو کرایے کی جگہ ہے کیا وہ جگہ مسجد کے لیے مخصوص کرانا پڑے گی یا اسی طرح درست ہے؟ ہم وہاں صرف ظہر اور عصر کی نماز ادا کرتے ہیں باقی نمازیں گھر آ کر مسجد میں ادا کرتے ہیں۔

جواب: کسی جگہ محض اذان جماعت کا اہتمام کرنے سے وہ جگہ وقف نہیں ہوتی اور نہ وہ مسجد کے حکم میں ہوتی ہے۔ صحیح بخاری میں قصہ عتبان بن مالک رضی اللہ عنہ میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے گھر نوافل کی

جماعت کرائی تھی۔[1] اس پر شارح صحیح بخاری حافظ ابن حجر رحمہ اللہ رقمطراز ہیں:

« وَ اِنَّ الْمَکَانَ الْمُتَّخَذَ مَسجِدًا مِنَ الْبَیتِ لَا یَخرُجُ عَن مِلكِ صَاحِبِهٖ.»(فتح الباری:۳/۶۲)

یعنی ''اس حدیث میں جملہ مسائل میں سے یہ بھی ہے کہ گھر کی جگہ میں سے کسی حصہ کو مسجد قرار دینے سے وہ مالک کی ملکیت سے خارج نہیں ہوتی۔''

دوسرے مقام پر فرماتے ہیں: کہ جمہور کے نزدیک وقف اس وقت ثابت ہوتا ہے جب وقفیت (وقف شدہ چیز) کی تصریح ہو یا صیغہ متحمل ہو اور مالک کی نیت وقف کی ہو۔ (فتح الباری : ۵/ ۳۹۹)

جب کہ زیر بحث مسئلہ میں دونوں چیزیں مفقود ہیں۔ اس لیے جائے مصلّٰی (نماز کی جگہ) مسجد کے حکم میں نہیں اور آپ کی نمازیں بلاتردد درست ہیں۔

نماز کے لیے مخصوص کی گئی جگہ کا حکم:

سوال: ایک آدمی نے آبادی کے قریب اپنی زرعی زمین کے ایک حصے کو مخصوص نشانات لگا لیے تھے کہ یہاں نماز ادا کی جائے گی وہ نماز پڑھتا بھی رہا اب اس کی وفات کے بعد وہاں کوئی نماز ادا نہیں کرتا۔ اب کیا اس جگہ کو زرعی اراضی میں ملایا جا سکتا ہے جبکہ قریبی آبادی میں مسجد موجود ہے؟

جواب: اگر مالک نے زمین کا یہ ٹکڑا وقف نہیں کیا تھا تو پھر اس کو مملوکہ زرعی زمین سے ملایا جا سکتا ہے اور اگر اس کو مسجد کے لیے وقف کر دیا تھا تو پھر ملانا ناجائز ہے۔ ہاں البتہ اس صورت میں قریب مسجد ہونے کی بناء پر اس کی ضرورت باقی نہ ہو تو اس کو فروخت کر کے رقم موجود مسجد پر صرف کر دی جائے۔

راستے کی جگہ شامل کر کے مسجد کی توسیع کا حکم:

سوال: ہمارے گاؤں میں ایک مسجد ہے جس کے مشرق، مغرب اور جنوب کے اطراف میں سرکاری سڑکیں ہیں جب کہ شمال کی جانب گھر ہیں۔ جنوب کی طرف جو راستہ ہے اس سے متصل جنوب ہی کی طرف خالی جگہ ہے جو کہ ملکیتِ سرکار ہے اور پنچایت گھر کے لیے ہے کچھ لوگ مسجد کو توسیع کرنا چاہتے ہیں جب کہ پہلی مسجد ہی نمازیوں کی ضرورت پوری کر کے خالی رہتی ہے جبکہ ایک منزلہ زائد بھی ہے۔ توسیع کرنے والوں کا خیال ہے کہ جنوب کی طرف جو راستہ ہے اسے مسجد میں شامل کر لیں اور اس راستہ کے متصل جنوب ہی کی طرف راستہ چھوڑ دیں جو کہ ملکیتِ سرکار ہے۔ گاؤں کے وہ لوگ جن کے استعمال میں یہ راستہ کثرت سے آتا ہے

[1] صحیح البخاری،بَابُ إِذَا دَخَلَ بَیتًا یُصَلِّی حَیثُ شَاءَ أَو حَیثُ أُمِرَ وَلَا یَتَجَسَّسُ،رقم:۴۲۴

وہ اس پر خوش نہیں ہیں کیونکہ اس طرح ان کی مشکلات میں اضافہ ہوتا ہے لیکن یہ لوگ محنت مزدوری کرنے والے ہیں اور مسجد کے متولی چوہدری لوگ ہیں یہ ان کے سامنے اپنے جذبات کا اظہار نہیں کر سکتے اور نہ ہی عدالت میں ان سے ٹکر لے سکتے ہیں آپ سے عرض ہے کہ آپ شریعت کے نقطۂ نظر سے راہنمائی کریں اور ہمیں آگاہ فرمائیں کہ کیا اس طرح مسجد کی توسیع درست ہے؟

جواب لکھتے وقت مندرجہ ذیل باتوں کو ذہن میں ملحوظ رکھیں۔

(۱) جس جگہ کو مسجد میں شامل کیا جا رہا ہے وہ عامۃ الناس کے لیے راستہ کے طور پر چھوڑی گئی ہے۔

(۲) اس جگہ کے متبادل جو راستہ دیا جا رہا ہے مسجد کی انتظامیہ وغیرہ کا اس پر کوئی حق نہیں ہے۔

(۳) لوگ اس متبادل راستہ پر خوش نہیں ہیں۔

(۴) پہلا راستہ سیدھا ہے اور ٹریفک کے مسئلہ پر لوگوں کو کوئی مشکل پیش نہیں آتی۔ لیکن متبادل راستہ تنگ گلی پر ختم ہوتا ہے راستہ سیدھا نہیں رہتا۔ یا تو ٹریفک کے استعمال کے قابل ہی نہیں رہتا یا پھر مشکل ہو جاتا ہے۔

(۵) سرکاری زمین اور خصوصاً راستہ پر (یعنی راستہ کی جگہ پر) مسجد تعمیر کرنا کیا حکم رکھتا ہے؟

(٦) اگر گاؤں والے راضی ہو بھی جائیں لیکن حکومت سے اجازت نامہ حاصل کرنے کے بغیر اس راستہ کی جگہ پر مسجد کی تعمیر کا کیا حکم ہے؟

(۷) اگر حکومت اجازت دے بھی دے تو پھر شریعت کی رُو سے تعمیر کیسی ہے؟

: صورتِ سوال سے ظاہر ہے کہ مسجد سے ملحقہ جنوبی طرف کافی وسیع جگہ خالی ہے جہاں راستہ کے علاوہ کوئی اور عمارت بھی کھڑی ہو سکتی ہے۔ بناء بریں احتیاطاً اربابِ حلّ وعقد (حکمرانوں) سے تصفیہ طلب اُمور کے بعد اور ممکنہ ضرورت کی صورت میں مسجد ہذا میں توسیع کا جواز ہے، بشرطیکہ راستہ سے گزرنے والوں کے لیے تنگی و تکلیف کا باعث نہ بنے۔

چنانچہ امام بخاری رحمہ اللہ نے صحیح بخاری میں بایں الفاظ باب قائم کیا ہے:

« بَابُ الْمَسْجِدِ يَكُونُ فِي الطَّرِيقِ مِنْ غَيْرِ ضَرَرٍ بِالنَّاسِ وَ بِهِ قَالَ الْحَسَنُ وَ أَيُّوبُ وَ مَالِكٌ » [1]

پھر قصہ ابی بکر رضی اللہ عنہ سے استدلال کیا ہے کہ انھوں نے اپنے گھر میں مسجد بنائی ہوئی تھی۔ جس میں مذکور ہے کہ

[1] صحیح البخاری، قبل رقم الحدیث: ٤٧٦

« فَابۡتَنٰی مَسۡجِدًا بِفِنَاءِ دَارِهٖ، فَكَانَ يُصَلِّي فِيهِ، وَ يَقۡرَأُ الۡقُرۡاٰنَ » ①

نیز متبادل جگہ اگر کسی کی شخصی ملکیت ہے تو اس کو ممکنہ توسیع میں شامل نہیں کیا جا سکتا، اور سرکاری جگہ کو مذکورہ بالاشرط کے ساتھ شامل کرنے کا جواز ہے۔ سرکار کی حیثیت محض امین کی ہے۔ لیکن سوال کے بعض اجزاء سے ظاہر ہوتا ہے کہ متبادل راستہ سے عامۃ الناس کو دقّت کا سامنا کرنا ہوگا۔

اس بناء پر انتظامیہ کو چاہیے کہ پہلے لوگوں کو مطمئن کرے، ورنہ توسیع کا ارادہ ترک کردے، مگر یہ کہ مخالفین کی وجہِ مخالفت محض مذہبی عصبیت ہو تو اس کی پرواہ نہیں کرنی چاہیے۔

بہرصورت فیصلہ حقائق اور واقعات کی روشنی میں ہونا چاہیے، تاکہ عوام صحیح طور پر راستہ سے مستفید ہو سکیں۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ راستہ پہلا ہو یا دوسرا۔ مقصد تو لوگوں کی سہولت ہے۔ (واللہ ولی التوفیق)

کیا غصب شدہ زمین پر نماز جائز ہے؟

سوال کیا غصب شدہ زمین پر نماز جائز ہے؟ (ابوحذیفہ، چونیاں)

جواب اس مسئلہ میں اہل علم کا اختلاف ہے۔ حنابلہ کی اس کے بارے میں دو روایتیں ہیں، ایک جواز کی اور دوسری عدمِ جواز کی۔ اسی طرح امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ، مالک رحمہ اللہ اور شافعی رحمہ اللہ بھی ایک قول کے مطابق جواز کے قائل ہیں۔ صاحبِ المہذب فرماتے ہیں:

''غصب شدہ زمین میں نماز ناجائز ہے، کیونکہ یہاں اگر سکونت حرام ہے تو اس مقام پر نماز پڑھنا بطریق اولیٰ ناجائز ہوگا۔ اگر کوئی یہاں نماز پڑھ لے تو نماز درست ہوگی، کیونکہ منع کا تعلق نماز سے مخصوص نہیں جو اس کی صحت سے مانع ہو۔''

امام نووی رحمہ اللہ رقم طراز ہیں: ''غصب شدہ زمین میں نماز بالاجماع حرام ہے اور ہمارے نزدیک اور جمہور فقہا اور اصحابِ اُصول کے ہاں نماز پڑھ لی جائے تو درست ہو جائے گی۔''

میرا رجحان بھی اِسی قول کی طرف ہے کیونکہ نہی کا تعلق نفس نماز سے نہیں جو صحتِ نماز سے مانع ہو۔

تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو: المجموع شرح المهذب ٣/ ١٦٥ ، اور المغنی: ٢/ ٤٧٦ ، ٤٧٧۔

حکومتی اراضی جو ضرورت سے زائد ہو اسے مسجد کے لیے استعمال کرنا:

سوال: کیا گورنمنٹ کی ایسی جگہ پر مسجد تعمیر ہو سکتی ہے جس کا اکثر حصہ گورنمنٹ سے منظور شدہ ہے البتہ کچھ

① صحیح بخاری، باب المسجد یکون فی الطریق من غیر ......الخ، رقم: ٤٧٦، مع فتح الباری: ١/ ٥٦٤

حصے کی منظوری نہیں ہے جبکہ یہ حصہ تقریباً ۳۵ سال سے عملاً مسجد میں شامل ہے۔ (عبدالقیوم، رئیس دارالعلوم محمدیہ)

(جواب) : حکومت کی جگہ ضرورت سے زائد ہو تو اس کو زیر استعمال لانے میں کوئی حرج نہیں کیونکہ شرعاً قومی مال میں اصل چیز تصرف کا جواز ہے بشرطیکہ گزرگاہ کے لئے تنگی کا باعث نہ بنے۔ اس پر امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی صحیح میں باب قائم کیا ہے: باب المسجد یکون فی الطریق من غیر ضرر بالناس

تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو: فتح الباری ۱/۵۶۴ و ۱۸۵۔

مسجد کے لیے نیچے دوکانیں اوپر مسجد بنانے کا حکم

(سوال) : راجن پور شہر میں ایک جدید مارکیٹ تعمیر ہو رہی ہے یہاں پر پہلے سے موجود چھوٹی سی مسجد تقریباً دو مرلہ رقبہ پر مشتمل ہے۔ اراضی کے مالک نے وہ مسجد جماعت اہلِ حدیث کی تولیت اور انتظام میں دے دی ہے۔ جماعت نے مزید تقریباً چار مرلے رقبہ مسجد کے لیے خرید لیا ہے اب انتظامیہ مسجد کا خیال ہے کہ پہلے سے موجود مسجد گرا کر تمام رقبے پر مسجد کے لیے دوکانیں بنا دیں جائیں اور اُوپر مسجد تعمیر کر دی جائے تاکہ مسجد کی مستقل آمدن کا ذریعہ بن سکے۔ از روئے قرآن و حدیث بتائیں کہ کیا ایسے کر سکتے ہیں؟

(جواب) : عمارت کی پہلی منزل میں مسجد کے مصارف کی غرض سے دکانیں بنانا اور مسجد کو بالائی منزل پر منتقل کرنے کا کوئی حرج نہیں۔ کشف القناع میں ہے کہ امام احمد رحمہ اللہ نے تبدیلِ وقف پر اس بات سے استدلال کیا ہے، کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے جامع مسجد کو کھجوروں کی تجارت گاہ سے بدل دیا۔ یعنی بدل کر کوفہ میں دوسری جگہ لے گئے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ شارعِ عام تنگ ہو گئی، تو انھوں نے مسجد کا کچھ حصہ راستہ میں ڈال دیا۔ ملاحظہ ہو! فتاویٰ ابن تیمیہ رحمہ اللہ۔ اس سے معلوم ہوا کہ بوقتِ ضرورت وقف میں تبدیلی و تصرف کا منتظمین کو اختیار ہے۔

نیچے دکانیں اوپر مسجد اور دکانوں کا مصرف:

(سوال) : ہماری مسجد جو کہ عرصۂ دراز سے ایک صاحب نے اپنے نام سے جگہ خرید کر بنوائی تھی۔ ابھی تک وہ اس جگہ اس کے نام سے رجسٹرڈ ہے اور اب مسجد نہایت خستہ ہونے کی وجہ سے منہدم کر کے دوبارہ تعمیر کر رہے ہیں لیکن جماعت کی رائے ہے اور مالکان بھی رضا مند ہیں کہ نیچے دکانیں بنا دی جائیں اور ان کے اوپر مسجد تعمیر کی جائے جب کہ یہ دکانیں مسجد کے مصارف میں ہی استعمال ہوں گی کیا یہ قرآن و حدیث کی رُو سے درست ہے یا نہیں؟

(جواب): جواباً عرض ہے۔مسجد کی نئی مشروع میں ترمیم کا کوئی حرج نہیں۔ نیچے دکانیں برائے مصارف مسجد اور بالائی منزل میں مسجد منتقل کی جا سکتی ہے۔«کَشفُ الصّناع عن متن الاقناع» میں ہے کہ امام احمد رحمہ اللہ نے تبدیل وقف پر اس بات سے استدلال کیا ہے، کہ عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے جامع مسجد کھجوروں کے تاجروں سے بدل دی۔یعنی بدل کر کوفہ میں دوسری جگہ لے گئے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ راستہ تنگ ہو گیا تو انھوں نے مسجد کا کچھ حصہ راستہ میں ڈال دیا۔ ملاحظہ ہو! فتاویٰ امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ۔

اسی طرح رسول اللہ ﷺ نے بھی بیت اللہ کے خزانہ کو فی سبیل اللہ تقسیم کرنے کا ارادہ فرمایا تھا۔ پھر بعض وجوہات کی بناء پر اس میں تصرف کو ترک کر دیا گیا بحوالہ «مُنتَقَی الاخبَار بَابُ مَا یَضَعُ بِفَاضِلِ مَالِ الکَعبَۃَ » موجودہ صورت کا تصرف تو اس سے کم تر ہے۔لہٰذا یہ بطریقِ اولیٰ جائز ہے۔

مسجد کے تہہ خانہ پر مالِ زکوٰۃ کا استعمال:

(سوال): مسجد کے نیچے تہہ خانہ بنا کر طلبا کو قرآن و حدیث کی تعلیم دی جائے اور وہ مسجد کا حصہ نہ ہو تو کیا اس کی تعمیر پر زکوٰۃ کی رقم لگائی جاسکتی ہے؟

(جواب): اگر مسجد کے نچلے حصہ کو مکمل طور پر راستہ جدا کر کے مسجد کے حکم سے علیحدہ کر دیا جائے تو ایسی صورت میں اس پر مالِ زکوٰۃ صرف ہوسکتا ہے۔

مسجد کے پرانے صحن میں بیت الخلاء کا گٹر بنانے کا حکم:

(سوال): ہمارے گاؤں کی جامع مسجد اہلِ حدیث کا بڑا ہال شہید کیے بغیر اس کے شمال میں مزید جگہ حاصل کر کے بڑی اور نئی مسجد تعمیر کی گئی جب کہ پرانی مسجد کا ہال بھی باقی ہے جو مسجد کے تعلیمی تبلیغی مقاصد وغیرہ کے لیے بدستور استعمال ہو رہا ہے اس پرانے ہال کے مشرق میں پرانا صحن ہے جس میں بھی سردیوں کے دنوں اور گرمیوں کی راتوں میں نماز ادا ہوتی رہتی ہے۔اس صحن کے جنوب میں امام مسجد کا مکان ہے۔کیا اس مکان میں بیت الخلا بناء کر اس کا گٹر پرانے صحن مسجد میں بنایا جا سکتا ہے؟ یعنی صحن کے ساتھ امام مسجد کے مکان کی دیوار ہے اور دیوار سے مکان کی جانب بیت الخلا اور دیوار کے دوسری جانب مسجد کے پرانے صحن میں اسی بیت الخلا کا گٹر ہو۔واضح رہے کہ اس مسئلہ پر ارکان جماعت میں سخت نزاع پایا جاتا ہے۔واضح اور شافی جواب مرحمت فرمائیں۔ جزاکم اللہ خیراً۔

نوٹ: گٹر بنانے کی کئی متبادل جگہیں موجود ہیں جہاں بآسانی یہ ضرورت پوری کی جاسکتی ہے۔

(جواب): مشارٌ الیہ جگہ میں گیٹر بنایا جا سکتا ہے۔صحیح بخاری کے ترجمۃ الباب میں حضرت حسن بصری رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ برف اور پلوں کے اوپر نماز پڑھنے میں کوئی حرج نہیں۔ اگر چہ نیچے یا اوپر یا سامنے پیشاب بہتا ہو،لیکن شرط یہ ہے کہ درمیان میں کوئی چیز حائل ہو۔اس کے علاوہ کسی دوسری مناسب جگہ بھی بنایا جا سکتا ہے۔شرعاً کوئی پابندی نہیں۔

چندے کے ڈبوں میں صدقہ فطر کی رقم کی تقسیم؟

(سوال) :اسلامی مراکز صدقہ فطر کی اس رقم کا کیا کریں جو مسلمان،نمازِعید سے پہلے چندے کے ڈبوں میں ڈال دیتے ہیں؟

(جواب) :اس رقم کو شرعی مصارف میں ہی خرچ کرنا چاہئے۔صدقات کی تقسیم کے عام معروف اُصول وضوابط کے مطابق وہ رقم غریبوں اور مسکینوں کی ملکیت میں دی جائے،اوران کی تقسیم عید کے دن سے موخر نہیں کرنی چاہئے،البتہ اس قدر تاخیر ہوسکتی ہے جس میں مستحقین تک رقم پہنچانے کا بندوبست کیا جا سکے۔

مسجد کی محراب میں بیل بوٹے؟

(سوال) ہماری مسجد کے محراب میں اللہ کے کسی بندے نے نیک نیتی کی بنا پر ٹائلیں لگاتے ہوئے خوبصورت گلدستہ ہائے پھول لگا دیے ہیں۔اب ان کی طرف توجہ کرنے سے نمازیوں کے خشوع میں خلل آتا ہے۔صحیح بخاری میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا والی حدیث دیکھی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ پردہ جس پر مورتیاں بنی ہوئی تھیں، ہٹا دینے کا حکم فرمایا اور حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ والی حدیث بھی زیر مطالعہ آئی جو انھوں نے اس طرح روایت کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک زمانہ میں مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کچی اینٹوں کی بنی ہوئی تھی اور چھت پر کھجور کی ڈالیاں تھیں، جب کہ ستون کھجور کی لکڑی کے تھے۔ پھر ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اپنی خلافت میں کچھ نہیں بڑھایا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مسجد کو بڑھایا لیکن عمارت ویسی ہی رکھی، جیسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں تھی یعنی کچی اینٹ اور ڈالیوں کی چھت اور ستون کھجور کی لکڑی کے، پر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اس کو بدل ڈالا اور بہت بڑھایا، اس کی دیواریں نقشی پتھر اور گچ سے بنوائیں اور اس کے ستون نقشی پتھروں کے اور اس کی چھت ساگوان سے بنائی۔

ان احادیث کے مطالعہ کے باوجود ہم فیصلہ نہیں کر پائے۔ اب آپ سے دریافت ہے کہ آیا ان گلدستوں کو محرابِ مسجد سے نکال دینا چاہیے یا شریعت اسلامیہ میں اس کی گنجائش ہے؟۔

نوٹ: گلدستوں کو ہٹانے کی صورت میں انتشار کا بھی اندیشہ ہے۔(حافظ محمد یحییٰ، لاہور کینٹ)

جواب موجودہ صورت میں راجح مؤقف یہ ہے کہ نقش و نگار کو خرم کرکے سادہ پتھر لگائے جائیں یا اسی حالت میں پھولوں کے گلدستوں کو ہٹا دیا جائے اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا فعل محض ان کے اجتہاد پر مبنی ہے جب کہ مرفوع نص میں ہے کہ نبی ﷺ نے ایک دفعہ دھاری دار کمبل میں نماز پڑھی تو اس کے نقش و نگار پر نگاہ پڑگئی۔نماز سے فارغ ہوکر فرمایا: میرے اس کمبل کو ابوجہم کے پاس لے جاؤ(اس کے بدلے میں)اس سے سادہ موٹا کمبل لے آؤ کیونکہ اس نے مجھے میری نماز سے غافل کردیا ہے۔

شارح بخاری، حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: و يستنبط منه كراهية كل ما يشغل عن الصلاة من الاصباغ والنقوش و نحوها (فتح الباری:۱/۴۸۳)''اس حدیث سے یہ استنباط کیا گیا ہے کہ ہر وہ شے جو نماز سے توجہ پھیر دے، رنگ یا نقش و نگار وغیرہ تو اس کا استعمال ناجائز ہے۔'' پھر واضح ہو کہ اختلاف یا انتشار وہاں ہوتا ہے جہاں اپنی مرضی ہو۔شرعی نص کی موجودگی میں کسی مسلم کو اختلاف زیب نہیں دیتا۔واللہ ولی التوفیق۔

مسجد میں محراب کی شرعی حیثیت:

سوال: کیا مسجد کا محراب دورِ نبوی یا خلفائے راشدین سے ثابت ہے؟ کیا مسجد میں ضروری ہے کہ محراب بھی بنایا جائے؟

جواب: علامہ شمس الحق عظیم آبادی نے عون المعبود: ۱۰/۱۸۰، میں بعض روایات نقل کی ہیں۔جن سے مسجد میں محراب کے جواز کا استدلال کیا ہے اور ہمارے شیخ محدث روپڑی رحمہ اللہ بھی جواز کے قائل ہیں۔تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو! فتاویٰ نذیریہ(۱/ ۳۰۷ تا ۳۱۹)

نمازی کے سامنے ہیٹر ہو تو اس کی نماز کا کیا حکم ہے؟

سوال مسجد میں نمازی کے سامنے ہیٹر ہو تو اس کی نماز کا کیا حکم ہے؟ امام بخاری رحمہ اللہ کے باب:«من صلى و قدّامه تنور أو نار......الخ » کا کیا مفہوم ہے؟

جواب نمازی کے سامنے آگ وغیرہ ہونے کی صورت میں امام بخاری رحمہ اللہ نے عنوان بندی میں کراہت یا عدم کراہت کی تصریح نہیں کی۔احتمال ہے کہ ان کی مراد یہ ہو کہ جو آدمی قبلہ کی طرف اس کو ہٹانے پر قادر ہو، اس کو ہٹا دینا چاہیے جس طرح کہ بعض سلف نے کراہت کی تصریح کی ہے۔(فتح الباری:۱/۶۸۶)

اور عدم استطاعت کی صورت میں اس پر کوئی مؤاخذہ نہیں۔ یہ بات باب کے تحت ذکر کردہ احادیث کے مطابق ہے۔ لہٰذا مسجد کے ہیٹروں کو غربی جانب کے بجائے شمالی یا جنوبی جانب یا پیچھے نصب کرنا چاہیے۔

کٹوتی کی رقم سے تعمیر مسجد:

(سوال): رشید ولد نتھا کا انتقال ہو گیا، جو شخص رشید کے مال کی وراثت تقسیم کرنے پر قادر تھا اس نے دیگر ورثاء سے کہا کہ مرحوم کی مسجد بنانے کی خواہش تھی لہٰذ مرحوم کی خواہش کو پورا کرنے کے لیے اپنے اپنے حصے سے رقم دو۔ پھر وراثت ملے گی لہٰذا کچھ نے مجبور ہو کر بادلِ نخواستہ رقم اپنے اپنے حصے سے ادا کی اور حصہ لیا۔ کیا جبراً کاٹی ہوئی رقم تعمیر مسجد میں لگ سکتی ہے؟ کیا مرحوم کی خواہش کو پورا کرنا ضروری ہے؟

(جواب): صرف خواہش کی تکمیل ورثاء کے ذمہ ضروری نہیں، البتہ وصیت کا نفاذ ضروری ہے۔ لیکن اس کے لیے شرط ہے کہ تہائی ترکہ کی حدود میں ہو۔

خواتین کا گھر میں اذان سے پہلے نماز پڑھنا:

(سوال): ہمارا گھر مسجد کے قریب ہے۔ ہماری عورتیں مسجد کی بجائے گھر میں نماز پڑھتی ہیں کیا یہ اذان سے پہلے نماز پڑھ سکتی ہیں؟

(جواب): نماز کا وقت ہو چکا ہو تو عورت گھر میں اذان سے قبل بھی نماز پڑھ سکتی ہے کیونکہ اوّل وقت نماز ادا کرنے کی شریعت میں ترغیب وارد ہے۔ دوسرا اذان کے دعوتی کلمات (حي على الصلوٰة اور حي على الفلاح) کا زیادہ تر تعلق ان لوگوں سے ہے جن کو با جماعت نماز ادا کرنے کا مکلّف بنایا گیا ہے۔

گھر میں عورت اور مرد کا صف میں برابر کھڑا ہونا:

(سوال): گھر میں عورتیں اور مرد نماز پڑھیں تو کیا وہ برابر کھڑے ہو سکتے ہیں؟ بعض لوگ کہتے ہیں کہ مرد کے برابر کھڑے ہو کر عورت نماز نہ پڑھے۔

(جواب): گھر میں جماعت کی صورت میں عورتیں پیچھے کھڑی ہوں۔ چاہے وہ اکیلی کیوں نہ ہو اور عدمِ جماعت کی صورت میں برابر کھڑے ہونے کا کوئی حرج نہیں۔

تصویر والے اخبار کا مسجد میں لانا:

(سوال): آج کل بعض لوگ اخبارات کا (جن میں مرد و زن کی تصاویر ہوتی ہیں) مساجد میں مطالعہ کرتے

ہیں۔ جب انھیں کہا جائے کہ تصاویر ہیں اور مسجد میں تصویر منع ہے، تو وہ نوٹ وغیرہ کا حوالہ دیتے ہیں، کہ کرنسی نوٹوں پر بھی تو تصاویر ہوتی ہیں۔ کیا مساجد میں ان اخبارات کا مطالعہ گناہ کے زمرے میں آتا ہے؟ مطالعے کے شوقین یہ بھی دلیل دیتے ہیں کہ حدیث میں ساری زمین کو مسجد قرار دیا گیا ہے۔ اس لیے مسجد میں اخبارات پڑھنا ٹھیک ہے، کیا یہ دلیل صحیح ہے؟

(جواب): مسجد میں تصویروں والا اخبار پڑھنے سے احتراز کرنا چاہیے۔ نوٹوں پر تصاویر کا معاملہ مجبوری کے ضمن میں آتا ہے، جس میں مواخذہ نہیں۔ قاعدہ ہے کہ: اَلضُّرُورَاتُ تُبِیحُ المَحظُورَاتِ''

سن آٹھ ہجری میں فتح مکہ کے وقت کعبہ کو بتوں سے صاف کیا گیا، لیکن سن سات ہجری میں آپ ﷺ نے صحابہ رضی اللہ عنہم کی معیت میں عمرہ اس حالت میں کیا کہ وہ مورتیاں اس میں موجود تھیں۔ [1]

اس سے معلوم ہوا کہ جہاں مجبوری ہو اور بس کی بات نہ ہو وہاں یہ ممانعت نہیں۔ یہی معاملہ کرنسی نوٹوں کا ہے۔ پھر ساری زمین کا مسجد ہونا صرف نماز پڑھنے کے جواز کے اعتبار سے ہے۔ حکماً مسجد نہیں؛ کیونکہ بالفعل مسجدوں کے اور عام زمین کے احکام مختلف ہیں۔ مسجدوں کو زمین پر قیاس کرنا قیاس مع الفارق (یعنی اصولاً غلط) ہے، جس کی کوئی حیثیت نہیں۔

عید گاہ کے لیے جگہ روک رکھنا:

(سوال) آج کل اکثر شہروں میں اور دیہات میں رواج ہے کہ عیدین پڑھنے کے لیے گاؤں کے باہر، کہیں مناسب جگہ پر کچھ زمین حاصل کر کے اسے عید گاہ کے طور پر مخصوص کر لیا جاتا ہے اور اس کے اردگرد چار دیواری کر لی جاتی ہے۔ وہ سارا سال بیکار پڑی رہتی ہے۔ صرف سال میں دو مرتبہ اس میں عید پڑھی جاتی ہے، کیا ایسا کرنا جائز ہے؟ کیا کھلی جگہ پر عید پڑھنا لازمی ہے۔؟ (غلام حسین تھاڑیا، قصور)

(جواب) نمازِ عید کھلی جگہ جنگل میں یا ایسی جگہ جہاں چار دیواری نہ ہو، کھلے میدان میں پڑھنے کی سعی کرنی چاہیے۔ بصورتِ دیگر جیسے بھی ممکن ہو نمازِ عید پڑھی جا سکتی ہے۔ لیکن سال بھر مخصوص ایام کے لیے جگہ روکے رکھنا درست فعل نہیں۔

کیا غیر مسلموں کو مسجد میں آنے کی دعوت دی جاسکتی ہے؟

(سوال): کیا غیر مسلموں کو مسجد میں آنے کی دعوت دی جا سکتی ہے تا کہ وہ بعض اہم معاملات کے بارے میں

---

[1] ......حوالہ......

مسلمانوں سے خطاب کریں یا اس لئے کہ انہیں مسلمانوں کی ضروریات سے آگاہ کیا جائے؟ اگر خطاب کرنے والی کوئی خاتون ہو تب کیا حکم ہے؟

(جواب): غیر مسلموں کو مسلمانوں کے اجتماعات میں دعوت دینے کے بارے میں کچھ تفصیل ہے:

اگر اس میں مسلمانوں کا واضح فائدہ ہو، اس کے مقابلے میں کوئی اس سے بڑی خرابی نہ ہو تو اس میں کوئی حرج نہیں، تاہم خرابیوں کو حسبِ استطاعت کم کرنے کی کوشش کرنا ضروری ہے۔ بالخصوص جب لیکچر دینے والی کوئی خاتون ہو، تو فتنہ کے اسباب کم کرنے میں اجتہاد کرنا چاہئے۔ نشستوں کو اس انداز سے ترتیب دیا جائے کہ ممکن حد تک اختلاط کم سے کم ہو۔

اس کی مثال یہ ہے کہ بعض علاقوں میں متعصب غیر مسلموں کی طرف سے مسلمان افراد پر تشدد کے واقعات کے بعد بعض افسر اور ذمہ دار افراد تشدد کے ان واقعات پر احتجاج کرنے اور مجرموں کی مذمت کرنے کے لئے، یا مسلمانوں کے قانونی حقوق واضح کرنے کے لئے، اور زیادتی وغیرہ کے موقع پر دفاع کے طریقے بتانے کے لئے آتے ہیں یا کوئی ایسا دنیوی علم سکھانے کے لئے آتے ہیں جو مسلمانوں کے لئے فائدہ مند ہے، تو اس قسم کے معاملات میں تعاون کرنا چاہئے۔

اگر اس میں دعوت وتبلیغ کے نقطہ نظر سے فائدہ ہو، اور اس کے ساتھ کوئی اس سے بڑی خرابی نہ ہو، تو بھی اس میں حرج نہیں۔ جب کہ ایسے پروگرام منعقد کرانے والوں کی نیت شروع میں بھی نیک ہو اور بعد میں بھی ہمیشہ نیک رہے۔ جب کہ اس سلسلے کا اصل مقصد اللہ کی طرف بلانا، اور اسلام کو دوسرے مذاہب سے برتر ثابت کرنا ہو۔ اس کی مثال وہ مناظرے ہیں جو مسجدوں اور کلیساؤں میں ہوتے ہیں تا کہ حق واضح ہو، اور حجت قائم ہو۔ اس مقصد کے لئے راستہ ہموار کرنے کے لئے ہونے والی ملاقاتیں اور دوسری ملاقاتیں جن کا تعلق تبلیغ اور اس کے پروگراموں سے ہو، وہ سب اس میں شامل ہیں۔

ان فوائد کا اندازہ لگانا مسجد کے اہل حل وعقد کا کام ہے۔ باقی افراد کو ان کا ساتھ دینا چاہئے، اور انہیں بہتر مشوروں سے نوازنا چاہئے، کیونکہ ایسے معاملات میں اکثر غلط فہمیاں اور لغزشیں ہو جایا کرتی ہیں۔ ان سے وہی محفوظ رہ سکتا ہے، جسے اللہ محفوظ رکھے۔

اگر ان اجتماعات میں مذکورہ بالا فوائد نہ ہوں، بلکہ ان کا مقصد محض غیر مسلموں سے میل ملاپ بڑھانا، ان کا احترام کرنا، اور ان سے محبت کا اظہار کرنا ہو، جب کہ اس میں مسلمانوں کا کوئی واضح فائدہ نہ ہو، اور دعوت وتبلیغ کا بھی کوئی واضح فائدہ نہ ہو، تو یہ بنیادی طور پر ممنوع ہیں۔ اس کی دلیل ان نصوص کا عموم ہے جو

مومنوں سے محبت رکھنے کا حکم دیتی ہیں اور کافروں سے دلی دوستی کرنے ، اور مومنوں کو چھوڑ کر کافروں کو ہم راز بنانے سے منع کرتی ہیں اور اس لئے بھی کہ مسجدوں کا احترام برقرار رکھنا واجب ہے۔ واللہ اعلم

غیر مسلم خواتین کی نامناسب لباس میں مسجد میں آمد؟

(سوال): اگر ہم غیر مسلموں کو مسجد میں آنے کی دعوت دیں تو ان عورتوں کے ساتھ کیا معاملہ کریں جو نامناسب لباس پہن کر مسجد میں آجائیں گی، اسی طرح مردوں اور عورتوں کے اختلاط کا مسئلہ بھی پیش آئے گا؟

(جواب): اسلام کی دعوت دینا فرض ہے، جس کو ترک کرنا کسی طرح جائز نہیں، اور دعوت کا طریقہ ہے: دوسروں سے رابطہ قائم کرنا، ان کو اپنی بات سنانا، اور ان کی بات سننا، اور ان سے براہِ راست میل جول رکھنا اور غیر مسلم جب تک اپنے غلط مذہب پر قائم ہے، اسے اسلامی شریعت کے مطابق پردہ کرنے کا اور اپنی عزت کا خیال رکھنے کا حکم نہیں دیا جاسکتا۔ لہٰذا یہی کہا جاسکتا ہے کہ یہ ایک عارضی خرابی ہے، اس پر صبر کریں اور اسے کم کرنے کی کوشش کریں، خرابی کم کرنے کے چند طریقے مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ ان کو نرمی سے سمجھایا جائے کہ مسجد میں آنے کے آداب کا خیال رکھنا ضروری ہے اور ان آداب میں باپردہ اور باوقار لباس پہننا، اور تہذیب سے گری ہوئی بات چیت نہ کرنا بھی شامل ہے۔

۲۔ اس دعوت کے لئے ایسا وقت مقرر کیا جائے کہ وہ افراد شامل نہ ہوں، جن کے اختلاط اور بے پردگی سے متاثر ہونے کا خطرہ ہو۔

۳۔ مسجد میں ٹھہرنے کا وقت مختصر رکھا جائے۔ مثلاً وہ مسجد کی سرسری زیارت کریں، پھر سب کو اس مقصد کے لئے مختص ہال میں ہی چلنے کی دعوت دی جائے، جو نمازیوں سے الگ ہو، تاکہ ایک طرف تو مسجد کا احترام قائم کرے، دوسری طرف فتنہ کے ذرائع محدود ہو جائیں۔

۴۔ جگہ کو اچھے انداز سے ترتیب دیا جائے، تاکہ جو ڈسپلن قائم رکھنا ممکن ہے وہ جہاں تک ہمارے اختیار میں ہے، زیادہ سے زیادہ قائم رکھا جاسکے۔

مسجد میں موسیقی والی اسلامی فلمیں دکھانا؟

(سوال): ہماری مسجد کی ایک سرگرمی یہ بھی ہے کہ یہاں ہر جمعہ کی شام مسلمانوں کو کوئی ویڈیو فلم دکھائی جاتی ہے۔ ان میں سے فلمیں بہت مفید ہوتی ہیں لیکن ان میں بیک گراونڈ میں تصویریں، موسیقی یا بے پردہ عورتوں کی تصویریں موجود ہوتی ہیں، کیا ایسی فلمیں اس ہال میں دکھائی جاسکتی ہیں جس میں نماز ادا کی جاتی ہے؟ اگر

دوسرے کمرے میں دکھائی جائیں، جہاں نماز نہیں پڑھی جاتی، تو کیا حکم بدل جائے گا؟

(جواب): اُصول یہ ہے کہ مسجدوں کو حرام اور مشتبہ کاموں سے محفوظ رکھنا چاہئے۔ انہیں اللہ کی عبادت اور اطاعت کے کاموں کے لئے مخصوص رہنا چاہئے۔ اس بات کا ان مساجد میں زیادہ خیال رکھنا چاہئے، جہاں سے لوگ دین سیکھتے ہیں، اور جن میں ہونے والی کاموں کی اقتدا کرتے ہیں۔

فلموں کے معاملے میں دو پہلو قابل غور ہیں:

ایک پہلو یہ ہے کہ ان میں جو تصویریں ہوتی ہیں، یا ان کے لئے جو تصویریں کھینچنا پڑتی ہیں، یہ ٹیلیویژن کے معاملے میں محل نظر ہیں۔ ہمارے دین میں یہ بذاتِ خود حرام نہیں کیونکہ یہ ان صورتوں سے قریب ہیں جو آئینے میں نظر آتی ہیں یا پانی میں دیکھنے سے نظر آتی ہیں۔

دوسرا پہلو یہ ہے کہ ان میں بعض خلافِ شریعت چیزیں پائی جاتی ہیں، جیسے سوال میں اشارہ کرتے ہوئے بے پردہ عورتوں کا ذکر کیا گیا ہے، یا ان فلموں کے ساتھ بعض اوقات تصویری موسیقی پائی جاتی ہے تو یہ واضح طور پر غلط کام ہے۔ پہلی چیز (بے پردہ عورتوں کی تصویروں کی حرمت) کے بارے میں تو اجماع ہے۔ دوسری چیز (تصویری موسیقی) کے بارے میں کم از کم جو بات کہی جا سکتی ہے وہ یہ ہے کہ یہ مشتبہ ہے۔ یعنی ہمارے سامنے ایسی چیز آگئی ہے جس میں فائدہ اور خرابی دونوں موجود ہیں۔

اگر اس کا فائدہ واضح اور غالب ہو تو ان فوائد کے حصول کے لئے ان کی اجازت دی جا سکتی ہے اور اس کی خرابیوں کو ختم یا کم کرنے کے لئے مسلمان حسبِ طاقت اللہ کا تقویٰ پیش نظر رکھے۔ مثلاً جب بے پردہ عورتوں کی تصویریں آئیں تو نظر جھکا لے اور جب موسیقی آئے تو اسے توجہ سے نہ سنے۔ البتہ احتیاط اسی میں ہے کہ جس شخص کے لئے ممکن ہو وہ ان سب چیزوں سے بچ کر رہے۔ جب کوئی ایسی فلم دکھانے کی ضرورت پڑے تو چاہئے کہ وہ حتیٰ الامکان مسجد اور اس سے تعلق رکھنے والی عمارت سے الگ جگہ میں دکھائی جائیں تاکہ اللہ کے گھر نامناسب اُمور سے محفوظ رہیں اور ان کا وقار قائم رہے۔ واللہ اعلم

مواضع الصلوٰۃ

مسجد کی موجودگی میں گھر یا دفتر میں مرد کا باجماعت فرض نماز ادا کرنا:

(سوال): کیا مسجد کی موجودگی میں گھر یا دفتر میں مرد کا باجماعت فرض ادا کرنا درست ہے؟

(جواب) اصلاً کوشش ہونی چاہئے کہ نمازِ باجماعت مسجد میں ادا ہو، بہ اَمر مجبوری باجماعت دفتر میں پڑھ لی

جائے تو اس کا بھی جواز ہے، نیز اضطراری حالت میں اکیلا بھی پڑھ سکتا ہے اور بلا عذر گھر میں نماز نہیں پڑھنی چاہیے۔

گھر اور دفتر میں نماز:

سوال : ہم چند احباب اپنے دفتر میں (جو کہ صرف دینی کام کے لیے مختص ہے) اذان دے کر باجماعت نماز ادا کر سکتے ہیں یا نہیں؟ جب کہ وہاں (دفتر) سے مسجد ۵ یا ۷ منٹ پیدل فاصلے پر ہے اور اذان بھی سنائی دیتی ہے۔ اسی طرح کیا میں اذان سننے کے بعد مع اپنے اہل و عیال کے گھر میں بغیر کسی شرعی عذر کے باجماعت نماز ادا کر سکتا ہوں یا نہیں؟ ایسی صورتِ حال میں ادا کی گئی نمازوں کا کیا حکم ہے؟ جب کہ یہ بھی معلوم ہے کہ اذان سننے کے بعد مسجد میں جا کر باجماعت نماز ادا کرنا فرض ہے۔

مجھے امید ہے کہ آپ ہر صورت اپنی دعوت و منہج کا پاس رکھتے ہوئے اپنے رسالہ ''الاعتصام'' میں ان سوالات کا جواب ضرور عنایت فرمائیں گے۔ میں آپ کا شکر گزار ہوں گا۔

جواب : مسجد سے اذان سُن کر نماز دفتر اور گھر میں نہیں پڑھنی چاہیے۔ اگرچہ ادائیگی باجماعت ہو۔ فرض نماز کو مسجدوں میں باجماعت ادا کرنا چاہیے۔ بشرطیکہ وہ مسجد اہلِ شرک کی نہ ہو۔

سوال : ہمارے چند عزیز ہیں جن کا عمل یہ ہے کہ وہ اپنی دکان پر ظہر عصر اور مغرب کی نماز جماعت سے پڑھتے ہیں جب کہ ان کی دکان سے مسجد کا فاصلہ اتنا ہے کہ اگر پیدل چلا جائے تو زیادہ سے زیادہ دس منٹ میں پہنچا جا سکتا ہے اور اگر موٹر سائیکل پر جائیں تو زیادہ سے زیادہ تین منٹ لگیں گے اور ان کے پاس موٹر سائیکلیں بھی موجود ہیں کیا ان کا یہ عمل قرآن و حدیث کے مطابق ہے یا اس کے خلاف ہے؟ کیا نبی پاک ﷺ کے دور میں صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اتنی قریب مسجد میں ہونے کے باوجود مسجد کی نماز ترک کر کے دکانوں پر نماز ادا کرتے تھے؟ شکریہ

جواب : نماز باجماعت مسجد میں جا کر ادا کرنی چاہیے۔ ایک نابینے آدمی کو عذر کے باوجود آپ نے مسجد کی جماعت سے پیچھے رہنے کی اجازت نہیں دی۔ حالانکہ اس کی آسانی اور سہولت کے پیشِ نظر کہا جا سکتا تھا، کہ گھر ہی میں جماعت کرا لیا کرو۔ لہٰذا ان لوگوں کو چاہیے کہ سستی اور کاہلی چھوڑ کر ہر نماز باجماعت مسجد میں پڑھا کریں۔

چارپائی پر نماز ادا کرنا:

سوال : جگہ ناپاک کی مجبوری کے باعث چارپائی پر کپڑا بچھا کر نماز ادا کی جا سکتی ہے یا نہیں؟

(جواب): شریعت میں کشتی میں نماز پڑھنے کا جواز ہے۔ المنتقیٰ، بابُ الصَّلٰوۃ فِی السَّفِینَۃ.
اور صحیح بخاری کی تبویب میں چھتوں، منبر اور لکڑی وغیرہ پر نماز پڑھنے کا بیان ہے اور استدلال بعض آثار کے علاوہ اس حدیث سے کیا ہے کہ ایک دفعہ نبی اکرم ﷺ نے منبر پر چڑھ کر نماز پڑھائی تھی۔
ان دلائل سے معلوم ہوا کہ چارپائی پر بھی نماز پڑھی جاسکتی ہے۔

تصویر والی جگہ نماز پڑھنا:

(سوال): جس کمرے میں نمازی کے آگے یا پیچھے یا دائیں یا بائیں کوئی تصویر لٹکی ہوئی ہو، کیا وہاں نماز پڑھنا درست ہے؟

(جواب): ایسی صورت میں نماز تو ہو جائے گی لیکن کراہت سے خالی نہیں۔ حدیث میں ہے:
« اَمِیطِی عَنِّی قِرَامَكِ هٰذَا، فَاِنَّه لَا تَزَالُ تَصَاوِیره تَعرِضُ فِی صَلَاتِی.» [1]
''اے عائشہ! اپنے اس باریک کپڑے کو مجھ سے ہٹادو۔ کیونکہ اس کی تصویریں میری نماز میں ظاہر ہوتیں ہیں۔''
حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:
« دَلَّ الحَدِیثُ أَنَّ الصَّلَاۃَ لَا تَفسُدُ بِذٰلِكَ، لِاَنَّهٗ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ لَم یَقطَعهَا، وَلَم یُعِدهَا » [2]

غصب شدہ زمین پر نماز جائز ہے یا نہیں؟

(سوال): کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلے میں کہ غصب شدہ زمین پر نماز جائز ہے یا نہیں؟ قرآن و حدیث کی روشنی میں جواب دے کر عنداللہ ماجور ہوں۔

(جواب): اس مسئلے میں اہلِ علم کا اختلاف ہے۔ علمائے حنابلہ کے ہاں دو روایتیں ہیں: عدمِ جواز اور جواز۔ اسی طرح امام ابوحنیفہ، مالک اور شافعی بھی ایک قول کے مطابق جواز کے قائل ہیں۔ صاحب " المهذب" فرماتے ہیں: کہ غصب شدہ زمین میں نماز ناجائز ہے۔ کیونکہ یہاں نماز کے علاوہ عام قیام اور سکونت چونکہ حرام ہے، اس لیے اس مقام پر نماز میں قیام بطریقِ اولیٰ ناجائز ہوگا البتہ اگر کوئی شخص یہاں نماز پڑھ لے تو نماز ہو جائے گی۔ کیونکہ ممانعت کا تعلق صرف نماز سے مخصوص نہیں جو اس کی صحت سے مانع ہو۔

---

[1] صحیح البخاری، بَابُ كَرَاهِیَةِ الصَّلَاۃِ فِی التَّصَاوِیرِ، رقم: ٥٩٥٩
[2] فتح الباری: ١/ ٤٨٤

امام نووی رقمطراز ہیں: کہ ایسی زمین میں نماز بالاجماع حرام ہے اور ہمارے نزدیک اور جمہور فقہاء اور اصحابِ اصول کے ہاں، اگر نماز پڑھ لی جائے، تو درست ہو جائے گی۔

میرا رجحان بھی اسی قول کی طرف ہے، کیونکہ نہی کا تعلق نفس نماز سے نہیں، جو صحت نماز سے مانع ہو۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو! اَلْمَجْمُوع شَرحُ الْمُهَذَّب:۱۶۵/۳، المغنی:۴۷۶/۲۔۴۷۷)

فقہاء کے اس قول سے غالباً یہ مراد ہے، کہ غصب شدہ زمین کا علم ہونے پر، اس میں نماز نہیں پڑھنی چاہیے۔ کیونکہ غصب ایک فعلِ حرام ہے، اور حرام ذرائع سے حاصل شدہ زمین میں نماز نہیں پڑھنی چاہیے۔ ہاں اگر کوئی اتفاقاً اس میں نماز پڑھ لیتا ہے، تو نماز ہو جائے گی، دہرانے کی ضرورت نہیں، کیوں کہ ایسی زمین میں نماز سے بالخصوص ممانعت کسی نص میں وارد نہیں۔

بے پردگی کے مقام پر عورت کا نماز پڑھنا:

(سوال): اسلام میں عورت کے لیے اجنبی مردوں سے پردہ لازمی قرار دیا گیا ہے، اس ضمن میں عرض ہے کہ اُن مقامات پر جہاں خواتین کے لیے پردے کا بندوبست نہ ہو، مثلاً: دورانِ سفر (سڑک) یا پارک وغیرہ اور بالخصوص گورنمنٹ کے ہسپتال میں جہاں عام وارڈز اور لان وغیرہ میں خواتین کے لیے نماز ادا کرنے کے لیے پردے والی جگہ نہ ہو۔ تو کیا بوقتِ نماز عورت کھلے میدان یا ہسپتال کے اس حصے میں نماز ادا کر سکتی ہے جہاں مرد حضرات کا زیادہ گزر ہو؟ اگر عورت بے پردگی کی وجہ سے نمازِ قضاء کر لے اور بعد میں کسی پردے والی جگہ میں نماز ادا کرے تو کیا یہ درست ہو گا؟

(جواب): پردے کے ساتھ عورت جہاں بھی نماز ادا کرے بامرِ مجبوری ہو جائے گی۔ (ان شاء اللہ)

حتی المقدور کوشش کرنی چاہیے کہ نمازِ قضاء کی بجائے ادا ہی ہو: ﴿لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا﴾ (البقرۃ: ۲۸۶)

عورت مردوں کی گزرگاہ میں نماز ادا کرے یا قضا کرے؟

(سوال) اسلام میں عورت کے لئے پردہ لازمی قرار دیا گیا ہے۔ ان مقامات پر جہاں خواتین کے لئے پردہ کا بندوبست نہ ہو یا جہاں سے مرد حضرات کا زیادہ گزر ہو تو کیا وہاں عورتوں کی نماز ہو جائے گی؟ اور اگر عورت بے پردگی کی وجہ سے نماز قضا کر لے اور بعد میں کسی پردہ والی جگہ نماز ادا کر لے تو اس بارے میں شرعی طور پر کیا حکم ہو گا؟

(جواب) عورت باپردہ جہاں بھی نماز ادا کرے، بامر مجبوری ہو جائے گی۔ حتی المقدور کوشش کرنی چاہئے کہ نماز قضا کی بجائے اپنے وقت میں ادا ہو۔ لا یکلف اللہ نفسا إلا وسعھا

کیا گاڑی یا کشتی پر فرض نماز ادا کرنا جائز ہے؟

(سوال): کیا گاڑی یا کشتی پر فرض نماز ادا کرنا جائز ہے؟

(جواب): اصل یہ ہے کہ فرض نماز زمین پر ادا کی جائے۔ ہاں البتہ اضطراری حالت میں جواز ہے۔ تاہم کشتی میں نماز کے جواز کی تصریح موجود ہے۔

ملاحظہ ہو! منتقی الاخبار، باب الصلاۃ فی السفینۃ. (نیل الأوطار: ۳/ ۲۱۱)

سواری پر سوار ہو کر نماز پڑھنا:

(سوال): کیا سواری پر سوار ہو کر نماز ہو جاتی ہے؟ حدیث کی روشنی میں جواب درکار ہے۔

(جواب): نفلی نماز سواری پر ہو جاتی ہے، لیکن فرضی اُتر کر پڑھنی چاہیے۔ حدیث میں ہے:

« كَانَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ يُسَبِّحُ عَلَى الرَّاحِلَةِ قِبَلَ اَيِّ وَجهٍ تَوَجَّهَ، وَ يُوتِرُ عَلَيهَا، غَيرَ اَنَّهٗ لَا يُصَلِّي عَلَيهَا المَكتُوبَةَ » ①

یعنی ''رسول اللہ ﷺ نفلی نماز اور وتر جونسی طرف سواری چلتی رہتی، اُس کے اُوپر پڑھتے۔ البتہ فرض نماز سواری سے نیچے اُتر کر پڑھتے تھے۔'' (بخاری مع فتح الباری: ۲/ ۵۷۵)

یاد رہے کسی معقول عذر کی بناء پر سواری پر فرض نماز جائز ہے۔ ایک دفعہ رسول اللہ ﷺ اپنے رفقاء سمیت تنگ جگہ پر اُترے۔ اوپر بارش تھی اور نیچے زمین تر تھی۔ تو آپ ﷺ نے سواری پر نماز پڑھائی تھی۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو! ''منتقی'' (بَابُ صَلٰوةِ الفَرضِ عَلَى الرَّاحِلَةِ لِعُذرٍ) مَعَ نیل الأوطار، جز:۲،ص:۱۴۷تا۱۵۰)

جہاں تک تعلق ہے مستحدث (موجودہ جدید) سواری کا مثلاً: ہوائی جہاز اور ریل گاڑی وغیرہ میں نماز پڑھنا، سو اس کے بارے میں عرض ہے، کہ بعض احادیث و آثار سے معلوم ہوتا ہے، کہ کشتی میں نماز پڑھنی جائز ہے۔ ②

اس سے مذکورہ سواریوں پر بھی نماز پڑھنے کا جواز اخذ کیا جا سکتا ہے۔ قیام پر قادر کے لیے تو بلا تردّد

① صحیح البخاری: بَابُ یَنزِلُ لِلمَکتُوبَةِ، رقم: ۱۰۹۸

② المنتقی، باب الصلاۃ فی السفینۃ

جائز ہے اور اگر کوئی قیام پر قادر نہ ہو تو بیٹھ کر پڑھ سکتا ہے، لیکن اس حالت میں اگر نیچے اتر کر موقع میسر آجائے، تو نیچے پڑھنی چاہیے۔ مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو! "نیل الأوطار" جز:۳، ص:(۲۱۱-۲۱۲)

کیا ریل گاڑی میں نماز ادا کی جا سکتی ہے؟

سوال: ریل گاڑی میں عموماً لوگ نماز پڑھتے ہیں۔ اس میں بھی اختلاف ہے اس کی بھی وضاحت فرمائیں!

جواب: بعض روایات میں کشتی میں نماز پڑھنے کا جواز ہے۔ ملاحظہ ہو! المنتقی: باب الصلوٰۃ فی السفینۃ۔ تو اس سے ریل میں نماز پڑھنے کے جواز کی بھی دلیل لی جا سکتی ہے جیسے بھی ممکن ہو کھڑے ہو کر یا بیٹھ کر۔ قرآن میں ہے: ﴿ لَا یُکَلِّفُ اللّٰهُ نَفسًا اِلَّا وُسعَهَا ﴾(البقرۃ:۲۸۶) ''اللہ کسی شخص کو اس کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا۔''

ہاں البتہ اگر آسانی سے زمین پر نماز پڑھنے کا موقع میسر آجائے تو پھر نیچے ہی پڑھنی چاہیے۔

اندھیرے میں نماز پڑھنا صحیح ہے یا نہیں؟

سوال: اندھیرے میں نماز پڑھنا صحیح ہے یا نہیں؟ حالانکہ اندھیرے میں نماز پڑھنے میں سکون ملتا ہے۔

جواب: اندھیرے میں نماز پڑھنے کا جواز ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا بیان ہے، کہ رسول اللہ ﷺ روشنی کے بغیر رات کو نماز پڑھتے تھے۔ « وَالبُیُوتُ یَومَئِذٍ لَیسَ فِیهَا مَصَابِیحُ.» [1]

قبر والی مساجد میں نماز پڑھنا

قبرستان میں تعمیر کیے گئے مدرسہ میں نماز پڑھنے کا کیا حکم ہے؟

سوال: ہمارے علاقے میں ایک مدرسہ قبرستان میں بنایا گیا ہے، اس کے اردگرد کچھ قبریں ہیں۔ سوال یہ ہے کہ کیا اس مدرسے میں نماز ادا کی جا سکتی ہے؟

جواب: متعدد احادیث میں قبرستان میں نماز پڑھنے کی ممانعت وارد ہے۔ اس لیے وہاں موجود مسجد میں نماز پڑھنی منع ہے۔ بلکہ اس کا بانی شریعت کی نگاہ میں ملعون ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

« لَعَنَ اللّٰهُ الیَهُودَ وَالنَّصَارٰی اِتَّخَذُوا قُبُورَ أَنبِیَاءِ هِم مَسَاجِدَ » [2]

---

[1] صحیح البخاری بَابُ التَّطَوُّعِ خَلفَ المَرأَةِ، رقم:۵۱۳، بَابُ الصَّلَاةِ عَلَی الفِرَاشِ و رقم:۳۸۲

[2] صحیح البخاری، بَابُ مَا یُکرَهُ مِنَ اتِّخَاذِ المَسَاجِدِ عَلَی القُبُورِ، رقم:۱۳۳۰

قبرستان میں تعمیر شدہ ایک مدرسہ میں نماز ہو جاتی ہے؟

سوال: قبرستان میں ایک مدرسہ تعمیر کیا گیا ہے کیا اس مدرسہ میں نماز ہو جاتی ہے؟

جواب: حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قبرستان میں نماز پڑھنے سے منع فرمایا ہے۔[1] ایک روایت میں ہے کہ جنائز پر نماز پڑھنے سے منع فرمایا۔

اسی طرح حضرت انس رضی اللہ عنہ ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«اَلْأَرضُ كُلُّهَا مَسجِدٌ إِلَّا الْمَقبَرَةَ وَ الْحَمَّامِ»[2]

''قبرستان اور حمام کے علاوہ تمام زمین مسجد ہے۔''

اسی طرح عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«اِجعَلُوا فِي بُيُوتِكُم مِن صَلَاتِكُم وَ لَا تَتَّخِذُوهَا قُبُورًا»[3]

اس حدیث سے بھی استلزاماً (ضمناً) ثابت ہوتا ہے کہ قبرستان میں نماز مکروہ ہے۔ چنانچہ امام بخاری رحمہ اللہ نے اس حدیث پر ''كراهية الصلوٰة فى المقابر'' کا باب قائم کیا ہے اور اکثر اہلِ علم نے اس حدیث سے استدلال کیا ہے، کہ قبرستان محلِ صلوٰۃ نہیں ہے، جیسا کہ بغوی نے شرح السنۃ میں، اور خطابی نے معالم السنن میں تصریح کی ہے۔[4] ان دلائل کی رُو سے قبرستان کے اندر تعمیر شدہ مدرسہ میں نماز پڑھنی ناجائز ہے۔

قبرستان کی جگہ مسجد تعمیر کرنے کا کیا حکم ہے؟

سوال کیا اس مسجد میں نماز پڑھنا اور اِمامت کرانا جائز ہے جس کی قبلہ والی دیوار قبرستان سے ملتی ہے۔ اسی طرح جنوب مشرق کی طرف مسجد سے ملحقہ ایک دربار ہے جس میں شرک کیا جاتا ہے۔ اکثر حاضرین مسجد کا عقیدہ شرکیہ ہے نیز مسجد کی قبلہ دیوار میں دو کھڑکیاں ہیں جن کو بوقتِ ضرورت کھولا جاتا ہے تو سامنے قبریں نظر آتی ہیں۔ (ناظم دفتر جامعہ اشاعت الاسلام، عارف والا)

جواب ①۔ صحیح مسلم میں حدیث ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: قبروں کی طرف نماز نہ پڑھو نہ ان پر

---

① مسند البزار''، رقم:٦٤٨٧

② سنن ابن ماجه، بَابُ الْمَوَاضِعِ الَّتِي يكره فِيهَا الصَّلَاةُ، رقم:٧٤٥، سنن ابى داؤد، باب فى المواضع التى لا تجوز فيها الصلاة، رقم:٤٩٢

③ صحيح البخارى، بَابُ كَرَاهِيَةِ الصَّلَاةِ فِي المَقَابِرِ، رقم:٤٣٢ و صحيح مسلم، رقم:٧٧٧

④ احكام الجنائز، ص:٢٣٦

بیٹھو۔[1]

②۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تمام زمین مسجد ہے سوائے قبرستان اور حمام کے۔[2]

③۔ آپ نے فرمایا: کچھ نماز گھروں میں پڑھو اور ان کو قبریں نہ بناؤ۔[3]

④۔ رسول اللہ ﷺ نے آخری بیماری میں فرمایا: ''اللہ یہود و نصاریٰ پر لعنت کرے انہوں نے اپنے انبیا کی قبروں کو مسجدیں بنالیا۔''[4]

⑤۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''اپنے گھروں کو قبریں نہ بناؤ۔ بے شک شیطان اس گھر سے بھاگ جاتا ہے جس میں سورۂ بقرہ پڑھی جائے''۔[5]

پہلی حدیث میں قبروں کی طرف نماز پڑھنے سے منع فرمایا گیا ہے۔سوال میں جس مسجد کا ذکر ہے اس کے سامنے چونکہ کھڑکیاں کھلتی ہیں، اس لئے اس میں نماز پڑھنا قطعاً حرام ہے کیونکہ قبروں کا منظر سامنے ہوتا ہے۔ اگر کھڑکیاں بند ہوں تو بھی ٹھیک نہیں کیونکہ کھڑکیاں قبروں کی خاطر رکھی گئی ہیں۔اور اس سے شبہ پڑتا ہے کہ مسجد قبرستان کا حصہ ہے لہٰذا ایسی مسجد میں نماز درست نہیں۔ چوتھی حدیث میں قبروں کو مسجد میں بنانے پر لعنت کی گئی ہے۔اور دوسری حدیث میں قبرستان میں نماز سے منع فرمایا ہے۔

پھر اس کے اطراف میں قبروں کا ہونا یہ بھی اس بات کی تائید ہے کہ یہ مسجد قبرستان کا حصہ ہے۔ اگر بالفرض مسجد پہلے ہو اور قبریں پیچھے بنی ہوں تو بھی کچھ خلل آ گیا۔ کیونکہ تیسری اور پانچویں حدیث میں گھروں کو قبریں بنانے سے روکا گیا ہے اور گھر میں قبر کی یہی صورت ہوتی ہے کہ گھر کی حدود اور صحن وغیرہ میں قبر بنا دی جائے، مسجد کے آس پاس قبریں اس قسم سے معلوم ہوتی ہیں۔مزید برآں صورتِ نقشہ سے بھی کراہت کی شکل واضح ہے، اس لئے ایسی مسجد میں نماز پڑھنے اور پڑھانے سے احتراز ضروری ہے۔

الکوکب النوری (۱/۱۵۳) میں ہے کہ قبروں پر بنائی گئی مسجد میں نماز پڑھنا مکروہ ہے، چاہے قبر سامنے ہو یا پیچھے یا دو جانب سے کسی ایک جانب میں۔ البتہ اگر قبر سامنے ہو تو شدید ترین کراہت ہے۔ فقہاءِ شافعیہ نے کہا قبروں پر مسجدیں بنانا اور ان میں نماز پڑھنا کبیرہ گناہ ہے۔(الزواجر:۱/۱۲) اور فقہاءِ مالکیہ نے کہا کہ

---

① صحیح مسلم، بَابُ النَّهْيِ عَنِ الْجُلُوسِ عَلَى الْقَبْرِ وَالصَّلَاةِ عَلَيْهِ، رقم: ۹۷۲
② سنن ابن ماجه، بَابُ الْمَوَاضِعِ الَّتِي تُكْرَهُ فِيهَا الصَّلَاةُ، رقم: ۷٤٥، سنن الترمذی، رقم: ۳۱۷
③ صحیح مسلم، بَابُ اسْتِحْبَابِ صَلَاةِ النَّافِلَةِ فِي بَيْتِهِ، وَجَوَازِهَا فِي الْمَسْجِدِ، رقم: ۷۷۷
④ صحیح البخاری، بَابُ مَا يُكْرَهُ مِنَ اتِّخَاذِ الْمَسَاجِدِ عَلَى الْقُبُورِ، رقم: ۱۳۳۰
⑤ صحیح مسلم، بَابُ اسْتِحْبَابِ صَلَاةِ النَّافِلَةِ فِي بَيْتِهِ، وَجَوَازِهَا فِي الْمَسْجِدِ، رقم: ۷۸۰

حرام ہے(تفسیر قرطبی:۱/ ۳۸)۔ اور فقہاءِ حنابلہ نے کہا:ایسی مسجدوں میں نماز پڑھنا حرام بلکہ باطل ہے۔تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو، زادالمعاد:۳/ ۲۲اور مجموعہ فتاویٰ ۲۷/ ۱۴۰، ۱۴۱)

کیا یہ صحیح ہے کہ بیت اللہ میں سابق انبیاءکی ۷۰ کے قریب قبریں ہیں؟

سوال: ۲۱۔اپریل کے ہفت روزہ میں قبرستان میں نماز کی ممانعت سے اتفاق ہے،مگر غالباً مشکوٰۃ کی شرح ''مظاہرحق'' میں یہ بات دیکھی ہے کہ بیت اللہ میں سابق انبیاء کی ۷۰ کے قریب قبریں ہیں۔جس طرح عام قبرستان مسمار کرکے مدرسہ تعمیر ہوا ہو نیز نئی مثال دارالحکومت اسلام آباد پرانے قبرستان میں عام مساجد ہوں گی۔تفصیل لکھیں!

جواب: بیت اللہ میں انبیاء علیہم السلام کی قبروں والا قصہ قابلِ اعتماد طُرق سے ثابت نہیں ہو سکا۔ ہاں البتہ جس جگہ قبروں کا نام ونشان مٹ جائے۔ وہاں تعمیر کا کوئی حرج نہیں اور کفار کی قبروں کومسمار کرکے بھی تعمیرِ مساجد وغیرہ کا جواز ہے۔ملاحظہ ہو! صحیح بخاری۔

جس جگہ پر پہلے قبرستان رہ چکا ہو اس جگہ مسجد بنانا اور نماز پڑھنا جائز ہے؟

سوال: ہمارے گھر کے ساتھ ایک مسجد بریلوی حضرات کی ہے، جس جگہ پرمسجد تعمیر ہے اس جگہ پر پہلے قبرستان تھا کیااس مسجد میں نماز ہوجائے گی یانہیں؟

جواب: قبروں کے آثار موجود نہ ہوتو نماز ہوجائے گی۔

قبرستان میں ایک مدرسہ تعمیر کیا گیا ہے کیا اس مدرسہ میں نماز ہو جاتی ہے؟

چھوٹے بچوں کا مساجد میں آنا

کتنی عمر کے بچوں کو نماز کے لیے مسجد میں لانا چاہیے؟

سوال: رمضان المبارک میں،خصوصاً افطاری کے وقت چھوٹے چھوٹے بچے مسجد میں آجاتے ہیں اور کچھ حضرات ساتھ لے آتے ہیں، کچھ بچے جن میں اکثر کا روزہ نہیں، نماز سے پہلے ہی گھر لوٹ جاتے ہیں، بقایا نماز کے دوران عموماً مسجد میں دوڑ بھاگ کرتے ، باتیں اور شرارتیں بھی کرتے ہیں۔یعنی ایک دوسرے کے ساتھ چھیڑ خانی وغیرہ۔کچھ حضرات یہ کہتے ہیں کہ اگر بچوں کو منع کریں گے تو یہ بڑے ہوکر مسجد میں نہیں آئیں گے۔ برائے نوازش ارشاد فرمائیں کہ کتنی عمر کے بچوں کو نماز کے لیے مسجد میں لانا چاہیے؟ حدیث خیر الأنام

کے مطابق، جیسا کہ اکثر علماء حضرات سے سنا ہے کہ سات سال کی عمر کے بچے کو نماز کی ترغیب دیں۔ دس سال کا ہو جائے تو نماز نہ پڑھنے پر ماریں۔ مسجدیں ہی امن کی جگہ ہیں۔ اگر مسجد میں ہی خشوع والی نماز نصیب نہ ہو تو کہاں جائیں۔ کیونکہ بچوں کی وجہ سے جیسے اوپر ذکر کیا ہے توجہ بٹ جاتی ہے۔ بعض حضرات یہ حوالہ بھی دیتے ہیں کہ ایک دفعہ حضور اکرم ﷺ منبر پر تشریف فرما تھے کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ، جن کی عمر اس وقت ۴ سال تھی، مسجد میں آئے تو نبی کریم ﷺ نے منبر سے اتر کر ان کو گود میں لے لیا۔ اس حوالہ سے بچوں کو مسجد میں لانے یا آنے کا جواز نکلتا ہے۔

جواب: بلا قید عمر کے چھوٹے بچوں کا مسجد میں آنا یا لانا درست فعل ہے۔ صحیح حدیث میں وارد ہے کہ: رسول کریم ﷺ اپنی نواسی امامہ بنت زینب کو اٹھا کر نماز پڑھتے تھے: «فَإِذَا سَجَدَ وَضَعَهَا، وَإِذَا قَامَ حَمَلَهَا» بوقتِ سجدہ اسے بٹھا دیتے اور جب قیام کے لیے اٹھنے لگتے تو اٹھا لیتے۔ [1]

شارح بخاری حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: « وَ عَلٰی جَوَازِ إِدخَالِ الصِّبیَانِ فِی المَسَاجِدِ » (فتح الباری ۱/۵۹۲) ''اس حدیث میں بچوں کو مسجدوں میں لانے کا جواز ہے۔''

نیز صحیح مسلم میں راوی کا بیان ہے: « رَأَیتُ النَّبِیَّ ﷺ یَؤُمُّ النَّاسَ وَأُمَامَةُ بِنتُ أَبِی العَاصِ وَهِیَ ابنَةُ زَینَبَ بِنتُ النَّبِیِّ ﷺ عَلَی عَاتِقِهِ، فَإِذَا رَکَعَ وَضَعَهَا، وَإِذَا رَفَعَ مِنَ السُّجُودِ أَعَادَهَا.» [2] ''میں نے نبی ﷺ کو لوگوں کی امامت کراتے دیکھا جبکہ امامہ آپ ﷺ کے کندھے پر سوار تھی.........۔''

اور سنن أبی داؤد میں راوی کے شک کے ساتھ نماز ظہر یا عصر کا ذکر موجود ہے۔

ظاہر ہے کہ فرض نماز کی ادائیگی کے لیے محل و مقام مسجد ہے۔ انہی طُرُق کے پیش نظر حافظ موصوف نے مذکور نتیجہ اخذ کیا ہے۔ اسی طرح دوسری روایت میں ہے، کہ ایک بچہ عمرو بن سلمہ قرأت میں امتیازی حیثیت کی بناء پر یا سات سال کی عمر میں عہدِ نبوی میں اپنی قوم کا امام تھا۔ [3]

واقعہ ہذا سے ظاہر ہے کہ امامت کا شرف موصوف کو مسجد ہی میں حاصل ہوتا تھا اور پھر حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما صِغرِ سنی (چھوٹی عمر) کے باوجود جماعت میں شرکت فرماتے تھے۔ چنانچہ ان کا بیان ہے کہ

---

① صحیح البخاری، بابٌ إِذَا حَمَلَ جَارِیَةً صَغِیرَةً عَلٰی عُنُقِهِ فِی الصَّلٰوةِ، رقم: ۵۱۶

② صحیح مسلم، بَابُ جَوَازِ حَمْلِ الصِّبْیَانِ فِی الصَّلَاةِ، رقم: ۵۴۳

③ صحیح البخاری، رقم: ۴۳۰۲

میں ایک دفعہ اپنی سواری کو منیٰ میں چرنے کے لیے چھوڑ کر خود جماعت میں شریک ہو گیا تھا۔

امام بخاری رحمہ اللہ نے اس سے اور دیگر روایات سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے، کہ بچوں کا وضوء، جماعت میں شرکت، عیدین، جنائز اور صفوں میں موجودگی سب ثابت شدہ امور ہیں، جن میں کوئی کلام نہیں ہو سکتا۔[1]

مزید آنکہ ایک دفعہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم عشاء کی نماز سے لیٹ ہو گئے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: «نَامَ النِّسَاءُ وَالصِّبیَانُ» "یعنی عورتیں اور بچے سو گئے۔"[2]

اس کی تشریح میں حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: « أَيِ الحَاضِرُونَ فِي المَسجِدِ » (فتح الباری ۴۸/۲) یعنی وہ جو مسجد میں موجود تھے اور حضرات حسنین رضی اللہ عنہما کی مسجد میں آمد و رفت کی متعدد احادیث میں مصرح (واضح) ہے۔ ملاحظہ ہو! "مسند احمد" وغیرہ۔

ایک اور صحیح روایت میں فرمانِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہے کہ میں بچے کا رونا سن کر نماز ہلکی کر دیتا ہوں کہ کہیں یہ امر بچے کی والدہ پر گراں نہ گزرے۔

اسی طرح حدیث: « مُرُوا اَولَادَکُم بِالصَّلٰوةِ اِذَا بَلَغُوا سَبعًا »[3] سے بھی مسجد میں بچوں کی آمد کا جواز مترشح ہے۔ دوسری طرف محدثین کرام نے چار، پانچ سال کے بچہ کا سماعِ حدیث بھی قابلِ اعتبار سمجھا ہے۔ یہ اسی صورت میں ممکن ہے جب اسے عام مجالس میں آنے کی اجازت ہو، جن میں مسجد بھی شامل ہے۔ حدیث میں وارد ہے:

«اِنَّمَا بُنِیَتِ المَسَاجِدُ لِمَا بُنِیَت لَهٗ.»[4]

یعنی مسجدیں جس کام کے لیے بنائی گئیں ہیں، وہی کام ان میں ہونا چاہیے۔

زیرِ حدیث امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

« مَعنَاهُ لِذِکرِ اللّٰهِ ، وَالصَّلٰوةِ، وَالعِلمِ، وَالمَذَاکَرَةِ فِي الخَیرِ وَ نَحوِهَا »

یعنی اس حدیث کا مفہوم یہ ہے کہ مساجد اللہ کی یاد، نماز، تعلیم و تعلّم اور امورِ خیر کے بارہ میں گفتگو کے لیے بناء کی گئی ہیں۔"

لہٰذا عام حالات میں کسی کو حق نہیں کہ بچوں کو مسجد میں آنے سے روکے۔ البتہ بچے اگر شریر قسم کے ہوں، جن

---

1. صحیح البخاری، ۱۱۸/۱
2. صحیح البخاری، بَابُ فَضلِ العِشَاءِ، رقم: ۵۶٦، صحیح مسلم، بَابُ وَقتِ العِشَاءِ وَتَأْخِیرِهٖ، رقم: ٦۳۸
3. سنن أبی داؤد، بَابُ مَتَی یُؤمَرُ الغُلَامُ بِالصَّلَاةِ، رقم: ۴۹۵
4. صحیح مسلم، بَابُ النَّهيِ عَن نَشدِ الضَّالَّةِ فِي المَسجِدِ ...الخ، رقم: ۵٦۹

سے احترام مسجد اور آداب مسجد مجروح ہوتے ہوں، تو بطورِ تادیب ان کے خلاف مناسب کارروائی ہو سکتی ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ مسجد میں بچوں کے کھیل کود پر درّے لگاتے تھے۔ ایک روایت میں ہے: «جَنِّبُوا مَسَاجِدَکُم صِبیَانَکُم »[1] یعنی ''اپنی مسجدوں کو بچوں سے بچاؤ۔''

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے اس کی وجہ یہ لکھی ہے

:« لِأَنَّهُم يَلعَبُونَ فِيهِ، وَ لَا يُنَاسِبُهُم »

''کیونکہ وہ کھیل کود کرتے ہیں اور یہ ان کے مناسب نہیں۔''

تاہم مُہذّب اور مؤدّب بچوں کو بلا روک ٹوک مسجدوں میں آنے کی اجازت ہے۔ لہو ولعب اور شور وغل کرنے والوں کا محاسبہ ایک لازمی امر ہے، تاکہ مسجد کی طہارت و پاکیزگی میں فرق نہ آنے پائے۔

کیا جماعت میں بچوں کی صف علیحدہ ہونی چاہیے؟

سوال: جماعت میں کیا بچوں کے لیے علیحدہ صف بنانی چاہیے؟

جواب: بچوں کے لیے علیحدہ صف بندی کی ضرورت نہیں بڑوں کے ساتھ کھڑے ہو سکتے ہیں۔ منٰی میں ابن عباس رضی اللہ عنہما بڑوں کی صف میں شامل تھے، فرمایا:

« وَدَخَلتُ فِي الصَّفِّ، فَلَم يُنكِر ذٰلِكَ عَلَيَّ أَحَدٌ»

''میں صف میں شامل ہوا تو مجھے کسی نے نہیں روکا۔''[2] نماز تہجد میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابن عباس بچے کو اپنے ساتھ کھڑا کیا تھا۔''[3]

جب کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ کا بیان ہے:

« فَقَامَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيهِ وَسَلَّمَ ، وَاليَتِيمُ مَعِي ، وَالعَجُوزُ مِن وَرَائِنَا ، فَصَلّٰى بِنَا رَكعَتَينِ »[4]

چھوٹے بچوں کے بڑوں کے درمیان کھڑا ہونا کیسا ہے؟

سوال: باجماعت نماز میں اکثر لوگ چھوٹے بچوں کو اپنے ساتھ اگلی صف میں کھڑا کر لیتے ہیں جس کی وجہ

---

① سنن ابن ماجه، بَابُ مَا يُكرَهُ فِي المَسَاجِدِ، رقم: ٧٥٠، اسناده ضعيف فتح الباری ١/ ٥٤٩

② صحيح البخاری، بَابُ سُترَةُ الإِمَامِ سُترَةُ مَن خَلفَهُ، رقم: ٤٩٣

③ صحيح البخاری، بَابٌ: يَقُومُ عَن يَمِينِ الإِمَامِ، بِحِذَائِهِ سَوَاءً إِذَا كَانَا اثنَينِ، رقم: ٦٩٧

④ صحيح البخاری، باب وضوء الصبيان ......الخ، رقم: ٨٦٠

سے صف عجیب صورت اختیار کر لیتی ہے، کیا ایسا کرنا درست ہے؟

(جواب): تمیز رکھنے والے اور ادب و آداب جاننے والے بچے کا صف میں کھڑے ہونے کا جواز چاہیے۔ خواہ پہلی صف ہی ہو۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما منیٰ میں سواری سے اُتر کر صف میں شامل ہو گئے تھے۔ [1]

حضرت انس رضی اللہ عنہ کے ساتھ ایک یتیم بچے نے صف بندی کی تھی۔ [2]

[1] صحیح البخاری، بَابُ سُتْرَةُ الإِمَامِ سُتْرَةُ مَنْ خَلْفَهُ، رقم: ٤٩٣

[2] صحیح البخاری، باب وضوء الصبیان ......الخ ،رقم: ٨٦٠

۳۔ کتاب الصلوٰۃ

فرض نمازوں کے لیے اذان، عام اذان اور مؤذن کے متعلق احکام

ایک وقت میں ایک سے زیادہ اذانوں کا کیسے جواب دیں؟

سوال: ایک اذان کا جواب دینے کی صورت میں دوسری طرف سے اذانیں ہو رہی ہیں کیا اُن کا بھی جواب دینا پڑے گا یا ایک ہی اذان کا جواب کافی ہے؟

جواب: اصلاً تو ایک ہی اذان کا جواب ہے لیکن عمومِ حدیث «اِذَا سَمِعتُمُ المُؤَذِّنَ، فَقُولُوا: مِثلَ مَا یَقُولُ » [1] کے پیشِ نظر کوئی متعدد اذانوں کا جواب دینا چاہے تو دے سکتا ہے۔

سوال: اگر ایک ہی وقت میں تین چار اذانیں ہو رہی ہوں تو ان کا جواب کس طرح دینا چاہیے؟

جواب: بظاہر احادیث اس بات پر دال ہیں کہ صرف ایک ہی اذان کا جواب دینا کافی ہے چنانچہ ایک روایت میں ہے: « اذِا سَمِعتُمُ المُؤذِّنَ فقُولُوا: مِثلَ مَا یَقُولُ » [2] ''جب تم مؤذن کی اذان سنو تو جس طرح مؤذن کہتا ہے، تم بھی اسی طرح کہو۔''

لیکن اس عموم کا اطلاق ''حَیعَلَتَین'' کے ماسوا پر ہو گا، کیونکہ صحیح مسلم میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی روایت میں صراحت موجود ہے کہ ''حَیَّ عَلَی الصَّلوٰۃ'' اور ''حَیَّ عَلَی الفَلَاحِ'' کی جگہ ''لَا حَولَ وَ لَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہِ'' کہنا ہو گا۔ زیرِ حدیث ہذا امام کرمانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

« قَالَ: قُل مَا یَقُولُ: وَ لَم یَقُل : مِثلَ مَا قَالَ : لِیَشعُرَ بِأَنَّہٗ یُجِیبُ بَعدَ کُلِّ کَلِمَۃٍ مِثلَ کَلِمَتِھَا»

یعنی ''حدیث میں بصیغۂ مضارع ''یقول'' کے لفظ ہیں اور بصیغۂ ماضی ''قَالَ'' نہیں تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ جواب ہر کلمہ کے بعد دینا ہو گا۔''

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: نسائی کی روایت اس بارے مصرح ہے جس کے الفاظ یوں ہیں:

---

[1] صحیح البخاری، بَابُ مَا یَقُولُ إِذَا سَمِعَ المُنَادِی، رقم:۶۱۱، صحیح مسلم، رقم:۳۸۳

[2] صحیح مسلم: بَابُ القَولِ مِثلَ قَولِ المُؤَذِّنِ لِمَن سَمِعَہٗ، ثُمَّ یُصَلِّی عَلَی النَّبِیِّ ﷺ ......الخ :۳۸۳

« اِنَّهُ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ يَقُولُ: كَمَا يَقُولُ الْمُؤَذِّنُ: حَتّٰى يَسْكُتَ.»

یعنی ''نبی ﷺ کلمات اس طرح دہراتے جس طرح مؤذن کہتا حتی کہ وہ خاموشی اختیار کرتا۔''

اور صاحب ''المرعاۃ'' فرماتے ہیں: اس سے بھی زیادہ واضح حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے، جو صحیح مسلم میں بایں الفاظ ہے:

« إذا قَالَ الْمُؤَذِّنُ : اللهُ أَكبَرُ اللهُ أَكبَرُ، فَقَالَ أَحَدُكُم: اللهُ أَكبَرُ اللهُ أَكبَرُ، ثُمَّ قَالَ : أَشهَدُ أَن لَا إِلَهَ إِلَّا اللهُ، قَالَ: أَشهَدُ أَن لَا إِلَهَ إِلَّا اللهُ، ثُمَّ قَالَ : أَشهَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا رَسُولُ اللهِ قَالَ: أَشهَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا رَسُولُ اللهِ ﷺ » ①

ان روایات میں بصورتِ اجابت مؤذن کی پیروی کی صراحت موجود ہے۔

ظاہر ہے کہ ایک وقت میں سب کی پیروی نہیں ہوسکتی۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ صرف ایک ہی اذان کا جواب دینا کافی ہے جب کہ حدیث میں تعبیر بھی صیغۂ اِفراد (مفرد صیغہ) اس امر کی مؤید ہے (واللہ اعلم)

اذان کے دوران باتیں اور بعد میں جواب دینا:

سوال: اذان ہو رہی ہو اور کوئی آدمی باتیں کرتا رہا، اذان مکمل ہونے کے بعد جواب میں ساری اذان کے لفظ کہہ لے تو یہ کیسا ہے؟

جواب: اذان کے کلمات کا جواب ساتھ ساتھ دینا چاہیے، اور باتیں کرنے سے احتراز ہونا چاہیے۔ اگر کوئی ایسی صورت پیدا ہو جائے کہ ساتھ جواب نہ دے سکے، تو بظاہر بعد میں عدمِ استدراک ہے۔ یعنی جواب نہ دیا جائے۔

امام کا خود ہی اذان اور تکبیر کہنا:

سوال: کیا امام خود اذان دے کر اور خود ہی تکبیر کہہ کر خود ہی جماعت کروا سکتا ہے؟

جواب: عہدِ اول سے اصل معمول بہا (جس پر عمل رہا) یہ ہے کہ موذّن امام سے علیحدہ ہو، لیکن اگر امام خود ہی مؤذن اور مکبّر بن جائے تو شریعت میں اس کا بھی جواز موجود ہے۔ چنانچہ حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تیرا رب بکریوں کے اس چرواہے سے تعجب کرتا ہے، جو پہاڑ کی چوٹی کے اوپر بکریاں چراتا ہے، وہاں اذان دیتا، اور نماز پڑھتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرشتوں سے فرماتا ہے: کہ میرے

① صحيح مسلم، بَابُ الْقَوْلِ مِثْلَ قَوْلِ الْمُؤَذِّنِ لِمَنْ سَمِعَهُ، ثُمَّ يُصَلِّي عَلَى النَّبِيِّ ﷺ......الخ ، رقم: ٣٨٥

اس بندے کی طرف دیکھو، نماز کے لیے اذان اور اقامت کہتا ہے۔ مجھ سے ڈرتا ہے۔ میں نے اسے معاف کر کے جنت میں داخل کردیا۔(ابو داؤد، النسائی) ①

اس طرح دوسری روایت میں ہے رسول اللہ ﷺ نے مالک بن حویرث رضی اللہ عنہ اور اس کے رفیق سفر سے فرمایا:« اِذَا أَنْتُمَا خَرَجْتُمَا فَأَذِّنَا ثُمَّ أَقِيمَا ثُمَّ لِيَؤُمَّكُمَا أَكْبَرُكُمَا» ②یعنی ''جب تم دونوں سفر میں نکلو تو تم دونوں کہو اذان، پھر دونوں اقامت کہو، پھر دونوں سے جو بڑا ہے، وہ امامت کرائے۔''

پہلی حدیث میں خود امام کی اذان اور اقامت کی تصریح موجود ہے، جب کہ دوسری روایت میں دونوں کو اذان اور اقامت کے جواز میں برابر قرار دیا گیا ہے۔ تفاوت صرف اطاعت کے اعتبار سے ہے کہ اس کا حقدار بڑا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ امام اذان اور اقامت کہہ سکتا ہے۔ شرح مسلم میں امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: کہ اگر کوئی شخص امامت اور اذان ہر دو کو جمع کرے تو اس میں اختلاف ہے۔ ہمارے اصحاب میں سے ایک جماعت یہ کہتی ہے کہ مستحب یہ بات ہے کہ اس طرح نہ کرے۔ بعض نے کہا ہے کہ ایسا کرنا مکروہ ہے۔ محققین اور اکثر علماء کا کہنا ہے: کہ اس میں کچھ حرج نہیں ہے۔ بلکہ یہ مستحب ہے۔ یہی بات زیادہ صحیح ہے۔ فقہ حنفی شافعی وغیرہ میں تو افضل ہی اس بات کو قرار دیا ہے کہ امام خود ہی مؤذن ہونا چاہیے۔

ابن عابدین رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ بہ نفسِ نفیس اذان اور اقامت دونوں کو ملا کر کہا کرتے تھے۔ نیز حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قول مشہور ہے کہ اگر خلافت کے ساتھ میں اذان دینے کا کام بھی نبھاہ سکتا تو اذان دیا کرتا۔

منفرد شخص کا بغیر اذان کے نماز پڑھنا:

سوال: اگر کسی علاقے میں اہلِ حدیث مسجد نہ ہو اور ایک مثل ہونے پر کوئی شخص نماز عصر ادا کرنا چاہتا ہو۔ اس علاقے میں اس وقت عصر کی اذان کسی نے نہیں دی۔ کیا منفرد شخص ایسے وقت میں اذان کے بغیر نماز ادا کرے گا؟

جواب: ایسی صورت میں اذان اور اقامت کا اہتمام کرنا چاہیے، کیونکہ عمومی دلیلوں کی بناء پر احتیاط کا تقاضا یہی ہے۔ اگرچہ اس کے وجوب اور عدمِ وجوب میں اہلِ علم کا اختلاف ہے۔ ③

---

① سنن أبی داؤد، باب الاذان فی السفر ،رقم:١٢٠٣ ، و قال المنذری: رجال اسناده ثقات

② صحیح البخاری، باب الاذان للمسافر اذا كانوا جماعة والإقامة،رقم:٦٣٠

③ (مفتی شیخ ابن باز) فتاویٰ إسلامیہ:١/ ٢٥٤-٢٥٥

امام مسجد کا اذان دینا پھر نماز پڑھانا، حدیث مبارکہ کی مخالفت تو نہیں؟

سوال: مولانا عبد الخالق سندھی کی کتاب ''فَھَل اَنتُم مُنتَھُونَ'' ہے۔ اس میں انھوں نے نواہی (ممنوعات) پر مشتمل احادیث جمع کی ہیں۔ بیہقی کے حوالے سے ایک حدیث لکھی ہے کہ امام اذان نہ دے۔ اگر بامر مجبوری اس نے اذان دینی ہو تو کیا امامت کے لیے کسی اور کو آگے کرے؟

سوال یہ ہے کہ دیہاتوں میں عموماً امام مسجد ہی اذان دیتا ہے، اور نماز بھی پڑھاتا ہے کیا اس کا ایسا کرنا حدیث مذکورہ بالا کی مخالفت نہیں۔ صحیح صورتِ حال سے آگاہ فرمائیں؟

جواب: اصل یہ ہے کہ مؤذن امام سے علیحدہ ہو، لیکن امام کے لیے بھی اذان دینے کا جواز ہے۔

چنانچہ صحیح بخاری میں حدیث ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے حضرت مالک بن حویرث رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھی سے مخاطب ہو کر فرمایا:

« اِذَا سَافَرتُمَا فَاَذِّنَا وَ اَقِیمَا وَ لِیَؤُمَّکُمَا اَکبَرُکُمَا »[1]

''یعنی جب تم دونوں سفر کرو تو اذان کہو اور تکبیر کہو اور تم میں جو بڑا ہے وہ تمہاری امامت کرے۔''

حدیث ہذا میں اذان کا خطاب دونوں کو ہے۔ جب بڑے نے اذان کہہ دی تو امامت بھی وہی کرائے گا۔ جس سے مؤذن کا امام ہونا لازم آ گیا۔ امام نووی رحمہ اللہ حدیث ہذا کی شرح میں رقمطراز ہیں:

اگر کوئی شخص امامت اور اذان ہر دو کو جمع کرے تو اس میں اختلاف ہے۔ ہمارے اصحاب میں سے ایک جماعت یہ کہتی ہے کہ مستحب یہ بات ہے کہ اس طرح نہ کرے اور بعض نے کہا کہ ایسا کرنا مکروہ ہے۔ محققین اور اکثر علماء کا یہ کہنا ہے کہ اس میں کوئی حرج نہیں ہے، بلکہ یہ مستحب ہے۔ یہی بات زیادہ صحیح ہے۔ اسی طرح راعیِ غنم (بکریوں کا چرواہا) کی بابت حدیث آتی ہے، کہ جب وہ جنگل میں اذان اقامت کہہ کر نماز پڑھتا ہے تو اللہ تعالیٰ کے لشکر اس کی اقتداء میں نماز پڑھتے ہیں۔[2]

اور بحوالہ ''بیہقی'' امام کے لیے اذان کی ممانعت جو نقل کی گئی ہے، بذاتِ خود امام موصوف نے اس حدیث کو ضعیف کہا ہے۔ فَھٰذَا حَدِیثٌ إِسنَادُہٗ ضَعِیفٌ'' اس لیے یہ قابلِ استدلال نہیں۔ فقہ حنفی کی کتاب ''شامی'' میں ہے کہ افضل یہ ہے کہ امام ہی مؤذن ہو۔ یہ ہمارا مذہب ہے اور امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ اس پر قائم تھے۔

---

[1] صحیح البخاری، باب الاذان للمسافر اذا کانوا جماعة والإقامة، رقم: ٦٣٠

[2] سنن أبی داؤد، باب الاذان فی السفر، رقم: ١٢٠٣

کونسی نمازوں میں دوہری اور کونسی نمازوں میں اکہری تکبیر کہنا سنت ہے؟

سوال: کونسی نمازوں میں دوہری تکبیر کہنا سنت ہے؟اور کن نمازوں میں اکہری تکبیر کہنا جائز ہے؟

جواب: بعض اہلِ علم کا کہنا ہے کہ جس نماز کے لیے اذان دوہری ہو اس کی تکبیر بھی دوہری ہونی چاہیے۔ دلیل میں وہ حدیث ابومحذورہ پیش کرتے ہیں جو کتب سنن و مسلم وغیرہ میں موجود ہے۔ باقی عام حالات میں تکبیر اکہری کہی جائے۔ یاد رہے بلا تخصیص کسی بھی نماز کے لیے دوہری اذان ہو سکتی ہے۔

اذان میں ترجیع کا اِذن عام ہے یا فجر سے خاص؟

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ کیا صرف فجر کی اذان ہی ''ترجیع'' کے ساتھ پڑھنی چاہیے یا باقی نمازوں کی اذانیں بھی ''ترجیع'' کے ساتھ پڑھنے کی اجازت ہے؟ اور اگر اذان ترجیع کے ساتھ پڑھی گئی ہو تو تکبیر میں کتنے کلمے کہنے چاہئیں، اور ''قَد قَامَتِ الصَّلٰوۃَ'' کے جواب میں ''اَقَامَهَا اللّٰهُ وَ اَدَامَهَا '' کس وقت پڑھنا چاہیے؟

جواب: صحیح مسلم اور سنن کی کتابوں میں وارد حضرت ابومحذورہ کی روایت میں اذان میں ترجیع کا اِذن عام ہے۔ فجر سے مخصوص نہیں۔ بایں صورت ابومحذورہ کی روایت میں تکبیر میں سترہ کلمات کا ذکر ہے۔ بظاہر اس کا جواز اس صورت میں ہے، جب اذان میں ''ترجیع'' ہو، ورنہ عام حالات میں تکبیر اکہری ہے، جفت نہیں۔ جس طرح کہ صحیح بخاری میں حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت میں مصرح (واضح) ہے، اور ''قد قامت الصلوٰۃ'' کے جواب میں ''أقامها الله و أدامها''[1] کہنے والی روایت تین علتوں کی بناء پر سخت ضعیف ہے۔

۱۔ محمد بن ثابت عبدی بالاجماع ضعیف ہے۔

۲۔ عبدی اور شہر بن حوشب کے درمیان واسطہ مجہول ہے۔

۳۔ شہر بن حوشب مختلف فیہ ہے۔(المجموع:۱۲۹/۳)

لہٰذا'' قَد قَامَتِ الصَّلٰوۃَ '' کے جواب میں اسی کلمے کا اعادہ ہونا چاہیے۔

اذان کے دوران نماز شروع کرنا:

سوال: اذان ہو رہی ہو اور نماز شروع کرلی جائے تو کیا نماز ہو جاتی ہے یا نہیں؟

جواب: افضل یہ ہے کہ اذان کا جواب دے کر نماز شروع کی جائے۔اگر کوئی اثنائے اذان میں ہی نماز

[1] سنن ابی داؤد،بَابُ مَا یَقُولُ إِذَا سَمِعَ الإِقَامَةَ، رقم:۵۲۸

شروع کردے، تو بھی نماز ہوجائے گی۔ ان شاء اللہ۔

اذان سننے کے بعد کھیت میں اذان کہنا:

سوال: جہاں اذان کی آواز بطریقِ احسن سنی جاتی ہے۔ وہاں جماعت سے نماز پڑھنے کے لیے کیا اذان ضروری ہے؟ مثلاً کھیتوں وغیرہ میں۔

جواب: مسموع (سنی گئی) اذان سب کے لیے کافی ہوسکتی ہے۔ (کتاب الاذان مؤلفہ مولانا عبدالقادر حصاری مرحوم، ص:۴۴)

مؤذن کی تنخواہ کا کیا حکم ہے؟

سوال: مؤذّن کے بارے میں یہ ہے کہ مؤذن ایسا ہونا چاہیے جو تنخواہ نہ لے، مگر سعودیہ کے اندر مؤذّن تنخواہ لیتا ہے کیا یہ جائز ہے؟

جواب: اس طرح مؤذّن جو کچھ وصول کرتا ہے، یہ بھی پابندیٔ وقت کا حقیر سا صلہ ہوتا ہے۔ سعودیہ میں مؤذنین کے رواتب کا اہتمام اسی بنیاد پر ہوتا ہے۔ دوسرا وہ بیت المال سے ہوتا، جس میں جملہ مسلمانوں کا حق ہے۔ اس کے باوجود حتی المقدور فرض ہذا کو مفت سرانجام دینے کی سعی کرنی چاہیے۔

مؤذن کا اذان کے بعد سونا یا بازار جانا:

سوال: مؤذن اذان کہنے کے بعد بازار چلا جائے یا سو جائے اس کے متعلق علمائے کرام کیا فرماتے ہیں؟

جواب: حسبِ حاجت یا ضرورت کوئی بھی کام کرسکتا ہے، لیکن جماعت میں شمولیت کا اہتمام ازبس ضروری ہے۔

کیا اذان کے بعد نماز دوسری جگہ جا کر پڑھنا جائز ہے؟

سوال: ایک شخص ایک مسجد میں اذان دے کر نماز دوسری مسجد جا کر پڑھے کیا یہ جائز ہے؟

جواب: ایک مسجد میں اذان دے کر بلاوجہ دوسری مسجد جا کر نماز پڑھنا درست عمل نہیں۔ ہاں البتہ اگر وہاں امام ہے، تو پھر درست ہے۔ صحیح مسلم اور ''سنن ابی داؤد'' وغیرہ میں حدیث ہے کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے ایک شخص کو دیکھا کہ اذان کے بعد مسجد سے نکل گیا۔ فرمایا: اس نے ابوالقاسم صلی اللہ علیہ وسلم کی نافرمانی کی ہے۔''[1] لیکن اصحاب ضرورت اس سے مستثنیٰ ہیں۔ چنانچہ حافظ ابنِ حجر تفصیل بیان

---

[1] صحیح مسلم،بَابُ النَّهيِ عَنِ الخُرُوجِ مِنَ المَسجِدِ إِذَا أَذَّنَ المُؤَذِّنُ، رقم:٦٥٥،سنن ابی داؤد،رقم:٥٤٦،سنن ابن ماجه،رقم:٧٣٣

کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

« وَ كَذَا مَن يَكُونُ إِمَامًا لِمَسجِدٍ آخَرَ وَ مَن فِي مَعنَاهُ » [1]

''اسی طرح جو شخص دوسری مسجد میں امام ہے، اور جو اس کے ہم معنی ہے، وہ بھی نکل سکتا ہے۔''

زیادہ بارشوں کو روکنے کے لیے اذانیں دینا:

(سوال): بعض لوگ بارش زیادہ ہونے کے باعث اذانیں دینا شروع کردیتے ہیں کہ بارش رک جائے کیا یہ شرعی لحاظ سے جائز ہے؟

(جواب): بارش روکنے کے لیے اذان دینا ثابت نہیں۔

اذان کے وقت کتوں کا بھونکنا:

(سوال): جس گاؤں میں اذان نہ ہوتی ہو وہاں اگر کوئی اذان کہے تو کتے اذان کی آواز پر عموماً بھونکنا شروع کردیتے ہیں لیکن جہاں باقاعدہ اذان ہوتی ہے وہاں بھی کئی کتے بھونکتے ہیں ہماری مسجد کے امام جب اذان کہتے ہیں تو مسجد کے پڑوس کا کتا بھونکنا شروع کردیتا ہے یا آواز نکالتا ہے، جب کہ کوئی اور شخص اذان کہے تو چپ رہتا ہے اس کی کیا وجہ ہے؟

(جواب): اس بارے میں کوئی شرعی نص نظر سے نہیں گزری۔ واضح ہو کہ کتے میں چونکہ شیطانی اوصاف پائے جاتے ہیں۔ شیطان سے اس کا تعلق بھی ہے۔ ممکن ہے نیکی سے معارضہ کی خاطر متنوع صورتوں میں وہ اپنے خُبثِ باطن کا اظہار کرتا ہو، جس طرح کہ اذان سن کر شیطان پیٹھ پھیر کر بھاگ جاتا ہے۔

شرح مسلم میں امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: مؤذن چونکہ توحید کا اقرار کرتا ہے، اور شعارِ اسلام کے لیے دعوت دیتا ہے اس لیے وہ مؤذن کو اپنا دشمن تصور کرتا ہے۔ کتاب ''منبہات ابن حجر رحمہ اللہ'' میں ایک روایت میں ہے۔ شیطان نے اپنے بیس دشمنوں میں سے ایک دشمن مؤذن کو گردانا ہے، جو پانچ وقتی اذان دیتا ہے۔

لوگوں کو نماز کے لیے جگانے کی خاطر سپیکر میں قرآن کی تلاوت کرنا؟

(سوال): اذان کے بعد کسی کو نماز کے لیے بلانا منع ہے لیکن عموماً صبح کی اذان کے وقت لوگ سوئے ہوئے ہوتے ہیں ان کو نماز کے لیے جگانے کے لیے سپیکر پر قرآن پڑھنا کیا بدعت ہے یا جائز ہے۔ عموماً سردیوں کے موسم میں جب اندر سوئے ہوئے ہوتے ہیں اور اذان نہیں سن پاتے تو کیا ایسا کرنا جائز ہے یا نہیں؟

[1] فتح الباری : ۱۲۱/۲

(جواب): اذان کے بعد کسی اضافے کی ضرورت نہیں، کیونکہ یہ طریق کار سلف صالحین سے ثابت نہیں۔ اگرچہ قرآن مجید کی تلاوت بلا تخصیص ہر وقت مطلوب ہے۔

کیا بغیر وضو اذان دینا جائز ہے؟

(سوال): بغیر وضو اذان دینا جائز ہے یا نہیں؟

(جواب): اذان بلا وضو دی جاسکتی ہے۔ حدیث میں ہے:

« كَانَ يَذْكُرُ اللّٰه عَلٰى كُلِّ احيَانِهِ »[1]

کیا مخنث اذان کہہ سکتا ہے؟

(سوال): ہمارے گاؤں میں مردانہ صفات سے محروم ایک مخلص مسلمان جن کی عمر ۵۰ سال سے زائد ہے۔ صوم وصلوٰۃ کے پابند ہیں اور حج کی سعادت بھی حاصل کر آئے ہیں۔ پہلے وہ گاہے بگاہے اذان دیتے تھے چند ماہ قبل ان کو مقامی مولوی صاحب نے فطری محرومی کے باعث اذان دینے سے منع کر دیا ہے۔ موصوف کا موقف ہے کہ روضہ اطہر میں مخنث ہی جھاڑو دیتے ہیں تو میں اذان کیوں نہیں دے سکتا اس نے مجھ سے مسئلہ دریافت کیا لیکن میں نے لاعلمی کا اظہار کیا اور آپ سے رجوع کر رہا ہوں کہ قرآن وحدیث کی روشنی میں وضاحت فرمائیں کہ وہ اذان دے سکتا ہے یا نہیں۔

(جواب): مخنث اذان کہہ سکتا ہے، بشرطیکہ اس کی علامات زیادہ طرح مردوں کے مشابہ ہوں۔ اس کے باوجود اَولیٰ یہ ہے کہ غیر مخنث اذان دے۔ حدیث میں ہے: « دَع مَا يُرِيبُكَ اِلٰى مَا لَا يُرِيبُكَ »[2]

نومولود کے کان میں اذان اور اقامت کہنا:

(سوال): نومولو بچے کے کان میں اذان اور اقامت کہنے والی حدیث کہاں ہے اور کیا وہ حدیث صحیح ہے؟ اگر وہ حدیث صحیح نہیں ہے تو پھر جو عام طور پر کہا جاتا ہے کہ نومولود بچے کے کان میں اذان واقامت کہنے سے بچہ مسلمان ہوجاتا ہے تو پھر نومولود بچے کو مسلمان کرنے کا صحیح طریقہ کیا ہے؟ مفصل دلائل پیش

---

[1] صحیح مسلم، بَابُ ذِكرِ اللهِ تَعَالٰى فِي حَالِ الجَنَابَةِ وَغَيرِهَا، رقم:۳۷۳، بحواله فتح الباری: ۱/۴۰۸، سنن ابن ماجه، رقم:۳۰۲

[2] صحیح البخاری، بَابُ تَفسِيرِ المُشَبَّهَاتِ، سنن الترمذی، رقم:۲۵۱۸، سنن النسائی، رقم:۵۷۱۱، مسند احمد:۱۷۲۷

فرمائیں۔ (محمد شفیق کمبوہ، والٹن لاہور)

(جواب): نومولود بچے کے کان میں اذان کے بارے میں ابورافع کی حدیث میں تصریح موجود ہے۔ امام احمد، ابوداؤد، ترمذی، علامہ البانی وغیرہ نے اس پر حسن کا حکم لگایا ہے، لہٰذا قابل عمل ہے اور اقامت کا ذکر کسی قابل استناد حدیث سے ثابت نہیں ہے۔

واضح ہو کہ اسلام دین فطرت ہے۔ بچہ جب پیدا ہوتا ہے تو وہ مسلمان ہی ہوتا ہے، نئے سرے سے مسلمان کرنے کی ضرورت نہیں۔ اذان صرف تعمیل شرع کی بنا پر ہے نہ کہ اسلام میں داخل کرنا مقصود ہے۔

کیا یہ صحیح ہے کہ نومولود کے دائیں کان میں اذان اور بائیں میں اقامت کہی جائے؟

(سوال): بچے کے کان میں اذان کتنے دن کے اندر کہی جائے؟ آیا دائیں کان میں اذان اور بائیں میں اِقامت یا دونوں میں اذان دی جائے؟ (ڈاکٹر حق نواز قریشی، راولپنڈی)

(جواب): اس بارے میں جو حدیث وارد ہے، اس میں یہ ہے کہ دائیں کان میں اذان اور بائیں میں اِقامت اور اس میں ہے کہ ولادت والے دن اذان کہی جائے۔ لیکن اس حدیث کو علامہ البانی رحمہ اللہ نے ضعیف قرار دیا ہے۔[1]

فجر کی پہلی اذان وغیرہ کے احکام

اَلصَّلٰوۃُ خَیرٌ مِنَ النَّومِ صبح کی پہلی اذان میں یا دوسری میں:

(سوال): ہمارے مولوی صاحب کا کہنا ہے کہ صبح کی پہلی اذان میں "اَلصَّلٰوۃُ خَیرٌ مِنَ النَّومِ" کہنا چاہیے کیونکہ لوگ اس وقت سو رہے ہیں۔ دوسری اذان میں بھی کہنا چاہیے کیا موصوف کا ایسا کہنا درست ہے؟ وضاحت فرمائیں!

(جواب): صبح کی دو اذانوں کی صورت میں صرف پہلی اذان میں " اَلصَّلٰوۃُ خَیرٌ مِنَ النَّومِ "کہنا چاہیے ملاحظہ ہو! سنن ابوداؤد وغیرہ۔

اَلصَّلٰوۃُ خَیرٌ مِنَ النَّومِ کے متعلق ایک سوال پر تبصرہ اور اس کا جواب:

(سوال): ''الاعتصام'' مؤرخہ ۱۵ مئی ،ص:٦، پر ایک سوال کے جواب میں آپ کا فرمان ہے کہ ''صبح کی دو

[1] سلسلة الاحاديث الضعيفة:١/ ٤٩٣

اذانوں کی صورت میں پہلی اذان میں «اَلصَّلٰوۃُ خَیرٌ مِنَ النَّوم» کہنا چاہیے'' اس ضمن میں عرض ہے کہ «بلوغ المرام بَابُ الاَذَان» میں احمد اور ابن خزیمہ رحمہ اللہ کے حوالے، نیز ترمذی «بَابُ التَّثوِیبِ فِی الفَجرِ» سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ الفاظ صبح کی فرض نماز کی اذان سے متعلق ہیں، نہ کہ پہلی اذان سے کیونکہ قرآن میں فجر کی وضاحت اور حدیث میں تشریح بھی ہوگئی کہ فجر وہ ہے جس وقت ماہ رمضان میں خورد ونوش اور وصال (جماع) وغیرہ ممنوع ہو جاتا ہے۔صلوٰۃ فجر کے بعد کسی نماز کے ممنوع ہونے سے بھی اس نماز کی اذان کا وقت طلوعِ فجر ہی مترشح (واضح) ہوتا ہے۔ان امثال سے مظہر (ظاہر) ہے کہ یہی وقت فجر کی اذان میں تثویب کرنے کا ہے۔مسلک اہلِ حدیث نیز احناف کو ہند وپاک میں ہم نے آج تک اسی پر عامل پایا ہے۔رہی بات کہ ''پہلی اذان کے وقت لوگ سوئے ہوئے ہوتے ہیں'' اس میں تثویب کی وجہِ جواز قرینِ قیاس نہیں، کیونکہ اس وقت صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی اکثریت مطابق سنتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم رات کے آخری حصے میں محوِ سجود (سجدوں میں مصروف) ہوا کرتی تھی۔قطع نظر ''خیر القرون'' کے اب تو دوسری اذان کے بعد تک اکثریت کا محوِ خواب رہنا عادت بن چکی ہے براہِ نوازش کتاب وسنت کی رُو سے مزید وضاحت فرما کر مطمئن فرمائیں۔

جواب: گزارش ہے صبح کی پہلی اذان کا تعلق بھی من وجہ صبح سے ہے۔جس طرح کہ جمعہ کی پہلی اذان کا تعلق جمعہ سے ہوتا ہے۔حدیث میں اس کی دو علتیں بیان ہوئی ہیں۔تہجد گزار تہجد ختم کردیں، اور سوئے ہوئے بیدار ہو جائیں۔اس علت کا تقاضا یہ ہے کہ «اَلصَّلٰوۃُ خَیرٌ مِنَ النَّوم» کا تعلق پہلی اذان سے ہو۔اس سے مقصود تہجد یا سحری کی اذان نہیں، جو ہمارے ہاں مشہور ہے شرع میں اس کا کوئی وجود نہیں۔غالباً اس کے پیشِ نظر آپ کے ذہن میں اشتباہ پیدا ہوا ہے۔دوسرا اس اذان کے ساتھ کھانے پینے کا ذکر محض اشتباہ (شبہ) دور کرنے کے لیے ہے کہ یہ وہ اذان نہیں جس کے ساتھ کھانا پینا حرام ہو جاتا ہے۔بلکہ وہ دوسری اذان ہے۔ورنہ لازم آئے گا کہ اس سے پہلے کھانا پینا جائز ہی نہ ہو کوئی بھی اس بات کا قائل نہیں۔

بخلاف امام یحییٰ قطان کے کہ انھوں نے اس کو رمضان سے مخصوص کردیا ہے۔جب کہ حقیقت حال یہ ہے، کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سارا سال نفلی روزے کثرت سے رکھا کرتے تھے۔لہٰذا بلالی اذان بھی سارا سال جاری وساری رکھنا مسنون ہے۔صلوٰۃِ داؤدی میں رات کے آخری حصے میں سونا محبوب ترین عمل قرار دیا گیا ہے ظاہر ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا بھی اس پر عمل ہوگا۔یہ کہنا کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم رات کے آخری حصہ میں ایک لمحہ بھی آرام نہیں کرتے تھے۔دعویٰ بلا دلیل ہے، جب کہ دوسری طرف متعدد روایات میں پہلی اذان کی

تصریح بھی موجود ہے۔ چنانچہ ''سبل السلام'' میں بحوالہ نسائی ہے:

«اَلصَّلٰوۃُ خَیرٌ مِنَ النَّومِ . اَلصَّلٰوۃُ خَیرٌ مِنَ النَّومِ ، فِی الاَذَانِ الاَوَّلِ مِنَ الصُّبحِ »[1]

ابن ارسلان کہتے ہیں: «وَصَحَّحَ ھٰذِہِ الرِّوَایَةَ ابنُ خُزَیمَةَ » ''اس روایت کو خزیمہ رحمہ اللہ نے صحیح کہا ہے۔'' صاحب ''البدر التمام'' علامہ مغربی فرماتے ہیں: تثویب فجر کی پہلی اذان میں ہے کیونکہ سونے والے کو جگانے کے لیے ہے، اور اذانِ ثانی نماز کے وقت ہونے کا اعلان، اور نماز کی طرف بلانے کے لیے ہے اور نسائی کی سنن کبریٰ میں ہے:

« کُنتُ أُوذِن لِرَسُولِ اللّٰهِ ﷺ. فَکُنتُ اَقُولُ فِی أَذَانِ الفَجرِ الاَوَّلِ : حَیَّ عَلَی الصَّلٰوۃِ .حَیَّ عَلَی الفَلَا ح . اَلصَّلٰوۃُ خَیرٌ مِنَ النَّومِ »[2]

اس سے مطلق روایات مقید ہو گئیں۔ جن میں صرف اذانِ فجر کا ذکر ہے۔ جب کہ بعض ائمہ حدیث کی تبویبات کا تعلق صرف اطلاق سے ہے۔ (وَالصَّحِیحُ مَا تَقَدَّمَ) پھر دوسری اذان کو اقامت پر محمول کرنا ظاہر کے خلاف ہے۔ جب کہ دو اذانیں مستقلاً ثابت شدہ امر ہے۔

الصلوٰۃ خیر من النوم فجر کی کس اذان میں؟

سوال اذان میں تثویب یعنی "الصلوٰۃ خیر من النوم" کا فجر کی پہلی اذان میں کہا جانا سنت ہے یا دوسری اذان میں؟ ہفت روزہ ''الاعتصام'' میں آپ نے اظہار فرمایا کہ کلماتِ تثویب اذانِ اوّل میں کہے جانے چاہئیں۔ اس پر میں نے اپنے اطمینان کے لئے آپ سے وضاحت چاہی تو آپ نے ''الاعتصام'' مورخہ ۱۴/ اگست ۱۹۹۸ء میں بحوالہ روایات مزید وضاحت کر دی۔ میرا مقصد یہ تھا کہ سنت رسول ﷺ اور پھر تعامل صحابہؓ کا صحیح علم ہو سکے۔ اب ایک پرانا کتابچہ ''اذانِ محمدی ﷺ'' مصنفہ مولانا محمد بن ابراہیم جونا گڑھی (ناشر مکتبہ سعودیہ، حدیث منزل، کراچی نمبرا) نظر سے گذرا جس کے صفحہ پر مولانا موصوف رقم طراز ہیں کہ ''اذانِ سحری میں "الصلوٰۃ خیر من النوم" نہیں کہا جائے گا (کیونکہ وہ اذانِ فجر کے ساتھ مخصوص ہے۔) اور اذانِ فجر میں یہ مقولہ دوبار دہرایا جائے گا۔ گویا دوسری اذانِ صلوٰۃ الفجر میں ہی تثویب کا عمل قرار پایا۔ جیسا کہ ہند و پاک نیز سعودی عرب میں بھی رائج ہے۔ علما کی اس پر تنقید قبل ازیں ہماری شنید میں نہیں آئی۔

---

[1] سبل السلام: ۱/ ۱۷۹، رقم: ۱۶۷، سنن النسائی، اَلأَذَانُ فِی السَّفَرِ، رقم: ۶۳۳

[2] سنن النسائی، التَّثوِیبُ فِی أَذَانِ الفَجرِ، رقم: ۶٤۷

اب تحقیق طلب بات یہ ہے کہ اگر سنت رسول ﷺ اور قرونِ اولیٰ کے مطابق تثویب کا عمل اذانِ اول میں ہی رہا تھا تو پھر متاخرین میں دوسری اذان میں تثویب کا رواج کیسے پا گیا؟ ان کے پاس اس کے دفاع کی کیا دلیل ہے؟ اگر یہ کہا جائے کہ چونکہ کئی جگہوں پر ایک اذان صلوٰۃ الفجر ہی کہی جاتی ہے، اس لئے اس میں ہی تثویب کا رواج پا گیا تو پھر بھی یہ نبوی اذان میں اپنی طرف سے اضافہ ٹھہرے گا جسے بے نقاب کرنا علما کا فرض ہے ورنہ عوام اسی کو صحیح سنت سے تعبیر کریں گے۔ اس مسئلے کا حل فرما کر عنداللہ ماجور ہوں۔

(ڈاکٹر عبید الرحمٰن چوہدری، مصطفیٰ آباد، لاہور)

۱۔ (جواب) الجواب بعون الوہاب (از مولانا حافظ عبدالقہار، کراچی منقول از ''صحیفہ اہلحدیث'' کراچی)

صورتِ مسئولہ میں واضح ہو کہ شرعاً الصلاة خير من النوم صبح کی اذان میں حي على الفلاح کے بعد دو بار موذن کو کہنا چاہیے۔ مشروع و مسنون یہی ہے جس کے مفصل دلائل محولہ بالا فتویٰ میں بیان ہو چکے ہیں جو کثیر تعداد میں ہیں اور زیادہ صحیح و قوی ہیں۔ البتہ سنن نسائی میں ابوسلیمان کی سند سے ابومحذورہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

«كُنْتُ أُؤَذِّنُ لِرَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَكُنْتُ أَقُولُ فِي أَذَانِ الْفَجْرِ الْأَوَّلِ: حَيَّ عَلَى الْفَلَاحِ .الصَّلَاةُ خَيْرٌ مِنَ النَّوْمِ .الصَّلَاةُ خَيْرٌ مِنَ النَّوْمِ .اللَّهُ أَكْبَرُ .اللَّهُ أَكْبَرُ .لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ .» [1]

''فرماتے ہیں کہ میں رسول اللہ ﷺ کے لئے اذان دیتا تھا تو میں فجر اوّل کی اذان میں حي على الفلاح کہہ کر الصلاة خير من النوم پھر الله اكبر ، الله اكبر لا إله إلا الله کہتا تھا۔'' (ج۱، ص۷۵، مطبع رحیمیہ، دہلی)

اس حدیث کو اگرچہ علامہ البانی رحمہ اللہ نے صحیح نسائی میں شمار کیا ہے، جبکہ ابومحذورہؓ کی بیت الحرام کے پاس اذان دینے والی حدیث اور ایک ایک حرف نبی ﷺ کے ابومحذورہ رضی اللہ عنہ والی حدیث جس میں فجر کی اذان میں الصلاة خير من النوم کہنے کا ذکر ہے، ان دونوں کو صحیح نسائی اور صحیح ابوداود میں شمار کیا ہے اور صحیح قرار دیا ہے، اور نسائی والی روایت فجر اوّل میں الصلاة خير من النوم کہنے والی سند میں جسے ابوجعفر الفراء سے سفیان ثوری کی روایت سے امام نسائی نے ذکر کیا اور مراد لیا ہے، لیکن حقیقت میں وہ ابوجعفر الفراء نہیں ہے۔ اس طرح یہ مجہول العین کی روایت شمار ہوگی جو کہ ضعیف کہلاتی ہے۔

---

[1] سنن النسائی، التَّثْوِيبُ فِي أَذَانِ الْفَجْرِ، رقم:٦٤٧

اور حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ والی حدیث:

« قال: كان في الاذان الاول بعد الفلاح، الصلاة خير من النوم، الصلاة خير من النوم »[1]

کہ پہلی اذان میں حی علی الفلاح کے بعد دوبار الصلاۃ خیر من النوم کہا جاتا تھا۔

تو اس کا جواب یہ ہے کہ ان دونوں حدیثوں میں فجر اوّل اور اذانِ اوّل کا جو ذکر آیا ہے، اس سے مراد فجر کی حقیقی اذان ہے جو نماز کا وقت داخل ہونے کے بعد دی جاتی ہے، وہ اذان مراد نہیں ہے جو حضرت بلال رضی اللہ عنہ صبح کی اذان سے چندمنٹ پہلے دیا کرتے تھے، اور یہاں اوّل اُولیٰ کا لفظ اقامت کے مقابلہ میں بولا گیا ہے، چنانچہ امام نووی رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں:

هذا نص على ان المراد من النداء الاول هو النداء الذى بعد دخول الوقت والنداء الاول هو بالنسبة إلى الإقامة (النووى: ١/ ٢٥٥)

''اس اذانِ اوّل سے وہی اذان مراد ہے کہ جو نماز کے وقت کے داخل ہونے کے بعد نماز کی طرف بلانے کے لئے دی جاتی ہے اور اسے اقامت کے مقابلے میں اذانِ اوّل کہہ دیا گیا ہے۔''[2]

علامہ حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ رقم طراز ہیں:

بالاولى اى عن الاولىٰ وهى متعلقة بسكت يقال سكت عن كذا إذا تركه، والمراد بالاولى الاذان الذى يوذن به عند دخول الوقت، وهو اول باعتبار الإقامة، و ثان باعتبار الاذان الذى قبل الفجرو جاء ه التانيث إمامن قبل مواخاته للإقامة اولانه ارادالمناداة او الدعوة التامة، ويحتمل ان يكون صفة لمحذوف والتقدير إذا سكت عن المرة الاولى او فى المرة الاولى

---

① اخرجه الطحاوى فى شرح معانى الآثار: ١/ ٩٥، والبيهقى فى السنن الكبرىٰ: ١/ ٤٢٣، والدارقطنى فى سننه: ١/ ٢٤٣

② یہ تاویل اس وقت صحیح ہے جب فجر کی صرف ایک اذان اور اقامت ہو تو واقعتاً ندائے اقامت سے پہلے ندائے اذان ہی پہلی پکار ہے لیکن جب فجر کی دو اذانیں دی جائیں تو پھر تین دفعہ کی پکاریں میں سے دوسری پکار فجر کی دوسری اذان ہوگی اور پہلی پکار فجر کی پہلی اذان جو صبح کاذب کے وقت دی جاتی ہے۔ جمہور علماء روایات کے اختلاف کے وقت پہلے جمع/تطبیق کا رویہ اختیار کرتے ہیں۔ ابتداء ہی سے تاویل شروع کردی جائے تو مناسب نہیں ہوتا۔ تاویل معنوی ترجیح کی قسم شمار ہوتی ہے۔ اصولی طور پر جمع و تطبیق، ترجیح سے مقدم ہے۔ (محدث)

یعنی ''اولیٰ سے مراد وہ اذان ہے جو نمازِ فجر کا وقت شروع ہونے پر دی جاتی ہے۔ یہ اقامت کے مقابلے میں پہلی اذان اور فجر سے پہلے دی جانے والی اذان کے مقابلے میں دوسری اذان ہے۔ یہاں اولیٰ (صیغہ مونث) یا تو اقامت کے مقابلے میں بولا گیا ہے یا مناداۃ یا دعوۃِ تامہ کے مقابلے میں اور یہ بھی احتمال ہے کہ یہاں محذوف عبارت اس طرح ہو کہ جب موذن پہلی مرتبہ خاموش ہو جائے۔''[1]

گویا ''الاولیٰ'' سے مراد وہ اذان ہے جو صبح کی نماز کے وقت کے داخل ہونے پر دی جاتی ہے۔[2]

اس کی دلیل صریح حدیث میں مذکور ہے جسے حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے حدیثِ عائشہؓ سے ذکر کیا اور جسے امام لیث مصری رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے:

عن عائشة قالت:صلى رسول الله ﷺ العشاء ثم صلى ثمان ركعات وركعتين جالسا، وركعتين بين ندائين ولم يكن يدعهما۔ وفي رواية الليث: ثم يمهل حتى يوذن بالاولى من صلاة الصبح فيركع ركعتين»[3]

''آپ ﷺ رات کی نماز (تہجد و تراویح) کے بعد دونوں اذانوں کے درمیان دو رکعت پڑھتے تھے (صبح سے پہلے کی سنت)۔''[4]

---

① فتح الباري:۲/۱۰۹، ۱۱۰

② یہاں حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کی عبارت کا مفہوم سمجھنے میں مفتی صحیفہ اہل حدیث کراچی غلطی کھا رہے ہیں کیونکہ یہاں حافظ ابن حجر رحمہ اللہ پہلی اذان کے دو مطلب بیان کر رہے ہیں: اقامت (تکبیر) کے اعتبار سے اذانِ فجر پہلی اذان ہے۔ نمازِ فجر کی دو اذانوں میں سے پہلی اذان (اگر فجر کی دو اذانیں کہی جائیں) لیکن یہاں مفتی صحیفہ صرف ایک مفہوم ہی مخصوص کر رہے ہیں جو فہم کا نقص ہے۔ دراصل مفتی صاحب کو اس بارے میں ہمارے ہاں 'اذانِ سحری' کے عوامی لفظ سے التباس پیدا ہوا ہے کہ شاید سحری کے کھانے پینے کے لیے جگانے کی غرض سے کوئی اذان مسنون ہے، حالانکہ فجر کی اگر دو اذانیں کہیں جائیں تو دو اذانیں فجر کے لیے ہی ہوتی ہیں۔ پہلی نمازِ فجر کی تیاری کے لیے وقت فجر سے پہلے فجر (صبح) کاذب کے وقت اور دوسری اذان نمازِ فجر کے اعلان کی غرض سے یعنی سنت رسول ﷺ کے مطابق دونوں اذانیں فجر سے متعلق ہی ہیں۔ ورنہ سحری کھانے کے لیے اگر اذان کہی بھی جاتی تو اس میں الا صلّوا فی الرحال کی قسم سے متعلق ہی ہیں۔ ورنہ سحری کھانے کے لیے اگر اذان کہی بھی جاتی تو اس میں الا صلّوا فی الرحال کی قسم کے کلمات حی علی الصلوٰۃ وغیرہ کی طرح کہے جاتے۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو فتویٰ مفتی مولانا ابو البرکات مع توثیق حضرت حافظ محمد گوندلوی رحمہ اللہ نشر کردہ ہفت روزہ، اہل حدیث، لاہور مجریہ ۴/۰۷/۱۹۷۰ء (جلد: ۱، شمارہ: ۴۷) (محدث)

③ فتح الباري:۳/ ۴۲، ۴۳

④ صحيح البخاري، بَابُ المُدَاوَمَةِ عَلَى رَكْعَتَيِ الفَجْرِ، رقم: ۱۱۵۹

دوسری روایت میں ہے کہ پھر کچھ دیر ٹھہرتے یہاں تک کہ موذن صبح کی پہلی اذان دیتے تو آپ ﷺ دو رکعت (صبح سے پہلے کی سنت) ادا فرماتے تھے۔''

اس سے معلوم ہوا کہ حدیثِ مذکورہ بالا میں الاول، اولیٰ سے مراد صبح کی وہ اذان ہے جو فجر کا وقت شروع ہونے پر دی جاتی ہے نماز کی دعوت دینے کے لئے۔اس سے مراد ہرگز وہ اذان نہیں ہے جو وقت فجر کے داخل ہونے سے پندرہ بیس منٹ قبل دی جاتی تھی کیونکہ نبی ﷺ فجر کے داخل ہونے سے پہلے کی اذان کے بعد دو رکعت (فجر کی سنت) نہیں پڑھتے تھے اور نہ دائیں کروٹ اس کے بعد لیٹتے تھے، بلکہ یہ دوگانہ اذانِ فجر کے بعد پڑھتے تھے اور اس کے بعد دائیں کروٹ لیٹا کرتے تھے۔

چنانچہ حدیثِ عائشہؓ میں بالاولی من صلاۃ الفجر اور بلالؓ کی روایت میں و یؤذن لصلاۃ الفجر اور انسؓ والی حدیث میں التثویب فی صلاۃ الغداۃ کے الفاظ بڑی زبردست دلیل ہیں کہ اولیٰ سے مراد وہ اذان ہے جو فجر کے وقت کے داخل ہونے پر دی جاتی ہے۔لفظ ''من'' بیانیہ ہے جو اس بات کا مکمل بیان ہے کہ اذانِ اول، مناداۃِ اولیٰ سے مراد صبح کی اذان اور فجر کی اذان ہے۔اس طرح علامہ شیخ البانی رحمہ اللہ، علامہ صنعانی رحمہ اللہ اور علامہ ابن رسلان رحمہ اللہ کی دلیل مرجوح قرار پاتی ہے کہ الصلاۃ خیر من النوم نمازِ فجر کے وقت کے داخل ہونے سے پہلے کی اذان میں کہنا چاہئے۔اس طرح ان حضرات کا یہ قول شاذ سمجھا جائے اور یہ قول کہ اذانِ فجر میں الصلاۃ خیر من النوم کہنا بدعت ہے، اس سے بھی زیادہ شاذ اور عجیب بات ہے۔

یاد رہے کہ اذان کا اطلاق، اقامت و تکبیر کے لئے متعدد احادیث میں ثابت ہے۔ چنانچہ حضرت عبداللہ بن مغفل رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں:

« قال النبی ﷺ : بَيْنَ كُلِّ أَذَانَيْنِ صَلَاةٌ، بَيْنَ كُلِّ أَذَانَيْنِ صَلَاةٌ، ثُمَّ قَالَ فِي الثَّالِثَةِ: لِمَنْ شَاءَ» [1]

''ارشادِ نبوی ﷺ ہے کہ دو اذانوں کے درمیان نماز (نفل) مشروع و مسنون ہے۔ پھر تیسری بار فرمایا کہ یہ مستحب ہے جو چاہے پڑھ لے اور جو نہ پڑھے، کوئی حرج کی بات نہیں۔''

اس طرح حضرت عائشہؓ والی سابقہ حدیث میں ''ورکعتین بین النداۃین'' [2] اور دونوں اذانوں

---

[1] متفق علیه، صحیح البخاری، بَابٌ: بَيْنَ كُلِّ أَذَانَيْنِ صَلَاةٌ لِمَنْ شَاءَ، رقم: ٦٢٧

[2] صحیح البخاری، بَابُ الْمُدَاوَمَةِ عَلَى رَكْعَتَيِ الْفَجْرِ، رقم: ١١٥٩

کے درمیان دو رکعت (صبح کی سنت) ادا فرماتے تھے، سے مراد متفقہ طور پر دو اذانوں سے مراد اذان اور اقامت ہے۔اس میں کسی کا کوئی قابل ذکر اختلاف موجود نہیں ہے۔

علامہ خطابی رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں:

«اراد بالاذانين:الاذان والإ قامة حمل احد الاسمين على الاخر كقولهم الاسودان:التمر والماء إنما الاسود احدهما، وكقولهم سيرة العمرين، يريدون ابابكرؓ وعمر ويحتمل ان يكون الاسم لكل واحد منها حقيقة، لان الاذان في اللغة الإعلام، فالاذان إعلام بحضور الوقت، والإقامة اذان بفعل الصلاة »①

''اذانین سے مراد اذان اور اقامت ہے۔ دونوں کو''اذانین''اس لئے کہا جاتا ہے کہ ایک کو دوسرے پر محمول کر دیا گیا ہے۔جس طرح کھجور اور پانی دونوں پر''اسودین'' کا لفظ بول دیا جاتا ہے حالانکہ اسود (سیاہ) ان میں سے صرف ایک ہے۔ اسی طرح سیرتِ عمرین سے ابوبکرؓ اور عمر رضی اللہ عنہ کی سیرت مراد ہوتی ہے۔ یہ بھی احتمال ہے کہ اذان اور اقامت دونوں کے لئے حقیقی طور پر یہ لفظ''اذانین''بولا گیا ہو کیونکہ اذن کا لغوی معنی اطلاع دینا ہے۔لہٰذا اذان (نماز کا) وقت ہو جانے کی اطلاع ہے اور اقامت نماز (کھڑی ہونے) کے وقت کی اطلاع ہے۔''

امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:''المراد بالاذانين:الاذان والإقامة''②

''اذانین سے مراد اذان اور اقامت ہے۔''

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں:

« اى اذان و إقامة وتوارد الشراح على ان هذا من باب التغليب كقولهم القمرين للشمس والقمرويحتمل ان يكون اطلق على الإقامة اذان لانها إعلام بحضور فعل الصلاة، كما ان الاذان إعلام بدخول الوقت»③

''جس طرح چاند سورج دونوں کے لئے قمرین (دو چاند) غالباً کہہ دیا جاتا ہے۔اسی طرح اذان واقامت کے لئے بھی اذانین (دو اذانیں) استعمال ہو گیا ہے اور اقامت پر اذان کا اطلاق اس

① معالم السنن و شرح السنة للبغوى
② شرح مسلم:١/ ٢٧٨
③ فتح البارى:٢/١٠٧

طرح درست ہے کہ وہ عمل نماز کے شروع ہونے کی اطلاع ہوتی ہے، جس طرح اذان، نماز کے وقت کے داخل ہوجانے کی اطلاع ہوتی ہے۔''

سنن نسائی پر عربی حاشیہ علامہ شیخ عطاء اللہ بھوجیانی رحمہ اللہ نے تحریر فرمایا ہے، جس میں انہوں نے بھی مختلف فیہ حدیث ابی محذورہ رضی اللہ عنہ میں اذانِ اول سے مراد فجر کے داخل ہوجانے پر صبح کی جو اذان دی جاتی ہے، وہی مراد لی ہے۔ واللہ سبحانہ اعلم

مزید تفصیل کے لئے علامہ شیخ عبدالعزیز نورستانی کی کتاب الإعلان مطالعہ فرمائیں۔

(جواب) الجواب بعون الوھاب (از حافظ ثناء اللہ مدنی حفظہ اللہ)

اصل بات یہ ہے کہ صبح کی ایک اذان دینے کی صورت میں کلمہ الصلاۃ خیر من النوم اسی اذان میں کہنے کے بارے میں ہی وارد ہوا ہے، مطلق احادیث میں اسی بات کا بیان ہے۔ اختلاف اس صورت میں ہے کہ صبح کی دو اذانوں کی صورت میں یہ کلمہ کون سی اذان میں کہا جائے؟ صحیفہ اہلحدیث کراچی کے مفتیانِ کرام نے اپنے دعویٰ کے اثبات میں جتنے دلائل پیش کئے ہیں، وہ سب عمومی ہیں، ان سے مدعا ثابت نہیں ہوتا۔ محل نزاع میں بطورِ نص روایت مطلوب ہے جو یہاں مفقود ہے۔ پھر ان حضراتِ اہل علم وفضل نے سارا زور اس بات پر صرف کیا ہے کہ پہلی اذان سحری کی اذان ہے حالانکہ کسی روایت میں سحری کی اذان کے سرے سے الفاظ ہی نہیں۔ [1]

امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی صحیح میں بلالی اذان پر بایں الفاظ تبویب قائم کی ہے: باب الاذان قبل الفجر یعنی فجر سے پہلے اذان کا کیا حکم ہے، مسنون ہے یا غیر مسنون؟ مشروعیت کی صورت میں یہ دوسری اذان سے کفایت کرسکتی ہے یا نہیں؟ (فتح الباری: ۲/۱۰۴)

ائمہ کرام کا بھی اس بارے میں اختلاف ہے کہ (وقتِ فجر سے قبل) پہلی اذان دوسری اذان کی جگہ کافی ہوسکتی

---

(1) سحری کی اذان کے عوامی الفاظ برصغیر پاک و ہند کے عوام میں مشہور ہو گئے ہیں جو غلط فہمی کا باعث بن رہے ہیں ورنہ شرع میں سحری کھانے کے لیے مسنون کلمات اذان کا استعمال نہ کہیں احادیث میں آیا ہے اور نہ ہی یہ معقول امر ہے کیونکہ اگر بارش کی وجہ سے نماز باجماعت مشکل ہو رہی ہو تو کلماتِ اذان میں بھی تبدیلی کر دی جاتی ہے۔ کہا جاتا ہے آلا صلّوا فی الرّحال یعنی نماز باجماعت کے لیے آنے کی بجائے اپنے ڈیروں پر ہی نماز ادا کر لی جائے۔ مراد یہ ہے کہ شریعت مقاصد کے مطابق ہی بلاتی ہے۔ یہ نہیں ہوتا کہ مقصد تو سحری کھلانا ہو لیکن دہائی حی علی الصلوٰۃ (نماز کی طرف آؤ) کی جائے۔ (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو ماہنامہ محدث، لاہور مجریہ، نومبر۱۹۷۱ء، رمضان ۱۳۹۱ھ، جلد:۱، عدد:۱۲)

ہے یا نہیں؟ اگر یہ اذان سحری یا تہجد کی ہے جس طرح کہ موصوفین کا زعم ہے تو پھر اس اختلاف کا کیا مطلب؟

دراصل اس اذان کا تعلق بھی من وجہ فجر سے ہے، اس لئے ائمہ میں اختلاف پیدا ہو گیا۔ پھر ان حضرات کا یہ دعویٰ کہ صبح صادق کی اذان زیادہ تر حضرت بلالؓ ہی دیا کرتے تھے۔ بلادلیل اور نصوصِ صحیحہ کے خلاف ہے۔ مفتی صحیفہ نے حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کی متعارض روایات میں بعض احتمالی توجیہات کا سہارا لے کر یہ نتیجہ اخذ کیا گیا ہے اور حافظ موصوف کی فیصلہ کن بات جو ان کے مخالف تھی، اس کو چھوڑ دیا ہے۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں:

« ثم فی أخرالامراخر ابن امّ مکتوم لضعفه ووکل به من یراعی الفجر واستقر اذان بلال بلیل » ①

''پھر آخری امر میں رسول اللہ ﷺ نے ابن امّ مکتوم کی اذان کو ان کے ضعف کی وجہ سے موخر کردیا اور ان کے ساتھ نگہبان مقرر کردیا جو ان کو طلوعِ فجر سے آگاہ کرے اور بلالؓ کی اذان مستقل طور پر رات کو مقرر ہو گئی۔''

عون المعبود (۱/۲۱۰) میں ہے:

« فإن الثابت عن بلال انه کان فی أخر ایام رسول الله صلی الله علیه وسلم یوذن بلیل ثم یوذن بعده ابن امّ مکتوم مع الفجر »

یعنی ''حضرت بلال رضی اللہ عنہ سے یہ بات ثابت ہے کہ نبی ﷺ کی زندگی کے اخیر میں وہ رات کو اذان دے دیتے تھے پھر ان کے بعد ابن امّ مکتوم فجر کی اذان دیا کرتے تھے۔''

نبی ﷺ سے ثابت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

« إِنَّ بِلَالًا يُؤَذِّنُ بِلَيْلٍ، فَكُلُوا وَاشْرَبُوا حَتَّى يُنَادِيَ ابْنُ أُمِّ مَكْتُومٍ » ②

''بلال رات کو اذان دیتا ہے پس تم کھاتے پیتے رہو یہاں تک کہ ابن اُمّ مکتوم اذان دے۔''

واضح ہو کہ شرع میں کھانے پینے کے لئے کسی اذان کا کوئی وجود نہیں، بلالی اذان میں کھانے پینے کا لفظ محض اشتباہ دور کرنے کے لئے استعمال ہوا ہے کہ یہ اذان کھانے پینے سے روکنے والی نہیں بلکہ وہ ابن امّ مکتوم کی اذان ہے۔ اس پر بیہقی نے یوں باب قائم کیا ہے:

« باب اذان الاعمی إذا اذن بصیر قبله او اخبره لوقت »

---

① فتح الباری :۲/۱۰۳

② صحیح البخاری،بَابُ الأَذَانِ بَعْدَ الفَجْرِ،رقم: ٦٢٠

محل بحث میں نصوصِ صریحہ واضحہ کو ترک کر کے عمومات سے استناد لینا ماہرین کے قواعد وضوابط کے خلاف ہے اور بلاوجہ تاویلات کا دروازہ کھولنا ایک غلط انداز ہے۔ ہاں البتہ اقتضائی صورت میں اس کا کوئی حرج نہیں کہ اذان کا اطلاق تکبیر پر ہو۔ تاہم مقامِ گفتگو میں اس کی کوئی گنجائش نہیں کیونکہ شرع میں فجر کی مستقلاً دو اذانیں ہیں جبکہ دوسری طرف متعدد روایات میں پہلی اذان کی تصریح بھی موجود ہے۔ چنانچہ سبل السلام (۴٦/۲) میں بحوالہ نسائی ہے: الصلاة خير من النوم، الصلاة خير من النوم في الاذان الاولى من الصبح اس سے مطلق روایات مقید ہوجاتی ہیں۔

ابن رسلان نے کہا کہ اس روایت کو ابن خزیمہ نے صحیح کہا ہے۔ تثویب (الصلوة خير من النوم) فجر کی پہلی اذان میں ہے کیونکہ یہ سونے والے کو بیدار کرنے کے لئے ہے۔ دوسری اذان نماز کے دخولِ وقت کا اعلان اور نماز کی طرف دعوت کے لئے ہے۔ اور نسائی کی سنن کبریٰ (اور صغریٰ) میں ابومحذورہ کا بیان ہے:

« كُنْتُ أُؤَذِّنُ لِرَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَكُنْتُ أَقُولُ فِي أَذَانِ الْفَجْرِ الْأَوَّلِ: حَيَّ عَلَى الْفَلَاحِ .الصَّلَاةُ خَيْرٌ مِنَ النَّوْمِ .الصَّلَاةُ خَيْرٌ مِنَ النَّوْمِ.»[1]

ابن حزم نے کہا کہ اس کی سند صحیح ہے۔ علامہ البانی نے بھی اس پر صحت کا حکم لگایا ہے اور صحیح ابی داود میں جملہ طرق اور شواہد کی بنا پر اس کو صحیح قرار دیا ہے یہ کتاب چند ماہ قبل کویت سے پہلی مرتبہ طبع ہوئی ہے۔ بلا تحقیق حدیثِ ہذا کو ضعیف قرار دینا درست نہیں۔

اس طرح سنن کبریٰ بیہقی میں ابومحذورہ کی حدیث میں ہے: انه كان يثوب في الاذان الاول من الصبح بامره ﷺ ''ابومحذورہ صبح کی پہلی اذان میں نبی ﷺ کے حکم سے الصلاة خير من النوم کہا کرتے تھے۔

مشکوٰۃ میں بحوالہ ابوادود الفاظ یوں ہیں: فإن كان صلاة الصبح قلت الصلاة خير من النوم اگر صبح کی نماز ہو تو الصلاۃ خیر من النوم کہا کرو۔ حواشی مشکوٰۃ میں اس پر علامہ البانی رقم طراز ہیں:

وذلك في الاذان الاول للصبح كما في رواية اخرى لابي داود

''یہ کلمہ صبح کی پہلی اذان میں کہا جائے گا جس طرح کہ ابوداؤد کی دوسری روایت میں ہے۔''

(حدیث رقم:٦۴۳)

---

① سنن النسائی، التَّثْوِيبُ فِي أَذَانِ الْفَجْرِ، رقم: ٦٤٧

نیز حدیث ابومحذورہ میں ہے:

« أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ عَلَّمَهُ فِي الأَذَانِ مِنَ الصُّبحِ، الصَّلَاةُ خَيرٌ مِنَ النَّوم »[1]

''نبی ﷺ نے ابومحذورہ کو تعلیم دی کہ صبح کی پہلی اذان میں الصلاۃ خیر من النوم کہا کرے۔''

اور ابن عمر کی روایت میں ہے:

« كَانَ فِي الْأَذَانِ الْاَوَّلِ بَعدَ الفَلَاحِ ، اَلصَّلٰوةُ خَيرٌ مِّنَ النَّومِ مَرَّتَينِ »[2]

''پہلی اذان میں حی علی الفلاح کے بعد الصلاۃ خیر من النوم کہا جاتا تھا۔''

مذکورہ جملہ دلائل میں اس امر کی تصریح ہے کہ الصلاۃ خیر من النوم صبح کی پہلی اذان میں کہا جائے۔ باقی رہا یہ مسئلہ کہ جہاں صبح کی پہلی اذان کا اہتمام نہ ہو، وہاں یہ کلمہ دوسری اذان میں کہا جائے، اس صورت میں عمومی احادیث پر عمل ہوگا اور یہ فعل "إحداث فی الاذان" کے زمرہ میں داخل نہیں ہوگا اور کلمہ الصلاۃ خیر من النوم بھی اس بات کا متقاضی ہے۔ دونوں اذانوں میں قدرِ مشترک چونکہ صبح کی نماز کے لئے بیدار کرنا ہے سو وہ حاصل ہے اور اس لئے بھی کہ اصل دوسری اذان ہے پہلی کا اضافہ مخصوص اغراض کے پیش نظر ہوا۔ اسی اصلی ترتیب کی بنا پر امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی صحیح میں باب الاذان بعد الفجر کا عنوان پہلے قائم کیا ہے۔ پھر باب الاذان قبل الفجر کی تبویب ذکر کی ہے۔

یہ اس طرح سمجھیں کہ مسافر پر جمعہ نہیں، اگر وہ مقامی لوگوں کے ساتھ مل کر پڑھنا چاہے تو اس کی اجازت ہے اور جمعہ فوت ہونے کی صورت میں ظہر بہر صورت پڑھنی پڑتی ہے، اس طرح کلمہ الصلاۃ خیر النوم پہلی اذان کے عدم کی صورت میں دوسری اذان کی طرف منتقل ہو جائے گا--- تاہم جن اصحابِ علم کا نکتہ نظر یہ ہے کہ یہ حکم پہلی اذان کے ساتھ ہی مخصوص ہے خواہ فجر کی ایک اذان ہی کہی جائے۔ مذکورہ علل اور وجوہات کی بنا پر میرے نزدیک یہ مسلک مرجوح ہے۔

آخر میں محترم ڈاکٹر صاحب کو میرا مشورہ ہے جب کسی مسئلہ میں بحث کی صورت میں طوالت نظر آئے تو بذاتِ خود موضوع سے متعلقہ کتابوں کا مطالعہ کریں۔ اور اشکالات کی صورت میں پختہ کار علما سے رہنمائی حاصل کرنی چاہیے۔

سوال کیا کوئی شخص بیت الخلا سے نکل کر بغیر وضو اذان دے سکتا ہے۔ قرآن وسنت سے رہنمائی فرمائیے۔

---

[1] شرح المعانی الآثار للطحاوی، بَابُ قَولِ المُؤَذِّنِ فِي أَذَانِ الصُّبحِ الصَّلَاةُ خَيرٌ مِنَ النَّومِ ......الخ، رقم: ٨٤٠، السنن الکبریٰ للبیهقی، بَابُ التَّثوِيبِ فِي أَذَانِ الصُّبحِ، رقم: ١٩٧٩

[2] السنن الکبریٰ للبیهقی، بَابُ التَّثوِيبِ فِي أَذَانِ الصُّبحِ، رقم: ١٩٨٦، شرح مشکل الآثار، رقم: ٦٠٨٢

کیا رسول ﷺ یا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے بھی ایسا کیا؟ (میاں عبدالحق مقصود)

جواب حدیث میں ہے: « كَانَ النَّبِيُّ ﷺ يَذْكُرُ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ أَحْيَانِهِ » [1]

یعنی ''نبی اکرم ﷺ ہر وقت اللہ کا ذکر کرتے تھے یعنی خواہ بے وضو ہوتے یا وضو سے''

اور جس حدیث میں ہے کہ اذان باوضو ہونی چاہئے، وہ ضعیف ہے۔ (إرواء الغلیل :۱/ ۲۴۰)

کیا اَلصَّلٰوةُ خَيرٌ مِّنَ النَّومِ فجر کی پہلی اذان میں کہا جائے گا یا دوسری میں؟

سوال: کیا «اَلصَّلٰوةُ خَيرٌ مِّنَ النَّومِ» فجر کی پہلی اذان میں کہا جائے گا یا دوسری میں؟ ہمارے ہاں فجر کی اذان میں یہ کلمات کہے جاتے ہیں۔ اصل مسئلہ کیا ہے؟

جواب: «اَلصَّلٰوةُ خَيرٌ مِّنَ النَّومِ» کا تعلق فجر کی پہلی اذان سے ہے۔ چنانچہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث میں ہے:

« كَانَ فِي الْأَذَانِ الْاَوَّلِ بَعدَ الفَلَاحِ ، اَلصَّلٰوةُ خَيرٌ مِّنَ النَّومِ مَرَّتَينِ » [2]

''پہلی اذان میں «حَيَّ عَلَى الفَلَاحِ» کے بعد دو مرتبہ «اَلصَّلٰوةُ خَيرٌ مِّنَ النَّومِ» کہا جاتا تھا۔''

''شرح المعانی الآثار للطحاوی'' (ج:۱،ص:۸۲،رقم:۸۴۰) میں ہے کہ اس کی سند حسن ہے۔

ابوداؤد اور نسائی وغیرہ میں ہے:

« وَ اِذَا أَذَّنتَ بِالاَوَّلِ مِنَ الصُّبحِ فَقُل: اَلصَّلٰوةُ خَيرٌ مِنَ النَّومِ. اَلصَّلٰوةُ خَيرٌ مِّنَ النَّومِ. اَلصَّلٰوةُ خَيرٌ مِّنَ النَّومِ. »

''جب تم فجر کی پہلی اذان کہو، تو کہو: «اَلصَّلٰوةُ خَيرٌ مِّنَ النَّومِ»۔''

تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو! تمام المنة ، ص:١٤٦۔١٤٧۔

یاد رہے کہ پہلی اذان، دوسری اذان سے تقریباً پندرہ بیس منٹ پہلے ہونی چاہیے۔ زیادہ نہیں۔ شریعت میں تہجد یا سحری کی اذان ثابت نہیں۔ صبح کی پہلی اذان کا تعلق بھی من وجہ فجر سے ہے۔

اَلصَّلٰوةُ خَيرٌ مِّنَ النَّومِ کے الفاظ اذان میں کب شامل کیے گئے؟

سوال: ''اَلصَّلٰوةُ خَيرٌ مِّنَ النَّومِ'' کے الفاظ اذان میں کب شامل کیے گئے۔ کیا نبی کریم ﷺ کی

---

[1] صحيح مسلم،بَابُ ذِكرِ اللهِ تَعَالَى فِي حَالِ الجَنَابَةِ وَغَيرِهَا ،رقم:٣٧٣، بحواله فتح البارى:١/ ٤٠٨، سنن ابن ماجه،رقم:٣٠٢

[2] السنن الكبرىٰ للبيهقى،بَابُ التَّثْوِيبِ فِي أَذَانِ الصُّبحِ، رقم:١٩٨٦،شرح مشكل الآثار، رقم:٦٠٨٢

زندگی میں یہ الفاظ اذان میں شامل تھے۔

جواب: "الصَّلٰوۃ خَیرٌ مِن النَّوم" کو بذاتِ خود رسول اللہ ﷺ نے اذان میں شامل کیا تھا۔ ابومحذورہ رضی اللہ عنہ کو اذان کی تعلیم کے دوران فرمایا:

«فَإِن کَانَت صَلٰوۃُ الصُّبحِ قُلتَ: اَلصَّلٰوۃُ خَیرٌ مِّنَ النَّومِ. اَلصَّلٰوۃُ خَیرٌ مِّنَ النَّومِ.» ①

کیا تہجد کی اذان کا تعلق خاص رمضان سے ہے؟

سوال: اَلصَّلٰوۃُ خَیرٌ مِنَ النَّومِ کس اذان میں کہنا چاہیے؟ نیز کیا تہجد کی اذان کا تعلق خاص رمضان سے ہے؟

جواب: جہاں صبح کی دو اذانوں کا اہتمام ہو۔ وہاں پہلی اذان میں اَلصَّلٰوۃُ خَیرٌ مِنَ النَّومِ کہا جائے، اور ایک کی صورت میں ظاہر ہے کہ موجود اذان میں کہا جائے گا۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے:

« کَانَ فِی اَلأَذَانِ اَلأَوَّلِ مِنَ الصُّبحِ ، الصَّلَاۃُ خَیرٌ مِنَ النَّومِ.» ②

حضرت ابومحذورۃ رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے:

« أَنَّ النَّبِیَّ ﷺ عَلَّمَهُ فِی الأَذَانِ مِنَ الصُّبحِ، الصَّلَاۃُ خَیرٌ مِنَ النَّومِ » ③

ان روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ "اَلصَّلٰوۃُ خَیرٌ مِنَ النَّومِ" صبح کی پہلی اذان میں کہا جائے گا۔

صبح کی پہلی اذان کا تعلق صرف رمضان سے نہیں، کیونکہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم رمضان کے علاوہ بھی کثرت سے نفلی روزے رکھا کرتے تھے۔ اذانِ بلالی میں « فَکُلُوا وَاشرَبُوا» کے الفاظ محض یہ اشتباہ (شبہ) دور کرنے کے لیے ہیں، کہ بلالی اذان سے کھانا پینا حرام نہیں ہوتا۔ ملاحظہ ہو! مرعاۃ المفاتیح (١/ ٤٤٤)

اذانِ تہجد اور صفیں سیدھی کرنا

سوال درج ذیل سوالات پر آپ کی رہنمائی درکار ہے۔ (نذیر احمد، جامعہ ابی بکر، کراچی)

١۔ تہجد اور فجر کی اذان کا وقفہ کتنا ہونا چاہیے؟

٢۔ الصلاۃ خیر من النوم کس اذان میں کہنا چاہیے؟

٣۔ کیا تہجد کی اذان کا تعلق خاص رمضان سے ہے؟

---

① سنن أبی داود، باب کیف الاذان، رقم: ٥٠٠

② السنن الکبریٰ للبیهقی، بَابُ التَّثوِیبِ فِی أَذَانِ الصُّبحِ، رقم: ١٩٨٦، شرح مشکل الآثار، رقم: ٦٠٨٢

③ شرح المعانی الآثار للطحاوی، بَابُ قَولِ المُؤَذِّنِ فِی أَذَانِ الصُّبحِ الصَّلَاۃُ خَیرٌ مِنَ النَّومِ ......الخ، رقم: ٨٤٠، السنن الکبریٰ للبیهقی، بَابُ التَّثوِیبِ فِی أَذَانِ الصُّبحِ، رقم: ١٩٧٩

۴۔ صفیں درست کرانے کے لئے امام کے کیا فرائض ہیں؟

۵۔ جماعت میں کیا بچوں کے لئے علیحدہ صف بنانا چاہیے؟

۶۔ مقتدی اگر امام سے تقدیم کریں تو ان کے لئے کیا وعید ہے؟

۷۔ جہر نمازوں میں کم از کم اور زیادہ سے زیادہ کتنی آیات تلاوت کی جاسکتی ہیں؟

جواب ۱۔شرع میں تہجد کی اذان کا ثبوت نہیں۔ نبی ﷺ رات کے مختلف اوقات میں تہجد پڑھتے تھے۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

«وَكَانَ لَا تَشَاءُ أَنْ تَرَاهُ مِنَ اللَّيْلِ مُصَلِّيًا إِلَّا رَأَيْتَهُ، وَلَا نَائِمًا إِلَّا رَأَيْتَهُ» [1]

"اگر تم رات کو رسول اللہ ﷺ کو نماز پڑھتے دیکھنا چاہتے تو دیکھ سکتے ہو اور اگر سویا ہوا دیکھنا چاہتے تو دیکھ سکتے ہو۔"

اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے: «مَا أَلْفَاهُ السَّحَرُ عِنْدِي إِلَّا نَائِمًا تَعْنِي النَّبِيَّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ» "میرے پاس تو سحر کے وقت آنحضرت ﷺ سوئے ہی رہے۔" [2]

یہ احادیث اس امر کا واضح ثبوت ہیں کہ نماز تہجد کا وقت متعین نہیں اس سے معلوم ہوا کہ تہجد کے لئے اذان بھی نہیں اور جہاں تک بلالی اذان کا تعلق ہے سو حدیث میں اس کے دو مقصد بیان ہوئے ہیں۔تہجد گزار تہجد ختم کردیں لیرجع قائمکم اور سوئے ہوئے بیدار ہوجائیں (ولینبه نائمکم)۔ [3]

اسکے علاوہ تیسرا کوئی مقصد نہیں۔دونوں اذانوں میں وقفہ کے بارے میں نسائی میں ہے:

« وَلَمْ يَكُنْ بَيْنَهُمَا إِلَّا أَنْ يَنْزِلَ هَذَا وَيَصْعَدَ هَذَا » [4]

یعنی "دونوں صرف اتنا ہی وقفہ ہوتا کہ ایک اترتا اور دوسرا چڑھ جاتا---"

مراد بہت کم وقفہ ہوتا تھا۔مبالغہ پر محمول کیا جائے تو قریباً بیس پچیس منٹ۔

۲۔ جہاں صبح کی دو اذانوں کا اہتمام ہو۔ وہاں پہلی اذان میں الصلاۃ خیر من النوم کہا جائے اور ایک کی صورت میں موجودہ اذان میں۔ابن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ:

---

① صحيح البخاری،بَابُ قِيَامِ النَّبِيِّ ﷺ بِاللَّيْلِ مِنْ نَوْمِهِ، وَمَا نُسِخَ مِنْ قِيَامِ اللَّيْلِ،رقم:۱۱۴۱

② صحيح البخاری:باب من نام عندالسحررقم :۱۱۳۳

③ صحيح البخاری باب الاذان قبل الفجر رقم:۶۲۱

④ سنن النسائی، هَلْ يُؤَذِّنَانِ جَمِيعًا أَوْ فُرَادَى، رقم:۶۳۹

« كَانَ فِي الْأَذَانِ الْأَوَّلِ مِنَ الصُّبحِ ، الصَّلَاةُ خَيرٌ مِنَ النَّومِ.»[1]

اور ابو محذورہ کی روایت میں ہے:

« أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ عَلَّمَهُ فِي الأَذَانِ مِنَ الصُّبحِ ، الصَّلَاةُ خَيرٌ مِنَ النَّومِ »[2]

۳۔ نیز صبح کی پہلی اذان کا تعلق صرف رمضان سے نہیں، کیونکہ صحابہ کرامؓ رمضان کے علاوہ بھی کثرت سے نفلی روزے رکھا کرتے تھے۔ اذانِ بلالی میں فَكُلُوْا وَاشْرَبُوْا کے الفاظ محض اشتباہ دور کرنے کے لئے ہیں کہ بلالی اذان سے کھانا پینا حرام نہیں ہوتا۔ (ملاحظہ ہو مرعاۃ المفاتیح: ۱/۲۸۱،۱/۴۴۴)

۴۔ امام کا فرض ہے کہ وہ خود نمازیوں کی صفیں سیدھی کرے، یہاں تک کہ نمازی صف بندی سیکھ جائیں۔ حضرت نعمان بن بشیرؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ ہماری صفیں برابر کیا کرتے تھے حتیٰ کہ ایسا معلوم ہوتا کہ آپ ان سے تیر کی لکڑی برابر فرمارہے ہیں اور یہ سلسلہ جاری رہا تاوقتیکہ آپ ﷺ نے سمجھا کہ ہم لوگ آپ ﷺ سے سیکھ چکے ہیں۔ پھر ایک روز آپ ﷺ نکلے اور تکبیر کہنے ہی والے تھے کہ ایک آدمی کا سینہ صف سے نکلا ہوا دیکھا تو آپ ﷺ نے فرمایا: اے اللہ کے بندو! تم اپنی صفوں کو ضرور سیدھا کرلیا کرو ورنہ اللہ تمہارے درمیان مخالفت ڈال دے گا۔[3] نیز صفوں کی درستگی کے لئے امام کو جماعت کی طرف چہرہ کرنا چاہیے۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک بار نماز کی اقامت ہوگئی تھی کہ رسول اللہ ﷺ نے چہرہ ہماری طرف کرکے فرمایا: ''تم لوگ اپنی صفوں کو درست کرو اور مل کر کھڑے ہو جاؤ میں تمہیں اپنی پیٹھ پیچھے سے بھی دیکھتا ہوں۔''[4]

اور صفوں کی درستگی کے لئے امام کسی اور کو بھی مقرر کرسکتا ہے۔ چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ لوگوں کو صفیں برابر کرنے کا حکم دے دیتے تھے اور جب لوگ لوٹ کر خبر دیتے کہ صفیں برابر ہوگئیں ہیں اس وقت تکبیر کہتے۔[5]

---

① السنن الكبرىٰ للبيهقي، بَابُ التَّثْوِيبِ فِي أَذَانِ الصُّبحِ، رقم: ۱۹۸۶، شرح مشكل الآثار، رقم: ۶۰۸۲

② شرح المعاني الآثار للطحاوي، بَابُ قَولِ المُؤَذِّنِ فِي أَذَانِ الصُّبحِ الصَّلَاةُ خَيرٌ مِنَ النَّومِ ......الخ، رقم: ۸۴۰، السنن الكبرىٰ للبيهقي، بَابُ التَّثْوِيبِ فِي أَذَانِ الصُّبحِ، رقم: ۱۹۷۹

③ صحيح مسلم، بَابُ تَسْوِيَةِ الصُّفُوفِ، وَإِقَامَتِهَا، وَفَضْلِ الْأَوَّلِ ......الخ، رقم: ۴۳۶

④ صحيح البخاري، بَابُ إِقْبَالِ الإِمَامِ عَلَى النَّاسِ، عِنْدَ تَسْوِيَةِ الصُّفُوفِ، رقم: ۷۱۹

⑤ الموطأ إمام مالك: كتاب قصر الصلوة في السفر، باب ما جاء في التسوية الصفوف، رقم: ۵۴۲

راوی بیان کرتا ہے کہ میں عثمان بن عفان کے ساتھ تھا کہ نماز کے لئے تکبیر ہوئی اور میں ان سے اپنے لئے وظیفہ مقرر کرنے کے متعلق بات کرتا رہا وہ اپنے جوتوں سے کنکریاں برابر کرتے رہے یہاں تک کہ مقرر کردہ لوگوں نے آکر صفوں کے برابر ہونے کی خبر دی تو حضرت عثمانؓ نے مجھے کہا: صف میں صحیح طور پر کھڑا ہو جا، پھر آپ نے تکبیر تحریمہ کہی۔[1]

۵۔ بچوں کے لیے علیحدہ صف بندی کی ضرورت نہیں، بڑوں کے ساتھ کھڑے ہو سکتے ہیں۔ منیٰ میں ابن عباس رضی اللہ عنہما بڑوں کی صف میں شامل ہوتے تھے۔ فرمایا: « وَدَخَلْتُ فِي الصَّفِّ، فَلَمْ يُنْكِرْ ذٰلِكَ عَلَيَّ أَحَدٌ. » ''میں صف میں داخل ہوا، پس مجھ پر کسی نے اعتراض نہیں کیا۔''[2]

نمازِ تہجد میں رسول اللہ ﷺ نے ابن عباسؓ جو ابھی بچے تھے، کو اپنے ساتھ کھڑا کیا تھا اور حضرت انس رضی اللہ عنہ کا بیان ہے:

« فَقَامَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ، وَالْيَتِيمُ مَعِيَ ، وَالْعَجُوزُ مِنْ وَرَائِنَا ، فَصَلَّى بِنَا رَكْعَتَيْنِ »[3]

۶۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: امام سے پہلے سر اٹھانے والے کو (کیا) اس بات سے ڈر نہیں لگتا ہے کہ اللہ اس کا سر کہیں گدھے کے سر سے نہ بدل دے۔[4]

اس سے معلوم ہوا امام سے سبقت کرنا سخت وعید کا باعث ہے۔

۷۔ فاتحہ کے علاوہ آدمی کو اختیار ہے نماز میں جتنی آیات چاہے تلاوت کرسکتا ہے اور اگر نہ بھی ملائے تب بھی نماز درست ہے۔

سحری کی اذان مستقل دینا جائز ہے؟

سوال: آج کل سحری کی اذان اہلِ حدیث کی مسجدوں میں ہمیشہ دینے کا جو رواج ہو گیا ہے۔ کیا یہ جائز ہے؟

جواب: فجر کی پہلی اذان ہمیشہ دینی جائز ہے۔ اس لیے کہ حدیث میں بلالی اذان کی عِلّت «لِيُوقِظَ

---

[1] الموطأ إمام مالك: كتاب قصر الصلوة فى السفر، باب ما جاء فى التسوية الصفوف، رقم: ٥٤٣

[2] صحيح البخارى، بَابُ سُتْرَةُ الإِمَامِ سُتْرَةُ مَنْ خَلْفَهُ، رقم: ٤٩٣

[3] صحيح البخارى، باب وضوء الصبيان ...... الخ، رقم: ٨٦٠

[4] صحيح البخارى، بَابُ إِثْمِ مَنْ رَفَعَ رَأْسَهُ قَبْلَ الإِمَامِ، رقم: ٦٩١

نَائِمُکُم وَ یُرجِعَ قَائِمُکُم» [1] (یعنی سوئے کو جگائے اور تہجد پڑھنے والا فارغ ہوجائے) بیان ہوئی ہے، جس کا تعلق پورے سال سے ہے۔ البتہ یہ سحری کے وقت میں ہے۔ سحری کے لیے نہیں۔ مقاصد کی نشاندہی پہلے ہوچکی ہے۔

دونوں اذانوں کا درمیانی وقفہ بھی تھوڑا ہونا چاہیے، پہلی فجرِ کاذب میں۔ دوسری فجرِ صادق میں۔

سحری کی اذان کا کتاب وسنت میں کوئی ثبوت ہے؟

سوال: رمضان المبارک کے علاوہ بعض لوگ گیارہ مہینوں میں سحری کی اذان دیتے ہیں۔ کوئی اسے نفلوں کی اذان بھی کہتا ہے۔ اُس اذان میں تثویب "الصَّلٰوۃُ خَیرٌ مِنَ النَّوم" بھی نہیں کہتے۔ کیا اس اذان کا کتاب وسنت میں کوئی ثبوت ہے؟

جواب: صبح کی دو اذانیں صحیح احادیث سے ثابت ہیں۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی ''صحیح'' میں دونوں اذانوں پر بایں الفاظ ابواب منعقد کیے ہیں۔ "بَاب الأَذان بعدَ الفجر" طلوعِ فجر کے بعد اذان کہنے کا بیان اور ''بَابُ الأَذَانِ قَبلَ الفَجرِ'' یعنی طلوعِ فجر سے قبل اذان کہنے کا بیان۔

پھر مصنف نے ہر تبویب کے تحت تین تین احادیث بیان کی ہیں۔ جن کے ایراد (ذکر کرنے) سے مدعیٰ کا اثبات مقصود ہے۔

نیز نسائی اور طحاوی رحمہما اللہ کی روایات میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے ان اذانوں کا درمیانی فاصلہ اس طرح منقول ہے: « وَ لَم یَکُن بَینَھُمَا اِلَّا اَن یَّنزِلَ ھٰذَا وَ یَصعَدَ ھٰذَا» یعنی ان دونوں اذانوں کے درمیان وقفہ صرف اتنا سا ہوتا کہ ایک اذان دے کر اُترتا اور دوسرا اذان کے لیے چڑھ جاتا۔

اگرچہ اس روایت میں مبالغہ ہے، لیکن اس مبالغہ کا مقصد درمیانی وقفہ کا تھوڑا ہونا ہے۔ طحاوی کی دوسری روایت میں ہے۔ آپ نے بلال رضی اللہ عنہ سے کہا: « اِنَّكَ تُؤَذِّنُ اِذَا کَانَ الفَجرُ سَاطِعًا » یعنی تو اس وقت اذان کہتا ہے جب کہ فجر چڑھنے والی ہوتی ہے۔ یعنی فجرِ کاذب کے وقت میں۔

فجرِ کاذب اور صادق میں فرق یہ ہے، کہ صادق وہ ہے جو چوڑائی میں چڑھے اور دائیں بائیں کناروں میں پھیل جائے، بخلاف کاذب کے، جس کا نام عرب لوگ "ذَنَبُ السرحان" (بھیڑیے کی دم) رکھتے ہیں۔ یہ آسمان کی بالائی میں عمودی شکل میں ظاہر ہو کر نیچے اترتی ہے۔ پس پہلی اذان کا مقصد نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم

[1] السنن الکبریٰ للبیہقی، بَابُ مَن طَلَعَ الفَجرُ وَفِی فِیهِ شَیءٌ ......الخ، رقم:۸۰۲۱

کے فرمان میں حسبِ ذیل ہے۔فرمایا:

«فَإِنَّهٗ يُؤَذِّنُ أَوْ يُنَادِي بِلَيْلٍ لِيُرْجِعَ قَائِمَكُمْ وَلِيُنَبِّهَ نَائِمَكُمْ»[1]

''بلال رضی اللہ عنہ رات کے وقت اذان دیتا ہے تا کہ قیام کرنے والے (نماز تہجد پڑھنے والے) کو لوٹائے اور سوئے ہوئے کو بیدار کردے۔''

علامہ صنعانی رحمہ اللہ ''سبل السلام'' میں فرماتے ہیں:

« وَ فِيهِ شَرْعِيَّةُ الْأَذَانِ قَبْلَ الْفَجْرِ ، لَا لِمَا شُرِعَ الْأَذَانُ، فَإِنَّ الْأَذَانَ، كَمَا سَلَفَ لِلْإِعْلَامِ لِدُخُولِ الْوَقْتِ ، وَ لِدُعَاءِ السَّامِعِينَ بِحُضُورِ الصَّلٰوةِ. وَ هٰذَا الْأَذَانُ الَّذِي قَبْلَ الْفَجْرِ. قَدْ أَخْبَرَ ﷺ بِوَجْهِ شَرْعِيَّتِهٖ بِقَوْلِهٖ: لِيُرْجِعَ قَائِمَكُمْ ، وَ يُوقِظَ نَائِمَكُمْ. (رواه الجماعة إلّا الترمذى) وَ الْقَائِمُ : الَّذِي يُصَلِّي صَلَاةَ اللَّيْلِ . وَ رُجُوعُهٗ : عَوْدُهٗ إِلٰى نَوْمِهٖ ، أَوْ قُعُودُهٗ عَنْ صَلٰوتِهٖ إِذَا سَمِعَ الْأَذَانَ. فَلَيْسَ لِلْإِعْلَامِ بِدُخُولِ الْوَقْتِ ، وَ لَا بِحُضُورِ الصَّلَاةِ »[2]

یعنی ''حدیث ابن عمر رضی اللہ عنہما میں فجر سے پہلے اذان کہنے کا ثبوت ہے، مگر یہ اذان اس لیے نہیں جو اس کی اصل غرض ہے۔ کیونکہ اصل مقصد اذان سے نماز کے وقت کا اعلان اور سامعین کو نماز میں شرکت کی دعوت دینا ہے اور فجر سے قبل جو اذان دی جاتی ہے، اس کے بارے میں نبی اکرم ﷺ نے اطلاع دی ہے، کہ یہ سوئے ہوئے کو جگانے، اور قیام کرنے والے کو لوٹانے کی خاطر ہے۔اس کو ترمذی رحمہ اللہ کے سوا باقی جماعت نے روایت کیا ہے۔قائم سے مراد: جو رات کو نماز پڑھتا ہے۔اس کو لوٹانے سے مراد یہ ہے، کہ وہ سو جائے یا نماز سے فارغ ہو کر بیٹھ جائے، جب کہ اذان سنے۔ پس یہ اذان نہ وقتِ نماز کی اطلاع کے لیے ہے اور نہ نماز میں حاضری کی خاطر ہے۔''

نیز حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''اگر کہا جائے کہ شرعی اذان کی تعریف جو پہلے گزر چکی ہے، وہ یہ ہے کہ مخصوص الفاظ سے نماز کے ٹائم کی اطلاع کرنا، اور قبل از وقت اذان دینے میں تو وقت کی اطلاع نہیں۔ تو اس کا جواب

[1] صحیح بخاری، باب الأذان قبل الفجر، رقم: ٦٢١

[2] سبل السلام: ١/ ١٢٤

یہ ہے کہ وقت کی اطلاع دینا"اعم" ہے۔ وقت ہو چکا ہو یا وقت ہونے کے قریب ہو۔
صبح کی نماز کو باقی نمازوں کے درمیان سے اس وقت اذان دینے کے ساتھ اس لیے مخصوص کیا گیا کہ، اوّل وقت نماز پڑھنے کی ترغیب دی گئی ہے اور صبح غالباً نیند کے بعد واقع ہوتی ہے۔ اس واسطے ایسے آدمی کا تقرر مناسب ہوا، کہ وہ لوگوں کو وقت کے داخل ہونے سے پہلے آگاہ کرے، تاکہ وہ تیار ہو جائیں، اور اوّل وقت کی فضیلت کو پالیں۔"[1]

ائمہ شارحینِ حدیث کی وضاحتوں سے یہ بھی معلوم ہوا، کہ پہلی اذان بھی من وجہ نماز فجر سے متعلق ہے۔ جیسے حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کے کلام میں مُشَارٌ إِلَيهِ ہے۔ اسی بناء پر ائمہ مشاہیر، مالک، شافعی، احمد، ابو یوسف (رحمہم اللہ) فرماتے ہیں:

"اذان ہٰذا دوسری اذان سے کافی ہو سکتی ہے۔ دوبارہ اذان کی ضرورت نہیں۔"

صاحب "المرعاۃ" نے بھی اسی مسلک کو ترجیح دی ہے۔

مذکورہ مباحث سے بخوبی نتیجہ اخذ ہو سکتا ہے کہ صبح کی پہلی اذان کا تعلق نہ تو نفلی نماز پڑھانے سے ہے اور نہ سحری کھانے پینے سے۔ چاہے رمضان ہو یا رمضان کے علاوہ۔ اگرچہ اذانِ اوّل کا فعل سحری کھانے کے مباح اوقات میں ہے۔

حضرت بلال رضی اللہ عنہ کی اذان سے چونکہ اشتباہ (شبہ) پڑ سکتا تھا کہ شاید اب کھانا پینا حرام ہو گیا، اس اشکال کو رفع کرنے کے لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« اِنَّ بِلَالًا يُؤَذِّنُ بِلَيلٍ ، فَكُلُوا وَاشرَبُوا ، حَتّٰى يُؤَذِّنَ ابنُ اُمِّ مَكتُومٍ»[2]

ورنہ سحری کھانا تو تمام اوقات میں مباح ہے۔ اذان سے پہلے ہو یا بعد اور حضرت بلال رضی اللہ عنہ کی یہ اذان سال بھر جاری رہتی تھی۔

"فتح الباری" میں ہے: « فِيهِ إِشعَارٌ بِاَنَّ ذٰلِكَ كَانَ مِن عَادَتِهِ المُستَمِرَّةِ » یعنی حدیث کے الفاظ «إِنَّ بِلَالًا يُؤَذِّن بِلَيلٍ» میں دلیل ہے کہ رات کو اذان دینا بلال رضی اللہ عنہ کی دائمی عادت تھی۔ نیز حدیث میں اس کی عِلّت «لِيُوقِظَ نَائِمَكُم وَيُرجِعَ قَائِمَكُم»[3] بیان ہوئی ہے، جس کا تعلق پورے سال سے ہے۔

---

[1] فتح الباری: ۲/۱۰۵

[2] صحیح البخاری، باب الأذان قبل الفجر، رقم: ٦٢٠

[3] صحیح مسلم: بَابُ بَيَانِ أَنَّ الدُّخُولَ فِي الصَّومِ يَحصُلُ بِطُلُوعِ الفَجرِ ......الخ، رقم: ١٠٩٣

بہر صورت جب بات واضح ہو گئی کہ پہلی اذان سے مقصود تہجد کا وقت ختم ہونے کی اطلاع اور سوئے ہوئے لوگوں کو بیدار کرنا ہے، تو اس کا تقاضا ہے کہ جہاں دو اذانیں ہوں وہاں «الصَّلٰوۃُ خَيرٌ مِّنَ النَّوم» پہلی اذان میں کہا جائے۔ اس سلسلے میں چند ایک احادیث بطورِ حوالہ ملاحظہ فرمائیں! نسائی میں ہے:

« عَن أَبِی مَحذُورَةَ قَالَ ...... قَالَ ...... حَیَّ عَلَی الفَلَاحِ. الصَّلٰوۃُ خَیرٌ مِّنَ النَّومِ . الصلوة خير من النوم فی الأولٰی من الصبح »[1]

حاشیہ نسائی میں ہے:

« فِی الأولٰی من الصبح: أی فی المُنَادَاةِ الْأُولٰی. و فی نسخةٍ : فی الأوَّل: أی فی النداء الأوّل . والمراد : الأذان دون الإقامة » واللّٰه تعالٰی أعلم.

یعنی ابو محذورہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: نبی ﷺ نے مجھے اذان سکھائی جس طرح کہ تم آج کل دیتے ہو، پھر اذان کے کلمات کہتے ہوئے کہا: "الصَّلٰوۃُ خَیرٌ مِّنَ النَّوم "صبح کی پہلی اذان میں ہے۔

نیز نسائی میں ہے:

« عَن أَبِی مَحذُورَةَ ، قَالَ : كُنتُ أُؤَذِّنُ لِرَسُولِ اللّٰهِ ﷺ، وَ كُنتُ اَقُولُ فِی أَذَانِ الفَجرِ الْأَوَّلِ : حَیَّ عَلَی الفَلَاحِ. اَلصَّلٰوۃُ خَیرٌ مِنَ النَّومِ ......»[2]

یعنی ابو محذورہ رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کے لیے اذان کہتے تھے، اور پہلی اذانِ فجر میں "الصلوٰۃ خیر من النوم" کہا کرتے تھے۔

"تلخیص الحبیر" میں ہے: « وَصَحَّحَهُ ابنُ حَزمٍ » یعنی ابو جعفر والی حدیث کو ابن حزم رحمہ اللہ نے صحیح کہا ہے۔ "دارقطنی" میں ہے: «الصَّلٰوۃُ خَیرٌ مِّنَ النَّومِ فِی الْاُولٰی مِنَ الصُّبحِ»[3]

نیز "دارقطنی" میں ہے:

« فَإِذَا اَذَّنتَ بِالْاُولٰی مِنَ الصُّبحِ فَقُل اَلصَّلٰوۃُ خَیرٌ مِّنَ النَّومِ مَرَّتَینِ »[4]

سنن ابوداؤد میں ہے:

« عَن أَبِی مَحذُورَةَ عَنِ النَّبِیِّ ﷺ نَحو هٰذَا الْخَبر. وَ فِيهِ « اَلصَّلٰوۃُ خَیرٌ مِّنَ النَّومِ.

---

1. سنن النسائی، الْأَذَانُ فِی السَّفَرِ، رقم:٦٣٣
2. سنن النسائی، التَّثوِيبُ فِی أَذَانِ الفَجرِ، رقم:٦٤٧
3. سنن الدارقطنی، بَابٌ فِی ذِكرِ أَذَانِ أَبِی مَحذُورَةَ وَاختِلَافِ الرِّوَايَاتِ فِيهِ ،رقم:٩٠٣
4. سنن الدارقطنی، بَابٌ فِی ذِكرِ أَذَانِ أَبِی مَحذُورَةَ وَاختِلَافِ الرِّوَايَاتِ فِيهِ ،رقم:٩٤٠

اَلصَّلٰوۃُ خَیرٌ مِّنَ النَّومِ فِی اَلاُولٰی مِنَ الصُّبحِ » ①

''سنن کبریٰ'' بیہقی میں ہے:

« إِنَّہٗ کَانَ یُثَوِّبُ فِی اَلاَذَانِ اَلاَوَّلِ مِنَ الصُّبحِ بِأَمرِہٖ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیہِ وَ سَلَّمَ »

یعنی ابومحذورہ رضی اللہ عنہ صبح کی پہلی اذان میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے تثویب کہتے تھے۔

ان روایات سے معلوم ہوا کہ "الصلوۃُ خَیرٌ مِّنَ النَّومِ" کا اضافہ پہلی اذان میں ہونا چاہیے۔ بشرطیکہ دونوں کے درمیان زیادہ وقفہ نہ ہو۔ بصورتِ دیگر یہ اذان خلافِ منہجِ نبوی ہوگی۔ اس کا اندازہ قریباً آدھ گھنٹہ تک کیا جا سکتا ہے۔ موجودہ وقت میں ''مسجد الحرام'' میں یہی اندازِ معمول بہا (اسی پر عمل ہو رہا) ہے۔

واضح ہو! اس ساری بحث کا تعلق دو اذانوں سے ہے۔ اگر کسی جگہ صبح کی صرف ایک اذان ہو تو وہاں بلاتردّد «اَلصَّلٰوۃُ خَیرٌ مِّنَ النَّومِ» کا اضافہ اس اذان میں ہوگا۔

اخیر میں یہ بھی یاد رہے کہ دوسری اذان اور اقامت کے مابین وقفہ صرف ہلکی سی دو رکعتوں کا ہونا چاہیے۔ طویل انتظار میں بیٹھے رہنا خلافِ سنت ہے۔ (ھذا ما عندی واللہ أعلم بالصواب وعِلمُہٗ أتمّ)

تہجد اور فجر کی اذان کے درمیان کتنا وقفہ ہونا چاہیے؟

سوال: تہجد اور فجر کی اذان کا وقفہ کتنا ہونا چاہیے؟

جواب: شرع میں تہجد کی اذان کا کوئی ثبوت نہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم رات کے مختلف اوقات میں تہجد پڑھتے تھے۔ ②

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

« وَکَانَ لَا تَشَاءُ أَن تَرَاہُ مِنَ اللَّیلِ مُصَلِّیًا إِلَّا رَأَیتَہٗ، وَلَا نَائِمًا إِلَّا رَأَیتَہٗ. » ③

''تم جب بھی چاہو، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو نماز پڑھتے دیکھ سکتے تھے اور جب بھی چاہو، سوئے ہوئے بھی دیکھ سکتے تھے۔''

ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے:

« مَا أَلفَاہُ السَّحَرُ عِندِی إِلَّا نَائِمًا ، تعنی النبی صلی اللہ علیہ وسلم » ④

---

① سنن أبی داؤد، بَابُ کَیفَ الأَذَانُ، رقم:۵۰۱

② صحیح البخاری، بَابُ :قِیَامِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیہِ وَسَلَّمَ اللَّیلَ حَتّٰی تَرِمَ قَدَمَاہُ، رقم:۱۱۳۰

③ صحیح البخاری، بَابُ قِیَامِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیہِ وَسَلَّمَ بِاللَّیلِ مِن نَومِہٖ، وَمَا نُسِخَ مِن قِیَامِ اللَّیلِ، رقم:۱۱۴۱

④ صحیح البخاری، بَابُ مَن نَامَ عِندَ السَّحَرِ، رقم:۱۱۳۳

یہ احادیث اس امر کا واضح ثبوت ہیں کہ نمازِ تہجد کا کوئی وقت متعین نہیں۔ چنانچہ اسی سے معلوم ہوا کہ تہجد کے لیے اذان بھی نہیں۔ جہاں تک بلالی اذان کا تعلق ہے، سو حدیث میں اس کے دو مقصد بیان ہوئے ہیں:

۱۔ تہجد گزار تہجد ختم کر دیں: «لِيَرجِعَ قَائِمُكُم»

۲۔ اور سوئے ہوئے بیدار ہو جائیں «وَلِيُنَبِّهَ نَائِمَكُم» ①

اس کے علاوہ تیسرا کوئی مقصد نہیں۔

دونوں اذانوں میں وقفہ کے بارے میں سنن نسائی میں ہے:

« إِنَّهُ لَم يَكُن بَينَهُمَا إِلَّا أَن يَّنزِلَ هٰذَا وَيَصعَدَ هٰذَا » ②

یعنی دونوں میں بہت کم وقفہ ہوتا تھا، اس کو مبالغے پر محمول کیا جائے تو قریبا بیس پچیس منٹ بنتے ہیں۔

سحری کی اذان کہنا سنت ہے یا بدعت؟

سوال: سحری کی اذان کہنا سنت ہے یا بدعت؟

جواب: سحری کی اذان کہنا ثابت نہیں۔ البتہ سحری کے وقت میں اذان دینا ثابت ہے۔ جس کے حدیث میں دو مقصد بیان ہوئے ہیں۔ تہجد گزار نماز سے فارغ ہو جائے، اور سویا ہوا بیدار ہو جائے۔ (اور فجر کی تیاری کر لے) گویا کہ من وجہ اس اذان کا تعلق نمازِ صبح سے ہے نہ کہ تہجد یا سحری سے۔

اذان الجمعہ

جمعہ کی اذان منبر کے قریب دی جائے یا مسجد کے دروازے پر؟

سوال: جمعہ کی اذان منبر کے قریب دی جائے یا مسجد کے دروازے پر؟

جواب: سنن ابی داؤد میں «عَلٰى بَابِ المَسجِدِ» کی تصریح ہے، کہ اذانِ خطبۂ جمعہ کی مسجد کے دروازے کے پاس کہی جائے لیکن یہ روایت مدلس راوی محمد بن اسحاق کے عنعنہ کی بناء پر قابلِ استدلال نہیں۔ ''مسند احمد'' کی جس روایت میں سماع کی تصریح ہے، اس میں «عَلٰى بَابِ المَسجِدِ» کے الفاظ نہیں۔ لہٰذا منبری اذان جونسی موزوں جگہ پر دی جائے درست ہے۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو! فتاویٰ اہلِ

① صحيح البخاری، بَابُ الأَذَانِ قَبلَ الفَجرِ، رقم: ٦٢١

② سنن النسائی، هَل يُؤَذِّنَانِ جَمِيعًا أَو فُرَادَى، رقم: ٦٣٩

حدیث (۲/ ۳۸۷، ۳۸۸ لشیخنا محدث روپڑی رحمہ اللہ تعالیٰ)

جمعہ کی دو اذانیں:

سوال: سورۃ جمعہ میں آتا ہے ''جب تمہیں نماز جمعہ کے لیے بلایا جائے تو دوڑ کر آؤ اور خرید وفروخت چھوڑ دو۔'' تو کیا اس آیت کی روشنی میں پہلی اذان خطبہ شروع ہونے سے پندرہ بیس منٹ پہلے دی جاسکتی ہے؟ (یعنی جمعہ کے لیے دو اذانیں) ایک خطیب صاحب فرماتے ہیں کہ صرف ایک اذان ہی دی جائے۔ لیکن اگر ایک اذان ہی دی جائے تو پھر اس آیت کا کیا مطلب ہے، کیونکہ اس آیت سے تو یہی واضح ہورہا ہے۔ حدیث میں ہے کہ امام کے منبر پر بیٹھنے سے پہلے آنے والے کو جمعے کا ثواب ملتا ہے۔

جواب: سورۂ جمعہ کی آیت کریمہ میں، منبری اذان کا بیان ہے۔ (یعنی اُس اذان کا جو خطیب صاحب کے منبر پر بیٹھنے پر کہی جاتی ہے) پہلی اذان کا نہیں، کیونکہ وہ تو خلیفہ ٔ ثالث حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دور میں شروع ہوئی اور وہ ضروری بھی نہیں صرف جائز ہے۔ جب کہ قرآنی آیت میں وجوب کے وقت کا ذکر ہے۔ اصولِ فقہ میں قاعدہ مشہور ہے:'' مَا لَا یَتِمُّ الوَاجِبُ إِلَّا بِهِ فَهُوَ وَاجِبٌ .''

اس کا مفہوم یہ ہے کہ اتنا وقت پہلے کاروبار چھوڑ دینا چاہیے کہ آدمی منبری اذان کے وقت مسجد میں پہنچ سکے، اور حدیث میں جن گھڑیوں کا بیان ہے، وہ صرف فضیلت کی گھڑیاں ہیں وجوب کی نہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ قرآنی آیت میں پہلی اذان کی طرف اشارہ تک نہیں اور نہ آج تک کسی مفسر نے اس سے یہ بات سمجھی ہے جو آپ کے ذہن میں ہے۔

اصلاً اذان ایک ہی ہے جس طرح کہ خطیب صاحب نے فرمایا۔ اضافی اذان کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جواز ہے۔ اس بارے میں تفصیل پہلے ''الاعتصام'' وغیرہ میں چھپ چکی ہے۔

کیا جمعہ کی اذان خطبہ سے پندرہ بیس منٹ پہلے دی جاسکتی ہے؟

سوال سورۃ جمعہ میں آتا ہے کہ ''جب تمہیں نمازِ جمعہ کے لئے بلایا جائے تو دوڑ کر آؤ اور خرید وفروخت چھوڑ دو۔'' تو آیا کیا اس آیت کی روشنی میں پہلی اذان خطبہ شروع ہونے سے ۱۵، ۲۰ منٹ پہلے دی جاسکتی ہے (یعنی جمعہ کے لئے دو اذانیں) ایک خطیب صاحب فرماتے ہیں کہ صرف ایک اذان ہی دی جائے، لیکن اگر ایک اذان ہی دی جائے تو پھر اس آیت کا کیا مطلب ہے، کیونکہ اس آیت سے تو یہی واضح ہورہا ہے کہ جب حدیث میں حکم ہے کہ امام کے منبر پر بیٹھنے سے پہلے آنے والے کے جمعے کا ثواب ملتا ہے۔

(محمد خورشید شاہ، راولپنڈی)

جواب سورۃ جمعہ کی آیتِ کریمہ میں منبری اذان کا بیان ہے۔ پہلی اذان کا نہیں وہ تو خلیفہ ثالث عثمانؓ کے دور میں شروع ہوئی اور یہ ضروری بھی نہیں۔ صرف جواز ہے قرآنی آیت میں وجوب کے وقت کا ذکر ہے۔ اُصولِ فقہ میں قاعدہ مشہور ہے: مالایتم الواجب إلا به فهو واجب جس کا مفہوم یہ ہے کہ پہلے اپنا کاروبار چھوڑ دینا چاہیئے تاکہ آدمی منبری اذان کے وقت مسجد میں پہنچ سکے اور حدیث میں جن گھڑیوں کا بیان ہے وہ صرف فضیلت کی گھڑیاں ہیں، وجوب کی نہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ قرآنی آیت میں پہلی اذان کی طرف اشارہ تک نہیں اور نہ آج تک کسی مفسر نے اس سے یہ بات سمجھی ہے جو آپ کے ذہن میں ہے۔ اصلاً اذان ایک ہی ہے جس طرح کہ خطیب صاحب نے فرمایا ہے۔ اضافی اذان کے بارہ میں زیادہ سے زیادہ جواز ہے۔ مزید تفصیل کے لئے سابقہ فتاویٰ کی طرف رجوع کریں۔

کیا جمعہ کی دوسری اذان آج بھی مشروع ہے؟

سوال: جمعہ کی دوسری اذان آج بھی مشروع ہے یا نہیں؟

جواب: اذانِ عثمانی کا محض جواز ہے۔ اگر کوئی اس پر عمل نہ کرنا چاہے تو نہ کرے، لیکن عامل پر نکیر نہیں ہونی چاہیے۔ موضوع ہذا پر میرا ایک تفصیلی فتویٰ جماعتی جرائد میں قبل ازیں شائع ہو چکا ہے۔ اس میں بعض اعتراضات کا تفصیلی جائزہ بھی پیش کیا گیا ہے۔

جمعہ کی دو اذانیں کب سے رائج ہوئی، نیز کیا یہ جائز ہے؟

سوال: رسولِ اکرم ﷺ کے وقت تو جمعہ کی اذان ایک ہی تھی لیکن عام طور پر مسجدوں میں دو اذانیں جمعہ کی ہوتی ہیں۔ یہ کب سے رائج ہوئی، نیز کیا یہ جائز ہے؟

جواب: مدینہ منورہ میں آبادی جب پھیل گئی تو خلیفۂ ثالث حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ نے پہلی اذان کا اضافہ کردیا۔[1]

صحیح بخاری میں یونس کی روایت میں ہے: «فَثَبَتَ الْأَمْرُ عَلٰى ذٰلِكَ»[2] یعنی اس اذان پر اجماع ہوگیا۔ ''فتح الباری'' میں ہے:

---

① صحیح البخاری، رقم: ۹۱۶، بمع فتح الباری: ۳/۳۹۵

② صحیح البخاری، بَابُ التَّأْذِينِ عِنْدَ الْخُطْبَةِ، رقم: ۹۱۶

« اَلَّذِی یَظهَرُ أَنَّ النَّاسَ أَخَذُوا بِفِعلِ عُثمَانَ فِی جَمِیعِ البِلَادِ. اِذ ذَاكَ لِكَونِهِ خَلِیفَةَ مُطَاعِ الأَمرِ » (۳۹۴/۲)

''ظاہر یہی ہے کہ یہ اذان سب شہروں میں جاری ہوگئی، کیونکہ وہ قابلِ اطاعت خلیفہ تھے۔''

استاذی المکرّم محدث روپڑی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''اگر چہ ابتداء اس کی لوگوں کی کثرت کی وجہ سے تھی۔ مگر سب شہروں میں اس کا پھیلنا دلالت کرتا ہے کہ آخر لوگوں کی کمی بیشی ضروری نہیں سمجھی گئی۔ پس ثابت ہوا کہ اب بھی یہ اذان درست ہے۔ خواہ کم ہوں یا زیادہ۔ ہاں ضروری نہیں۔ اگر کوئی نہ دینی چاہے نہ دے۔ مگر دینے والے پر بھی کوئی اعتراض نہیں۔ بعض لوگ جو کہتے ہیں کہ بلند جگہ بازار میں دینی چاہیے، کیونکہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ایسی جگہ میں ہی دی تھی۔ تو یہ ٹھیک نہیں۔ اذان سے مقصود اِعلام ہے، یعنی لوگوں کو بذریعہ توحید اعلان ہے۔ اس میں بازار یا کسی جگہ کی خصوصیت کو کوئی دخل نہیں۔ مدینہ شریف میں بازار مسجد کے ساتھ تھا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے موزوں جگہ پر دلوادی۔ اس طرح ہر شہر کی جامع مسجد میں موزوں جگہ دیکھ لینی چاہیے۔ (فتاویٰ اہلِ حدیث: ۱۰۶/۲)

بہر صورت مذکورہ بالا مُستندات کی روشنی میں جمعہ کی پہلی اذان دینے کا جواز ہے۔ (واللہ اعلم) [1]

تعاقب۔ جمعہ کی پہلی اذان کا شرعی حکم (از۔ مولانا عبیداللہ عفیف، شیخ الحدیث مسجد چینیاں والی۔ لاہور)

سوال: زید اس بات کا قائل و فاعل ہے کہ جمعۃ المبارک کی ایک اذان سنتِ نبوی، سنتِ صحابہ (رضی اللہ عنہم) اور

[1] ادارہ الاعتصام: جمعہ کی پہلی اذان، جو اذانِ عثمانی کہلاتی ہے، اس کی بابت اگر چہ حضرت مفتی صاحب حفظہ اللہ نے صرف جواز کا فتویٰ دیا ہے۔ اسے ضروری نہیں بتلایا ہے۔ تاہم ہمارے خیال میں مطلقاً جواز کا فتویٰ بھی محلِ نظر ہے۔ اس کا جواز صرف ایسی جگہوں پر ہی تسلیم کیا جانا چاہیے جہاں اس کی ضرورت مقتضی ہو۔ آج کل لاؤڈ اسپیکر اور گھڑیاں عام ہیں، جن کی وجہ سے اس طرح کے اِعلام (خبر دینے) کی بالعموم ضرورت نہیں ہے۔ جس طرح حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دَور میں تھی۔ البتہ جہاں آج بھی گھڑیاں اور لاؤڈ اسپیکر وغیرہ نہ ہوں تو وہاں بلاشبہ اذانِ اوّل کا جواز موجود ہے۔ لیکن جہاں ایسی صورت نہیں ہے (جیسا کہ آج کل بالعموم نہیں ہے) تو وہاں جمعہ کی پہلی اذان (اذانِ عثمانی) سے اجتناب ہی کرنا چاہیے اور صرف وہی ایک اذان دینی چاہیے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں ہوا کرتی تھی۔

اس موضوع پر ہمارے فاضل بزرگ و محقق مولانا عبیداللہ صاحب عفیف حفظہ اللہ کا ایک مُفصّل اور مُدلّل مضمون ہمارے پاس کافی عرصے سے اشاعت کے لیے آیا ہوا ہے جس میں اسی نقطۂ نظر کی تائید و حمایت کی گئی ہے، جو ہم نے مذکورہ بالا سطور میں پیش کیا ہے۔ (ان شاء اللہ) آئندہ شمارے سے بالاقساط قارئین کرام وہ ملاحظہ فرمائیں گے! (صلاح الدین یوسف)

شرعی اذان ہے۔ دوسری (یعنی پہلی) اذان حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی ایجاد ہے۔ اگر کوئی دوسری اذانِ شرعی جمعۃ المبارک کے دن پڑھے تو گنجائش ہے مگر اس صورت میں کہ اذان بازار یا مسجد کے دروازے پر ہو۔ تاکہ کم از کم حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی اذان پر عمل ہو سکے۔ بکر اس بات کا قائل ہے کہ دو اذانیں جمعۃ المبارک کو پڑھنی مسجد میں شرعی اذانیں ہیں۔ مسجد سے خارج حصہ کی کوئی ضرورت نہیں۔ ایک اذان پڑھنے والے کو بُرا اور ایسا ویسا کہتا ہے۔ ان دونوں میں سے کس کا قول و فعل کتاب و سنت کی روشنی میں صحیح ہے؟

جواب: صورتِ مسؤلہ میں کتاب و سنت کی روشنی میں زید کا قول ہی بوجوہ صحیح ہے۔ بکر کا نہیں۔

اوّل: اس لیے کہ اس حقیقت میں کسی بھی اہلِ علم کو اختلاف نہیں کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خلافت کے اوّل عہد تک صرف ایک ہی اذان پڑھی جاتی تھی۔ وہ بھی اس وقت پڑھی جاتی تھی جب خطیب خطبۂ جمعہ پڑھنے کے لیے منبر پر تشریف فرما ہو جاتا تھا۔ پھر جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے عہد میں مدینہ منورہ کی آبادی میں اضافہ ہوگیا اور نو آباد محلّہ جات مسجدِ نبوی سے دُور دُور آباد ہو گئے تھے اور جمعہ کی اذان ان کو سنائی نہ دیتی تھی۔ درانحالیکہ مدینہ منورہ کی آبادی میں روز افزوں اضافہ کے باوجود جمعہ صرف مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہی میں پڑھا جاتا تھا۔ اس طرح بعض حضرات مسجدِ نبوی سے دُور آباد ہونے کی وجہ سے جمعہ میں شرکت سے محروم رہنے لگے کہ ان کے آتے آتے ہی جمعہ کی نماز ختم ہو جاتی تھی۔ اس ضرورت کے پیشِ نظر خلیفۂ راشد حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اجتہاد سے کام لیتے ہوئے مقام ''زوراء'' پر پہلی اذان کہلوانے کا حکم صادر فرمایا: اور یہ مقام مسجدِ نبوی سے تقریباً اڑھائی سو میٹر کے فاصلہ پر واقع تھا۔ یہ حقیقت حدیثِ اذانِ عثمانی کے مختلف الفاظ کو یکجا کر لینے کے بعد پوری طرح کھل کر از خود سامنے آجاتی ہے۔ وہ حدیث مع تخریج الفاظ مختلفہ باحوالہ یہ ہے:

«قَالَ الاِمَامُ الزُّهرِيُّ رَحِمَهُ اللّٰهُ تَعَالٰى: أَخبَرَنِی السَّائِبُ بنُ یَزِیدَ، اَنَّ الاَذَانَ (الَّذِی ذَکَرَہُ اللّٰهُ فِی القُراٰنِ) ، کَانَ اَوَّلُهُ حِینَ یَجلِسُ الاِمَامُ عَلَی المِنبَرِ،(إِذَا قَامَتِ الصَّلٰوةُ) یَومَ الجُمُعَةِ،(عَلٰی بَابِ المَسجِدِ) فِی عَهدِ النَّبِیِّ ﷺ وَ اَبِی بَکرٍ وَ عُمرَ. فَلَمَّا کَانَ خِلَافَةُ عُثمَانَ، وَ کَثُرَ النَّاسُ، (وَ تَبَاعَدَتِ المَنَازِلُ)، أَمَرَ عُثمَانُ یَومَ الجُمُعَةِ بِالأَذَانِ الثَّالِثِ. وَ فِی رِوَایَةٍ: اَلاَوَّلِ. وَفِی اُخرٰی: بِأَذَانٍ ثَانٍ ـ(عَلٰی دَارٍ)، (لَهُ) فِی السُّوقِ. یُقَالُ لَهَا: الزَّورَاءُ) فَأُذِّنَ بِهٖ عَلَی الزَّورَاءِ ـ (قَبلَ خُرُوجِهٖ لِیَعلَمَ النَّاسُ اَنَّ الجُمُعَةَ قَد حَضَرَت) فَثَبَتَ الأَمرُ عَلٰی ذَالِكَ ـ (فَلَم یَعِبِ النَّاسُ ذٰلِكَ

عَلَیهِ، وَ قَدعَابُوا عَلَیهِ حِینَ اَتَمَّ الصَّلٰوةَ بِمِنًی .)[1]

یعنی حضرت امام زہری رحمہ اللہ فرماتے ہیں: کہ مجھے حضرت سائب بن یزید رضی اللہ عنہ نے خبر دی ہے۔ انھوں نے فرمایا: جمعہ کی وہ پہلی اذان، جس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں کیا ہے۔ حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں اور ابوبکر اور عمر رضی اللہ عنہما کے زمانہ میں جمعہ کے دن مسجد نبوی کے دروازہ پر اس وقت ہوا کرتی تھی، جب امام (خطبہ کے لیے) منبر پر تشریف فرما ہوتا تھا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دَورِ خلافت میں جب لوگ بہت ہو گئے اور مدینہ کی آبادی دُور دُور تک پھیل گئی، تو انھوں نے جمعہ کے دن تیسری اذان، اور ایک دوسری روایت کے مطابق پہلی اذان، اور تیسری روایت کے مطابق دوسری اذان، اپنے اس مکان پر پڑھنے کا حکم صادر فرمایا جسے مقامِ ''زوراء'' کہتے ہیں، جو کہ مدینہ منورہ کے ایک بازار میں واقع ہے۔ پس خطبہ کے لیے آپ کی آمد سے پہلے یہ اذان مقامِ ''زوراء'' پر اس لیے دی جاتی تھی تا کہ لوگوں کو یہ پتہ چل جائے کہ جمعہ کا وقت ہو چکا ہے۔ پھر یہی دستور قائم ہوگیا۔ لوگوں نے اس اذان کے اضافہ کے متعلق حضرت عثمان (رضی اللہ عنہ) پر کوئی عیب نہیں لگایا۔ حالانکہ آپ نے جب حج کے موقع پر منیٰ کے میدان میں نمازِ قصر کی بجائے پوری نماز پڑھی تو لوگوں نے ان پر نکیر کی تھی۔

اس حدیث سے صاف واضح ہوا کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہدِ رسالت میں اور حضرات شیخین رضی اللہ عنہما کے عہدِ خلافت میں اور پھر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خلافت کے اوّلین زمانہ میں جمعہ کے دن صرف ایک ہی

---

[1] أخرجه أبوداؤد فی سننه مع عون المعبود:ج:١، باب النداء یوم الجمعة ،ص:٤٢٣، و السیاق له والبخاری:١/١٢٤، ١٢٥، والنسائی:١/١٦٨، والترمذی مع تحفة الأحوذی:١/٣٩٨، و صححه، و ابن ماجه جلد اوّل، والشافعی فی الامّ:١/١٧٣۔

والزیادة الأولیٰ لابن اسحاق بن راهویه، وابن خزیمة، کذا فی الفتح الباری: (٢/٣٤٦)، و نیل الأوطار (٣/٢٩٨، و عون المعبود:١/٤٢٣) ، والزیادة الثانیة لابن الجارود والبیهقی، کذا فی "الأجوبة النافعة" للألبانی،ص:٨. والزیادة الثالثة لابی داؤد مع العون:١/٤٢٤، والطبرانی کذا فی الاجوبة النافعة ،ص:٨، والرابعة لابن عبد، وابن المنذر، وابن مردویه، ذکرها العینی فی عمدة القاري:٣/٢٣٣، دون عزو، الأجوبة النافعة،ص:٨. والخامسة لابن خزیمة، وابن ماجه. فتح الباری:٢/٣٢٧.والسادسة للطبرانی، فتح الباری:٢/٣٢٧. وتحفة الاحوذی: ١/٣٦٨، والسابعة ایضاً للطبرانی. فتح الباری:٢/٣٢٧. والثامنة ، و هی الاخیرة لابن حمید، وابن المنذر، و ابن مردویه، کذا فی الاجوبة النافعة،ص:٨.

اذان ہوا کرتی تھی، اور وہ اس وقت ہوتی تھی، جب امام خطبہ کے لیے منبر پر رونق افروز ہو جاتا تھا۔ یہی اذان شرعی اذان ہے۔

ثانیاً: اس لیے بھی زید ہی کا قول صحیح ہے، کہ اگر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اپنی اس اذان کو شرعی اذان تصور فرماتے، تو مسجد نبوی سے تقریباً اڑھائی سو میٹر دور فاصلہ پر یہ اذان نہ کہلواتے بلکہ مسجد نبوی کے اسی مقام پر اس کا اہتمام فرماتے جہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کے عہد میں ہوا کرتی تھی۔ رہی یہ بات کہ مقام ''زوراء'' کہاں اور مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے کتنے فاصلہ پر واقع ہے تو سنیے!

مقام ''زوراء'' کی تحقیق:

حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ صحیح بخاری کی شرح میں اس حدیث کی تفسیر میں ''الزوراء'' کی تحقیق کرتے ہوئے رقمطراز ہیں۔

« (اَلزَّورَآء) بِفَتحِ الزَّای، وَ سَکُونِ الوَاوِ ،وَبَعدَھَا رَآءٌ مَمدُودَۃٌ : وَ ھِی سُوقٌ بِالمَدِینَۃِ. »

علامہ ابن بطال کو اصرار ہے کہ ''زوراء'' ایک بڑے پتھر کا نام ہے، جو کہ مسجد نبوی کے دروازے کے قریب واقع تھا مگر ان کا یہ موقف درست نہیں۔ جیسا کہ امام بخاری، ابن ماجہ، ابن خزیمہ اور طبرانی رحمہم اللہ وغیرہ کی تصریحات سے واضح ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ''زوراء'' مدینہ کے بازار میں ایک مقام کا نام ہے۔

« قَالَ اَبُو عَبدِ اللّٰہِ (اِلاِمَامُ البُخَارِیُّ) الزّوراء، موضع بالسُّوقِ بِالمَدِینَۃِ» [1]

اور یہی بات صحیح ہے۔ چنانچہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ حضرت امام بخاری کی تائید فرماتے ہوئے لکھتے ہیں:

« وَ مَا فُسِّرَ بِہِ الزوراء، ھو المعتمد . وَ جَزَمَ ابنُ بَطَّالٍ بِأَنَّہٗ حَجَرٌ کَبِیرٌ عِندَ بَابِ المَسجِدِ. وَ فِیہِ نَظَرٌلما فی روایۃ ابن إسحاق، عن الزھری، عند ابن خزیمۃ، وابن ماجۃ بلفظ زاد النداءَ الثالث علی دارٍ فِی السُّوقِ یُقَالُ لَھَا: «الزَّورَاء». و فی روایۃ عند «الطبرانی» فَأَمَرَ بالنِّدَاءِ الاوّلِ عَلٰی دَارٍ لَہٗ. یُقَالُ لَھَا: «الزَّورَاءُ، فَکَانَ یُؤَذِّنُ لَہٗ عَلَیھَا» [2]

اس تصریح سے معلوم ہوا کہ "زَورَاء" کسی بڑے پتھر کا نام نہیں، بلکہ مدینہ منورہ کے ایک بازار کا نام ہے۔ جیسا کہ صحیح بخاری، صحیح ابن خزیمہ، سنن ابن ماجہ اور طبرانی کی روایات میں اس کی تصریح موجود ہے۔

---

[1] صحیح البخاری، بَابُ الأَذَانِ یَومَ الجُمُعَۃِ، رقم: ۹۱۲

[2] فتح الباری : ۲/ ۳۲۷

مشہور شیخ محمود محمد خطاب السبکی رحمہ اللہ نے بھی سنن أبی داؤد کی شرح "المنهل العذب المورود" میں یہی کچھ لکھا ہے۔ (ملاحظہ ہو:۱/ ۲۴۵)

مقام ''زوراء'' کی نشاندہی اور تحقیق:

الشیخ عطیہ محمد سالم حفظہ اللہ رقم فرماتے ہیں:

« وَ أَمَّا مَكَانُ هٰذَا الْأَذَانِ، وَ زَمَانُهُ. فَإِنَّ الْمَكَانَ قَد جَاءَ النَّصُّ، أَنَّهُ كَانَ عَلَى الزَّوْرَاء و قَد كَثُرَ الكَلَامُ فِي تَحدِيدِ الزوراء، مَعَ اِتِّفَاقِهِم أَنَّهَا مَكَانٌ بِالسُّوقِ، وَهٰذَا يَتَّفِقُ مَعَ الغَرَضِ مِن مَشرُوعِيَّتِهِ لِتَنبِيهِ أَهلِ السُّوقِ بِوَقتِ الجُمُعَةِ لِلسَّعيِ إِلَيهَا. أَمَّا الزُّورَاء بِعَينِهَا ، فَقَالَ عُلَمَاءُ تَارِيخِ المَدِينَةِ: أَنَّهُ اسمٌ لِلسُّوقِ نَفسِهَا وَقِيلَ: مَكَانٌ مِنهَا مُرتَفِعٌ كَانَ عِندَ أَحجَارِ الزَّيتِ، وَ عِندَ قَبرِ مَالِكِ بنِ سِنَانٍ ، وَعِندَ سُوقِ العَبَاء ة. وَالشَّيءُ الثَّابِتُ الَّذِي لَم يَقبَلِ التَّغيُّر- هُوَ قَبرُ مَالِكِ بنِ سِنَانٍ ، لٰكِن يَقُولُونَ عِندَهُ: وَ لَيسَ فِي مَكَانِهِ. وَ قَد بَدَا لِي أَنَّ الزُّورَاءَ: هُوَ مَكَانُ المَسجِدِ الَّذِي يُوجَدُ الآنَ بِالسُّوقِ فِي مُقَابَلَةِ بَابِ المِصرِي، المعروف بِمَسجِدِ فَاطِمَةَ» [1]

''یہ بات منصوص ہے کہ مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے دور پڑنے والی آبادی کو جمعہ کے وقت کی اطلاع دینے کے لیے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے مقام ''زوراء'' پر پہلی اذان کہلوانی شروع کر دی تھی۔ رہی یہ بات: کہ مقام ''زوراء'' کہاں اور مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے کتنے فاصلے پر تھا۔ سو واضح ہو کہ تاریخ مدینہ کے علماء کی تحقیق کے مطابق ''زوراء'' دراصل ایک بازار کا نام ہے۔ ایک دوسرا قول یہ بھی ہے کہ یہ مقام مدینہ منورہ کے بازار کی ایک اونچی گھاٹی پر ''احجار زیت'' کے قریب ہے۔ یہ بھی ہے کہ یہ مقام حضرت مالک بن سنان رضی اللہ عنہ کی قبر کے پاس واقع ہے اور ''سوق عباء ۃ'' کے نزدیک پڑتا ہے۔ میری رائے میں مقام ''زوراء'' وہاں تھا جہاں اب ''باب المصری'' کے سامنے بازار میں مسجد ''فاطمہ'' رضی اللہ عنہا واقع ہے۔ بہر حال میرے نزدیک یہی امر راجح ہے کہ اذانِ عثمانی اسی مقام پر کہی جاتی تھی، اور یہ سوق مدینہ کے وسط میں واقع ہے، جو کہ مسجد نبوی سے تقریباً دوصد پچاس میٹر (یعنی ایک فرلانگ اٹھاون گز اور ایک فٹ) دور ہے۔

پھر مفصل بحث کے بعد فیصلہ کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

[1] تتمه تفسير أضواء البيان:۸/۲۳۲-۲۳۳

«وَ بِهٰذَا تَرَجَّحُ عِندِي، أَنَّ مَوضِعَ أَذَانِ عُثمَانَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنهُ كَانَ بِذٰلِكَ المَكَانِ، وَ أَنَّهُ المُتَوَسِّطُ بِسُوقِ المَدِينَةِ، وَ تُقَدَّرُ مَسَافَتُهُ عَنِ المَسجِدِ النَّبَوِيِّ بِحَوَالَى مِأَتَينِ وَ خَمسِينَ مِترًا تَقرِيبًا»①

اس تحقیق سے ثابت ہوا کہ مقام ''زوراء'' مسجد نبوی سے تقریباً اڑھائی صد میٹر دُور تھا اور اتنے فاصلے پر کہی جانے والی اذان کو شرعی یعنی مسنون اذان قرار دینا کچھ مناسب معلوم نہیں ہوتا۔ (فافهم)

ثالثًا: اس لیے بھی کہ چونکہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے عہدِ خلافت میں مدینہ معظّمہ کی آبادی میں خاطر خواہ اضافہ ہوگیا، اور دُور دُور تک محلے آباد ہو گئے تھے اور خطبہ جمعہ والی اذان مسجدِ نبوی سے دور محلّہ جات میں سنائی نہیں دیتی تھی اور آتے آتے نمازِ جمعہ ختم ہو جاتی تھی۔ لہٰذا لوگوں کی اس مجبوری کے پیشِ نظر خلیفہ راشد سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ نے اجتہاد کرکے اس پہلی اذان کی طرح ڈالی تھی۔ یعنی بالفاظِ دیگر اذانِ عثمانی ایک مقامی ضرورت سے عہدہ برآ ہونے کے لیے شروع کی گئی تھی۔ جیسا کہ مذکورۃ الصدر حدیث کے الفاظ «فَلَمَّا كَثُرَ النَّاسُ وَ تَبَاعَدَتِ المَنَازِلُ» اس مقامی ضرورت پر دلالت کر رہے ہیں۔ شارحینِ حدیث نے بھی اس ضرورت کی نشاندہی کی ہے۔ علامہ الشیخ محمود محمد خطاب رقم فرماتے ہیں:

«فَإِنَّ الغَرَضَ الَّذِي زَادَ عُثمَانُ الأَذَانَ لِأَجلِهِ، وَ هُوَ، أَنَّهُ لَمَّا كَثُرَ النَّاسُ وَانتَشَرَتِ المَنَازِلُ، كَانَ مَن عِندَ الزُّورَاءِ، لَا يَسمَعُ الأَذَانَ الَّذِي عِندَ المَسجِدِ، زَادَ أَذَانًا ثَانِيًا (خَارِجَ المَسجِدِ) عَلَى «الزَّورَاءِ» لِإِسمَاعِهِم، فَإِذَا اجتَمَعَ النَّاسُ فِي المَسجِدِ، وَ جَلَسَ الخَطِيبُ عَلَى المِنبَرِ، أَذَّنَ المُؤَذِّنُ ثَانِيًا خَارِجَ المَسجِدِ عَلَى البَابِ، أَوعَلَى السَّطحِ، كَمَا كَانَ فِي زَمَنِ النَّبِيِّ ﷺ، وَ أَبِي بَكرٍ، وَ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنهُ. وَهٰذَا الغَرَضُ الَّذِي اَحدَثَ الأَذَانَ الثَّانِي مِن أَجلِهِ فِي زَمَنِ عُثمَانَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنهُ لَيسَ مَوجُودًا فِي زَمَانِنَا. فَإِنَّنَا لَم نَرَى أَذَانًا يُفعَلُ بَعِيدًا عَنِ المَسجِدِ»②

یعنی جس غرض کے لیے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے یہ مرّوجہ پہلی اذان کہلوانی شروع کی تھی۔ وہ یہ تھی کہ ان کے عہدِ خلافت میں مدینہ منورہ کی آبادی میں خاصا اضافہ ہوگیا تھا اور رہائشی مکانات دُور دُور تک پھیل گئے تھے اور مسجد نبوی ﷺ سے دور ہونے کی وجہ سے مقامِ ''زوراء'' سے پرے

① تفسير أضواء البيان، سورة الجمعة: ٨/٢٣٤

② المنهل العذب المورود شرح سنن أبي داؤد: ٦/٢٤٦

بسنے والوں کو خطبہ والی اذان سنائی نہ دیتی تھی۔ اس لیے بامر مجبوری ان لوگوں کو جمعہ کے وقت سے آگاہ کرنے کے لیے مقامِ ''زوراء'' پر آپ نے اس اذان کو رواج دیا۔ چونکہ اب یہ غرض موجود نہیں اس لیے ہم اس کی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔''

علامہ حافظ احمد محمد شاکر المصری رحمہ اللہ ارقام فرماتے ہیں:

« لِأَنَّ الْمَدِينَةَ لَم يَكُن بِهَا إِلَّا الْمَسجِدَ النَّبَوِيِّ، وَ كَانَ النَّاسُ كُلُّهُم يُجمِعُونَ فِيهِ، وَ كَثُرُوا عَن أَن يَسمَعُوا الْأَذَانَ عِندَ بَابِ الْمَسجِدِ . فَزَادَ عُثمَانُ الْأَذَانَ الْأَوَّلَ، لِيَعلَمَ مَن بِالسُّوقِ ، وَ مَن حَولَهُ حُضُورَ الصَّلٰوة » [1]

''اذانِ عثمانی کا پس منظر یہ ہے کہ مدینہ منورہ میں اس دور میں مسجد نبوی کے علاوہ اور کوئی مسجد جمعہ نہ تھی، اور تمام لوگ اسی میں جمعہ پڑھتے تھے، اور وہ اتنی زیادہ تعداد میں تھے کہ جمعہ کے خطبہ کے آغاز میں مسجد کے دروازے پر پڑھی جانے والی اذان سن نہ سکتے تھے۔ لہٰذا امیر المومنین حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو مروّجہ پہلی اذان اس لیے کہلوانی پڑی، تاکہ بازار میں اور اس کے گردونواح میں بسنے والوں کو جمعہ کے وقت کا علم ہو سکے۔

اور ''فتح الباری'' (۲/۳۲۷) میں بھی یہی وجہ مرقوم ہے۔

محدّث عصر حاضر علامہ البانی حفظہ اللہ رقمطراز ہیں:

« لَا نَرَى الِاقتِدَاءَ بِمَا فَعَلَهُ عُثمَانُ عَلَى الإِطلَاقِ ، وَ دُونَ قَيدٍ . فَقَد عَلِمنَا مِمَّا تَقَدَّمَ أَنَّهُ إِنَّمَا زَادَ الْأَذَانَ الْأَوَّلَ لِعِلَّةٍ مَعقُولَةٍ ، وَ هِيَ كَثرَةُ النَّاسِ وَ تَبَاعُدُ مَنَازِلِهِم عَنِ الْمَسجِدِ النَّبَوِيِّ فَمَن صَرَفَ النَّظَرَ عَن هٰذِهِ العِلَّةِ، وَ تَمَسَّكَ بِأَذَانِ عُثمَانَ مُطلَقًا، لَا يَكُونُ مُقتَدِيًا بِهِ رَضِيَ اللّٰهُ عَنهُ ، بَل هُوَ مُخَالِفٌ لَهُ ، حَيثُ لَم يَنظُر بِعَينِ الإِعتِبَارِ إِلٰى تِلكَ العِلَّةِ الَّتِي لَو لَاهَا لَمَا كَانَ لِعُثمَانَ أَن يَزِيدَ عَلٰى سُنَّتِهِ عَلَيهِ السَّلَام وَ سُنَّةِ الخَلِيفَتَينِ مِن بَعدِهِ» [2]

''ہمارے نزدیک حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا یہ عمل (اذان عثمانی) علی الاطلاق پیروی کے قابل نہیں جب تک وہ معقول علّت اور سبب موجود نہ ہو جس کی وجہ سے انھوں نے اس اذان کو رواج دیا اور وہ علّت اور سبب یہ تھا کہ مدینہ منورہ کی آبادی کا ان کے عہد میں بہت بڑھ جانا اور مسجد نبوی

[1] الأجوبة النافعة، ص: ۹ [2] الأجوبة النافعة، ص: ۸

سے لوگوں کے گھروں کا دُور پڑنا۔ لہٰذا جو شخص اس علّت اور سبب کا لحاظ کیے بغیر اذانِ عثمانی کو اختیار کرنے پر اصرار کر رہا ہے، وہ ایسا کر کے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی پیروی نہیں کر رہا، بلکہ وہ درحقیقت اس کی مخالفت پر تلا ہوا ہے۔ کیونکہ اس نے اذانِ عثمانی کی اس علّت اور سبب کا اعتبار نہیں کیا، جس کی وجہ سے آپ کو یہ اذان کہلوانی پڑی تھی۔ اگر یہ علّت معقولہ آپ کے پیشِ نگاہ نہ ہوتی تو آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سُنّت اور حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کی سُنّت پر اس اذان کا اضافہ ہرگز نہ کرتے۔"

محدثِ ہند مولانا عبید اللہ رحمانی حفظہ اللہ نے بھی اسی رائے کو اختیار فرمایا ہے۔ ملاحظہ ہو! (مرعاۃ المفاتیح:۳/۳۰۸)

اس تحقیق سے معلوم ہوا کہ امیر المومنین حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ایک مقامی اور ہنگامی ضرورت (لوگوں کی کثرت اور آبادی کا دور دور تک پھیل جانے) سے عہدہ برآ ہونے کے لیے اپنے اجتہاد سے اس اذان کو رواج دیا تھا، اور بس! لہٰذا زید کو بُرا بھلا کہنا درست نہیں۔

رابعًا: اس لیے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ تیسرے بڑے صحابی (رضی اللہ عنہ) اور خلیفہ راشد تھے اور آپ نے ایک مقامی اور ہنگامی ضرورت سے عہدہ برآ ہونے کے لیے اپنے اجتہاد سے یہ اذان کہلوانی شروع کی تھی۔ یہ ضرورت معقول بھی تھی، اور قابلِ اعتناء بھی۔ تاہم یہ بھی حقیقت ہے کہ خلیفۂ چہارم سیدنا علی رضی اللہ عنہ، حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما ایسے بزرگ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اور امام حسن بصری اور امام زہری رحمہما اللہ جیسے فقہاء تابعین رحمہم اللہ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی اس اذان کو مسنون اور شرعی اذان تسلیم نہیں کیا تھا۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا عمل:

شیخ البانی فرماتے ہیں:

« وَكَأَنَّهُ لِذَالِكَ كَانَ عَلِيُّ بنُ أَبِي طَالِبٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْه وَ هُوَ بِالكُوفَةِ، يَقتَصِرُ عَلَى السُّنَّةِ، وَ لَا يَأخُذُ بِزِيَادَةِ عُثمَانَ، كَمَا فِي القرطبي(۱۸/۱۰۰) » [1]

"سیدنا علی رضی اللہ عنہ اپنے "دارالخلافہ" کوفہ میں خطبہ کے شروع میں پڑھی جانے والی مسنون اذان پر اکتفا فرماتے تھے، اور اذانِ عثمانی پر عمل نہیں کرتے تھے۔ جیسا کہ قرطبی میں ہے۔"

حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی رائے:

« حَدَّثَنَا شَبَابَةُ قَالَ: حَدَّثَنَا هُشَيمُ بنَ الغَازِ، عَن نَافِعٍ، عَنِ ابنِ عُمَرَ، قَالَ: اَلْأَذَانُ

[1] التعليق على سنن الترمذي ،باب ما جاء في أذان الجمعة:۳/۳۹۳

اَلاوَّلُ یَومَ الجُمُعَۃِ بِدعَۃٌ »[1]

''حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے تھے کہ جمعہ کی پہلی اذان بدعت ہے۔''[2]

یہ روایت فتح الباری (۲/۳۲۷) میں بھی موجود ہے۔

''جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جمعہ کا خطبہ پڑھنے کے لیے منبر پر تشریف فرما ہو جاتے تھے تو پھر حضرت بلال رضی اللہ عنہ اذان پڑھتے تھے۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم خطبہ سے فارغ ہو جاتے تو حضرت بلال تکبیر کہتے اور پہلی اذان (اذانِ عثمانی) مسنون نہیں۔''

امام حسن بصری رحمہ اللہ تابعی کی رائے:

«حَدَّثَنَا أَبُو بَکرٍ ، قَالَ : حَدَّثَنَا هُشَیمُ بنُ بَشِیرٍ ، عَنِ الحَسَنِ ، أَنَّهٗ قَالَ : النِّدَآءُ الاَوَّلُ یَومَ الجُمُعَۃِ الَّذِی یَکُونُ عِندَ خُرُوجِ الاِمَامِ وَالَّذِی قَبلَ ذَالِكَ بِدعَۃٌ مُحدَثٌ»[3]

''امام حسن بصری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ درحقیقت جمعہ کی پہلی اذان وہ ہے جو خطبہ کے شروع میں اس وقت کہی جاتی ہے جب خطیب خطبہ کے لیے آجاتا ہے اور جو اذان اس خطبہ والی اذان سے پہلے کہی جاتی ہے وہ ایک نئی چیز ہے۔''

امام زہری تابعی رحمہ اللہ کی رائے:

« حَدَّثَنَا ابنُ عُلَیَّۃَ، عَن بُردٍ، عَنِ الزُّهرِیِّ، قَالَ: کَانَ الاَذَانُ عِندَ خُرُوجِ الاِمَامِ، فَاَحدَثَ اَمِیرُ المُومِنِینَ عثمَانُ التَّاذِینَۃَ الثَّالِثَۃَ عَلَی الزَّورَاءِ، لِیَجتَمِعَ النَّاسُ »[4]

''امام زہری رحمہ اللہ تصریح فرماتے ہیں کہ پہلے پہل جمعہ کی پہلی اذان خطبہ کے شروع میں کہی جاتی تھی، جب خطیب خطبہ پڑھنے کے لیے آجاتا تھا۔ بعد ازاں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے لوگوں کو جمع کرنے کے لیے مقام ''زوراء'' پر تیسری اذان (مروّجہ پہلی اذان) شروع کر دی۔''

---

[1] مصنف ابن أبی شیبۃ، باب الأذان یوم الجمعۃ: ۲/۱٤۰،رقم:٥٤٣٧

[2] وَفِی رِوَایَۃٍ قَالَ ابنُ عُمَرَ : اِنَّمَا کَانَ النَّبِیُّ ﷺ إِذَا صَعِدَ المِنبَرَ أَذَّنَ بِلَالٌ. فَاِذَا فَرَغَ النَّبِیُّ ﷺ مِن خُطبَتِہٖ، أَقَامَ الصَّلٰوۃَ. وَ الأَذَانُ الاَوَّلُ بِدعَۃٌ ' رَوَاہُ أَبُو طَاهِرِ المُخلِصُ فِی فوائدہ کذا فی الاجوبۃ النافعۃ للشیخ ناصر الدین الالبانیؒ، ص:(۹، ۱۰)

[3] مصنف ابن أبی شیبۃ (۲/۱٤۰)، باب الاذان یوم الجمعۃ،رقم:٥٤٣٥

[4] مصنف ابن أبی شیبۃ ،باب الاذان یوم الجمعۃ،رقم:٥٤٤٠

امام الماوردی کی رائے:

مُفسّر قرطبی (محمد بن احمد انصاری، متوفی ۶۷۱ھ) اپنی تفسیر میں امام الماوردی رحمہ اللہ سے نقل کرتے ہیں:

«عَنِ الْمَاوَرْدِيِّ، فَأَمَّا الْأَذَانُ الْأَوَّلُ، فَمُحدَثٌ. فَعَلَهُ عُثْمَانُ لِيَتَأَهَّبَ النَّاسُ لِحُضُورِ الْخُطْبَةِ عِنْدَ اتِّسَاعِ الْمَدِينَةِ، وَ كَثْرَةِ أَهْلِهَا» [1]

''مروّجہ پہلی اذان شرعی اذان نہیں۔ جب مدینہ منورہ وسیع ہوگیا، اور اس کے باشندوں کی تعداد بڑھ گئی تو اس وقت خلیفہ راشد حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اس لیے اذان کہلوانی شروع کی تھی، تاکہ لوگ تیار ہو کر خطبہ شروع ہونے سے پہلے پہلے مسجد میں پہنچ سکیں۔''

اس تفصیل پر ایک سرسری نظر ڈالنے کے بعد یہ حقیقت پوری طرح نکھر کر سامنے آجاتی ہے کہ گو خلیفۂ راشد امیر المومنین سیدنا عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ نے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی موجودگی میں اس مروّجہ اذان کی طرح ڈالی تھی۔ تاہم صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی حینِ حیات میں اس کو وہ قبولِ عام حاصل نہ ہوسکا، جو مسنون اذان کو شرعاً حاصل ہے۔ ورنہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما جیسے اکابر صحابہ، امام حسن بصری اور امام المحدثین محمد بن مسلم بن شہاب زہری رحمہما اللہ ایسے فقہاءِ حدیث اس اذان پر قولاً اور عملاً نکیر نہ کرتے۔ چنانچہ انہی وجوہ کے پیشِ نظر متعدد علماء محققین، ماہرینِ سنت اور شارحینِ حدیث نے خالص اتباعِ سنت کی نزاکتوں اور تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے ایک ہی اذان کو ترجیح دی ہے۔ جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ اس سلسلے میں مزید چند آراء پیش خدمت ہیں۔

مُجدّدِ وقت امام شافعی رحمہ اللہ کی رائے صائب:

فرماتے ہیں:

«وَ أُحِبُّ أَنْ يَكُونَ الْأَذَانُ يَومَ الْجُمُعَةِ، حِينَ يَدخُلُ الْإِمَامُ الْمَسجِدَ، وَ يَجلِسُ عَلٰى مَوضِعِهِ الَّذِي يَخطُبُ عَلَيهِ خَشَبٍ، أَو جَرِيدٍ، أَو مِنبَرٍ، أَو شَيءٍ مَرفُوعٍ لَهُ، أَوِ الْأَرضِ. فَإِذَا فَعَلَ أَخَذَ الْمُؤَذِّنُ فِي الْأَذَانِ. فَإِذَا فَرَغَ قَامَ فَخَطَبَ، وَ لَا يَزِيدُ عَلَيهِ. وَ أُحِبُّ أَنْ يُؤَذِّنَ مُؤَذِّنٌ وَاحِدٌ» [2]

''میں تو اس کو پسند کرتا ہوں کہ جب خطیب خطبہ پڑھنے کے لیے تیار ہو کر منبر یا چبوترہ وغیرہ پر

---

[1] تفسیر قرطبی: ۱۸/۱۰۰

[2] کتاب الام للشافعي، باب وقت الأذان للجمعة، ج:۱، ص:۱۷۳

بیٹھ جائے، تو اس وقت مؤذن اذان پڑھے۔ جب اذان پوری ہو جائے، تو اذان اور خطبہ کے درمیان کسی وقفہ کے بغیر فوراً خطیب خطبہ شروع کر دے، اور مجھے مؤذن بھی ایک ہی پسند ہے۔ یعنی ایک سے زائد مؤذنوں کا ایک ساتھ اذان پڑھنا مجھے پسند نہیں۔

مزید لکھتے ہیں:

« وَقَد كَانَ عَطَاءٌ يُنكِرُ أَن يَّكُونَ عُثمَانَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنهُ أَحدَثَهُ ، وَ يَقُولُ: اَحدَثَهُ مُعَاوِيَةُ. وَاللّٰهُ أَعلَمُ...... وَاَيُّهُمَا كَانَ ، فَالْأَمرُ الَّذِی عَلٰی عَهدِ رَسُولِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَحَبُّ اِلَیَّ »[1]

''امام عطاء تابعی رحمہ اللہ کو اس سے انکار ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے یہ اذان جاری کی تھی، بلکہ ان کے مطابق اس کو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے شروع کیا تھا۔ (واللہ اعلم) پھر فیصلہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ قطع نظر اس سے کہ کس نے یہ اذان جاری کی تھی۔ مجھے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہدِ رسالت والی صورتِ حال (ایک اذان) ہی زیادہ محبوب ہے۔''

الشیخ ابنِ ناصر رحمہ اللہ کا عمل:

علامہ البانی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

« كَانَ (الشَّيخُ مُحَمَّدُ بنُ نَاصِرٍ) يَقتَصِرُ يَومَ الجُمُعَةِ عَلٰی مُؤَذِّنٍ وَّاحِدٍ، وَ أَذَانٍ وَّاحِدٍ غَيرَ الاِقَامَةِ أُسوَةٌ بِرَسُولِ اللّٰهِ ﷺ إِذ لَم يَكُن فِی زَمَنِهٖ ، وَ لَا فِی زَمَنِ أَبِی بَكرٍ رَضِیَ اللّٰهُ عَنهُ عَلٰی مَا هُوَ الْأَشهَرَ، وَ صَدرًا مِن خِلَافَةِ عُثمَانَ، وَ كَانَ لَا يُؤَذِّنُ فِی زَمَنِهٖ عَلَيهِ الصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ إِلَّا مُؤَذِّنٌ وَاحِدٌ. وَ هٰذَا هُوَ الصَّحِيحُ المُعتَمَدُ»[2]

''جناب شیخ محمد بن ناصر، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی میں جمعہ کے دن ایک ہی مؤذن اور ایک ہی اذان پر اکتفا فرماتے تھے۔ کیونکہ مشہور ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کے عہد میں اور پھر خود حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خلافت کے اوّل حصہ میں اس پہلی اذان کا کوئی وجود نہ تھا۔ نیز آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں مؤذن بھی ایک ہی ہوتا تھا۔''

---

① كتاب الامّ للشافعي، بَاب وَقتُ الأَذَانِ لِلجُمُعَةِ، ج:١، ص:١٧٣

② الأَجوِبَةُ النَّافِعَةُ، ص:١٠

اہلِ مغرب کا عمل:

شیخ الاسلام حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کے مطابق مغربی ائمہ محدثین کا عمل بھی ایک اذان پر تھا۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

« وَ بَلَغَنِي أَنَّ أَهلَ المَغرِبِ الأَدنٰى الآنَ، لَا تَاذِينَ عِندَهُم سِوَى مَرَّةٍ »[1]

''مجھے یہ اطلاع ملی ہے کہ اہلِ مغرب کے ہاں جمعہ کے دن صرف ایک ہی اذان کا دستور رائج ہے۔''

اور معلوم ہے کہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کی وفات ۸۵۲ھ میں ہوئی تھی۔

علامہ محقق احمد محمد شاکر المصری رحمہ اللہ کی رائے:

« وَحَرَصُوا عَلَى إِبقَاءِ الأَذَانِ قَبلَ خُرُوجِ الإِمَامِ ، وَ قَد زَالَتِ الحَاجَةُ إِلَيهِ، لِأَنَّ المَدِينَةَ لَم يَكُن بِهَا إِلَّا المَسجِدَ النَّبَوِيّ...... أَمَّا الآنَ قَد كَثُرَت المَسَاجِدُ ، وَبُنِيت فِيهَا المَنَارَاتُ، وَ صَارَ النَّاسُ يَعرِفُونَ وَقتَ الصَّلٰوةِ بِأَذَانِ المُؤَذِّنِ عَلَى المَنَارَةِ، فَإِنَّا نَرٰى اَن يُكتَفٰى بِهٰذَا الأَذَانِ ، وَ أَنَّ يَكُونَ عِندَ خُرُوجِ الإِمَامِ اِتِّبَاعًا لِلسُّنَّةِ »[2]

''لوگ جمعہ کی مروّجہ پہلی اذان کو بحال رکھنے پر حریص واقع ہوئے ہیں، جب کہ اس کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ کیونکہ جس دَور میں یہ اذان شروع کی گئی تھی، اس وقت مدینہ منورہ میں سوائے مسجد نبوی کے دوسری کوئی مسجد (جمعہ) نہ تھی۔ مگر اب تو بکثرت مساجد موجود ہیں اور ان میں بلندوبالا منارات تعمیر ہو چکے ہیں اور منارہ پر جب مؤذن اذان پڑھتا ہے، تو لوگوں کو نماز کے وقت کا بآسانی پتہ چل جاتا ہے۔ لہٰذا ہماری رائے یہ ہے کہ خالص سنتِ رسول کی اتباع میں ایک ہی اذان پر اکتفا کی جائے اور یہ اذان اس وقت پڑھی جائے، جب امام خطبہ کے لیے تشریف لے آئے۔''

علامہ محمود محمد خطاب السبکی کی رائے:

« هٰذَا الغَرَضُ الَّذِي أُحدِثَ الأَذَانُ الثَّانِي مِن أَجلِهِ فِي زَمَنِ عُثمَانَ رضی اللہ عنہ، لَيسَ مَوجُودًا فِي زَمَانِنَا. فَإِنَّنَا لَم نَرَى أَذَانًا يُفعَلُ بَعِيدًا عَنِ المَسجِدِ۔ فَإِذَا يُطلَبُ الاِقتِصَارُ عَلٰى أَذَانٍ وَّاحِدٍ فِي الجُمُعَةِ فِي زَمَانِنَا ، كَمَا كَانَ فِي زَمَنِ النَّبِيِّ ﷺ

---

① فتح الباری:۲/۳۲۷

② التعلیق علی سنن الترمذی،بَابُ مَا جَاءَ فِي أَذَانِ الجُمُعَةِ،ج:۲،ص:۳۹۳

وَصَاحِبَیهِ أَبِی بَکرٍ، وَ عُمَرَ لِعَدَمِ الغَرَضِ الَّذِی أَحدِثَ الأَذَانُ الثَّانِی مِن أَجلِهِ. وَمَن لَّم یَقتَصِر عَلٰی أَذَانٍ وَاحِدٍ، فَقَد خَالَفَ سَیِّدُنَا عُثمَانَ فَضلًا عَن غَیرِهِ. وَ هٰذَا مَعلُومٌ لِمَنِ اطَّلَعَ عَلٰی مَا هُوَ مُقَرَّرٌ فِی کُتُبِ السُّنَّةِ» ①

یعنی جس غرض کے لیے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اس اذان کی داغ بیل ڈالی تھی وہ غرض اب ہمارے زمانے میں ختم ہو چکی ہے۔ لہٰذا ہماری رائے میں مسجد سے دُور اذان کی ضرورت نہیں۔ اس لیے اب اس طرح جمعہ کے لیے ایک ہی اذان پر اکتفا کرنا چاہیے، جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کے عہدِ مبارک میں ایک ہی اذان کہی جاتی تھی، کیونکہ اب پہلی اذان کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ بناء بریں اب جو شخص ایک اذان پر اکتفا نہیں کرتا۔ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرات شیخین کی مخالفت کے ساتھ ساتھ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے بھی خلاف کر رہا ہے۔

نیز لکھتے ہیں:

« وَ عَلٰی فَرضٍ، أَنَّهٗ وُجِدَ الغَرَضُ الَّذِی أُحدِثَ الأَذَانُ الثَّانِی مِن أَجلِهِ، زَمَنَ سَیِّدِنَا عُثمَانَ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ یُطلَبُ أَن یَقتَصِرَ عَلٰی أَذَانٍ وَاحِدٍ. کَمَا صَرَّحَ بِذَالِكَ الشَّافِعِیُّ فِی «الأُمِّ» ②

''بالفرض یہ مان لیا جائے کہ جس غرض کے پیشِ نظر حضرت عثمان کے عہد میں یہ اذان شروع کی گئی تھی وہ غرض اب بھی موجود ہے تو پھر بھی اتباعِ سنت کے تقاضے کے مطابق ایک ہی اذان پر اکتفاء کرنا چاہیے۔ جیسا کہ امام شافعی رحمہ اللہ نے اپنی کتاب '' الأمّ'' (ج:۱/۱۷۳) میں تصریح فرمائی ہے۔''

مزید لکھتے ہیں اور وضاحت سے لکھتے ہیں:

« (فَمَا یَفعَلُهُ) النَّاسُ قَبلَ دُخُولِ الوَقتِ مِمَّا یُسَمُّونَهٗ بِالْأُولٰی وَالثَّانِیَةِ۔ (لَا أَصلَ لَهٗ) لِأَنَّهٗ لَم یَفعَلهُ النَّبِیُّ ﷺ، وَ لَا أَمَرَ بِهٖ ، وَ لَا فَعَلَهٗ أَحَدٌ مِّن أَصحَابِهٖ، وَ لَا مِنَ السَّلَفِ، بَل هُوَ مُحدَثٌ أَحدَثَهٗ بَعضُ الْأُمَرَاءِ کَمَا ذَکَرَهٗ ابنُ الحَاجّ، فَیَتَعَیَّنُ تَرکُهٗ لِأَنَّ تَرکَهٗ ﷺ إِیَّاهُ مَعَ وُجُودِ المُقتَضٰی. وَ هُوَ تَشرِیعُ الْأَحکَامِ فِی حَیَاتِهٖ. وَاستِمرَارُهٗ عَلٰی ذٰلِكَ حَتّٰی فَارَقَ الدُّنیَا یَدُلُّ عَلٰی عَدَمِ مَشرُوعِیَّتِهٖ. وَ کَذٰلِكَ

① المنهل العذب المورود شرح سنن أبی داؤد:٦/٢٤٧

② المنهل العذب المورود:٦/٢٤٧

إجمَاعُ الْأُمَّةِ مِنَ الصَّحَابَةِ وَالسَّلَفِ الصَّالِحِ عَلٰى هٰذَا التَّرك دَلِيلٌ عَلٰى أَنَّ تَركَهُ هُوَ السُّنَّةُ وَ فِعلُهُ بِدعَةٌ مَذمُومَةٌ » ①

''نماز جمعہ کے وقت سے پہلے لوگ جو اذان پڑھتے ہیں اور اس کو پہلی اذان کہتے ہیں اور وقت آنے پر پڑھی جانے والی اذان کو دوسری اذان کا نام دیتے ہیں۔ یہ ایک ایسی بے اصل بات ہے جس پر نہ کبھی حضرت نبی اکرم ﷺ نے خود عمل کیا اور نہ آپ ﷺ نے اس کا حکم دیا تھا۔ نہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم، اور ائمہ سلف رحمہم اللہ نے ایسا کیا، بلکہ محقق ابن الحاج کے مطابق یہ کسی حکمران کی جاری کردہ بدعت ہے۔ لہٰذا اس کا ترک شرعاً متعین ہے۔ کیونکہ نبی اکرم ﷺ کا عہد تشریع احکام کا عہد تھا اور اس کی ضرورت بھی تھی لیکن اس کے باوصف آپ ﷺ کا اس کو ہمیشہ ترک کیے رکھنا اور اسی ترک پر آپ کا وفات پا جانا اس کے عدمِ مشروع ہونے پر دلالت کرتا ہے۔ اسی طرح صحابہ رضی اللہ عنہم اور سلف صالحین کا بھی اس کے ترک پر اجماع ہے اور ان کا یہ اجماع بھی اس امر کی دلیل ہے کہ اس اذان کو چھوڑ دینا ہی سنت ہے اور اس کو جاری رکھنا بدعت ہے۔''

الشیخ ناصر الدین البانی کی رائے سامی:

« قَد مَضٰى أَنَّ عُثمَانَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ إِنَّمَا زَادَ الْأَذَانَ الأَوَّلَ لِيَعلَمَ النَّاسُ أَنَّ الجُمُعَةَ قَدحَضَرَت، فَإِذَا أُذِيعَ الْأَذَانُ المُحَمَّدِي بِالمِذيَاعِ ، فَقَد حَصَلَتِ الغَايَةُ الَّتِي رَمٰى إِلَيهَا عُثمَانُ بِأَذَانِهِ، وَ اعتَقَدَ أَنَّهُ لَو كَانَ المِذيَاعُ فِي عَهدِ عُثمَانَ، وَ كَانَ يَرَى جَوَازَ اِستِعمَالِهِ، كَمَا نَعتَقِدُ، لَكَانَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ اِكتَفٰى بِإِذَاعَةِ الْأَذَانِ المُحَمَّدِي. وَأَغنَاهُ ذٰلِكَ عَن زِيَادَتِهِ » ②

''یہ ثابت ہو چکا کہ امیر المومنین حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے جمعہ کی اذان محض اس لیے جاری فرمائی تھی تاکہ لوگوں کو جمعہ کے وقت کا علم ہو جائے۔ مگر اب ہمارے زمانہ میں ریڈیو، (لاؤڈ سپیکر وغیرہ) ایجاد ہو چکے ہیں۔ لہٰذا جب محمدی اذان ریڈیو پر نشر کی جائے گی، تو اس ایک ہی اذان کے ساتھ وہ مقصد حاصل ہو جائے گا، جس کے حصول کے لیے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اذان (عثمانی) کا اجراء فرمایا تھا۔ میرا عقیدہ یہ ہے کہ اگر ان کے عہدِ خلافت میں ریڈیو موجود

---

① المنهل العذب المورود:٦/٢٤٥

② الأجوبة النافعة،ص:١٣

ہوتا، اور ہماری طرح اس کے استعمال کو جائز سمجھتے، تو وہ بس اذانِ محمدی یعنی ایک ہی اذان پر اکتفا فرماتے کہ یہ آلہ ان کو اس زائد اذان کے اضافہ سے بے نیاز کر دیتا۔''

شیخ موصوف دوسرے مقام پر لکھتے ہیں:

« وَالخَلَاصَةُ أَنَّ الَّذِی ثَبَتَ فِی السُّنَّةِ، وَ جَرٰی عَلَیهِ السَّلَفُ الصَّالِحُ هُوَ الِاكتِفَاءُ بِالْأَذَانِ الوَاحِدِ عِندَ صُعُودِ الخَطِیبِ عَلَی المِنبَرِ وَ أَن یَّكُونَ خَارِجَ المَسجِدَ عَلٰی مَكَانٍ مُرتَفِعٍ » [1]

''خلاصۂ کلام یہ کہ سنتِ رسول اللہ ﷺ سے جو کچھ ثابت ہے اور سلف صالح کا جس چیز پر عمل رہا ہے، وہ تو بس ایک ہی اذان ہے جو خطیب کے منبر پر بیٹھ جانے کے بعد مسجد کے صحن وغیرہ میں کسی بلند مقام پر پڑھی جاتی ہے۔''

اس تفصیل سے درج ذیل باتیں ثابت ہوئیں۔

اوّل: یہ کہ جناب رسول اللہ ﷺ کے عہدِ مبارک سے لے کر خلیفۂ ثالث حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے ابتدائی دورِ خلافت تک جمعۃ المبارک کے لیے صرف ایک اذان ہی ہوتی تھی، اور وہ بھی اس وقت جب خطیب خطبہ ارشاد فرمانے کے لیے منبر پر تشریف فرما ہو جاتا۔ یعنی عہدِ رسالت، عہدِ ابوبکر، و عمر رضی اللہ عنہما کے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعین رحمہم اللہ مروجہ اذانِ عثمانی کے تصور سے قطعاً نابلد تھے۔

ثانی: یہ کہ چونکہ حضرت عثمان کے عہد میں مدینہ منورہ کی آبادی میں بکثرت اضافہ ہو گیا تھا اور مسجدِ نبوی سے کافی دُور دُور تک نئے محلّہ جات آباد ہو گئے تھے۔ مگر آبادی کی اس کثرت اور پھیلاؤ کے باوصف پورے مدینہ منورہ میں جمعہ صرف مسجد نبوی ہی میں پڑھا جاتا تھا اور خطبہ کے شروع میں پڑھی جانے والی متوارث اذان (اذانِ محمدی) مقامِ ''زوراء'' سے پرے بسنے والوں کو سنائی نہ دیتی تھی اور وہاں سے آتے آتے خطبہ ختم ہو جاتا تھا اور یوں یہ لوگ اوّل وقت پر آنے اور خطبہ سننے کی فضیلت سے محروم رہ جاتے تھے۔ لہٰذا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ان لوگوں کی اس مشکل کے ازالہ کے لیے نمازِ جمعہ کو دوسری نمازوں پر قیاس کرتے ہوئے کہ ان کی اذانیں جماعت کھڑی ہونے سے پہلے کہی جاتی ہیں۔ خطبۂ جمعہ کے وقت سے تھوڑا وقت پہلے مقام ''زوراء'' پر ایک زائد اذان کہلوانی شروع کر دی گو یہ مقام ''زوراء'' مسجد نبوی سے ایک فرلانگ اور اٹھاون گز کے فاصلہ پر واقع تھا۔ تاہم وہاں کے مکینوں کی

[1] الاجوبة النافعة، ص: ٣٤

اطلاع کے لیے بڑا موزوں تھا۔ بالفاظ دیگر یہ ایک مقامی اور ہنگامی ضرورت سے عہدہ برآ ہونے کی ایک انتظامی تدبیر تھی۔

ثالث: ہر چند حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے دوسرے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی موجودگی میں مذکورہ بالا ہنگامی اور مقامی ضرورت کے پیشِ نظر اپنے اجتہاد سے اس اذان کا آغاز فرمایا تھا، مگر بایں ہمہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی نگاہ میں اس اذان کو وہ قبولِ عام حاصل نہ ہوسکا جو کہ متوارث اور خالص مسنون اذان کو حاصل ہے۔ ورنہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اپنے دارالخلافہ کوفہ شہر میں اس کو نظر انداز کر کے ایک اذان پر اکتفاء نہ فرماتے اور حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما جیسے عاشقِ سنت صحابی، امام زُہری اور امام حسن بصری رحمہما اللہ جیسے تابعین اور فقہاء اس اذانِ عثمانی کو بدعت اور مُحدَث کہنے کی کبھی ضرورت محسوس نہ فرماتے۔ لہٰذا ان کے اس طرزِ عمل سے ثابت ہوا کہ جمعۃ المبارک کی ایک ہی اذان سنتِ نبوی، سنتِ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم، اور شرعی اذان ہے اور اذانِ عثمانی کو ہر لحاظ سے مسنون اور شرعی اذان باور کر لینا درست نہیں۔

رابع: حضرت علی، حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما، امام زہری، امام حسن بصری، امام شافعی رحمہم اللہ ایسے فقہاءِ دین اور اساطینِ علم کی مذکورہ تنقیدات اور تنقیحات سے قطع نظر یہ بات بھی بالکل ظاہر ہے کہ اب ہمارے اس ترقی یافتہ مشینی دَور میں ہمارے شہروں اور دیہات میں اذانِ عثمانی کی مذکورہ علّت اور سبب بوجوہ ذیل متحقق نہیں۔

اوّلاً: اس لیے کہ شہر تو شہر ہیں ان کا ذکر ہی کیا اب تو ہر ایک گاؤں میں ایک سے زیادہ مساجد میں جمعہ پڑھا جاتا ہے اور ان متعدد مساجد میں پڑھی جانے والی متعدد اذانیں آبادی کے ہر ایک کونے تک بسہولت سنی جاتی ہیں اور یوں لوگوں کو بآسانی جمعہ کے وقت کا علم ہو جاتا ہے۔

ثانیاً: اس لیے کہ اب شہروں اور قصبات کی طرح دیہات کی طرح ہر ایک چھوٹی بڑی مسجد میں آلۂ تجہیر الصوت (لاؤڈ سپیکر) نصب ہوتا ہے اور اس میں پڑھی جانے والی اذان تو گہری نیند میں خراٹے بھرنے والوں کو بھی چونکا دیتی ہے اور مزید اب گھڑیوں کی بہتات نے اس مشکل کو ویسے بھی کوئی مشکل نہیں رہنے دیا۔

ہماری رائے:

اس لیے اندریں حالات ہماری ناقص رائے میں اذان عثمانی کے معاملے میں بھی دوسرے شرعی مسائل کی طرح خود صاحبِ شریعت جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذاتی اسوۂ حسنہ کا اتباع ہی اَقرب اِلی الصواب

اور مُوجبِ فلاح وفوز اور بلندیٔ درجات وحسنات ہے۔ کیونکہ جس سبب مبرر کے پیشِ نظر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اس زائد اذان (عثمانی) کو رواج بخشا تھا۔ اب وہ سبب متحقق نہیں۔ لہٰذا اب بھی اس اذان کو مسنون اور شرعی اذان باور کر کے اس کے جاری رکھنے پر اصرار کرنا صحیح نہیں۔ ہاں اگر کسی جگہ واقعی اس اذان کی ضرورت ہو تو یہ اذان دی جا سکتی ہے۔ مگر بلا ضرورت اس کو اختیار کیے رکھنا اتباعِ سنت کے تقاضوں کے منافی ہے۔ واللہ تعالیٰ أعلم بالصواب

اذان کہاں دی جائے؟

اب رہا یہ سوال کہ اذان کہاں دی جائے؟ خطیب کے سامنے مسجد کے اندر یا مسجد کے صحن میں یا اس کے دروازے پر یا مسجد کے احاطہ سے باہر۔ تو واضح ہو کہ اہلِ علم نے اذان کی تعریف اس طرح فرمائی ہے:

« اَلْاَذَانُ لُغَةً: اَلإِعلَامُ ، قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰی :﴿وَ أَذَانٌ مِنَ اللّٰهِ وَرَسُولِهِ ﴾(التوبة:٣) اَی إِعلَامٌ مِنهُمَا. وَ شَرعًا : هُوَ الإِعلَامُ بِدُخُولِ وَقتِ الصَّلٰوةِ المَفرُوضَةِ بِاَلفَاظٍ مَخصُوصَةٍ. » ①

''لہٰذا اس اذان کی لغوی اور شرعی تعریف سے معلوم ہوا کہ اذان محض اس لیے دی جاتی ہے تاکہ نماز پڑھنے والوں کو فرض نماز کے وقت کا علم ہو جائے''

اور اسی مقصد کے حصول کے لیے رسول اللہ ﷺ بلند مقام پر اذان کہلواتے تھے تاکہ لوگوں کو زیادہ سے زیادہ سنائی دے سکے۔ لہٰذا اذان خواہ پہلی ہو یا دوسری کسی ایسے بلند مقام، منارہ یا اونچی جگہ پر دینی چاہیے۔ جہاں سے دُور دُور تک آواز پہنچ سکے۔ تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگ سن سکیں۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ اہلِ علم اور اصحابِ فتویٰ نے مسجد کے اندر منبر کے قریب اذان دینے کو بدعت قرار دیا ہے۔ چند تصریحات ملاحظہ فرمائیے۔

الشیخ محمود محمد خطاب السبکی تصریح فرماتے ہیں:

«أَمَّا مَا يُفعَلُ الآنَ مِن وُقُوعِ الْاَذَانَينِ فِي مَكَانٍ وَّاحِدٍ، أَو أَحَدِهِمَا فَوقَ المَسجِدِ. وَالآخَرُ دَاخِلَ المَسجِدِ ، فَلَيسَ مُوَافِقًا لِمَا كَانَ عَلَيهِ سَيِّدُنَا عُثمَانُ، وَ لَا مَا كَانَ عَلَيهِ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيهِ وَسَلَّمَ وَ أَبُو بَكرٍ، وَ عُمَرُ رَضِيَ اللّٰهُ عَنهُمَا » ②

''اب جو دونوں اذانیں ایک ہی جگہ (مسجد کے اندر منبر کے نزدیک) دی جاتی ہیں یا ایک مسجد کی

① تیسیر العلّام: ١/ ١٣٧

② المنهل العذب المورود: ٦/ ٢٤٦

چھت پر اور دوسری چھت کے نیچے تو یہ نہ تو سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے طرزِ عمل کے موافق ہے اور نہ نبی اکرم ﷺ کی سنت، حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کے طرزِ عمل کے مطابق۔"

محدّث عصر حاضر علامہ البانی رحمہ اللہ:

تصریح فرماتے ہیں:

«وَالخُلَاصَةُ أَنَّ الَّذِی ثَبَتَ فِی السُّنَّةِ، وَ جَرٰی عَلَیهِ السَّلَفُ الصَّالِحُ ، هُوَ الِاكتِفَاءُ بِالْأَذَانِ الوَاحِدِ...... وَ أَن یَّكُونَ خَارِجَ المَسجِدِ عَلٰی مَكَانٍ مُرتَفِعٍ۔ وَ أَنَّهٗ إِنِ احتِیجَ إِلٰی أَذَانٍ عُثمَانِيّ. فَمَحَلُّهٗ خَارِجَ المَسجِدِ، أَیضًا فِی المَكَانِ الَّذِی تَقتَضِیهِ المَصلَحَةُ وَ یَحصُلُ بِهِ التَّسمِیعُ أَكثَرَ. و أَنَّ الْأَذَانَ فِی المَسجِدِ بِدعَةٌ عَلٰی كُلِّ حَالٍ» [1]

"رسول اللہ ﷺ اور سلف صالح سے تو بس ایک ہی اذان ثابت ہے اور وہ بھی کسی بلند مقام پر دینی چاہیے۔ اگر کسی مصلحت کے پیشِ نظر اذانِ عثمانی کی ضرورت پڑ ہی جائے، تو پھر مسجد کے باہر کسی ایسے مقام پر دی جائے جہاں اس مصلحت کا تقاضا پورا ہوسکتا ہو اور زیادہ سے زیادہ دُور تک سنائی دے سکے۔ تاہم مسجد میں اذان دینا (جیسا کہ ہمارے ہاں عام رواج چل نکلا ہے) بہرحال بدعت ہے۔ [2]

امام مالک کی تصریح:

« نَقَلَ حَافِظُ المَغرِبِ أَبُو عُمَرَ بنُ عَبدِ البَرِّ عَن مَالِكِ بنِ أَنَسٍ اِلاِمَامِ، أَنَّ الْأَذَانَ بَینَ یَدَیِ الاِمَامِ لَیسَ مِنَ الْأَمرِ القَدِیمِ» [3]

یعنی امام مالک بن انس رحمہ اللہ تصریح فرماتے ہیں کہ امام کے نزدیک (مسجد کے اندر) اذان

---

(1) الاجوبة النافعة، ص: ۳٤

(2) توضیح از صلاح الدین یوسف حفظہ اللہ...... اذان کی اصل غرض جب زیادہ سے زیادہ لوگوں کو اطلاع دینا ہے، تو یہ غرض اگر مسجد کے اندر اذان دینے سے حاصل ہوتی ہو، تو اسے بدعت کیونکر کہا جا سکتا ہے؟ جیسا کہ آج کل لاؤڈ سپیکر مسجد کے اندر ہی نصب ہوتا ہے، اور اس کے ذریعے سے ہی اذان زیادہ دُور تک پہنچائی جا سکتی ہے۔ اس لیے مسجد کے اندر اذان دینے کو ہر حال میں بدعت قرار دینا محلِ نظر ہے۔ (ص۔ی)]

(3) عون المعبود: ۱/ ٤٢٤، رقم: ۱۰۸۸

پڑھنا ایک نیا رواج ہے۔''

امام ابن الحاج محمد مالکی کی تحقیق:

« أَنَّ السُّنَّةَ فِي أَذَانِ الْجُمُعَةِ إِذَا صَعِدَ الإِمَامُ عَلَى المِنبَرِ، أَن يَكُونَ الْمُؤَذِّنُ عَلَى المَنَارِ۔ كَذَالِكَ كَانَ عَلَى عَهدِ النَّبِيِّ ﷺ وَ أَبِي بَكرٍ، وَ عُمَرُ، وَ صَدرًا مِّن خِلَافَةِ عُثمَانَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنهُم...... قَالَ عُلَمَاؤُنَا۔ وَ سُنَّةُ النَّبِيِّ ﷺ أَولٰى أَن تُتَّبَع۔ فَقَد بَانَ اَنَّ فِعلَ ذٰلِكَ فِي المَسجِدِ بَينَ يَدَيِ الخَطِيبِ بِدعَةٌ » [1]

''جمعہ کی اذان کے متعلق سنت طریقہ یہ ہے کہ جب امام خطبہ پڑھنے کے لیے منبر پر چڑھے تو اس وقت مؤذن منار پر کھڑا ہو۔ نبی ﷺ، حضرت ابوبکر وعمر اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہم کی خلافت کے شروع زمانہ تک اسی دستور پر عمل رہا۔ پھر خلیفہ ہشام بن عبدالملک نے اذانِ عثمانی کو منار پر اور نبی کریم ﷺ کے عہد سے لے کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی وفات تک پڑھی جانے والی مسنون و متوارث اذان کو اپنے سامنے کہلوانا شروع کردیا۔ اس واسطے ہمارے مالکی علماء نے کہا ہے کہ نبی ﷺ کی سنت ہی پیروی کے زیادہ لائق ہے۔ اس سے واضح ہے کہ مسجد کے اندر خطیب کے سامنے اذان دینا بدعت ہے۔''

امام شمس الحق ڈیانوی رحمہ اللہ:

حضرت سائب بن یزید رضی اللہ عنہ کی حدیث کے جملہ ''كَانَ يُؤَذِّنُ بَينَ يَدَي رَسُولِ اللّٰهِ ﷺ'' کی شرح میں رقم فرماتے ہیں: '' بَينَ يَدَي'' کا معنی سامنے ہے، جو قریب اور بعید دونوں کو شامل ہے۔ پھر معنی یہ لکھا ہے:

« وَالمَعنٰى: اَنَّ بِلَالًا يُؤَذِّنُ قُدَّامَ النَّبِي ﷺ، وَ أَمَامَهُ، إِذَا جَلَسَ النَّبِيُّ ﷺ يَومَ الجُمُعَةِ. لٰكِن لَا يُؤَذِّنَ قُدَّامَهُ عِندَ المِنبَرِ مُتَّصِلًا بِهٖ۔ كَمَا هُوَ المُتَعَارِفُ الآنَ فِي أَكثَرِ بِلَادَ الهِندِ إِلَّا مَا عَصَمَهُ اللّٰهُ۔ لِأَنَّ هٰذَا لَيسَ مَوضِعُ الأَذَانِ . وَ تَفُوتُ مِنهُ فَائِدَةُ الأَذَانِ. » [2]

''اس حدیث کا معنی یہ ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ جمعہ کا خطبہ ارشاد فرمانے کے لیے منبر پر

[1] عون المعبود: ۱/ ۴۲۴

[2] عون المعبود: ۱/ ۴۲۴

تشریف فرما ہو جاتے، تو حضرت بلال رضی اللہ عنہ اس وقت آپ کے سامنے کھڑے ہو کر اذان دیتے تھے، مگر اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ منبر کے عین متصل کھڑے ہو کر اذان دیا کرتے تھے جیسا کہ آج کل اکثر دیارِ ہند میں یہ غلط رواج چل نکلا ہے مگر جسے اللہ تعالیٰ محفوظ رکھے۔ کیونکہ یہ اذان کی جگہ ہی نہیں۔ ایسا کرنے سے تو اذان کا مقصد ہی فوت ہو جاتا ہے۔"[1]

علامہ احمد محمد شاکر مصری رحمہ اللہ:

لکھتے ہیں کہ مؤذنین کو حکم دیا جائے کہ جب خطبہ پڑھنے کے لیے خطیب منبر پر بیٹھ جائے تو مسجد کے دروازہ پر اذان کہا کریں۔[2]

مذکورہ دلائل کی روشنی میں مسجد کے اندر منبر کے عین متصل خطیب کے بالکل قریب کھڑے ہو کر اذان کہنا بہر حال بدعت ہے۔ اذان خواہ پہلی ہو کہ دوسری بہر حال ایسی جگہ پر کہنی چاہیے جہاں سے مؤذن کی اذان زیادہ سے زیادہ انسانوں کو سنائی دے سکے اور یہی سنتِ رسول ﷺ اور سنتِ شیخین ہے۔ ہاں اگر لاؤڈ اسپیکر میں اذان کہنا ہو تو پھر مسجد کے اندر منبر کے متصل بھی جائز ہے۔ تاہم پھر بھی جہاں تک ممکن ہو، بہتر یہی ہے کہ مائک کی تار لمبی کر کے باہر صحن مسجد میں اذان کہی جائے اور ایسا کرنا کوئی مشکل بھی نہیں کہ صرف چند گز تار کی مزید ضرورت ہے۔

چند خدشات کی وضاحت:

سوال کا جواب بحمد اللہ تعالیٰ وحسن توفیقہ مکمل ہو چکا۔ تاہم تکمیلِ فائدہ کی غرض سے چند ایک خدشات کا جواب ابھی باقی ہے اور وہ خدشات یہ ہیں:

ا۔ اذانِ عثمانی کو خلافِ سنت کہنا صحیح نہیں کیونکہ آپ خلیفہ راشد ہیں ہمیں حکم ہے:

«عَلَيكُم بِسنّتِي وَ سُنَّةِ الخُلَفَاءِ الرَّاشِدِينَ تَمَسَّكُوا بِهَا، وَ عَضُّوا عَلَيهَا بِالنَّوَاجِذِ»

---

[1] **توضیح از صلاح الدین یوسف** ﷾......: علماء کی یہ تصریحات اُس دَور کی ہیں جب لاؤڈ اسپیکر ایجاد نہیں ہوا تھا بلا شبہ بغیر اسپیکر کے مسجد کے اندر اذان سے اذان کا مقصد ہی فوت ہو جاتا ہے۔ اس صورت میں منارہ پر یا کسی اونچی جگہ پر ہی اذان دینی چاہیے۔ لیکن اسپیکر کی موجودگی میں اسپیکر کی بجائے منارہ پر چڑھنے کو ضروری قرار دینا صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ اس طرح اذان کا مقصد زیادہ سے زیادہ دور تک آواز پہنچانا فوت ہو جاتا ہے۔ (ص۔ی)

[2] التعليق على الترمذى، بَابُ مَا جَاءَ فِي أَذَانِ الجُمُعَةِ، ج:۲، ص:۳۹۳

أخرجه أحمد و سنن أبی داؤد والترمذی وصححه والحاکم ①

لہٰذا اذانِ عثمانی آج بھی قابلِ عمل ہے۔

جواب ①: اس حدیث میں ''سُنّتِی'' کا لفظ پہلے ہے اور سنتِ خلفائے راشدین دوسرے نمبر پر ہے چونکہ حضرت سائب بن یزید کی مذکورۃ الصدر حدیثِ صحیح سے ثابت ہو چکا ہے کہ سنتِ نبوی صرف ایک ہی اذان ہے۔ لہٰذا آپ ﷺ کی سنتِ ثابتہ کے ہوتے ہوئے چاروں خلفائے راشدین کے کسی اتفاقی عمل کی بھی کوئی اہمیت باقی نہیں رہتی۔ یہاں تو سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ اکیلے ہیں۔

جواب ②: سنتِ خلفائے راشدین سے مراد ان کا طریق نظامِ حکومت ہے۔ چنانچہ امام محمد بن اسماعیل الامیر الکحلانی اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں:

«فَإِنَّهُ لَيسَ الْمُرَادُ بِسُنَّةِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِينَ إِلَّا طَرِيقَتُهُمُ الْمُوَافَقَةُ لِطَرِيقَتِهِ ﷺ مِن جِهَادِ الْأَعدَاءِ وَ تَقوِيَةِ شَعَائِرِ الدِّينِ وَ نَحوِهَا» ②

''خلفائے راشدین کی سنت سے ان کا وہ سیاسی اور انتظامی طریق کار مراد ہے جو رسول اللہ ﷺ کے طریق کے موافق ہو اور پھر یہ طریقِ کار دشمنانِ اسلام کے خلاف جہاد اور دوسرے دینی شعائر وغیرہ کی سربلندی اور تقویت سے تعلق رکھتا ہو۔''

جواب ③: «وَمَعلُومٌ مِن قَوَاعِدِ الشَّرِيعَةِ أَن لَيسَ لِخَلِيفَةٍ رَاشِدٍ أَن يُشرِعَ طَرِيقَةً غَيرَ مَا كَانَ عَلَيهَا النَّبِيُّ ﷺ» الخ ③

اور یہ بھی معلوم ہے کہ قواعدِ شریعت کی رُو سے کوئی بھی خلیفہ رسول اللہ ﷺ کے طریق کے علی الرغم کوئی طریقہ وضع کرنے کا مجاز نہیں رکھتا۔'' چنانچہ یہی وجہ ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے متعدد مقامات پر بہت سے مسائل میں حضرات شیخین رضی اللہ عنہما کی مخالفت کی ہے۔ جیسے حج تمتع، مسئلہ اضافۂ مہر، کتابیہ عورت سے نکاح وغیرہ اور یہ مخالفت اس بات کی دلیل ہے، کہ یہ حدیث اپنے عموم پر محمول نہیں۔ ورنہ وہ ایسا ہرگز نہ کرتے، بلکہ خلفائے راشدین کے ہر ایک قول و فعل کو حجت گردانتے۔ مگر انھوں نے ایسا نہیں کیا۔ لہٰذا معلوم ہوا خلفائے راشدین کا وہی طرزِ عمل حجت ہوگا، جو سنتِ ثابتہ کے موافق ہو۔ ورنہ ہرگز نہیں۔

۲۔ اذانِ عثمانی پر صحابہ رضی اللہ عنہم کا اجماع ہو چکا ہے۔ جیسا کہ ''فَثَبَتَ الْأَمرُ عَلٰی ذَالِكَ'' سے متبادر ہے

① سنن أبی داؤد، بَابٌ فِی لُزُومِ السُّنَّةِ، رقم: ٤٦٠٧

② سبل السلام: ٢/ ١١

③ سبل السلام: ٢/ ١١

ملاحظہ ہو!صحیح بخاري۔أبو داؤد، سنن نسائی)

جواب: بلاشبہ صحابہ رضی اللہ عنہم کا اجماع حجت ہے، مگر اذانِ عثمانی پر صحابہ کا اجماع ثابت نہیں۔ ورنہ حضرت علی۔حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما جیسے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم۔ امام زہری، امام حسن بصری رحمہم اللہ جیسے فقہاء تابعین اس کو بدعت اور مُحدَّث نہ گردانتے اور امام شافعی رحمہ اللہ جیسے مجتہد اس کے خلاف رائے قائم نہ کرتے اور نہ علمائے اہل مغرب اور شیخ ابن ناصر جیسے فحول علماء اس کو نظر انداز کرتے (جیسا کہ گزشتہ صفحات میں گزر چکا ہے) لہٰذا ہمارے نزدیک اس عبارت کا صحیح مطلب یہ ہے کہ امام بخاری، امام أبوداؤد، اور امام نسائی کے عہد میں اذانِ عثمانی کو قبول عام ہو گیا تھا۔ چنانچہ صاحب" المنهل العذب المورود شرح "سنن ابی داؤد" نے اس عبارت کا یہی مفہوم بیان کیا ہے۔ الفاظ یہ ہیں:

« هٰذَا كَانَ بِالنِّسبَةِ لِزَمَنِ اَبِی دَاوُد » [1]

۳۔ ایک روایت میں اذانِ عثمانی کو تیسری اذان اور دوسری روایت میں پہلی اذان اور تیسری روایت میں دوسری اذان کہا گیا ہے۔ ایسا کیوں ہے؟ لہٰذا مَا التَّوفِيقُ بَينَ هٰذِهِ الرِّوَايَاتِ المُتَعَارِضَة؟

جواب «وَ لَا مُنَافَاةَ. لِأَنَّهُ سُمِّیَ ثَالِثًا بِاِعتِبَارِ كَونِهٖ مَزِيدًا، وَ أَوَّلًا بِاعتِبَارِ كَونِهٖ فِعلُهٗ مُقَدَّمًا عَلَى الْاَذَانِ، وَالإِقَامَةِ. وَ ثَانِيًا بِاعتِبَارِ الْاَذَانِ الحَقِيقِ، لَا الِاقَامَةِ» [2]

'' ان تینوں روایات میں کوئی منافات نہیں۔ چونکہ اذانِ عثمانی ایک زائد اذان ہے۔ لہٰذا اس اعتبار سے اذانِ محمدی اور تکبیر کے مقابلہ میں اس کو تیسری اذان کہا گیا ہے اور چونکہ یہ اذانِ عہدِ نبوی اور عہدِ شیخین والی متوارث اذان سے پہلے دی گئی تھی۔ لہٰذا ان وجوہ کے اعتبار سے اس کو راوی نے پہلی اذان کہہ دیا ہے، اور تکبیر چونکہ اذانِ حقیقی کے حکم میں نہیں آتی۔ لہٰذا اذانِ حقیقی کے اعتبار سے اذانِ عثمانی دوسری اذان قرار پائی اور یوں ان روایات میں کوئی تعارض نہیں۔''

خلاصہ مباحث:

کتاب وسنت اور مسطورہ بالا فُحول علماء وفقہاء کی تصریحات اور تنقیحات کے مطابق جمعة المبارک کی ایک ہی اذان سنتِ نبوی، سنتِ صحابہ اور شرعی اذان ہے۔ بہر حال کہ دوسری اذان حضرت عثمان رضی اللہ عنہ جیسے عظیم صحابی اور خلیفۂ راشد کی ایجاد کردہ ہے۔ گو ضرورت کے تحت اب بھی اس کو اپنانے کی گنجائش ہے۔ تاہم

[1] المنهل العذب المورود:٢٤٦/٦

[2] عون المعبود:٤٢٣/١

اس کو ہر لحاظ سے مسنون اور شرعی اذان باور کرلینا درست نہیں۔ اگر یہ اذان ہر لحاظ سے مسنون اور شرعی ہوتی تو حضرت علی رضی اللہ عنہ اپنے دورِ خلافت میں اس کو نظر انداز نہ کرتے اور نہ حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما امام حسن بصری، اور امام زہری رحمہ اللہ، جیسے فقہاء تابعین اس کو بدعت اور محدث قرار دیتے۔ چنانچہ امام عبد الرحمٰن مبارکپوری رحمہ اللہ رقمطراز ہیں:

« فَإِذَا عَرَفتَ أَنَّهُ لَيسَ المُرَادُ بِسُنَّةِ الخُلَفَاءِ الرَّاشِدِينَ إِلَّا طَرِيقَتَهُمُ المَوَافِقَةَ لِطَرِيقَتِهِ ﷺ. لَاحَ لَكَ أَنَّ الِاستِدلَالَ عَلٰى كَونِ الْاَذَانِ الثَّالِثِ الَّذِی هُوَ مِن مُجتَهَدَاتِ عُثمَانَ رَضِیَ اللّٰهُ عَنهُ أَمرًا مَسنُونًا، لَيسَ بِتَامٍ. أَلَا تَرٰی أَنَّ ابنَ عُمَرَ t قَالَ الْاَذَانُ الْاَوَّلُ يَومَ الجُمُعَةِ بِدعَةٌ فَلَو كَانَ هٰذَا الِاستِدلَالُ تَامًّا، وَ كَانَ الْاَذَانُ الثَّالِثُ أَمرًا مَسنُونًا لَم يُطلَق عَلَيهِ لَفظُ البِدعَةِ، لَا عَلٰى سَبِيلِ الِانكَارِ، وَ لَا عَلٰى سَبِيلِ غَيرِ الِانكَارِ. فَإِنَّ الْاَمرَ المَسنُونَ لَا يَجُوزُ أَن يُطلَقَ عَلَيهِ لَفظُ البِدعَةِ بِأَيِّ مَعنًى فَتَفَكَّر »①

اور اسی طرح مسجد کے اندر منبر کے عین متصل اور خطیب کے بالکل قریب کھڑے ہو کر اذان کہنا بدعت ہے، اِلّا یہ کہ لاؤڈ سپیکر کا سہارا لیا جائے۔

لہٰذا کتاب و سنت کی روشنی میں دلیل کے لحاظ سے زید کا قول و فعل صحیح اور راجح ہے۔ بکر کا قول و فعل چنداں مضبوط نہیں۔ اس لیے زید کو برا بھلا کہنا درست نہیں۔ هذا ما عندی۔ واللّٰه تعالىٰ أعلم بالصواب۔

جوابِ تعاقب۔ عثمانی اذان کی شرعی حیثیت (از۔ شیخ الحدیث حافظ ثناء اللہ مدنی۔ لاہور)

میں نے جمعہ کی پہلی اذان کے بارے میں ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے بتایا تھا کہ یہ اذان خلیفۂ راشد حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانے میں شروع ہوئی تھی۔ پھر اس کے جواز پر اجماع ہوگیا۔ میرا یہ جواب دیگر سوالوں کے جواب کے ساتھ ہفت روزہ ''الاعتصام'' لاہور کی اشاعت ۲۔ اکتوبر ۱۹۸۹ء میں شائع ہوا تھا جس پر ''الاعتصام'' کے اسی شمارے میں حافظ صلاح الدین یوسف صاحب نے تعاقب کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ مطلقاً جواز محلِ نظر ہے۔ چنانچہ انھوں نے بعد ازاں ''الاعتصام'' کے مسلسل چار شماروں میں مولانا عبید اللہ عفیف صاحب کا ایک تفصیلی مضمون شائع کیا جو چار قسطوں میں مکمل ہوا۔

اسی بناء پر میں چند نکتوں کی وضاحت ضروری سمجھتا ہوں۔ لیکن بطورِ تمہید یہ عرض کر دوں کہ جمعہ کی پہلی

① تحفة الاحوذی: ۱/۳۶۹

اذان، جس پر عمل دورِ صحابہ سے آج تک شائع اور ذائع ہے، ان مسائل سے نہیں جنھیں بدعت قرار دے کر ختم کرنے کی ضرورت ہو، بلکہ اس کے بالمقابل جو قصبوں، دیہاتوں اور شہروں میں جگہ جگہ جمعوں کے تعدّد کو بنیاد بنا کر یہ کہا جاتا ہے کہ ایسی صورت میں پہلی اذان کی ضرورت ہی نہیں رہتی، وہ محلِ نظر ہے۔ کیونکہ رسولِ کریم ﷺ کے زمانے میں جمعہ کیلیے مسجدوں کی یہ بھرمار نہ تھی بلکہ جمعہ مسجد نبوی میں ہی ہوتا تھا۔ آج اس سنت کے اِحیاء کی زیادہ ضرورت ہے تاکہ لاؤڈ اسپیکروں کی آوازوں کا باہمی ٹکراؤ اور شور کم ہو کر مسلمانوں کی اجتماعیت مستحکم ہو۔

اس ابتدائی بات کے بعد اصل مسئلے کی وضاحت کے لیے ہم چند نکات پیش کرتے ہیں:

۱۔ کیا جمعہ کی پہلی اذان شرعی ضرورت تھی یا انتظامی تدبیر؟

۲۔ کیا مقامِ ''زوراء'' پر اس اذان کا ہونا غیر شرعی ہونے کی بناء پر تھا؟

۳۔ یہ اذان کیوں عام ہوئی؟ نیز کیا اس کی ضرورت ختم ہو چکی ہے؟

۴۔ خلفائے راشدین کی سنت کا سنتِ رسول ﷺ سے کیا تعلق ہے؟

۵۔ بعض ائمہ کا اس کو بدعت کہنا کیا مفہوم رکھتا ہے؟

۱۔ جمعہ کی پہلی اذان ختم کرنے والوں کی بنیادی غلطی یہ ہے، کہ وہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی جمعہ کے لیے پہلی اذان کے اضافے کی اصل وجہ کا تعین ٹھیک طور سے نہیں کر سکے۔ اسی لیے وہ اسے کبھی انتظامی تدبیر قرار دیتے ہیں، اور کبھی مقامی اور ہنگامی ضرورت۔ حالانکہ یہ کوئی ہنگامی یا مقامی مسئلہ نہیں تھا، بلکہ شرع میں اس کی مثال پہلے بھی موجود تھی۔ وہی اس کے مُطلق جواز کی دلیل ہے۔ مثلاً رسولِ کریم ﷺ کے زمانہ میں جب آپ ﷺ نے صبح کی نماز کے لیے نیند سے بیداری کے بعد تیاری کی ضرورت محسوس کی تو صبح کی اصل اذان سے قبل ایک اذان کا اضافہ کر دیا، جو حضرت بلال رضی اللہ عنہ دیا کرتے تھے۔[1] اسی طرح حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے جب لوگوں کی آبادی بڑھ جانے کی بناء پر یہ ضرورت محسوس کی کہ جمعہ کی اصل اذان سے قبل تیاری کے لیے ایک مزید اذان کی ضرورت ہے تو انھوں نے پہلی اذان کا اضافہ کر دیا۔ جس سے بڑا مقصد یہی تھا کہ نمازی خطبہ شروع ہونے سے قبل جمعہ کی مبارک گھڑیوں کا ثواب حاصل کر سکیں، جن کی صراحت صحیح احادیث میں موجود ہے۔

[1] اس بارے میں میرا تفصیلی مضمون ''الاعتصام'' کے ۲۹ ستمبر ۸۹ء کے شمارہ میں شائع ہو چکا ہے اور اس کا خلاصہ ۶ اکتوبر ۱۹۸۹ء کے شمارہ میں ''عثمانی اَذان'' کے ساتھ دیگر اسئلہ کے جواب میں دوبارہ پیش کر دیا تھا۔

بعض علماء نے اس کی شرعی اصل یہ بھی قرار دی ہے کہ حضرت عثمان نے اس اذان کو دیگر نمازوں کی اذان پر قیاس کیا تھا۔ جیسے تمام نمازوں کی اذان نماز کھڑی ہونے سے کچھ دیر پہلے ہوتی ہے۔ اسی طرح جمعہ کا خطبہ، جو نماز کے قائم مقام ہے، اس سے کچھ قبل اذان مناسب سمجھی۔ لہٰذا انھوں نے عام نمازوں کی اذان پر قیاس کر کے اس کے شرعی ہونے کی دلیل پیش کی ہے۔ بہر صورت وجہ کچھ بھی ہو، اس کے لیے شرعی دلیل موجود ہے۔ اس لیے یہ اذان مشروع ہے۔ ملاحظہ ہو: فتح الباری: ۲/ ۳۹٤۔

۲۔ جیسا کہ ذکر کیا گیا کہ عثمانی اذان شرعی دلیل کی بنیاد پر ہی شروع کی گئی تھی۔ چنانچہ اس اذان کا مقام ''زوراء'' پر مسجد سے دُور ہونا کوئی شرعی حیثیت نہیں رکھتا۔ اذان کا اصل مقصد اطلاع دینا ہوتا ہے جہاں سے اطلاع کا اصل مقصد پورا ہو سکے وہی مقام اس کے لیے موزوں ہوتا ہے۔ خود مولانا عبید اللہ عفیف صاحب اپنے مضمون کی تیسری قسط "تیسیر العلّام" کے حوالے سے ایسی توجیہ پیش کر چکے ہیں، جو حدیث اَبوداؤد سے بھی ثابت ہے، کہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ صبح کی اذان مسجد سے باہر ''بنی نجار'' کی ایک عورت کے مکان پر دیا کرتے تھے۔ جو نسبتاً بلند تھا۔ چونکہ ''زوراء'' مدینہ کی اس وقت کی مارکیٹ میں تھا۔ اس لیے کاروبار میں مصروف لوگوں کو تیاری کے لیے اطلاع دینے کی ضرورت بھی، وہاں زیادہ تھی جس سے بازار کے قریب آبادی کو بھی اطلاع مل جاتی تھی۔ لہٰذا اس بات کی کوئی زیادہ اہمیت نہیں کہ مقامِ ''زوراء'' مسجدِ نبوی سے کتنے فاصلے پر تھا؟ مولانا موصوف نے مدینہ منورہ کے مشہور قاضی شیخ عَطِیَّہ محمد سالم کے حوالے سے اس کا مقام متعین کرنے کی جو کوشش کی ہے، اس کا اصل مسئلے سے خاص تعلق نہیں۔ میں نے آج سے قریباً بیس سال قبل یہ جگہ دیکھی تھی جو ''باب المصری'' کے دائیں جانب بازار سے بجانب مغرب تھی۔ اس وقت وہاں ''مسجدِ فاطمہ'' موجود تھی، جس سے چند گز دُور مالک بن سنان صحابی کا مدفن بھی تھا۔ شیخ عطیہ مسجدِ فاطمہ رضی اللہ عنہا نزد قبر مالک بن سنان کو مقامِ ''زوراء'' بتاتے ہیں۔ آج کل یہ دونوں جگہیں مسجد نبوی کی توسیع میں شامل ہو چکی ہیں۔

شیخ موصوف میرے مدینہ منورہ میں حصولِ تعلیم کے دوران محترم اساتذہ میں سے تھے۔ وہ خود بھی عثمانی اذان کی مشروعیت کے قائل ہیں۔ اس کا ذکر انھوں نے اپنے استاد شیخ محمد امین شنقیطی (جن کے تلمذ کا مجھے بھی شرف حاصل ہے) کی تفسیر ''اَضواء البیان'' کی تکمیل کرتے ہوئے اس کی آٹھویں جلد صفحہ: ۲۶۶، میں صراحتاً کیا ہے۔ میں اپنے فتوے میں اپنے استاد مکرم حافظ عبد اللہ محدث روپڑی رحمہ اللہ کے حوالے سے بھی تائید پیش کر چکا ہوں، کہ اذان سے مقصد بذریعہ توحیدی کلمات اعلان ہی ہے۔ اس میں بازار یا دوسری جگہ

کی خصوصیت کا کوئی دخل نہیں، شانِ نزول کی طرح سبب حدیث کے اصولوں میں یہ بات مُسَلَّمہ ہے کہ خاص جگہ یا اشخاص میں شریعت محدود نہیں ہوا کرتی۔ (اَلعِبرَۃُ بِعُمُومِ اللَّفظِ لَا بِخُصُوصِ السَّبَبِ)

۳۔ چونکہ عثمانی اذان کا سبب شرعی تھا۔ مسلمانوں کا پھیلاؤ، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانہ اوراس کے بعد برابر زیادہ ہی ہوتا رہا ہے۔ اس لیے اس اذان پر عمل بھی برابر جاری رہا۔ اس کو امام زہری رحمہ اللہ نے "فَثَبَتَ الأَمرُ عَلٰی ذٰلِكَ" سے روایت کیا ہے، جس کا مفہوم واضح ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے اس عمل کا سلسلہ بعد کے زمانوں میں بھی چلتا رہا۔

امام ابن ابی ذئب نے، جن کو وَرَع وتقویٰ کے اعتبار سے امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ نے امام مالک رحمہ اللہ پر مقدم سمجھا ہے، اس اذان کے بارے میں "فَثَبَتَ عَلٰی ذٰلِكَ حَتّٰی السَّاعَۃ" کے الفاظ بھی ذکر کیے ہیں۔ یعنی ''ان کے زمانے تک یہ عمل قائم رہا۔'' ان کبار ائمہ کی طرف سے الفاظِ حدیث کے بعد والے تبصرے کا مفہوم یہ بتانا کہ یہ اذان صرف امام اَبوداؤد وغیرہ کے زمانہ میں عام ہوئی۔ کبار ائمہ کو فہم حدیث میں تلقین کرنے کے مترادف ہے۔[1]

ادارہ ''الاعتصام'' مولانا عبید اللہ عفیف صاحب کی تائید سے گھڑیوں، موجودہ لاؤڈ اسپیکروں کی موجودگی اور مساجد کی کثرت کی وجہ سے جو اس ضرورت کو اب اہمیت نہیں دے رہا، تو یہ بنیاد بھی درست نہیں۔ کیونکہ ضرورت صرف نماز کے وقت کی اطلاع دینے کی نہیں ہوتی بلکہ نمازیوں کی کثرت کی وجہ سے وقت سے پہلے تیاری کے لیے خبردار کرنے کی بھی ہے۔[2]

ہم اُوپر صبح کی پہلی اذان کے بارے میں توجیہ پیش کر چکے ہیں، جو اسی طرح نماز کے وقت سے پہلے ہوتی تھی۔ وقت سے پہلے نماز یا خطبہ کی تیاری وقتی اور ہنگامی ضرورت نہیں ہے بلکہ ایک مستقل ضرورت ہے۔ اسی لیے اس عمل پر اعتراض صحابہ رضی اللہ عنہم کے زمانہ میں ہوا اور نہ بعد میں اس کی مذمت کسی نے کبھی اس وجہ سے کی۔ مولانا عبیداللہ عفیف بھی دلائل تو اس کے عدمِ جواز کے پیش کرتے ہیں۔ لیکن دبے لفظوں میں ضرورت کی بناء پر جوازِ عمل بھی تسلیم کرتے ہیں۔

٤۔ ہفت روزہ ''الاعتصام'' نے اپنے تعاقب کی چوتھی قسط میں ''خدشات'' کے زیرِ عنوان خلفائے راشدین کی سنت کی بحث کا جس انداز سے سنتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے معارض ہونا ذکر کیا ہے۔ نامناسب ہے۔

---

[1] فتح الباری:۲/۳۹٤

[2] فتح الباری:۲/۳۹٤

ابتداء ہی سے خلفائے راشدین کے طرزِ عمل کو سنت سے ٹکرانا اور اسے غلط بتانا درست طریق کار نہیں۔ بالخصوص جب کہ دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم سے اس پر نکیر بھی وارد نہیں ہوئی ہو۔ اگر خلفائے راشدین کا طرزِ عمل سنت سے انحراف کا ہوتا تو حدیث میں اس پر سنت کا اطلاق بھی نہیں ہونا چاہیے تھا۔ حالانکہ رسول کریم ﷺ نے اس کے لیے نہ صرف سنت کا لفظ بولا بلکہ اسے مضبوطی سے اختیار کرنے کی تلقین بھی فرمائی۔

«عَلَيكُم بِسُنَّتِي وَ سُنَّةِ الخُلَفَاءِ الرَّاشِدِينَ»[1]

اس کا واضح مفہوم یہ ہے کہ خلفائے راشدین کا طریقہ اللہ کے رسول ﷺ کی سنتوں کے مختلف پہلوؤں ہی کی وضاحت ہوتا ہے۔ اس لیے دونوں کے بظاہر مختلف نظر آنے پر پہلی صورت دونوں کو جمع کرنے کی اختیار کرنی چاہیے۔ جو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی اذان میں بوجوہ موجود ہے۔ ان کے طرزِ عمل کو آپ ﷺ نے اپنے طریقے کے ساتھ اسی لیے جمع کیا کہ وہ بھی رسول کریم ﷺ کے نائب ہونے کے منصب سے دین اور اس کے مختلف پہلوؤں کی حفاظت کرنے والے ہوتے ہیں۔ لہٰذا ان کے بارے میں دین میں تبدیلیاں یا بگاڑ کا تصور اتنا آسان نہیں۔ خصوصاً جمعہ کی پہلی اذان جیسا مسئلہ جس پر نہ صرف صحابہ نے اعتراض نہیں کیا بلکہ رواج اس پر پختہ ہوا۔

البتہ اگر رسول کریم ﷺ کی سنت سے خلفائے راشدین کی کسی رائے کے اتفاق کی کوئی صورت ممکن نہ ہو تو بلاشبہ شریعت سنّت رسول اللہ ﷺ ہی ہوگی۔ کیونکہ خلفائے راشدین کو شریعت میں اضافہ کی اجازت نہیں۔ لیکن جس بات کی دلیل شریعت میں موجود ہو وہ شریعت میں تبدیلی یا اضافہ نہیں ہوتی۔ جیسا کہ اذانِ عثمانی کے بارے میں اُوپر واضح ہو چکا۔ ایسی چیزوں کے بارے میں ہی سنتِ خلفائے راشدین کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ ورنہ اگر ہر بات جو رسول کریم ﷺ کے زمانہ میں موجود ہو وہی سنت ہو تو آپ ﷺ نے اپنی سنت کے ساتھ خلفائے راشدین کی سنت کو اختیار کرنے کا حکم ہی کیوں فرمایا؟

ظاہر ہے کہ وہ بظاہر ایک الگ فعل ہوگا۔ لیکن دلیل شرعی کے تحت آ جانے کی وجہ سے سنتِ رسول ﷺ کا تتمّہ بن جاتا ہے۔

۵۔ اذانِ عثمانی کے بارے میں بعض ائمہ کے لفظ "بِدعَةٌ" یا "مُحدَثٌ" سے کسی کو یہ غلط فہمی نہ ہو کہ شاید ان کے نزدیک یہ اذان اصطلاحی بدعت کی مذموم شکل ہے۔ حالانکہ ائمہ ایسی نئی صورتوں کو بھی لغۃً "مُحدَثٌ" ہی سے تعبیر کرتے ہیں۔ جن کی شکل نئی ہو۔ خواہ اس کی دلیل شریعت میں موجود ہو۔

---

[1] سنن ابن ماجه، بَابُ اتِّبَاعِ سُنَّةِ الخُلَفَاءِ الرَّاشِدِينَ المَهدِيِّينَ، رقم: ٤٢

چنانچہ عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا عثمانی اذان کو بدعت کہنا اس معنی میں ہے۔ جس معنی میں ان کے والد حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے باجماعت تراویح کو ''نِعمَتِ البِدعَةُ هٰذِه'' کہا تھا۔

یہ بدعت کا لغوی معنی میں استعمال ہے۔ جس طرح حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے تراویح کو باجماعت صورت میں رواج دیا اور اسے اچھی بدعت کہا اسی طرح ان کے بیٹے عبد اللہ نے اذانِ عثمانی کے رواج کو بدعت سے تعبیر کیا۔ حضرت عمر اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہما دونوں خلیفہ راشد ہیں اور اسی حیثیت میں ان کا طرزِ عمل شرعی ہونے کی بناء پر قابلِ اطاعت ہے۔

باقی رہا حضرت علی رضی اللہ عنہ کا کوفے میں طرزِ عمل کو کہ انھوں نے اذانِ عثمانی کو اختیار نہیں کیا۔ تو یہ کوئی قابلِ اعتراض بات نہیں۔ کوئی بھی حضرت عثمان کی اذان کے وجوب کا قائل نہیں۔ لیکن اس سے عثمانی اذان کا غیر مشروع ہونا لازم نہیں آتا۔ ممکن ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنے دَورِ خلافت میں کوفہ کے علاوہ دیگر علاقوں میں عثمانی اذان کو باقی رکھ کر خود اس پر عمل صرف کوفہ میں اس لیے چھوڑ دیا ہو کہ کوفے والوں کا رجحان بنو اُمیہ کی مخالفت کا تھا۔ ظاہر ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ بنو امیہ سے تھے اور انہی کی ہمدردی کے دعویٰ سے شام وغیرہ میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کوفہ والوں کے خلاف برسرپیکار تھے۔ ایسی مصلحتیں مباحات میں اختیار کرنا کسی کے نزدیک معیوب نہیں۔ بہر صورت حضرت علی رضی اللہ عنہ کی وسیع مملکت میں صرف کوفہ میں ایک اذان پر اکتفا عثمانی اذان کی غیر مشروعیت کی دلیل نہیں بن سکتا۔ بالخصوص جب حضرت علی رضی اللہ عنہ سے اس اذان کی زبانی مخالفت نہ حضرت عثمان کے دَور میں ثابت ہے اور نہ اس کے بعد۔ یہی توجیہ اگر سامنے رہے تو بعض سلف مثلاً: حسن بصری، زہری اور امام شافعی رحمہم اللہ وغیرہ کی آراء کی وجہ بھی معلوم ہو جاتی ہے کہ یہ تینوں بھی اہلِ بیت کے ہمدردوں میں شمار کیے جاتے ہیں لیکن ان میں سے کسی نے بھی عثمانی اذان کو غیر شرعی نہیں کہا۔

ہماری مذکورہ بالا گفتگو کا حاصل یہ ہے کہ عثمانی اذان کے رواج کے خلاف تگ و دَو کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ ایک جائز امر جس کے جواز پر اجماعِ امت موجود ہو۔ احیاءِ سنت کی سرگرمیوں کے درمیان رکاوٹ نہیں بن سکتا۔ اگرچہ بعض مخصوص علاقوں میں جب بعض لوگوں نے اپنی بدعات کو سہارا دینے کے لیے اذانِ عثمانی سے استدلال کی کوشش کی، تو بعض اہلِ علم نے اس مصلحت سے اذانِ عثمانی کو چھوڑ کر جمعہ کی ایک اذان پر اکتفا کرنے کو ترجیح بھی دی۔ برّصغیر پاک و ہند کے بعض علماء اور مصر و شام کے شیخ احمد محمد شاکر اور شیخ ناصر الدین البانی رحمہم اللہ وغیرہ کی توضیحات سے بھی یہی مقصود ہے۔ (واللہ اعلم بالصواب)

جمعۃ المبارک کی دوسری اذان خطبہ سے پہلے یا بعد میں؟

سوال: جمعۃ المبارک کی دوسری اذان خطبہ سے پہلے دینی چاہیے یا بعد میں۔ بعض لوگ خطبہ کے بعد دوسری اذان دیتے ہیں۔

جواب: جمعہ کی دوسری اذان خطیب جب منبر پر بیٹھ جائے، اس وقت دینی چاہیے۔ سائب بن یزید کی روایت میں ہے:

« كَانَ النِّدَاءُ يَومَ الجُمعَةِ اَوَّلَهُ اِذَا جَلَسَ الاِمَامُ عَلٰى المِنبَرِ »[1]

''خطبہ کے بعد اذان کا کوئی ثبوت نہیں۔''

اصل بات یہ ہے کہ حنفیہ کے نزدیک تقریر اور خطبہ میں فرق ہے۔ شروع میں مقامی زبان میں جو گفتگو کرتے ہیں اس کا نام وہ تقریر رکھتے ہیں اور جمعہ کا خطبہ بزبان عربی پڑھنا ان کے نزدیک شرط ہے۔ اس لیے وہ تقریر کے بعد اذان دیتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یوں سمجھیں کہ ان کے جمعہ کا آغاز ہی اس اذان سے ہوتا ہے لیکن یہ عمل بھی بدعت ہے، کیونکہ قبل از جمعہ شریعت میں تقریر نامی کوئی شے ثابت نہیں۔ دراصل حنفیہ نے اس حیلہ سے اپنی ایک الجھن کا حل تلاش کرنے کی بے کار سعی کی ہے۔ وہ یہ ہے کہ خطبۂ جمعہ عربی زبان کے بغیر دینا ان کے نزدیک جائز نہیں (گو نماز فارسی میں جائز ہو) لیکن عامۃ الناس عربی زبان کو سمجھ نہیں پاتے۔ اس بناء پر تقریر نامی بدعت کو انھوں نے ایجاد کیا، تاکہ عوام کی رغبت اہلِ حدیث کے خطبوں سے پھر جائے جو مقامی زبان میں خطبوں کے جواز کے قائل ہیں۔ مسئلہ ہذا کی تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو! فتاویٰ علمائے حدیث: (۸۴/۳تا۸۷)

جمعہ کی دو اذانوں کا حکم:

سوال: ہمارے بعض اہلِ حدیث کی مساجد میں جمعہ کی ایک اذان اور جب کہ اہلحدیث کی بعض مساجد میں جمعہ کی دو اذانیں دی جاتی ہیں۔ ایک اذان دینے والے اہلحدیث کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ کے عہد میں صرف ایک اذان عند الخطبہ دی جاتی تھی لہٰذا دوسری اذان دینا جائز نہیں۔ مگر دو اذان دینے والے اہلحدیث کہتے ہیں کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے جب لوگوں کی کثرت دیکھی تو انھوں نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی موجودگی میں اذان عند الخطبہ کے علاوہ ایک اور وقتی اذان جیسی نماز ظہر کے لئے ہوتی ہے، جاری کر دی جس

[1] صحیح البخاری، بَابُ الأَذَانِ يَومَ الجُمُعَةِ، رقم:۹۱۲

کا کسی صحابی نے انکار نہ کیا۔ لہٰذا آنحضرت ﷺ کے فرمان «عَلَيكُم بِسُنَّتِي وَسُنَّةِ الخُلَفَاءَ الرَّاشِدِينَ المَهدِيِّينَ»[1] کے تحت اذان عندالخطبہ دینے سے سُنتِ رسول ﷺ اور اذان وقتی سے سُنتِ خلفاء، دونوں سُنتوں پر عمل ہو جائے گا۔ چونکہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی یہ سنت، سنت رسول ﷺ کے مخالف نہیں لہٰذا یہ حضرات کہتے ہیں کہ ہمارے نزدیک جمعہ کی دو اذانیں مسنون ہیں۔

براہِ کرم قرآن وحدیث کی روشنی میں اس مسئلہ کا حل ارسال کر کے ممنون فرمائیں کہ کیا جمعہ کی دو اذانیں دینا جائز اور مسنون ہیں یا نہیں؟

(جواب): اصلاً جمعہ کی صرف ایک اذان ہے، جو خطیب کے منبر پر بیٹھنے کے وقت دی جاتی ہے۔ اذانِ عثانی کا محض جواز ہے۔ کیونکہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ خلیفہ مطاع تھے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی کثیر تعداد نے ان کے اس فعل پر موافقت کی ہے۔ اس وقت حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے سامنے عہدِ نبوی کی بطورِ مثال بلالی اذان موجود تھی، جو نماز فجر کی تیاری کے لئے قبل از وقت دی جاتی تھی۔ اسی طرح اذانِ عثانی کا اضافہ بھی قبل از وقتِ جمعہ کی تیاری کے لئے ہوا۔ لہٰذا اگر کوئی ایک اذان دے یا کوئی دو کا قائل ہو تو کسی پر نکیر نہیں ہونی چاہیے۔

اگرچہ اولیٰ ایک ہے۔ موضوع ہذا پر میرا ایک تفصیلی فتویٰ بعنوان ''عثانی اذان کی شرعی حیثیت'' چند سال قبل فتاویٰ ثنائیہ مدنیہ (جلد:۱) اور جملہ جماعتی جرائد و مجلّات میں شائع ہو چکا ہے۔ اس میں جانبین کے دلائل کا محاکمہ علمی انداز میں کیا گیا تھا۔ جو کافی مفید ہے۔

کیا اقامتِ جمعہ کے لئے مسجد کا وجود شرط ہے؟:

(سوال) ایسی جگہ جو مدرسہ کے لئے وقف ہو، کیا اس کی عمارت میں بچوں کی تعلیم کے علاوہ نمازِ پنجگانہ خصوصاً نماز جمعہ وعیدین کا ادا کرنا جائز ہے؟ جبکہ اس میں مسجد کی خاص علامات مثلاً مینار، منبر اور محراب وغیرہ بھی نہیں ہیں۔ (محمد فیاض کھوکھر، سیالکوٹ)

(جواب) اقامتِ جمعہ کے لئے مسجد کا وجود شرط نہیں۔ چنانچہ فقیہ ابن قدامہ فرماتے ہیں:

«ولا يشترط لصحة الجمعة إقامتها فى البنيان ويجوز إقامتها فيما قاربه من الصحراء وبها قال ابو حنيفة»

یعنی ''اقامتِ جمعہ کے لئے عمارت کا ہونا شرط نہیں۔ اس کے قریب میدان میں بھی جائز ہے۔

[1] سنن ابن ماجه،بَابُ اتِّبَاعِ سُنَّةِ الخُلَفَاءِ الرَّاشِدِينَ المَهدِيِّينَ،رقم:٤٢

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ بھی اسی بات کے قائل ہیں۔''

اس کی دلیل یہ ہے کہ مصعب بن عمیرؓ نے انصار کو جمعہ نقیع خضمات میں واقع ایک وادی ھزم النبیت میں پڑھایا تھا اور اس لئے بھی کہ عید پڑھنے کا مقام جنگل ہے۔ جمعہ بھی چونکہ ایک طرح کی عید ہے، لہٰذا اسے بھی جنگل میں ادا کیا جا سکتا ہے۔ (تفصیل کیلئے: المغنی:۳/ ۲۰۹)

جب جمعہ کی ادائیگی کے لئے مسجد کا وجود شرط نہیں تو کسی بھی دوسرے مقام پر جمعہ پڑھا جا سکتا ہے، خواہ وہ مدرسہ کی عمارت ہو یا کوئی دوسری جگہ۔ اس کے علاوہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قول: جمعوا حيثما كنتم ''جہاں کہیں بھی تم ہو جمعہ پڑھ لو۔'' بھی اسی بات کا موید ہے۔

اور عید اصلاً باہر پڑھنی چاہیے بامر مجبوری یہاں پڑھنے کا بھی جواز ہے اور مینار و محراب کی قیود بلا فائدہ ہیں، تاہم منبر کا وجود جمعہ میں حتیٰ المقدور سنت ہے، جبکہ عید کا خطبہ بلا منبر ہونا چاہیے۔

ابواب الصلوٰۃ

آدابِ نماز

نماز کے لیے قبلہ کی صحیح سمت معلوم کرنا:

(سوال): صحیح سمت قبلہ معلوم کرنے کا طریقہ مع وقت اور تاریخ الاعتصام: جلد:۵۱، شمارہ:۱۸،ص:۳۱، میں شائع ہوا تھا۔ کیا اب اس کے مطابق معلوم شدہ صحیح سمت کی طرف عین رُخ کر کے نماز ادا کرنی چاہیے اور اسی کے مطابق نئی مسجد جہاں ضرورت ہو بنانی چاہیے، یا صرف جہت قبلہ ہی کافی ہے؟

(جواب): نماز کے لیے صحیح سمت قبلہ کی کوشش ہونی چاہیے اور اسی سلسلے میں ماہرین اور تجربہ کار لوگوں کے تجربات سے بھی فائدہ اٹھانا چاہیے۔ اس کے باوجود اگر کوئی فرق رہ جائے۔ تو اللہ تعالیٰ معاف کرنے والا ہے۔ تاہم اہلِ علم کا اس بات پر اتفاق ہے، کہ کعبہ کے اندر بیت اللہ نظر آنے کی صورت میں کسی دوسرے رُخ میں نماز پڑھ لی تو نماز نہیں ہوگی۔

''نماز'' اور ''صلوٰۃ'' میں کیا فرق ہے؟

(سوال): ''نماز'' اور ''صلوٰۃ'' میں کیا فرق ہے اور لفظِ ''نماز'' اسلامک لٹریچر میں کہاں سے آیا؟

(جواب): لفظ نماز، اور صلوٰۃ، ہم معنی ہیں۔ نماز، اردو زبان میں بولا جاتا ہے جب کہ لفظ 'صلوٰۃ، عربی ہے۔ لفظ 'نماز، اسلامک لٹریچر میں 'صلوٰۃ، کے ترجمے کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔

نمازیں ضائع کرنے والے جہنمی ہیں، اس کا قرآنی حوالہ درکار ہے:

(سوال): جن لوگوں نے نماز کو ضائع کیا وہ عنقریب جہنم کے ایک خاص طبقے میں ڈالے جائیں گے۔ اس بات کا قرآنی حوالہ درکار ہے۔

(جواب): ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿فَخَلَفَ مِن بَعْدِهِمْ خَلْفٌ أَضَاعُوا الصَّلَاةَ وَاتَّبَعُوا الشَّهَوَاتِ فَسَوْفَ يَلْقَوْنَ غَيًّا﴾ (مریم:۵۹) ''پھر ان کے بعد چند ناخلف ان کے جانشین ہوئے جنھوں نے نماز کو کھو دیا اور خواہشاتِ نفسانی کے پیچھے لگ گئے، سو عنقریب ''غی'' میں ڈالے جائیں گے۔''

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: ''غی'' جہنم میں ایک وادی کا نام ہے۔ (تفسیر قرطبی:١١/ ١٢٥)

پنجگانہ نماز کی رکعات کی تفصیل حدیث کی روشنی:

سوال: پنجگانہ نماز کی رکعات کی تفصیل حدیث کی روشنی میں بیان فرمائیں کہ کچھ لوگ پنجگانہ نماز کی رکعات اس طرح پڑھتے ہیں، فجر ۴ رکعت، ظہر ۱۰ رکعت، عصر ۴ رکعت، مغرب ۵ رکعت اور عشاء ۷ رکعت اور بعض فجر ۴ رکعت، ظہر ۱۲ رکعت، عصر ۴ رکعت، مغرب ۷ رکعت اور عشاء ۱۷ رکعت۔

کیا نیچے والی رکعات پڑھنے والا درست ہے یا اُوپر والا، اور حدیث میں ان کی تعداد کتنی ہے۔ اگر کوئی نیچے والی رکعتیں پڑھے تو وہ بدعت تو نہیں کرے گا اور اگر اُوپر والی رکعات پڑھے تو نماز درست ہوگی؟

جواب: نمازوں کی رکعات کی پہلی تعداد زیادہ صحیح ہے۔ البتہ عشاء کے بعد وِتر ایک سے لے کر ۹ تک پڑھے جا سکتے ہیں۔ مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو! ہمارے شیخ محدث روپڑی رحمہ اللہ کی کتاب ''تعلیم الصلوۃ'' (ص:۵۵۔۵۶،۶۱ تا ۶۳)

دورانِ نماز اگر شیطانی وسوسہ آئے تو کیا کریں؟

سوال: کوئی شیطانی وسوسہ دل و دماغ میں اٹھتا ہے تو فوراً (أَعُوذُ بِاللّٰہِ) اور (لَا حَولَ) پڑھ لیتی ہوں لیکن کبھی کبھی نماز کی حالت میں انتہائی خوفناک بلکہ اتنا وحشتناک وسوسہ اٹھتا ہے کہ دل دہل جاتا ہے ایسی صورت میں کیا کیا جائے؟ حالانکہ حفظ ما تقدم کے طور پر اکثر و بیشتر سورہ فاتحہ کے شروع میں أَعُوذُ بِاللّٰہِ پڑھتی ہوں، مگر پھر بھی کبھی کبھی یہ حملہ نماز کے دوران ہو جاتا ہے اس وقت سمجھ نہیں آتی کہ کیا کروں۔

جواب: ایسی صورت میں بحالتِ نماز ہی تعوذ پڑھ کر تین دفعہ بائیں طرف پھونک مارا کریں۔ [1]

کیا داڑھی منڈوانے اور شلوار ٹخنوں سے نیچے رکھنے پر نماز میں نقص واقع ہوتا ہے؟

سوال: موحد، پرہیز گار شخص جو ساری نمازیں جماعت کے ساتھ ہی پڑھتا ہے۔ داڑھی منڈواتا ہے شلوار ٹخنوں سے نیچے رکھتا ہے اور اس پر اصرار کرتا ہے کیا ایسی چیزوں سے نماز میں نقص واقع تو نہیں ہوتا؟

جوابہ: ایسے امور سے نماز میں نقص پیدا ہوتا ہے۔ یہ اعمال ﴿إِنَّ الصَّلَاةَ تَنْهَى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ﴾ (العنکبوت:۴۵) کے برعکس اور منافی ہیں، جو یقیناً خسارے کا سودا ہے۔

[1] صحیح مسلم، بَابُ التَّعَوُّذِ مِنْ شَيْطَانِ الْوَسْوَسَةِ فِي الصَّلَاةِ، رقم:۲۲۰۳

عورت کا جوڑا باندھ کر نماز پڑھنا:

(سوال): کیا عورت جوڑا باندھ کر نماز پڑھ سکتی ہے؟ دلائل سے وضاحت کر دیں۔

(جواب): جوڑا باندھ کر نماز پڑھنا درست نہیں ہے۔ چنانچہ صحیح بخاری میں حدیث ہے کہ:

« وَلَا يَكُفُّ ثَوبَهٗ، وَلَا شَعرَهٗ »[1]

''کوئی آدمی اپنے کپڑے اور بالوں کو اکٹھا نہ کرے۔''

''سنن ابی داؤد'' میں بسند جید مروی ہے، کہ ابو رافع رضی اللہ عنہ نے حسن بن علی کو دیکھا کہ وہ اپنی گدی پر بال باندھ کر نماز پڑھ رہے تھے، تو انہوں نے کھول دیئے، اور کہا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے، کہ ''یہ شیطان کے بیٹھنے کی جگہ ہے:« بَابٌ : اَلرَّجُلُ لَا يُصَلِّي عَاقِصًا شَعرَهٗ.»[2]

اس واقعے کا تعلق اگرچہ مَرد سے ہے، لیکن اصلاً شرعی احکام و مسائل میں مرد و زن سب برابر ہیں، اِلَّا یہ کہ تخصیص کی کوئی دلیل ہو، جو یہاں نہیں ہے۔

امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: کہ اس فعل کی ممانعت پر علماء کا اتفاق ہے۔ مگر یہ کراہت تنزیہی ہے۔ اگر کوئی شخص اس حالت میں نماز پڑھ لے۔ تو نماز درست ہوگی۔ البتہ یہ کام ہے مکروہ (ناپسندیدہ)[3]

''فتح الباری'' میں ہے کہ « وَاتَّفَقُوا عَلٰى أَنَّهٗ لَا يُفسِدُ الصَّلَاةَ » (۲۹۶/۲) ''علماء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ فعل ہذا سے نماز فاسد نہیں ہوتی۔''

کیا ہر زندہ انسان پر نماز فرض ہے......؟

(سوال): کیا ہر زندہ انسان پر نماز فرض ہے؟ اگر فرض ہے تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام بھی تو زندہ آسمانوں پر اٹھائے گئے ہیں وہاں وہ کھاتے پیتے ہیں اور زندہ ہیں کیا وہ وہاں نماز پڑھتے ہیں تو کونسی؟ محمدی یا اپنی نبوت والی؟

(جواب): قرآن مجید میں ''سورہ آل عمران'' میں ہے:

﴿وَ اِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ لَمَاۤ اٰتَيْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَّ حِكْمَةٍ ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَ لَتَنْصُرُنَّهٗ قَالَ ءَاَقْرَرْتُمْ وَ اَخَذْتُمْ عَلٰى ذٰلِكُمْ اِصْرِيْ قَالُوْۤا اَقْرَرْنَا قَالَ فَاشْهَدُوْا وَ اَنَا مَعَكُمْ مِّنَ الشّٰهِدِيْنَ﴾ (ال عمرٰن:۸۱)

[1] صحیح البخاری، بَابُ لَا يَكُفُّ شَعَرًا، رقم:۸۱۵

[2] فتح الباری:۲۹۹/۲

[3] عون المعبود: ۲٤٦/۱

''اور جب اللہ تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام سے وعدہ لیا، کہ جو کچھ میں تم کو کتاب و حکمت سے عطا کروں۔ پھر تمہارے پاس رسول آجائے، جو کچھ تمہارے پاس ہے وہ رسول اس کی تصدیق کرے۔ البتہ تم ضرور اس کے ساتھ ایمان لاؤ گے اور البتہ ضرور اس کی مدد کرو گے۔ فرمایا: کیا تم نے اقرار کیا؟ اور کیا تم نے اس شرط پر میرے عہد کا بوجھ اٹھایا؟ انھوں نے کہا ہم نے اقرار کیا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اب تم گواہ رہو اور میں تمہارے ساتھ گواہی دینے والوں سے ہوں۔''

یہ وعدہ گزشتہ انبیاء علیہم السلام سے لیا گیا جن میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام بھی شامل تھے۔ جیسے دیگر انبیاء علیہم السلام پر اس عہد کی پیروی ضروری تھی۔ اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر بھی اس عہد کی پابندی ضروری ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ شریعت محمدی کے نفاذ کے بعد حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے جملہ امور اسی شرع کے تابع ہیں۔ چاہے وہ زمین پر ہوں یا آسمان پر۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ کیونکہ شریعت محمدی کا نفاذ ہر جگہ ہے۔

ایک روایت میں ہے:

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اگر موسیٰ علیہ السلام زندہ ہوتے تو ان کو میری اتباع کے بغیر کوئی چارہ نہ ہوتا۔''

(مشکوٰۃ باب الاعتصام بالکتاب والسنۃ) [1]

جب حضرت موسیٰ علیہ السلام پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع ضروری ہے، تو حضرت عیسیٰ بن مریم پر بطریقِ اولیٰ ضروری ہوگی۔ بلاشک حضرت عیسیٰ علیہ السلام اپنی امت کے لیے رسولِ برحق تھے۔ لیکن ان نصوص کی بناء پر وہ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے امتی بھی ہیں۔ لہٰذا ان کی نماز کا طریقہ ہم جیسا ہے۔ بعض متعصب مقلدین حنفیہ نے تو یہاں تک کہہ دیا، کہ جب وہ نازل ہوں گے، تو حنفی فقہ کے پیروکار ہوں گے۔ نہیں میرے بھائی! ان کا مسلک تو خالصتاً کتاب وسنت پر مبنی ہوگا۔

اوقاتِ نماز

قطبین وغیرہ علاقوں میں نماز کے وقت کا حساب:

سوال: اگر کسی مقام پر شام کی لالی ختم ہونے سے پہلے صبح کی روشنی نمودار ہوجائے تو نماز عشاء کس وقت پڑھی جائے گی؟ یا ساقط ہوجائے گی؟ خصوصاً قطبین پر چھ ماہ کا دن اور چھ ماہ کی رات ہوتی ہے تو اوقات نماز اور روزہ کس طرح مقرر رہوں گے یا ساقط ہوجائیں گے؟

[1] مصنف ابن ابی شیبة، بَابُ مَنْ کَرِہَ النَّظَرَ فِی کُتُبِ أَھْلِ الْکِتَابِ، ۲۶۴۲۱، مسند احمد ۱۴۶۳۱

(جواب) : ایسے علاقوں میں نماز اور روزہ کا حساب معروف اوقات کے مطابق ہوگا۔ قصۂ دجال کی روایت اس امر کی مصرح (وضاحت کرنے والی) ہے۔ ملاحظہ ہو مشکوٰۃ۔

نبی اکرم ﷺ کی نماز کا وقت:

(سوال) : مہربانی فرما کر ہمیں قرآن وسنت کی روشنی میں بتائیں کہ نبی اکرم ﷺ اپنی زندگی میں کون سے وقت میں نماز پڑھتے تھے۔ سورج ڈھل جانے کے فوراً بعد یا دیر سے اور عصر کی نماز کا کیا وقت تھا کیا آدمی کا سایہ اس کے مثل ہو جائے یا کہ دو مثل ہو جائے اور پھر نبی ﷺ اذان میں اور جماعت میں کتنا وقت لیتے تھے جواب دے کر ممنون فرمائیں۔

(جواب) : صحیح مسلم میں عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے، کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ظہر کا وقت ہے جب آفتاب ڈھلے اور (رہتا ہے اُس وقت تک کہ) ہو سایہ آدمی کا اس کے قد کے برابر۔ (لیکن دوپہر کا سایہ مثل میں داخل نہیں) جب تک نہ آئے عصر کا وقت اور عصر کا وقت ہے۔ جب تک کہ نہ آفتاب زرد ہو اور نمازِ مغرب کا وقت ہے۔ جب تک کہ نہ غائب ہو سرخی اور نمازِ عشاء کا وقت ہے۔ ٹھیک آدھی رات تک اور نمازِ صبح کا وقت ہے۔ پَو پھٹنے سے طلوعِ آفتاب تک۔

امام نووی رحمہ اللہ شرح مسلم میں فرماتے ہیں: کہ جب ہر چیز کا اصلی سایہ چھوڑ کر اس کے برابر ہو جائے تو ظہر کا وقت چلا جاتا ہے اور عصر کا وقت داخل ہو جاتا ہے اور صحیح مسلم وغیرہ کی دوسری روایت میں ہے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اکرم ﷺ نمازِ عصر پڑھتے اور آفتاب ہوتا تھا بلند زندہ، یعنی روشن ہوتا بغیر زردی کے۔ اور حدیث امامتِ جبرئیل علیہ السلام میں ہے، کہ پھر جبریل علیہ السلام نے نماز عصر پڑھائی۔ جب کہ ہر شی کا سایہ اس کے مثل ہو گیا اور دوسرے روز عصر اس وقت پڑھائی جب ہر شَیٔ کا سایہ اس کے دو مثل تھا۔ پھر فرمایا: ان دونوں کے درمیان وقت ہے۔

شیخنا محدث روپڑی رحمہ اللہ اس پر رقمطراز ہیں: پس معلوم ہوا کہ جبرائیل علیہ السلام نے جس وقت نماز پڑھائی ہے، اس وقت سے ذرا ہٹ کر پڑھے۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ گرمیوں میں ظہر کی نماز تین قدم سے پانچ قدم تک پڑھتے اور سردیوں میں پانچ قدم سے سات قدم تک۔ سردیوں گرمیوں میں دو قدم کا فرق بتلا رہا ہے، کہ زوال یعنی سورج ڈھلنے کا سایہ تین قدم ہونے پر نماز پڑھتے تھے۔ حالانکہ سردیوں میں اتنی تاخیر کی ضرورت نہیں۔ یہ صرف اس خاطر تاخیر ہوتی تھی، کہ اذان کے بعد کچھ انتظار کرنا چاہیے۔ ایک حدیث میں ہے کہ اتنا انتظار چاہیے کہ کھانے پینے والا کھانے پینے سے فارغ ہو جائے، اور اجابت والا اجابت کی حاجت

سے فارغ ہو جائے۔ ''شرح بلوغ المرام'' میں لکھا ہے، کہ اگر چہ اس حدیث میں ضعف ہے، لیکن اذان کی غرض اس کی مؤید (تائید کر رہی) ہے۔ کیونکہ اذان کی غرض یہی ہے، کہ لوگ سن کر پہنچ جائیں۔ نیز بخاری میں حدیث ہے:

« بين كُلِّ اَذَانَين صَلٰوةٌ ثَلَاثًا لِمَن شَاءَ. » ①

''آپ نے تین دفعہ فرمایا: کہ ہر اذان اور اقامت کے درمیان جو چاہے نماز پڑھ سکتا ہے۔''

اگر اذان اور اقامت کے درمیان وقفہ نہ کیا جائے تو جو نفل پڑھنا چاہے، نہیں پڑھ سکے گا۔ ہاں مغرب میں دونفلوں سے زیادہ وقفہ نہ کرنا چاہیے۔ کیونکہ اس کا وقت تنگ ہے۔ دوسری نمازوں میں اتنی افراتفری کی ضرورت نہیں۔ (فتاویٰ اہلِ حدیث:۲/۶۰۔۶۱)

طلوعِ آفتاب کا مقررہ وقت سے کتنے منٹ بعد نماز پڑھ سکتے ہیں؟

سوال: طلوعِ آفتاب کا جو وقت لکھا ہوتا ہے اس کے کتنے منٹ بعد نماز پڑھ سکتے ہیں؟

جواب: تقریباً دس منٹ بعد نماز پڑھی جا سکتی ہے۔

نصف النہار اور زوال کا مقررہ وقت سے کتنے منٹ بعد نماز پڑھ سکتے ہیں؟

سوال: نصف النہار اور زوال کا جو وقت لکھا ہوتا ہے اس کے کتنے منٹ بعد نماز پڑھ سکتے ہیں؟

جواب: تقریباً دس منٹ بعد۔

ظہر سے پہلے زوال کا وقت:

سوال: زوال کا وقت ظہر سے پہلے کتنے منٹ کا ہوگا جس میں نماز پڑھنا مکروہ ہے؟

جواب: قریباً پانچ چھ منٹ۔

ظہر سے پہلے زوال کا وقت کتنا ہوگا؟

سوال: ظہر سے پہلے زوال کا وقت کتنا ہوگا یعنی ممنوع وقت۔ کسی کیلنڈر میں تو ۴۵ منٹ کا وقفہ لکھا ہوتا ہے جو زیادہ لگتا ہے اور بعض میں ۱۵۔۲۰ منٹ ہوتا ہے۔ آپ بتائیں کہ صحیح کیا ہے؟

جواب: اہلِ علم نے زوال معلوم کرنے کا ضابطہ یوں بیان کیا ہے، کہ ایک سیدھی لکڑی کھڑی کی جائے۔

① صحيح البخاري، بَابٌ: كَمْ بَيْنَ الأَذَانِ وَالإِقَامَةِ، وَمَنْ يَنْتَظِرُ الإِقَامَةَ، رقم: ٦٢٤

پس جب سایہ گھٹتے گھٹتے انتہاء کو پہنچے۔یعنی اس کے بعد نہ گھٹے۔ بلکہ بڑھنا شروع ہوجائے،تو یہ سایہ اصل ہے اور جس سایہ پر سورج ڈھلا ہے،اس کا کوئی اعتبار نہیں۔صرف وہی سایہ معتبر ہے، جو اس کے سوا ہے۔(شرح رسالہ ابن ابی زید)

اور''شامی'' میں ہے، کہ اگر کوئی لکڑی لے کر زمین میں زوال سے پہلے گاڑ دے اور سایہ کا انتظار کرے، جب تک وہ لکڑی کی طرف گھٹتا رہے،اور جب انتہاء تک پہنچ کر پھر بڑھنا شروع ہو،تو اس سایہ کو جو بڑھنے سے پہلے ہے، یادرکھیں یہی سایہ اصلی ہے اور جب سایہ اصلی سائے کے دو مثل یا ایک مثل ہوجائے تو ظہر کا وقت ختم اور عصر کا وقت شروع ہوجاتا ہے اور صاحب ''العون'' فرماتے ہیں:

« ضَابِطُ مَا یُعرَفُ بِهٖ زَوَالُ کُلِّ بَلَدٍ، اَن یُدَقَّ وَ تَدٌ فِی حَائِطٍ، اَو خَشبَةٍ موَازِیًا لِلقَطبِ یَمَانِیًا، اَو شِمَالِیًا ، فَینظَرَ لِظِلِّهٖ. فَمَهمَا سَادَاهُ فَذٰلِكَ وَسطُ النَّهَارِ. فَاِذَا مَالَ اِلَی المَشرِقِ مَیلًا تَامًا فَذٰلِكَ الزَّوَالُ، وَ اَوَّلُ وَقتِ الظُّهرِ » (۱/۱۵٦)

حدیث میں ہے:

" فَاِذَا اَقبَلَ الفَیئُ فَصَلِّ ."[1] یعنی سایہ جب بجانب مشرق ظاہر ہوجائے،تو نماز پڑھ لو اور دوسری روایت میں ہے:«حَتّٰی تَمِیلَ الشَّمسُ»[2]

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

« وَ وَقتُ الِاستِوَاءِ المَذکُورِ، وَ اِن کَانَ ضَیِّقًا لَا یَسَعُ صَلٰوةً اِلَّا اَنَّهٗ یَسَعُ التَحرِیمَةَ. فَیَحرُمُ تَعَمُّدُ التَحرِیمِ فِیهِ »[3]

یعنی آسمان پر سورج کے برابر ہونے کا وقت اگرچہ تھوڑا اور نماز کے لیے ناکافی ہے،لیکن حرمت کے اعتبار سے اس میں وسعت ہے۔ وہ اس طرح کہ حرام کردہ شے کا اس میں قصد کرنا حرام ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ حُرمت کے چند لمحات ہیں، جو سورج چند سیکنڈ میں طے کر لیتا ہے۔ اس کا صحیح اندازہ کرنا مشکل امر ہے۔ البتہ احتیاطاً چار پانچ منٹ انتظار کرلیا جائے۔ حضرت محدث روپڑی رحمہ اللہ بھی بے حد تقلیل سے تعبیر فرمایا کرتے تھے۔ باقی سوال میں ذکر کردہ تحدید غیر متصور ہے۔

---

[1] صحیح مسلم،بَابُ إِسْلَامِ عَمْرِو بْنِ عَبَسَةَ،رقم:۸۳۲

[2] صحیح مسلم،بَابُ الْأَوْقَاتِ الَّتِی نُهِیَ عَنِ الصَّلَاةِ فِیهَا،رقم:۸۳۱

[3] المرعاة :۲/۵۳

جمعہ کے دن زوال:

(سوال): بریڈفورڈ سے سوال کیا گیا ہے کہ کیا جمعہ کے دن زوال ہوتا ہے یا نہیں؟ مثلاً برطانیہ میں بارہ بجے کے بعد زوال ختم ہوتا ہو اور خطبہ بارہ بجے شروع ہوتا ہو تو زوال کے وقت یا قبل از زوال پڑھی گئی سنتوں کا کیا حکم ہے؟ یہ جو مشہور ہے کہ جمعہ کے دن زوال نہیں ہوتا۔ اس کی کیا دلیل ہے؟

(جواب): صاحب ''مشکوٰۃ'' نے دو احادیث بیان کی ہیں، جو اس پر دالّ (دلالت کرتی) ہیں، کہ جمعہ کے دن زوال کا وقت مَنہی اوقات (جن اوقات میں نماز پڑھنا منع ہے) سے مستثنٰی ہے۔ اس وقت نماز پڑھنی جائز ہے۔ لیکن سندوں کے اعتبار سے دونوں احادیث کمزور ہیں۔

البتہ امام بیہقی رحمہ اللہ نے کہا ہے، کہ ابو قتادہ کی کمزور روایت جس میں ''جواز صلوٰۃ عند الزوال'' کا ذکر ہے، اس کے ساتھ کمزور شواہد کو ملا دیا جائے، تو حدیث میں مضبوطی پیدا ہو جاتی ہے۔ مزید آنکہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا فعل بھی اس بات کا مؤید (تائید کرتا) ہے، کہ وہ جمعہ کے دن نصف النہار کو نماز پڑھتے تھے اور اس لیے کہ نبی ﷺ نے جمعہ کے دن تبکیر (اوّل وقت آنا) کی تحریض اور امام کے نکلنے تک نماز پڑھنے کی بلا تخصیص و استثناء ترغیب دی ہے۔ چنانچہ صحیح مسلم میں حدیث ہے:

« مَنِ اغْتَسَلَ ، ثُمَّ أَتَى الْجُمُعَةَ، فَصَلَّى مَا قُدِّرَ لَهُ ، ثُمَّ أَنْصَتَ حَتَّى يَفْرُغَ مِنْ خُطْبَتِهِ، ثُمَّ يُصَلِّي مَعَهُ غُفِرَ لَهُ مَا بَيْنَهُ ، وَ بَيْنَ الْجُمُعَةِ الْأُخْرٰى ، وَ فَضْلُ ثَلَاثَةِ أَيَّامٍ.»[1]

یعنی جس نے غسل کیا پھر جمعہ کے لیے آیا، پس جو قسمت میں ہوا نماز پڑھی، پھر خاموشی اختیار کی حتی کہ خطیب اپنے خطبہ سے فارغ ہو جائے، پھر وہ امام کے ہمراہ نماز ادا کرتا ہے تو اس کے موجودہ اور پچھلے جمعہ کی درمیانی مدت اور تین دن زائد کے گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔

یہ روایت اور اس مفہوم کی دیگر صحیح روایات کے عمومات سے معلوم ہوتا ہے، کہ قبل از جمعہ نوافل کی کوئی تعداد مقرر نہیں۔ تاہم ابن ماجہ کی روایت میں قبل از جمعہ بلا فصل چار رکعتوں کا ذکر ہے، لیکن اس کی سند میں چار راوی سخت ضعیف ہیں۔ ملاحظہ ہو! "عون المعبود" بواسطہ "مرعاۃ المفاتیح" (۲/ ۲۹۷)۔ لہٰذا یہ ناقابلِ حجت و استدلال ہے۔ اس لیے عامۃ الناس کا اقامتِ جمعہ سے پہلے دو یا چار سنتوں کا نظریہ غیر درست ہے۔ بلکہ پہلے وقت آنے والا حسبِ توفیق نوافل پڑھ لے۔ ''کما تقدم آنفاً''۔ البتہ خطبہ کے دوران

[1] صحیح مسلم، بَابُ فَضْلِ مَنِ اسْتَمَعَ وَأَنْصَتَ فِي الْخُطْبَةِ، رقم: ۸۵۶

آنے والے کے لیے دو رکعت پڑھنے کی تاکید ہے، لیکن یہ "تحية المسجد" ہیں۔ نہ کہ "سنتیں" حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

« أَقوٰى مَا يَتَمَسَّكُ بِهِ فِي مَشرُوعِيَّةِ رَكعَتَينِ قَبلَ الجُمعَةِ عُمُومُ مَا صَحَّحَهُ ابنُ حِبَّانَ مِن حَدِيثِ عَبدِ اللّٰهِ بنِ الزُّبَيرِ مَرفُوعًا. مَا مِن صَلٰوةٍ مَفرُوضَةٍ إِلَّا وَ بَينَ يَدَيهَا رَكعَتَانِ، مِثلُهُ حَدِيثُ عَبدِ اللّٰهِ بنِ مُغَفَّلٍ: بَينَ كُلِّ أَذَانَينِ صَلٰوة »[1]

''سب سے مضبوط ترین دلیل، جس سے جمعہ سے پہلے دو رکعتیں پڑھنے پر تمسک (یعنی دلیل لی گئی ہے) کیا گیا ہے، وہ صحیح ابن حبان میں عبد اللہ بن زبیر کی مرفوع روایت کا عموم ہے، کہ ہر فرضی نماز سے پہلے دو رکعتیں ہیں اور اسی طرح عبد اللہ بن مغفل کی حدیث میں ہے، کہ ہر دو اذانوں کے درمیان نماز ہے۔'' یعنی اذان اور تکبیر۔

لیکن اس دوسری حدیث کا انطباق (لاگو کرنا) عہدِ رسالت میں مشکل نظر آتا ہے۔

« فَتَأَمَّل هٰذَا مَا عِندِي وَاللّٰهُ أَعلَمُ بِالصَّوَابِ وَ عِلمُهُ أَتَمُّ »

ظہر کی نماز کا اوّل وقت:

سوال: ظہر کی نماز کا وقت آج کل عموماً ایک بجے ہے جب کہ زوال کا وقت گیارہ بج کر پچاس منٹ پر ہے کیا ایک بجے کا وقت نماز کا اول یا درمیانہ یا آخری وقت شمار کیا جائے گا۔ اوّل وقت کب شروع ہوتا ہے۔

جواب: ظہر کا وقت سورج کے ڈھلنے سے لے کر ایک مثل (ہر شے کا سایہ اس کے برابر ہوجانے) تک ہے۔ دوپہر کا سایہ مثل میں داخل نہیں۔ اس حساب سے ظہر کے اوّل کا آپ بخوبی اندازہ کر سکتے ہیں۔ مشارٌ الیہ (اوپر بیان کردہ) وقت بہر صورت درمیانہ ہے۔ مزید وضاحت کے لیے ملاحظہ ہو! (عون المعبود: جلد اوّل) اور نقشہ اوقاتِ نماز مرتب شدہ قاری عزیر صاحب۔

سخت گرمی میں ظہر کی نماز ٹھنڈے وقت میں پڑھنا:

سوال: سخت گرمی میں ظہر کی نماز ٹھنڈے وقت میں پڑھنے کا حکم ہے۔ ٹھنڈے وقت سے کیا مراد ہے؟ مثلاً اگر نماز ظہر کا وقت ۱۲ بج کر ۱۰ منٹ پر شروع ہو رہا ہے اور ساڑھے بارہ بجے جماعت کا وقت ہے (عام دنوں کے مطابق) اگر اسے ٹھنڈے وقت پڑھیں تو کیا وقت ہونا چاہیے؟ وضاحت سے جواب دیں۔

---

[1] مرعاة المفاتيح ۲/۲۹۲

(جواب): ظہر کا وقت آفتاب کے ڈھلنے سے لے کر ایک مثل (ہر چیز کا سایہ اس کے برابر ہو جانے) تک ہے۔ دوپہر کا سایہ مثل میں داخل نہیں۔ ''صحیحین'' میں حدیث ہے:

« إِذَا اشْتَدَّ الْحَرُّ فَأَبْرِدُوا بِالصَّلَاةِ .» ①

''جب سخت گرمی ہو تو نماز ظہر ٹھنڈے وقت میں پڑھو۔''

ٹھنڈے وقت سے مراد یہ ہے، کہ شدت کی گرمی میں سورج ڈھلتے ہی فوراً نہ پڑھو۔ تھوڑی دیر کر لو۔ اس کا مفہوم قطعاً یہ نہیں کہ چار بجا دو۔ سنن ابی داؤد کی روایت میں موسم گرما اور سرما کے وقت کی یوں تصریح ہے۔ عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے، کہ رسول اللہ ﷺ کی نماز کا اندازہ موسمِ گرما میں تین قدم سے لے کر پانچ قدم تک تھا، اور جاڑوں کے موسم میں پانچ قدم سے لے کر سات قدم تک تھا۔ علامہ البانی رحمہ اللہ نے حدیث ہذا کو صحیح کہا ہے۔

قبل از وقت اذان:

(سوال): ''دائمی اوقات الصلوٰۃ'' کے مطابق ۱۳/۶ کو غروب شفق ۸ بج کر ۴۶ منٹ پر تھا۔ اس لیے عشاء کی اذان مذکورہ وقت پر یا اس کے بعد ممکن تھی، لیکن مسجد کمیٹی کے ذمہ دار حضرات میں سے ایک صاحب ۸/۴۵ پر اذان اور ۹ بجے نماز ادا کرنے پر بضد ہیں کیا قبل از وقت اذان دینا صحیح ہے؟ اگر نہیں تو کیا اذان واجب الاعادہ ہے؟ اگر ۴۵۔۸ پر اذان دینا صحیح نہیں تو اس صورت میں نماز کی حیثیت کیا بنی؟

اگر مذکورہ وقت پر اذان دینے سے نماز متاثر ہوتی ہے تو اس کوتاہی پر ذمہ دار آدمی اور امام صاحب پر شرعاً کیا بوجھ آتا ہے۔

(جواب): جس زمانہ میں نمازوں کے اوقات مقرر ہوئے تھے اس وقت انسانوں کے پاس اتنے ذرائع تسہیلِ معرفتِ اوقات (آسانی سے اوقات معلوم کرنے کے وسائل) موجود نہیں تھے۔ ظاہر ہے کہ اس وقت ان کا تعین ظاہری معلومات پر مبنی تھا، جس میں کمی وبیشی کا امکان ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مسجد نبوی اور مسجد قباء کے اوقاتِ نماز میں بھی تفاوت تھا (فرق) جو کسی کے ہاں قابلِ نکیر نہ تھا۔

ان حالات کے پیشِ نظر اور «اَلدِّینُ یُسرٌ» کا تقاضا ہے، کہ مذکورہ وقت پر اذان اور پڑھی ہوئی نماز دونوں درست ہوں۔ لیکن جان بوجھ کر عمل ہذا پر اصرار نہیں کرنا چاہیے۔ بلکہ موجودہ رَوش کو بدل کر ٹائم پیچھے

① صحیح البخاری، بَابُ الإِبْرَادِ بِالظُّهرِ فِی شِدَّةِ الحَرِّ، رقم:۵۳۳، صحیح مسلم، بَابُ اسْتِحْبَابِ الْإِبْرَادِ بِالظُّهرِ فِي شِدَّةِ الْحَرِّ ......الخ، رقم:۶۱۵

کر دینا چاہیے۔ ویسے بھی عشاء کی نماز کو مؤخر کرنا باعثِ اجر وثواب ہے۔ نیز ائمہ کے فرائض میں سے ہے کہ مسائل میں مقتدیوں کی صحیح رہنمائی کر کے ان کو خلفشار سے بچائیں، تا کہ قرآنی وعید ﴿وَ لَا تَنَازَعُوا فَتَفۡشَلُوا وَ تَذۡهَبَ رِيحُكُمۡ﴾ کی زَد سے محفوظ رہ سکیں۔

اذان اور نماز میں وقفہ:

سوال : ظہر، عصر اور عشاء کی نمازیں تو ہم اذان سے ۲۰ منٹ بعد ادا کرتے ہیں یعنی پانچ منٹ اذان کے اور پندرہ منٹ وضو اور طہارت کے لیکن دو نمازوں کے معاملہ میں اشتباہ ہے۔

(۲) فرض کریں اذان کا وقت 4.15 بجے صبح ہوتا ہے، تو نماز کتنے وقفہ سے ادا کریں۔ ظاہر ہے اٹھنے کے بعد حوائجِ ضروریہ سے فراغت پھر وضو اور سنت مؤکدہ کی ادائیگی۔ بقیہ نمازوں کی نسبت کچھ زیادہ وقفہ کا تقاضا ہے، جب کہ دُور کے محلوں سے بھی نمازی آتے ہیں۔ براہِ نوازش شریعت کے تقاضا کو پیشِ نظر رکھ کر صحیح وقفہ کا تعین فرمادیں۔ آپ کی عین نوازش ہوگی۔

(۳) مغرب کی اذان اگر 6.30 بجے ہو رہی ہو تو نمازِ عشاء کتنے وقفہ سے ادا کی جائے جب کہ ہمارے گردا گرد بریلوی حضرات پونے دو گھنٹہ بعد نماز پڑھتے ہیں۔

(۴) ہمارے ہاں جو نظام الاوقات آویزاں ہے اس پر 3.47 بج کر پر عصر کا وقت لکھا ہوا تھا۔ ہمارے دوستوں نے اوّل وقت پڑھنے کے شوق میں 4 بجے نماز کا وقت رکھا۔ اس طرح ہمیں ظہر کے وقت میں اذان دینا پڑتی تھی کیا یہ مناسب ہے کہ وقت سے قبل ہی اذان کہہ دی جائے۔

جواب : (۱) صبح کی اذان اور نماز میں وقفہ پچیس منٹ رکھ لیا کریں۔ اس میں بنیادی امر یہ ہے کہ صبح کی نماز کا آغاز اندھیرے میں ہو، اور اندھیرے میں ہی ختم ہو جانی چاہیے اور اگر کسی وقت سفیدی بھی ظاہر ہو تو کوئی حرج نہیں اور اگر کسی جگہ سنت کے مطابق صبح کی دو اذانوں کا اہتمام ہو، تو درمیانی وقفہ تھوڑا بھی رکھا جا سکتا ہے۔ کیونکہ صبح کی پہلی اذان کا مقصد تہجد بند کرانا، اور صبح کی نماز کے لیے تیاری ہے، جو اتنے وقفہ سے آسانی سے حاصل ہو سکتی ہے۔

(۲) سرخی غروب ہونے کے بعد عشاء کا وقت شروع ہوتا ہے۔ غروب ساڑھے چھ کے حساب سے یہ وقفہ ایک گھنٹہ پچیس منٹ ہے۔ لہٰذا بریلوی حضرات کی نماز وقت کے اندر ہوتی ہے۔ لیکن عشاء کے بارے میں مستحب یہ ہے کہ اُسے مؤخر پڑھا جائے اس کا اختیاری وقت آدھی رات تک ہے۔

(۳) فجر کے ماسوا وقت سے پہلے اذان دینی ناجائز ہے۔ دخولِ وقت کے بعد اذان دے کر بیس منٹ وقفہ کر لیا کریں۔ ضروری نہیں کہ نماز چار بجے ہی پڑھیں۔ چند منٹ اوپر بھی ہو جائیں تو کوئی حرج نہیں۔

وقت سے پہلے اذان اور عصر کا اوّل وقت:

سوال: ہمارے شہر کی مرکزی اہلِ حدیث مسجد رحمانیہ والے عصر کی اذان عام طور پر وقت سے پہلے دے دیتے ہیں۔ مثلاً کل اشتہار پر عصر کا وقت ۲۸۔۳ تھا مگر انھوں نے اذان ۱۰۔۳ پر دی۔ پوچھنا یہ ہے کہ ان کی اذان ہوئی یا نہیں۔ انھیں کئی بار کہا بھی ہے مگر وہ لوگ بڑے ضدی ہیں، جس کی وجہ سے لوگ بھی ان سے تنگ ہیں۔ اس کے علاوہ یہ بھی بتا دیں کہ عصر کا صحیح وقت، اوّل وقت کس وقت سے کس وقت تک رہتا ہے، میں نے اپنے شہر کے ایک بزرگ اہلحدیث عالم جو وفات پا چکے ہیں، سے سنا تھا کہ اوّل وقت ۴۵ یا ۵۰ منٹ تک رہتا ہے۔ گویا اس حساب سے آج کل عصر کا وقت ۳۰۔۳ سے ۱۵۔۴ تک اوّل وقت ہے۔ اس کا جواب ضرور دیں۔

جواب: نمازِ عصر کے وقت کے بارے میں وارد احادیث ملاحظہ فرمائیں! حدیث امامتِ جبریل میں ہے:

«وَصَلَّى بِي الْعَصْرَ حِينَ كَانَ ظِلُّهُ مِثْلَيْهِ»

''اور پھر عصر پڑھائی جب ہر شے کا سایہ اس کی مثل ہو گیا۔''①

اور صحیح مسلم میں ہے: ''اور وقت ظہر کا ہے، جب آفتاب ڈھلے اور (رہتا ہے اس وقت تک کہ) ہو سایہ آدمی کا اس کے قد کے برابر۔ جب تک کہ نہ آئے وقت عصر کا اور وقت عصر کا ہے جب تک کہ نہ ہو آفتاب زرد۔''

یاد رہے یہ سایہ سایۂ زوال کے علاوہ ہے اور بریدہ کی روایت میں ہے: ''رسول اللہ ﷺ نے قائم کی نمازِ عصر، دراں حالیکہ آفتاب تھا بلند سفید صاف'' (یعنی زرد نہ تھا)②

اور حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے: ''رسول اللہ ﷺ نمازِ عصر پڑھتے تھے، اور آفتاب ہوتا تھا بلند۔'' (یعنی روشن بغیر زردی کے) (متفق علیہ)③ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے۔ انھوں نے

---

① رواه أبي داؤد باب في المواقيت، رقم:۳۹۳

② صحيح مسلم، بَابُ أَوْقَاتِ الصَّلَوَاتِ الْخَمْسِ، رقم:۶۱۲

③ صحيح البخاري، بَابُ وَقْتِ الْعَصْرِ، رقم:۵۵۰، صحيح مسلم، بَابُ أَوْقَاتِ الصَّلَوَاتِ الْخَمْسِ، رقم:۶۲۱

اپنے عمّال کولکھا تھا۔ ''اور پڑھونماز عصر ایسے وقت میں کہ سورج بلند سفید (اور) صاف روشن ہو بقدر اس چیز کے کہ طے کر چکے سوار دو فرسخ (چھ میل) یا تین فرسخ (نو میل) سورج ڈوبنے سے پہلے۔''[1] اور حدیث جبریل میں ہے: ''دوسرے روز عصر کی نماز پڑھائی جب ہو گیا سایہ (ہر چیز کا) دوگنا اس سے۔''

اس بناء پر امام شافعی رحمہ اللہ وغیرہ نے کہا ہے کہ عصر کا اختیاری وقت دو مثل تک اور اصحاب اعذار اور حاجات وضروریات کے لیے غروبِ شمس تک ہے اور امام احمد وغیرہ کا کہنا ہے، کہ ایک مثل سے لے کر اصفرارِ شمس (سورج کے زرد ہونے) تک ہے۔

الحاصل یہ ہے کہ عصر کا وقت ایک مثل سے شروع ہو کر دو مثل یا سورج کے زرد ہونے تک ہے۔ اس معیار کو سامنے رکھ کر گھڑیوں کے اوقات کا تعین آسانی سے ہو سکتا ہے۔ لہٰذا شریعت کی روشنی میں مسائل کا حل افہام وتفہیم سے ہونا چاہیے۔ باہمی اختلافات اور ضد بازی سے مسائل سلجھانے کے بجائے الجھاؤ کا شکار ہو جاتے ہیں، جو سراسر خسارے کا سودا ہے۔ اللہ رب العزت جملہ مسلمانوں میں الفت ومحبت پیدا فرمائے۔ آمین!

سورج کے اعتبار سے عصر کا اوّل وقت کب شروع ہوتا ہے؟

سوال: سورج کے سائے کے حساب سے عصر کا اوّل وقت کب شروع ہوتا ہے؟

جواب جب ہر شے کا سایہ اس کے برابر ہو جائے تو عصر کا اوّل وقت شروع ہو جاتا ہے۔ چنانچہ حدیث میں ہے:

« صَلَّى الْعَصرَ حِينَ كَانَ ظِلُّهُ مِثلَهُ. »[2]

نبی اکرم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: ''جبریل نے مجھے نماز عصر اس وقت پڑھائی جب کہ ہر شے کا سایہ اس کے برابر ہو چکا تھا۔'' (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو! مرعاة المفاتيح (١/ ٣٨٥)

سوال: جرمنی کے دورہ پر جانے کا اتفاق ہوا۔ شام کو نماز پڑھی۔ یعنی مغرب کی نماز رات گئے انتظار کرتے رہے مگر شام کی لالی ختم نہ ہوئی بلکہ صبح کی پو پھوٹ گئی۔ ایسی صورت میں عشاء کا وقت نہ ملا۔ نمازِ عشاء کیسے پڑھی جائے؟ یا ساقط ہو جائے گی اور اگر روزہ ہو تو کیسے رکھا جائے؟

جواب: ایسی صورت میں نماز روزہ کا حسابِ عام معمول کے مطابق ہوگا۔ نماز روزہ ساقط نہیں ہوں گے۔

---

[1] موطأ مالك (لعبد الباقي)، كتاب وُقُوتِ الصَّلَاةِ، بَابُ وُقُوتِ الصَّلَاةِ، رقم:٦

[2] أبوداؤد مع عون المعبود ١/ ١٥

اس امر کی واضح دلیل صحیح مسلم میں قصہ دجال میں ہے۔آپ ﷺ نے فرمایا: اس کا ایک دن سال کی طرح ہو گا۔تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کی: کیا ہمیں اس میں ایک دن کی نماز کافی ہوگی؟ فرمایا نہیں:
' أُقْدُرُوا لَهُ قَدرًا '' بلکہ اندازہ کرنا۔'' یعنی گھنٹوں کے حساب سے۔ ①

نمازِ عصر اوّل وقت میں پڑھنا اور اعادہ نہ کرنا:

سوال: ہمارے حنفی بھائی خاص کر نمازِ عصر کو دھوپ زرد پڑ چکنے کے بعد بہت دیر سے پڑھتے ہیں: (صلوٰۃ الرسول، ص:۱۴۶) مؤلفہ مولانا صادق سیالکوٹی، میں مذکور مسلم شریف کی ایک حدیث شریف کے مطابق ہم اپنی نماز عصر اوّل وقت پر پڑھ کر پھر جا کر اُن کے ساتھ جماعت میں شامل ہو جاتے ہیں اس بارے میں آپ کیا فرماتے ہیں؟ مزید یہ کہ اگر اُن کے ساتھ دوبارہ نہ پڑھیں تو کوئی حرج تو نہیں؟

جواب: آپ حضرات عصر کی نماز اوّل وقت ادا کرلیا کریں۔ دوبارہ حنفیوں کے ساتھ اعادہ مت کریں۔

نمازِ مغرب کے بعد نمازِ عشاء کا وقت کب شروع ہوتا ہے؟

سوال: نمازِ عشاء کا وقت نمازِ مغرب کے بعد کب شروع ہوتا ہے؟ یعنی اندازاً کتنے گھنٹے یا منٹ بعد؟

جواب: نمازِ عشاء کا وقت غروبِ شمس کے قریباً ڈیڑھ گھنٹہ بعد شروع ہو جاتا ہے۔ حدیث میں ہے:

« وَقتُ المَغرِبِ مَا لَم يَغِبِ الشَّفَقُ » ②

یعنی جب تک شفق (سرخی) غائب نہ ہو مغرب کا وقت ہے۔
(شفق کے غروب ہونے پر عشاء کا وقت شروع ہو جاتا ہے۔)

اذان سے پہلے ہی اپنی نماز انفرادی طور پر پڑھنا:

سوال: ایک مسجد میں نمازِ ظہر کا وقت ۲ بجے مقرر ہوا ہے ایک آدمی ڈیڑھ بجے اذان سے پہلے ہی اپنی نماز انفرادی طور پر پڑھ کر اپنے کام میں مشغول ہو جاتا ہے۔ کیا اس کی نماز قبول ہوگی؟

جواب: نماز پہلے ٹائم ادا کرنی چاہیے۔ کسی جگہ اگر جماعت لیٹ ہوتی ہو تو لوگوں کو ہر وقت جماعت کا انتظام کرنا چاہیے۔ چاہے غیر مسجد میں کیوں نہ ہو۔ تاکہ جماعت کے اجر وثواب سے محروم نہ رہیں۔ اگر ایسی

① صحیح مسلم، بَابُ ذِكرِ الدَّجَّالِ وَصِفَتِهِ وَمَا مَعَهُ، رقم: ۲۹۳۷

② صحیح مسلم، بَابُ أَوقَاتِ الصَّلَوَاتِ الخَمسِ، رقم: ۶۱۲

صورت ممکن نہ ہوتو نماز ہو جائے گی۔ ان شاء اللہ۔

اوقاتِ ممنوعہ میں سببی اور فرضی نماز ادا کرنے کا حکم:

(سوال): استاذِ گرامیٔ قدر! مندرجہ ذیل حدیث کی رو سے راقم کو چند مسائل دریافت کرنے ہیں۔ امید ہے کہ آپ خصوصی شفقت فرمائیں گے۔

حَدَّثَنَا هَنَّادٌ، نَا وَكِيعٌ، عَنْ مُوسٰى بْنَ عَلِيٍّ بْنِ رِبَاحٍ، عَنْ أَبِيهِ، عَنْ عُقْبَةَ ابْنِ عَامِرٍ الْجُهَنِيِّ قَالَ: « ثَلَاثُ سَاعَاتٍ كَانَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ يَنْهَانَا أَنْ نُصَلِّيَ فِيهِنَّ، أَوْ نَقْبُرَ فِيهِنَّ مَوْتَانَا. حِينَ تَطْلُعُ الشَّمْسُ بَازِغَةً، حَتّٰى تَرْتَفِعَ. وَ حِينَ يَقُومُ قَائِمُ الظَّهِيرَةِ، حَتّٰى تَمِيلَ. وَ حِينَ تَضِيفُ لِلْغُرُوبِ، حَتّٰى تَغْرُبَ.»

قَالَ أَبُو عِيسٰى: هٰذَا حَدِيثٌ حَسَنٌ صَحِيحٌ.[1]

۱۔ اوقات منع میں فرضی نماز پڑھی جاسکتی ہے؟

۲۔ ان اوقات میں سببی نماز کا کیا حکم ہے؟

۳۔ اس بارے میں مختلف ائمہ کے کیا اقوال ہیں؟ نیز ترجیح کس مذہب کو دی جائے گی؟

۴۔ ان اوقات میں نماز پڑھنے سے کیوں منع کیا گیا ہے؟

(جواب) ۱) فرض نماز ممنوع اوقات میں پڑھی جاسکتی ہے۔ چنانچہ صحیح حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

« مَنْ نَسِيَ صَلٰوةً، أَوْ نَامَ عَنْهَا، فَكَفَّارَتُهَا أَنْ يُصَلِّيَهَا، إِذَا ذَكَرَهَا.»[2]

یعنی ''جو کسی نماز کو بھول گیا یا اس سے سویا رہا پس اس کا کفارہ یہ ہے، کہ جب یاد آئے پڑھ لے۔''

ظاہر ہے کہ حدیث ممنوع اوقات کو بھی شامل ہے۔ امام مالک، شافعی، احمد اور اسحاق رحمہم اللہ کا یہی مسلک ہے۔ یہ حدیث اور اس کی ہم معنی دیگر روایات ممانعت کی احادیث کی مخصّص (خاص کرنے والی) ہیں۔

''صحیحین'' کے علاوہ یہ الفاظ بھی وارد ہیں:

« فَوَقْتُهَا حِينَ يَذْكُرُهَا. لَا وَقْتَ لَهَا إِلَّا ذٰلِكَ » (المرعاة : ۱/ ۴۰۰)

اس سے معلوم ہوا کہ یہ وقت اس کی ادائیگی ہی کا ہے۔ نہ کہ قضاء کا۔''

---

[1] سنن الترمذی، بَابُ مَا جَاءَ فِي كَرَاهِيَةِ الصَّلٰوةِ عَلَى الْجَنَازَةِ ......الخ، رقم: ۱۰۳۰، صحیح مسلم، رقم: ۸۳۱، سنن أبي داؤد، رقم: ۳۱۹۲

[2] صحیح البخاری، بَابُ مَنْ نَسِيَ صَلَاةً فَلْيُصَلِّ إِذَا ذَكَرَ، وَلَا يُعِيدُ إِلَّا تِلْكَ الصَّلَاةَ، رقم: ۵۹۷

(۲) ممنوع وقت میں سببی نماز پڑھی جا سکتی ہے۔ حدیث میں ہے کہ ''وفد عبدالقیس'' سے مصروفیت کی بناء پر آپ ﷺ نے ظہر کے بعد والی دو رکعتیں عصر کے بعد پڑھی تھیں۔ امام نووی رحمہ اللہ اس حدیث کے فوائد بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

« مِنهَا: أَنَّ الصَّلٰوةَ الَّتِی لَهَا سَبَبٌ. لَا تُكرَهُ فِی وَقتِ النَّهیِ. وَ اِنَّمَا یُكرَهُ مَا لَا سَبَبَ لَهَا.» ①

''اوقاتِ ممنوعہ میں سببی نماز جائز ہے، جب کہ بلا سبب ناجائز ہے۔''

(۳) اس بارے میں ائمہ کے مسالک مختلف ہیں۔ داؤد مطلقاً جواز کے قائل ہیں۔ جب کہ امام شافعی سببی کے جواز کے قائل ہیں اور امام ابوحنیفہ نے منع کا مسلک اختیار کیا ہے۔ سابقہ بحث کی بناء پر ترجیح اس کو ہے کہ ممنوع وقت میں سببی نماز پڑھنا جائز ہے۔ امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے بھی مجموع فتاوی میں اسی مسلک کو اختیار کیا ہے۔ نوٹ: تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو! (مرعاۃ: ۲/۵۱)

سترہ کے احکام و مسائل

سترہ کی اہمیت اور مقام ابراہیم پر سترہ کا حکم:

(سوال): آج کل الاعتصام میں سُترہ کی اہمیت کے متعلق بحث ہو رہی ہے۔ آنحضرت ﷺ کے ارشادِ گرامی کے سامنے "السمع والطاعة" کے سوا چارہ نہیں اور یہی صراط مستقیم ہے ایک عملی مشکل ہے جس کا ذکر ضروری سمجھتا ہوں۔

۱۔ سُترہ ہر حالت میں ضروری ہے۔ ایک جامع مسجد میں ہزاروں نمازی ہیں۔ اول صف والوں کو مسجد کی دیوار بطورِ سُترہ مہیا ہوگئی، باقی لوگ سُترہ کہاں سے مہیا کریں اور کیسے کریں؟

۲۔ ﴿وَاتَّخِذُوا مِن مَّقَامِ اِبرٰهِیمَ مُصَلًّى﴾ قرآن مجید کا فرمان ہے۔ ہر طواف کرنے والے نے اس مقام پر دو رکعت نماز ادا کرنا ہے۔ اس مقام پر زبردست بھیڑ ہوتی ہے۔ اس جگہ سُترہ کا کیا انداز ہوگا۔ اس جگہ سُترہ رکھنا بھی ایک مسئلہ ہے۔

(جواب): (۱) حالتِ جماعت میں امام کا سُترہ ہی سب کے لیے کافی ہوتا ہے۔ علیحدہ رکھنے کی ضرورت نہیں۔ اس حالت میں بعض صفوں کے آگے سے کوئی گزر جائے تو نماز میں کوئی فرق نہیں آتا۔ حضرت ابن

① عون المعبود: ۱/۴۹۱

عباس رضی اللہ عنہما کا منیٰ والا قصہ' اس امر کی واضح دلیل ہے۔ صحیح بخاری میں اس پر باب قائم کیا ہے:

« سُترَةُ الاِمَامِ سُترَةُ مَن خَلفَهُ.»

۲۔ مقامِ ابراہیم پر اگر رش ہو تو دوسری جگہ پیچھے ہٹ کر بھی یہ دو رکعتیں ادا ہو سکتی ہیں۔ جہاں سامنے سُترہ ممکن ہو۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی ''صحیح'' میں بایں الفاظ تبویب قائم کی ہے:

« مَن صَلَّی رَکعَتَيِ الطَّوَافِ خَارِجًا مِنَ المَسجِدِ، وَ صَلَّی عُمَرُ رَضِیَ اللّٰهُ عَنهُ خَارِجًا مِنَ الحَرَمِ.»

پھر حدیث اُمّ سلمہ رضی اللہ عنہا نقل کی ہے۔ اس میں ہے « فَلَم تُصَلِّ حَتّٰی خَرَجَت.» ①

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ رقمطراز ہیں:

«أی مِنَ المَسجِدِ، اَو مِن مَکَّةَ. فَدَلَّ عَلٰی جَوَازِ صَلَاةِ الطَّوَافِ خَارِجًا مِنَ المَسجِدِ. اِذ لَو کَانَ شَرطًا لَازِمًا: لَمَا اَقَرَّهَا النَّبِیُّ ﷺ عَلٰی ذٰلِكَ » ②

اگرچہ افضل یہ ہے، کہ خلف المقام ان دو رکعتوں کو ادا کیا جائے۔ اسی بناء پر اس کے بعد باب قائم کیا ہے:« بَابُ مَن صَلَّی رَکعَتَيِ الطَّوَافِ خَلفَ المَقَامِ.»

مزید آنکہ بعض اہلِ علم ویسے بھی حدودِ حرم میں سُترہ کے قائل نہیں۔ اگرچہ جانب راجح اس کے خلاف ہے۔

مسجد حرام میں سترہ کا حکم:

سوال: کیا مسجد حرام میں اور جہاں کثیر تعداد میں نمازی ہوں وہاں نمازی کے آگے سے گذرنے کی اجازت ہے؟

جواب: عمومِ حدیث ''لَو یَعلَمُ المَارُّ بَینَ یَدَیِ المُصَلِّی'' کا تقاضا ہے، کہ نمازی کے آگے سے نہ گزرا جائے۔ لیکن بعض فقہاء نے خصوصی طور پر مسجدِ حرام میں نمازی کے آگے سے گزرے کی اجازت دی ہے۔ ان کا استدلال ''کثیر بن المطلب عن ابیه عن جده'' کی روایت سے ہے، لیکن سنداً وہ ضعیف ہے۔ اس کے ساتھ بعض آثار کو ملا کر سہارا لیا گیا ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے'' کہ ہجوم کی وجہ سے وہاں سُترے کا انتظام مشکل ہے۔ فتاویٰ اسلامیہ (۱/۲۷۹) اور فتاویٰ اہلِ حدیث میں (۲/۱۱۷) اسی مسلک کو اختیار کیا گیا

---

① صحیح البخاری، بَابُ مَن صَلَّی رَکعَتَيِ الطَّوَافِ خَارِجًا مِنَ المَسجِدِ، رقم: ۱۶۲۶

② فتح الباری: ۳/۴۸۷

ہے۔ میرے نزدیک راجح یہ ہے، کہ مطلقاً نمازی کے آگے سے مت گزرے۔ بیت اللہ شریف وغیرہ میں اگر کسی وقت بے احتیاطی ہو گئی ہو تو اللہ معاف کرنے والا ہے۔

بازار سے بنے بنائے سُترے کی شرعی حیثیت:

سوال: آج کل مساجد میں بازار سے بنے بنائے سُترے نظر آتے ہیں۔ اِن کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

جواب: سُتروں کا بازاری عمل سلف کے ہاں معمول بہا نہ تھا۔ بلکہ جو چیز میسر آتی سُترہ بناء لیتے تھے۔ ویسے بھی سُترے کی مقدار میں علماء کا اختلاف پایا جاتا ہے۔

امام صاحب کے لیے سترہ کا حکم:

سوال: کیا امام صاحب کے لیے ضروری ہے کہ سُترہ رکھیں؟ کیا اس کے بغیر نماز ہو جائے گی اور کتنے فاصلے پر رکھا جائے اور سُترہ کس چیز کا ہونا چاہیے؟

جواب: امام کو سُترے کا اہتمام کرنا چاہیے ورنہ خدشہ ہے کہ نماز میں نقص واقع ہو جائے۔ سُترہ سجدے کی جگہ کے قریب ہونا چاہیے۔ اصل یہ ہے کہ سُترہ کی کوئی ایک چیز ساتھ ہو۔ ورنہ بوقتِ ضرورت کوئی چیز بھی سُترہ بنائی جاسکتی ہے۔

مسجد یا غیر مسجد نمازی کے آگے سُترہ ہونا:

سوال: ''سُترہ'' کا مسئلہ مسجد کے اندر کیا ہے؟ عام طور ہم پر لوگ فرض کی ادائیگی کے بعد سنت، نوافل وغیرہ ویسے ہی پڑھ لیتے تھے۔ البتہ اس بات کا سختی سے خیال کیا جاتا تھا کہ نمازی کے آگے سے قطعاً نہ گزرا جائے کہ سخت گناہ ہے اب ہمارے ایک دوست کہتے ہیں کہ سنت، نوافل یا کوئی بھی انفرادی نماز کی ادائیگی کے وقت آگے ''سُترہ'' ہونا چاہیے یا پھر بالکل دیوار کے قریب ہو کر انفرادی نماز ادا کرنا چاہیے۔ اس مسئلہ کی وضاحت فرما دیں کیونکہ ہمارے دوست کا خیال ہے کہ سُترہ کے بغیر نماز نہیں ہوتی۔

جواب: بلاتفریق مسجد یا غیر مسجد نمازی کے آگے سُترہ ہونا چاہیے۔ عمومی احادیث کا تقاضا یہی ہے۔ متعدد روایات سے یہ بات ثابت ہے، کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم انفرادی نماز میں ستونوں کی طرف منہ کرکے نماز پڑھتے۔ بلکہ بذاتِ خود نبی ﷺ کا اپنا عمل بھی ایسے ہی تھا۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے باب بھی قائم کیا ہے: بَابُ الصَّلٰوۃِ اِلَی الْاُسْطُوَانَۃِ۔ فعل ھذا مسجد کے اندر سُترہ کے عمل کا مؤید ہے۔ پھر اہلِ علم کا اس بارے میں بھی اختلاف ہے، کہ مسجد الحرام میں سُترہ ہے یا نہیں؟ اگر مسجد کے اندر سُترہ کا تصور نہ ہوتا تو اختلاف کی

چنداں ضرورت ہی نہ تھی۔ اگرچہ راجح مسلک یہ ہے کہ مسجد الحرام میں بھی سُترہ ہونا چاہیے۔ ویسے سُترہ کے بغیر نماز ہو جاتی ہے، لیکن مع الکراہت۔

سلام پھرنے کے بعد بقیہ نماز بغیر سترہ کے پڑھنا:

سوال: جب نماز کھڑی ہو اور کوئی شخص آ جائے جس کی کچھ نماز فوت ہو چکی ہو اور وہ نماز میں شامل ہو جائے تو جب امام سلام پھیرے دے اور وہ شخص باقی نماز کے لیے اٹھ جائے تو کیا وہ سُترہ کی طرف نماز میں آگے یا پیچھے جا سکتا ہے؟ یا وہ نماز میں شامل ہونے سے پہلے اپنے سامنے سُترہ رکھ سکتا ہے۔ قرآن اور حدیث نبوی ﷺ کی روشنی میں جواب دیں۔ آپ کی بڑی مہربانی ہوگی۔

جواب: ایسی حالت میں سُترے کی تلاش میں آگے پیچھے جانے کی ضرورت نہیں۔ بلکہ بعد میں ملنے والا مقتدی موجودہ ہیئت میں ہی نماز مکمل کرلے اور نہ ہی پیشگی کسی سُترہ کے بندوبست کی ضرورت ہے۔ غزوہ تبوک کے سفر میں آپ ﷺ سے نمازِ فجر کی ایک رکعت فوت ہو گئی تھی۔ حالتِ قضائی میں ثابت نہیں ہو سکا، کہ آپ ﷺ نے اس وقت کسی سُترہ کا انتظام کیا ہو۔ حالانکہ عہدِ نبوت کے آخری دور کا یہ واقعہ ہے۔ نیز اصل چونکہ ''براءۃِ ذمہ'' ہے اس لیے بھی اسی کیفیت کو ترجیح ہوگی۔

سوال: کچھ آدمی جماعت کی پہلی رکعت میں آ کر شامل ہوئے کچھ دوسری تیسری اور چوتھی رکعت میں۔ امام صاحب کے آگے سُترہ ہے، جب امام صاحب نے نماز مکمل کرادی۔ یعنی دونوں طرف سلام پھیر دیا، تو جن کی نماز ابھی رہتی ہے۔ کیا وہ اگلی صف میں سُترہ کے نزدیک آ سکتے ہیں یعنی بحالتِ نماز؟ اور کیا ان کے لیے وہ امام صاحب والا سُترہ کافی ہے یا کیا وہ ایک دوسرے کے آگے پیچھے ہو کر سُترہ بناء سکتے ہیں؟

جواب: ایسی حالت میں مزید سُترے کی ضرورت نہیں۔ اسی جگہ اسی کیفیت میں نماز مکمل کر لینی چاہیے۔ غزوۂ تبوک کے سفر میں نبی ﷺ نے صبح کی جماعت سے فوت شدہ ایک رکعت ایسی حالت میں مکمل کی تھی، حدیث کے الفاظ یوں ہیں:

« فَلَمَّا سَلَّمَ عَبدُ الرَّحمٰنِ. قَامَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيهِ وَسَلَّمَ يُتِمُّ صَلَاتَهُ. فَأَفزَعَ ذٰلِكَ النَّاسَ » [1]

''جب عبدالرحمٰن بن عوف نے نماز مکمل کر لی، تو اللہ کے رسول ﷺ اپنی نماز مکمل کرنے کے لیے کھڑے ہو گئے۔ لوگ یہ منظر دیکھ کر حیران ہوئے۔''

---

[1] فتح الباری: ۷/۱۲۶

نمازی کے آگے سے گزرنے کی حد بندی:

سوال: نمازی کے آگے سُترہ نہ ہونے کی صورت میں چار پانچ صفیں چھوڑ کر گزرنا جائز ہے؟ اور اس کی دلیل میں کوئی حدیث ہے؟

جواب: حدیث میں مطلق نمازی کے آگے سے گزرنا منع آیا ہے۔ حد بندی کی تصریح نہیں۔ البتہ ابوداؤد کی ایک روایت میں « قَذفَهٗ بِحَجَرٍ » کے لفظ ہیں۔ یعنی پتھر پھینکنے کے بعد آگے سے گزر جانے میں کوئی حرج نہیں۔ لیکن اس کا مرفوع ہونا مشکوک ہے۔ علامہ البانی رحمہ اللہ نے اس کو ضعیف سنن (۱۱۰) میں ذکر کیا ہے۔ البتہ موقوف ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بسندِ صحیح ثابت ہے۔ مشکوٰۃ حاشیہ البانی (۱/ ۲۴۵)

سوال: نمازی کے آگے سے گزرنے کا بڑا گناہ حدیث میں وارد ہے مگر ایک مولانا صاحب فرما رہے تھے کہ جتنی حد تک نمازی سجدہ کرتا ہے اگر اس کے درمیان والی جگہ سے گزرا جائے گا تو نماز ٹوٹ جائے گی اگر دوسری صف میں سے گزر جائے گا تو نماز نہ ٹوٹے گی۔ مولانا ثناء اللہ امرتسری رحمہ اللہ کے نزدیک صف کی مٹی ہی اس کا سُترہ ہے کس حد تک بات درست ہے؟ امام شوکانی رحمہ اللہ کے نزدیک کیا یہی بات درست ہے کہ نمازی جتنی حد تک سجدہ کرتا ہے اس کے درمیان والی جگہ سے گزرے تو نماز ٹوٹ جائے گی ورنہ نہیں۔ ٹی وی میں بھی ایک مولانا صاحب یہی فرما رہے تھے۔ دوسری صف میں سے گزرے گا تو کوئی گناہ نہیں ہے۔ بینوا وتوجروا۔

جواب: سنن ابوداؤد میں حدیث ہے:

« اِذَا جَعَلْتَ بَيْنَ يَدَيْكَ مِثْلَ مُؤَخَّرَةِ الرَّحلِ فَلَا يَضُرُّكَ مَن مَرَّ بَيْنَ يَدَيْكَ .»[1]

یعنی ''پالان کی پچھلی لکڑی کے برابر آگے کوئی شے ہو اور پھر کوئی تیرے آگے سے گزر جائے، تو کوئی حرج نہیں۔''

علامہ عظیم آبادی رحمہ اللہ ''عون المعبود'' (۱/ ۲۵۵) میں فرماتے ہیں:

« ثُمَّ المُرَادُ مَن مَرَّ بَيْنَ يَدَيكَ بَيْنَ السُّترَةِ ، وَالقِبلَةِ ، لَا بَينَكَ ، وَ بَيْنَ السُّترَةِ »

یعنی ''آگے سے مراد سُترہ اور قبلہ کا درمیان ہے۔ نہ کہ نمازی اور سُترہ کا درمیان۔''

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ فاصلہ جائے سجود (سجدہ کی جگہ) سے کچھ زیادہ ہونا چاہیے، جس کی حد بندی ''قَذفَةٌ بِحَجَرٍ'' (کنکری پھینکنے) کے ساتھ کی گئی ہے۔ یعنی پتھر پھینکنے کے بقدر آگے سے گزرنے میں

[1] سنن أبي داؤد، بَابُ مَا يَستُرُ الْمُصَلِّيَ ،رقم:٦٨٥

کوئی حرج نہیں۔ لیکن یہ حدیث ضعیف ہے۔ بعض نے فاصلہ تین ہاتھ بیان کیا ہے۔ کیونکہ کعبہ میں آپ ﷺ کی نماز کا فاصلہ یہی تھا اور کچھ نے بکری کے گزرنے کا اندازہ ذکر کیا ہے۔ جس طرح کہ بعض نصوص میں واضح ذکر ہے:

« وَ جَمَعَ الدَّاوُودِی بِاَنَّ اَقَلَّهٗ مَمَرُّ الشَّاةِ، وَ اَكثَرَ ثَلَاثَةُ اَذرُعٍ. وَ جَمَعَ بَعضُهُم بِاَنَّ الاَوَّلَ فِی حَالِ القِيَامِ، وَالقَعُودِ. وَالثَّانِی فِی حَالِ الرُّكُوعِ، وَالسُّجُودِ. وَ قَالَ ابنُ الصَّلَاحِ : قَدَّرُوا مَمَرَّ الشَّاةِ بِثَلَاثَةِ اَذرُعٍ. قُلتُ: وَ لَا يَخفٰى مَا فِيهِ. وَ قَالَ البَغَوِی: اِستَحَبَّ اَهلُ العِلمِ الاَفضَلَ السُّترَةَ بِحَيثِ يَكُونُ بَينَهٗ، وَ بَينَهَا قَدرَ مَكَانِ السُّجُودِ، وَ كَذَالِكَ بَينَ الصُّفُوفِ. هٰذَا خُلَاصَةُ مَا فِی الفَتحِ » (۲۵۷/۱)

اسی بناء پر ''سبل السلام'' میں علامہ امیر (صنعانی) کا نظریہ ہے، کہ نمازی کے آگے سے گزرنے کی حُرمت صرف جائے سجود (سجدہ کی جگہ) تک ہے۔ بناء بریں موصوف مولوی صاحب کا فرمان کسی حد تک درست ہے۔ سابقہ حدیث کی بناء پر بہتر ہے'' کہ فاصلہ کچھ زیادہ کر لیا جائے۔

حضرت مولانا ثناء اللہ امرتسری مرحوم رحمہ اللہ کی بنیاد غالباً حدیث الخط وغیرہ ہے کہ بوقتِ ضرورت کوئی چیز بھی سُترہ بن سکتی ہے۔ علامہ شوکانی رحمہ اللہ نے امام نووی رحمہ اللہ سے نقل کیا ہے: « وَ يَحصُلُ بِاَیِّ شَیءٍ اَقَامَهٗ بَينَ يَدَيهِ.» یعنی ''نمازی جونسی شے آگے رکھ لے، تو سُترہ کا مقام حاصل ہو جائے گا۔'' حد بندی کے سلسلہ میں بظاہر امام شوکانی رحمہ اللہ کا اختیار تین ہاتھ ہے۔ ملاحظہ ہو! (نیل الأوطار: ۳/۳)

نمازی کے آگے سے گزرنے کے لیے کم از کم فاصلہ:

سوال: نمازی کے آگے سے گزرنے کے لیے کم از کم کتنا فاصلہ ہونا چاہیے؟ کیا شریعت نے چھوٹی بڑی مساجد کے لیے الگ الگ اصول وضع کیے ہیں؟ نیز نمازی کے بالکل سامنے بیٹھا ہوا شخص نمازی کے سلام پھیرنے کا انتظار کرے یا دائیں بائیں جہاں سے چاہے گزر جائے؟

جواب: جائے سجود چھوڑ کر آگے سے گزرنے کا جواز ہے۔ صاحب ''سبل السلام'' فرماتے ہیں:

«وَالحَدِيثُ دَلِيلٌ عَلٰى تَحرِيمِ المُرُورِ اَی مَا بَينَ مَوضِعِ جَبهَتِهٖ فِی سُجُودِهٖ، وَ قَدَمَيهِ » (۱۴۲/۱)

اور ''بَينَ يَدَیِ المُصَلِّی'' کی تشریح میں ''فتح الباری'' (۵۸۵/۱) میں حافظ ابن حجر رحمہ اللہ رقمطراز ہیں:

« أَی اَمَامَهٗ بِالقُربِ مِنهُ. وَ عَبَّرَ بِاليَدَينِ: لِكَونِ أَكثَرُ الشُّغلِ يَقَعُ بِهِمَا. وَاختُلِفَ فِی

تَحدِیدِ ذٰلِكَ. فَقِیلَ : إِذَا مَرَّ بَینَهٗ وَ بَینَ مِقدَارِ سُجُودِہٖ. وَ قِیلَ : بَینَهٗ، وَ بَینَ قَدرِ ثَلٰثَةِ اَذرُعٍ. وَ قِیلَ: بَینَهٗ، وَ بَینَ قَدرِ رَمیَةٍ بَحَجَرٍ.»

یعنی سامنے سے نمازی کے قریب سے نہیں گزرنا چاہیے، اور دو ہاتھوں سے تعبیر اس لیے کی گئی ہے کہ بیشتر کام ان سے سرانجام پاتے ہیں، اور اس کی حد بندی میں تین اقوال ہیں۔(۱) جائے سجود تک (۲) تین ہاتھ (۳) پتھر پھینکنے کے بقدر۔

پہلا مسلک راجح معلوم ہوتا ہے کیونکہ بیہقی کی روایت میں سَر کو نیچے رکھنے اور نگاہ کو زمین کی طرف کرنے کا ذکر ہے اور دوسرا مسلک بھی قریب ہے، کیونکہ بعض روایات میں سُترہ کا درمیانی فاصلہ، تین ہاتھ تک بیان ہوا ہے اور تیسرا مسلک کمزور ہے، کیونکہ اس بارے میں وارد حدیث سخت ضعیف ہے۔ امام ابوداؤد نے محمد بن اسماعیل کی وجہ سے اس کو منکر قرار دیا ہے۔ یاد رہے سُترہ کے اعتبار سے چھوٹی بڑی مسجد کا کوئی فرق نہیں۔ نمازی کے سامنے بیٹھا ہوا انسان دائیں بائیں ہٹ کر جا سکتا ہے۔ بشرطیکہ نمازی کے لیے تشویش کا باعث نہ بنے۔ ورنہ یہ بھی گزرنے کے معنی میں ہوگا، جس سے حدیث میں واضح طور پر روکا گیا ہے۔

نمازی کے آگے سے گزرنے کے فاصلہ:

سوال : بعض لوگ نمازی کے آگے سے دو یا تین صفوں کا فاصلہ چھوڑ کر گزر جانے کو گناہ تصور نہیں کرتے کیا یہ مسئلہ درست ہے؟ اگر درست ہے تو دلیل کیا ہے؟

جواب حدیث میں نمازی کے آگے سے گزرنے کی مخالفت کے بارے میں «بَینَ یَدَیِ المُصَلِّی» کے الفاظ ہیں۔[1] فاصلہ کی حد بندی کا تعین نہیں۔ البتہ علامہ صنعانی نے سبل السلام (۱/۱۴۲) میں پیشانی رکھنے کی جگہ اور پاؤں کی جگہ کا درمیانی فاصلہ مراد لیا ہے۔ بظاہر اگر کوئی محلِ سُترہ کے باہر سے گزر جائے، تو کوئی حرج معلوم نہیں ہوتا۔ اس کا اندازہ تین ہاتھ کے قریب ہے۔ بیت اللہ کے اندر آپ ﷺ نے دیوار کعبہ سے اتنے فاصلہ سے نماز ادا کی تھی۔

نمازی کے سامنے سے گزرنے سے نماز ٹوٹنا:

سوال : آدمی کی نمازی کے سامنے سے گزرنے سے نماز ٹوٹ جاتی ہے یا نہیں؟

جواب : نمازی کے آگے سے گزرنے سے نماز نہیں ٹوٹتی۔ راجح مسلک یہی ہے۔

---

[1] صحیح البخاری، بَابُ إِثمِ المَارِّ بَینَ یَدَیِ المُصَلِّی، رقم: ۵۱۰

عورت کے گزرنے سے نماز کا ٹوٹنا:

(سوال): راقم نے مسلم شریف کی حسب ذیل دو احادیث پڑھیں جس میں تعارض نظر آیا۔ براہِ کرم انھیں سنتِ رسولِ عربی ﷺ کی روشنی میں سمجھائیے!

وَ عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: يَقْطَعُ الصَّلَاةَ الْمَرْأَةُ وَالْحِمَارُ وَالْكَلْبُ، وَيَقِي ذٰلِكَ مِثْلُ مُؤْخِرَةِ الرَّحْلِ»[1]

''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: عورت، گدھا اور کتا نماز کو توڑ دیتے ہیں اور اس سے کجاوے کی پچھلی لکڑی کی مانند چیز بچاتی ہے۔''

۲۔ « وَ عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهَا قَالَتْ: كَانَ النَّبِيُّ ﷺ يُصَلِّي مِنَ اللَّيْلِ، وَأَنَا مُعْتَرِضَةٌ بَيْنَهُ، وَ بَيْنَ الْقِبْلَةِ كَاعْتِرَاضِ الْجَنَازَةِ »(متفق علیه)[2]

''ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ حضور اکرم ﷺ رات کو نماز پڑھا کرتے تھے، اور میں آپ ﷺ کے اور قبلہ کے درمیان عرض کے بل سوئی ہوتی۔ جیسا کہ جنازہ سامنے عَرض کے بل رکھا ہوتا ہے۔''

حل طلب مسئلہ یہ ہے، کہ متذکرہ بالا حدیث نمبر ا میں نبی اکرم ﷺ نے عورت کی بابت نماز کو توڑنے والی فرمایا ہے۔ جب کہ حدیث نمبر ۲ میں خود رسول اللہ ﷺ کا فعل اس کے خلاف ہے۔ کیا اس میں تعارض ہے؟ تطبیق ہوسکتی ہے؟۔

(جواب): بظاہر متعارض احادیث میں تطبیق یوں ہے، کہ حدیث ابی ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مقصود یہ ہے، کہ نمازی کے آگے سے گزرنا منع ہے، جب کہ حدیث عائشہ رضی اللہ عنہا میں نمازی کے سامنے لیٹنے کا جواز ہے۔ لہٰذا مُصَلّی کے آگے سے گزرنا ناجائز ہے اور اگر سامنے کوئی لیٹا ہوا ہو تو اس کے پیچھے کھڑے ہو کر نماز پڑھ لینا جائز ہے۔ لیٹا ہوا، گزرنے کی تعریف میں نہیں آتا۔

علاوہ ازیں اس میں بھی اختلاف ہے کہ ''قطع صلوٰۃ'' کا مفہوم نماز کا ٹوٹنا ہے یا اس کے خشوع میں کمی ہے؟ چنانچہ امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: جمہور علمائے سلف اور خلف نے نماز ٹوٹنے کی تاویل نماز سے نقصان

---

[1] صحیح مسلم، بَابُ قَدْرِ مَا يَسْتُرُ الْمُصَلِّي، رقم:۵۱۱، صحیح البخاری، بَابُ مَنْ قَالَ: لَا يَقْطَعُ الصَّلَاةَ شَيْءٌ، رقم:۵۱۵

[2] صحیح مسلم، بَابُ قَدْرِ مَا يَسْتُرُ الْمُصَلِّي، رقم:۵۱۱

سے کی ہے۔ اس لیے کہ ان چیزوں کے گزرنے سے دل ان کی طرف مشغول ہو جاتا ہے۔ یہ نہیں کہ اس سے نماز باطل ٹھہرتی ہو۔

اور امام ابوداؤد رحمہ اللہ نے اپنی ''سنن'' میں دونوں قسم کی روایات کے لیے مختلف ابواب قائم کیے ہیں۔ بحث کے اختتام پر رقمطراز ہیں:

«إِذَا تَنَازَعَ الخَبَرَانِ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ نُظِرَ إِلَى مَا عَمِلَ بِهِ أَصحَابُهُ مِن بَعدِهِ.» (1)

یعنی ''نبی اکرم ﷺ سے جب متعارض احادیث وارد ہوں، تو ان میں یہ دیکھا جاتا ہے، کہ آپ ﷺ کے بعد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا عمل کس پر تھا؟''

صاحب ''عون المعبود'' کلام ہذا کی تشریح میں فرماتے ہیں:

«قُلتُ قَد ذَهَبَ أَكثَرُ الصَّحَابَةِ (رِضوَانُ اللّٰهِ عَلَيهِم أَجمَعِين) إِلٰى أَن لَا يَقطَعَ شَيءٌ.»

یعنی میں کہتا ہوں کہ اکثر صحابہ رضی اللہ عنہم اس طرف گئے ہیں کہ کوئی شے نماز کو قطع نہیں کرتی۔

چند سطور بعد فرماتے ہیں: مؤلف کے نزدیک بھی راجح عدمِ قطع ہے۔ (۲۶۲/۱)

نیز امام ترمذی رحمہ اللہ نے بھی اکثر صحابہ رضی اللہ عنہم اور تابعین کا مسلک یہی نقل کیا ہے، کہ کسی شے کے نمازی کے سامنے سے گزرنے سے نماز باطل نہیں ہوتی البتہ خشوع جاتا رہتا ہے۔ (واللہ أعلم بالصواب و علمه أتم)

عورت، گدھا اور کالے کتے کے نمازی کے آگے سے گزرنے سے نماز ٹوٹنا:

سوال: کیا واقعی عورت، گدھا اور کالے کتے کے نمازی کے آگے سے گزرنے سے نماز ٹوٹ جاتی ہے؟ اگر یہ حدیث صحیح ہے تو کیا منسوخ ہے یا ابھی تک اس کا حکم برقرار ہے؟

جواب: مسئلہ ہذا سخت اختلافی مسائل میں سے ایک ہے۔ اہلِ علم کے اس میں متعدد مذاہب ہیں۔ جن کی بناء زیادہ تر دلائل مستنبطہ ہے۔ جملہ مذاہب میں سے ہمارے نزدیک محقق اور راجح بات یہ ہے، کہ نمازی کے سامنے سے کسی بھی شے کے گزرنے سے نماز قطع نہیں ہوتی۔ اگرچہ سامنے سُترہ نہ ہو۔ قریب ترین بات یہ ہے کہ وہ احادیث جن میں نماز ٹوٹنے کا ذکر ہے، وہ ان احادیث کے ساتھ منسوخ ہیں، جن میں عدمِ قطع کا ذکر ہے۔

علامہ احمد محمد شاکر، ترمذی (۱۶۴/۲) کے حواشی پر رقمطراز ہیں:

---

(1) سنن أبي داؤد، بَابُ مَن قَالَ: لَا يَقطَعُ الصَّلَاةَ شَيءٌ، رقم: ۷۲۰

« وَالصَّحِيحُ الَّذِی أَرضَاهُ وَ أَختَارُهُ أَنَّ أَحَادِيثَ القَطعِ مَنسُوخَةٌ بِحَدِيثِ لَا يَقطَعُ الصَّلٰوةَ شَیءٌ.»

''صحیح بات جس پر میں رضا و پسندیدگی کا اظہار کرتا ہوں، وہ یہ ہے کہ قطع کی احادیث حدیث ''لا یقطع الصلوٰۃ شئ'' (نماز کو کوئی شئی قطع نہیں کرتی) کے ساتھ منسوخ ہیں۔

پھر فرماتے ہیں:

« وَقَد حَقَّقتُ تَرجِيحَ النَّسخِ فِی تَعلِيقِی عَلَى المُحَلّٰی لِابنِ حَزمٍ » (۱۴/۴۔۱۵)

یعنی ''المحلّٰی ابن حزم'' کے حواشی پر میں نے نسخ کی تحقیق پیش کی ہے۔''

اور امام ابوداؤد اپنی ''سنن'' میں ابوسعید کی روایت بیان کرنے کے بعد فرماتے ہیں:

« إِذَا تَنَازَعَ الخَبرَانِ عَنِ النَّبِیِّ ﷺ نُظِرَ إِلٰى مَا عَمِلَ بِهِ أَصحَابُهُ مِن بَعدِهِ.» [1]

یعنی جب دو احادیث نبی ﷺ سے متعارض وارد ہوں، تو دیکھنا یہ ہوگا، کہ بعد میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا عمل کس پر تھا۔ ان میں سے اکثر جیسے عائشہ، ابن عباس، ابن عمر، علی، عثمان اور حذیفہ رضی اللہ عنہم عدمِ قطع کی طرف گئے ہیں، تو یہی مسلک راجح ہونا چاہیے۔ نسخ کی علامات میں سے یہ بھی ہے، کہ ابن عمر اور ابن عباس رضی اللہ عنہما حدیث قطع کے راوی ہیں، اور ان کا اپنا فیصلہ عدمِ قطع کا ہے۔ بحث کے اختتام پر ''صاحب المرعاۃ'' فرماتے ہیں: ''المحلّٰی'' پر شیخ احمد کی تحقیق سے معلوم ہوا، کہ حدیث (لَا يَقطَعُ الصَّلٰوةَ شَیءٌ) متاخر ہے۔ یہ عمدہ تحقیق ہے، اور یہ زیادہ حقدار اور زیادہ لائق ہے کہ اسے قبول کیا جائے۔ (۵۱۳/۱)

حالتِ نماز کے متعلق مسائل

ننگے سر نماز پڑھنا

کیا نبی ﷺ نے کبھی ننگے سر نماز بھی پڑھی ہے؟

سوال کیا نبی ﷺ نے کبھی ننگے سر نماز بھی پڑھی ہے؟ اگر پڑھی ہو تو اس کو دلیل بنا کر ہمیشہ ننگے سر نماز پڑھنا، ٹوپی رکھ کر پڑھنے سے کتنا افضل ہے؟

جواب رسول اللہ ﷺ نے ایک کپڑا اوڑھ کر نماز پڑھی ہے جس کی صورت یہ بھی تھی کہ ایک کپڑے کی

---

[1] سنن أبی داود، بَابُ مَنْ قَالَ: لَا يَقْطَعُ الصَّلَاةَ شَيْءٌ، رقم: ۷۲۰

دونوں طرف مخالف سمت سے کندھے پر ڈال لیں یعنی اس کی دائیں طرف بائیں کندھے پر اور بائیں طرف دائیں کندھے پر، جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ آپ کے سر پر کچھ نہ تھا۔ نماز دونوں طرح پڑھنا درست ہے ، سر ڈھانپ کر یا ننگے سر پڑھنا تمام محدثین کے نزدیک سنت میں داخل نہیں۔

نماز میں سر ڈھانپنے کا حکم:

سوال: رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا سر ڈھانکنے کے سلسلہ میں کیا معمول تھا؟ کیا آپ ﷺ ہمیشہ ننگے سر نماز پڑھتے تھے یا سر ڈھانک کر؟ ان ہر دو اعمال میں سے کون سا عمل سنتِ نبوی ﷺ کے زیادہ قریب ہے یا اجر وثواب کے لحاظ سے کون سا عمل دوسرے سے بڑھ کر ہے؟ (ماسٹر لال خان)

جواب: رسول اللہ ﷺ کے قول وعمل سے دونوں طرح نماز پڑھنا ثابت ہے:

«أَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ صَلَّی فِی ثَوْبٍ وَاحِدٍ قَدْ خَالَفَ بَیْنَ طَرَفَیْهِ» [1]

''نبی ﷺ نے ایک ہی کپڑا اوڑھ کر نماز پڑھی جس کے پڑھنے کی صورت یہ تھی کہ کپڑے کے دونوں سرے اُلٹے کر کے دوسرے کندھے پر ڈال لیے۔''

اس سے صاف ظاہر ہے کہ سر ننگا تھا۔ نیز بلوغ المرام باب شروط الصلاۃ میں ارشادِ نبوی ﷺ ہے کہ جب کپڑا افراخ ہو تو اوڑھ لے، یعنی صحیح بخاری اور صحیح مسلم کی روایت میں اوڑھنے کا طریقہ بتایا ہے کہ کپڑے کی دونوں طرفین خلاف طور پر کرے۔ (متفق علیہ)

یہ قولی حدیث کی مثال ہے، جبکہ پہلی حدیث کا تعلق عمل سے ہے۔ اس بارے میں وارد تمام احادیث کی روشنی میں یہی نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ سر ڈھانک کر یا ننگے سر نماز پڑھنے کا جواز ہے، کسی ایک جانب کو ترجیح دینا بلا دلیل ہے، تاہم شریعت میں عورت کے لئے سر ڈھانکنا ضروری قرار دیا گیا ہے۔ ننگے سر اس کی نماز نہیں ہوتی۔ چنانچہ صحیح حدیث میں ہے:

ان النبی صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قال: لَا یقبَلُ اللّٰهُ صَلٰوةَ حَائِضٍ اِلَّا بِخِمَارٍ» [2]

''اللہ تعالیٰ بالغہ عورت کی نماز بلا اوڑھنی کے قبول نہیں کرتا۔''

اس حدیث کا مفہوم یہ ہے کہ مرد کے لئے نماز میں سر ڈھانکنا ضروری نہیں، اس کو دونوں طرح اختیار

---

[1] صحیح البخاری، بَابُ الصَّلَاةِ فِی الثَّوْبِ الوَاحِدِ مُلْتَحِفًا بِهِ، رقم ٣٥٤

[2] سنن ابن ماجه، بَابُ فَضْلِ اللّٰهُمَّ رَبَّنَا لَكَ الحَمْدُ، رقم: ٦٥٥، سنن أبی داؤد، رقم: ٦٤١، سنن الترمذی، بَابٌ: مَا جَاءَ لَا تُقْبَلُ صَلَاةُ الحَائِضِ إِلَّا بِخِمَارٍ، رقم: ٣٧٧

ہے۔لہٰذا دونوں صورتوں میں اجر وثواب برابر ہے،تفریق کی کوئی وجہ نہیں۔

(سوال) : ننگے سَر نماز رسولِ کریم ﷺ نے پڑھی ہے یا نہیں؟ جبکہ صحابہ رضی اللہ عنہم نے ننگے سَر نماز پڑھی ہے۔

(جواب) : ''صحیحین'' میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، کہ نبی ﷺ نے بصورتِ ''توشیح'' ایک کپڑے میں نماز پڑھی۔''توشیح'' کی شکل یوں ہے: کپڑے کی بائیں طرف کو بائیں ہاتھ کے نیچے سے دائیں کندھے پر ڈالنا، اور کپڑے کی دائیں طرف کو دائیں ہاتھ کے نیچے سے نکال کر بائیں کندھے پر ڈالنا۔

اسی طرح عمر بن ابی سلمہ رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے۔میں نے نبی ﷺ کو اُمّ سلمہ رضی اللہ عنہا کے گھر میں بصورتِ ''توشیح'' ایک کپڑے میں نماز پڑھتے دیکھا۔(رواہ الجماعۃ) زیرِ حدیث ہذا علامہ شوکانی رحمہ اللہ رقمطراز ہیں:

« وَالحَدِيثُ يَدُلُّ عَلٰى أَنَّ الصَّلَاةَ فِي الثَّوبِ الوَاحِدِ صَحِيحَةٌ إِذَا تَوَشَّحَ بِهِ المُصَلِّي، أَو وَضَعَ طَرَفَهُ عَلٰى عَاتِقِهِ، أَو خَالَفَ بَينَ طَرَفَيهِ »[1]

یعنی یہ حدیث اس بات پر دال ہے، کہ ایک کپڑے میں نماز درست ہے۔ظاہر ہے جب ایک کپڑے میں نماز ہوگی تو سَر لامحالہ (یعنی لازماً) ننگا ہوگا۔

مولوی احمد رضا خاں بریلوی نے احکامِ شریعت میں لکھا ہے، کہ ننگے سَر نماز پڑھنے میں خشوع وخضوع زیادہ ہے۔

(سوال) : کیا حضور اکرم ﷺ سے ننگے سَر نماز ادا کرنا ثابت ہے۔آپ ﷺ نے کپڑا ہونے کے باوجود ننگے سَر نماز پڑھی ہو تو براہِ کرم اس کی وضاحت کریں؟

(جواب) : رسول اللہ ﷺ نے ایک کپڑا اوڑھ کر نماز پڑھی ہے، جس کی صورت یوں بیان ہوئی ہے، کہ کپڑے کی دونوں طرفیں مخالف طور سے کندھے پر ڈال لیں۔یعنی اس کی دائیں طرف بائیں کندھے پر، اور بائیں طرف دائیں کندھے پر ڈال لی۔[2]

اس سے صاف واضح ہے، کہ سَر پر کچھ نہ تھا۔اگر کپڑے کی موجودگی میں ایسا فعل ناجائز ہوتا، تو آپ حکماً اس سے منع فرما دیتے۔منع نہ کرنا مطلق جواز کی دلیل ہے۔نیز ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ تمہارا کوئی بھی ایک کپڑے میں اس طرح نماز نہ پڑھے، کہ کندھے پر کچھ نہ ہو۔(بلوغ المرام)[3]

---

[1] نیل الأوطار، جز:۲، ص:۷۸

[2] صحیح البخاری، بَابُ الصَّلَاةِ فِي الثَّوبِ الوَاحِدِ مُلتَحِفًا بِهِ،رقم:۳۵۵

[3] صحیح البخاری،بَابٌ :إِذَا صَلَّى فِي الثَّوبِ الوَاحِدِ فَلْيَجعَلْ عَلٰى عَاتِقَيهِ،رقم:۳۵۹

غور فرمائیے! آپ ﷺ نے ایک کپڑے میں نماز پڑھنے کی اجازت فرمائی۔ کندھے کا ڈھانپنا ضروری فرمایا۔ سر کا کہیں ذکر نہیں۔ یہ بھی مطلق جواز کی دلیل ہے۔ عملاً آپ ﷺ سے ننگے سَر نماز پڑھنا نظر سے نہیں گزرا۔ تاہم صحابی رسول حضرت جابر رضی اللہ عنہ کا ایسا عمل صحیح بخاری میں موجود ہے۔ [1]

جان بوجھ کر ننگے سر نماز پڑھنا:

سوال: اہلِ حدیث مساجد میں نمازی اکثر جان بوجھ کر ننگے سَر نماز پڑھتے ہیں۔ کیا حضور اکرم ﷺ کے وقت میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بھی ننگے سَر نماز ادا کیا کرتے تھے؟ کیا یہ فعل پسندیدہ اور افضل ہے؟

جواب: ننگے سَر نماز پڑھنے کا جواز ہے، جس طرح کہ متعدد روایات سے ثابت ہے۔ مثلاً رسول اللہ ﷺ نے ایک کپڑا اوڑھ کر نماز پڑھی ہے جس کے پڑھنے کی صورت یہ تھی، کہ کپڑے کی دونوں طرفیں خلاف سمت سے کندھے پر ڈال لیں، یعنی کپڑے کی دائیں طرف بائیں کندھے پر، اور بائیں طرف دائیں کندھے پر ڈالی۔ جس کا صاف مطلب یہ ہے، کہ سَر پر کچھ نہ تھا۔ ہاں البتہ سَر کا ڈھکنا افضل ہے۔ (جو بمقابلہ جواز ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ اگر کوئی جواز پر عمل کرے، تو اس پر طعن و تشنیع نہیں کرنا چاہیے) کیونکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے خطبہ کے دوران کبار صحابہ رضی اللہ عنہم کی موجودگی میں فرمایا تھا:

« إِذَا وَسَّعَ اللّٰهُ فَاوسِعُوا » [2]

یعنی ''جب اللہ فراخی کرے تم بھی فراخی کرو۔''

مولوی احمد رضا خان بریلوی نے ''احکامِ شریعت'' میں ننگے سَر نماز پڑھنے کو افضل قرار دیا ہے۔ کیونکہ اس میں خشوع وخضوع زیادہ ہے۔ اس کے برعکس علامہ ناصر الدین البانی نے ننگے سَر نماز پڑھنے کو مکروہ کہا ہے۔ فرماتے ہیں:

« وَالَّذِی أَرَاهُ فِی هٰذِهِ الْمَسْأَلَةِ أَنَّ الصَّلَاةَ حَاسِرُ الرَّاسِ مَكرُوهَةٌ »تمام المنة(۱/ ۵۹)

بحواله المسجد فی الاسلام،ص:۲۱۵)

لیکن علامہ موصوف کے نظریہ سے موافقت کرنا مشکل امر ہے۔ دلائل اپنی جگہ روزِ روشن کی طرح عیاں ہیں۔ بطورِ مثال صحیح بخاری کی ''کتاب الصلوۃ'' کی طرف رجوع فرمائیے: حقیقتِ حال واضح ہو جائے گی۔ (ان شاء اللہ)

---

[1] صحیح البخاری، بَابُ عَقْدِ الإِزَارِ عَلَی القَفَا فِی الصَّلَاةِ، رقم: ۳۵۲

[2] صحیح البخاری، بَابُ الصَّلَاةِ فِی القَمِیصِ وَالسَّرَاوِیلِ...... الخ، رقم: ۳۶۵

سوال: چند دنوں سے ہمارے ایک قاری صاحب ہر نمازِ جنازہ میں ننگے سَر پر سخت تنقید کرتے ہیں۔ وہ یہ الفاظ ادا کرتے ہیں۔ ''مسلمان مذہب کے اندر بامرِ مجبوری سَر ننگے سے عام نماز یا نمازِ جنازہ ہو جاتی ہے جہاں کپڑا مل جائے اور انسان جان بوجھ کر ننگے سَر سے نماز پڑھے تو اُس کی نماز نہیں ہوتی۔''

آپ قرآن وحدیث کی روشنی میں مجھے دلیل کے ساتھ جواب دیں۔

جواب: کسی مجبوری کے بغیر بھی ننگے سَر نماز پڑھنا جائز ہے صحیح بخاری "باب عقد الإزار علی القفا في الصلاۃ" کے تحت حضرت جابر رضی اللہ عنہ کا قصہ موجود ہے، کہ انھوں نے دوسرے کپڑے کی موجودگی کے باوجود صرف اَزار بند کو گدی پر باندھ کر نماز پڑھی۔ دوسرے شخص نے جب اعتراض کیا، تو فرمایا:

« انّمَا صَنَعتُ ذٰلِكَ لِيرَانِي أَحمَقُ مِثلُكَ .»①

یعنی ''میں نے یہ فعل اس لیے کیا ہے، تا کہ تجھ جیسا بے وقوف مجھے دیکھ لے۔''

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

« وَالغَرضُ بَيَانُ جَوَازِ الصَّلَاةِ فِي الثَّوبِ الوَاحِدِ، وَ لَو كَانَت الصَّلٰوةُ فِي الثَّوبَينِ أَفضَلُ ، فَكَأَنَّهُ قَالَ: صَنَعتُهُ عَمدًا لِبَيَانِ الجَوَازِ: إِمَّا لِيَقتَدِيَ بِي الجَاهِلُ إِبتِدَاءً، أَو يُنكِرُ عَلَيَّ ، فَأُعلِمُهُ أَنَّ ذٰلِكَ جَائِزٌ.»(فتح الباری(١/٤٦٧)

مقصود اس سے ایک کپڑے میں نماز پڑھنے کا جواز بیان کرنا ہے، اگرچہ دو میں افضل ہے۔ گویا کہ کیا اس نے اس فعل کو جواز بیان کرنے کے لیے عمداً کیا ہے، تا کہ جاہل انسان ابتداء میری اقتداء کر سکے یا مجھ پر انکار کرے، تو میں وجہ جواز بیان کر دوں؟ نیز صحیح بخاری میں "باب الصلاۃ في القمیص والسراویل والتبان والقباء" کے تحت حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا فرمان ہے۔ یعنی انسان تہ بند اور چادر میں بھی نماز پڑھ سکتا ہے۔ نیز تہ بند اور قمیص میں، تہہ بند اور چوغہ میں، پاجامہ اور چادر میں، پاجامہ اور قمیص میں۔ صحیح ابن حبان میں بروایت ابی ہریرۃ رضی اللہ عنہ اسی مفہوم کی ایک مرفوع روایت بھی بیان ہوئی ہے۔

پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کپڑا فراخ ہونے کے وقت کندھے ڈھانکنے کا حکم دیا ہے سَر کا نہیں۔

اس سے صاف معلوم ہوا کہ نماز میں سَر ڈھانکنا ضروری نہیں۔ مولوی احمد رضا بریلوی نے ''احکامِ شریعت'' میں ننگے سَر نماز پڑھنے کو زیادہ خشوع وخضوع کا باعث قرار دیا ہے۔ لہٰذا قاری صاحب موصوف کو اپنے متشددانہ موقف پر نظر ثانی کرنی چاہیے۔ (واللہ ولی التوفیق)

① صحیح البخاری، بَابُ عَقدِ الإِزَارِ عَلَی القَفَا فِی الصَّلَاۃِ، رقم: ٣٥٢

کپڑے کی موجودگی کے باوجود ننگے سر نماز پڑھنا:

سوال: کیا ننگے سر نماز پڑھی جا سکتی ہے؟ جب کہ کپڑا بھی موجود ہو۔ نیز یہ بھی ثابت ہے کہ کالا عمامہ سنت ہے کیا یہ سنت سر پر کپڑا رکھ کر نماز پڑھنے کو بھی ثابت کر رہی ہے۔ نیز ٹوپی کے ساتھ یا بغیر ٹوپی کے نماز میں اجر کے لحاظ سے افضل یا ادنیٰ کا فرق پڑتا ہے؟

جواب: کپڑے کی موجودگی کے باوجود ننگے سر نماز پڑھی جا سکتی ہے۔[1] کالے عمامہ سے صرف اس کے پہننے کا جواز معلوم ہوتا ہے۔ بحالتِ نماز بطورِ خاص اس سے استدلال کرنا مشکل امر ہے، اگرچہ عام معمول آپ ﷺ کا پگڑی پہننا تھا، لیکن صحیح بخاری کی روایت میں حضرت عمر بن ابی سلمہ رضی اللہ عنہ کا بیان ہے:

« رَأَیتُ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ یُصَلِّی فِی ثَوبٍ وَاحِدٍ فِی بَیتِ أُمِّ سَلَمَةَ، وَ قَد أَلقٰی طَرَفَیهِ عَلٰی عَاتِقَیهِ »[2]

یعنی ''میں نے رسول اللہ ﷺ کو اُمّ سلمہ رضی اللہ عنہا کے گھر میں ایک کپڑے میں نماز پڑھتے دیکھا ہے، اس کی دونوں طرفوں کو آپ نے دونوں کندھوں پر ڈالا ہوا تھا۔''

پھر صحیح بخاری وغیرہ میں مُصَلّٰی امامت (امامت کی جگہ) پر تذکرِ غسل (جنابت کے غسل کے یاد آنے) جنابت والی روایت سے مترشح (واضح) ہے، کہ اس وقت آپ ﷺ نے ننگے سر نماز پڑھائی تھی۔

ٹوپی یا غیر ٹوپی کے ساتھ نماز پڑھنا بظاہر یکساں جواز ہے۔ اگر ایسا کوئی مسئلہ ہوتا، تو جہاں آپ ﷺ نے عورت کے بارے میں فرمایا: کہ اس کی نماز بغیر دوپٹہ قبول نہیں ہوتی، وہاں مرد کو بھی اَمر دیا جا سکتا تھا۔ اس وقت حکم نہ دینا، اس بات کی دلیل ہے، کہ مرد کے لیے ننگے سر نماز پڑھنا جائز ہے۔

نماز میں سر ڈھانپنے کا مسنون طریقہ:

سوال: ایک دیوبندی عالم کی زبانی معلوم ہوا کہ ایک حدیث ایسے ہے کہ مسنون طریقہ یہ ہے کہ سَر پر پگڑی اور ٹوپی دونوں ہوں۔ کوئی ایک چیز ہونا منافق کی نشانی ہے اور نماز میں سَر کم از کم ڈھانپنا ضروری ہے۔ نہ ڈھانپنے سے نماز ناقص ہوگی۔

جواب: دیوبندی عالم کا یہ غلو ہے۔ شریعت سے اس نظریہ کی تائید نہیں ہوتی۔ جب کہ یہ بات معروف ہے کہ لباس کی ہیئت کا تعلق عادات سے ہے۔ عبادات سے نہیں۔ کتب احادیث میں ہے، کہ رسول اللہ ﷺ

[1] صحیح البخاری، بَابُ عَقدِ الإِزَارِ عَلَی القَفَا فِی الصَّلَاةِ، رقم:۳۵۲

[2] صحیح البخاری، بَابُ الصَّلَاةِ فِی الثَّوبِ الوَاحِدِ مُلتَحِفًا بِهِ، رقم:۳۵۵

نے ایک کپڑا اوڑھ کر نماز پڑھی جس کے پڑھنے کی صورت یہ تھی، کہ کپڑے کی دونوں طرفین مخالف سمت سے کندھے پر ڈال لیں۔ یعنی اس کی دائیں طرف بائیں کندھے پر اور بائیں طرف دائیں کندھے پر ڈال لی۔ جس کا صاف مطلب یہ ہے، کہ سر پر کچھ نہ تھا۔

کیا ننگے سر نماز پڑھنے سے نماز مکروہ ہو جاتی ہے؟

(سوال) : میں ایک دن ننگے سَر نماز پڑھ رہا تھا نماز کے بعد ایک شخص نے مجھے کہا کہ تمہاری نماز مکروہ ہوگئی ہے کیا نماز کے دوران سَر پر کپڑا رکھنا لازمی ہے؟

(جواب) : بحالتِ نماز کسی حدیث میں سَر پر کپڑا رکھنا ضروری قرار نہیں دیا گیا۔ البتہ سَر ڈھانپنا عام زندگی کا شعار ہونا چاہیے۔ ننگے سَر رہنا مروّت اور عادات نبوی کے خلاف ہے۔

نماز میں سَر ڈھانپنا ضروری ہے یا نہیں؟

(سوال) : نماز میں سَر ڈھانپنا ضروری ہے یا نہیں؟ ایک مفتی صاحب کا فتویٰ ہے کہ اگر کوئی آدمی ننگے سَر گلی کوچوں میں پھرے تو اس کی شہادت قبول نہیں، جب گلی کوچوں میں ننگے سَر پھرنے کی وجہ سے یہ وعید ہے کہ شہادت قبول نہیں تو نماز کی حالت میں ننگے سَر کھڑے ہونے کی صورت میں کم از کم نماز بھی مکروہ ہونی چاہیے۔ کیا یہ درست ہے؟ تفصیل سے وضاحت فرما دیں۔

(جواب) : نماز میں سَر کا ڈھانپنا ضروری نہیں۔ احرام کی حالت میں بھی تو سب حاجی ننگے سَر نماز پڑھتے ہیں۔ حدیث میں ہے، کہ تم میں سے کوئی شخص ایک کپڑے میں اس طرح نماز نہ پڑھے، کہ کندھے پر کچھ نہ ہو (بلوغ المرام) [1]

غور فرمایئے! رسول اللہ ﷺ نے ایک کپڑے میں نماز پڑھنے کی اجازت مرحمت فرمائی۔ صرف کندھے کا ڈھانپنا ضروری قرار دیا، سَر کا کہیں ذکر نہیں۔ اسی طرح خود رسول اللہ ﷺ نے ایک کپڑا اوڑھ کر نماز پڑھی ہے، جس کے پڑھنے کی صورت یہ تھی، کہ کپڑے کی دونوں طرفیں مخالف سمت سے کندھے پر ڈال لیں۔ یعنی اس کی دائیں طرف بائیں کندھے پر، اور بائیں طرف دائیں کندھے پر ڈال لی جس کا صاف مطلب یہ ہے، کہ سَر پر کچھ نہ تھا، چنانچہ مفتی صاحب کا فتویٰ لاعلمی پر مبنی ہے، جس کی شریعت میں کوئی اصل نہیں۔ البتہ ننگے سَر نماز پڑھنے کو معمول نہیں بنانا چاہیے۔

---

[1] صحیح البخاری، بَابٌ :إِذَا صَلَّى فِي الثَّوْبِ الوَاحِدِ فَلْيَجْعَلْ عَلَى عَاتِقَيْهِ، رقم: ۳۵۹

کیا نماز پڑھتے وقت سَر پر ٹوپی کا ہونا لازمی ہے؟

سوال : کیا نماز پڑھتے وقت سَر پر ٹوپی کا ہونا لازمی ہے؟

جواب : نبی ﷺ کے عمل اور ارشادِ مبارک سے ثابت ہے، کہ آپ ﷺ نے ننگے سَر نماز پڑھی۔ چنانچہ ایک حدیث میں ہے، کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک کپڑا اوڑھ کر نماز پڑھی، جس کے اوڑھنے کی کیفیت یہ تھی، کہ کپڑے کے دونوں پلّو مخالف سمت سے کندھے پر ڈال لیے، یعنی اس کی دائیں طرف بائیں کندھے پر، اور بائیں طرف دائیں کندھے پر ڈال لی۔ اس سے صاف واضح ہے، کہ آپ ﷺ کا سَر مبارک ننگا تھا۔

''صحیحین'' میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''جب کپڑا افراخ ہو تو اسے اوڑھ لے۔'' (یعنی نماز میں) [1]

صحیح مسلم کی روایت میں اوڑھنے کا یہ طریقہ بتایا ہے، کہ کپڑے کے دونوں کنارے باہم مخالف طرف سے کندھے پر ڈال لے۔ اگر کپڑا تنگ ہو تو تہ بند باندھ لے۔ [2]

تو اس طرح قولی حدیث سے بھی ثابت ہو گیا کہ نماز میں سَر ڈھانپنا لازمی نہیں۔

مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو! صحیح بخاری (کتاب الصلاۃ) کے ابتدائی ابواب۔

ننگے سر نماز پڑھنا جائز ہے تو جوتا پہنے نماز پڑھنے پر کیوں عمل نہیں کیا جاتا؟

سوال : اہلِ حدیث مساجد میں لوگ عموماً ننگے سَر نماز پڑھتے ہیں، ننگے سَر نماز پڑھنا احادیث سے ثابت ہے تو جوتی سمیت نماز پڑھنا بھی نبی کریم ﷺ کی سنت ہے، ایک سنت پر عموماً عمل کیا جاتا ہے، جب کہ دوسری سنت کو ترک کر دیا جاتا ہے، آخر اس کی کیا وجہ ہے؟

جواب : دونوں سنتوں پر عمل ہونا چاہیے، باعمل اہلِ حدیث کی زندگی ہمیشہ کتاب و سنت کے گرد گھومتی ہے۔ وہ ہر کام میں شریعت کی پیروی کے لیے کوشاں رہتے ہیں۔ لیکن کسی فعل کے جائز ہونے کا یہ معنی بھی نہیں، کہ نہ کرنے والا قابلِ مذمت اور موردِ الزام ٹھہرے۔

یاد رکھیں کہ عام حالات میں جوتا اُتار کر نماز پڑھنا افضل ہے۔ کیونکہ سجدے میں پاؤں کی انگلیوں کا رُخ اسی صورت میں قبلہ کی طرف کیا جا سکتا ہے، جب جوتا اتارا ہوا ہو، جس طرح کہ صحیح حدیث میں اس امر

---

[1] صحیح البخاری، بَابٌ :إِذَا صَلَّى فِي الثَّوْبِ الوَاحِدِ فَلْيَجْعَلْ عَلَى عَاتِقَيْهِ، رقم: ٣٦١

[2] صحیح مسلم، بَابُ حَدِيثِ جَابِرٍ الطَّوِيلِ وَقِصَّةِ أَبِي الْيَسَرِ، رقم: ٣٠١٠

کی صراحت موجود ہے۔

نماز میں جوتے اتارنے کا حکم کہاں آیا ہے؟

(سوال) نماز میں جوتے اتارنے کا خصوصی حکم کہاں آیا ہے، یا ہم نے لازم کیوں جان لیا ہے؟

(جواب) نماز کی حالت میں جب نبی کریم ﷺ کے جوتے میں نجاست لگی تھی تو جوتا اتارنے کا حکم دیا گیا، جس طرح کہ حدیث میں اس کی صراحت موجود ہے۔ عام حالات میں جوتا پہن کر نماز پڑھنا جائز ہے، لیکن بغیر جوتے کے نماز پڑھنا افضل معلوم ہوتا ہے، کیوں کہ رسول اللہ ﷺ کی نماز کا عام طریقہ یہی تھا کہ سجدے میں دونوں پاؤں کی انگلیاں قبلہ رُخ ہوتیں۔ ظاہر ہے کہ جوتوں میں یہ کیفیت مشکل ہے۔

حالتِ نماز میں سلام کا جواب دینا

بحالت نماز سلام کا جواب:

(سوال): مسجد میں امام جماعت کروا رہا ہے باہر سے آنے والے آدمی کو کیا کرنا چاہیے بعض لوگ آتے ہی السلام علیکم کہتے ہیں جب کہ سب لوگ نماز کی حالت میں ہوتے ہیں آیا ان کو زبان سے یا ہاتھ کے اشارے سے سلام کا جواب دینا چاہیے؟ وضاحت فرمائیں۔

(جواب): نماز کی حالت میں اگر کسی کو سلام کہا جائے، تو جواب صرف اشارہ سے دینا چاہیے۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو! ''مرعاۃ المفاتیح''

(سوال): جماعت کھڑی ہے۔ پیچھے آنے والا ''اَلسَّلَامُ عَلَيكُم'' پکارتا ہے۔ سوائے نمازیوں کے کوئی جواب دینے والا موجود نہیں ہے کیا اس طرح ''السلام علیکم'' کہنا درست ہے؟

(جواب): حالت نماز میں اگر کسی نمازی کو سلام کہا جائے، تو اس کا جواب اشارہ سے دینا چاہیے۔ اس بارے میں متعدد احادیث وارد ہیں۔ امام نسائی رحمہ اللہ نے اس پر مستقل تبویب قائم کی ہے:

«بَابُ رَدِّ السَّلَامِ بِالإِشَارَةِ فِي الصَّلَاةِ.»

پھر اس کے تحت حضرت عمار بن یاسر سے مروی روایت بیان کی ہے۔

«أَنَّهُ سَلَّمَ عَلٰى رَسُولِ اللّٰهِ ﷺ فِي الصَّلٰوةِ وَ هُوَيُصَلِّي. فَرَدَّ عَلَيهِ.»[1]

---

[1] سنن النسائی، بَابُ رَدِّ السَّلَامِ بِالْإِشَارَةِ فِي الصَّلَاةِ، رقم: ۱۱۸۸

''حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ کو حالتِ نماز میں سلام کہا، تو آپ نے جواب دیا۔''

دوسری روایت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔ انھوں نے بلال رضی اللہ عنہ سے دریافت کیا:

« كَيفَ كَانَ النَّبِيُّ ﷺ يَرُدُّ عَلَيهِم حِينَ كَانُوا يُسَلِّمُونَ عَلَيهِ، وَهُوَ فِي الصَّلٰوةِ، قَالَ: كَانَ يُشِيرُ بِيَدِهٖ »[1]

''جب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم آپ کو سلام کہتے اور آپ نماز میں ہوتے، تو آپ کیسے جواب دیتے تھے؟ کہا: اپنے ہاتھ سے اشارہ کرتے تھے۔''

زیرِ حدیث صاحب ''المرعاۃ'' فرماتے ہیں:

« فِيهِ دَلِيلٌ عَلٰى جَوَازِ رَدِّ السَّلَامِ فِي الصَّلٰوةِ بِالِاشَارَةِ. وَ هُوَ مَذهَبُ الجَمهُورِ » (۱۱/۲)

یعنی ''اس حدیث میں اس بات کی دلیل ہے، کہ اشارہ سے سلام کا جواب دینا جائز ہے۔ جمہور اہلِ علم کا یہی مسلک ہے۔''

تیسری روایت میں حضرت صہیب رضی اللہ عنہ کا بیان ہے، کہ رسول اللہ ﷺ نماز پڑھ رہے تھے۔ میرا آپ کے پاس سے گزر ہوا۔

« فَسَلَّمتُ عَلَيهِ، فَرَدَّ عَلَيَّ اِشَارَةً. وَ قَالَ: لَا اَعلَمُ اِلَّا اِشَارَةً بِاِصبَعِهٖ .» الترمذی والنسائی والبیہقی[2]

یعنی ''میں نے سلام کہا، تو آپ ﷺ نے اشارہ سے جواب دیا۔ کہا جہاں تک مجھے معلوم ہے ایک انگلی سے اشارہ کیا۔''

حالتِ نماز میں سلام کا جواب ہاتھ کے اشارے سے دینا؟

سوال: پہلے وقتوں میں جماعت میں ''السلام علیکم'' کا جواب ہاتھ کے اشارہ سے دیتے تھے۔ اب بھی جائز ہے کہ نہیں؟

جواب: نماز میں ہاتھ کے اشارہ سے سلام کا جواب پہلے بھی جائز تھا اور اب بھی جائز ہے۔ حضرت ابن

---

[1] سنن الترمذی، بَابُ مَا جَاءَ فِي الإِشَارَةِ فِي الصَّلَاةِ، رقم: ۳۶۸

[2] سنن الترمذی، بَابُ مَا جَاءَ فِي الإِشَارَةِ فِي الصَّلَاةِ، رقم: ۳۶۷، و حسنه سنن أبي داؤد، بَابُ رَدِّ السَّلَامِ فِي الصَّلَاةِ، رقم: ۹۲۵

مسعود رضی اللہ عنہ کی حدیث میں نماز میں صرف کلام سے روکا گیا ہے۔ اشارہ سے نہیں، بلکہ بروایت ابن ابی شیبہ مرسل ابن سیرین اسی قصہ میں نماز میں اشارہ کرنے کا جواز موجود ہے۔

مسجد میں داخل ہونے والا بلند آواز سے سلام کہہ سکتا ہے؟

سوال: مسجد میں جب نمازی نماز پڑھ رہے ہوں تو کیا ہم بلند آواز سے "السلام علیکم" کہہ سکتے ہیں؟

جواب: بحالتِ نماز بآواز بلند سلام کہا جاسکتا ہے لیکن اس کا جواب انگلی یا ہاتھ کے اشارہ سے ہونا چاہیے۔ چنانچہ ترمذی میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی حدیث میں ہے:

« قَالَ : قُلتُ لِبِلَالٍ کَیفَ کَانَ النَّبِیُّ ﷺ یَرُدُّ عَلَیهِم حِینَ کَانُوا یُسَلِّمُونَ عَلَیهِ وَ هُوَ فِی الصَّلَاةِ ؟ قَالَ: کَانَ یُشِیرُ بِیَدِہٖ.» [1]

''ابن عمر رضی اللہ عنہما نے کہا: میں نے بلال رضی اللہ عنہ سے دریافت کیا، کہ نبی ﷺ نماز لوگوں کے سلام کا جواب کس طرح دیتے تھے؟ کہا: ہاتھ کے اشارے سے؟''

صاحب ''مرعاۃ المفاتیح'' فرماتے ہیں:

« وَالحَدِیثُ فِیهِ دَلِیلٌ عَلٰی جَوَازِ رَدِّ السَّلَامِ فِی الصَّلٰوۃِ بِالإِشَارَۃِ . وَ هُوَ مَذهَبُ الجَمهُورِ: وَاختَلَفَ الحَنَفِیَّةُ، فَمِنهُم مَن کَرِهَهُ، وَ مِنهُم الطَّحَاوِیُّ، وَ مِنهُم مَن قَالَ : لَا بَأسَ بِهٖ.»

''اس حدیث میں اس امر کی دلیل ہے، کہ نماز میں سلام کا جواب اشارے سے ہونا چاہیے۔ جمہور کا مسلک یہی ہے۔ البتہ حنفیہ کا اس میں آپس میں اختلاف ہے۔ بعض نے مکروہ کہا اور ان میں الطحاوی ہیں، جب کہ بعض نے کہا ہے، کہ اس میں کوئی حرج نہیں۔''

بلاشبہ دلائل کے اعتبار سے راجح اس کا جواز ہی ہے۔ مسئلہ ہذا پر سیر حاصل بحث کے لیے ملاحظہ ہو! ''المرعاۃ'' (۲/ ۱۲)

سوال: نماز با جماعت کے دوران، جب کہ قرأت بھی شروع ہو چکی ہو، کیا باہر سے آنے والے کے لیے سلام کہنا جائز ہے یا نہیں؟ قرآن وسنت کی روشنی میں ذرا وضاحت سے جواب تحریر فرمائیں۔

جواب: بحالتِ نماز سلام کہنا صرف جائز ہی ہے۔ ضروری نہیں، جب کہ اس کا جواب اشارے سے دیا جائے گا۔ زبان سے نہیں۔ چنانچہ ''سنن ترمذی'' میں ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے، کہ میں نے بلال رضی اللہ عنہ سے

[1] سنن الترمذی، بَابُ مَا جَاءَ فِی الإِشَارَةِ فِی الصَّلَاةِ، رقم:۳۶۸

دریافت کیا، کہ نبی ﷺ نماز کی حالت میں صحابہ رضی اللہ عنہم کے سلام کا جواب کیسے دیتے تھے؟ فرمایا:

« كَانَ يُشِيرُ بِيَدِهِ » ''آپ ﷺ ہاتھ کے اشارے سے جواب دیتے تھے۔''[1]

جمہور اہلِ علم کا یہی مسلک ہے۔ صاحب ''المرعاۃ'' فرماتے ہیں: کہ یہی بات حق ہے۔ صحیح صریح احادیث اس پر دلالت کرتی ہیں۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو! مرعاۃ المفاتیح (۲/ ۱۲)

حالتِ نماز میں ممنوع اور مشروع اعمال

حالت نماز میں خواتین چہرہ چھپا کر رکھیں یا کھلا رکھ سکتی ہیں؟

سوال کیا حالت نماز میں خواتین کا چہرہ چھپا کر (نقاب ڈال کر) نماز پڑھنا جائز ہے؟ یا حالت احرام کی طرح چہرہ کھلا رہنا ضروری ہے؟

جواب اس وقت اگر کوئی اجنبی آدمی موجود نہ ہو تو عورت کے لیے چہرہ کھلا رکھنا جائز ہے اور کسی اجنبی کی موجودگی میں چہرہ ڈھکا ہونا چاہیے لیکن بلاوجہ چہرہ ڈھانپنا محض تکلف ہے۔ پھر عام حالت کو حالت احرم پر قیاس کرنا درست نہیں کیونکہ حالت احرام مخوص افعال کی متقاضی ہے۔

حالتِ نماز میں نبی ﷺ کا نام سن کر درود پڑھنا:

سوال: اگر آدمی نماز پڑھ رہا ہے تو مؤذن سے نبی ﷺ کا اسم گرامی سن کر درود پڑھنے کا کیا حکم ہے؟

جواب: نبی اکرم ﷺ پر درود پڑھنے کی مطلق احادیث کی بناء پر نمازی کے لیے بھی درود پڑھنے کا جواز ہے۔ (واللہ تعالیٰ اعلم)

نماز پڑھتے ہوئے رسول اللہ ﷺ کے نام سن کر درود بھیجنا چاہیے یا نہیں؟

سوال نماز پڑھتے ہوئے اگر دوسری مسجد سے اذان کی آواز آئے، تو رسول اللہ ﷺ کے نام کے جواب میں درود بھیجنا چاہیے یا نہیں؟

جواب بظاہر نبی اکرم ﷺ پر درود پڑھنے کی مطلق احادیث کی بناء پر دورانِ نماز بھی آپ ﷺ کا اسم گرامی سُن کر درود پڑھنے کا جواز معلوم ہوتا ہے۔ سماع چاہے داخلی ہو یا خارجی اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ (واللہ اعلم بالصواب و علمہ اتم)

[1] سنن الترمذی، بَابُ مَا جَاءَ فِي الإِشَارَةِ فِي الصَّلَاةِ، رقم: ۳۶۸

فرض نماز میں نبی رحمت ﷺ کا اسم گرامی سن کر درود بھیجنا:

(سوال) فرض نماز کھڑی ہو یا الگ کوئی سنتیں، نوافل وغیرہ ادا کر رہا ہو۔ نبی رحمت ﷺ کا اسم گرامی سن کر کیا وہ اپنے دل میں درود پڑھ سکتا ہے یا نہیں۔ بعض امام صاحب ایسی آیات کی تلاوت کر دیتے ہیں جس میں آپ کا نام آتا ہو۔ دورانِ نماز آپ پر اس طرح سے درود پڑھنا کیسا ہے؟

(جواب) اس صورت میں عمومِ اَحادیث کی بنا پر بحالتِ نماز نبی اکرم ﷺ پر درود پڑھنے کا جواز ہے۔ اور اگر کوئی نہ پڑھے تو بھی کوئی حرج نہیں کیونکہ اس میں اس حدیث پر عمل ہو جائے گا:

« لَا تَقرَءُ وا بِشَيءٍ مِنَ القُراٰنِ اِذَا جَهَرتُ اِلَّا بِاُمِّ القُراٰنِ»

جب میں اونچی آواز سے تلاوت کروں تو سورۂ فاتحہ کے سوا کچھ نہ پڑھو۔‘‘[1]

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد والی نماز کی تکمیل کیسے ہوئی؟

(سوال) حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی شہادت نماز پڑھاتے ہوئی تھی۔ کیا حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس وقت کسی صحابی کو امامت کے لیے کھڑا کیا تھا یا نماز دوبارہ پڑھی گئی تھی۔

(جواب) اُسی وقت دوسرے صحابی نے تکمیل کرائی تھی۔

دورانِ نماز دیکھ کر قرآن پاک پڑھنا کیا جائز ہے؟

(سوال) دورانِ نماز دیکھ کر قرآن پاک پڑھنا کیا جائز ہے؟ جس کی صورت کچھ اس طرح سے ہو کہ نمازی کے سامنے جائے نماز پر قرآن پاک رکھا ہو اور ایک صفحہ پڑھنے کے بعد وہ صفحہ تبدیل بھی کر سکے۔ کیا ایسا عمل کرنے سے نماز فاسد یا مکروہ تو نہیں ہوتی؟

(جواب) قرآن مجید سے دیکھ کر بحالتِ نماز قرأت کرنا جائز ہے۔ ایسی صورت میں امامت کا بھی جواز ہے۔ چنانچہ صحیح بخاری کے ’’ترجمۃ الباب‘‘ میں ہے:

« وَ كَانَت عَائِشَةُ يَؤُمُّهَا عَبدُهَا ذَكوَانُ مِنَ المُصحَفِ.»[2]

یعنی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا غلام ذکوان ان کی امامت مصحف سے دیکھ کر کرایا کرتا تھا۔

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

---

① سنن أبي داؤد، بَابُ مَن تَرَكَ القِرَاءَةَ فِي صَلَاتِهِ بِفَاتِحَةِ الكِتَابِ، رقم: ٨٢٤

② صحيح البخاري، فَمَن جَاءَ بَعدَ ذَلِكَ فَإِنَّمَا يَجِيءُ بِحَقٍّ إِلَى الصَّلَاةِ، فتح الباري، ١٨٤/٢

« إِستَدَلَّ بِهِ عَلٰی جَوَازِ قِرَاءَةِ المُصَلِّی مِنَ المُصحَفِ » (فتح الباری:۲/۱۸۵)

اس روایت سے استدلال کیا گیا ہے، کہ نمازی مصحف سے دیکھ کر قرآن کی تلاوت کر سکتا ہے۔

سعودی عرب کے مفتی اعظم شیخ ابن باز تعلیقات میں فرماتے ہیں: کہ درست بات یہ ہے، کہ فعل ہذا جائز ہے۔ جس طرح کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا عمل تھا۔ بعض دفعہ آدمی کو اس شی کی ضرورت پیش آتی ہے۔ نماز میں عملِ کثیر جب پے در پے نہ ہو تو وہ نماز کے لیے نقصان دہ نہیں۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم امامہ بنت زینب کو بحالت نماز اٹھا لیتے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صلاۃِ کسوف میں بھی تقدّم و تاخّر سے کام لیا۔ مزید دلائل اپنے مقامات پر موجود ہیں۔[1]

نماز میں ''سَدَل'' کرنا:

سوال نماز میں ''سَدَل'' سے منع کیا گیا ہے۔ اگر سردی کی وجہ سے سَر کے اُوپر سے چادر ایسے لٹکائی جائے کہ کندھے، بازو، سَر اور گردن چھپ جائے تو کیا یہ صورت بھی منع ہو گی؟ اگر کوئی شخص سر کے اوپر باندھے ہوئے رومال کو کھول کر سَر پر سے ہی دونوں کانوں کے اُوپر سے لٹکا دے کہ نظر قابو میں رہے اور نماز سکون سے پڑھی جائے تو یہ فعل کیسا ہے؟

جواب سنن ابی داؤد میں حسن درجہ کی حدیث میں سَدَل سے ممانعت وارد ہے۔[2] ائمۂ لغت اور شارحین حدیث سے اس لفظ کی جو تشریحات کی ہیں ان کو جمع کرنے سے معلوم ہوتا ہے، کہ لفظ سَدَل اُن تمام صورتوں کو شامل ہے جن میں کپڑا کھلا نمازی کے آگے سے لٹکتا ہو۔ سوال میں مذکورہ صورتوں کو اسی معیار پر پرکھنا چاہیے۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو! (مرعاۃ المفاتیح: ۱/ ۵۰۳)

نماز آنکھیں کھول کر پڑھیں یا بند کر کے؟

سوال آنکھیں کھول کر ہی نماز پڑھنی چاہیے یا بند بھی کی جا سکتی ہیں؟ اس پر نص صریح کیا ہے؟

جواب ابن عباس رضی اللہ عنہما کا کہنا ہے، کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: « إِذَا قَامَ اَحَدُکُم فِی الصَّلٰوةِ، فَلَا يَغمِض عَينَيهِ »[3] یعنی ''تم میں سے جب کوئی آدمی نماز میں ہو، تو وہ اپنی آنکھیں بند نہ کرے۔''

---

① صحیح البخاری، بَابُ إِذَا حَمَلَ جَارِيَةً صَغِيرَةً عَلَی عُنُقِهِ فِی الصَّلَاةِ، رقم:۵۱۶

② سنن أبی داؤد، بَابُ مَا جَاءَ فِی السَّدلِ فِی الصَّلَاةِ، رقم:۶۴۳، سنن الترمذی، بَابُ قِيَامِ النَّبِیِّ صلی اللہ علیہ وسلم بِاللَّيلِ فِی رَمَضَانَ وَغَيرِهِ، رقم:۳۷۸

③ معجم الاوسط، للطبرانی، رقم:۲۲۱۸

بعض سلف بھی اسی بات کے قائل ہیں، لیکن حدیث ہذا کے بارے میں امام عبدالرحمن بن ابی حاتم فرماتے ہیں: کہ «هٰذَا حَدِيثٌ مُنكَرٌ» ''یہ حدیث منکر ہے۔''منکر ضعیف کی اقسام میں سے ایک ہے۔ ملاحظہ ہو! المغنی ابن قدامہ (۳۹۶/۲) آنکھیں کھول کر نماز پڑھنے میں کوئی کلام نہیں۔ اصل یہی ہے۔

بیہقی اور مستدرک حاکم میں روایت ہے: « كَانَ ﷺ إِذَا صَلّٰى طَأْطَأَ رَأْسَهُ، وَ رَمٰى بِبَصَرِهٖ نَحوَ الْأَرضِ » [1] ''رسول اللہ ﷺ جب نماز پڑھتے، تو سر جھکاتے اور نگاہ زمین کی طرف رکھتے۔'' تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو! صفة الصلوة للالبانی'' (ص ۵۸)

دورانِ نماز نظر کہاں رکھی جائے؟

(سوال): جب آدمی نماز میں کھڑا ہوتا ہے اس وقت اس کی نظر کہاں ہونی چاہیے، کیا بالکل سامنے دیکھنا چاہیے یا کہ سجدہ کی جگہ پر؟

(جواب): مسئلہ ہذا میں اہلِ علم کا اختلاف ہے۔ صحیح بات یہ ہے کہ نماز میں نگاہ جائے سجود میں ہونی چاہیے۔ ''سنن کبریٰ بیہقی'' میں حدیث ہے:

« كَانَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ إِذَا صَلّٰى طَأْطَأَ رَأْسَهُ ، وَ رَمٰى بِبَصَرِهٖ نَحوَ الْأَرضِ .» [2]

جب کہ امام مالک اور ان کے ہمنوا اہلِ علم کا خیال ہے کہ نمازی سامنے قبلے کی طرف دیکھے جائے۔ سجود کی طرف نہ دیکھے۔ لفظ ﴿فَوَلِّ وَجهَكَ شَطرَ المَسجِدِ الحَرَامِ﴾(البقرة:١٤٤) سے ان کا استدلال ہے۔ امام ثوری، ابوحنیفہ، شافعی اور حسن بن حی نے کہا ہے کہ مستحب یہ ہے کہ جائے سجود کی طرف دیکھے اور شریک قاضی نے کہا ہے، کہ قیام میں جائے سجود کی طرف اور رکوع میں قدموں کی طرف اور سجدے میں ناک کی جگہ کی طرف اور بیٹھک میں اپنی گود کی طرف دیکھے۔ (تفسیر قرطبی (۱۶۰/۲)

''عون المعبود'' میں ہے کہ سلف اس بات کو مستحب سمجھتے تھے کہ ان میں کسی ایک کی نظر جائے سجود سے تجاوز نہ کرے۔ حاکم رحمہ اللہ نے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے ذکر کے ساتھ اس کو موصول بیان کیا ہے اور انھوں نے اس کو نبی ﷺ سے مرفوع بیان کیا ہے۔ (۳۴۳/۱)۔

تفسیر ''قرطبی'' اور ''فتح القدیر'' میں ''سورۃ النور'' کے شروع میں بھی بعض مراسیل کا تذکرہ ہے۔ جن میں جائے سجود کی طرف نگاہ کی تصریح ہے۔

---

[1] السنن الكبرى للبيهقي، بَابُ لَا يُجَاوِزُ بَصَرُهُ مَوْضِعَ سُجُودِهٖ، رقم:٣٥٤٢

[2] أيضًا

نماز کے دوران چھینک آ جائے تو اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ کہنا:

سوال: نماز کے دوران چھینک آ جائے تو کیا تحمید کہی جا سکتی ہے؟

جواب: نماز کے دوران چھینک آنے پر "اَلْحَمدُ لِلّٰہِ" کہی جا سکتی ہے، لیکن اس کا جواب نہیں دینا چاہیے۔ کیونکہ «یَرحَمُكَ اللّٰہُ» کا تعلق انسانی گفتگو سے ہے۔ جب کہ «اَلْحَمدُ لِلّٰہِ» قرآنی الفاظ میں سے ہے، اس لیے اس کا جواز ہے۔

سوال: نماز میں چھینک آئے تو نمازی «الحمد لله» کہہ سکتا ہے یا نہیں؟

جواب: بحالتِ نماز چھینک آنے سے «الحمد لله» کہا جا سکتا ہے، لیکن جواب دینا صحیح نہیں کیونکہ اس کا شمار لوگوں کے کلام میں ہوتا ہے، جو شرعاً ممنوع ہے۔

آدابِ جماعت وامامت (شروط صلاۃ)

آدابِ جماعت

جماعت کھڑی ہو جائے تو فرض نماز کے علاوہ اور کوئی نماز ادا نہ کرنا:

(سوال): جناب رسالت مآب ﷺ نے فرمایا ہے کہ جب جماعت کھڑی ہو جائے تو فرض نماز کے علاوہ اور کوئی نماز ادا نہیں ہوسکتی تو اس حالت میں ایک نمازی ظہر کی پہلی چار سنتوں میں سے تیسری رکعت میں ہے اور ادھر جماعت کھڑی ہو جاتی ہے تو کیا وہ بقیہ نماز ادا کرے یا نہیں۔ اگر ادا کرے تو اس کی سنتیں ادا ہو جائیں گی یا نہیں؟

(جواب): جب سنتوں کی چار رکعتوں سے ایک رکعت باقی ہوتو چھوڑ کر جماعت کے ساتھ شامل ہو جانا چاہیے۔ جماعت سے فراغت کے بعد کُل رکعات نئے سرے سے پھر پڑھنی ہوں گی۔ بناء کی روایت کمزور ہے۔ صحیح حدیث میں ہے:«لَا تُقبَلُ صَلٰوۃُ مَن أَحدَثَ، حَتّٰی یَتَوَضَّأَ»①

دو آدمی جماعت کے ساتھ نماز ادا کریں تو امام کا ساتھ والے سے ایک قدم آگے کھڑا ہونا:

(سوال): دو آدمی جماعت کے ساتھ نماز ادا کریں تو کیا امام ساتھ والے سے ایک قدم آگے کھڑا ہو یا کہ بالکل برابر ٹخنے کے ساتھ ٹخنہ ملا کر کھڑا ہو؟

(جواب): اس حالت میں مقتدی اور امام دونوں ٹخنے ملا کر برابر کھڑے ہوں۔ تقدیم و تاخیر کا کوئی ثبوت نہیں۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی ''صحیح'' میں ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت« بِتُّ فِي بَیتِ خَالَتِي مَیمُونَۃَ» پر یوں تبویب قائم کی ہے:« بَابُ یَقُومُ عَن یَمِینِ الاِمَامِ بِحِذَائِهٖ سِوَاءً اِذَا کَانَا اثنَینِ.»

لاؤڈ سپیکر کی اذان پر مسجد جانے کا حکم:

(سوال): بروایت حضرت ابن اُمّ مکتوم رضی اللہ عنہ کہ جب انھوں نے نماز گھر میں پڑھنے کی اجازت مانگی تو حضور ﷺ نے فرمایا کہ تجھے اذان سنائی دیتی ہے؟ اذان سننے کے پیشِ نظر آج کل لاؤڈ سپیکر کی آواز میلوں

① صحیح البخاری، باب لاتقبل صلاۃ بغیر طھور، رقم:١٣٥

تک پہنچتی ہے۔ اگر اس کے گھر سے مسجد تک کا فاصلہ اس کی پہنچ سے باہر ہو تو کیا اُسے مسجد میں حاضری دینا پڑے گی؟

(جواب): ایسے حالات میں استطاعت کے مطابق عمل ہو گا۔ قرآن مجید میں ہے: ﴿فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ﴾ (سورۃ التغابن:۱۶) ''اللہ سے ڈرو جہاں تک ہو سکے۔''

اور نبی اکرم ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے:

« مَا نَهَيْتُكُمْ عَنْهُ فَاجْتَنِبُوهُ، وَ مَا أَمَرْتُكُمْ فَأْتُوا مِنْهُ مَا اسْتَطَعْتُمْ .»[1]

''جس چیز سے میں تمھیں منع کروں اس سے باز رہو اور جس بات کا حکم دوں تو اسے جس قدر بجا لا سکتے ہو بجالاؤ۔''

اسی طرح وہ آدمی جس کا گھر مسجد کے قریب ہو، لیکن کسی آڑ کی وجہ سے اس کو اذان سنائی نہ دے۔ عدمِ سماع کے باوجود اس کو مسجد میں آ کر نماز ادا کرنی ہوگی۔ کیونکہ یہ شخص اذان سننے والے کے حکم میں ہوگا۔ جس طرح کہ اوّل الذکر شخص دُوری کی وجہ سے اذان سننے کے باوجود مسجد میں آنے کا مکلّف نہیں۔

شخص ہذا حکماً ایسے ہی ہے، گویا کہ اس کو اذان سنائی نہیں دی۔

مقتدی اقتداء میں زیادہ تاخیر نہ کرے:

(سوال): ایک آدمی امام کے پیچھے نماز فرض ادا کرتا ہے جب امام رکوع میں یا سجدے میں جاتا ہے یا سجدہ سے سَر اٹھاتا ہے تو مقتدی کافی دیر بعد سجدہ سے سَر اٹھاتا ہے۔ امام سجدہ میں پانچ بار یا سات بار تسبیح پڑھتا ہے تو ایک مقتدی ہے وہ اس سے بھی زیادہ دیر لگاتا ہے کہ امام دوسرے سجدے جا چکا ہوتا ہے اور وہ پہلے ہی سجدے میں پڑا ہے کیا ایسے آدمی کو جماعت کا ثواب ملے گا یا نہیں؟ جس نے امام کی اقتداء نہیں کی۔ باقی حدیث پاک کے حوالہ سے سجدہ کی تسبیح کی تعداد بتائیں کتنی ہے؟

(جواب): بلا ریب مقتدی کے جملہ افعال امام کے بعد ہونے چاہئیں۔ لیکن امام کی اقتداء سے غافل رہنا نماز کے وجود کو خطرہ میں ڈالنا ہے۔ جو کسی طور درست نہیں۔ لہٰذا اس سے اجتناب ضروری ہے۔ تسبیحات کے لیے کوئی عدد مقرر نہیں۔ حسبِ آسانی پڑھی جا سکتی ہیں۔ علامہ شوکانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

« وَلَا دَلِيلَ عَلٰى تَقْيِيدِ الْكَمَالِ بِعَدَدٍ مَّعْلُومٍ، بَلْ يَنْبَغِي الْاِسْتِكْثَارُ مِنَ التَّسْبِيحِ

[1] صحيح البخاري، بَابُ الْاِقْتِدَاءِ بِسُنَنِ رَسُولِ اللّٰهِ ﷺ، رقم: ۷۲۸۸

عَلٰی مِقْدَارِ تَطْوِیلِ الصَّلٰوۃِ مِن غَیرِ تَقْیِیدٍ بِعَدَدٍ۔ »[1]

یعنی تسبیحات مقرر کرنے کی کوئی دلیل نہیں۔ بلکہ نماز کی طوالت کے اعتبار سے اضافہ ہونا چاہیے۔

امام کا وضو سجدے میں ٹوٹ جائے تو اس کا نائب نماز کہاں سے شروع کرے؟

(سوال) امام کا وضو سجدے میں ٹوٹ جائے تو اس کا نائب نماز کہاں سے شروع کرے۔ کیا کسی کو پہلے نائب مقرر کرنا چاہیے کبھی کسی امام نے ایسا کیا تو نہیں۔ صحیح طریقہ کیا ہے؟

(جواب) روایات میں تصریح موجود ہے کہ اہلِ بصیرت اور ذوی العقول (عقل مند) کو امام کے قریب کھڑا ہونا چاہیے۔ اس میں حکمت یہ نظر آتی ہے کہ ایک تو امام کو آسانی سے لقمہ دیا جا سکتا ہے۔ دوسرا امام کے وضوٹو ٹنے کی صورت میں علمی تفوق (برتری) کے اعتبار سے کسی کو امام کا قائم مقام بآسانی مقرر کیا جا سکتا ہے، لیکن اس عمل کے لیے پہلے سے بالخصوص نائب مقرر کرنے کی کوئی دلیل نہیں۔ بظاہر اہلیت کی بنیاد پر بوقتِ ضرورت کوئی بھی نمازی امامت پر کھڑا ہوسکتا ہے۔ نائب امام وہیں سے نماز شروع کرے گا جہاں امام نے نماز چھوڑی ہے۔

باجماعت نماز کے لیے صف بندی کرنا

امام صف بندی کیسے کروائے؟

(سوال): کیا امام کے لیے یہ کافی ہے کہ زبان سے کہہ دے "صفیں سیدھیں کریں، مل جائیں وغیرہ یا صفوں میں چل پھر کر صفیں سیدھی کرے۔ صحیح طریقہ کیا ہے؟

(جواب): امامت کے فرائض سے ہے، کہ صفوں میں چل پھر کر اہتمام سے صفیں درست کی جائیں۔ جس طرح کہ نصوصِ شریعت میں ہے۔

ٹخنے سے ٹخنہ ملانے کا حکم:

(سوال) نعمان بن بشیر کی روایت میں ٹخنے سے ٹخنہ ملانے کا ذکر ہے جب کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ کی حدیث میں صرف قدم سے قدم ملانے کا ذکر ہے۔ حافظ روپڑی رحمہ اللہ ٹخنے سے ٹخنہ ملانے کے قائل نہیں۔ ٹخنہ ملانے کے لیے پاؤں اندر کی طرف موڑنا پڑتا ہے جس سے انگلیاں قبلہ رُخ نہیں رہتیں۔ زیادہ دیر کھڑے رہنا

[1] نیل الأوطار: ۲/ ۲۵٦

بھی مشکل ہوتا ہے۔ کیا محدث روپڑی کا اجتہاد درست ہے کہ ٹخنے سے ٹخنہ نہیں ملانا چاہیے؟

جواب: ہمارے شیخ محدث روپڑی رحمہ اللہ کا یہ فتویٰ ''فتاوٰی اہل'' حدیث (۱۹۹/۲) میں درج ہے۔ اس میں انہوں نے نمازی کی اضطرابی کیفیت کی تردید کی ہے۔ جس سے آپ کا مدعا مترشح ہونا ممکن ہے، صراحت نہیں۔ اصل بات یہ ہے، کہ نماز میں کندھے سے کندھا اور قدم سے قدم ملانا چاہیے۔ جس طرح کہ صحیح احادیث سے ثابت ہے۔ البتہ اس کو ملانے کی کیفیت میں تردد ہے، کہ یہ کیسے ممکن ہے۔

گزارش یہ ہے کہ ہمارے ہاں عام طور پر انگلیوں کے اطراف کو ملاتے ہیں۔ اس طرح سے صحیح مسنون کیفیت کا پیدا ہونا واقعی مشکل امر ہے، لیکن اگر ابتداء میں ہی اطراف انگلیوں کی بجائے قدموں کے ملانے سے آغاز کیا جائے تو مشکل خود بخود حل ہو جاتی ہے۔ اس طرح سے چھوٹے بڑے قدم کا امتیاز بھی غالباً ختم ہو جاتا ہے۔ البتہ چھوٹے بڑے قدم کی صورت میں کندھوں کی امتیازی کیفیت باقی رہتی ہے۔ بعض دفعہ پاؤں میں بھی یہ کیفیت ہو سکتی ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ حدیث میں جو کچھ بیان ہوا۔ عام جسمانی ساخت کے اعتبار سے ہے۔ خواہ یہ حکم تمام کو شامل نہیں۔ ہاں اپنی نیک نیت کی بناء پر اجر و ثواب سے وہ شخص محروم نہیں۔ (ان شاء اللہ) مسنون کیفیت کو قائم رکھنے کا جذبہ اگر جانبَین سے ہو، تو پھر کوئی ایسی الجھن پیدا نہیں ہوتی جس سے نماز میں خلل واقع ہو۔ باعثِ تشویش وہ صورت ہے جب جانبین سے عملی اتفاق کا مظاہرہ نہ ہو۔ ایسی صورت میں مزید الجھاؤ میں نہیں پڑنا چاہیے، تاکہ نمازی بحالتِ نماز عملِ کثیر سے محفوظ رہ سکے جس کی وجہ سے نماز میں نقص پیدا ہونے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ اس امر کی مزید وضاحت کرتے ہوئے قاری نعیم الحق نعیمؒ رقمطراز ہیں:

''جن احادیث میں قدم سے قدم اور کندھے سے کندھے ملانے کا ذکر آتا ہے، ان کا مقصد یہ ہے کہ تمام نمازی صف میں ایک دوسرے کے ساتھ مل کر کھڑے ہوں اور درمیان میں خالی جگہ نہ چھوڑیں۔ کسی کے قد یا قدم کا چھوٹا بڑا ہونا اس مقصد کے حصول میں رکاوٹ نہیں بن سکتا۔ باقی رہی بات قدرتی ساخت کی تو اس سلسلے میں عرض ہے، کہ اگر کسی کے قدموں کا رُخ کچھ ہی باہر کی جانب ہو اور انہیں سیدھا کرنا تکلیف کا سبب بنتا ہو، تو ایسے شخص کو تو اس حکم سے مستثنیٰ بھی قرار دیا جا سکتا ہے۔ ﴿لَا یُکَلِّفُ اللّٰهُ نَفۡسًا اِلَّا وُسۡعَهَا﴾ لیکن عام طور پر لوگوں کے قدم تھوڑی سی کوشش اور معمولی سے اہتمام سے سیدھے ہو جاتے ہیں۔ امام، مقتدی اور منفرد سب ہی کو حکم ہے، کہ ان کے جسم قدموں سمیت قبلہ رُخ ہوں۔ اس حکم کی پابندی سے احتراز کرنے کے لیے خواہ مخواہ عذر اور حیلے نہیں تراشنے چاہئیں۔ حقیقت یہ ہے کہ قدموں کو سیدھا کرنے کی کوشش دراصل نماز

اور زندگی کو سیدھا اور قبلہ رُخ کرنے کی کوشش ہے۔ اس میں نماز میں خلل پڑنے کے بجائے نماز اور زندگی کی اصلاح اور درستی ہوتی ہے۔ ہماری اس مختصر سی بحث سے امید ہے کہ اس بارے میں وارد جملہ اشکالات رفع ہو جائیں گے۔''

صفیں درست کرنے کے لیے امام کے فرائض:

(سوال) : صفیں درست کرنے کے لیے امام کے کیا فرائض ہیں؟

(جواب) : امام کے فرائض میں سے ہے کہ نمازیوں کے صف بندی سیکھنے تک خود صفیں درست کرے۔ حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہماری صفیں برابر کیا کرتے تھے حتی کہ ایسا معلوم ہوتا کہ آپ ان سے تیر کی لکڑی برابر فرما رہے ہیں اور یہ سلسلہ جاری رہا تاوقتیکہ آپ نے سمجھا کہ ہم لوگ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے سیکھ چکے ہیں۔ پھر ایک روز آپ نکلے اور تکبیر کہنے والے تھے کہ ایک آدمی کا سینہ صف سے نکلا ہوا دیکھا تو آپ نے فرمایا:

''اے اللہ کے بندو! تم اپنی صفوں کو ضرور سیدھا کر لیا کرو۔ ورنہ اللہ تم میں باہمی مخالفت ڈال دے گا۔''[1]

صفوں کی درستی کے لیے امام کو جماعت کی طرف چہرہ کرنا چاہیے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں، کہ ایک بار نماز کی اقامت ہوگئی تھی، کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے چہرہ ہماری طرف کر کے فرمایا:

''تم لوگ اپنی صفوں کو درست کرو اور مل کر کھڑے ہو جاؤ۔ میں تمہیں اپنی پیٹھ پیچھے سے بھی دیکھتا ہوں''[2]

امام اگر چاہے تو صفوں کی درستی کے لیے کسی کو مقرر بھی کر سکتا ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ لوگوں کو صفیں برابر کرنے کا حکم دیتے تھے اور جب لوگ لوٹ کر خبر دیتے کہ صفیں برابر ہو گئیں ہیں اس وقت تکبیر کہتے۔[3]

راوی بیان کرتا ہے کہ میں حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کے ساتھ تھا، کہ نماز کے لیے تکبیر ہوئی اور میں ان سے اپنے لیے وظیفہ مقرر کرنے کے متعلق بات کرتا رہا، وہ اپنے جوتوں سے کنکریاں برابر کرتے رہے یہاں تک کہ مقرر کردہ لوگوں نے آ کر صفوں کے برابر ہونے کی خبر دی۔ تب انہوں نے مجھے کہا: صف میں صحیح

---

(1) صحیح مسلم، بَابُ تَسْوِيَةِ الصُّفُوفِ، وَإِقَامَتِهَا......الخ، رقم: ٤٣٦

(2) صحیح البخاری، بَابُ تَسْوِيَةِ الصُّفُوفِ عِنْدَ الإِقَامَةِ وَبَعْدَهَا، رقم: ٧١٨

(3) موطأ امام مالك، بَابُ مَا جَاءَ فِي تَسْوِيَةِ الصُّفُوفِ، رقم: ٤٤

طور پر کھڑا ہو جا۔ پھر انہوں نے تکبیر تحریمہ کہی۔ ①

ایڑھی سے ایڑھی ملائیں؟ یا ٹخنے سے ٹخنا؟ یا پاؤں سے پاؤں؟

سوال : ہماری مسجد میں ایک مولوی صاحب نے نماز مغرب کی امامت کروائی اور صف بندی کرواتے ہوئے درج ذیل الفاظ کہے، ''نماز کے لیے ایڑھی سے ایڑھی ملانا فرض ہے اور اگر ایڑھی سے ایڑھی نہ ملائی جائے تو دل میں فتور پیدا ہوتا ہے'' جب کہ حافظ محمد عبداللہ روپڑی رحمہ اللہ کے فتویٰ کے حوالہ سے ایک مولانا صاحب نے بتایا ہے کہ ایڑھی سے ایڑھی ملانا تو کجا ٹخنے سے ٹخنا ملانا بھی مشکل ہے، صرف پاؤں سے پاؤں مل جائیں تو بہتر ہے۔

آپ سے یہ سوال ہے کہ کیا ایڑھی سے ایڑھی ملائیں؟ یا ٹخنے سے ٹخنا؟ یا پاؤں سے پاؤں؟

جواب : جماعت میں ہر نمازی کا کندھا، دوسرے کے کندھے، اور ٹخنا دوسرے کے ٹخنے کے ساتھ ملا ہوا ہونا چاہیے۔ چنانچہ صحیح بخاری کے ''ترجمۃ الباب'' میں حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ

« رَأَيتُ الرَّجُلَ مِنَّا يُلزِقُ كَعبَهٗ بِكَعبِ صَاحِبِهٖ .»

''میں نے دیکھا کہ ہم میں سے ہر شخص اپنا ٹخنا اپنے ساتھی کے ٹخنے کے ساتھ ملاتا تھا۔''

حضرت انس رضی اللہ عنہ کی مرفوع روایت میں ہے:

« وَكَانَ أَحَدُنَا يُلزِقُ مَنكِبَهٗ بِمَنكِبِ صَاحِبِهٖ وَقَدَمَهٗ بِقَدَمِهٖ.» ②

''ہم میں سے ہر شخص دوسرے کے کندھے سے اپنا کندھا اور اُس کے قدم سے اپنا قدم ملاتا تھا۔''

جب ٹخنے سے ٹخنا ملے گا، تو ایڑھی سے ایڑھی خود بخود مل جائے گی، اسی طرح پاؤں بھی مل جائیں گے۔ لہٰذا اس میں کوئی تعارض نہیں۔ محدث روپڑی رحمہ اللہ نے صورتِ مذکورہ کو قطعاً مشکل قرار نہیں دیا۔ بلکہ انہوں نے بار بار پاؤں ملانے کو ناپسند فرمایا ہے۔ فرماتے ہیں:

''کیونکہ نماز میں بلاوجہ پاؤں کو اِدھر اُدھر کرنا ناجائز ہے بلکہ تمام نماز میں پاؤں ایک جگہ رکھنے کی کوشش کرنی چاہیے، تاکہ نماز میں فضول حرکت نہ ہو۔'' (فتاویٰ اہلِ حدیث:۲/۱۹۹)

سوال : کیا ایڑھی سے ایڑھی یا ٹخنے سے ٹخنہ ملانا فرض ہے؟

جواب : ''مسند احمد'' (۴/۲۷۶) میں حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے

---

① موطأ امام مالك، بَابُ مَا جَاءَ فِي تَسوِيَةِ الصُّفُوفِ، رقم: ٤٥

② صحيح البخاري، بَابُ إِلزَاقِ المَنكِبِ بِالمَنكِبِ وَالقَدَمِ بِالقَدَمِ فِي الصَّفِّ، رقم: ٧٢٥

لوگوں کی طرف منہ کر کے فرمایا:

''لوگو! اپنی صفیں سیدھی کرو۔ لوگو اپنی صفیں سیدھی کرو۔ لوگو! اپنی صفیں سیدھی کرو۔ سنو! اگر تم نے صفیں سیدھی نہ کیں تو اللہ تعالیٰ تمہارے دلوں میں اختلاف اور پھوٹ ڈال دے گا۔''

راوی حدیث کہتے ہیں۔ پھر تو یہ حالت ہوگئی کہ ہر شخص اپنے ساتھی کے ٹخنے سے ٹخنہ، گھٹنے سے گھٹنہ، اور کندھے سے کندھا ملاتا۔

صحیح بخاری میں صف بندی سے متعلق یوں باب قائم کیا ہے:

«بَابُ اِلزَاقِ الْمَنکَبِ بِالْمَنکِبِ، وَالْقَدَمِ بِالْقَدَمِ فِی الصَّفِ.»

''صف میں کندھے سے کندھا اور قدم سے قدم ملا کر کھڑے ہونے کا بیان۔''

معمر رضی اللہ عنہ کی روایت میں زیادتی یوں ہے:

« وَ لَو فَعَلتَ ذٰلِكَ بِاَحَدِهِمُ الیَومَ، لَنَفَرَ کَأَنَّهٗ بَغلٌ شَمُوسٌ »[1]

اس سے معلوم ہوا ٹخنے وغیرہ ملانے کا اہتمام ہونا چاہیے۔ ورنہ نماز میں خلل پیدا ہونے کا اندیشہ ہے۔

پاؤں سے پاؤں ملانے کا طریقہ:

(سوال): پاؤں سے پاؤں ملانے کا طریقہ کیا ہے؟

(جواب): صرف اطراف یعنی انگلیوں کے پورے ملانے کی بجائے پورے قدم ملانے چاہئیں۔ اس سے صف درست ہو جاتی ہے۔ مزید وضاحت کے لیے ملاحظہ ہو! (الاعتصام شمارہ ۲۶، ۱۰ جولائی ۱۹۹۸ء)

جماعت کی حالت میں پاؤں نہ ملیں تو......؟

(سوال): جو لوگ جماعت کی حالت میں کندھے سے کندھا ملا کر تو کھڑے ہوتے ہیں مگر پاؤں کے ساتھ پاؤں نہیں ملاتے کیا انہیں نماز با جماعت کا ثواب ملے گا؟ قرآن وسنت کی روشنی میں جوابات دے کر تشفی فرمادیں۔

(جواب): فی الجملہ جماعت کا ثواب تو مل جائے گا۔ مگر سنت کے ترک کی بناء پر ثواب میں کمی واقع ہو جائے گی۔

(سوال): انسانی پاؤں مخروطی شکل کے ہوتے ہیں، پنجا بہ نسبت ایڑھی کے چوڑا ہوتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ انگوٹھے سے ایڑھی والی لائن تقریباً سیدھی ہوتی ہے جب کہ پاؤں کا بیرونی حلقہ ترچھا ہوتا ہے تو پھر صف

[1] فتح الباری ۲/ ۲۱۱

بندی میں ایڑھی سے ایڑھی ملانے کا کیا طریقہ اختیار کیا جائے؟ کندھے سے کندھا تو آسان ہے۔

(جواب) : پاؤں کے اگلے حصے سے پہلے ایڑھی ہے، ایڑھی ملائیں۔ صحیح صورت پیدا ہو جائے گی۔

پچھلی صف میں اکیلے نماز پڑھنا:

(سوال) تعلیم الاسلام، ص:۴۰۰ پر لکھا ہے کہ ''اے تنہا نماز پڑھنے والے تو صف میں کیوں داخل نہیں ہو گیا یا صف میں سے کسی کو کھینچ کر کیوں نہیں لایا؟ تو اپنی نماز لوٹا (اے ابویعلیٰ)[1]

لیکن نمازِ نبوی ﷺ، مرتبہ ڈاکٹر شفیق الرحمن کے صفحہ ۱۲۹، پر لکھا ہے کہ:

''اگر صف میں جگہ ہے تو پیچھے اکیلے کی نماز نہیں ہوتی اور اگر صف میں جگہ نہیں ہے تو یہ اضطراری کیفیت ہوگی، ایسی صورت میں اکیلے ہی کھڑا ہو جانا چاہیے، کیونکہ اگلی صف میں سے کسی کو پیچھے کھینچنا کسی صحیح حدیث سے ثابت نہیں۔ امام مالک، احمد، اوزاعی، اسحاق ور ابوداؤد رحمہم اللہ کا یہی مذہب ہے کہ صف سے آدمی کو نہ کھینچا جائے۔ البتہ ایک امام اور ایک مقتدی والے مسئلہ پر قیاس کر کے اس کا جواز ملتا ہے۔''

اس توجیہ سے اطمینان نہیں ہوا کیونکہ جب کبھی کسی امام یا مقتدی کا وضو فسخ ہو جائے تو اسے امامت سے ہٹنا اور پچھلے مقتدی کو امام بنانا ہوتا ہے اور وضوء فسخ ہونے والے کو مقتدیوں کی متعدد صفوں میں سے پیچھے نکلنا ہوگا۔ لامحالہ کچھ خلل تو ہوگا پھر مل جانے سے معمولی خلل دور ہو جائے گا۔ علی ہذا القیاس پیچھے کھینچے گئے نمازی کی جگہ بآسانی پر ہو سکتی ہے۔ دوسری طرف اکیلے شخص کی نماز نہیں ہوتی۔

ثانیاً: یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ جس وقت رسول اللہ ﷺ نے اکیلے نمازی کو نماز لوٹانے کا حکم دیا تو کیا صف میں جگہ باقی تھی یا نہیں؟ پھر متذکرہ بالا شروع کی روایت میں پیچھے کھینچنے کا ذکر بھی کیا گیا ہے۔ صحیح طریقہ کیا ہونا چاہیے؟

(جواب) ایسے شخص کو چاہیے کہ صف میں دائیں بائیں کھڑا ہونے کی جگہ تلاش کرے۔ بصورتِ دیگر امام کی دائیں جانب کھڑا ہو۔ یہ بھی ناممکن ہو تو صف سے آدمی کھینچ لے۔ اگر چہ حدیث ضعیف ہے لیکن ابن عباس رضی اللہ عنہما کا نبی ﷺ کے ساتھ نمازِ تہجد والی روایت سے اتنی ہی حرکت کا جواز معلوم ہوتا ہے۔ (تفصیلی بحث کے لیے دیکھئے الاعتصام، ۱۴، ستمبر ۱۹۹۰ء)

---

[1] المجمع، ج:۲/۹۲

بعد میں آنے والے شخص کا پہلی صف میں عدم گنجائش کی صورت میں کسی آدمی کو کھینچنا:

(سوال): گزشتہ دنوں رحیم یار خان سے ہمارے ایک قاری ''سہیل اسلم'' نے فون پر پوچھا کہ بعد میں آنے والے نمازی کو اگلی صف میں جگہ نہ ملے تو کیا وہ اگلی صف سے آدمی کو پیچھے کھینچ سکتا ہے؟ بعض لوگ اس کی سخت مخالفت کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ طریقہ بالکل غلط ہے۔ میں نے اُنہیں حضرت الاستاذ مفتی حافظ ثناء اللہ خان مدنی ﷾ اور استاد گرامی قاری نعیم الحق نعیم کے درجِ ذیل فتوے کا حوالہ دیا تھا، اسی طرح اور بھی کئی ایک لوگ یہ سوال کرتے رہتے ہیں، اسی باعث ۱۴ ستمبر ۱۹۸۹ء میں شائع ہونے والا فتویٰ دوبارہ شائع کیا جارہا ہے۔

(جواب): عَن وَابِصَةَ بنِ مَعبَدٍ، قال: « رَای رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ رَجُلًا يُصَلِّي خَلفَ الصَّفِّ وَحدَهٗ، فَأَمَرَهٗ أَن يُعِيدَالصَّلَاةَ » (رواہ احمد والترمذی وابوداؤد وقال الترمذی: هذا حديث حسن (مشکوۃ المصابیح حدیث ۱۱۵) [1]

''وابصہ بن معبد رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک شخص کو دیکھا جو صف کے پیچھے اکیلا نماز پڑھ رہا تھا تو آپ ﷺ نے اسے نماز دہرانے کا حکم دیا۔''

یہ روایت ''مسند احمد''، ترمذی، ابوداؤد کی ہے جسے امام ترمذی حسن قرار دیتے ہیں۔ امام احمد اور دیگر محدثین سے اس کی تصحیح ثابت ہے۔

نماز باجماعت میں شریک ہونے کا خواہش مند اگر صف میں جگہ نہ پائے تو وہ کیا کرے؟

۱۔ وہ اگلی صف کے کنارے سے یا درمیان سے ایک شخص کو کھینچ کر اپنی صف بنا لے۔

۲۔ وہ امام کے ساتھ دائیں طرف کھڑا ہو جائے۔

۳۔ وہ صف کے پیچھے اکیلا نماز پڑھے۔

آخری صورت مذکورہ بالا حدیث میں منع کر دی گئی ہے، لہٰذا اب بقیہ دو صورتوں میں ترجیح دی جائے گی۔

امام کے ساتھ مل جانے کی کوئی مثال حدیث میں موجود نہیں۔ سوائے اس خاص شکل کے کہ رسول اللہ ﷺ کی مرض الموت میں ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ لوگوں کی جماعت کرا رہے تھے اور نبی اکرم ﷺ ان کے ساتھ بائیں جانب آکر بیٹھ گئے اور آپ ﷺ ابوبکر رضی اللہ عنہ کے امام بن گئے، جب کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ لوگوں کی امامت کراتے رہے، یہ صورت مخصوص ہونے کے باوجود مقتدی کا امام کے ساتھ ملنا ثابت نہیں کرتی، کیونکہ

[1] سنن أبي داود، بَابُ الرَّجُلِ يُصَلِّي وَحْدَهُ خَلْفَ الصَّفِّ، رقم: ٦٨٢

رسول اللہ ﷺ مقتدی کے بجائے امام بنے تھے۔اس بناء پر ہمارے نزدیک پہلی صورت ہی راجح ہے۔جس میں کوئی قباحت بھی نہیں۔کیونکہ کسی شخص کو پیچھے کھینچ کر اپنی صف بنانے کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ حدیث مذکورہ بالا کی رُو سے اکیلے کی نماز نہیں ہوتی۔

اُصولِ فقہ کا قاعدہ ہے:''مَا لَا يَتِمُّ الْوَاجِبُ إِلَّا بِهِ فَهُوَ وَاجِبٌ.'' یعنی جس کام کے بغیر واجب کی تکمیل نہ ہوسکتی ہو وہ بھی واجب ہوتا ہے۔لہٰذا کسی کو اپنے ساتھ شامل کرنا تعمیل وجوب یا شریعت کی مخالفت سے احتراز کرنا ہی ہے۔

باقی رہا یہ مسئلہ کہ صف کے کنارے سے کسی شخص کو کھینچنے سے اس کی حرکت لازم آتی ہے۔تو نماز میں نماز کی ضرورت کے لیے حرکت جائز ہے،اگرچہ کسی کو آگے سے کھینچ کر اپنے ساتھ شامل کرنے والی حدیث ضعیف ہے۔تاہم اس سے استدلال کی بجائے تائید حاصل ہوجاتی ہے لہٰذا یہی صورت راجح معلوم ہوتی ہے۔شیخ المکرّم حافظ عبداللہ محدث روپڑی رحمہ اللہ نے کنارے سے کسی شخص کو کھینچنے کی بجائے درمیان سے کسی کو اپنے ساتھ ملانے کی صورت بتائی ہے،تاکہ امام درمیان میں رہے اور ایک شخص کی زیادہ حرکت کی بجائے صف کے شرکاء معمولی حرکت سے درمیانی خلا کو پُر کرلیں۔بہرصورت دونوں میں سے جو صورت بھی اختیار کی جائے وہ اگلی صف سے کسی شخص کو اپنے ساتھ ملانے کی ہی شکل ہے۔میں اسی موقف کی تائید کرتا ہوں۔(واللہ اعلم بالصواب وعلمہ اتم)

اضافہ: از حافظ نعیم الحق نعیم رحمہ اللہ:

اگلی صف میں سے کسی شخص کو کھینچنے یا نہ کھینچنے کا مسئلہ راجح اور مرجوح کا مسئلہ ہے۔صحیح اور غلط کا مسئلہ نہیں۔امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے فتاویٰ میں اور شیخ البانی رحمہ اللہ نے ''سلسلة الاحاديث الضعيفه والموضوعة'' اور ''إرواء الغليل'' میں اگلی صف میں سے کسی کو نہ کھینچنے کو ترجیح دی ہے،جب کہ صاحب سبل السلام امیر صنعانی رحمہ اللہ اور صاحب ''نيل الأوطار'' امام شوکانی رحمہ اللہ کا رجحان اس طرف معلوم ہوتا ہے،کہ صف کے پیچھے تنہا نماز پڑھنے کے بجائے اگلی صف میں سے کسی کو کھینچ کر ساتھ ملا لینا چاہیے۔راقم کے خیال میں بھی یہی دوسرا قول قابلِ ترجیح ہے اور وجوہِ ترجیح یہ ہیں:

(ا) جماعت کا لفظ جمع سے بناء ہے اور جمع کا لفظ کم از کم دو افراد کا تقاضا کرتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ اگر صرف ایک مقتدی ہو،تو وہ امام کے پیچھے کھڑا ہونے کے بجائے امام کے ساتھ کھڑا ہوتا ہے۔حالانکہ لفظ مقتدی (پیچھے چلنے والا) کا تقاضا یہ تھا،کہ وہ امام کے پیچھے کھڑا ہو اور لفظ امام (آگے چلنے والا) کا تقاضا یہ تھا،

کہ امام مقتدی سے آگے ہو۔ مگر دونوں لفظوں کے تقاضوں سے قطع نظر کرتے ہوئے شریعت نے لفظِ جماعت کے تقاضے کو ملحوظ رکھا ہے اور اکیلے مقتدی کو امام کے ساتھ کھڑا ہونے کا حکم دیا ہے۔ اس لیے صف کے پیچھے تنہا نماز پڑھنا لفظِ جماعت کے معنی ورُوح کے منافی ہے۔

ہاں عورت کو شرعی طور پر اس سے اس لیے مستثنیٰ رکھا گیا ہے، کہ ایک تو اس پر نماز با جماعت سرے سے فرض ہی نہیں۔ دوسرا یہ کہ وہ مرد کے ساتھ شرعی طور پر کھڑی نہیں ہوسکتی۔ کیونکہ یہ چیز دونوں کی نماز میں خلل انداز ہوسکتی تھی۔ ہاں اگر عورتوں کی صف موجود ہو اور اس میں مزید گنجائش نہ ہو، تو بعد میں آنے والی عورت کے لیے ہمارے خیال میں مناسب یہی ہے، کہ وہ بھی کسی عورت کو پیچھے کھینچ کر صف بناء لے۔ تاکہ لفظِ جماعت ان پر صادق آسکے۔

اسی طرح حدیث (ابن ماجہ حاکم وغیرہ) میں ستونوں کے درمیان صفیں بنانے سے منع کیا گیا ہے۔ اس کی وجہ بھی یہی معلوم ہوتی ہے، کہ اس سے جماعت کی جمعیت پارہ پارہ ہوتی ہے۔

(۲) شیخ البانی رحمہ اللہ اور ان کے ہم خیال حضرات کہتے ہیں ''چوں کہ اگلی صف میں سے کسی کو کھینچنے کے بارے میں کوئی صحیح حدیث وارد نہیں ہوئی۔ لہٰذا راجح امر یہ ہے، کہ بعد میں آنے والا شخص صف کے پیچھے اکیلا ہی نماز پڑھ لے۔''

اس سلسلہ میں قابلِ غور بات یہ ہے کہ جب صف کے پیچھے تنہا شخص کی نماز کا صحیح نہ ہونا۔ بلکہ اس کے اعادہ کا ضروری ہونا علی الإطلاق ثابت ہو چکا ہے، تو پھر ایسے شخص کے بارے میں تین ہی صورتیں ہوسکتی ہیں:

۱۔ یا تو ہم یہ کہیں کہ اگلی صف میں سے کسی کو کھینچ لے۔

۲۔ صف کے پیچھے اکیلا ہی نماز پڑھ لے اور پھر اس کا اعادہ بھی کرے۔ [1]

۳۔ اور یا پھر یہ کہیں کہ وہ اکیلا ہی نماز پڑھ لے اور اس کے اعادہ کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ صف کے پیچھے اکیلے شخص کی نماز کے صحیح نہ ہونے کا حکم اس شخص کے ساتھ خاص ہے، جو اگلی صفوں میں گنجائش ہونے کے باوجود پیچھے اکیلا ہی کھڑا ہو جائے۔

تیسری صورت ہمارے خیال میں تقیید بلا مُقَید اور تخصیص بلا مُخَصِّص کے ذیل میں آتی ہے۔ یعنی کسی عام اور مطلق حکم کو خواہ مخواہ مخصوص اور مقید قرار دے دینا۔ دوسری صورت ویسے ہی غیر معقول معلوم ہوتی ہے۔ آخر

---

[1] محمد جاوید سیالکوٹی متعلم جامعہ محمدیہ جی ٹی روڈ گوجراں والا کا لکھا ہوا ایک مضمون ہمیں موصول ہوا ہے، جس میں انہوں نے اسی رائے کا اظہار کیا ہے۔ (ن۔ ح۔ ن)

بعد میں آنے والے کا کیا قصور ہے، کہ اسے ایک نماز دو دفعہ پڑھنے کی تکلیف دی جائے!

پہلی صورت سب سے زیادہ معقول اور راجح معلوم ہوتی ہے۔ کیوں کہ ایک تو اس کی نظیر موجود ہے اور وہ یہ کہ امام کے ساتھ جب ایک ہی مقتدی کھڑا ہو اور دوسرا مقتدی آجائے تو اسے پہلے مقتدی کو پیچھے کھینچنا ہی پڑتا ہے۔ دوسرا اس کے بارے میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور وابصہ بن معبد رضی اللہ عنہ کی دو تین ضعیف حدیثیں (سنن بیہقی اور مسند ابی یعلی وغیرہ میں) اور ایک مقاتل بن حیان کی مرسل حدیث (مراسیل ابی داؤد میں) موجود ہے۔ مرسل حدیث اگرچہ محدثین کے نزدیک ضعیف ہی کی ایک قسم ہے۔ لیکن عام ضعیف حدیث اور مرسل میں یہ فرق ہے، کہ ضعیف حدیث کا حجت نہ ہونا متفق علیہ ہے۔ جب کہ مرسل کے بارے میں اختلاف ہے، حنفی اور مالکی اس کی حجیت کے قائل ہیں۔ نیز "رسالة ابی داؤد إلی اهل مکه" میں لکھا ہے کہ "مسند حدیث کی عدمِ موجودگی میں مرسل حجت ہے۔ تاہم اس کی حجیت میں صحیح حدیث والی قوت نہیں ہوگی۔" گویا امام ابوداؤد رحمہ اللہ کے نزدیک اگر مسند حدیث کسی مسئلہ میں موجود نہ ہو، تو مرسل روایت حسن درجے کی حدیث کا کام دے سکتی ہے۔

(۳) شیخ البانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "اگلی صف میں سے کسی کو کھینچنے کا فتویٰ دینا "تَشرِیعٌ بِدُونِ نَصٍّ صَحِیحٍ" ہے۔" یعنی اپنی طرف سے شریعت گھڑنے کے مترادف ہے۔

ہمارے خیال میں یہ فتویٰ "تَشرِیعٌ بِدُونِ نَصٍّ صَحِیحٍ" کے زُمرے میں نہیں آتا۔ بلکہ "قِیَاسٌ صَحِیحٌ" کے زُمرے میں آتا ہے۔ نیز اس کے لیے حسن درجے کی نص بھی موجود ہے۔ جیسا کہ تفصیل اوپر بیان کی جاچکی ہے۔

(۴) بعض حضرات کا خیال ہے کہ "اگلی صف میں سے کسی کو کھینچنے سے دو قباحتیں لازم آتی ہیں۔ ایک تو ساری صف ہلچل اور پریشانی میں مبتلا ہوجاتی ہے اور دوسرا یہ کہ کھینچنے والے شخص کو خواہ مخواہ پہلی صف کے ثواب سے محروم کر دیا جاتا ہے۔"

پہلی "قباحت" کے بارے میں یہ پیشِ نظر رہنا چاہیے، کہ نماز کی کسی ضرورت کے تحت صف کے ہلچل میں مبتلا ہونے میں شرعاً کوئی قباحت نہیں۔ کیوں کہ اس کی نظیر موجود ہے اور وہ یہ کہ اگر امام کا وضو ٹوٹ جائے اور وہ کسی مقتدی کو امام بناء کر وضو کرنے کے لیے چلا جائے، تو ظاہر ہے کہ اس صورت میں پہلی صف والوں کو تھوڑی بہت حرکت کر کے خالی جگہ کو پُر کرنا ہی ہوگا۔ بلکہ راقم کے خیال میں ان کو «مَن وَصَلَ

الصَّفَّ وَصَلَهُ اللّٰهُ»......الخ[1] کے تحت اس ہلچل کا اجر وثواب بھی ملے گا۔

اسی طرح دوسری ''قباحت'' کے متعلق یہ خیال رہنا چاہیے۔کہ «اِنَّمَا الاَعمَالُ بِالنِّیَّاتِ»[2] یعنی عملوں کا دارومدار نیتوں پر ہے۔اس لیے وہ شخص اپنی نیت کی وجہ سے (ان شاء اللہ العزیز) پہلی صف کے ثواب سے ہرگز محروم نہیں ہوگا۔ بلکہ ہوسکتا ہے کہ اسے صفِ اوّل کے اجر وثواب کے ساتھ ساتھ پچھلی صف قائم کرنے اور اپنے اکیلے بھائی کی نماز کی صحت میں تعاون کرنے کا اضافی ثواب بھی مل جائے۔

سوال: اگر جماعت کھڑی ہو اور پہلی صف مکمل ہوچکی ہو تو بعد میں آنے والے کو کیا کرنا چاہیے؟ کیا کسی آدمی کو پیچھے کھینچا جا سکتا ہے کہ نہیں؟ اگر کھینچا جا سکتا ہے تو بتائیں کہ درمیان سے یا ایک طرف سے اگر آدمی کو پیچھے کھینچنے کے بغیر نماز اکیلے ہی پڑھ لی جائے تو وہ نماز بعد میں دہرانا پڑے گی یا کہ ہو جائے گی؟

جواب: جماعت کے ساتھ بعد میں ملنے والا صف میں سے جہاں سے ممکن ہو آدمی پیچھے کھینچ لے اکیلا نہ پڑھے ممنوع ہے۔اس سلسلہ میں میرا ایک تفصیلی فتویٰ اور برادرِ محترم قاری نعیم الحق نعیم صاحب کا مضمون مزید وضاحت سے ہفت روزہ ''الاعتصام'' کے ایک ہی شمارہ میں چند ماہ قبل طبع ہو چکے ہیں۔مزید بسط (تفصیل) کے لیے انتہائی مفید ہیں۔

نماز با جماعت میں شامل ہونے والا پہلی صف میں کسی نمازی کو کھینچ لے؟

سوال: اگر پہلی صف مکمل ہو چکی ہو تو بعد میں آنے والا اکیلا نماز پڑھے یا اگلی صف سے نمازی کو کھینچ لے؟ اگر کھینچے تو کیا صف کے درمیان سے یا صف کے سرے سے؟ ہم سکول میں نمازِ ظہر با جماعت ادا کرتے ہیں ایک قاری صاحب کا موقف ہے کہ بعد میں آنے والا اکیلا ہی نماز پڑھے۔اگر اگلی صف سے آدمی کھینچنا ہے تو صف کے سرے سے کھینچے جب کہ میرا موقف یہ تھا کہ صف کے درمیان سے کھینچے۔قاری صاحب کا کہنا ہے کہ اگر درمیان سے کھینچے تو مذکورہ آدمی کا خلا ویسے ہی رہنے دیا جائے پُر نہ کیا جائے۔صحیح موقف کیا ہے؟

جواب: اکیلا صف کے پیچھے اگلی صف کے درمیان سے کسی کو کھینچے۔کیونکہ حدیث میں ہے:

« وَسِّطُوا الِامَامَ وَسُدُّوا الخَلَلَ » (رواہ ابوداؤد، مُنتقٰی، بَابُ وُقُوفِ الِامَامِ تِلقَاءِ وَسطِ الصَّفِّ)[3]

---

[1] سنن النسائی ،بَابُ مَن وَصَلَ صَفًّا ،رقم:۸۱۹

[2] صحیح البخاری،کَیفَ کَانَ بَدءُ الوَحیِ إِلَی رَسُولِ اللّٰهِ ﷺ؟،رقم:۱

[3] سنن أبی داؤد،بَابُ مَقَامِ الْإِمَامِ مِنَ الصَّفِّ، رقم:۶۸۱

''امام کو درمیان کرو اور خلل بند کرو۔''

اس حدیث میں امام کو درمیان رکھنے کا اشارہ ہے اور یہ اسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ درمیان سے آدمی کھینچے۔ کیونکہ کنارہ سے کھینچنے کی صورت میں اگر کنارہ میں کھڑا ہو جائے تو اس حدیث کا خلاف لازم آتا ہے اور اگر کھینچ کر درمیان لائے تو ضرورت سے زیادہ حرکت لازم آتی ہے۔ رہا درمیان میں خلل پیدا ہونا، سو اس کے متعلق ''سُدُّ وا الخَلَل'' کا ارشاد اسی حدیث میں موجود ہے۔ بقیہ صف اس ارشاد کے تحت خلل کو خود ہی بند کرے گی۔ اس میں ایک فائدہ یہ بھی ہے، کہ ہر ایک کو تھوڑی تھوڑی حرکت کرنی پڑے گی جس سے نماز میں کچھ خلل نہیں آتا، اور کنارہ سے کھینچ کر درمیان لانے سے تو بعض دفعہ بہت زیادہ چلنا پڑتا ہے، جو بظاہر نماز کی شان کے خلاف ہے اور ہر ایک نمازی کا تھوڑا سرکنا منافی نہیں۔ پس ترجیح اسی کو ہے کہ درمیان میں سے کھینچے نہ کہ کنارہ سے۔ (فتاویٰ اَہل حدیث:۲/ ۲۷۷) اس بارے میں علامہ البانی کا موقف یہ ہے، کہ اکیلا ہی نماز پڑھ لے۔ ①

اور شیخ ابن باز فرماتے ہیں: ''صف میں جگہ تلاش کرے یا امام کی دائیں جانب کھڑا ہو جائے۔'' ②

مسئلہ ہذا میں میرا رجحان پہلے مسلک کی طرف ہے۔ کیونکہ اکیلے کھڑے ہونے سے نبی ﷺ نے منع فرمایا ہے۔ ③ دوسرا، فعل ہذا مطلوب صف بندی کے بھی منافی ہے، پھر شریعت نے اکیلی عورت کو صف قرار دیا ہے۔ بخلافِ مرد کے اس کے لیے ایسی کوئی نص موجود نہیں۔ باقی رہی یہ بات کہ کھینچنے والی حدیث ضعیف ہے۔ سو اس بارے میں تفصیلی بحث ''الاعتصام'' میں پہلے شائع ہو چکی ہے۔ کھینچنے کی تائید قصۂ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی ہوتی ہے جب کہ وہ نمازِ تہجد میں آپ ﷺ کے بائیں طرف کھڑے ہو گئے تھے۔ آپ ﷺ نے پھیر کر دائیں طرف کر دیا تھا۔ ④

سوال: جب نمازی نماز پڑھنے کے لیے آتا ہے تو پیچھے جگہ بالکل نہیں ہے۔ ایک دو رکعت باقی بھی ہیں تو پھر آدمی کیا امام صاحب کے ساتھ جا کر مل سکتا ہے یعنی صف کے آگے سے امام کے دائیں جانب جا کر مل جائے یا کیا کرے؟ اگر مل جائے تو کہاں سے گزرے؟

جواب: پیچھے عدمِ گنجائش کی صورت میں بعد میں آنے والا جیسے بھی آسانی سے ممکن ہو، آگے گزر کر امام کی

① الإرواء:۲/ ۳۲۹

② ہوامش فتح الباری:۲/ ۲۱۳

③ سنن أبی داؤد، بَابُ الرَّجُلِ یُصَلِّی وَحدَهُ خَلْفَ الصَّفِّ ،رقم:۶۸۲

④ صحیح البخاری، بَابٌ: یَقُومُ عَنْ یَمِینِ الإِمَامِ، بِحِذَائِهِ سَوَاءً إِذَا کَانَا اثْنَیْنِ ،رقم:۶۹۷

دائیں جانب کھڑا ہو جائے۔ جماعت کی صورت میں امام کا سُترہ ہی مقتدی کا سُترہ تصور ہوتا ہے۔ تبویب بخاری یوں ہے:« بَابُ سُتْرَةِ الِامَامِ سُتْرَةُ مَن خَلفَهٗ.»

''فتح الباری'' میں ہے:

« فَأَمَّا الْمَأْمُومَ فَلَا يَضُرُّهٗ مَن مَرَّ بَينَ يَدَيهِ لِحَدِيثِ ابنِ عَبَّاسٍ هٰذَا.»(۵۷۲/۱)

یعنی مقتدی کے آگے سے کسی کا گزرنا اس کے لیے نقصان دہ نہیں، دلیل اس کی ابن عباس رضی اللہ عنہما کی یہ حدیث ہے۔'' جس کے الفاظ یہ ہیں:

« فَمَرَرتُ بَينَ يَدَی بَعضِ الصَّفِّ » ①

یعنی ''بحالت جماعت میرا گزر بعض صف کے آگے سے ہوا۔''

اگلی صف میں جگہ ہونے کے باوجود پچھلی صف میں کھڑا ہونا:

سوال: بعض لوگ اگلی صف میں جگہ موجود ہونے کے باوجود پچھلی صف میں کھڑے ہو جاتے ہیں، حتی کہ اگلی صف میں جگہ خالی ہی رہ جاتی ہے اور لوگ پیچھے ہی صف بنائے چلے جاتے ہیں۔ کیا ایسا کرنا درست ہے؟ اور کیا اس طرح پیچھے کھڑے ہونے والوں کی نماز درست ہے؟

جواب: پہلی صف کو مکمل کر کے پیچھے کھڑا ہونا چاہیے۔ بصورتِ دیگر نماز تو ہو جائے گی۔ لیکن اس میں نقص پیدا ہو جائے گا۔

جماعت کے انتظار میں کھڑا رہنا:

سوال: مکرمی مولانا حافظ ثناء اللہ مدنی صاحب، السلام علیکم، چند روز قبل مسجد اہلِ حدیث ریلوے ورکشاپ مغلپورہ لاہور میں بعد نماز مغرب علماء کرام کے مواعظ حسنہ سے استفادہ کا موقعہ ملا۔ نماز عشاء کی اذان کے بعد (مسجد کے صحن میں جہاں جماعت کا انتظام تھا) حاضرین میں سے بعض آپس میں ملنے ملانے اور گفتگو وغیرہ میں کھڑے کھڑے مصروف تھے۔ بعض جماعت کے انتظار میں کھڑے اور بعض بیٹھے ہوئے تھے۔ امامت محترم حافظ محمد یحییٰ عزیز صاحب نے کرانی تھی جو مسجد میں پچھلی صفوں میں موجود تھے۔ تکبیر ابھی نہیں کہی گئی تھی میں بھی چند اصحاب سے سلام کلام کے بعد اگلی صف میں جماعت کے انتظار میں کھڑا ہو گیا تھا کہ میرے قریب بیٹھے ہوئے ایک صاحب نے مجھ سے کہا کہ فرمان رسول اللہ ﷺ کے مطابق امام کے آنے

① صحيح البخاری، بَابُ سُتْرَةُ الإِمَامِ سُتْرَةُ مَنْ خَلْفَهٗ، رقم:۴۹۳

سے پہلے کھڑے نہیں ہونا چاہیے۔ میرے خیال میں حدیث کا مفہوم سمجھنے میں غالباً انھیں مغالطہ ہوا۔ سو میں نے ان کے موقف کو محل نظر قرار دیا۔ جلدی ہی امام صاحب (حافظ محمد یحییٰ عزیز صاحب) امامت کے لیے بڑھے اور میں نے مصلے تک پہنچنے سے پہلے ہی انھیں روک کر یہ مسئلہ دریافت کیا تو انھوں نے بھی مختصراً بتا دیا کہ امام کے آنے سے پہلے کھڑے نہیں ہونا چاہیے۔ خیر نماز کے بعد میں نے صاحب مذکور (جس نے مجھے کھڑے ہونے سے منع کیا تھا) سے وضاحت طلب کی کہ کیا امام کے مصلے پر آ جانے سے پہلے کھڑے نہیں ہونا چاہیے؟ تو انھوں نے اثبات میں جواب دیا۔ حالانکہ وہ خود بھی امام کے مصلے پر پہنچنے سے پہلے کھڑے ہو چکے تھے۔ جس کی نشاندہی پر انھوں نے کہا کہ ان سے غلطی ہوگئی۔ ظاہر ہے وہ اسی مفہوم کے قائل ہیں کہ امام کے مصلے پر پہنچ جانے سے پہلے کھڑے ہونا منع ہے میں نے ان سے یہ بھی کہا کہ یہاں اکثر علماء کرام ابھی کھڑے ہیں تو انھوں نے کہا کہ یہ تو کسی اور کام کی وجہ سے کھڑے ہیں حالانکہ خیال ہے کہ وہ لوگ باہمی دلچسپی کی باتوں میں مصروف ہوں گے۔ اس محدود سے وقت میں معاملہ کچھ عجیب سا لگا کہ کھڑے کھڑے ایک دوسرے سے باتیں کر لیں تو جائز اور اگر نماز کے انتظار میں کھڑے ہوں تو ناجائز۔ حالانکہ یہ کھڑے ہونا صف بندی میں شمار نہیں ہوتا۔

اب اس سلسلے میں جو احادیث مجھے معلوم ہوسکیں وہ درج ذیل ہیں:

① راوی ابوقتادہ رضی اللہ عنہ: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کہ جب نماز کی تکبیر ہو تو جب تک مجھ کو نہ دیکھ لو کھڑے نہ ہو۔[1]

② راوی ابوہریرہ رضی اللہ عنہ: رسول اللہ ﷺ تشریف لائے اور نماز کی تکبیر ہوگئی تھی۔ صفیں برابر ہو چکی تھیں۔ جب آپ مصلے پر کھڑے ہوئے۔ ہم انتظار میں تھے کہ اب تکبیر کہتے ہیں تو آپ ﷺ لوٹے اور فرمایا: تم اسی جگہ کھڑے رہو۔ ہم اسی حال میں ٹھہرے رہے یہاں تک کہ آپ ﷺ نکلے، آپ ﷺ کے سر سے پانی ٹپک رہا تھا۔ آپ نے غسل کیا تھا۔[2]

③ راوی ابوہریرہ رضی اللہ عنہ: نماز کی تکبیر ہوئی لوگوں نے صفیں برابر کر لیں۔ آنحضرت ﷺ باہر نکلے، آگے بڑھ گئے۔ آپ ﷺ جنبی تھے۔ پھر فرمایا یہیں ٹھہرے رہو اور لوٹ گئے، غسل کیا پھر باہر نکلے اور سر سے

---

[1] صحیح البخاری، بَابٌ: مَتَی یَقُومُ النَّاسُ، إِذَا رَأَوُا الْإِمَامَ عِنْدَ الْإِقَامَةِ، رقم: ٦٣٧، و صحیح مسلم، رقم: ٦٠٤

[2] صحیح البخاری، بَابٌ: هَلْ یَخْرُجُ مِنَ الْمَسْجِدِ لِعِلَّةٍ؟، رقم: ٦٣٩ و صحیح مسلم، بَابُ مَتَی یَقُومُ النَّاسُ لِلصَّلَاةِ، رقم: ٦٠٥

پانی ٹپک رہا تھا۔ پھر لوگوں کو نماز پڑھائی۔[1]

④ راوی ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ: نماز کی تکبیر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے کہی جاتی تھی اور لوگ صفوں میں اپنی جگہ لے لیتے تھے۔ قبل اس کے کہ آپ اپنی جگہ کھڑے ہوں۔[2]

⑤ راوی جابر رضی اللہ عنہ: بلال جب زوال ہوتا اذان دیتے اور اقامت نہ کہتے یہاں تک کہ آپ تشریف لائیں، جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لاتے اور بلال رضی اللہ عنہ دیکھ لیتے تب تکبیر کہتے۔

حاصل مقصد: محولہ بالا روایات کو ملا کر پڑھنے سے میری دانست میں یہ مفہوم ہے کہ امام کو مسجد میں آتا دیکھ کر ہی تکبیر کہی جائے اور صف بندی بھی کر لی جائے خواہ امام کو مصلے پر پہنچنے میں کچھ دیر ہی کیوں نہ ہو جائے جیسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو غسل کرنے میں کچھ وقت لگا ہو گا لوگوں کو کھڑا ہونے کا حکم تنزیہی ہو گا تحریمی نہیں اور وہ بھی لوگوں کو تکلیف کے پیشِ نظر، اہلحدیث کی مساجد میں عموماً یہی عمل ہے۔ اس سلسلے میں صحیح راہنمائی فرما کر عند اللہ ماجور ہوں۔

(جواب) : اصل یہی ہے کہ مقتدی امام کی آمد کے وقت کھڑے ہوں۔ چنانچہ امام ابوداؤد نے اپنی ''سنن'' میں مسئلہ ہذا پر بایں الفاظ تبویب قائم کی ہے:

«بَابُ فِي الصَّلٰوةِ تُقَامُ، وَ لَمْ يَاتِ الْاِمَامُ يَنْتَظِرُوْنَهُ قُعُوْدًا .»

یعنی ''نماز کی تکبیر ہو جاتی ہے اور امام نہیں آیا مقتدی بیٹھ کر انتظار کریں۔''

حضرت علی رضی اللہ عنہ اور ابراہیم نخعی رحمہ اللہ کے آثار بھی اس امر کے مؤید ہیں۔ (العون: ۱/ ۲۱۳) اور جن بعض احادیث میں امام کی آمد سے قبل مقتدیوں کے کھڑا ہونے کا بیان ہے۔ یہ صرف جواز پر محمول ہو گا۔ یا یوں کہا جائے کہ ابوقتادہ رضی اللہ عنہ کی روایت میں دراصل چوتھی حدیث ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ میں وارد فعل سے نہی کا بیان ہے۔ لفظ ''فَلَا تَقُومُوا حَتّٰى تَرَوْنِي قَدْ خَرَجْتُ''[3] سے اس کی راہنمائی ہوتی ہے۔ لوگوں کی عادت تھی کہ وہ اقامت کے وقت کھڑے ہو جاتے تھے۔ اگرچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم برآمد نہ ہوتے۔ اس سے منع کیا گیا ہے ممکن ہے کسی شغل کی وجہ سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم جلدی برآمد نہ ہو سکیں۔ کھڑے انتظار گراں گزرے۔ لیکن بخاری میں انس رضی اللہ عنہ کی حدیث میں بعد از تکبیر بعض حضرات سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی طویل سرگوشی کا بھی تذکرہ

---

① صحيح البخاري، بَابُ إِذَا ذَكَرَ فِي الْمَسْجِدِ أَنَّهُ جُنُبٌ، يَخْرُجُ كَمَا هُوَ، وَلَا يَتَيَمَّمُ، رقم: ٢٧٥، صحيح مسلم، بَابُ مَتَى يَقُومُ النَّاسُ لِلصَّلَاةِ، رقم: ٦٠٥

② صحيح مسلم، بَابُ مَتَى يَقُومُ النَّاسُ لِلصَّلَاةِ، رقم: ٦٠٥

③ صحيح مسلم، بَابُ مَتَى يَقُومُ النَّاسُ لِلصَّلَاةِ، رقم ٦٠٤

ہے۔ممکن ہے یہ واقعہ نادر ہو یا فعل ہذا محض جواز کے لیے ہو۔

نیز جابر بن سمرہ اور ابو قتادہ رضی اللہ عنہما کی روایات میں وجہِ ''جمع'' یوں ہے، کہ بلال رضی اللہ عنہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے برآمد ہونے کا انتظار کرتے۔ آپ کو گھر سے نکلتے دیکھ کر فوری تکبیر کہتے۔ اس سے پہلے کہ اکثریت کو نظر آئیں۔ پھر لوگ جب آپ کو دیکھ لیتے۔ وہ بھی کھڑے ہو جاتے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی جگہ نہ کھڑے ہوتے، یہاں تک کہ لوگ اپنی صفیں درست کر لیتے۔

اس سلسلہ میں جمہور اہلِ علم کا مسلک یہ ہے، کہ امام جب مسجد میں موجود نہ ہو اور اقامت ہو جائے، مقتدی کھڑے نہ ہوں۔ امام کی آمد کا انتظار کریں اور جب وہ مسجد میں موجود ہو، تو لوگ تکبیر کے وقت کھڑے ہوں اور مؤطا میں امام مالک رحمہ اللہ فرماتے ہیں: کہ اس میں کوئی حد بندی نہیں۔ اس کا انحصار لوگوں کی استطاعت پر ہے۔ کئی بھاری ہیں اور کئی ہلکے ہیں۔

نیز حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی دوسری اور تیسری روایات میں ایک ہی واقعہ کا ذکر ہے۔ اس پر امام بخاری رحمہ اللہ نے بایں الفاظ تبویب کی ہے: «بَابُ اِذَا قَالَ الِامَامُ مَکَانَکُم ، حَتّٰی رَجَعَ انتَظَرُوہُ.»

یعنی ''امام جب مأمومین سے کہے۔ اپنی جگہ ٹھہرے رہو۔ یہاں تک کہ وہ واپس آئے۔ مقتدی اس کا انتظار کریں۔''

اور ابو قتادہ رضی اللہ عنہ کی حدیث پر یوں عنوان قائم کیا ہے:

« بَابُ حَتّٰی یَقُومَ النَّاسُ اِذَا رَأَو الِامَامَ عِندَ الِاقَامَةِ .»

اس سے معلوم ہوا اقامت اور تکبیر تحریمہ میں بوقتِ ضرورت وقفہ ہو سکتا ہے اور بعد از اقامت بحکم امام کھڑے کھڑے انتظار درست ہے۔ مقتدیوں کو جلدی نہیں کرنی چاہیے اور انبیاء علیہم السلام کے حق میں نسیان (بھول چوک) ممکن ہے۔

نماز کے دوران دو صفوں کے درمیان سے گزرنا:

سوال: نماز کے دوران دو صفوں کے درمیان سے گزرنے والے کو منع کیا گیا تو اس نے جواب دیا کہ امام کے آگے سُترہ دیوار ہے اس لیے کوئی گناہ نہیں۔ کیا اس طرح متعدد صفوں میں سے کسی بھی صف کو ایک سرے سے دوسرے سرے تک عبور کیا جا سکتا ہے؟

جواب: ہاں جائز ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی ''صحیح'' میں بایں الفاظ تبویب قائم کی ہے: '' سُترَةُ

الإمام سُترةُ مَن خلفه. ''امام کا سُترہ مقتدی کا سُترہ ہے۔ پھر قصہ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے استدلال کیا ہے:

« فَمَرَرتُ بَينَ يَدَي بَعضِ الصَّفِّ. فَنَزَلتُ، وَ اَرسَلتُ الْأتَانَ تَرتَعُ ، وَ دَخَلتُ فِي الصَّفِّ فَلَم يُنكِر ذٰلِكَ عَلَيَّ اَحَدٌ.»①

یعنی ''میرا گزر بعض صف کے آگے سے ہوا۔ میں اترا اور گدھی کو چرنے کے لیے چھوڑ دیا اور میں صف میں شامل ہوگیا۔ اس بات کا مجھ پر کسی نے انکار نہ کیا۔''

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

« وَ كَانَ البُخَارِيُّ حَمَلَ الْأمرَ فِي ذٰلِكَ عَلَى المَألُوفِ المَعرُوفِ مِن عَادَتِهِ ﷺ، أَنَّهُ كَانَ لَا يُصَلِّي فِي الفَضَاءِ اِلَّا وَالعَنزَةُ أَمَامَهُ »②

بحالتِ نماز عارضہ کی وجہ سے خالی جگہ کو پُر کرنا:

(سوال) : جب ہم فرض نماز پڑھ رہے ہوں اور کسی آدمی کا وضوٹوٹ جائے تو وہ جگہ جو خالی رہ جاتی ہے کیا اس کو پُر کرنا چاہیے یا ویسے ہی کھڑے رہنا چاہیے۔ اکثر بچے صف چھوڑ کر بھاگ جاتے ہیں تو کیا اس صورت میں ہم چند قدم آگے چل کر صف پُر کر سکتے ہیں یا کہ نہیں اس کے متعلق بھی تفصیل سے بتائیں۔

(جواب) : بحالتِ نماز عارضہ کی وجہ سے خالی جگہ کو پُر کرلینا چاہیے۔ سنن ابوداؤد میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت میں ہے، کہ شیطان کے لیے صفوں کے درمیان جگہ نہ چھوڑو۔

مسجد کی دوسری منزل پر عورتیں مردوں کے برابر صف بنائیں یا مردوں سے پیچھے بنائیں؟

(سوال) : مسجد کی دوسری منزل پر عورتیں مردوں کے برابر صف بنائیں یا مردوں سے پیچھے بنائیں؟

(جواب) : موجودہ شکل میں عورتوں کی صف مقتدی مَردوں کے برابر بن سکتی ہے۔ بظاہر اس میں کوئی امر مانع نہیں اگرچہ اصل یہ ہے، کہ عورتوں کی صف مردوں کے پیچھے ہو۔

کرسی پر بیٹھ کر نماز پڑھنا:

(سوال) : آج کل مساجد میں کرسی پر بیٹھ کر فرض نماز پڑھنے کا رجحان ہو رہا ہے۔ باوجود اس بات کے کہ قیام

① صحيح البخاري، بَابُ سُترَةُ الإمَامِ سُترَةُ مَن خَلفَهُ، رقم:٤٩٣

② فتح الباري: ١/٥٧١۔٥٧٣

کی حالت میں کھڑا ہوا جاسکتا ہے صرف سجدہ اور قعدہ کی حالت میں تکلیف ہے۔ ایسی صورت میں کیا یہ جائز ہے کہ تمام نماز کرسی پر بیٹھ کر ادا کی جائے۔ ایک مولوی صاحب نے یہ فتویٰ دیا ہے کہ اگر کھڑے ہو کر قیام پر قادر ہے تو کھڑے ہونا فرض ہے ورنہ نماز نہیں ہوگی۔

(جواب): حتی المقدور نماز کھڑے ہو کر ادا کرنی چاہیے۔ سجدہ اور قعدہ میں جیسے بیٹھ سکتا ہے۔ بیٹھ جائے۔

﴿لَا یُکَلِّفُ اللّٰهُ نَفسًا اِلَّا وُسعَهَا ﴾(البقرۃ:۲۸۶)

کرسی پر بیٹھ کر نماز پڑھنے والے کی صف بندی کس طرح کرے:

(سوال): کرسی استعمال کرنے کی حالت میں اگر کھڑا ہو کر قیام کرے تو کرسی کا پچھلا حصہ ہی صف کی سیدھ میں ہوتا ہے اور نمازی کو صف سے آگے کھڑا ہونا پڑتا ہے۔ ایک مولوی صاحب نے اس طرح قیام کرنے والے نمازی کو بیٹھنے کا حکم دیا کہ نمازی کا صف کی سیدھ میں ہونا واجب ہے۔ ایسی صورت میں نمازی کیا کرے؟

(جواب): کوشش کرنی چاہیے کہ صف بندی میں خلل واقع نہ ہو۔ معمولی خلل کا کوئی حرج نہیں۔ «فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا استَطَعتُم» ایسی صورت میں قیام کرنا چاہیے۔ کیونکہ قیام کو زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ لیکن اصل یہ ہے کہ مریض کرسی کے بجائے زمین پر بیٹھ کر نماز پڑھے۔ احادیث سے یہ ثابت شدہ شکل ہے۔ بیٹھنے میں جو صورت اختیار کرسکتا ہے کرلے۔ اس میں وسعت ہے۔ کرسیوں پر بیٹھ کر نماز پڑھنے کی رسم ختم کردینی چاہیے۔ ساری خیر اسی میں ہے۔

کرسی پر بیٹھ کر نماز پڑھنے والا سجدہ کا حکم:

(سوال): آج کل مسجد میں کرسیاں رکھی ہوتی ہیں جن پر لوگ بیٹھ کر نماز ادا کرتے ہیں۔ سجدہ کرتے وقت اپنی پیشانی تختی پر رکھتے ہیں۔ ہمارے ہاں کچھ لوگ کہتے ہیں تختی پر سجدہ نہیں ہوتا۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ سجدہ ہوجاتا ہے؟

(جواب): حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے منقول ہے، کہ لکڑی پر سجدہ کرنا مکروہ ہے۔ فرمایا: اشارے سے نماز پڑھے۔ ملاحظہ ہو!(المغنی :۲/ ۵۷٦)

بناء بریں تختی پر سجدہ کرنے سے بچنا چاہیے۔ واضح ہو کہ کرسیوں پر بیٹھنے کے بجائے کوشش کرنی چاہیے کہ نماز زمین پر بیٹھ کر پڑھی جائے، تاکہ صف بندی میں خلل واقع نہ ہونے پائے۔

نماز کے لیے اقامت یعنی تکبیر کہنا

اقامت کا جواب دینا چاہیے یا نہیں؟

(سوال) اقامت کا جواب دینا چاہیے یا نہیں؟ جماعت المسلمین کے امیر مسعود احمد نے لکھا ہے کہ اقامت کا جواب دینا کسی حدیث سے ثابت نہیں

(جواب) اقامت کا جواب دینے کی حدیث سنن ابو داود میں ہے لیکن اس کی سند میں ضعف ہے۔ اس میں دو راوی محمد بن ثابت العبدی اور شہر بن حوشب ضعیف ہیں، نیز ان دونوں کے درمیان راوی مجہول ہے۔ لہٰذا یہ حدیث قابل عمل نہیں ہے۔

بیت اللہ میں سپیکر ہونے کے باوجود مکبر کا تکبیرات کہنا:

(سوال) بیت اللہ میں امام کی آواز سپیکر پر سنائی دیتی ہے، اس کے باوجود سپیکر (آلہ مُکبّر الصوت) میں تکبیرات کہتا ہے، اس کی کیا ضرورت ہے؟

(جواب) مکبّر کا جواز چونکہ شرع میں علی الاطلاق مسلمہ ہے، اس لئے اگر کوئی اس کو برقرار رکھتا ہے تو اس پر اعتراض نہیں ہوسکتا۔ بسا اوقات مسجد کا سپیکر خراب ہوسکتا ہے جس کا مشاہدہ بیت اللہ میں عملاً ہو چکا ہے تو اس صورت میں مکبر سے استفادہ کی ایک ضرورت بھی ہے۔

اقامت پڑھنے کا صحیح طریقہ کیا ہے؟

(سوال) کیا اقامت میں حی علی الصلوۃِ میں ۃ پر زیر پڑھنا، قد قامت الصلوٰۃ پر وقف کرنا جائز ہے؟

(جواب) اقامت کے ان کلمات کے اعراب کی ادائیگی کا محض جواز ہے، ورنہ اصلاً سماع میں وقف ہے۔[1]

کیا تکبیر کہنا صرف مؤذن کا حق ہے؟

(سوال): صورتِ احوال یہ ہے کہ ہماری مسجد میں چند نمازیوں کی وجہ سے مندرجہ ذیل مسئلہ اختلاف کا باعث بناء ہوا ہے۔ براہِ کرام ہماری رہنمائی فرمائی جائے۔

① ...... کیا تکبیر کہنا صرف مؤذن کا حق ہے؟

---

[1] عون المعبود: ۱/ ۱۸۸

② ...... کیا تکبیر کہنے کے لیے امام صاحب یا مؤذن کی اجازت ضروری ہے؟

③ ...... کیا تکبیر کہتے وقت امام صاحب کا مصلے پہ ہونا ضروری ہے؟

④ ...... اگر امام صاحب یا مؤذن کی اجازت کے بغیر تکبیر کہہ دی جائے تو کیا یہ عمل خلاف سنت ہوگا؟

تمام شقوں کا تفصیلاً جواب قرآن وسنت کی روشنی میں دیں، شکریہ!

جواب: ① تکبیر کا زیادہ استحقاق مؤذن کا ہے، البتہ اگر دوسرا شخص کہہ لے تو جائز ہے۔ ملاحظہ ہو! (بلوغ المرام مترجم دارالسلام: ۱/۱۴۷)

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''اہلِ علم کی اکثریت کے نزدیک اس پر عمل ہے کہ جو اذان کہے، وہی اقامت کا حق دار ہے۔''

② امام تکبیر کہلانے میں حق دار ہے یعنی اس کے اشارہ واجازت کے بغیر تکبیر نہ کہی جائے۔ [1]

③ تکبیر کے وقت امام کا مصلّٰی پر ہونا ضروری نہیں۔ [2]

④ عبداللہ بن زید رضی اللہ عنہ کی حدیث سے جواز معلوم ہوتا ہے۔

تکبیر کے لیے مؤذن سے اجازت لینا:

سوال: کیا نماز کی تکبیر کے لیے مؤذن سے اجازت لینا ضروری ہے؟

جواب: امام حازمی اپنی کتاب ''الاعتبار فی الناسخ والمنسوخ'' میں رقمطراز ہیں:

« وَاتَّفَقَ أَهلُ العِلمِ فِی الرَّجُلِ یُؤَذِّنُ، وَ یُقِیمُ غَیرُہٗ، أَنَّ ذَالِكَ جَائِزٌ. وَاختَلَفُوا فِی الأَولَوِیَّةِ. فَقَالَ أَکثَرُهُم: لَا فَرقَ. وَالَامرُ مُتَّسِعٌ ، وَ مِمَّن رَأَی مَالِكٌ، وَ أَکثَرُ أَهلِ الحِجَازِ، وَ أَبُو حَنِیفَةَ، وَ أَکثَرُ أَهلِ الکُوفَةِ ، وَ أَبُو ثَورٍ. وَ قَالَ بَعضُ العُلَمَاءِ مَن أَذَّنَ فَهُوَ یُقِیمُ . قَالَ الشَّافِعِیُّ: وَ إِذَا أَذَّنَ الرَّجُلُ اَحبَبتُ أَن یَتَوَلَّی الِاقَامَةَ »

یعنی اہلِ علم کا اس پر اتفاق ہے کہ ایک آدمی اذان کہے، اور دوسرا اقامت، تو یہ جائز ہے۔ البتہ اَولَوِیّت (یعنی افضلیت) میں ان کا اختلاف ہے۔ ان میں سے اکثریت اس بات کی قائل ہے کہ معاملہ میں وسعت ہے۔ ان لوگوں میں سے امام مالک اور اکثر اہل حجاز، امام ابوحنیفہ، اور اکثر اہل کوفہ اور امام ابوثور رحمہ اللہ ہیں اور بعض علماء نے کہا ہے کہ جو اذان دے وہی اقامت کہے۔ امام

① بلوغ المرام مترجم دار السلام۔ ج:۱، ص:۱۴۷

② صحیح البخاری، بَابُ إِذَا ذَکَرَ فِی المَسجِدِ أَنَّهُ جُنُبٌ، یَخرُجُ کَمَا هُوَ، وَلَا یَتَیَمَّم، رقم:۲۷۵

شافعی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مجھے یہ بات پسند ہے کہ جو آدمی اذان کہے وہی اقامت کہے۔ لیکن امام ترمذی نے یہ مسلک اکثر اہلِ علم کی طرف منسوب کیا ہے کہ جو اذان دے وہی اقامت کہے۔

اور صاحب ''سبل السلام'' حدیث میں ''مَن اَذَّنَ فَهُوَ يُقِيمُ'' پر بناء رکھتے ہوئے فرماتے ہیں:

« وَالحَدِيثُ دَلِيلٌ عَلٰى أَنَّ الإِقَامَةَ حَقٌّ لِمَن أَذَّنَ فَلَا تَصِحُّ مِن غَيرِهٖ »

''حدیث ہذا اس بات کی دلیل ہے کہ اقامت اس کا حق ہے، جو اذان کہے، دوسرے کی درست نہیں۔''

اور علامہ سندھی رحمہ اللہ نے ابن ماجہ کے حاشیہ پر کہا ہے: کہ اس حدیث کی سند میں افریقی (عبدالرحمٰن بن زیاد بن انعم) ہے۔ اگرچہ یحییٰ بن قطان اور امام احمد رحمہ اللہ نے اس کو ضعیف قرار دیا ہے، لیکن امام محمد بن اسماعیل بخاری رحمہ اللہ نے ''مقارب الحدیث'' کہہ کر اس کو تقویت پہنچائی ہے۔ نیز ابوداؤد اور منذری نے اس پر سکوت اختیار کیا ہے جو اس کے صالح للا حتجاج (یعنی قابلِ حجت) ہونے کی دلیل ہے اور امام شوکانی رحمہ اللہ نے ''السیل الجرار'' میں کہا ہے۔ حدیث ''مَن اَذَّنَ فَهُوَ يُقِيمُ'' پر کلام صرف اس اعتبار سے ہے کہ اس کی سند میں راوی عبدالرحمٰن بن زیاد افریقی ہے۔ اہلِ علم کی ایک جماعت نے اس کی توثیق کی ہے۔ اس میں ایسی کوئی جرح نہیں جس کی وجہ سے اس کی حدیث کو قابلِ حجت نہ سمجھا جائے اور صاحب ''المرعاۃ'' فرماتے ہیں:

مؤذن اذان کا زیادہ حقدار ہے۔ دوسرا اقامت نہ کہے مگر کسی ضرورت کی بناء پر، جس طرح کہ عبداللہ بن زید (جنھوں نے خواب میں اذان دیکھی تھی) کے قصہ میں ہے اور اس حدیث میں دلیل ہے کہ اقامت اسی کا حق ہے جو اذان دے۔ دوسرے کا اقامت کہنا مکروہ ہے۔(١/٤٢٦)

اور صاحب ''المنتقیٰ'' نے اس پر تبویب قائم کی ہے:''بَابُ مَن اَذَّنَ فَهُوَ يُقِيمُ'' جو شخص اذان کہے وہی اقامت کہے اور ابوداؤد نے یوں تبویب قائم کی ہے۔''بَابُ الرَّجُلِ يُؤَذِّنُ وَ يُقِيمُ آخَرُ'' یعنی ایک شخص اذان کہے اور دوسرا اقامت، پھر اس کے تحت دونوں قسم کی روایات کو بیان کیا ہے۔ اس سے غالبًا وسعت کی طرف اشارہ مقصود ہے۔ بہر صورت جملہ دلائل کے پیشِ نظر یہ کہنا ممکن ہے کہ اقامت کا اصلی استحقاق (حق) مؤذن کو حاصل ہے اور اگر کوئی دوسرا بھی کہہ دے تو مع الکراہت درست ہے اور اجازت کی صورت میں بلا کراہت درست ہے۔

قَد قَامَتِ الصَّلٰوۃُ کے جواب میں اَقَامَهَا اللّٰهُ وَ اَدامَهَا کہنا:

سوال: جس وقت اقامت کہنے والا ''قَد قَامَتِ الصَّلٰوۃُ'' کہے تو اس کے جواب میں ''اَقَامَهَا اللّٰهُ وَ اَدامَهَا'' کہنا چاہیے کہ نہیں؟ محمد اقبال کیلانی کی کتاب ''کتاب الصلاۃ'' میں لکھا ہے کہ یہ صحیح حدیث سے ثابت نہیں۔

جواب: مشارٌ الیہ روایت واقعی ضعیف ہے۔ امام منذری رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

« فِي إِسنَادِهِ رَجُلٌ مَجهُولٌ ، وَ شَهرُ بنُ حَوشَبٍ تَكَلَّمَ فِيهِ غَيرُ وَاحِدٍ. وَ وَثَّقَهُ أَحمَدُ، وَ يَحيٰى بنُ مُعِينٍ » [1]

لہٰذا اصل کلمہ ''قَد قَامَتِ الصَّلٰوۃَ'' کو ہی اختیار کرنا چاہیے۔

سوال: تکبیر ہو رہی ہو تو «قَد قَامَتِ الصَّلٰوۃِ» کہنے پر « اَقَامَهَا اللّٰهُ وَ اَدامَهَا» کہنا چاہیے یا آخر میں؟ ہمارے مولوی صاحب کا کہنا ہے درمیان میں کہنا چاہیے آخر میں نہیں۔

جواب: تکبیر میں «قَد قَامَتِ الصَّلٰوۃَ» کا جواب کلمات کے درمیان اسی طرح دہرانا چاہیے۔ «اَقَامَهَا اللّٰهُ» والی روایت صحیح نہیں۔

اقامت کے بغیر نماز کا حکم:

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس بارے میں کہ فرضی نماز کی ادائیگی کے وقت جو تکبیر کہی جاتی ہے وہ اگر سہواً چھوٹ جائے اس صورت میں نماز ہو جائے گی یا دوبارہ تکبیر کہہ کر نماز ادا کی جائے گی۔

جواب: صورت مرقومہ (تحریر کی گئی صورت) میں جمہور اہلِ علم اس بات کے قائل ہیں کہ نماز درست ہے، اعادے کی ضرورت نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اقامت حکماً سنتِ مؤکدہ ہے، فرض اور واجب نہیں اور جو لوگ واجب ہونے کے قائل ہیں، ان میں سے اکثریت کا خیال ہے کہ اقامت فرض کفایہ ہے، جس کا مفہوم و مدعا یہ ہے کہ کسی وقت ترک کی صورت میں نماز کو دہرانے کی ضرورت نہیں۔ البتہ عطاء اور مجاہد رحمہما اللہ وغیرہ کے نزدیک تکبیر چونکہ علی الاطلاق فرض ہے۔ لہٰذا بصورتِ ترکِ نماز کی دہرائی ضروری ہے اور بعض مالکی فقہاء نے سہواً (بھول جانے) اور غیر سہو (نہ بھولنے) میں فرق کیا ہے۔ یعنی سہواً اگر تکبیر رہ جائے تو نماز ہو جائے گی بصورتِ دیگر اعادہ (دہرانا) ضروری ہے۔ مشہور فقیہ امام خرقی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

---

[1] عون المعبود: ۲۰۸/۱

« وَ مَن صَلّٰی بِلَا أَذَانٍ، وَ لَا إِقَامَةٍ كَرِهنَا لَهُ ذٰلِكَ، وَ لَا يُعِيد» ①

’’جس نے اذان اور اقامت کے بغیر نماز پڑھی، ہمارے نزدیک یہ فعل مکروہ ہے۔ تاہم نماز لوٹانے کی ضرورت نہیں‘‘اس کے شارح فقیہ ابن قدامہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: کہ اگر کوئی بلا اذان اور اقامت کے نماز پڑھ لے تو

«فَالصَّلَاةُ صَحِيحَةٌ عَلَى القَولَينِ.»

’’دونوں اقوال (سنت مؤکدہ اور فرض کفایہ) کے مطابق نماز درست ہے۔‘‘

اس دلیل کی بناء پر کہ علقمہ اور اُسود رضی اللہ عنہما کا بیان ہے کہ ہم ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے پاس آئے تو انہوں نے ہمیں بلا اذان اور اقامت کے نماز پڑھائی۔‘‘ (رواہ الأثرم) مجھے معلوم نہیں ہو سکا کہ عطاء رحمہ اللہ کے ماسوا اس میں کسی نے مخالفت کی ہو۔ کہا کہ جو اقامت بھول جائے وہ نماز لوٹائے۔ امام اوزاعی رحمہ اللہ نے بعض دفعہ کہا اگر نماز کا وقت ہو تو لوٹائے اور اگر وقت گزر رائے تو نہ لوٹائے۔

« وَالصَّحِيحُ قَولُ الجَمهُورِ، لِمَا ذَكَرنَا، لِأَنَّ الِاقَامَةَ أَحَدُ الأَذَانَينِ، فَلَم تَفسُدِ الصَّلَاةُ بِتَركِهَا كَالآخَرِ»

یعنی ’’مذکورہ وجوہات کی بناء پر جمہور کا قول صحیح ہے۔ اس لئے بھی کہ اقامت دو اذانوں میں سے ایک ہے۔ اس کے ترک سے نماز فاسد نہیں ہوگی، جس طرح کہ اذان کے ترک سے نماز فاسد نہیں ہوتی۔‘‘ انتہی

مسئلہ ہذا پر امام شوکانی رحمہ اللہ نے قدرے تفصیل سے بحث کی ہے۔ جانبین کے دلائل جمع کرنے کے علاوہ فقہاءِ کرام کے مسالک کی بھی نشاندہی کی ہے۔ ان کا رجحان بھی وجوب کی طرف ہے۔ ملاحظہ ہو! ’’نیل الأوطار‘‘ (۲/۳۳۔۳٤) جس طرح کہ امام ابن حزم رحمہ اللہ بھی ’’المحلیٰ‘‘ میں وجوب کے قائل ہیں۔

جماعت کے نامور محقق مولانا عبدالقادر حصاروی مرحوم نے اپنی تالیف ’’کتاب الأذان‘‘ میں اسی مسلک کو اختیار کیا ہے۔

دوسری طرف صحیح بخاری کے انداز سے معلوم ہوتا ہے کہ امام بخاری رحمہ اللہ علی الاطلاق (بغیر شرط کے) ان کی مشروعیت اور مسنون ہونے کے قائل ہیں۔ اسی طرح امام فقیہ مجتہد ’’ابن دقیق العید‘‘ فرماتے ہیں:

« وَالمَشهُورُ أَنَّ الأَذَانَ وَالِاقَامَةَ سُنَّتَانِ. وَ قِيلَ: هُمَا فَرضَانِ عَلَى الكِفَايَةِ. وَ هُوَ قَولُ الاَصطَخرِي مِن أَصحَابِ الشَّافِعِيِّ » ②

① المختصر مع المغنی: ۱/۴۳۱

② احکام الاحکام ۱/۲۱۵

''مشہور بات یہ ہے کہ اذان اور اقامت دونوں سنت ہیں اور بصیغۂ مجہول ایک قول یہ بھی ہے کہ دونوں فرض کفایہ ہیں۔امام شافعی رحمہ اللہ کے اصحاب میں سے اصطخری رحمہ اللہ کا یہی قول ہے۔''

الحاصل ائمہ حدیث اور فقہاء عظام کے اقوال و آثار کی روشنی میں یہ امر واضح ہے کہ اذان اور اقامت دونوں تاکیدی امور میں سے ہیں۔تاہم اگر کسی وقت سہواً رہ جائیں تو نماز میں خلل واقع نہیں ہوگا۔ان شاء اللہ۔بخلاف شاذ مسلک کے،جس میں نماز کے بُطلان کا موقف اختیار کیا گیا ہے۔(هذا ما عندي و الله أعلم بالصواب وعلمه أتم)

دوسری جماعت کے لیے تکبیر کہنا:

سوال : دوسری جماعت کے لیے تکبیر کہنا کس حدیث سے ثابت ہے؟

جواب : صحیح بخاری کے ''ترجمۃ الباب'' میں ہے:

« وَ جَاءَ اَنَسٌ اِلٰی مَسجِدٍ قَد صُلِّیَ فِیهِ. فَأَذَّنَ، وَ اَقَامَ، وَ صَلّٰی جَمَاعَةً » [1]

''حضرت انس رضی اللہ عنہ ایک مسجد کی طرف آئے۔وہاں جماعت ہو چکی تھی،تو انھوں نے اذان اور اقامت کہہ کر جماعت کرائی۔''

ویسے بھی تکبیر فرض جماعت کا لاحقہ ہے جو تعامل سے ثابت ہے۔

اذانِ ابی محذورہ رضی اللہ عنہ میں اللہ اکبر کی تعداد:

سوال : گزشتہ شمارہ نمبر ۲۰ میں کلماتِ اذان و اقامت پر بحث کی گئی۔اس میں روایت حضرت ابی محذورہ رضی اللہ عنہ (مسلم شریف بحوالہ مشکوٰۃ) لکھی جس کے لفظ یہ تھے۔''اللہ اکبر۔اللہ اکبر۔اللہ اکبر۔اللہ اکبر۔'' جب کہ مسلم شریف جلد اوّل،صفحہ نمبر ۳۶۰،حدیث ۷۴۶،میں الفاظ صرف ''اللہ اکبر۔اللہ اکبر'' ہیں۔تفصیل سے بیان فرمائیں؟

جواب : حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے ابن القطان سے ذکر کیا ہے کہ صحیح مسلم کی بعض روایات میں چار دفعہ تکبیر کا ذکر ہے۔یہ اس لائق ہے کہ صحیح میں اسی کا شمار کیا جائے۔ابن القطان نے کہا ہے کہ اس سلسلہ میں صحیح بات یہ ہے کہ تکبیر چار دفعہ ہو۔اس سے یہ بات درست ثابت ہوتی ہے کہ اذان کے انیس کلمے ہیں،جس طرح کہ دوسری روایت میں تصریح ہے۔قاضی عیاض رحمہ اللہ نے بھی کہا ہے کہ فارسی کے بعض طُرق میں صحیح مسلم میں

[1] صحيح البخاري، باب فضل صلاة الجماعة

چار دفعہ کا ذکر ہے۔①

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ:

« وَ يَظْهَرُ لِهٰذَا التَّقْرِيرِ تَرْجِيحُ قَوْلِ مَنْ قَالَ بِتَرْبِيعِ التَّكْبِيرِ فِي أَوَّلِهِ عَلٰى مَنْ قَالَ بِتَثْنِيَتِهِ» ②

نماز کے لیے اقامت کب کہی جائے؟

(سوال) : اقامت کس وقت کہنی چاہیے جب کہ امام مقتدی کے پاس ہی تلاوتِ قرآن میں یا کسی شخص سے مصروفِ گفتگو ہے اور وہ اقامت کی آواز سن سکتا ہے یا صرف امام کے جائے امامت پر قدم رکھ چکنے کے بعد اقامت کہی جائے گی؟

(جواب) : امام جب امامت کے فرائض کی ادائیگی کے لیے تیار ہو۔ اس کی حالت یا کیفیت چاہے جونسی ہو، اس وقت تکبیر کہی جا سکتی ہے۔ اقامت کے لیے اس کا جائے مصلّٰی پر کھڑا ہونا ضروری نہیں۔ مؤذن رسول اللہ ﷺ حضرت بلال رضی اللہ عنہ کی عام طور پر عادت تھی کہ نبی کریم ﷺ کے گھر سے نکلتے ہی فوراً اقامت کہہ دیتے۔

اقامت اکہری یا دوہری:

(سوال) گزارش ہے کہ ترمذی کی ایک حدیث جس کو احناف حضرات اپنی اذان و اقامت کی دلیل کے طور پر پیش کرتے ہیں کیا یہ حدیث صحیح ہے؟ اگر ضعیف ہے تو اس کا ضعف کیا ہے امید ہے کہ جواب بادلیل ہو گا:

« بَابُ مَا جَاءَ اَنَّ الاِقَامَةَ مَثْنٰى مَثْنٰى. حَدَّثَنَا اَبُو سَعِيدِ نِ الاَشَجُّ ثَنَا عُقْبَةُ بْنُ خَالِدٍ عَنِ ابْنِ اَبِي لَيْلٰى، عَنْ عَمْرِو بْنِ مُرَّةَ، عَنْ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ بْنِ اَبِي لَيْلٰى، عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ زَيْدٍ قَالَ: كَانَ اَذَانُ رَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ شُفْعًا، شُفْعًا فِي الاَذَانِ، وَالاِقَامَةِ » ③

(جواب) : اس باب کے تحت بذاتِ خود امام ترمذی رقمطراز ہیں:« وَعَبْدُ الرَّحْمٰنِ بْنُ اَبِي لَيْلٰى لَمْ يَسْمَعْ مِنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ زَيْدٍ » ④ یعنی عبد الرحمٰن بن ابی لیلیٰ کا عبد اللہ بن زید سے سماع ثابت نہیں۔

---

① المرعاة:١/٤٢٣

② فتح الباری:٢٨٣

③ سنن الترمذی، ابواب الصلوٰة، بَابُ مَا جَاءَ أَنَّ الإِقَامَةَ مَثْنَى مَثْنَى، رقم:١٩٤

④ سنن الترمذی مع تحفة الاحوذی:١/٥٨١

محدث مبارکپوری رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

« وَحَدِيثُ اِفرَادِ الاِقَامَةِ اَصَحُّ، وَ أَثبَتُ. وَ قَد ثَبَتَ بِطَرِيقَينِ صَحِيحَينِ ، عَن عَبدِ اللّٰهِ بنِ زَيدٍ اِفرَادُ الاِقَامَةِ » [1]

یعنی افرادِ اقامت کی حدیث زیادہ صحیح اور زیادہ ثابت ہے۔

عبداللہ بن زید رضی اللہ عنہ سے "صحیحین" کے دو طریقوں میں افرادِ اقامت ثابت ہے۔ مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو! تحفة الاحوذی.

اقامت میں اعراب:

سوال: ٹیلی ویژن میں اقامت اس طرح سنی: حَیَّ عَلَی الصَّلَاۃِ. حَیَّ عَلَی الفَلَاحِ (اَلصَّلٰوۃ کے ۃ کے نیچے ایک زیر پڑھنا) قَد قَامَتِ الصَّلٰوۃُ، قَد قَامَتِ الصَّلٰوۃُ. (پہلے اَلصَّلٰوۃُ کو الصلٰت یعنی ۃ کو ساکن ت کی طرح پڑھنا) کیا مذکورہ الفاظ اسی طرح پڑھنے چاہئیں؟

جواب: اقامت کے کلمات کی اس طرح ادائیگی کا اعرابی حالت کے اعتبار سے محض جواز ہے۔ ورنہ اصلاً سماع میں وقف ہے۔ [2]

دوسری جماعت کرانے کا حکم:

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ کے بارے میں کہ جب پہلی جماعت امام کرادے تو کیا دوسری جماعت ہوسکتی ہے اور امام بلند آواز میں قرأت کرسکتا ہے؟

جواب: تکرارِ جماعت کا جواز ہے۔ حدیثِ متصدق متعدد طُرق سے مروی ہے فرمایا:

« أَلَا رَجُلٌ يَتَصَدَّقُ عَلٰى هٰذَا فَيُصَلِّي مَعَهُ .»

رسول اللہ ﷺ نے ایک شخص کو اکیلے نماز پڑھتے دیکھا، تو فرمایا: کہ کیا کوئی شخص اس کو صدقہ نہیں دیتا۔

امام ابوداؤد اور ترمذی وغیرہ نے اپنی "سنن" میں حدیثِ ہذا پر تعدد جماعت کے جواز کے ابواب قائم کیے ہیں اور صحیح بخاری کے عنوان "باب فضل جماعة" میں ہے۔

« وَ جَاءَ أَنَسٌ إِلٰى مَسجِدٍ قَد صُلِّيَ فِيهِ فَأَذَّنَ ، وَ أَقَامَ، وَ صَلّٰى جَمَاعَةً . »

---

[1] تحفة الاحوذی: ۱/ ۵۸۰

[2] عون المعبود: ۱/ ۱۸۸

یعنی ''حضرت انس ایک مسجد میں آئے وہاں جماعت ہو چکی تھی۔ انھوں نے اذان اور اقامت کہہ کر با جماعت نماز پڑھی۔''

باقی نماز کی جہری یا سری قرأت کا انحصار موجود نماز کی کیفیت پر موقوف ہے۔ظاہر ہے کہ جہری نماز میں قرأت بآواز بلند ہوگی اور سری میں آہستہ۔

سوال : مفترض کی مفترض کے ساتھ مسجد واحد میں بتکرارِ جماعت جائز ہے یا نہیں؟

جواب : اہل حدیث کی اکثر مساجد میں دیکھا گیا ہے، کہ ایک ہی نماز کی متعدد جماعتیں قائم ہوتی ہیں اور جماعت کرانے والوں کی اکثریت ان لوگوں پر مشتمل ہوتی ہے جو اپنے ذاتی شغل کو دعوت الی اللہ (اذان) سے مقدم گردانتے ہیں۔ کبھی تو وہ چند گاہکوں کی امید میں دکان پر بیٹھے رہتے ہیں اور کبھی ٹی وی ڈرامے یا میچ پر نظریں جمائے رکھتے ہیں اور کبھی انھیں دوستوں کی محفل سے نماز کی خاطر اٹھنا گراں معلوم ہوتا ہے، اور وہ یہ سوچ کر کہ خیر ہے، دوسری یا تیسری جماعت کرالیں گے۔ پہلی یعنی حقیقی جماعت میں شمولیت سے محروم رہتے ہیں۔ اس سلسلے میں ان کا سہارا یہ روایت بنی ہوئی ہے کہ

ایک دفعہ آنحضرت ﷺ اپنے صحابہ کو ظہر کی نماز پڑھا چکے تھے، کہ ایک آدمی مسجد میں داخل ہوا۔ آپ ﷺ نے کہا: اے فلاں! تجھے جماعت سے کس چیز نے روکے رکھا؟

تو اس نے کوئی وجہ بیان کی۔ راوی بیان کرتا ہے، کہ اس نے نماز پڑھنی شروع کی، تو آپ ﷺ نے فرمایا کوئی ہے، جو اس پر صدقہ کرے؟ اس طرح کہ اس کے ساتھ نماز ادا کرے۔تو ایک آدمی اس کے ساتھ کھڑا ہو گیا۔ (رواہ احمد بحوالہ سبل السلام:۲/۳)[1]

اور اس کی تائید میں حضرت انس رضی اللہ عنہ کا فعل پیش کیا جاتا ہے۔

« اَنَّهٗ دَخَلَ مَسجِدًا قَد صَلَّوا فِيهِ، فَأَمَرَ رَجُلًا فَاَذَّنَ بِهِم، وَ أَقَامَ فَصَلّٰى بِهِم جَمَاعَةً.» (رواه البيهقي بحواله تمام المنّة على فقه السنّة)

''وہ مسجد میں داخل ہوئے جہاں نمازی نماز پڑھ چکے تھے تو انھوں نے ایک آدمی کو اذان دینے کا حکم دیا تو اس نے اذان اور تکبیر کہی پھر انھوں نے ان کو جماعت کرائی۔''

بعض روایات میں ہے کہ آپ قریباً بیس آدمیوں کے ہمراہ بنو سلمہ سے گزرے جہاں نمازی جماعت کے ساتھ نماز ادا کر چکے تھے۔ تو آپ نے وہاں اذان کہلوائی اور جماعت کرائی۔

---

[1] السنن الكبرىٰ للبيهقي، بَابُ الْجَمَاعَةِ فِي مَسْجِدٍ قَدْ صُلِّيَ فِيهِ إِذَا لَمْ ......الخ، رقم:۵۰۱۲

اگر معاملہ یہاں تک رہتا تو خیر تھی کہ اگر کوئی شرعی امر یا سفر درپیش آجائے تو دوبارہ جماعت کرالی جاتی۔ لیکن معاملہ یہاں تک پہنچ چکا ہے، کہ ہمارے اہلِ حدیث خیال کے تبلیغی دوست پیر محمد علی چشتی بیان کرتے ہیں کہ ہم افریقی ملک کے دورے پر تھے، کہ وہاں کی مساجد میں عجیب معاملہ دیکھنے میں آیا، کہ بعض دفعہ ظہر کی جماعت اذانِ عصر تک جا پہنچتی تھی اور عصر کی جماعت قریب مغرب جا پہنچتی وہ اس طرح کہ اصلی یا حقیقی جماعت سے جن نمازیوں کی رکعات رہ جاتی ہیں، وہ انھیں پورا کرنے کے لیے کھڑے ہوتے ہیں، تو اپنے میں سے کسی ایک مسبوق کو آگے دھکیل دیتے ہیں۔ وہ مسبوق ان کا امام بن جاتا ہے اور باقی مسبوق مقتدی بن جاتے ہیں۔ کسی کی ایک رکعت اور کسی کی دو تو کسی کی تین رکعات فوت ہوئی ہوتی ہیں، جب مسبوق امام سلام پھیرتا ہے تو جن کی رکعات امام کے ساتھ پوری ہو جاتی ہیں، وہ سلام پھیرتے ہیں اور جن کی رکعات باقی رہتی ہیں، وہ ادا کرنے کھڑے ہوتے ہیں، تو بعد میں وضو کرکے آنے والے نمازی ان مسبوقین میں کسی کو آگے دھکیل کر اپنا امام بناء لیتے ہیں، اور باقی مسبوقین کے ساتھ صف بناء لیتے ہیں۔ جب دوسرا مسبوق امام سلام پھیرتا ہے، تو بعد والے مسبوق مقتدی صاحبان کھڑے ہو کر اپنی رکعت پوری کرنے کے لیے کھڑے ہو جاتے ہیں کہ اتنے میں لیٹ ہو جانے والے دوسرے نمازی وضو کرکے ان کے پیچھے کھڑے ہو جاتے ہیں اور مسبوقین میں سے کسی کو آگے دھکیل کر یا باقی مسبوقین کو پیچھے کھینچ کر صف بناء لیتے ہیں۔ اس طرح جماعت کا یہ سلسلہ لگاتار عصر تک جاری رہتا اور عصر کی جماعت کا مغرب تک اور مغرب کا عشاء تک جاری رہتا اور سب کی دلیل صرف ایک ہی حدیث ہے کہ " أَلَا رَجُلٌ يَتَصَدَّقُ عَلٰى هٰذَا فَيُصَلِّيَ مَعَهٗ؟ "

سوال پیدا ہوتا ہے کہ جن صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے سامنے آپ نے یہ بات کہی تھی۔ کیا انھوں نے بھی ساری زندگی ایسا طریقہ جاری رکھا، کہ پانچوں وقتوں کی نمازوں کی کئی کئی جماعتیں کرواتے تھے۔ یا اسی طرح صدقے کرتے رہتے تھے جس طرح ہمارے افریقی مسلمان دوست کرتے ہیں، یا وہ جماعتِ اصلیہ سے ملتے تھے اور جورہ جاتے تھے، وہ اپنی الگ نماز ادا کرتے تھے؟ اس سلسلے میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا اُسوہ اسی طرح ہمارے سامنے ہے، کہ وہ اگر جماعت سے رہ جاتے تو دوبارہ جماعت کھڑی کرنے کی بجائے الگ الگ نماز ادا کر لیتے۔ حضرت امام حسن بصری رحمہ اللہ بیان کرتے ہیں کہ

« كَانَ اَصحَابُ مُحَمَّدٍ اِذَا دَخَلُوا المَسجِدَ، وَ قَد صُلِّيَ فِيهِ. صَلَّوا فُرَادىٰ » [1]

[1] مصنف ابن ابی شیبة، مَنْ قَالَ :يُصَلُّونَ فُرَادَى، وَلَا يَجْمَعُونَ:۲/۲۲۳، رقم:۷۱۱۱

''اصحابِ رسول ﷺ جب ایسی مسجد میں داخل ہوتے جہاں جماعت ہو چکی ہوتی، تو وہ الگ الگ نماز ادا کرتے۔''

اسی طرح طبرانی کبیر میں ہے کہ

« اَنَّ عَلقَمَةَ ، وَالاَسوَدَ اَقبَلَا مَعَ ابنِ مَسعُودٍ إِلَى المَسجِدِ، فَاستَقبَلَهُمُ النَّاسُ، وَقَد صَلَّوا فَرَجَعَ بِهِمَا اِلَى البَيتِ، ثُمَّ صَلّٰى بِهِمَا » ①

''حضرت علقمہ اور اسود دونوں حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے ہمراہ مسجد کی طرف آرہے تھے کہ انھیں لوگ اس حال میں ملے کہ وہ مسجد میں نماز پڑھ چکے تھے تو آپ ان دونوں کو لے کر گھر آ گئے اور جماعت کرائی۔''

اگر ایک مسجد میں دوبارہ جماعت کرانا مطلقاً جائز ہوتا تو حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ گھر میں ہرگز جماعت نہ کراتے، حالانکہ مسجد میں نماز پڑھنا افضل ہے۔

حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا گھر میں نماز ادا کرنا، ان کا ذاتی اجتہاد نہیں، بلکہ سنتِ رسول کی اتباع ہے۔ چنانچہ طبرانی اوسط میں عبد الرحمٰن بن ابی بکرہ سے مروی ہے۔

« اَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ اَقبَلَ مِن نَوَاحِي المَدِينَةِ يُرِيدُ الصَّلٰوةَ ، فَوَجَدَ النَّاسَ قَد صَلَّوا. فَمَالَ اِلٰى مَنزِلِهٖ فَجَمَعَ اَهلَهٗ فَصَلّٰى بِهِم » ②

''رسول مقبول ﷺ نواحی مدینہ سے نمازِ فرض کے لیے مسجد کی طرف آرہے تھے، آپ ﷺ نے دیکھا کہ لوگ نماز ادا کر چکے ہیں تو آپ ﷺ گھر آ گئے اور گھر والوں کو جمع کر کے انہی کے ساتھ نماز ادا کی یعنی جماعت کرائی۔

امام محمد بن ادریس شافعی رحمہ اللہ خیر القرون کے اسلافِ کرام کا مشاہدہ بیان کرتے ہوئے ذکر کرتے ہیں کہ

« وَ إِنَّا قَد حَفِظنَا أَن قَد فَاتَت رِجَالًا مَعَهُ الصَّلٰوةُ فَصَلَّوا بِعِلمِهٖ مُنفَرِدِينَ، وَ قَد كَانُوا قَادِرِينَ عَلٰى اَن يَّجمَعُوا، وَ أَن قَد فَاتَتِ الصَّلٰوةُ فِي الجَمَاعَةِ قَومًا، فَجَاؤُا المَسجِدَ فَصَلّٰى كُلُّ وَاحِدٍ مِّنهُم مُنفَرِدًا، وَ اِنَّمَا كَرِهُوا لِئَلَّا يَجمَعُوا فِي مَسجِدٍ

---

① معجم الكبير للطبراني، رقم: ٩٣٨٠) بسند حسنٍ عن ابراهيم

② معجم الاوسط للطبراني، رقم :٤٧٣٩، و قال الهيثمي: و رِجَالُهٗ ثِقَاتٌ وَ قَالَ الاِمَامُ ناصر الدين الالباني في تمام المنّة و هو حَسَنٌ، ص:١٥٥

مَرَّتَينِ » [1]

''ہم نے یہ بات خوب یادرکھی ہے کہ ان میں سے جو آدمی جماعت سے رہ جاتے، وہ آپ کے علم کے باوجود الگ الگ نماز ادا کرتے۔ حالانکہ انھیں جماعت کرانے پر قدرت حاصل تھی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انھوں نے ایک مسجد میں دومرتبہ جماعت کرانے کو مکروہ سمجھا تھا۔''

چنانچہ اس مسئلہ پر امام شافعی رحمہ اللہ کا اپنا فتویٰ بھی پڑھنے کے قابل ہے فرماتے ہیں: کہ

''اگر کسی مسجد میں امام راتب ہو اور کسی آدمی یا چند آدمیوں کی نماز باجماعت فوت ہو جائے تو انھیں الگ الگ پڑھنی چاہیے۔ مجھے یہ بات پسند نہیں کہ وہ جماعت کرائیں۔ اگر وہ جماعت کرائیں تو نماز ہو جائے گی۔...... میں تو صرف اسی بناء پر دوبارہ جماعت کو پسند نہیں کرتا کہ ہمارے اسلاف کرام (صحابہ وتابعین) رضی اللہ عنہم نے ایسا نہیں کیا بلکہ بعض نے اسے ناپسند کیا ہے۔''

حضرت امام شافعی رحمہ اللہ مزید فرماتے ہیں: کہ میرے خیال میں ان کے مکروہ سمجھنے کی وجہ یہ ہے، کہ مسلمانوں کی جمعیت پارہ پارہ ہو جائے گی اور کوئی ایک یا کئی آدمی جان بوجھ کر جماعت سے پیچھے رہ کر دوسرے امام کے پیچھے نماز ادا کریں گے، تو اس طرح مسلمانوں کا کلمہ متفرق ہو جائے گا اور یہ مکروہ ہے اور میں دوبارہ جماعت کرانے کو اس مسجد میں مکروہ سمجھتا ہوں جہاں امام راتب اور موذّن موجود ہو۔ لیکن جو مسجد راستے پر یا کسی کونے پر ہو اور وہاں امام اور مؤذن متعین نہ ہو اور مسافر وغیر مسافر وہاں نماز ادا کرتے ہوں یا سستا لیتے ہوں، تو وہاں دوبارہ جماعت مکروہ نہیں۔ (انتهى ملخصًا) [2]

امام شافعی اور جمہور علمائے اسلام کے موقف کے حق میں علامہ ناصر الدین البانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

« وَ بِالْجُملَةِ فَالجَمهُورُ عَلٰى كَرَاهَةِ إِعَادَةِ الجَمَاعَةِ فِي المَسجِدِ بِالشَّرطِ السَّابِقِ. وَ هُوَ الحَقُّ، وَ لَا يُعَارِضُ هٰذَا الحَدِيثُ المَشهُورُ (أَلَا رَجُلٌ يَتَصَدَّقُ عَلٰى هٰذَا فَيُصَلِّي مَعَهُ) » [3]

''خلاصہ یہ ہے کہ ائمہ دین کی اکثریت شرطِ سابق کے ساتھ ایک مسجد میں (ایک نماز) کی دوبارہ جماعت کو مکروہ کہتے ہیں اور یہی حق ہے اور مشہور حدیث جس میں ذکر ہے کہ کوئی کھڑا ہو اور اس پر صدقہ کرے کہ اس کے ساتھ نماز ادا کرے۔ اس فتوے کے معارض نہیں ہے۔''

---

[1] كتاب الام:١/١٣٦

[2] كتاب الأمّ:١/١٣٦-١٣٧

[3] تمام المنة، ص ١٥٥

آگے لکھتے ہیں کہ اس حدیث میں زیادہ سے زیادہ یہ ثابت ہوتا ہے، کہ آنحضرت ﷺ نے ان صحابہ(رضی اللہ عنہم) میں سے جو آپ کے ساتھ نماز ادا کر چکے تھے کسی ایک کو ترغیب دلائی کہ وہ اس آدمی کے پیچھے نفل ادا کرے تو یہ مسئلہ مفترض کے پیچھے متنفل کی نماز کا ہے اور بحث اس مسئلہ میں ہے، کہ آیا مفترض کی نماز مفترض آدمی کے پیچھے دوبارہ جماعت کی شکل میں جائز ہے یا نہیں؟ اور اس صورت کو " یَتَصَدَّقُ عَلٰی هٰذَا " والی شکل پر قیاس کرنا، کئی وجوہات سے قیاس مع الفارق ہے۔"

اس مسئلے کے متعلق دَورِ حاضر کے جلیل القدر محدث اور نامور مفکر اسلام علامہ احمد محمد شاکر مصری رحمہ اللہ کا موقف بھی پڑھنے کے قابل ہے۔ آپ امام شافعی کی تائید کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

اس مسئلے میں صحیح اور جلیل القدر موقف امام شافعی کا ہے اور دور رَس نگاہ، گہرا فہم، اسلام کے مقاصد اور اس کی روح کا گہرا مشاہدہ کرنے والی عقل اسی موقف کے درست ہونے کی خبر دیتی ہے۔

کیونکہ اسلام کا پہلا بلکہ اعلیٰ اور اشرف مقصد، کلمۃ اللہ کو بلند کرنا اور اس کے لیے مسلمانوں کے دلوں کو ایک کلمے اور ایک مقصد پر جمع کرنا ہے۔ نماز با جماعت ادا کرنے اور صفوں کو درست رکھنے میں بنیادی حکمت یہی ہے۔ حضرت رسولِ مقبول ﷺ نے فرمایا:

« لَتُسَوُّنَّ صُفُوفَكُم، أَو لَيُخَالِفَنَّ اللّٰهُ بَينَ وُجُوهِكُم. » ①

''تم اپنی صفیں درست کرو ورنہ اللہ تمہارے درمیان اختلاف ڈال دے گا۔''

اور اسلام کے اس مقصد کا ادراک وہی کر سکتا ہے جس کی بصیرت کو اللہ نے "تفقه فی الدین" اور بحرِ شریعت کے موتی چننے اور اس کے اعلیٰ مقاصد تک رسائی حاصل کرنے کے لیے روشن کر رکھا ہو۔ جیسے امام شافعی اور جمہور ائمہ دین۔ (رحمہم اللہ)

اور مسلمانوں نے اپنی نمازوں کے کئی کئی جماعتوں کے نتائج آنکھوں سے دیکھ لیے ہیں اور اپنی صفوں کے اضطراب کو محسوس کر لیا ہے اور اپنے ہاتھوں سے چھو بھی لیا ہے۔ ہاں! جس شخص کے حواس باطل اور ناکارہ ہو چکے ہیں اور جس کی آنکھ پر اللہ نے پردہ ڈال دیا ہے اس کے لیے یہ المیہ کوئی بڑی چیز نہیں ہے۔

آپ بارہا مسلمانوں کی مساجد میں داخل ہو کر دیکھتے ہوں گے کہ ایک قوم جماعت ترک کر کے گوشے میں بیٹھی ہوتی ہے۔ وہ اپنے خیال میں سنت کی طلب میں اپنے لیے الگ جماعت کرواتی ہے اور سمجھتی ہے کہ ہماری جماعت دوسرے کی جماعت سے افضل ہے۔ اگر یہ قوم واقعی اپنے دعوے میں سچی ہو تو بھی انھوں نے

① صحیح مسلم، بَابُ تَسوِيَةِ الصُّفُوفِ، وَإِقَامَتِهَا......الخ، رقم:٤٣٦

الگ جماعت کروا کر ایسا گناہ کیا جو ان کی اصل نماز کا ثواب بھی لے گیا اور انھیں یہ بات قطعاً نفع نہ دے گی کہ فلاں مسلک یا جماعت کے لوگ سنن یا مندوبات کے تارک ہیں۔

آپ بعض ایسے لوگوں کو بھی دیکھیں گے کہ وہ مسلمانوں کی مساجد سے علیحدہ ہو جاتے ہیں اور مسلمانوں میں تفریق ڈالنے اور انھیں دکھ دینے کے لیے الگ مسجدیں بناتے ہیں۔ ہم اللہ سے نیکی کی توفیق اور گناہ سے بچنے کا سوال کرتے ہیں اور یہ بھی سوال کرتے ہیں کہ وہ ہمیں اپنے کلمے پر متحدہ ہونے کی ہدایت دے۔ کیونکہ وہ دعا سننے والا ہے۔ [1]

باقی رہا حضرت انس رضی اللہ عنہ کا فعل تو اس کے متعلق علامہ البانی فرماتے ہیں کہ وہ درجِ ذیل وجوہات کی بناء پر قابلِ استدلال نہیں۔

۱۔ اس لیے کہ وہ موقوف ہے۔

۲۔ ان سے زیادہ فقیہ اور بلند رتبہ والے صحابی حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا عمل ان کے خلاف ہے۔

۳۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا عمل عین سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے موافق ہے۔ [2]

ممکن ہے کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ ایسی مسجد کے پاس سے گزرے ہوں جس میں موذّن یا امام راتب موجود نہ ہو۔ دوسری روایات میں آتا ہے کہ آپ قریباً بیس آدمیوں کے ہمراہ مسجد بنوسلمہ کے پاس سے گزرے تھے تو آپ نے اذان کہلوائی اور جماعت کروائی۔ اس صورت میں باہر سے آنے والے مسافروں کی جماعت کے لیے گنجائش نکل سکتی ہے لیکن مطلقاً نہیں کیونکہ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے ایک مسجد میں ایک نماز کی متعدد جماعتوں کو دستور العمل نہیں بنایا، نہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں اور نہ آپ کی زندگی کے بعد۔ (واللہ أعلم وعلمہ أتم)

مزید وضاحت (از: حافظ ثناء اللہ، مدنی)

مسئلہ ہذا کی جو تصویر عزیز مولانا عبد الجبار سلفی حفظہ اللہ نے پیش کی ہے، واقعی قبیح شکل ہے جس سے موافقت نہیں کی جا سکتی۔ لیکن جہاں تک اصل مسئلہ میں جواز کا پہلو ہے، سابقہ مستندات کے پیشِ نظر اس میں تو کلام نہیں ہونا چاہیے۔ پھر سطور بالا میں علامہ البانی رحمہ اللہ کے حوالہ سے جو اشکال پیش کیا گیا ہے، اس کا جواب علامہ شمس الحق عظیم آبادی رحمہ اللہ کے الفاظ میں ملاحظہ فرمائیں! ''اگر کوئی یہ شبہ پیش کرے، کہ یہاں پر اقتداء

---

[1] تعلیقات سنن ترمذی: ۱/ ۴۳۱

[2] تمام المنّة علی فقه السنّة، ص: ۱۵۶

متنفل کی مفترض کے ساتھ پائی گئی اور اس میں کلام نہیں۔ گفتگو اس میں ہے کہ اقتداء مفترض کی مفترض کے ساتھ مسجد واحد میں بہ تکرار جماعت جائز ہے یا نہیں؟

تو اس کا جواب یہ ہے کہ

« أَقْوَالُ رَسُولِ اللّٰهِ ﷺ أَلَا رَجُلٌ يَتَصَدَّقُ عَلٰى هٰذَا فَيُصَلِّي مَعَهُ ، وَ أَيُّكُم يَتَّجِرُ عَلٰى هٰذَا ، وَ مَنْ يَتَّجِر عَلٰى هٰذَا فَيُصَلِّي مَعَهُ، وَ أَلَا رَجُلٌ يَقُومُ فَيَتَصَدَّقُ عَلٰى هٰذَا فَيُصَلِّي مَعَهُ.»[1]

عموم پر دلالت کرتے ہیں، خواہ مقتدی متصدق متنفل ہو یا مفترض اور اگرچہ اس واقعۂ خاص میں متصدق اس کا متنفل ہوا، مگر یہ خصوصی مورد قادحِ عموم کا نہ ہوگا۔

اوّل اس پر یہ ہے کہ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ جو منجملہ رواۃ اس حدیث کے ہیں، انھوں نے بھی یہی عموم سمجھا۔ چنانچہ انھوں نے بعد وفاتِ رسول اللہ ﷺ کے جماعت ثانیہ اقامت کے ساتھ قائم کی اس مسجد میں جہاں جماعت اولیٰ ہو چکی تھی۔ صحیح بخاری کے "باب فضل صلاۃ جماعة" میں ہے:

« وَ جَاءَ أَنَسٌ إِلٰى مَسْجِدٍ قَد صُلِّيَ فِيهِ. فَأَذَّنَ، وَ أَقَامَ، وَ صَلّٰى جَمَاعَةً » إِنْتَهٰى.[2]

پھر حافظ ابن حجر رحمہ اللہ اس کا وصل نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں: حاصل کلام یہ ہوا کہ سات صحابہ حضرت ابوسعید خدری، انس بن مالک، عصمہ بن مالک، سلمان، ابوامامہ، ابوموسیٰ اشعری اور الحکم بن عمیر رضی اللہ عنہم نے اس واقعہ کو رسول اللہ ﷺ سے روایت کیا۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ بموجبِ ارشاد رسول ﷺ ساتھ اس کے نماز پڑھنے لگے اس مسجد میں جہاں جماعت اولیٰ ہو چکی تھی اور اطلاق اس پر جماعت کا ہوگا کیونکہ "اَلإِثنَانِ فَمَا فَوقَهُمَا جَمَاعَةٌ " اور حضرت انس رضی اللہ عنہ نے بعد وفاتِ رسول اللہ ﷺ کے اس پر عمل کیا جیسا کہ مسند ابویعلی موصلی، ابن ابی شیبہ اور بیہقی کی روایت سے معلوم ہوا اور امام احمد بن حنبل اور اسحاق بن راہویہ کا بھی یہی مذہب ہے۔ جیسا کہ جامع ترمذی میں مذکور ہے اور یہی مذہب صحیح وقوی ہے کہ تکرارِ جماعت بلا کراہت جائز ہے اور فقہاء حنفیہ بھی اس بات کے قائل ہیں کہ تکرارِ جماعت ساتھ اذان ثانی کے اس مسجد میں کہ امام و مؤذن وہاں مقرر ہوں مکروہ ہے اور تکرار اس کا بغیر اذان کے مکروہ نہیں۔ بلکہ امام ابو یوسف سے منقول ہے، کہ اگر جماعت ثانیہ ہیئت اولیٰ پر نہ ہو، تو کچھ کراہت نہیں اور

---

[1] السنن الكبرٰى للبيهقى، بَابُ الْجَمَاعَةِ فِي مَسْجِدٍ قَدْ صُلِّيَ فِيهِ إِذَا لَمْ ......الخ، رقم:٥٠١٢، ٥٠١٣

[2] صحيح البخارى، بَابُ فَضْلِ صَلَاةِ الْجَمَاعَةِ قبل رقم٦٤٥

محراب سے عدول کرنے سے ہیئت بدل جاتی ہے۔ فتاویٰ مولانا شمس الحق عظیم آبادی صفحہ:۱۷۵ تا ۱۷۷، حنفی مذہب کی تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو! (بحر الرائق شرح کنز الدقائق) "شرح منیة المصلی" اور "طوالع الأنوار حاشیه درالمختار" وغیرہ۔ واضح ہو کہ حضرت ابن مسعود اور انس رضی اللہ عنہما کے اعمال میں سے چونکہ ہر ایک کو مرفوع روایات کی تائید حاصل ہے۔ لہٰذا دونوں طرح جواز ہے نیز آپ ﷺ کا فرمان "صلوة الجماعة تفضل صلاة الفذ......" الخ عام ہے۔

سوال: اکثر اہلِ حدیث مساجد میں جماعت کے بعد آنے والے حضرات اپنی دوبارہ جماعت کراتے ہیں۔ کیا یہ لوگ پہلی جماعت کے برابر ثواب کے مستحق ہیں۔ نیز ایک نماز کے لیے زیادہ سے زیادہ ایک ہی مسجد میں کتنی بار جماعت سے نماز ادا کی جا سکتی ہے؟

جواب: بلا عذر پہلی جماعت سے غیر حاضر نہیں رہنا چاہیے اس کا ثواب زیادہ ہے۔ کیونکہ یہ اصل ہے بعد میں جماعت کرانے والے بھی اجر و ثواب سے محروم نہیں رہیں گے جماعتوں کی تعداد کی کوئی حد بندی نہیں۔

سوال: کیا اوّل وقت جماعت کے ساتھ نماز ادا کرنا بہتر ہے یا دوسری جماعت کرانا جب کہ امام بھی کلین شیو ہو۔ ہماری مسجد میں کثرت کے ساتھ یہ عمل کیا جاتا ہے اور کہتے ہیں کہ دوسری جماعت کا ثبوت ملتا ہے۔

جواب: اصلاً اوّل وقت پہلی جماعت کے ساتھ ہی ملنے کا اہتمام ہونا چاہیے اور دوسری جماعت کے انعقاد میں اگرچہ علماء کا اختلاف ہے، لیکن بظاہر جواز ہے۔ صحیح بخاری کے ''ترجمة الباب'' میں قصہ انس اور بعض روایات اس امر کی واضح ادلّہ ہیں۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو! ''فتاویٰ شمس الحق''، لیکن کلین شیو امام کی اقتداء میں نماز نہیں پڑھنی چاہیے۔ حدیث میں ہے «اِجعَلُوا اَئِمَتَکُم خِیَارَکُم» [1] اور دوسری جماعت کا اہتمام کثرت سے کرنا سلف سے ثابت نہیں یہ محض ناگہانی ضرورت کی بناء پر ہے۔

سوال: چند آدمی عشاء کی نماز کے بعد آئے اور انھوں نے جماعت ثانیہ شروع کر دی۔ تھوڑی دیر بعد تراویح کی جماعت کھڑی ہو گئی۔ کیا تراویح کی جماعت کھڑی ہونے کے بعد فرضی نماز پڑھنے والوں کو نماز توڑ کر تراویح پڑھنے والوں کے ساتھ مل کر نمازِ عشاء پڑھنا واجب تھا یا وہ اپنی جماعت برقرار رکھتے؟ سنا ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پہلے الگ الگ ٹولیوں کی شکل میں تراویح ایک ہی مسجد میں باجماعت پڑھتے تھے۔ اگر یہ بات درست ہے تو پھر فرض پڑھنے والوں کو جماعت سے روکنا ناجائز ہے۔ ''جب اقامت ہو جائے تو فرضی نماز کے سوا اور کوئی نماز نہیں۔'' اس حدیث میں لفظ "المکتوبة" استعمال ہوا ہے۔ تراویح پڑھنے والوں کا

---

[1] سنن الدار قطنی، بَابُ تَخفِیفِ القِرَاءَۃِ لِحَاجَةٍ، رقم: ۱۸۸۱

اصرار کرنا کہ فرض پڑھنے والے ہمارے ساتھ شریک ہوں، درست معلوم نہیں ہوتا۔

(جواب) : نمازِ عشاء کی جماعت ثانیہ (دوسری جماعت) والے بایں صورت نماز کو جاری رکھیں اور نمازِ تراویح پڑھنے والے اپنی جگہ مصروف رہیں۔ اس میں کوئی حرج نہیں، لیکن آوازوں کے ٹکراؤ سے احتراز ہونا چاہیے، کیونکہ اس سے خشوع وخضوع میں فرق آتا ہے، جو نماز کا مغز ہے اور اگر ایسی صورت نہ ہو، تو پھر فرضی نماز والے کو امام تراویح کی اقتداء میں نماز پڑھنی چاہیے۔ قصۂ معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ اس امر کی واضح دلیل ہے، جو صحیح احادیث میں موجود ہے، وہ مسجد نبوی میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اقتداء میں عشاء کی نماز ادا کرتے اور پھر اپنی قوم کی امامت کراتے تھے۔ بالفرض اگر کوئی عمداً اس صورت کو اختیار نہ کرتے ہوئے امام تراویح سے علیحدہ جماعت کرالے یا انفرادی طور پر نماز پڑھ لے تو نماز ان شاء اللہ درست ہوگی۔ قطعی ممانعت کا تصور صرف اس کے لیے ہے جس نے وہی فرض نماز پڑھنی ہو جسے امام پڑھا رہا ہے۔ نوافل یا تراویح کی علیحدہ علیحدہ کئی جماعتوں کی شکل ایک امام پر جمعِ عمر رضی اللہ عنہ سے پہلے موجود تھی۔ جس کا کسی نے انکار نہیں کیا۔ آج کے دور میں بھی ایسی صورتیں ایامِ رمضان میں حرمین شریفین میں پیش آتی رہتی ہیں۔

(سوال) : ہمارے مولوی صاحب کہتے ہیں کہ جو آدمی پانچوں نمازیں باجماعت ادا کرتا ہو، وہ کبھی کسی مجبوری کی وجہ سے جماعت سے رہ جائے تو دوسری جماعت کرواسکتا ہے ورنہ دوسری جماعت ہر دیر سے آنے والا نہیں کرواسکتا۔ کیا یہ موقف درست ہے اور دوسری جماعت کروانے کے لیے دوبارہ تکبیر کہنی چاہیے یا نہیں؟

(جواب) : دوسری جماعت کروانا جائز ہے۔ صحیح بخاری کے ''ترجمۃ الباب'' میں ہے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ ایک مسجد کی طرف آئے۔ وہاں جماعت ہو چکی تھی۔ اذان اور اقامت کہہ کر جماعت کرائی۔ «بَابُ فَضلِ صَلٰوةِ الجَمَاعَةِ.»

اس سے معلوم ہوا کہ دوسری جماعت کے لیے اقامت بھی ہے۔ واضح ہو مومن کی شان ہے، کہ وہ بلا وجہ جماعت سے لیٹ نہیں ہوتا۔ ممکن ہے مولوی صاحب کا مقصود ترغیب وترہیب ہو۔ ورنہ ہر دو صورت میں جواز میں کوئی کلام نہیں ملاحظہ ہو! ترمذی: «بَابُ مَا جَاءَ فِي الجَمَاعَةِ فِي مَسجِدٍ قَد صُلِّيَ فِيهِ مَرَّةً.»

(سوال) : اصل جماعت ہوگئی ہے۔ لیٹ آنے والوں کو دوسری جماعت کروانی چاہیے۔ یا اپنی اپنی پڑھ لیں؟ پہلی جماعت اور دوسری جماعت کے اجر میں کیا فرق ہوگا؟ اس طرح تیسری اور چوتھی کب تک اور جماعتیں کروائی جاسکتی ہیں؟

(جواب) : پہلی جماعت کے فوت ہونے کی صورت میں دوسری کا جواز احادیث سے ثابت ہے۔ ملاحظہ ہو!

(ترجمۃ الباب) صحیح بخاری۔ اصل اجر وثواب تو پہلی جماعت کے لیے ہے۔ شرعی عذر کی صورت میں پیچھے رہ گیا ہو، تو اللہ پورا ثواب مرحمت کردیں گے۔ طویل سلسلہ جماعات کا بھی یہی حکم ہے۔

سوال: ایک آدمی ایک مسجد میں باجماعت نماز ادا کرے اور کسی کام کی بناء پر دوسری مسجد میں جائے اور وہاں بھی جماعت ہو رہی ہو تو کیا وہ وہاں بھی جماعت کے ساتھ نماز پڑھے؟ قرآن وسنت کی روشنی میں مدلل رہنمائی فرمائیں۔

جواب: باجماعت ادا شدہ نماز دوبارہ پڑھ لینی چاہیے۔ چنانچہ ''سنن ابی داؤد'' میں حدیث ہے:

« اِذَا صَلّٰی اَحَدُکُم فِی رَحلِهٖ، ثُمَّ اَدرَكَ الاِمَامَ وَ لَم يُصَلِّ. فَليُصَلِّ مَعَهٗ. فَاِنَّهَا لَهٗ نَافِلَةٌ. »[1]

''جب ایک تمہارا اپنے مقام پر نماز پڑھ لے۔ پھر امام کو پائے کہ اس نے نماز نہیں پڑھی، تو اس کے ساتھ نماز پڑھنی چاہیے۔ یہ اس کی نفلی بن جائے گی۔''

"عون المعبود" (۲۲۵/۱) میں ہے، کہ اس حدیث میں اس امر کی تصریح ہے، کہ دوسری نفلی اور پہلی فرضی نماز ہوگی۔ چاہے پہلے باجماعت پڑھی ہو یا اکیلے کیونکہ حدیث میں مطلق بیان ہوا ہے۔

سوال: اگر کوئی شخص اپنی فرض نماز تنہا ادا کر رہا ہو، اسی دوران لوگ جماعت ثانیہ کے ساتھ وہاں نماز قائم کریں تو وہ شخص نماز توڑ کر نئے سرے سے جماعت ثانیہ میں شامل ہو یا اسی پہلی نماز پر بناء کر کے جماعت میں شامل ہو جائے۔

جواب: ظاہر یہ ہے کہ ایسی صورت میں اس شخص کو تنہا نماز مکمل کر لینی چاہیے۔ کیونکہ یہ کیفیت اصل بناء کے مطابق ہے۔ تاہم سوال میں مرقومہ دونوں صورتوں میں بھی کوئی حرج معلوم نہیں ہوتا۔

امامت کے آداب وشروط

سپیکر پر نماز پڑھانا درست عمل ہے؟

سوال: حنفی کہتے ہیں کہ امام یا مکبّر کی آواز پر ہی امام کی اقتدا کرنی چاہیے۔ جس نے تکبیر تحریمہ یا دیگر تکبیرات اور رکوع سجدہ لاؤڈ سپیکر کی آواز پر کیا، اس کی نماز فاسد ہو جائے گی، کیونکہ سپیکر بذاتِ خود امام کی اقتدا کی صلاحیت نہیں رکھتا اور جو نماز میں داخل نہ ہو، اس کی آواز پر عمل کرنے سے نماز فاسد ہو جاتی ہے؟

[1] سنن أبی داؤد، بَابٌ فِيمَنْ صَلَّى فِي مَنْزِلِهِ ثُمَّ أَدْرَكَ الْجَمَاعَةَ يُصَلِّي مَعَهُمْ، رقم: ٥٧٥

(جواب) سپیکر پر نماز پڑھانا درست عمل ہے، کیونکہ یہ محض آواز کے دور تک پہنچانے کا ایک آلہ ہے جو معاون کی حیثیت رکھتا ہے، اصل اقتدا تو امام یا سامع ہے۔ اس کے جواز میں کوئی کلام نہیں ہونی چاہئے، آج کل معتدل احناف کا عمل بھی اسی پر ہے۔

مسجد کے سپیکر پر آواز سن کر عورت کا گھر میں امام مسجد کی اقتداء کرنا:

(سوال) : الاعتصام کی کسی سابقہ اشاعت میں پڑھا ہے کہ مسجد کے سپیکر پر آواز سن کر عورت کا گھر میں امام مسجد کی اقتداء میں نماز ادا کرنا درست نہیں، فاصلہ زیادہ ہونے کی وجہ سے اقتداء میں خلل پڑتا ہے۔

اگر امام کے نظر نہ آنے کی وجہ سے ہے تو ہمارے محلے کی مسجد میں جس جگہ امام نماز پڑھاتا ہے، اس سے اوپر والی منزل والے اور مسجد میں نماز پڑھنے والی عورتیں نیچے نہ تو امام یا مقتدیوں کو دیکھ سکتے ہیں اور نہ سپیکر کے بغیر امام کی آواز سن سکتے ہیں۔ اگر کبھی بجلی بند ہو جانے کی وجہ سے سپیکر پر امام کی آواز سنائی دینا بند ہو جائے تو اس وقت کوئی تکبیر وغیرہ کے ذریعے دوسرے نمازیوں کو آگاہ بھی نہیں کرتا۔ ایسی مسجد میں امام کی اقتداء کرنے والوں اور گھر میں امام کی اقتداء کرنے والیوں کی حالت اقتدا ایک جیسی ہے۔ اب کیا آپ ان دونوں پر ایک ہی حکم لگائیں گے؟ خیال رہے کہ امام کو شاذ و نادر ہی سہو ہوتا ہے اور عام حالات میں آواز سن کر بخوبی اقتداء کی جاسکتی ہے۔

(جواب) : مسجد میں بجلی بند ہو جانے کی صورت میں بآواز بلند تکبیر کے ذریعہ دوسرے نمازیوں کو آگاہ کرنا چاہیے۔ امام یا مکبّر کے سہو یا عدمِ سماع کی صورت میں عورتیں خود اپنی نماز مکمل کر لیں اقتداء ان کی درست ہے جبکہ سابقہ مشار الیہ صورت میں اقتداء ہی غیر درست ہے۔ شاذ و نادر حالت کو عمومی حالت پر قیاس کرنا ویسے بھی صحیح نہیں لہٰذا دونوں حالتوں میں فرق واضح ہے۔ ویسے اصل یہ ہے کہ عورتوں کو امام نظر آنا چاہیے۔ ملاحظہ ہو فتاویٰ اسلامیہ (۵/۲)

امام اور مقتدیوں کے درمیان دیوار، سُترہ، نہر یا راستے وغیرہ کے فاصلے پر نماز پڑھنا:

(سوال) : خواتین نے تقریباً ۱۰۰ میٹر دور ایک مسجد سے الاؤڈ سپیکر کی تار کے ذریعے جمعہ کی باجماعت نماز ادا کرنے کا اہتمام کیا ہے۔ امام یا خطیب کی آواز صاف سنائی دیتی ہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ کیا یہ طریقہ درست ہے کہ مسجد سے باہر ایسا اہتمام کر لیا جائے؟ یہاں اعتبار فاصلے کا ہوگا یا صف کے ساتھ صف کے اتصال کا؟

(جواب) امام اور مقتدیوں کے درمیان دیوار، سُترہ، نہر یا راستے وغیرہ کے فاصلے پر نماز پڑھی جاسکتی ہے۔ امام

بخاریؒ نے اپنی ''صحیح'' میں آثار واقوال اور حدیث سے اس بات کو ثابت کیا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

« بَابُ اِذَا کَانَ بَینَ الِامَامِ، وَ بَینَ القَومِ حَائِطٌ، اَو سُترَۃٌ . وَ قَالَ الحَسَنُ: لَا بَأسَ أَن تُصَلِّیَ ، وَ بَینَكَ ، وَ بَینَهٗ نَهرٌ. وَ قَالَ اَبو مِجلَز: یَاتَمُّ بِالاِمَامِ، وَ اِن کَانَ بَینَهُمَا طَرِیقٌ، اَو جِدَارٌ ، اِذَا سَمِعَ تَکبِیرَ الاِمَامِ.»

مشارالیہ فاصلہ کوئی زیادہ معلوم نہیں ہوتا۔ لہٰذا بایں صورت باجماعت نماز پڑھی جاسکتی ہے، بشرطیکہ عورتیں امام سے آگے نہ ہوں۔

سوال ہمارے گھر سے تھوڑے فاصلے پر مسجد ہے جہاں جمعہ کی نماز سپیکر لگا کر پڑھتے ہیں، میری والدہ گھر میں سپیکر کی آواز پر امام کی اقتداء میں نماز پڑھتی ہیں۔ یعنی وہ ظہر کی نماز ادا نہیں کرتیں۔ کیا اس طرح کرنا درست ہے؟

جواب گھر میں امام مسجد کی اقتداء میں جمعہ یا کوئی دوسری نماز نہیں پڑھنی چاہیے۔ کیونکہ فاصلہ زیادہ ہے جس سے اقتداء میں خلل واقع ہونے کا اندیشہ ہے۔ لہٰذا گھر میں بمطابق عادت اپنی تمام نمازیں الگ پڑھنی چاہئیں۔

حضور ﷺ نے ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پیچھے نماز پڑھی یا آپ ﷺ کی اقتداء میں ابوبکرؓ نے؟

سوال: جب نبی کریم ﷺ نے اپنے آخری وقت میں ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ نماز پڑھائیں تو ابوبکر رضی اللہ عنہ نے نماز پڑھانی شروع کی بعد میں آپ ﷺ بھی آ کر نماز میں شامل ہو گئے۔ آیا حضور ﷺ نے ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پیچھے نماز پڑھی یا حضور ﷺ کی اقتداء میں ابوبکر رضی اللہ عنہ نے پڑھی اور ابوبکر کی اقتداء میں سب مقتدیوں نے پڑھی؟ اس کا جواب مدلل ارسال کریں۔

جواب: مسئلہ ہذا میں اہلِ علم کا سخت اختلاف ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے، کہ اس سلسلہ میں وارد روایات مختلف ہیں۔ اسی بناء پر علماء کے مذاہب بھی مختلف ہیں۔ بعض نے مسلکِ ترجیح کو اختیار کیا ہے، کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ ماموم تھے۔ اس روایت کی بناء پر کہ جس میں اس امر کی تصریح موجود ہے۔ اس لیے بھی کہ راویٔ حدیث ابومعاویہ نے اپنی روایت میں تصریح کی ہے، کہ

« یَقتَدِی أَبُو بَکرٍ بِصَلٰوۃِ رَسُولِ اللّٰهِ ﷺ ، وَالنَّاسُ یَقتَدُونَ بِصَلَاۃِ أَبِی بَکرٍ.» (1)

''ابوبکر رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کی نماز کی اقتداء کر رہے تھے اور لوگ ابوبکر رضی اللہ عنہ کی نماز کی اقتداء کر

(1) صحیح البخاری، بَابٌ: الرَّجُلُ یَأْتَمُّ بِالإِمَامِ وَیَأْتَمُّ النَّاسُ بِالْمَأْمُومِ، رقم:۷۱۳

رہے تھے۔"

اور بعض نے اس کے برعکس مسلک اختیار کیا ہے، کہ ابوبکر امام تھے۔ جب کہ بعض جمع کے قائل ہیں۔ ان میں سے ابن حبان، بیہقی، ابن حزم رحمہم اللہ ہیں۔ انھوں نے اس قصہ کو تعدد پر محمول کیا ہے، کہ بعض دفعہ ابوبکر رضی اللہ عنہ امام تھے اور بعض دفعہ مأموم۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے اختلافِ نقل بھی اس کی مؤید ہے۔ لیکن راجح بات یہ ہے، کہ قصہ ایک ہے اور امامت میں اختلافِ رُواۃ کا تصرف ہے۔ اس سلسلہ میں وارد روایات کے طُرق سے یہ بات عیاں ہے۔ شیخین "بخاری" "مسلم کے اندازِ بیان اور طریقِ کار سے ظاہر ہے، کہ انھوں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث کے تمام وہ طُرق ذکر کیے جن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی امامت کا ذکر ہے۔ اس کے باوجود اس سے اختلاف کرنے والے رُواۃ بھی ثقہ ہیں۔ انھوں نے حضرت انس رضی اللہ عنہ کی حدیث سرے سے ذکر ہی نہیں کی۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: کہ امام شافعی رحمہ اللہ نے اس بات کی تصریح کی ہے، کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مرض الموت میں صرف ایک دفعہ نماز مسجد میں پڑھی ہے۔ یہ وہی ہے کہ جس کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیٹھ کر پڑھا تھا۔ اس میں ابوبکر رضی اللہ عنہ پہلے امام تھے۔ بعد میں مأموم بن گئے اور وہ لوگوں تک تبلیغِ تکبیر کے "مُبلِّغ" تھے۔ ابن عبد البر رحمہ اللہ نے کہا ہے، کہ صحیح آثار سے معلوم ہوتا ہے، کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم امام تھے۔ (1)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی آخری نماز کونسی تھی؟

سوال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زندگی میں جو آخری نماز باجماعت پڑھائی، وہ کون سی تھی؟

جواب ظہر کی نماز۔ (2)

جلد باز امام کے ساتھ باجماعت نماز یا انفرادی نماز خشوع سے؟

سوال: آج کل اکثر مساجد میں "نان سٹاپ" امام ہوتے ہیں جو اتنی جلدی جلدی جماعت کرواتے ہیں کہ آدمی پیچھے سورت فاتحہ نہیں پڑھ سکتا۔ کیا جو آدمی اسے چھوڑ کر انفرادی نماز خشوع وخضوع سے پڑھے گا، اس کی نماز ہو جائے گی؟ یا وہ جماعت سے ہی نماز پڑھے؟

جواب: حتی المقدور امام کی اقتداء میں نماز ادا کرنی چاہیے۔ جلد باز امام کو سمجھانا چاہیے۔ قرآن عظیم میں ہے: ﴿ وَ ذَكِّرْ فَاِنَّ الذِّكْرٰى تَنْفَعُ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴾ (الذاريات:٥٥)

---

(1) مرعاة المفاتيح:٢/١٢٦-١٢٧

(2) بخاري مع فتح الباري:٢/١٧٥، باب انما جعل الامام ...... الخ

''اور نصیحت کرتے رہو۔نصیحت مومنوں کو نفع دیتی ہے۔''

اس کے باوجود اگر وہ اپنی حرکاتِ شنیعہ (بُری حرکات) سے باز نہ آئے، تو دوسری مسجد کا رُخ اختیار کرلینا چاہیے۔

یاد رہے بعض لوگوں کی عادت ہے، کہ وہ بلا وجہ ہی قرأت میں ٹھہراؤ پیدا کرتے چلے جاتے ہیں۔ یہ بات درست نہیں۔ امام کے فرائض میں سے ہے کہ "من حيث المجموع" وہ اپنے کمزور، ناتواں اور حاجت مند مقتدیوں کا لحاظ رکھتے ہوئے درمیانی نماز پڑھائے۔ حدیث میں ہے:

« فَإِنَّ فِيهِمُ الضعِيفَ ، وَالكَبِيرَ ، وَذَا الحَاجَةِ » [1]

''مقتدیوں میں کمزور، بوڑھے اور حاجت مند بھی ہوتے ہیں۔''ان کا خیال رکھا جائے۔''

سوال: میں ایک ایسے علاقے میں رہائش پذیر ہوں، جہاں کوئی بھی اہلحدیث مسجد نہیں ہے۔گھر کے نزدیک دو مساجد ہیں ان میں سے ایک کا تعلق مکتب دیوبند سے ہے اور دوسری کا تبلیغی جماعت سے۔ آپ سے پوچھنا یہ ہے کہ کیا میں ان مساجد میں ان کے اماموں کے پیچھے باجماعت نماز ادا کرسکتا ہوں کہ نہیں۔

جواب: تقلیدِ شخصی کو شرعی حکم سمجھنے والے کو مستقلاً امام نہیں بنانا چاہیے، کیونکہ اس صورت میں یہ اہل بدعت سے شمار ہوسکتا ہے، اور اہل بدعت کی اقتداء کو مستقل طور پر اختیار نہیں کیا جاسکتا۔ البتہ ان کی اقتداء میں نماز پڑھنے کا موقع آجائے تو نماز ہوجائے گی۔ صحیح بخاری کے ''ترجمۃ الباب'' میں حضرت حسن بصری رحمہ اللہ کا قول ہے:" صَلِّ وَ عَلَيهِ بِدعَتُهُ " یعنی ''تو بدعتی کی اقتداء میں نماز پڑھ لے۔ اس کی بدعت کا وبال اس کی جان پر ہے۔''

یاد رہے کہ بدعت مُکَفِّرَۃ کفر تک لے جانے والی یا مُخرِج عَنِ المِلَّة (ملت سے نکال دینے والی) کسی امام میں پائی جائے تو اس کے پیچھے نماز قطعاً نہیں ہوگی۔ جیسے کوئی قرآن کو کلامِ الٰہی کے بجائے مخلوق سمجھتا ہے یا ذاتِ الٰہی کی صفات کو مخلوق پر قیاس کرتا ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔

لہٰذا سائل کو چاہیے کہ حتی المقدور اپنی باجماعت ادائیگیٔ نماز کا علیحدہ بندوبست کرے۔ اس کے لیے کوئی بھی مناسب جگہ مقرر ہوسکتی ہے، چاہے گھر میں ہی کیوں نہ ہو۔ حدیث میں ہے:

[1] صحيح البخاری، بَابُ تَخْفِيفِ الإِمَامِ فِي القِيَامِ، وَإِتْمَامِ الرُّكُوعِ وَالسُّجُودِ، رقم:٧٠٢، سنن ابن ماجه، بَابُ مَنْ أَمَّ قَوْمًا فَلْيُخَفِّفْ، رقم:٩٨٤

« وَ جُعِلَت لِیَ الاَرضُ مَسجِدًا وَ طَھُورًا »[1]

(سوال): نمازی بیمار یا کمزور ہے یا موسم شدید ہے اہلِ حدیث کی مسجدیں دور ہیں۔ مقلدین حنفی دیو بندی کی مسجد قریب ہے ان حالات میں نمازی کو حنفی، دیو بندی امام کے پیچھے (باجماعت) نماز پڑھنے کو ترجیح دینا چاہیے یا اکیلے اپنے گھر یا دوکان میں نماز پڑھنے کو۔ یاد رہے کہ عام نمازی کو دیو بندی امام یا مقتدی، منفرد یا باجماعت نماز پڑھنے سے نہ منع کرتے ہیں نہ کوئی رکاوٹ و بحث کرتے ہیں مگر اس خاص نمازی کو انھوں نے کہہ رکھا ہے کہ جب آپ ہماری مسجد میں آکر یا ہمارے پیچھے نماز پڑھیں تو ہماری طرح پڑھا کریں۔

(جواب): مسنون طریقہ سے بامر مجبوری دیو بندی امام کی اقتداء میں نماز پڑھی جا سکتی ہے، لیکن اصل یہ کہ باجماعت نماز کا اہتمام علیحدہ کیا جائے۔ چاہے وہ گھر میں ہو یا کسی اور مناسب مقام پر۔

مقتدی کا امام کے مصلّٰی پر سنتیں پڑھنا:

(سوال): کیا مقتدی امام کے مصلّٰی پر سنتیں پڑھ سکتا ہے؟

(جواب): بعد از جماعت مصلّٰیٔ امامت پر کھڑے ہو کر مقتدی کے لیے سنتیں یا نوافل پڑھنے میں کوئی حرج نہیں، کسی حدیث میں ممانعت وارد نہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ مسجد کے ہر حصے پر نمازی کے لیے نماز پڑھنا مباح ہے، جس میں جائے امامت یا مصلّٰی امامت بھی شامل ہے۔ ہاں البتہ مشاہدہ ہے کہ بعض لوگوں کے نزدیک جائے نماز سے زیادہ مفروش (مصلّٰی) کی تعظیم ہے۔ جب تک مصلّٰی بچھا رہے عظمت قائم ہے۔ جب اٹھا لیا تو کوئی بھی اس جگہ کی پرواہ نہیں کرتا۔ گویا کہ ان جہلاء کے نزدیک اصل عزت مفروش دری وغیرہ کی ہے، نہ کہ جائے اِمامت کی۔ یہ ایک لایعنی فعل ہے۔ شرع میں اس کی کوئی دلیل نہیں۔

کیا گھر میں عورتوں کی امامت کے لیے مرد امام رکھا جا سکتا ہے؟

(سوال): کیا مرد عورتوں کی امامت کروا سکتا ہے؟ عورتیں چونکہ مسجد میں جا کر نماز نہیں پڑھ سکتیں اس لیے اگر وہ گھر میں کسی مرد کی امامت میں نماز پڑھ لیں تو کیسا ہے؟

(جواب): مرد کو چاہیے کہ مسجد میں آکر باجماعت نماز پڑھے۔ عورتوں کی امامت کوئی باصلاحیت عورت کرا سکتی ہے اور اس صورت میں وہ آگے الگ کھڑی ہونے کی بجائے عورت کی صف میں ہی کھڑی ہو گی۔ (قیام

---

[1] صحیح البخاری، بَابُ قَولِ النَّبِیِّ ﷺ: جُعِلَت لِی ......الخ، رقم:٤٣٨، صحیح مسلم، باب جُعلت لی الأرض مسجدًا وطھورًا، رقم: ٥٢١

اللیل، امام مروزی) حضرت اُمّ ورقہ اہل خانہ کی امام تھیں۔ ملاحظہ ہو! (سنن ابو داؤد)[1]

ویسے بھی عورتوں کے لیے باجماعت پڑھنا ضروری نہیں اور ضرورت کی بناء پر مرد بھی عورتوں کی امامت کراسکتا ہے حضرت ابی بن کعب تراویح میں عورتوں کی امامت کراتے تھے۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو! عون المعبود (۱/۲۳۱)

شوہر مقتدی اور بیوی امام:

سوال: ہمارے والد بہت ضعیف ہیں، وہ نماز کے لیے مسجد نہیں جاسکتے۔ میری والدہ نماز وغیرہ کے ضروری مسائل جانتی ہے۔ کیا میرے والد اپنی بیوی کے پیچھے اسے امام بناء کر نماز پڑھ سکتے ہیں؟ اگر پڑھ سکتے ہیں تو کس جگہ کھڑے ہوں گے آگے، پیچھے یا برابر؟

جواب: جب شوہر مقتدی ہو اور عورت امام، تو درمیان میں پردہ کر کے شوہر دائیں طرف برابر کھڑا ہوگا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا فرمان ہے:

« تَستُرُ بَینَكَ وَ بَینَهَا بِثَوبٍ ثُمَّ تُصَلِّی بِحَذَائِكَ »[2]

''عورت اپنے شوہر اور اپنے درمیان کپڑے کا پردہ لٹکالے، پھر اس کے برابر کھڑی ہو کر نماز پڑھائے۔''

سبل السلام میں اُمِ ورقہ کی حدیث کے تحت امیر صنعانی فرماتے ہیں:

« وَالحَدِیثُ دَلِیلٌ عَلٰی صِحَّةِ إِمَامَةِ المَرأَةِ أَهلَ دَارِهَا، وَ إِن كَانَ فِیهِمُ الرَّجُلُ، فَإِنَّهٗ كَانَ لَهَا مُؤَذِّنٌ، وَ كَانَ شَیخًا، كَبِیرًا كَمَا فِی الرِّوَایَةِ. وَالظَّاهِرُ أَنَّهَا كَانَت تَؤُمُّ، وَ غُلَامَهَا، وَ جَارِیَتَهَا.»[3]

عورت کی امامت:

سوال: کیا عورت، عورتوں کی امامت کراسکتی ہے؟ خاص طور پر نمازِ تراویح میں قرآن سنانے کے لیے عورتوں کی جماعت کراسکتی ہے؟ اور اس کا طریقہ کیا ہے؟ یعنی امامت کرانے والی عورت مرد امام کی طرح آگے کھڑی ہوگی یا درمیان صف میں؟ مدلل جواب سے نوازیں انتہائی شکر گزار ہوں گا۔

---

[1] سنن أبی داؤد، بَابُ إِمَامَةِ النِّسَاءِ، رقم:۵۹۲، السنن الکبرٰی للبیهقی، بَابُ إِثبَاتِ إِمَامَةِ الْمَرْأَةِ، رقم:۵۳۵۳

[2] منتخب کنز العمال: ۲/ ۲۰۷

[3] سبل السلام: ۳/ ۹۸

جواب: ''سنن ابی داؤد'' میں حدیث ہے کہ نبی ﷺ نے اُمّ ورقہ بنت عبداللہ بن الحارث کو حکم دیا تھا کہ «أَن تَؤُمَّ أَهلَ دَارِهَا» یعنی ''اپنے اہل بیت کی امامت کرائے۔''[1]

عون المعبود(۱/۲۳۰) میں ہے کہ اس حدیث سے ثابت ہوا کہ عورتوں کی امامت اور ان کی جماعت رسول اللہ ﷺ کے فرمان سے صحیح ثابت ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے عورتوں کی امامت فرض اور تراویح میں کرائی تھی۔

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ "تلخیص الحبیر" میں فرماتے ہیں: ''حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے عورتوں کی امامت کرائی اور ان کے درمیان میں کھڑی ہوئیں۔''[2] اس روایت کو عبدالرزاق نے بیان کیا ہے۔ ان کے طریق سے ''دارقطنی'' اور ''بیہقی'' میں ابوحازم «عَن رَائِطَةَ الحَنفِيَّةِ» اور حضرت عائشہ سے منقول ہے کہ انھوں نے فرض نماز میں عورتوں کی امامت کرائی اور وہ ان کے درمیان تھیں۔ ''ابن ابی شیبہ'' اور حاکم میں ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا عورتوں کی امامت کراتیں، اور صف میں ان کے ساتھ کھڑی ہوتیں اور اُمّ سلمہ رضی اللہ عنہا کی حدیث میں ہے کہ انھوں نے عورتوں کی امامت کرائی اور درمیان میں کھڑی ہوئیں تھیں۔[3]

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے اَلدرایۃ میں ذکر کیا ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا رمضان کے مہینے میں عورتوں کی امامت کراتی تھیں اور ان کے درمیان کھڑی ہوتیں۔

علامہ شمس الحق فرماتے ہیں: ان احادیث سے معلوم ہوا کہ عورت جب عورتوں کی امامت کرائے تو ان کے درمیان کھڑی ہو، آگے کھڑی نہ ہو اور ''سبل السلام'' میں ہے کہ یہ حدیث اس امر کی دلیل ہے کہ عورت کا اپنے گھر والوں کی امامت کرانا درست ہے۔ اگرچہ ان میں آدمی ہو۔ اس لیے کہ اُمّ ورقہ کا مؤذن ایک بوڑھا آدمی تھا جس طرح کہ روایت میں ہے۔ ظاہر یہ ہے کہ یہ اس کی اور اپنے غلام کی اور لونڈی کی بھی امام تھیں۔[4] ابوثور، مزنی اور طبری کے نزدیک عورت کی امامت درست ہے۔ البتہ جمہور اس کے مخالف ہیں۔

ان دلائل سے معلوم ہوا کہ عورت کو فرض نماز کے علاوہ تراویح اور نوافل میں بھی امامت درمیان میں

---

[1] سنن أبی داؤد، بَابُ إِمَامَةِ النِّسَاءِ، رقم:۵۹۲، السنن الکبریٰ للبیهقی، بَابُ إِثْبَاتِ إِمَامَةِ الْمَرْأَةِ، رقم:۵۳۵۳

[2] مصنف عبد الرزاق الصنعانی، بَابُ الْمَرْأَةِ تَؤُمُّ النِّسَاءَ، رقم:۵۰۸۷

[3] المستدرك للحاکم، بَابٌ فِی فَضْلِ الصَّلَوَاتِ الْخَمْسِ، رقم:۷۳۱

[4] سنن أبی داؤد، بَابُ إِمَامَةِ النِّسَاءِ، رقم:۵۹۲، السنن الکبریٰ للبیهقی، بَابُ إِثْبَاتِ إِمَامَةِ الْمَرْأَةِ، رقم:۵۳۵۳

کھڑے ہو کر کرانی چاہیے۔(واللہ اعلم)

بے وضوء امام کی اقتداء میں پڑھی گئی نماز کا اعادہ:

(سوال) حافظ عبداللہ محدث روپڑی رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ ''امام نے بے وضو نماز پڑھائی تو مقتدی کو بھی امام کی طرح نئے سرے سے نماز پڑھنا ہوگی۔'' (فتاویٰ اہلحدیث)

ابن باز رحمہ اللہ وغیرہ ایسے موقعے پر مقتدی کی نماز کو صحیح کہتے ہیں۔ درست مسئلہ کیا ہے؟

(جواب) اس مسئلہ میں شیخ ابن باز رحمہ اللہ کا موقف راجح ہے۔ چنانچہ صحیح بخاری میں حدیث ہے: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: «يُصَلُّونَ لَكُمْ، فَإِنْ أَصَابُوا فَلَكُمْ، وَإِنْ أَخْطَئُوا فَلَكُمْ وَعَلَيْهِمْ»[1] ''وہ تمہیں نماز پڑھائیں گے۔ اگر وہ درستگی کو پہنچے تو تمہاری نماز کا ثواب تمہارے لئے ہے (اور ائمہ کا ثواب ان کے لئے ہے) اور اگر انہوں نے غلطی کی تو تمہاری نماز کا ثواب تمہارے لئے ہے اور ان کی غلطی کا مداوا ان کے ذمہ ہے۔''

امام بخاری نے اس پر یہ عنوان قائم کیا ہے: « بَابُ إِذَا لَمْ يُتِمَّ الإِمَامُ وَأَتَمَّ مَنْ خَلْفَهُ. » ابن منذر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''اس حدیث میں اس آدمی کی تردید ہے جو یہ کہتا ہے کہ امام کی نماز فاسد ہونے سے مقتدی کی نماز بھی فاسد ہو جاتی ہے۔''

اور ''شرح السنۃ'' میں امام بغوی فرماتے ہیں: ''اس حدیث میں اس بات کی دلیل ہے کہ جب کوئی امام بغیر وضو کے لوگوں کو نماز پڑھا دے تو مقتدیوں کی نماز درست ہے اور امام کو نماز لوٹانی پڑے گی۔[2]

اور مؤطا میں باب إعادة الجنب الصلاة میں بسندِ صحیح حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا عمل بھی اسی طرح بیان ہوا ہے۔ اور سنن بیہقی: (۲/۴۰۰) میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور عثمان رضی اللہ عنہ اور مصنف عبدالرزاق (۳۶۵۰) میں ابن عمر رضی اللہ عنہ کا عمل بھی یہی بیان ہوا ہے۔ محدث روپڑی رحمہ اللہ نے جو موقف اختیار کیا ہے، وہ حنفیہ کے مسلک کے مطابق ہے۔ مصنف عبدالرزاق (۳۶۶۱)، دارقطنی (۱/۳۶۹) میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے اس طرح مروی ہے، لیکن اس اثر میں راوی عمرو بن خالد واسطی متروک الحدیث ہے۔ امام احمد نے اس پر جھوٹا ہونے کا الزام لگایا ہے اور حبیب بن ابی ثابت مدلس ہے۔ اس نے اس روایت کو عنعنہ سے بیان کیا ہے۔

نیز واضح ہو کہ موصوفین مرحومین دونوں میرے عظیم اساتذہ میں شمار ہوتے ہیں۔ بالخصوص محدث

---

① صحيح البخاري، بَابُ إِذَا لَمْ يُتِمَّ الإِمَامُ وَأَتَمَّ مَنْ خَلْفَهُ، رقم:٦٩٤

② فتح الباري:١٨٨/٣

روپڑی رحمہ اللہ سے ابتدائی مراحل سے لے کر سالہا سال تک استفادہ کا موقعہ میسر رہا ہے۔(رحمهما الله رحمة واسعة) قارئین کرام ان کے لئے مغفرت کی دعا فرمائیں!

ایک امام کا دوبار جماعت کروانا:

(سوال): کیا ایک امام دوبارہ جماعت کرواسکتا ہے؟ میں ایک مسجد کا مستقل امام وخطیب ہوں، اتفاق سے میں شہر گیا وہاں نماز کا وقت ہو چکا تھا،انھوں نے مجھے نماز پڑھانے کو کہا، میں نے وہاں نماز پڑھائی پھر واپس اپنے گاؤں پہنچا تو وہاں میرا انتظار تھا میں نے وقت پر پہنچ کر وہاں بھی دوبارہ نماز پڑھائی، اس پر کچھ لوگوں نے اعتراض کیا تو میں نے دلیل کے طور پر یہ حدیث پیش کی کہ ابوسعید رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ایک آدمی مسجد میں آیا نبی صلی اللہ علیہ وسلم نماز پڑھ چکے تھے۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا اس پر کون صدقہ کرے گا؟ ایک شخص کھڑا ہوا اور اس نے آنے والے کے ساتھ باجماعت نماز پڑھی۔(ابو داؤد، كتاب الصلاة)[1]

اس پر ساتھیوں نے اعتراض کیا کہ وہ شخص پہلے مقتدی تھا۔امام نہیں تھا۔حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ والی حدیث پر بھی وہ یہ اعتراض کرتے تھے کہ معاذ بھی پہلے امام نہیں تھے۔ بلکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مقتدی تھے۔آپ وضاحت کر کے مستفید فرمائیں۔

(جواب): مسئلہ ہٰذا کی شرع میں مثال ملنا مشکل ہے، البتہ فرضیتِ صلوٰۃ کی ابتداء میں امامتِ جبرائیل سے اس بات کی نشان دہی ہوتی ہے کہ نماز کا امام ایک دن کی نماز میں دو دفعہ امام نہ بنے۔حضرت جبرائیل اسی روز تاخیر کے ساتھ دوبارہ بطورِامام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نماز پڑھا سکتے تھے بالخصوص جب کہ ان کی نفلی نماز تھی۔ لیکن ایسا نہیں ہوا بلکہ دوسرے روز آخری وقت میں نماز پڑھائی۔

تاہم اگر کوئی سبب اس بات کا متقاضی ہو، تو دوسری مرتبہ جماعت کروانا جائز ہی معلوم ہوتا ہے۔مثلاً مقتدیوں میں امامت کی اہلیت نہیں ہے یا وہ سب گونگے وغیرہ ہیں۔ظاہر ہے کہ عام حالات میں اہلیت کے ساتھ ساتھ سلیم الاعضاء (اعضاء کا صحیح) ہونا تقدیم کا باعث ہے۔

''کیا ایک امام دوبار جماعت کرواسکتا ہے؟'' ایک تعاقب:

(سوال): راقم ایک عرصے سے آپ کے علم وفضل سے استفادہ کر رہا ہے اور مجلّہ الاعتصام کا ۱۸ سال سے

---

[1] سنن أبي داؤد، كتاب الصلاة، باب الجمع في المسجد مرتين،رقم: ٥٧٤، سنن الترمذي،بَابُ مَا جَاءَ فِي الجَمَاعَةِ فِي مَسْجِدٍ قَدْ صُلِّيَ فِيهِ مَرَّةً،رقم: ٢٢٠

مستقل قاری ہے، آپ کے کالم ''احکام و مسائل'' کو نہایت دلچسپی سے پڑھتا ہے۔ الحمد للہ اس کے مطالعے سے بہت کچھ سیکھا اور جانا۔ جزاکم اللہ خیراً

۲۰۔ جون ۲۰۰۳ء کا الاعتصام (ج:۵۵، شمارہ:۲۴) سامنے ہے جس کے صفحہ ۱۵ پر قاری محمد منشاء عتیق بہاولنگری کے سوال بعنوان ''کیا ایک امام دو بار جماعت کروا سکتا ہے؟'' کے جواب میں آپ نے فرمایا ہے: ''مسئلہ ھذا کی شرع میں مثال ملنا مشکل ہے'' پھر آپ نے حدیث ''امامت جبرائیل'' کی جانب اشارہ کر کے اپنے موقف پر استدلال کیا ہے......الخ

مجھے اعتراف ہے کہ اس سلسلے میں راقم الحروف کی کوئی عرض درحقیقت سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے۔ تاہم اپنی اصلاح کے لیے عرض ہے کہ مندرجہ ذیل احادیث کی بناء پر مسئلہ ہٰذا پر دلیل لی جا سکتی ہے۔

۱۔ امام ابوداؤد اپنی ''سنن'' میں (کِتَاب الصلوٰۃ: باب من قَالَ: یصلی بکل طائفۃ رکعتین کے تحت) حدیث نقل کرتے ہیں:

«حَدَّثَنَا عُبَيْدُ اللّٰهِ بنُ مُعَاذٍ ، نَا الاشعَثُ عَنِ الحَسَنِ عَن اَبِی بَکرَۃَ قَالَ : «صَلّٰی النَّبِیُّ ﷺ فِی خَوفِ الظُّهرِ ،فَصَفَّ بَعضُهُم خَلفَهٗ، وَ بَعضُهُم بِاِزَاءِ العَدُوِّ، فَصَلّٰی رَکعَتَینِ، ثُمَّ سَلَّمَ. فَانطَلَقَ الَّذِینَ صَلَّوا مَعَهٗ، فَوَقَفُوا مَوقِفَ اَصحَابِهِم . ثُمَّ جَآءَ اُولٰٓئِكَ فَصَلَّوا خَلفَهٗ ، فَصَلّٰی بِهِم رَکعَتَینِ، ثُمَّ سَلَّمَ. فَکَانَت لِرَسُولِ اللّٰهِ ﷺ اَربَعًا، وَلِاَصحَابِهٖ رَکعَتَینِ، وَ بِذٰلِكَ کَانَ یُفتِی الحَسَنُ. قَالَ اَبُو دَاوٗدَ : وَ کَذٰلِكَ فِی المَغرِبِ یَکُونُ لِلاِمَامِ سِتُّ رَکعَاتٍ ،وَ لِلقَومِ ثَلَاثًا ثَلَاثًا...... قَالَ اَبُو دَاوٗدَ : کَذٰلِكَ رَوَاهُ یَحیَی بنُ اَبِی کَثِیرٍ عَن سَلمَةَ عَن جَابِرٍ عَنِ النَّبِیِّ ﷺ...... وَکَذٰلِكَ قَالَ سُلَیمَانُ الیَشکَرِی، عَن جَابِرٍ ، عَنِ النَّبِیِّ ﷺ .» [1]

خلاصہ: ۱۔ آپ نے اصحاب کو دو حصوں میں تقسیم کر کے خوف کی صورت میں دو دو رکعت نماز پڑھائی اور ہر دو رکعت پر سلام پھیرا۔

۲۔ حسن بصری اسی پر فتویٰ دیا کرتے تھے۔

۳۔ امام ابوداؤد فرماتے ہیں، نماز مغرب بھی امام دو مرتبہ پڑھا سکتا ہے۔

---

[1] سنن ابی داؤد، بَابُ مَنْ قَالَ: یُصَلِّی بِکُلِّ طَائِفَةٍ رَکْعَتَیْنِ، رقم:۱۲۴۸

۴۔ اسی کے ہم معنیٰ حدیث یحیی بنِ اَبی کَثِیرٍ، عَن سَلَمَة، عَن جَابِرٍؓ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ مروی ہے۔

۵۔ اور سُلَیمَانَ الیَشکُرِی ، عَن جَابِرٍ ، عَنِ النَّبِيِّ ﷺ سے بھی یہ حدیث مروی ہے۔

مزید حوالے: ''مسند احمد'' عن ابی بکرہ: (۴۹/۵) سنن نسائی کتاب صلوٰۃ الخوف میں أشعث عن الحسن، عن أبی بکرۃ ، نیز ''باب اختلاف نیة الإمام والمأموم'' کے تحت قتادہ، عن الحسن ، عن جابر ، بن عبد اللّٰہ الخ

علامہ بدر الدین عینی شرح ''سنن ابی داوٗد'' میں (۱۳۵/۵) رقمطراز ہیں:

« سُلیمَانَ بنِ قَیسِ الیَشکَرِی البَصرِی رَوٰی عَن جَابِرِ بنِ عَبدِ اللّٰہؓ...... الخ قَالَ أَبُو ذُرعَةَ: بَصرِی ثِقَةٌ. وَ قَالَ اَبُو حَاتِمٍ: جَالَسَ سُلَیمَانَ الیَشکَرِی جَابِرًا ، وَ سَمِعَ مِنهُ ، وَ کَتب عنه صحیفة . و توفی . و بقیت الصحیفة عند امرأتِہٖ الخ»

امام بغوی رحمہ اللہ ''شرح السنہ'' (۲۸۳/۴) میں اسی حدیث ابی بکرہ رضی اللہ عنہ اور حدیث جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ سے استدلال کرکے رقمطراز ہیں:

« فَلَو أَنَّ الاِمَامَ صَلّٰی بِالطَّائِفَةِ الاُولٰی تَمَامَ الصَّلٰوةِ وَسَلَّمَ بِهِم، ثُمَّ صَلَّاهَا مَرَّةً اُخرٰی بِالطَّائِفَةِ الثَّانِیَةِ فَجَائِزٌ. رَوَاهُ أَبُو بَکرَةَ عَن رَسُولِ اللّٰہِ ﷺ ...... وَ رَوٰی عَن جَابِرٍ اَنَّ النَّبِیَّ ﷺ ......الخ.»

امام ابو داوٗد کی اشارہ کردہ عبارت ''و کَذٰلِكَ فی المغرب'' کی مشارٌ الیہ حدیث ''دارقطنی'' (۴۸/۲) میں عن ابی بکرہ رضی اللہ عنہ بایں الفاظ مروی ہے:

« اَنَّ النَّبِیَّ ﷺ صَلّٰی بِالقَومِ صَلَاةَ المَغرِبِ ثَلَاثَ رَکعَاتٍ. ثُمَّ انصَرَفَ. وَ جَاءَ الآخِرُونَ، فَصَلّٰی بِهِم ثَلَاثَ رَکعَاتٍ. وَ کَانَت لَهُ سِتُّ رَکعَاتٍ. وَ لِلقَومِ ثَلَاثُ رَکعَاتٍ » انتهی [1]

صاحب عون المعبود امام صاحب کے قول ''و کَذٰلِكَ'' کی شرح میں (۹۰/۴) تحریر فرماتے ہیں: ''یَعنِی فِی غَیرِ المَغرِبِ'' بھی جائز ہے۔ پھر امام ابو داوٗد مشارٌ الیہ حدیث کے بارے میں فرماتے ہیں:

وَهُوَ عِندَ مُسلِمٍ بِلَفظٍ...... « فَصَلّٰی بِطَائِفَةٍ رَکعَتَینِ، ثُمَّ تَأَخَّرُوا ، فَصَلّٰی بِالطَّائِفَةِ الاُخرٰی رَکعَتَینِ، فَکَانَت لِرَسُولِ اللّٰہِ ﷺ اَربَعُ رَکعَاتٍ وَ لِلقَومِ رَکعَتَانِ .» (شرح

[1] سنن الدارقطنی، بَابُ صِفَةِ صَلَاةِ الخَوفِ وَأَقسَامِهَا، رقم:۱۷۸۳

السنة بغوی ٢٨٧/٤)[1]

''آپ نے فوج کو دو حصوں میں بانٹ کر دو دو رکعتیں پڑھائیں۔لوگوں کی دو دو رکعت ہوئیں اور آپ کی چار رکعت۔''

خلاصۂ کلام: میرے خیال میں حسن بصری رحمہ اللہ کی معنعن، یا قتادہ کے سماع ''عن سلیمان الیشکری'' کے متعلق محدثین کرام نے جو کلام کیا ہے،وہ حدیثِ ''بخاری و ''مسلم کی وجہ سے غیر مضر ہو جاتا ہے۔صاحب ''تنقیح الرواة'' (١/ ٢٦٨) کا میلان بھی اسی جانب معلوم ہوتا ہے۔ چنانچہ وہ رقم طراز ہیں کہ:

« وَ فِي البَابِ أَحَادِيثُ عِندَ مُسلِمٍ وَغَيرِهِ، فَبَعضُهَا صَحِيحَةٌ، وَ فِي إِسنَادِ بَعضِهَا كَلَامٌ ، وَ يَشُدُّ بَعضُهَا بَعضًا.»

''اس باب میں مسلم وغیرہ میں بھی احادیث آئی ہیں۔بعض صحیح ہیں،اور بعض میں کلام ہے۔البتہ مل کر تقویت پا جاتی ہیں۔'' (راقم کے نزدیک صحیح بخاری میں بھی روایات ہیں)

حاصلِ مطالعہ: یہ ہے کہ ''ایک امام دو بار جماعت کروا سکتا ہے''......' مسئلہ ھذا کی شرع میں مثال ملنا مشکل نہیں ہے۔(واللہ اعلم وعلمه اتم)

(جواب): محترم حافظ صاحب! مسئلہ ہذا کی توضیح پر میں آپ کا بے حد شکر گزار ہوں۔آپ نے جو استدلال پیش فرمایا ہے، اس میں تردُّد صرف اس اعتبار سے باقی رہتا ہے کہ اُصلاً ''صلوٰۃِ خوف'' کی بناء ضرورت و حاجت اور تخفیف پر ہے۔ جیسے صلوٰۃ خوف میں ایک رکعت پڑھنی جائز ہے۔ بلکہ شدتِ جنگ میں صرف اشارہ اور تکبیر ہی کافی ہو سکتی ہے۔جب کہ عام حالات میں شدتِ جنگ اس عمل کے جواز کا فتویٰ نہیں۔اسی طرح ممکن ہے کہ لاحق ضرورت کی بناء پر رسول اللہ ﷺ نے فعل ھذا کیا ہو؟ اسی وجہ سے میں نے اس دلیل سے صرفِ نظر کیا تھا۔

منتخب امام کی صفات:

(سوال) امام منتخب کرنے کے لئے حدیث میں چار صفات بیان ہوئی ہیں۔مولانا صادق سیالکوٹی رحمہ اللہ نے سبیل الرسول میں صحیح مسلم کا حوالہ دیا ہے لیکن مجھے وہ حدیث وہاں نہیں ملی۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے بخاری

[1] صحیح مسلم :کتاب المغازی،باب صلاة الخوف، رقم:٨٤٣، صحيح البخاری ، کتاب المغازی، بَابُ غَزوَةِ ذَاتِ الرِّقَاعِ،رقم:٤١٣٦

شریف میں ایک باب اس طرح قائم کیا ہے: باب اهل العلم والفضل احق بالإمامة" اور اس باب کے تحت حدیث نمبر ۶۴۲ میں ابوبکر صدیقؓ کی امامت کا واقعہ بیان فرمایا ہے حالانکہ قرات کے لحاظ سے حضرت اُبی بن کعبؓ سب سے زیادہ قاری تھے ان دونوں احادیث میں مطابقت کس طرح دی جائے گی۔

(جواب) مطلوبہ حدیث صحیح مسلم میں "باب من احق بالإمامة" کے تحت موجود ہے۔ (ج ۱ ص: ٤٦٥ طبعه دارعالم الكتاب) قصہ ابی بکر ایک مخصوص واقعہ ہے بخلاف ابومسعود کی حدیث کے، اس میں ایک قاعدہ کلیہ بیان ہوا ہے جو عموم کا فائدہ دیتا ہے۔ اَقْرَا (زیادہ خوبصورت تلاوت کرنے والے) پر علم والے کو مقدم کرنے کا استدلال درست نہیں۔ تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو مرعاة المفاتيح كتاب الصلوٰة، باب الامامة، الفصل الاوّل، ج:٤، ص:٤٥، طبع سرگودھا

(سوال) : اگر ایک عالم دین کہے کہ (۱) میں سگریٹ پیتا ہوں (۲) داڑھی کٹواتا اور سیاہ کرتا ہوں (۳) ٹیلیویژن دیکھنا اور رکھنا میری مجبوری ہے یعنی اس کے بغیر میرا گزارہ نہیں۔

کیا ایسے عالم کو مسجد میں امامت و خطابت کے فرائض ادا کرنے کے لیے رکھنا جائز ہے یا نہیں؟ جواب قرآن وسنت کے مطابق دیں۔ جزاکم اللہ۔

(جواب) : مذکور بالا قباحتوں (بُری عادات) سے متصف مولانا صاحب کو مسجد میں امامت و خطابت کے لیے مقرر نہیں کرنا چاہیے۔ ''دارقطنی'' میں حدیث ہے: ''اپنے امام بہتر لوگوں کو بنایا کرو۔''

امامت کے لیے زیادہ اہل کون ہے؟

(سوال) : ایک آدمی جس کی داڑھی ہے مگر وہ دین کا علم کم رکھتا ہے دوسرا وہ ہے جس کی داڑھی تو نہیں ہے مگر دین کا علم کافی رکھتا ہے دونوں میں سے کون سا امامت کے لیے زیادہ اہل ہے؟

(جواب) : متبع سنت، داڑھی والے کو امامت کے مصلّی پر کھڑا کرنا چاہیے۔ داڑھی منڈے عالم کی مثال تو وہی ہے جو اللہ نے قرآن میں یہود کی بیان فرمائی ہے:

﴿ مَثَلُ الَّذِينَ حُمِّلُوا التَّورَاةَ ثُمَّ لَم يَحمِلُوهَا كَمَثَلِ الحِمَارِ يَحمِلُ اَسفَارًا بِئسَ مَثَلُ القَومِ الَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيٰتِ اللهِ وَاللهُ لَا يَهدِی القَومَ الظّٰلِمِينَ﴾ (الجمعة:٥)

یعنی جن لوگوں کے (سر) پر تورات لدوائی گئی، پھر انھوں نے اس کے (بارِ تعمیل) کو نہ اٹھایا ان کی مثال گدھے کی سی ہے جس پر بڑی بڑی کتابیں لدی ہوں۔ جو لوگ اللہ کی آیتوں کی تکذیب کرتے ہیں۔ ان کی مثال بُری ہے اور اللہ ظالم لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا۔

نیز یہ شخص فاسق ہے، اور فاسق کو قصداً امام نہیں بنانا چاہیے۔ حدیث میں ہے:

«اِجعَلُوا اَئِمَتَکُم خِیَارَکُم»①

یعنی اپنے بہترین لوگوں کو امام بناؤ۔

اسلام میں نماز کی امامت کرانے کی شرائط:

سوال: اسلام میں نماز کی امامت کرانے کی کیا شرائط ہیں؟

جواب: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو قرآن مجید کا زیادہ ماہر ہو، وہ امامت کرائے۔ اگر قرآن میں برابر ہوں تو جو حدیث میں زیادہ ماہر ہو۔ اگر حدیث میں بھی برابر ہوں تو جس نے پہلے ہجرت کی ہو، اگر ہجرت میں بھی برابر ہوں تو جو عمر میں بڑا ہو اور جہاں کسی کے اختیارات ہوں وہاں دوسرا امامت نہ کرائے اور نہ اس کی عزت کی جگہ میں بیٹھے مگر اس کے اذن سے۔②

مزید وضاحت کے لیے ملاحظہ ہو! فتاویٰ اہلحدیث (۲/ ۲۰۵،۲۰۶)

بلا عذر بیٹھ کر امامت کرانا:

سوال: بلا عذر بیٹھ کر امامت کرانا جائز ہے یا نہیں؟

جواب: بلا عذر بیٹھ کر امامت کرانا قطعاً رسول اللہ ﷺ سے ثابت نہیں۔ امام خطابی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

« الفَرضُ لَا جَوَازَ لَهُ قَاعِدًا ، وَالمُصَلِّي يَقدِرُ عَلَى القِيَامِ»③

یعنی فرض نماز بیٹھ کر پڑھنا ناجائز ہے، جب کہ نمازی قیام پر قادر ہو۔

کبڑے امام کی اقتداء:

سوال: ائمہ ثلاثہ کے نزدیک کبڑا امام جس کی کمر رکوع کی حد تک جھکی ہو، اس کی اقتدا صحیح نہیں، کیا ایسے کو امام نہیں بنانا چاہئے؟

جواب: کبڑے آدمی کی چونکہ اس حالت میں اپنی نماز درست ہے لہٰذا اس کی امامت بھی درست ہے۔ قاعدہ معروف ہے:« من صحّت صلاته صحت إمامته .»①

---

① سنن الدارقطنی، بَابُ تَخفِيفِ القِرَاءَةِ لِحَاجَةٍ، رقم: ۱۸۸۱

② صحیح مسلم، بَابُ مَنْ أَحَقُّ بِالْإِمَامَةِ ، رقم: ۶۷۳

③ المرعاة: ۲/ ۱۹۶

تاہم کوشش ہونی چاہیے کہ صحت مند آدمی نماز پڑھائے۔ بوقتِ ضرورت ایسے آدمی کی امامت بھی درست ہے جس طرح کہ شرع نے نابینا کی امامت کو بھی قابل اعتبار سمجھا ہے۔

فالج زدہ امام جو صحیح ارکانِ نماز کی ادائیگی نہ کر سکے؟

(سوال): ایک مسئلہ کے متعلق رہنمائی فرما کر عند اللہ ماجور ہوں۔ صورت احوال یہ ہے کہ بندہ عرصہ ۳۳ سال جامع مسجد اہلِ حدیث شاد باغ لاہور میں درس و تدریس، خطابت اور امامت کے فرائض انجام دیتا رہا ہے لیکن ۱۹۹۴ء میں مجھے فالج کا حملہ ہوا۔ اب الحمد للہ علاج معالجے کے بعد تندرست ہوں لیکن دایاں ہاتھ ابھی مکمل طور پر ٹھیک نہیں ہوا۔ عرصہ دو سال سے نمازِ ظہر اور نمازِ عصر پڑھا رہا ہوں گزشتہ دنوں چند نمازیوں نے کہا کہ میں امامت کے دوران نماز کے ارکان ٹھیک طور پر ادا نہیں کرتا حالانکہ بہت سے نمازیوں نے کہا کہ مجھے نماز پڑھاتے رہنا چاہیے اور انھیں کوئی اعتراض نہیں ہے اندریں صورت شریعتِ مطہرہ کی روشنی میں رہنمائی فرمائیں۔

(جواب): صورتِ سوال سے ظاہر ہے کہ مقتدیوں کی اکثریت آپ کے منصبی فرائض کی ادائیگی سے مطمئن ہے۔ لہٰذا عمل خیر جاری رہنا چاہیے۔ پھر بھی مخلص رفقاء سے مشورہ کر لیں۔ اگر فی الواقع ارکانِ نماز میں کوئی خلل نظر آئے تو اس پر غور و فکر ہونا چاہیے۔ ورنہ صرف داہنے ہاتھ کا نقص امامت سے معزولی کا سبب نہیں بن سکتا۔

مردے نہلانے والے کی امامت:

(سوال): ایک آدمی مسجد میں مُردے نہلانے اور صفائی کرنے کے لئے رکھا گیا ہے، کیا اس کے پیچھے نماز ہو جائے گی؟

(جواب): مُردے نہلانے والے شخص کی اقتداء میں نماز پڑھنا جائز ہے۔ ممانعت کی کوئی وجہ نہیں۔ بشرطیکہ پاک صاف اور امامت کے اہل ہو۔

کیا قبر و حشر میں حنفی، وہابی کی تقسیم ہوگی؟

(سوال): اکثر اہلِ حدیث حضرات بریلوی ائمہ کی اقتداء میں نماز نہیں پڑھتے بلکہ کسی کٹر دیوبندی حضرات کے پیچھے بھی۔ حالانکہ دوسری طرف یہ کہتے ہیں کہ مقتدی کی نماز کا امام کی نماز پر انحصار نہیں۔ کیا قبر میں حشر میں کہیں حنفی، وہابی کا سوال ہوگا؟ کیا مولویوں نے عوام کو گورکھ دھندے میں نہیں ڈال رکھا ہے؟

---

(1) سبل السلام: ۳/ ۸۳

(جواب) : شرعی اصطلاح میں مقتدی اسی کو کہا جاتا ہے، جو امام کی اقتداء میں ہو۔ البتہ نیت کے اعتبار سے بعض امور میں اختلاف ظاہری اقتداء کے منافی نہیں۔ آپ کی یہ بات درست ہے، کہ حشر میں نسبتوں کے بارے میں سوال نہیں ہوگا۔ لیکن اتنی بات ضرور ہے، کہ ہر عمل کی قبولیت کے لیے عقیدے کی درستی اوّلین شرط ہے۔ علماء پر کلی انحصار کے بجائے بہتر ہے، کہ تلاش حق کے لیے خود جدو جہد کریں۔ رب کریم کا وعدہ ہے:

﴿ وَالَّذِينَ جَاهَدُوا فِينَا لَنَهدِيَنَّهم سُبُلَنَا ﴾ (العنکبوت:٦٩)

''اور جو لوگ ہماری راہ میں جدو جہد کرتے ہیں ہم انھیں اپنا راستہ ضرور دکھاتے ہیں۔''

صحیح العقیدہ لوگوں کی مسجد نہ ہونے کی صورت میں نماز کہاں پڑھیں؟

(سوال) : میں پورے علاقے میں واحد اہلِ حدیث ہوں اور یہاں کوئی اہلِ حدیث مسجد نہیں۔ میں پانچ وقت کی اذان بھی سنتا ہوں پھر بھی اکیلے گھر نماز پڑھتا ہوں کیونکہ مسجد میں مسنون طریقے سے نماز ادا نہیں کرسکتا۔ یہی حال جمعے اور عید کی نماز کا ہے۔ کیا میں اس صورت میں تارکِ جماعت نہیں بنتا؟

(جواب) : نماز باجماعت پڑھنی چاہیے۔ اگر آپ کے ہاں اہل توحید کی کوئی مسجد نہیں، تو کم از کم اپنی رہائش گاہ میں ہی جماعت کا اہتمام کریں۔ چاہے اکیلے کیوں نہ ادا کرنی پڑے۔ جمعہ اور عید کی نماز بھی مسلمانوں کی جماعت کے ساتھ ادا کریں اگر میسر نہ آسکے، تو کم از کم اپنے حلقۂ احباب میں ہی اس کی اقامت کی سعی کریں۔ اہلِ حدیث کے علاوہ بھی اگر اچھے عقیدے کے حامل لوگ مل جائیں تو ان کے ساتھ مل کر نماز پڑھ لیا کریں۔

قرآن غلط پڑھنے والے قاری کی اقتداء:

(سوال) : ایک ایسا قاری یا حافظ ہے جو نماز پڑھاتے وقت قرآن پاک غلط پڑھے مثلاً ﴿مِمَّا خَطِيئَتِهِم أُغرِقُوا فَأُدخِلُوا نَارًا﴾(نوح:٢٥) کی بجائے واحد کے صیغے ''أُغرِقَ فَأُدخِلَ'' پڑھے۔ کیا اس کے پیچھے نماز یا اس کی اپنی نماز ٹھیک ہے؟

(جواب) : قرآن غلط پڑھنے والے قاری کو تلفظ کی اصلاح کرنی چاہیے۔ اگر وہ اس بات کے لیے تیار نہ ہو تو اس کو امامت سے معزول کردیا جائے۔ بصورتِ دیگر دوسری مسجد اختیار کرلینی چاہیے۔ جہاں تک نماز کی قبولیت کا تعلق ہے۔ سو یہ معاملہ اللہ سے ہے۔ بندوں سے نہیں۔ ہمیں ظاہری حالت درست کرنی چاہیے۔ (واللہ ولی التوفیق)

امام صاحب قرآن مجید کی قرأت ٹھیک نہ کرتے ہوں تو......؟

سوال : اگر امام صاحب قرآن مجید کی قرأت ٹھیک نہ کرتے ہوں۔ غلطیاں ''لحن جلی ولحن خفی'' کرتے ہوں۔ بعض اوقات معانی میں فرق آجاتا ہے کیا ایسے امام کے پیچھے نماز ہو جائے گی؟ ایسی حالت میں کیا کرنا چاہیے؟ جماعت کے ساتھ مل جائیں یا جماعت کے بعد اپنی نماز پڑھی لیں؟

جواب : طاقت ہو تو ایسے شخص کو امامت سے معزول کر دینا چاہیے۔ ورنہ کسی دوسری مسجد کا رُخ کر لیا جائے۔ لیکن فتنہ سے بچنا چاہیے: «اَلْخِلَافُ شَرٌّ» اختلاف میں شر ہے۔

ناپسندیدہ اوصاف سے متصف امام کو بنانا:

سوال : کسی ایسے امام کے پیچھے نماز ہو جاتی ہے جو جھوٹ بولتا ہو، غیبت کرتا ہو، چغل خوری کرتا ہو، وعدہ خلافی کرتا ہو، دو بھائیوں میں ناچاکی کراتا ہو، مدرسے کی رکھی ہوئی امانت کھا جاتا ہو، دینی جماعت سے غیر جماعتوں کو ترجیح دیتا ہو اور سگریٹ نوشی کرتا ہو، مہربانی فرما کر قرآن وحدیث کی روشنی میں فتویٰ ارسال کریں؟

جواب : ایسا شخص امامت کے لائق نہیں۔ ''مشکوٰۃ'' میں حدیث ہے کہ ایک آدمی کو رسول اللہ ﷺ نے قبلہ رُخ تھوکنے کی بناء پر اِمامت سے معزول کر دیا تھا۔[1] اس سے معلوم ہوا کہ امام متقی پرہیز گار ہونا چاہیے اور ''دارقطنی'' میں حدیث ہے: «اِجعَلُوا اَئِمَّتَکُم خِیَارَکُم»[2]

یعنی ''اپنا امام اچھے لوگوں کو بنایا کرو۔''

بناء بریں جملہ قبیح (بُرے) اوصاف سے متصف امام کو فوراً امامت سے معزول کر دینا چاہیے۔

برے کردار والے شخص کی اقتدا میں نماز پڑھنا:

سوال : کیا کسی امام کے بارے میں معلوم ہو جائے کہ اس کا کردار درست نہیں ہے تو پھر اس کے پیچھے نماز پڑھی جا سکتی ہے یا کہ نہیں؟

جواب : باوثوق ذرائع سے اگر کسی امام کے بارے میں معلوم ہو جائے کہ وہ بدکردار ہے، تو ایسی صورت میں «اَلدِّینُ النَّصِیحَۃ»[3] کے جذبہ کے پیشِ نظر ہر ممکن حد تک اُسے سمجھانا چاہیے۔ اس کے باوجود اگر وہ اپنی حرکاتِ شنیعہ (بُری حرکات) سے باز نہ آئے تو دوسری مسجد کا انتخاب کر لینا چاہیے۔ یا پھر کسی مخصوص جگہ پر

---

[1] سنن أبی داود، بَابٌ فِی کَرَاھِیَۃِ الْبُزَاقِ فِی الْمَسْجِدِ، رقم: ٤٨١

[2] سنن الدارقطنی، بَابُ تَخْفِیفِ الْقِرَاءَۃِ لِحَاجَۃٍ، رقم: ١٨٨١

[3] صحیح مسلم، بَابُ بَیَانِ أَنَّ الدِّینَ النَّصِیحَۃُ، رقم: ٥٥

باجماعت نماز کا انتظام کرلیا جائے۔

سگریٹ پینے یا بیچنے والے شخص کی امامت کا حکم:

(سوال) سگریٹ پینا اور بیچنا جائز ہے یا نہیں؟ اگر ایک شخص سگریٹ خود پیتا نہیں لیکن بیچتا ہے اور اس نے داڑھی بھی پوری رکھی ہوئی ہے تو کیا وہ وقتی طور پر امامت کروا سکتا ہے؟ اگر سگریٹ بیچنا ناجائز ہے لیکن وہ سگریٹ بیچنا ترک نہیں کرتا تو کیا ہم اس کے پیچھے نماز پڑھ سکتے ہیں؟ (محمد رمضان ساجد)

(جواب) حقہ یا سگریٹ پینا حرام ہے۔ سنن ابوداود میں حدیث ہے:

«نَهَى رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ كُلِّ مُسْكِرٍ وَمُفَتِّرٍ» [1]

یعنی ''رسول اللہ ﷺ نے نشہ والی شے اور جس سے دماغ میں فتور پیدا ہو دونوں سے منع فرمایا ہے''۔

اس میں شبہ نہیں کہ حقہ سے دماغ میں فتور پیدا ہوتا ہے اور شریعت میں کسی چیز سے رکنے کا حکم حرمت پر دلالت کرتا ہے۔ حرمت کی دوسری وجہ یہ ہے کہ اس کی بدبو سخت تکلیف دہ ہے اور حدیث میں ہے کہ جس چیز سے بنی آدم کو تکلیف ہو، اس سے فرشتے بھی تکلیف محسوس کرتے ہیں۔ لہٰذا جس چیز سے فرشتوں کو تکلیف ہو، اس کی حرمت میں کیا شبہ باقی رہ جاتا ہے۔

منہ کی طہارت اور اس کی اچھی بو کی شریعت میں اس قدر اہمیت ہے کہ نبی ﷺ نے کچا پیاز یا لہسن کھا کر آنے والے کو مسجد میں آنے سے منع فرمایا ہے۔ جب دلائل سے سگریٹ، حقہ کی حرمت ثابت ہوگئی تو اس کا روبار کرنا بھی حرام ٹھہرا۔ لہٰذا اس کی خرید و فروخت میں ملوث آدمی کو امامت سے معزول کردینا چاہئے کیونکہ دارقطنی میں حدیث ہے ''امام بہتر لوگوں کو بنایا کرو۔'' [2] ہاں اگر وہ اس سے باز نہیں آتا اور اس کو ہٹانا بھی ممکن نہیں ہے تو اس کی اقتدا میں نماز پڑھ لینے سے نماز ہو جائے گی کیونکہ اس کاروبار کا مرتکب مجرم ہے، کافر نہیں۔ تاہم بہتر امام کی تلاش جاری رہنی چاہئے۔ جماعت میں تفرقہ سے اجتناب بھی از حد ضروری ہے، جملہ امور کو دانش و حکمت سے سرانجام دیا جائے۔

(سوال): گاؤں میں اور کوئی اہل حدیث مسجد نہیں کیا اس صورت میں اگر غلط کردار کے حامل خطیب کے پیچھے نماز نہ پڑھوں یعنی جمعہ کی نماز تو کیا اس کی جگہ میں ظہر کی نماز گھر ادا کرسکتا ہوں۔ ہم چار پانچ ساتھی ہیں۔ ہم نے وعدہ کیا ہے کہ اس غلط آدمی کے پیچھے ہم زندگی بھر نماز ادا نہ کریں گے کیا ایسی صورت میں ہم الگ اپنے

[1] سنن أبي داؤد،بَابُ النَّهْيِ عَنِ الْمُسْكِرِ،رقم:٣٦٨٦

[2] سنن الدارقطني،بَابُ تَخْفِيفِ الْقِرَاءَةِ لِحَاجَةٍ،رقم:١٨٨١

گھر میں یا کسی دوسری مسجد میں اپنا خطبہ جمعہ دے کر نمازِ جمعہ ادا کر سکتے ہیں کیونکہ گاؤں میں اور کوئی اہلِ حدیث جامع مسجد نہیں ہے؟

(جواب): ایسی صورت میں آپ دوسری مسجد میں جمعہ کی ادائیگی کا اہتمام کرلیں۔ لیکن جمعہ کو ترک مت کریں، چار پانچ ساتھی جمعہ پڑھ سکتے ہیں۔ انتظام کرلیں۔ اتنے عدد سے راجح مسلک کے مطابق اقامتِ جمعہ میں کوئی قباحت نہیں۔

غلط خطیب اور امام سے بائیکاٹ کا حکم:

(سوال): کیا ایک غلط خطیب اور امام سے بائیکاٹ جائز ہے یا کہ نہیں؟ کیونکہ ہم نے لوگوں کو بتایا ہے کہ اس غلط آدمی کی وجہ سے گاؤں میں جماعت بدنام ہوگی اور کمزور پڑ جائے گی ہماری مخالفت دین کی وجہ سے ہے۔

(جواب): غلط کار امام سے میل ملاقات کا بائیکاٹ نہیں ہونا چاہیے، بلکہ مسلسل سمجھاتے رہنا چاہیے۔ شاید کہ ہدایت کی راہ آسان ہو جائے۔ ﴿وَذَكِّرْ فَإِنَّ الذِّكْرٰى تَنفَعُ الْمُؤْمِنِينَ﴾

(سوال): کیا ماہِ رمضان میں اسی جامع مسجد میں ہم تین چار ساتھی اعتکاف کرلیں مگر ہم نے نہ تو کوئی فرض نماز اور نہ ہی نمازِ تراویح اور نہ ہی نمازِ جمعہ اس امام اور خطیب کے پیچھے ادا کرنی ہے۔ کیا اس صورت میں ہم اپنی جماعت کرالیا کریں۔ تراویح بھی اپنی ادا کرلیا کریں اور جمعہ کی نماز کی جگہ ظہر کی نماز مسجد میں ادا کرلیا کریں؟

(جواب): ایسی صورت میں آپ مسجد ہذا میں اعتکاف نہ بیٹھیں، بلکہ ترک کردیں۔ کیونکہ اس سے مزید فتنے جنم لیں گے۔ فتنہ کو مٹانا چاہیے اس میں اضافہ کا موجب نہیں بننا چاہیے۔

ایسا امام جو چوری کرتا ہو اور اپنے شاگردوں سے چوری کرواتا ہو

(سوال): ایک مسجد میں ایک قاری صاحب اپنے شاگردوں کو کہتے ہیں، کہ ٹرالی سے گنے کھینچ کر لاؤ۔ یا پھر شاگردوں کے ساتھ کسی گنے کے کھیت میں جاتے ہیں۔ وہاں مالک موجود نہیں ہوتا۔ نوکر وغیرہ موجود ہوتا ہے تو وہاں سے ۴۰، ۵۰ کلو گنا مالک کی غیر موجودگی میں لے آتے ہیں۔ کیا یہ جائز ہے؟ اگر یہ سب حرام ہے تو پھر ایسے امام کے پیچھے نماز ہو جاتی ہے یا نہیں؟

(جواب): بلا اجازت ٹرالی سے گنے کھینچ کر لانا یا مالک کی اجازت کے بغیر اس کے کھیت سے گنا حاصل کرنا قبیح افعال ہیں۔ ان سے اجتناب ضروری ہے۔ ان اُمور کے مرتکب امام کو «اَلدِّینُ النَّصِیحَة»[1] کے تحت

حتی المقدور سمجھانے کی کوشش کرنی چاہیے۔ اس کے باوجود اگر باز نہ آئے، تو امام و دیگر فرائض سے اسے معزول کردیا جائے۔ حدیث میں ہے:«اِجعلُوا اَئِمتکُم خِیارَکُم» [2] یعنی اچھے لوگوں کو امام مقرر کرو اور اگر یہ الزامات ذاتی عناد کی بناء پر لگائے گئے ہیں، تو اللہ سے ڈرنا چاہیے۔

﴿اِنَّ السَّمعَ وَالبَصَرَ وَالفُؤَادَ کُلُّ اُولٰئِکَ کَانَ عَنهُ مَسئُولًا﴾ (الاسراء: ۳۶)

سوال: جو امام ہے وہ ہی خطیب ہے کیا اس غلط آدمی یعنی خطیب کے پیچھے نماز جمعہ بھی ادا کرنا ناجائز ہے؟

جواب: جو حکم جماعت کا ہے، وہی حکم جمعہ کی ادائیگی کا ہے۔

سوال: چند بندے ایسے ہیں جو کہ جس امام کے پیچھے نمازیں پڑھتے ہیں، اُس کو امامت کے لیے ناقص سمجھتے ہیں۔ قطع نظر اس سے کہ وہ امام ناقص ہے یا نہیں۔ مگر یہ لوگ اپنے امام کو ناقص سمجھتے ہیں، تو کیا ناقص امام کی اقتداء میں ان کی نمازیں ادا ہو جائیں گی؟ جواب قرآن و حدیث کی روشنی میں الاعتصام میں شائع کریں۔

جواب: وہ مقتدی جو اپنے امام کو ناقص سمجھتے ہیں۔ اگر اس میں کوئی ایسا عیب ہے، جو شرعی طور پر امامت سے مانع ہے۔ مثلاً: کبائر کا مرتکب ہے، تو ایسی صورت میں امام ہذا کو لازماً بدل لینا چاہیے۔ کیونکہ امام متقی، پرہیز گار اور اخلاقِ حسنہ کا حامل ہونا چاہیے اور اگر اس کو ناقص سمجھنے کی کوئی دنیاوی وجہ ہے، تو بایں صورت مقتدیوں کو اظہارِ ندامت کرکے اپنے قبیح فعل سے تائب ہونا چاہیے اور آپس میں اخوتِ اسلامی کا مظاہرہ کرنا چاہیے۔ ورنہ اندیشہ ہے کہ ان کے اعمال میں نقصِ کبیر (بہت بڑا نقص) پیدا ہو جائے۔

سوال: ہمارے ایک نمازی بزرگ کے ہمارے امام صاحب کے ساتھ تعلقات کشیدہ ہیں نہ وہ امام صاحب سے بول چال کرتے ہیں نہ سلام دعا۔ بلکہ یوں کہیے کہ وہ امام صاحب کو دل سے پسند ہی نہیں کرتے مگر وہ ان کے پیچھے نماز پنجگانہ ادا کرتے ہیں۔ کیا ایسی صورت میں ان بزرگ صاحب کی نماز ہو جاتی ہے؟

جواب: امام صاحب سے تعلقات کشیدہ ہونے کے باوجود شخص ہذا کا اس کی اقتداء میں نماز ادا کرنا مستحسن فعل ہے۔ نماز قبول ہو جائے گی۔ ان شاء اللہ۔ البتہ نمازیوں اور متعلقین احباب کو چاہیے کہ ان دونوں کی آپس میں صلح کے لیے کوشاں رہیں۔ نبی اکرم ﷺ نے عام حالات میں تین دن سے زیادہ آپس کے بائیکاٹ سے سختی کے ساتھ منع فرمایا ہے۔ (واللّٰہ ولیّ التوفیق)

---

[1] صحیح مسلم، بَابُ بَیَانِ أَنَّ الدِّینَ النَّصِیحَۃُ ، رقم:۵۵

[2] سنن الدارقطنی، بَابُ تَخفِیفِ القِرَاءَۃِ لِحَاجَۃٍ، رقم:۱۸۸۱

ناقص کارکردگی والے شخص کو امام مسجد بنانا:

(سوال): مولوی صاحب کو اہل محلّہ نے جمعہ پڑھانے کے علاوہ بچوں کو بنیادی دینی تعلیم دینے کو کہا اس عرصہ میں جمعہ کبھی مولوی صاحب اور کبھی کوئی دوسرا پڑھاتا رہا۔ مگر بچے بنیادی دینی تعلیم سے بالکل محروم رہے۔ یہاں تک کہ دس سال میں ناظرہ تو دور کی بات ہے کسی ایک بچے کو بھی نماز صحیح طور پر نہیں سکھائی گئی۔ بالآخر چند افراد کو ہوش آیا انھوں نے راقم الحروف سے کہا مسجد میں تعلیم و تدریس کا سلسلہ قائم کرے۔ چنانچہ یکم جنوری ۱۹۹۸ء سے باقاعدہ آغاز ہوا۔ سات ماہ کے قلیل عرصہ میں کارکردگی کچھ یوں ہے:

۱۔ ناظرہ پڑھنے والے بچوں کی تعداد = ۱۶

۲۔ قرآن قاعدہ = ۱۰

۳۔ نماز اور دوسری دعائیں یاد کرنے والے بچے = ۱۰

تمام بچوں کو ضروری اور اہم دعائیں یاد کرانے کے علاوہ نماز وغیرہ سے متعلق عملی تربیت اور مشق کرائی جاتی ہے راقم کے اس کام کی وجہ سے مولوی صاحب اور ان کے بیٹے بہت ناراض ہو گئے اور بعض اوقات جمعہ کے خطبوں اور دوسری مجالس میں راقم پر فتوے داغنے کے علاوہ جی بھر کر گالیاں دیتے ہیں اور خوب تذلیل و رسوائی کرتے ہیں۔ (فالحمد للہ علی ذالک)

سوال یہ ہے کہ کیا ایسے مولوی صاحب کو (جس کو قرآن پاک کا ترجمہ بھی یاد نہیں) امام مسجد بنانا درست ہے؟

(جواب): بظاہر آپ کا موقف درست ہے فریق مخالف کو اپنی کوتاہیوں پر نظر ثانی کر کے تائب ہونا چاہیے۔ اگر حقیقی حال کچھ اور ہے تو رب العزت ہم سب کو ہدایت سے ہمکنار کر کے اتفاق و اتحاد کی توفیق عطا فرمائے! آمین!

(سوال): مندرجہ بالا ناقص کارکردگی کے حامل مولوی صاحب کا طرزِ عمل شریعت اسلامیہ کی نظر میں کیسا ہے؟

(جواب): اگر فی الواقع مولوی صاحب کا کردار یہی ہے، تو اسے توبہ تائب ہو کر اپنی اصلاح کرنی چاہیے ورنہ خطرہ ہے کہیں رب کی ناراضگی کی لپیٹ میں نہ آجائیں۔ اعاذنا اللہ منھا۔

(سوال): مذکورہ مولوی صاحب کے دو بیٹوں نے مسجد میں درس و تدریس کا سلسلہ قائم کرنے والوں کو کتے، گدھے جانوروں سے بدتر، بے ایمان، منافق کفار وغیرہ ناموں سے جمعہ وعید کے خطبوں کے دوران پکارا ہے۔ (نعوذ باللہ من ذالک) کیا ان لوگوں کو امام بنانا اور خطیب مقرر کرنا درست ہے؟

(جواب): مسلمان کے لائق نہیں کہ وہ مسلمان کو گالی گلوچ کرے۔ حدیث میں ہے: «سِبَابُ الْمُسْلِمِ

فُسُوقٌ وَ قِتَالُهُ كُفرٌ » [1] محترم ایسے موقع پر آپ کا فرض ہے کہ اسوۂ رسول ﷺ کو اپنے لیے قدوہ بناء کر عالی اخلاق کا مظاہرہ کریں۔ یہ کل کے دشمنوں کو دوست بنانے کا مجرب نسخہ ہے۔ اس طرح تیر کا نشانے پر لگنا یقینی امر ہے۔ ایسے امام کو فوراً امامت سے معزول کر دینا چاہیے۔ حدیث میں ہے: «اِجعَلُوا اَئِمَتَكُم خِيَارَكُم» [2] اور اگر وجہِ نزاع دنیاوی ہے، تو پھر آپس میں اصلاح کی سعی کرنی چاہیے۔ اندریں حالات امام کو امامت سے معزول نہیں کیا جا سکتا۔

کیا کلین شیو بھی بوقت ضرورت امام بن سکتا ہے؟

سوال: امامت کے لیے داڑھی کا کم از کم کتنا سائز شرط ہے۔ کیا کلین شیو بھی بوقتِ ضرورت امام بن سکتا ہے؟

جواب: امام کے لیے افضل یہ ہے کہ داڑھی پوری ہو، اور مٹھی سے کم کی صورت میں اجازت نہیں۔ کلین شیو کو امام مقرر نہیں کرنا چاہیے۔ تاہم اضطراری حالت میں کبھی اس کی اقتداء میں نماز پڑھ لی جائے، تو استغفار کرنا چاہیے۔ وہ رب رحیم قبول کرنے والا ہے۔

زنا کار امام کی اقتداء میں نماز کا حکم:

سوال: ایک فاضل عالم دین جس پر زنا کاری کا الزام ہو اور مختلف اوقات میں ایک سے زیادہ لڑکیوں (عورتوں) سے بدفعلی کرتے ہوئے دیکھا گیا ہو اور ہر بار ایک دو معززین اس فعل قبیح کے چشم دید گواہ ہوں اور بڑھتے بڑھتے پچاس سے زیادہ دیندار پکے مسلمان اس کے گواہ ہو جائیں تو آیا ایسا امام، امامت، نکاح، یا جنازہ و رسوماتِ دینی ادا کرنے کا اہل ہے؟

جواب: بشرطِ صحت سوال مذکور شخص امامت کے لائق نہیں۔ اسے فوراً منصب ہذا سے معزول کر دینا چاہیے۔ سنن ابوداؤد میں حدیث ہے: ایک شخص نے لوگوں کو نماز پڑھاتے وقت قبلہ کی طرف تھوک دیا۔ رسول اللہ ﷺ دیکھ رہے تھے۔ جب وہ نماز سے فارغ ہوا، تو آپ ﷺ نے فرمایا: کہ یہ شخص تمھیں پھر نماز نہ پڑھائے۔ اس شخص نے اس واقعہ کے بعد ان لوگوں کو پھر نماز پڑھانا چاہا، تو انھوں نے اس کو روک دیا، اور اس کو رسول اللہ ﷺ کا فرمان سنایا۔ اس نے رسول اللہ ﷺ کے پاس جا کر اس امر کو بیان کیا، تو آپ ﷺ نے فرمایا: ہاں۔ سائب بن خلاد راوی کہتا ہے کہ مجھے یہ گمان ہے کہ آپ ﷺ نے اس کو فرمایا: کہ تحقیق تو نے اللہ اور اس کے رسول کو اذیت دی۔ [1] ابوداؤد اور منذری نے اس حدیث پر سکوت کیا ہے۔

---

[1] صحیح البخاری، بَابُ خَوفِ المُؤمِنِ مِنْ أَنْ يَحبَطَ عَمَلُهُ وَهُوَ لَا يَشعُرُ، رقم:٤٨

[2] سنن الدارقطنی، بَابُ تَخفِيفِ القِرَاءَةِ لِحَاجَةٍ، رقم:١٨٨١

جب تھوڑی سی بات پر اس شخص کو امامت سے معزول کر دیا گیا۔ تو مرتکب کبیرہ گناہ، زنا کار کو فوراً امامت سے معزول کر دینا چاہیے۔صحیح بخاری میں ہے خلیفہ ثانی عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کو بسبب بیجا شکایت (بغیر شکایت) اہل کوفہ کی امامت و امارت کوفہ سے بسبب خوفِ فتنہ وفساد کے یا رعایت قوم کے (لوگوں کا لحاظ کر کے) معزول کر دیا تھا۔ ②

اس واقعہ سے معلوم ہوا کہ جس شخص کو امرِ دینی کے سبب مقتدی نہ چاہتے ہوں، اُسے امامت سے علیحدہ ہو جانا چاہیے۔ابوداؤد اور ابن ماجہ میں حدیث ہے کہ تین شخصوں کی نماز قبول نہیں ہوتی۔ان میں سے ایک وہ آدمی ہے، جو قوم کا امام ہے، لیکن نمازی اُسے پسند نہیں کرتے۔ ③

اور ایک روایت میں ہے کہ اگر تمھیں اپنی نمازوں کا قبول ہونا پسند ہے، تو چاہیے کہ تم میں سے بہتر اور پسندیدہ آدمی تم کو نماز پڑھائے۔اس لیے کہ امام تمہارے اور اللہ کے درمیان ایلچی ہیں۔

اس حدیث کی شاہد ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث ہے جس میں ہے کہ جو تمہارے درمیان برگزیدہ اور بہتر ہو، اس کو امام بنایا کرو۔ کیونکہ وہ تمہارے اور اللہ کے درمیان ایلچی ہے۔ امام مالک رحمہ اللہ کے نزدیک غیر عادل کی اقتداء میں نماز درست نہیں۔

علامہ شوکانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: جھگڑا تو امام غیر عادل کی جماعت کی صحت میں ہے، کراہت میں تو کوئی اختلاف ہی نہیں۔ یہ بھی یاد رہے کہ محض ذاتی اور دنیاوی عناد پر کسی کو امامت سے ہٹانا درست نہیں۔ ما بہ النزاع (موجودہ اختلافی معاملہ) میں بظاہر یہ معاملہ نہیں۔ (واللہ اعلم بحقیقة الحال والیه المرجع والمآب)

نفلی نماز میں ڈاڑھی کٹوانے والے حافظ قرآن کی امامت کا حکم:

سوال: کیا ڈاڑھی کٹوانے والے حافظِ قرآن کی امامت نفلی نماز میں جائز ہے؟ جب کہ اس سے بہتر و افضل حافظِ قرآن (امام وخطیب) موجود ہو جسے نمازیوں کی اکثریت چاہتی بھی ہے،اور نمازی حضرات ڈاڑھی کٹوانے والے حافظ امام کو ناپسند بھی کرتے ہوں۔

کیا ایسے حافظِ قرآن کا باپ جو خود بھی داڑھی کا خط کرواتا ہو مگر اس کی داڑھی مٹھ سے زائد ہو مگر متکبرانہ

---

① سنن أبی داؤد،بَابٌ فِی کَرَاهِیَةِ الْبُزَاقِ فِی الْمَسْجِدِ،رقم:۴۸۱

② صحیح البخاری،بَابُ وُجُوبِ الْقِرَاءَةِ لِلْإِمَامِ وَالْمَأْمُومِ فِی الصَّلَوَاتِ کُلِّهَا،......الخ،رقم:۷۵۵

③ سنن أبی داؤد،بَابُ الرَّجُلِ یَؤُمُّ الْقَوْمَ وَهُمْ لَهُ کَارِهُونَ ،رقم:۵۹۳

لہجے میں یہ کہے کہ میں اپنے فیصلے یا مسئلے میں کسی عالم دین یا مجتہد کے مسئلے کو نہیں مانتا کیا ایسے شخص کو فرض یا نفلی نمازوں میں امام بنانا جائز ہے؟

(جواب): نماز نفلی ہو یا فرض، دونوں کا حکم ایک جیسا ہے۔ ڈاڑھی کٹوانے والے حافظِ قرآن کی اقتداء میں نماز پڑھنا غیر درست ہے۔ بالخصوص ایک مُتَشَرِّع (شریعت کے پابند) انسان کی موجودگی میں ایسے شخص کو ہرگز امام مقرر نہیں کرنا چاہیے۔

"سنن دار قطنی" میں حدیث ہے: «اِجعَلُوا اَئِمَتَکُم خِیَارَکُم»[1]

یعنی اپنے امام بہتر لوگوں کو بنایا کرو۔ ہاں ایسا شخص جبرًا امام بن جائے اور مقتدی ہٹانے پر قادر نہ ہوں، تو اس صورت میں مقتدی مجرم نہیں نہ ان کی نماز میں کوئی خلل ہے۔

مذکورہ بالا صفات کے حامل انسان کو فوراً مصلی امامت سے معزول کر دینا چاہیے۔ صحیح حدیث میں ہے «کُلُّ اُمَّتِی مَعَافًی اِلَّا المُجَاهِرِینَ»[2] یعنی اللہ تعالیٰ میری ساری امت کو معاف کر دے گا ماسوا ان لوگوں کے جو علانیہ گناہ کے مرتکب ہوتے ہیں۔ شخص ہذا قطعاً امامت کے لائق نہیں۔ ﴿وَاللّٰهُ يَهدِى مَن يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّستَقِيمٍ﴾

جس امام کے اہل خانہ بے پردہ ہوں اس کی اقتدا کا حکم:

(سوال): شیخ الحدیث مولانا حافظ ثناء اللہ صاحب ......!! ایک حافظ قرآن امامت کرواتا ہے اس کی بیوی، ماں، ہمشیرگان وغیرہ پردہ نہیں کرتیں، ایسے حافظ، واعظ کو امام بنانا اور اس کے پیچھے نماز پڑھنا جائز ہے؟

(جواب): امام صاحب کو چاہیے کہ مشارٌ الیہ عورتوں کو پردے کی تلقین کرتے رہیں۔ اس طرح اُن کا فرض ادا ہو جائے گا، اور اُن کی امامت بھی درست ہوگی۔ لیکن اگر وہ اپنے فرض کی ادائیگی میں کوتاہی کرتے رہیں، تو گناہ میں وہ بھی شریک سمجھے جائیں گے اور ایسے امام سے واقعتاً نفرت کا اظہار ہونا چاہیے۔ حالات کے پیشِ نظر اُسے معزول بھی کیا جا سکتا ہے۔

جھوٹی قسم کھانے والے شخص کی امامت:

(سوال): کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اس مسئلہ میں کہ کوئی جھوٹی قسم اٹھا کر ناحق اور بے گناہ آدمیوں کو مجرم بنائے، جن کی سزا موت ہے، اور ۲۵ ہزار روپے لے کر سچی بات کہے اور اس کی اس حرکت کے باعث شر پیدا

---

[1] سنن الدارقطنی، بَابُ تَخفِيفِ القِرَاءَةِ لِحَاجَةٍ، رقم: ۱۸۸۱

[2] صحیح البخاری، بَابُ سَترِ المُؤمِنِ عَلَى نَفسِهِ، رقم: ۶۰۶۹

ہو اور دیہات کے لوگ دھڑوں میں تقسیم ہو جائیں۔ ایسا امام مسجد امامت کے قابل ہے اور اس کے پیچھے نماز ہو جاتی ہے؟

جواب : مذکورہ صفات کے حامل شخص کو فوراً امامت سے معزول کر دینا چاہیے۔ ''دارقطنی'' میں حدیث ہے:

«اِجعَلُوا اَئِمَّتَکُم خِیَارَکُم» [1] یعنی ''امام بہتر لوگوں کو بنایا کرو۔''

اسی طرح ''مشکوٰۃ المصابیح'' میں حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک شخص کو قبلہ کی طرف تھوکنے پر امامت سے معزول کر دیا تھا۔ [2]

مرقوم وجوہات کی بناء پر مذکورہ شخص بہت بڑا مجرم ہے۔ اس کو فی الفور مصلائے امامت سے علیحدہ کر دیا جائے اور اگر وہ زبردستی مصلائے امامت سے چمٹا رہے، اور مقتدی ہٹانے پر قادر نہ ہوں تو اس صورت میں مقتدی مجرم نہیں، اور نہ ان کی نماز میں کوئی خلل آئے گا۔ ان شاء اللہ۔

نا اہل لوگوں کی خطابت و امامت کا حکم:

سوال : مسجد کی خطابت کے لیے موجودہ زمانے میں کیا کوئی علمی معیار ہونا چاہیے یا نہیں؟ ایسا آدمی جو نہ تو کسی مدرسہ کا پڑھا ہو اور نہ ہی اس نے باقاعدہ کسی معلم سے دین کا علم سیکھا ہو، حتی کہ دنیاوی تعلیم بھی حاصل نہ کی ہو، خطابت کے فرائض انجام دے سکتا ہے؟

ایک صاحب جو سکول میں ساتویں یا آٹھویں جماعت تک پڑھ سکے اور غالباً اس نے دینی تعلیم بالکل حاصل نہیں کی، ترجمہ قرآن تک نہیں جانتے، پیشہ کے اعتبار سے درزی (ٹیلر ماسٹر) تھے۔ تقریباً ۵ برس سعودی عرب میں اسی حیثیت سے ملازمت بھی کرتے رہے ابتداء کچھ عرصہ تبلیغی جماعت کے ساتھ منسلک رہے ہیں اس لیے کچھ بول سکتے ہیں آج کل ایک مسجد کے خطیب بن بیٹھے ہیں۔ کیا ایسے شخص کی اقتداء میں نماز پڑھنا اور انھیں خطابت کی ذمہ داری سونپنا درست ہے؟ جو لوگ اس کام میں ان کے مدد و معاون ہیں ان کے بارے اور خود خطیب موصوف کے بارے میں شریعت کا کیا حکم ہے؟ نماز کی امامت کے لیے پہلی شرط قرآن کا زیادہ جاننا ہے کیا ایک حافظ قاری کی موجودگی میں ایک جاہل شخص کا از خود امامت کے لیے آگے بڑھنا اور امامت کا فریضہ ادا کرنا درست ہے؟

کافی عرصہ پہلے ایک خطیب صاحب سے یہ روایت سنی تھی کہ ایک بار حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ایک شخص کو

---

[1] سنن الدارقطني، بَابُ تَخفِيفِ القِرَاءَةِ لِحَاجَةٍ، رقم: ۱۸۸۱

[2] سنن أبي داؤد، بَابٌ فِي كَرَاهِيَةِ البُزَاقِ فِي المَسجِدِ، رقم: ۴۸۱

وعظ کرتے سنا تو اس سے دریافت کیا کہ کیا تم ناسخ ومنسوخ کا علم جانتے ہو؟ جواباً اس نے نفی کا اظہار کیا تو سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ: ''وعظ نہ کرو خود بھی گمراہ ہو گے اور دوسروں کو بھی گمراہ کرو گے۔'' کیا یہ روایت درست ہے؟ حوالہ درکار ہے۔

جواب: نااہل لوگ خطابت وامامت کے قطعاً حقدار نہیں صحیح حدیث میں ہے:

« اِذَا وُسِّدَ الاَمرُ اِلٰی غَیرِ اَھلِهٖ، فَانتَظِرِ السَّاعَةَ.»

یعنی ''معاملات جب نااہل لوگوں کے سپرد کردیے جائیں، تو قیامت کا انتظار کرنا چاہیے۔''

اس کے ہم معنی اور بھی بہت ساری روایات ہیں، جو کتب احادیث کی طرف مراجعت سے بآسانی دستیاب ہوسکتی ہیں۔ اہلِ علم کے لائق نہیں کہ جاہلوں کے لیے مدد ومعاون بنیں۔ ورنہ اس جرم میں وہ بھی شریک کار سمجھے جائیں گے۔ اہل کی موجودگی میں نااہل کو فرائض کی ادائیگی کے لیے آگے کرنا امانت میں خیانت ہے، جو جرم عظیم ہے۔قرآن میں ہے:﴿ اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُم اَن تُؤَدُّوا الاَمٰنٰتِ اِلٰى اَهلِهَا ﴾ ''اللہ تمھیں حکم دیتا ہے کہ امانتیں ان کے اہل کے سپرد کرو۔''

اہل کی موجودگی میں نا اہل کی اقتداء میں نماز نہیں پڑھنی چاہیے۔بصورت دیگر منتظمین ومعاونین حضرات سب کے سب عدالتِ الٰہی میں جوابدہ ہوں گے۔خطرہ ہے کہ کہیں نمازیں ضائع نہ ہوجائیں۔ پھر علماء کے بھی لائق نہیں کہ جرم یا گناہ ہوتا دیکھ کر خاموشی اختیار کریں۔ قیامت کے دن ہر آدمی سے اس کی ذمہ داری کی باز پرس ہوگی۔ اللہ رب العزت ہم میں فہمِ دین پیدا فرما کر فرائض کی ادائیگی کی کما حقہ توفیق بخشے۔ آمین! حضرت علی رضی اللہ عنہ کا قول علامہ بدر الدین زرکشی کی کتاب ''البرھان فی علوم القرآن'' میں موجود ہے۔ ملاحظہ ہو!(۲/۳۴)

فوٹوسٹوڈیو چلانے والا امام:

سوال: اگر مسجد کا خطیب یا امام جو مقامی جماعت کا امیر بھی ہے،فوٹوسٹوڈیو کی کمائی اس کا اہم ذریعہ معاش ہے، گھر میں ٹیلی ویژن ڈش بھی رکھتا ہے اس کے گھر میں غیرمحرم بھی عام آتے جاتے ہیں صرف نماز پڑھتے وقت سر ڈھانپتا ہے اور جمعے کے علاوہ کوئی نماز باجماعت ادانہیں کرتا۔کیا ایسا شخص دینی جماعت کا امیر رہ سکتا ہے؟ کیا اس کی اپنی نماز ہوجاتی ہے؟ کیا اس کے پیچھے مستقل نماز پڑھی جاسکتی ہے؟ اگر اس کے پیچھے نماز پڑھ کر دہرائی جائے تو؟

جواب: ایسے شخص کو جملہ فرائض اور واجبات سے فوراً معزول کردینا چاہیے۔ یہ امارت وامامت کے لائق

نہیں۔ ''دارقطنی'' میں حدیث ہے: « اِجعَلُوا اَئِمَّتَکُم خِیَارَکُم »[1]

''اپنے پیشوا بہتر لوگوں کو بنایا کرو۔''

نیز مشکوٰۃ المصابیح میں حدیث ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے ایک شخص کو قبلے کی طرف تھوکنے کی بناء پر امامت سے معزول کر دیا تھا۔[1] ایسے شخص کی اپنی نماز کا معاملہ اللہ کے سپرد ہے۔ جیسے اس کی مرضی ہو گی معاملہ کرے گا۔ ایسے شخص کی اقتداء میں اتفاقیہ نماز پڑھ لی جائے تو دہرانے کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ ان منہیات (حرام کاموں) کا مرتکب مجرم ہے کافر نہیں۔ لیکن مستقل امام نہیں بنانا چاہیے۔

جھوٹے اور بدعات میں ملوث شخص کی امامت:

سوال کیا ایسے شخص کے پیچھے نماز پڑھی جا سکتی ہے جو جھوٹ بولتا ہو، مسجد کے چندے کا حساب نہ دیتا ہو، گیارہویں وغیرہ کا کھانا کھاتا ہو یا دسویں، چالیسویں میں قرآن پڑھوا دیتا ہو؟

تعویذ دینا اور دم وغیرہ کرنا شریعت میں کیسا ہے؟ نیز کیا ایسے شخص کو امام مسجد بنایا جا سکتا ہے۔ خواہ وہ گھر میں پردے کی بھی پابندی نہ کرواتا ہو؟

جواب: مذکورہ بُرے خصائل کے مرتکب شخص کو مصلائے امامت سے معزول کر دینا چاہیے۔ اگر مقتدی اس کی معزولی پر قادر نہ ہوں، تو نماز کے لیے دوسری جگہ تلاش کرنی چاہیے۔ سنن دارقطنی میں حدیث ہے:

« اِجعَلُوا اَئِمَّتَکُم خِیَارَکُم »[3]

''اپنے امام بہتر لوگوں کو بناؤ۔''

ہاں البتہ اصلاحِ احوال کی صورت میں اس کی معزولی کا جواز نہیں ہوگا۔

شریعت کے مطابق دم کرنا جائز ہے، بشرطیکہ دم قرآن و سنت سے مأخوذ اور ان کے مطابق ہو۔ البتہ تعویذات سے پرہیز کرنا چاہیے۔ اگر یہ شرکیہ کلمات پر مشتمل ہوں، تو ایسے شخص کو امام نہیں بنانا چاہیے۔ نیز گھر میں پردے کی پابندی نہ کرانے والے امام کو اصلاح کی تلقین کرنی چاہیے اور اگر وہ اس میں لاپرواہی کا شکار ہے، تو اس کو بھی امام نہیں بنانا چاہیے۔

کثرت سے جھوٹ بولنے والا امام:

① سنن الدارقطنی، بَابُ تَخفِیفِ القِرَاءَۃِ لِحَاجَۃٍ، رقم: ۱۸۸۱

② سنن أبی داؤد، بَابٌ فِی کَرَاهِیَةِ البُزَاقِ فِی المَسجِدِ، رقم: ۴۸۱

③ سنن الدارقطنی، بَابُ تَخفِیفِ القِرَاءَۃِ لِحَاجَۃٍ، رقم: ۱۸۸۱

سوال امام کثرت سے جھوٹ بولتا ہے، کیا اس کے پیچھے نماز ہو جاتی ہے؟

جواب جھوٹ بولنے والے امام کو تبدیل کر دینا چاہیے۔ دار قطنی میں حدیث ہے کہ "امام بہتر لوگوں کو بنایا کرو۔"[1] اور اگر مقتدی اس کی تبدیلی پر قادر نہ ہوں تو اس کی اقتدا میں نماز تو ہو جائے گی لیکن پسندیدہ عمل نہیں۔

صحیح بخاری باب إمامة المفتون کے تحت حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا قول ہے:

«الصَّلَاةُ أَحْسَنُ مَا يَعْمَلُ النَّاسُ، فَإِذَا أَحْسَنَ النَّاسُ، فَأَحْسِنْ مَعَهُمْ، وَإِذَا أَسَاءُ وا فَاجْتَنِبْ إِسَاءَ تَهُمْ»

یعنی "نماز بہترین کام ہے جو لوگ کرتے ہیں۔ جب لوگ اچھا کام کریں تو تو بھی ان کے ساتھ اچھائی کر اور جب برا کریں تو ان کی برائی سے بچ"۔

اس پر حافظ ابن حجر رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

«وفيه ان الصلاة خلف من تكره الصلاة خلفه اولى من تعطيل الجماعة »[2]

"اس روایت میں یہ مسئلہ ہے کہ جس کی اقتدا میں نماز پڑھنا مکروہ ہو، جماعت ترک کرنے سے بہتر ہے کہ اس کی امامت میں نماز پڑھ لی جائے۔"

سوال: اگر امام اور خطیبِ مسجد میں درج ذیل خصلتیں پائی جاتی ہوں۔ (۱) جھوٹ بولنا (۲) وعدہ خلافی کرنا (۳) الزام تراشی، غیبت، بہتان بازی، شرانگیزی (۴) مسجد کے چندے کا حساب نہ دینا (۵) مسجد کی چیزوں کو باوجود روکنے کے ذاتی استعمال میں لانا (۶) زیور اور جائیداد گروی رکھ کر اس پر منافع، سود دینا (۷) اپنے مفاد کی خاطر سرکاری کارندوں کو رشوت دینا (۸) احتجاج کرنے والوں سے بدزبانی کرنا (۹) اپنے آپ کو عالم اور باقی سب کو جاہل کہنا وغیرہ۔

قرآن وسنت کی روشنی میں راہنمائی فرمائیں کہ ایسا شخص امامت وخطابت کا اہل ہے؟

جواب: "سنن دار قطنی" میں حدیث ہے کہ "اپنے امام بہتر لوگوں کو بنایا کرو۔"[3] لہٰذا امام ہذا کو فوراً مصلائے امامت سے علیحدہ کر دینا چاہیے۔ ہاں اگر ان بدخصائل کا حامل آدمی زبردستی خطابت وامامت سے

[1] سنن الدارقطنی، بَابُ تَخفِيفِ القِرَاءَةِ لِحَاجَةٍ، رقم:۱۸۸۱

[2] فتح الباری: ۲/ ۱۹۰

[3] سنن الدارقطنی، بَابُ تَخفِيفِ القِرَاءَةِ لِحَاجَةٍ، رقم:۱۸۸۱

چمٹا رہے، اور مقتدی اس کی معزولی پر قادر نہ ہوں، تو ایسی صورت میں مقتدی مجرم نہیں، اور نہ ان کی نماز میں کوئی خلل واقع ہوگا۔

عمداً جھوٹ بولنے والے شخص کی امامت:

(سوال) : اگر کوئی شخص کسی دوسرے فرد کو نقصان پہنچانے کے لیے جان بوجھ کر جھوٹ بولے تو کیا اس کے پیچھے نماز پڑھنا جائز ہے؟

(جواب) : عمداً جھوٹ بولنے والے آدمی کو امام نہیں بنانا چاہیے۔ ''دارقطنی'' میں حدیث ہے:

«اِجعَلُوا اَئِمَتَکُم خِیَارَکُم»[1]

''اپنے امام بہتر لوگوں کو بنایا کرو۔''

(سوال) : اگر کوئی شخص کسی کو نقصان پہنچانے یا بدنام کرنے کے لیے اپنی بیوی سے کسی پر غلط الزام لگوائے تو کیا اس کے پیچھے نماز پڑھنا جائز ہے یا نہیں؟

(جواب) : بالاقبیح خصلت سے متصف امام کو سخت الفاظ میں تنبیہ کرنی چاہیے۔ پھر بھی اگر وہ اس حرکت شنیعہ (بُری حرکت) سے باز نہ آئے تو فرائض امامت سے سبکدوش کر دیا جائے۔ کیونکہ امام کو تو مقتدیوں کے لیے قدوۂ حسنہ (اچھا نمونہ) ہونا چاہیے جب کہ اس میں اہلیت ہی مفقود ہے۔

ناانصافی کرنے والے کی امامت:

(سوال) : ہمارا گاؤں ''یوگو'' پورے بلتستان میں ٪۱۰۰ اہل حدیث آبادی والا گاؤں ہے۔ مسلم عرب این جی اوز (NGOs) ہر سال جامعہ دارالعلوم بلتستان کے توسط سے پورے بلتستان کے اہلِ حدیث حضرات میں قربانی کے جانور تقسیم کرتی ہیں۔ ہمارے گاؤں کے تمام لوگ اہلِ حدیث ہونے کے باوجود دو سیاسی دھڑوں میں تقسیم ہیں۔ دارالعلوم غواڑی کی طرف سے قربانی کے جانور جس پارٹی کے سپرد کیے جاتے ہیں، وہ لوگ ان کو پورے گاؤں پر تقسیم کرنے کی بجائے صرف اپنے من پسند لوگوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ اگر کوئی مفلس نادار، بیوہ، غریب، ضرورت مند لوگ ان کے پاس قربانی کا گوشت مانگنے کے لیے جائیں تو ان کو دھتکار دیتے ہیں، محض اسی لیے کہ ان کی پارٹی سے تعلق نہیں رکھتے۔ علاوہ ازیں وہ آپس میں بھی انصاف نہیں کرتے۔ غرباء و مساکین کو اوجھڑی، انتڑیاں اور چھیچھڑے دیتے ہیں جب کہ اچھا اور صاف گوشت اپنی

[1] سنن الدارقطنی، بَابُ تَخفِیفِ القِرَاءَۃِ لِحَاجَۃِ، رقم: ۱۸۸۱

پارٹ کے بڑے لوگوں کے گھروں میں بھیج دیتے ہیں اور اس کام میں گاؤں کا امام اور خطیب بھی برابر کا شریک ہوتا ہے۔ دارالعلوم کے ارباب حل وعقد اختیارات رکھنے کے باوجود اس کام پر خاموش رہتے ہیں، کیا اس ناانصافی میں وہ برابر کے شریک نہیں؟ ایسے امام وخطیب کو منصبِ امامت وخطابت پر فائز رہنا چاہیے یا نہیں اور یہ کہ ایسے امام کے پیچھے جمعہ ونماز پڑھنا کیسا ہے؟ نماز کا کیا ہوگا۔

(جواب): «اَلدِّینُ النَّصِیحَة »[1] کے پیشِ نظر صورتِ حال سے اصل ذمہ داروں کو آگاہ کرنا چاہیے، کہ وہ اس کوتاہی کے ازالے کی طرف توجہ دیں اور جو لوگ اس کوتاہی میں ملوث ہیں، بطریقِ احسن ان سے بھی بات چیت ہونی چاہیے۔ ممکن ہے کہ اصلاحِ احوال کا کوئی پہلو نکل سکے، تاہم اس امام اور اس قبیل کے لوگوں کی اقتداء میں نماز باجماعت ترک نہیں کرنی چاہیے۔''صحیح بخاری میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا قول ہے:

« اَلصَّلَاةُ اَحسَنُ مَا یَعمَلُ النَّاسُ ، فَإِذَا أَحسَنَ النَّاسُ ، فَاَحسِن مَعَهُم، وَإِذَا اَسَاؤُوا فَاجتَنِب إِسَاءَ تَهُم»[2]

''لوگوں کا سب سے بہتر عمل نماز ہے، چنانچہ ان کے تمام نیک کاموں میں شریک رہو اور اگر وہ کوئی برائی کریں تو برائی سے اجتناب کرو۔''

بدعہد امام کی اقتداء:

(سوال): ایک شخص اور اہل محلّہ کے مابین مسجد میں بالتکرار عہد و پیمان بندھا کہ وہ شخص اہل محلّہ کا امام مسجد ہے۔ فریقین نے شرائط کے ساتھ بار بار عہد کیا اہل محلّہ تو اپنے عہد پر قائم رہے مگر وہ شخص (امام مسجد) اپنے وعدے سے بلا وجہ پھر گیا بلکہ دراصل وہ شخص ''عادی عہد توڑ'' ہے کیا ایسے شخص کو امام بنانا درست ہے؟ جب کہ وعدہ توڑنا ازروئے حدیثِ علامت نفاق ہے اور مشکوٰۃ کی حدیث نمبر ۷۴۷، کے مطابق تو محض قبلہ کی طرف تھوکنے والے کو معزول کر دیا گیا تھا۔

(جواب): مذکور امام کو عہد پر پورا نہ اترنے کی صورت میں امامت سے معزول کیا جا سکتا ہے۔ قرآن مجید میں ہے:

﴿یٰاَیُّهَا الَّذِینَ اٰمَنُوا اَوفُوا بِالعُقُودِ﴾ (المائدۃ:۱)

''اے ایمان والو! اپنے اقراروں کو پورا کرو۔''

﴿ وَ اَوفُوا بِالعَهدِ اِنَّ العَهدَ کَانَ مَسئُولًا ﴾ (الاسراء:۳۴)

---

[1] صحیح مسلم، بَابُ بَیَانِ أَنَّ الدِّینَ النَّصِیحَةُ ، رقم:۵۵

[2] صحیح البخاری، باب امامة المفتون والمبتدع ،رقم: ۶۹۵

''اور عہد کو پورا کرو کہ عہد کے بارے میں ضرور سوال ہوگا۔''

امام کے پیچھے ذاتی رنجش کی بناء پر نماز نہ پڑھنا:

سوال: کسی امام کے پیچھے ذاتی رنجش کی بناء پر نماز نہ پڑھنا کیسا ہے جب کہ اس میں کوئی شرعی نقص نہ ہو؟

جواب: کسی امام کی اقتداء میں محض اپنی ذات رنجش کی بناء پر نماز نہ پڑھنا پُر خطر عمل ہے۔ اس پر نظر ثانی کرنا از بس ضروری ہے۔

نابالغ بچے کی امامت

نابالغ لڑکے کی امامت کا حکم:

سوال: نابالغ لڑکے کی امامت ازروئے شریعت کیسی ہے؟

جواب: ممیّز (سمجھ دار) بچے کی امامت درست ہے۔ صحیح بخاری میں ہے۔ چھ سات سال کا بچہ عہدِ نبوت میں اپنی قوم کا امام تھا۔[1]

تعلیم و تربیت اور اہلیت کی غرض سے نابالغ بچے کی امامت:

سوال: راقم مسجد میں امامت کا فریضہ سرانجام دیتا ہے۔ طلبہ (دینی تعلیم کے) باجماعت نماز ادا کرتے ہیں جب کہ بڑے لوگوں میں سے کبھی ایک کبھی دو اور کبھی کوئی بھی نہیں ہوتا۔ راقم الحروف ہفتہ میں ایک دو بار جہری نمازوں میں صحیح قرأت کرنے والے سمجھدار لڑکے کو (برائے تربیت و مشق) امامت کے لیے کھڑا کر دیتا ہے تاکہ وہ بوقتِ ضرورت امامت کرا سکے۔ کیا یہ طرزِ عمل درست ہے؟

جواب: بغرض تعلیم و تربیت اور اہلیت کی بناء پر ممیّز بچے کو امام بنانے کا کوئی حرج نہیں۔

سولہ سالہ لڑکے کی امامت:

سوال: ہمارے گاؤں کے بوڑھے امام مسجد کے معاشی اور گھریلو حالات انتہائی خراب ہیں۔ ۳ لاکھ روپے کا قرض اور ۲ بیٹیوں کی شادی کا مسئلہ بھی درپیش ہے، خود بیمار ہے اور بیوی کینسر سے فوت ہو چکی ہے۔ کیا گاؤں کے رہائشی اسے قربانی کی کھالیں دے سکتے ہیں؟ نیز بعض مرتبہ وہ بیماری کے باعث اپنے ۱۶ سالہ بیٹے کو امامت کے لئے بھیجتا ہے جو قرآن کو سمجھتا اور نماز کے تمام مسائل سے واقف ہے۔ کیا اس کے پیچھے فرض

[1] صحیح البخاری کتاب المغازی

نماز ہوسکتی ہے؟

جواب جملہ مستحقین کے حقوق کا خیال رکھتے ہوئے اور امام ہذا کے فقر و فاقہ اور ضروریاتِ زندگی کے پیش نظر اس کو قربانی کی کھالیں دی جاسکتی ہیں۔ علاوہ ازیں ۱۶ سالہ نوجوان کی اقتدا میں نماز ہوجاتی ہے بشرطیکہ وہ ضروری مسائل اِمامت سے واقف ہو۔

سوال: کیا سولہ سال کے نوجوان کی امامت میں نماز پڑھنا درست ہے جب کہ وہ دین کے بنیادی مسائل سے واقف ہو؟

جواب: سولہ سال کے نوجوان کی اقتداء میں نماز ہوجاتی ہے، بشرطیکہ وہ ضروری مسائلِ امامت سے واقف ہو۔

نابالغ بچہ صرف حافظ قرآن ہونے کی بناء پر تراویح پڑھا سکتا ہے؟

سوال: کیا کوئی نابالغ بچہ صرف حافظ قرآن ہونے کی بناء پر رمضان میں تراویح کی یا غیر رمضان میں نماز کی امامت کروا سکتا ہے، جبکہ بالغ باشرع پختہ مشق حفاظ بھی موجود ہوں اور نابالغ حافظ نماز بے قاعدگی سے ادا کرتا ہو؟

جواب: نابالغ باشعور بچہ اہلیت کی بنیاد پر امامت کرا سکتا ہے۔ صحیح بخاری وغیرہ میں عمرو بن سلمہ رضی اللہ عنہ کا قصہ اس امر کی واضح دلیل ہے۔ اس کا اپنا بیان ہے کہ «فَكُنْتُ اَحفَظُ ذٰلِكَ الكَلَامَ» "جو کلام لوگ نقل کرتے، میں اسے یاد کر لیتا۔"[1]

سنن ابی داؤد کی روایت میں ہے کہ

«كُنتُ غُلَامًا حَافِظًا، فَحَفِظتُ مِن ذٰلِكَ قُرآنًا كَثِيرًا.»[2]

''میں یاد کرنے والا بچہ تھا۔ میں نے بہت سارا قرآن اس طرح (لوگوں سے سُن سُن کر) یاد کر لیا تھا۔''

بعض حنفیہ وغیرہ نے اس پر اعتراض کیا ہے کہ اس کی امامت کا حکم نبی ﷺ نے نہیں فرمایا تھا۔ لہٰذا یہ واقعہ قابل حجت نہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ زمانۂ وحی میں کسی واقعے کا وقوع پذیر ہونا، اور ہوتے رہنا، جواز کی دلیل ہے۔ حضرت ابوسعید اور جابر رضی اللہ عنہما نے عزل کے جواز پر دلیل اس امر سے قائم کی کہ عہدِ نبوت میں عزل ہوتا تھا، اور اس سے روکا نہیں گیا۔ اگر یہ فعل ناجائز ہوتا تو اللہ اپنے نبی کو اس بات سے آگاہ فرما دیتا

[1] صحیح البخاری، رقم: ۴۳۰۲

[2] سنن أبی داؤد، بَابُ مَنْ أَحَقُّ بِالْإِمَامَةِ، رقم: ۵۸۵

﴿وَمَا كَانَ رَبُّكَ نَسِيًّا﴾ جس طرح بحالتِ نماز آپ ﷺ کی طرف وحی نازل ہوئی کہ جوتے میں گندگی لگی ہے، تو آپ ﷺ نے اس کو اتار دیا۔ اسی طرح معاملہ یہاں بھی ہوسکتا تھا۔ لہٰذا عمرو بن سلمہ رضی اللہ عنہ کو امامت سے منع نہ کرنا جواز کی دلیل ہے۔ مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو! مرعاۃ المفاتیح (۱۱۲/۲ تا ۱۱۴)

حضرت عمرو بن سلمہ رضی اللہ عنہ فرض نماز میں امام تھے۔ وتر اور تراویح تو فرضوں کی نسبت معمولی شئی ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: ہم (عورتیں) معلّموں سے نابالغ لڑکے لاکر ان کو امام بنا لیتیں۔ وہ ہم کو ماہِ رمضان میں نماز پڑھاتے، ہم ان کو (بطورِ خدمت) بھنا ہوا گوشت اور گندم کی روٹی کھلا دیا کرتی تھیں۔ اس سے ثابت ہوا کہ نابالغ بچے گھروں میں عورتوں کو تراویح پڑھاتے تھے۔ ابن شہاب زہری رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''نابالغ بچے جو نماز پڑھنا اور قرآن پڑھنا جانتے تھے، وہ رمضان اور غیر رمضان میں لوگوں کو نمازیں پڑھاتے تھے''۔ (قیام اللیل: صفحہ ۱۷۴ باب إمامة الغلام الادرلم يحتلم فى رمضان وغیرہ، تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو: مرعاۃ المفاتیح (۱۱۲/۲ تا ۱۱۴)

پنجگانہ فرض نمازوں کے احکام ومسائل

قیام کے احکام ومسائل

نماز کے لیے نیت کرنا

زبان ہلائے بغیر دل ہی دل میں نیت:

سوال: نماز کے آغاز میں دل ہی دل میں زبان ہلائے بغیر نیت کے الفاظ دہرا لینا جائز ہے یا نہیں؟ نیز ایک شخص نے حضورِ قلب کے بغیر نماز شروع کر دی یعنی یہ احساس کیے بغیر کہ کونسی نماز ہے تو اس کی نماز ہو جائے گی یا نہیں؟

جواب: اصل ''نیت'' دِل کے پختہ ارادہ کا نام ہے۔ دل ہی دل میں تکرار کی چنداں ضرورت نہیں۔ ماسوائے اس کے کہ اس کو توہم سے تعبیر کیا جائے۔ بایں صورت اگر تو احساسِ نیت نمایاں ہے۔ نماز ہو جائے گی۔ (ان شاء اللہ) بصورتِ دیگر اِعادہ ضروری ہے۔

نیت دل سے یا زبان سے کریں؟

سوال: میں جب نماز کے لیے کھڑا ہوتا ہوں تو دل ہی دل میں بغیر زبان ہلائے یہ دہرا لیتا ہوں کہ آج کی فلاں نماز (مثلاً مغرب) کے فرض یا سنتیں ادا کر رہا ہوں یا صلوٰۃ الحاجت پڑھ رہا ہوں یا صلوٰۃ استخارہ وغیرہ۔ یہ بدعت تو نہیں۔ نیز دل میں نیت کرتے وقت کیا کیا دل میں لانا ضروری ہے۔ (یعنی نماز کا وقت، استقبال کعبہ وغیرہ) جس کے بغیر نماز نہیں ہوتی۔

جواب: دل کے پختہ ارادہ کا نام نیت ہے۔ اقامتِ نماز کے لیے صرف موجود فی الذہن نماز کا تصور ہی کافی ہے۔ مزید کسی شے کے اعادہ کی ضرورت نہیں۔ امام نووی رحمہ اللہ نے فرمایا ہے: کہ ''نیت کا معنی ''قصد'' اور دل کا پختہ ''ارادہ'' ہے اور امام بیضاوی نے کہا ہے کہ ''نیت'' سے مراد: ''دل کا اس چیز کی طرف اٹھنا جس کو وہ اپنی کسی غرض کے موافق سمجھے، جو حصولِ نفع یا دفعِ ضرر کے لیے اس وقت ہو یا کبھی آئندہ۔'' اور شریعت میں نیت اس ارادے کو کہتے ہیں، جو اللہ کی رضا اور اس کے حکم کی تعمیل کے لیے کسی کام میں اٹھے۔ [1]

---

[1] نيل الأوطار: ١٤٨/١

علامہ ابن القیم ''زاد المعاد'' میں فرماتے ہیں: نبی اکرم ﷺ جب نماز کے لیے کھڑے ہوتے تو ''اللہ اکبر'' کہتے۔ اس سے پہلے کچھ نہ کہتے۔ آپ ﷺ نے کبھی زبان سے نیت کا لفظ نہیں بولا اور نہ کبھی یہ کہا کہ میں اللہ کے لیے پڑھتا ہوں، فلاں نماز قبلہ رُخ ہو کر چار رکعت۔ امام یا مقتدی بن کر، اداء یا قضاء، وقتی فرض (ظہر عصر وغیرہ) اور یہ دس بدعتیں ہیں۔ رسول اللہ ﷺ سے کسی نے کبھی صحیح یا ضعیف، مرسل یا متصل قطعاً کوئی لفظ نقل نہیں کیا بلکہ کسی صحابی سے بھی نہیں۔

نماز شروع کرنے سے پہلے زبان سے نیت کرنا:

سوال: نماز شروع کرنے سے پہلے زبان سے نیت کرنا کیا ضروری ہے؟ بعض حضرات کہتے ہیں کہ یہ بدعت ہے حضور ﷺ سے ثابت نہیں اور بعض احباب کہتے ہیں کہ پہلے زبان سے نیت کرنا ضروری ہے۔ تفصیل سے جواب دیں؟

جواب: عربی زبان میں لفظِ نیت کے معنی ''قصد وارادہ'' کے ہیں۔ ظاہر ہے کہ قصد اور ارادہ دل کا فعل ہے اور اہلِ شرع نے اس کی تعبیر یوں کی ہے: « تَعَلُّقُ القَلبِ نَحوَ الفِعلِ إِبتِغَاءَ لِمَرضَاةِ اللّٰهِ .» یعنی ''اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل کرنے کی خاطر دل کو کسی فعل وعمل کے متعلق کر دینے کا نام نیت ہے۔''

اس سے معلوم ہوا کہ زبانی کلامی کے بجائے نیت صرف دل ہی سے ہونی چاہیے۔ پھر نبی اکرم ﷺ کی نماز کی جملہ تفصیل حدیث کی کتابوں میں موجود ہے۔ کسی ایک بھی روایت سے ثابت نہیں ہو سکا، کہ آپ ﷺ نے زبانی ''نیت'' کا اظہار کیا ہو۔ بلکہ صحیح مسلم میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے:

« كَانَ يَفتَتِحُ الصَّلٰوةَ بِالتَّكبِيرِ ، وَ القِرَاءَةَ بِالحَمدِ لِلّٰهِ رَبِّ العَالَمِينَ .»[1]

یعنی ''نبی اکرم ﷺ ''اَللّٰهُ اَكبَرُ'' سے نماز شروع کرتے اور قرأت کا آغاز '' اَلحَمدُ لِلّٰهِ رَبِّ العَالَمِينَ'' سے کرتے۔''

اور اعرابی والی روایت میں ہے:

« اِذَا قُمتَ إِلَى الصَّلٰوةِ فَكَبِّر ، ثُمَّ اقرَأ مَا تَيَسَّرَ مَعَكَ مِنَ القُراٰنِ .»[2]

یعنی ''جب تو نماز کے لیے کھڑا ہو تو تکبیر کہہ۔ پھر بآسانی قرآن سے جو پڑھ سکتے ہو، پڑھو۔''

ایک اور روایت میں الفاظ یوں ہیں:

---

[1] صحیح مسلم، بَابُ مَا يَجمَعُ صِفَةَ الصَّلَاةِ وَمَا يُفتَتَحُ بِهِ ......الخ، رقم: ٤٩٨

[2] صحیح مسلم، باب: اقرَأُ مَا تَيَسَّرَ مَعَكَ مِنَ القُرآنِ، رقم: ٣٩٧

«تَحرِیمُهَا التَّکبِیرُ، وَ تَحلِیلُهَا التَّسلِیمُ.»[1]

یعنی ''تکبیر سے نماز میں داخل ہوتا ہے اور سلام سے فارغ ہوتا ہے۔''

ان نصوص سے معلوم ہوا کہ زبانی ''نیت'' کا شرع میں کوئی وجود نہیں۔ بعد کے اَدوار میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے ائمہ عظام تک کوئی فرد بھی اس بات کا قائل نظر نہیں آتا۔ بلکہ مولانا محمد عبد الحی حنفی "آکام النفائس" میں رقمطراز ہیں:

''زبانی ''نیت'' کا مسئلہ مجھ سے بہت دفعہ پوچھا گیا، کہ آیا یہ رسول اللہ ﷺ اور انکے اصحاب سے ثابت ہے یا نہیں؟ اور آیا شرع میں اس کی کوئی اصل بھی ہے؟ تو میں نے یہی جواب دیا، کہ نہ تو شارع ہی سے ثابت ہوا، اور نہ ان کے صحابیوں میں سے کسی ایک سے ثابت ہوا۔''

اور علامہ ابن قیم رحمہ اللہ زاد المعاد میں فرماتے ہیں: کہ رسول اللہ ﷺ جب نماز کے لیے کھڑے ہوتے تو " اللّٰہ اکبر "فرماتے اور اس سے پہلے کچھ نہ فرماتے اور نہ یوں کہتے، کہ میں فلاں نماز کی چار رکعت کعبہ کی طرف منہ کر کے امام یا مقتدی ہو کر پڑھتا ہوں اور نہ اداء یا قضاء یا فرض کا نام لیتے۔ جب کہ یہ سب بدعات ہیں۔ کسی نے آپ سے نقل نہیں کیا، نہ سندِ صحیح سے، اور نہ سندِ ضعیف سے، نہ مسند سے، اور نہ مرسل سے۔ بلکہ آپ کے صحابہ (رضی اللہ عنہم) میں سے بھی کسی سے منقول نہیں ہوا۔ اور تابعین میں سے بھی کبھی کسی نے اس کو مستحب نہیں کہا اور نہ چاروں اماموں نے'' علامہ موصوف کی اس عبارت کو صاحبِ "مرقاۃ" علامہ ملا علی قاری حنفی نے بھی "مرقاۃ" میں نقل کیا ہے اور فقیہ ابن الہمام حنفی ''فتح القدیر''، ''شرح ہدایہ'' میں فرماتے ہیں: کہ بعض حُفّاظِ حدیث نے کہا ہے، کہ رسول اللہ ﷺ سے نہ تو صحیح طریق سے ثابت ہے، اور نہ ضعیف سے، کہ آپ شروع نماز کے وقت کہتے ہوں، کہ میں فلاں نماز پڑھتا ہوں اور نہ تابعین میں سے کسی سے ثابت ہوا۔ بلکہ آپ سے تو یہی منقول ہے کہ جب نماز کے لیے کھڑے ہوتے تو ''اَللّٰہُ اَکبَرُ'' فرماتے۔ لہٰذا یہ بدعت ہے۔

جملہ نقول سے مقصود صرف یہ ہے، کہ نماز شروع کرنے سے پہلے زبانی کلامی نیت کا شریعت میں کوئی وجود نہیں۔ بہرصورت اس سے احتراز ضروری ہے۔ حدیث میں ہے:

«مَن أَحدَثَ فِي أَمرِنَا هٰذَا مَا لَیسَ مِنهُ فَهُوَ رَدٌّ»[2]

''جو دین میں اضافہ کرے وہ مردود ہے۔''

---

[1] سنن أبی داؤد، بَابُ الْإِمَامِ يُحدِثُ بَعدَ مَا يَرفَعُ رَأْسَهُ مِنْ آخِرِ الرَّكعَةِ، رقم: ٦١٨

[2] صحیح البخاری بَابُ إِذَا اصطَلَحُوا عَلَى صُلحِ جَورٍ فَالصُّلحُ مَردُودٌ، رقم: ٢٦٩٧)

تعوذ اور تسمیہ کے مسائل

نماز پڑھتے وقت تکبیرِ تحریمہ سے پہلے بسم اللہ پڑھیں یا اعوذ باللہ؟

سوال: نماز پڑھتے وقت تکبیرِ تحریمہ سے پہلے ''بسم اللہ'' یا ''اعوذ باللہ'' یا کوئی اور چیز پڑھنا ضروری ہے؟ اگر ضروری ہے تو واضح کیجیے کہ کونسی چیز پڑھی جائے اور نہ پڑھنے سے نماز پر اثر پڑتا ہے کہ نہیں؟

جواب تکبیرِ تحریمہ سے پہلے کچھ بھی پڑھنا ثابت نہیں۔لہٰذا ''بہ نیت'' تکبیر تحریمہ سے نماز کا آغاز کردینا چاہیے۔

امام تکبیر بلند آواز کہے اور مقتدی آہستہ آواز سے، اس کی دلیل کیا ہے؟

سوال: امام تکبیر بلند آواز سے کہتا ہے مقتدی آہستہ آواز سے۔اس کی کیا دلیل ہے؟

جواب: امام جو بلند آواز سے تکبیر کہتا ہے۔ یہ مقتدیوں کو سنانے کے لیے ہے، تاکہ مقتدی اس کی اقتداء کر سکیں اور مقتدی چونکہ اپنے لیے تکبیر کہتا ہے۔اس لیے اسے تکبیر میں آواز بلند کرنے کی ضرورت نہیں۔ البتہ بوقتِ ضرورت مقتدی سامع کی حیثیت سے آواز بلند کرسکتا ہے۔

صحیح حدیث میں ہے:

« فَإِذَا كَبَّرَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَبَّرَ أَبُو بَكْرٍ لِيُسْمِعَنَا »[1]

یعنی ''جب رسول اللہ ﷺ نے تکبیر کہی، تو ابوبکر نے تکبیر کہی، تاکہ ہمیں سنائے۔''

اس حدیث سے معلوم ہوا، کہ عام حالات میں مقتدی آہستہ تکبیر کہے۔

تکبیر تحریمہ کے بعد تمام مختلف مسنون دعائیں پڑھی جاسکتی ہیں؟:

سوال تکبیر تحریمہ کے بعد نبی ﷺ سے کئی دعائیں ثابت ہیں۔کیا بیک وقت دو یا تین دعائیں پڑھی جاسکتی ہیں یا صرف ایک وقت میں ایک دعا پڑھنی چاہیے؟

جواب افتتاحِ صلوٰۃ میں صرف کسی ایک دعا کو اختیار کیا جائے، متعدد اَدعیہ کو جمع کرنا ثابت نہیں۔

''ثناء'' نماز کی تمام رکعتوں میں پڑھی جائے گی یا صرف ابتدائی رکعت میں؟

سوال: کیا ''ثناء'' نماز کی تمام رکعتوں میں پڑھی جائے گی یا صرف ابتدائی رکعت میں؟

---

[1] صحيح مسلم، بَابُ اِئْتِمَامُ الْمَأْمُومِ : رقم:٤١٣، سنن النسائی، بَابُ الِائْتِمَامِ بِمَن يَأْتَمُّ بِالإِمَامِ، رقم:٧٩٨

جواب: ثناء صرف پہلی رکعت میں ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے:

«كَانَ رَسُولَ ﷺ اِذَا افْتَتَحَ الصَّلَاةُ قَالَ: سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَ بِحَمْدِكَ ...... » الخ [1]

''رسول اللہ ﷺ جب نماز کا آغاز کرتے، تو سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَ بِحَمْدِكَ...... الخ پڑھتے''

باجماعت نماز میں ثناء پڑھ کر شامل ہوں یا کہ صرف سورہ فاتحہ؟

سوال: امام کے ساتھ بعد میں ملنے والا شخص جس سے چند رکعت جماعت سے فوت ہو چکی ہوں ثناء پڑھ کر شامل ہو یا کہ صرف سورہ فاتحہ؟ ایسے وقت میں مقتدی شامل ہوا کہ امام کی رکعت بھی پہلی ہو۔ اگر ثناء پڑھی تو سورہ فاتحہ رہ جائے گی۔ اگر فاتحہ پڑھ لی تو رکعت ہو جائے گی مگر ثناء تو رہ جائے گی۔ رہ جانے کی صورت میں ثناء کا کیا حکم ہے؟ یہ تو ٹھیک ہے کہ ثناء سنت ہے۔ تفصیل بیان کریں اور اگر مقتدی امام کے ساتھ دو رکعت میں شامل ہوا دو ابھی باقی ہیں تو امام جب نماز پوری کرنے کے لیے آخری تشہد میں درود اور دعا پڑھے گا آدھی نماز میں شامل ہونے والا مقتدی تشہد کہاں تک پڑھے گا؟ پورا تشہد درود اور دعا یا صرف تشہد؟

جواب: صرف ''فاتحہ'' پر اکتفاء کیا جائے۔ کیونکہ نماز میں اس کی تلاوت ضروری ہے اور ثناء کا پڑھنا ضروری نہیں۔ صرف مسنون ہے۔ بعد میں شامل ہونے والا مقتدی امام کے ساتھ درود اور ادعیہ وغیرہ بھی پڑھ سکتا ہے۔ ملاحظہ ہو! ''سنن نسائی''

کیا ہر رکعت میں تعوذ پڑھنا ضروری ہے؟

سوال: کیا ہر رکعت میں تعوذ پڑھنا ضروری ہے یا پہلی رکعت میں ہی کافی ہے اور باقی میں بسم اللہ سے شروع کریں؟ نیز کیا ہر تشہد میں درود اور دعائیں پڑھنی چاہئیں یا صرف آخری تشہد میں؟

جواب: علامہ ابن القیم رحمہ اللہ ''زاد المعاد'' میں فرماتے ہیں:

''صحیح حدیث کی بناء پر زیادہ واضح بات یہ ہے، کہ ''تعوذ'' صرف ایک دفعہ پڑھی جائے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے:

« كَانَ اِذَا نَهَضَ مِنَ الرَّكعَةِ الثَّانِيَةِ۔ اِستَفتَحَ القِرَاءَ ةَ، وَ لَم يَسكُت » (٦١/١) [2]

''جب آپ ﷺ دوسری رکعت سے (تیسری کے لیے) کھڑے ہوتے، تو قرأت شروع

[1] سنن ابن ماجه ، بَابُ افْتِتَاحِ الصَّلَاةِ، رقم: ٨٠٦، سنن الترمذی ، بَابُ مَا يَقُولُ عِندَ افْتِتَاحِ الصَّلَاةِ، رقم: ٢٤٣، سنن أبي داؤد، بَابُ مَنِ اسْتَوَى قَاعِدًا ...... الخ، رقم: ٧٧٦

[2] السنن الصغير بَابُ سَكْتَتَيِ الْإِمَامِ، رقم: ٥٤٢، معرفة السنن والآثار، رقم: ٣٠٨٥

کر دیتے۔ (پہلی رکعت کی طرح شروع میں) خاموش نہ ہوتے۔"

تشہد اوّل میں حدیث « فَكَيفَ نُصَلِّي عَلَيكَ؟ قَالَ: قُولُوا : اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ......»① کے عموم کی بناء پر درود پڑھنے کا جواز ہے اور دعائیں آخری تشہد میں پڑھنی چاہئیں۔ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: "تم میں سے کوئی شخص تشہد اخیر سے فارغ ہو تو چار چیزوں سے پناہ مانگے......" الخ۔ (رواه الجماعة: البخاری والترمذی بحواله المنتقیٰ)②

کیا ہر رکعت کے شروع میں اعوذ باللہ پڑھا جا سکتا ہے؟

(سوال): پہلی رکعت کے بعد ہر رکعت میں "اعوذ باللّٰہ" پڑھا جا سکتا ہے۔ کچھ علماء کہتے ہیں کہ صرف پہلی رکعت میں تعوذ پڑھنا ہے۔ کیا دونوں طرح جائز ہے؟ کون سا طریقہ زیادہ بہتر ہے؟

(جواب): امام حسن، عطاء، اور ابراہیم رحمہم اللہ کا مسلک یہ ہے کہ ہر رکعت میں "تعوذ" مستحب ہے۔ ان کا استدلال قرآنی آیت کے عموم سے ہے۔ ﴿فَاِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ﴾ (النحل:۹۸) اور دوسرا مذہب صرف پہلی رکعت میں پڑھنے کا ہے۔ بطورِ فیصلہ امام شوکانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

« فَالْأَحوَطُ، اَلِاقتِصَارُ عَلٰى مَا وَرَدَت بِهِ السُّنَّةُ. وَ هُوَ الِاستِعَاذَةُ قَبلَ قِرَاءَةِ الرَّكعَةِ الْاُولٰى. فَقَط » (نيل الأوطار:۱/۲۰۵)

یعنی زیادہ احتیاط والا مسلک یہ ہے، کہ اس شئی پر اکتفاء کیا جائے جو سنت میں وارد ہے اور وہ یہ ہے کہ صرف پہلی رکعت کی قرأت سے پہلے تعوذ پڑھا جائے۔

صحیح مسلم میں حدیث ہے:

« إِذَا نَهَضَ مِنَ الرَّكْعَةِ الثَّانِيَةِ اسْتَفْتَحَ الْقِرَاءَةَ بِـ ﴿الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ﴾ وَلَمْ يَسْكُتْ »③

ہر رکعت میں "أَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيطَانِ الرَّجِيم" پڑھنا کیسا ہے؟

(سوال): ہر رکعت میں "أَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيطَانِ الرَّجِيم" پڑھنا کیسا ہے؟ کیونکہ ابن حزم رحمہ اللہ

① صحيح البخاری، بَابُ الصَّلَاةِ عَلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، رقم:۶۳۵۷

② صحيح مسلم، بَابُ الْقِرَاءَةِ فِي الْفَجْرِ، رقم:۵۸۸، سنن بن ماجه، بَابُ مَا يُقَالُ بَعْدَ التَّشَهُّدِ وَالصَّلَاةِ عَلَى النَّبِيِّ ﷺ، رقم:۹۰۹، سنن أبی داود، بَابُ مَا يَقُولُ بَعْدَ التَّشَهُّدِ، رقم:۹۸۳

③ صحيح مسلم، بَابُ مَا يُقَالُ بَيْنَ تَكْبِيرَةِ الْإِحْرَامِ وَالْقِرَاءَةِ، رقم:۵۹۹

المحلّٰی میں لکھتے ہیں: جو''أَعُوذُ بِاللّٰہِ'' نہ پڑھے اس کی رکعت نہیں ہوتی اور''اعوذ باللہ''پڑھنا ہر رکعت میں واجب ہے۔

جواب: بعض اہلِ علم ہر رکعت میں''تعوذ'' پڑھنے کے قائل ہیں لیکن جمہور اہلِ علم ہر رکعت میں تعوذ کے قائل نہیں۔صحیح حدیث میں ہے۔حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

« اَنَّ النَّبِیَّ ﷺ کَانَ اِذَا نَھَضَ فِی الرَّکعَةِ الثَّانِیَةِ. اِستَفتَحَ القِرَاءَ ةَ. وَ لَم یَسکُت.»[1]

امام ابن قیم رحمہ اللہ نے بھی اس حدیث سے استدلال کیا ہے کہ صرف پہلی رکعت میں پڑھنا استعاذہ کافی ہے۔[2]

قرأت سے قبل تعوذ کے کونسے الفاظ سنت سے ثابت ہیں؟

سوال: قرأت سے قبل تعوذ کے مسنون الفاظ جو صحیح حدیث سے ثابت ہیں، ذکر فرمائیں؟

جواب: قرأت سے قبل''تعوذ'' کے الفاظ ملاحظہ فرمائیں:«أَعُوذُ بِاللّٰہِ السَّمِیعِ العَلِیمِ مِنَ الشَّیطٰنِ الرَّجِیمِ.» یا یوں پڑھیں!«أَعُوذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیطٰنِ الرَّجِیمِ مِن نَفخِہٖ، وَ نَفثِہٖ، وَ ھَمَزِہٖ » اور الفاظ «أَعُوذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیطٰنِ الرَّجِیمِ » مرفوع متصل سند سے ثابت نہیں، روایت مرسل ہے۔

سوال: الاعتصام کی گزشتہ اشاعت میں آپ نے ایک سوال کے جواب میں فرمایا کہ «تعوُّذ،کے الفاظ «أَعُوذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیطٰنِ الرَّجِیمِ » مرفوع روایت سے ثابت نہیں۔البتہ مرسل طریق سے ثابت ہیں۔جب کہ حقیقت اس کے برعکس ہے۔مثلاً''بخاری ومسلم شریف'' میں واقعہ کا خلاصہ یہ ہے کہ:

« اِستَبَّ رَجُلَانِ عِندَ النَّبِیِّ ﷺ فَجَعَلَ اَحَدُھُمَا یَغضَبُ، وَ یَحمَرُّ وَجھُہٗ، وَ یَنتَفِخُ اَودَاجُہٗ فَنَظَرَ اِلَیہِ النَّبِیُّ ﷺ. فَقَالَ: اِنِّی لَاَعلَمُ کَلِمَةً لَو قَالَھَا، لَذَھَبَ دَاعَنہُ. اَعُوذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیطٰنِ الرَّجِیمِ » انتھی[3]

اس کے علاوہ سورہ''نحل'' کی آیت کریمہ ﴿وَ اِذَا قَرَأتَ القُراٰنَ فَاستَعِذ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیطٰنِ الرَّجِیمِ﴾(النحل:۹۸) میں ارسال وغیرہ کا سوال نہیں۔مزید برآن اگر یہ سوال ہو کہ''صحیحین'' والے واقعہ اور قرآنی آیت میں نماز کا ذکر نہیں تو اس کا جواب امام شوکانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

---

① السنن الصغیر بَابُ سَکْتَتَيِ الْإِمَامِ، رقم:٥٤٢، معرفة السنن والآثار، رقم:٣٠٨٥

② زاد المعاد:١/٦١

③ صحیح البخاری، بَابُ مَا یُنْھَی مِنَ السِّبَابِ وَاللَّعْنِ ، رقم:٦٠٤٨

« وَلَا شَكَّ اَنَّ الاٰيَةَ تَدُلُّ عَلٰى مَشرُوعِيَةِ الِاستِعَاذَةِ قَبلَ القِرَاءَةِ، وَ هِيَ اَعَمُّ مِن اَن يَكُونَ خَارِجَ الصَّلٰوةِ، اَو دَاخِلَهَا » (نيل الأوطار:٤/٢٠٥)

نیز مفسرین کرام، مثلاً حافظ ابن کثیر، الجامع لأ حکام القرآن قرطبی، امام بغوی، خازن، درمنثور، وحیدی تفہیم القرآن، تفسیر عثمانی، ترجمہ وتفسیر مولانا عبد الستار دہلوی اور اگر امام شوکانی رحمہ اللہ کی تائید کو شامل کرلیا جائے تو « تِلكَ عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ » یہ سب مفسرین «أَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيطٰنِ الرَّجِيمِ فِي الصَّلٰوةِ » کے قائل ہیں اور جو ''تعوذ'' آپ نے ''سنن'' وغیرہ سے تحریر فرمایا ہے۔ وہ بھی مسنون ہے۔ بہر حال اگر میری رائے میں کوئی غلطی ہو تو آپ اصلاح فرمادیں۔

(جواب): محترم مولانا عبد الواحد اظہر حفظہ اللہ بعد از سلام گزارش ہے، کہ میں آپ کا بے حد ممنون ہوں کہ آپ نے میرے فتویٰ پر نقد فرمایا: جزاکم اللہ خیراً۔ عرض ہے بلاشبہ ''تعوذ'' کے الفاظ «أَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيطٰنِ الرَّجِيمِ» خارج نماز ثابت ہیں۔

جس طرح کہ ''صحیحین'' کے مذکورہ قصہ میں ''نص'' موجود ہے۔ اگر میں نے نفی عام کردی ہے تو مجھ سے ذہول ہوا ہے۔ سورۃ ''النحل'' کی آیت کریمہ میں وارد الفاظ کا تو کوئی بھی انکار نہیں کرتا۔ ''تعوذ'' کی جملہ شکلوں میں یہ الفاظ موجود ہیں۔ یہاں صرف یہ مسئلہ زیر بحث ہے، کہ بطورِ نصِ نبوی نماز میں کونسے کلماتِ تعوذ ثابت ہیں۔ جواب اس کا یہ ہے، کہ جبیر بن مطعم (رضی اللہ عنہ) کی روایت میں ہے:

« أَعُوذُ بِاللّٰهِ السَّمِيعِ العَلِيمِ مِنَ الشَّيطٰنِ الرَّجِيمِ مِن نَفخِهٖ، وَ نَفثِهٖ وَ هَمزِهٖ » [1]

اور ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے:

« أَعُوذُ بِاللّٰهِ السَّمِيعِ العَلِيمِ مِنَ الشَّيطٰنِ الرَّجِيمِ مِن هَمزِهٖ ، وَ نَفخِهٖ، وَ نَفثِهٖ » [2]

لیکن «أَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيطٰنِ الرَّجِيمِ» کلمات والی روایت ''مرسل حسن'' ہے۔ ملاحظہ ہو! التلخيص الحبير: ١/ ٢٣٠ . اور امام شوکانی رحمہ اللہ نے جو کچھ بیان فرمایا ہے: اس کا مفہوم تو صرف یہ ہے، کہ قرأت سے قبل ''استعاذہ'' مشروع ہے، بحالتِ نماز ہو یا اس کے علاوہ۔ اس کا تو کوئی بھی انکار نہیں کرتا۔ سبھی مشروعیت کے قائل ہیں۔ پھر ظاہر ہے، جملہ مفسرین کے اقوال بھی نصِ شریعت کے تابع ہونے چاہئیں۔ علیحدہ ان کی کوئی حیثیت نہیں۔ مزید کوئی ملاحظات ہوں تو مستفید فرمائیں۔ شکریہ۔

[1] سنن أبي داؤد، بَابُ مَا يُستَفتَحُ بِهِ الصَّلَاةُ مِنَ الدُّعَاءِ، رقم: ٧٦٤

[2] سنن أبي داؤد، بَابُ مَن رَأَى الِاستِفتَاحَ بِسُبحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمدِكَ، رقم: ٧٧٥

دوسری رکعت کی ابتداء "اعوذ باللہ" سے کرے یا "بسم اللہ" سے؟

سوال: آدمی پہلی رکعت مکمل کرنے کے بعد دوسری رکعت کی ابتداء "اعوذ باللہ" سے کر سکتا ہے یا "بسم اللہ" سے ہی کرے گا۔

جواب: بعض اہلِ علم کے نزدیک دوسری رکعت کے شروع میں بھی "اعوذ باللہ" پڑھنی چاہیے۔ علامہ البانی رحمہ اللہ اسی بات کے قائل ہیں۔ جب کہ علامہ ابن قیم، اور امام شوکانی رحمہما اللہ وغیرہ کا مسلک اس کے برعکس ہے۔ اظہر مسلک یہی ہے۔ پہلے کا صرف جواز ہے۔

پہلی رکعت کے علاوہ تمام رکعات کی ابتداء تعوذ سے یا تسمیہ سے؟

سوال: نماز میں دوسری، تیسری، چوتھی رکعت کی ابتداء تعوذ سے کرنی چاہیے یا تسمیہ سے؟

جواب: مسئلہ ہذا میں اہلِ علم کا اختلاف ہے۔ امام نووی "المجموع" (۳/۳۲۶) میں فرماتے ہیں: شوافع کا صحیح مذہب یہ ہے، کہ "أَعُوذُ بِاللّٰهِ" ہر رکعت میں پڑھنی مستحب ہے اور امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا قول یہ ہے، کہ یہ پہلی رکعت کے ساتھ مخصوص ہے۔ امام شوکانی رحمہ اللہ نے نیل الأوطار (۲/ ۲۰۵) میں حسن، عطاء اور ابراہیم سے نقل کیا ہے، کہ "تعوذ" ہر رکعت میں مستحب ہے۔ قرآنی عموم سے ان کا استدلال ہے۔ ﴿فَاِذَا قَرَأْتَ الْقُرْاٰنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ﴾ (النحل: ۹۸) علامہ البانی بھی اسی بات کے قائل ہیں۔ اس مسئلہ پر علامہ ابن قیم رحمہ اللہ نے "زاد المعاد" (۱/۶۱) میں کافی مفید بحث کی ہے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے:

« أَنَّ النَّبِیَّ ﷺ كَانَ إِذَا نَهَضَ مِنَ الرَّكْعَةِ الثَّانِيَةِ اسْتَفْتَحَ الْقِرَاءَ ةَ وَ لَمْ يَسْكُتْ. »[1]

یعنی "نبی ﷺ جب دوسری رکعت میں اٹھتے تو بلا خاموشی قرأت کا آغاز کر دیتے۔"

اس سے استدلال کیا ہے کہ تعوذ صرف پہلی رکعت میں ہے۔ علامہ شوکانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

« فَالْأَحْوَطُ ، اَلْاِقْتِصَارُ عَلٰی مَا وَرَدَتْ بِهِ السُّنَّةُ . وَ هُوَ الْاِسْتِعَاذَةُ قَبْلَ قِرَاءَ ةِ الرَّكْعَةِ الْأُولٰی. فَقَطْ »[2]

"زیادہ احتیاط والا مسلک یہ ہے، کہ جس قدر کوئی شی سنت میں وارد ہے، اسی پر اکتفا کیا جائے۔"

---

① السنن الصغیر بَابُ سَكْتَتَيِ الْإِمَامِ، رقم: ۵۴۲، معرفة السنن والآثار، رقم: ۳۰۸۵

② نیل الأوطار: ۲/۳۰۵

اور وہ یہ ہے کہ "تعوذ" صرف پہلی رکعت میں پڑھی جائے۔ اور صاحب "منتقی الاخبار" نے بایں الفاظ تبویب قائم کی ہے: «باب افتتاحُ الثانية بالقراءة من غيرِ تعوُّذٍ ، وَ لَا سكتَةٍ » یعنی دوسری رکعت کا آغاز "تعوذ" اور "سکتے" کے بغیر ہونا چاہیے۔ پھر بحوالہ "مسلم حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت نقل کی ہے۔

« كَانَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ اِذَا نَهَضَ فِي الرَّكعَةِ الثَّانِيَةِ، اِفتَتَحَ القِرَاءَةَ بِ﴿الحَمدُ لِلّٰهِ رَبِّ العَالَمِينَ﴾. وَ لَم يَسكُت.»[1]

یعنی "رسول اللہ ﷺ جب دوسری رکعت میں اُٹھ کھڑے ہوتے تو بلا خاموشی ﴿ اَلحَمدُ لِلّٰهِ رَبِّ العَالَمِینَ﴾ سے قرأت کا افتتاح کرتے۔"

اس حدیث کی شرح میں امام شوکانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

« وَالحَدِيثُ يَدُلُّ عَلٰى عَدَمِ مَشرُوعِيَّةِ السَّكتَةِ قَبلَ القِرَاءَةِ فِي الرَّكعَةِ الثَّانِيَّةِ. وَ كَذَالِكَ عَدَمُ مَشرُوعِيَّةِ التَّعَوُّذِ فِيهَا ، وَ حُكمُ مَا بَعدَهَا مِنَ الرَّكعَاتِ حُكمُهَا »[2]

یعنی حدیث ہذا اس بات پر دال ہے کہ دوسری رکعت کی قرأت سے پہلے "سکتہ" غیر مسنون ہے۔ اسی طرح اس میں "تعوذ" پڑھنی بھی غیر مشروع ہے اور بعد والی رکعتوں کا وہی حکم ہے جو اس رکعت کا حکم ہے۔ لہٰذا زیادہ واضح بات یہی معلوم ہوتی ہے، کہ "تعوذ" صرف پہلی رکعت میں پڑھی جائے۔

نماز میں سورہ فاتحہ شروع کرنے سے پہلے "بسم اللّٰہ" پڑھنی چاہیے یا نہیں؟

سوال: نماز میں سورہ فاتحہ شروع کرنے سے پہلے "بسم اللہ" پڑھنی چاہیے یا نہیں؟ ہماری مسجد کے امام صاحب فرماتے ہیں کہ سورۃ فاتحہ سے پہلے "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم" نہیں پڑھنی چاہیے؟

جواب: "بسم اللّٰہ" سورہ فاتحہ کا جزء ہے۔ لہٰذا "سورہ فاتحہ" کے ساتھ اس کا پڑھنا ضروری ہے۔ مولوی صاحب موصوف نے ممکن ہے جہری پڑھنے کی نفی کی ہو، کہ اسے سِرّی پڑھنا چاہیے۔ بایں صورت ان کا موقف درست ہے اور اگر وہ مطلق نفی کے قائل ہیں، تو وہ غلطی پر ہیں۔ اس موقف سے رجوع کرنا چاہیے۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو! تفسیر فتح القدیر وغیرہ۔

کیا سورۃ فاتحہ کے شروع میں بسم اللّٰہ پڑھنی چاہیے؟

سوال: نماز میں سورہ فاتحہ شروع کرنے سے پہلے "بسم اللہ" پڑھنی چاہیے یا نہیں؟ ہماری مسجد کے امام

[1] صحیح مسلم، بَابُ مَا يُقَالُ بَيْنَ تَكْبِيرَةِ الْإِحْرَامِ وَالْقِرَاءَةِ، رقم: ٥٩٩

[2] نیل الأوطار :٢/ ٢٨٠

صاحب فرماتے ہیں کہ سورۃ فاتحہ سے پہلے ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم'' نہیں پڑھنی چاہیے؟

جواب: "بسم اللّٰه" سورہ فاتحہ کا جزء ہے۔ لہٰذا ''سورہ فاتحہ'' کے ساتھ اس کا پڑھنا ضروری ہے۔ مولوی صاحب موصوف نے ممکن ہے جہری پڑھنے کی نفی کی ہو، کہ اسے سرّی پڑھنا چاہیے۔ بایں صورت ان کا موقف درست ہے اور اگر وہ مطلق نفی کے قائل ہیں، تو وہ غلطی پر ہیں۔ اس موقف سے رجوع کرنا چاہیے۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو! تفسیر فتح القدیر وغیرہ۔

بسم اللہ سرّی یا جہری؟

سوال: جہری نمازوں میں اکثر اہل حدیث خطیب سورۃ فاتحہ سے قبل بسم اللہ بلند آواز سے نہیں پڑھتے اور قرأت ''الحمد'' سے شروع کرتے ہیں۔ اس طرح سورۃ فاتحہ کی چھ آیات بنتی ہیں اور ساتویں آیت بسم اللہ ہے۔ شرعاً بتایا جائے کہ بسم اللہ بلند آواز سے پڑھنی چاہیے یا آہستہ؟

جواب: شریعتِ اسلامیہ میں بہت سارے احکام و مسائل ایسے ہیں، جو بسم اللہ کے ساتھ مختص ہیں۔ قطع نظر اس کے، کہ یہ سورۃ فاتحہ کی آیت ہے یا نہیں۔ اس میں بھی اہلِ علم کا اختلاف ہے، جس کی تفصیل امام شوکانی رحمہ اللہ کی تفسیر ''فتح القدیر'' کے شروع میں دیکھی جاسکتی ہے، اگرچہ راجح مسلک یہ ہے، کہ یہ ''الحمد'' کی آیت ہے۔ لیکن اس کے آیت ہونے سے یہ لازم نہیں آتا، کہ اس کو بھی لازماً جہری نمازوں میں بالجہر پڑھا جائے اور نہ ہی سرّی پڑھنے سے سورت کی آیت میں کوئی کمی واقع ہوتی ہے، جس طرح کہ سائل کا خیال ہے۔ سات آیات تو اپنی جگہ قائم رہتیں ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ آیا اس کو آہستہ پڑھا جائے یا بآواز بلند؟ اس مسئلے کا دارومدار مختلف احادیث پر ہے۔

اس بارے میں زیادہ بہتر بات یہ ہے، کہ بسملہ نماز میں آہستہ پڑھی جائے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت اس بارے میں صحیح صریح ہے اور یہ کہنا کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ حدیث کو بھول گئے، پھر بعد میں یاد آیا۔ اس سے حدیث کی پختگی میں کوئی فرق واقع نہیں ہوتا، جس طرح کہ مصطلح الحدیث میں معروف ہے:

« نِسيَانُ الرَّاوِي لَا يَضُرُّ صِحَّةَ الحَدِيثِ »

''راوی کے بھولنے سے حدیث کی صحت متاثر نہیں ہوتی۔''

بعض احادیث میں بسملہ بالجہر کا ذکر بھی ہے۔ جو اس بات پر محمول ہے کہ بعض دفعہ آپ نے بآواز بلند بھی پڑھی ہے، تاکہ مقتدیوں کو اس کی قرأت کا علم ہو جائے۔ اس طرح اس موضوع پر جملہ احادیث

میں مطابقت پیدا ہو جاتی ہے۔

کیا امام جہری نمازوں میں سورۃ فاتحہ سے پہلے بسم اللہ اونچی آواز سے پڑھے؟

(سوال) : فجر، مغرب اور عشاء کی نمازوں میں جب امام سورۃ فاتحہ پڑھتا ہے تو اُسے سورۃ فاتحہ سے پہلے "بسم اللہ" پڑھنی چاہیے یا کہ نہیں۔

(جواب) : جَہری اور سِرّی نمازوں میں ''سورۃ فاتحہ'' کے آغاز میں امام اور ماموم دونوں کو ''بسم اللہ'' ضرور پڑھنی چاہیے۔ کیونکہ یہ ''فاتحہ'' کا جزء ہے، لیکن ترجیح اس بات کو ہے، کہ جَہری نمازوں میں ''بسم اللہ'' آہستہ پڑھی جائے۔

جہری نمازوں میں امام کا سورۃ فاتحہ کے شروع میں بسم اللہ بلند آواز سے پڑھنا:

(سوال) : کیا مغرب اور عشاء کی نماز میں امام سورہ فاتحہ کے شروع میں ''بسم اللہ'' بلند آواز سے پڑھے یا کہ خفیہ (دل میں) نیز اس کے علاوہ باقی سورتوں کا کیا حکم ہے؟

(جواب) : راجح مسلک کے مطابق جَہری نمازوں میں ''بسم اللہ'' سِرّی پڑھنی چاہیے۔

امام نماز میں سورۃ الفاتحہ کے شروع میں بسم اللہ جہرًا پڑھے یا سِرًّا؟

(سوال) : بعض ائمہ مساجد جَہری قرأت والی نمازوں میں سورت الحمد سے پہلے یعنی افتتاح کی صورت میں بسم اللہ نہیں پڑھتے اور نہ ہی الحمد کے بعد قرأت والی سورت سے پہلے بسم اللہ پڑھتے ہیں۔ استفسار کی صورت میں بخاری شریف کا حوالہ دیتے ہیں جب کہ ہمارے اکثر جلیل القدر اہلِ حدیث بزرگ قرأت میں بسم اللہ بھی جَہری آواز سے ہی پڑھتے ہیں۔ اس نئی ایجاد سے مقتدیوں کو سہو بھی ہو جاتا ہے اور نماز کی ترتیب و ہیئت میں کمی بیشی کا احتمال بھی رہتا ہے۔ اس لیے مذکورہ بالا سوال کا جواب قرآن و حدیث سے ارشاد فرمائیں۔

(جواب) : نماز میں ''بسم اللہ'' کے جَہر اور عدمِ جَہر کے بارے میں روایات کے اختلافات کی بناء پر اہلِ علم کے مختلف اقوال ہیں۔ کچھ لوگ جہر کے قائل ہیں۔ جب کہ دوسرا گروہ عدمِ جَہر کا نظریہ رکھتا ہے۔ اوّل الذکر کے قُدوہ (پیشوا) امام شافعی رحمہ اللہ وغیرہ ہیں۔ ثانی الذکر میں امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کا شمار ہوتا ہے۔ تیسرے گروہ نے دونوں طرح جواز کو اختیار کیا ہے۔ ان میں سے شیخ البخاری، امام اسحاق بن راہویہ رحمہما اللہ ہیں۔ بعد میں امام ابن حزم رحمہ اللہ نے بھی اسی مذہب کو ترجیح دی ہے۔

اور صاحب "المرعاۃ" فرماتے ہیں: «وَ هُوَ الرَّاجِحُ عِندَنَا» (۱/۵۹۱)

یعنی ہمارے نزدیک راجح مسلک یہی ہے۔

شیخنا محدث روپڑی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "بِسمِ اللّٰہِ" دونوں طرح درست ہے، خواہ سرّی پڑھے یا جہری۔ (1)

اور سرّی پڑھنے کے دلائل سے "صحیح بخاری کی وہ حدیث ہے، جس کی طرف سائل نے اشارہ کیا ہے:

« عَن اَنَسٍ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ اَنَّ النَّبِیَّ ﷺ، وَ اَبَا بَکرٍ، وَ عُمَرَ کَانُوا یَفتَتِحُونَ الصَّلٰوۃَ بِالحَمدُ لِلّٰہِ رَبِّ العٰلَمِینَ. » (2)

اور سعودی عرب کے مفتی اعظم شیخنا سماحۃ الشیخ عبدالعزیز بن عبداللہ بن باز رحمہ اللہ رقمطراز ہیں:

"وَالصَّوَابُ تَقدِیمُ مَا دَلَّ عَلَیہِ حَدِیثُ أَنَسٍ رَضِیَ اللّٰہُ عَنہُ مِن شَرعِیَّۃِ الاِسرَارِ بِالبَسمَلَۃِ لِصِحَّتِہٖ، وَ صَرَاحَتِہٖ فِی ھٰذِہِ المَسئَلَۃِ . وَ کَونُہٗ نَسِیَ ذٰلِكَ ، ثُمَّ ذَکَرَہٗ لَا یَقدَحُ فِی رِوَایَتِہٖ. کَمَا عُلِمَ ذٰلِكَ فِی الاُصُولِ، وَالمُصطَلَحِ. وَ تُحمَلُ رِوَایَۃُ مَن رَوَی الجَهرَ بِالبَسمَلَۃِ عَلٰی أَنَّ النَّبِیَّ ﷺ کَانَ یَجهَرُ بِھَا فِی بَعضِ الأَحیَانِ، لِیَعلَمَ مَن وَّرَاءَ ہٗ أَنَّہٗ یَقرَأُھَا. وَ بِھٰذَا تَجتَمِعُ الأَحَادِیثُ. وَ قَد وَرَدَت أَحَادِیثُ صَحِیحَۃٌ تُؤَیِّدُ مَا دَلَّ عَلَیہِ حَدِیثُ أَنَسٍ مِن شَرعِیَّۃِ الاِسرَارِ بِالبَسمَلَۃِ "(وَاللّٰہُ أَعلَمُ) (3)

یعنی مسئلہ ہذا میں حضرت انس رضی اللہ عنہ کی حدیث کے صحیح اور مصرح ہونے کی بناء پر اس کو مقدم کرنا حق وصواب ہے اور ان کا اس کو بھول کر، پھر یاد کر لینا، روایت میں قادحہ (معیوب) نہیں۔ جس طرح کہ علمِ اصول میں معروف ہے۔ لیکن جس سے جہری "بسملہ" مروی ہے۔ وہ اس پر محمول ہے، کہ نبی ﷺ بسا اوقات جہری پڑھتے، تاکہ مقتدی کو اس کی قرأت کا علم ہو جائے۔ اس طرح تمام مختلف روایات میں توفیق اور تطبیق ہو جاتی ہے۔ نیز کچھ اور بھی صحیح احادیث حدیث انس رضی اللہ عنہ کی مؤید ہیں کہ بسملہ سرّی پڑھنی چاہیے۔ (واللہ أعلم)

واضح ہو کہ اصل قدر و قیمت دلائل کی ہے۔ پھر عمل اسی کے تابع ہونا چاہیے۔ جب کہ جملہ مستندات اسرار (معتبر روایاتِ سرّی) کے مؤید (تائید میں) ہیں۔ لہٰذا میرے نزدیک بھی راجح بات "بِسمِ اللّٰہ" کو

---

(1) فتاوی اھلحدیث ۲/ ۱۳۸

(2) صحیح البخاری، بَابُ مَا یَقُولُ بَعدَ التَّکبِیرِ، رقم: ۷۴۳

(3) حاشیہ فتح الباری ۲/ ۲۲۹

پوشیدہ پڑھنا ہے۔

تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو! حاشیہ کتاب ''صلوٰۃ الرسول ﷺ: ۲۳۶ تا ۲۳۷، (واللہ أعلم بالصواب)

(سوال): بعض علماء سورۃ فاتحہ اور دوسری سورۃ کی، نماز میں جہری قرأت کی ابتداء میں ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم'' پڑھتے ہیں بعض دونوں جگہ حذف کر دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ قرآن مجید میں صرف دو سورتوں کو جدا کرنے کے لیے ہے تو کیا یہ صرف قرآن مجید میں لکھنے کے لیے ہے نمازوں میں پڑھنے کے لیے نہیں؟

(جواب): نماز میں سورت کے ساتھ (بسملہ) کی جہری یا سری قرأت کے بارے میں دونوں طرح کی روایات وارد ہیں۔ ترجیح اس بات کو ہے کہ (بسملہ) کی قرأتِ سری کی جائے اور جو لوگ کلیۃً حذف کے قائل ہیں یہ نظریہ صحیح احادیث کے منافی ہونے کی بناء پر غیر درست ہے۔

سماحۃ الشیخ ابن باز ''فتح الباری'' کے حاشیہ پر رقمطراز ہیں:

« وَالصَّوابُ تَقدِیمُ مَا دَلَّ عَلَیهِ حَدِیثُ اَنَسٍ رَضِیَ اللّٰهُ عَنهُ مِن شَرعِیَّةِ الِاسرَارِ بِالبَسمَلَةِ لِصِحَّتِهٖ ، وَ صَرَاحَتِهٖ فِی هٰذِهِ المَسئَلَةِ، وَ کَونُهُ نَسِیَ ذَالِكَ. ثُمَّ ذَکَرَهُ. لَا یَقدَحُ فِی رِوَایَتِهٖ، کَمَا عُلِمَ ذٰلِكَ فِی الْاُصُولِ، وَالمُصطَلَحِ . وَ تُحمَلُ رِوَایَةَ مَن رَوَی الجَهرَ بِالبَسمَلَةِ عَلٰی اَنَّ النَّبِیَّ ﷺ کَانَ یَجهَرَ بِهَا فِی بَعضِ الْاَحیَانِ، لِیَعلَم مِن وَرَائِهٖ اَنَّهُ یَقرَأُهَا. وَ بِهٰذَا تَجتَمِعُ الَاحَادِیث. وَ قَد وَرَدَت اَحَادِیثُ صَحِیحَةٌ تُؤَیِّدُ مَا دَلَّ عَلَیهِ حَدِیثُ اَنَسٍ رَضِیَ اللّٰهُ عَنهُ مِن شَرعِیَّةِ الِاسرَارِ بِالبَسمَلَةِ . » [1]

سینے پر ہاتھ باندھنا

سینے پر ہاتھ باندھنے کی کیفیت:

(سوال): نبی کریم ﷺ سے نماز میں بائیں ہاتھ پر دایاں ہاتھ رکھنا بھی ثابت ہے اور بائیں ہاتھ کو پکڑنا بھی۔ ''صلوٰۃ النبی'' ﷺ میں علامہ البانی نے حنفیہ کے عمل، دائیں کو بائیں ہاتھ پر رکھنا اور دائیں ہاتھ کی انگلیوں اور انگوٹھے سے بائیں ہتھیلی کے جوڑ کو پکڑ کر دیگر تین انگلیاں بازو پر پھیلانا بدعت لکھا ہے۔ ہاتھ پکڑنے، تھامنے کی صحیح کیفیت کیا ہے۔ خیال رہے کہ ہاتھ رکھنے نہیں پکڑنے کے بارے میں بتائیں۔

(جواب): ہاتھ پکڑنے کی تصریح ''نسائی'' کی روایت میں ہے۔ وائل بن حجر رضی اللہ عنہ کا بیان ہے، میں نے رسول

[1] فتح الباری ۲/۲۲۹

اللہ ﷺ کو دیکھا۔ « إِذَا كَانَ قَائِمًا فِي الصَّلَاةِ قَبَضَ بِيَمِينِهِ عَلَى شِمَالِهِ »[1] جب نماز میں کھڑے ہوتے، تو اپنے داہنے ہاتھ کے ساتھ بائیں کو پکڑتے تھے۔

اہلِ لغت کے ہاں لفظ قبض کا مفہوم یہ ہے کہ کسی شئی کو پکڑ کر اس پر انگلیوں کو ملا لیا جائے۔ چنانچہ "المنجد" میں ہے: «أَمسَكَهُ بِيَدِهِ وَ ضَمَّ عَلَيهِ اَصَابِعَهُ » صرف اسی پر اکتفاء کرنا چاہیے اور سوال میں مرقوم شکل واقعتاً بدعت ہے۔ اس لیے کہ یہ پُر تکلف کیفیت رسول اللہ ﷺ سے ثابت نہیں۔

کیا سینے پر ہاتھ باندھنا منسوخ ہے؟ یا سنتِ مستمرہ ہے؟

سوال: میرے والد محترم صاحب کا اصرار ہے کہ نماز میں ایک تو ناف کے نیچے ہاتھ باندھا کروں اور دوسرا رفع یدین نہ کیا کروں۔ جس طرح عام لوگ نماز پڑھتے ہیں اسی طرح پڑھا کروں۔ لوگ مجھے طعنے دیتے ہیں کہ تمہارا بیٹا وہابی ہو گیا ہے۔ مزید یہ کہ رفع الیدین کا حکم آخری وقت میں نبی ﷺ نے منسوخ کر دیا تھا یہ امر صرف لوگوں کے بت چھڑوانے کے لیے تھا۔ جس کا ثبوت میں نے مانگا تو والد صاحب کے پاس جواب نہیں تھا۔ صرف اتنا کہا کہ کیا باقی ساری دنیا کافر ہے۔ صرف تو ہی مسلمان ہے ہمارے باپ دادا جس راہ پر چلے ہیں وہی راستہ اختیار کرو از راہِ کرم بذریعہ قرآن وسنت میری راہنمائی فرمائیں کہ کیا رفع الیدین ترک کر دوں اور ہاتھ ناف کے نیچے باندھوں؟ جہاں تک میرے علم میں ہے کہ منسوخیٔ رفع الیدین اور ہاتھ ناف کے نیچے باندھنا ضعیف حدیث ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

جواب: رفع الیدین اور سینے پر ہاتھ باندھنا ''سنن مستمرہ'' ہیں۔ نسخ کی کوئی دلیل نہیں۔ اس پر قائم رہیں۔ والد صاحب کو بدلائل قائل کرنے کی کوشش جاری رکھیں۔ «لَعَلَّ اللّٰهُ يُحدِثُ بَعدَ ذٰلِكَ اَمرًا»

نماز میں ہاتھوں کو کہاں باندھنا چاہیے؟

سوال: ذہن میں چند ایک سوال کافی دیر سے کھٹک رہے ہیں براہِ کرم شافی جواب سے نواز کر مشکور فرمائیں میں گورنمنٹ کالج گوجرانوالہ میں انگلش کا لیکچرار ہوں، طلبا بھی یہ سوال پوچھتے رہتے ہیں۔

۱۔ نماز میں ہاتھ کہاں باندھنے چاہئیں؟ عام طور پر مشہور ہے کہ ہاتھ سینے پر باندھنے چاہیں اس کے بارے میں کونسی حدیث ہے۔ کیا ہاتھ سینے کے نیچے اور ناف کے اُوپر بھی ہو سکتے ہیں۔ سینہ کی لغت میں تعریف کیا ہے؟ مجھے یاد ہے کہ چند ماہ قبل آپ نے کسی سوال کے جواب میں فرمایا تھا کہ سینہ پہلی پسلی

[1] سنن النسائی، بَابُ وَضعُ اليَمِينِ عَلَى الشِّمَالِ فِي الصَّلَاةِ، رقم:۸۸۷

سے لے کر آخری پسلی تک ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں متعلقہ لغت کا حوالہ مع عبارت دے دیں۔

۲۔ نماز پڑھتے وقت کندھے سے کندھا گھٹنے سے گھٹنا اور ٹخنے سے ٹخنا ملانے کا حکم ہے۔

لیکن عام طور پر پاؤں بالکل سیدھے نہیں ہوتے بلکہ انگلیاں (پاؤں کا سامنے والا حصہ) باہر دائیں طرف نکلی ہوتی ہے اور ایڑھی اندر کی طرف مڑی ہوتی ہے سڑک پر ان گنت لوگ دیکھ کر پتہ چل جاتا ہے کہ خدا نے اکثریت کی ساخت ایسی بنائی ہے اب مکمل تمام پاؤں نماز میں صرف اسی صورت میں ملایا جا سکتا ہے کہ پاؤں کو کھینچ کر، زور لگا کر سیدھا کیا جائے، جب کہ اس صورت میں ٹانگوں میں کھچاؤ اور درد ہوسکتا ہے پھر ہر آدمی کے پاؤں کا سائز دوسرے سے مختلف ہوتا ہے اس لیے ٹخنہ کیسے مل سکتا ہے؟ یہی الجھن کندھا ملانے کے معاملے میں ہے ہر آدمی کا قد دوسرے سے مختلف ہوتا ہے پانچ فٹ قد والا چھ فٹ قد والے سے کندھے کیسے ملائے؟ کھینچ تان کر بھی کندھے ملانا مشکل ہے کیا چھوٹے قد والا بڑے قد والے سے پنجوں کے بل کھڑا ہو کر کندھا ملائے؟ اور پھر گھٹنے سے گھٹنا اور ٹخنے سے ٹخنا کیسے ملائے؟

جب سارا زور جسم اور توجہ ذہن ان کاموں کی طرف ہو جائے تو قرآن اور نماز کے الفاظ پر غور و فکر کرنے کا موقعہ کہاں ملے گا؟

جواب: (ا) بحالتِ نماز ہاتھ سینے پر باندھنے چاہئیں۔ چنانچہ ''صحیح ابن خزیمہ'' میں حدیث ہے۔

حضرت وائل بن حجر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نماز پڑھی، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دائیں ہاتھ کو بائیں ہاتھ پر رکھ کر سینے پر ہاتھ باندھے اور ''مسند احمد'' میں ھلب صحابی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سینے پر ہاتھ رکھے ہوئے دیکھا۔ نیز ''مراسیل ابوداؤد'' میں ہے۔ حضرت طاؤس فرماتے ہیں: کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنا دایاں ہاتھ نماز میں اپنے بائیں ہاتھ پر رکھ کر اپنے سینے پر باندھا کرتے تھے۔ اگرچہ یہ حدیث مرسل ہے، لیکن دوسری مستند احادیث سے مل کر قوی ہوگئی ہے۔

علامہ البانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

« وَضعُهُمَا عَلَى الصَّدرِ، هُوَ الَّذِى ثَبَتَ فِى السُّنَّةِ . وَ خِلَافُهُ اِمَّا ضَعِيفٌ، اَو لَا اَصلَ لَهُ » [1]

''دونوں ہاتھوں کو سینے پر رکھنا، یہی سنت سے ثابت ہے اور اس کے برخلاف یا تو ضعیف ہے یا بے بنیاد۔''

---

[1] صفة الصلوة، ص: ۵۷

سینے کی تعریف اہل زبان کے ہاں یوں ہے:

« مَا دُونَ العُنُقِ اِلٰی قَضَاءِ الجُوفِ » ①

''گردن کے نیچے سے لے کر پیٹ کے آغاز تک۔''

(۲) صورتِ سوال سے ظاہر ہے، کہ سائل کے ہاں یہ بات مسلمہ ہے، کہ نماز میں مونڈھے سے مونڈھا اور قدم سے قدم ملانا چاہیے، جس طرح کہ صحیح احادیث سے ثابت ہے۔ البتہ ان کو ملانے کی کیفیت میں تردّد ہے، کہ یہ کیسے ممکن ہے۔

گزارش ہے کہ ہمارے ہاں عام طور پر لوگ انگلیوں کے اطراف کو ملاتے ہیں۔ اس طرح سے واقعی صحیح کیفیت کا پیدا ہونا مشکل امر ہے، لیکن اگر ابتداء میں ہی اطراف انگلیوں کے بجائے قدموں کے ملانے سے آغاز کیا جائے، تو مشکل خود بخود حل ہو جاتی ہے۔ اس طرح سے چھوٹے بڑے قدم کا امتیاز بھی غالباً ختم ہو جاتا ہے۔ البتہ چھوٹے بڑے قد کی صورت میں کندھوں کی امتیازی کیفیت باقی رہتی ہے۔ بعض دفعہ پاؤں میں بھی کیفیت ہو سکتی ہے، تو اس کا جواب یہ ہے، کہ حدیث میں جو کچھ بیان ہوا، عام جسمانی ساخت کے اعتبار سے ہے۔ نوادر (نہایت قلیل تعداد) کو یہ حکم شامل نہیں۔ ہاں اپنی نیک نیت کے اجر و ثواب سے، وہ شخص محروم نہیں۔ (ان شاء اللہ)

مسنون کیفیت کو قائم رکھنے کا جذبہ اگر جانبین سے ہو پھر تو کوئی ایسی الجھن پیدا نہیں ہوتی۔ جس سے نماز میں خلل واقع ہو۔ باعثِ تشویش وہ صورت ہے۔ جب جانبین سے عملی اتفاق کا مظاہرہ نہ ہو تو ایسی شکل میں مزید الجھاؤ میں نہیں پڑنا چاہیے، تاکہ نمازی بحالتِ نماز عمل کثیر سے محفوظ رہ سکے جس کی وجہ سے نماز میں نقص پیدا ہونے کا اندیشہ ہوتا ہے۔

جن احادیث میں قدم سے قدم اور کندھے سے کندھا ملانے کا ذکر آتا ہے۔ ان کا مقصد یہ ہے، کہ تمام نمازی صف میں ایک دوسرے کے ساتھ مل کر کھڑے ہوں اور درمیان میں خالی جگہ نہ چھوڑیں کسی کے قدم کا چھوٹا یا بڑا ہونا، اس مقصد کے حصول میں رکاوٹ نہیں بن سکتا۔ باقی رہی بات قدرتی ساخت کی تو اس سلسلے میں عرض ہے، کہ اگر کسی کے قدموں کا رُخ کچھ زیادہ ہی باہر کی جانب ہو اور انھیں سیدھا کرنا تکلیف کا سبب بنتا ہو، تو ایسے شخص کو تو اس حکم سے مستثنیٰ بھی قرار دیا جا سکتا ہے۔ ﴿لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا﴾ لیکن عام طور پر لوگوں کے قدم تھوڑی سی کوشش اور معمولی سے اہتمام سے سیدھے ہو جاتے ہیں۔ امام مقتدی اور

① بحوالہ المنجد

منفرد سب ہی کو حکم ہے، کہ ان کے جسم قدموں سمیت قبلہ رُخ ہوں۔ اس حکم کی پابندی سے احتراز کرنے کے لیے خواہ مخواہ عذر اور حیلے نہیں تراشنے چاہئیں۔ ①

سینے کی حد کیا ہے؟

(سوال) : احیاء السنۃ گرجاکھ گوجرانوالہ کی شائع کردہ نماز کی کتاب میں لکھا ہے کہ حلق کے نیچے سے آخری پسلیوں تک سب سینہ ہی ہے۔ کیا لغت کے مطابق یہ درست ہے؟

(جواب) : ہاں لغت میں اسی طرح لکھا ہے: "مَا دُونَ العُنُقِ إِلَى فَضَاءِ الجَوفِ" ملاحظہ ہو! "المنجد" وغیرہ۔

نماز میں سینے پر ہاتھ باندھنے کے مختلف طریقے منقول ہیں؟

(سوال) : کیا صحیح احادیثِ مبارکہ میں کوئی ایسا ثبوت ملتا ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے مختلف طریقوں سے نماز ادا فرمائی ہو؟ مثال کے طور پر آپ نے سینے پر بھی ہاتھ باندھے ہوں اور ناف کے نیچے ہاتھ باندھنے کی روایات بھی ملتی ہوں؟ رکوع سے سجدے میں جاتے ہوئے کبھی پہلے ہاتھ زمین پر لگائے ہوں اور کبھی گھٹنوں کو پہلے زمین پر لگایا ہو؟ اگر ایسا فرق نہیں ملتا، تو پھر علمائے احناف کا بتایا ہوا نمازوں کی ادائیگی کا طریقہ کن دلائل پر مبنی ہے؟

(جواب) : صحیح دلائل سے ثابت ہے، کہ اللہ کے نبی ﷺ نماز میں سینے پر ہاتھ باندھتے تھے۔ ملاحظہ ہو! ''صحیح ابن خزیمہ'' ناف کے نیچے ہاتھ باندھنا کسی صحیح حدیث سے ثابت نہیں۔ (تفصیل کے لیے علامہ عبد الرحمٰن مبارک پوری رحمہ اللہ کی "إبكار المنن" کا مطالعہ فرمائیں!

سجدے کو جاتے ہوئے راجح اور قوی مسلک یہی ہے کہ نمازی پہلے اپنے ہاتھ زمین پر ٹکائے۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو! کتاب: اَلقَولُ المَقبُولُ فِي تَعلِيقِ وَ تَخرِيجِ صَلوةِ الرَّسُولِ ﷺ (ص٤٢٥) لتلميذى المحقق حافظ عبد الرء وف بن عبد الحنان

اس سلسلہ میں حنفی مسلک کی بنیاد چونکہ بعض غیر صحیح روایات ہیں، اس بناء پر انہوں نے جمہور اہلِ علم سے ہٹ کر مختلف راہ اختیار کی ہے، جو باعث افسوس ہے۔

---

① حقیقت یہ ہے کہ یہ قدموں کو سیدھا کرنے کی کوشش دراصل نماز اور زندگی کو سیدھا اور قبلہ رُخ کرنے کی کوشش ہے۔ اس سے نماز میں خلل پڑنے کے بجائے نماز اور زندگی کی اصلاح اور درستی ہوتی ہے۔ (قاری نعیم الحق نعیمؒ)

کیا سینے پر ہاتھ باندھنے والی حدیث ضعیف ہے؟

سوال: ہفت روزہ ''الاعتصام'' کے شمارہ نمبر ۲٦، جلد: ۵۰، میں ایک سوال کے جواب میں آپ نے فرمایا ہے کہ سینے پر ہاتھ باندھنے سنت ہیں اور اس سلسلے کی احادیث سنداً صحیح ہیں صحیح ابن خزیمہ میں درج وائل بن حجر رضی اللہ عنہ کی حدیث آپ نے ذکر کی ہے اور اسے صحیح قرار دیا ہے جب کہ ابن خزیمہ کے حاشیہ میں اسے ضعیف کہا گیا ہے۔ فوٹو سٹیٹ ارسالِ خدمت ہے دریں اثناء نماز میں سینے پر ہاتھ باندھنے کے متعلق دوسری روایات کی بھی تحقیق درج کریں۔

جواب: ''صحیح ابن خزیمہ'' کے حاشیہ پر جہاں علامہ البانی نے کہا ہے، کہ اس کی سَند کمزور ہے۔ وہاں یہ بیان کیا ہے، کہ شواہد وطرق کے اعتبار سے صحیح ہے۔ لہٰذا واردا شکال رفع ہوگیا۔ اس بناء پر حافظ ابن حجر رحمہ اللہ اور امام نووی رحمہ اللہ وغیرہ نے اس حدیث کو معرض استدلال میں ذکر کیا ہے۔ ملاحظہ ہو! (بلوغ المرام، الدرایہ، التلخیص فتح الباری) اور امام نووی رحمہ اللہ (الخلاصہ، شرح المھذب، شرح مسلم) وغیرہ میں۔ اس سلسلہ کی دوسری روایت ھلب الطائی سے مروی ہے۔ اس میں ہے، کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا دائیں اور بائیں پھرتے اور میں نے دیکھا کہ سینے پر ہاتھ رکھے ہوئے تھے۔[1] اس کی سند متصل اور راوی سب ثقہ ہیں۔ (تحفۃ الاحوذی) اور طاؤس کی مرسل روایت میں ہے:

«يَضَعُ يَدَهُ الْيُمْنٰى عَلٰى يَدِهِ الْيُسْرٰى ، ثُمَّ يَشُدُّ بَيْنَهُمَا عَلٰى صَدرِهٖ ، وَ هُوَ فِي الصَّلٰوةِ.»

ابوداؤد نے اس کو ''مراسیل'' میں بیان کیا ہے اور سنداً حسن ہے، جب کہ حنفیہ کے نزدیک مرسل روایت مطلقاً قابلِ حجت ہے۔ لہٰذا ان کی طرف سے اعتراض نہیں ہوسکتا اور ہمارے ہاں اس کی تائید دیگر روایات سے ہوتی ہے، اس لیے باعث تقویت ہے اور وائل بن حجر رضی اللہ عنہ کی ''مسند احمد''، ابوداؤد، نسائی وغیرہ میں روایت ہے۔ فرماتے ہیں: کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا دایاں ہاتھ بائیں ہاتھ کی ہتھیلی کی پشت اور کلائی پر رکھا۔ اس کے بارے میں علامہ البانی فرماتے ہیں: اس کیفیت پر عمل کرنے سے لازماً ہاتھ سینہ پر آئیں گے۔ تجربہ کرکے دیکھیں۔ ''تحقیق المشکاۃ'' (۱/ ۲۴۹)

مزید تفصیل کے لیے فتح الغفور فی تحقیق وضع الیدین علی الصدور''، رسالہ محمد حیات

[1] أخرجه احمد

سندھی اور ''تحفة الاحوذی'' ملاحظہ فرمائیں!

کیا ''تحت السُّرۃ'' ہاتھ باندھنے والی روایت صحیح ہے؟

سوال : «عَن أَبِی وَائِلٍ عَن اَبِی هُرَیرَةَ رَضِیَ اللّٰهُ عَنهُ اَخذ اَلاكُفِّ عَلَى الاَكُفِّ فِی الصَّلٰوةِ تَحتَ السُّرَّةِ » (سنن ابوداؤد، نسخة الاعرابی: ۱/ ۲۸۰، المعلی ابن حزم: ۳/ ۳۰)

کیا مذکورہ بالا روایت[1] صحیح ہے؟

جواب : یہ حدیث ضعیف ہے، کیونکہ اس کی سند میں عبدالرحمٰن بن اسحاق واسطی ہے۔اس کے ضعف پر ائمۂ جرح وتعدیل کا اتفاق ہے۔[1] اسی طرح بیہقی رحمہ اللہ اور حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے بھی اس حدیث کو ضعیف کہا ہے۔ملاحظہ ہو! ''نصب الرایه'' (۱/ ۳۱٤)، فتح الباری (۲/ ۲۲٤)

نیز اس کی سند میں اضطراب ہے، کیونکہ بعض راویوں نے اس کو ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے اور یہ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے دارقطنی اور اوسط ابن منذر میں ہے جب کہ ابوداؤد میں یہ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کا اپنا قول ہے۔

''تحفة الاشراف'' (۱۰/ ۱۱۱،رقم:۱۳٤۹٤) بھی ملاحظہ کریں!

یہ روایت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے بھی ضعیف ہے، کیونکہ اس کی سند میں بھی مذکورہ ضعیف راوی ہے۔تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو! ضعیف ''سنن ابی داؤد'' (۹/ ۲۹۱)

فاتحہ خلف الامام کا حکم

مقتدی سورۂ فاتحہ کس وقت پڑھے؟

سوال مسعود احمد بی ایس سی ،امیر جماعت المسلمین (رجسٹرڈ) نے درج ذیل حدیث سے ثابت کیا ہے کہ سورۂ فاتحہ اس وقت پڑھی جائے جب امام خاموش ہو۔'' حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں:

« کانوا یقراون خلف رسول الله ﷺ إذا انصت فإذا قرا لم یقرء وا وإذا انصت قرء وا »[3]

اس کی سند کیسی ہے؟ اگر سند صحیح ہے تو سورۂ فاتحہ کس وقت پڑھی جائے گی؟ امام کے سکتوں میں یا مروّجہ

---

[1] سنن أبی داؤد،بَابُ وَضعِ الیُمنَى عَلَى الیُسرَى فِی الصَّلَاةِ، رقم:۷۵۸، و رقم:۷۵٦

[2] شرح مهذب:۳/۳۱۳، شرح مسلم نووی: ٤/ ۱۱۵

[3] بیهقی:جزء القراة / صلوٰة المسلمین

طریقہ ہی صحیح ہے؟

جواب اثر ہذا سند کے اعتبار سے اگرچہ قابل قبول ہے لیکن یہ اس بارے میں نص نہیں کہ دیگر مواقع پر فاتحہ کی قرات نہیں ہو سکتی، اس کتاب کے صفحہ پر ہے: ابوہریرہ کے شاگرد نے کہا: فكيف اصنع إذا جهر الإمام ''جب امام جہری قرات کرے تو مجھے کیا کرنا چاہئے؟'' جواب میں ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اقرا بها في نفسك ''اپنے جی میں پڑھ لے۔'' پھر بیہقی نے اپنی سند کے ساتھ مکحول سے نقل کیا ہے:

«اقْرَأْ بِهَا يعني بالفاتحة فِيمَا جَهَرَ بِهَا الْإِمَامُ إِذَا قَرَأَ بِفَاتِحَةِ الْكِتَابِ وَسَكَتَ سِرًّا، وَإِنْ لَمْ يَسْكُتْ قَرَأْتَهَا قَبْلَهُ وَمَعَهُ وَبَعْدَهُ، لَا تَتْرُكَنَّهَا عَلَى حَالٍ.»①

''جب امام جہری قرات کرے تو اس کی خاموشی میں مقتدی سری قرات کرے۔ اور اگر وہ خاموش نہ ہو تو اس سے پہلے اس کے ساتھ اور اس کے بعد قرات کو کسی حال میں مت چھوڑ۔''

پھر حضرت عبادہ رضی اللہ عنہ کی مشہور روایت میں ہے کہ ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صبح کی نماز پڑھائی تو قرات کرنا مشکل ہو گیا۔ سلام پھیرنے کے بعد آپ نے دریافت کیا: مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ تم اپنے امام کی اقتدا میں قرات کرتے ہو، ہم نے عرض کی: ہاں یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! آپ نے فرمایا سوائے فاتحہ کے کچھ نہ پڑھو، جو فاتحہ نہیں پڑھتا اس کی نماز نہیں۔''②

اس حدیث میں امام کی قرات کے وقت مقتدی کی قراتِ فاتحہ کا جواز ہے، اگر سکتات میں قرات کا تعین ہوتا تو آپ اس کی راہنمائی فرما دیتے۔ اس امر کی صراحت نہ کرنا جواز کی دلیل ہے۔ اصولِ فقہ کا مشہور قاعدہ ہے: تاخير البيان عن وقت الحاجة لا يجوز ''ضرورت کے وقت وضاحت کو مؤخر کرنا جائز نہیں۔''

سنن ابوداؤد کی روایت میں الفاظ یوں ہیں:

«فلا تقرءوا بشيء من القرآن إذا جهرتُ إلا بام القرآن.»③

''جب میں قراتِ جہری کروں تو سوائے اُمّ القرآن کے قرآن سے تم کچھ نہ پڑھو۔''

یہ الفاظ اس بارے میں نص ہیں کہ امام کی جہری قرات کے وقت مقتدی کے لئے فاتحہ پڑھنے کا جواز ہے۔ امام شوکانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''شوافع کا فاتحہ کی قرات کے بارے میں اختلاف ہے کہ آیا قرات فاتحہ امام کے سکتوں کے

---

① السنن الكبرىٰ للبيهقي، بَابُ مَنْ قَالَ يَقْرَأُ خَلْفَ الْإِمَامِ فِيمَا يَجْهَرُ فِيهِ ......الخ، رقم: ٢٩٥٢

② سنن ابی داؤد، بَابُ مَنْ تَرَكَ الْقِرَاءَةَ فِي صَلَاتِهِ بِفَاتِحَةِ الْكِتَابِ، رقم: ٨٢٣

③ سنن ابی داؤد، بَابُ مَنْ تَرَكَ الْقِرَاءَةَ فِي صَلَاتِهِ بِفَاتِحَةِ الْكِتَابِ، رقم: ٨٢٤

دوران ہوگی یا اس کی قرات کے موقع پر؟ احادیث کے ظاہر سے معلوم ہوتا ہے کہ فاتحہ امام کی قرات کے وقت پڑھی جائے اور امام کے سکوت کے موقعہ پر اگر ممکن ہو تو پڑھنا اَحوط (زیادہ احتیاط) ہے کیونکہ ایسا کرنا پہلے قول والوں کے نزدیک بھی جائز ہے۔اس پر عمل کرنا اجماع پر عمل کرنے کے مترادف ہوگا لیکن یہ معمول بنالینا کہ امام کے فاتحہ یا سورت کی تلاوت کے وقت ہی فاتحہ پڑھنے کی سعی کی جائے، ایسا کرنا کوئی مستند نہیں بلکہ سب طرح جائز اور سنت ہے۔ البتہ مقتدی کے لئے امام کی قراتِ فاتحہ کے وقت فاتحہ پڑھنا زیادہ مناسب ہے۔''[1]

احناف کی طرف سے سورۃ فاتحہ نہ پڑھنے کی یہ دلیل صحیح ہے؟

سوال اَحناف سورۂ اعراف کی آیت ﴿وَإِذَا قُرِءَ الْقُرانُ﴾ سے فاتحہ خلف الامام نہ پڑھنے کی دلیل لیتے تھے، اسی طرح سورۃ الاحقاف کی آیت ﴿وَإِذْ صَرَفْنَا إِلَيْكَ نَفَرًا مِنَ الْجِنِّ يَسْتَمِعُونَ الْقُرانَ فَلَمَّا حَضَرُوهُ قَالُوا أَنْصِتُوا﴾ (الاحقاف:۲۹) اور سورۃ القیامہ کی آیت ﴿لَا تُحَرِّكْ بِهِ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهِ﴾ (القيامة: ١٦) سے بھی کچھ حنفی مولوی یہی دلیل لینے لگے ہیں۔ کیا نبی کریم ﷺ، صحابہ؇، تابعین ؒ یا کسی مفسر نے ان آیات کی اس طرح تفسیر کی ہے؟

جواب مذکورہ بالا آیاتِ قرآنی کا تعلق سورۂ فاتحہ کے علاوہ سے ہے کیونکہ نبی کریم ﷺ کی ذاتِ گرامی قرآن کی مُبیّن (وضاحت کرنے والی) ہے۔صحیح احادیث میں آپ ﷺ کا فرمان ہے کہ ''سورۃ فاتحہ کے بغیر کوئی نماز نہیں'' اور قرآن میں ہے: ﴿وَمَا اتٰكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ وَمَا نَهٰكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوا﴾ (الحشر:۷) ''تمہارے لئے رسول اللہ ﷺ بہترین نمونہ ہیں'' کا تقاضا بھی یہی ہے کہ آپ ﷺ کے فرمان کے سامنے سر جھکا دیا جائے اور اپنی عقل وفکر کو نبوت کی روشنی کے تابع کردیا جائے، سلامتی اسی میں ہے۔تفسیر بالرائے کے بارے میں عذاب کی سخت تہدید اور وعید وارد ہے۔

آخری دو رکعتوں میں فاتحہ کے ساتھ کوئی اور سورت ملانا:

سوال فرض نماز کی آخری رکعتوں میں عموماً صرف سورہ فاتحہ ہی پڑھی جاتی ہے۔کیا ان رکعتوں میں فاتحہ کے علاوہ کوئی سورت بھی ملائی جاسکتی ہے یا نہیں؟

جواب فرضوں کی آخری رکعتوں میں فاتحہ کے ساتھ سورت ملانے کا جواز ہے۔صحیح مسلم وغیرہ میں حضرت

---

[1] ملخصاً فی نیل الاوطار:۲/۲۳٤

ابوسعید خدری کی روایت اس امر کی واضح دلیل ہے۔ ملاحظہ ہو مشکوۃ مع مرعاۃ المفاتیح (۶۰۲/۱) حدیث کے الفاظ یہ ہیں:

«عَنْ أَبِی سَعِیدِ الْخُدْرِیِّ، أَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ کَانَ یَقْرَأُ فِی صَلَاةِ الظُّهْرِ فِی الرَّکْعَتَیْنِ الْأُولَیَیْنِ فِی کُلِّ رَکْعَةٍ قَدْرَ ثَلَاثِینَ آیَةً، وَفِی الْأُخْرَیَیْنِ قَدْرَ خَمْسَ عَشْرَةَ آیَةً »[1]

''نبی کریم ﷺ ظہر کی نماز میں پہلی دو رکعتوں میں ہر رکعت میں ۳۰ آیات کے بقدر پڑھا کرتے تھے، جب کہ آخری دو رکعتوں میں ۱۵ آیات کے بقدر......''

تیسری رکعت میں ملنے والا مقتدی اپنی پہلی دو رکعت میں فاتحہ کے بعد سورۃ ملائے یا نہ؟

سوال: کوئی شخص اگر چار رکعت والی نماز میں امام کے ساتھ تشہد کے بعد آخری دو رکعات پائے، تو ان دو فوت شدہ رکعتوں میں اُسے سورۂ فاتحہ کے ساتھ دوسری سورت پڑھنی چاہیے یا صرف سورۂ فاتحہ پڑھنا کافی ہے۔ کیونکہ اس مسئلے میں بعض حضرات سورۃ فاتحہ کے ساتھ دوسری سورت پڑھنا ضروری کہتے ہیں۔ مگر ہمارے بعض لوگ صرف سورۃ فاتحہ کافی سمجھتے ہیں۔ براہِ کرم قرآن وسنت کی روشنی میں صحیح جواب عنایت فرمائیں۔

جواب: ''صحیح بخاری رحمہ اللہ وغیرہ میں حدیث ہے، کہ ''جتنی نماز امام کے ساتھ پاؤ پڑھو اور جتنی فوت ہو جائے پوری کرو۔''[2]

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ مسبوق (مقتدی) امام کے سلام پھیرنے کے بعد جتنی نماز پڑھتا ہے، وہ اس کی باقی ماندہ نماز ہے اور جو امام کے ساتھ پڑھی ہے وہ اس کی پہلی نماز ہے کیونکہ اس حدیث میں فوت شدہ کی بابت ''مکمل کرنے'' کا لفظ استعمال کیا گیا ہے جس کے معنی آخر سے پورا کرنے کے ہیں اور آخر سے پورا کرنا اسی صورت میں ہوسکتا ہے کہ جو نماز امام کی فراغت کے بعد پڑھے وہ اس کی آخری ہو۔ اور بعض روایتوں میں ''اتمام'' (مکمل کرنا) کی جگہ ''قضا'' کا لفظ آیا ہے، تو یہ اس کے خلاف نہیں کیونکہ قضا کے معنی پورا کرنے کے بھی آئے ہیں۔ جیسے قرآن مجید میں ہے۔

﴿فَإِذَا قُضِیَتِ الصَّلٰوةُ فَانتَشِرُوا فِی الْأَرْضِ﴾ (الجمعة:۱۰)

---

① صحیح مسلم، بَابُ الْقِرَاءَةِ فِی الظُّهْرِ وَالْعَصْرِ، رقم: ۴۵۲

② صحیح البخاری، بَابُ قَوْلِ الرَّجُلِ: فَاتَتْنَا الصَّلَاةُ، رقم: ۶۳۵

یعنی ''جب نماز پوری ہو جائے ،تو پھر روزی کی تلاش میں پھیل جاؤ۔''

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: کہ ان دولفظوں کے مطابق جمہور کا عمل ہے۔انہوں نے کہا:

« إن ما ادرك المأموم هو اول صلاته إلا انه يقضي مثل الذى فاته من قراء ة السورة مع امّ القرآن فى الرباعية لكن لم يستحبوا به إعادة الجهر فى الركعتين الباقيتين وكان الحجة فيه قوله ما ادركت مع الإمام فهو اول صلاتك واقض ما سبقك به من القرآن۔ اخرجه البيهقى وعن إسحق والمزنى لا يقرا الامام القرآن فقط وهو القياس » ①

اس سے معلوم ہوا کہ جمہور کا مسلک یہ ہے، کہ مقتدی جو دو رکعتیں بعد میں پڑھے، ان میں فاتحہ کے ساتھ سورت ملائے۔ ان کا استدلال اس حدیث سے ہے، کہ مأموم نماز کا جو حصہ امام کے ساتھ پائے، وہ اس کی پہلی نماز ہے، اور جو چیز قرآن سے فوت ہو جائے اس کی قضاء دے۔ تاہم اس میں جہری قرأت نہیں۔ ہاں البتہ اسحاق اور مزنی کا خیال ہے، کہ صرف ''فاتحہ'' پڑھے۔ قیاس کا تقاضا یہی ہے۔لیکن بالا دلیل کی رُو سے ترجیح پہلے مسلک کو ہے اور دوسرے کا صرف جواز ہے۔ کیونکہ ''فاتحہ'' کے ساتھ سورت ملانا ضروری نہیں۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں ہے:

« وَ اِن لَم تَزِد عَلٰى اُمِّ القُراٰنِ اَجزَتَ......الخ » ②

''اگر تو فاتحہ کے ساتھ کوئی اور سورۃ ملائے تو کفایت کر جائے گی''۔

سورۃ الفاتحہ کی آخری آیت نہ پڑھ سکنے کی صورت میں کیا رکعت لوٹائی جائے گی؟

سوال: مقتدی نے ابھی سورہ فاتحہ مکمل نہیں کی امام نے رکوع کر دیا مقتدی پڑھتا رہا۔ پھر اس خوف سے فاتحہ کی ''صرف آخری آیت'' چھوڑ دی کہ امام رکوع سے اٹھ نہ جائے۔کیا یہ رکعت دوبارہ پڑھنا ہوگی۔ امام کے سلام پھیرنے کے بعد؟

جواب: یہ رکعت دوبارہ پڑھنی ہوگی کیونکہ فاتحہ کل سورت کا نام ہے بعض کا نہیں۔

امام کے سورۃ فاتحہ کی قراءت کے بعد شامل ہونے والا فاتحہ کب اور کیسے پڑھے؟

سوال: زید جماعت میں اس وقت شامل ہوا جب امام فاتحہ پڑھ کر دوسری سورۃ شروع کر چکا تھا اب زید

① فتح البارى :۲/ ۱۱۹

② مرعاة المصابيح: ۱/ ۵۸۷

سورۃ فاتحہ کب اور کیسے پڑھے جب کہ قرأت کا سننا بھی فرض ہے اگر سورۃ فاتحہ نہ پڑھے تو کیا وہ رکعت ہو جائے گی؟

جواب : امام کی قرأت کے دوران مقتدی آہستہ فاتحہ پڑھ سکتا ہے۔ یہ استماع اور خاموشی کے منافی نہیں۔ کیونکہ شریعت میں خاموشی کا اطلاق بعض دفعہ عدمِ جہر (آواز بلند نہ کرنے) پر ہوتا ہے۔ چنانچہ صحیح حدیث میں رسول اللہ ﷺ کی تکبیر اور قرأت کے درمیان چپ ہو کر دعاے افتتاح پڑھنے کو سکوت اور اسکات سے تعبیر کیا گیا ہے۔ بہرصورت صحیح نصوص کی بناء پر فاتحہ کی قرأت از بس ضروری ہے۔ اس کے بغیر نماز نہیں۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو! تَحقِیقُ الکَلَامِ ، مِرعَاۃُ المَفَاتِیحِ (۱/ ۵۹۸۔۵۹۹) فتاویٰ اہلِ حدیث (۲/۱۴۲۔۱۴۰) (توضیح الکلام مولانا ارشاد الحق اثری حفظہ اللہ)

امام کے آمین کہنے کے وقت شامل ہونے والا سورۃ فاتحہ پڑھے گا؟

سوال : دوران جماعت مقتدی پہلی یا دوسری رکعت میں اس وقت شامل ہوا جب امام صاحب سورۂ فاتحہ کے آخر میں پہنچ چکے تھے۔ لہٰذا مقتدی نے امام کے ساتھ صرف آمین کہی۔ راہنمائی فرمائیں کہ مقتدی سورۂ فاتحہ کس وقت پڑھے گا یا کہ ضرورت نہیں رہے گی؟ اس صورت میں دعاے استفتاح پڑھنا ضروری ہے یا نہیں؟

جواب : ایسی حالت میں مقتدی کو اگر موقع مل جائے، تو سورۂ فاتحہ پڑھنی شروع کر دے۔ امام چاہے جونسی حالت میں بھی ہو (سکتہ یا قرأت)۔ کیونکہ صحیح احادیث میں ہے، کہ فاتحہ کے بغیر نماز نہیں ہوتی۔ اس حالت میں دعاے استفتاح نہ پڑھی جائے۔ کیونکہ اس کا پڑھنا مستحب ہے۔ واجب نہیں۔ پھر بھی اگر فاتحہ پڑھنے سے رہ جائے تو بعد میں رکعت مکمل پڑھنا پڑے گی۔

امام کے ساتھ قراءت نہ کرنے والی روایت کا حکم؟

سوال : ذیل میں چند صحیح احادیث کا ترجمہ، عدمِ فاتحہ خلف الامام کی تائید میں ارسال کر رہا ہوں، امید ہے کہ وضاحت کر کے تشفی فرمائیں گے۔

۱۔ زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کا فتویٰ ترجمۂ حدیث: جب کوئی شخص امام کے پیچھے ہو تو اس کے لیے کوئی قرأت نہیں، چاہے فاتحہ ہو یا غیر فاتحہ۔ [1]

---

[1] صحیح مسلم، باب سُجود التِّلاوۃ، رقم: ۵۷۷

۲۔ امام کے پیچھے قرأت نہ کرنے کے جواز میں جابر رضی اللہ عنہ کا فتویٰ: آپ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ کسی نے ایک رکعت بھی پڑھی اور اس میں فاتحہ نہ پڑھی تو اس کی نماز نہیں الا یہ کہ وہ امام کے پیچھے ہو۔ (مؤطا امام مالک، ترمذی، امام ترمذی نے اس کو حسن صحیح کہا ہے) ①

۳۔ ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فتویٰ بیان کرتے ہیں: آپ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نماز سکھا رہے تھے اور بتا رہے تھے کہ جب امام ''سَمِعَ اللّٰه'' کہے تو تم ''رَبَّنَا لَكَ الحَمد'' کہو، وہ رکوع میں جائے تو تم بھی رکوع میں جاؤ۔ اس طرح سمجھاتے ہوئے فرمایا کہ جب امام قرأت کر رہا ہو تو تم « فَأَنصِتُوا » چپ رہو۔ ②

۴۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ایک جہری نماز پڑھا رہے تھے، آپ کو الجھن پیش آئی، نماز ختم کرنے کے بعد فرمایا کہ کون میرے پیچھے قرأت کر رہا تھا؟ صحابہ نے کہا کہ ہم لوگ قرأت کر رہے تھے اس پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: «لَا تَفعَلُوا اِلَّا بِفَاتِحَةِ الكِتَاب» ③ ''جہری قرأت میں سورہ فاتحہ کے علاوہ کچھ نہ پڑھو۔''

اس روایت پر اعتراض:

اس روایت میں محمد بن اسحاق کا تفرد ہے اور اس کو دجّال اور کذّاب کہا گیا ہے اس کے علاوہ اس بات کو کوئی اور بیان نہیں کرتا۔ اس پر دوسرا الزام یہ ہے کہ یہ مُدلّس ہے اور مُدلّس کی ''عَن'' سے روایت نا قابلِ قبول ہے اور اس میں محمد بن اسحاق ''عَن'' سے روایت کرتا ہے۔

۵۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کا فتویٰ:

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب دریافت کیا ''کوئی ابھی میرے ساتھ قرأت کر رہا تھا؟'' تو ایک صحابی رضی اللہ عنہ نے اقرار کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''اسی لیے قرآن کے سلسلے میں مجھ سے تنازعہ ہو رہا تھا۔'' ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ''پھر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ قرأت کرنے سے رُک گئے۔'' ④

بعض حضرات کا کہنا ہے کہ ہم جہری نمازوں میں امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ کے وقفات میں سورت پڑھتے

---

① سنن الترمذی، بَابُ مَا جَاءَ فِی تَرْكِ القِرَاءَةِ خَلْفَ الإِمَامِ إِذَا جَهَرَ الإِمَامُ بِالقِرَاءَةِ، رقم: ۳۱۲

② صحیح مسلم، بَابُ التَّشَهُّدِ فِی الصَّلَاةِ، رقم: ۴۰۴

③ سنن أبی داؤد، بَابُ مَنْ تَرَكَ القِرَاءَةَ فِی صَلَاتِهِ بِفَاتِحَةِ الْكِتَابِ، رقم: ۸۲۳

④ سنن ابی داؤد، بَابُ مَنْ كَرِهَ القِرَاءَةَ بِفَاتِحَةِ الْكِتَابِ إِذَا جَهَرَ الْإِمَامُ، رقم: ۸۲۶

ہیں، لیکن ﴿اَلحَمدُ لِلّٰہِ رَبِّ العَالَمِین﴾ اور دوسری آیت کے بعد نبی ﷺ سے اتنے بڑے وقفات ثابت نہیں ہیں جن میں سورۃ فاتحہ کی آیات امام کے پیچھے اس خاموشی کی حالت میں پڑھ سکیں۔ اس طرح اگر کوئی سورت فاتحہ پڑھے گا تو ﴿غَیرِ المَغضُوبِ عَلَیھِم وَلاَ الضَّالِّینَ﴾ کے بعد جب امام "آمین" کہے گا تو مقتدی کو ابھی آیت پڑھنا باقی ہوگی۔ اس لیے وہ کبھی امام کے ساتھ آمین نہ کہہ سکے گا اور اس طرح وہ ثواب سے محروم رہے گا، جس کے متعلق یہ آیا ہے کہ جو شخص امام کی "آمین" اور اس پر فرشتوں کی "آمین" کہنے پر ان کی مطابقت میں "آمین" کہے گا اس کے اگلے (پرانے) گناہ معاف ہو جائیں گے۔[1]

جواب: حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کا قول بایں الفاظ مروی ہے:

« عَن عَطَاءِ بنِ یَسَارٍ، اَنَّہٗ اَخبَرَہٗ، اَنَّہٗ سَأَلَ زَیدَبنَ ثَابِتٍ عَنِ القِرَاءَ ۃِ مَعَ الاِمَامِ، فَقَالَ: لَا قِرَاءَ ۃَ مَعَ الإِمَامِ فِی شَیءٍ »[2]

"عطاء بن یسار نے زید بن ثابت رضی اللہ عنہ سے امام کے ساتھ قرأت کے بارے میں دریافت کیا، تو انھوں نے جواباً فرمایا: امام کے ساتھ کوئی قرأت نہیں۔"

عبارت ہذا کے ترجمہ سے ظاہر ہے، کہ سائل نے انتساب میں جو لفظ۔ فاتحہ کا اضافہ کیا ہے، وہ صحیح مسلم میں نہیں ہے۔ شارح مسلم امام نووی رحمہ اللہ نے اس اثر کے دو جوابات دیے ہیں، جن کا ماحاصل یہ ہے:

ا۔ ثابت شدہ احادیث "لَا صَلٰوۃَ لِمَن لَّم یَقرَأ بِاُمِّ القُراٰنِ. اِذَا کُنتُم خَلفِی ، فَلَا تَقرَؤُوا اِلَّا بِاُمِّ القُراٰنِ" اور ان کے ہم معنی دیگر احادیث زید رضی اللہ عنہ وغیرہ کے قول پر مقدم ہیں۔

۲۔ زید کا قول "مابعد الفاتحہ' جہری نمازوں میں قرأت پر محمول ہوگا۔ یہ تاویل ضروری ہے، تاکہ قول ہذا کی صحیح احادیث سے موافقت ہو سکے۔ جن میں فاتحہ کے علاوہ سورت کی قرأت سے مقتدی کو منع کیا گیا ہے اور علامہ عبدالرحمٰن مبارکپوری رحمہ اللہ اس کے جواب میں رقم طراز ہیں:

زید رضی اللہ عنہ کا یہ "اَثر" «ما عدا فاتحة» (فاتحہ کے علاوہ) پر یا "ترکِ جہر" پر محمول ہوگا، تاکہ اس میں اور احادیثِ مرفوعہ صحیحہ میں موافقت ہو جائے......اور اگر یہ "اَثر" (ماعدا فاتحہ) یا "ترکِ جہر" پر محمول نہ ہو، تو احادیثِ مرفوعہ صحیحہ اس پر مقدم ہوں گی۔"[3]

---

[1] صحیح البخاری باب جَھرِ المَأمُومِ بِالتَّأمِینِ، رقم: ۷۸۲، صحیح مسلم، رقم: ۴۱۰

[2] صحیح مسلم، باب سُجود التِّلاوۃ، رقم: ۵۷۷

[3] تحقیق الکلام، حصہ دوم، ۲۱۴

علامہ موصوف کا یہ مدلل جواب، دراصل امام نووی رحمہ اللہ اور بیہقی کی گفتگو کا ملخص ہے، جس میں ایک عاقل اور صاحبِ بصیرت انسان کے لیے دعوتِ فکر و تحقیق ہے، تا کہ عظمتِ حدیث اور مقامِ سنت پر آنچ نہ آنے پائے۔

حنفی فقہاء کی صراحت:

اس بناء پر ائمہ حنفیہ مثلاً: ابن الہمام اور ملا علی قاری وغیرہ نے صراحت کی ہے، کہ حنفیہ کے ہاں صحابی کا قول قابل حجت و استدلال ہے، بشرطیکہ کوئی مرفوع حدیث اس کے منافی نہ ہو۔ چنانچہ فقیہ ابن الہمام فرماتے ہیں:

« إِنَّ قَولَ الصَّحَابِيِّ حُجَّةٌ.فَيَجِبُ تَقلِيدُهُ عِندَنَا،إِذَا لَم يَنفِهِ شَيءٌ آخَرُ مِنَ السُّنَّةِ » [1]

یعنی صحابی کا قول قابلِ حجت ہے۔ ہمارے نزدیک اس کی تقلید واجب ہے، بشرطیکہ سنت میں کوئی اس کے منافی نہ ہو۔

اور ملا علی قاری فرماتے ہیں:

« قَولُ الصَّحَابِيِّ حُجَّةٌ عِندَنَا. إِذَا لَم يَنفِهِ شَيءٌ آخَرُ مِنَ السُّنَّةِ » [2]

یعنی صحابی کا قول ہمارے نزدیک قابلِ حجت ہے، بشرطیکہ سنت کے منافی نہ ہو۔

اور مولانا عبدالحی حنفی ''امام الکلام'' میں فرماتے ہیں:

«صَرَّحَهُ ابنُ الهَمَّامِ، وَ غَيرُهُ أَنَّ قَولَ الصَّحَابِيِّ حُجَّةٌ، مَا لَم يَنفِهِ شَيءٌ مِنَ السُّنَّةِ، وَ مِنَ المَعلُومِ أَنَّ الأَحَادِيثَ المَرفُوعَةَ دَالَّةٌ عَلٰى إِجَازَةِ قِراءةِ الفَاتِحَةِ خَلفَ الأَئِمَّةِ، فَكَيفَ يُوخَذُ بِالأَثَارِ وَ تُترَكَ السُّنَّةُ، (اِنتَهٰى) » (ص،١٦١)

یعنی ''ابن ہمام وغیرہ نے اس بات کی تصریح کی ہے، کہ صحابی کا قول حجت ہے، بشرطیکہ سنت سے کوئی شے اس کی نفی نہ کرے اور یہ بات معلوم ہے کہ مرفوع احادیث اس بات پر دال ہیں، کہ اماموں کی اقتداء میں فاتحہ پڑھنے کی اجازت ہے۔ پس یہ کیسے ہوسکتا ہے، کہ آثار کو لے لیا جائے اور سنت کو چھوڑ دیا جائے؟''

اس سے یہ بات کھل کر سامنے آگئی، کہ سنت کے مقابلہ میں کسی کے قول کی کوئی حیثیت نہیں۔ چاہے وہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہی کیوں نہ ہوں۔ یہی جواب ہے۔ ان تمام آثار کا جو محلِ بحث میں سنت کے معارض پیش

[1] فتح القدیر،٣/٢٦٤

[2] مرقاۃ،٢/٢٣٤

کیے جاتے ہیں۔اس میں جابر رضی اللہ عنہ کا قول بھی شامل ہے۔ حافظ ابن عبد البر رحمہ اللہ نے ''التمہید'' اور ''الاستذکار'' میں صراحت کی ہے، کہ جس کسی صحابی رضی اللہ عنہ سے ''ترکِ قرأتِ خلفِ امام'' ثابت ہے۔اس سے اس کا خلاف بھی منقول ہے، ماسوائے جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ کے۔لیکن علامہ مبارکپوری رحمہ اللہ فرماتے ہیں، کہ ان سے بھی قرأت خلف الامام ثابت ہے۔وہ بحوالہ ''ابن ماجہ'' فرماتے ہیں:

« عَن يَزِيدَ الفَقِيهِ ، عَن جَابِرِ بنِ عَبدِ اللّٰهِ، قَالَ: كُنَّا نَقرَأُ فِي الظُّهرِ ، وَالعَصرِ خَلفَ الِامَامِ فِي الرَّكعَتَينِ الْاولَيَينِ بِفَاتِحَةِ الكِتَابِ، وَ سُورَةٍ ، وَ فِي الْاخرَيَينِ بِفَاتِحَةِ الكِتَابِ.»①

﴿إِذَا قَرَأَ فَأَنصِتُوا﴾ کی تحقیق:

ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کی روایت میں لفظ ﴿وَ إِذَا قَرَأَ فَأَنصِتُوا﴾(النحل:۹۸) کی تصحیح اور تضعیف میں ائمہ فن اور نقاد اور حفاظِ حدیث کا اختلاف ہے:

امام احمد، امام مسلم، اور حافظ منذری رحمہم اللہ نے اس لفظ کو صحیح قرار دیا ہے، جب کہ اکثر حفاظ، امام بخاری، ابوداؤد، ابوحاتم، یحییٰ بن معین، حاکم، دارقطنی، ابن خزیمہ، محمد بن یحییٰ الذہلی، حافظ ابوعلی نیشاپوری، حافظ علی بن عمر اور بیہقی رحمہم اللہ نے اس لفظ کو ضعیف گردانا ہے۔

محدثین کے ہاں یہ مُسلَّمہ اصول ہے، کہ تعارض کی صورت میں کثرت کو قلت پر غالب قرار دیا جاتا ہے، لہٰذا اکثریت کا قول قابلِ اعتبار ٹھہرا کہ یہ ٹکڑا ضعیف ہے۔اس کی دو وجہیں ہیں:

۱۔ یہ لفظ غیر محفوظ اور سلیمان تیمی کا وہم ہے۔

۲۔ سلیمان تیمی نے قتادہ سے سماع کی صراحت نہیں کی۔جب کہ قتادہ مدلس ہے۔اس طرح قتادہ نے بھی یونس بن جبیر سے سماع کی صراحت نہیں کی۔ سلیمان تیمی اور قتادہ کا مدلس ہونا ''کتب اسماء الرجال'' میں معروف ہے اور اگر تفصیل مطلوب ہو، تو اس بات میں ''تحقیق الکلام'' کا مراجعہ بے حد مفید ہے۔ملاحظہ ہو! (حصہ دوم، ص:۸۳، تا ۱۰۱) اور بفرضِ محال اگر اس کو صحیح تسلیم کر بھی لیا جائے، تو اس کا اطلاق ''سورۃ فاتحہ'' کے علاوہ پر ہوگا۔

محمد بن اسحاق رحمہ اللہ پر جرح کا جواب:

محمد بن اسحاق پر جرح، تدلیس اور تفرّد کا جواب بالاختصار ملاحظہ ہو!

① تحقیق الکلام حصہ اول ،ص:۱۰۱

علامہ ابن الہمام حنفی فرماتے ہیں:

''بلاشبہ محمد بن اسحاق رحمہ اللہ ثقہ راوی ہے اور امام مالک رحمہ اللہ سے جو اس کے بارے میں جرح نقل کی گئی ہے، وہ ثابت نہیں اور اگر ثابت ہو تو اہلِ علم نے اس کو قبول نہیں کیا اور کس طرح قبول ہو، جبکہ شعبہ نے اس کو ''امیر المومنین فی الحدیث'' کہا ہے۔ کبار ائمہ نے اس سے روایت بیان کی ہے۔ بخاری رحمہ اللہ نے ''جُزءُ القراء ۃ'' میں بڑے زور شور سے اس کا ثقہ ہونا ثابت کیا ہے۔ جبکہ ابن حبان نے اس سے رجوع کر لیا تھا اور محمد بن اسحاق سے صلح کی نیز اس کے پاس تحفہ بھیجا۔''①

اور علامہ زیلعی حنفی لکھتے ہیں: ''بیہقی نے ذکر کیا ہے، کہ محمد بن اسحاق نے اپنے شیخ سے یہ حدیث سُنی ہے، اور یہ حدیث متصل صحیح ہے۔ یعنی اس میں تدلیس وغیرہ کا کوئی شبہ نہیں۔''②

اور حافظ ابن حجر رحمہ اللہ ''القول المسدد'' میں فرماتے ہیں: ''ابن جوزی نے محمد بن اسحاق پر جو حملہ کیا ہے وہ فضول ہے، کیونکہ ائمہ نے اس کی حدیث کو قبول کیا ہے۔ وہ سچا ہے۔ زیادہ سے زیادہ اس میں تدلیس کا عیب ہے۔ جبکہ فاتحہ کی حدیث میں وہ بھی نہیں۔ کیونکہ مکحول سے ان کا سماع ثابت ہے۔ پھر محمد بن اسحاق اس روایت کے بیان میں متفرد بھی نہیں۔'' چنانچہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

« وَ تَابَعَهُ زَيْدُ بْنُ وَاقِدٍ، وغَيْرُهُ، عَنْ مَكْحُولٍ » ③

یعنی اس حدیث کو بیان کرنے میں محمد بن اسحاق متفرد نہیں۔ زید بن واقد وغیرہ نے عن مکحول اس کی متابعت کی ہے۔

محمد بن اسحاق رحمہ اللہ پر تفصیلی بحث کے لیے ملاحظہ ہو! "تحقیق الکلام" حصہ اول (ص:۵۷ تا ۶۲) اور ''اہلحدیث کے امتیازی مسائل'' (شیخنا محدث روپڑی رحمہ اللہ ، ص:۶۳)

" فَانتَهَى النَّاسُ عَنِ القِرَاءَ ة " کا مطلب:

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی روایت کا جواب یہ ہے، کہ اس میں جملہ ''فَانتَهَى النَّاسُ عَنِ القِرَاءَة'' یعنی لوگ قرأت کرنے سے باز آ گئے۔ یہ زُہری (راوی حدیث) کا ''مُدرَج'' کلام ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا

① فتح القدیر بحوالہ تحقیق، ص:۵۷

② نصب الرایہ، ص:۲۳۱

③ التلخیص:۸۷

کلام نہیں۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

« فَانتَهَى النَّاسُ إِلَى آخِرِهِ مُدرَجٌ فِي الخَبَرِ مِن كَلَامِ الزُّهرِيِّ، بَيَّنَهُ الخَطِيبُ. وَاتَّفَقَ عَلَيهُ البُخَارِيُّ فِي التَّارِيخِ، وَ أَبُودَاوُدَ، وَ يَعقُوبُ بنُ سُفيَانَ، وَالذُّهَلِيُّ، وَالخَطَّابِي، وَ غَيرُهُم » ①

اور پھر راوی حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بذاتِ خود امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ پڑھنے کے قائل تھے۔ حنفیہ کا مُسلَّمہ اصول ہے، کہ راوی جب اپنی روایت کے خلاف کرے، تو راوی کے عمل کو لیا جاتا ہے، اور روایت کو چھوڑ دیا جاتا ہے اور اسی طرح کی صورت حال کچھ ﴿وَ إِذَا قَرَأَ فَأَنصِتُوا﴾(النحل:۹۸) میں بھی ہے۔ کیونکہ یہ جملہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے، لیکن راوی (ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ) کا عمل اس کے خلاف ہے۔ لہٰذا حنفیہ کو اپنے اصول کی بناء پر ''فاتحہ خلف الامام'' کا قائل ہونا چاہیے۔'' (والتوفیق بید اللّٰہ)

مُقتدی کے لیے ''فاتحہ'' بالخصوص وقفات میں پڑھنے کا کوئی تقیُّد (قید) نہیں۔ تاہم مقتدی کے لیے ضروری ہے، کہ جیسے بھی ممکن ہو، سرّی اور جہری نمازوں میں فاتحہ پڑھے۔ اس بارے میں حضرت مکحول کا تفصیلی فتویٰ ''سنن أبی داوٗد'' میں ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔ مزید تفصیل کے لیے ''عون المعبود'' (۳۰۵/۱) اور اگر فاتحہ پڑھتے ہوئے کسی کی کوئی آیت رہ جائے، پھر بھی امام کے ساتھ ''آمین'' کہہ کر بقیہ مکمل کر لے، تاکہ موافقت سے محروم نہ رہے۔ (واللہ أعلم)

مقتدی کو امام کے پیچھے فاتحہ کس طرح پڑھنی چاہیے؟

سوال: مقتدی کو امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ پڑھنی ہوتی ہے۔ لیکن بعض مقتدی امام کی قرأت کے ساتھ ساتھ پڑھتے ہیں، کیا مقتدیوں کو امام کے ساتھ ساتھ سورہ فاتحہ پڑھنی چاہیے یا امام کو چاہیے کہ ہر آیت پر وقفہ کرے تاکہ مقتدی اس وقت میں پیچھے تلاوت کر لیں یا پھر مقتدی امام کے ساتھ ہی سورۃ فاتحہ پڑھتا چلا جائے؟

جواب: اہم شئ یہ ہے، کہ مقتدی کو امام کی اقتداء میں سورۃ الفاتحہ پڑھنی ضروری ہے۔ شکل جونسی اختیار کر لی جائے درست ہے۔ ملاحظہ ہو سنن ابوداؤد۔ ②

جہری نمازوں میں امام کے پیچھے فاتحہ پڑھنے کا حکم:

سوال: جہری نمازوں میں قرأت خلف الامام کے مسئلہ میں کوئی اختلاف ہے یا یہ متفق علیہ مسئلہ ہے؟ ناصر

① تلخیص، ص: ۸۷

② سنن ابی دائود، بَابُ مَنْ تَرَكَ الْقِرَاءَةَ فِي صَلَاتِهِ بِفَاتِحَةِ الْكِتَابِ، رقم: ۸۲۵

الدین البانی صاحب نے اپنی کتاب ''صلوٰۃ النبی ﷺ'' میں جہری نماز میں قرأت خلف الامام سے منع کیا ہے جب کہ سری میں اس کو ضروری قرار دیا ہے۔

(جواب) : جہری نمازوں میں امام مالک رحمہ اللہ وغیرہ ''فاتحہ خلف الامام'' پڑھنے کے قائل نہیں۔ علامہ البانی رحمہ اللہ نے بھی بعض روایات کی بناء پر اسی مسلک کو اختیار کیا ہے۔ لیکن فی الواقع یہ مسلک مرجوح ہے۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو! (مرعاۃ المفاتیح) جلد اوّل۔

مقتدی کے فاتحہ پڑھنے کے لیے امام کا سکتہ کرنا:

(سوال) : بعض لوگ قائل ہیں کہ فاتحہ پڑھنے کے بعد امام کو سکتہ اتنا لمبا کرنا چاہیے کہ مقتدی فاتحہ مکمل کر لیں کیا اتنا لمبا سکتہ کرنا ثابت ہے؟ کیا اسلاف میں بھی لمبے سکتے کا اختلاف رہا ہے؟

"تخریج صلوٰۃ الرسول" میں بس اتنا لکھا ہے کہ فاتحہ کے بعد نہیں بعد والی صورت کے بعد سکتہ ثابت ہے۔

(جواب) : اتنا لمبا سکتہ ثابت نہیں۔ فاتحہ کے بعد سکتے کا مسئلہ ویسے بھی محلِ نظر ہے۔ بعض حنابلہ اس بات کے قائل ہیں۔

نماز میں ثابت شدہ ''سکتے'':

(سوال) : نماز میں کہاں کہاں ''سکتے'' مسنون ہیں؟ تفصیل سے جواب دیں؟

(جواب) : نماز میں ثابت شدہ ''سکتے'' دو ہیں۔ ایک تکبیرِ تحریمہ کے بعد، اور دوسرا مکمل قرأت سے فراغت کے بعد۔

علامہ احمد شاکر رحمہ اللہ نے ترمذی کے حاشیہ پر حدیث ہذا کو صحیح کہا ہے۔ علامہ البانی رحمہ اللہ نے بھی بعد از فراغت قرأت سکتہ کو صحیح کہا ہے۔ اصل حدیث کے اصل الفاظ یوں ہیں:

« عَن سَمُرَةَ بنِ جُندُبٍ، قَالَ حَفِظتُ سَكتَتَينِ فِي الصَّلٰوةِ : سَكتَةٌ اِذَا كَبَّرَ الِامَامُ حَتّٰى يَقرَاءَ، وَ سَكتَةٌ إِذَا فَرَغَ مِن فَاتِحَةِ الكِتَابِ، وَ سُورَةٍ عِندِ الرُّكُوعِ »[1]

البتہ راوی ہشیم نے یونس سے فاتحہ کے بعد سکتہ ذکر کیا ہے، لیکن دوسری طرف عبدالوارث بن سعید اور اسماعیل بن علیہ نے مکمل قرأت کے بعد ذکر کیا ہے۔ ان کی روایت راجح ہے، کیونکہ اکثر رواۃ نے سکتہ مکمل قرأت کے بعد ذکر کیا ہے۔ فاتحہ کے بعد سکتہ والی روایت کو شیخ البانی نے ضعیف قرار دیا ہے۔

---

(1) سنن الترمذی، بَابُ مَا جَاءَ فِی السَّكتَتَینِ، رقم: ۲۵۱

سکتوں میں سورۃ فاتحہ پڑھنا:

(سوال): میں نے فاتحہ خلف الامام کا نیا طریقہ دیکھا ہے کہ پہلے امام فاتحہ پڑھتا ہے امام کے خاموش ہونے پر مقتدی آہستہ قرأت کرتے ہیں اوراس کے بعد رکوع ہوتا ہے۔اس کے متعلق وہ کہتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نماز میں دو سکتے کرتے (یعنی دو مرتبہ خاموش ہوتے) تھے۔کیا یہ طریقہ صحیح احادیث سے ثابت ہے؟ وضاحت فرمادیں۔

(جواب): یہ بات درست ہے، کہ رسول اللہ ﷺ سے نماز کے قیام میں دو سکتے ثابت ہیں۔لیکن اس دوسرے سکتے کے دوران مقتدی کے لیے سورۂ فاتحہ پڑھنا رسول اللہ ﷺ سے ثابت نہیں۔تاہم بعض سلف نے اس کو مستحب سمجھا ہے۔ملاحظہ ہو!(المغنی:۲/۱۶۳۔۱۶۴)

جب کہ علامہ مبارک پوری رحمہ اللہ نے بھی ان سے موافقت نہیں کی۔[1] چنانچہ امام کے پیچھے پیچھے ہی پڑھ لینی چاہیے۔جیسا کہ حدیثِ ابی ہریرہ رضی اللہ عنہ میں ہے، کہ:«اِقرَاْ بِهَا فِي نَفسِكَ »[2]

امام کا سورۃ فاتحہ کی قراءت کرتے ہوئے معمولی سا ٹھہراؤ کرنا:

(سوال): باجماعت نماز میں امام سورۂ فاتحہ کی آیات میں کتنا وقفہ رکھے؟ کیا مقتدیوں کو وہی آیت پڑھنے کے لیے وقت دے یا امام اپنی قرأت تسلسل کے ساتھ بغیر کسی وقفے کے مکمل کرے؟اس صورت میں مقتدی فاتحہ کب پڑھیں؟

(جواب): امام ہر آیت کی تلاوت علیحدہ علیحدہ کرے۔درمیان میں معمولی سا ٹھہر کر آگے چلتا جائے۔اور مقتدی ساتھ ساتھ فاتحہ پڑھتا جائے یا سکتات میں پڑھ لے۔جیسے بھی آسانی ہو۔جواز ہے۔ملاحظہ ہو! (سنن ابی داؤد)[3]

کیا چار رکعتی نماز میں صرف ایک مرتبہ سورۃ فاتحہ پڑھنے سے نماز ہو جائے گی؟

(سوال): ہمارے خطیب صاحب سے ایک دن فاتحہ خلف الامام کے مسئلے پر بات ہوئی تو انھوں نے کہا کہ بخاری شریف میں ”لا صلوٰۃ“ کا لفظ ہے کہ فاتحہ کے بغیر نماز نہیں ہوتی۔اگر کوئی ۴ رکعتی نماز میں ایک رکعت

---

[1] صحیح مسلم،بَابُ وُجُوبِ قِرَاءَةِ الْفَاتِحَةِ فِي كُلِّ رَكْعَةٍ، ......الخ ، رقم:۳۹۵

[2] تحفۃ الاحوذی۔ ۲/ ۸۰

[3] سنن ابی دائود،بَابُ مَنْ تَرَكَ الْقِرَاءَةَ فِي صَلَاتِهِ بِفَاتِحَةِ الْكِتَابِ،رقم:۸۲۵

میں فاتحہ پڑھ لے تو اس کی نماز ہو جائے گی یا نہیں؟

(جواب): ہر رکعت میں سورہ فاتحہ کا پڑھنا ضروری ہے۔اس کے بغیر نماز نہیں ہوتی۔

کیا سورۃ فاتحہ کے متعلق علامہ البانی رحمہ اللہ کا موقف درست ہے؟

(سوال): علامہ ناصر الدین البانی کا فاتحہ خلف الامام کے متعلق جو موقف ہے کیا وہ صحیح ہے یا غلط؟

(جواب): فاتحہ خلف الامام کے بارے میں علامہ البانی رحمہ اللہ کا موقف یہ ہے، کہ جہری نمازوں میں مقتدی نہ پڑھے۔لیکن دلائل کے اعتبار سے یہ کمزور مسلک ہے۔ ملاحظہ ہو، تحقیق الکلام، محدث مبارکپوری)

"مُسیء الصلاۃ" حدیث کی فنی حیثیت:

(سوال): حدیث مُسی الصلوٰۃ علماء میں معروف ہے جس میں ہے۔ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ کے سامنے نماز پڑھی پھر آ کر سلام کیا تو آپ ﷺ نے سلام کا جواب دینے کے بعد فرمایا کہ نماز پڑھو تم نے نماز نہیں پڑھی۔ تین یا چار مرتبہ نماز پڑھنے کے بعد اس نے سوال کیا کہ مجھے نماز سکھائیں آپ ﷺ نے نماز سکھاتے ہوئے فرمایا پھر قرآن پڑھو جتنا میسر ہو، بتایا جاتا ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: «اِقرَاء بِأُمِّ القُرآنَ» براہِ مہربانی ان الفاظ کی فنی حیثیت اور مکمل متن مع حوالہ تحریر فرمائیں

(جواب): "سنن ابی داؤد" میں رفاعہ (رضی اللہ عنہ) کی حدیث میں ہے: « ثُمَّ اقرَاء بِأُمِّ القُرانِ، وَ بِمَا شَاءَ اللّٰهُ اَن تَقرَأَ»[1] یعنی "پھر سورۃ الفاتحہ کی اور (اس کے علاوہ) جتنی اللہ توفیق دے قرأت کر۔"

اسی طرح "مسند احمد" اور ابن حبان میں ہے: «اِقرَاء بِأُمِّ القرآنِ ، ثُمَّ اقرَأ بِمَا شِئتَ»[2] بحوالہ "مرعاۃ المفاتیح" (۵۲۳/۱)

اور علامہ البانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: کہ جزء القراءۃ امام بخاری میں بسند صحیح وارد ہے، کہ آپ نے "مُسِیُّ الصلوۃ" (نماز ٹھیک نہ پڑھنے والے) کو حکم دیا تھا کہ نماز میں فاتحہ پڑھے۔[3]

وَ اِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَ اَنْصِتُوْا کا شانِ نزول بیان فرمائیں:

(سوال): قرآن کریم کی آیت ﴿وَ اِذَا قُرِئَ القُراٰنُ فَاستَمِعُوا لَهٗ وَاَنصِتُوا﴾ (النحل:۹۸) کی شانِ نزول

---

① سنن أبی داؤد، بَابُ صَلَاةِ مَنْ لَا يُقِيمُ صُلْبَهُ فِي الرُّكُوعِ وَالسُّجُودِ، رقم:۸۵۹

② صحیح ابن حبان، ذِكْرُ الْخَبَرِ الدَّالِّ عَلَى أَنَّ قَوْلَهُ ﷺ: فَلَا تَفْعَلُوا إِلَّا بِأُمِّ الْكِتَابِ...... الخ، رقم:۱۷۸۷

③ صفة الصلاۃ، ص: ٦٩

کی وضاحت فرمادیں۔

(جواب): اس آیت کی شانِ نزول کے بارے میں متعدد اقوال ہیں۔ علامہ عبدالحی لکھنوی نے ''امام الکلام'' میں سات اقوال ذکر کیے ہیں۔ ساتواں قول یہ ہے کہ نبی ﷺ اس کے مخاطب ہیں۔ نزولِ قرآن کے وقت آپ ساتھ ساتھ پڑھتے، تو اس آیت کے ذریعے آپ ﷺ کو حکم دیا گیا ہے، کہ آپ قرآن کو سنا کریں۔

نیز امام رازی ''تفسیر کبیر'' میں فرماتے ہیں: کہ اس آیت میں خطاب کفار سے ہے۔ مسلمان اس کے مخاطب ہی نہیں اس قول کو انھوں نے حسن قرار دیا۔(۸/۸۵)، اور یہ بھی ذکر فرمایا ہے: کہ کفار کے قول ﴿لَا تَسۡمَعُوا لِهٰذَا الۡقُرۡاٰنِ﴾(حم السجدة:٢٦) کے جواب میں استماع (غور سے سنتے) اور انصات (خاموشی) کا حکم دیا گیا ہے۔

باجماعت نماز کی صورت میں مقتدی کو فاتحہ پڑھنی چاہیے یا نہیں؟

(سوال): نماز باجماعت میں سورۃ فاتحہ پڑھنی چاہیے یا نہیں کیونکہ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ امام کی قرأت کے دوران خاموشی اختیار کرنی چاہیے۔ وضاحت کریں؟

(جواب): حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے مروی مرفوع متصل حدیث ہے:

« لَا صَلَاةَ لِمَنۡ لَّمۡ يَقۡرَأۡ بِفَاتِحَةِ الۡكِتَابِ » (متفق عليه) [1]

''جو سورت فاتحہ نہ پڑھے اس کی کوئی نماز نہیں۔''

حدیث ہذا عموم کے اعتبار سے سب حالتوں کو شامل ہے۔ حضرت عبادہ رضی اللہ عنہ کی دوسری روایت میں ''خلف الامام'' کی تصریح بھی وارد ہے:

«لَا صَلَاةَ لِمَنۡ لَّمۡ يَقۡرَأۡ بِفَاتِحَةِ الۡكِتَابِ خَلۡفَ الۡاِمَامِ » (اسناده صحيح)

تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو! کتاب:'' الكتاب المستطاب'' (لشیخنا محدث روپڑی رحمہ اللہ، ص:۳۵۰)

---

[1] صحيح البخاری، باب وُجُوبِ الۡقِرَائَةِ لِلۡاِمَامِ وَالۡمَامُومِ فِي الصَّلٰوةِ كُلِّهَا ...... الخ، رقم:٧٥٦، صحيح مسلم:٣٩٤

نماز میں سورۂ فاتحہ پر مولانا اثری کی تحقیق پر تبصرہ:

پندرہ اپریل ۲۰۰۵ء کے الاعتصام میں فاضل محقق مولانا ارشاد الحق اثری ﷾ کا مضمون بعنوان ''نماز میں سورۂ فاتحہ سہواً رہ جائے تو کیا حکم ہے؟'' شائع ہوا، فی الجملہ ان کی تحقیق قابلِ تعریف ہے۔ جزاہ اللہ خیرا۔ لیکن ایک بات محلِ تردد ہے، موصوف فرماتے ہیں:

''امام، مقتدی یا منفرد جو بھی ''سورۂ فاتحہ'' بھول جائے، اسے وہ رکعت دوبارہ پڑھنی چاہیے۔''

میرے خیال میں اس موقف پر نظر ثانی ہونی چاہیے۔ انھیں یوں کہنا چاہیے تھا، کہ جس رکعت میں سورۂ فاتحہ رہ جائے، وہ اور اس کے بعد والی رکعت کو دوبارہ پڑھنا چاہیے کیونکہ ''اَلْبِنَاءُ عَلَی الْفَاسِدِ فَاسِدٌ'' کے تحت بعد والی نماز تو نماز ہی تصور نہیں ہوگی۔ (واللہ اعلم)

مقتدی سرّی نمازوں میں فاتحہ کے ساتھ مطلقاً سورت ملا سکتا ہے؟

(سوال) کیا مُصلّی سرِّی نمازوں میں پہلی دو رکعتوں میں فاتحہ کے بعد امام کے پیچھے کوئی سورۃ پڑھے گا یا نہیں؟

(جواب): مأموم (مقتدی) سرّی نمازوں میں فاتحہ کے ساتھ مطلقاً سورت ملا سکتا ہے۔ ممانعت صرف جہری نمازوں کے لیے وارد ہے۔

مغرب کی باجماعت نماز میں تینوں رکعتوں میں صرف سورۃ فاتحہ پڑھنا:

(سوال): کیا جو آدمی مغرب کی نماز باجماعت ادا کر رہا ہے وہ تینوں رکعتوں میں صرف سورہ فاتحہ پڑھے کیونکہ پہلی دو رکعتوں میں فاتحہ کے بعد امام کی قرأت سنتا ہے۔ یا یہ بھی ہے کہ فرائض کی پہلی دو رکعتوں میں سورہ فاتحہ کے علاوہ کوئی اور سورت بھی ملائے؟ غیر جہری نماز اور آخری دو رکعات میں صرف فاتحہ پڑھے تو کیا شام کی تیسری رکعت میں باجماعت نماز ادا کرنے والا صرف فاتحہ ہی پڑھے گا۔''

(جواب): مقتدی سری نماز میں فاتحہ کے ساتھ سورت ملا سکتا ہے اور آخری دو رکعتوں یا مغرب کی آخری رکعت میں بھی قرأت کا جواز ہے۔ ممانعت جہر کی صورت میں ہے۔

« فَلَا تَقْرَءُوا بِشَیْءٍ مِّنَ الْقُرْاٰنِ إِذَا جَهَرْتُ إِلَّا بِأُمِّ الْقُرْاٰنِ »[1]

ملاحظہ ہو: صحیح مسلم اور مؤطا امام مالک وغیرہ۔

---

[1] سنن أبی داؤد، بَابُ مَنْ تَرَكَ الْقِرَاءَةَ فِی صَلَاتِهِ بِفَاتِحَةِ الْكِتَابِ ، رقم: ۸۲٤

مقتدی اور امام کا آمین کہنا

کیا آمین بالجہر کے عدم جواز پر استدلال صحیح ہے؟

(سوال) میانوالی میں ایک حنفی عالم قاری محمد شعیب صاحب نے جمعہ پڑھایا اور قرآن کی آیت ﴿یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَرْفَعُوْٓا اَصْوَاتَکُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِیِّ﴾ سے آمین بالجہر کا ردّ کرتے ہوئے کہا کہ اہل حدیث کہتے ہیں کہ آمین سے مسجد گونج گئی۔ پہلی بات یہ ہے کہ مسجد نبوی کچی مسجد تھی، وہ کس طرح گونجتی تھی؟ دوسرے، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: کہ نبی ﷺ سے اپنی آواز بلند نہ کرو، ورنہ تمہارے ایمان ضائع ہو جائیں گے۔ کیا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نعوذ باللہ نبی ﷺ کے نافرمان تھے جو ایسا کرتے تھے؟ حنفی کہتے ہیں کہ آمین اگر کہیں بھی تو بس اتنی کہ ساتھ والا سن لے۔ آواز گونجنے والی روایات میں اہل حدیث جھوٹے ہیں۔ (شاہجہاں ملک)

(جواب) اس آیت سے آمین بالجہر کے عدم جواز پر استدلال کرنا نری جہالت ہے، جملہ مفسرین اور سلف کے فہم کے خلاف تفسیر بالرائے ہے جو مذموم ہے۔

مولانا عبدالحیٔ حنفی التعلیق المجد میں فرماتے ہیں:

« والإنصاف أن الجهر قوی من حیث الدلیل »

''انصاف کی بات یہ ہے کہ اونچی آواز سے آمین کہنے کا ثبوت بہت پختہ ہے۔''

امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی صحیح میں باقاعدہ امام اور مقتدی کے لیے بآواز بلند آمین کہنے کے عنوانات قائم کیے ہیں اور اس ضمن میں نقل کیا ہے کہ حضرت عبد اللہ بن زبیر اور ان کے مقتدی اتنی بلند آواز سے آمین کہ کرتے تھے کہ مسجد گونج اٹھتی تھی۔ ①

امام بخاری رحمہ اللہ نے سے بصیغہ جزم ذکر کیا ہے جو اس کے صحیح ہونے کی دلیل ہے۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نبی ﷺ کے نافرمان نہ تھے، تاہم ان کا فہم، فہم نبوت کے تابع تھا۔ جب

① بخاری تعلیقاً، ج:۲، ص:۲۶۲، مع فتح الباری، باب جھر الامام بالتأمین

آپ ﷺ سے آمین باجہر ثابت ہے تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اس پر عامل رہے۔ مسجد میں گونج کے لیے باقاعدہ پختہ چھت ہونا ضروری نہیں، کچی مسجد میں بھی گونج پیدا ہوسکتی ہے۔ بلکہ جو مسجد پختہ نہ ہو البتہ مجمع ہو تو وہاں قدرتی طور پر گونج پیدا ہو جاتی ہے جس طرح کہ آج کل خانہ کعبہ اور مسجد نبوی کے مناظر میں مشاہدہ کیا جاتا ہے۔

عطاء بن ابی رباح رحمہ اللہ تابعی کا بیان ہے کہ میں نے دو سو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو پایا کہ وہ مسجد حرام میں جب امام وَلَا الضَّالِّيْنَ کہتا تو سب بلند آواز سے آمین کہتے۔ (بیہقی، ابن حبان، یہ اثر صحیح ہے) حرمین شریفین کی نمازوں کی کیفیت آج بھی اس امر پر شاہد ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جس قدر یہود اونچی آمین سے چڑتے ہیں، اتنا کسی اور سے نہیں، پس تم بہت آمین کہا کرو۔ (1)

یہ حدیث ابن ماجہ میں ہے، اس کی سند گو کہ ضعیف ہے لیکن شواہد کی بنا پر صحیح ہے۔ نیز صرف ساتھ والے کے آمین سننے کا کوئی ثبوت نہیں، یہ بلا دلیل بات ہے۔ اہل حدیث کی طرف جھوٹ کی نسبت کرنا کج روی کا نتیجہ ہے، اس کے سوا کچھ نہیں۔ اللہ رب العزت جملہ اہل اسلام میں صحیح فہم پیدا فرمائے۔ آمین۔

سوال: جہری نماز میں امام جب ﴿وَ لَا الضَّآلِّينَ﴾ کہے تو مقتدی فوراً آمین کہہ سکتے ہیں یا جب امام کہے تو اس کی آمین سن کر مقتدی آمین کہے؟ ہمارے یہاں ایک مولوی صاحب کہتے ہیں کہ «إِذَا قَالَ الِاَمَامُ ﴿غَيرِ المَغضُوبِ عَلَيهِم وَلَا الضَّآلِّينَ﴾ فَقُولُوا: آمِينَ» کا مطلب یہ ہے کہ امام جب بلند آواز سے آمین کہے تو مقتدی پھر بول سکتے ہیں۔ وہ ''سنن کبریٰ'' کی کسی حدیث کا حوالہ دیتے ہیں: « إِذَا قَالَ الِاَمَامُ: ﴿وَ لَا الضَّآلِّينَ﴾ وَقَالَ: اٰمِينَ فَقُولُوا: آمِينَ » آپ پوری تحقیق سے اس مسئلہ کی وضاحت فرمائیں؟

جواب: جمہور اہلِ علم کے نزدیک مستحب یہ ہے، کہ مقتدی کی (آمین) امام کی (آمین) کے ساتھ ہو۔ چنانچہ اس سلسلہ میں ان کا استدال ایک روایت سے ہے، جس کے الفاظ یوں ہے:

---

(1) سنن ابن ماجه،بَابُ الْجَهْرِ بِآمِينَ،رقم:٨٥٦

«اِذَا قَالَ الاِمَامُ:﴿غَیرِ المَغضُوبِ عَلَیهِم وَ لَا الضَّالِّینَ﴾ فَقُولُوا: آمِین، فَإِنَّ المَلَائِکَةَ تَقُولُ: آمِینَ. وَ إِنَّ الاِمَامَ یَقُولُ: آمِین. فَمَن وَافَقَ تَامِینُهُ تَامِینَ المَلَائِکَةِ، غُفِرَ لَهُ مَا تَقَدَّمَ مِن ذَنبِه» (النسائی، ابوداؤد، والسراج) ①

یعنی ''جب امام ﴿غَیرِ المَغضُوبِ عَلَیهِم وَلَا الضَّالِّینَ﴾ کہے، تو تم آمین کہو۔ کیونکہ فرشتے آمین کہتے ہیں، اور اس لئے بھی کہ امام بھی آمین کہتا ہے۔ پس جس کی (آمین) فرشتوں کی (آمین) سے موافق ہوتی ہے، اس کے سابقہ گناہ معاف کر دیے جاتے ہیں۔''

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

« وَهُوَ دَالٌّ عَلٰی أَنَّ المُرَادَ، المُوَافَقَةُ فِی القَولِ، وَالزَّمَانِ»

یعنی یہ حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے، کہ موافقت سے مراد قولی اور زمانی موافقت ہے۔

اور امام خطابی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

« مَعنٰی قَولِهٖ إِذَا قَالَ الاِمَامُ﴿ وَلَا الضَّالِّینَ﴾، فَقُولُوا : آمِین ! أَی مَعَ الاِمَامِ، حَتّٰی یَقَعُ تَامِینُکُم، وَ تَامِینُهٗ مَعًا » ②

''فَقُولُوا آمِینَ'' کا مفہوم یہ ہے کہ امام کے ساتھ آمین کہو، حتی کہ تمہاری اور امام کی آمین اکٹھی واقع ہو۔''

یہ بھی یاد رہے کہ اکٹھی ''آمین'' کہنے کا مفہوم یہ ہرگز نہیں ہے، کہ امام اگر سنت کو سہواً یا عمداً ترک کر دے، تو مقتدی بھی آمین نہ کہے۔ بلکہ مقتدی کو سنت پر عمل کرتے ہوئے، پھر بھی آمین کہنی چاہیے۔ صحیح حدیث میں وارد ہے:« صَلُّوا کَمَا رَأَیتُمُونِی أُصَلِّی »③

یعنی جیسے مجھے نماز پڑھتے ہوئے دیکھا۔ ٹھیک اسی طرح نماز پڑھو۔

تو گویا آپ ﷺ نے فرمایا: کہ تم ہر دو صورت آمین بلند آواز سے کہو۔ نیز امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

---

① سنن النسائی، بَابُ جَهرُ الْإِمَامِ بِآمِینَ ، رقم:٩٢٧، سنن أبی داؤد، بَابُ التَّأْمِینِ وَرَاءَ الْإِمَامِ، رقم: ٩٣٦

② المعالم ١/٢٢٤

③ صحیح البخاری، بَابُ الأَذَانِ لِلمُسَافِرِ، إِذَا کَانُوا جَمَاعَةً، وَالإِقَامَةِ، وَکَذٰلِكَ بِعَرَفَةَ وَجَمعٍ...... الخ، رقم:٦٣١

«عَلٰی أَنَّ الْمَامُومَ یُؤَمِّنُ، وَ لَو تَرَکَهُ الإِمَامُ سَهوًا، أَو عَمدًا » (الأم)

یعنی ''مأموم (مقتدی) کو آمین کہنی چاہیے، اگرچہ امام بھول کر یا قصداً چھوڑ دے۔''

اور سائل کے سنن کبریٰ کے حوالہ سے نقل کردہ الفاظ اصل میں نہیں ہیں اور اگر بالفرض یہ ثابت بھی ہوجائیں، تو ان کا مفہوم وہی ہے جو پہلے بیان ہو چکا۔ کہ مقتدی کی ''آمین'' آگے پیچھے کی بجائے، امام کے ساتھ ہونی چاہیے۔ بلکہ امام بیہقی کے قائم کردہ عناوین اس پر دال (دلالت کرتے) ہیں، کہ امام اور مأموم (یعنی مقتدی) دونوں کو آمین کہنی چاہیے۔ (سنن کبریٰ) [1]

کیا عورتیں بھی آمین بالجہر کیا کریں؟

(سوال): آمین بالجہر آپ ﷺ کی سنت مبارکہ ہے۔ کیا عورتیں بھی آمین بالجہر کیا کریں؟ یا انھیں منع کیا گیا ہے اگر منع کیا گیا ہے تو وہ حدیث کونسی ہے؟

(جواب): اصلاً شرعی احکام و مسائل عورتوں اور مردوں سب کے لیے برابر ہیں۔ اِلّا یہ کہ فرق کی کوئی واضح دلیل ہو۔ زیرِ بحث مسئلہ میں عورتوں کے استثناء کی چونکہ کوئی دلیل نہیں۔ لہٰذا آمین بالجہر کا حکم دو صنفوں کو یکساں طور پر شامل ہے۔ [2]

عورتوں کی آمین مردوں تک پہنچنا:

(سوال): اگر عورتیں آواز سنوار کر آمین بالجہر کہیں اور ان کی آواز جماعت میں شامل مردوں تک پہنچے، تو کیا یہ درست ہے؟

(جواب): عورتوں کو سادہ آواز میں آمین بالجہر کہنی چاہیے۔ قرآن میں ہے:

﴿ فَلَا تَخْضَعْنَ بِالْقَوْلِ ﴾(الاحزاب:۳۲) ''تم نرم لہجے میں بات نہ کرو۔''

سادگی میں آواز اگر مردوں تک پہنچ بھی جائے تو کوئی حرج نہیں۔ صحابیات رسول اللہ ﷺ سے مختلف مسائل دریافت کرنے کے لیے حاضر ہوتی تھیں۔ ظاہر ہے کہ آواز تو پھر سنائی دیتی تھی۔

---

① السنن الکبریٰ للبیھقی، باب التامین :٥٥، باب جھر الإمام بالتأمین :٥٦۔ و ٥٨

② تاہم دوسری نصوص کی بنیاد پر عورتوں کو یہ احتیاط ملحوظ رکھنی چاہیے، کہ ان کی آواز مردوں تک نہ پہنچے۔ (ص۔ی)

مقتدی آمین کب کہے؟

سوال: جو آدمی امام کے پیچھے سورۃ فاتحہ پڑھتا ہے وہ آمین کب کہے گا؟ اپنی سورت فاتحہ کے آخر میں یا پھر جب امام اپنی سورۃ فاتحہ ختم کرے گا تب یا پھر دونوں بار؟

جواب: مقتدی دو بار آمین کہے۔ اولاً امام کے ساتھ آمین کہے، تاکہ حدیث «اِذَا اَمَّنَ الاِمَامُ فَاَمِّنُوا» [1] یعنی ''جب امام آمین کہے۔ پس تم بھی آمین کہو۔'' پر عمل ہو سکے۔ ثانیاً دیگر احادیث جن میں دعا کے اخیر میں (آمین) کی ترغیب وارد ہے، ان کی بناء پر سورہ فاتحہ بھی چونکہ دعا ہے، اس لیے اس کے اختتام پر بھی (آمین) کہی جائے۔ (مشکوٰۃ، باب القراءۃ فی الصلوۃ)

آمین کہنے اور سلام پھیرنے میں امام کی اقتدا:

سوال: آنحضرت ﷺ کا فرمان ہے کہ امام آمین کہے تو تم آمین کہو۔ کیا امام کے آمین مکمل کرنے کے بعد مقتدی آمین کہیں اور اسی طرح جب امام کے منہ سے ''السلام علیکم ورحمۃ اللّٰہ'' مکمل ادا ہو جائے اس وقت اپنا سلام پھیریں؟

جواب: امام کی (آمین) کے ساتھ ہی مقتدی کی (آمین) کا آغاز ہونا چاہیے، تاکہ موافقت ہو سکے۔ [2]

اسی طرح سلام جب امام پھیر لے تو پھر مقتدی کو پھیرنا چاہیے۔

حدیث میں ہے: «تَحلِیلُهَا التَّسلِیمُ» [3]

آمین اور رفع الیدین نہ کرنے والے کی نماز کا حکم:

سوال: کیا آمین نہ کہنے کی وجہ سے اور رفع الیدین نہ کرنے کی وجہ سے نماز نہیں ہوتی؟

جواب: آمین اور رفع یدین نہ کرنے سے نماز میں نقص پیدا ہو جاتا ہے اور سنت سے استخفاف (ہلکا سمجھنے) کی صورت میں ممکن ہے نماز ہی نہ ہو۔

دو مرتبہ آمین کہنا:

سوال: جہری نمازوں میں فاتحہ خلف الامام پڑھنے کے بعد ''آمین'' اپنی کہہ چکنے کے بعد کیا پھر دوبارہ جہراً

---

[1] سنن أبی داؤد، بَابُ التَّأمِینِ وَرَاءَ الْإِمَامِ، رقم:٩٣٦
[2] المرعاۃ (١/٥٩٣)
[3] سنن أبی داؤد، بَابُ الْإِمَامِ یُحدِثُ بَعْدَ مَا یَرْفَعُ رَأْسَهُ مِنْ آخِرِ الرَّكْعَةِ، رقم:٦١٨

امام کے ساتھ ''آمین'' کہی جائے۔ یا کہ فاتحہ پڑھنے کے بعد خود آہستہ آمین کہے بغیر ''آمین'' جہراً کہنے کے لیے امام کی قرأتِ فاتحہ ختم ہونے کا انتظار کیا جائے؟

جواب: حدیث « اِذَا اَمَّنَ الِامَامُ فَاَمِّنُوا »[1] کا تقاضا یہ ہے، کہ (آمین) امام کے ساتھ کہی جائے اور جہری نمازوں میں سورۂ فاتحہ کی قرأت میں سبقت کی بجائے امام کی پیروی ہونی چاہیے۔ تاکہ (آمین) میں امام کے ساتھ موافقت ہو سکے اور اقتداء کا مقصد حاصل ہو۔

مقتدی کا (آمین اور رَبَّنَا ......) امام متصل بعد ہونا:

سوال: نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ امام آمین کہے تو تم بھی آمین کہو۔ جس کی آمین امام کی آمین کے مطابق ہوگئی، اس کے سابقہ گناہ بخش دیئے جائیں گے۔ اس حدیث کی وجہ سے کہا جاتا ہے کہ امام اور مقتدی ایک ساتھ آمین کہیں۔ اسی طرح ایک حدیث میں یہ ہے کہ جب امام سَمِعَ اللّٰهُ لِمَن حَمِدَهٗ کہے تو تم اَللّٰھُمَّ رَبَّنَا لَکَ الحَمدُ کہو۔ جس کا قول فرشتوں کے قول کے موافق ہوگیا اس کے سابقہ گناہ بخش دیئے جائیں گے۔ کیا آمین کی حدیث کی طرح امام اور مقتدی ایک ساتھ رَبَّنَا لَكَ الحَمدُ کہیں گے؟

جواب: دونوں احادیث کے الفاظ ملاحظہ فرمائیں:

۱۔ « اِذَا أَمَّنَ الِامَامُ فَأَمِّنُوا ، فَإِنَّهٗ مَن وَافَقَ تَامِينُهٗ تَامِينَ المَلَائِكَةِ، غُفِرَ لَهٗ مَا تَقَدَّمَ مِن ذَنبِهٖ »[2]

۲۔ « إِذَا قَالَ الِامَامُ: سَمِعَ اللّٰهُ لِمَن حَمِدَهٗ فَقُولُوا: اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا لَكَ الحَمدُ، فَإِنَّهٗ مَن وَافَقَ قَولُهٗ قَولَ المَلَائِكَةِ غُفِرَ لَهٗ مَا تَقَدَّمَ مِن ذَنبِهٖ »[3]

ان دونوں احادیث میں فاء آئی ہے، جو ترتیب اور تعقیب کا تقاضا کرتی ہے۔ یعنی اس کا تقاضا یہ ہے کہ مقتدی کا قول (آمین اور رَبَّنَا ......) دونوں صورتوں میں امام کے قول کے بعد متصل ہونا چاہیے۔ نہ کہ برابر۔ جس طرح کہ سائل کا خیال ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ پہلی حدیث میں موافقت سے مراد امام کی موافقت نہیں۔ بلکہ فرشتوں کی موافقت ہے، جس طرح کہ دوسری حدیث میں بھی اسی امر کی تصریح ہے۔

---

[1] سنن أبی داؤد، بَابُ التَّأمِينِ وَرَاءَ الْإِمَامِ ، رقم:۹۳٦

[2] متفق علیه، صحیح البخاری، بَابُ جَهرِ الإِمَامِ بِالتَّأمِينِ ، رقم: ۷۸۰، و رقم: ٦٤٠٢، صحیح مسلم، رقم: ٤١٠

[3] متفق علیه، صحیح البخاری بَابُ فَضلِ اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا لَكَ الحَمدُ ، رقم: ۷۹٦، صحیح مسلم، رقم: ٤٠٩

بلند آواز سے آمین کہنا؟

سوال: کیا کسی حدیث میں آتا ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پیغمبر اسلام کے پیچھے اونچی آواز میں آمین کہتے تھے؟

جواب ہاں احادیث سے ثابت ہے کہ صحابہ کرام آپ ﷺ کی اقتدا میں آمین بآوازِ بلند پکارتے تھے۔ صحیح بخاری میں ہے کہ ''عبداللہ بن زبیر اور ان کے مقتدی اتنی بلند آواز سے آمین کہا کرتے تھے کہ مسجد گونج اُٹھتی تھی۔''[1]

ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

« إِذَا أَمَّنَ الإمَامُ فَأَمِّنُوا »[2] ''جب امام آمین کہے۔ تم بھی آمین کہو۔''

اور دوسری روایت میں بخاری کے الفاظ یوں ہیں: « إِذَا أَمَّنَ القَارِي فَأَمِّنُوا۔»[3] ''جب قاری آمین کہے۔ تم بھی کہو۔''

ظاہر ہے کہ رسول اللہ ﷺ امام تھے اور صحابہ رضی اللہ عنہم مقتدی تھے سب اکٹھے آمین پکارتے تھے۔

اونچی ''آمین'' کہنے پر اعتراض:

سوال: یہاں میاں والی شہر میں ایک حنفی عالم قاری محمد شعیب صاحب نے جمعہ پڑھایا ہے اور آمین بالجہر کا ردّ قرآن کی آیت ﴿ يَآأَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَرْفَعُوْآ اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ ﴾(الحجرات:۲) سے کرتے ہوئے کہا کہ اہلِ حدیث کہتے ہیں کہ آمین سے مسجد گونج گئی۔ پہلی بات یہ ہے مسجد نبوی کچی تھی وہ کس طرح گونجتی تھی؟ دوسرے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ ''نبی ﷺ سے اپنی آواز بلند نہ کرو ورنہ تمہارے اعمال ضائع ہو جائیں گے۔'' کیا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نبی علیہ السلام کے نافرمان تھے کہ ایسا کرتے تھے؟ آمین اگر کہیں بھی تو بس اتنی کہ ساتھ والا سن لے، آواز گونجنے والی روایات میں اہلِ حدیث جھوٹے ہیں۔

براہِ مہربانی مفصل مسئلہ بیان فرمایا جائے، اہلِ حدیث ساتھیوں میں بے چینی پائی جاتی ہے۔ کیا کسی مفسر نے اس آیت سے آمین بالجہر کا رد کیا ہے؟ (بینوا توجروا)

جواب: مذکورہ بالا آیت سے آمین بالجہر کے عدمِ جواز پر استدلال کرنا، پلندۂ جہالت ہے۔ بلکہ جملہ

---

[1] صحیح البخاری، بَابُ جَهْرِ الإِمَامِ بِالتَّأْمِينِ، قبل رقم: ۷۸۰

[2] صحیح البخاری، بَابُ جَهْرِ الإِمَامِ بِالتَّأْمِينِ، رقم: ۷۸۰

[3] صحیح البخاری، بَابُ التَّأْمِينِ، رقم: ٦٤٠٢

مفسرین اور سلف رحمہم اللہ کے فہم کے خلاف ''تفسیر بالرائے'' ہے جس کا انجام کار جہنم ہے۔

مولانا عبدالحی لکھنوی رحمہ اللہ حنفی تعلیق الممجد میں فرماتے ہیں:

« وَالِانصَافُ أَنَّ الجَهرَ قَوِیٌّ مِن حَیثُ الدَّلِیل » (۴۴۶/۱)

''انصاف کی بات یہ ہے، کہ اونچی آواز سے (آمین) کہنے کا ثبوت بہت پختہ ہے۔''

امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی ''صحیح'' میں باقاعدہ امام اور مأموم کے لیے بآواز بلند (آمین) کہنے کے عناوین قائم کیے ہیں۔ اس ضمن میں نقل کیا ہے، کہ حضرت عبد اللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما اور ان کے مقتدی اتنی بلند آواز سے آمین کہا کرتے تھے۔ کہ مسجد گونج اٹھتی تھی۔ ① صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نبی ﷺ کے نافرمان نہیں تھے۔ تاہم ان کا فہم، فہمِ نبوت کے تابع تھا۔ جب آپ ﷺ سے (آمین بالجہر) ثابت ہے، تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بھی اسی پر عامل رہے۔ جہاں تک اس بات کا تعلق ہے، کہ پختہ مسجد میں آواز گونجتی ہے۔ یہ کوئی ضروری نہیں۔ کچی میں بھی گونج پیدا ہوسکتی ہے۔ بلکہ جہاں مجمع ہو، افراد کثیر تعداد میں ہوں، وہاں قدرتی طور پر گونج پیدا ہو جاتی ہے۔ جس طرح کہ آج کل خانہ کعبہ اور مسجد نبوی کے مناظر میں مشاہدہ ہے۔ تابعی عطاء بن رباح رحمہ اللہ کا بیان ہے، کہ میں نے دوسو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو پایا۔ مسجد حرام میں جب امام ﴿ وَلَا الضَّآلِّینَ ﴾ کہتا، تو وہ سب بلند آواز سے (آمین) کہتے۔

بیہقی، ابن حبان، یہ ''اثر'' صحیح ہے۔ حرمین کی نمازوں کی کیفیت آج بھی اس امر پر شاہد ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''یہود (اونچی) آمین سے جس قدر چڑتے ہیں، اتنا کسی اور سے نہیں۔ پس تم بہت (آمین) کہا کرو۔'' ②

یہ حدیث ''ابن ماجہ'' میں ہے۔ اس کی سند ضعیف ہے، لیکن شواہد کی بناء پر صحیح ہے۔ نیز صرف ساتھ والے کے آمین سننے کا کوئی ثبوت نہیں، بلا دلیل بات ہے، اہلِ حدیث کی طرف جھوٹ کی نسبت کرنا، کج رَوِی کا نتیجہ ہے اس کے سوا کچھ نہیں۔ اللہ رب العزت جملہ اہلِ اسلام میں صحیح فہم پیدا فرمائے۔ آمین!

کیا صحابہ کرام کا اونچی آمین کہنا ثابت ہے؟

سوال: کیا کسی صحیح حدیث میں آتا ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پیغمبر اسلام ﷺ کے پیچھے اونچی آواز میں آمین کہتے تھے؟

① صحیح البخاری، بَابُ جَهْرِ الْإِمَامِ بِالتَّأْمِینِ، قبل رقم:۷۸۰

② سنن ابن ماجه، بَابُ الْجَهْرِ بِآمِینَ، رقم:۸۵۷

جواب: ہاں احادیث سے ثابت ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اقتداء میں آمین باآواز بلند پکارتے تھے۔ "صحیح بخاری میں ہے عبداللہ بن زبیر اور ان کے مقتدی اتنی بلند آواز سے آمین کہا کرتے تھے کہ مسجد گونج اٹھتی تھی۔ ایک روایت میں ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« إِذَا أَمَّنَ الإِمَامُ فَأَمِّنُوا » [1]

"جب امام آمین کہے تم آمین کہو"

اور دوسری روایت میں بخاری کے الفاظ یوں ہیں: « إِذَا أَمَّنَ القَارِي فَأَمِّنُوا.» [2]

"جب قاری آمین کہے تم بھی آمین کہو۔" ظاہر ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم امام تھے اور صحابہ رضی اللہ عنہم مقتدی تھے سب اکٹھے آمین پکارتے تھے۔

مقتدی کے آمین کہنے کا مقام:

سوال: میں نے ہفت روزہ "اہلِ حدیث" میں حافظ عبدالستار الحماد صاحب کا فتویٰ پڑھا کہ امام اور مقتدی کو بیک وقت آمین کہنا چاہیے۔ علامہ البانی رحمہ اللہ نے صفۃ صلوۃ النبی اردو، ص:۱۶۵ (سلسلۃ الاحادیث الضعیفہ، حدیث:۹۵۲) اور صحیح الترغیب والترھیب (ج:۱/ ۲۰۵) میں لکھا ہے:

"مقتدیوں کی آمین امام کے ساتھ باآواز بلند ہونی چاہیے، نہ امام سے سبقت کریں اور نہ امام سے مؤخر کریں۔"

لیکن ہماری مسجد کے امام صاحب کہتے ہیں کہ امام آمین کہہ کر فارغ ہو جائے تو بلا تاخیر مقتدیوں کو آمین کہنی چاہیے۔ جب تک امام مکمل طور پر آمین نہ کہہ چکے مقتدی آمین کہنا شروع نہ کریں۔"

مولانا! صحیح بات کون سی ہے پہلی یا دوسری؟

جواب: مقتدی کی آمین امام کے ساتھ ہی ہونی چاہیے۔ جمہور اہلِ علم کا مسلک یہی ہے اور یہی اظہر ہے۔

ملاحظہ ہو! مرعاۃ المفاتیح : ۱/ ۵۹۳۔

قرأت مسنونہ:

سوال: امام جماعت اس بات کا قائل ہے کہ "قرأت مسنونہ" تبھی قراءتِ مسنون کہلائے گی اگر وہ سورتیں جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف نمازوں میں پڑھی ہیں۔ پوری پوری پڑھی جائیں وگرنہ مسنون قراءت نہیں ہوگی۔

---

[1] صحيح البخاري، بَابُ جَهْرِ الإِمَامِ بِالتَّأْمِينِ، رقم: ۷۸۰

[2] صحيح البخاري، بَابُ التَّأْمِينِ، رقم:٦٤٠٢

امام جماعت بالالتزام وہی سورتیں نماز کی رکعتوں میں پڑھتا ہے جو حضور ﷺ نے پڑھی ہیں مگر پوری سورتیں نہیں پڑھتا کبھی آدھی سورت کبھی آخری تین چار آیتیں پڑھ کر رکوع میں چلا جاتا ہے اور ایسا کبھی کبھار نہیں ہوتا بلکہ ہمیشہ یوں ہی ہوتا ہے کیا ایسا امام مندرجہ بالا حقیقتِ احوال کے پس منظر میں ''مسخِ سنت'' کے گناہ کا مرتکب نہیں ہوتا؟ اگر ہوتا ہے تو کیوں اور نہیں ہوتا تو کیوں یعنی ہر دو صورت میں دلائل بھی درکار ہیں۔

(جواب): بلاریب قرأتِ مسنون تبھی بنے گی، جب آپ ﷺ کے طریقہ کے مطابق ہوگی۔ قرآن میں ہے: ﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ﴾(الاحزاب:۲۱) عام حالات میں ہر رکعت میں نبی ﷺ پوری پوری سورتیں پڑھتے تھے۔ حدیث میں ہے «لِكُلِّ رَكْعَةٍ سُورَةٌ» [1] یعنی ہر رکعت میں مکمل سورت پڑھو۔ لیکن یہ امر مندوب ہے۔ واجب نہیں، کیونکہ بعض دفعہ نبی ﷺ ایک رکعت میں دو یا دو سے زیادہ سورتیں جمع کر لیتے تھے، جس طرح کہ نظائر کو جمع کرنے کی آپ ﷺ کی عادتِ مبارک تھی۔ سورۃ "الرحمن" اور "النجم" کو ایک رکعت میں اور "اقتربت" اور "الحاقة" ایک میں......الخ اور بعض دفعہ صرف فاتحہ پر اکتفاء کی۔ مزید سورت کو نہیں ملایا۔ [2] اور ایک صحابی ﴿قُلْ هُوَ اللَّهُ أَحَدٌ﴾ کو ہر رکعت میں پڑھ کر، اس کے ساتھ سورت ملاتا تھا۔ آپ ﷺ نے اسے بھی پسند فرمایا۔ [3]

عمرو بن شعیب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، اُس نے نقل کی اپنے باپ سے، اُس نے نقل کی اپنے دادا سے کہا اُس نے نہیں مفصل سے کوئی سورت چھوٹی اور نہ بڑی، مگر کہ میں نے سنی رسول اللہ ﷺ سے، کہ امامت کرتے تھے۔ اس کے ساتھ (رواہ مالک) اور سورت کا بعض حصہ پڑھنے کا بھی جواز ہے، جس طرح صحیح مسلم میں ہے۔ نبی ﷺ نے صبح کی نماز میں ''المومنون'' شروع کی۔ جب آپ ﷺ موسیٰ اور ہارون یا عیسیٰ علیہ السلام کے ذکر پر پہنچے، تو کھانسی نے آلیا، تو آپ ﷺ نے یہیں رکوع کر دیا، اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے صبح کی پہلی رکعت میں ایک سو بیس آیات تلاوت کیں اور دوسری رکعت میں ''مثانی'' سورتوں سے ایک سورت پڑھی۔ [4]

اور ''دارقطنی'' میں بسند قوی ابن عباس رضی اللہ عنہما سے وارد ہے۔ انھوں نے ''سورہ فاتحہ'' پڑھی اور ہر رکعت

---

[1] ابن نصر طحاوی بسند صحیح

[2] مسند الحارث بن ابی اسامه

[3] صحیح البخاری، بَابُ الجَمعِ بَينَ السُّورَتَينِ فِي الرَّكعَةِ، قبل رقم:۷۷۵، و رقم:۷۳۵۷

[4] صحیح بخاری بَابُ الجَمعِ بَينَ السُّورَتَينِ فِي الرَّكعَةِ ،قبل رقم:۷۷۵

میں ''سورہ بقرہ'' کی ایک ایک آیت بھی پڑھی۔ اسی طرح ''صحیح بخاری میں ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فجر کی دو رکعتوں میں ''بقرہ'' اور ''آل عمران'' سے دو آیتوں کی تلاوت کی ﴿قُولُوا آمَنَّا بِاللّٰہِ...... ﴾(البقرۃ:۱۳۶) اور ﴿قُل یَاَھلَ الکِتَابِ تَعَالُوا...... ﴾(آل عمرٰن:٦٤) [1]

اصل یہ ہے کہ جو شے نفلوں میں جائز ہے۔ وہ فرضوں میں بھی جائز ہے، جب تک کوئی تخصیص نہ ہو۔ لہٰذا اس عموم سے فرضوں کے لیے بھی استدلال ہو سکتا ہے اور قتادہ نے کہا، جو ایک سورت دو رکعتوں میں پڑھے یا ایک سورت کو بار بار دو رکعتوں میں پڑھے، سب اللہ کی کتاب ہے۔ یعنی پڑھنے کا جواز ہے۔ سورۃ "الزلزال" کو آپ نے دو رکعتوں میں پڑھا اور موجودہ مصحف کی ترتیب کے خلاف بھی پڑھا جائے، تو جائز ہے۔ احنف نے پہلی رکعت میں الکھف اور دوسری میں یوسف یا یونس پڑھی اور انھوں نے یہ بھی ذکر کیا، کہ عمر رضی اللہ عنہ نے صبح کی نماز انہی سورتوں کیساتھ (اسی انداز میں) پڑھائی تھی۔

اور ابن مسعود نے ''انفال'' سے چالیس آیتوں کی تلاوت کی اور دوسری رکعت میں مفصل کی ایک سورت پڑھی۔ [2]

ان دلائل سے معلوم ہوا، کہ افضل یہ ہے، کہ ہر رکعت میں پوری سورت پڑھی جائے اور بعض حصہ پڑھنے کا بھی جواز ہے۔قرآنی آیت ﴿فَاقرَؤُا مَا تَیَسَّرَ مِنَ القُراٰنِ ﴾(المزمل:۲۰) کا عموم بھی اسی بات کا متقاضی ہے۔

نیز مختلف اوقات میں جو متعین سورتوں کی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تلاوت فرمائی ہے۔ مثلاً جمعہ کے روز فجر کی نماز میں (سورۃ السجدہ) اور (سورۃ الدھر) اور جمعہ وعیدین میں (سورۃ الاعلیٰ) اور (سورۃ الغاشیۃ) کی تلاوت آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے۔ یا عیدین میں (ق) اور (اقتربت الساعۃ) بھی پڑھتے۔ یہاں سنت تب ادا ہوگی، جب ان سورتوں کو مکمل پڑھا جائے، اور کچھ حصہ پڑھنے سے سابقہ دلائل کی بناء پر نماز تو ہو جائے گی۔ لیکن ایسا امام قرأت مسنونہ کے اجر وثواب سے محروم ہے۔

---

[1] صحیح مسلم، باب فضل رکعتی الفجر، رقم:۷۲۷

[2] صحیح البخاری ترجمۃ الباب، بَابُ الجَمعِ بَینَ السُّورَتَینِ فِی الرَّکعَۃِ

امام کا بعض آیات پڑھنا اور مقتدی کا آیات کا جواب دینا

بحالت نماز صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ کہنا:

(سوال) : اگر آدمی سورۃ فتح کی آخری آیت نماز میں تلاوت کر رہا ہو یعنی کہ ﴿ مُحَمَّدٌ رَّسُول الله ﴾ الآیۃ تو کیا نماز میں ﷺ کہنا جائز ہے یا نہیں؟

(جواب) : عمومی دلائل کی بناء پر بحالت نماز صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ کہا جا سکتا ہے۔

امام آیت درود پڑھے تو مقتدی کا جواب دینا:

(سوال) : نماز کے اندر اگر امام آیت درود پڑھے تو مقتدی جواب دے یا خاموش رہے؟

(جواب) : بظاہر جواز ہے۔

نمازِ جمعہ میں سَبِّحِ اسْمِ رَبِّكَ الاَعْلٰى کا جواب دینا:

(سوال) : اکثر نماز کی کتابوں میں بعض قرآن کریم کی آیات کا جواب دینے کے بارے میں لکھا ہوتا ہے۔ مثلاً سورت رحمٰن کی آیت ﴿ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰن ﴾ کے بعد کہا جاتا ہے کہ «لَا اُكَذِّبُ» اسی طرح سورۃ الاعلیٰ کے بعد ﴿ سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الاَعْلٰى ﴾ کی تلاوت کے بعد مسجد «سُبْحَانَ رَبِّكَ الاَعْلٰى» کی آواز سے گونج جاتی ہے اسی طرح سے سورۃ الغاشیہ کے اخیر میں «ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا حِسَابَهُم» کے بعد مقتدی وائمہ حضرات پکارتے ہیں کہ «اَللّٰهُمَّ حَاسِبْنَا حِسَابًا يَّسِيرًا»

اسی طرح سورۃ التین اور دوسری آیات کے لیے جواب کی رغبت دلائی جاتی ہے۔ بعض محققین سے سنا ہے کہ یہ عمل صحیح نہیں ہے اور اس بارے میں کوئی بھی صحیح حدیث نہیں۔ آپ سے التجا ہے کہ اس موضوع پر مفصل جواب بمع احادیث جو اس سلسلہ میں پیش کی جاتی ہیں عنایت فرمائیں اور صحیح موقف سے ہمیں آگاہ فرمائیں۔

(جواب) : امام کی اقتداء میں سامع یا مقتدی کا چند مخصوص آیات کی تلاوت کے بعد جواب دینا کسی مرفوع صحیح صریح حدیث سے ثابت نہیں۔ موضوع ہذا پر میرا ایک تفصیلی فتوے جواب در جواب کی صورت میں عرصہ ہوا

ماہنامہ ''محدث'' لاہور میں شائع ہو چکا ہے۔ یہ ۲۳ صفحات پر مشتمل ہے۔

مزید وضاحت:

سوال جناب حافظ صاحب، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ ہمارے ہاں ایک مولوی صاحب ہیں۔ انھوں نے اپنے مقتدیوں کو سری نمازوں میں یعنی ظہر، عصر کی پہلی دو رکعتوں میں سورہ فاتحہ کے علاوہ قراءت سے منع کر رکھا ہے اور وہ دلیل میں سنن النسائی کی روایت پیش کرتے ہیں، جو ان کے الفاظ میں درج ہے: «بَابُ تَرْكِ الْقِرَآءَةِ خَلْفَ الْاِمَامِ فِيمَا لَمْ يَجْهَر» ''جس (نماز میں جہر نہیں کیا گیا۔ اس میں امام کے پیچھے قراءت چھوڑ دینا۔'' «عَنْ عِمْرَانَ بْنِ حُصَيْنٍ قَالَ صَلَّى النَّبِيُّ ﷺ الظُّهْرَ فَقَرَأَ رَجُلٌ خَلْفَهٗ سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلٰى» ''عمران بن حصین سے روایت ہے نبی کریم ﷺ نے نماز پڑھائی ظہر کی، پس پڑھا ایک شخص نے آپ ﷺ کے پیچھے «سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلٰى»۔ « فَلَمَّا صَلّٰى قَالَ مَنْ قَرَأَ سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلٰى ؟ قَالَ رَجُلٌ اَنَا! قَالَ لَقَدْ عَلِمْتُ اَنَّ بَعْضَكُمْ قَدْ خَالَجَنِيْهَا» ''پس جب آپ ﷺ نماز سے فارغ ہو چکے تو فرمایا، کس نے پڑھا: «سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلٰى» کہا ایک آدمی نے کہ ''میں نے!'' آپ نے فرمایا: جان لیا ہے میں نے کہ تم میں سے بعض قرآن کو میرے ساتھ خلط ملط کرتے ہیں۔ [1]

« عَنْ عِمْرَانَ بْنِ حُصَيْنٍ اَنَّ النَّبِيَّ ﷺ صَلّٰى صَلٰوةَ الظُّهْرِ اَوِ الْعَصْرِ وَ رَجُلٌ يَقْرَأُ خَلْفَهٗ فَلَمَّا انْصَرَفَ قَالَ اَيُّكُمْ قَرَأَ سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلٰى قَالَ رَجُلٌ مِنَ الْقَوْمِ اَنَا وَ لَمْ اُرِدْ بِهَا اِلَّا الْخَيْرَ »

''عمران بن حصین رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے ظہر یا عصر کی نماز پڑھی اور ایک شخص نے آپ ﷺ کے پیچھے قراءت کی۔ پس جب آپ ﷺ نماز سے فارغ ہوئے تو فرمایا تم میں سے کس نے سبح اسم ربك الاعلیٰ پڑھی ہے ایک شخص نے قوم میں سے کہا، میں نے، اور میرا ارادہ اس سے حصولِ خیر ہی کا تھا۔ «فَقَالَ النَّبِيُّ ﷺ قَدْ عَرَفْتُ اَنَّ بَعْضَكُمْ قَدْ خَالَجَنِيْهَا »(نسائی، شریف مجتبٰی بھوجیانی، ص:۱۸۔۱۹) [2] ''پس فرمایا نبی ﷺ نے، میں نے معلوم کر لیا ہے کہ بعض تم میں سے مجھ سے قرآن میں جھگڑا اڑانے والے ہیں۔'' «خَالَجَنِيْهَا» کی شرح قابلِ غور اور لائق مطالعہ ہے۔

---

[1] صحیح مسلم، بَابُ نَهْيِ الْمَأْمُومِ عَنْ جَهْرِهِ بِالْقِرَاءَةِ خَلْفَ إِمَامِهِ، رقم:۳۹۸

[2] سنن النسائی، بَابُ تَرْكُ الْقِرَاءَةِ خَلْفَ الْإِمَامِ فِيمَا لَمْ يَجْهَرْ فِيهِ ، رقم:۹۱۸

ابوداؤد شریف میں یہ روایت ایک آدھ لفظ کے ہیر پھیر سے دوسندوں سے مروی ہے۔ مسلم میں تین سندوں سے اور جزء القراءۃ للبخاری میں کم از کم ۹ یا ۱۰ سندوں سے مروی ہے۔ لہٰذا اس کی صحت میں شک نہیں ہونا چاہیے۔ مزید توجہ طلب باتیں:

۱۔ صحابی رضی اللہ عنہ نے پوری سورۃ الاعلیٰ بلند آواز سے پڑھی تھی یا صرف پہلی ایک آیت؟

۲۔ سورۃ الاعلیٰ بلند پڑھنے والے صحابی نے سورۃ فاتحہ کیسے پڑھی ہوگی؟

۳۔ جو صحابہ سورۃ الاعلیٰ ضروری پڑھ رہا ہے، وہ سورۃ فاتحہ چھوڑ سکتا ہے؟

۴۔ پوری جماعت صحابہ میں سے ایک نے پڑھا تھا، باقیوں نے کیا کیا تھا؟

۵۔ صحابی نے جہراً پڑھنے کو «لَمْ اُرِدْ بِهَا اِلَّا الْخَيْرَ» سے تعبیر کیا تھا یا قرآن کی قراءۃ کو؟

۶۔ عالم استغراق میں آپ ﷺ اَحْیَانًا ایک آدھ آیت اونچی پڑھ لیا کرتے تھے۔ صحابہ کو ایسا کرنے پر کیوں ٹوکا؟

۷۔ «خَالَجَنِيْهَا» نفی کے لیے فرمایا یا اثبات کے لیے؟ (انکار کے لیے یا اقرار کے لیے؟) (سائل محمد اقبال......قصور)

جواب کتب احادیث میں نبی کریم ﷺ کی نماز کا جو طریقہ صریحاً منقول ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ ظہر وعصر کے فرضوں کی پہلی دو رکعتوں میں سورۃ فاتحہ کے علاوہ بھی قراءۃ فرماتے تھے۔

بلکہ صحیح مسلم میں ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی روایت سے مفہوم ہے کہ گاہے بگاہے آپ ﷺ ظہر کے فرضوں کی پچھلی دو رکعتوں میں بھی قراءت فرماتے لیتے تھے۔ صحیح بخاری میں ابوقتادہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

« كَانَ النَّبِيُّ ﷺ يَقْرَأُ فِي الرَّكْعَتَيْنِ مِنَ الظُّهْرِ وَالْعَصْرِ بِفَاتِحَةِ الْكِتَابِ وَ سُوْرَةٍ وَّ يُسْمِعُنَا الْاٰيَةَ اَحْيَانًا» (جلد اوّل، ص:۱۰۵، باب القراءۃ فی العصر) [1]

کہ نبی اکرم ﷺ ظہر اور عصر کی ہر دو رکعتوں میں سورۃ الفاتحہ اور (اس کے ساتھ) سورۃ (ملاکر) پڑھتے تھے اور کبھی کبھی ہمیں بھی کوئی آیت سناتے تھے۔''

شبہ: اگر کوئی کہے کہ آپ ﷺ کی قراءت تو بحیثیت امام کے تھی اور اس میں کسی کو کلام نہیں...... اس وقت متنازع فیہ مسئلہ مقتدی کا ہے نہ کہ امام کا؟

[1] صحیح البخاری، بَابُ الْقِرَاءَةِ فِي الْعَصْرِ، رقم:۷۶۲

[2] صحیح البخاری، بَابُ الْأَذَانِ لِلْمُسَافِرِ، إِذَا كَانُوا جَمَاعَةً، وَالإِقَامَةِ، وَكَذٰلِكَ بِعَرَفَةَ وَجَمْعٍ...... الخ، رقم:۶۳۱

تو اس کا جواب یہ ہے کہ حدیث «صَلُّوْا كَمَا رَأَيْتُمُوْنِيْ» [2] کے پیش نظر اجازتِ ھذا مقتدی کو بھی شامل ہے۔ پھر سنن ابن ماجہ کی روایت میں ماموم کے جوازِ قراءت پر نص صریحًا موجود ہے۔ پوری روایت بسندہٖ ملاحظہ فرمائیں:

' حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ يَحْيٰى حَدَّثَنَا سَعِيْدُ بْنُ عَامِرٍ حَدَّثَنَا شُعْبَةُ عَنْ مُسْعِرٍ عَنْ يَزِيْدَ الْفَقِيْرِ عَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ قَالَ كُنَّا نَقْرَأُ فِي الظُّهْرِ وَ الْعَصْرِ خَلْفَ الْاِمَامِ فِي الرَّكْعَتَيْنِ الْاُوْلَيَيْنِ بِفَاتِحَةِ الْكِتَابِ وَ سُوْرَةٍ وَّ فِي الْاُخْرَيَيْنِ بِفَاتِحَةِ الْكِتَابِ (ابن ماجه، ص: ٦١) [1]

''کہ ہم ظہر اور عصر کی پہلی دو رکعتوں میں امام کے پیچھے سورۃ الفاتحہ اور (اس کے ساتھ) سورۃ (ملا کر) پڑھتے تھے، جب کہ آخری دو رکعتوں میں (صرف) فاتحہ الکتاب۔''

باقی رہی سنن نسائی کی وہ روایت کا جس کا حوالہ مولوی صاحب مذکور دیتے ہیں، تو امام نووی نے شرح مسلم میں اس کا جواب یوں دیا ہے کہ آپ ﷺ نے اس شخص کو مطلق قرائت سے نہیں روکا تھا بلکہ صرف آواز بلند کرنے سے منع فرمایا تھا...... الفاظ یوں ہیں:

' مَعْنٰى هٰذَا الْكَلَامِ الْاِنْكَارُ عَلَيْهِ وَ الْاِنْكَارُ فِيْ جَهْرِهٖ اَوْ رَفْعِ صَوْتِهٖ بِحَيْثُ اَسْمَعَ غَيْرَهٗ لَا عَنْ اَصْلِ الْقِرَاءَةِ بَلْ فِيْهِ اَنَّهُمْ كَانُوْا يَقْرَءُوْنَ بِالسُّوْرَةِ فِي الصَّلٰوةِ السِّرِّيَّةِ (جلد اوّل، ص: ١٧٢)

یعنی ''اس کلام کا مفہوم یہ ہے کہ آپ ﷺ نے اس کو بآوازِ بلند قراءت سے روکا تھا، کیونکہ اس نے آواز دوسرے کو سنائی، نہ کہ اصلی قراءت سے انکار مقصود ہے!...... نفسِ حدیث میں تو یہ مسئلہ موجود ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سرّی نماز میں سورۃ پڑھتے تھے۔''

صاحب التعليقات السلفية (بھوجیانی) نے بھی قریباً یہی بات دہرائی ہے کوئی نئی بات نہیں کہی۔ اسی بنا پر امام نووی رحمہ اللہ نے اس روایت پر صحیح مسلم کے حاشیہ میں بایں الفاظ تبویب قائم کی ہے: «بَابُ نَهْيِ الْمَأْمُوْمِ عَنْ جَهْرِهٖ بِالْقِرَائَةِ خَلْفَ اِمَامِهٖ»

یعنی ''ماموم کے لیے امام کے پیچھے جہری قراءت کرنا منع ہے۔'' اور امام ابوداؤد نے اپنی سنن میں یوں

---

[1] سنن ابن ماجه، بَابُ الْقِرَاءَةِ خَلْفَ الْإِمَامِ، رقم: ٨٤٣

باب باندھا ہے:« بَابُ مَنْ رَّأَ القِرَاءَ ةَ اِذَا لَمْ يَجْهَرْ » لہٰذا حدیثِ مذکور کے الفاظ کے پیش نظر امام نسائی کی تبویب کی بجائے ابوداؤد رحمہ اللہ اور امام نووی رحمہ اللہ کی تبویبیں درست اور مؤقف کے اظہار کے لیے ہیں، جب کہ امام نسائی کی تبویب سے ان لوگوں کے استدلال کی طرف اشارہ ہے جو اس حدیث سے مقتدی کے لیے قراءۃ کے قائل نہیں۔

امام نسائی و ترمذی وغیرہ کی یہ عام عادت ہے کہ اپنی تبویب سے دوسروں کے استدلالات کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ یہ ضروری نہیں کہ خود ان کا اپنا موقف بھی وہی ہو۔ چنانچہ حدیث ہٰذا کے اخیر میں امام ابوداؤد رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

«وَ قَالَ ابْنُ كَثِيْرٍ فِي حَدِيْثِهٖ قَالَ قُلْتُ لِقَتَادَةَ كَاَنَّهٗ كَرِهَهٗ قَالَ لَوْ كَرِهَهٗ نَهٰى عَنْهُ »

''محمد ابن کثیر اپنی حدیث میں بیان فرماتے ہیں کہ شعبہ نے کہا، میں نے قتادہ سے دریافت کیا، معلوم یوں ہوتا ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے اس شخص کا آپ ﷺ کے پیچھے «سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلٰى » پڑھنا مکروہ جانا؟ تو قتادہ نے جواب دیا، اگر آپ ﷺ نے اس فعل کو مکروہ جانا ہوتا تو فعلِ قراءت سے منع فرما دیتے۔

عون المعبود میں ہے:« فَدَلَّ عَلٰى عَدَمِ الْكِرَاهَةِ» یعنی اس حدیث سے دلیل ملتی ہے کہ امام کے پیچھے قراءۃ کرنی مکروہ نہیں۔(جلد اوّل،ص:۳۰۷) نیز مؤطا امام مالک رحمہ اللہ میں حضرت عبد اللہ بن عمر (رضی اللہ عنہما) کے متعلق مذکور ہے کہ وہ سرّی نمازوں کی چاروں رکعتوں میں سورۃ فاتحہ کے ساتھ سورۃ ملایا کرتے تھے۔

امام محمد رحمہ اللہ کی روایت میں صراحت موجود ہے کہ ان کا یہ عمل ظہر اور عصر کے فرضوں میں تھا۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: مرعاۃ المفاتیح جلد اوّل،ص:۶۰۰۔

نیز محدث شام علامہ ناصر الدین البانی رحمہ اللہ نے اپنی کتاب «صِفَةُ صَلٰوةِ النَّبِيِّ ﷺ» میں بایں الفاظ عنوان قائم کیا ہے:«وُجُوْبُ الْقِرَاءَ ةِ فِي السِّرِّيَّةِ» یعنی سرّی نماز میں قراءت واجب ہے۔'' پھر اس کے تحت تحریر فرماتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو سرّی نماز میں قراءت پر برقرار رکھا ہے۔''

بایں ہمہ آپ نے ان پر صرف قراءت میں حاصل تشویش کا انکار کیا۔ یہ اس وقت کا قصہ ہے جب کہ آپ ﷺ نے صحابہ کو ظہر کی نماز پڑھائی تو فرمایا:«اَيُّكُمْ قَرَأَ سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلٰى »''تم میں سے کس نے «سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلٰى » پڑھا ہے۔'' ایک آدمی نے کہا: میں نے!...... اور میرا مقصود اس

سے خیر کے سوا کچھ نہیں تھا۔'' آپ ﷺ نے فرمایا: مجھے احساس ہو رہا تھا کہ ایک شخص نے مجھ پر قراءت خلط ملط کردی ہے۔[1] ایک دوسری روایت جو جزء القراءۃ للبخاری، مسند احمد اور السّراج میں بسند حسن مروی ہے، میں ہے کہ: صحابہ کرام رضی اللہ عنہم، نبی اکرم ﷺ کی اقتداء میں قراءت بآوازِ بلند کرتے تھے،تو آپ ﷺ نے فرمایا:« خَلَطْتُمْ عَلَيَّ الْقُرْاٰنَ »تم نے مجھ پر قرآن کو خلط ملط کردیا ہے۔''

پھر محدث موصوف صفحہ ۹۶ کے حاشیہ پر رقمطراز ہیں کہ سرّی نماز میں قراءت خلف الامام کی مشروعیت کے قائل، قدیم قول کے مطابق امام شافعی ہیں اور امام ابوحنیفہ کے شاگرد امام محمد سے بھی ایک قول اسی کے موافق ہے۔ ملا علی قاری اور بعض حنفی شیوخ نے بھی اس مسلک کو پسد کیا ہے۔ اور یہی قول امام زہری، مالک، ابن المبارک، احمد بن حنبل اور محدثین کی ایک جماعت وغیرہ کا ہے۔(رحمہم اللہ تعالیٰ)

اب آپ سوالات کا جواب بالترتیب لاحظہ فرمائیں:

۱۔ لفظ «خَالَجَنِیْهَا» سے ظاہر ہے کہ اس نے سورۃ کا کچھ حصہ بلند آواز سے پڑھا ہوگا۔ امام خطابی ''معالم السنن'' میں فرماتے ہیں:

« وَ اِنَّمَ اَنْكَرَ عَلَيْهِ مُجَاذَبَتَهٗ اِيَّاهُ فِي قِرَاءَةِ السُّوْرَةِ حِيْنَ تَدَاخَلَتِ الْقِرَآءَ تَانِ »

۲۔ جہاں تک سورۃ فاتحہ کاتعلق ہے،اس کے بارے میں امام خطابی فرماتے ہیں:

« فَاَمَّا قِرَآءَ ةُ فَاتِحَةِ الْكِتَابِ فَاِنَّهٗ مَأْمُوْرٌ بِهَا عَلٰى كُلِّ حَالٍ اِنْ اَمْكَنَهٗ اَنْ يَّقْرَأَ فِي السَّكْتَةِ فَعَلَ وَ اِلَّا قَرَأَ مَعَهٗ لَا مَحَالَةَ »

''جہاں تک سورۃ الفاتحہ کاتعلق ہے،تو وہ ہر حال میں اس کے پڑھنے کا پابند ہے، اگر ممکن ہو تو خاموشی کے وقفہ میں پڑھے ورنہ ساتھ ساتھ!''

۳۔ سورۃ الفاتحہ نہیں چھوڑ سکتا۔

۴۔ ظاہر ہے کہ باقی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے سورت سرّی پڑھی ہوگی۔ اس لیے تنبیہ کی ضرورت صرف اس ایک کو سمجھی گئی، جس نے سرِّی کی مخالفت کی۔

۵۔ ممکن ہے صحابی کی مراد دونوں ہوں۔ جہر میں چونکہ آپ ﷺ کی سنت کی مخالفت تھی اس لیے اس سے منع فرمادیا۔

۶۔ آپ ﷺ ایک آدھ آیت اونچی سناتے تھے۔لیکن اس نے زیادہ قراءت کی ہوگی نیز آپ ﷺ کی

---

[1] صحیح مسلم،بَابُ نَهْيِ الْمَأْمُومِ عَنْ جَهْرِهِ بِالْقِرَاءَةِ خَلْفَ إِمَامِهِ،رقم:۳۹۸

اونچی قراءت کا مقصود یہ ظاہر کرنا ہوسکتا ہے کہ سرّی نمازوں میں سورۃ فاتحہ کے علاوہ دیگر سورتوں کی قراءت بھی مشروع ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ یہی وجہ ہے کہ آپ ﷺ کی قراءت جہراً بے فائدہ نہ تھی، جب کہ مقتدی کی قراءت جہراً خلل کا باعث ہوتی ہے۔ علاوہ ازیں جب امام سورۃ فاتحہ کے سوا کوئی سورۃ جہراً پڑھے گا، تو مقتدی اسے خاموشی سے سنیں گے۔ مگر جب مقتدی ایسا کرے گا تو امام خاموش نہ ہوگا۔ لہٰذا اختلاط واقع ہوگا۔

۷۔ «خَالَجَنِیْھَا» سے مقصود (جہر سے) انکار ہے۔

سوال: ﴿سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلٰی﴾ کہنے کے بعد مقتدی ''سُبْحَانَ رَبِّیَ الْاَعْلٰی'' کہیں یا نہیں؟

جواب: آیت کریمہ ﴿سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلٰی﴾ کے بعد مقتدی کے لیے ''سُبْحَانَ رَبِّیَ الْاَعْلٰی'' کہنا کسی مرفوع متصل روایت سے ثابت نہیں۔ اسی طرح دیگر بعض آیات کے جوابات بھی مقتدی کے لیے ثابت نہیں ہو سکے۔ جملہ تفاصیل ملاحظہ ہو!

مقتدی کے لیے مخصوص آیات کے جوابات دینا:

سوال: جمعہ کی نماز میں جب امام صاحب ﴿سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلٰی﴾ پڑھتے ہیں تو مقتدی جہری آواز میں ''سُبْحَانَ رَبِّیَ الْاَعْلٰی'' کہتے ہیں۔ اب ایک مولوی صاحب نے ارشاد فرمایا ہے کہ یہ حدیث سے ثابت نہیں، تو کونسا فعل ثابت ہے؟ جواب دے کر ممنون فرمائیں۔

جواب: مقتدی کے لیے مخصوص آیات کے جوابات دینا واقعی کسی صحیح حدیث سے ثابت نہیں۔ مسئلہ ہذا میں تفصیلی بحث قبل ازیں ماہنامہ ''محدث'' لاہور میں چھپ چکی ہے۔

سوال: ایک مسئلہ آپ کی خدمت میں ارسال کر رہا ہوں وضاحت فرما کر جواب سے نوازیں۔ وہ یہ ہے کہ ہم ''سورۃ الاعلیٰ'' کی پہلی آیت یا دیگر ایسی سورتیں جن میں سوالیہ قسم کی آیات ہیں مثلاً سورۃ ''غاشیہ'' اور ''والتین'' کے آخر میں، جو جوابی کلمات کہتے ہیں کیا یہ حضور علیہ السلام سے بحالتِ نماز ثابت ہیں یا نہیں یا آپ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو حکم دیا ہے؟ وضاحت فرمائیں۔ فقط والسلام:

جواب: ''سنن ابی داؤد'' میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے: « أَنَّ النَّبِیَّ ﷺ کَانَ اِذَا قَرَأَ ﴿سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلٰی﴾ قَالَ: سُبْحَانَ رَبِّیَ الْاَعْلٰی »[1]

اس حدیث میں کلمہ ''اِذَا قَرَأَ'' عام ہے۔ اس کے عموم میں حالتِ نماز وغیرہ سب داخل ہیں، اسی طرح

[1] سنن أبی داؤد، بَابُ الدُّعَاءِ فِی الصَّلَاۃِ، رقم: ۸۸۳

اپنے عموم کے اعتبار سے یہ روایت فرضی اور نفلی سب نمازوں کو شامل ہے۔ اس کی تائید صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے افعال سے بھی ہوتی ہے۔

چنانچہ ''سنن کبریٰ بیہقی'' میں ہے: «اِنَّهٗ قَرَأَ فِی الصُّبحِ بِسَبِّحِ اسمَ رَبِّكَ الاَعلٰی فَقَال: سُبحَانَ رَبِّیَ الاَعلٰی»[1] یعنی حضرت علی رضی اللہ عنہ نے صبح کی نماز میں آیت ﴿سَبِّحِ اسمَ رَبِّكَ الاَعلٰی﴾ پڑھی، اور پھر "سُبحَانَ رَبِّیَ الأَعلی" کہا۔ سعید بن جبیر رحمہ اللہ کا بیان ہے، کہ میں نے ابن عمر رضی اللہ عنہما کو سنا ﴿سَبِّحِ اسمَ رَبِّكَ الاَعلٰی﴾ پڑھا، پھر "سبحَانَ رَبِّیَ الاَعلی" کہا۔ اس کی مثل حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے بھی منقول ہے، کہ ابن زبیر رضی اللہ عنہ سے مأثور ہے کہ

« اِنَّهٗ قَرَأَ سَبِّحِ اسمَ رَبِّكَ الاَعلٰی، فَقَالَ: سُبحَانَ رَبِّیَ الاَعلٰی. وَ هُوَ فِی الصَّلٰوةِ. فَقِيلَ لَهٗ: اَتَزِيدُ فِی القُراٰنِ؟ فَقَالَ: لَا اِنَّمَا اَمَرنَا بِشَیءٍ فَعَلتُهٗ. »

حدیث مذکور میں عزیزی نے صحت کا حکم لگایا ہے ابوداؤد میں ہے: خُولِفَ ابنُ وَكِيع فِی هٰذَا الحَدِيثِ. رَوَاهُ أَبُو وَكِيع، وَ شُعبَةُ، عَن أَبِی إِسحَاق، عَن سَعِيدِ بنِ جُبَيرٍ، عَنِ ابنِ عَبَّاسٍ مَرفُوعًا.

اسی طرح سورۃ ''والتین'' اور ''لَا أُقسِمُ'' اور ''وَالمُرسِلٰت'' کے بارے میں لفظ ''مَن قَرَأَ'' وارد ہوا ہے جو عموم کا متقاضی ہے۔ حالتِ نماز و غیر حالتِ نماز کو شامل ہے۔ اسی بناء پر صاحب ''مشکوٰۃ'' حدیث ابن عباس رضی اللہ عنہما مذکور اور اس حدیث کو "باب القراءة والصلوٰة" کے تحت لائے ہیں، لیکن حدیث ہذا کی سند میں راوی مجہول ہے۔ ''مرعاۃ المصابیح'' ص:۶۲۸ (جلد اوّل) میں ہے:

« فِی إِسنَادِهٖ رَجُلٌ مَجهُولٌ فَالحَدِيثُ ضَعِيفٌ. »

نیز ''فتح القدیر للشوکانی'' (ص:۳۴۳، جزء ۵) میں ہے۔ "وَ فِی إِسنَادِهٖ رَجُلٌ مَجهُولٌ" اور ابن کثیر جزء:۴، ص:۱۵۸ پر ہے:

« وَ قَد رَوَاهُ شُعبة عَن اسماعِيل بن أمية قال قُلتُ: مَن حَدَّثَكَ؟ قَالَ: رَجُلٌ صَدَقَ عَن اَبِی هُرَيرَةَ.»

ترمذی میں ہے:

« اِنَّمَا يُروٰی بِهٰذَا الِاسناد، عن هذا الاعرابی، عَن ابی هريرة. و لا يسمّٰی »

''ابوداؤد'' میں ہے: «هٰذَا الاعرابی لا يعرف ففی الاسناد جهالة.»

---

[1] سنن الكبرٰى للبيهقى، بَابُ الْوُقُوفِ عِنْدَ آيَةِ الرَّحْمَةِ وَآيَةِ الْعَذَابِ وَآيَةِ التَّسْبِيحِ، رقم:٣٦٩٤

اس روایت میں لفظ "فَلْيَقُلْ" استعمال ہوا ہے اور ''احکام القرآن لابن العربی'' میں ہے: "وَ فِي رِوَايَةٍ غَيْرِهٖ إِذَا قَرَءَ أَوْ سَمِعَ" جو مقتدی کو بھی شامل ہے لیکن ساتھ ہی فرماتے ہیں: "وَ هٰذَا أَخْبَارٌ ضَعِيفَةٌ" ملاحظہ ہو! ۱۹۴۱ جزء:۴۔ بہر صورت یہ حدیث ضعیف ہے، کما عرفت۔

باقی رہا معاملہ ''سورۃ غاشیہ'' کا، تو اس بارے میں مجھے کوئی نص نہیں معلوم۔ ہوسکتا ہے کہ آپ نے اس سورت کے اختتام پر اَللّٰهُمَّ حَاسِبْنِي پڑھا ہو۔ البتہ ''مشکوٰۃ'' (جزء ثانی، ص:۴۱۷) پر ایک روایت بحوالہ ''مسند احمد'' بایں الفاظ موجود ہے:

« يَقُولُ فِي بَعْضِ صَلٰوتِهٖ: اَللّٰهُمَّ حَاسِبْنِي حِسَابًا يَّسِيرًا .»[1]

''تفسیر ابن کثیر'' جز:۴، ص:۴۸۹، پر ہے ''صَحِيحٌ عَلٰى شَرْطِ مُسْلِمٍ'' یعنی یہ حدیث امام مسلم کی شرط کے مطابق صحیح ہے، لیکن اس میں ''سورۂ غاشیہ'' کا تعین کرنا امر مشکل ہے۔ حاصل خلاصہ یہ ہے، کہ ''سورۃ الاعلیٰ'' میں قاری کے لیے جواب کی رخصت ہے۔ اس بیان میں وارد باقی احادیث قریباً ضعیف اور ناقابلِ حجت ہیں، باقی رہا معاملہ سامع مقتدی یا غیر مقتدی کے جواب کا، تو یہ کسی مرفوع حدیث سے ثابت نہیں ہو سکا۔

نیز قاری کے لیے مزید گنجائش بھی ثابت ہے۔ چنانچہ صحیح مسلم، مسند احمد اور سنن نسائی میں حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے:

«إِذَا مَرَّ بِآيَةٍ فِيهَا تَسْبِيحٌ. سَبَّحَ . وَ إِذَا مَرَّ بِسَوَالٍ ،سَأَلَ. وَ إِذَا مَرَّ بِتَعَوُّذٍ ،تَعَوَّذَ»[2]

یعنی ''نبی ﷺ کا مرور (دورانِ تلاوت گزر) تسبیح کی آیت سے ہوتا، تو آپ ﷺ تسبیح پڑھتے اور جب سوال سے ہوتا سوال کرتے اور جب تعوذ سے گزر ہوتا، تو تعوذ پڑھتے۔''

نیز "تلخيص الحبير" طبع انصاری کے ص:۹۰ میں ہے:

« وَ يَستحبُّ للقارى فى الصلوٰة و خارجها أن يَسأَلَ الرَّحمَةَ. إِذَا مَرَّ بِآيَةِ الرَّحمَةِ. وَ أَن يَتَعَوَّذَ. إِذَا مَرَّ بِآيَةِ العَذَابِ.»

''سنن ابی داؤد'' بمع ''عون المعبود'' جزء اول ص:۳۴۱، پر امام ابوداؤد نے امام احمد سے نقل کیا ہے:

[1] مسند احمد، رقم:۲۴۲۱۵، صحيح ابن خزيمة، رقم:۸۴۹، المستدرك على الصحيحين للحاكم، رقم:۱۹۰

[2] مسند احمد، رقم:۲۳۳۶۷، صحيح مسلم، بَابُ اسْتِحْبَابِ تَطْوِيلِ الْقِرَاءَةِ فِي صَلَاةِ اللَّيْلِ، رقم: ۷۷۲، سنن النسائي، بَابُ تَسْوِيَةِ الْقِيَامِ وَالرُّكُوعِ، ......الخ، رقم:۱۶۶۴

''يُعجِبُنِي فِي الفَرِيضَةِ اَن يَّدعُوَ بِمَا فِي القُراٰنِ'' صاحبِ ''عون المعبود'' اس جملہ کی تشریحات کرتے ہوئے رقمطراز ہے:

« فَالِامَامُ اَحمَدُ يَخُصُّ هٰذَا فِي النوافل» بل يَستَحِبُّهُ فِي الفَرَائِضِ اَيضًا. وَ بِهِ قَالَ الشَّافِعِيُّ : »

لیکن مسند احمد کی روایت میں ساتھ یہ قید بھی موجود ہے: « يَقرَأُهُ فِي صَلٰوةٍ لَيسَت بِفَرِيضَةٍ» اور بعض روایات میں صلوٰۃ اللیل کی صراحت ہے۔ نیل الأوطار، ص:۲۳۷، جزء:۳، میں ہے:

« وَالظَّاهِرُ استِحبَابُ هٰذِهِ الاُمُورِ لِكُلِّ قَارِیءٍ مِن غَيرِ فَرقٍ بَينَ المُصَلِّي، وَ غَيرِهٖ، وَ بَينَ الإِمَامِ، وَالمنفرد، والمأمُومِ . وَ اِلٰى ذٰلِكَ ذَهَبَت الشافِعِيَّة.»

لیکن میری نظر میں اولیٰ یہ ہے کہ اس حکم کو صرف قاری پر محصور کیا جائے۔ جیسا کہ حدیث میں نص موجود ہے۔ (واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب وعلمه اتم) (حافظ ثناء اللہ مدنی)

تعلیق از حافظ محمد ابراہیم کمیر پوری

قارئین کرام نے محترم حافظ ثناء اللہ صاحب کا جواب اور اس کے دلائل ملاحظہ فرمائے۔ حافظ صاحب نے اپنا رُجحان یہ ظاہر کیا ہے، کہ یہ جوابی کلمات امام کہے مقتدی نہ کہے، لیکن ہمارے نزدیک اولیٰ اور اَقرب الی الصواب بات وہ ہے، جو حافظ صاحب نے ''نیل الأوطار'' کے حوالہ سے پیش کی ہے۔ یعنی امام شوکانی رحمہ اللہ کے نزدیک یہ کلمات امام اور مقتدی دونوں کے لیے مستحب ہیں۔

ہم مسئلہ زیرِ استفتاء کی مزید وضاحت کے لیے مفتی جماعت حضرت محدث روپڑی رحمہ اللہ کی تحقیق ہدیہ قارئین پیش کرنا چاہتے ہیں۔

آپ کا علمی و تحقیقی مقام بلا نزاع مُسلَّم ہے۔ قیامِ پاکستان سے قبل ہماری جماعت میں اساطینِ علم، شیوخ الحدیث، اربابِ تحقیق اور اصحابِ فتویٰ کثیر اور معقول تعداد میں موجود تھے۔ لیکن یہ حقیقت ہے۔ کہ پورے ہندوستان میں محدث روپڑی کے فتویٰ کو جس عزت و احترام سے دیکھا جاتا تھا، وہ مقام کسی دوسرے اہلِ علم کے فتویٰ کو حاصل نہ ہو سکا۔ ہمارے لیے مزید وجہِ اطمینان یہ ہے، کہ ہمیں تو ہر لحاظ سے محدث روپڑی سے نسبت ہے اور مذکورہ الصدر استفتاء کے مفتی عزیز مکرم مولانا حافظ ثناء اللہ صاحب کو بھی انھیں سے شرفِ تلمذ حاصل ہے اور وہ بھی اپنے تمام اساتذہ سے زیادہ حضرتِ مرحوم کی تحقیق کو ترجیح دیتے ہیں۔

اس سلسلہ میں ہم حضرت حافظ صاحب، محدث روپڑی رحمہ اللہ کے اپنے اخبار ''تنظیم اہلِ حدیث'' ۱۲

جمادی الاول ۱۳۸۲ھ سے اسی مضمون کا ایک سوال اور خاص اُن کے قلم سے، اس کا جواب نقل کرنا کافی سمجھتے ہیں۔

قرآنِ مجید کی جن سورتوں کے جوابات حدیث میں آ گئے ہیں، وہ جس طرح امام کے لیے جائز اور مستحب ہیں، اسی طرح مقتدی کے لیے بھی جائز اور مستحب ہیں۔ بلکہ مندرجہ ذیل واقعہ سے ثابت ہوتا ہے، کہ رسول اللہ ﷺ کو سامعین کا جواب دینا بہت محبوب تھا۔ چنانچہ ''مشکوٰۃ'' باب القراءۃ میں ہے:

« عَنْ جَابِرٍ قَالَ: خَرَجَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلَى أَصْحَابِهِ، فَقَرَأَ عَلَيْهِمْ سُورَةَ الرَّحْمٰنِ مِنْ أَوَّلِهَا إِلَى آخِرِهَا فَسَكَتُوا، فَقَالَ: لَقَدْ قَرَأْتُهَا عَلَى الجِنِّ لَيْلَةَ الجِنِّ فَكَانُوا أَحْسَنَ مَرْدُودًا مِنْكُمْ، كُنْتُ كُلَّمَا أَتَيْتُ عَلَى قَوْلِهِ ﴿فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ﴾ قَالُوا: لَا بِشَيْءٍ مِنْ نِعَمِكَ رَبَّنَا نُكَذِّبُ فَلَكَ الحَمْدُ » (رَوَاهُ التِّرمِذِيُّ، وَ قَالَ هٰذَا حَدِيثٌ غَرِيبٌ) ①

یعنی ایک روز رسول اللہ ﷺ صحابہ رضی اللہ عنہم کے پاس آئے اور ''سورۃ رحمٰن'' ساری پڑھی۔ صحابہ رضی اللہ عنہم خاموش سنتے رہے۔ بعد میں آپ ﷺ نے فرمایا: میں نے یہ سورت جنوں پر پڑھی تھی جب بھی میں آیت ﴿فَبِأَيِّ الآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ﴾ پر پہنچتا، تو وہ نہایت اچھا جواب دیتے ہوئے کہتے: «لَا بِشَيْءٍ مِّن نِعَمِكَ رَبَّنَا، نُكَذِّبُكَ، فَلَكَ الحَمدُ» یعنی ''اے ہمارے رب! تیری کوئی ایسی نعمت نہیں، جن کو ہم جھٹلا سکیں۔ پس تیرے لیے حمد ہے۔''

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ ﷺ کو یہ بات بہت پیاری لگتی تھی، کہ سامعین بھی جواب دیں۔ لہٰذا مقتدی کو جواب دینا چاہیے۔ یہ حدیث اگر چہ ضعیف ہے۔ مگر امام شافعی رحمہ اللہ نے اس سے استدلال کیا ہے، کہ سامع بھی جواب دے۔ امام شافعی رحمہ اللہ کے استدلال سے معلوم ہوتا ہے، کہ حدیث [illegible] ہے، خاص کر فضائلِ اعمال میں۔ رہی یہ بات کہ نماز غیر نماز میں کوئی فرق ہے، یا نہیں؟ تو اس کا جواب یہ ہے، کہ بظاہر کوئی فرق معلوم نہیں ہوتا۔ یہ ایسا ہی سمجھ لینا چاہیے، جیسے امام کی (آمین) کے ساتھ (آمین) کہی جاتی ہے۔ کیونکہ سماع قرأت کو مخل نہیں۔ اس کا (آمین) پر قیاس صحیح ہے۔'' (بحوالہ فتاویٰ اہلِ حدیث، ج:۲، ص:۱۵۴، ۱۵۵)

① سنن الترمذی، بَابٌ: وَمِنْ سُورَةِ الرَّحْمٰنِ، رقم: ۳۲۹۱

حضرت میاں صاحب دہلوی کی تحقیق انیق و تائید

مزید اطمینان کے لیے ہم حضرت شیخ الکل فی الکل مولانا سید نا نذیر حسین محدث دہلوی رحمہ اللہ المعروف بڑے میاں صاحب رحمہ اللہ کی تحقیق پیش کرنا مناسب خیال کرتے ہیں۔ فتاویٰ نذیریہ، جلد اوّل، ص: ۴۲۰، ۴۲۳ میں ان کا اپنا فتویٰ موجود ہے۔ استفادۂ تام کے لیے ہم سوال و جواب نقل کر دیتے ہیں۔

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ عمر کہتا ہے کہ ﴿ اَلَیسَ اللّٰہُ بِأَحکَمِ الحَاکِمِینَ ﴾ اور ﴿سَبِّحِ اسمَ رَبِّكَ الاَعلٰی﴾ اور ﴿فَبِاَیِّ حَدِیثٍ بَعدَهٗ یُؤمِنُونَ﴾ وغیرہ آیات کا جواب جس طرح قاری کو دینا چاہیے اسی طرح سامع کو بھی دینا چاہیے اور زید کہتا ہے کہ ان آیات کا جواب صرف قاری کو دینا چاہیے سامع کو نہیں دینا چاہیے۔ پس ان دونوں سے کس کا قول حق وصواب ہے۔ بینوا توجروا۔

الجواب: صورت مسئول عنہا میں عمر کا قول اُقرب الی الصواب (حق سے زیادہ قریب) ہے یعنی آیاتِ مذکورہ کا جواب جس طرح قاری کو دینا چاہیے، اسی طرح سامع کو بھی دینا چاہیے اس لیے کہ رسول اللہ ﷺ کا بوقتِ قرأۃ ان آیتوں کا جواب دینا ثابت ہے اور آپ ﷺ کا قول و فعل امت کے لیے ہر وقت دستور العمل ہے تاوقتیکہ اس کی تخصیص کسی وقتِ خاص، یا شخصِ خاص یا حالتِ خاص کے ساتھ ثابت نہ ہو مثلاً ''رفع الیدین'' اور ''وضع الیدین علی الصدر'' (سینے پر ہاتھ باندھنا) اور ''رفع سبابه فی التشهد'' (تشہد میں انگلی اٹھانا) اور ''جلسۂ استراحت'' اور ''تورک'' اور ''قبل افتتاح قرأت'' کے «اَللّٰہُ اَکبَرُ کَبِیرًا وَالحَمدُ لِلّٰہِ کَثِیرًا وَ سُبحَانَ اللّٰہِ بُکرَۃً وَّ اَصِیلًا» یا «اِنِّی وَجَّهتُ وَجهِیَ لِلَّذِی فَطَرَ السَّمٰوَاتِ وَالاَرضَ» یا «اَللّٰهُمَّ بَاعِد بَینِی وَ بَینَ خَطَایَایَ» پڑھنا یا رکوع میں ''سُبُّوحٌ قُدُّوسٌ رَبُّ المَلَائِکَةِ وَالرُّوحُ'' اور سجدہ میں «سَجَدَ لَكَ وَجهِی وَ عِظَامِی وَ مُخِّی» پڑھنا وغیرہ۔ یہ سب ایسے افعال ہیں جن کی مسنونیت میں کسی طرح کا شک نہیں ہوسکتا اور امتِ محمدیہ میں سے ہر شخص کے لیے یہ افعال مسنون ہیں، خواہ وہ شخص امام ہو یا مقتدی، خواہ منفرد ہو حالانکہ یہ کہیں ثابت نہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے مقتدیوں کو ان امور کی تعلیم فرمائی ہو یا عام طور پر فرمایا ہو کہ جو شخص جب نماز پڑھے تو ایسا کرے پھر بھی یہ احکام ہر شخص کے لیے اسی وجہ سے عام رہے کہ قول و فعل۔ پیغمبر ﷺ تمام افرادِ امت کے لیے دستور العمل ہوتا ہے جب تک حدیث مرفوع سے ہی تخصیص ثابت نہ ہو: ''قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی ﴿لَقَد کَانَ لَکُم فِی رَسُولِ اللّٰہِ اُسوَۃٌ حَسَنَۃٌ﴾ (الاحزاب:۲۱)

پس بناء بر تقریر ھذا ان آیات کا جواب ہر شخص کو دینا چاہیے۔ عام ازیں کہ قاری ہو یا سامع، نماز میں ہو یا غیر نماز میں، امام ہو یا مقتدی یا منفرد ''اِتِّبَاعًا لِفِعلِ النَّبِیِّ ﷺ''۔

اس کے بعد حضرت میاں صاحب رحمہ اللہ نے ابوداؤد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ اور صحیح مسلم سے ان احادیث کو نقل کیا ہے جن سے آنحضرت ﷺ سے ان آیات کا جواب دینا ثابت ہوتا ہے۔ اس کے بعد آپ ''جامع ترمذی'' کے حوالہ سے وہ حدیث لائے ہیں جس میں آپ ﷺ نے صحابہ کی خاموشی پر جنوں کے جواب دینے کا تذکرہ فرمایا: اور صحابہ رضی اللہ عنہم کو ''سورۂ رحمٰن'' کی مخصوص آیت کے جواب کی ترغیب دی، ان تمام روایات کو نقل کرنے کے بعد میاں صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔

''اس حدیث ''ترمذی'' سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اس قسم کی آیتوں کا جواب قاری یا مصلی کے اعتبار سے نہیں ہے۔ بلکہ اس کلام پاک کے معنیٰ اور موقع کے لحاظ سے ہے۔ جب ہی تو آپ ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے سکوت پر اعتراض فرمایا: اور جنات کے جواب دینے کو مدحیہ طور پر ذکر فرمایا: حالانکہ آپ ﷺ نے اس سے پہلے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو اس جواب کی تعلیم نہیں فرمائی تھی۔ پس معلوم ہوا کہ خود رسول اللہ ﷺ نے بھی جن جن آیات کا جواب دیا ہے وہ اُس خصوصیت سے نہیں کہ آپ ﷺ امام یا قاری تھے بلکہ ان آیتوں کا معنیٰ اور موقع ہی ایسا ہے کہ جب وہ آیت پڑھی جائے، تو پڑھنے والا اور سننے والا، اس کا مناسب جواب، جو احادیث سے ثابت ہو، دے۔

اس کے بعد حضرت صاحب نے اپنی اس تقریر کی تائید میں جامع صغیر کی شرح، شرح صحیح مسلم اور کتاب الاذکار للنووی کی بعض عربی عبارات تحریر فرمائی ہیں جنھیں طوالت کے خوف سے حذف کر رہے ہیں۔ ان عبارات کا جوہری مفہوم یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کا یہ قول ﴿اَلَیسَ ذٰلِكَ بِقٰدِرٍ عَلٰی اَن یُّحیِیَ المَوتٰی﴾(القیامۃ:٤٠) اور ﴿اَلَیسَ اللّٰهُ بِاَحكَمِ الحٰكِمِینَ﴾(التین:٨) تو ''بَلٰی'' کہے۔ کیونکہ ان آیات میں سوال کیا گیا ہے جس کا جواب دینا چاہیے اور خطاب کا حق ہے، کہ مخاطب اس کا مناسب جواب دے۔ اگر نہ دے گا تو سامع غافل اور بے خبر تصور ہوگا یا جیسے کوئی جانور ہے جو آواز تو سنتا ہے لیکن مطلب نہیں سمجھتا یا کسی اندھے، گونگے، بہرے کی طرح جسے کچھ سمجھ نہ آئے۔ یہ حالت بہت بُری حالت ہے۔(مفہوم عبارت نقل کردہ میاں صاحب)

اس ساری تحقیق کا خلاصہ یہ ہے، کہ مذکورہ آیات کا جواب قاری اور امام کی طرح سامع اور مقتدی کے لیے بھی جائز اور مستحب ہے اگرچہ واجب کسی پر نہیں۔ بعض نوجوان اہلِ علم ایسے مسائل میں تشدد پر اتر آتے ہیں اور پُرسکون ماحول میں توحّش اور ارتعاش پیدا کرنا وجہِ افتخار خیال کرتے ہیں۔ یہ رَوش سلف کے تعامل کے قطعی خلاف ہے۔ ضعیف حدیثوں سے وجوب تو نہیں۔ استحباب بہرحال ثابت ہو جاتا ہے اور جہاں دلائل

متعارض ہوں، وہاں تطبیق کے علاوہ توفیق کا عمل بھی مناسب ہوتا ہے اور دلائل متعارضہ کا حق یہی ہے کہ مسئلہ میں وسعت رہنے دی جائے، اور کسی کو کوئی خاص اور معین صورت اختیار کرنے پر نہ مجبور کیا جائے، اور نہ ہی دوسری صورت اپنانے والوں پر طعن و تشنیع کی جائے اور نہ ہی فریقین سے کسی کو بدعتی یا تارکِ حدیث کہا جائے۔ کیونکہ سلامتی کی راہ یہی ہے۔ (ہفت روزہ اہلِ حدیث: ۲۰/ اکتوبر۔۳ نومبر ۱۹۷۸ء)

تعاقب از مولانا حافظ ثناء اللہ خان صاحب

فروعی مسائل میں اہلِ حدیث کا طرزِ فکر و عمل:

مؤقر جریدہ ہفت روزہ ''اہلِ حدیث'' لاہور مؤرخہ ۲۰/ اکتوبر ۱۹۷۸ء میں قرآنی آیات کے جواب کے سلسلہ میں میری رائے کے ساتھ، ہمارے محترم دوست مدیر اعلیٰ اہلِ حدیث نے اپنی مخالفانہ رائے کا اظہار بھی ضروری سمجھا ہے، اور اس کے لیے انھوں نے جماعت اہلِ حدیث کی دو مایہ ناز ہستیوں کے فتاویٰ کی اشاعت بھی کی ہے، تاکہ اپنے مدعا کو تقویت دے سکیں۔

جہاں تک ان مبارک ہستیوں کے عزت و احترام اور علم و فضل اور اعلیٰ مقام کا تعلق ہے، ہمیں ان سے کوئی نسبت نہیں، لیکن موصوف مدیر اعلیٰ نے ان کے فتویٰ کو جس انداز میں شائع کیا ہے اور اس ضمن میں اپنی طرف سے جو اصولِ بحث (ضعیف حدیث کے قابلِ عمل ہونے کی) اٹھائی ہے۔ موجودہ علمی انحطاط کے دور میں وہ کئی فتنوں کا دروازہ کھول سکتی ہے، اس لیے میں نے مناسب سمجھا، کہ کم از کم اس بارے میں اہلِ حدیث کے اندازِ فکر کی وضاحت کر دوں۔ کیونکہ اہلِ حدیث کا نہج فکر مخصوص ہے۔ یہ تو ممکن ہے کہ کسی مسئلہ میں اہلِ حدیث علماء کی دو رائے ہوں۔ لیکن اہلِ حدیث کا مخصوص فکر اگر اپنے امتیازات کھو بیٹھے، تو پھر اس مکتبِ فکر کے وجود کا جواز ہی باقی نہیں رہتا۔ جیسا کہ بعض موقعوں پر عامۃ الناس علمائے اہلِ حدیث کی مختلف آراء دیکھ کر پریشان ہو جاتے ہیں اور اس تذبذب میں پڑ جاتے ہیں، کہ اس میں سے کون سا مسلک اہلِ حدیث کا ہے، حالانکہ مسلک اہلِ حدیث پیش آمدہ مسائل کے حل میں صرف ایک مخصوص طرزِ عمل سے واسطہ رکھتا ہے۔ جس کی حفاظت علماء اہلِ حدیث پر فرض ہے۔ ہمارے نزدیک آراء کے باہمی تفاوت کی زیادہ اہمیت نہیں۔ طوالت سے بچنے کے لیے ہم مثالیں پیش کرنے سے احتراز کرتے ہیں۔ غالباً مدیر اعلیٰ کو بھی ہمارے اصل اصول سے اختلاف نہیں ہوگا۔

اس تمہید کے بعد ہم اپنے جائزہ کو ''اہلِ حدیث'' کے علمی اسلوب کی وضاحت کی غرض سے صرف دو

نکتوں پر محدود رکھیں گے۔

اوّلاً: مدیر اعلیٰ کا یہ فرمان محدثین کے نزدیک کہاں تک درست ہے کہ:

''ضعیف حدیثوں سے وجوب تو نہیں، استحباب بہر حال ثابت ہو جاتا ہے۔''

ثانیاً: مسئلہ مذکورہ کی وضاحت کے لیے محترم بزرگوں کے فتوؤں کی اشاعت کا انداز تقلیدی تو نہیں ہے، جب کہ خود ہی یہ بزرگ غیر منقسم ہندوستان میں مُقلّدین کے خلاف صف آراء رہے۔ شیخ الکل میاں صاحب رحمہ اللہ نے ''معیار الحق'' کتاب لکھی اور حضرت الاستاذ محدث روپڑی رحمہ اللہ کی بیشتر تصانیف کا محور یہی موضوع رہا۔ پہلے نکتہ کے لیے ہم اہلِ حدیث کے متقدمین اور متاخرین، راسخین فی العلم کے چند ایک ارشادات کا مختصر ذکر ہی کافی سمجھتے ہیں۔ ورنہ اس موضوع پر ان بزرگوں نے اس قدر تفصیلی بحثیں کی ہیں کہ ایک مستقل تصنیف ہی اس کی متحمل ہو سکتی ہے اور اس موضوع پر (ان شاء اللہ) کسی فرصت میں ایک مقالہ ہدیۂ ناظرین کروں گا۔ فی الحال ائمہ کے چند ارشادات پیش خدمت ہیں:

اصولِ حدیث کی مشہور کتاب ''قواعد التحدیث'' میں علامہ جمال الدین قاسمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

«فقد حُكِىَ فِيهِ عَن جَمَاعَة مِن الْأَئِمَّةِ أَنَّهُم لَا يَرَونَ العَمَلُ بِالحَدِيثِ الضَّعِيفِ مُطلَقًا، كَابِنِ مُعِينٍ، وَالبُخَارِيِّ، وَ مُسلِمٍ، وَ اَبِى بَكرِ بنِ العَرَبِيِّ الفَقِيهِ، وَ غَيرِهِم، وَ مِنهُم ابنُ حَزمٍ»

یعنی ''ائمہ اہلِ حدیث کی ایک جماعت اس طرف گئی ہے، کہ ضعیف حدیث پر عمل مطلقاً ناجائز ہے (خواہ مسئلہ وجوبی ہو یا استحبابی) ان میں سے ابن معین، بخاری، مسلم، ابوبکر بن العربی رحمہم اللہ وغیرہم ہیں، ابن حزم رحمہ اللہ کی بھی یہی تحقیق ہے۔''

شیخ الاسلام ابن تیمیہ ''القاعدة الجليلة'' (ص:۴۰) میں فرماتے ہیں:

«وَ لَم يَقُل اَحَدٌ مِنَ الْأَئِمَّةِ اِنَّهُ يَجُوزُ اَن يُّجعَلَ الشَّیءُ وَاجِبًا، اَو مُستَحَبًّا بِحَدِيثٍ ضَعِيفٍ. وَ مَن قَالَ هٰذَا: فَقَد خَالَفَ الِاجمَاعَ»

یعنی ''ائمہ میں سے کوئی بھی یہ نہیں کہتا کہ کسی ضعیف حدیث سے کسی شے کو واجب یا مستحب قرار دینا جائز ہے۔ وہ اجماع کی مخالفت کرتا ہے۔''

گویا مدیر اعلیٰ کی یہ بات کہ ''ضعیف حدیثوں سے وجوب تو نہیں استحباب بہر حال ثابت ہو جاتا ہے۔'' ائمہ اہلِ حدیث کے اجماع کے خلاف ہے۔ ہند میں اہلِ حدیث اندازِ فکر کے مشہور نقیب نواب صدیق حسن

خان رحمہ اللہ اپنی عربی تفسیر ''فتح البیان فی مقاصد القرآن'' کے مقدمہ میں فرماتے ہیں:

« أَخطَأَ مَن قَالَ إِنَّهٗ یَجُوزُ التَّسَاهُلُ فِی الاَحَادِیثِ الوَارِدَةِ فِی فَضَائِلِ الأَعمَالِ »

یعنی وہ شخص غلطی پر ہے، جو عقیدہ رکھے کہ فضائلِ اعمال میں ضعیف احادیث کو بھی لینا جائز ہے۔

چونکہ مدیر اعلیٰ کو یہ غلطی اہل الرائے کے بعض علماء کے طرزِ عمل سے لگی ہے۔ اس لیے محدثین کے اس مسلک کی وضاحت ہم ان ہی کے حوالہ سے پیش کیے دیتے ہیں۔ چنانچہ مولانا عبدالحیٔ لکھنوی اپنی تصنیف ''الاجوبۃ الفاضلۃ'' میں مشہور محقق جلال الدین الدوانی رحمہ اللہ سے نقل فرماتے ہیں:

«اِتَّفَقُوا عَلٰی اَنَّ الحَدِیثَ الضَّعِیفَ لَا یَثبُتُ بِهٖ اَحکَامُ الخَمسَةِ الشَّرعِیَّةِ. وَ مِنهَا الاِستِحبَابُ»

یعنی ''محدثین کا اس پر اتفاق ہے کہ ضعیف حدیث سے کوئی حکم شرعی (وجوب، حرمت، استحباب کراہت اور اباحت) ثابت نہیں ہوتا۔ ان میں سے استحباب بھی ہے۔''

عالمِ اسلام کے مشہور محدث علامہ ناصر الدین البانی حفظہ اللہ متذکرہ بالا مغالطے (بعض ائمہ حدیث ضعیف حدیث سے احتجاج میں تساہل روا رکھتے ہیں) کا ازالہ کرتے ہوئے شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ سے نقل کرتے ہیں:

« وَ مَن نَقَلَ عَن اَحمَدَ اَنَّهٗ کَانَ یَحتَجُّ بِالحَدِیثِ الضَّعِیفِ الَّذِی لَیسَ بِصَحِیحٍ وَ لَا حَسَنٍ، فَقَد غَلَطَ عَلَیهِ » [1]

یعنی جس نے امام احمد رحمہ اللہ سے نقل کیا ہے، کہ وہ ضعیف حدیث سے بھی دلیل پکڑتے ہیں۔ اس نے آپ پر غلط الزام لگایا ہے۔''

اور علامہ احمد محمد شاکر ''الباعث الحثیث'' (ص:۱۰۱) میں لکھتے ہیں:

« وَ أَمَّا مَا قَالَهُ الاِمَامُ اَحمَدُ بنُ حَنبَلٍ، وَ عَبدُ الرَّحمٰنِ بنُ مَهدِيٍ، وَ عَبدُ اللّٰهِ ابنُ المُبَارِكِ ، اِذَا رَوَینَا فِی الحَلَالِ، وَالحَرَامِ. شَدَدنَا. وَ اِذَا رَوَینَا فِی الفَضَائِلِ، وَ نَحوِهَا. تَسَاهَلنَا. فَاِنَّمَا یُرِیدُونَ بِهٖ فِیمَا أَرجَحُ (وَاللّٰه أَعلَمُ) ان التَّسَاهُلَ إِنَّمَا فِی الأَخذِ بِالحَدِیثِ الحَسَنِ الَّذِی لَم یَصِل اِلٰی دَرَجَةِ الصِّحَّةِ. فَاِنَّ الاِصطِلَاحَ مِن التفرقة بَینَ الصَّحِیحِ، وَالحَسَنِ، لَم یَکُن فِی عَصرِهِم مُستَقِرًّا وَاضِحًا، بَل کَانَ

[1] القاعدة الجلیلة، ص:۸۵

اَکثَر المُتَقَدِّمِینَ لَا یُصَنِّفُ الحَدِیث اِلَّا بِالصِّحَّةِ . أَو الضُّعفِ فَقَط.»

یعنی احمد بن حنبل، عبدالرحمٰن بن مہدی اور عبداللہ بن مبارک رحمہ اللہ کے اس قول، کہ حرام اور حلال کے بارہ میں مروی حدیث میں ہم سختی کرتے ہیں اور فضائلِ اعمال کے بارہ میں ہم نرمی کرتے ہیں کا مفہوم یہ ہے، کہ ان کی نرمی صرف حسن حدیث قبول کرنے تک تھی۔ کیونکہ ان کے زمانہ میں ابھی صحیح اور حسن کا مروجہ فرق نہ تھا۔ بلکہ اکثر متقدمین حدیث کو صحیح کہتے تھے یا ضعیف۔ یعنی وہ حدیث کی صحیح اور ضعیف صرف دو قسمیں کرتے تھے۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ اور مشہور محدث علامہ احمد محمد شاکر رحمہ اللہ کی توجیہات پیش کرنے کے بعد شیخ البانی ایک اور توجیہ اپنی طرف سے بھی پیش کرتے ہیں، وہ یہ کہ ان کی مذکورہ نرمی دراصل ان کا یہ رواج تھا، کہ وہ ضعیف احادیث کو باسند روایت کرتے تھے۔ کیونکہ اس زمانہ میں ضعیف حدیث کو باسند نقل کرنا، اس کی تصحیح یا تضعیف سے کفایت کرنا تھا۔ (ملخصًا)

دراصل قرآنی آیات کے جواب کے بارے میں اس کا استحباب قاری تک محدود رکھنے کے حق میں میری ترجیحی رائے احادیث کے معیار پر مبنی ہے۔ میں نے اپنے جواب میں اس بارے میں وارد احادیث میں صحت پر بحث کر کے لکھا ہے، کہ صحیح احادیث میں سامع مقتدی یا غیر مقتدی کا جواب ثابت نہیں۔ اس لیے میری نظر میں اُولیٰ یہ ہے، کہ اس حکمِ استحباب کو صرف قاری پر محصور رکھا جائے۔ یہ بات لکھتے ہوئے میرے سامنے ایک تو احادیث کا معیار تھا، کہ سامع کے بارے میں کوئی صحیح حدیث موجود نہیں، جب کہ ہمارے ہاں اہلِ حدیث میں یہ عمل عام ہو کر عدمِ توازن کا شکار ہو گیا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ وہ قرآن کی عام آیت رحمت و عذاب پر تو خاموش رہتے ہیں۔ لیکن چند مخصوص صورتوں میں جواب کو سنت قرار دے دیا ہے۔ یہ مروجہ طریقہ سلف میں موجود نہ تھا۔ اس لیے میں نے یہ رواج مرجوح سمجھا۔ تیسری وجہ میرے سامنے فقہاء محدثین کا یہ اصول تھا، کہ عبادت میں اصل ''حظر'' (ممانعت) ہے۔ چنانچہ ہمارے جن بزرگوں نے سامع کو بھی قاری پر قیاس کیا ہے، انھوں نے اس مذکورہ اصول سے اس مسئلہ میں بے اعتنائی کی ہے۔

چوتھی وجہ چند احادیث ہیں، جو نماز کی حالت میں مقتدی کی خاموشی کو کم از کم احتیاطی حیثیت تو دے دیتی ہیں مثلاً حدیث «لَا تَفعَلُوا اِلَّا بِفَاتِحَةِ الکِتَابِ» [1] اور « وَ اِذَا قَرءَ فَأَنصِتُوا» وغیرہ۔ یعنی سورت فاتحہ کے علاوہ مقتدی خاموشی اختیار کرے۔ قرآن کی آیت ﴿وَ اِذَا قُرِئَ القُرانُ فَاستَمِعُوا لَهٗ وَانصِتُوا

[1] سنن أبی داؤد، بَابُ مَن تَرَكَ القِرَاءَةَ فِی صَلَاتِهٖ بِفَاتِحَةِ الكِتَابِ، رقم: ۸۲۳

لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ﴾ (الاعراف:۲۰٤) کا بھی یہی معنی ہے۔

پانچویں وجہ جو حقیقت میں فتویٰ میں مذکور حضرت شیخ الکل میاں صاحب کے اصول (قول وفعل) کی صحیح تعبیر ہے۔ پیغمبر تمام افرادِ امت کے لیے دستور العمل ہوتا ہے، جب تک حدیث مرفوع میں ہی تخصیص ثابت نہ ہو۔ وہ یہ کہ نبی ﷺ کی اتباع صرف اس معنی میں جمیع افرادِ امت کے لیے عام ہے۔ جب فرد کی حالت بھی وہی ہو، یعنی آپ نے اگر کوئی عمل قاری کی حیثیت سے کیا ہے، تو یہ امت کے سب قاریوں کے لیے ہو گا۔ علماءِ اصول نے عموماً فعل اور ''العبرۃ بعموم اللفظ" (عموم لفظ کے معتبر ہونے) کی مباحث میں اس نکتہ کی وضاحت کی ہے۔ مثلاً قرآن کی آیت ﴿وَ اِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ﴾(الاعراف:۲۰٤) سے کوئی شخص یہ عمومی حکم نکالے کہ نماز سے باہر ایک شخص قرآن کی تلاوت کر رہا ہو، تو اس کے قریب دوسرے تلاوت کرنے والے سب خاموش ہو جائیں، تو یہ عموم غلط ہو گا۔

ہمارا خیال ہے کہ مدیر اعلیٰ موصوف بھی اس حکم کو مقتدی اور عام سامع تک نہیں سمجھتے ہوں گے۔ اس روشنی میں ہماری ترجیحی رائے پر بھی غور فرمائیں، کہ ہماری احتیاط کتنا وزن رکھتی ہے۔

اب ہم دوسرے نکتہ پر توجہ دلانا مناسب سمجھتے ہیں۔ جماعت اہلِ حدیث پاک و ہند میں حضرت شیخ الکل اور حضرت الاستاذ محدث روپڑی وغیرہ بزرگوں کی مجاہدانہ سرگرمیوں کا ثمر ہے۔ ان بزرگوں کی کتاب وسنت کے احیاء اور تقلید سے اجتناب کے لیے کامیاب تحریک کے امتیازات آہستہ آہستہ پسِ پشت ڈالے جا رہے ہیں۔ ان بزرگوں نے تو ''مذاہب اربعہ'' کے مذہبی تعصب سے نجات دلائی تھی۔ لیکن ہم لوگ ان کی تقلید کے درپے ہو کر پانچواں تقلیدی مذہب اختیار کر رہے ہیں۔ اور آج کل زور اس بات پر دیا جاتا ہے، کہ ہم ان بزرگوں کے ہر جزوی مسئلہ کو بھی تسلیم کریں۔ حالانکہ اہلِ حدیث کا مسلک چند فروعی مسائل کی مخصوص تعبیر نہیں ہے۔ بلکہ اہلِ حدیث کتاب وسنت کی سلفی نہج پر فہم وتعبیر کا نام ہے۔ کسی مخصوص مسئلہ میں اہلِ حدیث کی دو یا زیادہ آراء سے مسلک اہلِ حدیث پر کوئی زَد نہیں پڑتی۔ اس لیے ہم نے بھی پیش آمدہ مسئلہ میں کوئی سخت رویہ اختیار نہیں کیا تھا۔ بلکہ استحباب کے دو پہلوؤں میں سے ایک کو اولیٰ قرار دیا تھا۔ یعنی قرآنی آیات کا جواب صرف استحبابی مسئلہ ہے۔ قاری کے جواب کے حق تک تو ہم بھی مستحب سمجھتے ہیں۔ لیکن سامع کے لیے ضعف احادیث کی وجہ سے جواب کو احتیاط کے منافی سمجھتے ہیں۔ بہت سے ائمہ نے اس حکم کو مزید محدود کیا ہے۔ بعض تو اس کے لیے صرف نفل نماز کی شرط لگاتے ہیں اور بعض صرف منفرد کے لیے جائز سمجھتے ہیں۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو! المغنی لابن قدامہ جلد اوّل ص:۵۵۰، سبل السلام جلد

اول،ص:۲۸۶،وغیرہ۔ (اہلِ حدیث، الاسلام، الاعتصام)

مولانا محمد عطاء اللہ صاحب حنیف کا تبصرہ

اس سلسلے میں ہمیں دوگزارشات کرنی ہیں۔ اوّل حدیث ضعیف کے سلسلے میں،وہ یہ کہ فاضل مضمون نگار کی حدیثِ ضعیف کے متعلق بحث سے معلوم ہوتا ہے، کہ حدیث ضعیف مطلقاً ناقابلِ اعتبار ہے۔ لیکن یہ اطلاق محلِ نظر ہے۔ ہم موصوف کو حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کے اس فیصلے کی طرف توجہ دلائیں گے، کہ انھوں نے تین شرطوں کے ساتھ مشروط کیا ہے۔ ''تدریب الراوی'' وغیرہ میں ہے:

« ذَكَرَ شَيخُ الِاسلَامِ ثَلَاثَةَ شُرُوطٍ . اَحَدُهَا: اَن يَكُونَ الضُّعفُ غَيرَ شَدِيدٍ. فَيَخرُجُ مِنَ الفَردِ مِنَ الكَذَّابِينَ، وَالمُتَّهِمِينَ بِالكِذبِ، وَ مَن فَحشَ غَلَطُهُ. نَقَلَ العَلَائِی الاتِّفَاقَ عَلَيهِ. الثَّانِي: يَندَرِجَ تَحتَ اَصلٍ مَعمُولٍ بِهِ. الثَّالِثُ: اَن لَّا يَعتَقِدَ عِندَ العَمَلِ بِهِ ثُبُوتَهُ ، بَل يَعتَقِدِ الِاحتِيَاطَ »[1]

یعنی شیخ الاسلام (حافظ ابن حجر رحمہ اللہ) نے حدیث ضعیف کے لیے تین شرطیں ذکر کی ہیں۔

(۱)ضعف شدید قسم کا نہ ہو،یعنی راوی کذاب یا متہم بالکذب اور خطائے فاحش کا مرتکب نہ ہو۔ اگر کسی روایت میں اس انداز کا راوی ہو گا،تو یہ ضعفِ شدید ہو گا،جس کی وجہ سے روایت پایۂ اعتبار سے ساقط ہو جائے گی۔ (۲) بیان کردہ روایت کی کوئی ایسی اصل (بنیاد) موجود ہو جو معمول بہ ہو(۳)عمل کرتے وقت روایت کے ثبوت کا اعتقاد نہ رکھے، بلکہ احتیاط کے طور پر اس پر عمل کو جائز سمجھے۔

تیسری شرط کا مطلب یہ ہے، کہ اگر حدیث ضعیف میں مذکور عمل کی فضیلت کی کوئی اصل صحیح بھی موجود ہو، تو ایسی ضعیف قابلِ عمل ہو سکتی ہے اور ہم سمجھتے ہیں کہ فاضل موصوف کے استاذ علامہ ناصر الدین البانی (رحمہ اللہ) جو ضعیف احادیث کے معاملہ میں کافی متشدد بتائے جاتے ہیں، اس توجیہ سے شاید ان کو بھی انکار نہ ہو۔ جیسا کہ شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کا بھی رجحان اسی طرف ہے۔ فاضل تنقید نگار نے حضرت الامام کی جس عبارت کا ایک ٹکڑا نقل کیا ہے۔ وہ عبارت یہ ہے۔ (یعنی ایک طویل بحث کے سلسلے میں)

« لٰكِن أَحمَدَ بنَ حَنبَلٍ وَغَيرَهُ مِنَ العُلَمَاءِ جَوَّزُوا اَن يُروِی فِي فَضَائِلِ الأَعمَالِ مَا لَم يُعلَم أَنَّهُ ثَابِتٌ اِذَا لَم يُعلَم اَنَّهُ كَذِبٌ. وَ ذٰلِكَ أَن العَمَلَ اِذَا عُلِمَ أَنَّهُ مَشرُوعٌ

[1] تدریب الراوی، ص:۱۹۶، طبع مدینة منورة:۱۹۵۹ء

بِدَلِيلٍ شَرعِيٍ وَ رُوِيَ فِي فَضلِهِ حَدِيثٌ لَا يُعلَمُ أَنَّهُ كَذِبٌ . جَازَ اَن يَكُونَ الثَّوَابُ حَقًا . وَ لَم يَقُل أَحَدٌ مِنَ الأَئِمَّةِ أَنَّهُ يَجُوزُ أَن يَجعَلَ الشَّئَى وَاجِبًا، أَو مُستَحِبًّا بِحَدِيثٍ ضَعِيفٍ. وَ مَن قَالَ هٰذَا، فقد خَالَفَ الِاجمَاعَ . وَهٰذَا كَمَا أَنَّهُ لَا يَجُوزُ أن يُحَرَّمَ شَيءٌ اِلَّا بِدَلِيلٍ شَرعِيٍ لٰكِن اِذَا عُلِمَ تَحرِيمُهُ، وَ رُوِيَ حَدِيثٌ فِي وَعِيدِ الفَاعِلِ لَهُ. وَ لَم يُعلَم انه كذب جاز ان يرويه فيجوز ان يروى فى الترغيب و التَّرهِيبِ، مَا لم يُعلَم اَنَّهُ كَذِبٌ اِلٰى اٰخِرِ مَا قَالَ » [1]

دوسری بات زیر بحث مسئلہ کے متعلق ہے۔سو اوّلاً ہمارے ہاں اس رواج کا، کہ مقتدی بلند آواز سے یہ ''جوابات'' دیتے ہیں، کوئی جواز معلوم نہیں ہوتا۔ ثانیاً مولانا عبدالرحمٰن مبارکپوری نے ''تحفۃ الاحوذی'' (ص: ۲۱۵، ج:۴) میں زیر حدیث متعلقہ جواب آیت ''سورہ والتین'' فرمایا ہے:

« وَالحديث يَدُلُّ عَلٰى اَن مَن يَّقرَأُ هٰذِهِ الأيَاتِ يُستَحَبُّ لَهُ، اَن يَّقُولَ تِلكَ الكَلِمَات سَوَاءٌ كَانَ فِي الصَّلٰوةِ اَو خَارِجِهَا. وَ اَمَّا قَولُهَا لِلمُقتَدِى خَلفَ الِامَامِ فَلَم اَذِنٌ عَلٰى حَدِيثٍ يَدُلُّ عَلَيهِ . » اِنتَهٰى

یعنی اس حدیث سے یہ تو معلوم ہوتا ہے کہ قاری کا ﴿أَلَيسَ اللّٰهُ بِأَحكَمِ الحَاكِمِينَ﴾ (التین:۸) کے بعد «بَلٰى وَ اَنَا عَلٰى ذَالِكَ مِنَ الشّٰهِدِينَ» کہنا مستحب ہے۔ وہ قاری نماز کے اندر ہو یا نہ ہو۔

لیکن امام کے پیچھے مقتدی کا کہنا جہاں تک مجھے علم ہے، کسی حدیث میں نہیں آیا ہے۔ مولانا عبید اللہ صاحب مبارکپوری مدظلہ کا بھی فیصلہ یہی ہے:

« وَالحَدِيثُ يَدُلُّ عَلٰى اَن مَن يَّقرَءُ هٰذِهِ الأيَاتِ يُستَحَبُّ لَهٗ ، اَن يَّقُولَ تِلكَ الكَلِمَاتِ سَوَاءٌ كَانَ فِي الصَّلٰوةِ اَو خَارِجِهَا. وَ اَمَّا قَولُهَا لِلسَّامِعِ المُقتَدِى، اَو غير المُقتَدِى فَلَم اَقِف عَلٰى حَدِيثٍ مَرفُوعٍ صَرِيحٍ يَدُلُّ عَلٰى ذٰلِكَ » الخ [2]

رہی وہ بات جو مرعاۃ میں متاخرین شافعی فقہاء سے نقل کی گئی ہے تو اس کی حیثیت نکتہ آفرینی سے زیادہ نہیں معلوم ہوتی۔ ھذا ما عندنا واللہ اعلم (ہفت روزہ الاعتصام، ص: ۲۷/ دسمبر ۱۹۷۰ء)

---

① التوسل، ص: ۸۴، ۸۵

② مرعاۃ المفاتیح، ص: ۶۸، ص: ۶۲۸۔ جلد اوّل طبع المکتبۃ السلفیہ لاھور

مولانا عطا اللہ حنیف بھوجیانی رحمہ اللہ کے تبصرے پر جوابِ تبصرہ

(مولانا حافظ ثناء اللہ خاں صاحب)

ضعیف خبر اجماعِ امت کی رُو سے ناقابلِ اعتبار ہے۔ میں نے مؤقر جریدہ اہلِ حدیث لاہور مجریہ ۲۰/ اکتوبر ۱۹۷۸ء میں بعض قرآنی آیات کے جواب دینے کے مسئلہ پر قاری کے لیے اس کا استحباب صحیح حدیث سے ثابت کیا تھا اور اس کے ضمن میں سامع کے لیے وارد روایات کا ضعف بھی بیان کیا تھا۔ آخر میں اپنی ترجیحی رائے میں یہ اظہارِ خیال کیا تھا، کہ سامع کے لیے جواب نہ دینے میں احتیاط ہے۔ کیونکہ اس بارے میں احادیث ثابت نہیں ہیں۔ اس فتوے کی اشاعت کے لیے مدیرِ اعلیٰ ''اہلِ حدیث'' نے اپنی مخالفانہ رائے کے لیے یہ اصول پیش کیا تھا کہ ''ضعیف حدیثوں سے وجوب تو نہیں استحباب بہرحال ثابت ہو جاتا ہے۔'' جس پر میں نے فروعی مسائل میں اہلِ حدیث کے طرزِ فکر و عمل کی وضاحت کے لیے تبصرہ مناسب سمجھا اور اس اصولی بحث پر اپنا آرٹیکل اشاعت کے لیے مختلف رسائل کو بھیجا۔

ہفت روزہ ''الاسلام'' گوجرانوالہ نے اسے بعینہٖ شائع کیا اور ہفت روزہ ''الاعتصام'' لاہور نے بھی عنوان تبدیل کر کے اس کی اشاعت کی۔ ہم واجب الاحترام حضرت مولانا عطاء اللہ صاحب حنیف کے انتہائی شکر گزار ہیں، کہ انھوں نے اس پر اپنی طرف سے ملاحظات بھی پیش فرمائے، اور نفسِ مسئلہ کی نہ صرف پُرزور تائید کی، بلکہ اس سلسلہ میں جماعت اہلِ حدیث کے دو مایہ ناز بزرگوں کے تائیدی کلمات بھی نقل فرمائے۔ اگر صرف فتویٰ کی تائید ہمارا مقصود ہوتی تو ہمارے لیے حضرت مولانا عطاء اللہ صاحب حنیف جیسے بزرگ کی اس مسئلہ پر حتمی رائے کافی تھی، جو ہمارے لیے موقف سے بڑھ کر تائید ہے، لیکن ہمیں یہ یقین نہیں آرہا کہ محترم موصوف اہلِ حدیث مکتبِ فکر کے امتیازی اصولی مسئلہ کے بارے میں محدثین کبار سے اختلاف رائے فرما سکتے ہیں۔ کیونکہ زیرِ بحث مسئلہ کی تائید کے ساتھ ہی ہمارے اٹھائے ہوئے اصولی مسئلہ پر انھوں نے تعاقب فرمایا ہے۔ چنانچہ موصوف نے اوّلاً موضوعِ بحث کو کچھ بدل دیا ہے۔ ہمارے زیرِ نظر صرف یہ جائزہ لینا تھا (کہ ضعیف حدیث سے وجوب تو نہیں استحباب بہرحال ثابت ہوتا ہے) اہلِ حدیث کا اندازِ فکر ہے یا نہیں! لیکن محترم موصوف اس موضوع کو بدل کر فرماتے ہیں: کہ راقم (ثناء اللہ) کے نزدیک حدیثِ ضعیف مطلقاً ناقابلِ اعتبار ہے۔ لیکن مولانا موصوف کی رائے میں یہ اطلاق محلِ نظر ہے۔ چونکہ ہم پاکستان میں محدثین کا طرزِ عمل و فکر کا انحطاط دیکھ رہے ہیں۔ اس لیے ضروری سمجھتے ہیں کہ اس کی وضاحت مناسب طور پر

ہو جائے لہٰذا ہم پہلے یہ واضح کریں گے کہ محققین ائمہ حدیث شرعی احکام کے ثبوت میں ضعیف حدیث کا اعتبار نہیں کرتے۔

چونکہ استحباب پانچ شرعی تکلیفی احکام میں سے ایک حکم ہے۔لہٰذا یہ کسی ضعیف خبر سے ثابت نہیں ہوتا۔ پھر یہ بتائیں گے کہ جن ائمہ حدیث نے ضعیف حدیث کی روایت یا اس پر عمل کے لیے چند شروط لگائی ہیں، ان کا اصل مقصد اور ماحصل کیا ہے اور ہم کس طرح آج انحطاطِ علمی کے دور میں ان شروط کا اہتمام نہ رکھ سکنے کی وجہ سے حدیث کے سلسلہ میں نہ صرف غث وسمین کی تمیز ختم ہوگئی ہے۔ بلکہ لوگ ہر طرح کی ضعیف خبر پر عمل سے بڑھ کر اسے عقیدہ میں بھی قابلِ استدلال ٹھہراتے ہیں۔

اب ہم پہلے نکتہ کو لیتے ہیں، کہ حدیثِ ضعیف سے کوئی حکم شرعی تکلیف (وجوب، استحباب، اباحت، کراہت، حرمت) ثابت نہیں ہوتا۔اس سلسلے میں ہم جہابذہ محدثین کے بعض اقوال اپنے پہلے تبصرہ میں پیش کر چکے ہیں۔ دیگر بے شمار تائیدات اور وضاحتوں سے علم حدیث کی کتابیں بھری پڑی ہیں۔ہم ان شاء اللہ کسی دوسری فرصت میں وہ تفصیلاً عرض کریں گے۔ فی الحال اس نکتہ پر امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ سے محدثین کا جو اجماع ہم نے نقل کیا تھا، اُس کے متعلق وضاحت کرنا کافی ہوگا۔کیونکہ محترم مولانا عطا اللہ صاحب حنیف نے غلطی سے یہی عبارت ضعیف حدیث کے قابلِ اعتبار ہونے کے لیے پیش کردی ہے، اور اس عبارت کا کچھ زیادہ حصہ نقل فرمایا ہے، کہ شاید ضعیف حدیث سے استحباب کے لیے گنجائش نکل سکے۔لیکن اصل رائے جس سے ضعیف حدیث کے ناقابلِ اعتبار ہونے کا حتمی فیصلہ ہوتا ہے، وہ چھوڑ دی ہے۔ لہٰذا اب ہم عبارت کو وہاں سے شروع کرتے ہیں، عبارت یوں ہے:

« وَ لَا یَجُوزُ اَن یُّعتَمَدَ فِی الشَّرِیعَةِ عَلَی الاَحَادِیث الضَّعِیفَةِ الَّتِی لَیسَت صَحِیحَةً، وَ لَا حَسَنَةً، لٰکِن اَحمَدُ بنَ حَنبَلٍ رَحِمَهُ اللّٰهُ، وَ غَیرَهٗ مِنَ العُلَمَاءِ » ......الخ (1)

مولانا محترم نے ترجمہ نہیں دیا۔لہٰذا ہم تفہیم کے لیے عبارت مکمل طور پر نقل کیے دیتے ہیں، تاکہ یہ واضح ہو جائے کہ محدثین کا اتفاق اور اجماع کیا ہے اور اختلافی نکتہ کیا ہے؟

''شریعت میں صحیح اور حسن احادیث کے علاوہ ضعیف پر اعتماد جائز نہیں، لیکن احمد بن حنبل رحمہ اللہ وغیرہ بعض علماء نے اعمال کی فضیلت کے ذکر میں بعض ایسی روایات کے صرف نقل کی اجازت دی ہے، جن کے صحت کے درجہ تک پہنچنے کا علم نہیں ہوسکا، بشرطیکہ ان کا جھوٹ بھی نامعلوم ہو،

(1) التوسل، ص: ۸٤، ۸٥

وجہ یہ ہے کہ جب اصل عمل تو صحیح دلائل سے مشروع ہو اور اس مشروع عمل کی فضیلت کے بارے میں ایسی حدیث (خفیف، ضعیف) ذکر کر دی گئی، جس کا جھوٹ ہونا معلوم نہیں تو (نفس عمل) مشروع ہونے کی بناء پر ثواب تو درست ہے (البتہ ضعیف حدیث سے ثواب کی کیفیت یا کمیت کا تعلق ہی باقی رہ جائے گا، جو اسرائیلیات کے درجہ کی بات ہو گی۔ ظاہر ہے کہ جب اسرائیلی روایات شرعِ محمدی کے خلاف نہ ہوں، تو وعظ و نصیحت میں ان کا ذکر جائز ہے۔لیکن مسائل میں ان کا کسی درجہ اعتبار نہیں) فرماتے ہیں: کہ کوئی امام (بشمول احمد بن حنبل رحمہ اللہ وغیرہ) یہ نہیں کہتا کہ ضعیف احادیث کا اعتبار کرکے کوئی بات واجب یا مستحب قرار دینی جائز ہے اور جو شخص (ضعیف حدیث کے کسی درجہ اعتبار کی) یہ بات کرتا ہے، وہ اجماعِ امت کی مخالفت کرتا ہے (خطوط وحدانی میں مذکور باتیں بھی ابن تیمیہ رحمہ اللہ کی اگلی عبارت کا مفہوم ہیں)

متذکرہ بالا عبارت سے حسبِ ذیل باتیں حاصل ہوتی ہیں۔

۱۔ صحیح اور حسن حدیث کے علاوہ ضعیف احادیث پر اعتبار جائز نہیں۔

۲۔ پوری امت اس بات پر اجماع کر چکی ہے، کہ ضعیف حدیث سے وجوب یا استحباب پر استدلال جائز نہیں، اور ائمہ سے اس کا کوئی بھی قائل نہیں۔

۳۔ محدثین کے نزدیک معرض استدلال اور روایت میں ضعیف احادیث کا اعتبار نہیں لیکن احمد بن حنبل رحمہ اللہ وغیرہ بعض علماء چند شروط سے فضائلِ اعمال میں ان کی صرف روایت جائز سمجھتے ہیں۔

لیکن روایتِ حدیث کے بارے میں بھی محدثین کا مسلک صحیح مسلم کے ''مقدمہ'' سے ملاحظہ فرمایئے۔

حافظ ابن رجب حنبلی رحمہ اللہ شرح ترمذی (ق:۳/۱۱۳) میں فرماتے ہیں:

«وَ ظَاهِرُ مَا ذَكَرَهُ مُسلِمٌ (يَعنِي الصَّحِيح) يَقتَضِي اَنَّهُ لَا تُروٰى اَحَادِيث التَّرغِيب اِلَّا عَمَّن تُروٰى عَنهُ الاَحكَامُ.»

امام مسلم رحمہ اللہ نے اپنی ''صحیح'' کے مقدمہ میں ظاہراً یہ مسلک بیان کیا ہے، کہ ترغیب وترہیب (فضائلِ اعمال) میں بھی صرف وہ احادیث روایت کی جائیں جو احکام میں روایت کی جاتی ہیں۔ یعنی محدثین کا اختلاف ضعیف حدیث کی صرف روایت میں ہے۔ اس کے اعتبار نہ کرنے پر سب متفق ہیں۔ امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ وغیرہ کا بعض اعمال میں تساہل روایت کی حد تک ہے۔

غور فرمایئے! اس دور میں جب کہ احادیث کی تدوین مکمل نہیں ہوئی تھی۔ اگر احمد بن حنبل رحمہ اللہ وغیرہ

بعض شرائط کے تحت ضعیف احادیث کی روایت بھی روا نہ رکھتے، تو آج ہم بہت سی ایسی ضعیف روایات سے محروم رہ جاتے جو شواہد اور توابع کی بناء پر مفید ہوتیں۔ خصوصاً جب کہ حدیثِ حسن بھی اس دور میں ضعیف کی قسم شمار ہوتی تھی، حالانکہ حسن قابلِ اعتماد ہے۔ یہ وضاحت ہم پہلے تبصرہ میں بھی کر چکے ہیں۔

محدثین کا اختلاف بیان کرنے کے ساتھ مناسب ہوگا کہ یہ بھی بیان کر دیا جائے کہ ضعیف سے استحباب پر استدلال کن لوگوں کا مسلک ہے اور اس بدعت کی ایجاد کا باعث کیا ہے؟

ہم پہلے ابن تیمیہ رحمہ اللہ سے یہ نقل کر چکے ہیں، کہ پوری امت کا ضعیف حدیث کے ناقابلِ اعتبار ہونے پر اجماع ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے، کہ اہل الحدیث کے علاوہ اہل الرائے بھی ضعیف حدیث کو نا قابلِ اعتبار سمجھتے ہیں، لیکن دورِ تقلید و انحطاط میں جب مسلک کو ضعیف احادیث سے تائید دینے کی جزئی صورتیں پیش آئیں، تو متعصبین نے بعض اصول ایجاد کیے جن میں سے ایک یہ تھا، کہ ضعیف حدیث کے مطابق ان کے امام کا عمل مل جائے تو ایسی حدیث قابلِ عمل سمجھی جائے گی۔ پھر جب اس اصول کا استعمال معرضِ استدلال میں ہوا تو اُس نے یہ شکل اختیار کی کہ ضعیف حدیث سے استحباب ثابت ہو جاتا ہے۔ یہ دونوں باتیں بعض متاخرین اہل الرائے کی کتابوں میں ملتی ہیں۔ اگرچہ ان کی تائید کے لیے انھوں نے متقدمین اہل الرائے یا بعض محدثین سے حسبِ منشاء استنباطات کی کوشش کی ہے، لیکن احمد بن حنبل رحمہ اللہ وغیرہ کے مسلک کی وضاحت ہم کر چکے ہیں۔

اب ہم بعض محدثین کی ضعیف احادیث کی روایت اور شرائط پر گزارشات پیش کرتے ہیں۔ چنانچہ اس سلسلہ میں حضرت مولانا عطاء اللہ صاحب حنیف نے ''تدریب الراوی'' کے حوالہ سے چند شروط کا ذکر کیا ہے۔ یہ شروط اگرچہ طالبانِ حدیث کے ہاں معروف ہیں، لیکن ان شروط سے ذہول بہت عام ہو چکا ہے۔ میں شیخ الاسلام حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کے کلام اور اس کے مفہوم کے لیے، اُن کے شاگردِ خاص حافظ سخاوی رحمہ اللہ کی کتاب ''القول البدیع فی الصلوٰۃ علی الحبیب الشفیع''، ص:۲۵۸ طبع مدینہ منورہ، کے حوالہ سے نقل کرنا مناسب سمجھتا ہوں:

« وَ قَد سَمِعتُ شَیخَنَا مِرَارًا. یَقُولُ: وَ کَتَبَهُ لِی بِخَطِّ : اَنَّ شَرَائِطَ العَمَلِ بِالضَّعِیفِ ثَلَاثَةٌ : اَلاَوَّلُ متفق عَلَیهِ، اَن یَّکُونَ الضَّعفُ غَیرَ شَدِیدٍ فَیَخرُجُ مِنَ الفَردِ مِنَ الکَذَّابِینَ، وَالمُتَّهَمِینَ بِالکِذبِ ، وَ فُحش غَلَط. الثَّانی اَن یَّکُونَ مُندرجا تحت اصل عام فَیَخرُجُ مَا یَختَرِعُ بِحَیثُ لَا یَکُونُ لَهُ أَصلٌ صَحِیحًا. الثالث: ان لا

يُعتقَدَ عِندَ العَمَلِ بِهِ ثُبُوتُهُ لِئَلَّا يُنسَبَ إِلَى النَّبِيِّ ﷺ مَا لَم يَقُلْه .»

''ہم نے اپنے استاذ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ سے کئی بار سنا، اور انھوں نے مجھے اپنے ہاتھ سے لکھ کر دیا، کہ ضعیف حدیث پر عمل کے لیے تین شرطیں ہیں۔ پہلی جس پر اتفاق ہے، یہ ہے کہ ضعف شدید نہ ہو، تاکہ جھوٹوں اور جھوٹ کے ساتھ متہم، اور جن سے روایتِ حدیث میں بڑی غلطیاں ہوئیں، سے احتراز ہو جائے۔ دوسری یہ ہے، کہ وہ حدیث ایک عام اصل کے تحت ہو، تاکہ جس حدیث کا کوئی اصل صحیح ثابت نہ ہو۔ اس سے بچا جا سکے۔ تیسری شرط یہ ہے، کہ اس حدیث پر عمل کرتے وقت اس کے سنت ہونے کا عقیدہ نہ ہو۔ کیونکہ اس طرح رسول اللہ ﷺ کی طرف وہ بات منسوب ہو جائے گی، جو آپ ﷺ نے نہیں فرمائی۔''

ان شرائط کی علیحدہ علیحدہ تشریح بھی پیش خدمت ہے۔ پہلی شرط کا معنی یہ ہے، کہ ضعیف حدیث پر عمل کے لیے حدیث کی حالت کی واقفیت ضروری ہے، تاکہ شدید ضعف سے بچا جا سکے۔ اس شرط کو پیشِ نظر رکھ کر غور فرمایئے! کہ ہمارے ہاں آج وہ لوگ کتنی تعداد میں ہیں، جو احادیث کی صحت کے معیار کو سامنے رکھ کر گفتگو کر سکیں۔ [1]

خصوصاً احوالِ رواۃ کے سلسلہ میں جب مختلف ائمہ کی طرف سے جرح و تعدیل کا اختلاف ہوتا ہے، تو اس میں ترجیح دینا کتنا مشکل امر ہے۔ کجا یہ کہ راوی کی عدالت اور ضبط کی باریکیوں کو سامنے رکھ کر معیارِ حدیث کے متعلق کوئی پختہ رائے قائم کی جائے۔ ہم یہ نہیں کہتے، کہ یہ کام ناممکن ہے۔ لیکن یہ بات ماننی پڑے گی، کہ اس معیار کا فیصلہ کر سکنے والے بہت کم لوگ ہوں گے۔ نتیجتاً ضُعف شدید اور ضعفِ خفیف کا امتیاز مٹ جائے گا اور بیشتر دفعہ ضعفِ شدید نظر انداز کر دیا جائے گا۔

دوسری شرط کا معنی یہ ہے، کہ ضعیف حدیث میں مذکور مسئلہ کا اصل صحیح حدیث سے ثابت ہو۔ مثلاً کوئی عمل اصلاً تو صحیح حدیث سے مشروع ہے۔ لیکن اس پر ثواب کا ذکر ضعیف حدیث میں آیا ہو۔ غور فرمایئے! کہ بات عمل کی ہو رہی تھی اور عمل صحیح حدیث سے مشروع ہے۔ حالانکہ ثواب کا تعلق انسان سے نہیں، وہ اللہ کے

[1] ساتویں صدی ہجری کے امامِ حدیث حافظ ابن الصلاح رحمہ اللہ اس فن میں لوگوں کی کمزوری دیکھ کر تو یہ رائے رکھتے ہیں کہ اب کسی حدیث پر نئے سرے سے صحت اور ضُعف کی تحقیق مشکل ہے۔ اس لیے ہمیں متقدمین حدیث کی تصحیح و تضعیف پر اکتفاء کرنا چاہیے۔ یہاں سے کسی کو تقلید کا وہم نہ پڑے۔ کیونکہ واقعات کی تحقیق اور ان کی صحت وضُعف قریبی دور میں ممکن ہوتا ہے۔ لمبا عرصہ گزرنے کے بعد کسی واقعہ کی مستقل براہِ (براہِ راست) تحقیق بڑی مشکل ہوتی ہے۔ نیز تقلید کا تعلق درایتِ فقہی سے ہے روایت سے نہیں ہے۔ جیسا کہ علمائے امت نے وضاحت کی ہے۔

ہاتھ میں ہے۔ضعیف احادیث پر عمل سے کیا فرق پڑا؟ اصل عمل تو صحیح حدیث پر ہے۔ضعیف پر نہیں۔

تیسری شرط کا مطلب یہ ہے، کہ ضعفِ خفیف کے باوجود اس مسئلہ پر عمل کرتے وقت اس کے شرعی ہونے کا عقیدہ نہ رکھے، کیونکہ شرع کے ثبوت کے لیے رسول اللہ ﷺ سے نقلِ صحیح اور ثبوت ضروری ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مذکورہ بالا شرائط سے نتیجہ یہ نکلتا ہے، کہ صحیح حدیث کے علاوہ ضعیف پر عمل جائز نہیں۔ البتہ مخالف جانب کے لحاظ سے ایسا ممکن ہوگا'' کہ بعض ان ضعف والی احادیث پر جن میں ظاہراً ثواب کا ذکر ہے۔لیکن مسئلہ صحیح حدیث سے ثابت ہے۔ضعیف احادیث پر عمل کا وہم پڑے گا۔ حالانکہ وہاں اصل عمل صحیح حدیث پر ہوگا۔ ابن تیمیہ رحمہ اللہ کی جو عبارت پہلے گزر چکی ہے جس کے متعلق ہم نے وعدہ کیا تھا، کہ اس کی وضاحت ہم شروط کی بحث میں کریں گے۔ ابن تیمیہ رحمہ اللہ وہاں ایسی شروط کا لحاظ رکھ کر امام احمد رحمہ اللہ کی رائے کی وضاحت کر رہے ہیں۔لیکن ابن تیمیہ رحمہ اللہ کی رائے میں امام کے نزدیک ایسی شرائط کا تعلق روایتِ حدیث سے ہے عملِ حدیث سے نہیں۔ اس لیے روایتِ حدیث کی صورت میں ان شرائط کا لحاظ یا صرف صحیح حدیث پر عمل کی رائے رکھنا ایک ہی معنی رکھتا ہے۔

ہمارا دل چاہتا ہے، کہ محدثین کا طریق روایت اور روایت میں صحت وضعف کے اعتبار کے لحاظ سے ان کے عمل پر بحث کریں اور یہ بتائیں کہ وہ کسی نہ کسی انداز میں روایت کرتے وقت بھی صحت اور ضعف کی نشاندہی ضروری سمجھتے تھے۔لیکن اس کے لیے ایک مستقل مضمون کی ضرورت ہے۔ اس لیے ہم اس نکتہ کو چھوڑے دیتے ہیں۔ ہم اپنی گفتگو کو ختم کرنے سے پہلے اپنے استاذ شیخ ناصر الدین البانی، جن کے بارے میں حضرت مولانا عطا اللہ صاحب کو یہ غلط فہمی ہوگئی کہ وہ شروط بالا کی اس توجیہ سے اختلاف نہیں کریں گے کہ ضعیف حدیث قابلِ عمل ہوسکتی ہے، کے مسلک کی وضاحت ان کے کلام سے کیے دیتے ہیں۔ چنانچہ استاذِ محترم کی کلام بلفظہٖ ملاحظہ فرمائیے:

« و جُملةُ القول إِنَّنَا نَنصَحُ إِخوَانَنَا المُسلِمِينَ فِی مَشَارِقِ الْأَرضِ، وَ مَغَارِبِهَا أَن يَّدعُوا العَمَلَ بِالْأَحَادِيثِ الضَّعِيفَةِ مُطلَقًا. وَ أَن يُوَجِّهُوا هِمَّتَهُم إِلَى العَمَلِ بِمَا ثَبَتَ مِنهَا عَنِ النَّبِيِّ ﷺ . فَفِيهَا مَا يُغنِی عَنِ الضَّعِيفَةِ. وَ فِی ذٰلِكَ مُنجَاةٌ مِنَ الوُقُوعِ فِی الكَذِبِ عَلٰی رَسُولِ اللّٰهِ (ﷺ)، لِأَنَّنَا نَعرِفُ بِالتَّجرُبَةِ أَنَّ الَّذِينَ يُخَالِفُونَ فِی هٰذَا ، قَد وَقَعُوا فِی مَا ذَكَرنَا مِنَ الكَذِبِ ، لِأَنَّهُم يَعمَلُونَ بِكُلِّ مَا هَبَّ وَ دَبَّ مِنَ الحَدِيثِ . وَ قَد أَشَارَ (صَلَّی اللّٰهُ عَلَيهِ وَ سَلَّمَ) إِلٰی هٰذَا بِقَولِهٖ:

كَفٰى بِالمَرءِ كَذِبًا أَن يُحَدِّثَ بِكُلِّ مَا سَمِعَ . رَوَاه مسلم فى مقدمة صحيحه . وَ عَلَيهِ أَقُولُ: كَفٰى بِالمَرءِ ضَلَالًا أَن يَعمَلَ بِكُلِّ مَا سَمِعَ .»

ہم مشرق ومغرب میں اپنے مسلمان بھائیوں کو نصیحت کرتے ہیں، کہ وہ ضعیف احادیث پر عمل کو کلی طور پر ترک کردیں اور اپنی ہمتوں کو صرف انہی احادیث پر مرکوز کردیں، جو نبی علیہ السلام سے ثابت ہیں۔ ان میں وہ چیز موجود ہے جو ضعیف احادیث سے انسانوں کے لیے کافی ہو اور اس میں نجات ہو۔ چہ جائیکہ انسان رسول اللہ ﷺ پر جھوٹ کا ارتکاب کر بیٹھے، کیونکہ ہم تجربہ کی بناء پر جانتے ہیں کہ جو لوگ اس میں مخالفت کرتے ہیں، وہ کذب میں واقع ہوئے ہیں، کیونکہ وہ ہر قسم کی غث وسمین پر عمل کے عادی ہیں۔ رسول اللہ ﷺ اسی طرف اشارہ فرماتے ہیں، کہ انسان کے لیے یہی جھوٹ کافی ہے، کہ وہ ہر سنی بات بیان کردے اور میں کہتا ہوں۔ یہی گمراہی کافی ہے، کہ آدمی ہر سُنی بات پر عمل کرے۔

خلاصۂ کلام یہ ہے، کہ محققین علمائے امت اس بات پر متفق ہیں، کہ شریعت اور اس کی جزئیات خواہ وہ عملی ہوں یا فضائلِ اعمال ان کا اعتبار اسی صورت میں ہوگا جب وہ رسول اللہ ﷺ سے بہ نقلِ صحیح ثابت ہوں۔ اگر کوئی چیز آپ ﷺ سے ثابت نہ ہو یا اس کی نسبت آپ ﷺ کی طرف ضعیف ہو، تو اسے مشروع نہیں سمجھا جائے گا۔ کیونکہ یہ وعید بالفاظِ تواتر ثابت ہے: «مَن كَذَبَ عَلَيَّ مُتَعَمِّدًا فَلیَتَبَوَّأ مَقعَدَهٗ مِنَ النَّارِ»[1] یعنی جو شخص رسول اللہ ﷺ پر قصداً جھوٹ بولے۔ وہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنالے۔ آپ ﷺ پر جھوٹ کی ایک شکل یہ ہے، کہ کسی بات کے بارے میں آپ ﷺ کی نسبت اعتماد نہ ہو، کہ وہ آپ ﷺ ہی کا قول وفعل اور تقریر ہے اور وہ یقینی صیغوں سے آپ ﷺ کی طرف نسبت کی جائے۔

ضعیف حدیث کے بارے میں کوئی شخص یہ دعویٰ نہیں کرسکتا کہ وہ رسول اللہ ﷺ کی سنت ہے۔ لہٰذا اس کی اتباع کی صورت میں ظن مرجوح پر عمل لازم آئے گا۔ جبکہ اللہ تعالیٰ نے اس کی مذمت فرمائی ہے: ﴿إِن يَتَّبِعُونَ إِلَّا الظَّنَّ وَ إِنَّ الظَّنَّ لَا يُغنِي مِنَ الحَقِّ شَيئًا﴾(النجم:۲۸) (و اخر دعوانا ان الحمد لله رب العالمين)

سوال: کیا ﴿إِنَّ إِلَينَا إِيَابَهُم ثُمَّ إِنَّ عَلَينَا حِسَابَهُم﴾(الغاشية:۲۶) کے جواب میں « اَللّٰهُمَّ حَسِبنِي حِسَابًا يَّسِيرًا» کا ثبوت ہے اور اگر ہے تو صرف امام جواب دے یا مقتدی بھی شامل ہوں گے؟

[1] صحيح البخارى، بَابُ إِثمِ مَنْ كَذَبَ عَلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، رقم:۱۰۷

(جواب): مذکورہ بالا آیت کے جواب میں «اللّٰھُمَّ حَاسِبنِی ......»[1] پڑھنے کا ثبوت مجھے نہیں مل سکا۔ ہاں البتہ بعض روایات میں یہ بات ثابت ہے، کہ آپ ﷺ نے بعض نمازوں میں اس دُعا کو پڑھا ہے۔ لیکن محل کا تعین نہیں، کہ سورہ ''غاشیہ'' کے اختتام پر پڑھا ہو۔

(سوال) محافل قراءت میں قاری صاحبان تلاوت کرتے ہیں تو سامعین حضرات اونچی آواز سے اللہ اللہ کہہ کر قاری صاحب کو داد دیتے ہیں۔ قرآن وسنت کی رو سے اس کی کیا حیثیت ہے اور کہاں تک گنجائش ہے؟

(جواب) قاری کی تلاوت کے دوران اللہ، اللہ کہہ کر داد دینے کا شریعت میں کوئی ثبوت نہیں بلکہ یہ عمل نص قرآنی ﴿وَإِذَا قُرِءَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوا لَهُ وَأَنْصِتُوا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ﴾ (الاعراف:۲۰۴) ''اور جب قرآن پڑھا جائے تو توجہ سے سنا کرو اور خاموش رہا کرو تا کہ تم پر رحم کیا جائے۔'' کے خلاف ہے۔ حق بات یہ ہے کہ ایسے لوگوں کو معانی و مفاہیم سے ناواقفی کی بنا پر الفاظِ قرآن سے دراصل لذت وسرور حاصل ہی نہیں ہوتا بلکہ ان کی لطف اندوزی محض قاری کی نغمہ سرائی پر موقوف ہے اور وہ اس کی حسین وجمیل آواز پر مر مٹنے والے ہیں۔ اگرچہ تحسین صوت بھی مطلوب امر ہے۔

لیکن امام مناوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''قرآنی حروف کو ان کی حدود سے متجاوز کرنا حرام ہے''۔ پھر عامۃ الناس کی دلچسپی کا حال یہ ہے کہ اگر کوئی سادہ آواز میں قرآن پڑھتا ہے تو سننے کے لئے تیار نہیں ہوتے بلکہ نفرت کا اظہار کرتے ہیں جبکہ قرآن میں مؤمنوں کے اوصاف یوں بیان ہوئے ہیں: ﴿إِنَّمَا الْمُومِنُونَ الَّذِينَ إِذَا ذُكِرَ اللَّهُ وَجِلَت قُلُوبُهُمْ وَإِذَا تُلِيَت عَلَيْهِمْ ءايٰتُهُ زَادَتْهُم إِيمٰنًا﴾(الانفال:۲) ''مومن تو وہ ہیں، جب اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے تو ان کے دل ڈر جاتے ہیں اور جب انہیں اس کی آیتیں پڑھ کر سنائی جاتی ہیں تو ان کا ایمان اور بڑھ جاتا ہے۔''

نیز فرمایا: ﴿تَقْشَعِرُّ مِنْهُ جُلُودُ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ ثُمَّ تَلِيْنُ جُلُوْدُهُمْ وَقُلُوْبُهُمْ اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ ذٰلِكَ هُدَى اللّٰهِ يَهْدِىْ بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ هَادٍ﴾ (الزمر:۲۳)

''جو لوگ اپنے پروردگار سے ڈرتے ہیں، ان کے بدن کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں پھر ان کے بدن اور دل نرم (ہو کر) اللہ کی یاد کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں۔ یہی اللہ کی ہدایت ہے وہ اس سے جس کو چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے اور جس کو اللہ گمراہ کرے، اس کو کوئی ہدایت دینے والا نہیں۔''

پھر صحیح حدیث میں ہے، حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ میں نے نبی ﷺ کے سامنے قرآن

[1] مسند احمد، رقم:۲۴۲۱۵، صحیح ابن خزیمة، رقم:۸۴۹، المستدرك علی الصحیحین للحاکم، رقم:۱۹۰

کی تلاوت کی۔«فَالْتَفَتُّ إِلَيْهِ، فَإِذَا عَيْنَاهُ تَذْرِفَانِ» (متفق علیه)[1] ''ناگہانی میں نے نگاہ اٹھا کر دیکھا تو آپ کی دونوں آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔'' اس سے معلوم ہوا کہ قرآنی تاثیر کا تقاضا یہ ہے کہ اس کے اثرات انسان کے دل و دماغ پر ظاہر ہوں نہ کہ اللہ اللہ، کمان کمان، یا استاذ ہیہ ہیہ کہہ کر خانہ پری کی جائے، اس سے اجتناب انتہائی ضروری ہے۔[2]

سوال کیا قراء کرام کا اختتامِ تلاوت پر ''صدق الله العظیم'' قسم کے الفاظ کہنا جائز ہے؟

جواب قراءت کے اختتام پر صدق الله العظیم کہنا کتاب و سنت سے ثابت نہیں۔ صحیح بخاری میں حدیث ہے « مَنْ اَحدَثَ فِي اَمرِنَا هٰذَا مَا لَيسَ مِنهُ فَهُوَ رَدٌّ » [3] ''جو دین میں اضافہ کرے وہ مردود ہے۔''

پھر متعدد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی تلاوتوں کے تذکرے احادیث کی کتابوں میں مرقوم ہیں لیکن کسی ایک سے بھی یہ کلمات ثابت نہیں ہو سکے۔ اگر کوئی کہے قرآن میں ہے: (قُلْ صَدَقَ اللّٰهُ) تو اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ کا فرمان اپنی جگہ برحق ہے لیکن اس میں یہ کہاں ہے کہ جب تم تلاوت ختم کرو تو یہ کہو۔ ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی تلاوت سن کر آپ نے فرمایا: حَسْبُكَ تیرے لئے یہ کافی ہے۔ یہ نہیں فرمایا: صدق الله العظیم لہٰذا اس سے احتراز ضروری ہے۔

سوال اسی طرح جب قاری صاحب آیاتِ عذاب یا آیاتِ انعام تلاوت کرتا ہے تو کیا سامعین اس کا جواب دے سکتے ہیں۔ اگر دے سکتے ہیں تو سراً ہونا چاہئے یا جہراً۔ نیز حالتِ نماز میں اس کا کیا حکم ہے؟

جواب سامع یا مقتدی کا قاری کی تلاوت سے بعض آیات کا جواب دینا احادیثِ صحیحہ سے ثابت نہیں، البتہ قاری یا امام کے لئے ثابت ہے۔ چنانچہ صحیح مسلم میں حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے رات کی نماز کی کیفیت نقل کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ آپ جب کسی ایسی آیت سے گزرتے جس میں تسبیح کا ذکر ہوتا تو تسبیح کرتے اور جب سوال (والی آیت) سے گزرتے تو سوال کرتے اور جب تعوذ (والی آیت) سے گزرتے تو پناہ پکڑتے۔[4]

---

[1] صحیح البخاری، بَابُ قَوْلِ الْمُقْرِءِ لِلْقَارِءِ حَسْبُكَ، رقم: ۵۰۵۰

[2] السنن والمبتدعات: صفحہ ۲۱۹/ ۲۲۰

[3] صحیح البخاری بَابُ إِذَا اصطَلَحُوا عَلٰى صُلحِ جَورٍ فَالصُّلحُ مَردُودٌ، رقم: ۲۶۹۷

[4] صحیح مسلم، بَابُ اسْتِحْبَابِ تَطْوِيلِ الْقِرَاءَةِ فِي صَلَاةِ اللَّيْلِ، رقم: ۷۷۲، سنن النسائی، بَابُ تَسْوِيَةِ الْقِيَامِ وَالرُّكُوعِ، وَالْقِيَامِ بَعْدَ ...... الخ، رقم: ۱۶۶۴

عمیر بن سعید سے روایت ہے کہ حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے نمازِ جمعہ میں سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الاَعلَى (الاعلیٰ:۱)" پڑھنے پر سُبْحَانَ رَبِّيَ الْاَعْلىٰ کہا۔ بیہقی (۲/۳۱۱) مصنف عبدالرزاق (۲/۴۵۱) [1] اس اثر کی سند صحیح ہے۔ اسی طرح حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بھی اس موقع پر یہی کلمات کہنا بسندِ حسن ثابت ہے۔ [2] تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو القول المقبول فی تخریج و تعلیق صلوٰۃ الرسول ﷺ

اس موضوع پر عرصہ قبل ماہنامہ "محدث" میں ایک تفصیلی فتویٰ جواب در جواب شائع شدہ ہے جو ارباب ذوق کیلئے کافی مفید ہے۔ اس فتوی میں حافظ محمد ابراہیم کمیرپوری، سید نذیر حسین دہلوی کی آراء پر تعلیقات کے علاوہ مولانا عطاء اللہ حنیف کا تبصرہ بھی بڑی تفصیل سے موجود ہے۔ دیکھیے محدث: ج۹/عدد ا، صفحات ۳ تا ۲۳ بابت دسمبر ۱۹۷۸ء

امام کا مخصوص دنوں میں مخصوص سورتوں کی تلاوت کرنا اور مقتدی کا فاتحہ کے علاوہ دیگر سورتیں پڑھنا

نمازِ جمعہ میں نماز کی مسنون قراءت کی بجائے اس سورت کی آخری آیات تلاوت کرنا:

سوال: احادیث مبارکہ سے ثابت ہے کہ حضور اکرم ﷺ جمعرات کے دن عشاء کی نماز میں سورہ جمعہ اور سورہ منافقون، جمعہ کو صبح کی نماز میں سورہ سجدہ اور سورہ دہر اور نماز جمعہ میں سورہ اعلیٰ اور سورہ غاشیہ پڑھا کرتے تھے۔ چنانچہ یہ قرأت مسنونہ قرار پائی۔ اہلحدیث حضرات بہت پابندی کے ساتھ ان نمازوں میں "قرأت مسنونہ" کی تلاوت کا اہتمام کرتے ہیں مگر (کثیر منهم) "ان میں سے اکثر" ان سورتوں کو پورا پورا نہیں پڑھتے بلکہ آدھی آدھی یا آخری تین تین آیات ہی پر اکتفا کر کے سمجھتے ہیں کہ انھوں نے "قرأت مسنونہ" سے نمازیں ادا کر لی ہیں اور یہی تاثر مقتدی حضرات کو دیا جاتا ہے۔

دریافت طلب امر یہ ہے کہ اگر پوری پوری سورتیں نہ پڑھی جائیں تو کیا تب بھی "قرأت مسنونہ" ہی کہلائے گی یا بالفاظ دیگر کسی سنت ثابتہ میں (یعنی حضور اکرم ﷺ کے کسی قول یا فعل میں) اگر کچھ کمی بیشی کر

[1] مصنف عبدالرزاق، بَابُ الرَّجُلِ يَدْعُو وَيُسَمِّي فِي دُعَائِهِ، رقم: ۴۰۵۰، السنن الکبریٰ للبیهقی، بَابُ الْوُقُوفِ عِنْدَ آيَةِ الرَّحْمَةِ وَآيَةِ الْعَذَابِ وَآيَةِ التَّسْبِيحِ، رقم: ۳۶۹۴

[2] ایضاً

لی جائے تو کیا پھر بھی وہ سنت ثابتہ ہی کہلائے گی یا اس کا نام کچھ اور ہوگا۔ اگر اور ہوگا تو کیا ہوگا؟

(جواب) : قرأت مسنونہ کی تعمیل اس صورت میں ہوگی جب مکمل سورتوں کی تلاوت کی جائے۔ بعض آیات پر اکتفاء کرنے سے سنت ادا نہیں ہوگی، کیونکہ علی الاطلاق اسم سورت کا اطلاق کُل پر ہے۔ بعض پر نہیں۔ مثلاً کہا جائے، کہ فلاں نے ''سورہ فاتحہ'' کی تلاوت کی۔ اس کا مفہوم واضح ہے کہ مکمل سورت کی تلاوت کی۔ پھر نماز میں ''سورہ فاتحہ'' کی مشروعیت کے قائلین سب اس بات پر متفق ہیں، کہ مکمل سورت کا پڑھنا ضروری ہے، کیونکہ نام کا اطلاق کُل پر ہے۔ بعض پر نہیں۔

علامہ ابن قیم رحمہ اللہ قرأت مسنونہ پر بحث کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

« وَ أَمَّا الْجُمُعَةُ فَكَانَ يَقرَأُ فِيهَا بِسُورَةِ الْجُمُعَةِ ، وَالْمُنَافِقِينَ كَامِلَتَينِ، وَ سُورَةَ سَبِّح ، وَالغَاشِيَةَ. وَالِاقتِصَارُ عَلٰى قِرَاءَةِ أَوَاخِرِ السُّورَتَينِ مِن ﴿ يَاَيُّهَا الَّذِينَ ......﴾ إِلٰى آخِرِهَا فَلَم يَفعَلهُ قَطُّ. وَ هُوَ مُخَالِفٌ لِهَديِهِ الَّذِي كَانَ يُحَافِظُ عَلَيهِ. وَ أَمَّا قِرَائَةُ فِي الَأعيَادِ، فَتَارَةً كَانَ يَقرَأُ سُورَة (قٓ) وَ (اقتَرَبَت) كَامِلَتَينِ، وَ تَارَةً سُورَة«سَبِّح»، وَالغَاشِيَةِ» ، وَ هٰذَا هُوَ الهَديُ الَّذِي استَمَرَّ أَن لَقِيَ اللّٰهَ عَزَّوَجَلَّ، لَم يَنسَخهُ شَيءٌ وَ لِهٰذَا أَخَذَ بِهٖ خُلَفَاءُهُ الرَّاشِدُونَ مِن بَعدِهٖ» [1]

حاصل اس کا یہ ہے کہ نبی ﷺ نے جمعہ اور عیدین وغیرہ میں ساری زندگی مخصوص مکمل سورتوں کا اہتمام فرمایا۔ بعض آیات کو کافی نہیں سمجھا۔ بعد میں خلفاء راشدین نے بھی اسی طریقہ کار کو اپنایا۔

فرض یا سنت اگر چار رکعتیں ہوں تو آخری دو رکعتوں میں صرف فاتحہ پڑھنا:

(سوال) فرض یا سنت اگر چار رکعتیں ہوں تو کیا آخری دو رکعتوں میں صرف فاتحہ پڑھنی چاہیے یا کوئی مزید سورت بھی پہلی دو رکعتوں کی طرح ملا سکتا ہے۔

(جواب) فرضوں کی آخری دو رکعتوں میں بہتر ہے، کہ صرف ''سورۃ فاتحہ'' پر اکتفاء کیا جائے، جس طرح ''صحیح بخاری میں واضح ذکر ہے اور سورتیں ساتھ ملانے کا بھی جواز ہے، جس طرح کہ حضرت ابو سعید رضی اللہ عنہ وغیرہ کی روایات سے استدلال کیا گیا ہے۔ ملاحظہ ہو! ''بلوغ المرام'' اور نوافل سنتوں کی سب رکعتوں میں فاتحہ کے ساتھ سورتیں ملانے کا جواز ہے جس طرح کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی تہجد سے متعلقہ روایت سے مفہوم ہے:

« يُصَلِّي أَربَعًا، فَلَا تَسئَل عَن حُسنِهِنَّ ، وَ طُولِهِنَّ . ثُمَّ يُصَلِّي أَربَعًا. فَلَا تَسئَل

[1] زاد المعاد، ۱/۵۳، ۵۴

عَن حُسنِهِنَّ، وَ طُولِهِنَّ »[1]

سری اور جہری نمازوں میں سورۃ فاتحہ اور دیگر سورتوں کی قرأت:

سوال: شیخ الحدیث مولانا حافظ ثناء اللہ صاحب، امام ترمذی رحمہ اللہ اپنی جامع الترمذی کے «بَابُ مَا جَاءَ فِی تَرکِ القِرَاءَ ۃِ خَلفَ الاِمَامِ اِذَا جَھَرَ الاِمَامُ بِالقِرَاءَ ۃِ» کے حاشیہ میں یہ روایت لائے ہیں کہ:

''ہم سے اسحاق بن منصور انصاری نے انھوں نے معن سے انھوں نے مالک سے انھوں نے ابی نعیم وہب سے سنا، کہتے تھے کہ ''جس نے پڑھی ایک رکعت کہ نہ پڑھے اس میں سورۃ الفاتحہ تو اُس نے نماز ہی نہیں پڑھی مگر یہ کہ ہو پیچھے امام کے یہ حدیث حسن صحیح ہے۔ (جامع الترمذی مترجم، مسجد کے احکام، باب قرأت نہ کرنے کے بیان میں جب امام جہر کرتا ہو۔(۱/۱۵۵) ناشر محمد علی، کارخانہ اسلامی کتب خان محل دستگیر کالونی۔کراچی)

جب کہ ابن ماجہ میں مروی ہے، جابر بن عبد اللہ کہتے ہیں کہ ہم ظہر اور عصر کی نماز میں امام کے پیچھے پہلی دو رکعتوں میں سورۃ الفاتحہ اور ایک سورۃ پڑھتے تھے اور اخیر کی دو رکعتوں میں صرف سورۃ الفاتحہ پڑھتے تھے۔[2] اور علامہ سندھی حاشیہ میں حافظ ابو الحجاج المزی سے نقل کرتے ہیں کہ «ھٰذَا اِسنَادٌ صَحِیحٌ وَ رِجَالُہٗ ثِقَاتٌ» اور یہی روایت جزء القراءۃ بیہقی ء میں بھی موجود ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ ان دونوں روایتوں میں کس طرح تطبیق دی جا سکتی ہے؟ پہلی روایت کے بارے میں امام ترمذی کہتے ہیں کہ یہ حدیث حسن صحیح ہے اور دوسری روایت کے بارے میں جو ابن ماجہ اور جزء القراء بیہقی میں ہے۔علامہ سندھی کہتے ہیں:« ھٰذَا اِسنَادٌ صَحِیحٌ وَ رِجَالُہٗ ثِقَاتٌ» آپ ہمیں یہ بتائیں کہ دونوں روایتوں میں سے کس روایت کی سند میں ضعف ہے اور عام مسلمانوں کو کیسے بتائیں کہ جابر بن عبد اللہ کا قرأت خلف الامام کے متعلق موقف کیا تھا؟

جواب: ان دونوں روایات کے درمیان وجہ جمع یوں ہے، کہ ممکن ہے حضرت جابر رضی اللہ عنہ کا مسلک یہ ہو، کہ امام کی جہری قرأت کی صورت میں مقتدی قرأت نہ کرے۔جس طرح کئی ایک اہلِ علم اس بات کے قائل ہیں۔ البتہ سری میں مقتدی کو قرأت کرنی چاہیے اور یہ بھی ممکن ہے کہ ان کے نزدیک اس حالت کا تعلق

---

[1] صحیح البخاری،بَابُ فَضلِ مَن قَامَ رَمَضَانَ، رقم:۲۰۱۳، صحیح مسلم،بَابُ صَلَاۃِ اللَّیلِ، وَعَدَدِ رَکَعَاتِ النَّبِیِّ ﷺ فِی اللَّیلِ......الخ ،رقم:۷۳۸

[2] سنن ابن ماجہ، کتاب اقامۃ الصلوٰۃ والسنۃ فیھا، بَابُ الْقِرَاءَ ۃِ خَلْفَ الْإِمَامِ، رقم:۸۴۳

مُدرِکِ رکوع سے ہو، کہ اس حالت میں ملنے والے سے قرأت ''فاتحہ'' ساقط ہو جاتی ہے۔ امام اسحاق بن ابراہیم منظلی نے یہی توجیہ کی ہے، جس طرح کہ امام ابن خزیمہ نے ان سے بیان کیا ہے۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو! کتاب القراءۃ بیہقی۔

حضرت جابر رضی اللہ عنہ کے موقف کی وضاحت ہو چکی اور عام کم علم مسلمانوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرامین سے آگاہ کرنا چاہیے، جن کی اقتداء کا حکم ربانی ہے۔ بے شمار ایسی احادیث موجود ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے، کہ سری اور جہری نمازوں میں سورۃ فاتحہ کی قرأت ضروری ہے۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو! تحقیق الکلام، علامہ عبدالرحمٰن مبارکپوری۔

چار رکعت فرض نماز میں امام کے پیچھے سورت فاتحہ کے علاوہ کوئی سورت پڑھنا:

سوال: کیا چار رکعت فرض نماز میں امام کے پیچھے سورت فاتحہ کے علاوہ بھی کوئی سورت پڑھ سکتا ہے یا نہیں؟ یعنی آخری دو رکعت میں۔

جواب: چار رکعتی فرض نماز کی پچھلی دو رکعتوں میں سورۃ الفاتحہ کے ساتھ سورۃ ملائی جا سکتی ہے۔ صحیح مسلم میں حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی روایت میں پچھلی دو رکعتوں کا اندازہ پندرہ پندرہ آیتیں بیان ہوا ہے۔[1] جس سے ظاہر ہے کہ یہ اندازہ فاتحہ کے ساتھ دیگر آیات کو ملا کر ہے۔ ورنہ فاتحہ کی تو صرف سات آیتیں ہیں۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو! ''مرعاۃ المفاتیح'' (۱/۶۰۰۔۶۰۲)

ظہر اور عصر کی نمازوں میں مقتدی کا فاتحہ کے بعد سورت پڑھنا:

سوال: ظہر اور عصر کی نمازوں میں امام قرأت نہیں کرتا بلکہ خاموشی سے امامت کرتا ہے ان نمازوں میں مقتدیوں کو سورہ فاتحہ کے بعد کوئی سورت پڑھنی چاہیے یا کہ سورۃ فاتحہ کے بعد خاموش کھڑے ہو کر امام کے رکوع جانے کا انتظار کرنا چاہیے؟

جواب: سرّی نمازوں میں ''فاتحہ'' کے علاوہ قرأت کے اضافہ کا جواز ہے۔ صحیح مسلم میں حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی روایت واضح طور پر اس کی دلیل ہے۔[2]

اور مؤطا امام مالک میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا فعل بایں الفاظ مروی ہے:

---

[1] صحیح مسلم، بَابُ الْقِرَاءَةِ فِي الظُّهْرِ وَالْعَصْرِ، رقم: ٤٥٢

[2] مشکوٰۃ مع المرعاۃ: ١/٦٠٢

« كَانَ يَقرَأُ فِي الاَربَعِ جَمِيعًا فِي كُلِّ رَكعَةٍ بِاُمِّ القُراٰنِ ، وَ سُورَةٍ مِّنَ القُراٰنِ. »[1]

یعنی ''ابن عمر رضی اللہ عنہما چار رکعتی نماز کی ہر رکعت میں فاتحہ اور مزید کوئی سورت پڑھتے تھے۔''

ظاہر یہ ہے کہ یہ معاملہ فرائض کا ہے، جس طرح کہ امام محمد رحمہ اللہ کی روایت میں تصریح موجود ہے:

« فِي الاَربَعِ جَمِيعًا مِنَ الظُّهرِ ، وَالعَصرِ »

اور صاحب ''المرعاۃ'' فرماتے ہیں:

« فَالظَّاهِرُ اَنَّهُ يَجُوزُ الزِّيَادَةُ عَلَى الفَاتِحَةِ فِي الاُخرَيَينِ مِن غَيرِ كَرَاهَةٍ » (۱/۶۰۰)

نیز امام شافعی رحمہ اللہ جدید قول کے مطابق اور امام مالک و احمد رحمہما اللہ نے بھی جواز کو اختیار کیا ہے۔

عشاء کی نماز میں امام کا لمبی سورتوں کا ہر روز تلاوت کرنا:

سوال: عشاء کی نماز میں امام کا لمبی سورتوں کا ہر روز تلاوت کرنا کیا حضور علیہ السلام کی سنت کے مطابق عمل ہے؟

جواب: عام حالات میں عشاء کی نماز میں درمیانی سورتیں پڑھنی چاہئیں، جیسے سورۃ الطارق۔ الاعلیٰ۔ والشّمس وغیرہ۔

ایک رکعت میں مختلف سورتیں ملانا:

سوال: امام صاحب سری نماز میں سری قرأت فرماتے ہیں مقتدی نے ثناء اور سورہ فاتحہ کے بعد چار مختلف سورتیں پڑھیں۔ پانچویں شروع کی تو امام صاحب رکوع میں چلے گئے۔ مقتدی بھی رکوع میں چلا گیا۔ حدیث میں میرے علم کے مطابق دو سورۃ ملانے کا ذکر ہے۔ ﴿قُل هُوَ اللّٰهُ اَحَد﴾(الاخلاص:۱) کے ساتھ کوئی اور سورت، کیا ایسا کرنا درست ہے یعنی ۵ سورۃ ایک ہی رکعت میں؟ کیا صرف دو سورت پڑھنے کے بعد خاموش ہو جانا چاہیے تھا؟ یا ایک ہی سورۃ کا تکرار کرتا رہے؟ خاموش رہنے کی صورت میں وساوس پیدا ہوتے ہیں۔ ذہن منتشر ہوتا ہے۔

جواب: ایک رکعت میں مختلف سورتیں ملانا جائز ہے، کسی مخصوص عدد کی کوئی حد بندی نہیں۔ ہاں! البتہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت مبارکہ تھی کہ باہم ملتے جلتے مضامین والی سورتیں جمع کرتے۔

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

« وَ فِيهِ مَا تَرجَمَ لَهُ وَ هُوَ الجَمعُ بَينَ السُّوَرِ ، لِاَنَّهُ اِذَا جَمَعَ بَينَ السُّورَتَينِ سَاغَ

---

[1] مؤطا امام مالك، اَلقِرَاءَةُ فِي المَغرِبِ وَالعِشَاءِ، رقم: ۲۶۰

الجَمعُ بَینَ ثَلاثٍ فَصاعِدًا لِعَدَمِ الفَرقِ. وَ قَد رَوَی اَبُوداوٗدَ، وَ صَحَّحَهُ، ابنُ خُزَیمَةَ مِن طَرِیقِ عَبدِ اللّٰهِ بنِ شَقِیقٍ، قَالَ: سَأَلتُ عَائِشَةَ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهَا أَکَانَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ یَجمَعُ بَینَ السُّوَرِ؟ قَالَت: نَعَم مِنَ المُفَصَّلِ.» ①

یعنی ''اس میں وہی مسئلہ ہے، جس کے لیے مصنف نے باب قائم کیا ہے، اور وہ ہے ''مختلف سورتیں جمع کرنا'' جب دو سورتیں اکٹھی پڑھنی جائز ہیں تو تین یا زیادہ کو جمع کرنے کا جواز بھی نکل آیا۔ کیونکہ دو یا اس سے زیادہ میں کوئی فرق نہیں۔..........''

لہٰذا ایک رکعت میں متعدد سورتیں جمع ہو سکتی ہیں۔ قاری اپنی استعداد اور نشاط کے مطابق جمع کر سکتا ہے جب کہ ایک سورت کے تکرار کا بھی جواز ہے۔

پہلی رکعت میں چھوٹی سورت پڑھی جائے اور دوسری رکعت میں بڑی سورت پڑھنا

سوال : نماز میں اگر پہلی رکعت میں چھوٹی سورت پڑھی جائے اور دوسری رکعت میں بڑی سورت پڑھیں تو کوئی حرج ہے؟

جواب : صورت مسئلہ میں نماز تو ہو جائے گی، لیکن طریقہ مسنونہ کے خلاف ہے۔

سورۃ فاتحہ دو بار پڑھنا:

سوال آدمی نماز میں سورۂ فاتحہ پڑھنے کے بعد بھول گیا، سمجھا کہ ابھی نہیں پڑھی اور دوبارہ پڑھتے ہوئے یاد آجائے کہ میں نے تو پہلے بھی پڑھ لی تھی۔ کیا اب بعد والی فاتحہ قرات کو کفایت کر جائے گی؟

جواب ایسی صورت میں فاتحہ دوبارہ مکمل کر لینے میں کوئی حرج نہیں۔

جہری قرأت والی نمازوں میں کم از کم اور زیادہ سے زیادہ کتنی آیات:

سوال : جہری قرأت والی نمازوں میں کم از کم اور زیادہ سے زیادہ کتنی آیات تلاوت کی جا سکتی ہیں؟

جواب : ''فاتحہ'' کے علاوہ آدمی کو اختیار ہے، نماز میں جتنی آیات چاہے تلاوت کر سکتا ہے اور اگر نہ بھی ملائے تو نماز پھر بھی درست ہے۔

نماز میں مختلف مقامات سے قرآن پڑھنے کا حکم:

سوال : دوران نماز مختلف جگہ سے قرآن پڑھنے کے بارے میں کیا حکم ہے؟ جیسے کہ ہمارے قراء اور

① فتح الباری: ۳/ ۲٦٠

علماء کا طرزِ عمل ہے۔

(جواب): دورانِ نماز مختلف مقامات سے قرآن کی تلاوت ہوسکتی ہے۔ [1]

تین چار ماہ میں جہری نمازوں میں قرآنِ مجید ختم کرنا:

(سوال): فرض جہری نمازوں میں تراویح کے انداز میں مسلسل قرآنِ مجید پڑھنے یعنی تقریباً ۳،۴ ماہ میں قرآنِ مجید کی تلاوت کا مکمل کرنے کا شرعاً کیا حکم ہے؟ ایک مفکر اسلام کا کہنا ہے کہ یہ فرائض نماز کے لیے مکروہ ہے۔ کیا ایک روز پہلے یہ بتا دینا کہ کل نماز میں رکوع نمبر، سورۂ نمبر، اور آیت نمبر تلاوت کی جائے گی نامناسب ہے؟ کیا یہ بہتر نہیں کہ جو نمازی عربی سے مکمل واقفیت نہیں رکھتے وہ گھر سے پڑھ کر آئیں؟ براہِ مہربانی مستند حوالوں سے روشنی ڈالیں، دل کا اطمینان درکار ہے۔

(جواب): تین چار ماہ میں جہری نمازوں میں قرآنِ مجید ختم کرنا کراہت سے بہرحال خالی نہیں۔ کمزور وناتواں اور حاجت مندوں کی رعایت کے پیشِ نظر نبی کریم ﷺ نے معاذ رضی اللہ عنہ کو عشاء کی نماز میں لمبی قرأت کرنے سے صرف روکا ہی نہیں بلکہ فتنے باز قرار دیا۔ پھر قدرے چھوٹی سورتوں کی تلقین فرمائی۔ بعض دیگر روایات سے بھی اس امر کی راہنمائی ملتی ہے۔ (بلوغ المرام باب صلاۃ الجماعۃ والامامۃ) [2]

تاہم باقی نمازوں کی نسبت فجر کی نماز میں لمبی قرأت کرنا مسنون ہے۔ نیز امام کا نمازیوں کو مقام قرأت سے آگاہ کرنا ضروری نہیں، اپنے شوق سے امام کے مقامِ قرأت سے آگاہ رہیں۔ تو اس میں کوئی حرج بھی نہیں، کیونکہ یہ شے فرائضِ امامت میں شامل نہیں۔

منفرد نمازی فرض نماز سرًّا پڑھے یا جہرًا:

(سوال): جماعت المسلمین کے مطابق منفرد نمازی بھی اسی طرح فرض نماز پڑھے گا جس طرح امام نماز پڑھے گا۔ جو چیز امام جہراً پڑھتا ہے منفرد فرض نماز میں وہ چیز جہراً پڑھے گا۔ کہتے ہیں کہ یہ فرض نماز کا حصہ ہیں۔ کیا یہ طریقہ درست ہے؟

(جواب): کسی مرفوع متصل روایت سے یہ طریقہ ثابت نہیں۔

---

[1] صحیح البخاری بَابُ الجَمعِ بَینَ السُّورَتَینِ فِی الرَّکْعَةِ

[2] صحیح البخاری، بَابُ إِذَا طَوَّلَ الإِمَامُ، وَکَانَ لِلرَّجُلِ حَاجَةٌ، فَخَرَجَ فَصَلَّی، رقم: ۷۰۱، صحیح مسلم، بَابُ الْقِرَاءَةِ فِی الْعِشَاءِ، رقم: ۴۶۵

مسئلہ رفع الیدین کے احکام و مسائل

(سوال): اگر امام صاحب رفع الیدین کے قائل نہ ہوں، اور اہلِ حدیث اس کے پیچھے باجماعت نماز پڑھ رہا ہو، تو کیا ایسے امام کے پیچھے نماز ہو جائے گی جب کہ لوگ کہتے ہیں کہ نماز میں امام کی اطاعت ضروری ہوتی ہے؟ ہمیں بتائیں کہ مقتدی ایسے امام کے پیچھے جو رفع یدین نہیں کرتا، رفع یدین کرے یا نہ؟

(جواب): رفع یدین کے تارک امام کی اقتداء میں رفع یدین ترک نہیں کرنی چاہیے۔ بلکہ حتی المقدور (کوشش کرکے) امام کو اس کے سنت ہونے کا احساس کرانا چاہیے۔ شاید کہ آپ کی دعوت اس کی ہدایت کا موجب بن جائے۔ اس امر میں امام کی اطاعت نہیں۔ نبی اکرم ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے:

«صَلُّوا كَمَا رَأَيْتُمُونِي أُصَلِّي»[1]

یعنی ''نماز اس طرح پڑھو جس طرح کہ تم مجھے نماز پڑھتے ہوئے دیکھتے ہو۔''

یہ حکم امام اور مقتدی سب کو شامل ہے۔

(سوال): بندہ رفع الیدین کو سنت رسول ﷺ سمجھ کر نماز میں ادا کرتا ہے جب کہ والدین کا اصرار ہے کہ رفع الیدین چھوڑ دو مجھے اس صورت میں سنت رسول ﷺ پر عمل کرنا چاہیے یا والدین کی اطاعت؟

چونکہ اسلامی تعلیمات میں اس قسم کی نظائر ملتی ہیں کہ حضور ﷺ نے حج اور جہاد کے مواقع پر اطاعت وخدمت والدین کو ترجیح دی ہے۔ اب جب کہ رفع الیدین سنت ہے اور اطاعت و خدمت والدین فرض ہے مجھے کس پہلو کو ترجیح دینا چاہیے؟

(جواب): ان حالات میں والدین کی دلجوئی کے لئے ترک رفع کی گنجائش ہے۔ البتہ وقتاً فوقتاً بطریقِ احسن افہام وتفہیم کا سلسلہ جاری رہنا چاہیے۔ ﴿لَعَلَّ اللّٰهَ يُحدِثُ بَعدَ ذٰلِكَ أَمرًا﴾

ہمارے بعض اسلاف تبلیغی مصلحت کے پیشِ نظر ترکِ رفع الیدین پر عامل تھے۔ اس طرح ممکن ہے آپ بھی کوئی بہتر ناصحانہ کردار ادا کرسکیں۔ ﴿وَاللّٰهُ يَهدِي مَن يَشَاءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّستَقِيم﴾

(سوال): کیا حضور نبی کریم ﷺ اپنی ہر نماز میں رفع الیدین کرتے رہے؟ اور آپ ﷺ اپنی تمام زندگی رفع الیدین کرتے رہے یا آپ ﷺ نے اسے ترک کردیا تھا؟

---

[1] صحيح البخاري، بَابُ الأَذَانِ لِلمُسَافِرِ، إِذَا كَانُوا جَمَاعَةً، وَالإِقَامَةِ، وَكَذٰلِكَ بِعَرَفَةَ وَجَمعٍ...... الخ، رقم: ٦٣١

بعض لوگ کہتے ہیں کہ آپ ﷺ کبھی کبھی رفع الیدین کرتے تھے اور کبھی نہیں کرتے تھے اور بعض کہتے ہیں کہ آپ ﷺ نے اپنی زندگی کے آخری ایام میں اسے ترک کر دیا تھا؟ قرآن و حدیث کی روشنی میں وضاحت فرمادیں۔

جواب: زیرِ بحث مسئلہ سے غالباً سائل کا مقصود قبل از رکوع اور بعد از رکوع رفع الیدین ہے۔ اسی تقدیر پر ہم آئندہ موضوع پر بحث کریں گے۔ یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جس کا ثبوت غالباً حدیث کی ہر کتاب میں موجود ہے۔ ائمہ محدثین میں سے کوئی ایک بھی مؤلف ایسا نہیں پایا جاتا، جس نے اس کے نسخ کی تبویب (باب) قائم کیا ہو۔ اس کی بنیادی وجہ یہی ہے کہ ان کے نزدیک دعویٰ نسخ کی کوئی حقیقت نہیں۔ اسی بناء پر مولانا عبد الحی حنفی فرماتے ہیں:

« اِنَّ ثُبُوتَه عَنِ النَّبِیِّ ﷺ أَکثَرُ، وَ أَرجَحُ. وَ أَمَّا دَعوٰی نَسخِهِ، فَلَیسَت بِمُبَرهَنٍ عَلَیهَا بِمَا یَشفِی العَلِیلَ، وَ یُروِی الغَلِیلَ » [1]

یعنی رسول اکرم ﷺ سے رفع الیدین کرنے کا بہت کافی اور نہایت عمدہ ثبوت ہے۔ جو لوگ کہتے ہیں کہ رفع الیدین منسوخ ہے ان کا قول بے دلیل ہے۔

اور حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں: کہ جب رکوع کرنے کا ارادہ کرے تو رفع الیدین کرے، اور جب رکوع سے سر اٹھائے اس وقت بھی رفع الیدین کرے۔ میں رفع الیدین کرنے والوں کو نہ کرنے والوں سے اچھا سمجھتا ہوں۔ کیونکہ رفع الیدین کرنے کی حدیثیں بہت زیادہ ہیں اور بہت صحیح ہیں۔ [2]

غور فرمایئے ......!! کیا اس منطق کو حضرت شاہ صاحب نہ پا سکے کہ رفع الیدین تو منسوخ ہے، اور میں ان لوگوں سے اظہار محبت کیوں کر رہا ہوں، جو رفع الیدین پر عامل ہیں۔ جب کہ امر واقعہ اس کے خلاف ہے اور حنفی مذہب کی مستند کتاب "درّ مختار" میں ہے کہ جس نے کہا کہ رفع الیدین سے نماز میں نقصان آتا ہے، اس کا قول مردود ہے اور رکوع میں جانے سے اور رکوع سے اٹھنے کے وقت رفع الیدین کرنے سے کچھ نقصان نہیں ہے۔ (۱/۵۸۴)

پھر مذاہبِ اربعہ میں سے تین مذہب مالکیہ، شافعیہ، حنابلہ رفع الیدین کے حامی ہیں۔ کیا یہ سب لوگ

---

[1] التعلیق الممجد

[2] حجة الله البالغة: ۲/۴۳۴

(نعوذ باللہ) منسوخ پر عمل کرتے ہیں۔ ان کو نسخ کا علم نہ ہوسکا ہو۔ بعید از عقل ہے .... پھر یہی نہیں کوفیوں کے ماسوا جملہ محدّثین وفقہاء اس کے قائل تھے۔ ابن عساکر رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ امام مالک رحمہ اللہ کا انتقال اسی مسلک پر ہوا تھا۔ (۱۵/ ۷۸/ ۲) بلکہ ہمیں تو بذاتِ خود حنفیہ سے بھی ایسے افراد نظر آتے ہیں، حنفی ہونے کے باوجود ان کا عمل رفع الیدین پر تھا۔

چنانچہ قاضی ابو یوسف کے شاگرد عصام بن یوسف ابو عصمہ کے بارے میں یہ بات مشہور ہے:

« كَانَ يَرفَعُ يَدَيهِ عِندَ الرَّكُوعِ وَالرَّفعِ مِنهُ » [1]

یعنی وہ رکوع کو جاتے وقت، اور اٹھتے وقت رفع الیدین کرتے تھے۔

اس روایت پر حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے سکوت کیا ہے جو اس کے قابلِ استدلال ہونے کی دلیل ہے اور حافظ زیلعی حنفی نے بھی ''نصب الرایہ'' میں اس پر کلام نہیں کیا۔ نیز مولانا ظفر احمد عثمانی فرماتے ہیں:

« اِنَّ سَكُوتَهُ فِي التَّخلِيصِ عَلٰى حَدِيثٍ يَدُلُّ عَلٰى صِحَّتِهٖ أَو حَسنِهٖ » [2]

یعنی ''حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کا تلخیص میں سکوت اس بات پر دال ہے کہ حدیث ہذا صحیح ہے یا حسن۔''

اور امام ابن دقیق العید نے باقاعدہ اس سے استدلال کیا ہے، کہ رفع یدین منسوخ نہیں ہے اور صاحب ''سفر السعادۃ'' علامہ مجدالدین فیروز آبادی رقمطراز ہیں: کہ کثرتِ روایات کی وجہ سے (تین مواقع پر ثابت شدہ رفع الیدین) متواتر حدیث کے مشابہ ہے۔ اس مسئلہ میں چار سو حدیثیں اور آثار آئے ہیں۔ عشرہ مبشرہ صحابہ (جنہیں حضور ﷺ نے ان کی زندگی میں جنتی کہا تھا) نے ان کو روایت کیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ اس طرح نماز پڑھتے رہے۔ یہاں تک کہ اس دنیا سے رحلت فرما گئے۔ اس کے سوا کچھ ثابت نہیں (بحوالہ ''صلوٰۃ الرسول'' ﷺ مولانا سیالکوٹی مرحوم) مسئلہ ہذا کو احادیث میں ''کان یقیل یا کان یصلّی'' سے تعبیر کیا گیا ہے، جو اس کے استمرار کی دلیل ہے۔ اہلِ علم اس بات سے واقف ہیں کہ کام فعل مضارع پر دوام و استمرار کا فائدہ دیتا ہے۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے ''تلخیص الحبیر'' میں ایک روایت نقل کی جس کے الفاظ یوں ہیں:

« زَادَ البَيهَقِيُّ فَمَا زَالَت تِلكَ صَلَاتُهٗ حَتّٰى لَقِيَ اللّٰهَ . » (۱/ ۲۱)

''بیہقی نے یہ زیادتی کی ہے کہ آپ کی نماز اسی طرح رفع یدین کے ساتھ رہی، حتیٰ کہ اللہ سے جا ملے۔''

---

[1] الفوائد ص١١٦، بحواله صفة صلوة النّبى ص ٢٦

[2] انهاء السكن ٢٤

حدیث ہذا دوام واستمرار رفع یدین کی واضح دلیل ہے۔اس اضافہ پر بعض حنفیہ کا اعتراض ہے۔ یہ ٹکڑا تو ''سنن کبریٰ'' بیہقی میں موجود نہیں۔اس کا جواب یہ ہے کہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے ''سنن کبریٰ'' بیہقی کا حوالہ نہیں دیا بلکہ بیہقی کی طرف نسبت کی ہے۔مختصر خلافیات بیہقی میں یہ الفاظ موجود ہیں، اس کتاب کا قلمی نسخہ ''مکتبہ حرم مکی'' میں محفوظ ہے۔اس کا فوٹو میرے پاس موجود ہے۔اس میں واضح طور پر یہ الفاظ تحریر ہیں:

البتہ بعض متعصب حنفیوں نے حضرت جابر بن سمرہ کی روایت:

« قَالَ خَرَجَ عَلَينَا رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ فَقَالَ مَالِی أَرَاکُم رَافِعِی أَیدِیکُم، کَأَنَّهَا اَذنَابُ خَیلٍ شمسٍ؟ اُسکُنُوا فِی الصَّلٰوةِ.»[1]

''کہا، رسول اللہ ﷺ ہمارے پاس تشریف لائے۔فرمایا کہ کیا ہے میں تمہارے ہاتھوں کو اٹھے ہوئے دیکھتا ہوں گویا کہ وہ شریر گھوڑوں کی دُمیں ہیں۔''

سے اس کو منسوخ قرار دینے کی ناکام سعی کی ہے۔حافظ ابن حجر رحمہ اللہ اس کے جواب میں رقمطراز ہیں: اس میں رفع یدین کے مخصوص ہیئت پر مخصوص مقام میں منع ہونے کی دلیل نہیں۔اور وہ رکوع کو جاتے ہوئے اور رکوع سے اٹھتے وقت۔اس لیے کہ یہ طویل حدیث بھی مسلم ہی میں حضرت جابر بن سمرہ سے مروی ہے جس میں یہ ہے کہ صحابہ''السّلام علیکم ورحمة اللّٰه'' کے وقت دائیں بائیں اپنے ہاتھوں سے اشارہ کرتے تھے۔[2] صرف اس سے روکا گیا ہے۔

چند سطور بعد امام بخاری رحمہ اللہ کا قول نقل کرتے ہیں جس نے جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث سے بوقتِ رکوع رفع یدین کے منع ہونے پر دلیل لی، اس کا علم سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ بات مشہور ہے اس میں کوئی اختلاف نہیں۔یہ حالت تشہد کا واقعہ ہے ملاحظہ ہو! التلخیص(۱/ ۲۲۱)

صحیح مسلم کے حواشی پر امام نووی رحمہ اللہ نے بایں الفاظ تبویب قائم کی ہے:

« بَابُ الْأَمرِ بِالسَّكُونِ فِی الصَّلٰوةِ وَالنَّهیِ عَنِ الاِشَارَةِ بِالیَدِ وَ رَفعِهَا عِندَ السَّلَامِ ......الخ»

حنفیوں نے اس کا جواب یوں دیا ہے کہ اُسْكُنُوا فِی الصَّلٰوةِ الفاظ عام ہیں اور اصولِ فقہ کا قاعدہ ہے: اَلعِبرَةُ بِعُمُومِ اللَّفظِ لَا بِخُصُوصِ السَّبَبِ . یعنی اعتبار عمومی الفاظ کا ہوتا ہے نہ کہ خصوصی سبب کا۔ بناء بریں یہ الفاظ اپنے عموم کے اعتبار سے ''عندالرکوع'' رفع یدین کو بھی شامل ہیں۔حضرات اس کا

---

[1] صحیح مسلم،بَابُ الْأَمرِ بِالسُّكُونِ فِی الصَّلَاةِ، وَالنَّهیِ عَنِ الْإِشَارَةِ بِالْیَدِ......الخ ،رقم: ۴۳۰

[2] صحیح مسلم،بَابُ الْأَمرِ بِالسُّكُونِ فِی الصَّلَاةِ، وَالنَّهیِ عَنِ الْإِشَارَةِ بِالْیَدِ، ......الخ،رقم: ۴۳۱

مطلب تو یہ ہوا کہ حدیث ہذا اپنے عموم کے اعتبار سے تکبیر تحریمہ تکبیرِ قنوت اور تکبیرِ عیدین وغیرہ سب کو شامل ہے۔ لہٰذا حنفیہ کو ان مواقع پر بھی ''رفع الایدی'' کا قائل نہیں ہونا چاہیے۔ جب کہ حقیقتِ حال اس کے خلاف ہے۔ صاحبِ ''ہدایہ'' نے امام شافعی رحمہ اللہ کے خلاف دلیل قائم کرتے ہوئے کہا کہ "عند الرکوع" رفع یدین کا وجود نہیں۔ اس کے لیے ایک مصنوعی روایت سے احتجاج لینے کی سعی کی ہے۔ جس کے الفاظ یوں ہیں:

« لَا تُرفَعُ الْاَیدِی إِلَّا فِی سَبعِ مَوَاطِنَ : تَکبِیرَۃِ الِافتِتَاحِ، وَ تَکبِیرَۃِ القُنُوتِ، وَ تَکبِیرَۃِ العِیدَینِ، وَ ذَکَرَ الْاَربَعَ فِی الحَجِّ . » [1]

دوسری بات یہ ہے کہ حنفی اصولوں کی سب سے بڑی قباحت یہ ہے کہ ان کے اصول فروع کے تابع ہیں۔ جب کہ دیگر مذاہب میں بالعموم اور مذاہبِ ثلاثہ، مالکیہ، شافعیہ، حنابلہ کے ہاں بالخصوص فروع اصولوں کے تابع ہیں۔ اسی بناء پر نسبتاً ان کا استقامت کا پہلو نمایاں ہے جب کہ حنفیوں کی حالت یہ ہے کہ جب کسی مسئلہ میں ٹکراؤ نظر آتا ہے، وہاں ایک نیا اصول گھڑ لیتے ہیں۔ دوسری جگہ یہی اصول ٹوٹ جاتا ہے۔ اس بناء پر ''اصول الشاشی'' کو مجموعہ تضادات کہا جاتا ہے۔ بلکہ صاحب اصول شاشی انکار حدیث کے بانی نظر آتے ہیں۔ "واللہ المستعان"

بالِاختصار زیرِ بحث مسئلہ پر غور فرمائیں! «اُسکُنُوا فِی الصَّلٰوۃِ» میں حنفیوں نے بزعمِ خود عموم کو لیا ہے۔ اور سببِ ورود حدیث کو نظر انداز کر دیا ہے۔ دوسری طرف جمہور اہلِ علم کا مسلک یہ ہے کہ عورت "اعسار بالنفقه" (اخراجات کی تنگی) کی بناء پر خاوند سے طلاق کا مطالبہ کر سکتی ہے۔ قرآن کی آیت ﴿وَ لَا تُمسِکُوھُنَّ ضِرَارًا لِّتَعتَدُوا﴾ ''اور اس نیت سے ان کو نکاح میں نہ رکھو کہ انہیں تکلیف دو''۔ کے عموم سے ان کا استدلال ہے۔ لیکن حنفی مسلک میں خرچہ کی تنگی کی بناء پر عورت طلاق کا مطالبہ کرنے کی مجاز نہیں۔ جب ان لوگوں کے سامنے عمومی آیت ﴿وَ لَا تُمسِکُو ھُنَّ ضِرَارًا لِّتَعتَدُوا﴾ پیش کی جاتی ہے، تو اس کا جواب بجائے عموم پر عمل کے یہ دیتے ہیں کہ آیت ہذا اپنے سببِ نزول کے ساتھ مخصوص ہے۔ جس طرح کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ ایک شخص اپنی بیوی کو طلاق دیتا، جب عدت گزرنے لگتی تو وہ رجوع کر لیتا تب اللہ رب العزت نے آیت ﴿وَ لَا تُمسِکُو ھُنَّ ضِرَارًا لِّتَعتَدُوا﴾ نازل فرمائی۔

غور فرمایئے! یہاں حنفیوں نے عمداً عموم آیت کو چھوڑ کر سبب سے مقید کیا ہے، جب کہ حدیث کے عموم

[1] هدایه جزء اوّل ص ۹٦

کو لے لیا ہے، اور سبب کو ترک کر دیا ہے۔ اس مثال سے معلوم ہوا کہ اصول کے نام پر بے اصولی کرنا حنفیوں کا طرّۂ امتیاز ہے۔ ''اَلحَذرُ کُلَّ الحَذرِ اَیُّھَا العَاقِلُ البَصِیرُ.''

خلاصہ یہ ہے کہ رکوع میں جاتے ہوئے، اور رکوع سے اٹھ کر رسول اللہ ﷺ نے تاحیات رفع یدین کیا ہے۔ اس کا ترک قطعاً آپ سے ثابت نہیں۔ فرمایا: « صَلُّوا کَمَا رَأَیتُمُونِی اُصَلِّی »[1] نماز ٹھیک اس طرح پڑھو جس طرح تم نے مجھے پڑھتے ہوئے دیکھا۔

دعا ہے! اللہ جل جلالہ جملہ مسلمانوں کو سنت پر عمل اور اس پر ثابت قدمی کی توفیق بخشے۔ آمین!

مسئلہ رفع الیدین میں مولانا سید نذیر حسین صاحب کا مؤقف:

سوال: گزارش آپ کی خدمت میں یہ ہے کہ ہمارے ہاں ایک مولوی صاحب نے ہماری سندھی زبان میں ایک کتاب لکھی ہے جس میں وہ لکھتا ہے کہ اہلحدیثوں کے بڑے عالم مولانا سید نذیر حسین صاحب نے بھی دلائل دیکھ کر آخر یہ فیصلہ دیا کہ حقانی علماء سے یہ بات مخفی نہیں ہے کہ رکوع میں جاتے وقت اور رکوع سے اٹھتے وقت رفع الیدین کرنے کے لئے الجھنا اور لڑنا تعصب اور جہالت سے خالی نہیں کیونکہ مختلف اوقات میں رفع الیدین کرنا اور نہ کرنا دونوں ثابت ہیں۔[2]

آپ مہربانی کر کے جلد جواب عنایت فرما کر ارسال کریں تاکہ اس کو جواب دے سکوں۔ فجزاك اللہ

جواب: واضح ہو کہ مسلک اہلحدیث کی بنیاد شخصیات پر نہیں بلکہ کتاب و سنت کے نصوص کی پیروی پر ہے۔ ﴿فَرُدُّوهُ اِلَی اللّٰہِ وَالرَّسُولِ﴾ اور '' عَضُّوا عَلَیھَا بِالنَّوَاجِذِ''[3] کا مفہوم یہی ہے۔ ائمہ اربعہ کے اقوال بھی اسی بات کے مؤید ہیں بالخصوص امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا فرمان ہے: « اِذَا صَحَّ الحَدِیثُ فَھُوَ مَذھَبِی » ''میرا مسلک صحیح حدیث ہے۔''

لہٰذا بلا تردّد کہا جا سکتا ہے کہ نصوصِ صحیحہ کے معارض کسی بھی نظریہ کی کوئی اہمیت نہیں۔ قائل چاہے جو بھی ہو۔ صد احترام کے باوجود سید صاحب کا یہ فرمانا کہ رفع الیدین کرنا، اور نہ کرنا دونوں طرح ثابت ہے۔ محلِ نظر ہے کیونکہ رفع الیدین کرنا تو تواتر معنوی سے ثابت ہے جب کہ رفع الیدین نہ کرنے کے بارے

---

(1) صحیح البخاری، بَابُ الاَذَانِ لِلمُسَافِرِ، إِذَا کَانُوا جَمَاعَةً، وَالإِقَامَةِ، وَکَذَلِكَ بِعَرَفَةَ وَجَمعٍ...... الخ، رقم: ٦٣١

(2) فتاوی نذیریہ :١/ ٢٢١

(3) سنن أبی داؤد، بَابٌ فِی لُزُومِ السُّنَّةِ، رقم: ٤٦٠٧

میں مصرح (واضح) کوئی ایک حدیث بھی پایۂ ثبوت کو نہیں پہنچ سکی۔ اس لیے دونوں حالتوں کو برابر کیسے قرار دیا جاسکتا ہے۔ بلاریب معارض کے مدمقابل انداز حکیمانہ ہونا چاہیے جیسے ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ اُدعُ اِلیٰ سَبِیلِ ربِّكَ بِالحِكمَةِ وَالمَو عِظَةِ الحَسَنَةِ ﴾ (النحل:۱۲۵)

(سوال): مسئلہ رفع الیدین کے بارے میں تفصیل سے تحریر کریں؟

(جواب): رفع الیدین رسول اکرم ﷺ کی سنت ہے۔ اس بارے میں بہت ساری احادیث وارد ہیں۔ ان کا احاطہ مختصر مجلس میں مشکل امر ہے۔ اس بارے میں ''صلوٰۃ الرسول ﷺ'' مؤلفہ مولانا محمد صادق مرحوم سیالکوٹی کی طرف رجوع فرمائیں! کافی حد تک تشفی ہو جائے گی۔ (ان شاء اللہ تعالیٰ) اور اگر عربی زبان سے واقف ہیں تو ''مرعاۃ المفاتیح'' جلد اوّل کا مطالعہ کریں۔ اس میں مخالفین کے دلائل کا جائزہ بھی خوب پیش کیا ہے، جو قابلِ تعریف اور لائقِ تحسین ہے۔ بطورِ مثال حدیث ملاحظہ فرمائیں:

''حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ تحقیق رسول اللہ ﷺ اپنے ہاتھ اٹھاتے تھے برابر مونڈھوں کے، جب شروع کرتے نماز، اور جب تکبیر کہتے واسطے رکوع کے، اور جس وقت اٹھاتے سر اپنا رکوع سے، اٹھاتے دونوں ہاتھ اسی طرح سے (یعنی جس طرح نماز کے شروع میں اٹھاتے تھے۔[1]

بغیر رفع الیدین نماز کا حکم:

(سوال): کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص جو کہ حنفی مسلک سے تعلق رکھتا ہے، وہ سورہ فاتحہ امام کے پیچھے پڑھتا ہے۔ دیگر نماز کے اہم بنیادی ارکان کو سنت کے مطابق کرتا ہے، لیکن رفع الیدین نہیں کرتا۔ کیا اس کی نماز ہو گی یا نہیں؟ یا کہ صرف اس سنت کے ثواب وفضیلت سے محروم ہو جائے گا۔؟

(جواب): مذکور شخص کی نماز تو رفع یدین کے بغیر ہو جائے گی۔ لیکن اس کو التزام سنت کی تبلیغ وترغیب واہمیت کا سلسلہ جاری رہنا چاہیے۔ ﴿لَعَلَّ اللّٰهَ یُحدِثُ بَعدَ ذٰلِكَ أَمرًا﴾

کیا رفع یدین کے بغیر نماز ہو جاتی ہے؟

(سوال): رفع یدین کے بغیر نماز ہو جاتی ہے یا نہیں؟ یا پورا ثواب ملتا ہے کہ نہیں؟

---

[1] صحیح البخاری باب: رَفعُ الیَدَینِ فِی التَّكبِیرَۃِ، رقم:۷۳۵۔ صحیح مسلم، بَابُ استِحبَابِ رَفعِ الیَدَینِ حَذوَ المَنكِبَینِ مَعَ تَكبِیرَۃِ الإِحرَامِ......الخ، رقم:۳۹۱

(جواب): متعدد صحیح احادیث سے رفع یدین کرنا ثابت ہے۔ ایک مومن اور متبع سنت کے لائق نہیں، کہ اس کو ترک کرے۔ عمداً چھوڑنے سے خطرہ ہے کہ نماز میں نقص پیدا ہو جائے۔

کیا رسولِ کریم ﷺ نے رفع یدین کرنا چھوڑ دیا تھا؟

(سوال): کیا رسولِ کریم ﷺ نے رفع یدین کرنا چھوڑ دیا تھا؟

(جواب): میرے علم میں کوئی صحیح روایت ایسی نہیں جس میں یہ ہو کہ رسول اللہ ﷺ نے رکوع کے وقت رفع یدین کو ترک کردیا ہو۔ جب کہ اثبات کی بہت ساری روایات موجود ہیں۔ قریباً حدیث کی جملہ کتب میں مل سکتی ہیں۔ یہاں تک کہ وائل بن حجر رضی اللہ عنہ جو آپ ﷺ کی زندگی کے آخری ایام میں مسلمان ہوئے تھے، ان سے بھی مشکوٰۃ میں بحوالہ مسلم مروی ہے: "باب صفة الصلوة" حتی کہ عصام بن یوسف بلخی، فقیہ، حنفی بھی رکوع کو جاتے اور اس سے اٹھتے ہوئے رفع یدین کرتے تھے۔[1] پھر اسی کے مطابق وہ فتویٰ دیا کرتے تھے۔[2] اور امام الہند شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب "حجة الله البالغة" میں لکھا ہے:

«وَالَّذِي يَرفَعُ أَحَبُّ إِلَيَّ مِمَّن لَا يَرفَعُ. فَإِنَّ أَحَادِيثَ الرَّفعِ أَكثَرُ، وَ أَثبَتُ.»

یعنی جو لوگ رکوع کو جاتے ہوئے اور سر اٹھاتے ہوئے رفع یدین کرتے ہیں۔ وہ نہ کرنے والوں سے مجھے زیادہ پیارے ہیں۔ کیونکہ رفع الیدین کی حدیثیں تعداد میں زیادہ ہیں اور ثبوت میں بھی زیادہ پختہ ہیں۔

مولانا انور شاہ صاحب دیوبندی مرحوم بھی اسی بات کے قائل تھے، کہ رفع یدین عمر بھر میں کبھی کر لینا چاہیے اور مفتی کفایت اللہ حنفی فرماتے ہیں: کہ آمین بالجہر، اور رفع یدین کرنے والوں کو بنظرِ حقارت دیکھنا درست نہیں۔ کیونکہ بہت سے صحابہ و تابعین اور ائمۂ مجتہدین ان کو سنت سمجھتے ہیں۔ قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پتی "مالا بدمنہ" میں رفع یدین کی بابت لکھتے ہیں۔ کہ اکثر فقہاء و محدثین اثبات آں مے کنند" (بحوالہ فتاویٰ ثنائی (۱/۵۹۷-۵۹۸) اور امام ترمذی رحمہ اللہ نے اپنی "سنن" میں فرمایا ہے: "اکثر صحابہ، تابعین اور محدثین کا اسی پر عمل ہے۔"

ان نصوص اور تصریحات سے معلوم ہوا کہ رفع یدین منسوخ نہیں۔ محققین حنفیہ بھی اسی بات کے قائل ہیں اور جہاں تک نماز کے آغاز میں رفعِ یدین کا تعلق ہے، سبھی اہلِ علم متفقہ طور پر اس کے قائل ہیں۔ کسی کا اختلاف نہیں۔

---

[1] الفوائد، ص: ۱۱۶

[2] البحر الرائق: ۶/۲۹۳)، رسم المفتی: ۱/۲۸

وِتر میں رفع یدین کا حکم:

(سوال): کیا رسول کریم ﷺ نے وِتر میں رفع یدین کا حکم دیا ہے؟

(جواب): غالباً سائل کا مقصود قنوتِ وِتر میں رفع یدین ہے۔قنوتِ وِتر میں رفعِ یدین کرنا رسولِ اکرم ﷺ سے ثابت نہیں۔ہاں البتہ بعض سلف سے آثار موجود ہیں۔

ملاحظہ ہو! ''قیام اللیل'' از امام محمد بن نصر مروزی۔مگر جس طرح حنفیہ وِتر کی دعاے قنوت سے پہلے رفع یدین کرتے ہیں۔اس کا ثبوت میرے علم میں نہیں۔

تارک رفع الیدین امام کے پیچھے نماز:

(سوال): اللہ تعالیٰ نے فرمایا اطاعت کرو اللہ کی اور اللہ کے رسول ﷺ کی اور اپنے عملوں کو ضائع نہ کرو۔(القرآن) اور نبی ﷺ نے فرمایا کہ نماز اس طرح پڑھو جس طرح مجھے پڑھتے ہوئے دیکھتے ہو اور اگر کوئی رفع یدین بھی نہ کرتا ہو، آمین بالجہر کا بھی قائل نہ ہو۔فاتحہ خلف الامام کا بھی قائل نہ ہو اور مقلد بھی ہو تو کیا اس کے پیچھے نماز ہو جائے گی یا نہیں؟ کیونکہ جس نے سنت کے مطابق نماز ادا نہیں کی اس کی اپنی ہی نہیں ہوئی تو مقتدیوں کی کیسی ہو جائے گی؟

(جواب): کسی متبعِ سنت امام کی اقتداء اختیار کرنی چاہیے، اسی میں خیر ہے۔

رفع الیدین کرنے کی احادیث زیادہ ہیں یا نہ کرنے کی؟

(سوال): رفع الیدین یعنی نماز میں کئی دفعہ ہاتھوں کو اٹھانا، جو اہلِ حدیث نماز میں کرتے ہیں۔فقہ حنفی سے ثابت ہے یا نہیں؟ اور ہاتھ اٹھانے میں احادیث زیادہ ہیں یا نہ اٹھانے میں؟ براہِ کرم ''الاعتصام'' میں شائع کریں۔

(جواب): حنفی فقہاء میں سے بعض رفع الیدین کے عامل تھے۔ان میں سے عصام بن یوسف بلخی ہے۔(بحوالہ الفوائد) اثبات رفع یدین کی احادیث تقریباً متواتر درجہ کی ہیں۔جبکہ اس کے بالمقابل کوئی روایت بھی قابلِ حجت نہیں۔جملہ تفاصیل کے لیے ملاحظہ ہو! ''مرعاۃ المفاتیح: جلد اوّل۔''

کیا امام کعبہ جو اس وقت ہیں وہ رفع الیدین کرتے ہیں؟

(سوال): کیا امام کعبہ جو اس وقت ہیں وہ رفع الیدین کرتے ہیں؟ یا کہ نہیں کرتے اگر نہیں کرے تو پھر یہ ایسے کیوں ہے؟

جواب: ائمہ کعبہ رفع الیدین کے قائل اور عامل ہیں۔

سوال: حافظ صاحب! کچھ دن قبل ایک بھائی نے صحیح بخاری کی یہ حدیث لا کر دکھائی اور کہا کہ اس حدیث میں رفع یدین کا رکوع جاتے وقت اور رکوع سے اٹھتے وقت ذکر نہیں ہے۔ اس بھائی نے کہا کہ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے کبھی رفع یدین کیا اور کبھی نہیں کیا۔ اُمید ہے کہ آپ تسلی بخش جواب مرحمت فرمائیں گے۔ جزاک اللہ خیراً۔

جواب: محدثین کے ہاں یہ معروف اصول ہے، کہ نتیجۂ حدیث کے جملہ طُرق کو جمع کر کے نکالا جاتا ہے، نہ کہ کسی ایک طریق کو لے کر اس پر جمود اختیار کر لیا جائے۔ جبکہ حقیقت حال یہ ہے، کہ اس حدیث کے بعض طُرق میں رفع یدین کی بھی تصریح موجود ہے۔ ملاحظہ ہو! فتح الباری (۲/ ۳۰۸) بلکہ ذرا وسعت سے کام لے کر یوں کہیے، کہ ایک مسئلہ میں وارد جملہ احادیث کو جمع کر کے پھر حکم لگایا جاتا ہے۔ قاعدہ معروف ہے:

« اَلْاَحَادِیثُ یُفَسِّرُ بَعضُهَا بَعضًا.»

یعنی ''احادیث ایک دوسری کی تفسیر ہوتی ہیں۔'' جس طرح کہ قرآنی آیات سے بھی نتیجہ اسی طرز پر حاصل کیا جاتا ہے۔ جملہ تفاصیل کتبِ اصول میں ملاحظہ کی جا سکتی ہیں۔

کیا رفع الیدین میں ہاتھ (ہتھیلیاں) قبلہ رُخ ہوں؟

سوال: ''مجمع الزوائد'' کی روایت ہے کہ رفع الیدین میں ہاتھ (ہتھیلیاں) قبلہ رُخ ہوں ''تخریج صلوٰۃ الرسول'' میں سندھو صاحب نے یہ حدیث ضعیف بتائی ہے۔ جو علماء کرام ہر قسم کی ضعیف حدیث سے قطعاً گریز کرتے ہیں، ان کے نزدیک ہاتھوں کا رُخ کس طرف ہو؟ اور اس کی دلیل کیا ہے؟

جواب: مسئلہ ہذا میں دیگر اہلِ علم کا موقف تہدید کا ہے۔ سنن ابوداؤد میں حدیث ہے:

« کَانَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ اِذَا دَخَلَ فِی الصَّلٰوةِ رَفَعَ یَدَیهِ مَدًّا.»[1]

یعنی ''رسول اللہ ﷺ جب نماز میں داخل ہوتے تو اپنے دونوں ہاتھوں کو لمبا کھینچ لیتے۔''

علامہ شوکانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

« لَا مَطعَنَ فِی إِسنَادِهٖ.»

یعنی اس حدیث کی سند میں کوئی جرح نہیں۔ پھر ''مدا'' کی تشریح میں رقمطراز ہیں:

« یَجُوزُ اَن یَّکُونَ مُنتَصِبًا عَلَی المَصدَرِیَّةِ بِفِعلٍ مُقَدَّرٍ، وَ هُوَ یَمُدُّ هُمَا مَدًّا. وَ

[1] سنن أبی داؤد، بَابُ مَن لَم یَذکُرِ الرَّفعَ عِندَ الرُّکُوعِ، رقم: ۷۵۳

يَجُوزُ اَن يَّكُونَ مُنتَصِبًا عَلَى الحَالِيَةِ. أَى رَفَعَ يَدَيهِ فِي حَالِ لِكَونِهٖ مَدَّ لَهُمَا اِلٰى رَاسِهٖ. وَ يَجُوزُ اَن يَّكُونَ مَصدَرًا مُنتَصِبًا بِقَولِهٖ رَفَعَ: لِاَنَّ الرَّفعَ بِمَعنَى المَدِّ، اَصلُ المَدِّ فِي اللُّغَةِ: اَلجَرُّ. قَالَهُ الرَّاغِبُ، وَلارتِفَاعُ قَالَهُ الجَوهَرِيُّ، وَ مَدُّ النَّهَارِ اِرتِفَاعُهُ وَ لَهٗ مَعَانٍ اُخرٰى. ذَكَرَهَا صَاحِبُ القَامُوسِ ب وَغَيرُه.

وَ قَد فَسَّرَ ابنُ عَبدِ البَرِ اَلمَدَّ اَلمَذكُورَ فِي الحَدِيثِ بِمَدِّ اليَدَينِ فَوقَ الْاُذُنَينِ مَعَ الرَّاسِ. اِنتَهٰى. وَالمُرَادُ: مَا يُقَابِلُ النَشرَ المَذكُورَ فِي الرِّوَايَةِ الْاخرٰى ، لِأَنَّ النَّشرَ تَفرِيقُ الاَصَابِعِ » [1]

حاصل یہ کہ آپ ﷺ اپنے دونوں ہاتھوں کو سر کی طرف لمبا کرکے اٹھاتے تھے اور یہ انگلیوں کو پھیلانے کے بالمقابل ہے۔کتاب "صفة الصلوٰة"میں علامہ البانی فرماتے ہیں: « كَانَ يَرفَعُهُمَا مَمدُودَةَ الاَصَابِعِ لَا يُفَرِّجُ بَينَهَا وَ لَا يَضُمَّهَا» (ص:٥٦)یعنی نبی ﷺ انگلیاں لمبی کرکے دونوں ہاتھوں کو اٹھاتے تھے۔نمازی نہ ان میں کشادگی کرے اور نہ ان کو ملائے۔ ہاتھوں کا رُخ قبلہ کی طرف ہونا چاہیے۔امام شوکانی رحمہ اللہ نے "نيل الأوطار"(٢/١٨٨) میں بحوالہ ابوداؤد روایت نقل کی ہے۔

« حَتّٰى يُحَاذِى بِظَهرِ كَفَّيهِ المَنكِبَينِ وَ بِاَطرَافِ اَنَامِلِهِ الْاُذُنَينِ .»

دوسری روایت میں ہے:

«كَبَّرَ فَحَاذٰى بِاِبهَامِيهِ اُذُنَيهِ» [2]

مسئلہ رفع الیدین میں امام مالک بن انس رحمہ اللہ کا موقف:

سوال: امام مالک بن انس رحمہ اللہ عدمِ رفع الیدین کے قائل تھے۔جس کی تصریح المدوّنة الكبرىٰ (١/٦٨)، هداية المجتهد(١/١١٤) اور نووی کی شرح مسلم (١/١٦٨) سے ہوتی ہے۔ حافظ ابن کثیر کی تصریح کے مطابق امام مالک کا مدفن مدینۃ النبی ہے۔ [3] ظاہر ہے کہ امام مالک نے وہی فتویٰ دیا ہوگا کہ جس پر مسجد نبوی میں یا علمائے مدینہ کا عمل رہا ہوگا۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یا تو آخر عمر رسول اللہ ﷺ میں رفع الیدین منسوخ ہوگیا تھا۔یا پھر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے یہ سنت ترک کردی ہوگی اور اگر یہ دونوں باتیں نہیں تھیں تو

---

① نيل الأوطار:٢/١٨٣

② مستدرك على الصحيحين للحاكم، بَابٌ أَمَّا حَدِيثُ أَنَسٍ ،رقم:٨٢٢

③ البداية :١٠/٦٥٠

پھر وہ کیا عوامل تھے کہ جن کی بناء پر امام مالک رحمہ اللہ نے مدینہ منورہ جو کہ مہبط (نزول) وحی الٰہی تھا میں رہتے ہوئے عدم رفع الیدین کا فتویٰ دیا۔

جواب: کسی قول کے فقہ مالکی میں درج ہونے سے یہ لازم نہیں آتا، کہ امام مالک کا مسلک بھی یہی ہو۔ یہ قول مالکیوں کا ہے۔ امام مالک کے ہاں معمول بہ نہیں۔ اس امر کی واضح دلیل یہ ہے، کہ امام مالک رحمہ اللہ نے اپنی کتاب ''موطا'' میں ابن عمر رضی اللہ عنہما کی رفع یدین کرنے والی حدیث نقل کی ہے۔ پھر سلف صالحین کے آثار سے حجت لی ہے۔[1]

علامہ زرقانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ابن وہب اور ابن قاسم اور ابن مہدی اور محمد بن الحسن اور عبد اللہ بن یوسف اور ابن نافع وغیرہم نے اپنے اپنے موطأ میں امام مالک رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے:

« وَإِذَا رَكَعَ وَ إِذَا رَفَعَ رَأْسَهُ مِنَ الرُّكُوعِ رَفَعَهُمَا كَذٰلِكَ اَيضًا.»

یعنی ''جب رکوع کرتے اور رکوع سے سر اٹھاتے، تب بھی دونوں ہاتھوں کو اسی طرح اٹھاتے۔'' اور یحییٰ بن یحییٰ کی روایت میں «اِذَا رَكَعَ » کا لفظ چھوٹ گیا ہے۔ ابن عبد البر رحمہ اللہ نے کہا روایت اور لوگوں کی ٹھیک ہے۔[2]

مسئلہ ہذا پر سیر حاصل بحث کے لیے ملاحظہ ہو! (التحقیق الراسخ محدث گوندلوی رحمہ اللہ)

سوال: میں رفع یدین کے ساتھ نماز پڑھتا ہوں کیونکہ میں نے خود صحیح بخاری میں پڑھا ہے مگر کیا وجہ ہے کہ لوگ صحیح بخاری شریف کی احادیث پر عمل نہیں کرتے؟

جواب: صحیح احادیث پر عمل کرنا ہر مسلمان کا فرض ہے۔ تارکینِ سنت نبوی کو غور کرنا چاہیے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ضد اور عناد کی وجہ سے نمازیں اللہ کے ہاں قبولیت نہ حاصل کر سکیں۔ بلکہ بذاتِ خود مطالعہ کر کے زندگی کو کتاب وسنت کے مطابق ڈھالنا چاہیے۔

یہ بات معروف ہے کہ جن بعض روایات سے ان لوگوں کا استدلال ہے۔ وہ ناقابلِ حجت ہیں۔ ہماری بات کی تصدیق کے لیے کتاب ''التحقیق الراسخ'' اور ''جزء رفع الیدین'' امام بخاری کو غور و تدبر سے پڑھیں۔

ترک رفع یدین پر چند احادیث وآثار اور اقوال کی حقیقت:

سوال: نماز کے دوران ترک رفع یدین پر چند احادیث وآثار اور اقوال ارسال خدمت ہیں ان کی حقیقت

[1] مؤطا امام مالك، بَابُ افتتاح الصلوٰة ،رقم: ۲۰ ،بترقيم عبدالباقي

[2] كشف المُغَطّاء،ص: ۷۹

سے آگاہ فرمائیں۔

«حَدَّثَنَا عَبدُ اللّٰهِ بنُ اَیُّوبَ المَخرَمِی ، وَ سَعدَانُ بنُ نَصرٍ، وَ شُعَیبُ ابنُ عَمرٍو، فِی آخَرِینَ. قَالُوا : ثَنَا سُفیَانُ ابنُ عُیَینَةَ ، عَنِ الزُّهرِیِّ ، عَن سَالِمٍ ، عَن اَبِیهِ قَالَ : رَأَیتُ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ اِذَا افتَتَحَ الصَّلَاةَ رَفَعَ یَدَیهِ ، حَتّٰی یُحَاذِیَ بِهِمَا، وَ قَالَ بَعضُهُم: حَذوَ مَنکِبَیهِ . وَ اِذَا اَرَادَ اَن یَرکَعَ ، وَ بَعدَ مَا یَرفَعُ رَأسَهٗ مِنَ الرُّکُوعِ لَا یَرفَعُهُمَا » ①

(جواب): مسند ابی عوانہ میں «لَا یَرفَعُهُمَا» کے بعد یہ الفاظ ہیں:« وَقَالَ بَعضُهُم لَا یَرفَعُ بَینَ السَّجدَتَینِ . وَالمَعنٰی وَاحِدٌ. » یعنی بعض راویوں نے «لَا یَرفَعُهُمَا» کی بجائے « لَا یَرفَعُ بَینَ السَّجدَتَینِ» کے الفاظ نقل کیے ہیں اور دونوں کا معنی ایک ہی ہے کہ ''آپ دوسجدوں کے درمیان رفع یدین نہیں کرتے تھے۔'' اس عبارت سے یہ بات واضح ہوگئی کہ «لَا یَرفَعُهُمَا» سے مقصود یہ ہے کہ آپ ﷺ سجدوں کے درمیان رفع یدین نہیں کرتے تھے اور جہاں تک رکوع کو جاتے اور رکوع سے اُٹھ کر رفع یدین کرنے کا تعلق ہے، سو یہاں اس کا اثبات ہے۔نفی نہیں۔ حدیث ہذا پر مصنف کی تبویب بھی اس امر کی واضح دلیل ہے چنانچہ فرماتے ہیں:

« بَابُ رَفعِ الیَدَینِ فِی افتِتَاحِ الصَّلٰوةِ قَبلَ التَّکبِیرِ بِحَذَاءِ مَنکِبَیهِ، وَ لِلرُّکُوعِ، وَلِرَفعِ رَأسِهٖ مِنَ الرُّکُوعِ، وَ اَنَّهٗ لَا یَرفَعُ بَینَ السَّجدَتَینِ. »

''نمازی نماز کے شروع میں تکبیر سے پہلے دونوں کندھوں کے برابر ہاتھ اٹھائے اور رکوع کو جائے اور رکوع سے سر اٹھاتے وقت رفع یدین کرے، اور دوسجدوں کے درمیان رفع یدین نہ کرے۔''

مسئلہ رفع الیدین کے متعلق عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی حدیث:

(سوال): عَن عَلقَمَةَ قَالَ: قَالَ عَبدُ اللّٰهِ ابنُ مَسعُودٍ : اَلَا اُصَلِّی بِکُم صَلَاةَ رَسُولِ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: فَصَلّٰی فَلَم یَرفَع یَدَیهِ اِلَّا مَرَّةً ②

(جواب): حنفیہ کا تمام تر دارو مدار ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی اس روایت پر ہے۔ جب کہ اس میں راویٔ حدیث

① صحیح ابی عوانہ:۲/۹۰

② سنن أبی داؤد،بَابُ مَن لَم یَذکُرِ الرَّفعَ عِندَ الرُّکُوعِ ،رقم:۷۴۸

سفیان ثوری کو وہم ہوا ہے۔''علل'' ابن ابی حاتم میں ہے کہ " وَ لَم يَقُل اَحَدٌ مَا رَوَاهُ الثَّورِيُّ"علامہ زیلعی حنفی رحمہ اللہ نے ''نصب الرایہ'' میں اور حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے ''اَلتَّلخِیص'' میں ابو حاتم کا یہ قول نقل کیا ہے۔ امام بخاری نے ''جزء رفع الیدین'' میں وہم کی یہ دلیل بیان فرمائی ہے، کہ یہ حدیث عاصم سے عبد اللہ بن ادریس بھی روایت کرتے ہیں۔ کہ جن کے متعلق امام احمد بن حنبل یحییٰ سے نقل کرتے ہیں، کہ ابن ادریس کی کتاب میں نے خود دیکھی ہے۔ اس میں یہ لفظ موجود نہیں۔ جب کہ سفیان کی روایت زبانی ہے تحریر نہیں اور مسلّمہ اصول ہے کہ کتاب (تحریر) کو حفظ پر ترجیح ہے۔ پھر امام صاحب ابن ادریس کی روایت بیان کر کے فرماتے ہیں:

« هٰذَا هُوَ المَحفُوظُ عِندَ اَهلِ النَّظرِ مِن حَدِيثِ ابنِ مَسعُودٍ.»

''یعنی اہل تحقیق کے ہاں ابن مسعود کی حدیث اسی طرح محفوظ ہے۔''

اس حدیث میں دوسری جرح امام ترمذی نے نقل کی ہے کہ عبد اللہ بن مبارک فرماتے ہیں: ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی حدیث (ثوری کی سند کے ساتھ) ثابت نہیں اور ابن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث ثابت ہے۔

تیسری جرح یہ ہے کہ حدیث ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا دار و مدار عاصم بن کلیب پر ہے، اور عاصم بن کلیب تفرد (تنہا ہونے) کی صورت میں قابلِ حجت نہیں۔ ''میزان الاعتدال'' میں ہے:

« قَالَ ابنُ المَدِينِي لَا يُحتَجَّ بِهٖ بِمَا انفَرَدَ بِهٖ.»

حافظ ابن عبد البر ''تمہید'' میں لکھتے ہیں، کہ یہ حدیث بوجہ تفردِ عاصم ضعیف ہے۔ اس حدیث پر تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو! کتاب التحقیق الراسخ ، ص:۱۱۳تا۱۱۶)

مسئلہ رفع الیدین کے متعلق عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث:

سوال: « عَنِ ابنِ عُمَرَ رضی اللہ عنہ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيهِ وَسَلَّمَ كَانَ يَرفَعُ يَدَيهِ اِذَا افتَتَحَ الصَّلَاةَ ثُمَّ لَا يَعُودُ » [1]

جواب: اس حدیث کے بارے میں حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: کہ یہ حدیث موضوع ہے «وَ هُوَ مَقلُوبٌ» تلخیص الحبیر (۱/ ۲۲۲) بلکہ امام بیہقی نے خود حاکم سے نقل کیا ہے، کہ یہ روایت جھوٹی اور بناوٹی ہے۔ ملاحظہ ہو! نصب الرایہ (۱/۴۰۴)

[1] خلافیات بیهقی، بحواله نصب الرایه:۲/ ۴۰۴

ترکِ رفع یدین پر اہلِ مدینہ کا مؤقف:

(سوال): ترکِ رفع یدین پر اہلِ مدینہ کا اجماع ہے:

« قَالَ ابنُ القَيِّمِ مِن اُصُولِ مَالِكٍ: اِتِّبَاعُ عَمَلِ اَهلِ المَدِينَةِ، وَ اِن خَالَفَ الحَدِيثُ المَالِكِيَّةَ قَالُوا :رَفعُ اليَدَينِ حَذوَ المَنكِبَينِ عِندَ تَكبِيرَةِ الِاحرَامِ مَندُوبٌ. وَ فِيمَا عَدَا ذَالِكَ مَكرُوهٌ » [1]

(جواب): صاحب کتاب ''الفقه علی المذاهب الاربعة'' کا ترکِ رفع یدین پر اہلِ مدینہ کا اجماع نقل کرنا غفلت کی دلیل ہے، جب کہ واقعات اس دعویٰ کی تردید کرتے ہیں۔ نیز امام مالک کی طرف منسوب اصول بھی محل نظر ہے۔ کیونکہ امام مالک رحمہ اللہ سے منقول ہے، کہ ہر ایک کی بات کو قبول بھی کیا جا سکتا ہے اور چھوڑا بھی جا سکتا ہے۔ سوائے صاحب قبر یعنی نبی ﷺ کے۔ اس سے معلوم ہوا، کہ امام مالک کے نزدیک اصل سندِ حدیث ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ «جُزءُ رَفعِ اليَدَينِ» میں فرماتے ہیں:

« وَلَم يَثبُت عِندَ اَهلِ النَّظرِ عَمَّن اَدرَكنَا مِنَ الحِجَازِ وَ اَهلِ العِرَاقِ.»

''حجاز اور عراق کے جن اہل نقد و تحقیق اور علمائے نظر کا ہمیں علم ہے ان سے ترکِ رفع الیدین ثابت نہیں۔''

نیز تکبیرۃ الاحرام کے علاوہ مالکیہ کی طرف کراہتِ رفع کی نسبت کرنا بھی غیر درست ہے۔ کیونکہ حافظ ابن عبد البر نے کہا ہے: کہ مالک رحمہ اللہ سے رکوع کو جاتے اور اٹھتے ترکِ رفع صرف ابن القاسم نے ذکر کیا ہے جب کہ ہمارے نزدیک حجت وہ حدیث ہے، جو ابن عمر سے مروی ہے، جسے ابن وہب وغیرہ نے مالک رحمہ اللہ سے بیان کیا ہے اور ترمذی نے مالک رحمہ اللہ وغیرہ سے صرف یہی مذہب نقل کیا ہے۔ خطابی نے نقل کیا، اور اس کی پیروی میں قرطبی نے «المفهم» میں کہا: کہ مالک رحمہ اللہ کے دو قولوں سے آخری اور صحیح ترین قول یہی (رفع یدین والا) ہے۔ حافظ عراقی نے ''طرح التثریب'' میں کہا، اس قول کی حکایت مالک رحمہ اللہ سے ابو مصعب، اشہب، الولید بن مسلم اور سعید بن ابی مریم نے کی ہے اور ترمذی نے بھی مالک سے اس بات کو جزم سے نقل کیا ہے۔ مسئلہ ہذا کی مکمل تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو! مرعاۃ المفاتیح (۱/ ۵۲۹_۵۴۹)

---

[1] کتاب الفقه علی المذاهب الاربعة: ۱/ ۲۰۵

عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت کی اسنادی حیثیت:

سوال: ''مشکوۃ المصابیح'' کے مصنف نے ''باب صِفَةِ الصَّلٰوۃِ'' میں حضرت علقمہ سے انھوں نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے بیان کیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم رفع یدین نہیں کرتے تھے۔ اس پر امام ابوداؤد نے عدمِ صحت کا حکم لگایا ہے۔ برائے مہربانی وضاحت فرمادیجئے کہ یہ صحیح کیوں نہیں؟ اور یہ کہ رفع یدین سنت ہے یا نماز کا رکن یا شرط؟ اور اس کے بارے میں کیا کسی امام کا قول بھی ملتا ہے کہ رفع یدین کرنا یا نہ کرنا دونوں طرح صحیح ہے۔ کیا رفع یدین نہ کرنے سے نماز میں کمی آجاتی ہے؟

جواب: اس حدیث کی عدمِ صحت کی مختلف وجوہ ہیں۔ ناقدینِ ائمہ حفاظ نے اس کو ضعیف قرار دیا۔ اس حدیث کا دارومدار عاصم بن کلیب راوی پر ہے، جو اس میں منفرد ہے۔ علی بن مدینی فرماتے ہیں: کہ اس کے منفرد ہونے کی صورت میں کوئی روایت قابلِ حجت نہیں ہوتی۔ اگر اس کی سند صحیح تسلیم کر لی جائے تو پھر نتیجہ یہ ہوگا کہ ابن مسعود تکبیرِ تحریمہ کے علاوہ رفع یدین بھول گئے جس طرح کہ بہت سارے امور اور بھی بھول گئے تھے۔ مثلاً وہ رکوع میں ہاتھ گھٹنوں پر رکھنے کی بجائے، تطبیق (آپس میں ملا کر گھٹنوں کے اندر رکھنے) کے قائل تھے۔ جب کہ دیگر سب صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین ان کے مخالف تھے۔ انہوں نے رفع الیدین کی نفی کی ہے۔ جب کہ اثبات نفی پر مقدم ہے۔

احادیثِ رفع الیدین ابن مسعود کی حدیث پر مقدم ہیں۔ کیونکہ یہ بہت سارے صحابہ رضی اللہ عنہم سے منقول ہیں، یہاں تک کہ علامہ سیوطیؒ نے کہا ہے کہ احادیثِ رفع یدین نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے متواتر ہیں۔ احتمال ہے کہ آغازِ نماز میں رفع یدین کے بعد مزید اضافہ ہوگیا ہو۔ علامہ زیلعی حنفی نے نصب الرایۃ (۱/ ۲۰۷) میں اور حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے تلخیص (ص۸۳) میں ابن ابی حاتم کی ''علل'' (ص:۹۶) سے نقل کیا ہے کہ:

''آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے شروع کے علاوہ رفع الیدین نہیں کیا۔''

یہ سفیان ثوری کا وہم ہے۔ امام بخاری نے وہم کی دلیل یہ بیان فرمائی ہے، کہ عاصم بن کلیب سے عبداللہ بن ادریس بھی روایت کرتے ہیں اور امام احمد بن حنبل یحییٰ بن معین سے نقل کرتے ہیں، کہ ابن ادریس کی کتاب میں نے خود دیکھی ہے۔ اس میں یہ لفظ موجود نہیں، سفیان کی یہ روایت زبانی ہے اور مسلّمہ اصول ہے کہ کتاب کو حفظ پر ترجیح ہے۔ پھر امام صاحب ''جزء رفع الیدین'' میں فرماتے ہیں کہ

«هٰذَا هُوَ الْمَحْفُوظُ عِنْدَ أَهْلِ النَّظَرِ مِنْ حَدِيثِ ابْنِ مَسْعُودٍ.»

حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں: کہ میں رفع الیدین کرنے والوں کو نہ کرنے والوں

سے اچھا سمجھتا ہوں۔ کیونکہ رفع الیدین کرنے کی حدیثیں بہت زیادہ اور بہت صحیح ہیں۔ [1] امام محمد بن یحی ذہلی کا قول ہے: کہ رفع الیدین نہ کرنے والے شخص کی نماز ناقص ہوگی۔ [2] لہٰذا رفع یدین کا اہتمام لازماً ہونا چاہیے۔

نماز پڑھنے کی کیفیت اول وآخر:

سوال: نماز معراج کے موقع پر فرض ہوئی تھی، نماز کے اوقات اور اُن کی ادائیگی کا طریقہ کار سکھلانے کے لیے جبرائیل دو دن مسلسل نبی پاک ﷺ کو باجماعت نماز پڑھاتے رہے ہیں۔ کیا اُس طریقے میں اور نبی پاک ﷺ نے اپنی زندگی کے آخری ایام میں جو نمازیں پڑھائی تھیں، ان میں کوئی فرق تھا؟ یعنی نمازوں کی ادائیگی کے طریقے میں شروع سے آخر تک کوئی تبدیلی ہوئی تھی؟ جس طرح کچھ لوگ کہتے ہیں کہ ''رفع الیدین'' نمازوں کی ابتدا میں تھی بعد میں منسوخ کردی گئی تھی؟ براہ کرم قرآن وحدیث سے جواب دیں؟

جواب: نماز پڑھنے کی کیفیت اول وآخر ایک جیسی رہی، اس میں تبدیلی واقع نہیں ہوئی۔ رسول اکرم ﷺ ساری زندگی رفع الیدین سے نماز ادا کرتے رہے۔ نسخ کی واضح کوئی دلیل نہیں۔ امام محمد بن مروزی فرماتے ہیں:

« أجمَعَ عُلَمَاءُ الأمصَارِ عَلٰی مَشرُوعِيَةِ ذٰلِكَ إِلَّا أَهلُ الكُوفَة » [3]

''اہلِ کوفہ کے سوا تمام شہروں کے اہلِ علم کا اس (رکوع کو جاتے اور اٹھتے وقت) رفع یدین کی مشروعیت پر اجماع ہے''۔

مولانا عبدالحی لکھنوی حنفی "السعایہ" میں فرماتے ہیں:

''حق بات یہ ہے کہ رکوع کو جاتے اور رکوع سے اٹھتے رسول اللہ ﷺ اور آپ کے بہت سارے اصحاب سے قوی طُرق اور صحیح احادیث سے بلاشبہ رفع یدین کرنا ثابت ہے۔''

"التعلیق الممجد" میں فرماتے ہیں:

''رسول اللہ ﷺ سے رفع الیدین کرنے کا بہت کافی اور نہایت عمدہ ثبوت ہے۔ جو لوگ کہتے ہیں کہ رفع الیدین منسوخ ہے ان کا قول بے دلیل ہے۔''

حنفی علماء کی اس اندرونی شہادت سے معلوم ہوا، کہ رفع یدین منسوخ نہیں۔ جس طرح کہ بعض متعصبین

---

[1] حجة الله البالغه: ۲/ ۴۳۴

[2] صحیح ابن خزیمه، ج:۱، ص:۵۸۹، ۲۹۸

[3] فتح الباری۲/ ۲۲۰، تحت رقم الحدیث: ۷۳۵

حنفیہ کا زعمِ باطل ہے۔ مسئلہ ہذا پر تفصیلی بحث کے لیے ملاحظہ ہو۔ ہمارے شیخ محدث گوندلوی رحمہ اللہ کی کتاب «اَلتَّحقِیقُ الرَّاسِخُ فِی أَنَّ أَحَادِیثَ رَفعِ الیَدَینِ لَیسَ لَهَا نَاسِخٌ»

کیا رفع الیدین آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی مستقل سنت ہے؟

سوال: محترم جناب شیخ الحدیث صاحب! عرض ہے کہ ہماری جماعت (اہل حدیث) کے نمازیوں کی تعداد بہت کم بلکہ نہ ہونے کے برابر ہے۔ کیونکہ ہمارے گاؤں میں تقریباً اڑھائی سو گھر آباد ہیں۔ جن میں سے صرف پندرہ بیس گھر اہلِ حدیث جماعت کے ہیں، اور اُن میں سے صرف چند ایک نماز پڑھنے آتے ہیں اور بریلوی اور دیو بندیوں کی اکثریت ہے اور بریلوی حضرات آئے دن کوئی نیا مسئلہ چھیڑ دیتے ہیں جس سے فضا مکدر ہوتی ہے اور طرح طرح کے سوال کرتے ہیں جس سے سخت ذہنی کوفت ہوتی ہے۔ بعض سوالوں کے جواب ہم اُسی وقت دے دیتے ہیں مگر کچھ سوالوں کے جواب تحقیق اور مطالعہ سے تلاش کرنے پڑتے ہیں۔ اس لیے آپ سے گزارش ہے کہ چند سوالوں کے جواب مع حدیث حوالہ صفحہ نمبر ضرور دیں۔ اللہ آپ کو جزائے خیر عطا فرمائے اور لمبی صحت والی عمر عطا فرمائے، آمین۔

ایک مولوی صاحب نے کہا ہے کہ اگر تم یہ ثابت کردو کہ رفع الیدین پاک پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے ساری عمر یعنی وفات تک کیے رکھا ہے تو میں تمہیں دس ہزار روپے انعام دوں گا۔ میں نے کہا ہے کہ مجھے انعام کا لالچ مت دو۔ رہی حدیث کی بات تو وہ میں تمہیں ضرور تلاش کر کے بتاؤں گا اور اُس نے کہا ہے کہ اگر کوئی مل جائے کہ رفع الیدین آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی مستقل سنت ہے تو میں ضرور کیا کروں گا۔

آپ سے گزارش ہے کہ حدیث کے حوالہ سے مع صفحہ نمبر ضرور آگاہ کریں تا کہ کوئی آدمی شاید راہ ہدایت پر آجائے۔

جواب: عَنِ ابنِ عُمَرَ رَضِیَ اللّٰهُ عَنهُمَا اَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ کَانَ اِذَا افتَتَحَ الصَّلٰوةَ رَفَعَ یَدَیهِ، وَاِذَا رَکَعَ، وَاِذَا رَفَعَ رَأسَهٗ مِن رُکُوعٍ، وَکَانَ لَا یَفعَلُ ذٰلِكَ فِی السُّجُودِ. فَمَا زَالَت تِلكَ صَلٰوتُهٗ حَتّٰی لَقِیَ اللّٰهَ تَعَالٰی.»[1]

''حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب نماز شروع کرتے تو رفع یدین کرتے اور جب رکوع کرتے، اور جب اٹھاتے سر اپنا رکوع سے اور سجدوں میں رفع یدین نہ کرتے۔ اللہ تعالیٰ سے ملتے

[1] تلخیص الحبیر، بَابُ صِفَةِ الصَّلَاةِ، رقم:۳۲۸

دم تک آپ کی نماز اسی طرح رہی (یعنی وفات تک حضور ﷺ رکوع میں جاتے اور رکوع سے سر اٹھاتے وقت رفع الیدین کرتے رہے۔)''

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ آپ ﷺ نے وفات تک ساری نمازوں میں رفع یدین کی ہے۔ ہمارے شیخ محدث گوندلوی رحمۃ اللہ علیہ رقم طراز ہیں:

''اور بعض حنفیہ کا حدیث ابن عمر رضی اللہ عنہ بزیادت بیہقی «فما زالت تلك صلوته حتى لقى الله»[1] کو موضوع کہنا اس بناء پر کہ اس میں ایک راوی عصمہ بن محمد ہے۔ اُس کو یحییٰ بن قطان نے کذاب اور دوسرا راوی عبدالرحمٰن بن قریش ہے۔ اُس کو ذہبی نے ''میزان'' میں ''وضّاع'' کہا ہے۔ سو اوّلاً تو اس کا جواب یہ ہے کہ عصمہ بن محمد دو شخص ہیں: ایک عصمہ بن محمد بن ہشام بن عروہ ہے۔ وہ متروک الحدیث ہے۔ اس کو یحییٰ نے ''کذاب'' کہا ہے اور ابو حاتم نے "لیس بالقوی" اور دوسرا عصمہ بن محمد بن فضالۃ بن عبید الانصاری ہے۔ اس کو کسی نے ''کذاب'' وغیرہ نہیں کہا اور یہی عصمہ بن محمد انصاری راوی زیادتی "فما زالت تلك صلوته حتى لقى الله" الحديث رواه البيهقى کے ہیں۔

مولوی شوق نیموی حنفی نے اپنی بے علمی سے بوجہِ تعصب مذہبی عصمہ بن محمد انصاری کو مجروح قرار دے کر روایت کو ضعیف وموضوع کہہ دیا ہے۔ ورنہ عصمہ بن محمد انصاری پر کسی نے جرح، جو قادح ہو نقل نہیں کی۔ اس لیے حفاظِ حدیث مثل حافظ ابن حجر رحمہ اللہ، وحافظ زیلعی رحمہ اللہ وغیرہ نے اس روایت کو معرضِ استدلال میں ذکر کرتے ہوئے کوئی جرح نہیں کی اور محدثین کا ایک روایت کو نقل کر کے استدلال کرنا، اور اس پر جرح نہ کرنا، اس کے صحت کی دلیل ہے۔ جیسا کہ کہا مولانا محمود الحسن الدیوبندی الحنفی استاذ الاحناف الموجودین کتب معتبرہ میں مصرح موجود ہے، کہ نقل روایت کے بعد سکوت کرنا، یعنی روایت پر کسی قسم کا طعن وجرح نہ کرنا، اس امر کی دلیل ہے، کہ ناقل کے نزدیک وہ روایت مقبول ہے۔ ورنہ ساکت متصمہ بہ تقصیر ہوگا جو اکابر کی نسبت خیالِ باطل ہے۔ (دیکھو رسالہ احسن القری، ص:۱۳)

دیکھئے اب ہمارے مولوی اشفاق الرحمٰن صاحب حدیث مذکور کی صحت تسلیم کرتے ہیں یا مولانا محمود الحسن کی تکذیب کرتے ہیں۔

ثانیاً: روایت «فما زالت تلك صلوته حتى لقى الله» کی مؤیدات، وہ روائتیں بھی ہو سکتی ہیں، جن میں لفظ «اذا كان يفعل» وغیرہ آیا ہے۔ جو جرح عبدالرحمٰن بن قریش پر کی گئی ہے۔ وہ بھی

[1] السنن الكبرىٰ للبيهقى، بَابُ التَّكْبِيرِ لِلرُّكُوعِ وَغَيْرِهِ، رقم: ۲۴۹۲

درست نہیں۔ کیونکہ سلیمانی نے متہم بالوضع کہا ہے، کما فی "المیزان" پس درحقیقت وہ وَضَّاع نہیں ہے۔ صرف اس پر اِتہام ہے۔ اس لیے امام خطیب بغدادی نے ان کی توصیف کی ہے۔ «ما لفظه لا يسمع عنه الاخير »(لسان المیزان) اور حافظ ذہبی نے حکم وضع کا نہیں لگایا، یہ آپ کی خوش فہمی کا نتیجہ ہے۔ کیونکہ حافظ صاحب ''میزان'' میں فرماتے ہیں: ''اتهمه السليماني بوضع الحديث.''

یعنی یہ ان پر اتہام ہے درحقیقت کوئی جرح نہیں۔ آپ نے اپنی خوش فہمی سے حافظ ذہبی پر اس کو وضاع کہنے کا الزام لگایا۔

ولنعم ما قيل: وَ كَم مِن عَائِبٍ قَولًا صَحِيحًا...... وَ آفته مِنَ الفَهمِ السَّقِيمِ

کیونکہ یہ روایت بطریقِ محدثین ضعیف وموضوع ہوتی، تو بڑے بڑے حفاظ اس روایت کو ذکر کر کے سکوت نہ کرتے۔ جب کہ وہ ادنی ادنی ضعف کو ذکر کر کے روایت کو مجروح قرار دیتے ہیں اور مولانا عبدالرحمٰن صاحب نے جو "ابکار المنن" میں سکوت کیا ہے۔ اس کی وجہ غالبًا یہی معلوم ہوتی ہے۔ کہ مولانا موصوف نے اس قول کو لغو اور قابلِ جواب نہیں سمجھا۔ یا مولانا نے اس پر مفصل لکھنے کا ارادہ کیا ہو۔ اس وجہ سے اس جگہ مسامحت سے کام لیا۔ ورنہ قول نیموی کا محض بے علمی اور ناواقفی پر مبنی ہے۔ [1]

رفع الیدین کرنا اور نمازِ جنازہ وعیدین میں اس کی حیثیت؟

سوال: کیا پیغمبرِ اسلام اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم رفع یدین کرتے تھے اور آخر تک کرتے رہے؟ کیا نماز عید میں رفع یدین کرتے تھے اور کیا نمازِ جنازہ میں بھی رفع یدین کرنا چاہیے؟

جواب: امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے شاگردِ خاص امام محمد رحمہ اللہ اپنی مشہور کتاب موطأ میں رفع الیدین کی صحیح حدیث لائے ہیں۔ عبداللہ بن عمر سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب نماز شروع کرتے تو رفع الیدین کرتے اور جب رکوع کے لئے تکبیر کہتے تو رفع الیدین کرتے اور رکوع سے سر اُٹھاتے تو رفع الیدین کر کے سمع الله لمن حمده اور ربنا لك الحمد کہتے۔

اس سے معلوم ہوا کہ ان کے نزدیک رفع الیدین کی حدیث صحیح ثابت ہے، منسوخ نہیں۔

امام محمد بن یحیٰی ذہلی کا قول ہے، کہ رفع الیدین نہ کرنے والے آدمی کی نماز ناقص ہوگی۔ [2] پھر تکبیر تحریمہ کے وقت رفع الیدین کی ہمیشگی کے حنفیہ بھی قائل ہیں۔ جس دلیل کی بناء پر اس پر ہمیشگی ثابت ہے، اُسی

① التحقيق الراسخ، ص: ٥٥، ٥٦

② صحيح ابن خزيمة: ١/ ٢٩٨/ ٥٨٩

روایت میں رکوع سے پہلے اور رکوع کے بعد بھی رفع الیدین کا ذکر ہے، اگر پہلی رفع الیدین ہمیشہ ہے، تو باقی جگہ بھی ہمیشگی ثابت ہوگی۔ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی سابقہ روایت اس امر کی واضح دلیل ہے۔

مولانا اشفاق الرحمٰن حنفی رسالہ ''نور العین'' میں فرماتے ہیں: مواظبت عند الافتتاح (ابتدائی رفع یدین پر ہمیشگی) کا ثبوت نفسِ نقل رفع سے نہیں بلکہ نقلِ رفع، وعدمِ نقل ترک رفع سے ہے۔ (انتہی)

تو یہی دلیل متنازعہ فیہ محل کی ہوئی۔ نماز عیدین اور جنازہ کی تکبیر تحریمہ کے ساتھ رفع الیدین سب کے نزدیک ثابت ہے۔ البتہ زائد تکبیرات میں اختلاف ہے بعض احادیث سے عیدین کی نمازوں کی زوائد تکبیرات میں رفع الیدین کا استدلال کیا جاتا ہے، لیکن وہ محل نظر ہے۔ جس کا حاصل خلاصہ یہ ہے، کہ نماز عیدین کی تکبیروں میں رفع الیدین کے متعلق کوئی صریح دلیل نہیں، امام ابن حزم رحمہ اللہ کا فرمان ہے:

« لَم يَصِح قَطُّ أَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ رَفَعَ فِيهِ يَدَيهِ » ①

''رسول اللہ ﷺ سے قطعاً ثابت نہیں کہ آپ نے ان تکبیروں میں رفع الیدین کی ہو۔''

تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو! کتاب ''القول المقبول'' (لتلمیذی حافظ عبد الرؤف، شارحہ) اس طرح جنازہ کی زوائد تکبیرات میں بھی رفع الیدین مرفوع حدیث سے ثابت نہیں۔ ملاحظہ ہو! احکام الجنائز (علامہ البانی ص:۱۱۶)۔ تاہم ابن عمر سے موقوف بسندِ صحیح ثابت ہے۔ ②

نمازِ عید اور نمازِ جنازہ کی زائد تکبیرات میں رفع یدین کرنا

سوال: نمازِ عید اور نمازِ جنازہ کی زائد تکبیرات میں رفع یدین کرنا آنحضرت ﷺ سے ثابت نہیں۔ بعض علماء اسی لیے منع کرتے ہیں۔ حافظ عبداللہ صاحب روپڑی رحمہ اللہ اور بعض دیگر علماء رفع یدین کے قائل ہیں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے کسی کا عمل صحیح سند سے ثابت ہے یا نہیں؟ نمازِ جنازہ کے بارے میں علامہ البانی کی لکھی ہوئی کتاب میں شاید کسی صحابی (ابن عمر رضی اللہ عنہما) کا عمل صحیح سند سے ثابت ہے تلخیص میں نہیں۔ بلکہ ''تخریج صلوٰۃ الرسول ﷺ ''میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کے اثر کو سندھو صاحب نے ضعیف الاسناد بتایا ہے۔ کیا کسی اور صحابی سے بھی ایسا کرنا ثابت ہے؟

جواب: زوائد تکبیرات میں رفع یدین کرنا بسند صحیح حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے ثابت ہے، امام دارقطنی نے اپنی ''علل'' میں اس کو بیان کرکے کہا ہے کہ درست بات یہ ہے کہ اثر ہذا ابن عمر رضی اللہ عنہما پر موقوف ہے اور

---

① المحلی ٥/ ٨٣-٨٤

② بیہقی: ٤/ ٤٤

بیہقی (۴/۴۴) میں بھی اثر ہذا بسند صحیح ذکر ہوا ہے اور امام بخاری رحمہ اللہ نے اس کو ''بَابُ سُنَّةِ الصَّلٰوةِ عَلَى الجَنَازَةِ '' کے تحت معلق بیان فرمایا ہے اور ''جُزءُ رَفعِ اليَدَينِ '' میں اس کو موصول ذکر کیا ہے اور ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی بسند صحیح ثابت ہے:''اِنَّهُ كَانَ يَرفَعُ يَدَيهِ فِي تَكبِيرَاتِ الجَنَازَةِ.'' [1] حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا اثر واقعی ضعیف ہے۔ضعف کی وجہ ابن لھیعہ راوی کمزور ہے۔مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو! ''عون المعبود'' (۳/۱۹۵۔۱۹۶)

رکوع و بعد از رکوع اور رکعات کے احکام

رکوع میں مسنون تسبیحات کے علاوہ دعائیں پڑھنا:

(سوال) رکوع میں تسبیحاتِ مسنونہ کے علاوہ کوئی دوسری دعا مانگ لینا کیسا ہے،سجدہ میں قرآنی دعا مانگے یا نہ؟

(جواب) رکوع اور سجود میں منصوص دعائیں،تسبیحات وغیرہ ہی پڑھنی چاہئیں۔

دورانِ رکوع نظر کہاں رکھی جائے؟

(سوال): دوران رکوع نظر کہاں رکھنی چاہیے؟ (زبیر احمد اظہر،گوجرانوالہ)

(جواب): نگاہ سجدے والی جگہ پر ہی ہونی چاہیے۔ [2]

(سوال): رکوع کے دوران سجدے کی جگہ پر نظر رکھنی چاہیے یا پاؤں پر؟

(جواب): نگاہ سجدے کی جگہ ہونی چاہیے۔ [3]

کیا رکوع میں شامل ہونے والے کی رکعت ہو جائے گی؟

(سوال): سورۃ فاتحہ خلف امام حضرت عبادہ بن صامت کی روایت کی رُو سے فرض ہے اور علماء حضرات یہی کہتے ہیں کہ جو رکوع میں ملے اس کی رکعت نہیں ہوتی۔وہ رکعت سلام کے بعد پڑھے۔لیکن حکم ہے کہ جو شخص جمعہ کے دن دوسری رکعت کے رکوع میں مل جائے اس کی رکعت ہوگئی اور وہ صرف ایک رکعت اور ادا کرے

---

① سنن سعید بن منصور

② تفسیر ابن کثیر (۳/۳۱۶) مستدرك حاكم (۲/۴۲۶) صفة صلاة النبی ﷺ ص ۵۸ علامه البانی رحمه الله

③ ابن کثیر: ۳/ ۳۲۔ صفة الصلاة ص ۵۸

گا۔ اگر رکوع کے بعد ملا تو پھر چار رکعتیں ظہر کی پڑھے گا۔ اگر جمعہ میں مُدرِکِ رُکوع مُدرِکِ رکعت ہے تو باقی نمازوں میں کیوں نہیں؟

(جواب) : اصل بات یہ ہے، کہ جمعہ کے دن بھی ''مُدرِکِ رُکوع، (رکوع میں شامل ہونے والا) مُدرِکِ رکعت نہیں، یہاں جو اختلافی نکتہ ہے، وہ یہ ہے، کہ جمعہ کے دن نمازی کم از کم کتنی نماز امام کے ساتھ پائے، تو وہ ''مُدرِکِ جمعہ'' (جمعہ میں شامل ہونے والا) سمجھا جائے گا۔ امام ترمذی رحمہ اللہ نے اکثر اہلِ علم سے نقل کیا ہے، کہ کم از کم ایک رکعت مکمل پائے، تو وہ ''مُدرِکِ جمعہ'' سمجھا جائے گا۔ ان حضرات کا چند ایک احادیث سے استدلال ہے۔ لیکن صاحب ''تحفۃ الاحوذی'' رحمہ اللہ نے ان کو ضعیف قرار دیا ہے۔ دوسری طرف امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ اور ان کے موافقین کا مسلک ہے، کہ مقتدی امام کو جونسے جُزء میں پائے۔ اگرچہ وہ تشہد میں ہی کیوں نہ ہو، وہ ''مُدرِکِ جمعہ'' ہی سمجھا جائے گا۔

علامہ مبارک پوری رحمہ اللہ نے بھی عمومِ حدیث « فَمَا أَدرَكتُم فَصَلُّوا وَمَا فَاتَكُم فَأَتِمُّوا » [1] کے پیشِ نظر اس مذہب کو راجح قرار دیا ہے۔

پھر پہلے مسلک پر تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں: مجھے کسی بھی صحیح صریح حدیث کا علم نہیں ہو سکا، جو ان کے نظریہ کی مؤید ہو۔ [2] لیکن علامہ البانی نے ابنِ عمر رضی اللہ عنہما کی روایت، (جس میں جمعہ کی کم از کم ایک رکعت پانے کا تذکرہ ہے) کو مرفوع اور موقوف صحیح قرار دیا ہے اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت سے اس کو ضعیف گردانتے ہیں۔ بحث کے اختتام پر فرماتے ہیں:

« وَ جُملَةُ القَولِ أَنَّ الحَدِيثَ بِذِكرِ الجُمُعَةِ صَحِيحٌ مِن حَدِيثِ ابنِ عُمَرَ، مَرفُوعًا، وموقوفًا، لا من حديث أبي هريرة (والله ولي التوفيق) » [3]

ظاہر ہے حدیث ابن عمر رضی اللہ عنہما کے اثبات کی صورت میں ترجیح پہلے مسلک کو ہوگی۔ (واللہ اعلم)

رکوع میں ملنے والے کی رکعت کا حکم:

(سوال) : اہلِ حدیث میں اس مسئلہ پر اختلاف ہے ایک جماعت رکعت ہو جانے کی قائل ہے جب کہ دوسری کہتی ہے کہ رکعت نہیں ہوتی حالانکہ دونوں ''سورۃ فاتحہ'' پڑھنے کو فرض سمجھتے ہیں۔

---

[1] صحيح البخاري، بَابُ قَولِ الرَّجُلِ: فَاتَتنَا الصَّلَاةُ، رقم:٦٣٥

[2] تحفة الأحوذي ٣/٦٣، طبع مصري

[3] إرواء الغليل ٣/٩٠

جولوگ رکوع کی رکعت ہونے کے قائل ہیں وہ بخاری کی حدیث پیش کرتے ہیں کہ حضرت ابوبکرہ رضی اللہ عنہ ایک دن دوڑ کر رکوع کرتے ہوئے صف میں جا ملے۔ بعد سلام آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''اللہ تعالیٰ تیری حرص کو زیادہ کرے اور مت لوٹا، تو (یعنی نماز کو)۔''

اس حدیث سے یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ اگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم مدرک رکوع کو مدرک رکعت نہ جانتے تو پھر دوڑنے کی کیا ضرورت تھی۔

دوسری حدیث: ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس وقت سجدہ کی حالت میں آکر ملو تو اس رکعت کو شمار نہ کرو اور جو کوئی رکوع میں آکر ملے اس نے نماز پائی۔

تیسری حدیث: ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ (جس آدمی نے جمعہ کے دن دوسری رکعت کا رکوع پا لیا وہ ایک رکعت اور پڑھ لے۔ [1]

اس طرح اور حدیثیں لکھنے کے بعد لکھتے ہیں کہ جس طرح ظہر کی چار رکعت اس وقت تک فرض ہیں جب تک آدمی حضر میں ہو اور اگر سفر میں ہو تو دو رکعتوں کی فرضیت اٹھ جاتی ہے، اسی طرح فاتحہ اور قیام اس وقت تک فرض ہے جب تک امام رکوع میں نہ گیا ہو۔ جس وقت امام رکوع میں چلا گیا اس وقت یہ دونوں چیزیں فرض نہ رہیں۔ جو مدرکِ رکوع کو مدرکِ رکعت نہیں مانتے، ان کے پاس صرف اجتہاد ہے اور یہ کہ مندرجہ ذیل صحابہ، تابعی، تبع تابعی امام و صالحین اس کے قائل ہیں۔ مثلاً حضرت ابوبکر صدیق، حضرت ابوبکرہ، حضرت زید بن وہب، حضرت ابن مسعود، حضرت ابن عمر، حضرت ابوہریرہ، حضرت زید بن ثابت (رضی اللہ عنہم)، باقی نام و دلائل (مکتبہ ایوبیہ حدیث محل کراچی) کے شائع شدہ پمفلٹ ''رکوع کی رکعت'' میں دیکھے جا سکتے ہیں۔

براہ مہربانی اس کی وضاحت فرمائیں کیونکہ ہم تو ابھی تک یہی سنتے آئے ہیں کہ جس رکعت میں سورۃ فاتحہ نہ پڑھی جائے وہ رکعت نہیں ہوتی۔

جواب: رکوع کی رکعت کا مسئلہ مختلف فیہ مسائل میں سے ایک ہے۔ جمہور اہلِ علم اس بات کے قائل ہیں کہ ''مدرکِ رکوع'' (رکوع پانے والا) ''مدرک رکعت'' (رکعت پانے والا) ہے لیکن دوسری طرف محققین کی ایک جماعت کا موقف یہ ہے، کہ ''مدرک رکوع'' ''مدرکِ رکعت'' نہیں۔ جمہور کے دلائل میں سے وہ احادیث ہیں جن کی سائل نے نشاندہی کی ہے۔ یہاں ہم بالاختصار جمہور کے دلائل کا جائزہ پیش کرتے ہیں،

[1] سنن ابن ماجہ، بَابُ مَا جَاءَ فِيمَنْ أَدْرَكَ مِنَ الْجُمُعَةِ رَكْعَةً، رقم: ۱۱۲۱

ملاحظہ فرمائیں! ابوبکرہ رضی اللہ عنہ کی روایت میں ''اورمت لوٹا'' (یعنی نماز کو) یہ ترجمہ اس بناء پر ہے، کہ حدیث ہذا میں وارد لفظ ''و لا تُعِدهُ'' کو تاء کے ضمہ اور عین کے کسرہ سے پڑھا جائے۔ لیکن اس ضبط سے محدثین نے موافقت نہیں کی۔ چنانچہ صاحب ''المرعاۃ'' فرماتے ہیں:

« وَقَد أبعَدَ مَن قَالَ: وَ لَا تُعِد ،بِضَمِ التَّاءِ ،وَ كَسرِ العَينِ ، مِنَ الاِعَادَةِ ، أَى لَا تُعِدِ الصَّلٰوةَ الَّتِى صَلَّيتَها » (۹۸/۲)

یعنی ''اس آدمی کا نظریہ بعید ہے جس نے لفظ ''ولا تعد'' کو تاء کے ضمہ اور عین کے کسرہ اعادہ سے پڑھا ہے۔ یعنی اس نماز کو نہ لوٹا، جو میں پڑھ چکا ہوں۔''

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ رقمطراز ہیں:

« قوله : لَا تعد ضَبَطنَاهُ فِى جَمِيعِ الرِّوَايَاتِ ، بِفَتحِ أَوَّلِهِ، وَ ضَمِّ العَينِ ، مِنَ العَودِ. اِى لَا تَعُد اِلٰى مَا صَنَعتَ مِنَ السَّعيِ الشَّدِيدِ . ثُمَّ مِنَ الرَّكُوعِ دُونَ الصَّفِ. ثُمَّ مِنَ المَشيِ اِلَى الصَّفِّ. وَ قَد وَرَدَ مَا يَقتَضِى ذٰلِكَ صَرِيحًا فِى طُرُقِ حَدِيثِهٖ.»

یعنی ''تمام روایات جن کو ہم نے ضبط کیا ہے وہ ''لا تعد'' کی تاء کے فتحہ اور عین کے ضمہ ''عَوَدْ'' سے ہے۔ یعنی یہ جو تو نے سر پٹ دوڑ لگائی۔ پھر صف بندی سے پہلے رکوع کیا۔ پھر صف کی طرف دوڑا۔ آئندہ ایسا نہ کرنا۔''

اس حدیث کے طرق میں ایسے الفاظ موجود ہیں، جو بالصراحت اس شئی کے متقاضی ہیں۔ اسی بناء پر فرمایا: ''زَادَكَ اللّٰهُ حِرصًا وَ لَا تَعُدْ'' یعنی اللہ تعالیٰ تیرا شوق زیادہ کرے۔ آئندہ ایسا نہ کرنا۔ جس شے سے روک دیا جائے، اس سے دلیل لینا غیر درست ہے۔

حضرت امام بخاری رحمہ اللہ ''جزء القراءۃ'' میں فرماتے ہیں:

حدیث ابی بکرہ رضی اللہ عنہ سے معلوم ہوا، کہ کسی کو جائز نہیں ہے، کہ حضور کے منع کرنے کے بعد صف کے پیچھے سے رکوع کرتا ہوا امام کے ساتھ شریک ہو جائے، اور اس کا یہ مطلب نہیں ہے۔ کہ ابوبکرہ رضی اللہ عنہ نے رکوع کی رکعت کو شمار کیا ہو۔ نیز انھوں نے اس روایت میں یہ ٹکڑا بھی نقل کیا ہے۔ «وَاقضِ مَا سَبَقَكَ» یعنی ابوبکرہ اپنی رکوع والی رکعت کو پھر سے پڑھ لو۔ یہ روایت طبرانی میں بھی اسی طرح وارد ہے۔ پھر ''صحیحین'' میں واضح طور پر فرمانِ نبوی ہے: « فَمَا أَدرَكتُم فَصَلُّوا وَمَا فَاتَكُم فَأَتِمُّوا.» [1]

[1] صحیح البخاری، بَابُ قَولِ الرَّجُلِ: فَاتَتنَا الصَّلَاةُ، رقم: ۶۳۵ مع فتح الباری ۱/ ۱۱۷

لوگو! نماز میں بھاگ کر نہ ملو۔ جو امام کے ساتھ پاؤ، اسے پڑھ لو، اور جو حصہ فوت ہو جائے، اس کو امام کے سلام پھیرنے کے بعد پڑھ لیا کرو۔''

یعنی ابن حجر رحمہ اللہ زیر حدیث ہذا لکھتے ہیں:

« وَاستُدِلَّ بِهِ عَلٰى أَنَّ مَن أَدرَكَ الِامَامَ رَاكِعًا، لَم تُحسَب لَهُ تِلكَ الرَّكعَةُ لِلَامرِ بِاِتمَامِ مَا فَاتَهُ ، لِأَنَّهُ فَاتَهُ الوَقُوفُ ، وَالقِرَاءَ ةُ فِيهِ. وَ هُوَ قَولُ اَبِى هُرَيرَةَ ،وَ جَمَاعَة، بَل حَكَاهُ البُخَارِىُّ فِى القِرَاءَ ةِ خَلفَ الِامَامِ عَن كُلِّ مَن ذَهَبِ اِلٰى وُجُوبِ القِرَاءَ ةِ خَلفَ الِامَامِ .»

یعنی اس حدیث میں دلیل ہے ان لوگوں کی جو کہتے ہیں (کہ) رکوع میں شامل ہونے سے رکعت شمار نہ ہوگی۔ اس لیے کہ آپ نے فرمایا: فوت شدہ حصہ کو پڑھ لو! چونکہ اس صورت میں قیام اورقرأت فوت ہو چکے ہیں۔ اس لیے اس رکعت کا اعادہ ضروری ہے۔ یہی قول حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ اور ایک جماعت کا ہے۔ یہاں تک کہ امام بخاری نے فرمایا: جو صحابہ ''قراءۃ خلف الامام'' کو واجب سمجھتے ہیں، وہ سب اس طرح کہتے ہیں۔

امام ابن حزم رحمہ اللہ نے ''المحلّٰی'' میں اس حدیث پر اس طرح نوٹ دیا ہے۔ جمہور کے لیے اس حدیث میں ہرگز کوئی دلیل نہیں ہے۔ علامہ ابن حزم رحمہ اللہ نے قیام اور قرأت کے لازم ہونے پر مذکور حدیث سے استدلال کیا ہے اور جزماً فرمایا ہے کہ ''رکعت'' اور ''رکنِ رکعت'' کے فوت میں کوئی فرق نہیں۔ چونکہ جملہ ارکان کی تکمیل کے بغیر نماز نہیں ہوسکتی اور حدیث کا تقاضا یہ ہے کہ جو چیز امام پہلے ادا کر چکا ہے، اسے پورا کیا جائے۔ اس حکم سے کسی رکن کو خارج کرنا مناسب نہیں۔ اس کے بعد ابن حزم فرماتے ہیں: کہ بعض حضرات نے اس پر اجماع کا دعویٰ کیا ہے:''وهو كاذب فى ذلك''یعنی اجماع کا مدعی جھوٹا ہے۔

صاحب ''المرعاۃ'' فرماتے ہیں:

« وَ ذَهَبَ أبوهريرة، و اهل الظاهر، و ابن خزيمة، و ابوبكر الضبعى، والبخارى الى أنه لا تُجزِئُهُ تِلكَ الرَّكعَةُ ، اِذَا فَاتَهُ القِيَامُ ، وَ قِرَاءَ ةُ فَاتِحَةِ الكِتَابِ، وَ اِن اَدرَكَ الرُّكُوعَ مَعَ اِلامَامِ. وَقَد حُكِىَ هَذَا المَذهَبُ فِى «الفتح» عَن جَمَاعَةٍ مِنَ الشَّافِعِيَّةِ، وَ قَوَّاهُ الشَّيخُ تَقِىُّ الدِّينَ السبكى، وَغَيرُهُ من محدثى الشافعية. و رجحه المقبلى. قال: و قد بحثت هذه المسئلة ، وأحطتها فى جَمِيع بحثى فقهًا

و حديثاً، فلم أحصُلُ مِنها عَلى غَير مَا ذُكِرَت، يعني مِن عَدَمِ الاعتِدَادِ بِإِدرَاكِ الرُّكوعِ، فقط. وَهُوَ القَولُ الرَّاجِحُ عِندِي. فَلَا يَكُونُ مُدرِكُ الرُّكُوعِ مُدرِكَ الرَّكعَةِ لِمَا فَاتَه مِنَ القِيَامِ، وَ قِرَاءَةِ فَاتِحَةِ الكِتَابِ، وَ هُوَ مِن فُرُوضِ الصَّلٰوةِ، وَ أَركَانِهَا، ولحديث « اَدرَكتُم فَصَلُّوا ، وَ مَا فَاتَكُم ، فَأَتِمُّوا » (ص:٩٨)

یعنی ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ، اہل ظاہر اور ابن خزیمہ، ابوبکر ضبعی اور بخاری (رحمہم اللہ) اس طرف گئے ہیں، کہ یہ رکعت شمار نہیں ہوتی۔ کیونکہ اس سے قیام اور فاتحۃ الکتاب فوت ہو چکی ہے۔ اگرچہ امام کے ساتھ رکوع پالے۔ یہ مسلک حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے ''فتح الباری'' میں شوافع کی ایک جماعت سے نقل کیا ہے۔ محدثین شافعیہ سے تقی الدین سبکی وغیرہ نے اس مذہب کو قوی کہا ہے اور مقبلی نے اس کو راجح قرار دیا ہے اور کہا ہے: کہ میں نے اس مسئلہ کو خوب کھنگالا ہے۔ فقہ اور حدیث دونوں کی رُو سے اس پر نظر کی ہے۔ مجھے اس سے زیادہ کچھ حاصل نہیں ہوا، جو میں نے ذکر کر دیا ہے (یعنی رکوع میں ملنے سے رکعت شمار نہیں ہوتی) میرے نزدیک بھی راجح قول یہی ہے، کہ ''مدرک رکوع''، ''مدرک رکعت'' نہیں، کیونکہ اس سے قیام اور فاتحہ فوت ہو چکے ہیں۔ دونوں نماز کے فروض اور ارکان سے ہیں اور اس حدیث کی بناء پر کہ جو امام کے ساتھ پاؤ۔ پڑھ لو، اور جو فوت ہو جائے، اس کو بعد میں مکمل کرو۔''

اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی دوسری روایت کا جواب یہ ہے، کہ " مَن أَدرَكَ الرَّكعَةَ فَقَد أَدرَكَ الصَّلٰوةَ'' کا اصلاً ترجمہ اس طرح ہے۔ جس نے رکعت پائی اس نے نماز پائی، رکعت نام ہے، قیام ،قرأت اور رکوع اور سجدہ کے مجموعہ کا۔ یہاں رکعت کا معنی رکوع لینا غیر درست ہے۔ صاحب ''العون'' فرماتے ہیں: کہ اس مقام پر حقیقی معنی رکعت کے ہیں۔ اس حدیث سے ثابت نہیں ہوتا، کہ ''مدرک رکوع'' کی رکعت ہو جاتی ہے۔ (۳۳۲/۱) اس مفہوم کی تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے، کہ خود راویٔ حدیث حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ رکوع کی رکعت کے قائل نہیں تھے۔

دوسری بات یہ ہے، کہ یہ حدیث سنداً ضعیف ہے۔ اس میں ایک راوی یحییٰ بن ابی سلیمان المدینی ہے، وہ ضعیف ہے اور منکر الحدیث ہے۔ اس نے یہ روایت اپنے اُستاذ زید اور ابن المقبری سے نہیں سنی۔ اس لیے اس حدیث سے حجت نہیں پکڑی جا سکتی۔ (جزء القراءۃ) نیز فتاویٰ نذیریہ میں ہے کہ رکعت سے رکوع مراد لینا جائز نہیں۔ کیونکہ یہ ''معنی مجازی'' ہے اور لفظ کا مجازی معنی مراد لینا بلا قرینہ کے جائز نہیں اور اس حدیث

میں کوئی قرینہ نہیں ہے۔ ساتھ اس کے یہ حدیث ضعیف بھی ہے۔''صاحب العون'' فرماتے ہیں۔ سید نذیر حسین رکوع کی رکعت نہ ہونے کے قائل ہیں۔(۲۳۴/۱)

تیسری دلیل کو''دارقطنی'' نے بایں الفاظ نقل کیا ہے:

« مَن اَدرَکَ الرُّکُوعَ مِنَ الرَّکعَةِ الأخرَةِ یَومَ الجُمُعَةِ، فَلیُضِف اِلَیهَا الأخرٰی »[1]

یعنی ''جس شخص نے جمعہ کی نماز کی پچھلی رکعت کا رکوع پا لیا اس کو چاہیے، کہ دوسری رکعت ملا لے۔''

لیکن اس کی سند میں یاسین بن معاذ راوی ''متروک'' اور نا قابلِ حجت ہے۔

جمہور کی چوتھی دلیل بحوالہ ابن خزیمہ یوں ہے:

« مَن أَدرَکَ الرَّکعَةَ مِنَ الصَّلٰوةِ، فَقَد اَدرَکَهَا قَبلَ اَن یُّقِیمَ الاِمَامُ صُلبَه. »[2]

یعنی ''جس نے رکوع پالیا امام کے سَر اٹھانے سے پہلے، اس نے اس رکعت کو پالیا۔''

اس کا جواب یہ ہے، کہ اس کی سند میں یحییٰ بن حمید راوی مجہول الحال ہے۔ یہ حدیث نا قابلِ اعتماد ہے۔ جس طرح کہ ''جزء القراءة للبخاری میں ہے۔''دارقطنی'' نے بھی اس کو ضعیف قرار دیا ہے اور عقیلی نے اس کو ''الضعفاء'' میں ذکر کیا ہے اور یہ ''قبل ان یقیم الامام صلبه'' کے الفاظ بیان کرنے میں متفرد ہے۔ عقیلی نے کہا ہے، کہ اس حدیث کو مالک اور دیگر حفاظ اصحاب زہری رحمہ اللہ نے ذکر کیا ہے۔ لیکن انھوں نے آخری زیادتی کو بیان نہیں کیا۔ ممکن ہے یہ زُہری کا کلام ہو۔ اسی طرح اس حدیث میں قرۃ بن عبدالرحمٰن بھی متکلم فیہ ہے اور ''التعلیق المغنی'' میں ہے:

« فیه یحییٰ بن حمید، قال البخاری: لا یتابع فی حدیثه. »

بلاشبہ بعض صحابہ رکوع کی رکعت کے قائل ہیں۔ عام طور پر وہ لوگ ہیں جو سورۃ فاتحہ کی فرضیت کے قائل نہیں۔ اس فہرست میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کو شامل کرنا سخت غلطی ہے۔ ان سے بسندِ صحیح ثابت ہے، کہ وہ رکوع کی رکعت کے قائل نہیں۔ (عون المعبود (۳۳۳/۱) میں ہے:

« وَ قَالَ عَلِیُّ بنُ عَبدِ اللّٰهِ! اِنَّمَا اَجَازَ اِدرَاکَ الرُّکُوعِ مِن اَصحَابِ النَّبِیِّ ﷺ اَلَّذِینَ لَم یَرَوا القِرَاءَةَ خَلفَ الاِمَامِ. مِنهُم ابنُ مَسعُودٍ، وَ زَیدُ بنُ ثَابِتٍ، وَ ابنُ عُمَرَ. »

---

[1] سنن الدارقطنی، بَابٌ: فِیمَن یُدرِکُ مِنَ الجُمُعَةِ رَکعَةً أَو لَم یُدرِکهَا، رقم:۱۶۰۳

[2] صحیح ابن خزیمه، بَابُ ذِکرِ الوَقتِ الَّذِی یکون فیه المَأمُومُ ......الخ، رقم:۱۵۹۵

یاد رہے عبادات میں اصل حظر (ممانعت) ہے، یعنی قیاس ناجائز ہے۔ بفرض تسلیم رکوع کی رکعت کو حضری سفری نماز پر قیاس کرنا۔ قیاس مع الفارق ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے، کہ سفر میں ''قصر'' کرنا راجح مسلک کے مطابق واجب نہیں۔ نماز پوری پڑھنا بھی جائز ہے۔ جب کہ قیام اور فاتحہ ہر صورت واجب ہیں۔ ان کے بغیر نماز کا وجود ہی نہیں۔

لہٰذا جملہ دلائل و براہین کی روشنی میں ہمارے نزدیک راجح بات یہی ہے، کہ ''مدرک رکوع'' ''مدرک رکعت'' نہیں۔ مذکورہ دلائل کی موجودگی میں بعض حضرات کا دعویٰ مزعومہ کہ ہمارے پاس محض اجتہاد ہے۔ باعثِ تعجب اور قابلِ صد افسوس ہے۔ اللہ تعالیٰ جملہ مسلمانوں کو کتاب و سنت میں فہم و بصیرت عطا فرمائے! (آمین)

مزید بسط و تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو! ''عون المعبود'' :۱/۳۳۲ تا ۳۳۷، اور ''مرعاۃ المفاتیح'' (۲/ ۹۷ تا ۹۸)، اور ''دلیل الطالب علی ارجح المطالب'' للعلامہ القنوجی رحمہ اللہ۔ اور مختصر ''سنن ابی داؤد'' للمنذری کے حاشیہ پر علامہ احمد شاکر اور حامد فقہی بھی عدمِ رکعت کے قائل ہیں۔

حالتِ رکوع میں شامل ہونے والے کی رکعت کا حکم:

سوال کیا حالتِ رکوع میں شامل ہونے سے رکعت شمار ہوگی؟

جواب رکوع کی رکعت شمار کرنے میں علماء کا سخت اختلاف ہے، تاہم میری نظر میں راجح بات یہ ہے کہ قیام اور فاتحہ کے فوت ہونے کی بنا پر رکوع کی رکعت شمار نہیں ہوگی۔ صاحب مرعاۃ المفاتیح فرماتے ہیں:

«والحق عندی أن من أدرك الامام راكعًا و دخل معه فی الركوع لم تحسب له تلك الركعة » (۲/۱۲۹)

''میرے نزدیک حق بات یہ ہے کہ جو امام کے ساتھ رکوع کی حالت میں داخل ہوا، اس کی رکعت شمار نہیں ہوگی۔''

مدرکِ رکوع کی رکعت کا حکم:

سوال: اگر مقتدی جماعت کے ساتھ ملتا ہے اور امام کو رکوع کی حالت میں پاتا تو کیا کھڑا ہو کر فاتحہ پڑھ کر رکوع میں شامل ہو جائے۔ کیا رکعت ہو جائے گی؟

جواب: امام کے ساتھ رکوع کی حالت میں ملنے والے مقتدی کو فاتحہ کا آغاز نہیں کرنا چاہیے۔ البتہ پہلے

سے شریک ہونے والے کی بعض آیات باقی ہوں تو مکمل کر کے ساتھ مل جائے۔

کیا مدرک رکوع مدرک رکعت ہو سکتا ہے؟

سوال: جو آدمی رکوع میں شامل ہو جائے کیا اس کی رکعت ہو جائے گی یا نہیں؟ قرآن وسنت کی روشنی میں جواب دے کر مشکور فرماویں۔

جواب: رکوع کی رکعت کا مسئلہ چند سخت مشہور اختلافی مسائل میں سے ایک ہے جس پر زمانۂ قدیم سے بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ مزید طوالت کی ضرورت نہیں۔ بالاختصار، جمہور اہلِ علم ''مُدرِكِ رُكُوع'' (یعنی رکوع میں شامل ہونے والا) کی رکعت کو شمار کرتے ہیں۔ جب کہ دوسری طرف اہلِ علم کی ایک جماعت رکوع کی رکعت کی قائل نہیں۔ ان میں سے صحابیِ جلیل حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بھی ہیں، جن کی زیادہ تر مرویات پر اعتماد کرتے ہوئے جمہور رکوع کی رکعت کے قائل ہوئے ہیں۔ اگرچہ وہ اپنے مقام پر محلِ تأمل ہیں۔ امام المحدثین بخاری رحمہ اللہ بھی رکوع پر رکعت کو شمار نہیں کرتے۔ میرے نزدیک بھی أقرب إلى الصواب بات یہی ہے، کہ مدرکِ رُکوع مدرکِ رَکعت نہیں۔ دلیل اس کی مشہور صحیح حدیث ہے:

« فَمَا أَدرَكتُم فَصَلُّوا وَمَا فَاتَكُم فَأَتِمُّوا.»[1]

یعنی ''جو حصہ نماز کا امام کے ساتھ پالو، سو اسے پڑھ لو! اور جو رہ جائے، اسے (بعد میں) پورا کرلو!''

یہاں چونکہ مقتدی سے دو اہم چیزیں (قیام اور قرأتِ فاتحہ) جن پر نماز کا دارومدار ہے، وہ فوت ہو چکی ہیں۔ لہٰذا مذکورہ حدیث کی بناء پر رکعت کی قضائی ہونی چاہیے۔ (واللّٰہ أعلم بالصواب)

تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو! (فتاویٰ اهلحدیث جلد دوم ص ۱۵۶/۱۸۲) اور (هداية السائل إلى أدلة المسائل للنواب صديق حسن خان رحمہ اللہ (ص: ۱۸٦)

مقتدی نے ابھی فاتحہ کا کچھ حصہ پڑھا تھا کہ......:

سوال: کہا جاتا ہے کہ مُدرِکِ رکوع اس لیے مُدرِکِ رکعت نہیں کہ اس سے دو فرض (قیام اور قرأت) چھوٹ گئے ہیں۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس صورت میں آپ کا کیا فتویٰ ہو گا۔ جب نمازی قیام میں شامل ہو کر سورۂ فاتحہ شروع کرتا ہے ایک یا دو یا تین آیات پڑھ پاتا ہے اور امام رکوع میں چلا جاتا ہے۔ بینوا توجروا۔

جواب: اس صورت میں مأموم ''سورۂ فاتحہ'' پوری کر کے امام کے ساتھ مل جائے۔ چنانچہ حدیث میں ہے:

[1] صحيح البخاري، بَابُ قَولِ الرَّجُلِ: فَاتَتنَا الصَّلَاةُ، رقم: ٦٣٥

« لَا تُبَادِرُونِی بِرَکُوعٍ، وَ لَا بِسَجُودٍ، فَإِنَّهُ مَهمَا أَسبِقُکُم بِهِ، إِذَا رَکَعتُ، تُدرِکُونِی بِهِ إِذَا رفعتُ، إِنِّی قَد بَدَنتُ » [1]

’’مجھ سے پہلے رکوع کرو نہ سجدہ، میں اسے تم سے پہلے کر گزرتا ہوں، تو تم مسابقت کا ادراک میرے اٹھنے کے بعد کرلیا کرو۔ بے شک میں بوجھل (کبرسنی یا جسم کے بھاری ہونے کے اعتبار سے) ہو چکا ہوں۔‘‘

شارح حدیث امام خطابی رحمہ اللہ نے حدیث ھذا کا مفہوم یوں بیان فرمایا ہے:

« یُرِیدُ أَنَّهُ لَا یَضُرُّکُم رَفعِی رَاسِی مِنَ الرُّکُوعِ، وَ قَد بَقِیَ عَلَیکُم شَیءٌ مِنهُ، إِذَا أَدرَکتُمُونِی قَائِمًا قَبلَ أَن أَسجُدَ . وَ کَانَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ إِذَا رَفَعَ رَأسَهُ مِنَ الرُّکُوعِ، یَدعُو بِکَلَامٍ فِیهِ طُولٌ .»

مزید آنکہ ’إنجاح الحاجۃ‘ میں وضاحت یوں ہے:

« قَولُهُ مَهمَا أَسبِقُکُم بِهِ...... الخ أَيِ اللَّحظَةُ الَّتِی أَسبِقُکُم بِهَا فِی ابتِدَاءِ الرُّکُوعِ، وَ تَفُوتُ عَنکُم، تُدرِکُونَهَا إِذَا رَفَعتُ رَاسِی مِنَ الرُّکُوعِ، لِأَنَّ اللَّحظَةَ الَّتِی یَسبِقُ بِهَا الِامَامُ عِندَ الرَّفعِ، تَکُونُ بَدَلًا عَنِ اللَّحظَةِ الأُولٰی لِلمَأمُومِینَ. فَالفَرضُ مِنهُ أَنَّ التَّاخِیرَ الثَّانِی یَقُومُ مَقَامَ التَّاخِیرِ الأَوَّلِ، فَیَکُونُ مِقدَارُ رُجُوعِ الِامَامِ، وَ المَامُومِ سَوَاءً ، وَ کَذَا السَّجدَةُ.» [2]

ائمہ حدیث کی تشریحات کا حاصل یہ ہے، کہ مقتدی اگر امام کو قیام کے بعد رکوع میں اور رکوع کے بعد قومہ میں سجدہ میں جانے سے قبل پالے، تو درست ہے۔ ظاہر ہے کہ اتنے وقفے میں مأموم ’’سورۂ فاتحہ‘‘ کی تکمیل، پھر رکوع سے فراغت کے بعد امام کو سجدہ سے قبل بخوبی پاسکتا ہے۔

بالخصوص جب کہ ائمہ سنت کی عاداتِ کریمہ میں سے ہے، کہ وہ نبی کریم ﷺ کی اقتداء میں بعد از رکوع لمبی دعا میں مصروف رہتے اور تأخیر میں جو حکم رکوع کا ہے وہی سجدہ کا بھی ہے۔ تأخیر ثانی پہلی تأخیر کے قائم مقام ہوگی۔ نیز امام ابن حزم رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

« فَمَن دَخَلَ خَلفَ إِمَامٍ، فَبَدَأَ بِقِرَاءَةِ أُمِّ القُرآنِ . فَرَکَعَ الِامَامُ قَبلَ أَن یُتِمَّ هٰذَا الدَّاخِلُ أُمَّ القُرآنِ ، فَلَا یَرکَعُ حَتّٰی یُتِمَّهَا. ...... بُرهَانُ ذَالِكَ مَا ذَکَرنَاهُ مِن وُجُوبِ

[1] سنن أبی داود، بَابُ مَا یُؤمَرُ بِهِ المَأمُومُ مِنَ اتِّبَاعِ الإِمَامِ ،رقم:٦١٩،سنن ابن ماجه،بَابُ النَّهيِ أَن یُسبَقَ الإِمَامُ بِالرُّکُوعِ وَالسُّجُودِ، رقم:٩٦٣

[2] عون المعبود،١/٢٣٩

قِرَاءَ ةِ أُمِّ القُرآنِ فِی کُلِّ رَکعَةٍ . وَ قَد قَالَ رَسُولُ اللّٰہِ ﷺ مَہمَا اَسبِقُکُم بِہٖ ، إِذَا رَکَعتُ تُدرِکُونِی بِہٖ إِذَا رَفَعتُ » [1]

یعنی جس نے امام کی اقتداء میں شامل ہوکر ''سورہ فاتحہ'' شروع کی اور تکمیل سے پہلے امام رکوع میں چلا گیا، تو یہ شخص رکوع نہ کرے حتی کہ ''فاتحہ'' کو پورا کرے۔ دلیل اس کی وہی ہے، جو قبل ازیں ہم بیان کر چکے ہیں، کہ ہر رکعت میں فاتحہ واجب ہے۔

رسول اللہ ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے۔ میں آپ سے پہلے رکوع یا سجدہ کر گزرتا ہوں، تو تم لوگ مسابقت (پہلے کرنے کا) ادراک یعنی (کمی کا پورا کرنا) میرے اُٹھنے کے بعد کرلیا کرو۔''

ان واضح اور مُصَرَّ ح دلائل وشواہد سے معلوم ہوا، کہ مقتدی ''سورہ فاتحہ'' پوری کرکے رکوع کرے اور اگر بالفرض کوئی مقتدی فاتحہ نامکمل چھوڑ کر رکوع میں چلا جائے تو اس رکعت کا اعادہ ضروری ہے۔ کیونکہ فاتحہ مکمل سورت کا نام ہے۔بعض آیات نہیں صحیح حدیث میں وارد ہے:

« لَا صَلَاةَ لِمَن لَّم یَقرَأ بِفَاتِحَةِ الکِتَابِ» (متفق علیه) (هذا ما عندی و الله أعلم بالصواب وعلمه أتم) [2]

نمازِ باجماعت میں ملنے کا طریقہ:

سوال ''الاعتصام'' کے شمارہ ۳، جلد: ۴۷۔ ۲۰ جنوری/ ۱۹۹۵ء ، ۱۸شعبان کے ص:۹، پر حافظ ثناء اللہ صاحب مدنی حفظہ اللہ کا ایک سوال کا جواب چھپا ہے، جو راقم کو ذرا کھٹکتا ہے۔ اگر راقم کی رائے درست نہ ہوتو تصحیح فرما دینا۔ اگر مفتی صاحب حفظہ اللہ کی رائے درست ہوتو بذریعہ ''الاعتصام'' تائید فرما دینا، تاکہ راقم اپنے موقف پر نظر ثانی کر سکے۔ سوال درج ذیل ہے۔

امام جب رکوع وسجدہ میں ہوتو جو شخص نماز میں آکر ملے وہ تکبیر کہہ کر سینہ پر دونوں ہاتھ باندھ کر پھر تکبیر کہہ کر امام کے ساتھ رکوع یا سجدہ میں ملے یا کوئی اور صورت ہے۔ سوال ختم ہوا۔

حضرت حافظ ثناء اللہ صاحب کا جواب حدیث « تَحرِیمُهَا ، التَّکبِیرُ، وَ تَحلِیلُهَا، التَّسلِیمُ» [3]

---

[1] المحلّی:،جز:۳،ص:۱۷۹

[2] صحیح البخاری، باب وُجُوبِ القِرَائَةِ لِلاِمَامِ وَالمَامُومِ فِی الصَّلٰوةِ کُلِّهَا ......الخ،رقم:۷۵٦، صحیح مسلم:۳۹٤

[3] سنن أبی داؤد،بَابُ الْإِمَامِ یُحْدِثُ بَعْدَ مَا یَرْفَعُ رَأْسَهُ مِنْ آخِرِ الرَّكْعَةِ،رقم:٦١٨

اور روایت ابن عمر رضی اللہ عنہما «رَأَیتُ رَسُولَ اللّٰہِ ﷺ اِفتَتَحَ التَّکبِیر فِی الصَّلٰوۃِ ، فَرَفَعَ یَدَیہِ حِینَ یُکَبِّرُ» [1] کے پیش نظر نمازی پہلے مکمل طور پر نماز کی کیفیت کو اختیار کرے۔ پھر جس حالت میں امام کو پائے اسے اختیار کرے۔ جواب ختم ہوا۔

حضرت حافظ صاحب نے یہ واضح نہیں فرمایا: کہ سینے پر ہاتھ باندھ کر امام کے ساتھ ملنا ہے یا کہ صرف ''اللہ اکبر'' کہہ کر۔ حضرت کے یہ الفاظ کہ ''نمازی پہلے مکمل طور پر نماز کی کیفیت کو اختیار کرے۔......الخ'' بتا رہے ہیں، کہ ہاتھ وغیرہ سینے پر باندھ کر، پھر امام والی حالت میں داخل ہونا ہے، جب کہ راقم کا خیال ہے، کہ مقتدی پہلے ''اَللّٰہُ اَکبَرُ'' کہے اور رفع یدین کرے۔ جیسا کہ حضرت حافظ صاحب نے تحریر فرمایا ہے: اور ہاتھ وغیرہ باندھنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ سیدھا جس حال میں امام ہے، اسی حالت میں شامل ہو جائے۔ اگر ہاتھ باندھ کر شامل ہو، تو پھر مندرجہ ذیل حدیث سے مطابقت نہیں رہتی۔ حضرت علی اور معاذ رضی اللہ عنہما سے مروی ہے، رسولِ کریم ﷺ نے فرمایا: کہ جب تم میں سے کوئی نماز کو آئے تو...... «فَلیَصنَع ، کَمَا یَصنَعُ الاِمَامُ» [2] اسے وہ کرنا چاہیے، جو کہ امام کرتا ہے۔

تنبیہ: اس کی سند میں اگرچہ ضعف ہے۔ مگر علامہ عبید اللہ رحمانی رحمہ اللہ نے اس کو شواہد کی بناء پر قابلِ قبول قرار دیا ہے۔ [1]

اور علامہ مرحوم اس کی تشریح میں رقمطراز ہیں:

« أَی لِیُکَبِّر تَکبِیرَۃَ الاِحرَامِ، وَ یُوَافِقَ الاِمَامَ فِیمَا ھُوَ مِنَ القِیَامِ ، أَوِ الرَّکُوعِ، أَو غَیرِ ذٰلِكَ ، وَ لَا یُخَالِفُہُ بِأَدَاءِ مَا سَبَقَ مِنَ الصَّلٰوۃِ »

یعنی تکبیرِ تحریمہ کہے اور قیام، رکوع، سجود وغیرہ میں (مقتدی) امام کی موافقت کرے۔ سابقہ نماز کی ادائیگی کر کے امام کی مخالفت نہ کرے۔

نوٹ: قیام میں آ کر ملنے والے مقتدی کو ہاتھ باندھنے ہی ہیں۔ کیونکہ امام بھی اس حالت میں ہے مگر بعد ازاں مقتدی پابند نہیں۔ ''اللہ اکبر'' کہہ کر ''رفع الیدین'' کرے اور امام کی حرکات وسکنات میں شریک ہو

---

[1] صحیح البخاری، بَابٌ: إِلَی أَینَ یَرفَعُ یَدَیہِ؟، رقم:۷۳۸

[2] ترمذی بحوالہ مشکوٰۃ باب ما علی المأموم، فصل:۲ (سنن الترمذی، بَابُ مَا ذُکِرَ فِی الرَّجُلِ یُدرِكُ الإِمَامَ وَھُوَ سَاجِدٌ کَیفَ یَصنَعُ، رقم:۵۹۱)

[3] مرعاۃ المفاتیح:۳/۱۲۸

جائے۔ھذا ما عندی واللہ اعلم بالصواب۔ (الاعتصام: ۲۹ ستمبر ۱۹۹۵ء)

مزید وضاحت (از شیخ الحدیث حافظ ثناء اللہ مدنی)

ہاں اصل یہی ہے، کہ مسبوق تکبیر کہہ کر امام کے ساتھ مل جائے اور جہاں تک سینے پر ہاتھ رکھنے کا تعلق ہے، سو یہ ایک ذیلی حالت ہے۔ اس سے مقصود صرف نماز میں داخل ہونے کی عمومی حیثیت کا اظہار ہے اور حدیث «فَلیَصنَعْ کَمَا یَصنَعُ الِامَامُ »[1] اگر چہ ضعیف ہے، لیکن محدثین نے شواہد کی بناء پر اس کو قابلِ اعتبار سمجھا ہے۔ یہ اس بات پر محمول ہے، کہ بعد میں آنے والا امام کو جونسی حالت قیام، قعود، رکوع سجود میں سے پائے، ساتھ شامل ہو جائے۔ امام کے قیام کی طرف لوٹنے کا انتظار نہ کرے اور اگر کوئی شخص حدیث ہذا کے عموم کی بناء پر بغیر « وَضعُ الْأَیدِی » صرف تکبیر پر اکتفاء کرے۔ یہ بھی درست ہے۔ مجھے اپنی رائے پر اصرار نہیں۔

فتویٰ ہذا ''مرعاۃ'' اور ''سبل السّلام'' وغیرہ کی طرف مراجعت کے بعد ہی تحریر کیا گیا تھا۔ بہر صورت میرے خیال میں مسئلہ ہذا میں وُسعت کا پہلو موجود ہے۔ (واللہ أعلم بحقیقۃ الحال)

حوالہ کی نشاندہی:

مشارٌ الیہ روایت امام بیہقی کی کتاب ''شعب الایمان'' میں ہے۔ ملاحظہ ہو! (۳/۴۲۵) الرابع والعشرین من شعب الایمان و ھو باب فی الاعتکاف" عنون کے تحت یہ حدیث بیان ہوئی ہے۔

لیکن سخت ضعیف ہے۔ بذاتِ خود مصنف نے بھی اس کو ضعیف قرار دیا ہے چنانچہ فرماتے ہیں:

« وَ إِسنَادُہٗ ضَعِیفٌ، وَ مَا قَبلَہٗ(فِیہِ) ضُعفٌ. (واللہ أعلم) »

اور رقم الحدیث (۳۹۶۷) کے تحت فرماتے ہیں: درست بات یہ ہے، کہ علی بن حسین سے راوی محمد بن سلیم کے بجائے محمد بن زاذان ہے۔

« وَھُوَ مَترُوكٌ . قَالَ البُخَارِیّ: لَا یُکتَبُ حَدِیثُہٗ. »

اور حافظ ابن حجر رحمہ اللہ تقریب التھذیب میں رقمطراز ہیں:

« مُحَمَّدُ بنُ زَاذَانَ المَدَنِی مَترُوكٌ، مِنَ الخَامِسَةِ /ت ق.»

---

[1] سنن الترمذی، بَابُ مَا ذُکِرَ فِی الرَّجُلِ یُدرِكُ الإِمَامَ وَھُوَ سَاجِدٌ کَیفَ یَصنَعُ، رقم: ۵۹۱

رکوع کے بعد "سمع الله ......" اور "ربنا ولك ......" کہنے میں امام اور مقتدی کے احکام

امام اللھم ربنا ولك الحمد بلند آواز سے کہے یا آہستہ؟

سوال ''صلوٰۃ المسلمین'' میں مختلف احادیث سے ثابت کیا گیا ہے کہ امام رکوع سے سر اُٹھاتے وقت اللھم ربنا ولك الحمد بھی بلند آواز سے کہے۔ کیا کسی صحیح حدیث سے ثابت ہے کہ امام مذکورہ الفاظ سری طور پر کہہ سکتا ہے؟

جواب مذکورہ الفاظ امام کو ''سری'' کہنے چاہئیں چنانچہ صحیح بخاری میں رفاعہ بن رافعہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ

''ہم نبی ﷺ کے پیچھے تھے جب آپ نے رکوع سے سر اٹھایا تو سمع الله لمن حمده کہا۔ پیچھے ایک آدمی نے کہا: ربنا ولك الحمد...... الخ جب آپ نماز سے فارغ ہوئے تو فرمایا: ابھی یہ کلمات کس نے کہے؟ ایک آدمی نے کہا: میں نے، آپ نے فرمایا: میں نے تیس سے زائد فرشتوں کو دیکھا ہے، وہ اس کوشش میں تھے کہ کون پہلے اس نیک عمل کو لکھتا ہے۔''

یہ حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ اس ذکر کو جہری پڑھنا نبی ﷺ اور آپ کے اصحاب کا طریقہ نہ تھا، اگر تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اس ذکر کو جہری پڑھتے تو اس صحابی کی آواز سب کی آواز سے نمایاں نہ ہوتی۔ یہ سنت قولی تقریری ہے، اس کا تعلق بھی فرائض سے ہے لہٰذا سری پڑھنے میں کوئی اشکال نہیں۔

مقتدی کا امام کے ساتھ الله اكبر یا سمع الله وغیرہ کے الفاظ کہنا:

سوال : کیا مقتدی امام کے ساتھ ''اللہ اکبر'' اور ''سمع اللہ، وغیرہ کے الفاظ کہے یا کہ نہ کہے؟ مثلاً جب امام رکوع کو جاتا ہے تو کہتا ہے «اَللّٰہ اَکبَر» تو مقتدی بھی اللہ اکبر کہے اور اٹھتے ہوئے امام کہتا ہے «سَمِعَ اللّٰہُ ......الخ» اور کیا مقتدی بھی «سَمِعَ اللّٰہُ» کہے؟

جواب : امام کے ساتھ مقتدی بھی تکبیر کہے۔ حدیث میں ہے:

« اِذَا کَبَّرَ فَکَبِّرُوا، أی للإحرام، أو مُطلَقًا. فَیَشمَلُ تکبِیرَ النَّقل. زَادَ اَبُودَاوٗدَ، وَ لَا تُکَبِّرُوا حَتّٰی یُکَبِّرَ »[1]

---

[1] المرعاۃ:۲/۱۲۱

مقتدی کے لیے تسمیع کے بارے میں اہلِ علم کا اختلاف ہے۔ اصل یہ ہے کہ صرف تحمید پر اکتفاء کرے۔صاحب ''المرعاۃ'' فرماتے ہیں:

« وَلَيسَ فِي جَمعِ المَأمُومِ بَينَ التَّسمِيعِ، وَالتَّحمِيدِ. حَدِيثٌ صَحِيحٌ صَرِيحٌ. قَالَ الحَافِظُ : زَادَ الشَّافِعِيُّ أَنَّ المَأمُومَ يَجمَعُهُمَا أَيضًا، لٰكِن لَم يَصِح فِي ذٰلِكَ شَيءٌ» (٦٣٧/١)

امام کے سمع اللّٰہُ کہنے سے پہلے سمعَ اللّٰہ کہنا جائز ہے؟

سوال: جب امام «سَمِعَ اللّٰهُ لِمَن حَمِدَهٗ» کہے ،تو « رَبَّنَا لَكَ الحَمد» کہو، جولوگ اس کا یہ مطلب بیان کرتے ہیں کہ «سَمِعَ اللّٰه......» کے بعد «رَبَّنَا لَكَ الحَمد......» کہو' ان کے نزدیک امام کے «سَمِعَ اللّٰهُ ......» کہنے سے پہلے «سَمِعَ اللّٰه......» کہنا جائز ہے۔ یا نہیں؟

جواب: جولوگ مأموم (مقتدی) کے سمع اللہ کہنے کے قائل ہیں ان کے نزدیک "سَمِعَ اللّٰه" امام کی اتباع میں کہنا چاہیے نہ کہ پہلے۔ کیونکہ امامت کا مفہوم یہی ہے، کہ مأموم کسی صورت امام سے سبقت نہ کرے۔

سمع الله اور ربنا ولك الحمد مقتدی اور امام دونوں کہیں؟

سوال: کیا امام اور مقتدی دونوں کو «سَمِعَ اللّٰهُ لِمَن حَمِدَهٗ» اور «رَبَّنَا لَكَ الحَمدُ» (دونوں کلمات) کہنا ضروری ہے؟

جواب: امام تسمیع اور تحمید دونوں کو جمع کرے۔ صحیح حدیث میں ہے:

« إِنَّهٗ كَانَ حِينَ رَفَعَ رَأسَهٗ مِنَ الرَّكُوعِ، يَقُولُ: سَمِعَ اللّٰهُ لِمَن حَمِدَهٗ، رَبَّنَا لَكَ الحَمدُ »[1]

''رسول اللہ ﷺ جب اپنا سر رکوع سے اُٹھاتے تو فرماتے:"سَمِعَ اللّٰهُ لِمَن حَمِدَهٗ رَبَّنَا لَكَ الحَمدُ."

اور مأموم صرف تحمید پر اکتفاء کرے۔صاحب ''المرعاۃ'' فرماتے ہیں:

« وَلَيسَ فِي جَمعِ المَأمُومِ بَينَ التَّسمِيعِ، وَالتَّحمِيدِ حَدِيثٌ صَحِيحٌ صَرِيحٌ. قَالَ الحَافِظ: زَادَ الشَّافِعِيُّ، أَنَّ المَأمُومُ يَجمَعُهُمَا أَيضًا ، لٰكِن لَم يَصِحُّ فِي ذٰلِكَ شَيءٌ » (٦٣٧/١)

''مأموم کے لیے تسمیع اور تحمید کو جمع کرنے کی کوئی صحیح صریح حدیث موجود نہیں۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے

---

[1] سنن أبي داؤد، بَابُ افتِتَاحِ الصَّلَاةِ ،رقم:٧٣٣

کہا ہے، کہ امام شافعی رحمہ اللہ نے مزید بیان فرمایا ہے: کہ مقتدی دونوں کو جمع کرے، لیکن اس بارے میں کوئی صحیح شے وارد نہیں۔ لہٰذا وہ صرف تحمید پر اکتفاء کرے۔''

کیا ہر نماز میں سمع اللہ لمن حمدہ کہنے پر فرشتے حاضر ہوتے ہیں؟

سوال: کتب احادیث میں جو یہ واقعہ مذکور ہے کہ «سَمِعَ اللّٰهُ لِمَن حَمِدَهٗ » کے جواب میں بلند آواز سے جواب دینے پر فرشتے تیزی سے زمین کی طرف آئے اور ان الفاظ کو لکھنے لگے اس وجہ سے بہت سے احباب باواز بلند «رَبَّنَا لَكَ الحَمدُ......الخ » کے الفاظ کہتے ہیں پوچھنا یہ ہے کہ کیا تا قیامت فرشتے ہر بار زمین پر اس سلسلے میں اترتے رہیں گے؟

جواب: فرشتوں کی آمد و رفت لیل و نہار مختلف اوقات میں جاری رہتی ہے۔

سمع اللہ لمن حمدہ کے بعد ربنا و لك الحمد کب کہے؟

سوال: جو لوگ امام کے پیچھے مقتدی کے لیے «سَمِعَ اللّٰهُ لِمَن حَمِدَهٗ » تجویز کرتے ہیں، ان کے نزدیک امام کے ساتھ ساتھ «رَبَّنَا لَكَ الحَمدُ» کہنے کی غرض سے امام کے ساتھ ساتھ «سَمِعَ اللّٰهُ لِمَن حَمِدَهٗ » کہا جائے گا یا عام اصول کے مطابق امام کے بعد اور « رَبَّنَا لَكَ الحَمدُ »بھی امام کے بعد؟ میرے علم میں آیا ہے کہ آپ مقتدی کے لیے «سَمِعَ اللّٰهُ لِمَن ......» کہنے کے قائل نہیں۔

جواب: پہلے ذکر ہو چکا ہے کہ مقتدی «رَبَّنَا لَكَ الحَمدُ» امام کے بعد کہے گا، ساتھ نہیں اسی طرح کا معاملہ «سَمِعَ اللّٰهُ لِمَن حَمِدَهٗ » کا ہوگا، ان لوگوں کے نزدیک جو مقتدی کے لیے «سَمِعَ اللّٰهُ لِمَن حَمِدَهٗ » کے جواز کے قائل ہیں۔ نیز صاحب '' اَلمِرعَاة '' فرماتے ہیں:

«وَلَيسَ فِى جَمعِ المَأمُومِ بَينَ التَّسمِيعِ وَالتَّحمِيدِ حَدِيثٌ صَحِيحٌ صَرِيحٌ. قَالَ الحَافِظُ: زَادَ الشَّافِعِیُّ أَنَّ المَأمُومَ يَجمَعُهُمَا اَيضًا. لٰكِن لَم يَصِحَّ فِى ذٰلِكَ شَیءٌ.»(١/ ٦٣٧)

''مقتدی کے «سَمِعَ اللّٰهُ »اور «رَبَّنَا لَكَ الحَمدُ» (دونوں) کو جمع کرنے کے بارے میں کوئی صحیح صریح حدیث موجود نہیں۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: کہ امام شافعی رحمہ اللہ نے کہا ہے، کہ مقتدی بھی دونوں کو جمع کرے، لیکن اس بارے میں کوئی صحیح بات ثابت نہیں۔''

جو میرا نظریہ ہے اس کی بنیاد بھی یہی بات ہے، کہ اس سلسلے میں کوئی صحیح صریح حدیث ثابت نہیں۔

کیا مقتدی بھی سمع اللہ لمن حمدہ کہے؟

سوال : آج کل ہمارے ہاں یہ مسئلہ زیرِ بحث ہے کہ مقتدی«سَمِعَ اللّٰهُ لِمَن حَمِدَهٗ »نہ کہے۔ کیونکہ حدیث میں وارد ہے کہ« إِذَا قَالَ الإِمَامُ سَمِعَ اللّٰهُ لِمَن حَمِدَهٗ، فَقُولُوا: رَبَّنَا وَ لَكَ الحَمدُ»[1] اور امام المحدثین امام بخاری رحمہ اللہ نے «بَابَ مَا يَقُولُ الإِمَامُ، وَ مَن خَلفَهٗ إِذَا رَفَعَ رَاسَهٗ مِنَ الرَّكُوعِ» کے تحت یہی حدیث رقم فرمائی ہے جس سے امام اور مقتدی میں تقسیم کی دلیل اخذ کی جاتی ہے کہ امام کے لیے «سَمِعَ اللّٰهُ ......الخ» اور مقتدی کے لیے«رَبَّنَا لَكَ الحَمدُ» ہے۔

حالانکہ ''صحیح بخاری میں ہے کہ:«كَانَ النَّبِیُّ ﷺ قَالَ: سَمِعَ اللّٰهُ لِمَن حَمِدَهٗ. فَقَالَ: اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا وَلَكَ الحَمدُ.»[2] اب سوال یہ ہے کہ جب امام« رَبَّنَا لَكَ الحَمد» کہہ سکتا ہے تو مقتدی کے لیے «سَمِعَ اللّٰهُ لِمَن حَمِدَهٗ» کی ممانعت کیوں؟ اگر مقتدی کے لیے «سَمِعَ اللّٰهُ لِمَن حَمِدَهٗ» کی ممانعت ثابت کی جائے تو حدیث:« إِذَا قَالَ الإِمَامُ ﴿غَيرِ المَغضُوبِ عَلَيهِم وَ لَا الضَّالِّينَ﴾ فَقُولُوا: آمِينَ»[3] سے مقتدی کے لیے سورۂ فاتحہ ادھوری چھوڑ کر آمین ہی کہنا ہو گا جب کہ ایسی نماز ''خداج'' غیر تمام کے زمرہ میں ہوگی۔ کیونکہ حدیث ہے:

« لَا صَلٰوةَ لِمَن لَّم يَقرَأ بِفَاتِحَةِ الكِتَابِ »[4]

پھر آپ ﷺ کا فرمان:« اِنَّمَا جُعِلَ الاِمَامُ لِيُؤتَمَّ بِهٖ» بھی اس امر کا مقتضی ہے، کہ امام اور مقتدی میں تقسیم نہ کی جائے بلکہ « إِذَا كَبَّرَ الإِمَامُ فَكَبِّرُوا، وَ إِذَا رَكَعَ فَاركَعُوا، وَ إِذَا سَجَدَ فَاسجُدُوا، وَ اِذَا قَرَأَ فَأَنصِتُوا»[5] یعنی قرأتِ قرآن کے ماسوا باقی تمام اعمال میں امام کی اقتداء کی جائے۔

پھر امام ترمذی رحمہ اللہ کے یہ الفاظ :«قَالَ ابنُ سِيرِينَ، وَ غَيرُهٗ يَقُولُ مَن خَلفَ الِامَامِ: سَمِعَ

[1] صحیح البخاری،بَابُ فَضلِ اللّٰهُمَّ رَبَّنَا لَكَ الحَمدُ،رقم:٧٩٦

[2] صحیح البخاری،بَابُ فَضلِ اللّٰهُمَّ رَبَّنَا لَكَ الحَمدُ،رقم:٧٩٥

[3] صحیح البخاری، بَابُ جَهرِ المَأمُومِ بِالتَّأمِينِ،رقم:٧٨٢

[4] صحیح البخاری، باب وُجُوبِ القِرَاءَةِ لِلاِمَامِ وَالمَامُومِ فِی الصَّلٰوةِ كُلِّهَا ...... الخ،رقم: ٧٥٦،صحیح مسلم:٣٩٤

[5] سنن ابن ماجه،بَابُ إِذَا قَرَأَ الإِمَامُ فَأَنصِتُوا ،رقم:٨٤٦

اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهُ رَبَّنَاوَلَكَ الحَمدُ مِثلَ مَا يَقُولُ الإمَامُ- وَ بِهِ يَقُولُ الشَّافِعِيُّ، وَ إِسحَاقُ»
بھی امام اور مقتدی کی عدمِ تقسیم پر دال ہیں اور ''دار قطنی'' میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

« كُنَّا إِذَا صَلَّينَا خَلفَ رَسُولِ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: سَمِعَ اللّٰهُ لِمَن حَمِدَهُ . قَالَ: من وَّرَائهُ: سَمِعَ اللّٰهُ لِمَن حَمِدَهُ »

اس روایت میں اظہر من الشمس ہے کہ امام اور مقتدی دونوں ہی «سَمِعَ اللّٰهُ لِمَن حَمِدَهُ» کہیں اور «رَبَّنَا لَكَ الحَمد» بھی، یعنی تقسیم نہیں۔

آپ سے گزارش ہے کہ آپ اس مسئلہ کی مزید وضاحت فرمائیں تا کہ جملہ اشکال رفع ہوسکیں۔

(جواب): مسئلہ ہذا کے تین پہلو ہیں۔ سبھی بحث و تمحیص کے متقاضی ہیں۔ بالاختصار ملاحظہ فرمائیں:

① کیا امام بعداز رکوع صرف تسمیع « سَمِعَ اللّٰهُ لِمَن حَمِدَهُ، پر اکتفاء کرے یا ساتھ تحمید « رَبَّنَا لَكَ الحَمدُ» بھی ملائے؟

② اس حالت میں منفرد (اکیلا) کیا کرے۔ دونوں کلمے جمع کرے یا نہ؟

③ کیا مأموم (مقتدی) صرف تحمید پر اِکتفا کرے یا ساتھ تسمیع بھی ملاسکتا ہے؟

جملہ سوالات کے جوابات بالترتیب پیشِ خدمت ہیں:

①..... بظاہر حدیث « إِذَا قَالَ الإِمَامُ سَمِعَ اللّٰهُ لِمَن حَمِدَهُ، فَقُولُوا رَبَّنَا لَكَ الحَمد.» [1] میں امام اور مقتدی کی تقسیم نظر آتی ہے۔ اسی بناء پر امام مالک اور امام ابوحنیفہ رحمہما اللہ تفریق و تقسیم کے قائل ہیں۔ یعنی امام صرف ''سَمِعَ اللّٰهُ لِمَن حَمِدَهُ '' کہے اور مقتدی'' اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا لَكَ الحَمدُ''۔ لیکن علمائے محققین اور ناقدینِ حدیث نے اس استدلال سے موافقت نہیں کی، بلکہ اس کو ناپسند فرمایا ہے۔ ان کا کہنا ہے: کہ حدیث ہذا میں تقسیم مقصود نہیں ہے، بلکہ یہاں تو صرف مقتدی کے لیے ''تحمید'' کے وقت کا تعین مقصود ہے۔ جیسا کہ '' فاءِ تعقیب'' لفظ ''فَقُولُوا'' میں اس پر دال ہے۔ حاصل یہ ہے، کہ جب امام «سَمِعَ اللّٰهُ لِمَن حَمِدَهُ»
کہہ کر فارغ ہو جائے، تو پھر مقتدی ''رَبَّنَا لَكَ الحَمدُ'' کہے۔ اس حدیث میں امام کے اعتبار سے ''تحمید'' کا اثبات ہے اور نہ نفی۔

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے استدلال ہذا کو محلِ نظر قرار دیا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

[1] صحيح البخاري، بَابُ جَهْرِ المَأْمُوم بِالتَّأْمِينِ، رقم:۷۸۲

« أُستُدِلَّ بِهِ عَلٰی أَنَّ الِامَامَ لَا يَقُولُ: رَبَّنَا لَكَ الحَمدُ. وَ عَلٰی أَنَّ المَامُومَ لَا يَقُولُ: سَمِعَ اللّٰهُ لِمَن حَمِدَهُ، لِكَونِ ذٰلِكَ، لَم يُذكَر فِی هٰذِهِ الرِّوَايَةِ ، كَمَا حَكَاهُ الطَّحَاوِی، وَ هُوَ قَولُ مَالِكٍ، وَ أَبِی حَنِيفَةَ. وَ فِيهِ نَظرٌ ، لِأَنَّهُ لَيسَ فِيهِ مَا يَدُلُّ عَلَی النَّفیِ، بَل فِيهِ أَنَّ قَولَ المَامُومِ:«رَبَّنَا لَكَ الحَمدُ» يَكُونُ عَقبَ قَولِ الِامَامِ: «سَمِعَ اللّٰهُ لِمَن حَمِدَهُ» وَالوَاقِعُ فِی التَّصوِيرِ ذٰلِكَ . لِأَنَّ الِامَامَ يَقُولُ التَّسمِيعَ فِی حَالِ انتِقَالِهِ. وَالمَأمُومُ يَقُولُ: اَلتَّحمِيدَ فِی حَالِ اِعتِدَالِهِ. فَقَولُهُ: يَقَعُ عَقبَ الِامَامِ، كَمَا فِی الخَبَرِ.وَ هٰذَا المَوضِعُ يَقرُبُ مِن مَسأَلَةِ التَّأمِينِ ، كَمَا تَقَدَّمَ مِن أَنَّ لَا يَلزَمُ مِن قَولِهِ:«اِذَا قَالَ:﴿وَ لَا الضَّالِّينَ﴾ فَقُولُوا: آمِينَ. أَنَّ الِامَامَ لَا يُؤَمِّنُ بَعدَ قَولِهِ: ﴿وَلَا الضَّالِّينَ﴾. وَ لَيسَ فِيهِ أَنَّ الِامَامَ يُؤَمِّنُ ، كَمَا أَنَّهُ لَيسَ فِی هٰذَا، أَنَّهُ يَقُولُ:«رَبَّنَا لَكَ الحَمدُ،لٰكِنَّهُمَا مُستَفَادَانِ مِن أَدِلَّةٍ أُخرٰی صَحِيحَةٍ صَرِيحَةٍ.» [1]

یعنی ''اس حدیث سے استدلال کیا گیا ہے کہ امام ''رَبَّنَا لَكَ الحَمدُ'' نہ کہے اور مأموم '' سَمِعَ اللّٰهُ لِمَن حَمِدَهُ'' نہ کہے۔ اس لیے کہ یہ اس روایت میں بیان نہیں ہوا، جس طرح کہ طحاوی نے اس کی حکایت کی ہے اور یہی قول امام مالک رحمہ اللہ اور ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا ہے، لیکن یہ قول محلِ نظر ہے۔ کیونکہ اس حدیث میں کوئی ایسی شے نہیں جو نفی پر دال ہو۔ بلکہ اس میں تو صرف یہ ہے کہ مأموم کا قول ''رَبَّنَا لَكَ الحَمدُ'' امام کے قول ''سَمِعَ اللّٰهُ لِمَن حَمِدَہ'' کے بعد ہونا چاہیے اور واقع میں اس کی تصویر یوں ہے، کہ امام ''تسمیع'' حالتِ انتقال میں کہتا ہے، جب کہ مأموم ''تحمید'' حالتِ اعتدال میں کہتا ہے۔ اس لحاظ سے مأموم کا قول امام کے بعد ہو گا، جس طرح کہ حدیث میں ہے۔ یہ مقام ''مسئلۂ تامین'' کے قریب ہے۔ (کما تقدم) جس طرح کہ فرمانِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم «اِذَا قَالَ الِامَامُ﴿وَلَا الضَّالِّينَ﴾۔ فَقُولُوا: آمِينَ! ''یعنی جب امام (آمین) کہے، تو تم (آمین) کہو۔ اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ امام ﴿وَلَا الضَّالِّينَ﴾ کے بعد (آمین) نہ کہے اور اس میں یہ بھی نہیں ہے، کہ امام (آمین) کہے، جس طرح یہاں یہ نہیں ہے کہ امام ''رَبَّنَا لَكَ الحَمد'' نہ کہے۔ لیکن یہ دونوں مسئلے دیگر صحیح صریح دلائل سے مستفاد (حاصل) ہیں۔'' (انتہٰی)

[1] فتح الباری ۲/۲۸۳

اس سلسلہ میں وارد صریح روایات جو امام کی ''تحمید'' کے جواز پر نص ہیں۔ ''بخاری اور ''مسلم میں ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے اور ''بخاری میں ابن عمر رضی اللہ عنہما اور ''مسلم میں عبد اللہ بن ابی اوفی اور علی بن ابی طالب سے منقول ہیں۔ ان میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز کے وصف میں بیان ہوا ہے، کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم جب رکوع سے سر اٹھاتے تو "سَمِعَ اللّٰهُ لِمَن حَمِدَهٗ رَبَّنَا لَكَ الحَمد" پڑھتے۔ صاحب ''المرعاۃ'' فرماتے ہیں:

" فَهٰذَا صَرِيحٌ فِي مَشرُوعِيَّةِ التَّحمِيدِ لِلاِمَامِ." (۱/۶۳۶)

یعنی پس یہ واضح ہے، کہ امام کے لیے ''تحمید'' مشروع ہے۔

بعض لوگ اس مقام پر شُبہ پیش کرتے ہیں کہ تقسیم والی حدیث ''قولی'' ہے، جب کہ جمع والی ''فعلی'' ہے، جب کہ اصولی قاعدہ ہے، کہ قول کو فعل پر مقدم کیا جاتا ہے۔ اس اشکال کا حل یوں ہے، کہ یہ قاعدہ وہاں جاری ہوتا ہے جہاں قولی حدیث فعلی کے خلاف ہو۔ جب کہ مقامِ بحث میں سرے سے تعارض کا وجود ہی معدوم ومفقود (موجود نہیں) ہے۔ بعض نے یہاں یہ بھی مفروضہ قائم کیا ہے۔ شاید آپ کا فعلِ جمع نفلی نماز میں منحصر ہو۔ جواباً عرض ہے، کہ یہ بات بھی بعید از قیاس ہے۔ کیونکہ غالب اَحوال میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم امام کی حیثیت میں ہوتے تھے۔ پھر لیت ولعل اور مفروضوں پر بناء رکھنا دانشمندی سے بعید، بلا فائدہ اور غیر معقول شئ ہے۔ بلکہ ''صحیح بخاری'' ''کتاب الاعتصام'' میں صبح کی نماز کی صراحت موجود ہے۔ یاد رہے سرتاج حنفیہ مولانا عبد الحی لکھنوی رحمہ اللہ نے "السعایة" میں اسی بات کو ترجیح دی ہے، کہ امام ''تسمیع'' اور ''تحمید'' کو جمع کرے۔ فرماتے ہیں:

« لٰكِنَّ الدَّلِيلَ يُسَاعِدُ الجَمعَ . فَهُوَ الْاَحَقُّ بِالاِختِيَارِ.»

بلکہ جمہور اہلِ علم، امام احمد، شافعی، ابو یوسف، محمد اور متاخرین حنفیہ رحمہم اللہ اس بات کے قائل ہیں۔

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ رقمطراز ہیں:

« اَلْاَحَادِيثُ الصَّحِيحَةُ تَشهَدُ لَهٗ »[1]

یعنی صحیح احادیث اسی مسلک کی مؤید ہیں۔

۲۔ جہاں تک منفرد کا تعلق ہے، سو اس بارے میں امام طحاوی اور حافظ ابن عبد البر رحمہما اللہ نے اجماع نقل کیا ہے، کہ اکیلا نماز پڑھنے والا ''تسمیع'' اور ''تحمید'' کو جمع کرے گا۔

۳۔ مأموم کے بارے میں امام شافعی، اسحاق، ابو بردہ عطاء، داؤد اور ابن سیرین رحمہم اللہ اس بات کے قائل

[1] فتح الباری ۲/۲۸۴

ہیں، کہ امام اور منفرد کی طرح یہ بھی ''تسمیع'' اور ''تحمید'' کو جمع کرے۔ ان لوگوں کا استدلال ''صحیحین'' کی بعض عمومی احادیث سے ہے۔ مثلاً حدیث ابی ہریرۃ رضی اللہ عنہ میں ہے:« ثُمَّ يَقُولُ: سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهُ، حِينَ يَرفَعُ صُلبَهُ مِنَ الرَّكعَةِ، ثُمَّ يَقُولُ : وَ هُوَ قَائِمٌ : رَبَّنَا وَ لَكَ الحَمدُ.»[1] ساتھ اس حدیث کا انضمام (ملانا) بھی کر لیا جاتا ہے کہ « صَلُّوا كَمَا رَأَيتُمُونِي أُصَلِّي »[2]

اور ''دار قطنی'' کی روایت میں بطورِ نص الفاظ یوں ہیں:

« عَن اَبِی هُرَيرَةَ قَالَ : كُنَّا إِذَا صَلَّينَا خَلفَ رَسُولِ اللّٰهِ ﷺ فَقَالَ: سَمِعَ اللّٰهُ لِمَن حَمِدَه. قَالَ من وَرَاءَهُ : سَمِعَ اللّٰهُ لِمَن حَمِدَهُ »[1]

یعنی حضرت ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہا: جب ہم رسول اللہ ﷺ کی اقتداء میں نماز پڑھتے۔ آپ ﷺ فرماتے:«سَمِعَ اللّٰهُ لِمَن حَمِدَهُ» مقتدی بھی کہتے:«سَمِعَ اللّٰهُ لِمَن حَمِدَهُ»

لیکن حدیث ہذا میں امام دار قطنی رحمہ اللہ نے اس بات کی تصریح کی ہے، کہ محفوظ الفاظ یوں ہیں:

" اِذَا قَالَ الإِمَامُ: سَمِعَ اللّٰهُ لِمَن حَمِدَهُ. فَليَقُل مَن وَّرَاءَهُ:" رَبَّنَا لَكَ الحَمدُ "

یعنی ''امام جب«سَمِعَ اللّٰهُ لِمَن حَمِدَهُ» کہے، تو مقتدی کو «رَبَّنَا لَكَ الحَمدُ» کہنا چاہیے۔''

اس طرح بریدہ رضی اللہ عنہ سے مروی ''دار قطنی'' کی دوسری روایت ہے

« يَا بُرَيدَةُ ! إِذَا رَفَعتَ رَأسَكَ مِنَ الرَّكُوعِ، فَقُل: « سَمِعَ اللّٰهُ لِمَن حَمِدَهُ ، اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا لَكَ الحَمدُ، مِلأَ السَّمٰوٰت، وَ مِلأَ الارضِ ، وَ مِلَأ مَا شِئتَ مِن شَیءٍ بَعدُ.»[1]

بظاہر حدیث ہذا امام اور منفرد اور ماموم سب کو شامل ہے۔ لیکن اس کی سند ضعیف ہے۔ اس بناء پر صاحب ''المرعاۃ'' فرماتے ہیں:

«وَ لَيسَ فِی جَمعِ المَأمُومِ بَينَ التَّسمِيعِ، وَالتَّحمِيدَ حَدِيثٌ صَحِيحٌ صَرِيحٌ» (۶۳۷/۱)

یعنی ''مقتدی کے لیے تسمیع اور تحمید کے جمع کرنے کے بارے میں کوئی صریح صحیح حدیث موجود نہیں۔''

---

① صحیح البخاری، بَابُ التَّكبِيرِ إِذَا قَامَ مِنَ السُّجُودِ، رقم:۷۸۹

② صحیح البخاری، بَابُ الأَذَانِ لِلمُسَافِرِ، إِذَا كَانُوا جَمَاعَةً، وَالإِقَامَةِ، وَكَذٰلِكَ بِعَرَفَةَ وَجَمعٍ...... الخ، رقم:۶۳۱

③ سنن الدارقطنی

④ سنن الدارقطنی، بَابُ ذِكرِ نَسخِ التَّطبِيقِ وَالأَمرِ بِالأَخذِ بِالرُّكَبِ، رقم:۱۲۸۴

اور حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: «وَ زَادَ الشَّافِعِیُّ اَنَّ الْمَأْمُومَ یَجْمَعُ بَیْنَھُمَا اَیْضًا، لٰکِنْ لَمْ یَصِحَّ فِی ذٰلِکَ شَیْءٌ.» ① یعنی ''امام شافعی رحمہ اللہ نے اضافہ کیا ہے، کہ ماً موم بھی ''تسمیع'' اور ''تحمید'' کو جمع کرے، لیکن اس بارے میں کوئی شئ بسندِ صحیح ثابت نہیں ہو سکی۔''

مزید آنکہ یاد رہے۔سوال میں ذکر کردہ پہلی حدیث: «إِذَا قَالَ الإِمَامُ :سَمِعَ اللّٰہُ لِمَنْ حَمِدَہٗ. فَقُولُوا:رَبَّنَا لَکَ الحَمدُ» بَابَ مَا یَقُولُ الِامَامُ وَ مَن خَلفَه، اِذَا رَفَعَ رَاسَهٗ مِنَ الرَّکُوعِ کے تحت بیان نہیں ہوئی۔ بلکہ اس باب کے تحت سوال میں ذکر کردہ دوسری حدیث: « کَانَ النَّبِیُّ ﷺ اِذَا قَالَ :سَمِعَ اللّٰہُ لِمَن حَمِدَہٗ. قَالَ:اَللّٰھُمَّ رَبَّنَا لَکَ الحَمدُ » بیان ہوئی ہے اور پہلی حدیث بعد والے «بَابُ فَضلِ أَللّٰھُمَّ رَبَّنَا لَکَ الحَمدُ» کے تحت بیان ہوئی ہے۔ واضح ہو کہ سوال میں منقول روایت سے تقسیم کی دلیل اخذ کرنا درست موقف نہیں۔ سابقہ سطور میں اس امر کی وضاحت ہو چکی ہے۔ جہاں تک مقتدی کا تعلق ہے، اس کے لیے جمع کی کوئی واضح صحیح حدیث موجود نہیں جو جواز پر دال ہو۔ لہٰذا مقتدی کو صرف ''تحمید'' پر اکتفا کرنی چاہیے۔ البتہ امام ''تسمیع'' اور ''تحمید'' دونوں کو جمع کرے۔ (کما تقدم)

دراصل مصنف مذکور تبویب میں اس بات کی طرف اشارہ کرنا چاہتے ہیں، کہ امام اور ماً موم کو وہی کچھ کرنا چاہیے جو ان کے حق میں ثابت ہے۔ امام کے لیے چونکہ ''تسمیع'' اور ''تحمید'' کا جمع کرنا نصِ حدیث: «کَانَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ إِذَا قَالَ:سَمِعَ اللّٰہُ لِمَن حَمِدَہٗ قَالَ: اَللّٰھُمَّ رَبَّنَا لَکَ الحَمدُ» سے ثابت ہے۔ لہٰذا اسے جمع کرنا چاہیے اور ماً موم کے لیے جمع کی کوئی دلیل نہیں، اس لیے اس کو صرف ''تحمید'' پر اِکتفا کرنی چاہیے۔

جس طرح دوسری حدیث: « إِذَا قَالَ الِامَامُ: «سَمِعَ اللّٰہُ لِمَن حَمِدَہٗ. فَقُولُوا: اَللّٰھُمَّ رَبَّنَا لَکَ الحَمدُ»② میں تصریح موجود ہے اور اگر مصنف موصوف کا موقف مسئلہ ہذا میں تفریق کا ہوتا، تو حدیث «فَقُولُوا:رَبَّنَا » کو « بَابُ مَا یَقُولُ الِامَامُ وَ مَن خَلفَهٗ » کے تحت لاتے جب کہ امر واقعہ یوں نہیں۔

مقتدی کے لیے راجح مسلک کے مطابق «سَمِعَ اللّٰہُ» کہنے کی ممانعت اس لیے ہے، کہ رسول اللہ ﷺ سے ثابت نہیں ہے۔ سورۂ فاتحہ ادھوری چھوڑ کر امام کے ساتھ (آمین) کہے۔ یہ (آمین) امام کے

① فتح الباری۲/۲۸٤

② صحیح البخاری،بَابُ فَضلِ اللّٰھُمَّ رَبَّنَا لَکَ الحَمْدُ،رقم:۷۹٦

بالتبع تعمیل حدیث «فَقُولُوا: آمِینَ» کی بناء پر ہوگی۔ بعد میں صف میں ملنے والے۔ بعد ازاں فاتحہ مکمل کر کے اصل محل پر۔ پھر (آمین) کہے گا۔ بایں توجیہ سورۂ فاتحہ کا ادھورا رہنا لازم نہ آیا، جس طرح کہ وہم پڑھ سکتا تھا۔

یاد رہے امام کے ائتمام (اقتداء) کا حکم ضروری ہے۔لیکن صرف اس انداز میں ہوگا جس طرح صاحبِ شریعت سے ثابت ہے۔ عام حالات میں اقتداء کا اطلاق صرف ظاہری حالت پر ہوتا ہے، باطنی پر نہیں۔اس بناء پر امام اور مقتدی کی نیت کے اختلاف کی شرع میں گنجائش موجود ہے اور امام ترمذی رحمہ اللہ کے حوالہ سے بعض ائمہ کے جو اقوال نقل کیے ہیں، دیگر ناقلین مذاہب نے بھی بلا شبہ ان اقوال کی نسبت ان کی طرف کی ہے۔ لیکن چونکہ ان کی بنیاد کسی ٹھوس واضح دلیل پر نہیں ہے، اس لیے یہ نا قابلِ التفات ہیں اور ''دارقطنی'' والی روایت کی حقیقت پہلے معلوم ہو چکی۔ یہ قابلِ حجت نہیں ہے۔ البتہ علامہ سیوطی رحمہ اللہ نے "الحاوی للفتاویٰ" میں نو مختلف طریقوں سے کوشش کی ہے، کہ مأموم کے لیے بھی ''تسمیع'' کا اثبات کیا جائے۔لیکن واقعہ یہ ہے، کہ جملہ دلائل میں سے کوئی ایک بھی دلیل ایسی نہیں، جو موضوع ہذا پر نص کی حیثیت رکھتی ہو۔ بہر صورت ان پر نقد و تبصرہ کی بڑی گنجائش موجود ہے۔(ملاحظہ ہو!(۱/۵۲،۵۶) بحث: ذکر التشنیع فی مسألة التسمیع)

امام کے سمع اللہ لمن حمدہ کہنے کے بعد مقتدی کا رکوع سے اٹھنا:

سوال: اسلامیہ پارک کی ایک مسجد میں نماز پڑھنے کا اتفاق ہوا۔ امام صاحب نے بتایا کہ جب تک امام «سَمِعَ اللّٰهُ لِمَن حَمِدَهٗ» کہہ نہ چکے مقتدی رکوع سے نہ اٹھے حالانکہ مشہور یہی ہے کہ امام کے رکوع سے اٹھنے کے بعد رکوع سے اٹھا جائے۔ کیا ان کا قول درست ہے۔؟

جواب: سنن ابوداؤد کی روایت میں واضح مذکور ہے کہ « فَاِنَّ الاِمَامَ یَرکَعُ قَبلَکُم، وَ یَرفَعُ قَبلَکُم فَقَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: فَتِلكَ بِتِلكَ »[1] امام تم سے پہلے رکوع کرتا ہے اور تم سے پہلے رکوع سے اٹھتا ہے۔رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: مقتدی کی کمی بعد میں پوری ہو جاتی ہے۔''

اس روایت سے معلوم ہوا کہ امام کے رکوع سے اٹھنے کے بعد کھڑے ہونے والی بات حدیثِ رسول ﷺ کے موافق ہے۔

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''ابوداؤد کی روایت میں یہ زیادتی ہے۔

[1] سنن أبی داؤد، بَابُ التَّشَهُّدِ، رقم:۹۷۲، صحیح مسلم، بَابُ التَّشَهُّدِ فِی الصَّلَاةِ، رقم:۴۰۴

«وَلَا تَرْكَعُوا حَتّٰى يَرْكَعَ، وَ لَا تَسْجُدُوا حَتّٰى يَسْجُدَ»[1] یعنی تم رکوع مت کرو۔ یہاں تک کہ امام رکوع کرے اور تم سجدہ مت کرو یہاں تک کہ امام سجدہ کر لے۔ پھر فرماتے ہیں:

« وَ هِيَ زِيَادَةٌ حَسَنَةٌ تَنفِي اِحتِمَالَ اِرَادَةِ الْمُقَارَنَةِ مِن قَولِهٖ: «اِذَا كَبَّرَ فَكَبِّرُوا.»[2]

''یہ ایک اچھی زیادتی ہے۔ اس سے ''جب امام تکبیر کہے۔ تب تم تکبیر کہو'' میں جو مقارنت کا احتمال ہے اس کی نفی ہوتی ہے۔''

رکوع کے بعد سینے پر ہاتھ باندھنا

رکوع سے کھڑے ہو کر سینہ پر ہاتھ باندھنے کی دلیل:

(سوال): بعض لوگ رکوع سے کھڑے ہو کر سینہ پر ہاتھ باندھتے ہیں اور دلیل پیش کرتے ہیں:''اذا قام......الخ'' کیا حدیثِ مذکور سے یہ استدلال صحیح ہے؟

(جواب): نماز میں بعد از رکوع ہاتھ باندھنے کا شریعت میں کوئی ثبوت نہیں ہے۔''إِذَا قَامَ ''اتنا عام نہیں جتنا کہ ان لوگوں نے سمجھ لیا ہے۔ بالفرض اگر «إِذَا» کو عام مان لیا جائے، تو بتایئے! قرآن کی ان آیات کا مفہوم کیا ہوگا؟

﴿ وَإِذَا قُرِئَ عَلَيهِمُ القُرآنَ لَا يَسجُدُونَ﴾ (الانشقاق:۲۱)

''اور جب ان کے سامنے قرآن پڑھا جاتا ہے تو سجدہ نہیں کرتے۔''

﴿إِذَا تُتلٰى عَلَيهِم اٰيٰتُ الرَّحمٰنِ خَرُّوا سُجَّدًا وَّ بُكِيًّا﴾ (مریم:۵۸)

''جب ان کے سامنے ہماری آیتیں پڑھی جاتی تھیں، تو سجدے میں گر پڑتے اور روتے رہتے تھے۔''

﴿وَإِذَا قُرِئَ القُراٰنُ فَاستَمِعُوا لَهٗ وَانصِتُوا لَعَلَّكُم تُرحَمُونَ﴾(الاعراف:۲۰۴)

''اور جب قرآن پڑھا جائے، تو توجہ سے سنا کرو اور خاموش رہا کرو۔ تا کہ تم پر رحم کیا جائے۔''

اصل بات یہ ہے کہ «إِذَا» کا عموم اپنے محل و مقام کی مناسبت کے اعتبار سے ہوتا ہے، نہ کہ جیسا ان لوگوں نے سمجھا ہے۔ (والتوفیق بید اللہ)

اس بارے میں علامہ البانی رحمہ اللہ کا نظریہ بھی ملاحظہ فرمائیں:

---

[1] سنن ابی داؤد،بَابُ الْإِمَامِ يُصَلِّي مِنْ قُعُودٍ،رقم:۶۰۳

[2] فتح الباری:۱۷۹/۲

« وَلَستُ أَشُكُّ أَنَّ وَضعَ اليَدَينِ عَلَى الصَّدرِ فِي هٰذَا القِيَامِ بِدعَةٌ ضَلَالَةٌ، لِأَنَّهُ لَم يَرِد مُطلَقًا فِي شَيءٍ مِن أَحَادِيثِ صِفَةِ الصَّلٰوةِ .وَ مَا أَكثَرَهَا . وَ لَو كَانَ لَهُ أَصلٌ لَنُقِلَ إِلَينَا ، وَ لَو مِن طَرِيقٍ وَاحِدٍ. وَ يُؤَيِّدُهُ أَنَّ أَحَدًا مِّنَ السَّلَفِ، لَم يَفعَلهُ، وَ لَا ذَكَرَ أَحَدٌ مِّن أَئِمَّةِ الحَدِيثِ فِيمَا أَعلَم »[1]

یعنی ''مجھے اس بارے میں ذرا برابر شک وشبہ نہیں، کہ اس قیام میں ہاتھ باندھنا بدعت اور گمراہی ہے۔ نماز کے اوصاف میں وارد کثرتِ احادیث کے باوجود کسی میں اس کا ذکر نہیں ملتا۔ اس کی اگر کوئی اصل ہوتی تو ضرور منقول ہوتی۔ اگرچہ ایک ہی طریق سے کیوں نہ ہو، اور اس کی تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے، کہ سلف میں سے کسی ایک کا اس کے مطابق عمل نہ تھا اور جہاں تک مجھے علم ہے، ائمۂ حدیث میں سے کسی نے اس کا تذکرہ نہیں کیا۔''

رکوع کے بعد ہاتھ باندھنے کی شرعی حیثیت:

سوال: نماز میں رکوع کے بعد ہاتھ باندھنے کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

جواب: رکوع کے بعد ہاتھ باندھنے کا مصرح (واضح) کوئی ثبوت نہیں۔

صاحب "المرعاۃ" فرماتے ہیں:

« وَ مَحَلُّ الوَضعِ مِنهَا كُلُّ قِيَامٍ هُوَ قَبلَ الرُّكُوعِ، لِأَنَّ الَاصلَ هُوَ الِارسَالُ ، كَمَا هُوَ وَضعُ الِانسَانِ خَارِجَ الصَّلٰوةِ. فَلَا يُترَكُ هٰذَا الَاصلُ إِلَّا فِيمَا وَرَدَ النَّصُّ عَلٰى خِلَافِهِ. وَ هُوَ القِيَامُ قَبلَ الرُّكُوعِ. وَ أَمَّا القَومَةُ: أَيِ الِاعتِدَالُ بَعدَ رَفعِ الرَّاسِ مِنَ الرُّكُوعِ، فَلَم يَرِد حَدِيثٌ مَّرفُوعٌ صَرِيحٌ يَدُلُّ عَلَى الوَضعِ فِيهِ، فَيَكُونُ فِيهِ العَمَلُ عَلَى الَاصلِ. وَالَاحَادِيثُ المُطلَقَةُ تُحمَلُ عَلَى المُقَيَّدَةِ » (۱/۵۵۸)

موضوع ہذا پر ہمارے شیخ محدث روپڑی رحمہ اللہ اور پروفیسر حافظ عبداللہ بہاول پوری مرحوم اور سید محب اللہ شاہ مرحوم کی تصانیف کافی مفید ہیں۔ معترضین کے جملہ اعتراضات کا خوب جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

(واللہ ولی التوفیق)

سوال: جب نمازی رکوع کے بعد کھڑا ہوتا ہے تو اُس وقت سینے پر ہاتھ باندھنا کیسا ہے؟

جواب: رکوع کے بعد سینے پر ہاتھ باندھنا کسی حدیث سے صراحتاً ثابت نہیں۔

[1] صفة الصلوٰۃ، ص: ۱۱۵، طبع: ۳

(سوال): رکوع کے بعد سینے پر ہاتھ باندھنا کیسا ہے؟

(جواب): قیام میں ہاتھ باندھنا مسنون ہے اور شرعی اصطلاح میں قیام کا اطلاق صرف قبل از رکوع حالت پر ہوتا ہے جس میں قرأت ہے۔ ورنہ لازم آئے گا، کہ ہر رکعت میں دو سجدوں کی طرح دو قیام ہیں، جب کہ کوئی بھی اس بات کا قائل نہیں۔ سب لوگ جانتے ہیں۔ ایک رکعت میں تکرارِ قیام صرف صلوٰۃ کسوف میں معروف ہے۔ اس بناء پر بعد از رکوع کی حالت کو اعتدال یا رفع بعد الرکوع یا قومہ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔(حجۃ اللہ البالغہ)

محدثین کرام کی عادت ہے، کہ پہلے قیام کو علی الاطلاق بیان کرتے ہیں اور دوسرے کو مقید، اور جہاں دونوں اکٹھے آئیں، پہلے کو لفظِ قیام سے تعبیر کرتے ہیں اور دوسرے کو اعتدال یا رفع بعد الرکوع سے۔

اس سے معلوم ہوا کہ ''سنن نسائی'' کی روایت میں« اِذَا کَانَ قَائِمًا ،یا«كُلَّمَا قَامَ قَبَضَ بِيَمِينِهِ عَلٰى شِمَالِهِ » [1] کا تعلق پہلے قیام سے مخصوص ہے۔ لفظ« اِذَا ، رکوع سے پہلے حالت کے ساتھ مختص ہے۔ عام نہیں۔ بعض حالات میں ''اذا'' کے عدمِ عموم کی بے شمار امثلہ موجود ہیں۔ مثلاً فرمایا رب العزت نے:﴿اِذَا تُتلٰی عَلَیهِم اٰیٰتُ الرَّحمٰنِ خَرُّوا سُجَّدًا وَّ بُکِیًّا﴾ (مریم:۵۸)﴿وَ اِذَا قُرِیَٔ عَلَیهِمُ القُراٰنُ لَا یَسجُدُونَ﴾ (الانشقاق:۲۱) پھر رکوع کے بعد ہاتھ چھوڑنے کے لیے دلیل کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ انسان کی طبعی حالت یہی ہے۔ البتہ باندھنے کے لیے دلیل کی ضرورت ہے، جو یہاں موجود نہیں۔ اس بناء پر اہل علم نے کہا ہے، کہ وضو کے بعد شرمگاہ کو ہاتھ لگنے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے۔

جس طرح کہ بسرہ رضی اللہ عنہا کی روایت میں ہے اور طلق بن علی رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے، کہ وضو نہیں ٹوٹتا۔ طلق کی حدیث چونکہ اصل کے مطابق ہے۔ اس لیے اس کا اعتبار نہیں ہوگا اور بسرہ کی حدیث 'ناقل عن الاصل' ہے۔ لہٰذا راجح بات یہی ہے، کہ وضو ٹوٹ جاتا ہے اور براء کی حدیث میں ہے۔

نبی کا رکوع وسجود میں اور سجدوں کے درمیان، اور رکوع کے بعد وقفہ قریباً برابر ہوتا۔ سوائے قیام اور تشہد کے کہ وہ لمبے ہوتے۔ اس سے معلوم ہوا کہ قیام کا اطلاق صرف رکوع سے پہلی حالت پر ہے۔ رکوع کے بعد ہاتھ باندھنے کے بارے میں علامہ البانی فرماتے ہیں:'' مجھے اس میں کوئی شک نہیں، کہ اس قیام میں ہاتھ باندھنا بدعت اور گمراہی ہے۔ کیونکہ 'صفة الصلوٰۃ' کی اتنی ساری احادیث میں سے کسی میں وارد نہیں۔ اگر اس کا کوئی اصل موجود ہوتا، تو منقول ہوتا چاہیے۔ ایک طریق سے کیوں نہ ہو۔ اس کی تائید اس بات سے

---

[1] سنن النسائی،وَضْعُ الْيَمِينِ عَلَى الشِّمَالِ فِي الصَّلَاةِ،رقم:۸۸۷

ہوئی ہے، کہ سلف صالحین میں سے کسی نے یہ فعل نہیں کیا اور جہاں تک مجھے علم ہے، ائمہ حدیث میں سے کسی نے اس مسئلہ کو چھیڑا تک نہیں۔''[1]

رکوع سے اٹھنے کے بعد نمازی اپنے ہاتھ کہاں رکھے؟

سوال رکوع سے اٹھنے کے بعد نمازی اپنے ہاتھ کہاں رکھے؟ ثلاث رسائل فی الصلاۃ از عبدالعزیز بن عبداللہ بن باز (ترجمہ: قاری محمد صدیق) میں پڑھا ہے کہ حالت قیام رکوع سے پہلے اور رکوع کے بعد ہاتھ سینے پر ہی باندھنے چاہئیں۔ انھوں نے حضرت سہیل بن سعد اور حضرت وائل بن حجر رضی اللہ عنہما (سنن ابوداوٗد) کی احادیث سے استدلال کیا ہے۔

جواب رکوع کے بعد ہاتھ چھوڑ دینے چاہئیں، ہاتھ باندھنے کی کوئی واضح اور صریح نص موجود نہیں۔ ان حضرات کے دلائل کا انحصار غالباً عمومی عبارتوں پر ہے جو محل نزاع میں مفید نہیں۔ اس بارے میں ہمارے استاذ محدث روپڑی کا رسالہ ارسال الیدین بعد الرکوع اور رفع الابہام کے علاوہ پروفیسر حافظ عبداللہ بہاولپوری رحمہ اللہ کے عربی و اردو رسائل ملاحظہ فرمائیں جو سوال اور جواب کی صورت میں ہیں۔ ان کتب میں شیخ ابن باز وغیرہ حضرات کے دلائل کا بطریق احسن جواب دیا گیا ہے۔

رکوع و سجود میں تسبیح کا ایک مرتبہ پڑھنا:

سوال: مصنف ابن ابی شیبہ میں حضرت علیؓ کا یہ قول مجھے نہیں ملا کہ رکوع و سجود میں تسبیح ایک مرتبہ بھی کفایت کر جاتی ہے۔ یہ کس کتاب اور کس مقام پر ہے؟

جواب: مذکورہ ''اَثر'' ہمارے شیخ محدث روپڑیؒ کے فتاویٰ اہلِ حدیث (۱۵۶/۲) میں ہے۔ صحیح مسلم (۶/ ۶۲) ابوداوٗد (۸۷۱، ۸۷۴، ۸۷) ترمذی (۲۶۲) اور نسائی (۱۹۰/۲) میں ان کلمات کا رکوع اور سجدے میں ایک بار ہی پڑھنے کا ذکر ہے۔ ابوداوٗد کی ایک روایت میں سُبحَانَ رَبِّیَ العَظِیمِ کا دو مرتبہ ذکر ہوا ہے اور المغنی ابن قدامہ (۱۷۸/۲) میں ہے، کہ تسبیح ایک بھی کافی ہو سکتی ہے کیونکہ حضرت عقبہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں نبی ﷺ نے بلا ذکرِ عدد تسبیح کا حکم دیا ہے۔ اس سے معلوم ہوا، کہ ایک بھی کافی ہو سکتی ہے اور کم از کم اِکمالی عدد تین ہے کیونکہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت کردہ حدیث میں نبی ﷺ کا فرمان ہے: « وَ ذٰلِكَ اَدنَاهُ »

عام حالات میں اسی پر عمل ہونا چاہیے۔ بوقتِ ضرورت ایک تسبیح بھی کافی ہو سکتی ہے۔ یہ بھی یاد رہے

---

[1] صفۃ الصلوٰۃ، ص: ۱۱۵

کہ زیادہ سے زیادہ عدد کا کوئی تعین نہیں۔ امام شوکانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

« لَا دَلِیلَ عَلَی تَقیِیدِ الکَمَالِ بِعَدَدٍ مَعلُومٍ بَل یَنبَغِی الِاستِکثَارُ مِنَ التَّسبِیحِ عَلٰی مِقدَارِ تَطوِیلِ الصَّلٰوۃِ مِن تَقیِید بِعَدَدٍ »[1]

دورانِ جماعت نماز میں شامل ہونے کا طریقہ کیا ہے؟

(سوال): امام جب رکوع وسجدہ میں ہو تو جو شخص نماز میں آ کر ملے وہ تکبیر کہہ کر سینہ پر دونوں ہاتھ باندھ کر پھر تکبیر کہہ کر امام کے ساتھ رکوع یا سجدہ میں ملے یا کوئی اور صورت ہے؟

(جواب): حدیث «تَحرِیمُهَا التَّکبِیرُ وَ تَحلِیلُهَا التَّسلِیمُ»[2] اور روایت ابن عمر رضی اللہ عنہما « رَأَیتُ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ افتَتَحَ التَّکبِیرُ فِی الصَّلٰوۃِ ، فَرَفَعَ یَدَیهِ حِینَ یُکَبِّرُ»[3] کے پیشِ نظر نمازی پہلے مکمل طور پر نماز کی کیفیت کو اختیار کرے۔ پھر جس حالت میں امام کو پائے اسے اختیار کرے۔

(سوال): رکوع کے بعد ہاتھ باندھنا کیسا ہے؟

(جواب): رکوع کے بعد ہاتھ باندھنا کسی صحیح اور واضح حدیث سے ثابت نہیں۔

رکوعِ تعظیمی اور سجدۂ تعظیمی کے احکام

والدین کے لئے رکوع کرنا:

(سوال): کیا والدین جیسی معزز ہستی کے لئے رکوع کرنا جائز ہے؟

(جواب): جائز نہیں بلکہ یہ شرک ہے کیونکہ رکوع عبادت اور سجدے کی طرح اللہ کے لئے ہے، ان دونوں فعلوں کو غیر اللہ کے لئے کرنا جائز نہیں۔[4]

جو اہل علم سجدۂ تعظیمی کو شرک قرار نہیں دیتے، سابقہ دلائل کی بنا پر ان کا موقف درست نہیں۔ فاعل جب جملہ وضاحتوں کے حکم سے واقف ہو تو فیصلہ صرف ظاہر کی بنا پر ہوگا، فاعل کی نیت اور اعتقاد کا اس میں کوئی دخل نہیں۔

---

① المرعاۃ: ۱/ ٦٤١

② سنن أبی داؤد، بَابُ الْإِمَامِ یُحْدِثُ بَعْدَ مَا یَرْفَعُ رَأْسَهُ مِنْ آخِرِ الرَّکْعَةِ، رقم: ٦١٨

③ صحیح البخاری، بَابٌ: إِلَی أَیْنَ یَرْفَعُ یَدَیْهِ؟، رقم: ٧٣٨

④ فتاویٰ اللجنة الدائمة: ۱/ ۳۳٦، ۳۳۷

۲۔ سوال میں اشارہ کردہ جملہ اُمور شرک ہیں۔ البتہ قومی ترانے وغیرہ کے بارے میں فتویٰ نمبر ۲۱۲۳ میں ہے کہ قومی جھنڈا یا قومی سلام کی خاطر کھڑا ہونا منکر بدعات سے ہے۔ رسول اللہ ﷺ اور خلفاے راشدین کے عہد میں یہ شے موجود نہ تھی اور یہ کمالِ توحید کے وجوب کے منافی ہے اور مسلمانوں پر صرف اللہ وحدہ لاشریک کی تعظیم واجب ہے، اس لحاظ سے بھی یہ اس تعظیم کے منافی ہے۔ مزید برآں یہ شرک کی طرف بھی ایک ذریعہ ہے اور اس میں کفار کی مشابہت ہے۔ اور یہ قبیح عادات میں ان کی تقلید ہے جبکہ نبی ﷺ نے ان کی مشابہت یا ان کے ساتھ تشبہ اختیار کرنے سے منع فرمایا ہے۔ (فتویٰ مندرجہ برصفحہ ۳۲۵)

اساتذہ یا بڑے لوگوں کی خاطر قیام کرنا یا سلوٹ مارنا بھی ممنوع ہے، کیونکہ « خیر الھدی ھدی محمد ﷺ وشر الامور محدثاتھا » [1] ''بہترین ہدایت محمد ﷺ کی ہدایت ہے اور دین میں اختراعات بدترین اُمور ہیں۔''

نبی ﷺ جب تشریف لاتے تو صحابہ کرامؓ آپ کے لئے اُٹھتے نہ تھے، کیونکہ آپ ﷺ اس کو ناپسند فرماتے ہیں۔ کسی مدرّس کو یہ لائق نہیں کہ طلبہ کو اپنی تعظیم کی خاطر قیام کا حکم دے اور طلبہ کے لئے بھی یہ لائق نہیں کہ جب اساتذہ کھڑا ہونے کا حکم کریں تو اس میں ان کی تعمیل کریں۔ کیونکہ خالق کی نافرمانی میں مخلوق کی اطاعت نہیں۔ (فتویٰ برصفحہ:۱۲۳۴)

۳۔ ایسا شخص شرکِ اکبر کا مرتکب ہے اور اس کا حکم پہلے گزر چکا ہے۔ یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جس میں ہمیں اختلاف کی گنجائش نظر نہیں آتی۔ سلف اسی بات کے قائل تھے۔ عرصہ ہوا مرکزی جمعیت اہلحدیث کی سرگودھا میں منعقد آل پاکستان کانفرنس میں یہ (مسئلہ II) اُٹھا تھا اور علما کرام کا اختلاف طول پکڑ گیا تھا، اسکے پیشِ نظر محدث روپڑی رحمہ اللہ نے اوپر درج شدہ فتویٰ تحریر فرمایا تھا۔

سجدۂ عبادت اور سجدۂ تعظیمی میں فرق:

سوال: کیا سجدۂ عبادت اور سجدۂ تعظیمی کے حکم میں کوئی فرق ہے؟

مندرجہ ذیل مسائل میں قرآن وحدیث اور فہمِ سلف کے مطابق آپکی رہنمائی مطلوب ہے:

۱۔ سجدہ لغیر اللہ کو ہمارے ہاں بالاتفاق حرام سمجھا جاتا ہے لیکن بعض لوگ ''سجدہ تعظیمی'' اور ''سجدہ عبادت'' میں فرق کرتے ہیں۔ اوّل الذکر کو حرام اور ثانی الذکر کو شرک وکفر اور مُخرج عن الملة

[1] صحیح البخاری، بَابُ الِاقْتِدَاءِ بِسُنَنِ رَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، رقم:۷۲۷۷

قرار دیتے ہیں۔ کیا ان کا یہ موقف کتاب وسنت اور فہم سلف کے مطابق ہے؟ نیز کیا اس میں فاعل کی نیت اور اعتقاد کا کوئی دخل ہے یا نہیں؟

۲۔ کیا تعظیمی سجدہ، تعظیمی رکوع، تعظیمی قیام، تعظیمی قعود، تعظیمی طواف، یہ سب شرک ہیں یا صرف تعظیمی سجدہ ہی شرک ہے؟ اور کیا مندرجہ بالا مظاہر عبودیت زندہ و مردہ (یعنی قبر والوں اور حکام و اساتذہ یا قومی ترانے وغیرہ) کے لئے یکساں حکم رکھتے ہیں، یا ان میں کوئی فرق ہے؟

۳۔ اگر یہ شرک ہے تو شرک کس درجے کا؟ اس کا مرتکب خارج عن الملۃ ہے یا نہیں؟ اس کا ذبیحہ کھانا اور اس سے رشتہ کرنا کیسا ہے؟

نوٹ: علمائے سلف میں سے مذکورہ بالا پہلوؤں پر جن علمائے کرام نے جس پہلو پر بھی گفتگو کی ہو، براہِ کرم اس کا حوالہ بھی درج کر دیجیے۔ جزاکم اللہ (ابوعبدالرب عبدالقدوس سلفی، اسلام آباد)

جواب: الجواب بعون الوہاب: سجدہ تعظیمی اور سجدۂ عبادت میں کوئی فرق نہیں، دونوں شرک ہیں جو لوگ سجدۂ تعظیمی کو شرک قرار نہیں دیتے، ان کا اشکال یہ ہے کہ سجدۂ تعظیمی پہلی اُمتوں میں چلا آرہا تھا اور صرف اسلام نے اسے ممنوع اور حرام قرار دیا ہے، ورنہ سجدۂ عبادت تو غیر اللہ کے لئے شرک ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ بلا شبہ شرک جملہ شرائع میں سے کسی شریعت میں جائز نہیں رہا، تاہم اس کے مظاہر کی شکلیں بدلتی رہیں، اس طرح وہ شریعت کی جزئیات بن جاتی ہیں۔ جس طرح آدم علیہ السلام کے عہد میں صلبی اولاد کا آپس میں نکاح جائز تھا جو بعد میں حرام ہو گیا اور اگر آج کوئی اس کے جواز کا دعویدار ہو تو وہ کافر ہے، کیونکہ اس نے خواہش پرستی کو معبود بنالیا۔ قرآنِ کریم میں ہے: ﴿أَفَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ إِلَٰهَهُ هَوَاهُ﴾ (الجاثیہ:۲۳) ''بھلا تم نے اس شخص کو دیکھا جس نے اپنی خواہش کو معبود بنا رکھا ہے۔''

یہی کیفیت سجدۂ تعظیمی ہو یا عبادت، ہر دو کی ہے۔ اگر وہ اللہ کے حکم سے ہے تو وہ غیر کی عبادت میں شامل نہیں اور اگر وہ اپنی مرضی سے ہے تو وہ غیر کی عبادت ہے جو شرک کے زمرہ میں داخل ہے، کیونکہ حکم صرف اللہ کا چلتا ہے، کسی کو اس میں دخل نہیں اور دخل اندازی کرنے والا مشرک ہے۔ مثلاً کعبہ مشرفہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنا عین اللہ کی عبادت ہے اور اس کے ماسوا کسی اور مکان کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنا عین شرک ہے، کیونکہ طریقہ عبادت مقرر کرنا صرف اللہ کا اختیار ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿أَمْ لَهُمْ شُرَكَٰٓؤُا شَرَعُوا لَهُم مِّنَ الدِّينِ مَا لَمْ يَأْذَنۢ بِهِ اللَّهُ﴾ (الشوریٰ:۲۱) ''کیا اُن کے وہ شریک ہیں جنہوں نے اُن کے لئے ایسا دین مقرر کیا ہے جس کا اللہ نے حکم نہیں دیا۔''

دوسرے مقام پر فرمایا: ﴿ لاَ تَسْجُدُوْا لِلشَّمْسِ وَلاَ لِلْقَمَرِ وَاسْجُدُوْا لِلّٰهِ الَّذِیْ خَلَقَهُنَّ اِنْ کُنْتُمْ اِیَّاهُ تَعْبُدُوْنَ﴾ (فصلت:۳۷) ''تم لوگ نہ تو سورج کو سجدہ کرو اور نہ چاند کو بلکہ اللہ ہی کو سجدہ کرو جس نے ان چیزوں کو پیدا کیا ہے، اگر تمہیں اس کی عبادت منظور ہے۔''

اس آیتِ کریمہ میں مطلقاً غیر اللہ کو سجدہ کرنے سے منع کیا گیا ہے اور صرف اللہ وحدہ لاشریک کی عبادت کا حکم دیا گیا ہے۔ ہمارے استاذ محدث روپڑی رحمہ اللہ رقم طراز ہیں کہ

''اس آیت میں اس طرف اشارہ ہے کہ یہ حکم سورج، چاند پر ہی موقوف نہیں بلکہ سجدہ محض خالق کا حق ہے، مخلوق کا نہیں؛ خواہ سورج، چاند ہو یا کوئی اور مخلوق ہو اور ﴿ اِنْ کُنْتُمْ اِیَّاهُ تَعْبُدُوْنَ﴾ سے مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی سجدہ غیر کو ہو گیا تو پھر خاص اللہ کے عابد نہیں رہو گے، بلکہ مشرک ہو جاؤ گے۔ اس کی مثال ایسی ہے، جیسے قرآنِ مجید میں ہے: ﴿فَاتَّبِعُونِی﴾ (آل عمران:۳۱)

''کہہ دیں کہ اگر تم مجھ صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت رکھتے ہو تو میری اتباع کرو۔''

اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر میرے مقابلہ میں کسی اور کی اتباع کرو گے، خواہ کسی طرح سے ہو تو پھر اللہ کی محبت کا دعویٰ جھوٹا ہے۔ ٹھیک اسی طرح آیتِ بالا کا مطلب سمجھ لینا چاہئے کہ جب غیر کو سجدہ ہوا (خواہ اس کا نام سجدۂ تعظیمی رکھو یا کچھ اور) تم خاص اللہ کے عابد نہیں رہ سکتے بلکہ مشرک ہو جاؤ گے۔ گویا ہماری شریعت میں سجدہ مطلقاً حرام کر دیا گیا ہے خواہ اس کا نام کوئی کچھ بھی رکھے اور اس کی تائید احادیث سے بھی ہوتی ہے۔ فتاویٰ ابن تیمیہ رحمہ اللہ میں ہے:

اما تقبيل الارض ووضع الراس ونحو ذلك مما فيه السجود، مما يفعل قدام بعض الشيوخ وبعض الملوك فلا يجوز، بل لايجوز الانحناء كالركوع ايضا كما قالوا للنبى ﷺ: الرجل منا يلقى اخاه اينحنى له؟ قال: (لا) ولما رجع معاذ من الشام سجد للنبى ﷺ فقال: ما هذا يا معاذ؟ قال: يا رسول الله ! رايتهم فى الشام يسجدون لاساقفتهم ويذكرون ذلك عن انبيائهم فقال: (كذبوا عليهم لو كنت آمرًا احدا ان يسجد لاحد لامرت المراة ان تسجد لزوجها من اجل حقه عليها۔ يا معاذ ! إنه لا ينبغي السجود إلا لله (واما فعل ذلك تدينا وتقربا فهٰذا من اعظم المنكرات، ومن اعتقد مثل هذا قربة وتدينا فهو ضالّ مفتر، بل يبين له ان هٰذا ليس بدين ولا قربة فإن اصر على ذلك اُستيب فإن تاب وإلا قتل» [1]

[1] فتاوى ابن تيميه : ج۱ ص۱۱٦، طبع جديد : ۲/۱۳۷

''زمین کو بوسہ دینا اور سر زمین پر رکھنا اور ایسی ہی وہ صورتیں جس میں بعض مشائخ اور بعض بادشاہوں کے سامنے سجدہ کیا جاتا ہے تو یہ کچھ جائز نہیں بلکہ جھکنا مثل رکوع کے بھی جائز نہیں۔ چنانچہ صحابہؓ نے رسول اللہ ﷺ سے کہا کہ ہم میں سے کوئی اپنے بھائی سے ملتا ہے تو کیا اس کے لئے جھکے؟ تو فرمایا: نہیں اور جب حضرت معاذؓ سفر شام سے واپس آئے تو انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سجدہ کیا آپ ﷺ نے فرمایا: اے معاذ! یہ کیا؟ کہا: میں نے اہل کتاب کو دیکھا کہ وہ اپنے علما کو ایسے ہی سجدہ کرتے ہیں۔ فرمایا: یہ جھوٹ ہے۔ اگر میں کسی کو کسی کے لئے سجدہ کا حکم دیتا تو عورت کو حکم دیتا، اس کے شوہر کے اس پر حق کی وجہ سے۔ اے معاذؓ! سوائے اللہ کے کسی کے لئے سجدہ لائق نہیں۔'' اور دین اور ثواب سمجھ کر سجدہ کرنا کبیرہ گناہوں میں سے ہے (البتہ قتل وغیرہ کے ڈر سے ایسا کیا جائے تو وہ کبیرہ گناہ میں شامل نہیں بلکہ بعض کے نزدیک جائز ہے) جو اس کا اعتقاد رکھے، وہ گمراہ مفتری ہے۔ اس کو سمجھایا جائے کہ یہ دین اور ثواب نہیں، پھر بھی اصرار کرے تو اس سے توبہ طلب کی جائے اور اگر توبہ نہ کرے تو قتل کر دیا جائے۔''

قریب قریب اس قسم کی روایتیں مشکوٰۃ کے باب عشرۃ النساء وغیرہ میں موجود ہیں کہ غیر اللہ کو سجدہ جائز نہیں، اگر جائز ہوتا تو عورت کو خاوند کے لئے سجدہ کا حکم ہوتا اور مشکوٰۃ کے اسی باب میں آپ ﷺ کی قبر کو سجدہ کرنے کی ممانعت بھی مذکور ہے۔ اور جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو یا آپ ﷺ کی قبر کو سجدہ کی اجازت نہیں تو غیر کے لئے کس طرح اجازت ہوگی بلکہ مشکوٰۃ باب القیام میں قیامِ تعظیمی سے بھی آپ ﷺ نے منع فرمایا ہے تو سجدہ کس طرح جائز ہوگا؟ خلاصہ یہ ہے کہ نماز کی مشابہت کسی غیر کے لئے جائز نہیں، نہ قیام نہ رکوع نہ سجدہ۔ یہی وجہ ہے کہ قبروں میں ممانعت ہے، تا کہ عبادتِ قبور سے مشابہت نہ ہو اور جب مشابہت منع ہے تو حقیقۃً قیام یا رکوع یا سجدہ غیر کے لئے کیونکر جائز ہوگا۔'' (فتاویٰ اہلحدیث: ۱/ ۱۴۷ تا ۱۵۰)

سعودی عرب کی ''دائمی کمیٹی برائے فتاویٰ و بحوثِ علمیہ'' کا فتویٰ ہے کہ غیر اللہ کو سجدہ کرنا شرک ہے، اس طرح غیر اللہ کے نام پر جانور ذبح کرنا بھی شرک ہے۔ اس کے شرعی حکم کی وضاحت کے باوجود اگر کوئی غیر اللہ کو سجدہ کرتا ہے یا غیر اللہ کے لئے جانور ذبح کرتا ہے تو اس کی فرض اور نفلی عبادت قبول نہیں ہوتی، اگر چہ وہ نماز، روزہ کرے۔

مشرک جب شرک پر مرجائے تو اس کے اعمال قبول نہیں ہوتے۔ ہاں البتہ موت سے پہلے خالص توبہ کی صورت میں اس کے گناہ معاف ہوجاتے ہیں۔ (فتویٰ نمبر: ۴۳۶۰)

سجود کی اقسام اور ان کے احکام

فرض نمازوں کے سجود

سجدہ میں جاتے ہوئے پہلے ہاتھ رکھے جائیں یا گھٹنے؟

سوال صحیح ابوداود از علامہ البانی ؒ میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے سجدہ میں جاتے وقت اونٹ کی طرح بیٹھنے سے منع فرمایا اور حکم دیا کہ گھٹنوں سے پہلے ہاتھ رکھو۔ یہ روایت حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، جبکہ وائل بن حجر رضی اللہ عنہ کی حدیث جو ابوداود، نسائی اور ترمذی وغیرہ میں موجود ہے، اس میں ارشاد یہ ہے کہ ''وائل بن حجر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا، جب آپ سجدہ کرتے تو دونوں گھٹنے ہاتھوں سے پہلے رکھتے اور جب سجدہ کے بعد اُٹھتے تو دونوں ہاتھ گھٹنوں سے پہلے اُٹھاتے۔''

علماء اہلحدیث دونوں احادیث کو صحیح کہتے ہیں مگر ساتھ یہ بھی کہتے ہیں کہ چونکہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت اسناد کے لحاظ سے زیادہ قوی اور عمدہ ہے لہٰذا اسی کو ترجیح ہے۔ اختلاف کی بات یہ ہے کہ رفع الیدین رسول اللہ ﷺ کے آخری عمل سے ثابت ہے جس کا ثبوت وائل بن حجر رضی اللہ عنہ کی صحیح حدیث ہے۔ وائل بن حجر رضی اللہ عنہ ۹ ہجری کے موسم سرما میں مسلمان ہوئے، جب آپ رضی اللہ عنہ ۱۰ ہجری میں دوبارہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ نے رسول اللہ ﷺ کو رفع الیدین کرتے دیکھا لہٰذا رفع الیدین کی ناسخ وہی روایت ہوسکتی ہے جو وائل بن حجر رضی اللہ عنہ کے دور کے بعد کی ہو اور ایسا ممکن نہیں۔ اسی بات کو اگر اس طرح کہا جائے کہ سجدہ کو جاتے وقت ہاتھوں سے پہلے گھٹنے رکھنا، وائل بن حجر ؒ کی حدیث کی وجہ سے رسولِ کریم ﷺ کا آخری عمل ہونا ثابت ہوگیا لہٰذا ترجیح آخری عمل کو ہے اور پچھلا حکم منسوخ ہوگیا اور اس عمل کی ناسخ حدیث اس دور کے بعد کی ہونی چاہیے جو کہ ممکن نہیں۔ کیا اہلحدیث اس کے یکسر خلاف عمل نہیں کرتے؟

جواب مذکورہ مسئلہ میں صحیح موقف یہ ہے کہ وائل بن حجر کی روایت ضعیف ہے جس کو ابوداود، نسائی اور ترمذی وغیرہ نے روایت کیا ہے۔ اس کی سند شریک بن عبداللہ قاضی کی وجہ سے ضعیف ہے، ہمام ؒ نے بھی ان کی متابعت کی ہے مگر انہوں نے اس حدیث کو موصول کی بجائے مرسل روایت کہا ہے۔ حازمی نے مرسل ہی کو محفوظ کہا ہے، ہمام سے اس حدیث کی ایک دوسری سند بھی ہے مگر وہ منقطع ہونے کی وجہ سے ضعیف ہے۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو: سلسلۃ الاحادیث الضعیفۃ: ۲/ ۳۲۹، ۳۳۰ اور إرواء الغلیل: ۲/ ۷۵، ۳۵)

اس حدیث کی ایک تیسری سند (سنن کبریٰ بیہقی:۲/۹۹) میں ہے اور وہ بھی سخت ضعیف ہے۔ اس میں درج ذیل علتیں ہیں:

۱۔ راوی محمد بن حجر کے بارے میں امام بخاری نے کہا: فيه نظر (تاریخ کبیر:۱/۶۹) ''اس میں کلام ہے۔''

۲۔ راوی سعید بن عبدالجبار کو ابن حجر رضی اللہ عنہ نے تقریب میں ضعیف کہا ہے۔

اُمّ عبدالجبار کے بارے میں تہذیب التہذیب میں عبدالجبار بن وائل کے ترجمہ میں ہے کہ اس نے اپنے والدین سے سنا نہیں، اگر یہ بات صحیح ہے کہ اس نے اپنے باپ کی طرح اپنی والدہ سے بھی نہیں سنا تو اس سند میں چوتھی علت انقطاع ہے تو مشار الیہ سند اصل میں یوں ہے:

محمد بن حجر ثنا سعيد بن عبدالجبار عن عبدالجبار بن وائل عن أُمه عن وائل بن حجر

اور جہاں تک ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت کا تعلق ہے، وہ صحیح ہے۔ اس کو ابوداود، نسائی، احمد وغیرہ نے روایت کیا ہے۔ علامہ مبارکپوری رحمہ اللہ نے کہا:

''یہ حدیث صحیح یا حسن لذاتہ ہے اور اس کے سب راوی ثقہ ہیں۔''[1]

مذکورہ بحث سے معلوم ہوا کہ راجح اور قوی مسلک یہی ہے کہ سجدے میں جاتے وقت آدمی گھٹنوں کی بجائے پہلے اپنے ہاتھ زمین پر ٹکائے، اس مختصر بحث سے وہ تمام توجیہات جو صورتِ سوال میں ذکر کی گئی ہیں، کالعدم ہو جاتی ہیں۔ جملہ تفصیل کے لئے تحفۃ الاحوذی اور اِرواء الغلیل ملاحظہ ہو۔[2]

سجدے میں جاتے وقت زمین پر پہلے ہاتھ رکھے جائیں یا گھٹنے؟

سوال: سجدے میں جاتے وقت زمین پر پہلے ہاتھ رکھے جائیں یا گھٹنے؟ یا دونوں طرح جائز ہے؟ دونوں اطراف کی احادیث زیادہ تر غریب اور ضعیف ہیں۔ ہاتھوں والی احادیث پر امام بخاریؒ نے شدید جرح کی ہے۔[3] اسی طرح اونٹ والی حدیث بھی امام بخاری رحمہ اللہ نے ضعیف کہی ہے۔[4]

''جزء رفع الیدین'' میں مالک بن حویرث رضی اللہ عنہ سے ایک روایت ہے، جس میں سجدہ میں جاتے وقت

---

[1] تحفة الاحوذی: ۱/۲۲۹

[2] اس سلسلے میں تفصیلی مضمون کیلئے دیکھئے: نماز میں سجدے میں جانے کی کیفیت از مولانا منیر قمر سیالکوٹی شائع شدہ ماہنامہ ''محدث'' لاہور: ج:۳۱ عدد۲ بابت فروری ۱۹۹۹ء... صفحہ:۸تا۲۳ سیریل نمبر ۲۲۳۔

[3] نیل الأوطار جز ۲ صفحه ۲۱٤

[4] ایضاً

گھٹنے پہلے رکھنے کا ذکر ہے اور یہ حدیث صحیح ہے۔ امید ہے جرح و تعدیل اور مزید تحقیق سے اس مسئلہ کو بیان کریں گے اور صحیح حدیث سے مسئلہ کی وضاحت کریں گے۔

جواب: اس بارے میں راجح اور قوی مسلک یہ ہے، کہ سجدے میں جاتے وقت آدمی زمین پر پہلے ہاتھ رکھے۔ چنانچہ سنن ابی داؤد میں حدیث ہے: « وَلْيَضَعْ يَدَيْهِ قَبْلَ رُكْبَتَيْهِ » ①

اس پر ابن عمر رضی اللہ عنہما کی وہ روایت شاہد ہے، جو نافع روایت کرتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے، کہ ابن عمر رضی اللہ عنہما زمین پر گھٹنوں سے پہلے ہاتھ رکھتے تھے اور فرماتے: کہ رسول اللہ ﷺ ایسا ہی کرتے تھے۔ ابن خزیمۃ (٦٢٧) دار قطنی (١/٣٤٤) اس کی سند جید ہے اور "صحیح بخاری کے ترجمۃ الباب میں ہے:

« وَقَالَ نَافِعٌ: كَانَ ابْنُ عُمَرَ يَضَعُ يَدَيْهِ قَبْلَ رُكْبَتَيْهِ.»

کیا مقتدی کا امام سے پہل کرنا جائز ہے؟

سوال: بعض لوگ امام سے پہلے آمین کہتے اور رکوع و سجود میں پہلے جانے کی کوشش کرتے ہیں کیا ایسا کرنا درست ہے؟ کیا تقدیم میں کوئی وعید ہے؟

جواب: رکوع سجود اور آمین وغیرہ میں امام سے سبقت نہیں کرنی چاہیے۔ حدیث میں ہے جو امام سے قبل رکوع سے سر اٹھانے کی کوشش کرتا ہے۔ قریب ہے کہ اللہ اس کا چہرہ گدھے کا سا بدل دے۔ ایک آدمی نے تجربہ کرنا چاہا، تو اللہ نے اس کا منہ اس طرح بدل ڈالا۔ ملاحظہ ہو! تحفۃ الاحوذی۔ جملہ ارکان میں جب امام مصروف ہو جائے، تو پھر مقتدی کو آغاز کرنا چاہیے۔

مقتدی کا افعالِ نماز میں امام سے پہل کرنا:

سوال: مقتدی اگر افعالِ نماز میں امام سے پہل کریں تو ان کے لیے کیا وعید ہے؟

جواب: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

"امام سے پہلے سر اٹھانے والے کو (کیا) اس بارے میں ڈر نہیں لگتا ہے، کہ اللہ اس کا سر کہیں گدھے کے سر سے نہ بدل دے۔" ②

---

① سنن أبی داؤد، بَابُ كَيْفَ يَضَعُ رُكْبَتَيْهِ قَبْلَ يَدَيْهِ، رقم: ٨٣٨

② صحیح البخاری، بَابُ إِثْمِ مَنْ رَفَعَ رَأْسَهُ قَبْلَ الإِمَامِ، رقم: ٦٩١، صحیح مسلم، بَابُ النَّهْیِ عَنْ سَبْقِ الْإِمَامِ بِرُكُوعٍ أَوْ سُجُودٍ وَنَحْوِهِمَا، رقم: ٤٢٧

اس سے معلوم ہوا، کہ امام سے سبقت کرنا سخت وعید کا باعث ہے۔

سجدے میں کہنیاں کیسے ہوں؟

سوال: سجدے میں کہنیاں کانوں کی طرح باہر کی طرف ہوں یا پیٹ کی طرف اندر؟

جواب: سجدے میں کہنیوں کو نہ تو زمین پر ٹکایا جائے نہ پہلوؤں سے ملایا جائے۔ بلکہ زمین سے اونچی اور کروٹوں سے الگ کشادہ رکھنا چاہیے۔ ''صحیح بخاری میں حدیث ابوحمید رضی اللہ عنہ ملاحظہ ہو! صحیح البخاری۔[1]

سجدہ کی حالت میں پاؤں ملا کر رکھیں یا الگ؟

سوال: نماز کے سجدہ کی حالت میں پاؤں کس طرح ہوں؟ ملا کر یا علیحدہ علیحدہ؟

جواب: سجدہ کی حالت میں ایڑھیاں ملانے کی روایت بیہقی (۱۱۶/۲) میں ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا بیان ہے، کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سجدہ کی حالت میں پایا، کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی ایڑھیوں کو ملائے ہوئے تھے۔[2]

سجدہ میں ایڑھیوں کو ملانا:

سوال: سجدہ میں ایڑھیوں کو ملانا، حدیث عائشہ رضی اللہ عنہا میں اس کا ذکر ہے۔[3] مگر محقق سندھو صاحب نے حدیث کی سند کے بارے میں نہیں بتایا کہ کیسی ہے؟ محدثین نے تو ضرور حالت اسناد بتائی ہوگی...... خصوصاً البانی صاحب نے حاشیہ ابن خزیمہ میں...... یہاں بعض لوگوں نے اس عمل کو نیا دین کہہ ڈالا۔

جواب: سنداً روایت ہذا صحیح ہے۔ ثابت شدہ شئی پر عمل کرنے سے نیا دین نہیں بنتا۔ میرے پاس ایک کتاب ہے، اس کا عنوان یہی ہے:« لَا جَدِيدَ فِي الصَّلٰوةِ » لیکن اس کے اکثر و بیشتر دلائل قابل اطمینان نہیں۔

سجدہ میں ایڑھیاں ملانے سے پاؤں کی انگلیاں مڑ جائیں تو؟

سوال: سجدہ کی حالت میں ایڑھیاں ملائی جائیں تو دونوں پاؤں کی ساری انگلیاں قبلہ رُخ نہیں رہتیں۔

---

[1] صحيح البخارى، بَابُ لَا يَفْتَرِشُ ذِرَاعَيْهِ فِي السُّجُودِ، قبل رقم:٨٢٢

[2] صحيح مسلم، بَابُ مَا يُقَالُ فِي الرُّكُوعِ وَالسُّجُودِ، رقم:٤٨٦، سنن ابن ماجه، بَابُ مَا تَعَوَّذَ مِنْهُ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ، رقم:٣٨٤١، السنن الكبرىٰ للبيهقى، بَابُ مَا جَاءَ فِي الْمَلْمُوسِ، رقم:٦١٤، سنن الدارقطنى، بَابُ صِفَةِ مَا يُنْقِضُ الْوُضُوءَ وَمَا رُوِىَ فِي الْمُلَامَسَةِ وَالْقُبْلَةِ، رقم:٥١٣

[3] بحواله ابن خزيمه، الحاكم، البيهقى، صلوٰة الرسول، محققه، ص:٢٧٧

بلکہ چھوٹی انگلیاں زمین کی طرف ہوجاتی ہیں اور پاؤں کے پنجے کے قریب والے حصے بھی آپس میں مل جاتے ہیں۔کیا اس طرح سجدہ سنت کے مطابق ہے؟

جواب: سجدہ میں ایڑھیاں ملانے سے اگر چھوٹی بعض انگلیاں زمین کی طرف مڑ بھی جائیں،تو کوئی حرج نہیں۔

﴿لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفسًا اِلَّا وُسعَهَا﴾(البقرۃ:۲۸۶) بلا ریب یہ سجدہ سنت کے مطابق ہی ادا ہوگا۔

"أَحَبُّ الدِّينِ إِلَى اللهِ اَلحَنِيفِيَّةُ السُّمحَةُ وَ خَيرُ دِينِكُم أَيسَرُهٗ. وَ مَا جَعَلَ عَلَيكُم فِي الدِّينِ مِن حَرَجٍ" کا تقاضا یہی ہے۔

کیا سجدے میں پاؤں ملاتے ہوئے انگلیاں اندر کی طرف ہوں گی یا باہر کی طرف؟

سوال: سجدے کی حالت میں پاؤں ملانے کی صورت میں کیا انگلیاں اندر کی طرف ہوں گی یا باہر کی طرف؟

جواب: صحیح بخاری (۸۲۸) اور سنن ابی داؤد (۷۳۲) وغیرہ میں ابوحمید کی حدیث میں ہے،کہ پاؤں کی انگلیوں کے سرے قبلے کی طرف مڑے ہونے چاہئیں اور قدموں کو کھڑا رکھا جائے۔اس سے معلوم ہوا پاؤں کی انگلیاں اندر قبلہ رُخ ہونی چاہئیں۔

سجدہ میں پاؤں کی انگلیوں کے سرے یا تلوے زمین پر لگائیں؟

سوال: ''صحیح بخاری کی احادیث کے مطابق سات ہڈیوں پر سجدہ کرنا فرض ہے،ان میں پاؤں بھی شامل ہیں۔ایک روایت میں ہے:« رِجلَينِ » اور دوسری میں ہے:«اَطرَافِ القَدَمَينِ»

ان الفاظ کے مطابق سجدے میں محض پاؤں کی انگلیوں کے سرے لگالینا ہی کافی ہے یا انگلیوں کا تلوے والا حصہ (پیٹ) لگانا بھی ضروری ہے؟ اور ہر پاؤں کی کتنی انگلیوں کا پیٹ لگانا فرض ہے؟ صاحب ''بہارِ شریعت'' نے لکھا ہے کہ دونوں پاؤں کی ایک ایک انگلی کا پیٹ سجدے کی حالت میں زمین پر لگانا فرض اور دونوں پاؤں کی تین تین انگلیوں کا پیٹ لگانا واجب ہے،جس کے بغیر سجدہ ادا نہ ہوگا۔

جواب: حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے "رِجلَين" والی روایت کو''اطراف القدمین'' والی روایت پر محمول کیا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں:« وَهُوَ مُبَيِّنٌ لِلمُرَادِ مِنَ الرِجلَينِ »[1]

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ بحالتِ سجدہ صرف انگلیوں کے سرے لگانا ہی کافی ہے۔انگلیوں کا

[1] فتح الباری:۲/ ۲۹۷

پیٹ لگانا اس میں شامل نہیں اور صاحبِ بہارِ شریعت نے جو وضاحت کی ہے۔ دلیل سے اس کی تائید حاصل ہونا مشکل امر ہے۔

سجدہ کے لیے ماتھا ننگا ہونا:

(سوال): کیا سجدہ کے لیے ماتھا ننگا ہونا ضروری ہے؟ نیز اگر پیشانی کپڑے یا ٹوپی وغیرہ سے ڈھکی ہوئی ہوتو سجدہ ہوجائے گا؟

(جواب): اصل یہ ہے، کہ بحالت سجدہ پیشانی ننگی ہو اور اگر کپڑے یا ٹوپی وغیرہ سے ڈھکی ہو تو سجدہ ہو جائے گا۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو! (المغنی فقیه ابن قدامة ۲/ ۱۹۷ تا ۱۹۹۔ طبع دار عالم الكتب)

سجدوں میں تسبیحات کی تعداد:

(سوال): فرض نماز میں امام سجدہ کرتے وقت زیادہ سے زیادہ کتنی بار تسبیحات پڑھے۔ کم از کم نماز میں کتنا وقت لگائے؟

(جواب): بحالتِ رکوع اور سجدہ شرع میں تسبیحات کا کوئی تعین نہیں۔ لمبی نماز میں زیادہ پڑھی جائیں اور مختصر نماز کی صورت میں کم۔ علامہ شوکانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

« لَا دَلِيلَ عَلٰى تَقيِيدِ الكَمَالِ بِعَدَدٍ مَعلُومٍ ، بَل يَنبَغِى الِاستِكثَارُ مِنَ التَّسبِيحِ عَلٰى مِقدَارِ تَطوِيلِ الصَّلٰوةِ مِن غَيرِ تَقيِيدٍ بِعَدَدٍ » ①

اسی طرح نماز میں وقت صَرف کرنے کی شریعت میں کوئی حد بندی نہیں۔ یہ مصلّی (نمازی) کی نشاط پر منحصر ہے۔ ہاں البتہ اگر یہ صاحب امام ہوں تو بایں صورت نماز مختصر پڑھانی چاہیے۔ حدیث میں ہے:

« فَإِنَّ فِيهِمُ الضَّعِيفَ وَالكَبِيرَ ، وَذَا الحَاجَةِ » ②

سجدہ میں پڑھی جانے والی دعائیں کتنی مرتبہ پڑھی جائیں؟

(سوال): سجدے کی مختلف دعائیں جو حدیث میں آئی ہیں، کیا «سُبحَانَ رَبِّيَ الاَعلٰى» کی طرح تین مرتبہ پڑھی جائیں گی؟ جیسے سُبحَانَكَ اللّٰهُمَّ رَبَّنَا وَ بِحَمدِكَ اللّٰهُمَّ اغفِرلِی دعا ہے؟

---

① مرعاة المفاتيح: ۱/ ۶۱۴

② صحيح البخاری، بَابُ تَخفِيفِ الإِمَامِ فِی القِيَامِ، وَإِتمَامِ الرُّكُوعِ وَالسُّجُودِ، رقم: ۷۰۲، سنن ابن ماجه، بَابُ مَن أَمَّ قَومًا فَليُخَفِّف، رقم: ۹۸۴

جواب: رکوع اور سجود میں تسبیحات کی زیادہ سے زیادہ کوئی گنتی مقرر نہیں۔حتی المقدور جتنی دفعہ کوئی چاہے پڑھ سکتا ہے۔بعض احادیث میں دس دفعہ کا بھی ذکر ہے۔ یہ روایت سنن نسائی اور سنن ابی داؤد وغیرہ میں حسن درجہ کی ہے۔جس حدیث میں سُبحَانَ رَبِّیَ الاَعلٰی اور سُبحَانَ رَبِّیَ العَظِیمِ تین مرتبہ بیان ہوا ہے۔ یہ ادنیٰ (کم از کم) درجہ ہے۔امام شوکانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

لَا دَلِیلَ عَلٰی تَقیِیدِ الکَمَالِ بِعَدَدٍ مَعلُومٍ، بَل یَنبَغِی اَلاِستِکثَارُ مِنَ التَّسبِیحِ عَلٰی مِقدَارِ تَطوِیلِ الصَّلٰوۃِ مِن غَیرِ تَقیِیدٍ بِعَدَدٍ » [1]

''زیادہ سے زیادہ تسبیحات کی تعداد مقرر کرنے کی کوئی دلیل نہیں، بلکہ نماز کی طوالت کے اعتبار سے بلا قید ان کو زیادہ کیا جا سکتا ہے۔''

رکوع اور سجود میں صرف منصوص دعائیں تسبیحات وغیرہ ہی پڑھنا:

سوال: رکوع وسجود میں تسبیحاتِ مسنونہ کے علاوہ کوئی دوسری قرآنی دعا وغیرہ مانگنا کیسا ہے؟

جواب: رکوع اور سجود میں صرف منصوص دعائیں تسبیحات وغیرہ ہی پڑھنی چاہئیں۔

رکوع وسجود میں دعا ایک مرتبہ یا تین مرتبہ؟

سوال: رکوع اور سجدے میں صرف ایک ہی دعا پڑھ سکتے ہیں یا دو تین اکٹھی بھی پڑھ سکتے ہیں؟

جواب: متعدد دعاؤں کو جمع کرنے کا جواز ہے۔صحیح مسلم میں حدیث ہے:

« وَ اَمَّا السُّجُودِ فَاجتَهِدُوا فِی الدُّعَاءِ.» [2] ''بحالت سجود دعا میں مبالغہ کرو۔''

صاحب ''مرعاۃ المفاتیح'' فرماتے ہیں: کہ یہ حدیث اس امر کی دلیل ہے، کہ بحالتِ سجود آدمی دنیا و آخرت کی طلب اور اُن کے شر سے بچنے کے لیے جونسی دعا چاہے کر سکتا ہے۔(۱/ ٦٣٥) اور صحیح مسلم کی دوسری روایت میں ہے:« فَاَکثِرُوا الدُّعَاءَ» [3] یعنی ''کثرت سے دعا کرو۔''

رکوع اور سجدہ میں غیر مسنون دعائیں پڑھی جا سکتی ہیں؟

سوال: کیا نمازِ فرض میں سجدہ اور رکوع میں «سُبحَانَ رَبِّیَ العَظِیمِ» اور «سُبحَانَ رَبِّیَ الْاَعلٰی»

---

[1] مرعاۃ المفاتیح: ١/ ٦٤١

[2] صحیح مسلم،بَابُ النَّهْیِ عَنْ قِرَاءَۃِ الْقُرْآنِ فِی الرُّکُوعِ وَالسُّجُودِ،رقم:٤٧٩

[3] صحیح مسلم، بَابُ مَا یُقَالُ فِی الرُّکُوعِ وَالسُّجُودِ، رقم:٤٨٢

کے علاوہ کوئی اور دعا بھی پڑھی جاسکتی ہے جیسا کہ بعض مقامات پر حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے ثابت ہے۔

(جواب): ہاں! اس کے علاوہ بھی وارد ہے، چنانچہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے رکوع اور سجدہ میں یہ دعا پڑھتے تھے۔

« سُبْحٰنَكَ اللّٰهُمَّ رَبَّنَا وَبِحَمْدِكَ. اَللّٰهُمَّ اغْفِرْلِي »[1]

سجود السھو (نماز میں بھول جانے کے سجدے)

سجدۂ سہو کس وقت اور کیوں کر کرتے ہیں؟

(سوال) بارہا دفعہ مختلف مکاتبِ فکر کی مساجد میں نماز پڑھنے کا اتفاق ہوا۔ ہر مسلک کے ائمہ کرام، سجدہ سہو، مختلف انداز سے ادا فرماتے ہیں۔ براہِ کرم، سجدہ سہو، کس وقت اور کیونکر کیا جاتا ہے؟ اس میں کیا پڑھا جاتا اور اسلام کس وقت پھیرتے ہیں؟ (محمد صدیق طارق، راولپنڈی)

(جواب) سجدۂ سہو احادیث میں جس طرح وارد ہے، ویسے ہی کرنا چاہیے۔ پس اگر ایک شخص بھول کر دو یا تین رکعات پڑھنے کے بعد سلام پھیر دیتا ہے تو اسے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ اور عمران رضی اللہ عنہ کی حدیث کے مطابق نماز مکمل کر کے سلام کے بعد سجدۂ سہو کرنا چاہیے۔ اگر وہ دو رکعت پڑھ کر اٹھ کھڑا ہوا اور بیٹھا نہیں تو اسے نماز مکمل کر لینے کے بعد ابن بحینہ کی حدیث کی رو سے سلام سے پہلے سجدہ کرنا چاہیے۔

اور اگر اسے شک ہو کہ آیا اس نے تین رکعات پڑھیں ہیں یا چار؟ تو اسے یقین پر اعتماد کرتے ہوئے ابوسعید اور عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کی حدیث کی رو سے سلام سے قبل سجدہ کرنا ہوگا اور اگر اسے شک واقع ہو مگر اسے یہ بالکل علم نہیں ہے کہ اس نے کتنی رکعتیں ادا کی ہیں تو وہ ظن غالب پر بنا کرتے ہوئے نماز پوری کرے اور حدیث ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے مطابق سلام کے بعد سجدۂ سہو کرے۔ اس طرح سب احادیث پر عمل ہو جائے گا۔

مذکورہ صورتوں کے علاوہ اگر کوئی اور صورت پیش آجاتی ہے تو وہ مذکورہ صورتوں میں سے جس صورت کے قریب ہوگی، اس کا حکم اس صورت کا حکم ہوگا۔[2]

علامہ شوکانی رحمہ اللہ کا بھی یہی قول ہے، مگر ابن حبان اور ان کے قول میں فرق یہ ہے کہ انھوں نے نئی

---

[1] صحیح بخاری، باب الدعا فی الرکوع، رقم: ٧٩٤

[2] صحیح ابن حبان: ١/١٩٥، ١٩٦

پیش آمدہ صورت میں، ہر دو طرح درست ہے، کو اختیار کیا ہے، یعنی اس صورت میں سجدۂ سہو سلام سے پہلے ی بعد میں، ہر طرح اختیار ہے۔ واضح رہے کہ اس مسئلہ میں اختلاف فضیلت کی حد تک ہے۔ یعنی سجدہ سہو سلام سے قبل افضل ہے یا سلام کے بعد۔ رہا جواز تو اس میں کسی کو کوئی اختلاف نہیں۔ ملاحظہ ہو: نیل الاوطار:۳/ ۱۱۲، بحوالہ القول المقبول، ص:۵۱۱۔

واضح ہو کہ سجدۂ سہو سلام سے قبل یا بعد کرنے کا ذکر تو آپ احادیث میں ملاحظہ فرما چکے، البتہ صرف ایک ہی طرف سلام پھیر کر سجدۂ سہو کرنا سنت سے ثابت نہیں۔ اور سجدہ سہو میں تسبیح وہی ہے جو عام حالات میں پڑھی جاتی ہے۔

مسبوق کا سجدہ سہو کرنا:

سوال: اگر امام سجدۂ سہو کرنے سے پہلے سلام پھیرے تو مسبوق کھڑا ہو کر اپنی نماز مکمل کرے اور آخر میں اکیلا ہی سجدۂ سہو ادا کرے۔ کیا یہ درست ہے؟

جواب: مسبوق اگر فوت شدہ نماز کی قضائی کے آغاز میں ہو پھر تو احوط یہی ہے، کہ امام کے ساتھ مل کر سجودِ سہو کر لے اور اگر امام تأخیر سے سجدۂ سہو کرتا ہے، تو پھر اپنی نماز مکمل کر کے سجدۂ سہو کرے۔ کیونکہ پہلی صورت اقرب الی الاقتداء ہے، جب کہ دوسری میں یہ شے مفقود ہے۔

سوال: شافعیہ کے نزدیک امام سجدہ سہو نہ کرے تو امام کے سلام پھیرنے کے بعد مقتدی سجدہ سہو کر لے۔ حنفیہ کے سوا سب یہی کہتے ہیں بشمول حافظ ابن حزم رحمہ اللہ۔

جواب حنفیہ کے نزدیک اس کی وجہ یہ ہے کہ مقتدی کی نماز کی بنا امام کی تکبیر تحریمہ پر ہے تو چونکہ اس نے سجدہ سہو نہیں کیا لہٰذا مقتدی بھی نہ کرے۔ اس صورت میں راجح بات یہ ہے کہ مقتدی کو سجودِ سہو کر دینا چاہئے۔ ملاحظہ ہو: فتح الباری:۲/ ۱۸۸۔

واجب امور میں سہو ہو جانے سے سجدہ سہو کرنا:

سوال: کیا واجب امور میں سہو ہو جانے سے سجدہ سہو کرنا واجب ہے۔ حنابلہ اور مالکیہ کے نزدیک امام واجب سجدۂ سہو ترک کر دے تو مقتدی خود سجدہ سہو کرے؟

جواب بایں صورت واجب کو ادا کرنے کے ساتھ سجدہ سہو بھی کرنا چاہئے۔

غیر مشروع سجدۂ سہو کرنے پر مزید سجدۂ سہو کرنا:

سوال مالکیہ کے نزدیک کسی نے اگر ایسی صورت میں سجدہ سہو کر لیا کہ جس میں سجدہ سہو مشروع نہیں ہے تو

چونکہ اس نے نماز میں سجدہ سہو کا اضافہ کیا ہے لہٰذا اس اضافہ کی وجہ سے اب اس پر سجدہ سہو کرنا واجب ہے، آپ کیا فرماتے ہیں؟

(جواب) حدیث: «لِكُلِّ سَهْوٍ سَجْدَتَانِ بَعْدَ مَا يُسَلِّمُ»[1] کی بنا پر ایسے شخص پر کوئی مواخذہ نہیں ہے۔

مقتدی دوسری رکعت میں ملے اور امام پانچ رکعت پڑھے:

(سوال) : اگر کوئی شخص ظہر کی نماز میں امام صاحب کے ساتھ دوسری رکعت پالے اور امام چوتھی رکعت میں بیٹھنے کی بجائے کھڑا ہو جائے اور پانچویں رکعت پڑھ کر سجدۂ سہو کرے تو مقتدی کی چار رکعت پوری ہو جائیں گی۔ کیا مقتدی کو پانچویں بعد میں پڑھنی پڑے گی یا امام کے ساتھ سلام پھیرنے پر نماز پوری ہو جائے گی؟

(جواب) : صورتِ مسئولہ میں مقتدی کی نماز مکمل ہے۔ اسی پر اکتفاء کرے۔ کیونکہ بندے پر اصل فریضہ چار رکعت ہی ہے۔

دوسری رکعت کا ایک سجدۂ سہواً رہ جائے:

(سوال) : ہمارے یہاں ظہر کی ایک نماز میں امام صاحب نے دوسری رکعت کا ایک سجدۂ سہواً چھوڑ دیا۔ نماز سے فراغت پر نمازیوں کے یاد دلانے پر صرف سجدۂ سہو پر اکتفا کیا کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا ہے کہ نماز میں کمی وبیشی کی صورت میں سجدۂ سہو کر لینا چاہیے۔

(جواب) : صورتِ مسئولہ میں جہاں سے سجدہ فوت ہوا ہے۔ وہاں سے لے کر دوبارہ نماز کی تکمیل کی جائے اور نماز کے اخیر میں دو سجدے کر کے سلام پھیرا جائے۔ اگر سجودِ سہو بعد از سلام کر لئے جائیں، تو یہ بھی جائز ہے۔

واضح ہو، کہ یہاں مقامِ سَہو سے نماز کا اِعادہ اس لئے ضروری ہے، کہ سجدہ نماز کا رکن ہے اور رکن کے فوت ہونے سے بعد والی نماز کالعدم ہے۔

سجدہ سہو ایک طرف سلام پھیر کر یا دونوں طرف؟

(سوال) : اگر "التحیات" پڑھنے کے بعد یاد آئے کہ میں نے سجدۂ سہو کرنا ہے تو کیا اسی وقت ایک طرف سلام کر کے سجدۂ سہو ادا کرے یا پھر نماز کے اختتام پر؟ اگر نماز پڑھ کر کرے گا تو کیسے اور کس طریقے سے؟

(جواب) : سجدۂ سہو نماز کے اختتام پر کرنا ہوگا۔ دونوں طرف سلام پھیرنے سے پہلے یا بعد، جس طرح کہ کتبِ احادیث میں تفصیل موجود ہے۔ ایک طرف سلام پھیر کر سجدۂ سہو کرنے کی کوئی دلیل نہیں۔ اس بارے میں

[1] سنن أبي داؤد، بَابُ مَنْ نَسِيَ أَنْ يَتَشَهَّدَ وَهُوَ جَالِسٌ، رقم:١٠٣٨

الشیخ محمد بن صالح العثیمین ﷾ کا ایک کتابچہ بعنوان ''سُجود السھو'' کافی مفید ہے۔ اس کو ہمارے فاضل دوست حافظ عبدالرشید اظہر ﷫ نے اردو کے قالب میں ڈھالا ہے۔ ''مکتب الدعوۃ'' اسلام آباد سے مفت مل سکتا ہے۔

نماز میں سجدۂ سہو کی صورتیں:

سوال: نماز میں سجدۂ سہو کی کیا کیا صورتیں ہیں؟

جواب: ''سجودِ سہو'' کی متعدد صورتیں اُحادیث میں وارد ہیں۔ ایک دفعہ نبی ﷺ دو رکعتوں میں تشہد بیٹھنا بھول گئے، تو آپ ﷺ نے قبل از سلام ''سجودِ سہو'' کیے، جس طرح کہ ابن بحینہ کی روایت میں تصریح موجود ہے اور ایک دوسرے موقعہ پر آپ ﷺ نے ظہر کی پانچ رکعت پڑھ لیں تو سلام پھیرنے کے بعد سجدۂ سہو کیا۔[1]

اس میں اصل ضابطہ یہ ہے، کہ ''سجودِ سہو'' وہاں کیے جائیں، جہاں آپ ﷺ کے فعل سے ثابت ہیں۔ اس کے ماسوا ''سجودِ سہو'' سلام پھیرنے سے پہلے ہوں گے۔ کیونکہ ان کا تعلق نماز سے ہے اور وہ پہلے ہی مناسب ہے۔ امام احمد بن حنبل ﷫ نے اسی طریق کار کو اختیار کیا ہے۔ ملاحظہ ہو فتح الباری (۹۳/۳) اسی موضوع پر شیخ عثیمین کی مستقل تصنیف بنام ''سُجود السھو'' موجود ہے۔ ہمارے فاضل دوست حافظ عبدالرشید اظہر ﷫ نے اس کو اُردو قالب میں ڈھالا ہے، جو لائقِ مطالعہ ہے۔ مکتب الدعوۃ اسلام آباد سے دستیاب ہے۔

نماز میں سورت پڑھنا یا سجدہ، رکوع کرنا بھول گیا:

سوال: نماز میں سورت پڑھنا یا سجدہ، رکوع کرنا بھول گیا، سجدۂ سہو کیا لیکن سجدۂ سہو کے بعد بھول کر پوری التحیات پڑھ لی تو کیا نماز ادا ہو جائیگی؟

جواب: سورۃ سے مراد، اگر ''سورۃ فاتحہ'' ہے، تو اس کے رہ جانے سے نماز ادا نہیں ہوگی۔ کیونکہ صحیح حدیث میں ہے: « لَا صَلٰوۃَ لِمَن لَّم یَقرَأ بِفَاتِحَۃِ الکِتَابِ.»[2]

اور اگر فاتحہ کے علاوہ ہے، تو اس کے رہ جانے سے نماز ہو جاتی ہے۔ حدیث میں ہے:

---

① صحیح البخاری، بَابُ إِذَا صَلّٰی خَمسًا، رقم: ۱۲۲۶

② صحیح البخاری، باب وُجُوبِ القِرَائَۃِ لِلاِمَامِ وَالمَامُومِ فِی الصَّلٰوۃِ کُلِّھَا ...... الخ، رقم: ۷۵٦، صحیح مسلم: ۳۹٤

« وَ إِن لَّم تَزِد عَلٰی أُمّ القُراٰنِ أَجزَأَت. وَ اِن زِدتَ فَهُوَ خَيرٌ »①

دوسری روایت میں ہے:

« لَم يَزِد عَلٰی ذٰلِكَ شَيئًا » رواہ الحارث بن أبی أسامة فی مسندہ، (ص ۳۸ من زوائدة »

(بسند حسن بحوالہ صفة الصلوٰة للالبانی:ص۷۷۔ طبع ۳ ②

اگر رکوع یا سجود بھول کر رہ جائے، تو اس کا مداوا ''سجودِ سہو'' سے نہیں ہوتا۔ کیونکہ ان کو نماز میں رکنیت کی حیثیت حاصل ہے۔ لہٰذا ان سے بعد والی نماز دوبارہ پڑھنی ہو گی اور ''سجودِ سہو'' کے بعد ''التحیات'' پڑھے جانے سے کوئی شے لازم نہیں، کیونکہ 'سنن' کی بعض روایات سے جواز مترشح ہے۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے مجموعہ روایاتِ ثلاثہ کو حسن قرار دیا ہے۔③

قنوت وتر بھولنے پر سجدہ سہو کا حکم:

سوال: وِتر میں دعا کس طرح پڑھنی چاہیے، رکوع کے بعد یا پہلے، تکبیر کہہ کر یا بغیر تکبیر کے، اور دعا ہاتھ اٹھا کر کرنی چاہیے یا چھوڑ کر یا سینے پر باندھ کر، اگر نمازِ وتر میں دعا بھول جائیں تو سجدۂ سہو کرنا چاہیے یا نہیں؟ اور قنوتِ نازلہ کی بھی وضاحت کر دیں۔

جواب: نمازِ وِتر میں ''دعائے قنوت'' رکوع سے پہلے پڑھنی چاہیے۔ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا قول و فعل اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا عمل اس کے مطابق تھا۔ چنانچہ حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم تین وِتر پڑھتے تھے۔ پہلی رکعت میں ''سورۃ الاعلیٰ'' اور دوسری میں ''الکافرون'' اور تیسری میں ''سورۃ الاخلاص'' پڑھتے اور ''دعائے قنوت'' رکوع سے پہلے پڑھتے تھے۔ (ملخصاً) حدیث ہذا سند کے اعتبار سے صحیح ہے، اور تمام رواۃ ثقات ہیں۔④

دوسری روایت میں ہے:

« عَلَّمَنِی رَسُولُ اللّٰہ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَن اَقُولَ : إِذَا فَرَغتُ مِن قِرَاءَ تِی فِی

① صحیح البخاری بَابُ القِرَاءَ ةِ فِی الفَجرِ، رقم:۷۷۲

② صحیح ابن خزیمة بَابُ ذِکرِ الدَّلِیلِ عَلَی أَنَّ الصَّلَاةَ بِقِرَاءَ ةِ فَاتِحَةِ الْکِتَابِ جَائِزَةٌ دُونَ ......الخ، رقم:۵۱۳، مسند الحارث، بَابُ الْقِرَاءَ ةِ فِی الصَّلَاةِ، رقم:۱۷۵

③ فتح الباری ۳/۹۹

④ عمل الیوم واللیلة، للنسائی:۷۳۴

الوِترِ. «اللّٰهُمَّ اهدِنِی»①

یعنی حضرت حسن رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے تعلیم دی، کہ وِتر میں قرأت سے فراغت کے بعد میں «اَللّٰهُمَّ اهدِنِی» پڑھوں۔''

تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو!"إرواء الغلیل" (۲/۱٦۸) نیز حضرت علقمہ رضی اللہ عنہ کا بیان ہے، کہ ابن مسعود اور صحاب رسول رضی اللہ عنہم نمازِ وِتر میں ''قنوت'' رکوع سے پہلے پڑھتے تھے۔ اس ''اَثر'' کی سند صحیح ہے۔ ملاحظہ ہو! مصنف ابن أبی شیبہ: ۲/۳۰۲ اور صحیح ابن خزیمہ(۱۱۰۰) میں ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کی روایت میں رکوع کے بعد بھی قنوتِ وِتر کا جواز ہے تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو! (القول المقبول فی تخریج أحادیث الرسول صلی اللہ علیہ وسلم)

قنوت وِتر اور قنوت نازلہ کو جمع کی صورت میں رکوع کے بعد ہاتھ اٹھا کر بھی دعا کی جا سکتی ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ وغیرہ کا رجحان اسی طرف معلوم ہوتا ہے۔ اور نمازِ وِتر میں اگر کوئی دعا قنوت بھول جائے، تو ''سجودِ سہو'' کے سلسلہ میں سلف سے نفی اور اثبات میں دونوں قسم کے آثار ملتے ہیں۔ ملاحظہ ہو! ''کتاب الوتر'' امام محمد بن نصر مروزی۔ بظاہر اس امر میں وسعت معلوم ہوتی ہے۔ (واللہ تعالیٰ اعلم)

قنوت نازلہ وہ دعا ہے، جو کسی حادثہ کے موقعہ پر بعد از رکوع پڑھی جاتی ہے۔ اس کے الفاظ کی صراحت ''کتاب الوتر مروزی'' اور ''حصن حصین'' (۳۲۱) میں موجود ہے۔

عیدین کی نماز میں سجدۂ سہو:

سوال: ہمارے محلے کے خطیب صاحب نے ۲۴ مئی ۱۹۹۴ء کو عیدِ قربان کی نماز پڑھانے سے پہلے عام لوگوں کو نماز پڑھنے کی ترکیب بتا کر کہا کہ اگر مجھ سے کوئی غلطی سرزد ہو جائے تو تم میں سے کوئی نہ کوئی سبحان اللہ زور سے ضرور کہے تاکہ میں سجدۂ سہو ادا کر سکوں۔

اس سے پہلے میں نے ایک دینی مسائل کی کتاب میں یہ پڑھا تھا کہ عیدین کی نماز میں سجدۂ سہو نہیں ہوتا۔ حکمت اس میں یہ بتائی تھی کہ اِن موقعوں پر عوام کا بے پناہ ہجوم ہوتا ہے۔ اگر امام سجدۂ سہو کرے گا تو آخر تک ہر نمازی کی سمجھ میں اِس بات کا آنا مشکل ہے اور گڑ بڑ ہونے کا امکان ہے اور دو عملی کا مظاہرہ ہو جائے گا بعض لوگ امام کی اتباع کریں گے اور بعض نہیں کریں گے۔

جواب: اصولِ راجح اور محقق مسلک کے مطابق نماز، چاہے فرض ہو یا نفلی، ہر دو صورت میں نسیان کی شکل

① التوحید لابن منده، رقم: ۳۳۸، الاحاد والمثانی لابن ابی عاصم، رقم: ٤١٥

میں سجودِ سہو مشروع ہیں۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی "صحیح" میں بایں الفاظ تبویب قائم کی ہے:

«بَابُ السَّهوِ فِی الفَرضِ، وَالتَّطَوُّعِ، وَ سَجَدَ ابنُ عَبَّاسٍ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُمَا سَجدَتَینِ بَعدَ وِترِهِ.»

یعنی "فرضی اور نفلی نماز میں سہو کی صورت میں کیا ہونا چاہیے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے وِتر کے بعد دو سجدے کیے تھے۔"

یہ "اَثر" لانے سے مصنف کا مقصود نوافل میں بھی "سجودِ سہو" کا اثبات ہے۔ کیونکہ راجح مسلک کے مطابق وِتر واجب نہیں۔ اسی طرح اہلِ علم نے اس مسئلہ پر بھی گفتگو کی ہے، کہ نمازِ عید کا کیا حکم ہے؟ ایک گروہ کے نزدیک واجب ہے، جب کہ دوسرا گروہ اس کی محض سنیت یا سنت مؤکدہ ہونے کا قائل ہے، لیکن دلائل کی رُو سے بظاہر اوّل الذکر مسلک راجح ہے۔ قرآن میں ہے:﴿ فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانحَر﴾(الکوثر:۲) وجہ استدلال یہ ہے، کہ صیغۂ امر وجوب کا متقاضی ہے۔ پھر نبی ﷺ نے نمازِ عید پر مداومت کی ہے۔ کبھی ترک نہیں کی۔ مزید آنکہ یہ دین کا ظاہری عظیم شِعار ہے۔ واضح ہو، کہ اصل اختلاف یہ نہیں، کہ مجمع کی کثرت کی وجہ سے آواز لوگوں کو سنائی دیتی ہے یا کہ نہیں۔ اگر یہی علت فرض کر لی جائے، پھر تو حج کے دوران یا آگے پیچھے، بیت اللہ میں فرض نمازوں میں بھی سجود سہو نہیں ہونے چاہئیں۔ حالانکہ کوئی بھی اس بات کا قائل نہیں۔

اصل صورتِ حال یہ ہے، کہ بعض سلف کے نزدیک نفلی نماز میں سجدۂ سہو نہیں۔ ممکن ہے اس دینی کتاب کے مؤلف نے اسے نفلی نماز سمجھ کر کہا ہو، کہ اس میں سجدۂ سہو نہیں، جب کہ اصل معاملہ اس کے برعکس ہے۔ لہٰذا "صلوٰۃِ عید" میں سہو کی صورت میں بلا تردّد سجدۂ سہو ہونا چاہیے۔ بناء بریں مُشارٌ اِلیہ موصوف خطیب صاحب کا موقف درست ہے۔

امام مسجد کا بھولے سے نمازِ تراویح میں تین رکعات ایک سلام کے ساتھ پڑھنا:

سوال: امام مسجد نے بھولے سے نمازِ تراویح میں تین رکعات ایک سلام کے ساتھ یعنی ایک رکعت زائد پڑھ لی۔ پھر آخر میں سجدۂ سہو کیا۔ اس کے بعد اگلی دو رکعت کی بجائے صرف ایک رکعت تراویح پڑھی اور اس میں بھی سجدۂ سہو کیا، بھولے سے زائد پڑھی ہوئی رکعت کو بھی شمار کیا، اور اسی رکعت سے متعلق سجدۂ سہو دوبارہ کیا۔ کیا یہ دونوں امور یعنی ان رکعات کو شمار کرنا اور دوبارہ سجدۂ سہو کرنا درست تھا؟

جواب: بایں صورت مصلّی (نمازی) کو چاہیے، کہ تین رکعات کے ساتھ ہی بلا سلام پھیرے چوتھی رکعت کا

اضافہ کرے۔ پھر قبل از سلام سجدۂ سہو کرکے فارغ ہو جائے۔ یہ جو طریق کار امام مسجد نے اختیار کیا ہے اس کی چنداں ضرورت نہیں تھی۔ مضٰی ما مضٰی (جو ہو گیا سو ہو چکا) اب اسے دہرانے کی ضرورت نہیں۔

فرض یا نفل نماز کی ایک رکعت زیادہ پڑھنے کے لیے کھڑا ہونے کی صورت:

سوال: اگر کوئی شخص بھولے سے فرض یا نفل نماز کی ایک رکعت زیادہ پڑھنے کے لیے کھڑا ہو جائے۔ امام ہو یا منفرد۔ یاد آنے پر انھیں منسوخ کرے۔ وہ بیٹھ جائے یا وہ دو رکعت جاری رکھے، اور پھر اس کے ساتھ دانستہ جفت بنانے کی غرض سے۔ مزید ایک رکعت پڑھے یا بس وہی رکعت پڑھ کر سجدۂ سہو کرے۔ کیا محدثین کا اس بارے میں اختلاف ہے۔ حدیث کے ساتھ گہرا شغف رکھنے والوں کا اس بارے میں کیا مذہب ہے؟ نبی کریم ﷺ کے زمانے میں احکام بدلتے رہتے تھے اس لیے صحابہ رضی اللہ عنہم نے سبحان اللہ، سبحان اللہ نہیں کہا۔ جب آپ ﷺ نے ایک رکعت زیادہ پڑھ لی تھی۔

جواب: ایسا شخص یاد آنے پر بیٹھ جائے۔ اسے جفت بناء کر مزید اضافہ نہ کرے۔ امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ ایک سوال کے جواب میں فرماتے ہیں: لاعلمی میں اگر مقتدی کھڑے ہو جائیں، تو ان کی نماز باطل نہ ہو گی۔ البتہ اگر انھیں غلطی کا علم ہو جائے، تو انھیں امام کی اتباع نہیں کرنی چاہیے، بلکہ بیٹھے انتظار کرتے رہیں اور جب وہ سلام پھیرنے لگے، تو اس کے ساتھ سلام پھیر دیں یا اس سے قبل ہی سلام پھیر دیں، مگر انتظار احسن ہے۔ الفتاویٰ الکبریٰ (۱/ ۱۴۷) نیز علامہ صنعانی رحمہ اللہ حدیث ابن مسعود رضی اللہ عنہما کی شرح میں فرماتے ہیں: یہ (پانچویں رکعت میں امام کی متابعت) صحابہ رضی اللہ عنہم کے ساتھ خاص تھا۔ اس لیے کہ عصرِ نبوت میں احکام میں تغیر و تبدیلی ممکن تھا۔ اگر آج ایسی صورت پیدا ہو جائے، تو مقتدیوں کو "سبحان اللہ" کہنا چاہیے۔ اگر امام بیٹھ جائے، تو بہتر۔ ورنہ انھیں بیٹھے انتظار کرنا چاہیے۔ یہاں تک کہ اس کے تشہد کے ساتھ تشہد پڑھیں اور اس کے سلام کے ساتھ سلام پھیر دیں۔[1]

اور علماء میں سے امام مالک، شافعی، احمد، اسحاق بن راہویہ رحمہم اللہ وغیرہ اس طرف گئے ہیں۔ اگر کوئی ظہر کی پانچ رکعات پڑھ لے، تو اس کی نماز درست ہے، لیکن سجدۂ سہو کرے گا۔ اگرچہ وہ چوتھی رکعت میں نہ بیٹھا ہو۔ ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی حدیث «قَالُوا صَلَّيتَ خَمسًا. فَسَجَدَ سَجدَتَينِ بَعدَ مَا سَلَّمَ»[2] سے ان کا استدلال ہے۔ لیکن حنفیہ کا کہنا ہے، کہ چوتھی رکعت میں عدمِ قعدہ کی صورت میں سجدوں سے قبل لوٹ کر

---

[1] سبل السلام: ۱/ ۳۴۹

[2] صحیح البخاری، بَابُ إِذَا صَلَّى خَمْسًا، رقم:۱۲۲۶

قعدہ کرے، کیونکہ اس میں نماز کی اصلاح ہے۔ المرعاۃ (۲/۳۱)۔ بعض اہلِ علم کا کہنا ہے، کہ پانچویں رکعت کے ساتھ چھٹی ملالے اور اخیر میں سجدۂ سہو کرے۔ چار فرض اور دو نوافل بن جائیں گے۔ لیکن اس مسلک کی کوئی قابلِ اعتماد دلیل معلوم نہیں ہو سکی۔

البتہ حدیث سے یہ ثابت ہے، کہ پانچویں رکعت کے ساتھ سجدۂ سہو مل کر قائمقام چھٹی رکعت بن کر نماز شفع (جفت) بن جاتی ہے۔[1] جب کہ اصل میں بھی وِتر کی بجائے شفع تھی۔ اصلی کیفیت لوٹ آئی۔ اختلاف کا ذکر ہو چکا۔ بظاہر ترجیح پہلے مسلک کو ہے۔ جسے امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ اور علامہ صنعانی نے اختیار کیا ہے۔ (واللہ تعالیٰ اعلم)

مقتدی تکبیر تحریمہ اور تکبیراتِ انتقال اور "رَبَّنَا لَكَ الحَمد......الخ" کا بھول جائے:

سوال: اگر کوئی شخص امام کی اقتداء میں کوئی فرض چیز بھول جائے۔ مثلاً: آنحضرت ﷺ نے تکبیر تحریمہ اور تکبیراتِ انتقال اور "رَبَّنَا لَكَ الحَمد......الخ" کا حکم دیا ہے اور امر وجوب کے لیے ہوتا ہے بعض علماء مندرجہ بالا امور کو فرض کہتے ہیں تو ان علماء کے نزدیک اگر مقتدی ان میں سے کچھ بھول جائے یا سورۃ فاتحہ کی چھ آیتیں پڑھے اور رکوع میں جانے کے بعد یاد آئے کہ ایک آیت نہیں پڑھی تو کیا ان امور میں سے کچھ بھولنے پر (ان علماء کے نزدیک) امام کے سلام پھیرنے کے بعد مقتدی ایک آیت مزید پڑھ کر سجدۂ سہو کرے؟

جواب: اہلِ علم کے ایک گروہ کے نزدیک یہ امور واجب ہیں۔ جب کہ جمہور علماء اس کے خلاف ہیں۔ بظاہر اوّل الذکر گروہ کے دلائل قوی ہیں۔ لہٰذا ان اُمور میں سے جہاں سے کوئی شے رہ جائے، اس رکعت سے دوبارہ نماز پڑھنی ہوگی۔ اسی طرح جن لوگوں کے نزدیک فاتحہ واجب ہے۔ آیت فوت ہونے کی صورت میں دوبارہ اس رکعت کو پڑھنا ہوگا، کیونکہ فاتحہ کا اطلاق کُل پر ہے۔ بعض پر نہیں۔ یاد رہے آیت کو اپنے محل پر پڑھا جاتا ہے۔ بلا محل تلاوت نا قابلِ اعتبار فعل ہے۔ (الاعتصام، لاہور: ۲ جون ۱۹۹۵ء)

سجدۂ سہو کے بعد تشہد کا حکم:

سوال: "تخریج صلوٰۃ الرسول" ص: ۵۰۷، تاریخ اشاعت رمضان ۱۴۱۳ھ میں لکھا ہے۔ سجدۂ سہو کے بعد تشہد۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ احادیث آپس میں مل کر حسن کے درجہ کو پہنچ جاتی ہیں۔[2]

---

[1] صحیح مسلم، بَابُ السَّهْوِ فِي الصَّلَاةِ وَالسُّجُودِ لَهُ، رقم: ۵۷۱

[2] فتح الباری: ۲/۹۸-۹۹، نیل الأوطار: ۳/۱۲۳

سلام سے پہلے سجدۂ سہو کیا جائے تو تشہد پڑھنا ثابت نہیں لیکن بعد از سلام سجدۂ سہو کرنے کی صورت میں مذکورہ بالا بیان ابن حجر رحمہ اللہ کی روشنی میں تشہد پڑھیں یا نہیں؟

جواب: اس مقام پر اصل عبارت یوں ہے:

« لٰكِن وَرَدَ فِي التَّشَهُّدِ فِي سُجُودِ السَّهوِ عَنِ ابنِ مَسعُودٍ، عِندَ أَبِي دَاوُد، وَالنِّسَائِي، وَ عَنِ المُغِيرَةِ عِندَ البَيهَقِي، وَ فِي إِسنَادِهِمَا ضُعفٌ. فَقَد يُقَالُ: إِنَّ الأَحَادِيثَ الثَّلَاثَةَ فِي التَّشَهُّدِ بِاجتِمَاعِهَا تَرتَقِي إِلٰى دَرَجَةِ الحَسَنِ. قَالَ العَلَّائِي: وَ لَيسَ ذٰلِكَ بِبَعِيدٍ. وَ قَد صَحَّ ذٰلِكَ عَنِ ابنِ مَسعُودٍ مِن قَولِهٖ أَخرَجَهُ ابنُ أَبِي شَيبَةَ »[1]

یہاں راجح بات یہ ہے کہ نمازی کو تشہد کا اختیار ہے۔ چاہے پڑھے یا ترک کردے۔

المرعاۃ میں ہے: «وَالرَّاجِحُ عِندَنَا أَنَّهُ مُخَيَّرٌ فِي التَّشَهُّدِ» (۳۹/۲)

پہلے تشہد میں اگر درود شریف رہ جائے تو سجدۂ سہو لازم ہے؟

سوال: چار رکعت نماز کے پہلے تشہد میں درود شریف پڑھنا مسنون ہے یا غیر مسنون؟ اور اگر مسنون ہو تو بالفرض پہلے تشہد میں درود شریف پڑھنا بھول جائے تو سجدۂ سہو ادا کرنا ہوگا یا نہیں؟

جواب: پہلے تشہد میں درود پڑھا جا سکتا ہے اور اگر رہ جائے، تو سجدۂ سہو لازم نہیں آتا۔

چار رکعات والی نماز میں دوسری رکعت میں بھول کر تشہد پڑھنا:

سوال: اگر کوئی نمازی چار رکعات والی نماز پڑھ رہا ہو اور دو رکعت کے بعد تشہد کے بعد درود شریف بھی پڑھے اور سلام پھیرنے سے پہلے یاد آئے اور اُٹھ کر نماز مکمل کرلے۔ کیا اس نمازی کے لیے سجدۂ سہو لازم ہے کہ نہیں؟ یا نماز دوبارہ پڑھے؟ یا سجدے کے بغیر نماز پڑھے یا اگر سجدۂ سہو ضروری تھا اور کوئی بھول جائے تو کیا حکم ہے؟

جواب: اس حالت میں سجدۂ سہو نہیں بلکہ بعض اہلِ علم عمومِ حدیث کی بناء پر پہلے تشہد میں بھی درود پڑھنے کے قائل ہیں اور ضروری سجدۂ سہو اگر کوئی بھول جائے، تو یاد آنے پر کرنا چاہیے۔

امام بھول کر پانچویں رکعت کے لیے کھڑا ہو جائے تو......؟

سوال: امام صاحب نماز مکمل ہونے کے بعد (یعنی دوسرے تشہد) کے بعد چوتھی رکعت سے کھڑے ہو گئے

[1] فتح الباری: ۹۹/۳

یہاں تک کہ کمر سیدھی ہوگئی۔ مقتدیوں میں سے تین اشخاص نے سبحان اللہ کہا تو امام صاحب بیٹھ گئے اور دو سجدے کیے۔ کچھ نمازیوں نے اعتراض کیا کہ جب امام نے کمر سیدھی کرلی تو پھر رکعت پڑھنے کے بعد ہی بیٹھے گا جب کہ کچھ نمازیوں نے کہا کہ نماز کے مکمل ہونے کے یقین کے بعد اگلی رکعت پڑھنا منع ہے۔

وضاحت فرمائیں۔ کیا امام نے ایسا کرکے درست کیا ہے؟

جواب: چار رکعت کے بعد کھڑا ہونے والا امام یاد آنے پر بیٹھ جائے، کیونکہ فرضی نماز میں چار رکعات سے زائد کا تصور نہیں۔

امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ سے سوال ہوا، کہ ایک امام پانچویں رکعت کے لیے اٹھ کھڑا ہوا، مقتدیوں نے ''سبحان اللہ'' کہا، لیکن اس نے ان کی طرف توجہ نہیں دی۔ تو کیا مقتدی اس کے ساتھ اٹھ کھڑے ہوں یا نہ؟

امام صاحب نے جواباً فرمایا: مقتدی اگر جہالت کی وجہ سے اس کے ساتھ اٹھ کھڑے ہوں، تو ان کی نماز باطل نہیں ہوگی۔ لیکن باخبر ہونے کی صورت میں ان کے لائق نہیں، کہ ایسے امام کی پیروی کریں، بلکہ وہ منتظر رہیں۔ یہاں تک کہ وہ امام کے ہمراہ سلام پھیریں یا اس سے پہلے سلام پھیر کر فارغ ہو جائیں۔ البتہ انتظار کرنا زیادہ بہتر ہے۔[1]

لہٰذا مسئولہ کیفیت میں امام کا فعل درست ہے۔

نماز میں کلام کی حرمت کا حکم مدینہ میں آیا:

سوال: حدیث سے ثابت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز کم پڑھائی۔ پھر صحابہ رضی اللہ عنہم کے بتانے پر مکمل کی اور سجدۂ سہو کیا۔ شروع میں نماز میں بات چیت کرلیتے۔ سلام کا جوب بھی دیا جاتا لیکن آیت ﴿حَافِظُوا عَلَى الصَّلَوٰت﴾ الخ اُترنے پر بات چیت بند ہوگئی کس طرح پتہ چلا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ نماز صحابہ کے بتانے پر اس آیت مبارکہ کے نازل ہونے سے پہلے مکمل کرکے سجدۂ سہو کیا تھا یا بعد میں کیونکہ احناف کا کہنا یہ ہے کہ اب بات چیت کرنے سے نماز ٹوٹ جاتی ہے جب کہ اہلِ حدیث اس حدیث پر عمل کررہے ہیں؟

جواب: یہ بات واضح ہے کہ نماز میں خاموشی کی روایت کے راوی زید ہیں اور آیت میں ﴿وَ قُوْمُوا لِلّٰهِ قَانِتِيْن﴾ بالاتفاق مدنی ہے۔ اس سے معلوم ہوا، کہ نماز میں کلام کی حرمت کا حکم مدینہ میں آیا، لیکن کب آیا؟ اس بارے میں روایات میں تصریح موجود ہے، کہ ابن مسعود رضی اللہ عنہما کی حبشہ سے ان کی آمد اس وقت ہوئی، جب آپ ''معرکۂ بدر'' کی تیاری میں مصروف تھے اور اُس وقت نماز میں کلام کی حرمت نازل ہو چکی تھی۔

[1] مجموع فتاویٰ: ۲۳/۵۳

لیکن ''قصہ ذوالیدین'' بہت بعد کا ہے۔ کیونکہ روایت میں تصریح موجود ہے، کہ اس نماز میں ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بھی شریک تھے۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی آمد سن سات ہجری بموقعہ ''خیبر'' ہوئی ہے جب کہ جنگ بدر سن دو ہجری میں ہوئی ہے۔ اس سے معلوم ہوا، کہ مسئلہ ہذا میں اہلِ حدیث کا مسلک راجح ہے۔

سجود سہو کے مابین اللھم اغفرلی پڑھنا:

سوال: سجدۂ سہو دو کیے جاتے ہیں ایک سجدہ کر کے دوسرے سجدے کے درمیان دعا «اَللّٰھُمَّ اغفِرلِی» آخر تک پڑھنی چاہیے یا نہیں؟

جواب: عمومی حالت نماز کے پیشِ نظر ''سجودِ سہو'' کی صورت میں ''مابین السجدتین'' والی دعا پڑھنی چاہیے۔

سجدہ سہو کرنے سے پہلے گردن کو ہلکا سا گھمانا:

سوال: محترم شیخ الحدیث صاحب۔ السلام علیکم! مجھے ایک شخص نے کہا ہے کہ جب سجدۂ سہو کرنا ہے تو اس کا طریقہ کار یہ ہے کہ تشہد کی دعائیں پڑھ کر گردن کو دائیں طرف ہلکا سا پھیرنا ہے پھر سجدے کرنے ہیں۔ پھر اس کے بعد سلام پھیرنا ہے آپ اس موضوع پر احادیث کی روشنی میں رہنمائی فرمائیں۔

جواب: سجدۂ سہو کرنے سے پہلے گردن کو دائیں طرف ہلکا سا پھیرنا، کسی نص سے ثابت نہیں۔

آخری رکعت کا ایک سجدہ رہ جائے:

سوال: ہمارے ہاں عشاء کی نماز ایک حافظ صاحب نے پڑھائی آخری رکعت میں دو کے بجائے ایک سجدہ کرلیا، پیچھے مقتدی حضرات نے کئی طرح سے اشارہ دیا مگر شاید وہ سمجھ نہ سکے۔ سلام پھیرنے کے بعد جب ان سے کہا گیا کہ آپ نے آخری رکعت میں ایک سجدہ کیا ہے تو انہوں نے سجدۂ سہو کرلیا کیا سجدۂ سہو سے نماز ہوگئی یا چھوڑا ہوا سجدہ بھی کرنا پڑے گا؟

جواب: مذکورہ صورت میں امام کو چاہیے کہ پہلے فوت شدہ سجدہ کرے کیونکہ سجدہ ارکانِ نماز میں سے ہے جس کی ادائیگی انتہائی ضروری ہے۔ پھر تشہد مکمل کر کے دو سجود سہو کر کے سلام پھیر دے۔

کیا غلطی کی اصلاح کے باوجود امام سجود سہو کرے گا؟

سوال: نماز میں امام نے اٹھنے یا بیٹھنے میں غلطی کر لی مگر لقمہ ملنے پر غلطی کی اصلاح بھی کر لی۔ کیا اس صورت میں سجدۂ سہو کرے گا یا نہیں؟

(جواب): غلطی کی اصلاح کے باوجود امام سجود سہو کرے گا۔ کیونکہ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دو رکعت کے بعد (تشہد میں بیٹھنے کی بجائے) کھڑے ہونے کے لیے حرکت کی، تو لوگوں نے ''سبحان اللہ'' کہا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم بیٹھ گئے۔ پھر ''سجدۂ سہو'' بھی کیا۔

« أَخرَجَهُ البَیهقِی مَوقُوفًا ، وَ فِی بَعضِ طُرُقِهٖ اَنَّهٗ قَالَ: هٰذِهِ السُّنَّةَ قَالَ الحَافِظُ: وَ رِجَالُهٗ ثِقَاتٌ » [1]

رکعات میں شک کی صورت میں سجدہ سہو:

(سوال): سجدۂ سہو کی جملہ صورتوں کی مع امثلہ وضاحت مطلوب ہے؟

(جواب): اس وقت سجودِ سہو کی جملہ صورتوں کا احاطہ کرنا ممکن نہیں۔ بطورِ مثال دو ایک صورتیں ملاحظہ فرمائیں! مثلاً:

امام یا منفرد (اکیلے نمازی) کو چار رکعتی نماز میں شک پڑ جائے، کہ تین رکعتیں پڑھی ہیں یا چار؟ تو ایسی صورت میں ضروری ہے، کہ بناء یقین پر رکھی جائے اور وہ تین رکعتیں ہیں۔ چوتھی رکعت پڑھ کر سلام سے پہلے سجدۂ سہو کرے۔ اس سلسلے میں صحیح مسلم میں حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کی مرفوع روایت بالکل واضح ہے۔

اگر تین رکعات پر سلام پھیر لے۔ بعد میں آگاہی ہو، تو وہ تکبیر کے بغیر نماز کی نیت سے کھڑا ہو جائے۔ چوتھی رکعت پڑھے۔ پھر تشہد کے لیے بیٹھے۔ تشہد اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر درود اور دعا کے بعد سلام پھیر دے۔ پھر سجدۂ سہو کرے، اور سلام پھیر دے۔ ''قصۂ ذو الیدین'' میں اس امر کی وضاحت موجود ہے۔

تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو! علامہ ابن عثیمین کا رسالہ: سجود السھو

احتیاط کے طور پر سجدۂ سہو کرنا:

(سوال): کیا احتیاط کے طور پر سجدۂ سہو کو اپنا معمول بنایا جا سکتا ہے؟

(جواب): سجودِ سہو بھول یا شک کی صورت میں ہیں۔ احتیاطاً نہیں۔

کسی رکعت کا درمیانی سجدہ رہ جائے تو......؟

(سوال): اگر نماز میں کسی رکعت کا سجدہ کسی وجہ سے رہ جائے تو سجدۂ سہو کفایت کر سکتا ہے یا نہیں؟ حدیث میں ہے کہ ایک نمازی کا آخری رکعت کا سجدہ حذف ہو گیا تھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو سجدہ کرنے کا حکم دیا اور پھر تشہد مکمل کرنے پر سجدۂ سہو کا حکم فرمایا۔

[1] نیل الأوطار: ۳/ ۱۲۸

اگر مذکورہ صورت کے علاوہ پہلی یا دوسری رکعت کا سجدہ حذف ہو جائے اور سلام پھیرنے سے پہلے یاد آ جائے تو کیا کرے؟ صحیح حدیث کی روشنی میں وضاحت فرمائیں۔ (حافظ محمد حسین، حجرہ شاہ مقیم، اوکاڑہ)

جواب : دو سجدوں میں سے اگر ایک سجدہ رہ جائے، تو جس رکعت میں سجدہ رہا ہے، وہیں سے نماز شروع۔ جس کی صورت یہ ہے، کہ ایک سجدہ پہلے ہو چکا ہے، ایک سجدہ اور کر کے اس کے بعد والی رکعتیں پڑھ لے۔ پھر اخیر میں التحیات کے بعد سلام سے پہلے یا بعد میں سجدۂ سہو کرے۔ کیونکہ دونوں سجدے رکن ہیں۔ ایک کے چھوٹنے سے نماز نہیں ہوتی۔ (فتاویٰ اہلحدیث از محدث روپڑی رحمہ اللہ: ۲/ ۲۸۰)

سجدے میں تسبیحات پڑھنا بھول جائے تو......؟

سوال : مجھے دوسری رکعت کے سجدے میں یاد آیا کہ میں نے پہلی رکعت کے دوسرے سجدے میں «سُبْحَانَ اللّٰهِ رَبِّيَ الاَعْلٰی» نہیں پڑھا۔ میں نے معمول کے مطابق باقی نماز ادا کی اور سلام سے پہلے سجدۂ سہو کر لیا کیا یہ ایک درست فعل تھا؟

جواب : آپ کا سجودِ سہو کا عمل درست ہے۔ ملاحظہ ہو! المغنی: ۲/ ۱۸۰، طبع دار عالم الکتب.

سجدۂ تلاوت کے احکام و مسائل

نماز میں سجدۂ تلاوت آ جائے تو کتنے سجدے کرنے چاہئیں؟

سوال نماز میں سجدۂ تلاوت آ جائے تو کتنے سجدے کرنے ہیں۔ مسنونہ دعا کے علاوہ کوئی دوسری دعا مانگ لینے کا کوئی حرج تو نہیں۔ امام اپنی ضرورت کی کوئی دعا فرض نماز کے سجدہ میں مانگے تو خیانت تو نہیں بن جائے گی؟

جواب سجدہ تلاوت صرف ایک ہے، صرف مسنون دعا ہی پڑھنی چاہیے، جس کے الفاظ یوں ہیں: « اَللّٰهُمَّ اكْتُبْ لِي بِهَا عِنْدَكَ أَجْرًا، وَضَعْ عَنِّي بِهَا وِزْرًا، وَاجْعَلْهَا لِي عِنْدَكَ ذُخْرًا، وَتَقَبَّلْهَا مِنِّي كَمَا تَقَبَّلْتَهَا مِنْ عَبْدِكَ دَاوُدَ»[1] روایت ہذا شواہد کی بنا پر حسن درجہ کی ہے۔ اور دوسری دعا « سجد وجهي للذي خلقه»[2] اس کا سجدۂ نماز میں پڑھنا تو ثابت ہے مگر سجدۂ قرآن میں پڑھنا بسند صحیح ثابت نہیں۔ صرف مسنون دعا پر اکتفا کرنا چاہیے۔ امام سجدہ میں صرف مسنون دعا کرے گا، اضافہ نہیں کرنا چاہیے۔ البتہ

① ابو داود، ترمذی، ابن ماجه وغیره) (سنن الترمذی، بَابُ مَا يَقُولُ فِي سُجُودِ القُرْآنِ، رقم: ۵۷۹

② سنن أبي داؤد، بَابُ مَا يَقُولُ إِذَا سَجَدَ، رقم: ۱۴۱۴، سنن الترمذی، بَابُ مَا يَقُولُ فِي سُجُودِ القُرْآنِ، رقم: ۵۸۰

بحالتِ تشہد اختیار ہے کہ نمازی دین و دنیا کی بہتری کی جو دعائیں چاہے، کرسکتا ہے۔

سجدہ تلاوت فوراً باوضو اور چارپائی پر کرنے کا حکم:

(سوال) : قرآن پاک کا سجدہ اُسی وقت کرنا چاہیے یا بعد میں بھی کرسکتے ہیں؟ اور سجدہ چارپائی پر کرسکتے ہیں یا نہیں؟

(جواب) : سجدۂ تلاوت میں چونکہ عَلٰی أَحَدِ القَولَینِ' (ایک قول کے مطابق) طہارت شرط نہیں۔ لہٰذا بلاتأخیر کرلینا چاہیے۔ ''صحیح بخاری کے ''ترجمۃ الباب'' میں ہے :

« وَ کَانَ ابنُ عُمَرَ یَسجُدُ عَلٰی غَیرِ وُضُوءٍ »①

یعنی ''ابن عمر رضی اللہ عنہ بلا وضو سجدۂ تلاوت کرلیا کرتے تھے۔''

پھر مصنف کا استدلال اس حدیث سے ہے، کہ رسول اللہ ﷺ نے مکہ معظمہ میں سورہ ''النجم'' کی تلاوت فرمائی۔ آپ کے ساتھ مسلمانوں، مشرکین اور جنّ وانس نے بھی سجدہ کیا۔ وجہِ استدلال یہ ہے، کہ مشرکین کی عدمِ ادائیگی کے باوجود ان کا فعل سجدہ سے موسوم ہے۔ لہٰذا ایک مسلم کا سجدہ تو ہر حالت میں بطریقِ اَولیٰ شرعی سجدہ ہی قرار پائے گا۔ مزید آنکہ مجالسِ عامہ میں عادۃً ہر شخص باوضو نہیں ہوتا۔ بلا تفصیل سبھی کا سجدہ کرگزرنا طہارت کے عدمِ اشتراط (شرط نہ ہونے) کی دلیل ہے۔②

جب چارپائی پر نماز پڑھی جاسکتی ہے، تو سجدۂ تلاوت بھی ہوسکتا ہے۔ مزید تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو! فتاویٰ أهل حدیث (۱/ ۳۲۹) شیخنا محدث روپڑی رحمہ اللہ (۱۷۔اپریل ۱۹۹۲)

ریڈیو اور لاؤڈ سپیکر میں قرآن کریم سننے پر سجدہ تلاوت:

(سوال) : قرآن کا سجدہ واجب ہے۔ ریڈیو میں مساجد میں لاؤڈ سپیکر میں جمعہ کو سورۃ سجدہ پڑھی جاتی ہے ایسی صورت میں سجدہ گھروں میں بیٹھنے والوں پر بھی واجب ہے؟

(جواب) : سجدۂ تلاوت اس صورت میں کرنا چاہیے جب تلاوت سننے کی نیت ہو ورنہ نہیں۔③

نماز میں کوئی ایسی سورت پڑھی جائے جس کے آخر میں سجدہ آتا ہے:

(سوال) : اگر نماز میں کوئی ایسی سورت پڑھی جائے جس کے آخر میں سجدہ آتا ہے جیسے سورہ علق، تو سجدۂ

---

① صحیح البخاری، بَابُ سُجُودِ المُسلِمِینَ مَعَ المُشرِکِینَ وَالمُشرِکُ نَجَسٌ لَیسَ لَهُ وُضُوءٌ

② فتح الباری: ۲/ ۵۵٤

③ مرعاۃ المفاتیح: ۲/ ٤٥

تلاوت کرنے کی صورت کیا ہوگی؟ کیونکہ اب رکوع بھی کرنا ہے اور سجدۂ تلاوت بھی۔

(جواب): ایسی صورت میں پہلے سجدۂ تلاوت کرے۔ پھر چند آیات پڑھ کر رکوع میں چلا جائے۔

دو سجدوں کے درمیانی امور

سجدوں والی رفع یدین کی احادیث کا حکم:

(سوال): ابن حزم نے "المحلّٰی" اور البانی نے ''صفۃ صلاۃ النبی ﷺ'' میں سجدوں والی رفع یدین کی احادیث کو صحیح کہا ہے کہ یہ احادیث فی الواقع قابلِ عمل ہیں؟ عبد اللہ روپڑی رحمہ اللہ نے ضعیف بتایا ہے۔ وضاحت فرمائیں؟

(جواب): مسئلہ ہذا کو امام ابن حزم نے ''المحلّٰی'' میں "اَلْأَعمَالُ الْمُستَحَبَّةُ فِيْ الصَّلٰوةِ. وَ لَيسَت بَفَرضٍ" کے عنوان کے تحت بیان کیا ہے۔ علامہ البانی نے "صفة الصلاة" میں حدیث کو صحیح قرار دیا ہے۔ لیکن ان کا اپنا عمل عدمِ رفع پر ہے۔ میں نے بذاتِ خود ان کی مدنی زندگی میں اس بات کا مشاہدہ کیا ہے، جس طرح کہ راوی حدیث ہذا (اس حدیث کے راوی) مالک بن حویرث کا عمل بھی اس کے خلاف ہے۔ صحیحین میں اس امر کی وضاحت موجود ہے، جب کہ صحیحین میں ابن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت میں سجود کے موقع پر عدمِ رفع کی تصریح موجود ہے۔ اس کے بالمقابل روایت سرے سے صحیحین میں موجود ہی نہیں۔

اصولِ حدیث میں یہ بات مُسَلَّمہ ہے کہ متفق علیہ روایت کا مقام اعلیٰ و ارفع ہے۔ جب کہ اس کے بالمقابل روایت کی صحت بھی کئی ایک اہلِ علم کے نزدیک محلِ نظر ہے۔ حضرت الشیخ محدث روپڑی رحمہ اللہ نے ''فتاویٰ اہلحدیث'' (۲/ ۱۲۵تا۱۳۶) میں اس مسئلہ کو لکھا ہے، اور دلائل سے ثابت کیا ہے کہ حدیث ہذا قابلِ حجت نہیں۔ اسی طرح صاحب ''عون المعبود'' (۱/ ۲۶۹۔۲۷۰) نے دلائل کی رُو سے اس حدیث کو ضعیف کہا ہے۔ ''دلیل الطالب علی أرجح المطالب'' میں نواب صاحب رحمہ اللہ نے بھی فرمایا ہے کہ یہ حدیث ضعیف ہے۔ جملہ دلائل کے پیشِ نظر عام رجحان بھی عدمِ رفع کی طرف ہے۔

سجدوں میں رفع الیدین:

(سوال): علامہ البانی حفظہ اللہ نے اپنی کتاب ''صفۃ الصلوٰۃ'' میں چار مزید جگہوں میں رفعِ یدین کرنے کو سنت کہا ہے۔ یعنی سجدہ میں جاتے وقت، سجدے سے سر اٹھاتے وقت، دوسرا سجدہ کرتے وقت اور پھر دوسرے سجدے

سے سر اٹھاتے وقت، اور ساتھ ہی حدیث کی مختلف کتابوں سے حوالے دیئے ہیں اور ان حدیثوں کو صحیح بھی کہا ہے۔ البانی صاحب کا موقف عام اہلِ حدیث کے موقف سے ہٹا ہوا نظر آتا ہے۔ آپ اس بارے میں سائل کی تشفی فرمائیں؟

(جواب) : بحالتِ سجود جمہور اہلِ علم رفعِ یدین کے قائل نہیں۔ ان کا اعتماد ابن عمر، علی بن ابی طالب اور ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہم سے مروی روایات پر ہے۔ ان روایات کو یہ مزیت (خصوصیت) حاصل ہے کہ ان کی نسبت صحیحین کی طرف ہے۔ اربابِ فن کے ہاں یہ بات معروف ہے کہ اعلیٰ ترین درجہ متفق علیہ روایت کا ہے۔ جب کہ اِثبات کی بیشتر روایات متکلم فیہ ہیں۔ صاحب "المرعاۃ" فرماتے ہیں:

" وَهٰذِهِ الأَحَادِيثُ ضَعَّفَهَا الجمهُورُ وَ عَلَّلُوهَا " (۱/ ۵۵۰)

یعنی اثبات کی روایات کو جمہور نے ضعیف اور معلول قرار دیا ہے۔

مزید رقمطراز ہیں:

«وَالحَقُّ فِي ذٰلِكَ مَا ذَهَبَ إِلَيهِ الجمهُورُ، لِأَنَّ أَحَادِيثَ النَّفيِ صَحِيحَةٌ صَرِيحَةٌ فِي النَّفيِ، بِخِلَافِ أَحَادِيثِ الاِثبَاتِ. فَإِنَّهَا مَعلُولَةٌ، وَ بَعضُهَا غَيرُ صَرِيحَةٍ فِي الاِثبَاتِ. وَ لَو سُلِّمَ صِحَّتُهَا ، وَ لِكَونِهَا صَرِيحَةً فَحَدِيثُ ابنِ عُمَرَ، وَ مَن وَافَقَهُ أَولٰى أَن يُعمَلَ بِهِ، لِكَونِهِ أَصَحُّ ، وَ أَقوٰى ، وَ أَرجَحُ ، وَ أَصرَحُ»

یعنی اس بارے میں حق بات وہ ہے جسے جمہور نے اختیار کیا ہے، کیونکہ نفی کی حدیثیں نفی میں صحیح صریح ہیں بخلاف اثبات کے وہ معلول ہیں۔ بعض اثبات میں غیر صریح ہیں اور بفرضِ صحت اور صراحت بھی ابن عمر رضی اللہ عنہ اور ان کے موافقین کی حدیث اولیٰ ہے کہ اس پر عمل کیا جائے۔ کیونکہ یہ زیادہ صحیح، زیادہ راجح، اور زیادہ واضح ہے۔

علامہ شوکانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

«« وَهٰذِهِ الأَحَادِيثُ لَا تَنهَضُ لِلاِحتِجَاجِ بِهَا عَلَى الرَّفعِ فِي غَيرِ تِلكَ المَوَاطِنِ. فَالوَاجِبُ البَقَاءُ عَلَى النَّفيِ الثَّابِتِ فِي الصَّحِيحَينِ، حَتّٰى يَقُومَ دَلِيلٌ صَحِيحٌ يَقتَضِي تَخصِيصَهُ ، كَمَا قَامَ فِي الرَّفعِ عِندَ القِيَامِ مِنَ التَّشَهُّدِ الأَوسَطِ » [1]

"اور یہ احادیث اس قابل نہیں ہیں کہ ان سے معروف مواقعِ رفع کے علاوہ پر استدلال کیا

[1] نیل الأوطار (۱/ ۱۸۸) طبع حلبی

جائے۔ پس لازم یہی ہے کہ ''بخاری و'' مسلم میں مذکور رفع یدین کی نفی کو ہی باقی چھوڑ دیا جائے۔ یہاں تک کہ کوئی دلیل صحیح قائم ہو جائے۔ جیسے دو رکعت میں تشہد پڑھ کر اٹھنے کے وقت رفع یدین پر صحیح دلیل قائم ہوگئی ہے۔

دوسری طرف کچھ اہلِ علم سجدہ میں رفعِ یدین کے استحباب کے قائل ہیں۔ ان کا اعتماد چند ایک آثار و اقوال کے علاوہ بعض مرفوع روایات پر ہے۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ "فتح الباری" میں فرماتے ہیں:

«وَ أَصَحُّ مَا وَقَفتُ عَلَيهِ مِنَ الاَحَادِيثِ فِي الرَّفعِ فِي السُّجُودِ، مَا رَوَاهُ النَّسَائِيُّ مِن رِوَايَةِ سَعِيدِ بنِ اَبِي عَرُوبَةَ، عَن قَتَادَةَ، عَن نَصرِ بنِ عَاصِمٍ، عَن مَالِكِ بنِ الحُوَيرِثِ أَنَّهُ رَأَى النَّبِيَّ ﷺ يَرفَعُ يَدَيهِ فِي صَلَاتِهِ إِذَا رَكَعَ، وَ إِذَا رَفَعَ رَأسَهُ مِن رُكُوعِهِ، وَ إِذَا سَجَدَ، وَ إِذَا رَفَعَ رَأسَهُ مِن سُجُودِهِ حَتّٰى يُحَاذِي بِهِمَا فُرُوعَ اُذُنَيهِ. وَ قَد اَخرَجَ مُسلِمٌ بِهٰذَا الاسنَادِ طَرَفَهُ الاَخِيرَ، كَمَا ذَكَرنَاهُ فِي أَوَّلِ البَابِ الَّذِي قَبلَ هٰذَا ، وَ لَم يَتَفَرَّد بِهِ سَعِيدٌ. فَقَد تَابَعَهُ هَمَّامٌ، عَن قَتَادَةَ عِندَ أَبِي عَوَانَةَ فِي صَحِيحِهِ» (اِنتَهٰی)

اس پر نقد و تبصرہ کرتے ہوئے صاحب "عون المعبود" رقمطراز ہیں:

« فَظَهَرَ مِن قَولِ الحَافِظِ هٰذَا أَنَّ حَدِيثَ النَّسَائِيِّ مِن طَرِيقِ سَعِيد بنِ أَبِي عَرُوبَةَ، عَن نَصرِ بنِ عَاصِمٍ، عَن مَالِكِ بنِ الحُوَيرِثِ صَحِيحُ الاِسنَادِ. فَقَد قَامَ دَلِيلٌ صَحِيحٌ عَلَى الرَّفعِ فِي السُّجُودِ فَيَجِبُ القَولُ بِهِ قُلتُ: لَا يَستَلزِمُ مِن صِحَّةِ إِسنَادِهِ صِحَّتُهُ كَيفَ؟ وَ قَد رَوَى البُخَارِيُّ فِي صَحِيحِهِ حَدِيثَ مَالِكِ بنِ الحُوَيرِثِ مِن طَرِيقِ خَالِدٍ، عن أَبِي قَتَادَةَ. وَ لَيسَ فِيهِ زِيَادَةٌ، وَ إِذَا سَجَدَ ، وَ إِذَا رَفَعَ رَأسَهُ مِنَ السُّجُودِ. وَ رَوَاهُ مُسلِمٌ مِن طَرِيقِ أَبِي عَوَانَةَ، عَن قَتَادَةَ، عَن نَصرِ بنِ عَاصِمٍ ، وَ لَيسَ فِيهِ تِلكَ الزِّيَادَةُ. وَ كَذَا رَوَاهُ أَبُودَاوُدُ، وَ ابنُ مَاجَةَ ، وَالدَّارِمِيُّ ، وَالدَّارُقُطنِيُّ، وَالبُخَارِيُّ فِي «جُزءِ رَفعِ اليَدَينِ » وَ لَم يَذكُر أَحَدٌ مِن هٰؤُلَاءِ تِلكَ الزِّيَادَةَ (۲۷/۱)

پھر "فتح الباری" سے بحوالہ ''جزء رفع اليدين'' نقل کرتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی مرفوع روایت میں ہے:« وَ لَا يَرفَعُ يَدَيهِ فِي شَيءٍ مِن صَلَاتِهِ، وَ هُوَ قَاعِدٌ. وَ أَشَارَ إِلَى تَضعِيفِ مَا وَرَدَ

فِي ذٰلِكَ.»

مسئلہ ہذا پر ہمارے مربی اوّل شیخ مجتہد العصر محدث روپڑی رحمہ اللہ نے نہایت محققانہ، محدثانہ، فقیہانہ انداز میں گفتگو فرمائی ہے۔ بحث اگرچہ طویل ہے لیکن فوائد و ثمرات سے بھرپور اور علمی ترقی و اضافہ کی موجب ہے۔ لہٰذا بعینہٖ ان کے الفاظ میں ملاحظہ فرمائیں۔

سجدہ میں رفع یدین کی احادیث شبہ سے خالی نہیں۔ جس کی تفصیل مندرجہ ذیل ہے۔

اصولِ حدیث میں لکھا ہے کہ اگر کوئی محدث "إِسنَادُهٗ صَحِيحٌ" کہے تو اس سے صحتِ حدیث ثابت نہیں ہوتی۔ ہاں اگر "إِسنَادُهٗ صَحِيحٌ" کہہ کر اس کے بعد کوئی جرح ذکر نہ کرے، تو یہ صحت حدیث پر دلالت ہوگی، کیونکہ اگر کوئی جرح ہوتی تو وہ سکوت نہ کرتا۔

"الفیہ" عراقی میں ہے:

أَلحُكمُ لِلاسنَادِ بِالصِّحَّةِ أَو بِالحَسَنِ دُونَ الحُكمِ لِلمَتنِ رَأَو
وَ أَقبَلَهٗ أَن يُطلِقَهٗ مَن يَعتَمِدُ وَ لَم يُعَقِّبهُ بِضُعفٍ يُنتَقَدُ

یعنی اسناد کے صحیح یا حسن ہونے کا حکم متن کے صحیح یا حسن ہونے کو نہیں چاہتا۔ ہاں (مُعتَمَدعَلَيهِ مُحَدِّث) اسناد پر صحیح یا حسن ہونے کا حکم کرے اور اس کے بعد کوئی ضعف بیان نہ کرے جس سے متن کی تنقید ہو، تو اس صورت میں متن بھی صحیح ہوگا۔

اس عبارت کا مطلب اگرچہ بعض نے اتنا ہی بیان کیا ہے، مگر اصل یہ ہے کہ اس عبارت سے دو باتیں مفہوم ہوتی ہیں۔ ایک یہ کہ متن پر صحت یا حسن کا حکم لگانا یہ حدیث کے صحیح یا حسن ہونے کا کم درجہ ہے، کیونکہ اسناد پر حکم لگانے کی صورت میں یہ احتمال رہتا ہے کہ شاید اس میں شذوذ یا علت وغیرہ ہو۔ (شذوذ کا مطلب ہے کہ ثقہ راوی اپنے سے زیادہ ثقہ کی یا کئی ثقوں کی مخالفت کرے اور علتِ پوشیدہ، عیب کو کہتے ہیں جس پر ہر ایک مطلع نہیں ہوسکتا۔ بلکہ بڑے بڑے محدثین مطلع ہوتے ہیں) گویا اس احتمال کی بناء پر یہ حکم لگانے سے حدیث کی صحت یا حسن اس درجہ کی نہیں سمجھی جاتی، جس درجہ کی متن پر حکم لگانے سے سمجھی جاتی ہے۔ دوسری بات یہ کہ کمتر درجہ معتبر ہے، لیکن اس شرط پر کہ اسناد پر صحت یا حسن کا حکم لگانے کے بعد محدث سکوت کرے اور اس میں شذوذ و علت وغیرہ بیان نہ کرے۔ جو ضعف حدیث کا باعث ہو۔ یہ مطلب "مقدمہ ابن صلاح" کی عبارت سے اچھی طرح واضح ہوجاتا ہے۔ "مقدمہ ابن صلاح" کی نوع ثانیہ:۱۶ میں ہے:

« قَولُهُم هٰذَا حَدِيثٌ صَحِيحُ الاسنَادِ، أَو حَسَنُ الاسنَادِ دُونَ قَولِهِم هٰذَا حَدِيثٌ

صَحِيحٌ، أَو حَدِيثٌ حَسَنٌ، لِأَنَّهُ قَد يُقَالُ: هٰذَا حَدِيثٌ صَحِيحُ الِاسنَادِ ، وَ لَا يَصِحُّ، لِكَونِهِ شَاذًا، أَو مُعَلَّلًا غَيرَ أَنَّ المُصَنِّفَ المُعتَمَدَ مِنهُم، إِذَا اقتَصَرَ عَلٰى قَولِهِ: إِنَّهُ صَحِيحُ الِاسنَادِ، وَ لَم يَذكُر لَهُ عِلَّةً ، وَ لَم يَقدَح فِيهِ. فَالظَّاهِرُ مِنهُ الحُكمُ لَهُ، بِأَنَّهُ صَحِيحٌ فِي نَفسِهِ، لِأَنَّ عَدَمَ العِلَّةِ ، وَالقَدحِ ، هُوَ الأَصلُ ، وَالظَّاهِرُ (وَاللّٰهُ أَعلَمُ).»

یعنی محدثین کا یہ کہنا کہ یہ حدیث ''صَحِيحُ الاِسنَادِ'' یا ''حَسَنُ الاِسنَادِ'' ہے۔ یہ ان کے اس قول سے کم درجہ ہے کہ ''یہ حدیث صحیح ہے'' یا ''یہ حدیث حسن ہے''۔ کیونکہ بعض دفعہ کہا جاتا ہے: کہ یہ حدیث صَحِيحُ الاِسنَادِ ہے اور درحقیقت بوجہِ ''شاذ'' یا ''معلل'' ہونے کے حدیث صحیح نہیں ہوتی۔ ہاں معتمد مصنف ''صَحِيحُ الاِسنَادِ'' کہہ کر کوئی علت اور عیب ذکر نہ کرے، تو ظاہر یہی ہے کہ اس کا یہ حکم حدیث کی صحت کی بابت ہے۔ کیونکہ اصل اور ظاہر یہی ہے کہ کوئی علت اور عیب نہیں۔ ورنہ وہ ذکر کرتا ہے۔

اس عبارت سے اوپر کی دونوں باتیں اچھی طرح واضح ہوگئیں۔ کیونکہ اسناد پر ''صحت'' یا ''حسن'' کے حکم لگانے کی بابت کہا ہے کہ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حدیث صحیح ہے اور جب براہ راست حدیث پر ''صحت'' یا ''حسن'' کا حکم لگایا جائے تو یہ حدیث کے ''صحیح'' یا ''حسن'' ہونے کی تنصیص اور تصریح ہے اور ظاہر کا درجہ تنصیص سے کم ہے۔ کیونکہ ظاہر میں کچھ احتمال رہتا ہے۔ جیسے یہاں احتمال ہے کہ شاید شذوذ وغیرہ کا کوئی احتمال ہو۔ برخلاف تنصیص اور تصریح کے کہ اس میں اس قسم کی گنجائش نہیں۔ اور باوجود درجہ کم ہونے کے ظاہر پر بالاتفاق عمل ہوتا ہے۔ صرف اتنی بات ہے کہ جب ظاہر کا اور تنصیص کا مقابلہ ہو جائے، تو پھر ظاہر پر عمل نہیں رہتا۔ جیسے ''صَحِيحُ الاِسنَادِ'' کہنے سے۔ اگرچہ صحتِ حدیث ظاہر ہوتی ہے، لیکن جب ''صَحِيحُ الاِسنَادِ'' کہنے کے بعد محدّث کسی عیب کی تنصیص اور تصریح کردے، تو پھر اس تنصیص اور تصریح پر عمل ہوگا۔ ظاہر پر عمل نہیں ہوگا۔ یعنی یہ حدیث صحیح نہیں سمجھی جائے گی۔ اگر یہ تنصیص اور تصریح نہ ہو تو پھر ظاہر پر عمل ہوگا۔ یعنی حدیث صحیح سمجھی جائے گی۔ یہ تو ایک عام قاعدہ کا بیان تھا۔ اب اس اسناد کا حال سنیے، جس کو حافظ ابن حجر رحمہ اللہ وغیرہ نے صحیح کہا ہے:

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے ''طبقات المدلسین'' (ص:۲) میں مدلسین کے پانچ مراتب ذکر کیے ہیں۔ (مدلس اس راوی کو کہتے ہیں، جو اپنے ملاقاتی سے ایسے صیغہ کے ساتھ روایت کرے، جس سے سماع کا وہم ہو

مگر سنا نہ ہو۔ جیسے کہے قال فلان بن فلان) ان میں سے تیسرے مرتبہ کی بابت فرماتے ہیں:

« اَالثَّالِثَةُ مَن أَكثَرَ مِنَ التَّدلِيسِ، فَلَم يَحتَجَّ الأَئِمَّةُ مِن أَحَادِيثِهِم إِلَّا بِمَا صَرَّحُوا فِيهِ بِالسَّمَاعِ، وَ مِنهُم مَّن قَبِلَهُم، كَأَبِى الزُّبَيرِ المَكِّيِّ. » (إِنتَهٰى)

یعنی تیسرے مرتبہ کے وہ لوگ ہیں جو تدلیس بہت کرتے ہیں۔ ایسے لوگوں کی احادیث سے ائمہ نے استدلال نہیں پکڑا۔ مگر جن روایتوں میں انھوں نے سماع کی تصریح کی ہے وہ لائق استدلال ہیں اور بعض محدثین نے ان کی احادیث کو مطلق رد کر دیا ہے، خواہ سماع کی تصریح کریں یا نہ۔ جبکہ بعض محدثین نے مطلقاً قبول کر لیا ہے۔

اس کے بعد آگے چل کر اس مرتبہ کے پچاس آدمی بتلائے ہیں۔ جن میں سے ایک قتادہ کو بھی شمار کیا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

« قَتَادَةُ بنُ دِعَامَةَ السُّدُوسِى، البَصرِى، صَاحِبُ أَنَسِ بنِ مَالِكٍ رَضِىَ اللّٰهُ عَنهُ، كَانَ حَافِظَ عَصرِهِ، وَ هُوَ مَشهُورٌ بِالتَّدلِيسِ، وَ صَفَهُ بِهِ النَّسَائِى، وَغَيرُهُ.» [1]

یعنی ''قتادہ بن دعامة سدوسی حضرت انس رضی اللہ عنہ کے شاگرد اپنے زمانہ کے حافظ ہیں، اور وہ تدلیس کے ساتھ مشہور ہیں۔ امام نسائی وغیرہ نے ان کو مدلس کہا ہے۔''

اب یہاں دو صورتیں ہیں: ایک یہ ہے کہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے قتادہ کی تدلیس کا اعتبار نہ کیا ہو اور اس کی حدیث کو مطلقاً قبول کرتے ہوئے ''إِسنَادُهٗ صَحِيحٌ'' کہہ کر سکوت کیا۔ جس سے اوپر کے قاعدہ کے مطابق یہ حدیث ادنیٰ درجہ کی صحیح ہوگئی۔ دوسری صورت یہ ہے کہ قتادہ چونکہ تدلیس کے ساتھ مشہور ہیں۔ اس لیے ''إِسنَادُهٗ صَحِيحٌ'' کے بعد اس بات کے ذکر کی ضرورت نہ سمجھی کہ اس میں قتادہ مدلس ہیں۔ کیونکہ شہرت بمنزلۂ ذکر کے ہے۔ پس اس صورت میں حدیث ضعیف ہوگی۔ میرے خیال میں اس صورت کو ترجیح ہے کیونکہ جب ائمہ حدیث تیسرے مرتبہ والوں کی احادیث کو لائقِ استدلال نہیں سمجھتے، تو حافظ ابن حجر رحمہ اللہ سے ان کی مخالفت بعید ہے اور امام ابوداؤد کا اس کو اپنی کتاب میں لانا اس کی صحت کی دلیل نہیں۔ کیونکہ وہ ایسی ضعیف احادیث بھی لے آتے ہیں، جو تائید کے قابل ہوں اور اگر بالفرض دوسری صورت کو ترجیح نہ ہو تو بھی معاملہ مشکوک رہا۔ کیونکہ احتمال ہے کہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے ''إِسنَادُهٗ صَحِيحٌ'' پر شہرت کی بناء پر سکوت کیا ہو اور احتمال ہے کہ تدلیس کا اعتبار نہ کرتے ہوئے سکوت کیا ہو۔ بہر صورت حافظ ابن حجر کے

---

[1] طبقات المدلسین، ص: ۱۸۰

''إِسنَادُہٗ صَحِیحٌ'' کہنے سے اس حدیث کو صحیح سمجھنا دوہری غلطی ہے اور ابن سید الناس کے کلام کو بھی اسی پر قیاس کرلیں۔ بلکہ ابن سید الناس نے ''وَرِجَالُہٗ ثِقَاتٌ'' کہہ کر ''إِسنَادُہٗ صَحِیحٌ'' کی تفسیر کردی ہے۔ یعنی ''إِسنَادُہٗ صَحِیحٌ'' سے مراد یہ ہے کہ راوی ثقہ ہیں اور قتادہ اگرچہ مدلس ہیں، لیکن ثقہ ہونے میں کوئی شبہ نہیں اور ''فتح البیان'' اور ''عون المعبود'' کی عبارت کا بھی یہی مطلب ہے۔ اور اگر کچھ اور ہے تو ان کی غلطی ہے اور امام شوکانی کے سکوت کی وجہ بھی شہرت ہے۔ یعنی قتادہ کی تدلیس مشہور ہے۔ اس لیے کچھ کلام نہیں کیا۔ جب اس حدیث کی صحت میں شبہ رہا جس کی نسبت ''إِسنَادُہٗ صَحِیحٌ'' صراحۃً کہا گیا ہے۔ تو سجدہ میں رفع یدین کی حدیث کی نسبت کس طرح تسلی ہوسکتی ہے۔ رہی یہ بات کہ شعبہ کی روایت اعمش، ابی اسحاق اور قتادہ سے سماع پر محمول ہے۔ سو اس کی نسبت عرض ہے کہ اعمش اور ابی اسحاق سے تو خواہ سماع پر محمول ہو، مگر شعبہ کی روایت کا سماع پر محمول ہونا مشکوک ہے، جس کی وجہ مندرجہ ذیل ہے۔

''طبقات المدلسین'' کی عبارت جو مولوی عبدالرحمٰن صاحب مرحوم نے ''تحفۃ الأحوذی'' میں نقل کی ہے وہ پوری اس طرح ہے:

« وَقَالَ البَیهَقِیُّ فِی «المَعرِفَة»: رَوَینَا عَن شُعبَةَ قَالَ: کُنتُ أَتَفَقَّدُ فَمَ قَتَادَةَ، فَإِذَا قَالَ: حَدَّثَنَا، وَ سَمِعتُ، حَفِظتُهُ. وَ إِذَا قَالَ: حَدَّثَ فُلَانٌ، تَرَکتُهُ. قَالَ: وَ رَوَینَا عَن شُعبَةَ أَنَّهُ قَالَ: کَفَیتُکُم تَدلِیسَ ثَلَاثَةٍ: اَلأَعمَشِ، وَ أَبِی إِسحَاق، وَ قَتَادَةَ(قُلتُ) فَهٰذِهٖ قَاعِدَةٌ جَیِّدَةٌ ......الخ » [1]

یعنی بیہقی نے معرفہ میں کہا ہے کہ ہم نے شعبہ سے روایت کی۔ فرماتے تھے: کہ جب قتادہ حدیث سناتے، تو میں ان کے منہ کی طرف خیال رکھتا۔ جب حَدَّثَنَا اور ''سَمِعتُ'' کہتے تو میں یاد کرلیتا اور جب ''حَدَّثَ'' کہتے، تو میں چھوڑ دیتا۔ نیز بیہقی نے کہا کہ ہم نے شعبہ سے روایت کیا، فرماتے تھے: میں نے تین کی تدلیس سے تمہاری کفایت کی۔ اعمش، ابواسحاق اور قتادہ۔ میں (حافظ ابن حجر رحمہ اللہ) کہتا ہوں: یہ عمدہ قاعدہ ہے۔ ان تینوں سے جب کوئی روایت شعبہ کے واسطہ سے آئے، تو وہ سماع پر دلالت کرے گی۔ خواہ ''عَن'' ہی کے ساتھ روایت ہو۔

اس عبارت کے پہلے حصہ میں ہے کہ شعبہ نے قتادہ سے وہی روایتیں لیں ہیں، جن میں سماع کی تصریح ہے۔ باقی چھوڑ دی ہیں۔ تو اب ''عَن'' والی روایت شعبہ سے آہی نہیں سکتی، تو اس کے سماع پر محمول ہونے

[1] طبقات المدلسین، ص:۲۱

کے کیا معنی؟ اور اس صورت میں قتادہ کی تدلیس کی کفایت کرنے سے شعبہ کا یہ مطلب ہو گا، کہ جب قتادہ کا کوئی دوسرا شاگرد ایسے صیغہ کے ساتھ روایت کرے جس میں سماع کی تصریح نہ ہو تو وہ روایت میرے پاس لاؤ۔ میں اس کی تمیز کر دوں گا، کہ وہ سماع والی ہے یا نہیں۔ کیوں کہ میں اس کی بڑی جستجو رکھتا تھا۔

پس یہ عبارت اس بات کی دلیل ہوئی کہ یہ ''عن'' والی روایت شعبہ کی نہیں۔ بلکہ کسی راوی کی غلطی سے شعبہ کی طرف نسبت ہو گئی ہے اور اس کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے، کہ مالک بن حویرث راوی حدیث کا اپنا عمل اس حدیث پر نہیں، کیوں کہ وہ صرف رکوع کو جاتے، اور رکوع سے اٹھتے وقت رفع یدین کرتے تھے۔ جیسے مسلم باب استحباب رفع الیدین...... الخ میں اور بخاری باب رفع الیدین ......الخ میں ہے۔ ہاں اگر تدلیس کی کفایت کرنے سے شعبہ کا مطلب یہ لیا جائے، کہ جن روایتوں میں قتادہ نے سماع کی تصریح نہیں کی ان کی بابت بعد کو شعبہ نے قتادہ سے تحقیقات کر کے ''سماع'' والی اور ''غیر سماع'' والی کے درمیان تمیز کر لی اور روایت کرنے کے وقت اسی لفظ سے روایت کیں، جس لفظ کے ساتھ سنی تھیں۔ جو ''سماع'' کے لفظ کے ساتھ سنیں۔ وہ ''سماع'' کے لفظ کے ساتھ روایت کیں اور جو ''عن'' وغیرہ کے ساتھ سنیں وہ ''عن'' وغیرہ کے ساتھ روایت کیں تو اس وقت بے شک حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کا قاعدہ کہ شعبہ کی روایت ان تینوں سے سماع پر محمول ہے درست ہو گا اور اس قاعدہ کی بناء پر رفع یدین کی حدیث صحیح ہو گی۔ لیکن شعبہ کے مطلوب میں چونکہ شبہ پڑ گیا ہے، اس لیے تسلی پوری طرح نہیں۔ کیوں کہ « اِذَا جَاءَ الِاحتِمَالُ بَطَلَ الِاستِدلَالُ »

اس کے علاوہ مالک بن حویرث کا صرف دو جگہ رفع یدین بتلا رہا ہے، کہ سجدہ کی رفع یدین کوئی مستقل رفع یدین نہیں، بلکہ یہ وہی ہے جو سجدہ کو جاتے اور سجدہ سے سر اٹھاتے وقت ہاتھ رکھے اور اٹھائے جاتے ہیں۔ کیونکہ احادیث کے مطابق دونوں ہتھیلیاں سجدہ میں کبھی کندھوں کے برابر، کبھی منہ کے دونوں طرف رکھی جاتی ہیں اور سجدہ سے سر اٹھاتے وقت ساتھ اٹھائی جاتی ہیں۔ اس کی شکل وصورت بظاہر رکوع کو جاتے اور رکوع سے سر اٹھاتے وقت رفع الیدین کی سی بن جاتی ہے۔ اس لیے راوی نے کبھی صورت وشکل کا لحاظ کرتے ہوئے رکوع کے رفع یدین کے ساتھ اس کا بھی ذکر کر دیا اور کبھی یہ خیال کرتے ہوئے کہ یہ رکوع کا مستقل رفع یدین ہے۔ یہ کوئی الگ رفع یدین نہیں، اس کا ذکر چھوڑ دیا اور عبد اللہ بن عمر اور حضرت علی رضی اللہ عنہم وغیرہ کی احادیث میں جو وارد ہے، کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سجدہ میں رفع یدین نہیں کرتے تھے، اس سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ یعنی انھوں نے بھی اس کے مستقل نہ ہونے کی وجہ سے نفی کر دی ہے۔ آپ نے ان احادیث کو معارض بتایا ہے حالانکہ یہ مؤید ہیں۔ پھر آپ کا یہ کہنا بھی غلط ہے کہ عدمِ رؤیت اثباتِ رؤیت

کے منافی نہیں، کیونکہ یہاں عدمِ رؤیت اور اثباتِ رؤیت کا مقابلہ نہیں، بلکہ رؤیتِ عدم اور رؤیتِ اثبات کا مقابلہ ہے۔ یعنی جن روایتوں میں ذکر ہے کہ رسول اللہ ﷺ سجدہ میں رفع یدین نہیں کرتے تھے۔ ان میں سے کئی روایتوں میں رؤیت کی تصریح ہے۔ ملاحظہ ہو! مسلم: باب مذکورہ اور بخاری باب إلی أین یرفع یَدَیهِ فتأمل فیه![1]

اور سندھی کا اس طرح سے تطبیق کرنا کہ آنحضرت ﷺ سجدہ کی رفع یدین کبھی کرتے، کبھی نہ کرتے۔ یہ اس وقت مناسب ہے، جب سجدہ کی رفع یدین مستقل طور پر ثابت ہو جائے، مگر جب ثبوت ہی مشکوک ہے تو اس کی ضرورت ہی کیا ؟ اس کے علاوہ ہم کہتے ہیں کہ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما وغیرہ کی حدیث میں رکوع میں رفع یدین کا اثبات ہے، اور سجدہ میں نفی ہے۔ اگر اس کا یہ مطلب لیں کہ رسول اللہ ﷺ سجدہ میں کبھی چھوڑ دیتے تھے اور راوی نے جیسا دیکھا اسے بیان کردیا۔ تو اس پر سوال ہوگا، کہ رسول اللہ ﷺ نے سجدہ میں کیوں چھوڑا؟ کیا جواز بتلانے کی غرض سے چھوڑا، یا بھول کر چھوڑا یا منسوخ ہونے کی وجہ سے چھوڑا؟ بلاوجہ بھول کی نسبت آپ ﷺ کی طرف غیر مناسب ہے۔ نیز بھول میں آپ ﷺ کی اقتداء نہیں ہوتی ۔ تو گویا مطلب یہ ہوا کہ سجدہ میں ہمیشہ ''رفع الیدین'' کرنا چاہیے۔ حالانکہ سندھی کی یہ مراد نہیں۔ اس طرح نسخ کی صورت کو سمجھ لینا چاہیے کیونکہ نسخ کی صورت میں لازم آئے گا کہ سجدہ میں بالکل نہ کرنا چاہیے۔ حالانکہ سندھی کی یہ بھی مراد نہیں۔ اب رہی پہلی صورت یعنی جواز بتلانے کی غرض سے چھوڑا۔ سو اس کی بابت عرض ہے کہ سجدہ میں جواز بتلانے کی غرض سے چھوڑا ہے تو رکوع میں نہ چھوڑنے کا مطلب عدمِ جواز ہوگا۔ یعنی رکوع میں چھوڑنا جائز نہیں ہوگا۔ حالانکہ سندھی کی یہ مراد بھی بعید ہے۔ کیونکہ نسائی کتاب ''الافتتاح'' کی پہلی حدیث پر سندھی نے رکوع میں بھی ترکِ جواز تسلیم کیا ہے۔

پھر یہاں پر ایک اور دوہرا اعتراض پڑتا ہے۔ وہ یہ کہ اثبات اور نفی دونوں قسم کی احادیث میں استمرار کا

[1] اس سے ایک شبہ اور اس کے جواب کی طرف اشارہ ہے۔ شبہ یہ ہے کہ یہاں عدمِ رؤیت اور اثباتِ رؤیت کہنا صحیح ہے۔ کیونکہ جو فعل ایک نے دیکھا۔ دوسرے نے نہیں دیکھا۔ مثلاً مالک بن حویرث رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ کو سجدہ میں رفع یدین کرتے دیکھا اور عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے نہیں دیکھا۔ اس طرح سے ایک طرف عدمِ رؤیت ہوگئی اور دوسری طرف اثباتِ رؤیت ہوگئی۔ جواب اس کا یہ کہنا اس وقت صحیح ہوسکتا ہے، جب ایک صحابی کہتا ہے، کہ میں نے رفع یدین کرتے دیکھا، دوسرا کہتا کہ میں نے نہیں دیکھا، یا اس کے ذکر سے سکوت کرتا۔ احادیث میں اس طرح نہیں، بلکہ ایک میں ہے کہ کرتے دیکھا۔ دوسری میں ہے نہ کرتے دیکھا۔ (بس مقابلہ رؤیتِ اثبات اور رؤیتِ عدم میں ہوا، نہ کہ عدمِ رؤیت اور اثباتِ رؤیت میں۔)

صیغہ ہے، جو ہمیشگی کو چاہتا ہے۔ تو اب اس طرح سے موافقت نہیں ہوسکتی کہ کبھی کرتے۔ کبھی نہ کرتے، بلکہ اس کی صورت یہی ہے کہ سجدہ میں رفع یدین سے مراد مستقل رفع یدین نہیں، بلکہ رفع یدین والی وہی شکل و صورت ہے۔ فتأمل فيه! [1]

رہی وائل بن حجر رضی اللہ عنہ کی حدیث جس کو آپ نے اصل قرار دیا ہے۔ اس میں عبدالوارث بن سعید بے شک ہمام سے زیادہ ثقہ ہے۔ لیکن ہمام کو خارج سے تقویت بہت ہے۔ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما وغیرہ کی متفق علیہ احادیث جن میں سجدہ میں رفع یدین کی نفی ہے۔ اس کے شواہد ہیں۔ پھر ''شرح نخبہ'' میں صحت کے چند درجے مقرر کیے ہیں: اول نمبر: بخاری، مسلم کی روایات۔ پھر صرف بخاری کی۔ پھر صرف مسلم کی۔ پھر جو ''بخاری'' ''مسلم کی شرط پر ہوں۔ پھر جو صرف بخاری کی شرط پر ہوں۔ پھر جو مسلم کی شرط پر ہوں اور اس روایت کو مسلم نے بھی روایت کیا ہے، لیکن اس میں سجدہ میں رفع یدین نہیں۔

پس اس جہت سے بھی اس روایت کو تقویت ہوگئی۔ پھر عبدالجبار بن وائل کے استاد میں اختلاف ہے۔ عبیداللہ بن عمر بن میسرہ جو اعلیٰ درجہ کے ثقہ ہیں، جن کی بابت تقریب میں ''ثقہ ثبت'' لکھا ہے۔ یہ عبدالوارث سے وائل بن علقمہ نقل کرتے ہیں اور ابو خیثمہ زہیر بن حرب بھی اس اعلیٰ درجہ کے ثقہ ہیں۔ وہ بھی عبدالوارث سے بواسطہ عبدالصمد بن عبدالوارث، وائل بن علقمہ ہی نقل کرتے ہیں اور ابراہیم بن الحجاج سامی جس کو تقریب میں ''ثقه يَهِمُ قليلاً'' کہا ہے۔ یعنی ثقہ ہے، کچھ وہم کرتا ہے۔ اور عمران بن موسیٰ، ابو عمرو البصری جس کو تقریب میں ''صدوق'' کہا ہے۔ یہ دونوں عبدالوارث سے علقمہ بن وائل نقل کرتے ہیں اور صحیح یہی ہے۔ چنانچہ ''تہذیب'' میں اور ''تقریب'' میں حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے اس کی تصریح کی ہے۔ اب دیکھیے عبیداللہ اور ابو خیثمہ اعلیٰ درجہ کے ثقہ ہیں۔ دونوں کی بابت ''تقریب'' میں ''ثقہ ثبت'' لکھا ہے اور ابراہیم اور عمران یہ ان کی نسبت بہت ہلکے درجہ کے ہیں، کیونکہ دوسرے کو تو صرف سچا کہا ہے، اس کے حافظہ وغیرہ کی تعریف نہیں کی اور پہلے کے لیے جامع لفظ بولا ہے، جو حافظہ وغیرہ کو بھی شامل ہے، لیکن ساتھ یہ بھی

[1] اس سے اس طرف اشارہ ہے کہ یہاں دونوں طرف اگرچہ ہمیشگی اور استمرار کے صیغہ ہیں، لیکن موافقت کے لیے تاویل کا کوئی حرج نہیں۔ وہ یوں کہ جب چند دن ایک شخص نے ایک حالت دیکھی، تو یہ خیال کرکے کہ باقی دنوں میں بھی اسی طرح کرتے ہوں گے۔ استمرار کا صیغہ استعمال کردیا کیونکہ اصل یہ ہے کہ حکم قائم رہے اور اس کا بدلنا ایک موہوم شے ہے۔ پس یہ تیسرا اعتراض ٹھیک نہیں۔ ہاں پہلے دو اعتراض ٹھیک ہیں۔ ایک یہ کہ جب مستقل رفع یدین کا ثبوت ہی مشکوک ہے تو پھر اس موافقت کی ضرورت کیا؟ دوسرا یہ کہ اس سے لازم آتا ہے کہ رکوع کے رفع یدین کا ترک ناجائز ہو۔ فافهم!)

کہہ دیا ہے، کہ وہ کچھ وہم کرتا ہے۔ مگر باوجود اس کے عبد الجبار بن وائل کے استاد کی نسبت انہی کا قول درست ہے۔ یہ کیوں؟ اس لیے کہ ان کے قول کو خارج سے تقویت پہنچ گئی ہے۔ وہ یوں کہ عفان بن مسلم بصری نے ہمام بن یحییٰ بصری سے علقمہ بن وائل نقل کیا ہے۔ اس طرح کے بعض اور خارجی قرائن بھی ہیں، جو عبد الجبار کا استاد علقمہ بن وائل ہونے کے متقاضی ہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ یہ کوئی ضروری نہیں کہ زیادہ ثقہ کی بات کو ہمیشہ ترجیح ہوا کرے۔ بلکہ بعض خارجی شواہد ادنیٰ کو اعلیٰ کر دیتے ہیں، اور اسی کی بات درست ہوتی ہے۔ پس اس بناء پر ہمام کی روایت کو ترجیح ہونی چاہیے اور یہی وجہ ہے کہ امام مسلم، ہمام کی روایات اپنی کتاب میں لائے ہیں اور عبد الوارث کی نہیں لائے۔ ملاحظہ ہو! باب وضع یدہ الیمنیٰ الخ، پس جس روایت کو آپ نے اصل خیال کیا تھا، وہ محل استدلال میں فرع بھی نہ رہی۔ اس کے علاوہ مالک بن الحویرث کی حدیث میں سجدہ میں رفع یدین سے مراد مستقل رفع یدین مراد نہ ہو، تو اس میں بھی وہی مراد لینا چاہیے۔ تاکہ سب احادیث میں موافقت ہو جائے، اور کسی قسم کا اختلاف نہ رہے۔ (عبد اللہ امرتسری مقیم روپڑ ضلع انبالہ، ۳۰ صفر ۱۳۵۳ھ، ۲۴ مئی ۱۹۳۵ء، ماخوذ از فتاویٰ اہلحدیث (۲/ ۱۲۶ تا ۱۳۴)

اور علامہ البانی محدث العصر رحمہ اللہ نے زیرِ بحث مسئلہ پر کتاب "صفة الصلوٰة" کے علاوہ اپنی شہرۂ آفاق تصنیف "إرواء الغليل" (۲/ ۶۷-۶۸) پر بھی اجمالاً بحث کی ہے۔ اس سلسلہ میں وارد بعض احادیث و آثار و اقوال پر صحت کا حکم لگایا ہے، جن پر اکثر و بیشتر مناقشہ حضرت الاستاذ محدث روپڑی کے سلسلۂ کلام میں گزر چکا ہے۔ اعادہ کی چنداں ضرورت نہیں۔

پھر علامہ موصوف کا اس بارے میں نظریہ یہ ہے، کہ سجود میں رفع الیدین بالاِستمرار نہیں بلکہ وقتاً فوقتاً ہے۔ عملاً بندہ نے اپنی مدنی زندگی میں بارہا موصوف کو نماز پڑھتے دیکھا، بلکہ صف بندی میں آپ کے ساتھ کھڑا ہونے کا موقع میسر آیا۔

موصوف کو سجود میں رفع یدین پر عامل نہیں پایا۔ اس سے بھی اس موقف کو تائید حاصل ہوتی ہے، کہ اصلاً سجود میں رفع یدین کا مسلک کمزور ہے اور عدمِ رفع کا مسلک پختہ ہے اور یہی راجح ہے۔

دونوں سجدوں کے درمیان رَبِّ اغفِرلِی کہنے کی تعداد:

سوال: مولانا صادق سیالکوٹی لکھتے ہیں کہ 'رَبِّ اغفِرلِی' دونوں سجدوں کے درمیان کہنا 'ابن ماجہ' اور 'غنية الطالبين' میں تین مرتبہ آیا ہے۔ عبد الرؤف سندھو تخریج میں لکھتے ہیں، کہ دو مرتبہ اور ایک مرتبہ تو اکثر آیا ہے، لیکن تین بار نہیں۔ جب کہ صحیح بخاری و مسلم میں ہے کہ حضور ﷺ کا رکوع، سجود و قیام بعد

الرکوع اور دونوں سجدوں کے درمیان بیٹھنا تقریباً برابر ہوتا تھا۔صحیح تعداد تسبیح مذکورہ نبی کریم ﷺ وصحابہ رضی اللہ عنہم سے کیا ثابت ہے؟ جمہور تین مرتبہ کے قائل کیوں ہیں؟

(جواب) : مختلف روایات میں تطبیق اور توفیق کی صورت یوں ہے، کہ ان کو مختلف حالات پر محمول کیا جائے۔ بعض دفعہ آپ ﷺ اس کلمہ کو دو یا تین دفعہ پڑھتے اور بسا اوقات تکرار سے مسلسل پڑھتے رہتے۔ جس طرح کہ حضرت براء رضی اللہ عنہ کی روایت سے مفہوم ہے۔ دراصل اس کا دارومدار نماز کی طوالت اور تخفیف پر ہے۔ عام حالات میں تسبیحات کا اندازہ تین سے دس تک ہے۔ جس طرح کہ بالترتیب ابن مسعود، اور انس رضی اللہ عنہما کی روایات میں مصرح (واضح) ہے۔ لیکن امام شوکانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

« لَا دَلِیلَ عَلٰی تَقیِیدِ الکَمَالِ بِعَدَدٍ مَعلُومٍ، بَل یَنبَغِی الِاستِکثَارُ مِنَ التَّسبِیحِ عَلٰی مِقدَارِ تَطوِیلِ الصَّلٰوۃِ مِن غَیرِ تَقیِیدٍ بِعَدَدٍ » [1]

اور جو لوگ تین دفعہ کے قائل ہیں۔ وہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی حدیث کے ظاہر کی بناء پر ہیں۔

دو سجدوں کے درمیان دعا کتنی مرتبہ؟

(سوال) : قیام اور رکوع وسجود کی تسبیح کے لگ بھگ جلسہ بین السجدتین میں دعا پڑھنی چاہیے۔ کیا دو دفعہ «رَبِّ اغفِرلِی» کہنے سے ایک مرتبہ «سُبحَانَ رَبِّیَ الاَعلٰی» کے بقدر الفاظ نہیں ہو جاتے؟ یعنی اگر چھ مرتبہ «رَبِّ اغفِرلِی» کہا جائے تو اس کے الفاظ «سُبحَانَ رَبِّیَ الاَعلٰی» تین مرتبہ کہنے کے برابر نہیں ہوجاتے؟

(جواب) : رکوع، سجود اور سجدوں کے درمیان الفاظ اذکار کا برابر ہونا ضروری نہیں۔ صرف ماثور کا اہتمام ہونا چاہیے۔ چاہے الفاظ کی کمی وبیشی ہو۔

دو سجدوں کے درمیان اَللّٰھُمَّ اغفِرلِی وَارحَمنِی ......الخ۔ دعا والی حدیث کا حکم:

(سوال) : ایک عالم صاحب کراچی میں پروپیگنڈہ کر رہے ہیں کہ دو سجدوں کے درمیان اَللّٰھُمَّ اغفِرلِی وَارحَمنِی ......الخ۔ دعا والی حدیث ضعیف ہے اس کو ترک کر دینا چاہیے۔ اصل حقیقت کیا ہے؟ براہ کرم تفصیل سے وضاحت فرمادیں۔

(جواب) : یہ روایت ترمذی، ابوداؤد اور ابن ماجہ وغیرہ میں ہے۔ اس کی سند میں ایک راوی حبیب بن ابی ثابت ہے جو مدلس ہے۔ جملہ کتب میں کسی محدث نے اس کی تحدیث یا سماع کی صراحت نہیں کی۔ اس لیے

---

[1] المرعاۃ: ۱/۶۴۱

حدیث ضعیف ہے۔نسائی، ابوداؤد اور ابن ماجہ وغیرہ میں « اَللّٰھُمَّ اغْفِرْلِیْ » کے الفاظ ہیں۔ابن ماجہ میں دو دفعہ کی تصریح ہے۔ یہ روایت صحیح ہے لہٰذا بَینَ السَّجدَتَینِ ان الفاظ کو پڑھنا چاہیے۔تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو! کتاب القول المقبول (ص ٤٤١)

یہ بھی یادرہے، کہ مسلک حقہ سے لگاؤ محض جذباتی انداز سے نہیں ہونا چاہیے، بلکہ اس کی اساس کتاب وسنت پر ہونی چاہیے۔ جو اصحاب الحدیث کا امتیازی نشان ہے۔ واللہ ولی التوفیق.

سوال : الاعتصام جلد ۵۳ کا شمارہ نمبر ۴۰ زیر نظر ہے۔اس شمارے کے صفحہ نمبر ۷ پر "بین السجدین" کی معروف دعا «اَللّٰھُمَّ اغفِرلِی وَارحَمنِی وَاھدِنِی وَ عَافِنِی وَارزُقنِی» کے بارے آپ نے تحریر فرمایا۔جس کا خلاصہ یہ ہے کہ: ''روایت ہذا حبیب بن ابی ثابت کی تدلیس کی وجہ سے ضعیف ہے۔'' (الاعتصام ۵۳/۴۰ مجریہ ۱۹/ اکتوبر ۲۰۰۱ء)

لیکن مذکورہ دعا صحیح مسلم سے ثابت ہے۔

« عَن اَبِی مَالِكٍ الاَشجَعِیِّ عَن اَبِیهِ قَالَ: کَانَ الرَّجُلُ اِذَا اَسلَمَ عَلَّمَهُ النَّبِیُّ ﷺ الصَّلٰوةَ ثُمَّ اَمَرَهُ اَن یَدعُوا بِھٰؤُلَاءِ الکَلِمَاتِ :اَللّٰھُمَّ اغفِرلِی وَارحَمنِی وَاھدِنِی وَ عَافِنِی وَارزُقنِی » [1]

جواب : بلاشبہ یہ دعا ''صحیح مسلم (۲/۳۴۵) میں ثابت ہے۔لیکن عمومی دعا کے طور پر۔جس حدیث کا ضعف بیان ہوا ہے، وہ دوسجدوں کے درمیان ہے۔

دوسجدوں کے درمیان والی حدیث:

سوال : تخریج ''صلوٰۃ الرسول'' میں عبد الرؤف سندھو صاحب نے دوسجدوں کے درمیان والی حدیث «اَللّٰھُمَّ اغفِرلِی وَارحَمنِی ...... الخ» کو ضعیف بتایا ہے کیونکہ اس کا راوی حبیب بن ابی ثابت مدلس ہے۔(ص:۲۴۰) پر امام حاکم، ذہبی، نووی، مبارکپوری، عبد القادر اور البانی کی تصحیح نقل کرنے کے بعد۔آیا ان کی تحقیق درست ہے؟

جواب : تحقیق درست ہے۔

کیا دوسجدوں کے درمیان جلسے والی دعا ضعیف ہے؟

سوال : میں نے الاعتصام (۵۳/۳۰) میں آپ کے جوابات کا مطالعہ کیا، دوسجدوں کے درمیان جلسے کی

---

[1] صحیح مسلم کتاب الذکر والدعا، بَابُ فَضلِ التَّھلِیلِ وَالتَّسبِیحِ وَالدُّعَاءِ، رقم:۲۶۹۷

دعا کے بارے میں پڑھا کہ وہ حدیث ضعیف ہے۔ میں آپ سے یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ سنن ابی داؤد (رقم الحدیث ۸۵۰) میں حدیث کے الفاظ یوں ہیں:

« اَللّٰهُمَّ اغفِرلِي وَارحَمنِي وَ عَافِنِي وَاهدِنِي وَارزُقنِي.»

اور یہ حدیث جیسے کہ آپ نے بتایا کہ حبیب بن ابی ثابت کے مدلس ہونے کی وجہ سے ضعیف ہے اور اس کی سند میں کامل بن العلاء ابو العلاء راوی بھی صدوق یخطئی ہے۔ لیکن الکلم الطیب میں البانی رحمہ اللہ نے جس حدیث کو صحیح قرار دیا ہے اس کی الفاظ یوں ہیں:

« اَللّٰهُمَّ اغفِرلِي وَارحَمنِي وَاهدِنِي وَاجبُرنِي وَعَافَنِي وَارزُقنِي. » (الرقم :۹۷)

صاحب القول المقبول کہتے ہیں کہ یہ حدیث حسن بھی نہیں ہے اور نہ جید ہے اب میں آپ سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ:

۱۔ یہ دونوں حدیثیں ایک ہی سند سے ہیں یا مؤخر الذکر دوسری سند سے ہے؟

۲۔ اگر دوسری سند سے مروی ہے تو اس کا حکم کیا ہے؟

۳۔ کیا یہ دونوں حدیثیں ایک ہی ہیں اور الفاظ کی تبدیلی راویوں کی طرف سے ہے؟

۴۔ اگر حدیث ضعیف ہے تو حاکم، ذہبی، نووی، عبدالقادر الارناؤوط اور البانی رحمہم اللہ نے اسے صحیح اور مبارکپوری رحمہ اللہ نے حسن کیوں کہا ہے؟

(جواب): الاعتصام کے ایک شمارہ میں ''جلسہ بین السجدتین'' میں پڑھی جانے والی معروف روایت کو میں نے ضعیف قرار دیا۔ جن پر آپ کے استفسارات کی تفصیل اور جوابات درج ذیل ہیں۔

آپ نے سنن ابی داؤد سے الفاظِ حدیث نقل کرنے کے بعد الکلم الطیب سے حدیث کے الفاظ نقل کیے جو قدرے مختلف ہیں۔

اول الذکر تین سوالوں کا جواب یہ ہے کہ مختلف کتب میں وارد یہ حدیث ایک ہی طریق سے مروی ہے۔ تفصیلی تخریج کے لیے القول المقبول (۴۴۰۔۴۴۱) کی طرف رجوع فرمائیں! یاد رہے کہ ''الکلم الطیب'' حدیث کی مستقل کتاب نہیں، کہ اس میں مندرجہ روایات اپنی سند سے مروی ہوں، بلکہ حدیث کی دوسری مستقل کتب سے روایات نقل کی گئی ہیں۔ اس حدیث میں الفاظ کا قدرے اختلاف راویوں کی طرف سے ہی معلوم ہوتا ہے، کیونکہ حدیث کا ''مخرج'' ایک ہی ہے۔

آخری سوال کا جواب یہ ہے، کہ ائمہ مذکورین نے حبیب بن ابی ثابت کی تدلیس کی طرف توجہ نہیں کی،

حبیب بن ابی ثابت چونکہ ''صحیحین'' کا راوی ہے۔ بظاہر اسی لیے اس کی تدلیس کی طرف التفات نہ ہو سکا۔
حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے ''تقریب'' میں اس کی توثیق ذکر کرتے ہوئے فرمایا ہے:
« وَ كَانَ كَثِيرَ الِارسَالِ، وَالتَّدلِيسِ.»
ابن عجمی نے بھی اسے "التبيين لاسماء المدلسين" میں ذکر کیا ہے۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے "تعريف اهل التقديس بمراتب الموصوفين بالتدليس" میں اسے طبقہ ثالثہ میں ذکر کیا ہے، اور اس طبقہ کے مدلّسین کے متعلق محققین کی راجح رائے یہ ہے، کہ جب یہ تحدیث کی صراحت کریں (یعنی حَدَّثَنَا کہیں) تو قابلِ حجت ہیں۔ وگرنہ نہیں۔ زیر بحث روایت کے جمیع طرق میں حبیب بن ابی ثابت عنعنہ (عَن عَن کے الفاظ) سے روایت کرتے ہیں۔ لہٰذا بموجب اصول محدثین یہ روایت ضعیف ہے۔ اگرچہ بعض اہلِ علم نے اسے صحیح بھی قرار دیا ہے۔ هذا ما عندي والله اعلم.

دو سجدوں کے درمیان انگلی سے اشارہ کرنا:

سوال: اس وقت میرے سامنے ''الاعتصام'' کا شمارہ نمبر ۲۱، جلد: ۵۵، کا صفحہ ۱۳ ہے۔ اس میں دو سجدوں کے درمیان'' انگلی سے اشارہ کے متعلق آپ نے فرمایا کہ اشارہ نہیں کرنا چاہیے۔
شیخ عبدالعزیز نورستانی صاحب نے لکھا ہے کہ: ''حضرت وائل رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:
« ثُمَّ جَلَسَ...... ثُمَّ اَشَارَ بِسَبَابَتِهٖ، وَ وَضَعَ الِابهَامَ عَلَى الوُسطٰى وَ قَبَضَ سَائِرَ اَصَابِعِهٖ...... » (مسند احمد:۳۱۷، و اسناده صحيح، صَلُّوا ص:۳۹) [1]
نیز الشیخ حافظ عبدالمنان صاحب نور پوری کی کتاب ''احکام و مسائل'' (جلد اوّل، ص:۱۹۳، ۱۹۴، ۱۹۵) میں حسب ذیل احادیث ہیں جن سے «بين السجدتين اشاره بسبابة» کا ثبوت پیش کیا گیا ہے۔
۱۔ عَنِ ابنِ عُمَرَ رضی اللہ عنہ اَنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ اِذَا جَلَسَ فِي الصَّلٰوةِ ...... بَاسِطَهَا عَلَيهَا » [2]
۲۔ عَن عَلِيِّ بنِ عَبدِ الرَّحمٰنِ المُعَاوِيِّ اَنَّهٗ قَالَ: رَآنِي عَبدُ اللّٰهِ بنُ عُمَرَ، وَ اَنَا اَعبَثُ بِالحَصٰى فِي الصَّلٰوةِ . فَلَمَّا انصَرَفَ. نَهَانِي. قَالَ: اِصنَع، كَمَا كَانَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ يَصنَعُ. قُلتُ: وَ كَيفَ كَانَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ يَصنَعُ؟ قَالَ: كَانَ اِذَا جَلَسَ فِي الصَّلٰوةِ وَضَعَ كَفَّهُ اليُمنٰى عَلٰى فَخِذِهِ اليُمنٰى ، وَ قَبَضَ أَصَابِعَهٗ كُلَّهٗ. وَ أَشَارَ بِاِصبَعِهِ الَّتِي

[1] مسند احمد بن حنبل ،رقم:۱۸۸۵۸

[2] صحيح مسلم،بَابُ صِفَةِ الجُلُوسِ فِي الصَّلَاةِ، وَكَيفِيَّةِ ......الخ ،رقم: ۵۸۰

تَلِی الاِبهَامَ وَ وَضَعَ كَفَّهُ الیُسرٰی عَلٰی فَخِذِهِ الیُسرٰی »[1]

(الفاظ « اِذَا جَلَسَ فِی الصَّلٰوةِ، سے استدلال ہے۔)

۳۔ وَضَعَ الاِبهَامَ عَلَی الوُسطٰی، وَ قَبَضَ سَائِرَ أَصَابِعِهٖ، ثُمَّ سَجَدَ [2]

۴۔ عَن عَبدِ اللّٰهِ ابنِ زُبَیرٍ قَالَ: كَانَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا قَعَدَ يَدْعُو، وَضَعَ يَدَهُ الْيُمْنَى عَلَى فَخِذِهِ الْيُمْنَى، وَيَدَهُ الْيُسْرَى عَلَى فَخِذِهِ الْيُسْرَى، وَأَشَارَ بِإِصْبَعِهِ السَّبَّابَةِ، وَوَضَعَ إِبْهَامَهُ عَلَى إِصْبَعِهِ الْوُسْطَى، وَيُلْقِمُ كَفَّهُ الْيُسْرَى رُكْبَتَهُ» [3]

نیز علامہ نور پوری حفظہ اللہ نے اس مسئلہ میں جناب البانی رحمہ اللہ کے موقف (کہ اشارہ درست نہیں ہے) کے مقابلہ میں عبدالعزیز نورستانی صاحب کے موقف (کہ ''مسند احمد'' کی مرفوع حدیث عن وائل، ص:۳۱۷، کی رو سے یہ عمل درست وثابت ہے) کو درست قرار دیا ہے۔(احکام ومسائل:۱/۱۹۵)

سوال یہ ہے کہ آپ اپنی تحقیق سے آگاہ فرما کر ممنوع فرمائیں کہ صحیح موقف کونسا ہے؟

(جواب) : جو لوگ دو سجدوں کے درمیانے جلسے میں تحریک سبابہ (انگلی ہلانے) کے قائل ہیں۔ان کا استدلال دو طرح سے ہے:

۱۔ اُن عمومی احادیث سے، جن میں نماز میں بیٹھنے کی حالت میں سبابہ (شہادت والی انگلی) کو حرکت دینے کا ذکر ہے۔جس طرح حضرت وائل، حضرت ابن عمر، حضرت ابو ہریرہ اور حضرت عبد اللہ بن زبیر رضی اللہ عنہم سے مروی احادیث میں ہے۔ جب کہ دیگر روایات میں تشہد میں بیٹھنے کی قید موجود ہے۔ اس لیے مطلق کو مقید پر محمول کیا جائے گا۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے ابن رُشید رحمہ اللہ سے نقل کیا ہے، کہ:

« إِذَا أُطلِقَ فِي الَاحَادِيثِ الجُلُوسُ فِي الصَّلَاةِ مِن غَيرِ تَقيِيدٍ، فَالمُرَادُ بِهٖ جُلُوسُ التَّشَهُّدِ » [4]

''جب احادیث میں بحالتِ نماز مطلق بیٹھنے کا ذکر ہو،تو اس سے مراد تشہد میں بیٹھنا ہوتا ہے۔''

جس طرح ''سنن نسائی'' میں ان الفاظ میں باب قائم کیا گیا ہے:«مَوضِعُ اليَدَينِ عِندَ الجُلُوسِ

---

[1] صحیح مسلم،بَابُ صِفَةِ الْجُلُوسِ فِی الصَّلَاةِ، وَكَيْفِيَّةِ ......الخ،رقم: ۵۸۰

[2] رواه احمد عن وائل: ۳۱۷، و بلوغ الامانی جز: ۳، ص: ۱۴۹، و روی نحوه ابوداؤد

[3] صحیح مسلم،بَابُ صِفَةِ الْجُلُوسِ فِی الصَّلَاةِ، وَكَيْفِيَّةِ وَضْعِ الْيَدَيْنِ عَلَى الْفَخِذَيْنِ،رقم: ۵۷۹

[4] فتح الباری: ۲/ ۳۱۰، باب من لم یر التشهد الاول واجبا

لِلتَّشَهُّدِ الْاَوَّلِ » پھر اس کے تحت حضرت وائل کی حدیث بیان کی ہے۔ [1]

اس حدیث میں « جُلُوسٌ لِلتَّشَهُّدِ » کی تصریح نہیں۔ اس کے باوجود امام صاحب کا فہم یہ ہے، کہ یہاں « جلوس بین السجدتین » نہیں، بلکہ ''تشہد'' کا جلوس مراد ہے۔

حضرت عبد اللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما کی حدیث پر امام بیہقی رحمہ اللہ نے ''سنن کبریٰ'' (۲/۱۳۲) میں یوں باب باندھا ہے: « بَابُ الدَّلِيلِ عَلٰى اَنَّ هٰذَا سُنَّةُ الْيَدَيْنِ فِي التَّشَهُّدَيْنِ جَمِيعًا. »

۲۔ البتہ مصنف عبد الرزاق (۲/۶۸) میں حضرت وائل کی روایت میں تحریک سبابہ کے بعد « ثُمَّ سَجَدَ » کے الفاظ ہیں۔ اس میں عبد الرزاق، عن الثوری، عن عاصم منفرد ہے اور محمد بن یوسف فریابی کے مخالف ہے۔ جب کہ وہ حضر و سفر میں ثوری رحمہ اللہ کا مصاحب تھا۔ اس نے حدیث کے آخر میں سجدے کا ذکر نہیں کیا اور عبد اللہ بن ولید نے اس کی متابعت کی ہے۔ اس بناء پر حدیث کے اخیر میں « ثُمَّ سَجَدَ » عبد الرزاق کا وہم ہے۔ اس بارے میں سماحۃ الشیخ ابن باز اور علامہ البانی کا موقف بھی یہی ہے، کہ « ثُمَّ سَجَدَ » کے جملے میں عبد الرزاق کو وَہم ہوا ہے۔ جملہ روایات بھی اسی بات پر متفق ہیں، کہ انگلی کا اشارہ پہلے اور دوسرے تشہد میں ہے۔ یہی مسلک درست ہے۔ (واللہ تعالیٰ اعلم)

دو سجدوں کے درمیان دعا کے وقت شہادت کی انگلی ہلانا:

سوال: نماز کے دو سجدوں کے درمیان دعا کے وقت شہادت کی انگلی ہلانا ثابت ہے کہ نہیں؟

جواب: ما بین السجدتین رفع سبابہ کا ذکر مسند احمد کی روایت میں ہے۔ لیکن بعض محققین نے اس کو شاذ قرار دیا ہے۔

جلسۂ استراحت

کیا جلسۂ استراحت سنت سے ثابت ہے؟

سوال: گزارش ہے کہ ہمارے محلے کی مسجد اہلِ حدیث کے امام جب نماز پڑھاتے ہیں تو جلسۂ استراحت کرنا بہت ضروری سمجھتے ہیں جس سے تقریباً آدھے نمازی اُن کی آواز ''اللہ اکبر'' سن کر اُن سے پہلے ہی کھڑے ہو جاتے ہیں اور دوسرے لوگ امام صاحب کو دیکھتے رہتے ہیں تاکہ وہ اُن کے اٹھنے کے بعد کھڑے

[1] سنن النسائی، بَابُ مَوْضِعِ الْيَدَيْنِ عِنْدَ الْجُلُوسِ لِلتَّشَهُّدِ الْاَوَّلِ، رقم: ۱۱۵۹

ہوں جو کہ خشوع وخضوع کے خلاف ہی محسوس ہوتا ہے۔ چوں کہ ہمارے ہاں احناف اور اہلِ حدیث سب قسم کے نمازی ہوتے ہیں اور سب لوگ اتنا لمبا جلسۂ استراحت ضروری نہیں سمجھتے جس سے نماز کی ہیئت ایک عجیب شکل اختیار کر جاتی ہے۔ اِس سلسلے میں میں نے بعض اہلِ حدیث علماء سے پوچھا تھا۔ اُن کا خیال تھا کہ امامت کے وقت امام جلسۂ استراحت سے اجتناب کرلے تو اچھا ہے۔ میں نے امام ابن قیم رحمہ اللہ کی کتاب زاد المعاد کا مطالعہ بھی کیا ہے۔ اُنھوں نے بھی امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کی رائے نقل کی ہے کہ جلسۂ استراحت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بیماری کی صورت میں دیکھا گیا جب کہ براہِ راست اٹھنا مشکل ہوتا ہے۔ ویسے بھی عقلاً نماز میں کوئی حرکت ''اللہ اکبر'' کہے بغیر ممکن نہیں ہوتی تو جلسۂ استراحت جو کہ ایک سکوت کی کیفیت ہے بغیر دوبارہ اللہ اکبر کہے کیسے اُس سے نکلا جا سکے گا۔ ہر سکوت کی کیفیت سے دوسری حالت میں جانے کے لیے اللہ اکبر کہنا ضروری ہے اس لیے براہِ کرم میری اور دیگر سب کی رہنمائی فرمایئے کہ امام کو کیسا رویہ اپنانا چاہیے کہ نمازی امام سے پہلے کھڑے نہ ہونے پائیں تاکہ ایک قبیح شکل جو کہ صرف ہماری اہلِ حدیث مساجد میں پائی جاتی ہے، سے بچا جا سکے۔

جواب: جلسۂ استراحت ابوحمید ساعدی رضی اللہ عنہ کی مشہور حدیث سے ثابت ہے۔ اس کا ذکر مالک بن حویرث کی حدیث میں بھی ہے جو ''صحیح بخاری وغیرہ میں ہے۔[1]

علامہ البانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: جلسۂ استراحت کو اس امر پر محمول کرنا، کہ یہ حاجت کی بناء پر تھا۔ نہ کہ عبادت کی غرض سے۔ لہٰذا یہ مشروع نہیں جیسا کہ حنفیہ کا قول ہے۔ باطل ہے، اور اس کے بطلان کے لیے یہی کافی ہے کہ دس صحابہ رضی اللہ عنہم نے اسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقۂ نماز میں داخل ہونے پر سکوت اختیار کیا۔ اگر انھیں یہ علم ہوتا، کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے بوقت ضرورت کیا ہے، تو ان کے لیے اسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقۂ نماز میں داخل کرنا جائز نہ تھا۔[2]

لہٰذا مقتدیوں کو چاہیے طریقۂ نبوی کے مطابق امام ہذا سے نماز کی تعلیم حاصل کریں۔ امام صاحب پر اپنی مرضی ٹھونسنے سے اجتناب کریں۔ ساری خیر وبرکت اسی میں ہے۔ فعل یا ترک کا نام سنت ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: « ولكنا نتبع السنةَ فِعلًا أو تركًا »[3]

سماحۃ الشیخ ابن باز رحمہ اللہ فرماتے ہیں: وہ احکام جو دین کی طرف منسوب ہوں، ضروری ہے، کہ وہ دین کے

---

[1] صحيح البخاري، بَابُ مَنِ اسْتَوَى قَاعِدًا فِي وِتْرٍ مِنْ صَلاَتِهِ ثُمَّ نَهَضَ، رقم: ٨٢٣

[2] إرواء الغليل: ٢/ ٨٣

[3] فتح الباري: ٣/ ٥٩٩

نصوص سے ثابت ہوں اور ہر وہ شے جو زمانۂ تشریعی اور شرعی نصوص میں ثابت نہیں، وہ اس کے قائل پر مردود ہے۔امیر المومنین عمر رضی اللہ عنہ نے ''حجر اسود'' کو مخاطب کر کے جو فرمایا تھا: اس کا مقتضی بھی یہی ہے۔ ①

''جلسۂ استراحت' کے ترک پر چوں کہ شرعی کوئی نص موجود نہیں۔ لہٰذا اس کا اہتمام ہونا چاہیے۔ اَلخَیرُ کُلُّ الخَیرِ فِی الاِتِّبَاعِ اوراس کو کمزوری پر محمول کرنا محل نظر ہے۔(واللہ ولی التوفیق)

کیا جلسۂ استراحت ضروری ہے؟

سوال گزارش ہے کہ ہمارے محلے کی مسجد کے امام جب نماز پڑھاتے ہیں تو جلسہ استراحت کرنا بہت ضروری سمجھتے ہیں جس سے تقریباً آدھے نمازی اُن کی آواز ''اللہ اکبر'' سنے بغیر ہی اُن سے پہلے ہی کھڑے ہوجاتے ہیں جبکہ دوسرے لوگ امام صاحب کو دیکھتے رہتے ہیں تاکہ وہ اُن کے اُٹھنے کے بعد کھڑے ہوں جو کہ خشوع وخضوع کے خلاف محسوس ہوتا ہے چونکہ ہمارے ہاں احناف اور اہل حدیث سب قسم کے نمازی ہوتے ہیں اور سب لوگ اتنا لمبا جلسہ استراحت ضروری نہیں سمجھتے جس سے نماز کی ہیئت ایک عجب شکل اختیار کرجاتی ہے۔اس سلسلے میں میں نے بعض اہل حدیث علما سے پوچھا تو اُن کا خیال تھا کہ امامت کے وقت امام کو جلسہ استراحت سے اجتناب کرنا چاہئے۔ میں نے امام ابن قیم کی کتاب زاد المعاد کا مطالعہ بھی کیا ہے جس میں اُنہوں نے امام احمد بن حنبل کی رائے نقل کی ہے کہ جلسہ استراحت نبی ﷺ کی بیماری کی صورت میں دیکھا گیا جبکہ براہِ راست اُٹھنا مشکل ہوتا ہے۔ ویسے بھی عقلاً نماز میں کوئی حرکت ''اللہ اکبر'' کہے بغیر ممکن نہیں ہوتی تو جلسہ استراحت جو کہ ایک سکوت کی کیفیت ہے، بغیر دوبارہ اللہ اکبر کہے، کیسے اس سے نکلا جاسکے گا۔ ہر سکوت کی کیفیت سے دوسری حالت میں جانے کے لئے ''اللہ اکبر'' کہنا ضروری ہے اس لئے براہِ کرم رہنمائی فرمائیے کہ امام کو کیسا رویہ اپنانا چاہئے۔(ڈاکٹر محمد احمد، علامہ اقبال ٹاؤن)

جواب جلسہ استراحت ابوحمید ساعدی کی مشہور حدیث سے ثابت ہے۔ ایسے ہی اس کا ذکر مالک بن حویرث کی حدیث میں بھی ہے جو صحیح بخاری وغیرہ میں ہے۔ علامہ البانی فرماتے ہیں کہ جلسہ استراحت کو اس امر پر محمول کرنا کہ یہ حاجت کی بنا پر تھا، نہ کہ عبادت کی غرض سے لہٰذا یہ مشروع نہیں جیسا کہ حنفیہ کا قول ہے، تو یہ بات باطل ہے اور اس کے بطلان کے لئے یہی کافی ہے کہ دس صحابہ نے اسے رسول اللہ ﷺ کے طریقہ نماز میں داخل ہونے پر سکوت اختیار کیا ہے اگر اُنہیں یہ علم ہوتا کہ نبی ﷺ نے اسے بوقتِ ضرورت کیا

① حاشیہ فتح الباری ۳/ ۵۹۹

ہے تو ان کے لئے اسے رسول اللہ ﷺ کے طریقہ نماز داخل کرنا جائز نہ تھا۔ [1]

لہٰذا مقتدیوں کو چاہیے کہ طریقہ نبوی کے مطابق امام سے نماز کی تعلیم حاصل کریں اور امام صاحب پر اپنی مرضی ٹھونسنے سے اجتناب کریں۔ ساری خیر و برکت اسی میں ہے۔ فعل یا ترک ہر دو کا نام سنت ہے جیسا کہ امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ولكننا نتبع السنة فعلا او تركا . [2]

سماحۃ الشیخ ابن باز رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ وہ احکام جو دین کی طرف منسوب ہوں، ضروری ہے کہ وہ دین کے نصوص سے ثابت ہوں اور ہر وہ شے جو زمانہ تشریعی اور شرعی نصوص میں ثابت نہیں وہ اس کے قائل کو واپس لوٹا دی جائے گی۔ امیر المومنین حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حجر اسود کو مخاطب کر کے جو فرمایا تھا، اس کا مقتضیٰ بھی یہی ہے۔ [3]

جلسۂ استراحت کے ترک پر چونکہ شرعی کوئی نص موجود نہیں، لہٰذا اس کا اہتمام ہونا چاہیے۔ تمام بھلائیاں سنت کی پیروی میں ہیں اور اسکو نمازی کی کمزوری پر محمول کرنا درست نہیں۔

جلسۂ استراحت یا درمیانی قعدہ سے اُٹھنے کا کیا مسنون طریقہ:

سوال: جلسۂ استراحت یا درمیانی قعدہ سے اُٹھنے کا کیا مسنون طریقہ ہے؟ ہاتھ پر ٹیک لگانا چاہیے یا نہیں؟ صلوٰۃ المصطفیٰ میں ٹیک لگانے کو مکروہ قرار دیا ہے۔ کیا یہ درست ہے؟

جواب: ''صحیح بخاری وغیرہ میں حضرت مالک بن حویرث رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، کہ رسول اکرم ﷺ جب دوسرے سجدہ سے اپنا سَر اٹھاتے تو بیٹھ جاتے اور زمین پر ٹیک لگا کر پھر کھڑے ہوتے۔ [4]

یاد رہے کہ اٹھنے کے وقت دونوں ہاتھ زمین پر ٹیکتے ہوئے مٹھیاں بند رکھنی چاہئیں۔ جس طرح کہ ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی حدیث میں رسول اللہ ﷺ کا فعل واضح ہے۔ (غریب الحدیث حربی)

اور جن روایات میں ٹیک لگانے سے روکا گیا ہے، وہ ضعیف ہیں۔ ملاحظہ ہو! ''نصب الرایہ'' زیلعی اور ''تحقیق الترمذی'' میں علامہ احمد شاکر اور ''صلوٰۃ المصطفیٰ'' کا اعتماد ضعیف روایت پر ہے۔ جو نا قابلِ التفات ہے۔

---

① ارواء الغليل :٢٨٣

② فتح الباری :٤٧٥/٣

③ فتح الباری به تعليق شيخ ابن باز :٤٦٠٦

④ صحيح البخاری،بَابُ مَنِ اسْتَوَى قَاعِدًا فِي وِتْرٍ مِنْ صَلَاتِهِ ثُمَّ نَهَضَ،رقم:٨٢٣

دوسری رکعت کے لیے کھڑے ہونے کی کیفیت

سجدہ کے بعد اُٹھتے ہوئے ٹیک لگانے کی کیفیت:

سوال: نئی رکعت کے لیے اٹھتے وقت ہاتھوں کو ٹیک لگانے کی کیفیت کون سی ہے؟ آیا ہتھیلیوں کے ذریعے ٹیک لگائیں یا مٹھیاں بند کر کے؟ اور اگر دونوں کیفیات صحیح احادیث سے ثابت ہیں تو ترجیح کس کو ہو گی اور کن دلائل کی بناء پر؟

جواب: اٹھتے وقت دونوں ہاتھ زمین پر ٹیکتے ہوئے مٹھیاں بند رکھنی چاہئیں۔ جیسا کہ حدیث ابن عمر رضی اللہ عنہ میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا فعل مروی ہے۔ اس کو حربی نے ''غریب الحدیث'' میں روایت کیا ہے۔ علامہ البانی رحمہ اللہ نے احادیثِ ضعیفہ (۳۹۲/۲) میں اس کی سند کو حسن کہا ہے۔

دوسری رکعت کے لیے آٹا گوندھنے والی کیفیت اختیار کرنا:

سوال: بعض لوگ دوسری یا تیسری رکعت کے لیے اٹھتے ہیں تو ہاتھ اس طرح رکھتے ہیں جیسے آٹا گوندھنے والی رکھتی ہے۔ اس طرز کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

جواب: نماز میں قیام کے لیے اٹھتے وقت آٹا گوندھنے کی کیفیت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی روایت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فعل سے منقول ہے۔ جس طرح کہ حربی نے ''غریب الحدیث'' میں روایت کیا ہے۔ علامہ البانی نے اس حدیث کی سند کو جید قرار دیا ہے۔ زاد المعاد کے محققین نے صالح کہا ہے۔[1]

مٹھیاں بند رکھ کر اٹھنا:

سوال: بعض دوست دوسری اور چوتھی رکعت میں کھڑے ہوتے ہوئے آٹا گوندھنے والی عورت کی طرح مٹھیاں بند کر کے زمین پر ہاتھ رکھتے ہیں اس کی صحیح صورت کیا ہے؟ کیا حدیث میں کھڑے ہونے کی یہ کیفیت بیان کی گئی ہے یا ہاتھوں کی انگلیوں کی ہیئت مقصود ہے؟ یہ حدیث کس کتاب میں ہے اور سند کے اعتبار سے کیسی ہے؟

جواب: مٹھیاں بند رکھ کر اٹھا جائے۔ یہی کیفیت حدیث میں بیان ہوئی ہے۔

مشارٌ الیہ حدیث حربی کی کتاب ''غریب الحدیث'' میں ہے۔ علامہ البانی رحمہ اللہ نے اس کی سند کو جید کہا

[1] الأحادیث الضعیفہ: ۳۹۲/۲، زاد المعاد: ۲٤۰/۱

اور ''زاد المعاذ'' کے محقق نے اس پر صالح کا حکم لگایا ہے۔ صحیح بخاری میں ہے۔ جب آپ ﷺ دوسرے سجدہ سے اٹھتے، تو بیٹھ جاتے اور زمین پر ٹیک لگا کر کھڑے ہوتے۔ اُٹھتے وقت دونوں ہاتھ زمین پر ٹیکتے ہوئے مٹھیاں بند رکھنے کا بیان ابن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت میں ہے، جو حربی نے ذکر کی ہے۔

سوال : دوسری رکعت سے اٹھنے کی کیفیت کیا ہے؟

جواب : دوسری رکعت سے اٹھنے کی صورت یہ ہے، کہ دونوں ہاتھوں کو زمین پر ٹیکیں اور مٹھیاں بند رکھ کر اٹھیں۔

ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی روایت میں رسول اکرم ﷺ کا فعل اسی طرح ذکر ہوا ہے۔ حدیث ہذا حربی کی غریب الحدیث میں ہے۔ علامہ البانی رحمہ اللہ نے اس کی سند کو حسن اور جید قرار دیا ہے۔ نیز "زاد المعاد" کے حاشیہ پر معلّقین نے اس کو صالح کہا ہے۔

تشہد کے احکام و مسائل

تشہد میں بیٹھنے کا مسنون طریقہ:

سوال : تشہد میں بیٹھنے کا مسنون طریقہ کیا ہے؟

جواب : پہلے تشہد میں دایاں پاؤں بچھا کر اس پر بیٹھا جاتا ہے۔ صحیح مسلم (۵/ ۸۰) میں حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی روایت میں اس امر کی تصریح موجود ہے۔[1] آخری قعدہ میں بایاں پاؤں (دائیں طرف) نکالے اور اپنی بائیں جانب کولہے پر بیٹھے۔[2]

آخری تشہد بیٹھنے کی کیفیت:

سوال : نماز میں آخری تشہد بیٹھنے کی کیفیت بیان کریں جب کہ بعض لوگ کہتے ہیں کہ دایاں بازو کھڑا کرنا ہے اور بعض کہتے ہیں کہ بایاں کھڑا کرنا ہے قرآن وسنت کی روشنی میں وضاحت کریں؟

جواب : تشہد کی حالت میں کوئی دونوں ہاتھوں کو گھٹنوں پر رکھے۔

جیسا ابن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت میں ہے یا رانوں پر، جس طرح ابن زبیر کی روایت میں ہے۔ دونوں طرح جواز ہے۔ بائیں ہاتھ کو رکھنا اور دائیں بازو کو اٹھانے کی تصریح سنن ابو داود «بَابُ کَیفَ الجُلُوسَ فِي التَّشَھُدِ» میں موجود ہے۔ فرمایا:

---

[1] صحیح مسلم، بَابُ صِفَةِ الْجُلُوسِ فِي الصَّلَاةِ، وَکَیْفِیَّةِ وَضْعِ الْیَدَیْنِ عَلَی الْفَخِذَیْنِ، رقم: ۵۷۹

[2] سنن أبي داود، بَابُ افْتِتَاحِ الصَّلَاةِ، رقم: ۷۳٤

« وَ وَضَعَ يَدَهُ الْيُسْرٰى عَلٰى فَخِذِهِ الْيُسْرٰى، وَ حَدَّ مِرفَقَهِ الْاَيمَنِ عَلٰى فَخِذِهِ الْيُمْنٰى »[1]

اس کی تشریح میں ابن ارسلان رقمطراز ہیں:

« يَرفَعُ طَرفَ مِرفَقِهٖ مِن جِهَةِ الْعَضُدِ عَن فَخِذِهٖ، حَتّٰى يَكُونَ مُرتَفِعًا عَنهُ، كَمَا يَرتَفِعُ الْوَتَدُ عَنِ الْاَرضِ، وَ يَضَعُ طَرفَهُ الَّذِى مِن جِهَّةِ الْكَفِّ عَلٰى طَرفِ فَخِذِهِ الْيُمْنٰى »[2]

تشہد میں کس طرح سے بیٹھا جائے؟

سوال: تشہد میں کس طرح سے بیٹھا جاتا ہے؟

جواب: دوسرے سجدہ کے بعد اُٹھ کر بایاں پاؤں بچھا کر اس پر بیٹھ جانا چاہیے، اور دایاں پاؤں کھڑا رکھا جائے، اور دائیں ہاتھ کو اپنے دائیں گھٹنے پر رکھیں، اور بائیں ہاتھ کو اپنے بائیں گھٹنے پر۔[3]

ابو حمید ساعدی رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے، کہ جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ سجدہ ہوتا جس کے بعد سلام ہے تو اپنا بایاں پاؤں (دائیں طرف) نکالتے اور اپنی بائیں جانب کولہے پر بیٹھتے۔[4]

تشہد (التحیات) کے وقت بائیں ہاتھ کی انگلیوں کی کیفیت:

سوال: تشہد (التحیات) کے وقت بائیں ہاتھ کی انگلیوں کی کیا کیفیت ہوگی؟

جواب: بائیں ہاتھ کی انگلیوں کو ''تشہد'' میں بائیں گھٹنے پر پھیلا کر رکھا جائے۔[5]

تشہد میں یعنی ''التحیات'' میں انگلیاں رکھنے کی کیفیت:

سوال: جب ہم رکوع میں ہوتے ہیں تو ہاتھوں کی انگلیوں کو کشادہ رکھتے ہیں یعنی کھلا رکھتے ہیں اور سجدے میں انگلیوں کو ملا کر رکھتے ہیں اور جب ہم تشہد میں یعنی ''التحیات'' میں بیٹھیں تو انگلیوں کو کیسے رکھنا چاہیے؟

جواب: بحالت تشہد انگلیوں کو ملا کر رکھیں کھولنے کی ضرورت نہیں۔ صحیح مسلم وغیرہ میں حدیث ہے۔ دائیں

---

① سنن أبی داؤد،بَابُ رَفْعِ الْيَدَيْنِ فِى الصَّلَاةِ،رقم:٧٢٦

② عون المعبود:١/٣٦١

③ صحيح مسلم،بَابُ صِفَةِ الْجُلُوسِ فِى الصَّلَاةِ، وَكَيْفِيَّةِ وَضْعِ الْيَدَيْنِ عَلَى الْفَخِذَيْنِ،رقم:٥٧٩

④ سنن أبی داؤد،بَابُ افْتِتَاحِ الصَّلَاةِ ،رقم:٧٣٤

⑤ صحيح مسلم،بَابُ صِفَةِ الْجُلُوسِ فِى الصَّلَاةِ، وَكَيْفِيَّةِ وَضْعِ الْيَدَيْنِ عَلَى الْفَخِذَيْنِ،رقم:٥٨١، اور ابو زرعہ، بحوالہ صفۃ صلوٰۃ النبی ﷺ،ص:١٣٥

ہاتھ کو اپنے دائیں گھٹنے پر رکھیں اور بائیں ہاتھ کو اپنے بائیں گھٹنے پر رکھیں اور صحیح مسلم کی دوسری روایت میں ہاتھوں کو رانوں پر رکھنے کی بھی تصریح موجود ہے۔ بظاہر نمازی کو اختیار ہے، جونسی کیفیت چاہے اختیار کر سکتا ہے۔

کیا تشہد میں نظر سجدہ والی جگہ پر ہونی چاہیے؟

سوال: تشہد میں نظر سجدہ والی جگہ پر ہونی چاہیے۔ یا اشارے والی انگلی پر؟

جواب تشہد میں نگاہ اشارے والی انگلی پر ہونی چاہیے۔ حدیث میں ہے:«لَا یُجَاوِزُ بَصَرُہٗ اِشَارَتَہٗ.»[1]
''اپنی نگاہ اشارے کے مقام پر رکھتے۔'' (صلوۃ الرسول ﷺ، مع تخریج ص:۳۰۶، صفۃ الصلوۃ، علامہ البانی ص:۱۳۵)

تشہد میں تورّک[2] چار رکعتی نماز میں یا دو رکعتی نماز میں:

سوال کیا سلام پھیرنے والے تشہد میں پاؤں نکال کر بیٹھنا صرف چار رکعت والی نماز میں ضروری ہے یا دو رکعت میں بھی یہی طریقہ ہے؟ اور کیا ہر بڑے تشہد میں پاؤں نکال کر بیٹھنا سنت ہے؟

جواب صحیح بخاری کے باب سنة الجلوس في التشهد کے تحت ابوحمید الساعدی کی روایت میں الفاظ ہیں:«وَ اِذَا جَلَسَ فِی الرَّکْعَةِ الآخِرَةِ»[3]

جس سے امام شافعی رحمہ اللہ کا استدلال ہے کہ صبح کی نماز کے تشہد میں تشہد اخیر کی طرح بیٹھنا چاہیے۔

دو رکعت والی نماز کے تشہد میں تورّک کرنا:

سوال: دو رکعت والی نماز کے تشہد میں بایاں پاؤں دائیں ٹانگ کے نیچے سے نکال کر بیٹھنا چاہیے یا بغیر سلام والی تشہد کی طرح بیٹھنا چاہیے؟

جواب: ظاہر یہ ہے کہ دو رکعتی نماز میں ٹانگ نکال کر بیٹھنا چاہیے۔ عمومِ حدیث «الرکعة الاخیرة» کا تقاضا یہی ہے۔[4]

آخری قعدہ میں مقتدی کی صورت میں تورک کرنا:

سوال: نماز جماعت کی شکل میں آخری قعدہ میں مقتدی کی صورت میں تورک کرنا مشکل ہوتا ہے کیونکہ

---

1. سنن ابی داؤد،بَابُ الْاِشَارَةِ فِی التَّشَھُّدِ، رقم:۹۹۰
2. التحیات میں بایاں پاؤں دائیں ٹانگ کے نیچے سے نکال کر کولہوں پر بیٹھنا۔
3. صحیح البخاری،بَابُ سُنَّةِ الْجُلُوسِ فِی التَّشَھُّدِ، رقم:۸۲۸
4. صحیح البخاری،بَابُ سُنَّةِ الْجُلُوسِ فِی التَّشَھُّدِ، رقم:۸۲۸، فتح الباری:۲/ ۳۰۹

لوگ قریب قریب بیٹھے ہوتے ہیں۔ کیا یہ صرف امام کے لیے ہے؟ اگر مقتدی کے لیے بھی ضروری ہے تو کیسے عمل کیا جائے؟

جواب نماز میں تَوَرُّک ہر مقتدی کو کرنا چاہیے۔ حدیث میں ہے:« صَلُّوا كَمَا رَأَيْتُمُونِي أُصَلِّي »[1] مشکل اس وقت پیش آتی ہے، جب بعض اس کا اہتمام ترک کر دیتے ہیں۔ سب کے التزام کی صورت میں دقت کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔

مسبوق مقتدی کو امام کی طرح ''تورک'' کرنا:

سوال : (ا) اگر مسبوق نے امام کے ساتھ صرف ایک ہی رکعت پائی تو وہ تشہد میں امام کی اقتداء میں تورک بیٹھے یا وہ اس طرح بیٹھے جس طرح پہلے قعدے میں بیٹھا جاتا ہے۔

(ب) امام دو رکعت پڑھ کر تیسری کے شروع میں ''رفع یدین'' کرتا ہے۔ مسبوق جس کی یہ دوسری رکعت ہے، وہ امام کی اقتداء میں رفع یدین کرے یا نہ کرے؟ کیونکہ خود اس کی یہ تیسری رکعت نہیں۔ یاد رہے کہ مقتدی امام کی اقتداء میں دعاے قنوت پڑھتا ہے۔ اگرچہ اس مقتدی کی یہ آخری رکعت نہ ہو۔ مقتدی امام کے ساتھ آخری قعدہ میں التحیات، درود اور دعا سب کچھ پڑھتا ہے۔ اگرچہ اس نے ایک بھی رکعت نہ پائی ہو۔ امام کی اقتداء میں سجدۂ سہو بھی کرتا ہے۔ اگرچہ سہو کے وقت وہ امام کی اقتداء میں داخل نہ ہوا ہو۔

جواب : بظاہر مقتدی کو امام کی طرح ''تورک'' کرنا چاہیے۔ اقتداء کا تقاضا یہی ہے۔ بایں وجہ امام کی اقتداء میں دو رکعت کے بعد ''رفع یدین'' کا جواز ہے۔ اس لیے کہ مقامِ اقتداء، اسی بات کا متقاضی ہے۔ آپ کے ذکر کردہ جملہ استدلالات سے بھی اس امر کی تائید ہوتی ہے۔

کیا ہر بڑی التحیات میں پاؤں نکال کر بیٹھنا سنت ہے؟

سوال : کیا سلام پھیرنے والی ''التحیات'' میں پاؤں نکال کر بیٹھنا صرف چار رکعت والی نماز میں ضروری ہے یا دو رکعت والی نماز میں بھی یہی طریقہ ہے؟ اور کیا ہر بڑی التحیات میں پاؤں نکال کر بیٹھنا سنت ہے؟

جواب : ''صحیح بخاری کے باب «سُنَّةُ الجُلُوسِ فِي التَّشَهُّدِ» کے تحت ابوحمید الساعدی کی روایت میں الفاظ، «وَ إِذَا جَلَسَ فِي الرَّكْعَةِ الآخِرَةِ »۔[2] سے، امام شافعی رحمہ اللہ کا استدلال ہے، کہ صبح کی نماز

[1] صحيح البخاري، بَابُ الأَذَانِ لِلْمُسَافِرِ، إِذَا كَانُوا جَمَاعَةً، وَالإِقَامَةِ، وَكَذَلِكَ بِعَرَفَةَ وَجَمْعٍ...... الخ، رقم:٦٣١

[2] صحيح البخاري، بَابُ سُنَّةِ الجُلُوسِ فِي التَّشَهُّدِ، رقم:٨٢٨

کے تشہد میں ''تشہد اخیر'' کی طرح بیٹھنا چاہیے۔[1] آخری تشہد میں پاؤں نکال کر بیٹھنا سنت ہے۔

کیا تشہد میں انگلی اٹھانا مسنون ہے؟

(سوال): تشہد میں انگلی اٹھانا کیسا ہے؟ اور کس لفظ پر اٹھائی جائے، اٹھانے کی کیفیت کیا ہے اور کب تک اٹھائی جائے؟

(جواب): تشہد میں انگلی اٹھانا مسنون ہے۔ حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے:

« كَانَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ اِذَا جَلَسَ فِی الصَّلٰوةِ، وَضَعَ يَدَيهِ عَلٰی رُكبَتَيهِ، وَ رَفَعَ اِصبَعَهُ اليُمنٰی الَّتِی تَلِی الِابهَامَ، يَدعُو بِهَا »[2]

یعنی رسول اللہ ﷺ نماز میں (جب، تشہد میں) بیٹھتے اپنے دونوں ہاتھوں کو اپنے دونوں گھٹنوں پر رکھتے اور اپنی داہنی انگلی جو انگوٹھے کے ساتھ ملتی ہے، اٹھا کر اس کے ساتھ دعا کرتے۔

صاحب ''عون المعبود''، ''مرقاۃ'' سے نقل کرتے ہیں:

« أَن يَتَشَهَّدَ بِهَا، وَ اَن يَستَمِرَّ عَلَی الرَّفعِ إِلٰی آخِرِ التَّشَهُّدِ » (۳۷۵/۱)

یعنی تشہد کے اخیر تک انگلی اٹھائے رکھنی چاہیے۔

ابوداؤد اور نسائی کی روایت میں بسندِ صحیح یوں ہے۔

« كَانَ يُحَرِّكُ اِصبَعَهُ يَدعُوا بِهَا »[3]

یعنی ''آپ انگلی کو حرکت دیتے رہتے۔ اس کے ساتھ دعا کرتے۔''

علامہ البانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اس حدیث میں اس بات کی دلیل ہے، کہ سلام تک بالاستمرار (مسلسل) انگلی کا اشارہ اور حرکت جاری رہنی چاہیے، کیونکہ اس سے پہلے دعا ہے۔ امام مالک رحمہ اللہ وغیرہ کا مسلک یہی ہے اور جہاں تک تعلق ہے بعد از اشارہ انگلی رکھنے کا یا نفی اور اثبات یعنی: «اَشهَدُ اَن لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهَ» پڑھنے کے وقت سے، اسے ''مقید'' کرنے کا، تو یہ سنت سے ثابت نہیں۔ بلکہ اس حدیث کی دلالت کی بناء پر فعل ہذا سنت کے مخالف ہے۔[4]

---

① فتح الباری: ۳۰۹/۲

② صحیح مسلم، بَابُ صِفَةِ الجُلُوسِ فِی الصَّلَاةِ، وَكَيفِيَّةِ ......الخ، رقم: ۵۸۰

③ سنن النسائی، بَابُ مَوضِعِ اليَمِينِ مِنَ الشِّمَالِ فِی الصَّلَاةِ، رقم: ۸۸۹

④ صفة صلوة النبی ﷺ، طبع ۳، ص: ۱۳۶

بیہقی کی جس روایت سے فقہائے شافعیہ نے دلیل لی ہے، کہ اشارہ ''لا الٰہ الا اللہ'' پر کرنا چاہیے۔ پھر بعد میں صاحب "سُبُلُ السَّلام" نے بھی یہی کچھ بیان کیا ہے۔ اس کے دو جواب ہیں۔

اولاً: اس حدیث میں قطعاً اس بات کی صراحت نہیں کہ اشارہ ''لا الٰہ الا اللہ'' پر ہونا چاہیے۔

ثانیاً: یہ ہے کہ خفاف بن ایماء سے بیان کرنے والا راوی مجہول ہے۔ بناء بریں یہ حدیث ضعیف ہے۔

سنن ابوداؤد وغیرہ کی جس روایت میں انگلی کے حرکت نہ کرنے کا ذکر ہے، وہ قابلِ حجت نہیں۔ کیونکہ یہ روایت شاذ ہے یا منکر، ملاحظہ ہو! تحقیق المشکوٰۃ للالبانی (١/ ٢٨٤)

جہاں تک کیفیت کا تعلق ہے۔ سو اس بارے میں صحیح مسلم میں ہے، کہ رسول اللہ ﷺ جب تشہد پڑھنے کو بیٹھتے تو اپنا دایاں ہاتھ دائیں ران پر رکھتے، اور اپنا بایاں ہاتھ بائیں ران پر رکھتے، اور اپنی سبابہ انگلی کے ساتھ اشارہ کرتے، اور اپنا انگوٹھا اپنی درمیانی انگلی کے اوپر رکھتے۔[1]

سنن ابوداؤد کی روایت میں حلقہ بنانے کا ذکر بھی ہے۔ انگوٹھا اور درمیانی انگلی کو ملا کر حلقہ بناتے۔[2]

جس طرح کہ بعض روایات میں (۵۳) کی گرہ کا بھی تذکرہ ہے۔[3] جس کی صورت یہ ہے، کہ انگوٹھے کو مسبحہ انگلی کے نیچے چوڑائی میں کر دیا جائے۔ اور صحیح مسلم میں دائیں ہاتھ کی تمام انگلیوں کے قبضہ اور سبابہ سے اشارہ کا حکم ہے۔[4] نیز ایک روایت میں انگلی کی طرفِ نگاہ رکھنے کا بھی ذکر ہے۔ مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو! عون المعبود، (۱/۳۶۱)

تشہد میں انگلی کے اٹھانے اور ہلانے کا حکم:

سوال: تشہد میں انگلی کے اٹھانے اور ہلانے کا کیا حکم ہے؟

جواب: تشہد میں انگلی اٹھانی چاہیے۔ احادیث کے ظاہر سے جو معلوم ہوتا ہے، وہ یہ ہے، کہ شروع تشہد سے انگلی اٹھانی چاہیے۔ جیسا کہ علامہ مبارکپوری رحمہ اللہ نے تحفۃ الاحوذی (۲/۱۸۳) میں کہا ہے۔ نیز حضرت وائل بن حجر رضی اللہ عنہ کی روایت «یُحَرِّکُهَا» کے مطابق سلام پھیرنے تک اسے حرکت دیتے رہنا چاہیے۔

التعلیقات السلفیہ علی سنن النسائی میں ہے:

---

[1] صحيح مسلم، بَابُ صِفَةِ الْجُلُوسِ فِي الصَّلَاةِ، وَكَيْفِيَّةِ ......الخ ،رقم:۵۷۹

[2] سنن أبي داؤد، بَابُ رَفْعِ الْيَدَيْنِ فِي الصَّلَاةِ،رقم:۷۲۶

[3] صحيح مسلم، بَابُ صِفَةِ الْجُلُوسِ فِي الصَّلَاةِ، وَكَيْفِيَّةِ ......الخ ،رقم:۵۸۰

[4] صحيح مسلم، بَابُ صِفَةِ الْجُلُوسِ فِي الصَّلَاةِ، وَكَيْفِيَّةِ ......الخ ،رقم:۵۸۰

« ظَاهِرُ الاَحَادِيثِ يَدُلُّ عَلٰى اَنَّ الاِشَارَةَ مِن اِبتِدَاءِ الجُلُوسِ اِلٰى آخِرِهٖ » (۱۳۷/۱)

''ظاہر احادیث دلالت کرتی ہیں، کہ اشارہ ''تشہد'' کے آغاز سے لے کر اخیر تک ہے۔''

''عون المعبود'' میں سید نذیر حسین رحمہ اللہ سے بھی یہی نقل کیا ہے، کہ

« اَنَّ المُصَلّٰی يَستَمِرُّ عَلَى الرَّفعِ اِلٰى آخِرِ الدُّعَاءِ بَعدَ التَّشَهُّدِ.»

رفعِ سبابہ کس وقت کرنا چاہیے؟

سوال: رفعِ سبابہ کس وقت کرنا چاہیے؟ ہمارے یہاں ایک اہلِ حدیث صاحب کہتے ہیں کہ صرف اس وقت جب التحیات میں «اَشهَدُ اَن......» کہے۔ اس وقت انگلی کو حرکت دینی چاہیے۔ اس کے بعد حرکت دینا، یعنی مسلسل انگلی کو حرکت دینا حدیث سے ثابت نہیں۔

جواب: بعض اہلِ علم اس بات کے قائل ہیں کہ رفعِ سبابہ ''لا الٰہ الا اللہ'' کہتے وقت ہونا چاہیے۔ ان لوگوں کا اعتماد بیہقی کی ایک روایت پر ہے۔ اس کا ایک جواب یہ ہے، کہ اس روایت میں قطعاً اس بات کی تصریح نہیں کہ نبی ﷺ ''لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ'' کہنے پر اشارہ کرتے تھے۔ پھر روایت بھی ضعیف ہے۔ خفاف سے بیان کرنے والا راوی مجہول ہے۔ ''ابویعلیٰ'' میں اس کی دوسری سند بھی ہے۔ لیکن اس میں سعید بن عیاض ضعیف ہے۔ حافظ ذہبی ''الکاشف'' میں اس کے بارے میں فرماتے ہیں: اسے ترک کر دیا گیا ہے۔

نیز علامہ البانی نے ''حاشیۃ مشکوٰۃ'' اور ''صفة الصلاۃ'' (ص:۱۳۶) میں ''لا الہ الا اللہ'' پر انگلی اٹھا کر رکھ لینے کو بے اصل قرار دیا ہے۔ جملہ احادیث کے عموم کا تقاضا یہ ہے، کہ ''تشہد'' میں اول تا آخر انگلی کو اٹھا کر مسلسل حرکت میں لانا چاہیے۔ فرمایا: «كَانَ يُحَرِّكُ إِصبَعَهٗ يَدعُو بِهَا» [1] اور عدمِ حرکت والی روایت شاذ یا منکر ہے کیونکہ « لَا يُحَرِّكُهَا » [2] میں محمد بن عجلان نے اپنے سے اَوثق زائد بن قدامہ کی مخالفت کی ہے جس میں « يُحَرِّكُهَا » کے الفاظ ہیں۔ حدیث میں رفع سبابہ کی وجہ یہ بیان ہوئی ہے:

« هِيَ أَشَدُّ عَلَى الشَّيطَانِ مِنَ الحَدِيدِ. يَعنِي السَّبَابَةَ » [3]

یعنی ''تشہد میں شہادت کی انگلی کا اٹھانا زیادہ سخت ہے شیطان پر لوہے (کا نیزہ مارنے) سے۔''

اور عبد اللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

---

① سنن أبي داؤد۔ سنن النسائي، بَابُ مَوضِعِ اليَمِينِ مِنَ الشِّمَالِ فِي الصَّلَاةِ، رقم:۸۸۹

② سنن أبي داؤد، بَابُ الإِشَارَةِ فِي التَّشَهُّدِ، رقم:۹۸۹

③ مسند احمد، رقم: ۶۰۰۰

«كَانَ النَّبِيُّ ﷺ يُشِيرُ بِإِصبَعِهِ، إِذَا دَعَا » ①

یعنی ''نبی ﷺ جب تشہد پڑھتے تو اپنی انگلی سے اشارہ کرتے تھے۔''

اور صحیح مسلم میں ابن عمر رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے: «يدعو بها» یعنی مسبحہ (شہادت کی انگلی) کے ساتھ آپ دعا کرتے تھے۔ مزید آنکہ ابوداؤد میں ہے: « لَا يُجَاوِزُ بَصَرُهُ إِشَارَتَهُ» ② ''اپنی نگاہ کو اشارے کے مقام پر رکھتے۔'' نیز فرمایا: « قَد حَنَاهَا شَيئًا» ③ یعنی نبی ﷺ انگلی کو تھوڑا سا جھکائے ہوئے تھے۔

صاحب ''المرعاۃ'' فرماتے ہیں:

« فَالرَّاجِحُ عِندَنَا أَن يَعقِدَ مِن أَوَّلِ القُعُودِ مُشِيرًا بِالمُسَبِّحَةِ ، مُستَمِرًّا عَلٰى ذٰلِكَ إِلٰى أَن يُسَلِّمَ. (وَاللّٰهُ أَعلَمُ) قَالَ العُلَمَاءُ: خُصَّتِ السَّبَّابَةُ بِالاِشَارَةِ: لِاتِّصَالِهَا بِنِيَاطِ القَلبِ فَتَحرِيكُهَا سَبَبٌ لِحُضُورِهٖ » (٦٦٢/١)

یعنی ''ہمارے نزدیک راجح بات یہ ہے کہ قعدہ کے شروع سے (انگلیوں کی) گرہ لگائے۔ سلام پھیرنے تک مسلسل مسبحہ (انگشتِ شہادت) کے ساتھ اشارہ کرتا رہے۔ واللہ اعلم۔ علماء نے کہا ہے کہ اشارہ کے لیے سبابہ انگلی کو اس لیے خاص کیا گیا ہے کیونکہ اس کا دل سے قریبی تعلق ہے۔'' پس مسبحہ (انگشتِ شہادت) کو حرکت دینا دل کی بیداری کا موجب (سبب) ہے۔

تشہد میں شہادت والی انگلی کو حرکت کب اور کس حد تک دیں؟

سوال: تشہد میں شہادت والی انگلی کو حرکت کب اور کس حد تک دینا ہوتی ہے؟ نیز مٹھی کب بند کرنی چاہیے؟

جواب: احادیث کے ظاہر سے معلوم ہوتا ہے، کہ تشہد کے ابتداء سے لے کر اخیر تک انگلی اٹھائے رکھنی چاہیے۔ ساتھ ساتھ اشارہ بھی ہوتا رہے۔ البتہ کسی مخصوص جگہ کے تعین کے بارے میں کوئی روایت ثابت نہیں۔ چنانچہ علامہ مبارکپوری رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

« ظَاهِرُ الاَحَادِيثِ يَدُلُّ عَلَى الاِشَارَةِ مِن اِبتِدَاءِ الجُلُوسِ » ④

---

① سنن أبي داؤد،بَابُ الْإِشَارَةِ فِي التَّشَهُّدِ،رقم: ٩٨٩ ، سنن النسائي،بَابُ بَسْطِ الْيُسْرَى عَلَى الرُّكْبَةِ ،رقم: ١٢٧٠

② سنن ابی داؤدبَابُ الْإِشَارَةِ فِي التَّشَهُّدِ،رقم:٩٩٠

③ سنن ابی داؤدبَابُ الْإِشَارَةِ فِي التَّشَهُّدِ،رقم:٩٩١

④ تحفة الاحوذي: ١٨٥/٢

حضرت وائل بن حجر رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث کے الفاظ «یُحَرِّکُھَا» کے مطابق سلام پھیرنے تک اسے حرکت میں رکھنا چاہیے، جب کہ ابن زبیر سے مروی حدیث «لَا یُحَرِّکُھَا» کی صحت محلِ نظر ہے۔

اس کے متعلق علامہ البانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: کہ

یہ الفاظ میرے نزدیک شاذ یا منکر ہیں، کیونکہ محمد بن عجلان اس پر ثابت نہیں رہے، ابن عجلان کی طرح دوسرے راویوں نے بھی روایت کیا ہے۔ مگر انہوں نے ان الفاظ کا ذکر نہیں کیا۔ لہٰذا یہ حدیث حضرت وائل سے منقول حدیث کے مقابلے میں پیش کرنا درست نہیں۔ (1)

تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو! ''التعلیقات السلفیة'' (۱/ ۱۳۷)

نیز یاد رہے، کہ حالتِ تشہد میں داہنے ہاتھ کو ران پر رکھنے کی مختلف شکلیں وارد ہیں۔ جن کی تفصیل تحفة الأحوذی، (۲/ ۱۸۳) میں دیکھی جا سکتی ہے۔ ایک صورت یہ ہے، کہ اپنا انگوٹھا اپنی درمیانی انگلی کے بیچ میں رکھے۔ (مسلم) یہ کیفیت سارے ''التحیات'' میں جاری رہنی چاہیے اور ظاہر یہی ہے، کہ تمام صورتوں میں مٹھی مسلسل بند رہنی چاہیے۔ (2)

نماز میں بوقتِ تشہد انگلی ہلاتے رہنا:

سوال: نماز میں بوقتِ تشہد انگلی ہلاتے رہنا کیا قرآن وحدیث سے ثابت ہے؟

جواب: ''سنن کبریٰ بیہقی'' (۲/۱۳۲) وغیرہ میں حدیث ہے: «فَرَأَیْتُهُ یُحَرِّکُھَا، یَدعُوا بِھَا» (3) یعنی ''میں نے آپ ﷺ کو (دورانِ تشہد) دیکھا، انگلی کو حرکت دیتے ہوئے، اس کے ساتھ دعا کرتے ہوئے۔'' لفظ «یُحَرِّکُھَا» کا تقاضا ہے، کہ تشہد میں انگلی کو حرکت دیتے رہنا چاہیے۔

تشہد میں انگلی کو حرکت شروع سے دیں یا درود شریف کے بعد:

سوال: تشہد کی حالت میں شروع سے ہی انگلی کو حرکت دینی شروع کر دینی چاہیے یا درود کے بعد جب دعائیں شروع کریں۔ نیز کیا دو سجدوں کے درمیان بھی حرکت دینی چاہیے؟

جواب: ظاہر یہ ہے کہ تشہد میں انگلی کو حرکت شروع سے دی جائے، کیونکہ حدیث کے لفظ «یُحَرِّکُھَا» کا

(1) تحقیق المشکاة: ۱/ ۲۸۷ تمام المنة ۲۱۷۔۲۱۸

(2) تحفة الاحوذی: ۲/ ۱۸۳

(3) السنن الکبریٰ للبیہقی، بَابُ مَنْ رَوَی أَنَّهُ أَشَارَ بِهَا وَلَمْ یُحَرِّکْهَا، رقم: ۲۷۸۷، سنن النسائی، بَابُ قَبْضِ الثِّنْتَیْنِ مِنْ أَصَابِعِ الْیَدِ الْیُمْنَی ......الخ، رقم: ۱۲۶۸

تقاضا یہی ہے، کہ اسے شروع تشہد سے آخر تک حرکت دیتا رہے۔ مولانا عبدالرحمٰن مبارکپوری رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

«ظَاهِرُ الحَدِيثِ يَدُلُّ عَلَى الِاشَارَةِ مِن اِبتِدَاءِ الجُلُوسِ »[1]

پھر «يَدعُو بِهَا » کا مفہوم بھی یہی ہے۔

سجدوں کے درمیان اشارے والی حدیث کو عبدالرزاق نے «المصنف،(۲/ ۶۸)، اور اس سے احمد نے ''مسند'' (۴/ ۳۱۷) میں، اور طبرانی نے «المعجم الكبير، (۲۲/ ۳۳) میں ذکر کیا ہے۔ اس حدیث کے راوی وائل بن حجر رضی اللہ عنہما ہیں۔ اس بارے میں وائل کی دیگر جملہ روایات اس کے خلاف ہیں اور جن لوگوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز کا وصف بیان کیا ہے ان کی روایات بھی وائل کی اس روایت کے خلاف ہیں۔ ان کے مطلق اور مقید الفاظ کا تعلق تشہد کی بیٹھک سے ہے۔

علامہ بکر بن عبد اللہ ابو زید فرماتے ہیں: ''علمائے سلف میں سے کسی نے دو سجدوں کے درمیان اشارہ کرنے کی تصریح نہیں کی، اور نہ کسی نے اس کے مقتضیٰ کے مطابق کوئی ''ترجمۃ الباب'' قائم کیا ہے اور مسلمانوں کا متوارث عمل عدمِ اشارہ اور عدمِ حرکت ہے۔ یہ ان روایات سے ہے جس پر عدمِ عمل میں مسلمان متفق ہیں یا تو اس کے ضعف کی وجہ سے یا اس بناء پر کہ اس کا ظاہر ترتیب حکمی کے خلاف ہے۔ امام بیہقی نے «السنن الكبرىٰ، (۲/ ۱۳۱) میں اس حدیث کے ضعف کی طرف اشارہ کیا ہے۔ شیخ الاسلام ابن باز اور علامہ البانی رحمہما اللہ نے کہا ہے، کہ عبدالرزاق کی یہ روایت ''ثوری عن عاصم'' ہے اس میں عبدالرزاق، ثوری سے متفرد ہے۔ محمد بن یوسف فریابی اس کا مخالف ہے۔ جب کہ وہ ہمہ وقت ثوری کے ساتھ رہا ہے۔ انھوں نے حدیث کے اخیر میں سجدۂ مذکورہ کا ذکر نہیں کیا۔ عبد اللہ بن الولید نے محمد کی متابعت کی ہے۔ حدیث کے اخیر میں یہ زیادتی « ثُمَّ سَجَدَ» عبدالرزاق کے اوہام سے ہے۔

روایات اس بات پر متفق ہیں، کہ اشارے کا تعلق پہلے اور دوسرے تشہد کے جلوس سے ہے۔[2] مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو! كِتَابٌ لَا جَدِيدَ فِي أَحكَامِ الصَّلٰوةِ:ص:۳۸تا ٤٦۔ تأليف علامه بكر بن عبد الله ابوزيد.

دائیں ہاتھ کٹ جانے کی وجہ سے بائیں ہاتھ کی انگلی کو حرکت دینا:

سوال: ایک آدمی کا دایاں ہاتھ کسی وجہ سے کٹ جاتا ہے تو اب حالت نماز میں بائیں ہاتھ کی انگلی کو

① تحفة الاحوذی:۲/ ۱۸۵

② تمام المنة:۱/ ۲۱٤۔۲۱۷، السلسلة الصحيحة:٥/ ۳۰۸، ۳۱٤۔ حديث:۲۲٤۷۔۲۲٤۸

شہادت کے لیے اٹھا سکتا ہے یا کہ نہیں؟

(جواب) : داہنا ہاتھ کٹنے کی وجہ سے جس طرح وضو کرنے والے سے اس کا دھونا ساقط ہو جاتا ہے، اسی طرح شہادت کی انگلی کی حرکت بھی ساقط ہو جاتی ہے۔ البتہ بعض اہلِ علم نے کہا ہے، کہ بازو کا اگر سرا موجود ہو، تو صرف اسے ہی دھولیا جائے، لیکن کوئی بھی قائل نہیں، کہ اس کے بجائے بائیں ہاتھ کو دو دفعہ دھویا جائے۔ اسی طرح ''رفع سبابہ'' کا مسئلہ سمجھ لینا چاہیے۔ کیونکہ اس کے دائیں ہاتھ کی تسبیح والی انگلی ہی اس کام کے لیے مقرر ہے۔

تشہد میں انگلی کو حرکت دائیں بائیں یا اوپر نیچے:

(سوال) : لوگ تشہد میں انگلی کو اُوپر نیچے حرکت دیتے ہیں اور مالکیہ دائیں بائیں۔ حدیث یا آثار سے کیا ثابت ہے؟

(جواب) : تشہد میں سبابہ انگلی کے ساتھ مسلسل حرکت کا ذکر احادیث میں موجود ہے۔ وائل بن حجر رضی اللہ عنہ کی روایت میں پہلے انگلی اٹھانے کا بیان ہے۔ پھر یوں الفاظ ہیں: «فَرَأَيتُهُ يُحَرِّكُهَا يَدعُوا بِهَا »[1] یعنی ''میں نے آپ کو دیکھا انگلی کی حرکت کے ساتھ دعا کرتے۔'' اور جس روایت میں عدمِ حرکت کا بیان ہے۔ وہ شاذ ہے یا منکر۔ وہ قابل حجت نہیں۔

تشہد میں مخاطب کا صیغہ یعنی السلام علیك یا غائب کا صیغہ یعنی السلام علی النبی:

(سوال) : تشہد میں مخاطب کا صیغہ یعنی ''اَلسَّلَامُ عَلَيكَ'' درست ہے یا جیسے علامہ البانی صاحب غائب کا صیغہ تجویز کرتے ہیں۔ اس بارے میں جمہور علماء کی کیا رائے ہے؟

(جواب) : جمہور اہلِ علم تشہد میں صیغۂ خطاب اور نداء کے قائل ہیں۔ صاحب'' مرعاۃ المفاتیح'' رقمطراز ہیں:

« لٰكِن جُمهُورَ الصَّحَابَةِ ، وَالتَّابِعِينَ، وَ غَيرَهِم مِنَ المُحَدِّثِينِ ، وَالفُقَهَاءِ مُتَّفِقُونَ عَلَى التَّشَهُدِ المَرفُوعِ المَروِيِّ بِصِيغَةِ الخِطَابِ ، وَالنِّدَاءِ. اى عَدَمِ المُغَايَرَةِ بَينَ زَمَانِهِ ﷺ، وَ مَا بَعدَهُ »[2]

''لیکن جمہور صحابہ رضی اللہ عنہم اور تابعین اور ان کے علاوہ محدثین و فقہاء سب بصیغۂ خطاب اور نداء مرفوعاً مروی تشہد پر متفق ہیں۔ یعنی نبی ﷺ کے عہد اور بعد کے دور میں صیغے کا کوئی تفاوت نہیں۔''

---

[1] السنن الكبرىٰ للبيهقي، بَابُ مَنْ رَوَى أَنَّهُ أَشَارَ بِهَا وَلَمْ يُحَرِّكْهَا، رقم:٢٧٨٧، سنن النسائي، بَابُ قَبْضِ الثِّنْتَيْنِ مِنْ أَصَابِعِ الْيَدِ الْيُمْنَى ......الخ، رقم:١٢٦٨

[2] مرعاة المفاتيح: ١/٦٦٤

تشہد میں " السلام علی النبی" کہنا:

(سوال) : بعض علماء کہتے ہیں کہ تشہد میں '' السلام علی النبی'' کہنا صحابہ رضی اللہ عنہم کا اجتہاد تھا، کہنا وہی چاہیے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سکھایا تھا۔ یعنی " السلام علیك ایها النبی " کیا کسی ایک صحابی سے بھی صحیح سند سے یہ ثابت ہے کہ اس نے آپ کی وفات کے بعد بھی " السلام علیك ایها النبی " کہا ہو؟ مؤطا امام مالک رحمہ اللہ کی شرح میں علامہ وحید الزماں رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ یہ امر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے ثابت ہو گیا تو واجب ہے اتباع اس کا ہم پر؟''

(جواب) : "اَلسَّلامُ عَلَيكَ اَيُّها النَّبِیّ" کے الفاظ تو عہد نبوت سے لے کر ثابت شدہ ہیں۔ نئے سرے سے ان میں بحث کرنے کی ضرورت نہیں۔ جب کہ "السَّلام علی النبی "کا وقوع حادث ہے۔ اس میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اجتہاد کا عمل دخل ہے۔ اشکال اجتہادی الفاظ پر ہونا چاہیے تھا، نہ کہ منصوص پر۔ مولانا وحید الزماں کا جو نظریہ ہے، دیگر بعض اہلِ علم بھی اسی بات کے قائل ہیں۔ لیکن جمہور کے ہاں ترجیح پہلے مسلک کو ہے دوسرے کا صرف جواز ہے۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو! مرعاة المفاتيح۔

چار رکعتوں والی نماز کے پہلے تشہد میں درود شریف پڑھنے کا حکم:

(سوال) : چار رکعتوں والی نماز کے پہلے تشہد میں درود شریف پڑھنے کا کیا حکم ہے؟ بعض لوگ نہ پڑھنے کے قائل ہیں، بعض جائز کہتے ہیں جب کہ بعض واجب گردانتے ہیں؟

(جواب) : حدیث کے عموم کی بناء پر پہلے تشہد میں درود پڑھنے کا جواز ہے۔

« قُولُوا : اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ...... » الخ [1]

(سوال) : چار یا تین رکعات والی نماز کے درمیانے تشہد میں صرف التحیات پڑھنی چاہیے یا درود شریف ابراہیمی اور دعائیں بھی ملانی چاہئیں؟ قرآن وحدیث کی روشنی میں فتویٰ درکار ہے۔

(جواب) : تین یا چار رکعتوں والی نماز کے درمیانے تشہد میں عمومِ احادیث کی بناء پر درود ملانا جائز ہے۔ تاہم دعائیں آخری تشہد میں ہی ملانی چاہئیں۔

تشہد میں نمازِ جنازہ والی دعا پڑھنا:

(سوال) : فرض نماز کے تشہد میں کوئی عزیز، دوست، والدین یاد آجائیں تو کیا نمازِ جنازہ والی دعا ان کی

---

[1] صحيح البخاري، بَابُ الصَّلاَةِ عَلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، رقم: ٦٣٥٧

مغفرت کے لیے پڑھی جاسکتی ہے؟

(جواب): بظاہر جواز ہے۔ حدیث میں ہے:

ثُمَّ لِيَتَخَيَّرَ مِنَ الدُّعَاءِ اَعجَبَهُ اِلَيهِ» (1)

''پھر جو دعا نمازی کو زیادہ پسند ہو پڑھ لے۔''

تشہد کا طول کس قدر ہو؟

(سوال): الاعتصام کے کسی شمارے میں پڑھا تھا کہ نبی ﷺ نماز کی آخری رکعت میں ''التحیات'' کے لیے بیٹھتے تو اس میں بہت طویل قرآن و حدیث کی دعائیں پڑھتے تھے لیکن آپ ﷺ تو فرض نمازوں کی امامت خود کرواتے تھے اور کمزور وضعیف مقتدیوں کا خیال فرماتے ہوئے نماز کو طول نہیں دیتے تھے۔ پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ کونسی نماز کے آخری ''التحیات'' کے آخر میں طویل دعائیں پڑھتے تھے۔ میں نے صبح کے دو فرضوں کی آخری رکعت میں قرآن و حدیث کی مسنون دعائیں پڑھنی شروع کی ہیں۔ مگر وہ اتنا طویل سلسلہ شروع ہو جاتا ہے کہ ہر دعا کی افادیت اتنی ضروری معلوم ہوتی ہے کہ چھوڑنے کو دل نہیں چاہتا۔ نتیجتاً وہ دو رکعت آدھ گھنٹے سے بھی زیادہ وقت لے لیتی ہیں اور سلام پھیرنے کے بعد یہ بات میرے لیے سوہانِ روح بن جاتی ہے کہ جو کچھ میں اپنے بچوں کے لیے یا بہن بھائیوں کے لیے خاص طور پر اللہ تعالیٰ سے مانگنا چاہتی ہوں کہ جو کچھ اپنی زبان یعنی اُردو یا پنجابی میں ہی مانگ سکتی ہوں وہ نہیں مانگ سکی کیونکہ نماز کی حالت میں تو صرف عربی دعائیں ہی پڑھ سکتے ہیں اور سلام پھیرنے کے بعد میری دماغی ہمت جواب دے دیتی ہے کیونکہ میں عمر رسیدہ عورت ہوں اور دماغی کمزوری کا عارضہ بھی ہے۔ براہِ مہربانی کوئی ایسا طریقہ بتائیں کہ میرے بچے بھی میری دعاؤں سے محروم نہ رہیں۔

(جواب): فرض نماز میں واقعی مقتدیوں کا لحاظ رکھنا ضروری ہے۔ لیکن ''تشہد'' کے طُول کا انحصار صرف فرض پر نہیں، بلکہ نوافل و رواتب بھی اس زمرہ میں شامل ہیں۔ بالخصوص رات کی نماز جس کی طوالت کا دارومدار انسان کے ذہنی نشاط پر ہوتا ہے۔

محترمہ کتاب و سنت میں ایسی دعائیں موجود ہیں، جن میں ''مشارٌ الیہ'' اشخاص کے تذکرے موجود ہیں۔ مولانا عبدالسلام بستوی مرحوم کی کتاب ''اسلامی وظائف'' کو سامنے رکھ کر بآسانی آپ ان کا انتخاب کر

(1) متفق علیه بحواله مشکوٰة مع مرعاة المفاتیح: ١/١٦٦، صحیح البخاری: بَابُ مَا يُتَخَيَّرُ مِنَ الدُّعَاءِ بَعْدَ التَّشَهُّدِ وَلَيْسَ بِوَاجِبٍ، رَقم: ٨٣٥

سکتی ہیں۔ بالخصوص جب کہ رب العزت نے آپ کو''حفظ القرآن'' کی دولت سے بھی نوازا ہے، یا صرف جامع دعا«ربَّنا اٰتِنَا......الخ» بہ نیت پڑھ لیا کریں۔ اس میں دین ودنیا کی تمام بھلائیاں جمع ہیں۔

قعدۂ اولیٰ میں درود واذکار

کیا نماز میں پہلے تشہد کے ساتھ درود شریف پڑھنا چاہیے؟

سوال: کیا نماز میں پہلے تشہد کے ساتھ درود شریف پڑھنا چاہیے؟ بعض لوگ پہلے قعدے میں تشہد کے ساتھ درود شریف پڑھنے کے لیے قرآن کی آیت﴿یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَیْہِ﴾(الاحزاب:٥٦) اور اس حدیث سے جس میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے آپ ﷺ سے درود پڑھنے کے بارے میں سوال کیا تھا، استدلال کرتے ہوئے ضروری قرار دیتے ہیں جب کہ ''مسند احمد''، تلخیص ابن حجر رحمہ اللہ اور نصب الرایۃ کی روایات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ پہلے قعدے میں صرف تشہد ہی پڑھیں گے۔ بہر حال بحوالہ وضاحت فرما کر عند اللہ ماجور ہوں۔

جواب: کسی بھی صحیح مرفوع متصل روایت میں پہلے تشہد میں درود پڑھنے کی ممانعت نہیں۔ بلکہ حدیث کعب بن عجرہ رضی اللہ عنہ کا عموم، جواز پر دال ہے۔ فرماتے ہیں:

« اَنَّ النَّبِیَّ ﷺ سُئِلَ عَنْ کَیْفِیَّۃِ الصَّلٰوۃِ عَلَیْہِ ، فَقَالَ: « قُوْلُوْا: اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ » الخ [1]

اور بعض صحیح روایات میں الفاظ یوں ہیں:

« قَالُوْا: یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ ! قَد عَلِمنَا کَیفَ نُسَلِّمُ عَلَیکَ (أَی فِی التَّشَھُّدِ)، فَکَیفَ نُصَلِّی عَلَیکَ؟ قَالَ: قُولُوا : اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ ...... » [2]

یعنی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کی: یا رسول اللہ ﷺ! ہمیں اس بات کا تو علم ہو گیا، کہ آپ پر سلام (تشہد میں) کیسے پڑھا جائے۔ پس یہ فرمائیے: کہ درود کیسے پڑھیں، فرمایا: کہو:''اَللّٰھُمَّ صَلِّ علی محمّد'' ...... الحدیث .

علامہ البانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

---

[1] تلخیص الحبیر، جز:١، ص٢٦٨

[2] صحیح البخاری،بَابُ الصَّلاَۃِ عَلَی النَّبِیِّ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ،رقم:٦٣٥٧

« فَلَم یَخُصَّ تَشَهُّدًا دُونَ تَشَهُّدٍ. فَفِیهِ دَلِیلٌ عَلٰی مَشرُوعِیَّةِ الصَّلَاةِ عَلَیهِ فِی التَّشَهُّدِ الْأَوَّلِ أَیضًا. وَ هُوَ مَذهَبُ الِامَامِ الشَّافِعِی، کَمَا نَصَّ عَلَیهِ فِی کِتَابِهِ الأمّ وَ هُوَ الصَّحِیحُ عِندَ أَصحَابِهٖ، کَمَا صَرَّحَ بِهِ النَّوَوِیُّ فِی المَجمُوعِ، (۳/۴۶۰) وَ قَد جَاءَ ت أَحَادِیثُ کَثِیرَةٌ فِی الصَّلَاةِ عَلَیهِ فِی التَّشَهُّدِ، وَ لَیسَ فِیهَا التَّخصِیصُ المُشَارُ إِلَیهِ، بَل هِیَ عَامَّةٌ تَشمَلُ کُلَّ تَشَهُّدٍ...... وَ لَیسَ لِلمَانِعِینَ المُخَالِفِینَ أَیَّ دَلِیلٍ یُحتَجُّ بِهٖ »[1]

یعنی رسول اللہ ﷺ نے درود پڑھنے کے لیے کسی ایک ''تشہد'' کو خاص نہیں کیا۔ پس اس حدیث میں اس بات کی دلیل ہے، کہ پہلے تشہد میں بھی درود پڑھنا مشروع ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ کا مسلک بھی یہی ہے جس طرح کہ ''الام'' میں منصوص ہے اور امام شافعی رحمہ اللہ کے اصحاب کے نزدیک بھی یہی بات صحیح ہے جس طرح کہ نووی نے ''المجموع''(۳/۴۶۰) میں تصریح کی ہے۔ نیز بہت سی احادیث میں تشہد میں آپ ﷺ پر درود کا تذکرہ موجود ہے، لیکن ان میں مشارٌ الیہ تخصیص کا نام ونشان تک نہیں، بلکہ وہ عام اور ہر تشہد کو شامل ہیں اور مخالفین کے پاس قابلِ احتجاج کوئی دلیل موجود نہیں۔

مانعین کے دلائل کا جائزہ:

اس سلسلے میں مانعین کے بھی چند دلائل ہیں۔ ان کا جائزہ لینا بھی ضروری ہے۔ جس طرح کہ سائل نے بھی ان کی نشاندہی کی ہے۔ چنانچہ ''سنن ابوداؤد'' میں حدیث ہے:

« عَنِ النَّبِیِّ ﷺ کَانَ فِی الرَّکعَتَینِ الاولَیَینِ کَأَنَّهٗ عَلَی الرَّضفِ. قَالَ: قُلنَا: حَتّٰی یَقُومَ. قَالَ: حَتّٰی یَقُومَ »[2]

یعنی نبی ﷺ پہلی دو رکعتوں میں ایسے ہوتے تھے، گویا کہ گرم پتھر پر ہیں۔ ہم کہتے ابھی اٹھے۔''

اور ترمذی کی روایت میں ہے، شعبہ نے کہا: پھر سعد نے کسی شے کے ساتھ اپنے ہونٹوں کو حرکت دی۔ پس میں نے کہا ''حتی یقوم'' وہ بھی کہہ رہے تھے «حتی یقوم» امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اہلِ علم کا

---

[1] صفة الصلوٰة، ص: ۱۴۲۔۱۴۳

[2] سنن أبی داؤد، بَابٌ فِی تَخفِیفِ الْقُعُودِ، رقم: ۹۹۵، سنن الترمذی، بَابُ مَا جَاءَ فِی مِقْدَارِ الْقُعُودِ فِی الرَّکْعَتَیْنِ الْأُولَیَیْنِ، رقم: ۳۶۶

عمل اس حدیث کے مطابق ہے۔ وہ اس بات کو پسند کرتے ہیں، کہ آدمی پہلی دو رکعتوں میں زیادہ دیر نہ بیٹھے اور پہلی دو رکعتوں میں تشہد سے زیادہ کچھ نہ پڑھے۔ اگر کسی نے تشہد پر اضافہ کیا، تو اس پر دو ''سجودِ سہو'' لازم ہو جاتے ہیں۔ اس طرح شعبی وغیرہ سے بیان کیا گیا ہے۔ نیز امام ترمذی حدیث ہذا پر حکم لگاتے ہوئے رقمطراز ہیں۔

« هٰذَا حَدِيثٌ حَسَنٌ إِلَّا أَنَّ أَبَا عُبَيْدَةَ، لَمْ يَسْمَعْ مِنْ أَبِيهِ .»

یعنی یہ حدیث حسن درجہ کی ہے۔ البتہ ابوعبیدہ کا اپنے باپ (عبد اللہ) سے سماع ثابت نہیں۔''

اور عمرو بن مُرّۃ کا بیان ہے۔ میں نے ابوعبیدہ سے دریافت کیا۔ کہ تجھے عبد اللہ سے کوئی شے یاد ہے؟ کہا: مجھے کوئی شئی یاد نہیں۔ عون المعبود (۱/ ۳۷۸) اور حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

« وَهُوَ مُنْقَطِعٌ لِأَنَّ أَبَا عُبَيْدَةَ لَمْ يَسْمَعْ مِنْ أَبِيهِ » [1]

یعنی یہ حدیث منقطع ہے۔ اس لیے کہ ابوعبیدہ کا اپنے باپ سے سماع ثابت نہیں۔

لہٰذا یہ روایت قابلِ حجت نہ ٹھہری اور جہاں تک تعلق ہے اس روایت کا جو ''مسند احمد'' اور ''ابن خزیمہ'' میں ہے۔ جس میں حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

''رسول اللہ ﷺ نے ان کو تشہد کی تعلیم دی پس جب وہ (درمیانہ قعدہ) میں بیٹھتے اور (آخری قعدہ) میں بیٹھتے، تو بائیں ران پر بیٹھتے۔«اَلتَّحِيَّاتُ لِلّٰهِ .... عَبْدُهٗ وَرَسُولُهٗ» تک پڑھتے۔ پھر اگر درمیانے قعدہ میں ہوتے تو صرف تشہد پڑھ کر کھڑے ہو جاتے اور اگر اخیر میں ہوتے، تو تشہد کے بعد اللہ سے جو چاہتے دعا مانگتے۔ پھر سلام پھیرتے۔'' [2]

روایت ہذا واضح طور پر اس بات پر دال ہے، کہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے (قعدہ اُولیٰ) میں صرف تشہد پر اکتفاء کی ہے، لیکن روایت موقوف ہے۔ مرفوع نہیں۔ صاحب ''المرعاۃ'' فرماتے ہیں: امام ابوحنیفہ نے اسی بات کو اختیار کیا، لیکن امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک دُرود کا اضافہ بھی درست ہے۔ پھر وہ اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

« اَلظَّاهِرُ أَنْ لَا يَزِيدَ عَلَى التَّشَهُّدِ، لٰكِنْ لَوْ زَادَ يَجِبُ عَلَيْهِ سَجْدَتَا السَّهْوِ لِأَنَّهٗ لَمْ يَقُمْ دَلِيلٌ شَرْعِيٌّ عَلٰى وُجُوبِ سَجْدَةِ السَّهْوِ عَلٰى مَا زَادَ عَلَى التَّشَهُّدِ فِي الْقَعْدَةِ

---

[1] تلخیص الحبیر: جز ۱، ص: ۲۶۳

[2] التلخیص: ۱/ ۲٦٤، صحیح ابن خزیمة، بَابُ الِاقْتِصَارِ فِي الْجِلْسَةِ الْأُولٰى عَلَى التَّشَهُّدِ، ...... الخ، رقم: ۷۰۸، مسند احمد، رقم: ٤٣٨٢

الاولیٰ »(۱/۶۷۱)

یعنی ''ظاہر بات یہ ہے، کہ نمازی تشہد پر اضافہ نہ کرے۔ لیکن اگر کوئی اضافہ کردے، تو اس پر سجودِ سہو واجب نہیں، کیونکہ کوئی شرعی دلیل اس بات پر قائم نہیں ہوسکی، کہ (قعدۂ اولیٰ) میں تشہد پر زیادتی کی صورت میں سجدۂ سہو لازم ہے۔''

جملہ دلائل سے ظاہر ہے کہ علامہ موصوف کا استدلال صرف شواہد پر مبنی ہے۔ بطورِ خاص کوئی صحیح مستند موجود نہیں۔ جب کہ دوسری جانب واضح موقف ہے۔ جو مُصَرَّح دلائل (واضح دلائل) پر موقوف ہے۔ مزید آنکہ 'المنتقیٰ، بَابُ مَا جَاءَ فِي الصَّلٰوةِ عَلٰی رَسُولِ اللّٰهِ ﷺ' میں حدیث ہے:

« فَقَالَ لَهُ بَشِيرُ بْنُ سَعِدٍ: اَمَرَنَا اللّٰهُ اَن نُّصَلِّيَ عَلَيكَ فَكَيفَ نُصَلِّي عَلَيكَ؟ ثُمَّ قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ: قُولُوا اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ......»[1]

یعنی بشیر بن سعد رضی اللہ عنہ نے آپ ﷺ سے دریافت کیا، کہ اللہ نے ہمیں آپ پر درود کا حکم دیا ہے ہم آپ پر کیسے درود بھیجیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کہو:«اَللّٰهُمَّ صَلِّ علی محمدٍ ......»الخ

اور ''مسند احمد'' میں ہے:« فَكَيفَ نُصَلِّي عَلَيكَ، إِذَا نَحنُ صَلَّينَا فِي صَلَاتِنَا؟»[2] یعنی جب ہم نماز پڑھیں تو اپنی نمازوں میں آپ پر کیسے درود بھیجیں؟'' مقامِ ہذا توضیح و تفصیل کا محل ہے۔ پہلے اور دوسرے (قعدہ) میں درود پڑھنے کے اعتبار سے فرق کی وضاحت نہ کرنا، عمومِ جواز کی دلیل ہے اور علومِ فقہ میں قاعدہ معروف ہے:« تَاخِيرَ البَيَانِ عَن وَقتِ الحَاجَةِ لَا يَجُوزُ .»یعنی ضرورت کے وقت کسی شے کی وضاحت نہ کرنا ناجائز ہے۔

اس سے معلوم ہوا پہلے تشہد میں درود پڑھنا جائز ہے۔ واضح ہو کہ علماء کا ایک گروہ نماز میں درود کے وجوب کا قائل ہے، جب کہ جمہور علماء عدمِ وجوب کے قائل ہیں۔ علامہ شوکانی رحمہ اللہ نے عدمِ وجوب کو اختیار کیا ہے۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو! ''نیل الأوطار'' (۲/۲۹۵۔۲۹۶)

درمیانی قعدہ میں درود شریف پڑھنا:

سوال: درمیانی قعدہ میں کیا درود شریف پڑھنا ضروری ہے۔ علامہ البانی رحمہ اللہ کے مطابق درود شریف نہ

[1] سنن أبی داؤد، بَابُ الصَّلَاةِ عَلَى النَّبِيِّ ﷺ بَعدَ التَّشَهُّدِ، رقم: ۹۸۰، سنن الترمذی، رقم: ۳۲۲۰، سنن الدارمی، رقم: ۱۳۸۲

[2] مسند احمد، رقم: ۱۷۰۷۲

پڑھنے والے کا موقف بے دلیل ہے کیا یہ صحیح ہے؟

(جواب): پہلے ''تشہد'' میں درود پڑھنے کے لیے علامہ البانی کا استدلال عام حدیث« فَكَيْفَ نُصَلِّي عَلَيْكَ؟ قَالَ: قُولُوا: اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ......»[1] سے ہے، جب کہ مخالفین کا استدلال بھی چند ایک روایات پر مبنی ہے۔ مثلاً ''مسند احمد'' اور ابن خزیمہ نے ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، کہ رسول اللہ ﷺ نے ان کو تشہد سکھایا۔ پس جب وہ درمیانہ قعدہ میں بیٹھتے اور آخر قعدہ میں بیٹھتے، تو بائیں ران پر بیٹھتے اور تشہد ''عبدہ و رسولہ'' تک پڑھتے۔ پھر اگر درمیانے قعدہ میں ہوتے تو صرف تشہد پڑھ کر کھڑے ہو جاتے اور اگر اخیر میں ہوتے، تو تشہد کے بعد جو اللہ چاہے دعا مانگتے۔ پھر سلام پھیرتے اور دوسری روایت میں ابن مسعود رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔ فرمایا:

« كَانَ النَّبِيُّ ﷺ فِي الرَّكْعَتَيْنِ الْاُولَيَيْنِ، كَأَنَّهُ عَلَى الرَّضْفِ حَتّٰى يَقُومَ »[2]

''نبی ﷺ پہلی دو رکعتوں میں بیٹھتے گویا کہ گرم پتھر پر ہوں۔''

لیکن روایت ہذا منقطع ہے۔ کیونکہ ابو عبیدہ کا سماع اپنے باپ سے ثابت نہیں۔ ''ابن ابی شیبہ'' میں تمیم بن سلمہ کے طریق سے ہے، کہ

«كَانَ اَبُو بَكْرٍ اِذَا جَلَسَ فِي الرَّكْعَتَيْنِ، كَأَنَّهُ عَلَى الرَّضْفِ ۔ إِسْنَادُهُ صَحِيحٌ وَ رُوِيَ عَنِ ابْنِ عُمَرَ نَحْوَهُ.»

''حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ جب دو رکعتوں میں بیٹھتے، تو گویا وہ گرم پتھر پر ہوتے۔ اس کی سند صحیح ہے۔ اسی طرح ابن عمر رضی اللہ عنہما سے بھی مروی ہے۔ لیکن پہلا مسلک اولیٰ معلوم ہوتا ہے۔''

پہلے تشہد میں درود افضل یا غیر افضل؟

(سوال): تین یا چار رکعتی نماز میں دوسری رکعت میں تشہد پڑھنے کے بعد درود پڑھنا جائز ہے یا نہیں افضل ہے یا غیر افضل؟

(جواب): عمومِ حدیث کی بناء پر جواز ہے۔«قُولُوا اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ...... »[3]

---

[1] صحیح البخاری،بَابُ الصَّلَاةِ عَلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ،رقم:٦٣٥٧

[2] سنن أبی داؤد،بَابٌ فِي تَخْفِيفِ الْقُعُودِ،رقم:٩٩٥، سنن الترمذی،بَابُ مَا جَاءَ فِي مِقْدَارِ الْقُعُودِ فِي الرَّكْعَتَيْنِ الْأُولَيَيْنِ.،رقم:٣٦٦

[3] صحیح البخاری،بَابُ الصَّلَاةِ عَلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ،رقم:٦٣٥٧

پہلے تشہد میں درودِ ابراہیمی واجب ہے؟

(سوال) : پہلے تشہد میں درودِ ابراہیمی پڑھنا چاہیے یا نہیں؟ بعض لوگ وجوب کی حد تک قائل ہیں۔ دلیل یہ دیتے ہیں کہ حدیث میں پہلے اور آخری کی کوئی تمیز نہیں ہے اس لیے ضروری ہے اور بعض نفی کرتے ہیں؟

(جواب) : عمومِ حدیث«فَقُولُوا» کے اعتبار سے پہلے تشہد میں درود پڑھنے کا جواز ہے، جب کہ مخالف جانب کے بھی کچھ دلائل ہیں، اگرچہ بعض میں کلام ہے۔ بہر صورت مسئلہ ہذا میں تشدد نہیں اختیار کرنا چاہیے۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو!''مرعاۃ المفاتیح'' (۱/۶۷۱)، ''فتاویٰ اہل حدیث'' (۲/۱۸۷)

قعدۂ اوّل میں تشہد کے بعد درود اور دعائیں:

(سوال) : چار رکعت نماز یعنی ظہر و عصر وغیرہ میں دو رکعت کے بعد قعدے میں کیا صرف تشہد ہی پڑھنا ہوتا ہے یا درود اور دعاء وغیرہ بھی، جیسے کہ آخری قعدے میں پڑھا جاتا ہے۔ براہ مہربانی فتوی کو احادیث صحیحہ سے مزین کریں۔

(جواب) : قعدۂ اوّل میں تشہد کے بعد درود اور دعائیں پڑھنی بھی جائز ہیں۔ چنانچہ متعدد روایات میں موجود ہے، کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کی ہمیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر (تشہد میں) سلام کا تو علم ہو گیا ہے، فرمائیے! درود کیسے بھیجیں؟ فرمایا: کہو''اللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّد......الحديث''[1]

حدیث ہذا عموم کے اعتبار سے دونوں تشہدوں کو شامل ہے۔ اور دوسری روایت میں ہے:

« وَ يُصَلِّيْ تِسْعَ رَكَعَاتٍ لَا يَجْلِسُ بَيْنَهُنَّ إِلَّا عِنْدَ الثَّامِنَةِ، وَ يَحْمَدُ اللّٰهَ، وَ يُصَلِّيْ عَلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَدْعُوْا بَيْنَهُنَّ، وَ لَا يُسَلِّمُ تَسْلِيْمًا»(النسائی طبع مجتبائی، ص:۲۵۰)[2]

''نبی صلی اللہ علیہ وسلم وتر نو رکعتیں پڑھتے۔ ان میں نہ بیٹھتے مگر آٹھویں رکعت میں۔ اللہ کی تعریف کرتے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجتے اور ان کے درمیان دعاء مانگتے، اور سلام کے بغیر کھڑے ہو جاتے۔''

موضوع ہذا پر ''الاعتصام'' میں اہلِ علم کے مفید تر مضامین شائع ہو چکے ہیں۔ مزید تفصیل کی ضرورت نہیں۔ تواریخ مع اسماء ملاحظہ فرمائیں!

---

[1] صحیح البخاری، کتاب الصلاۃ، بابُ الصَّلاۃِ عَلَی النَّبِیِّ ﷺ، رقم: ٦٣٥٧

[2] سن النسائی، کَیْفَ الْوِتْرُ بِتِسْعٍ، رقم: ١٧٢٠

۱۔ مولانا خالد جاوید اختر مرجالوی۔ ۱۷۔۲۴، نومبر ۸۹ء۔

۲۔ پیر محبّ اللہ شاہ۔ دسمبر ۱۹۸۹ء

۳۔ مولانا نیک محمد مرحوم۔ ۲۵۔ دسمبر ۱۹۸۹ء

(۲) بعض روایات میں ''تشہد اوّل'' میں بھی دعاء کا ذکر موجود ہے۔ چنانچہ سنن نسائی میں ہے:

«وَلْيَتَخَيَّرْ أَحَدُكُمْ مِنَ الدُّعَاءِ أَعْجَبَهُ إِلَيْهِ، فَلْيَدْعُ اللّٰهَ عزّوجل» (ص:۱۷٤۔طبع مجتبائی) [1]

''چاہیے کہ ایک تمہارا اپنی من پسند دعاء پڑھ کر اللہ سے مانگے۔''

قعدۂ اخیرہ میں درود واذکار

آخری تشہد میں درود کے بعد پڑھی جانے والی دعائیں کونسی ہیں؟

سوال: نماز کے آخری تشہد میں درود شریف کے بعد «رَبِّ اجعَلنِي ......الخ» اور «رَبَّنَا اٰتِنَا......الخ» کب اور کیسے شروع ہوا۔ اصل دعا کونسی ہے جو فرمانِ رسول ﷺ کے عین مطابق ہو؟

جواب: سلام پھیرنے سے قبل نبی ﷺ نے نمازی کو اختیار دیا ہے، جونسی دعا چاہے۔ پڑھ سکتا ہے۔ حدیث میں ہے: «ثُمَّ يَتَخَيَّرُ مِنَ الدُّعَاءِ أَعجَبَهُ إِلَيهِ، فَيَدعُوا» [2] پھر جو دعا نمازی کو زیادہ پسند ہو پڑھ لے۔''

منصوص بعض دعائیں ملاحظہ فرمائیں!

۱۔ اَللّٰهُمَّ اِنِّي اَعُوذُبِكَ مِن عَذَابِ القَبرِ، وَ اَعُوذُبِكَ مِن فِتنَةِ المَسِيحِ الدَّجَّالِ، وَاَعُوذُبِكَ مِن فِتنَةِ المَحيَا، وَ فِتنَةِ المَمَاتِ. اَللّٰهُمَّ اِنِّي اَعُوذُبِكَ مِنَ المَأثَمِ وَالمَغرِمِ. [3]

۲۔ اَللّٰهُمَّ اِنِّي ظَلَمتُ نَفسِي ظُلمًا كَثِيرًا. وَ لَا يَغفِرُ الذُّنُوبَ اِلَّا اَنتَ. فَاغفِرلِي مَغفِرَةً مِّن عِندَكَ، وَارحَمنِي. اِنَّكَ اَنتَ الغَفُورُ الرَّحِيمُ. [4]

---

[1] سنن النسائی، كَيفَ التَّشَهُّدُ الاَوَّلُ ،رقم: ۱۱۶۳، صحیح البخاری: بَابُ مَا يُتَخَيَّرُ مِنَ الدُّعَاءِ بَعدَ التَّشَهُّدِ وَلَيسَ بِوَاجِبٍ، رقم: ۸۳۵

[2] صحیح البخاری: بَابُ مَا يُتَخَيَّرُ مِنَ الدُّعَاءِ بَعدَ التَّشَهُّدِ وَلَيسَ بِوَاجِبٍ، رقم:۸۳۵

[3] صحیح البخاری، بَابُ الدُّعَاءِ قَبلَ السَّلَامِ، رقم: ۸۳۲

[4] صحیح البخاری، بَابُ الدُّعَاءِ قَبلَ السَّلَامِ، رقم: ۸۳٤

اختیارِ نبوی کی بناء پر سوال میں مُشارٌ اِلَیہ (یعنی جن کی طرف اشارہ کیا گیا ہے) اُدعیہ کو بھی پڑھا جا سکتا ہے۔ بالخصوص «رَبَّنَا آتِنَا...... » کو محدثین نے جامع دعا قرار دیا ہے۔ جامع سے مراد ہے، کہ الفاظ تھوڑے اور معانی بہت یا ایسی دعا جو مقصد اور مطلب کو جمع کرنے والی ہو۔

رسول اللہ ﷺ نے ایک لاغر مریض سے کہا تھا:

« أَفَلا قُلتَ : اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنيَا.....الخ، قَالَ : فَدَعَا اللّٰهَ بِهٖ، فَشَفَاهُ اللّٰهُ.» [1]

''پس تو نے کیوں نہ کہا؟ یا الٰہی! ہم کو دنیا میں بھلائی اور آخرت میں بھلائی دے.....الخ'' پس اس شخص نے اللہ سے یہ دعا مانگی، تو اللہ نے اسے صحت یاب کر دیا۔''

آخری تشہد میں درود کے بعد غیر ماثور دعاؤں کے اضافے سے بچنا:

سوال : فرض نماز یا سنتوں میں آخری رکعات میں درود شریف کے بعد عربی زبان میں مسنون دعاؤں کے ساتھ اپنی زبان ''اردو، یا پنجابی'' میں بھی دعا کر سکتے ہیں؟

جواب : نماز کے آخری تشہد میں درود کے بعد مسنون دعاؤں کے ساتھ غیر ماثور دعاؤں کے اضافے سے بچنا چاہیے۔ بالخصوص غیر عربی دعاؤں کا قطعاً کوئی ثبوت نہیں۔ کیونکہ نماز کی زبان عربی ہے، جسے ترک کرنے کی دلیل کی ضرورت ہے، جو درحقیقت میسر نہیں۔

تشہد اخیری میں حدث ہو جائے تو......؟

سوال : شنید ہے کہ بعض کتب فقہ میں مندرج ہے کہ اگر کوئی نمازی فرض یا نفل نماز پڑھ رہا ہو۔ تشہد اخیری میں حدث ہو جائے یعنی وضو ٹوٹ جائے تو اس کی نماز مکمل ہو جاتی ہے اور اُسے دوبارہ ادا کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ کیا یہ سچ ہے اور کس حد تک قرآن و سنت سے یہ مسئلہ مطابقت رکھتا ہے؟

جواب : فقہ حنفی میں یہ مسئلہ معروف ہے، کہ تشہد کے اخیر میں مصلّی (نمازی) سے اگر کوئی فعل نماز کے منافی صادر ہو جائے، تو وہ نماز سے فارغ سمجھا جائے گا۔ اس کی بناء انھوں نے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ایک روایت پر رکھی ہے جس کے الفاظ یوں ہیں:

« اِذَا قُلتَ هٰذَا: وَقَضَيتَ هٰذَا . فَقَد قَضَيتَ صَلَاتَكَ . إِن شِئتَ أَن تَقُومَ، فَقُم . وَ

---

[1] صحیح مسلم، بَابُ كَرَاهَةِ الدُّعَاءِ بِتَعجِيلِ العُقُوبَةِ فِي الدُّنيَا، رقم:۲۶۸۸، بحوالہ مشکوٰۃ باب جامع الدعا

إن شِئتَ أَن تَقعُدَ . فَاقعُد. رَوَاهُ أَحمَدُ، وَ أَبُودَاؤدُ، وَالدَّارَقُطنِي. وَ قَالَ: الصَّحِيحُ أَنَّ قَولَهٗ: « إِذَا قَضَيتَ هٰذَا، فَقَد قَضَيتَ صَلَاتَكَ، مِن كَلَامِ ابنِ مَسعُودٍ (رَضِيَ اللّٰهُ عَنهُ). وَ فَصَّلَهٗ شَبَابَةُ، عَن زُهَيرٍ. وَ جَعَلَهٗ مِن كَلَامِ ابنِ مَسعُودٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنهُ وَ قَولُهٗ أَشبَهُ بِالصَّوَابِ مِمَّن أَدرَجَهٗ. فَقَد اتَّفَقَ مَن رَوٰى تَشَهُّدَ ابنِ مَسعُودٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنهُ عَلٰى حَذفِهٖ» (1)

یعنی جب تو یہ کہہ دے اور اسے پورا کرے، تو تُو نے نماز مکمل کر لی۔ اگر اٹھنا چاہتا ہے، تو اُٹھ کھڑا ہو اور اگر بیٹھنا چاہتا ہے، تو بیٹھا رہے۔ احمد، اَبوداؤد اور دارقطنی نے اسے روایت کیا ہے۔ ''دارقطنی'' نے کہا، کہ صحیح بات یہ ہے، کہ ''إِذَا قَضَيتَ هٰذَا، فَقَد قَضَيتَ صَلَاتَكَ'' ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا کلام ہے اور شبابہ نے زہیر سے جداگانہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے کلام سے بیان کیا ہے اور صاحب ''المنتقی'' فرماتے ہیں کہ زیادہ درست بات یہی ہے بہ نسبت ان لوگوں کے جنھوں نے اسے ''مدرج'' قرار دیا ہے اور جن لوگوں نے ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے تشہد کو ذکر کیا ہے، سب اس کے حذف پر متفق ہیں۔

بلکہ امام بیہقی رحمہ اللہ نے اَبوالأحوص کے طریق سے عن ابن مسعود رضی اللہ عنہ جو کچھ بیان کیا ہے اس زیادتی کے مخالف ہے۔ فرمایا:

«مِفتَاحُ الصَّلٰوةِ التَّكبِيرُ، وَانقِضَاءُ هَا التَّسلِيمُ. إِذَا سَلَّمَ الِامَامُ فَقُم، إِن شِئتَ»

''نماز کا آغاز تکبیر سے ہے اور اختتام تسلیم سے۔ جب امام سلام پھیرے اگر تو چاہتا ہے، تو کھڑا ہو جا۔''

امام بیہقی رحمہ اللہ نے ''المعرفۃ'' میں کہا ہے۔ حُفّاظ اس طرف گئے ہیں، کہ یہ زہیر بن معاویہ کا وَہم ہے۔

اور امام نووی رحمہ اللہ نے ''الخلاصۃ'' میں فرمایا: ''اُتَّفِقَ عَلٰى أَنَّهَا مُدرَجَة'' یعنی سب حفاظ اس بات پر متفق ہیں، کہ یہ جملہ ''مُدرَج'' ہے۔ یعنی کسی راوی نے اپنی طرف سے اس کو حدیث میں داخل کر دیا ہے۔ اس کی مؤید ابن عمر رضی اللہ عنہما سے بھی ایک روایت مرفوعاً مروی ہے۔

«إِذَا أَحدَثَ الرَّجُلُ. وَ قَد جَلَسَ فِي آخِرِ صَلَاتِهٖ قَبلَ أَن يُّسَلِّمَ، فَقَد جَازَت صَلَاتُهٗ.» (رواه ابوداؤد) (2)

''یعنی آدمی جب نماز کے اخیر میں سلام پھیرنے سے پہلے بے وضو ہو جائے، تو اس کی نماز

---

(1) اَلمُنتَقٰی : باب فی کون السلام فرِیضة

(2) سنن الترمذی، بَابُ مَا جَاءَ فِي الرَّجُلِ يُحدِثُ فِي التَّشَهُّدِ، رقم: ۴۰۸

درست ہے۔'' لیکن اس کی سند کمزور ہے۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:« ليس إسناده بذاك القوى.»

اس میں راوی عبد الرحمٰن (ناقابلِ اعتماد)، جب کہ دوسری طرف فقہاء و محدثین اور اصحاب مذاہب متبوعہ اس طرف گئے ہیں، کہ نماز سے فراغت کے لیے سلام پھیرنا ضروری ہے۔ ان کا استدلال حضرت علی رضی اللہ عنہ کی حدیث سے ہے۔

« وَتَحلِيلُهَا التَّسلِيمُ » رواه الخمسة اِلَّا النَّسَائِي. وَقَالَ التِرمَذِيُّ: هٰذَا أَصَحُّ شَیءٍ فِي هٰذَا البَابِ، وَ أَحسَنُ.»[1]

اگر چہ اس روایت میں بھی کلام ہے، لیکن امام شوکانی رحمہ اللہ اس کے طُرق کے بارے میں فرماتے ہیں:

« وَهٰذِهِ الطُّرُقُ يُقَوِّي بَعضُهَا بَعضًا. فَيَصلُحَ الحَدِيثُ لِلاحتِجَاجِ بِهِ.»[2]

''حدیث ہذا کے بعض طُرق بعض کے لیے تقویت کا باعث ہیں۔ لہٰذا یہ حدیث قابلِ حجت ہے۔''

اور علامہ البانی نے اس کو صحیح قرار دیا ہے۔ بحث کے اخیر میں فرماتے ہیں:

« لٰكِنَّ الحَدِيثَ صَحِيحٌ بِلَا شَكٍّ. فَإِنَّ لَهٗ شَوَاهِدَ يَرقٰى بِهَا إِلٰى دَرَجَةِ الصِّحَّةِ»[3]

''حدیث ہذا بدونِ شک صحیح ہے۔ اس کے شواہد موجود ہیں، جو اس کو درجۂ صحت تک پہنچا دیتے ہیں۔''

دلائل کے اعتبار سے یہی مسلک راجح ہے۔

قعدۂ اخیرہ میں درود شریف پڑھنے کا حکم:

سوال: کیا قعدۂ اخیرہ میں درود شریف پڑھنا کسی حدیث سے واضح طور پر ثابت ہے؟ نبی کریم ﷺ کے قول، فعل یا تقریر سے باحوالہ وضاحت فرما دیں، نیز اگر کسی صحابی کا عمل بھی ہو تو اُس کا حوالہ دے دیں۔ اس وضاحت کی ضرورت اس لیے پیش آئی ہے کہ بعض لوگوں کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ درود شریف کے بغیر بھی نماز ہو جاتی ہے۔ آپ سے درخواست ہے کہ اس قول کی بھی وضاحت فرما دیں۔ جَزَاكُمُ اللّٰهُ فِي الدَّارَينِ

جواب: ''صحیح بخاری بَابُ الصَّلَاةِ عَلَى النَّبِيِّ ﷺ کے تحت حدیث میں کعب بن عجرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں، کہ نبی اکرم ﷺ ہمارے پاس تشریف لائے۔ ہم نے عرض کی: یا رسول اللہ ﷺ! ہمیں یہ تو معلوم ہو گیا، کہ

[1] سنن أبي داؤد، بَابُ الْإِمَامِ يُحدِثُ بَعدَ مَا يَرفَعُ رَأسَهُ مِنْ آخِرِ الرَّكْعَةِ، رقم: ٦١٨

[2] نيل الأوطار: ١٧٩/٣

[3] إرواء الغليل: ٩/٢

آپ پر سلام کیسے بھیجنا ہے۔ اب یہ فرمایئے: کہ آپ پر ''درود'' کیسے پڑھیں؟ فرمایا: ''کہو!
«اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ...... الخ »[1]

الفاظ حدیث سے ظاہر ہو رہا ہے، کہ جب سلام کا تعلق ''تشہد نماز'' سے ہی ہے، تو ''درود'' کا تعلق بھی نماز سے ہے جس کی یہاں تعلیم دی گئی ہے۔ حدیث ہذا عموم کے اعتبار سے دونوں تشہدوں کو شامل ہے۔
دوسری روایت میں ہے، کہ نبی ﷺ نے ایک آدمی کو دیکھا، کہ نماز میں تمجید وتحمید کے بغیر دعا کرنے لگا۔ فرمایا: ''اس نے جلدی کی۔'' پھر آپ ﷺ نے اُسے بلایا، اور فرمایا: ''جب تم میں سے کوئی شخص نماز پڑھے، تو چاہیے کہ پہلے اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا کرے، پھر درود بھیجے۔'' ایک روایت میں ہے: ''چاہیے کہ نبی ﷺ پر درود بھیجے۔ پھر جو چاہے دعا کرے۔''[2]

یہ حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے، کہ اس تشہد میں بھی نبی ﷺ پر درود بھیجنا واجب ہے، کیونکہ آپ نے اس بات کا حکم دیا ہے۔ امام شافعی اور امام احمد (دو روایتوں میں سے آخری روایت کے مطابق) وجوب کے قائل ہیں اور ان سے پہلے صحابہ رضی اللہ عنہم وغیرہ سے بھی ایک جماعت اسی بات کی قائل ہے۔[3]
وجہِ استدلال یہ ہے، کہ عام حالات میں چونکہ دعاوں کا محل نماز کا آخری حصہ ہے اور اسی اثناء میں درود کا حکم دیا گیا ہے۔ معلوم ہوا کہ آخری قعدہ میں درود پڑھنا چاہیے۔ میرے نزدیک زیادہ احتیاط والا مسلک یہی ہے کہ قعدہ اخیرہ میں درود شریف کو واجب قرار دیا جائے۔ حضرت عمر، ابن عمر، ابن مسعود، جابر بن زید رضی اللہ عنہم، شعبی، محمد بن کعب قرضی، ابوجعفر، شافعی، احمد بن حنبل، اسحاق، ابن اعواز رحمہم اللہ وجوب کے قائل ہیں، قاضی ابن العربی نے بھی اسی مسلک کو اختیار کیا ہے۔ دوسری طرف بہت سے اہلِ علم عدمِ وجوب کے قائل ہیں کہ درود کے بغیر بھی نماز ہو جاتی ہے۔ ان کے دلائل اپنی جگہ موجود ہیں، لیکن احتیاطی مذہب وجوب کا ہی معلوم ہوتا ہے۔

تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو! مرعاۃ المفاتیح (١/ ٦٧٤ تا ٦٧٦) اور ''فتح الباری''(١١/ ١٦٤)

تشہد میں درود کے بعد دعاؤں کا آغاز کس دعا سے کریں؟

سوال: تشہد میں درود کے بعد کیا دعاؤں کا آغاز «رَبِّ اجعَلنِی» سے کرنا چاہیے؟

---

① صحیح البخاری، بَابُ الصَّلاَةِ عَلَی النَّبِیِّ صَلَّی اللهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ، رقم: ٦٣٥٧

② سنن أبی داؤد، بَابُ الدُّعَاءِ، رقم: ١٤٨١، المستدرك علی الصحیحین للحاکم، رقم: ٨٤٠ و صححه

③ صفة الصلاة، ص ١٦٢

(جواب): جیسے چاہے پڑھ سکتا ہے۔ حدیث میں اس وقت جملہ دعاوں کا اختیار دیا گیا ہے، ارشاد ہے:

« ثُمَّ يَتَخَيَّرُ مِنَ الدُّعَاءِ، أَعجَبَهُ إِلَيهِ »[1]

سلام پھیرتے وقت نمازیوں، امام اور فرشتوں کی نیت کرنا:

(سوال): سلام پھیرتے وقت نمازیوں، امام اور فرشتوں کی نیت کرنا چاہیے یا نہیں؟

(جواب): سب کی ''نیت'' کرنا درست ہے۔ حضرت سمرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

« قَالَ أَمَرَنَا رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَنْ نَرُدَّ عَلَى الْإِمَامِ، وَأَنْ نَتَحَابَّ، وَأَنْ يُسَلِّمَ بَعْضُنَا عَلَى بَعْضٍ »[2]

بقیہ نماز کے لیے امام کے دونوں سلام پھیرنے کے بعد کھڑا ہوا جائے؟

(سوال): امام صاحب جب نماز سے ایک طرف سلام کہتے ہیں، تو جن لوگوں کی دو یا ایک رکعت رہی ہو وہ فوراً کھڑے ہو جاتے ہیں۔ کیا دونوں طرف سلام کہنے کے بعد کھڑا ہونا چاہیے یا ایک طرف؟

(جواب): امام دونوں طرف سلام پھیرے تو پھر مقتدی کو بقیہ نماز کی تکمیل کے لیے کھڑے ہونا چاہیے حدیث میں ہے: « تَحرِيمُهَا التَّكبِيرُ وَ تَحلِيلُهَا التَّسلِيمُ »[3]

نماز کے بعد اذکار و وظائف

وِرد کا اسلام میں کیا تصور ہے؟

(سوال) وِرد کا اسلام میں کیا تصور ہے؟ اور کسی آیت کا ورد کرنا مقصود ہو تو کیا طریقہ ہے؟

(جواب) ورد وظائف کرنے کی کتاب وسنت میں ترغیب وارد ہے۔ بعض کے لئے اوقات کا تعین ہے اور بعض کو علی الاطلاق چھوڑا گیا ہے۔ اسی طرح بعض اذکار میں گنتی کا تعین ہے، جبکہ بعض میں گنتی کی تصریح نہیں، احادیث میں جس انداز سے وظائف وارد ہوئے ہیں، اس طرح ہونے چاہئیں، اپنی طرف سے کمی بیشی کی اجازت نہیں۔

---

[1] صحیح البخاری: بَابُ مَا يُتَخَيَّرُ مِنَ الدُّعَاءِ بَعْدَ التَّشَهُّدِ وَلَيْسَ بِوَاجِبٍ، رقم: ۸۳۵

[2] سنن أبی داؤد، بَابُ الرَّدِّ عَلَى الْإِمَامِ، رقم: ۱۰۰۱

[3] جامع ترمذی، باب ماجاء ان مفتاح الصلوۃ الطهور (سنن أبی داؤد، بَابُ الْإِمَامِ يُحدِثُ بَعْدَ مَا يَرْفَعُ رَأْسَهُ مِنْ آخِرِ الرَّكْعَةِ، رقم: ۶۱۸

نماز کے بعد ذکر بالجہر کا جواز:

سوال: نماز کے بعد ذکر بالجہر کا کیا جواز ہے؟

جواب: نمازیوں کو تنگی و تکلیف کے پیشِ نظر نماز کے بعد (تکبیر کے سوا) عام ذکر اذکار آہستہ ہونا چاہیے۔ اگر چہ جہر کا جواز موجود ہے لیکن جہر سے مراد بہت زیادہ باآواز بلند نہیں۔ جس طرح اہلِ بدعت کی عادت ہے۔ حدیث میں ہے: «إِربَعُوا عَلٰی أَنفُسِکُم، فَإِنَّکُم لَا تَدعُونَ أَصَمَّ، وَ لَا غَائِبًا......» [1]

دوسری طرف ائمہ اربعہ مطلقاً عدمِ جہر کے قائل ہیں۔ ابن بطال اور دیگر اہلِ علم نے نقل کیا ہے، کہ

« إِنَّ أَصحَابَ المَذَاهِبِ المَتبُوعَةِ وَ غَیرَهُم مُتَّفِقُونَ عَلٰی عَدَمِ استِحبَابِ رَفعِ الصَّوتِ بِالتَّکبِیرِ، وَالذِّکرِ » [2]

فرض نماز کے بعد اذکارِ مسنونہ کا جہر غیر مفرط (یعنی آہستہ آواز) کے ساتھ کرنا:

سوال: ہمارے یہاں کے حنفی بریلوی ہر نماز کے بعد جو تین دفعہ اونچی آواز سے کلمہ پڑھتے ہیں کیا وہ حدیث سے ثابت ہے؟ کیا اس کے متعلق مسند امام اعظم میں بھی کچھ لکھا ہے۔ تفصیل سے جواب دیں کیونکہ میں نے حصن حصین میں نماز کی دعاؤں کے بارے میں پڑھا تھا جو کہ نماز کے بعد پڑھی جاتی ہیں۔ اس میں امام جزری نے اس کے متعلق کچھ نہیں لکھا۔

جواب: مذاہب اربعہ اس بات پر متفق ہیں، کہ فرض نماز کے بعد ذکر اذکار سرّی ہونا چاہیے۔ امام ابن بطال وغیرہ فرماتے ہیں: « أَصحَابُ المَذَاهِبِ المَتبُوعَةِ، وَ غَیرِهِم مُتَّفِقُونَ عَلٰی عَدَمِ استِحبَابِ رَفعِ الصَّوتِ بِالتَّکبِیرِ، وَالذِّکرِ » [3]

''مروجہ مذاہب ذکر و تکبیر کی آواز بلند نہ کرنے پر متفق ہیں۔''

اسی طرح ''مشکوٰۃ'' کے حواشی میں علامہ ملا علی قاری حنفی سے منقول ہے:

« نَصَّ بَعضُ عُلَمَائِنَا، بِأَنَّ رَفعَ الصَّوتِ فِی المَسَاجِدِ حَرَامٌ، وَ لَو بِذِکرٍ .»

یعنی ہمارے بعض علماء نے تصریح کی ہے کہ مسجدوں میں آواز بلند کرنا حرام ہے۔ اگر چہ اللہ کا ذکر کرنا ہی مقصود کیوں نہ ہو۔

---

[1] صحیح البخاری، بَابُ مَا یُکرَهُ مِنْ رَفعِ الصَّوْتِ فِی التَّکْبِیرِ، رقم:۲۹۹۲، صحیح مسلم، رقم:۲۷۰٤

[2] مرعاۃ المصابیح: ۱/ ۷۱٦

[3] المرعاۃ:۱/۷۱٦

لیکن راجح بات یہ ہے، کہ اذکارِ مسنونہ کا جہر غیر مفرط (یعنی آہستہ آواز) کے ساتھ ذکر کا جواز ہے۔ لیکن اجتماعی شکل وصورت میں نہیں۔ جس طرح کہ اہل بدعت کی عادت ہے۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو! مرعاۃ المفاتیح (۷۱۶/۱)

نماز کے بعد اذکار بلند آواز سے پڑھیں یا آہستہ:

(سوال): فرض نمازوں کے بعد جو اذکار پڑھے جاتے ہیں کیا وہ سب کے سب بلند آواز سے پڑھے جائیں گے یا انہیں سراً پڑھنا مسنون ہے؟ مثلاً نماز کے بعد ایک بار اللہ اکبر بلند آواز سے کہنا تو ثابت ہے کیا اَستَغفِرُ اللّٰهَ...... اَللّٰهُمَّ أَنتَ السَّلَامُ......رَبِّ اَعِنِّی عَلٰی ذِکرِكَ ......» وغیرہ مسنون اذکار جہراً پڑھے جائیں گے یا انہیں دل میں پڑھا جائے گا؟

(جواب): مسئلہ ہذا میں اہلِ علم کا اختلاف ہے۔ اکثر اہلِ علم عدم جواز کے قائل ہیں، جب کہ ایک گروہ جواز کا قائل ہے۔ بظاہر جواز ہے۔ چنانچہ ''صحیح بخاری میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں:

« اِنَّ رَفعَ الصَّوتِ بِالذِّکرِ حِینَ یَنصَرِفُ النَّاسُ مِنَ المَکتُوبَةِ، کَانَ عَلٰی عَهدِ النَّبِیِّ ﷺ »[1]

''نبی ﷺ کے زمانے میں لوگ فرض نمازوں سے فراغت کے وقت آواز بلند ذکر کرتے تھے۔''

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

« وَ فِیهِ دَلِیلٌ عَلٰی جَوَازِ الجَهرِ بِالذِّکرِ عَقِبَ الصَّلَاةِ »[2]

''اس حدیث میں نماز کے بعد جہری ذکر کا جواز ہے۔'' لیکن ذکر بہت اونچی آواز سے نہیں ہونا چاہیے۔ کیونکہ ''صحیح بخاری کی دوسری حدیث میں ہے:

« اِربَعُوا عَلٰی اَنفُسِکُم، فَاِنَّکُم لَا تَدعُونَ اَصَمَّ، وَ لَا غَائِبًا.»...... الحدیث[3]

مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو! مرعاۃ المفاتیح (۷۱۶/۱)

نماز کے بعد آیت الکرسی کا پڑھنا:

(سوال): نماز کے بعد آیت الکرسی کا پڑھنا کیا کسی صحیح حدیث سے ثابت ہے؟

---

[1] صحیح البخاری، باب الذکر بعد الصلوٰۃ، رقم: ۸۴۱

[2] فتح الباری: ۳۲۵/۲

[3] صحیح البخاری، بَابُ مَا یُکرَہُ مِن رَفعِ الصَّوتِ فِی التَّکبِیرِ، رقم: ۲۹۹۲

(جواب): حافظ ہیثمی نے اس کی سند کو حسن قرار دیا ہے۔[1] اور حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے ''بلوغ المرام'' میں ابن حبان سے اس کی صحت نقل کی ہے اور علامہ شوکانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اس بارے میں وارد ایک سند کو منذری نے صحیح اور ہیثمی نے اس کا جید ہونا نقل کیا ہے اور حافظ ابن قیم رحمہ اللہ نے ''زاد المعاد'' (۳۰۴/۱) میں کہا۔اس حدیث کے طُرق کو جمع کرنے سے پتہ چلتا ہے۔کہ اس کی کوئی اصل ہے۔بہرصورت روایت قابلِ حجت اور لائقِ عمل ہے۔تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو! تخریج صلوٰۃ الرسول ﷺ، ص: ۳۲۷۔

آیۃ الکرسی پڑھنے والی حدیث کا حکم:

(سوال): آیۃ الکرسی کے متعلق آپ کا فتویٰ ہے کہ نماز کے بعد پڑھنے والی حدیث ضعیف ہے۔لیکن بلوغ المرام میں حافظ ابن حجر رحمہ اللہ اور ابن حبان رحمہ اللہ نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔ برائے مہربانی اس حدیث کے متعلق اچھی طرح وضاحت فرمادیں۔امام نسائی کے نزدیک بھی یہ حدیث صحیح ہے۔

(جواب): حدیث ہذا شواہد کی بناء پر صحیح ہے۔تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو! تلمیذ رشید حافظ عبدالرؤف بن عبدالحنان کی کتاب ''القول المقبول'' ضعف کا فتوی اس وقت میرے ذہن میں نہیں۔

کیا نماز کے بعد ''آیۃ الکرسی'' والی حدیث ضعیف ہے؟

(سوال): مولوی عزیر مبارک پوری نے ایک مضمون میں اپنی تحقیق بیان کی ہے کہ نمازوں کے بعد آیت الکرسی ، والی حدیث ضعیف ہے اور اس میں ایک راوی جھوٹا ہے۔مضمون کے سیاق و سباق سے پتہ چلتا ہے کہ ان کا خیال ہے کہ آیت الکرسی جو لوگ پڑھتے ہیں ترک کر دیں! کیا یہ صحیح ہے؟ نیز کیا محدثین کا اصول کہ فضائلِ اعمال میں ضعیف پر عمل ہوسکتا ہے، غلط اور نا قابلِ تسلیم ہے؟

(جواب): واضح ہو، کہ ہر دور میں محدثین عظام کا طرۂ امتیاز رہا ہے، کہ وہ احادیث کو یوں پرکھتے ہیں، جیسے سُنار کسوٹی پر کھرا اور کھوٹا سونا پرکھتا ہے۔لہٰذا یہ بات کوئی تعجب کی نہیں، کہ محترم محقق العصر غازی عزیر (حفظہ اللہ) نے بھی محدثین کے اصولوں کے مطابق اپنی تحقیق پیش کرنے کی سعی فرمائی ہے۔یہ انتہائی مستحسن عمل ہے۔

یہ دوسری بات ہے کہ بعض دفعہ تحقیقی میدان میں فہمِ قواعد میں اختلاف پیدا ہو جاتا ہے جس کی وجہ سے نتائج مختلف ہوتے ہیں۔کبھی کسی محدث نے جان بوجھ کر صحیح حدیث کو نہ تو ضعیف کہا ہے اور نہ فی الواقع ضعیف کو صحیح کہا ہے۔حقیقت یہ ہے کہ علم مصطلح الحدیث بحرِ زخّار ہے، جس میں غوطہ زن ہو کر سچے موتی حاصل

[1] مجمع الزوائد: ۱۴۸/۲

کرنے کی سخت ضرورت ہے۔ پھر یہ فریضہ ہر عام و خاص سرانجام نہیں دے سکتا۔ بلکہ یہ کام صرف کبار علماء کا ہے۔ جنہوں نے ساری زندگیاں اس فن میں صرف کر دیں۔ جہاں تک زیرِ بحث مسئلہ کا تعلق ہے، سو یہ حدیث بیہقی رحمہ اللہ کی ''شعب الایمان'' میں ہے۔ (۳۳۰/۵) اور امام ابن جوزی رحمہ اللہ نے اس کو موضوعات میں بیان کیا ہے۔ سند کے اعتبار سے روایت ہذا سخت ضعیف ہے، مگر شواہد کی بناء پر یہ حدیث صحیح ہے۔ شواہد میں ابوامامہ، مغیرہ بن شعبہ، ابن مسعود اور صلصال بن دلہمس کی احادیث معروف ہیں۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو! القول المقبول (ص ۴۸۰، ۴۸۱)

نماز کے بعد فارغ وقت میں آیۃ الکرسی کتنی مرتبہ پڑھیں؟

سوال : آیۃ الکرسی ہر نماز کے بعد یا فارغ وقت میں کتنی تعداد میں پڑھنا مسنون ہے؟

جواب : فرض نماز کے بعد ''آیۃ الکرسی'' کا صرف ایک بار پڑھنا ہی کافی ہے۔ اس بارے میں اگرچہ بعض محدثین اور شارحینِ حدیث نے کلام کیا ہے، لیکن راجح بات یہ ہے، کہ روایت صحیح اور بلا تردّد قابلِ احتجاج (دلیل کے قابل) ہے۔

اسی طرح مختلف اوقات میں اس کے پڑھنے کی فضیلت وارد ہے، لیکن اس کے لیے کسی عدد کا تعین نہیں۔ مثلاً رات کو سوتے وقت کوئی پڑھ لے، تو رات بھر اللہ کی حفاظت میں رہتا ہے۔[1]

اُنگلیوں پر تسبیحات شمار کرنے کا مسنون طریقہ

سوال اُنگلیوں پر تسبیحات شمار کرنے کا مسنون طریقہ کیا ہے؟

جواب رسول اللہ ﷺ تسبیحات داہنے ہاتھ کی گرہوں پر کیا کرتے تھے۔ سنن ابوداؤد میں عبداللہ بن عمرو سے مروی ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا: يعقد التسبيح قال ابن قدامة بيمينه[2] ''تسبیح کی گرہ لگاتے۔ راویٔ حدیث ابن قدامہ رحمہ اللہ نے کہا: اپنے داہنے ہاتھ سے گنتی کرتے۔''[3]

سنن ابوداؤد کی ایک دوسری روایت میں « و ان يعقدن بالانامل » تسبیحات پوروں پر گنیں کے الفاظ بھی ہیں۔[4]

---

① صحیح البخاری، کتاب الوکالۃ، بَابُ فَضْلِ سُورَةِ البَقَرَةِ، رقم: ۵۰۱۰

② ابوداؤد مع شرح عون المعبود: ۱/۵۵۶

③ سنن أبی داؤد، بَابُ التَّسْبِيحِ بِالْحَصَى، رقم: ۱۵۰۲

④ سنن أبی داؤد، بَابُ التَّسْبِيحِ بِالْحَصَى، رقم: ۱۵۰۱

یسیرہ کی حدیث میں اس کی علت یہ بیان ہوئی ہے کہ انگلیاں عدالتِ الٰہی میں بطورِ گواہ پیش ہوں گی جن کا آغاز چھوٹی اُنگلی سے ہوگا کیونکہ اہل عرب کا طریقہ حساب اسی سے شروع ہوتا ہے۔ ویسے بھی ہاتھ زمین پر رکھے ہوئے گنتی کریں تو یہ چھوٹی انگلی داہنے ہاتھ کی داہنی طرف سے سب سے پہلے پہلی آتی ہے۔حدیث میں ہے:

«يُعْجِبُهُ التَّيَمُّنُ، فِي تَنَعُّلِهِ، وَتَرَجُّلِهِ، وَطُهُورِهِ، وَفِي شَأْنِهِ كُلِّهِ» [1]

''رسول اللہ ﷺ جوتا، کنگھی، طہارت، تمام اہم اُمور میں داہنی طرف کو پسند فرماتے۔''

امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

« قاعدة الشرع المستمرة استحباب البداء باليمين في كل ما كان من باب التكريم والتزيين، وما كان بضدهما استحب فيه التياسر » [2]

'شرعی رواج اور ضابطہ یہ ہے کہ ہر وہ شے جس میں تکریم اور تزیینکا پہلو پایا جاتا ہے، اس کو داہنی جانب سے شروع کرنا مستحب ہے اور اس کے برخلاف استنجا وغیرہ کو بائیں ہاتھ سے شروع کرنا مستحب ہے۔''

البتہ اُنگلیوں کے عقود (گرہوں رپوروں) کواوپر یا نیچے سے استعمال کرنے کا بظاہر اختیار ہے۔ واللہ اعلم!

مولانا عبدالرحمٰن محدث مبارکپوری رحمہ اللہ نے تحفۃ الاحوذی (۲۸۴/۴) میں انامل سے مراد مکمل انگلیاں لی ہیں لیکن یہ درست معلوم نہیں ہوتا کیونکہ بظاہر الفاظِ حدیث اس کی تائید نہیں کرتے۔

نماز کے بعد تسبیح صرف دائیں ہاتھ پر پڑھنا:

سوال نماز کے بعد تسبیح صرف دائیں ہاتھ پر پڑھنی چاہیے؟ بائیں ہاتھ پر سنا ہے کہ نہیں پڑھی جاسکتی۔ کیا یہ صحیح ہے؟

جواب: تسبیح صرف دائیں ہاتھ پر پڑھنی چاہیے۔ [3]

سنن ابوداؤد میں اس کی تصریح موجود ہے۔ [4]

---

[1] صحيح البخاري: باب التيمن، بَابُ التَّيَمُّنِ فِي الْوُضُوءِ وَالغَسْلِ، رقم: ١٦٨

[2] فتح الباري: ١/٢٧٠

[3] سنن أبي داؤد، بَابُ التَّسْبِيحِ بِالْحَصَى، رقم: ١٥٠٢

[4] عون المعبود: جلد: ١، ص: ٥٥٦

کیا تسبیحات دونوں ہاتھوں کی انگلیوں پر کی جا سکتی ہیں؟

سوال: فرض نماز کے بعد تسبیحات/ اذکارِ مسنونہ دائیں ہاتھ کی انگلیوں پر ہی کرنا چاہیے یا دونوں ہاتھوں کی انگلیوں پر بھی کیا جا سکتا ہے؟

جواب: فرض نماز کے بعد ''تسبیحات'' صرف داہنے ہاتھ پر کرنی چاہیے۔[1] چنانچہ ''سنن ابی داوٗد'' میں اس امر کی تصریح موجود ہے۔[2]

بعد از جماعت تکبیر کے علاوہ اذکار بلند آواز کرنا:

سوال: جماعت کے بعد بلند آواز سے ایک بار ''اَللّٰهُ اَكبَر'' کہنا تو ثابت ہے کیا اس کے بعد «اَستَغفِرُكَ اللّٰہَ» (تین مرتبہ) بھی بلند آواز سے ثابت ہے؟ یا کہ دل میں پڑھنا چاہیے؟ اسی طرح دوسرے مسنون اذکار بلند آواز سے جماعت کے بعد پڑھے جا سکتے ہیں؟

جواب: بعد از جماعت تکبیر کے علاوہ اذکار میں بھی ''صحیحین'' میں ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت میں بلند آواز ذکر کی تصریح موجود ہے۔[3]

فرض نماز سے سلام پھیرنے کے بعد ماتھے پر ہاتھ رکھنا:

سوال: اکثر دیوبندی حضرات فرض نماز سے سلام پھیرنے کے بعد ماتھے پر ہاتھ رکھ لیتے ہیں میں نے ان سے پوچھا کیا پڑھتے ہیں کوئی کچھ کہتا ہے کوئی کچھ۔ مثلاً یا قوی وغیرہ تاہم میں نے حصن حصین (اُردو ترجمہ والی) میں صبح و شام کی بہت سی دعاوں میں آخر پر یہ لکھا ہوا پڑھا کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم فرض نماز کے بعد ماتھے پر ہاتھ رکھ کر یہ دعا پڑھتے تھے:

«بِسمِ اللّٰهِ الَّذِی لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الرَّحمٰنُ الرَّحِیمُ۔ اَللّٰهُمَّ اذهَب عَنِّی الهَمَّ وَالحُزنَ»

لیکن حوالہ ندارد۔ علمائے کرام نے کہا کہ یہ دعا حدیث میں موجود ہے میں اس پر عمل کرتا ہوں لیکن اوّل مسنون دعائیں (آیت الکرسی، سبحان اللہ، الحمد، اللہ اکبر وغیرہ) اور سب سے آخر میں مذکورہ دعا۔ عرض یہ ہے کہ آپ اس کی استنادی حیثیت پر مفصل روشنی ڈالیں۔

---

① سنن أبي داؤد،بَابُ التَّسْبِيحِ بِالْحَصَى ،رقم:١٥٠٢

② عون المعبود:١/٥٥٦

③ بحواله مرعاة المفاتيح:٢/٢٣٣

(جواب) : حصن حصین عربی اور اس کی شرح ''تحفۃ الذاکرین'' میں عمل ہذا کا ذکر نہیں۔ ورد وظائف کی بعض دیگر کتابوں میں بھی مجھے اس کی اصل معلوم نہیں ہو سکی۔

سلام کے بعد مقتدیوں کا پلٹنا:

(سوال) : نسائی شریف «كِتَابُ الِافْتِتَاحِ ، بَابُ النَّهيِ عَن مُبَادَرَةِ الِامَامِ بِالِانصِرَافِ مِنَ الصَّلٰوةِ» اس حدیث کا مفہوم کیا ہے؟ جب امام سلام کے بعد فارغ ہو کر مقتدیوں کی طرف منہ کر کے بیٹھ جائے تو کیا مقتدیوں کو اس کے بعد اٹھنا چاہیے؟

(جواب) : اس حدیث کا مفہوم یہ ہے، کہ امام کے مکمل سلام پھیرنے سے قبل مقتدی کو نماز سے فراغت حاصل نہیں کرنی چاہیے۔ بلکہ اس کی پیروی میں نماز سے فارغ ہو۔ سبقت کرنی منع ہے۔ یہاں انصراف کا تعلق نماز سے بعد والی حالت کے ساتھ نہیں، بلکہ سلام پھیرنے کی حالت مقصود ہے۔ قرینہ صارفہ یہ ہے، کہ نفس حدیث میں رکوع، سجود اور قیام کے ساتھ انصراف کا ذکر ہوا ہے۔ مسئلہ چونکہ رسول اللہ ﷺ نے مقتدیوں کی طرف متوجہ ہو کر بتایا تھا، تو بظاہر یہ شُبہ پڑھتا ہے، کہ شاید مقتدیوں کو امام کے پلٹنے کے بعد اٹھ کر جانا چاہیے، لیکن مراد یہ نہیں۔ کیونکہ سلام پھیرنے کے بعد مقتدی اقتداء سے مکمل طور پر آزاد ہو جاتا ہے۔ اقتداء کا ادنیٰ شُبہ بھی باقی نہیں رہتا۔ لہٰذا مقتدی کو امام کے پلٹنے تک بیٹھنے کا پابند نہیں کیا جا سکتا۔

ممکن ہے رسول اللہ ﷺ نے پلٹنے سے اس لیے منع کیا ہو، کہ عورتیں پہلے اُٹھ کر چلی جائیں۔ کیونکہ عورتیں بھی مسجد میں نماز ادا کرتی تھیں۔ (كذا قال الطيبي: " عون المعبود ") اب چونکہ عورتوں کی موجودگی کی عِلّت نہیں۔ لہٰذا پلٹنے کی ممانعت بھی نہیں۔ (واللہ اعلم)

مقتدی امام کے سلام پھیرنے کے کتنی دیر بعد اپنی جگہ سے اٹھیں؟

(سوال) سنن نسائی کی کتاب الافتتاح کے باب النهي عن مبادرة الإمام بالانصراف من الصلوٰۃ میں اس حدیث کا مفہوم کیا ہے کہ جب امام سلام کے بعد فارغ ہو کر مقتدیوں کی طرف منہ کر کے بیٹھ جائے، کیا اس کے بعد مقتدیوں کو پھرنا چاہئے؟

(جواب) اس حدیث کا مفہوم یہ ہے کہ امام کے مکمل سلام پھیرنے سے قبل مقتدی کو نماز سے فراغت حاصل نہیں کرنی چاہئے بلکہ اس کی پیروی میں ہی نماز سے فارغ ہونا ضروری ہے، امام پس سبقت کرنا منع ہے۔ یہاں انصراف کا تعلق نماز سے بعد والی حالت کے ساتھ نہیں بلکہ سلام پھیرنے کی حالت مقصود ہے۔ اس کی

بنیاد یہ ہے کہ نفس حدیث میں رکوع، سجود اور قیام کے ساتھ ہی اِنصراف کا ذکر ہے۔ مسئلہ چونکہ آپ نے مقتدیوں کی طرف متوجہ ہو کر بتایا تو بظاہر یہ شبہ پڑھتا ہے کہ شاید مقتدیوں کو امام کی بالا کیفیت میں اٹھ کر جانا چاہیے لیکن مراد یہ نہیں کیونکہ سلام پھیرنے کے بعد مقتدی اقتدا سے مکمل طور پر آزاد ہو جاتا ہے۔ اقتداء کا ادنیٰ شبہ بھی باقی نہیں رہتا کہ مقتدی کو نماز سے فراغت کے بعد امام کے ان کی طرف منہ پھیرنے تک بیٹھنے کا پابند بنایا جا سکے۔

نمازِ فجر کے بعد سونا؟

(سوال) صبح کے وقت میں امت کے لیے برکت رکھ دی گئی ہے لہٰذا نمازِ فجر کے بعد سونا نہیں چاہیے۔ جو سو جائے گا وہ برکت (روزی) سے محروم کر دیا جائے گا'' کیا یہ مسئلہ حدیث سے ثابت ہے؟

(جواب) دن کا پہلا حصہ بلاشبہ جملہ کاروبار کے لیے باعث برکت ہے، جس طرح کہ ترمذی، ابوداؤد، اور دارمی کی روایت میں تصریح موجود ہے۔ لیکن اس کا معنی یہ نہیں کہ نمازِ فجر کے بعد سونا منع ہے۔ ممانعت کی کوئی روایت ثابت نہیں اور نہ یہ کہ روزی سے برکت اٹھ جاتی ہے، بہرحال نمازِ فجر کے بعد سونے سے احتراز کرنا چاہیے۔

ایک بے اصل واقعہ

(سوال) ایک صحابی نماز پڑھ کر ذکر اذکار کیے بغیر فوراً اٹھ کر گھر چلے جاتے تھے، دیگر صحابہ کے شکایت کرنے پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے اس کی وجہ پوچھی تو اُنہوں نے بتایا کہ میرے اور میری بیوی کے پاس یہی ایک چادر ہے، میں اپنی بیوی کو یہ چادر دے دیتا ہوں تاکہ وہ نماز پڑھ لے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اگر کسی نے جنتی جوڑا دیکھنا ہو تو اُنہیں دیکھ لے۔'' ...... پھر کہیں سے مال کے لدے ہوئے صدقے کے اونٹ آئے تو وہ آپ ﷺ نے اُس صحابی کو دے دیے، جب وہ اونٹ لے کر گھر پہنچے تو بیوی نے کہا کہ یا مجھے گھر رکھو یا ان اونٹوں کو رکھو۔ چنانچہ اُس صحابیؓ نے وہ اونٹ واپس کر دیے۔

اکثر واعظین و خطباے کرام بغیر کسی حوالہ کے یہ قصہ بیان کرتے ہیں۔ اس قصے کی حقیقت کیا ہے؟ یہ کس کتاب میں مذکور ہے؟ صحابی کا نام کیا ہے؟ (ابوسعید اعوان بابا)

(جواب) یہ قصہ بے اصل اور قصہ گو لوگوں کی ایجاد معلوم ہوتا ہے۔ تلاشِ بسیار کے باوجود ہمیں اس کا کوئی حوالہ نہیں مل سکا۔

فرض نماز کے بعد اور دیگر مواقع پر اجتماعی دعا

نماز کے بعد اجتماعی دعا کی حیثیت:

سوال: کیا نماز سے فارغ ہو کر آدمی دعا مانگ سکتا ہے؟ درج ذیل حدیث کی وضاحت فرما دیں:

« اَنَّ عَبدَ اللّٰهِ بنَ الزُّبَيرِ رَاٰی رَجُلًا رَافِعًا يَدَيهِ قَبلَ اَن يَّفرُغَ مِن صَلٰوتِهٖ فَلَمَّا فَرَغَ مِنهَا قَالَ: اِنَّ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ لَم يَكُن يَرفَعُ يَدَيهِ حَتّٰى يَفرُغَ مِن صَلٰوتِهٖ »[1]

حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے ایک شخص کو دیکھا کہ نماز ختم ہونے سے پہلے ہاتھ اٹھا کر دعا مانگ رہا ہے تو نماز کے بعد آپ نے اس سے فرمایا کہ نبی اکرم ﷺ نماز کے بعد ہی ہاتھ اٹھاتے تھے'' (اس کے سب راوی ثقہ ہیں)

نیز فتاوی اہلحدیث جلد نمبر ا ص ۱۹۰ فتاویٰ نذیریہ جلد نمبر ا ص ۵۶۴ میں بھی ہے کہ یہ دعا شرعا درست اور مستحب ہے۔ تو اگر آپ کہیں کہ نماز کے بعد دعا کرنے کے ثبوت میں جو حدیثیں آتی ہیں وہ ضعیف ہیں تو عرض ہے حدیث «اِنَّمَا الاَعمَالُ بِالنِّيَّاتِ» بھی ضعیف ہے اور نماز عید کی پہلی رکعت میں سات تکبیروں اور دوسری میں پانچ تکبیروں والی روایت بھی ضعیف ہے۔ مراد یہ ہے کہ جب ایک حدیث چاہے وہ ضعیف ہو اگر اس کے خلاف کوئی حسن صحیح روایت نہ ہو تو وہ حدیث ضعیف بھی احادیث کے قوانین کے مطابق حسن اور صحیح حدیث کا درجہ رکھتی ہے۔ آپ بتلایئے کہ دعا نہ کرنے کے متعلق کون سی صحیح احادیث ہیں؟

جواب: روایت ہذا کی سند کے بارے میں آگاہی حاصل نہیں ہو سکی، کہ وہ صحیح ہے یا غیر صحیح۔ کسی حدیث کے راوی ثقہ ہونے سے یہ لازم نہیں آتا، کہ حدیث صحیح ہے۔ امکان ہے کہ اس کی سند میں انقطاع ہو، یا اس میں کوئی اور مدلس راوی ہو، جس نے تحدیث یا سماع کی صراحت نہ کی ہو۔ لہٰذا وہ لوگ جو محض رواۃ کے ثقہ ہونے پر حدیث کو صحیح سمجھ بیٹھے ہیں، وہ غلطی میں مبتلا ہیں۔ حافظ ھیثمی کی عادت ہے، کہ وہ ابن حبان کی توثیق پر اعتماد کرتے ہیں۔ طبرانی کے شیوخ کے بارے میں ہیثمی کا نرالا اصول ہے۔ وہ مجمع الزوائد کے مقدمہ میں رقمطراز ہیں:

''طبرانی کے وہ شیوخ جن کا ذکر ''میزان الاعتدال للذھبی'' میں ہے، ان کے ضعف کے بارے میں، میں نے آگاہ کر دیا ہے، اور جو اس میں (میزان میں) نہیں ان کو میں نے ثقات

[1] رجاله ثقات مجمع الزوائد ص ۱۴۹

میں شمار کیا ہے۔''

دوسری بات یہ ہے، کہ اس حدیث میں اجتماعی دعا کا ذکر نہیں۔ زیادہ سے زیادہ اس سے انفرادی دعا پر استدلال ہوسکتا ہے۔ فتاوی اہلحدیث اور فتاوی نذیریہ میں ذکر کردہ دلائل محل نظر ہیں۔ مثلاً فتاوی نذیریہ اور فتاوی اہلحدیث میں بحوالہ ابن ابی شیبہ روایت ہے، کہ سیدنا عامر کہتے ہیں: میں نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ فجر کی نماز پڑھی جب آپ نے سلام پھیرا تو قبلہ کی طرف سے منہ پھیر کر (مقتدیوں کی طرف متوجہ ہوئے) «رَفَعَ یَدَیهِ، وَ دَعَا» ''دونوں ہاتھ اٹھا کر دعا مانگی۔'' علامہ عبیداللہ رحمانی رحمہ اللہ حدیث ہذا پر طویل بحث کے بعد فرماتے ہیں: ''مذکورہ تفصیل سے واضح ہوگیا، کہ مختصر اور مُطَوّل دونوں میں سے کسی روایت میں بھی «وَرَفَعَ یَدَیهِ، وَدَعَا» کی زیادتی موجود نہیں''

ویسے بھی یہ روایت عامر سے نہیں، بلکہ یزید بن ابی مسعود عامری سے مروی ہے اور باقی دلائل بھی ضعف کی بناء پر لائقِ استدلال نہیں۔ ان کا ضعف فتاوی اہلحدیث میں بھی ملاحظہ کیا جاسکتا ہے، (۲/۱۹۳۔۱۹۳)

راجح بات یہ ہے، کہ فضائل واعمال میں ضعیف حدیث نا قابلِ اعتبار ہے۔ ''محدث'' کے کسی شمارے میں مسئلہ ہذا پر ہم تفصیلی گفتگو کر چکے ہیں۔ اسکی طرف مراجعت مفید ہے۔ واضح ہو کہ ہمارے شیوخ محدث روپڑی اور محدث گوندلوی نماز کے بعد اجتماعی دعا کے عملاً قائل و فاعل نہ تھے، الا یہ کہ کسی کی طرف سے دعا کی درخواست ہو۔ چنانچہ مقتدیوں میں سے کسی کے تقاضے پر یا امام کی کسی ضرورت اور مطالبے پر اجتماعی دعا کرنا جائز ہے۔ جبکہ اسے نمازوں میں معمول بناء لینا خلاف سنت رسول ہے۔ حدیث «اِنَّمَا الاَعمَالُ»...... صحیح ہے، لیکن اس میں دعا کا کہاں تذکرہ ہے؟ اس روایت کو یہاں پیش کرنا بغیر محل ہے۔ عیدین کی تکبیروں والی روایت شواہد کی بناء پر صحیح ہے۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو! إرواء الغلیل (۳/ ۱۰۷/ ۶۳۹) اور سواطع القمرین فی تخریج احکام العیدین (۱۴۵۔۱۵۲)

اہلِ علم میں سے کوئی بھی اس بات کا قائل نہیں کہ ضعیف حدیث عدمِ تعارض کی بناء پر حسن اور صحیح حدیث کا درجہ رکھتی ہے۔ امام مسلم مقدمہ صحیح مسلم میں فرماتے ہیں:

''جو شخص ضعیف حدیث کا ضعف جاننے کے باوجود بیان نہیں کرتا، وہ اپنے اس فعل کی وجہ سے گنہگار ہے اور عوام الناس کو دھوکہ دیتا ہے۔ کیونکہ ممکن ہے، کہ اس کی بیان کردہ احادیث کو سننے والا ان سب پر یا ان میں سے بعض پر عمل کرے اور یہ بھی ممکن ہے کہ وہ سب احادیث یا ان میں سے اکثر احادیث اکاذیب ہوں اور ان کی کوئی اصل نہ ہو۔ جب کہ صحیح احادیث اس قدر ہیں، کہ ان کے ہوتے ہوئے ضعیف احادیث کی

ضرورت ہی نہیں ہے۔ بہت سے لوگ ضعیف اور مجہول اسانید والی احادیث جاننے کے باوجود محض اس لئے روایت کرتے ہیں، کہ عوام الناس میں ان کی شہرت ہو اور یہ کہا جائے، کہ ان کے پاس کتنی احادیث ہیں اور اس نے کتنی کتابیں تالیف کردی ہیں۔ جو شخص علم کے معاملے میں یہ روش اختیار کرتا ہے، اس کے لئے علم میں کچھ حصہ نہیں ہے اور اسے عالم کہنے کی بجائے، جاہل کہنا زیادہ مناسب ہے۔

نماز کے بعد دعا کرنے کی دلیل نہ ہونے کی وجہ سے یہ فعل درست نہیں۔ کیونکہ عبادات اصلاً توقیفی ہیں۔ یعنی شریعت کی بیان کردہ ہی ہیں۔ ان میں کسی کی مرضی، خواہش اور منشا کا کوئی دخل نہیں۔

ضروری وضاحت اور شکریہ: ہفت روزہ الاعتصام ۱۲ جنوری ۲۰۰۱ء کے احکام ومسائل میں بسلسلہ اجتماعی دعا بعد از فرائض حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما کا ایک اثر ذکر ہوا تھا، کہ انہوں نے ایک شخص کو دیکھا کہ نماز ختم ہونے سے پہلے ہاتھ اٹھا کر دعا مانگ رہا تھا تو نماز کے بعد آپ نے اس سے فرمایا کہ نبی اکرم ﷺ نماز کے بعد ہی ہاتھ اٹھاتے تھے، روایت ہذا کے متعلق آگاہی سے میں نے لاعلمی کا اظہار کیا تھا، بعد میں بعض احباب نے مجھے محترم حافظ ابوطاہر زبیر علی زئی حفظہ اللہ کی تحقیق سے آگاہ کیا کہ یہ اثر ''جامع المسانید'' حافظ ابن کثیر میں موجود ہے لیکن سلیمان العطار کی جہالت کی وجہ سے ضعیف ہے۔ اس مخلصانہ کاوش اور توجہ دلانے پر میں ان حضرات کا بے حد شکر گزار ہوں۔ (حافظ ثناء اللہ خان مدنی)

تعاقب: ''الاعتصام'' کے بعض فتویٰ پر تعاقب اور ان کا جائزہ: گزشتہ دنوں سندھ سے سید محمد قاسم شاہ صاحب بن پیر محب اللہ شاہ راشدیؒ کی طرف سے ایک مراسلہ ملا جس میں انہوں نے میرے ''الاعتصام'' میں شائع ہونے والے چار مختلف فتووں پر تعاقب فرمایا ہے۔ ان کے سوالات اور جوابات ترتیب وار ذیل میں ملاحظہ فرمائیں! (ثناء اللہ مدنی)

محترم المقام جلیل القدر جناب حافظ ثناء اللہ مدنی صاحب (سلمک اللہ سبحانہ وتعالیٰ) السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ امید ہے کہ مزاج عالی مع الخیر ہوں گے۔

نماز کے بعد ہاتھ اٹھا کر دعا کرنے کے بارے ایک سوال پر استفسار اور اس کا جواب:

سوال : گزارش ہے کہ آپ نے الاعتصام کے شمارہ نمبر ۷ ۲۸ ذوالقعدہ ۱۴۲۱ھ جمعۃ المبارک (مطابق ۲۳ فروری تا یکم مارچ ۲۰۰۱ء) میں (ص۔۱۳) پر ضروری وضاحت اور شکریہ کے عنوان کے تحت حافظ زبیر علی زئی صاحب کا شکریہ ادا کیا، کہ انہوں نے نماز کے بعد ہاتھ اٹھا کر دعا کرنے کے بارے میں حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کے اثر کے متعلق آگاہ کیا کہ یہ اثر جامع المسانید ابن کثیر (ص ۵۲۵ ج ۷) میں موجود ہے لیکن یہ اثر

سلیمان العطار کی جہالت کی وجہ سے ضعیف ہے۔

اس کے متعلق عرض ہے کہ یہ راوی مجہول نہیں۔ اس راوی کا پورا نام سلیمان بن الحسن بن المنہال العطار، ابو ایوب البصری ہے۔حضرت شیخ الاسلام جناب محبّ اللہ شاہ راشدی رحمہ اللہ نے اپنی کتاب "رجال کتاب القراء ۃ خلف الامام للبیہقی" میں اس کو ذکر کیا ہے اور تحریر فرمایا ہے، کہ:

اَطلَقَ عَلَيهِ اَبُو بَكرِ الِاسمَاعِيلِيُّ « اَلعَدلَ » كِتَابُ المُعجِمِ لِاَبِی بَكرِ الِاسمَاعِيلِيِّ (٦٤٧/٢).

وَ قَالَ حَمزَةُ بنُ يُوسُفَ السَهمِيُّ: سَأَلتُ اَبَا مُحَمَّدَ بنَ غُلَامِ الزُّهرِيِّ ، عَن سُلَيمَانَ بنِ الحَسنِ اَبِی اَيُّوبَ العَطَّارِ البَصرِيِّ، فَقَالَ : هُوَ ثِقَةٌ. وَ قَالَ اَيضًا: سَأَلتُ الدَّارُقُطنِی عَن اَبِی اَيُّوبَ سُلَيمَانَ بنِ الحَسنِ العَطَّارِ البَصرِيِّ، فَقَالَ : لَا بَأسَ بِهِ. كِتَابُ سُؤَالَاتِ حَمزَةَ بنِ يُوسُفَ السَّهمِيِّ لِلدَّارِقُطنِی ، وَغَيرِهِ مِنَ المَشَائِخِ (ص ٢١٧ـ٢١٨ـ رقم الترجمة نمبر ٢٩٤ـ٢٩٦)

اس لیے یہ راوی مجہول کیسے ہوا بلکہ قابلِ احتجاج ہوا۔

(جواب) : اس کا جواب محترم حافظ زبیر علی زئی حفظہ اللہ کے قلم سے ہی ملاحظہ فرمائیں! وہ آپ کے اس سوال کے جواب میں لکھتے ہیں کہ: سلیمان بن الحسن، ابوایوب العطار البصری رحمہ اللہ بلاشبہ ثقہ تھے، تاہم ان کا انتقال ۲۶۲ھ میں ہوا۔ دیکھئے تاریخ بغداد (۵۴/۹) المنتظم لابن الجوزی (۱۸۲/۱۲) ترجمہ نمبر ۱۶۷۵۔

جب کہ امام طبرانی، عکا شہر میں ۲۶۰ھ میں پیدا ہوئے۔ (رحمہ اللہ) دیکھئے سیر اعلام النبلاء (۱۶/ ۱۱۹) اور عام کتب میں ترجمۃ الطبرانی۔امام طبرانی رحمہ اللہ کا پہلا سماع ۲۷۳ھ (یعنی تیرہ سال کی عمر) میں ان کے والد نے کرایا۔(السیر ١٦/ ١١٩) لہٰذا سلیمان مذکور سے امام طبرانی کا سماع ناممکن وغیر ثابت ہے۔

سندِ مذکور کا راوی سلیمان بن الحسن العطار کوئی دوسرا شخص ہے۔ المعجم الاوسط (۳۸۹/۴) ح: ۳۶۶۳ میں اس کے ساتھ "المصری" کا لقب موجود ہے۔ جب کہ اس کی کنیت مجھے کہیں نہیں ملی۔ لہٰذا استاذِ طبرانی کی جہالت بدستور باقی ہے۔ کتاب الدعا للطبرانی کے محقق ڈاکٹر محمد سعید بن محمد حسن البخاری نے بھی لکھا ہے کہ:

«لَم اَقِف عَلَيهِ» (مقدمہ کتاب الدعا ص ۳۳۸ و کتاب امعار، ح: ۲۰۶۱ ابوایوب البصری کے شاگردوں میں امام طبرانی اور استادوں میں اَبو کَامِلِ الجَحدَرِی کا نام نہیں ملا۔ شیخ البانی رحمہ اللہ نے

یہی روایت فُضَیلِ ابنِ سُلَیمَانَ النُّمَیرِی کی وجہ سے السلسلة الضعيفة ج ٦ ص ٥٦ حديث نمبر ٢٠٤٤ پر ذکر کر کے ''ضعیف'' قرار دی ہے۔ وما علینا الا البلاغ (زبیر علی زئی)

سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا سے تعزیت والے واقعہ کی سند کیسی ہے؟

سوال حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے تعزیت کے واقعہ والی حدیث (ابوداؤد مع عون المعبود:٣/١٦٠) کی سند کیسی ہے؟ اس حدیث سے یا ترمذی رحمہ اللہ کی مذکورہ بالا حدیث سے تعزیت کے موقع پر مروّجہ اجتماعی دعا ثابت ہوتی ہے یا نہیں؟

جواب یہ حدیث سنداً ضعیف ہے۔ اگر صحیح بھی مانی جائے تو اس میں اجتماعی مروّجہ دعا کا ذکر ہی نہیں۔ اسی طرح ترمذی کی مذکورہ روایت سے بھی تعزیت کے موقع پر مروّجہ اجتماعی دعا کا ثبوت نہیں ملتا۔

اجتماعی دعا کسے کہتے ہیں؟

سوال: اجتماعی دعا کسے کہتے ہیں؟

① ۔امام فرض نماز کے بعد ہاتھ اٹھا کر اونچی آواز سے دعا کرتا ہے مقتدی آمین کہتے جاتے ہیں۔

② ۔امام فرض نماز کے بعد ہاتھ اٹھا کر دل میں دعا کرتا ہے مقتدی بھی دل میں اپنی اپنی دعا کرتے ہیں۔ ان دونوں میں کونسی اجتماعی دعا کہلائے گی یا دونوں اجتماعی ہیں۔ سنت سے کس طرح دعا مانگنا ثابت ہے یا بالکل کوئی ثبوت نہیں؟ کیونکہ کئی علماء اجتماعی دعا کو بدعت کہتے ہیں۔ مثلاً مولانا برکات صاحب نے لکھا ہے کہ جو اجتماعی دعا کراتا ہے اس سے ثبوت مانگا جائے۔ جب کہ مولانا صادق صاحب سیالکوٹی نے ''صلوٰۃ الرسول''، ص:٣١٢، بحوالہ فتاویٰ نذیریہ از ابن ابی شیبہ سنت لکھا ہے۔ اگر ابن ابی شیبہ میں کوئی حدیث ہے تو اس کی کیا پوزیشن ہے۔ اجتماعی دعا سنت یا بدعت کیا ہے؟ احناف کے ہاں بھی ظہر، مغرب اور عشاء میں امام قبلہ رُخ ہی رہ کر ہاتھ اٹھا کر صرف اللھم انت السلام...... ہی پڑھتا ہے جبکہ فجر اور عصر کے وقت مقتدیوں کی طرف رُخ کر کے بعد از اذکار ہاتھ اٹھا کر دعا مانگی جاتی ہے۔ براہِ مہربانی سب کی رہنمائی اور آگاہی کے لیے پوری وضاحت کریں کہ اجتماعی دعا کی کیا تعریف ہے یہ سنت ہے یا کہ بدعت۔ اگر کوئی کبھی کبھار اجتماعی دعا کرے تو کیسا ہے؟

جواب: سوال میں مذکور صورتیں اجتماعی دعا ہی کی شکلیں ہیں۔

ہاتھ اٹھا کر دعا کرنا یا بغیر ہاتھ اٹھائے کرنا دونوں طرح سنت سے ثابت ہے۔ انفرادی طور پر دعا کرنا

بلاشبہ ثابت ہے اور اجتماعی دعا کا ثبوت بوقتِ ضرورت ہے۔ جیسے بارش وغیرہ کی طلب کے لیے اور جہاں تک تعلق ہے نماز کے بعد اجتماعی دعا کا یہ محل تأمل (قابلِ غور) ہے اور انفرادی دعا کا کئی ایک احادیث سے ثبوت ملتا ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی "صحیح" میں بایں الفاظ تبویب قائم کی ہے:"باب الدعا بعد الصلوٰۃ" یعنی نماز سے فراغت کے بعد دعا کرنا مشروع ہے۔ شارح بخاری حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: کہ مصنف کا مقصود ان لوگوں کی تردید کرنا ہے، جو نماز کے بعد دعا کو غیر مشروع سمجھتے ہیں۔ اسی طرح داخلِ نماز (نماز کے دوران میں) بھی دعا کے چھ مقامات ہیں۔

(۱) تکبیر تحریمہ کے بعد۔ (۲) حالت اعتدال میں۔ (۳) بحالت رکوع۔ (۴) بحالتِ سجدہ۔ (۵) دو سجدوں کے درمیان۔ (۶) تشہد میں (۷) اسی طرح قنوت میں بھی دعا ہے۔(۸) قرأت کے وقت جب کہ مصلّی (نمازی) کا گزر آیت رحمت یا آیت عذاب سے ہو۔[1]

دعا کے جملہ آداب میں سے یہ بھی ہے، کہ فضیلت کے اوقات کا اہتمام کیا جائے۔ مثلاً: بحالتِ سجدہ اور اذان کے وقت نیز باوضو ہو، نماز سے فراغت پا چکا ہو۔ قبلہ رُخ ہو اور دعا میں رفع یدین کرے۔ گناہوں کا اقرار، توبہ کا اظہار اور خلوص کا مظاہرہ کرے۔ دعا کا آغاز اللہ کی حمد و ثنا اور نبی ﷺ پر درود سے ہو اور اللہ کے اسمائے حسنیٰ کے ساتھ سوال کیا جائے۔[2]

سائل نے دو متضاد فتووں کے حوالہ سے نماز کے بعد اجتماعی دعا کے بارے میں استفسار کیا ہے۔ بلکہ جواز پر دال بعض حوالہ جات بھی صلوٰۃ الرسول مؤلفہ مولانا محمد صادق سیالکوٹی رحمہ اللہ سے نقل کیے ہیں۔ ان کے بارے میں مزید تحقیق کی خواہش کا اظہار کیا ہے۔ بلاشبہ صلوٰۃ الرسول کو قبولیت عامہ حاصل ہے۔ اسی بناء پر پاک و ہند میں اس کے متعدد ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ بلکہ مختلف زبانوں میں اس کے ترجمے بھی ہو چکے ہیں۔ اس کی شہرت کے پیشِ نظر شاگرد رشید حافظ عبدالرؤف بن عبدالحنان بن حکیم محمد اشرف سندھو فارغ التحصیل (شریعت کالج مدینہ یونیورسٹی) مقیم شارجہ (متحدہ عرب امارات) نے اس پر تعلیق اور تخریج کا اہتمام فرمایا ہے۔ جس سے اس کے حسن میں مزید اضافہ ہوا ہے: یزیدك وجهه حسنا ...... اذا ما زدته نظرا

اللہ رب العزت ان کی مساعی جمیلہ کو قبول فرما کر عُقبیٰ کے لیے ذریعۂ نجات بنائے۔ آمین! امید ہے بارش کا پہلا قطرہ ثمر آور ثابت ہو گا۔ (ان شاء اللہ تعالیٰ)

---

[1] فتح الباری:۱۱/۱۳۲

[2] الفتح:۱۱/۱۴۱

یہی وہ اسلوب ہے جو اہل رائے کے بالمقابل فقہاء محدثین (اہلحدیث) کا طرّۂ امتیاز سمجھا جاتا ہے۔ اسی امتیازی حیثیت کے حاملین نے دیگر مذاہب پر اپنی جرأت اور قوت و ہمت کا لوہا منوا کر شرفِ فوقیت حاصل کیا، جو صرف اس امت کا خاصہ ہے۔

جملہ تفصیل "الفصل بن حزم" میں دیکھی جا سکتی ہے۔''مقدمہ صحیح مسلم میں حضرت عبد اللہ بن مبارک کا قول ہے: « الإِسنَاد مِنَ الدِّین لَولاَ الِاسنَادُ لَقَالَ مَن شَاءَ مَا شَاءَ »

اسی طرح مقدمہ ''جامع الاصول'' میں سفیان ثوری کا قول ہے:''سند مومن کا ہتھیار ہے۔ جب اس کے پاس ہتھیار نہیں ہوگا، تو دشمن سے جنگ کیسے کرے گا۔''

آفرین ان فحول پر جنھوں نے ہزاروں انسانوں کے سیرت و کردار اور احوال و سیر کو شیشۂ مرئی میں ڈھال کر رہتی دنیا تک پوری امت پر عظیم احسان فرمایا ہے۔ « اُولٰئِكَ آبائی فجئنی بِمِثلِهِم »

بہر صورت سائل نے ''صلوٰۃ الرسول'' کے واسطہ سے بحوالہ ''فتاویٰ نذیریہ'' از ابن ابی شیبہ جو حدیث نقل کی ہے، اس کے بارے میں گزارش ہے۔ فی نفسہ روایت تو حسن درجہ۔لیکن اس میں الفاظ'' وَرَفَعَ یَدَیهِ ، وَدَعَا" یعنی نبی اکرم ﷺ نے ہاتھ اٹھائے اور دعا کی۔موجود نہیں۔ بناء بریں اس روایت کو بطورِ دلیل پیش کرنا درست نہیں۔ ملاحظہ ہو! ابن ابی شیبہ (۱/۳۰۲)

مذکورہ کتاب میں ایک روایت حضرت انس سے دعویٰ پر دلیل کے طور پر پیش کی ہے۔لیکن وہ بھی سخت ضعیف ساقط الاعتبار (اس کا اعتبار نہیں) ہے۔ مزید وضاحت کے لیے ملاحظہ ہو! '' صلوٰۃ الرسول مع التعلیقات والحواشی'' حافظ عبدالرؤف، ص:۳۳۲ تا ۳۷۷، اور حنفیوں کے جس طریقہ کی طرف آپ نے اشارہ کیا ہے۔ یہ اختراعی طریق کار ہے۔شریعت میں اس کی کوئی دلیل نہیں اور اجتماعی دعا صرف منصوص مقامات پر درست ہے۔اس کے علاوہ نہیں۔ (کَمَا سَبَقَ)

ہر فرضی نماز کے بعد اجتماعی دعا کرنا صحیح ہے یا نہیں؟

سوال: ہر فرضی نماز کے بعد اجتماعی دعا کرنا صحیح ہے یا نہیں؟

جواب: فرضوں کے بعد حسبِ رغبت ونشاط یعنی (شوق اور توجہ) انفرادی دعا کا جواز ہے۔لیکن اجتماعی دعا سے احتراز کرنا چاہیے۔ خدشہ ہے کہ بدعت کے زُمرہ میں شامل نہ ہو جائے۔ اس موضوع پر میرا ایک تفصیلی فتویٰ "الإعتصام" میں شائع ہو چکا ہے۔ (جلد۴۳،شمارہ:۳۶)

فرض نمازوں کے بعد اجتماعی دعا کرنی چاہیے یا نہیں؟

سوال : فرض نمازوں کے بعد اجتماعی دعا کرنی چاہیے یا نہیں؟

جواب : فرض نمازوں کے بعد اجتماعی دعا ثابت نہیں۔

نماز کے بعد امام اور مقتدیوں کا ہاتھ اٹھا کر دعا کرنا درست عمل ہے؟

سوال : کسی بھی (باجماعت) نماز کے بعد امام اور سب مقتدی ہاتھ اٹھا کر دعا کرتے ہیں، تو کیا یہ عمل کسی بھی حدیث سے ثابت ہے؟ کیونکہ اکثر بلکہ بے شمار اہلِ حدیث حضرات نمازِ جمعہ کے بعد اجتماعی دعا کرتے ہیں؟

جواب : فرض نماز کے بعد بلا عارضہ (بلا سبب و بلا مطالبہ) اجتماعی دعا کا صحیح احادیث سے ثبوت نہیں ملتا۔ جمعہ غیر جمعہ سب کا حکم یکساں ہے۔ تفریق کی کوئی وجہ نہیں۔

امام صاحبان نماز کے بعد اجتماعی دعا مانگتے ہیں کیا یہ نبی کریم ﷺ سے ثابت ہے؟

سوال : آج کل امام صاحبان فرض نماز کے بعد مقتدیوں کے ساتھ مل کر اجتماعی دعا مانگتے ہیں کیا حضور اکرم ﷺ بھی فرض نمازوں کے بعد اسی طرح اجتماعی دعا مانگا کرتے تھے۔ اگر آپ ﷺ ایسا نہیں کرتے تھے تو پھر یہ دعا مانگنا بدعت ہے یا کہ نہیں؟

جواب : فرض نماز کے بعد اجتماعی دعا کرنا رسول اللہ ﷺ سے ثابت نہیں۔ ظاہر ہے عدمِ ثبوت کی بناء پر ''احداث فی الدین'' ہی قرار پائے گی۔

صحیح حدیث میں ہے: « مَنۡ اَحۡدَثَ فِی اَمۡرِنَا هَذَا مَا لَیۡس مِنۡهُ فَهُوَ رَدٌّ »[1] یعنی'' جو دین میں اضافہ کرے، وہ مردود ہے۔''

اس سلسلہ میں حکیم مولوی عماد الدین حنفی دیوبندی بلوچستانی کی تالیف ''التحقیق الحسن فی نفی الدعا الاجتماعی بعد الفرائض والسنن'' لائقِ مطالعہ ہے۔

نماز کے بعد باجماعت دعا:

سوال : جنابِ مَن نماز کے بعد باجماعت دعا کے متعلق آپ کا فتویٰ ''الاعتصام'' میں شائع ہوا تھا جس کے مطابق باجماعت نماز کے بعد باجماعت دعا مانگنے کی کوئی صحیح حدیث معلوم نہ ہونے کا ذکر تھا۔ جس کی بناء پر

[1] صحیح البخاری بَابُ إِذَا اصطَلَحُوا عَلَى صُلحِ جَورٍ فَالصُّلحُ مَردُودٌ، رقم: ۲۶۹۷

بندہ نے نماز کے بعد باجماعت دعا ترک کر دی۔ مگر ہمارے ایک عزیز نے ''صلوٰۃ الرسول'' مصنفہ مولانا محمد صادق سیالکوٹی رحمہ اللہ سے باجماعت دُعاء کا ثبوت پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ کتاب کے مطلوبہ صفحہ کی فوٹو کاپی ساتھ ارسال کر رہا ہوں۔ براہِ کرم اس صفحہ کا جائزہ لے کر یہ ارشاد فرمائیں کہ کیا ان احادیث یا ضعیف احادیث سے اس طرح کے عمل کیے جا سکتے ہیں یا نہیں؟ یا اُن ضعیف احادیث کے ملنے سے کوئی عمل جائز ہو سکتا ہے۔ جن احادیث کے خلاف کوئی صحیح حدیث نہ ملتی ہو؟

صلوٰۃ الرسول کی عبارت: ''فرض نماز کے بعد ہاتھ اٹھا کر دعا مانگنا۔'' درست ہے۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«مَا مِن عَبدٍ بَسَطَ كَفَّيهِ فِي دُبُرِ كُلِّ صَلٰوةٍ ، ثُمَّ يَقُولُ: اَللّٰهُمَّ إِلٰهِي ، وَ إِلٰهَ إِبرَاهِيمَ ، وَ إِسحٰقَ ، وَ يَعقُوبَ ، وَ إِلٰهَ جِبرِيلَ ، وَ مِيكَائِيلَ ، وَ إِسرَافِيلَ . أَسئَلُكَ تَستَجِيبُ دَعوَتِي . فَإِنِّي مُضطَرٌّ ، وَ تَعصِمُنِي فِي دِينِي ، فَإِنِّي مُبتَلِيءٌ ، وَ تَنَالُنِي بِرَحمَتِكَ . فَإِنِّي مُذنِبٌ ، وَ تَنفِي عَنِّي الفَقرَ فَإِنِّي مُذنِبٌ ، وَ تَنفِي عَنِّي الفَقرَ فَإِنِّي مُتَمَسِّكٌ إِلَّا كَانَ حَقًّا عَلَى اللّٰهِ عَزَّوَجَلَّ أَن لَا يَرُدَّ يَدَيهِ خَائِبَتَينِ »[1]

''جو بندہ ہر نماز کے بعد اپنے دونوں ہاتھ پھیلا کر کہے۔«اَللّٰهُمَّ اِلٰهِي وَ اِلٰهَ اِبرَاهِيمَ...... اِلٰى آخِرِهٖ» تو خدا تعالیٰ اس کے ہاتھوں کو نہیں پھیرتا نامراد۔''

حضرت عامر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں:

« صَلَّيتُ مَعَ رَسُولِ اللّٰهِ ﷺ الفَجرَ فَلَمَّا سَلَّمَ اِنحَرَفَ ، وَ رَفَعَ يَدَيهِ وَ دَعَا...... »

''میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ فجر کی نماز پڑھی۔ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سلام پھیرا تو قبلہ کی طرف سے منہ پھیر کر (مقتدیوں کی طرف متوجہ ہو کر) دونوں ہاتھ اٹھا کر دعا مانگی۔''[2]

ملاحظہ: معلوم ہوا کہ امام کا سلام پھیر کر مقتدیوں کی طرف منہ کر کے دعا مانگنا درست ہے۔

(جواب): فرض نماز کے بعد اجتماعی دعا کے جواز کے سلسلہ میں جناب محمد آصف عزیز سلفی حفظہ اللہ نے ہمیں کتاب ''صلوٰۃ الرسول صلی اللہ علیہ وسلم'' مؤلفہ مولانا محمد صادق سیالکوٹی مرحوم کے دو صفحوں کی فوٹو سٹیٹ ارسال کی ہے۔ جن میں بزعم خود اس امر کے جواز کا ثبوت ہے۔ اس پر بالاختصار ہماری گزارشات ملاحظہ فرمائیں!

---

(1) عمل اليوم والليلة لابن سنى

(2) فتاوى نذيريه بحواله ابن ابى شيبه

امام ابن سنی کی "عمل الیوم واللیلۃ، رقم:۱۳۸" کے حوالہ سے نقل کردہ روایت کی سند میں تین عِلّتیں موجود ہیں۔

۱۔ اسحاق بن خالد راوی کے بارے میں ابن عدی نے "الکامل"(۱/ ۳۳۷) میں اور امام ذہبی رحمہ اللہ نے "میزان الاعتدال فی نقد اسماء الرجال"(۱/ ۱۹۰) میں کہا ہے: "یہ بہت ساری منکر روایات بیان کرتا ہے۔" اس سے معلوم ہوا کہ یہ ضعیف ہے۔

۲۔ اس کی سند میں عبدالعزیز بن عبدالرحمٰن ہے۔ امام ابن حبان رحمہ اللہ فرماتے ہیں: کہ یہ ثقات سے بہت ساری مقلوب اور اثبات کی طرف غلط منسوب احادیث بیان کرتا ہے۔ پھر دلائل سے اس امر کی وضاحت کی ہے۔[1]

عبد اللہ بن امام احمد کا بیان ہے "مجھے میرے والد نے اس کے بارے میں فرمایا: اس کی احادیث کو کاٹ دو۔ یہ جھوٹی ہیں یا یوں فرمایا کہ یہ من گھڑت ہیں۔" حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے ابن عدی سے بیان کیا ہے، کہ عبدالعزیز بن عبدالرحمٰن کی خصیف سے بیان کردہ روایات باطل ہیں۔[2]

اس امر کی تصریح خصیف کے ترجمہ میں کی ہے۔

۳۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "عبدالعزیز نے خصیف کے واسطہ سے انس رضی اللہ عنہ سے منکر حدیث بیان کی ہے اور خصیف کا انس رضی اللہ عنہ سے سماع معلوم نہیں ہو سکا۔ علامہ ذہبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "صدوق سیّئ الحفظ. ضعّفه أحمد." خصیف صدوق، خراب حافظہ والا ہے۔ امام احمد نے اس کو ضعیف کہا ہے۔ "الکاشف"(۱/ ۲۸) ابن حبان نے کہا ہے، انصاف کی بات یہ ہے، کہ اس کو ترک کردیا جائے۔[3]

اور دوسری حدیث ابن ابی شیبہ (۱/ ۳۰۲، رقم:۳۰۹۳) میں ہے اس کی سند حسن درجہ کی ہے، لیکن اصل کتاب میں "انصرف" کے بعد "ورفع یدیه، ودعا" کے الفاظ نہیں ہیں۔ لہٰذا یہ روایت قابلِ استدلال ہی نہ ٹھہری، اس کے باوجود ان روایات میں مروّجہ اجتماعی دعا کا تذکرہ تک نہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ فرض نماز کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا عام معمول انفرادی ذکر و اذکار اور دعائیں پڑھنا تھا،

---

① المجروحین: ۲/ ۱۳۸

② تهذیب التهذیب: ۳/ ۱٤٤

③ المجروحین: ۱/ ۲۸۷

جس طرح کہ بہت ساری روایات میں وارد ہے۔ اسی کو لازم پکڑنا چاہیے۔ اَلْخَیْرُ کُلُّ الْخَیْرِ فِی الاِتِّبَاعِ.

باقی رہی یہ بات کہ ضعیف حدیث فضائلِ اعمال میں قابلِ اعتبار ہے یا ضعیف کے بالمقابل صحیح نہ ہو تو اس پر بھی عمل رَوَا ہے۔ یہ بڑی پُرفریب اور پرکشش بات ہے۔ اس کی آڑ میں بہت سارے لوگ من گھڑت اور موضوع روایات کو اپنے لیے سرمایۂ افتخار تصور کرتے ہیں، جس طرح کہ واقعات شاہد ہیں۔ بالخصوص روافض اور بریلوی قبوری مسلک کی بنیاد ہی اس پر ہے۔ یہ عقیدہ و مسلک بیش بہا خرابیوں کا باعث اور دین میں اضافہ کا موجب بناء ہے۔ شریعت کی نگاہ میں اس کی کوئی قدر و قیمت نہیں۔ چاہے بظاہر کتنا ہی خوبصورت اور مزخرف محل کیوں نہ نظر آئے۔ یاد رہے تارِ عنکبوت کا سہارا لینا دراصل بدعات و خرافات کا دروازہ کھولنا ہے۔ جو سراسر خسارے کا سودا ہے۔ امام مالک رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''جو شے رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں دین نہ تھی۔ وہ آج بھی دین نہیں ہو سکتی۔''

اصل صورتِ حال یہ ہے، کہ ضعیف روایات پچاس سے زائد اقسام پر مشتمل ہیں۔ جن کی طرف حافظ ابن الصلاح نے ''علوم الحدیث'' میں اشارہ کیا ہے اور ''توضیح الأفکار شرح تنقیح الأنظار'' میں اس کی جملہ تقاسیم کی تفاصیل موجود ہیں، جن کی معرفت سے اربابِ ذوق کے لیے صحیح منزل کا تعین کرنا سہل و آسان ہو جاتا ہے۔ ویسے محققین اہلِ علم تو مطلقاً ضعیف روایت کو ناقابلِ عمل تصور کرتے ہیں۔ چنانچہ اصولِ حدیث کی مشہور کتاب ''قواعد التحدیث'' میں علامہ جمال الدین قاسمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔ ''ائمۂ حدیث کی ایک جماعت اس طرف گئی ہے کہ ضعیف پر عمل مطلقاً ناجائز ہے۔ (خواہ مسئلہ وجوبی ہو یا استحبابی) ان میں سے ابن معین، بخاری، مسلم، ابوبکر ابن العربی وغیرھم ہیں۔ ابن حزم کی بھی یہی تحقیق ہے۔''

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''ائمہ میں سے کوئی بھی یہ نہیں کہتا کہ کسی ضعیف حدیث سے کسی شئی کو واجب یا مستحب قرار دینا جائز ہے اور جو یہ کہتا ہے، وہ اجماع کی مخالفت کرتا ہے۔[1]

اور نواب صدیق حسن خاں اپنی عربی تفسیر ''فتح البیان فی مقاصد القرآن'' کے مقدمہ میں فرماتے ہیں: ''وہ شخص غلطی پر ہے، جو عقیدہ رکھے کہ فضائلِ اعمال میں ضعیف احادیث کو بھی لینا جائز ہے اب ہم بعض محدثین کی ضعیف احادیث کی روایت اور شرائط پر بعض گزارشات پیش کرتے ہیں۔ حافظ سخاوی رحمہ اللہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کے حوالہ سے فرماتے ہیں: ہم نے اپنے اُستاذ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ سے کئی بار سنا اور انھوں نے مجھے اپنے ہاتھ سے لکھ کر دیا کہ ضعیف حدیث پر عمل کے لیے تین شرطیں ہیں۔ پہلی جس پر اتفاق ہے یہ

[1] القاعدة الجليلة، ص: ٨٤

ہے، کہ ضعف شدید نہ ہو، تا کہ جھوٹوں اور جھوٹ کے ساتھ متہم، اور جن سے روایت حدیث میں بڑی غلطیاں ہوئیں، سے احتراز ہو جائے اور دوسری یہ ہے کہ وہ حدیث ایک عام اصل کے تحت ہو، تا کہ جس حدیث کا کوئی اصل صحیح ثابت نہ ہو، اس سے بچا جا سکے۔ تیسری شرط یہ ہے، کہ اس حدیث پر عمل کرتے وقت اس کے سنت ہونے کا عقیدہ نہ ہو، کیونکہ اس طرح رسول اللہ ﷺ کی طرف وہ بات منسوب ہو جائے گی، جو آپ نے نہیں فرمائی۔''

ان شرائط کی علیحدہ علیحدہ تشریح بھی پیشِ خدمت ہے۔ پہلی شرط کا معنی یہ ہے، کہ ضعیف حدیث پر عمل کے لیے حدیث کی حالت کی واقفیت ضروری ہے، تا کہ شدید ضُعف سے بچا جا سکے۔ اس شرط کو پیشِ نظر رکھ کر غور فرمایئے، کہ ہمارے ہاں آج وہ لوگ کتنی تعداد میں ہیں، جو احادیث کی صحت کے معیار کو سامنے رکھ کر گفتگو کر سکیں۔ خصوصاً احوالِ رواۃ کے سلسلہ میں جب مختلف ائمہ کی طرف سے جرح و تعدیل کا اختلاف ہوتا ہے، تو اس میں ترجیح دینا کتنا مشکل امر ہے؟ کُجا یہ کہ راوی کی عدالت اور ضبط کی باریکیوں کو سامنے رکھ کر معیارِ حدیث کے متعلق کوئی پختہ رائے قائم کی جائے۔ ہم یہ نہیں کہتے، کہ یہ کام ناممکن ہے، لیکن یہ بات ماننی پڑے گی کہ اس معیار کا فیصلہ کر سکنے والے بہت کم لوگ ہوں گے۔ نتیجتاً ضعفِ شدید اور ضعفِ خفیف کا امتیاز مِٹ جائے گا اور بیشتر دفعہ ضعفِ شدید نظر انداز کر دیا جائے گا۔

اور دوسری شرط کا معنی یہ ہے، کہ ضعیف حدیث میں مذکور مسئلہ کا اصل صحیح حدیث سے ثابت ہو، مثلاً کوئی عمل اصلاً تو صحیح حدیث سے مشروع ہے، لیکن اس پر ثواب کا ذکر ضعیف حدیث میں آیا ہو۔ غور فرمایئے! کہ بات عمل کی ہو رہی تھی اور عمل صحیح حدیث سے مشروع ہے۔ حالانکہ ثواب کا تعلق انسان سے نہیں، وہ اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ ضعیف احادیث پر عمل سے کیا فرق پڑا؟ اصل عمل تو صحیح حدیث پر ہے ضعیف پر نہیں۔

تیسری شرط پر عمل کا مطلب یہ ہے، کہ ضعفِ خفیف کے باوجود اس مسئلہ پر عمل کرتے وقت اس کے شرعی ہونے کا عقیدہ نہ رکھے، کیونکہ شرع کے ثبوت کے لیے رسول اللہ ﷺ سے نقل صحیح اور ثبوت ضروری ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مذکورہ بالا شرائط سے نتیجہ یہ نکلتا ہے، کہ صحیح حدیث کے علاوہ ضعیف پر عمل جائز نہیں۔

مسئلہ ہذا پر سیر حاصل بحث کے لیے ملاحظہ ہو! ماہنامہ محدث لاہور جلد ۹ عدد: ۱۔۲، میں شائع شدہ ہمارا تفصیلی فتویٰ ''بعض آیاتِ قرآنی کا جواب'' (ص: ۳۰ تا ۴۳)

اس فتویٰ کا امتیازی پہلو یہ ہے، کہ یہ اہلِ علم کی مختلف تحریروں اور نظریات کے علاوہ نقد و تبصرہ سے مزین ہے۔ لاحق اور وارد شکوک و شبہات کا علمی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

فرض نماز کے بعد اجتماعی دعا:

سوال میں چند سال سے ماہنامہ ''محدث'' کا مستقل قاری ہوں اور آپ کا سوال وجواب والا کالم بہت شوق سے پڑھتا ہوں۔ میں ''فرض نماز کے بعد اجتماعی دعا'' کے سلسلہ میں آپ کی رہنمائی چاہتا ہوں۔

سب سے پہلے میں نے مجلّہ ''الدعوۃ'' میں مفتی مبشر احمد ربانی صاحب کے قلم سے یہ مسئلہ پڑھا۔ انہوں نے اپنے فتوے کی تائید میں امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ اور ابن قیم کی کتابوں کے اقتباسات نقل کئے۔ پھر مفتی اعظم ابن باز رحمہ اللہ کا فتویٰ پڑھا۔ شیخ الحدیث حافظ محمد شریف صاحب سے خود میں نے پوچھا۔ مولانا اقبال کیلانی کی کتاب ''نماز کے مسائل'' میں بھی پڑھا۔ مذکورہ بالا تمام علما کے نزدیک یہ دعا بدعت ہے سنت نہیں۔ (کیونکہ میرے خیال میں جو چیز سنت نہ ہو، وہ بدعت ہی ہے۔)

البتہ مولانا عاصم الحداد رحمہ اللہ ''فقہ السنہ'' میں لکھتے ہیں کہ اس پر ہمیشگی ٹھیک نہیں۔ پھر میں نے مشہور محقق عالم حافظ زبیر علی زئی صاحب سے خط لکھ کر پوچھا۔ ان کے دو خط میرے پاس ہیں جن کا خلاصہ یہ ہے کہ

فرض نماز کے بعد اجتماعی دعا کسی صحیح حدیث سے ثابت نہیں! بعض ضعیف احادیث میں فرائض کے بعد رسول اللہ ﷺ سے انفرادی دعا مروی ہے۔ بعض علما مختلف روایات کے عموم اور ضعیف احادیث کی رو سے اسے ثابت سمجھتے ہیں مثلاً ''طبرانی'' (یا شاید ''طبری'') کی فضیل بن سلیمان والی روایت۔ اگر یہ روایت ثابت ہو جائے تو پھر فرائض کے بعد انفرادی اور اجتماعی دونوں طرح دعا کرنا جائز ہے۔ یہ مسئلہ اجتہادی ہے، اس میں بدعت کا فتویٰ نہیں لگانا چاہئے اور قولِ راجح یہی ہے کہ یہ دعا نہ کی جائے۔ اِلا یہ کہ کبھی کبھار کوئی مطالبہ ہو۔ چونکہ یہ مسئلہ اجتہادی ہے، اس لئے جس کی جو تحقیق ہے عمل کرے۔ ان شاء اللہ ماجور ہوگا۔

دوسری طرف گوجرانوالہ کے عالم دین مولانا بشیر الرحمٰن سلفی صاحب نے اپنی کتاب غالباً ''الدعاء؛ روحِ عبادت'' میں اس دعا کو بہت ساری حدیثوں اور آیتوں کی رو سے سنتِ ثابتہ بتلاتے ہیں۔ منکرین کو نوخیز علما میں شمار کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک سابقہ علمائے اہلحدیث مثلاً مولانا اسماعیل سلفی رحمہ اللہ وغیرہ کا یہ موقف نہیں تھا اور حضرت عبد اللہ بن زبیرؓ کی ایک روایت پر وہ بہت زور دیتے ہیں۔

اسی مسئلے پر اس سلسلے کی دوسری کتاب جس کے اوپر یعنی باہر والے ٹائٹل پر ''فرض نمازوں کے بعد دعائے اجتماعی کے فضائل و دلائل'' از مولانا عبد الجبار سلفی اور اندر والے ٹائٹل پر ''فرض نمازوں کے بعد دعائے اجتماعی اور اہلحدیث کا مسلکِ اعتدال'' لکھا ہوا ہے۔ مولانا ابو مسعود عبد الجبار سلفی صاحب بھی اسے سنت ہی بتلاتے ہیں اور بہت ساری حدیثوں اور آیتوں سے حوالے دیتے ہیں۔ موخر الذکر دونوں علما منکرین

اجتماعی دعا (یعنی علماء) کو بعض جگہ پر بہت سخت الفاظ کہہ جاتے ہیں جس کا اندازہ دونوں کتابیں پڑھنے سے ہوتا ہے۔

اب آپ بتائیں کہ ایسی صورتحال میں ہم کیا کریں۔ دونوں طرف اہل حدیث علماء ہیں کچھ سنت بتلا رہے ہیں اور کچھ بدعت (معاملہ سنت اور بدعت کا ہے)۔اس سلسلے میں بہت سے سوال ذہن میں اٹھتے ہیں مثلاً :ا۔اہلحدیث علماء میں اتنا اختلاف کیوں ہے؟

۲۔ کیا واقعی یہ دعا بدعت ہے؟ اگر ہے تو پھر جو علماء اسے سنت سمجھتے ہیں، بالخصوص جن کا میں نے ذکر کیا ہے،ان کی کتابوں میں جو دلائل ہیں ان کا کیا کریں؟

۳۔ اور اگر بدعت نہیں ہے تو جو علماء اسے بدعت سمجھتے ہیں، وہ کن دلائل کی رو سے اسے بدعت کہتے ہیں؟

۴۔ یا پھر یہ مسئلہ اجتہادی ہے (سنت ، بدعت والا کوئی مسئلہ نہیں) جس کی جو تحقیق ہو عمل کرے۔ دونوں طرح ٹھیک ہے--- گنجائش موجود ہے؟

۵۔ انفرادی دعا فرائض یا سنن کے بعد باقاعدگی سے جائز ہے؟ یا کبھی کبھار؟

۶۔ بعض علماء صرف جمعہ کی نماز کے بعد ہمیشہ دعا کرتے ہیں۔اس میں شرکت کا کیا حکم ہے؟

میں نے ساری تفصیل سے آپ کو آگاہ کر دیا ہے۔ برائے مہربانی دونوں صورتوں میں یعنی اگر بدعت ہے تو سنت کہنے والوں کے تمام دلائل کی حقیقت اور اگر سنت ہے تو منکرین کیوں اسے بدعت کہتے ہیں، مکمل تفصیل سے بیان کریں۔ نیز سابقہ علما اور محدثین کے مسلک کو بھی بیان کریں۔ جزاکم اللہ خیراً (محمد نوید عامر)

الجواب بعون الوهاب: بلاشبہ عام حالات میں ہاتھ اُٹھا کر دعا کرنا متعدد احادیث سے ثابت ہے جس میں کوئی شک نہیں ہونا چاہئے۔اس موضوع پر علامہ سیوطی کا ایک مستقل رسالہ بنام فض الوعاء فی احادیث رفع الیدین فی الدعاء بھی ہے اور اسی موضوع پر حافظ منذری کی بھی ایک تصنیف ہے اور امام نووی نے المجموع شرح المهذب (۴/ ۵۰۷تا۵۱۱) میں صفة الصلاة باب کے آخر میں صحیحین سے یا دونوں میں سے کسی ایک سے قریباً تیس احادیث جمع کی ہیں جن میں دعا میں رفع الیدین کی تصریح موجود ہے۔مزید براں قرآن کی متعدد آیات میں دعا کی صرف ترغیب وتحریص ہی نہیں بلکہ دعا کا حکم بھی دیا گیا ہے۔جن کی عملی تفسیر خود رسول اکرم ﷺ کی ذاتِ گرامی ہے۔ارشادِ باری تعالیٰ ہے:﴿ وَمَا يَنطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ ○ إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ○﴾ (النجم:۳ ، ٤) ''اور آپ ﷺ اپنی خواہش نفس کی پیروی میں بات نہیں کرتے وہ تو وحی ہوتی ہے جو ان پر اتاری جاتی ہے۔''

شریعت کی قولی وفعلی تشریحات کتبِ احادیث اور ان کی شروح میں محفوظ ہیں جن کے ذریعے ایک طالب حق بآسانی مطلوبہ مقاصد سے آگاہی حاصل کرسکتا ہے۔ بالخصوص نماز ایک عظیم فریضہ ہے جس کی جملہ جزئیات کا عملی نمونہ ہمہ وقت آپ ﷺ خود تھے اور صحابہ کرام کی ایک بڑی جماعت آپ کی اقتدا میں پانچوں وقت نمازیں پڑھتی تھی۔ اُنہوں نے ہر اعتبار سے نماز کے مسائل کی وضاحت میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ مگر ان سے کسی ایک فرد نے بھی نماز کے بعد اجتماعی دعا کا ذکر تک نہیں کیا۔ پھر محدثین عظام جن کی حدیثی خدمات اظہر من الشمس ہیں جنہوں نے ایک ایک فرمانِ نبوی سے بے شمار مسائل کا استنباط واستخراج کیا، کبھی کسی نے کسی روایت سے فرض نماز کے بعد اجتماعی دعا کا وجوب یا استحباب کا مسئلہ اَخذ نہیں کیا۔ یہاں تک کہ اجتماعی دعا کے قائلین نے جن روایات کو اپنے استدلال کی بنیاد بنایا ہے، وہ بھی ذخیرۂ حدیث میں موجود اور محدثین کے سامنے تھیں۔ لیکن اس کے باوجود آپ ائمہ محدثین کے ابواب وتراجم کو اٹھا کر دیکھیں، آپ کو اجتماعی دعا کے فرض یا استحباب پر ادنیٰ سی جھلک بھی نظر نہیں آئے گی۔ اجتماعی دعا کے قائلین کے دلائل اور ان پر محاکمہ درج ذیل ہے:

ا۔ بطورِ مثال حضرت ابوامامہ کی روایت کو لیجئے۔۔۔

رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا گیا کہ دعا کس وقت زیادہ قبول ہوتی ہے۔ ارشاد فرمایا: جوف اللیل الآخر ودبر الصلوات المکتوبات رات کے آخری حصہ میں اور فرض نمازوں کے بعد۔[1]

یہ روایت ابواب ماجاء فی جامع الدعوات کے ضمن میں بیان ہوئی ہے اور امام ترمذی نے اس پر حسن کا حکم لگایا ہے۔ اصل صورتِ حال یہ ہے کہ یہ حدیث ضعیف ہے، اس میں ابن جریج مدلس راوی ہے۔ دارقطنی نے کہا کہ بدترین تدلیس ابن جریج کی ہے کیونکہ وہ تدلیس اس وقت کرتا ہے جب اس نے حدیث کسی مجروح سے سنی ہو۔ اسی امر کی صراحت حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کی کتاب طبقات المدلسین میں بھی موجود ہے اور روایتِ ہذا کو ابن جریج نے عنعنہ سے ذکر کیا ہے، سماع اور تحدیث کی صراحت نہیں کی۔

دوسری بات یہ ہے کہ سند میں انقطاع ہے کیونکہ اس میں راوی عبدالرحمٰن بن سابط کا ابن جریج سے سماع ثابت نہیں، امام ابن معین نے یہی کچھ کہا ہے۔ پھر یہ بھی یاد رہے کہ اس حدیث میں دبر الصلوات المکتوبات کا اضافہ ''شاذ'' ہے۔ کیونکہ اس حدیث کی ابوامامہ سے پانچ سندیں اور بھی ہیں جن میں یہ اضافہ نہیں بلکہ صرف پہلے ٹکڑے جوف اللیل الآخر پر اکتفا کیا گیا ہے۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو: الفتوحات الربانیة: ۳/ ۳۰

اگر اس حدیث کو مان بھی لیا جائے تب بھی چونکہ اس حدیث میں اجتماعی دعا کا تو ذکر ہی نہیں، اس لئے

[1] سنن الترمذی: ۵/ ۱۸۸ عمل الیوم واللیلة للنسائی: ص: ۱۸۶

یہ دلیل کیسے بن سکتی ہے؟ صاحبِ مشکوٰۃ نے اس حدیث کو عنوان "باب الذکر بعد الصلوٰۃ" کے تحت ذکر کیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مولف کے نزدیک اس سے مقصود عمومی ذکر و اذکار ہیں جو انفرادی طور پر ہاتھ اٹھائے بغیر دعا ہی کی ایک شکل ہے اور ان میں کسی کو کوئی اختلاف ہی نہیں کہ جس طرح حالت نماز میں ذِکر ہیں، اسی طرح سلام پھیرنے کے بعد بھی بہت ساری دعائیں پڑھنا مسنون ہیں۔ ہر مقام پر یہ سمجھ لینا کہ ہاتھ اُٹھائے بغیر دعا کا کوئی تصور نہیں، ایسا تصور جہالت اور شرعی نصوص سے لاعلمی پر مبنی ہے۔

۲۔ اجتماعی دعا کے قائلین کا استدلال مصنف ابن ابی شیبہ کی اس روایت سے بھی ہے جو یزید بن اسود عامری سے مروی ہے کہ «صَلَّيْتُ مَعَ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْفَجْرَ، فَلَمَّا سَلَّمَ انْحَرَفَ ورفع يديه ودعا» "میں نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ صبح کی نماز ادا کی جب آپ ﷺ نے سلام پھیرا تو قبلہ کی طرف سے منہ موڑ کر دونوں ہاتھ اُٹھا کر دعا کی۔"[1]

اس روایت کی سند بھی "حسن" درجہ کی ہے مگر اس میں ورفع يديه ودعا کے الفاظ نہیں۔[2]

یہ حدیث ابوداود، نسائی، ترمذی اور مسند احمد وغیرہ میں بھی ہے مگر ان میں بھی مذکورہ الفاظ نہیں۔

---

① مصنف ابن ابی شیبة، کتاب الصلوٰة، مَنْ كَانَ يَسْتَحِبُّ إِذَا سَلَّمَ أَنْ يَقُومَ أَوْ يَنْحَرِفَ، رقم: ٣٠٩٣

② مصنف ابن ابی شیبہ کی کتاب الصلاة باب من كان يستحب إذا سلم أن يقوم أو ينحرف (١/ ٣٠٢) میں یہ روایت موجود ہے لیکن 'و رفع يديه و دعا' کے الفاظ اس میں موجود نہیں جیسا کہ محترم حافظ ثناء اللہ مدنی ﷾ نے بھی اشارہ کیا ہے۔ ان الفاظ کے اضافے کا معاملہ بھی ایک داستان ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ چند اہل علم نے غلط فہمی سے اسے اپنی کتابوں میں نقل کر دیا اور ان کے بعد میں آنے والے دیگر اہل علم بھی اصل کتاب سے مراجعت کیے بغیر حوالہ دیتے رہے۔ مثلاً شیخ محمد بن مقبول الاہدل یمنی (متوفی ۱۲۵۸ھ) نے سب سے پہلے اپنے رسالہ سنية رفع اليدين في الدعا بعد الصلاة المكتوبة میں اسے ابن ابی شیبہ کے حوالہ سے نقل کیا۔ اسی طرح شیخ عبدالحیی لکھنوی ﷫ نے اپنی کتاب النافع الکبیر کے آخر میں فرض نمازوں کے بعد دعائے اجتماعی کے ثبوت کے لیے اس سے ملتی جلتی روایت ابن السنی کی سند سے ذکر کی۔ پھر ابن ابی شیبہ ہی کی روایت کی بنیاد پر سید نذیر حسین دہلوی، محمد عبدالرب، سید حسین احمد وغیرہ نے بھی فرض نمازوں کے بعد اجتماعی دعا کے جواز کا فتویٰ دے دیا۔ دیکھئے فتاویٰ نذیریہ، ج:۱، ص: ۵۶۶، ۵۷۰۔ اسی طرح حافظ عبداللہ روپڑی نے بھی ابن ابی شیبہ کی اس روایت کے پیش نظر فرض نمازوں کے بعد اجتماعی دعا کے ثبوت کا فتویٰ دیا۔ دیکھئے فتاویٰ اہل حدیث، ج:۲، ص: ۱۹۰ تا ۱۹۳۔ اسی طرح محمد علی المالکی (متوفی: ۱۳۶۶ھ) نے اس کتاب کی تلخیص میں، پھر ظفر احمد تھانوی نے انہی کا تتبع کرتے ہوئے اعلاء السنن (۴/۱۶۴) میں اور علامہ بنوری نے معارف السنن (۳/۱۲۳) میں اسے ذکر کیا، حالانکہ اصل کتاب میں وہ الفاظ ہی نہ تھے کہ جن کی بنیاد پر مسئلہ مذکور ثابت کیا جا رہا تھا۔ مذکورہ بالا یہ تفصیل شیخ ابو غدہ عبدالفتاح نے اپنی تالیف ثلاث رسائل فی استحباب الدعاء، ص: ۱۳۸ تا ۱۴۰ میں رقم کی ہے۔ (محدث)

۳۔ ان حضرات کا استدلال حضرت ابوہریرہ کی اس روایت سے بھی ہے کہ ''رسول اللہ ﷺ نے سلام پھیرنے کے بعد قبلہ رخ ہو کر یہ دعا کی:

« اللهم خلص الوليد بن الوليد وعياش بن ابی ربيعة ... الخ »[1]

اس روایت میں کئی باتیں محل نظر ہیں۔۔۔ اوّل، تو اس میں بھی اجتماعی دعا کا ذکر نہیں۔ ثانیاً، اس میں راوی علی بن زید بن جدعان ضعیف ہے۔ ثالثاً، اس روایت کی تین سندیں اور بھی ہیں جن میں رکوع کے بعد اس دعا کا ذکر ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ علی بن زید کو روایت میں وہم ہوا ہے کیونکہ مذکورہ دعا قنوتِ نازلہ تھی۔

۴۔ ان حضرات کا استدلال فضل بن عباس سے مروی اس روایت سے بھی ہے کہ ''نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: نماز دو رکعت ہے۔ ہر دو رکعت میں تشہد بیٹھو یعنی سلام پھیرو۔ خشوع و خضوع اور اطمینان کرو پھر دونوں ہاتھوں کو اپنے ربّ کی طرف سیدھے پھیلاؤ اور یاربّ یاربّ کہو۔ جو شخص ایسا نہیں کرے گا، اس کی نماز ناقص ہوگی، ناقص ہوگی۔ اور ایک دوسری روایت میں اس شخص کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وہ ایسا ایسا ہے۔''[2]

یہ روایت مسند احمد، ترمذی، ابویعلی اور ابن خزیمہ وغیرہ میں ہے۔ اس کے بھی متعدد جوابات ہیں:

۱۔ اس کی سند میں عبداللہ بن نافع بن ابی العمیاء مجہول راوی ہے۔

۲۔ اس روایت کا تعلق نفلی نماز سے ہے کیونکہ فرض نماز تو تین اور چار رکعت بھی ہوتی ہے۔ ائمہ حدیث ابوداود، ابن ماجه، ابن خزیمه اور بیہقی اس کو ''باب صلوٰة الليل والنهار'' کے تحت لائے ہیں اور امام ترمذی نے اس کو ماجاء فی التخشع فی الصلاة میں ذکر کیا ہے۔

۳۔ اگر اس روایت کو تسلیم بھی کر لیا جائے تو اس میں اجتماعی دعا کا ذکر ہی نہیں کیونکہ اس میں تو سب صیغے واحد کے ہیں۔

۵۔ ان لوگوں کا استدلال حضرت عبداللہ بن زبیر کے ایک اثر سے بھی ہے کہ انہوں نے ایک آدمی کو سلام پھیرنے سے پہلے ہاتھ اٹھائے دیکھا تو کہا: ''رسول اللہ ﷺ نماز سے فراغت کے بعد ہاتھ اُٹھا کر دعا کرتے تھے۔''[3]

---

[1] تفسیر ابن کثیر ۱/۵۵۵

[2] سنن الترمذی، بَابُ مَا جَاءَ فِي التَّخَشُّعِ فِي الصَّلَاةِ، رقم: ۳۸۵

[3] مجمع الزوائد

واقعہ کے سیاق سے ظاہر ہے کہ یہ آدمی دوسروں کے سامنے انفراداً نماز پڑھ رہا تھا۔ اس لئے یہ قصہ نفلی نماز کا ہے، نہ کہ فرض کا۔ بنا بریں زیر بحث مسئلہ سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔

۶۔ نیز ان کا استدلال اس روایت سے بھی ہے کہ جو آدمی ہر نماز کے بعد اپنے دونوں ہاتھ اٹھا کر کہے: اللهم إلهي وإله إبراهيم... الخ تو اس کے ہاتھوں کو اللہ نامراد نہیں پھیرتا۔ (عمل الیوم واللیلہ از ابن السنی: ص) تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس کی سند میں راوی اسحٰق بن خالد ضعیف ہے اور عبدالعزیز بن عبدالرحمٰن بھی اس میں سخت ضعیف ہے اور تیسرا راوی خصیف بن عبدالرحمٰن کمزور حفظ والا (سیی الحفظ) ہے یعنی اس کا حافظہ خراب ہے اور امام احمد نے اس کو ضعیف کہا ہے۔

۷۔ بعض لوگ اس روایت سے بھی استناد لیتے ہیں کہ

''جو شخص کسی قوم کا امام ہو تو اسے اپنے لئے ہی دعا نہیں کرنی چاہئے، اگر اس نے ایسا کیا تو اس نے قوم کی خیانت کی۔''[1]

اس کا جواب یہ ہے کہ ابن خزیمہ نے اپنی صحیح (۶۳/۱) میں اور علامہ البانی نے ضعیف الجامع میں اس کو ضعیف کہا ہے۔ (۲۵۶۵)

بفرضِ تسلیم، اس کا تعلق اندرونِ نماز دعاوں سے ہے، نماز سے فراغت کی دعاوں سے نہیں۔ دوسری طرف امام ابن قیم نے ''زاد المعاد'' میں اس امر کی تصریح کی ہے کہ تمام نماز میں نبی ﷺ کی دعائیں بصیغہ مفرد ہیں تو پھر مقتدیوں کی شرکت کا کیا معنی ہوا، یہ بھی غور طلب معاملہ ہے۔ اور ابن خزیمہ نے حدیثِ ہذا کو غیر ثابت کہا ہے اور دعاءِ استفتاح اللهم اغسله من خطایای--- پر انہوں نے باب قائم کیا ہے کہ امام کو اپنے لئے خصوصی دعا کرنے کی رخصت ہے۔ ملاحظہ ہو صحیح ابن خزیمہ (۶۳/۳) اور امام ابن تیمیہ کا خیال ہے کہ یہ حدیث دعاءِ قنوت وغیرہ کے بارے میں ہے۔[2]

نیز اس حدیث میں صرف امام کے لئے ہدایت ہے کہ اپنے لئے خاص دعا نہ کرے، اس میں یہ تو نہیں کہ مقتدی بھی ساتھ دعا کریں، لہٰذا اس حدیث سے بھی اجتماعی دعا پر استدلال کرنا ناقابل قبول ہے اور پھر یہ خطاب بحالتِ امامت ہے، سلام پھیرنے کے بعد والی کیفیت سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔

عرصہ ہوا، گلبرگ لاہور میں ایک تقریب تھی جس میں استاذِ مکرم حافظ محمد محدث گوندلوی رحمہ اللہ، مولانا محمد

---

[1] مسند احمد، سنن أبی داود، بَابُ أَيُصَلِّي الرَّجُلُ وَهُوَ حَاقِنٌ؟، رقم: ۹۰ ، سنن الترمذی، بَابُ مَا جَاءَ فِي كَرَاهِيَةِ أَنْ يَخُصَّ الإِمَامُ نَفْسَهُ بِالدُّعَاءِ، رقم: ۳۵۷

[2] زاد المعاد: ج ۱، ص: ۲۶٤

عطاء اللہ حنیف رحمہ اللہ اور راقم الحروف شریک تھا۔ اس وقت مغرب کی نماز محدث گوندلوی نے پڑھائی، بعد میں کسی نے کہا: حضرت دعاء کیجئے تو انہوں نے فرمایا کہ میری امامت ختم ہو چکی ہے۔ ان کا مقصود یہ تھا کہ امام اور مقتدی اب اِقتدا کی پابندی سے آزاد ہیں، اس لئے اجتماعی دعا کی ضرورت نہیں۔

اجتماعی دعا اور صحابہؓ و تابعین رحمہ اللہ کا طرزِ عمل

سوال میں جس روایت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، غالباً وہ فضل بن عباس کی روایت ہے جس کی حقیقت پہلے واضح ہو چکی۔ بعض لوگوں کا دعویٰ یہ بھی ہے کہ فرض نماز کے بعد اجتماعی دعا کرنے پر تعامل اُمت ہے۔ اب بالاختصار اس کی حقیقت کو ملاحظہ فرمائیں:

کتبِ احادیث میں مشہور قصہ ذوالیدین سے بھی اس امر کی نشاندہی ہوتی ہے کہ عہدِ نبوت میں نماز کے بعد اجتماعی دعا کا تصور نہ تھا۔

صحیح بخاری کے الفاظ یوں ہیں: «وَخَرَجَ سَرَعَانُ النَّاسِ فَقَالُوا: أَقَصُرَتِ الصَّلَاةُ؟»

یعنی ''مسجد سے جلدی نکلنے والے مقتدی یہ کہتے ہوئے نکل گئے کہ کیا نماز کم کر دی گئی ہے۔''[1]

اور صحیح بخاری میں باب التسلیم کے تحت حدیث ہے کہ حضرت اُمّ سلمہؓ نے فرمایا: ''نبی اکرم ﷺ جب سلام پھیرتے تو عورتیں فوراً اُٹھ کھڑی ہوتیں اور آپ ﷺ تھوڑے سے وقفہ کے لئے تشریف رکھتے۔'' امام ابن شہاب زہری رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ ''میرا خیال ہے کہ رسول اللہ ﷺ اس لئے بیٹھے رہتے تا کہ عورتیں مردوں سے پہلے گھروں کو رخصت ہو جائیں۔''[2]

اس حدیث کو امام بخاری رحمہ اللہ نے بھی سلام پھیرنے کے باب کے تحت نقل کیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سلام پھیرنے کے بعد بیٹھے رہنے کا عام حالات میں اس وقت معمول نہ تھا۔ اس سے نماز سے فراغت کے بعد اجتماعی دعا کا تصور ناپید ہو جاتا ہے۔ صحیح بخاری کے باب الذکر بعد الصلوٰۃ کی احادیث پر غور کیجئے یہاں صرف ذکر و اذکار کی تصریح ہے جس سے اجتماعی دعا کی خود بخود نفی ہو جاتی ہے اور صحیح بخاری کے باب مکث الإمام فی مصلاہ بعد السلام اور باب من صلی بالناس فذکر حاجة فتخطا ہم پر بار بار غور فرمائیے، حقیقتِ حال منکشف ہو جائے گی۔ ان شاء اللہ

ابن ابی شیبہ (۱/۳۰۲) میں ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سلام پھیرنے کے بعد اِمام کے بیٹھے رہنے کو بدعت

---

[1] صحیح البخاری، بَابُ مَنْ يُكَبِّرُ فِي سَجْدَتَيِ السَّهْوِ، رقم: ۱۲۲۹

[2] صحیح البخاری، بَابُ التَّسْلِيمِ، رقم: ۸۳۷

قرار دیتے تھے اور عبداللہ بن عمر نماز کے اِتمام پر فوراً کھڑے ہو جاتے یا جائے نماز سے اُٹھ جاتے۔ [1]

حضرت ابو عبیدہ بن جراح کی سلام کے بعد ایسی کیفیت ہوتی، گویا گرم پتھر پر تھے۔ فوراً اُٹھ کھڑے ہوتے۔ [2]

نیز صحیح حدیث میں حضرت عائشہ کا بیان ہے کہ

«كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا سَلَّمَ لَمْ يَقْعُدْ إِلَّا مِقْدَارَ مَا يَقُولُ: اللَّهُمَّ أَنْتَ السَّلَامُ وَمِنْكَ السَّلَامُ، تَبَارَكْتَ ذَا الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ وَفِي رِوَايَةِ ابْنِ نُمَيْرٍ يَا ذَا الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ» [3]

''رسول اللہ ﷺ سلام پھیرنے کے بعد اللھم انت السلام...... الخ'' پڑھنے کے مقدار برابر بیٹھتے۔''

اور حضرت ابن مسعودؓ سے بھی رسول اللہ ﷺ کا عمل اس طرح مروی ہے۔ اگرچہ اہل علم نے اس حدیث کی مختلف توجیہیں کی ہیں مگر ایک ظاہری توجیہ یہ بھی ہے جس سے انکار کی گنجائش نہیں کہ سلام پھیرنے کے بعد آپ فوری تشریف لے جاتے۔

حسن بصری سلام کے بعد پیچھے ہٹ جاتے یا فوراً اُٹھ کر چلے جاتے۔ [4]

اور طاؤس جب سلام پھیرتے تو بلا توقف فوراً اُٹھ کر چلے جاتے، بیٹھتے نہیں تھے۔ [5]

ابن مسعودؓ جب سلام پھیرتے تو صف سے اُٹھ کر مشرق یا مغرب کی طرف چلے جاتے۔ [6]

نسائی میں ہے کہ حضرت انس فرماتے ہیں: رسول اللہ ﷺ نماز ہلکی اور پوری پڑھا کرتے تھے۔ پھر فرمایا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ نماز پڑھی، آپ ﷺ سلام پھیرتے ہی اُٹھ جاتے، پھر میں نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ساتھ نماز پڑھی، وہ بھی سلام کے بعد کود کر اپنی جگہ سے کھڑے ہو جاتے، گویا کہ گرم

---

① كتاب الصلوٰة باب من قال يستحب إذا سلم ان يقوم وينحرف: ۱/۳۰۱

② ابن ابی شیبه: ۱/۳۰۲

③ صحیح مسلم: كتاب المساجد باب استحباب الذكر بعد الصلوٰة وبيان صفته، رقم: ۵۹۲

④ مصنف ابن ابی شیبه: ۱/۳۰۲

⑤ مصنف ابن ابی شیبه: ۱/۳۰۲

⑥ مصنف عبدالرزاق: رقم ۳۲۲۱، ۲/۲۴۳، مصنف ابن ابی شیبه: ۱/۳۰۲

پتھر پر تھے۔[1] --- ابوالزناد کہتے ہیں کہ میں نے خارجہ بن زید سے سنا کہ وہ ان اماموں کے عمل کو کوتاہی شمار کرتے تھے جو سلام پھیرنے کے بعد بیٹھے رہتے ہیں اور فرماتے کہ سنت طریقہ یہ ہے کہ امام اٹھ کر فوراً چلا جائے۔---[2] شعبی اور ابراہیم نے بھی بیٹھے رہنے کو مکروہ سمجھا ہے۔[3]

--- اور یہ بات حضرت عمر سے بھی منقول ہے۔[4] --- فقہ مالکی کی کتاب المدونة میں امام مالک کا قول منقول ہے کہ امام کو سلام کے فوراً بعد اُٹھ کر چلے جانا چاہئے، بیٹھے نہیں رہنا چاہئے۔ ان آثار کو ذکر کرنے سے مقصود عملاً اجتماعی دعا کی نفی ہے ورنہ اگر کوئی بیٹھا رہے تو اسکا بھی جواز ہے جس طرح کہ دیگر روایات میں تصریح ہے۔

فتوی اللجنة الدائمة سعودی عرب میں کبار علماء پر مشتمل اللجنة الدائمة نے بھی اس بارے میں فتویٰ صادر کیا ہے، ملاحظہ فرمائیں

''عبادات کی جملہ اقسامِ توقیفی ہیں۔ جس کا مفہوم یہ ہے کہ ان کی ہیئات اور کیفیات کا طریق کار کتاب وسنت سے ثابت ہونا چاہئے۔ نماز کے بعد اجتماعی دعا کی مزعومہ صورت کا ثبوت نبی اکرم ﷺ کے قول، فعل اور تقریر سے نہیں ملتا۔ ساری خیر اسی میں ہے کہ ہم آپ ﷺ کی ہدایت کی پیروی کریں۔

نماز سے فراغت کے بعد آپ ﷺ جو وِرد و وظائف پڑھتے تھے، وہ مستند دلائل سے ثابت ہیں بعد میں انہی وظائف پر آپ کے خلفاءِ راشدین، صحابہ کرام اور ائمہ سلف صالحین کار بند رہے۔ رسول اللہ ﷺ کے فرامین کے خلاف جو طریقہ ایجاد کیا جائے گا، وہ مردود ہے۔ نبی رحمت ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے: من عمل عملا ليس عليه امرنا فهو ردّ جو دین میں نیا طریقہ ایجاد کرے، وہ ناقابل قبول ہے۔

جو امام سلام پھیرنے کے بعد ہاتھ اٹھا کر دعا کرتا ہے اور اس کے مقتدی بھی ہاتھ اٹھائے آمین، آمین کہتے ہیں، ان حضرات سے مطالبہ کیا جائے کہ نبی ﷺ کے عمل سے دلیل پیش کریں ورنہ اس عمل کی کوئی حقیقت نہیں، وہ ناقابل قبول اور مردود ہے۔ جس طرح ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿قُلْ هَاتُوا بُرْهَٰنَكُمْ إِنْ كُنتُمْ صَادِقِينَ﴾ (النمل:٦٤) سنت سے ہمیں کوئی دلیل نہیں مل سکی جو ان کے دعویٰ کی مستند بن سکے۔''[5]

---

[1] صحیح سنن نسائی: رقم: ٧٩٤ للالبانی
[2] سنن کبریٰ بیهقی: ١٨٣/٦
[3] سنن کبریٰ بیهقی ١٨٢/٢
[4] سنن کبریٰ بیهقی: ١٨٢/٢
[5] فتاویٰ اللجنة الدائمة: ٩٩/٧

اس فتویٰ کو میں نے اپنی عربی تصنیف جائزۃ الاحوذی فی التعلیقات السلفیۃ علی سنن الترمذی میں بھی درج کیا۔ راقم السطور نے بلادِ عربیہ کا بالعموم اور سعودی عرب کا بالخصوص متعدد مرتبہ دورہ کیا ہے، کسی مقام پرنماز کے بعد اجتماعی دعا کا عمل نظر نہیں آیا۔ دراصل یہ برصغیر میں ہندوستانی اور پاکستانی بعض سلفیوں اور اکثرحنفیوں کی ایجاد ہے۔ اس کو دین کا حصہ سمجھ لیا گیا ہے۔ کیا ان ممالک میں رہائش پذیر سب جاہل اور مسئلہ ہذا سے نابلد ہیں، حقیقتِ حال اس کے برعکس ہے۔ (1) ہم سب کا فرض ہے کہ اس پر غوروفکر کریں۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿وَالَّذِينَ جَٰهَدُوا فِينَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا﴾ (العنکبوت:٦٩) ''اور جن لوگوں نے ہمارے لئے کوشش کی، ہم ان کو ضرور اپنے رستے دکھا دیں گے۔''

بنابریں کتاب وسنت کے سچے اور مخلص داعی کا فرض ہے کہ قائلین اور فاعلین سے اس سلسلہ میں نص صحیح وصریح کا مطالبہ کرے۔ بصورتِ دیگر ان کو اپنے غلط موقف سے رجوع پر مجبور کرے۔ والتوفیق بیداللہ دیگر ضمنی سوالات کے جوابات درج ذیل ہیں:

۱۔ اہلحدیث کا مسلک چونکہ کتاب وسنت ہے بسا اوقات نصوص کے فہم کی بنا پر اختلاف پیدا ہوجاتا ہے، اس بنا پر یہ فعل قابل مذمت نہیں۔

۲۔ جب یہ عمل سنتِ صحیحہ سے ثابت نہیں تو بلا شبہ بدعت ہے۔ مخالفین کے دلائل کی بنا شرعی عمومات پر ہے،

(1) حافظ صاحب کے تفصیلی فتویٰ سے یہ شبہ نہیں ہونا چاہیے کہ آپ اجتماعی دعا کی مطلق طور پر نفی کررہے ہیں بلکہ بعض استثنائی صورتوں میں آپ اجتماعی دعا کے قائل ہیں مثلاً ہفت روزہ الاعتصام (ج۵۴/ عدد۱۶، بابت ۲۶۔اپریل تا ۲مئی ۲۰۰۲ء، ص:۹) میں حافظ صاحب ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے رقمطراز ہیں: ''رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے بارش کے لیے اجتماعی دعا کی تھی چنانچہ صحیح بخاری میں ہے:« فَرَفع رسول الله يديه يدعو و رفع الناس أيديهم معه يدعون......» اس حدیث سے معلوم ہوا کہ بوقتِ حاجت یا ضرورت اور کسی سبب کی بنا پر اجتماعی دعا کا جواز ہے۔

اسی طرح ایک اور سائل کا جواب دیتے ہوئے حافظ صاحب رقم طراز ہیں: ''حضرت عثمان رضی اللہ عنہ منبر پر تشریف فرما تھے کہ عمر بن عاص رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ آپ نے تو اس امت کو تباہی کے کنارے پر لا کھڑا کیا ہے۔ لہٰذا آپ اور دوسرے لوگ بھی آپ کے ساتھ توبہ کریں۔ علقمہ کا بیان ہے کہ آپ نے قبلہ رخ ہوکر ہاتھ اٹھائے اور فرمایا: اللهم انی استغفرك و أتوب اليك اور لوگوں نے بھی آپ کے ساتھ ہاتھ اٹھائے۔

اسی طرح موصوف اپنے ایک فتویٰ (الاعتصام،۱۲/ جنوری ۲۰۰۱ء،ص:۱۱) میں رقم طراز ہیں کہ ''ہمارے شیوخ محدث روپڑی اور محدث گوندلوی رحمہ اللہ نماز کے بعد اجتماعی دعا کے عملاً قائل و فائل نہ تھے، الا یہ کہ کسی کی طرف سے دعا کی درخواست ہو۔ چنانچہ مقتدیوں میں سے کسی کے تقاضے پر یا امام کی کسی ضرورت اور مطالبے پر اجتماعی دعا کرنا جائز ہے جب کہ اسے نمازوں میں معمول بنالینا خلاف سنت ہے۔'' (محدث)

جو محل اختلاف میں مفید نہیں۔

۳۔ ظاہر ہے کہ جو شئے سنت سے ثابت نہیں، وہ بدعت ہے۔

۴۔ عبادات میں اصل توقف ہے، اجتہاد کی گنجائش نہیں۔

۵۔ انفرادی دعا کا آدمی کو ہر وقت اختیار ہے، جس مناسب وقت میں چاہے مانگ سکتا ہے لیکن ہمیشہ ایک وقت کا التزام نہیں کرنا چاہیے۔

۶۔ جمعہ کی نماز کے بعد والی دعا کا حکم بھی نماز کے بعد اجتماعی دعا جیسا ہے، تخصیص کی کوئی دلیل نہیں۔

اس مسئلے کے بارے میں ''کتاب الاعتصام'' از امام شاطبی لائق مطالعہ ہے۔

اللہ ربّ العزت جملہ اہل اسلام کو کتاب وسنت کے صحیح فہم کی توفیق عطا کرے۔ آمین

اجتماعی دعا پر حنفی علماء کا موقف

اس موضوع پر ایک مخلص حنفی دوست [1] اشاعتِ دین کا جذبہ صادقہ رکھنے والے نے درج ذیل تحریر میرے سپرد کی ہے، ان کے الفاظ ملاحظہ فرمائیں:

''آپ کو معلوم ہے کہ خانہ کعبہ اور مسجد نبوی میں نماز کے بعد اجتماعی دعا کبھی بھی نہیں ہوتی اور نہ دعا بعد الفرائض میں رفع یدین ہوتا ہے۔ پاکستان میں بھی اہل حدیث کی اکثر وبیشتر مساجد میں نماز کے بعد اجتماعی دعا نہیں ہوتی۔ دعا بعد الفرائض انفراداً رشید احمد رحمہ اللہ (بانی ہفت روزہ ''ضربِ مومن'' اور روزنامہ ''اسلام'') اپنی مشہور تالیف ''نمازوں کے بعد دعا'' یعنی زبدة الكلمات فی حکم الدعاء بعد الصلوات میں احادیث، عباراتِ فقہ، الروایات المزیدة، العبارات المزیدة کے تحت پوری تحقیقات کے بعد مندرجہ ذیل فتویٰ صفحات ۱۹، اور ۲۰ پر صادر فرما چکے ہیں۔

حاصل کلام: زبدة الكلمات مع ضمیمه میں مندرجہ تحقیقات کا حاصل یہ ہے:

① ۔ نماز کے بعد اجتماعی دعا کا مروّجہ طریقہ بالا جماع بدعتِ قبیحہ ہے۔

② ۔ دعا بعد الفرائض میں رفع یدین نہیں، إلا ان یدعو احیانا لحاجة خاصة (الا کہ کبھی کسی خاص ضرورت کے لئے ایسا کیا جائے)

③ ۔ امام مالک اور امام طرطوشی اور ان دونوں کے اصحاب رحمہم اللہ تعالیٰ کے ہاں ہر نماز کے بعد فارغ ہوتے ہی امام کا اپنی جگہ سے ہٹ جانا لازم ہے۔

[1] محترم محمد سرور صاحب نے یہ تحریر ماہنامہ القاسم (ج:۶/عدد:۱۱، مارچ:۲۰۰۳ء، ص:۱۹) میں بھی شائع کرائی ہے۔

④۔ عندالاحناف بھی امام کا فجر و عصر کے سوا نماز کے بعد تین بار استغفار اور دعا اللھم انت السلام۔۔۔ الخ سے زیادہ دیر بیٹھنا مکروہ ہے۔ اس دعا میں نہ رفع یدین ہے، نہ اجتماعیت۔ امام و مقتدی ہر شخص بلا رفع یدین سراً وانفراداً یہ مختصری دعا مانگ کر سنتوں میں مشغول ہو جائے۔

فجر و عصر کے بعد اس شرط سے بیٹھنا جائز ہے کہ اوراد و أدعیہ میں امام اور مقتدیوں کے درمیان کوئی رابطہ نہ رہے۔ نماز کے بعد کی دعا میں اجتماعیت بدعت ہے۔ امام ہو یا مقتدی ہر شخص اپنے طور پر انفراداً، سراً بلا رفع یدین دعا مانگے۔ فرض کے بعد کی دعا میں رفع یدین نہیں، البتہ کبھی کبھار کسی خاص ضرورت سے کوئی دعا مانگنا چاہے تو رفع یدین کر سکتا ہے مگر دوسروں کے سامنے التزام نہ کرے تاکہ کسی کو فرض کے بعد کی دعا میں رفع یدین کا شبہ نہ ہو۔

⑤۔ نوافل کے بعد انفراداً ہاتھ اٹھا کر طویل دعا مسنون ہے۔

⑥۔ دعا کے لئے اجتماع بدعت ہے، البتہ کسی دوسرے مقصد کے لئے اجتماع ہو تو اس میں اجتماعی دعا جائز ہے۔ واللہ الھادی إلی سبیل الرشاد وھو العاصم من المحدثات فی الدھن والبدع والضلال (۹ ربیع الاوّل ۱۴۰۹ھ)

اس تالیف کے صفحات ۲۰ تا ۲۴ پر مذکورہ بالا فتویٰ کی موافقت اور تائید میں عصر حاضر اور ماضی قریب کے اکابر کی تحریرات بھی کلمۃ الجامع کے عنوان کے تحت پیش کی گئی ہیں۔

مندرجہ بالا فتویٰ مندرجہ ذیل آیاتِ مبارکہ کے بھی عین موافق معلوم ہوتا ہے:

﴿اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّ خُفْيَةً اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ﴾ (الاعراف:۵۵)

﴿ وَ اذْكُرْ رَّبَّكَ فِيْ نَفْسِكَ تَضَرُّعًا وَّ خِيْفَةً وَّ دُوْنَ الْجَهْرِ مِنَ الْقَوْلِ بِالْغُدُوِّ وَ الْاٰصَالِ وَ لَا تَكُنْ مِّنَ الْغٰفِلِيْنَ ﴾ (الاعراف: ۲۰۵)

اگرچہ کچھ حنفی دیوبندی مساجد میں بھی نماز کے بعد اجتماعی دعا اور دعا بعد الفرائض میں رفع یدین کی بدعت آہستہ آہستہ ختم ہو رہی ہے لیکن حنفی مساجد میں اس فتویٰ پر عمل درآمد کی رفتار بہت سست ہے جس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ فتویٰ مذکورہ بالا تالیف کے أوراق میں ہی دَب کر رہ گیا ہے، عوام کے سامنے آیا ہی نہیں۔ اس تالیف میں بھی یہ فتویٰ، فتویٰ کے عنوان سے نہیں بلکہ ''حاصل کلام'' کے عنوان سے چھپا ہے۔ اس طرح یہ فتویٰ عوام کی نظروں سے اوجھل رہا ہے۔ لہٰذا یہ ضروری ہے کہ اس فتویٰ کی خوب تشہیر ہو تاکہ لوگ اس پر عمل درآمد کی طرف متوجہ ہوں۔

امید ہے کہ آپ بھی مذکورہ بالا فتویٰ سے پوری طرح متفق ہوں گے۔ اس لئے آپ سے درخواست ہے کہ آپ اس فتویٰ کو اپنے تائیدی نوٹ کے ساتھ دارالافتاء اور احکام و مسائل کے زیرعنوان بالترتیب ماہنامہ ''محدث'' اورہفت روزہ ''الاعتصام'' کی قریبی اشاعت میں شائع کروا کر عوام کو اس بدعت کے چنگل سے نجات حاصل کرنے میں مدد ورہنمائی فرما کر ثوابِ دارین سے مستفید ہوں۔'' (چوہدری محمد سرور، جوہر ٹاؤن لاہور)

اسی موضوع پر دیگر کتب ومضامین:

۱۔ التحفة المرغوبة فی افضلية الدعاء بعد المكتوبة از شیخ محمد ہاشم سندھی

۲۔ المنح المطلوبة فی استحباب رفع اليدين فی الدعاء بعد الصلوت المكتوبة از حافظ احمد بن محمد بن صدیق الغماری المغربی

۳۔ سنية رفع اليدين فی الدعاء بعد الصلوات المكتوبة از محمد بن عبدالرحمٰن الاہدل یمنی (شیخ ابو غدہ نے ان تینوں رسالوں کو اپنی تعلیق وتخریج کے ساتھ یکجا کر کے شائع کیا ہے)

۴۔ مسلك السادات إلى سبيل الدعوات بعد الصلوات المكتوبات از شیخ محمد علی المالکی المکی

۵۔ استحباب الدعوات عقيب الصلوات از مولانا محمد اشرف علی تھانوی

۶۔ حسن التفهم والدرك لمسالة الترك از عبداللہ الغماری

۷۔ الاذكار المسنونة بعد الصلوات المكتوبة از ظفر الحسن

۸۔ التحقيق الحسن فی نفی الدعاء الاجتماعی بعد الفرائض والسنن از عماد الدین حنفی دیوبندی بلوچستانی

۹۔ زبدة الكلمات فی حكم الدعا بعد الصلوات از مفتی رشید احمد حنفی

۱۰۔ النفائس المرغوبة فی حكم الدعا بعد المكتوبة از مفتی کفایت اللہ

۱۱۔ فرض نمازوں کے بعد دعائے اجتماعی کے فضائل ودلائل' از عبدالجبار سلفی

۱۲۔ الدعاء ؛روح عبادت از بشیر الرحمٰن سلفی

۱۳۔ اجتماعی دعا کی شرعی حیثیت از رانا محمد اسحٰق رحمہ اللہ

۱۴۔ فرض نمازوں کے بعد اجتماعی دعا از مولانا محمد عبدالمعبود

۱۵۔ اجتماعی دعا از مولانا صفدر عثمانی

❀ ضمنی طور پر درج ذیل علما نے اجتماعی دعا پر بحث کی ہے، چند ایک کا تذکرہ حسبِ ذیل ہے:

۱۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہ فی مجموع الفتاویٰ (۲۲/ ۵۱۹) نیز الفتاویٰ الکبریٰ (۱/ ۱۸۸ تا ۲۰۵)

۲۔ امام شاطبی فی الاعتصام (۱/ ۲۵۲، ۲۶۹، ۳۵۳، ۳۶۷)

۳۔ ابن قیم فی زاد المعاد (۱/ ۲۵۷)

۴۔ ابن الحاج فی المدخل (۲/ ۲۷۶)

۵۔ شیخ ابن باز فی فتاویٰ وتنبیہات (ص: ۳۱۱)

۶۔ شیخ صالح بن عثیمین فی فتاویٰ (۱/ ۳۶۷، ۳۶۸)

۷۔ سید نذیر حسین محدث دہلوی فی فتاویٰ نذیریہ (ج ۱ ص ۵۶۶ تا ۵۷۰)

۸۔ حافظ عبداللہ محدث روپڑی فی فتاویٰ اہلحدیث (ج ۲ ص ۱۹۰ تا ۱۹۳)

۹۔ عبدالروف بن عبدالحنان فی القول المقبول فی شرح وتعلیق صلوٰۃ الرسول (ص ۴۸۹ تا ۵۰۰)

✿ علاوہ ازیں درج ذیل رسائل وجرائد میں بھی اس موضوع پر بحثیں موجود ہیں:

۱۔ الاعتصام ج ۵۴ عدد ۱۶؛ ۱۲ تا ۱۸ جنوری ۲۰۰۲ء (ص ۱۰ تا ۱۱)

۲۔ ایضاً عدد ۷؛ ۲۳ فروری ۲۳ تا یکم مارچ، (ص: ۱۳)

۳۔ ایضاً عدد ۱۹؛ ۲۵ تا ۳۱ مئی (ص ۷ تا ۱۱)

۴۔ ایضاً عدد ۲۲: ۱۵ تا ۲۱ جون ۲۰۰۲ء (ص ۱۱ تا ۱۵)

۵۔ ماہنامہ شہادت ج ۱ عدد ۳؛ مارچ ۲۰۰۲ء (ص ۴۰)

۶۔ ایضاً عدد ۱۰؛ اکتوبر ۲۰۰۲ء (ص ۴۰)

۷۔ ماہنامہ القاسم ج ۶ عدد ۱۱؛ مارچ ۲۰۰۳ء (ص ۱۹)

۸۔ ایضاً عدد ۱۲؛ اپریل ۲۰۰۳ء (ص ۱۶) (فہرست تیار کردہ: ادارہ محدث)

کیا نبی کریم ﷺ نے نماز کے بعد اجتماعی دعا کروائی تھی:

سوال: کیا نماز فرض کے بعد حضور ﷺ نے اجتماعی دعا مانگی ہے یا اسکا حکم دیا ہے؟ حدیث کی کتاب کی جلد نمبر اور صفحہ نمبر ضرور لکھیے۔ جوابات تحریراً ارسال فرما کر ممنون فرمائیں۔

جواب: نماز فرض کے بعد اجتماعی دعا کا کوئی ثبوت نہیں۔

اجتماعی دعا کے متعلق سعودی علماء کا مؤقف:

سوال: بعد جماعت کے اجتماعی دعا کے متعلق ''الاعتصام'' کے گزشتہ کسی شمارہ میں مفتیٔ مکہ مکرمہ کا عدمِ جواز

کا فتویٰ دیکھا گیا، لیکن مختصراً ''فتاویٰ علمائے حدیث'' (۲/۲۱۴) جامعہ سعیدیہ خانیوال۔ پھر دعا کے جواز بلکہ افضلیت ''فتاویٰ نذیریہ'' (ص:۵۶۴) پر کتاب، ص:۲۱۸، تک ملاحظہ فرما کر جواب دیں۔

جواب: فرض نماز کے بعد ہاتھ اٹھا کر دعا کرنے پر ''الاعتصام'' میں متعدد دفعہ اجمالاً اور تفصیلاً بحث ہو چکی ہے۔ ''فتاویٰ نذیریہ'' میں بحوالہ ''ابن ابی شیبہ'' نقل کردہ روایات پر بھی تفصیلی گفتگو ہو چکی ہے۔ بار بار اعادہ کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔ ماحاصل اس کا یہ ہے، کہ اس بارے میں کوئی روایت ثابت نہیں۔

اسی بناء پر سعودی عرب کے بعض جید علماء مثلاً شیخ ابن باز رحمہ اللہ نے اس کو بدعت قرار دیا ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول یہ تھا، کہ بحالت تشہد سلام پھیرنے سے قبل بکثرت دعائیں کرتے تھے، جن کی تصریح کتب احادیث میں موجود ہے اور سلام پھیرنے کے بعد ذکر اذکار میں مصروف ہو جاتے۔

شریعت میں ہاتھ اٹھا کر دعا مانگنا:

سوال: فرض نماز کے بعد دعا میں بعض لوگ ہاتھ اٹھانے کو بہت ضروری خیال کرتے ہیں اور بعض مستحب، اور بعض محض جواز کے قائل ہیں، کیونکہ ہم نے کئی علماء سے سنا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے فرض نماز کے بعد کی دعاؤں میں ہاتھ اٹھانا ثابت تو نہیں مگر فرائض کے علاوہ نوافل میں یا بعد میں ہاتھ اٹھا کر دعا کا ثبوت ملتا ہے۔ اسی بناء پر اس جواز کو سنت نبوی یا ثواب نہیں خیال کیا جاتا تاکہ بدعت کے زمرے میں نہ آ جائے۔ میں نے مولانا مودودی مرحوم کی زندگی میں ان کا ایک درس سنا، جس میں انھوں نے بھی ایک سوال کے جواب میں یہی کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نماز کے بعد دعا کے لیے ہاتھ اٹھانا ثابت نہیں۔ آپ کی طرف سے کسی کے سوال کے جواب ہفت روزہ الاعتصام، ۸۔ ستمبر ۱۹۹۵ء صفحہ ۱۰/۹۳۶، پر مرقوم ہے کہ فرض نماز کے بعد اجتماعی دعا کرنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت نہیں۔ ظاہر ہے عدمِ ثبوت کی بناء پر ''احداث فی الدین'' ہی قرار پائے گا۔

ماہنامہ ''صراطِ مستقیم'' کراچی کے صفحہ ۴۱، پر ایک سوال کے جواب میں مولانا بشیر الرحمٰن سلفی کی طرف سے وضاحت ہے کہ فرض نماز کے بعد دعا میں ہاتھ اٹھانا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل سے ثابت ہے، اور یہ حدیث بالکل صحیح ہے اس سنت پر عمل کرنا چاہیے۔ ان کے شائع شدہ موقف کی فوٹو کاپی ارسال خدمت ہے:

درج بالا گزارشات کی بناء پر ایک الجھن پیدا ہو گئی ہے۔ وضاحت فرما کر عند اللہ ماجور ہوں۔ سنت نبوی اور ''احداث فی الدین'' کو عرش و فرش کے فاصلے سے تعبیر کیا جائے تو بے جا نہ ہوگا اور اس کی عملی صورت پانچ دفعہ روزانہ پیش آتی ہے جس سے اس مسئلہ کی اہمیت عیاں ہے۔

سوال یہ ہے کہ فرض نماز کے بعد ہاتھ اٹھا کر دعا مانگنا کونسی حدیث سے ثابت ہے۔حوالہ بھی اور یہ بھی بتائیں کہ آپ ﷺ نے کن کن مواقع پر ہاتھ اٹھا کر دعا مانگی ہے؟

سید نذیر حسین محدث دہلوی رحمہ اللہ نے اپنے فتاویٰ میں عنوان قائم فرمایا ہے، کہ فرض نمازوں کے بعد ہاتھ اٹھا کر دعا کرنا جائز ہے، اس مسئلہ پر انھوں نے متعدد احادیث رقم فرمائی ہیں۔مولانا عبدالرحمٰن مبارک پوری مرحوم نے بھی ''تحفة الاحوذی''(۱/ ۲٤٦) میں اس مسئلہ پر سیر حاصل گفتگو فرمائی اور فرمایا ہے کہ نمازوں کے بعد ہاتھ اٹھا کر دعا کرنا جائز ہے۔امام بخاری رحمہ اللہ نے ''الأدب المفرد'' اور ''صحیح بخاری شریف'' میں دعا میں ہاتھ اٹھانے کا اشارہ کیا ہے۔ایک صحیح حدیث نوٹ کریں کہ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے پاس ایک آدمی نے نماز کے تشہد میں دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیے تو حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

« إِنَّ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ كَانَ يَرفَعُ يَدَيهِ بَعدَ اَن يَّفرُغَ مِنَ الصَّلٰوةِ.»[1]

یہ حدیث بالکل صحیح ہے کہ آنحضرت ﷺ نماز کے بعد ہاتھ اٹھا کر دعا فرمایا کرتے تھے۔لہٰذا ہمیں بھی آپ کے عمل کی پیروی کرنا چاہیے۔اس موضوع پر راقم الحروف کا ایک رسالہ (چار صفحی) چھپ چکا ہے، اور بڑا رسالہ عنقریب چھپنے والا ہے۔انتظار کیجیے۔

(جواب): واضح ہو کہ جملہ اہلِ علم تقریباً اس بات پر متفق ہیں، کہ فرض نماز کے قطعِ نظر ہاتھ اٹھا کر دعا کرنا متعدد صحیح احادیث سے ثابت ہے۔حافظ منذری رحمہ اللہ نے اس مسئلہ پر ''جز''(رسالہ) تصنیف کیا، جس میں تیس کے قریب احادیث بیان کی ہیں۔علامہ سیوطی رحمہ اللہ کا رسالہ ''فضل الدعا'' اس کا موضوع بھی یہی ہے۔محدثین نے بھی اپنی کتابوں کے تراجم وابواب میں اس امر کو خوب واضح کیا ہے۔

لیکن بالخصوص فرض نماز کے بعد اجتماعی یا انفرادی دعا کا کیا حکم ہے؟ سو یہ مسئلہ اس وقت زیرِ غور ہے۔ جہاں تک اجتماعی دعا کا تعلق ہے، یہ رسول اللہ ﷺ سے قطعاً ثابت نہیں۔

میں نے ایک سوال کے جواب میں اسی بات کی نفی کی ہے، اور شیخ ابن باز رحمہ اللہ مفتی اعظم سعودی عرب نے اپنے بعض فتوؤں میں اس کو بدعت قرار دیا ہے۔

انفرادی دعا کے بعض اہلِ علم قائل ہیں۔علامہ مبارکپوری رحمہ اللہ کا رجحان تحفۃ الاحوذی میں اسی طرف معلوم ہوتا ہے اور شیخ محمد بن عبدالرحمٰن یمانی نے اپنے رسالہ ''سنية رفع اليدين فی الدعا'' میں اسی موقف کا اظہار کیا ہے۔جو چاہے ہاتھ اٹھا کر دعا کرسکتا ہے اور مجلّہ ''صراط مستقیم'' میں محترم مولانا بشیر الرحمٰن

[1] ابن أبی حاتم، ابن هیثم، بحواله تحفة الاحوذی، (رجاله ثقات)

سلفی نے بھی غالباً اسی طریقۂ دعا کے اثبات کی سعی فرمائی ہے، اور اجتماعی طریقہ دعا سے سائل اور مسئول عنہ دونوں ساکت ہیں۔ لہٰذا جہت کے اختلاف کی بناء پر ہمارے فتووں میں تضاد نہ ہوا۔ اب مفتی موصوف نے حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی جس روایت کو ذکر کرکے دعویٰ کیا ہے، کہ یہ حدیث بالکل صحیح ہے۔ محض مفروضہ اور غیر تحقیقی بات ہے۔ ماہرینِ فن اس بات سے آگاہ ہیں، کہ حضرت ہیثمی کا قول (رجالہ ثقاتٌ) (اس حدیث کے رواۃ ثقہ ہیں) صحت حدیث کو مستلزم نہیں۔ ممکن ہے سند میں انقطاع ہو، جب کہ حافظ موصوف کے ''مجمع الزوائد'' میں اوہام بھی معروف ہیں۔ مدعیٔ صحت کے لیے ضروری ہے، کہ پہلے اس کی صحیح سند پیش کرے۔ پھر اس پر اپنے دعوے کی بناء رکھے۔ مثل مشہور ہے: أَثبِتِ العَرشَ ثُمَّ انقُشَ'' (پہلے تخت کے وجود کو ثابت کر۔ پھر اس پر نقش و نگار کر) ایسے امور کے بارے میں اصولِ حدیث میں معروف ہے، کہ توقف کرنا چاہیے۔ (حَتّٰی یَاتِیَ اللّٰہُ بِاَمرِہٖ)

اور ''فتاویٰ نذیریہ'' میں واردروایات کے بارے میں کئی دفعہ ''الاعتصام'' میں تفصیلی بحث شائع ہو چکی ہے۔ اعادہ کی ضرورت نہیں۔ اوّلاً: تو ذکر کردہ روایات ضعیف ہیں اور کسی سے تمسک ممکن ہے تو وہ اصل موقف کی مؤید نہیں۔

''صفة الصلاة'' کے باب میں محدثین کے قائم کردہ تراجم وابواب پر، میں نے کافی غور وخوض کیا۔ بالخصوص ''صحیح بخاری اس میں فرض نماز کے بعد اجتماعی یا انفرادی دعا کی طرف اشارہ تک موجود نہیں۔ عظیم شارح ''خاتمة الحفاظ'' ابن حجر رحمہ اللہ بھی ساکت نظر آتے ہیں۔ معلوم یوں ہوتا ہے، کہ اصل دعا کا محل قبل از سلام ہے۔ بعد میں صرف ذکر اذکار، تسبیحات، تحمیدات اور تکبیرات وغیرہ ہیں۔ حافظ ابن تیمیہ رحمہ اللہ وغیرہ کا یہی خیال ہے۔ اللہ تعالیٰ جملہ مسلمانوں کو سنت پر عمل کرنے کی توفیق بخشے۔ آمین!

اجتماعی دعاء کے متعلق ابن زبیر رضی اللہ عنہما کی حدیث کی حقیقت کیا ہے؟

سوال: صورت احوال یہ ہے کہ مولانا بشیر الرحمٰن صاحب نے ''روح عبادت الدعا'' ص:۶، پر لکھا ہے (نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نماز کے بعد ہاتھ اٹھا کر دعا فرمایا کرتے تھے) دلیل کے لیے حدیث یہ لکھی ہے:

« عَن عَبدِ اللّٰهِ بنِ الزُّبَيرِ أَنَّهُ رَأَی رَجُلًا رَافِعًا يَدَيهِ، يَدعُوا قَبلَ أَن يَّفرُغَ مِن صَلٰوتِهٖ. فَلَمَّا فَرَغَ مِنهَا، قَالَ: إِنَّ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ لَم يَكُن يَرفَعُ يَدَيهِ حَتّٰی يَفرُغَ مِن صَلٰوتِهٖ » رجاله ثقات۔ تحفة الاحوذی(۲۴۵/۱) الطبرانی و مجمع الزوائد (۱۶۹/۱۰)[1]

[1] المعجم الكبير للطبرانی، رقم: ۳۲۴

''حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما نے ایک آدمی کو دیکھا کہ وہ نماز سے فراغت سے پہلے ہی ہاتھ اٹھا کر دعا کر رہا تھا۔ فارغ ہونے کے بعد اُسے فرمایا: کہ رسول اکرم ﷺ تو نماز کے بعد ہاتھ اٹھا کر دعا فرماتے تھے۔'' یہ حدیث بالکل صحیح اور قابلِ عمل ہے۔

(ص:۱۳۰۔۱۶) پر فرماتے ہیں: (علم قواعد) گرائمر میں لفظ ''حتّٰی'' کا عمل یہ ہے، کہ اس لفظ سے پہلے جس طرح کسی چیز کی شدت سے نفی ہوگی (حتی) کے بعد اس طرح اس فعل کا اثبات ہوگا۔ اس کی مثال قرآن مجید میں ہے:

﴿ فَإِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهُ مِنْ بَعْدُ حَتَّىٰ تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهُ ﴾ (البقرة:۲۳۰)

یعنی تیسری طلاق کی صورت میں عورت کسی اور مرد سے نکاح کرنے سے پہلے اپنے خاوند پر حلال نہیں۔ مگر بعد میں حلال ہے۔ یعنی لفظ ''حتیٰ'' سے پہلے جس عمل کی نفی ہوگی حتی کے بعد اس کا اثبات ہوگا۔ یہاں بھی فراغت نماز سے پہلے ہاتھ نہیں اٹھاتے تھے، مگر فراغت کے بعد نبی اکرم ﷺ ضرور اٹھاتے تھے..... کا مفہوم ہے۔ [1]

(ص:۴۶) پر فرماتے ہیں: « قَبلَ أَن يَّفرُغَ » یعنی فراغت سے پہلے اس نے ہاتھ اٹھائے تھے جس سے تشہد میں ہاتھ اٹھانا سمجھ آرہا ہے۔ یہاں عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کا انکار، قنوت میں ہاتھ اٹھانا نہیں۔ تشہد میں ہاتھ اٹھانے سے انکار ہے۔''

(ص:۲۳۔۲۴) پر لکھا ہے: ''عبداللہ بن نافع بن عمیاء کو مجہول قرار دے کر ہی اسے ضعیف کہا گیا ہے۔ مگر امام ابن حبان نے اس کی توثیق کی ہے۔ اصولِ حدیث کی رُو سے ابن حبان کی ثقاہت دوسروں کی ہلکی سی تنقید پر قابلِ ترجیح ہے۔ ان کا کہنا کہ ہمیں اس کا علم نہیں۔ یعنی مجہول ہے۔ ابن حبان کے علم کا مقابلہ نہیں کر سکتا، کیوں کہ جان کر، معلوم کرکے، باخبر ہوکر ہی وہ اسے ثقات میں شامل مان رہے ہیں۔ لہٰذا وہ ہلکا سا ضعف بھی ختم ہوگیا ہے۔''

(ص:۲۷) پر لکھا ہے: ''حافظ ابن حجر رحمہ اللہ ''بلوغ المرام'' میں مسلکِ محدثین کے ثبوت میں بہت سے مقامات پر ضعیف احادیث سے استدلال نہ کرتے۔'' امام بخاری رحمہ اللہ اپنی مایہ ناز کتاب ''صحیح بخاری میں ضعیف احادیث کو ''ترجمۃ الباب'' میں تائید کے لیے پیش نہ کرتے۔ حق یہ ہے، کہ تمام ''ائمۂ ہدیٰ'' نے احادیثِ ضعاف کو معرضِ استدلال میں دلیل بنایا ہے۔ امام ابن قیم ''اعلام الموقعین'' (۱/۳۱) میں ائمہ

[1] مغنی اللبیب: ۱/۱۳۳

کرام رحمہم اللہ کا اجماع نقل کرتے ہیں۔ ملاحظہ ہو!

« لَيسَ المُرَادُ بِالضَعِيفِ عِندَهُ البَاطِلَ، وَ لَا المُنكَرَ بَل الحَدِيثُ الضَعِيفُ عِندَهُ قَسِيمُ الصَّحِيحِ، وَقِسمٌ مِن اَقسَامِ الحَسَنِ. »

''ضعیف حدیث سے مراد باطل، منکر، مردود اور قابلِ انکار نہیں ہے۔ بلکہ ضعیف حدیث کا درجہ حسن حدیث جیسا ہے، عمل وقول میں۔''

پھر لکھتے ہیں: « لَيسَ اَحَدٌ مِنَ الأَئِمَةِ اِلَّا هُوَ مُوَافِقُهُ عَلٰى هٰذَا الاَصلِ » ''کوئی بھی اہل حدیث امام اس مسئلہ میں اس بات کا مخالف نہیں ہے۔ سب موافق ہیں۔''

نیز امام ترمذی رحمہ اللہ تو کتاب ''العلل'' میں فرماتے ہیں: « قَد رَوٰى غَيرُ وَاحِدٍ مِنَ الاَئِمَةِ عَنِ الضُّعَفَاءِ » ''یعنی اکثر ائمہ حدیث نے ضعیف لوگوں کی روایات کو بیان کیا ہے۔''

ہاں! اس بات میں بھی کوئی شک نہیں، کہ اگر ضعیف حدیث کے مقابلہ میں صحیح حدیث یا واضح دلیل موجود ہو تو ضعیف حدیث پر عمل نہیں کیا جائے گا۔

(ص:۴۶) پر لکھا ہے: ''کسی ضعیف حدیث کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہوتا، کہ یہ لازماً نا قابلِ عمل ہے...... بلکہ یہ نا قابلِ انکار حقیقت ہے کہ دین وشریعت کا کافی حصہ، انہی ضعاف احادیث پر مشمل ہے۔''

اپیل ہے! کہ آپ براہِ مہربانی اس تحریر کا مدلل جواب عنایت فرمائیں گے۔ شکریہ

جواب: حافظ نور الدین ہیثمی رحمہ اللہ نے ''مجمع الزوائد'' میں جو روایت ہذا کے راویوں کو ثقہ قرار دیا ہے۔ یہ بات فی الواقع نفس حدیث کی صحت کو مستلزم نہیں، کیونکہ امکان ہے درمیان سند میں انقطاع ہو۔ دوسری بات یہ ہے کہ صاحب "المجمع" پر توثیق رواۃ کے بارے میں کلی اعتماد کرنا صحیح نہیں۔ کیونکہ کتاب ہذا میں ان کے کئی ایک اوہام اہلِ علم میں معروف ہیں۔ ہمارے ایک فاضل دوست شیخ عاصم اردنی استاذ مدینہ یونیورسٹی نے کتاب ہذا کی تخریج پر پنجاب یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی ہے۔ لیکن ان کی کاوش ابھی تک سامنے نہیں آسکی۔

جب تک اس حدیث کی اصل سند سامنے نہ آئے، اس وقت تک توقف کرنا چاہیے اور اصل روایت طبرانی میں بروایت محمد بن ابی یحییٰ مروی ہے اور اگر کوئی اس حدیث کی صحت کا دعویدار ہے، تو پہلے اسے اصل سند پیش کرنی چاہیے، تاکہ معیارِ محدثین پر اس کو پرکھا جاسکے۔ ورنہ یہ حدیث بالکل صحیح اور قابلِ عمل ہے کے دعویٰ کی حقیقت، تارِ عنکبوت سے زیادہ نہیں ہوگی۔

بغرضِ تسلیم بھی اس حدیث میں اجتماعی دعا کا ذکر نہیں۔ بلکہ صرف انفرادی دعا کا تذکرہ ہے۔ پھر صحیح روایات میں تصریح ہے کہ فرض نماز سے فراغت کے بعد نبی ﷺ کا معمول ذکر اذکار کرنا تھا۔ ہاتھ اٹھا کر دعا کرنا نہیں۔ باقی ضعیف حدیث کی حجیت کے بارے میں میرا ایک تفصیلی مضمون جواب در جواب ماہنامہ ''محدث'' لاہور میں ۲۴ صفحات پر مشتمل شائع شدہ ہے۔ اس کے مطالعہ سے جملہ شکوک و شبہات دُور ہو سکتے ہیں۔

کیا یہ حدیث اجتماعی دعا کے لیے دلیل بن سکتی ہے؟

سوال: حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کے حوالے سے سنن ترمذی میں یہ روایت آتی ہے: « اِنَّ رَبَّکُم حَیِیٌّ کَرِیمٌ یَستَحیِی مِن عَبدِہٖ، اِذَا رَفَعَ یَدَیہِ اِلَیہِ اَن یَرُدَّھُمَا صِفرًا »[1] اس حدیث سے بعض لوگ فرض نماز کے بعد مروّجہ اجتماعی دعا پر استدلال کرتے ہیں جبکہ علامہ ابن تیمیہ رحمہ اللہ اس دعا کو ''بدعت'' کہتے ہیں۔[2] درست موقف کون سا ہے؟

جواب: اس حدیث میں فرض نماز کے بعد اجتماعی دعا کا ذکر ہی نہیں، تو اس سے استدلال کرنا چہ معنی دارد؟ البتہ اس میں کوئی شک نہیں کہ عام حالات میں ہاتھ اٹھا کر دعا کرنا متعدد احادیث سے ثابت ہے۔ ملاحظہ ہو! ''المجموع شرح المھذب'' (٤/ ٥٠٧۔٥١١) اور علامہ سیوطی کا رسالہ ''فض الدعا '' تخریج محمد شکور میادینی.

فرض نماز کے بعد اجتماعی دعا سنت ہے یا بدعت؟

سوال: ہاتھ اٹھا کر اجتماعی دعا فرض نماز کے بعد سنت ہے یا بدعت؟

جواب: فرض نماز کے بعد ہاتھ اٹھا کر اجتماعی دعا کرنا سنت سے ثابت نہیں۔

کیا رسول اللہ ﷺ نے کسی موقعہ پر ہاتھ اٹھا کر اجتماعی دعا کی؟

سوال: رسول اللہ ﷺ نے کس موقعہ پر ہاتھ اٹھا کر اجتماعی دعا کی؟

جواب: رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے بارش کے لیے اجتماعی دعا کی تھی چنانچہ ''صحیح بخاری میں ہے:

« فَرَفَعَ رَسُولُ اللّٰہِ ﷺ یَدَیہِ یَدعُوا، وَ رَفَعَ النَّاسُ اَیدِیَھُم مَعَہٗ یَدعُونَ »[3]

[1] سنن الترمذی، رقم: ٣٥٥٦، مشکوٰۃ المصابیح، رقم: ٢٢٤٤

[2] فتاوی الکبری ١/ ٢١٩

[3] صحیح البخاری، اَبوابُ الاستسقاء، بَابُ رَفعِ النَّاسِ اَیدِیَھُم مَعَ الاِمَامِ فِی الاِستِسقَاءِ، رقم: ١٠٢٩

''رسول اللہ ﷺ نے اپنے دونوں ہاتھ اٹھا کر دعا کی اور لوگ بھی آپ کے ساتھ اپنے ہاتھ اٹھا کر دعا کرتے رہے۔''

اس حدیث سے معلوم ہوا، کہ بوقتِ حاجت یا ضرورت اور کسی سبب کی بناء پر اجتماعی دعا کا جواز ہے۔

کیا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اجتماعی دعا کی تھی؟

سوال: ہاتھ اٹھا کر اجتماعی دعا کے بارے میں صحابہ رضی اللہ عنہم کرام کا کیا معمول رہا؟

جواب: فرض نماز کے بعد اجتماعی دعا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے ثابت نہیں۔ ہاں! البتہ دوسرے موقعہ پر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ منبر پر تشریف فرما تھے، کہ عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نے عرض کی، کہ آپ نے تو اس امت کو تباہی کے کنارے پر لا کھڑا کیا ہے۔ لہٰذا آپ اور دوسرے لوگ بھی آپ کے ساتھ توبہ کریں۔ علقمہ رضی اللہ عنہ کا بیان ہے، کہ آپ نے قبلہ رُخ ہو کر ہاتھ اٹھائے اور فرمایا: « اَللّٰهُمَّ اِنِّی اَستَغفِرُكَ وَ اَتُوبُ اِلَیكَ »[1] اور لوگوں نے بھی آپ کے ساتھ ہاتھ اٹھائے۔

عید کی نماز کے بعد اجتماعی دعا:

سوال: نمازِ عید کے بعد اجتماعی دعا کرنا کیسا ہے؟

جواب: نمازِ عید کے بعد اجتماعی دعا کا ثبوت نہیں۔ ظاہر ہے، جب کوئی شے ثابت نہ ہو، تو اسے اختیار کرنا خطرے سے خالی نہیں۔

عید کے بعد اجتماعی دعا کرنا جائز ہے؟

سوال عید کے بعد اجتماعی دعا کرنا جائز ہے، بعض لوگ اسے بھی بدعت میں داخل کر دیتے ہیں؟

جواب نمازِ عید کے بعد اجتماعی دعا کا ثبوت نہیں، ظاہر ہے جب کوئی ثابت نہ ہو تو وہ خطرہ کا مقام ہے۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو: مرعاۃ المفاتیح: ۳۳۱/۲

سوال کیا عید کی نماز کے بعد اجتماعی دعا کرنا بدعت ہے، اگر نہیں تو کیا نماز کے بعد دعا مانگی جائے یا خطبہ کے بعد یا خطبہ کے دوران؟ اور ہاتھ اٹھائے جائیں یا نہیں؟

جواب نمازِ عید یا خطبہ کے بعد اجتماعی دعا کا ثبوت نہیں، ظاہر ہے کہ جو چیز ثابت نہ ہو، وہ بدعت ہونے کے خطرہ سے خالی نہیں۔ اور نماز یا خطبہ کے بعد اجتماعی دعا کرنا درست نہیں۔

---

[1] طبقات ابن سعد: ۳/ ۶۹

سوال: ۱۰ر مئی (۲۰۰۲ء) کے ''الاعتصام'' میں ایک سوال کے جواب میں آپ نے فرمایا: کہ نمازِ عید کے بعد اجتماعی دعا کا ثبوت نہیں، اور بے ثبوت شے کا اختیار کرنا خطرے سے خالی نہیں۔ اس ضمن میں عرض ہے کہ خاکسار گزشتہ پون صدی کے دوران ملک ہندو پاک کے مختلف شہروں میں عید کی نمازوں میں شامل ہوتا رہا اور ہر جگہ خطبے کے بعد اجتماعی دعا ہی ہوتی رہی۔ بلکہ علمائے کرام اور ائمہ نماز عید کے دن اس عمل کی تاکید بھی فرماتے رہے۔ خصوصاً ''صحیحین'' کے حوالے سے جہاں حائضہ عورتوں کی عید کے اجتماع میں شمولیت کی تاکید ہے یعنی «وَيَشهَدنَ الخيرَ ، وَ دَعوَةَ المُؤمِنِينَ» اور «فَيَشهَدنَ جَمَاعَةَ المُسلِمِينَ وَ دَعوَاتِهِم» [1] «يَشهَدنَ الخَيرَ، وَ دَعوَةَ المُسلِمِينَ» [2]

یومِ عید کو اجتماعی دعا کو سنت کے مترادف خیال کیا جاتا رہا۔ مگر اب اس کے بدعت ہونے کا فتویٰ دیا جانے لگا ہے۔ محولہ بالا احکام نبویؐ کے باوصف اگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا معمول اجتماعی دعا کا نہیں تھا، تو اس کا ثبوت بھی ہونا چاہیے کہ ان کا طریق کار کیا تھا؟ کیا وہ (مرد و زن) خطبے کے فوراً بعد عیدگاہ کو چھوڑ دیتے تھے یا انفرادی دعائیں مانگتے رہتے تھے۔ جب کہ کسی کی دعا قلیل اور کسی کی طویل ہوسکتی تھی۔ بات کچھ سمجھ میں نہیں آ رہی، کہ مسلک اہلِ حدیث کے علماء کرام نے بھی اس ''بدعت'' کو کیسے جاری رکھا ہوا ہے۔ جن عورتوں کو نماز کی معافی ہو ان کی عیدگاہ میں حاضری کے لیے تاکید کا مقصد کیا ہوسکتا ہے؟ صرف خطبہ سن کر چلے جانا یا کچھ اور بھی؟ مسئلہ کی وضاحت فرما کر عند اللہ ماجور ہوں۔

جواب: ظاہر یہ ہے، کہ مشارٌ الیہ حدیث میں دَعوَةَ المُسلِمِينَ سے مراد خطبۂ عیدین میں ذکر و اذکار اور کلماتِ وعظ و نصیحت ہیں۔ نبی اکرم ﷺ سے ثابت نہیں ہوسکا، کہ عیدین کے بعد دعا کی۔ احادیث کے راویوں میں سے کبھی کسی راوی نے بھی اس بات کا تذکرہ نہیں کیا۔ بلکہ اس وقت جو شے آپ ﷺ سے ثابت ہے۔ وہ یہ ہے، کہ مسلمانوں کی جملہ حاجات و ضروریات کا جائزہ لے کر ان کے حل کی سعی فرماتے۔ حقیقتاً جب ساری ہیئت اجتماعی دعا ہی ہے، تو پھر خود ساختہ تکلفات میں پڑنے کی کیا ضرورت ہے، جس میں بجائے فائدے کے نقصان کا پہلو یقینی ہے۔ حقیقت یہ ہے، کہ یہ سبھی کچھ رُوحِ نماز سے غفلت کا نتیجہ ہے۔ ورنہ نماز تو مُناجاتِ ربّ اور قربِ الٰہی کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

---

[1] صحيح البخاری، كتاب الصلاة، بَابُ وُجُوبِ الصَّلَاةِ فِي الثِّيَابِ، رقم: ۳۵۱

[2] صحيح مسلم، كِتَابُ صَلَاةِ العِيدَينِ، بَابُ ذِكرِ إِبَاحَةِ خُرُوجِ النِّسَاءِ فِي العِيدَينِ، رقم: ۸۹۰، صحيح البخاری، رقم: ۱۶۵۲

﴿ وَاسْجُدْ وَاقْتَرِبْ ﴾ (العلق:۱۹) ''اور سجدہ کرو اور قرب (الٰہی) حاصل کرتے رہو۔''

صحیح مسلم میں حدیث ہے:« اَقرَبَ مَایَکُونُ العَبدُ مِن رَّبِّہٖ، وَھُوَ سَاجِدٌ. فَاَکثِرُوا الدُّعَاءَ » ①

''سجدے کی حالت میں بندہ اپنے رب کے انتہائی قریب ہوتا ہے، لہٰذا بکثرت دعا کیا کرو۔''

باقی رہی یہ بات کہ تمام علمائے حدیث کا عمل عید کے بعد اجتماعی دعا پر رہا ہے۔ تو یہ حقیقت کے خلاف ہے۔ بلکہ بات یوں ہے، کہ محققین اہلِ علم کبھی اس بات کے قائل نہیں رہے۔ کیونکہ اس کی کوئی سند نہیں۔ ہمارے شیخ حافظ محمد محدث گوندلوی رحمہ اللہ کے شاگرد رشید علامہ عبید اللہ رحمانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

« لَم یَثبُت عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَ سَلَّمَ دُعَاءٌ بَعدَ صَلٰوۃِ العِیدَینِ، وَ لَم یَنقُلِ الدُّعَاءَ اَحَدٌ بَعدَھَا» ②

''نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے عیدین کے بعد دعا ثابت نہیں ہوسکی۔ اور نہ کسی نے اس کے بعد دعا نقل کی ہے۔''

لہٰذا عمل دلیل کے تابع ہونا چاہیے۔ نیز صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا دعا میں طریقہ وہی تھا، جس کی سنت سے وضاحت ہوچکی، اور صحابیات رضی اللہ عنہن بھی اسی پر عمل پیرا تھیں۔

میرے اس فتوے پر ''محدث'' لاہور (ربیع الاول ۱۴۲۳ھ) میں مولانا محمد رمضان سلفی صاحب (استاذ جامعہ لاہور الاسلامیہ) نے بایں تعلیق فرمائی ہے: ''محترم حافظ صاحب کی سجدہ والی مثال حائضہ عورت کے حوالہ سے واضح نہیں ہے، کیونکہ حائضہ عورت نماز نہیں پڑھتی۔ البتہ حدیث میں وارد لفظ ''ودعوتھم'' کی دعا کے ساتھ تفسیر صحیح حدیث سے ثابت ہے۔ صحیح البخاری میں ہے۔

« عَن أُمِّ عَطِیَّۃَ، قَالَت: کُنَّا نُؤمَرُ أَن نَخرُجَ یَومَ العِیدِ حَتّٰی نُخرِجَ البِکرَ مِن خِدرِھَا، حَتّٰی نُخرِجَ الحُیَّضَ، فَیَکُنَّ خَلفَ النَّاسِ، فَیُکَبِّرنَ بِتَکبِیرِھِم، وَیَدعُونَ بِدُعَائِھِم یَرجُونَ بَرَکَۃَ ذٰلِکَ الیَومِ وَطُھرَتَہٗ » ③

''حضرت اُم عطیہ کہتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے ہمیں عید کے دن نکلنے کا حکم ہوتا۔ یہاں تک کہ ہم کنواری اور حیض والی عورتوں کو بھی ساتھ لے جائیں۔ وہ لوگوں کے پیچھے سے مردوں کے ساتھ تکبیریں کہتیں اور ان کی دعا میں شریک ہوتی تھیں......''

حدیثِ نبوی سے ہی لفظ 'دعوت، کی وضاحت آجانے کے بعد دیگر معانی کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔''

---

① صحیح مسلم، بَابُ مَا یُقَالُ فِی الرُّکُوعِ وَالسُّجُودِ، رقم:۴۸۲

② مرعاۃ المفاتیح: ۲/ ۳۳۱

③ صحیح البخاری، بَابُ التَّکبِیرِ أَیَّامَ مِنًی، وَإِذَا غَدَا إِلَی عَرَفَۃَ، رقم: ۹۷۱، مع الفتح: ۲/ ۴۶۱

جواب: اس کا جواب یہ ہے کہ مضمون کے سیاق و سباق سے ظاہر ہے کہ سجدے والی مثال کا تعلق ان افراد سے ہے جنھوں نے نماز پڑھنی ہے اور عید کے اجتماع میں حائضہ کی شرکت صرف کلماتِ ذکر و اذکار وغیرہ میں ہے۔ جس حدیث میں "یَدعُونَ بِدُعَائِهِم" کا ذکر ہے اس سے مقصود بھی ہیئتِ اجتماعی میں شرکت ہے جس میں کلماتِ وعظ و نصیحت اور ذکر اذکار شامل ہیں، جس پر دعا کا اطلاق ہوا ہے۔ نہ کہ نماز کے بعد اجتماعی دعا کرنا جس کا کوئی ثبوت نہیں۔

عید کی نماز کے بعد اجتماعی دعا نماز کے بعد مانگی جائے یا خطبہ کے بعد؟

سوال: عید کی نماز کے بعد اجتماعی دعا نماز کے بعد مانگی جائے یا خطبہ کے بعد؟ یا خطبہ کے دوران؟ اور ہاتھ اٹھائے جائیں یا نہیں؟

جواب: نماز عید یا خطبے کے بعد اجتماعی دعا کا ثبوت نہیں، البتہ خطبے کے دوران ذکر اذکار اور دعا یہ کلمات ہاتھ اٹھائے بغیر کہے جا سکتے ہیں۔

کسی کی اپیل پر فرائض کے بعد اجتماعی دعا کرانا:

سوال: صورتِ احوال یہ ہے کہ "الاعتصام" کا باقاعدہ قاری ہوں۔ آج مجھے سوال درپیش ہے کہ اجتماعی دعا فرائض کے بعد ثابت نہیں ہے، لیکن اپیل پر کسی بیمار وغیرہ کے لیے دعا میں کوئی حرج نہیں۔ میں اس مندرجہ بالا موقف کا قائل ہوں۔ میں فرائض کے بعد انفرادی دعا کیا کرتا تھا۔ باقی اگر اجتماعی دعا کریں تو میں نہیں کرتا۔ میں اکیلے ہی کرتا ہوں۔ گزشتہ دنوں میرے دوست نے انگلینڈ سے ایک کتاب "فتاویٰ از شیخ عبدالعزیز بن عبداللہ بن باز مترجم" ارسال کی اس کتاب میں تقریباً ۲۷۰ فتوے ہیں۔ اس کتاب میں ہے کہ کسی نے سوال پوچھا کہ کیا فرض نماز کے بعد آپ ﷺ نے ہاتھ اٹھا کر دعا مانگی ہے؟ (سوال میں اجتماعی یا انفرادی دعا کا ذکر نہیں تھا) تو مفتی سعودی عرب شیخ عبدالعزیز بن عبداللہ بن باز رحمہ اللہ نے جواب دیا کہ نہ تو حضور ﷺ اور نہ آپ ﷺ کے صحابہ نے فرض نماز کے بعد ہاتھ اٹھا کر دعا مانگی، اور انھوں نے اس کو بدعت قرار دیا ہے۔

اب آپ سے سوال یہ ہے کہ ایک حدیث میں آتا ہے کہ فرض نماز کے بعد دعا کی قبولیت کا وقت ہے اور دوسری طرف ہاتھ اٹھا کر دعا مانگنا ثابت نہیں۔ کیا یہ حدیث ضعیف ہے اگر حدیث صحیح ہے تو پھر ان میں تطبیق کی کیا صورت ہے۔

یاد رہے کہ لاہور کے ایک مرکز، ''مرکز تحقیق واشاعت'' نے ایک پمفلٹ شائع کیا ہے کہ انفرادی دعا بعد از فرض نماز بدعت ہے۔ بعض دوست کچھ نہ کچھ نئی بات ہی بتاتے ہیں اس لیے سوال نمبر۲ میں تمام شک و شبہادت دور کریں؟ مہربانی ہوگی۔

جواب: فرض نماز کے بعد اجتماعی دعا کا واقعۃً کوئی ثبوت نہیں اور جو لوگ فرض نماز کے بعد انفرادی دعا کے قائل ہیں۔ ان کا استدلال ترمذی میں وارد حضرت ابو امامہ (رضی اللہ عنہ) کی روایت سے ہے جس میں اجابت دعا کے اوقات میں ''دُبُرُ الصَّلَوَات المَکتُوبَات'' شمار کیا گیا ہے اور اسی طرح عمومی روایات جن میں دعا کی ترغیب وارد ہے، سے بھی ان کا احتجاج ہے۔ اوّلاً: روایت میں کچھ کلام ہے۔ ثانیاً: لفظ دبر کا مفہوم امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کی تحقیق کے مطابق نماز کا آخری حصہ قبل از سلام ہے جس طرح کہ اس موقعہ پر ''ادعیہ'' (دعائیں) کی تحریض (شوق دلانا) بھی وارد ہے۔

اگرچہ بعد از سلام کا بھی احتمال موجود ہے۔ عربی زبان میں یہ استعمال بھی شائع ہے۔ بہر صورت من وجہ گنجائش کا پہلو موجود ہے جس کو شارح محدث مبارکپوری رحمہ اللہ اور شیخ یمانی رحمہ اللہ نے اپنے رسالہ '' سُنِّیَّة رَفعِ الیَدِینِ فِی الدُّعَاءِ بَعدَ الصَّلَوَاتِ المَکتُوبَاتِ لِمَن شَاءَ '' میں اختیار کیا ہے۔

رسالہ ہٰذا ''المنتقٰی'' کے حاشیہ پر اور ''معجم طبرانی'' کے آخر میں طبع شدہ ہے۔

کسی کی اپیل پر امام اور مقتدی اجتماعی دعا کر سکتے ہیں؟

سوال: فرض نماز کے بعد اگر کوئی شخص دعا کرنے کی اپیل کرے تو کیا امام اور مقتدی اجتماعی دعا کر سکتے ہیں؟ نیز نماز جمعہ کے بعد اجتماعی دعا کرنا کیسا ہے؟ (محمد شاہد، حجرہ شاہ مقیم)

جواب: کسی ضرورت کی بناء پر اجتماعی دعا میں کوئی حرج نہیں۔ ''صحیح بخاری'' میں ہے:

« فَرَفَعَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یَدَیهِ یَدعُو، وَ رَفَعَ النَّاسُ اَیدِیَهُم مَعَ رَسُولِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یَدعُونَ» [1]

اس کے وقت کا کوئی تعین نہیں، چاہے فرض نماز کے بعد ہو یا جمعہ کی نماز کے بعد۔ اگر فرض نماز اور جمعہ کے بعد طریقۂ مسنونہ سمجھ کر مسلسل اس طرح دعا کی جائے، تو یہ سنت سے ثابت نہیں۔

کسی سبب کی بنا پر فرض نمازوں کے بعد دعا کرنا:

سوال: اللہ تعالیٰ کے حضور فرض نماز کے بعد یا عام حالات میں انفرادی طور پر ہاتھ اٹھا کر دعا مانگنے کے

[1] صحیح البخاری، اَبواب الاستسقاء، بَابُ رَفعِ النَّاسِ اَیدِیَهُم مَعَ الاِمَامِ فِی الاِستِسقَاءِ، رقم:۱۰۲۹

متعلق احادیث اور قرآن پاک کا حوالہ دے کر مشکور فرمائیں۔

(جواب): فرض نماز کے بعد کسی سبب کی بناء پر یا کسی بھی دوسرے موقع پر کبھی اجتماعی دعا کر لی جائے، تو اس میں کوئی حرج نہیں۔ ''صحیح بخاری وغیرہ میں دیہاتی کا قصہ مشہور و معروف ہے۔ آپ ﷺ نے ہاتھ اٹھا کر دعا مانگی اور لوگوں نے بھی آپ کے ساتھ ہاتھ اٹھائے، تو اللہ تعالیٰ نے بارش برسا دی۔

اور اگر کوئی فرضوں کے بعد ویسے ہی انفرادی دعا کرنا چاہے تو اس کا بھی جواز ہے۔

مجمع الزوائد (۱۰/۱۶۹) کی ایک روایت میں ہے: ''عبداللہ بن زبیر نے ایک شخص کو سلام پھیرنے سے پہلے ہاتھ اٹھائے دیکھ کر فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نماز سے فراغت کے بعد ہاتھ اٹھایا کرتے تھے۔''

مؤلف نے کہا ہے کہ اس کے راوی ثقہ ہیں۔ عمومی حالات میں قریباً تیس (۳۰) روایات سے ہاتھ اٹھا کر دعا کرنا ثابت ہے۔ ملاحظہ ہو، حافظ منذری کی ''جزء'' اور ''فض الوعاء'' للسیوطی اور ''فتح الباری'' وغیرہ۔

اس بارے میں صاحب تحفۃ الاحوذی اور شیخ محمد بن عبدالرحمٰن یمانی اپنی کتاب «سنية رفع اليدين» میں فرماتے ہیں: اگر کوئی انفرادی طور پر نماز کے بعد ہاتھ اٹھا کر دعا مانگ لے تو اس میں کوئی قباحت نہیں۔''

عام حالات میں دعا کرنے کے لیے کونسا طریقہ سنت سے ثابت ہے؟

(سوال): بعض لوگ بازو سامنے کی طرف لمبے کر کے دعا کرتے ہیں اور اکثر سینے کے قریب ہاتھ پھیلاتے ہیں۔ عام حالات میں دعا کرنے کے لیے کونسا طریقہ سنت سے ثابت ہے؟

(جواب): اس سلسلہ میں مرفوع کوئی روایت ثابت نہیں۔ البتہ ابن عمر رضی اللہ عنہما وغیرہ کے آثار سے معلوم ہوتا ہے، کہ دعا کے عام حالات میں ہاتھ سینہ کے برابر ہونے چاہئیں۔ البتہ مبالغہ کی صورت میں اس سے اُوپر بھی ہو سکتے ہیں، جس طرح کہ نماز استسقاء میں اُلٹے ہاتھ پھیلانے میں انتہائی مبالغہ کرنا، آپ کا معمول تھا۔ ''حصن حصین'' میں ہے: « وَرَفَعَهُمَا حَذْوَ مَنْكِبَيْهِ »[1]

سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما سے بسند صحیح ''الأدب المفرد'' میں یہ بھی ثابت ہے، کہ انھوں نے دعا میں اپنے دونوں ہاتھ اس کیفیت سے اٹھائے، کہ ہاتھوں کا نیچے والا حصہ دونوں کندھوں کے برابر تھا اور اندرونی حصہ چہرے کے قریب۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو! فتح الباری (۱۱/۱۴۲۔۱۴۳)

نماز یا عام مجالس ہاتھ اٹھا کر دعا مانگنا کیسا ہے؟

(سوال): کیا نماز یا عام جلسوں وغیرہ کے بعد ہاتھ اٹھا کر دعا مانگنا کیسا ہے؟ جب کہ کچھ ساتھی کہتے ہیں کہ

[1] تحفة الذاكرين، ص: ٤١

بالکل صحیح نہیں۔ ضلع راجن پور کی بستی جھینہ میں جلسہ کے بعد مولانا نے ہاتھ اٹھا کر دعا کروائی اور لوگوں نے بھی ہاتھ اٹھائے اور دعا مانگی۔

(جواب): یاد رہے عام حالات میں ہاتھ اٹھا کر دعا کرنے کا جواز ہے۔ اس بارے میں قریباً تیس روایات وارد ہیں۔ اصل بات یہ ہے، کہ فرض نماز کے بعد اجتماعی دعا کا ثبوت نہیں۔ دیگر مواقع پر بوقتِ ضرورت اجتماعی دعا کا جواز ہے، جس طرح صلوٰۃِ استسقاء وغیرہ میں اس کا ثبوت ملتا ہے یا کوئی حاجت مند دعا کے لیے کہہ دے، تو پھر بھی ہوسکتی ہے۔ جلسہ کے موقع پر جن حضرات نے ہاتھ اٹھا کر اجتماعی دعا کی، ممکن ہے ان کے پیش نظر کسی کی فریاد یا کوئی اور سبب ہو۔

ہاتھ اٹھا کر دعا مانگنا بدعت ہے؟

(سوال): ہمارے مولوی صاحب نے آج کے درس میں فرمایا ہے کہ ہاتھ اٹھا کر دعا مانگنا بدعت ہے جیسے دوسرے بدعات کر رہے ہیں ہم بھی ایسے ہی بدعات کر رہے ہیں۔ لہٰذا میں نے کہا تھا کہ عیدین میں ہاتھ اٹھا کر دعا مانگنا جائز ہے میں نے سنا ہے لیکن انھوں نے کہا ثبوت لاؤ۔ اب آپ سے التماس ہے کہ:

۱۔ کیا ہاتھ اٹھا کر دعا مانگنا بدعت ہے؟

۲۔ اگر ثابت نہیں تو یہ بدعت کہاں سے شروع ہوئی؟

۳۔ اسے آج تک روکا کیوں نہیں گیا؟

اگر پہلے سوال کا جواب نفی میں ہے تو دوسرے دونوں سوالوں کے جواب کی ضرورت نہیں۔

(جواب): ۳۰ کے قریب احادیث میں ہاتھ اٹھا کر دعا کرنا ثابت ہے۔ امام منذری رحمہ اللہ نے ان احادیث کو ایک تالیف میں جمع کیا ہے۔ اس موضوع پر علامہ سیوطی کی تصنیف "فض الوعاء" کے نام سے مشہور و معروف ہے اور بالخصوص عیدین میں ہاتھ اٹھا کر دعا کرنے کی صراحت کسی صحیح حدیث میں موجود نہیں ہے۔ ممکن ہے مولوی صاحب موصوف کا مقصود فرضی نماز کے بعد اجتماعی دعا کی نفی کرنا ہو۔ جس کا عامۃ الناس میں بلا استناد عام رواج ہے۔ صورت ہذا میں ان کا موقف واقعی درست ہے، لیکن اس سے انفرادی ''بعد الصلوٰۃ المکتوبۃ'' (فرضی نماز کے بعد) دعا کی نفی نہیں ہوتی۔ بلکہ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے، کہ اس کی تخصیص و ترغیب ہے۔ بعض اہلِ علم نے اس موضوع پر بعض کتابیں بھی تصنیف فرمائی ہیں۔ اس سلسلہ کی معروف کتاب ''سنية رفع اليدين فی الدعا بعد الصلوات المكتوبة لمن شاء.'' شیخ محمد بن عبدالرحمٰن یمانی کی تصنیف ہے۔

ہاتھ اٹھا کر دعا مانگتے ہوئے تھک جائیں تو ہاتھ نیچے کرتے ہوئے دعا کرنا کیسا ہے؟

(سوال) : دوسری بات یہ ہے کہ جب اپنی زبان اُردو یا پنجابی میں دعا مانگوں تو کیا پھر ہاتھ اٹھانے ضروری ہوں گے بلکہ دل چاہتا ہے کہ ہاتھ ضرور اٹھائیں۔ مگر اکثر اوقات میرے کندھوں اور دماغ میں کچھاوٹ ہونے لگتی ہے پھر ہاتھ اسی حالت میں نیچے کر لیتی ہوں اس میں کوئی حرج تو نہیں؟

(جواب) : دعا میں ہاتھ اٹھانا ضروری نہیں۔ بلا اٹھائے بھی دعا کرنے کا جواز ہے۔ دونوں صورتوں میں سے کسی کو بھی آپ اختیار کر سکتی ہیں؟

دعا کے بعد ہاتھوں کو چہرے پر پھیرنا کیسا ہے؟

(سوال) دعا کے بعد ہاتھوں کو چہرے پر پھیرنا کیسا ہے؟ کیونکہ کئی سلفی بھائیوں سے سنا ہے کہ یہ بدعت ہے۔ قرآن وحدیث کی روشنی میں اس مسئلے کا جواب دیں۔

(جواب) دعا کے بعد ہاتھوں کو چہرے پر پھیرنے والی روایات میں ضعف ہے، اگرچہ بعض اہل علم نے ان کو حسن درجہ تک بنانے کی سعی کی ہے لیکن بہتر ہے کہ منہ پر ہاتھ پھیرنے کے بغیر ہی ہاتھوں کو چھوڑ دیا جائے لیکن اسے بدعت قرار دینا ثقیل امر ہے، کیونکہ بعض آثارِ صحابہ اس کی تائید میں موجود ہیں جو سنداً صحیح ہیں۔

دعا مختصر ہونی چاہیے یا طویل؟

(سوال) : دعا مختصر ہونی چاہیے یا طویل؟

ہمارے محلے کی مسجد کے خطیب صاحب نمازِ جمعہ کے بعد اتنی لمبی دعا مانگتے ہیں کہ لوگ ہاتھ اٹھائے ہوئے تھک جاتے ہیں وہ اتنی دیر جمعہ کی دو رکعتیں پڑھانے میں نہیں لگاتے جتنی دیر دعا مانگنے میں لگا دیتے ہیں۔ آپ مہربانی کر کے وضاحت فرمائیں کہ کیا اُن کا یہ عمل شریعت محمدی ﷺ کے مطابق ہے؟

(جواب) : جمعہ یا اس کے علاوہ عام فرضی نماز کے بعد اجتماعی دعا کا اہتمام امامت کے فرائض میں سے نہیں ہے۔ سلام پھیرنے پر مقتدی امام کی اقتداء سے آزاد ہو جاتا ہے اور امام صاحب اگر کسی وجہ سے دعا مانگنا چاہیں تو آپ ان کے ساتھ دعا کرنے کے پابند نہیں۔ بیٹھے ورد کرنا چاہیں تو کر سکتے ہیں۔ یا مسجد سے اُٹھ کر باہر جانا چاہیں تو اس سے بھی کوئی امر مانع نہیں۔ باقی رہا داعی کا دعا لمبی یا مختصر کرنا سو یہ داعی کے نشاط پر منحصر ہے، اس میں شرعی کوئی پابندی نہیں۔

ختم قرآن کی مجلس میں لوگوں کو مدعو کرنا:

سوال: ختم قرآن کی مجلس میں زیادہ سے زیادہ لوگوں کو بلانا بھی آج کل حفاظ کا معمول بن گیا ہے ان کا یہ عمل کیسا ہے؟ ہوسکتا ہے کہ ان کا مقصد زیادہ سے زیادہ لوگوں کو اجتماعی دعا میں شرکت کرانا ہو لیکن کیا اس میں ریاکاری کا عمل کارفرما نہیں؟

جواب: مجالسِ خیر میں شرکت باعثِ رحمت ہے۔ صحیح حدیث میں ہے:

« مَا اجتَمَعَ قَومٌ فِي بَيتٍ مِّن بُيُوتِ اللّٰهِ إِلَّا يَتلُونَ كِتَابَ اللّٰهِ، وَ يَتَدَارَسُونَهُ بَينَهُم إِلَّا نَزَلَت عَلَيهِمُ السَّكِينَةُ، وَ غَشِيَتهُمُ الرَّحمَةُ، وَ حَفَّتهُمُ المَلَائِكَةُ » [1]

یعنی نہیں جمع ہوتی کوئی قوم کسی گھر میں اللہ کے گھروں میں سے مگر تا کہ اللہ کی کتاب کو پڑھیں اور اس کے آپس میں معنی بیان کریں مگر ان پر تسکین اُترتی ہے اور ان کو رحمت ڈھانکتی ہے۔

لہٰذا نیت میں اگر خلوص ہو تو یہ عمل ریاکاری نہیں بنتا۔ (واللہ اعلم)

۲۷ رمضان کو ختم قرآن کے موقع پر مٹھائی تقسیم، اجتماعی دعا وغیرہ درست ہے؟

سوال: کیا ۲۷ رمضان کو قرآن مکمل کرنا پھر اس پر مٹھائی بسلسلہ تقاریر اور اجتماعی دعا اور پھر اس پر مزید اضافہ کہ مسجد کی لائٹس بند کرنا۔ کیا قرآن وسنت سے جائز ہے اور اندھیرے میں اجتماعی دعا کا کیا ثبوت ہے؟

جواب: بلاشبہ رمضان میں تلاوت قرآن مجید کا اہتمام کثرت سے ہونا چاہیے۔ چنانچہ (مشکوٰۃ باب الاعتکاف) میں حدیث ہے رسول اللہ ﷺ ہر رمضان میں جبریل علیہ السلام سے قرآنِ مجید کا دور کرتے تھے اور جس سال آپ فوت ہوئے اس سال دو دفعہ دور کیا۔ [2] لیکن ستائیس تاریخ کی تعیین نہیں۔ بلا تعیین ستائیس کو بھی ختم ہو جائے تو کوئی حرج نہیں۔ باقی امور کا اضافہ سنت سے ثابت نہیں۔

---

[1] صحیح مسلم، بَابُ فَضلِ الِاجتِمَاعِ عَلَى تِلَاوَةِ القُرآنِ وَعَلَى الذِّكرِ، رقم: ۲۶۹۹

[2] صحیح البخاری، بَابٌ: أَجوَدُ مَا كَانَ النَّبِيُّ ﷺ يَكُونُ فِي رَمَضَانَ، رقم: ۱۹۰۲

مسبوق① نمازی کے متعلق احکام

مسبوق نمازی جس رکعت میں شامل ہوا اس میں ثنا پڑھے گا؟

(سوال): ظہر کی جماعت ہورہی ہے، آدمی دو رکعت لیٹ ہو جانے پر تیسری رکعت میں شامل ہوتا ہے۔ تو کیا وہ نماز فاتحہ سے شروع کرے یا «سبحانك اللہ» سے؟ اور وہ سورہ فاتحہ کے بعد کوئی سورت ملائے گا یا نہیں؟ کیونکہ مقتدی کی تو پہلی رکعت ہے اور امام کی تیسری، جس میں وہ اور باقی تمام رکعات ساتھ پڑھنے والے مقتدی صرف ''سورۃ فاتحہ'' ہی پڑھیں گے۔

(جواب): نماز میں ''سورہ فاتحہ'' کی قرأت چونکہ ضروری ہے اور «سبحانك اللہ» پڑھنا مسنون ہے۔ لہٰذا صرف فاتحہ کی قرأت کا اہتمام ہونا چاہیے۔ ہاں البتہ مقتدی اگر یہ سمجھتا ہے کہ ثناء کے بعد امام کے رکوع میں جانے سے پہلے ''فاتحہ'' کو پڑھ سکتا ہے، تو ثناء بھی پڑھ سکتا ہے اور ''سورہ فاتحہ'' کے علاوہ دوسری سورت بھی ملا سکتا ہے۔

سلام کے بعد مسبوق کی رہ جانے والی رکعت کونسی شمار ہوگی؟

(سوال) اگر کوئی آدمی نماز میں دیر سے شامل ہوتا ہے تو کیا جو رکعت وہ پڑھے وہ اس کی پہلی رکعت ہوگی یا جو امام امام پڑھ رہا وہ والی ہوگی۔ نیز دیر سے آنے پر نماز میں شامل ہونے کا طریقہ کی ہے مثال کے طور پر امام سجدے یا کسی اور حالت میں ہے تو جو آدمی آئے وہ ایک ہی بار رفع یدین کرے گا اور امام کے ساتھ مل جائے یا جس طرح اکثر کرتے ہیں کہ رفع یدین کرکے تھوڑی دیر ہاتھ باندھتے ہیں پھر امام کے ساتھ دوبارہ اللہ اکبر کہہ کر ملتے ہیں۔

(جواب) امام کے ساتھ بعد میں ملنے والے کی نماز پہلی ہوگی۔ حدیث میں ہے « مَا أَدْرَكْتُمْ فَصَلُّوْا وَ مَا فَاتَكُمْ فَأَتِمُّوْا» جتنی نماز امام کے ساتھ پاؤ پڑھو اور جتنی فوت ہو جائے پوری کرو۔''②

اس حدیث میں فوت شدہ نماز کی بابت، اِتمام' کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ جس کے معنی آخر سے پورا کرنے کے ہیں اور اخیر سے پورا کرنا اس صورت سے ہوسکتا ہے کہ جو امام کی قراءت کے بعد پڑھے وہ اس کی اخیر ہو۔

① مسبوق سے مراد وہ نمازی ہے جو نماز میں بعد میں ملا ہے اس سے پہلے نماز کا کچھ حصہ گزر چکا ہے۔

② صحیح البخاری، بَابُ قَوْلِ الرَّجُلِ: فَاتَتْنَا الصَّلَاةُ، رقم: ٦٣٥

جس رکعت میں شامل ہوئے ہیں وہ رکعت پہلی تصور ہوگی؟

سوال مقتدی امام کے ساتھ جس رکعت میں شامل ہوگا وہ مقتدی کی پہلی رکعت تصور ہوگی یا جو رکعت امام کی ہے وہی مقتدی کی ہوگی؟

جواب مقتدی امام سے جس رکعت میں ملتا ہے وہ اس کی پہلی رکعت ہوتی ہے...... راجح مسلک یہی ہے۔

نماز میں شامل ہونے والے کی کونسی رکعت پہلی ہوگی؟

سوال مثال کے طور پر اگر مقتدی کو امام کے ساتھ ایک ہی رکعت ملی تو کیا اب وہ ثنا پڑھنے کے بعد مزید دو رکعت پڑھ کر تشہد میں بیٹھے گا...... یا کیا کرے؟

جواب صحیح بخاری میں وارد ہے:« مَا أَدْرَكْتُمْ فَصَلُّوْا وَ مَا فَاتَكُمْ فَأَتِمُّوْا»[1] یعنی جتنی نماز امام کے ساتھ پاؤ پڑھو اور جتنی فوت ہو جائے پوری کرو۔'' اس حدیث سے معلوم ہوا کہ مقتدی امام کے فارغ ہونے کے بعد جتنی نماز پڑھتا ہے وہ اس کی پچھلی نماز ہے اور جو امام کے ساتھ پڑھی وہ اس کی پہلی ہے۔ جب یہ پچھلی ہوئی تو بقیہ سارا عمل پچھلی جیسا ہونا چاہیے۔ ثنا نہیں پڑھے گا، مزید ایک رکعت پڑھ کر تشہد میں بیٹھے گا۔

باجماعت نماز میں بعد میں شامل ہونے والا نماز کس طرح شروع کرے؟

سوال مقتدی جب جماعت میں شامل ہو تو تکبیر تحریمہ کے بعد ہاتھ باندھے، پھر رفع الیدین کر کے سجدہ یا تشہد میں امام کے ساتھ شریک ہو یا سیدھا رفع الیدین کر کے امام کے ساتھ شامل ہو جائے۔

جواب ظاہر یہ ہے کہ مقتدی ہاتھ باندھے بغیر بعد از تکبیر تحریمہ اسی حالت میں چلا جائے جس میں امام کو پاتا ہے۔ جامع ترمذی میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی روایت میں ہے:«فَلْيَصْنع كما يصنع الامام»[2] اور سنن ابی داؤد میں قصہ معاذ رضی اللہ عنہ میں ہے:«لا أراه على حال الا كنت عليها»[3]

علامہ احمد شاکر رحمہ اللہ نے جامع ترمذی کے حاشیہ پر اور علامہ البانی رحمہ اللہ نے السلسلة الصحيحة (رقم:۱۱۸۸) میں اس کو صحیح کہا ہے۔

---

1. صحیح البخاری، بَابُ قَوْلِ الرَّجُلِ: فَاتَتْنَا الصَّلَاةُ، رقم:٦٣٥
2. سنن الترمذی، بَابُ مَا ذُكِرَ فِي الرَّجُلِ يُدْرِكُ الإِمَامَ وَهُوَ سَاجِدٌ كَيْفَ يَصْنَعُ، رقم:٥٩١
3. سنن ابی داؤد، بَابُ كَيْفَ الْأَذَانُ، رقم:٥٠٦

ظہر یا عصر کی با جماعت نماز میں شامل ہونے والا صرف سورۃ فاتحہ ہی پڑھے؟

(سوال) : ایک آدمی ظہر یا عصر کی نماز میں شامل ہوتا ہے اور وہ صرف سورت فاتحہ ہی پڑھتا ہے جب کہ امام رکوع میں چلا جاتا ہے۔تو کیا اس کی نماز ہو جائے گی؟ حالانکہ اس نے فاتحہ کے بعد کوئی دوسری سورت نہیں پڑھی۔

(جواب) : اس شخص کی نماز ہو جائے گی۔ فاتحہ کے ساتھ دوسری سورت کا ملانا ضروری نہیں۔ حدیث میں ہے کہ فاتحہ سب سورتوں سے کافی ہو جاتی ہے، لیکن ''فاتحہ'' سے کوئی سورت کافی نہیں ہوتی۔(ملاحظہ ہو! المرعاۃ وغیرہ)

با جماعت نماز میں شامل ہونے کے طریقہ:

(سوال) : اگر جماعت کھڑی ہوئی ہو تو اس میں کس طرح شامل ہونا چاہیے۔ میں نے ایک جگہ پڑھا تھا کہ «سُبْحَانَ اللّٰهِ» پڑھ کر اس کے ساتھ شامل ہو جانا چاہیے۔خواہ جماعت سجدے میں ہو یا التحیات میں؟

(جواب) : نمازی کے لیے نماز میں داخل ہونے کی صورت، چاہے جماعت ہو یا انفرادی حالت میں، جماعت کے آغاز میں ہو یا وسط یا اخیر میں، ہر صورت میں شریعتِ مطہرہ میں ایک ہی طریقہ مقرر و متعین ہے اور وہ ہے «اَللّٰهُ اَكبَر» نہ کہ «سبحان الله» اس کے بغیر کوئی شخص نماز میں داخل نہیں سمجھا جا سکتا۔

حدیث میں ہے: «تَحرِيمُهَا التَّكبِيرِ»[1] اسی طرح حدیث مُسِیءِ الصَّلَاۃ میں مذکور ذکر کی صراحت موجود ہے۔تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو! تهذيب السنن، لابن قيم، زیرِ حدیث مذکور

با جماعت نماز میں شامل ہونے والا گزری ہوئی رکعت کس طرح ادا کرے؟

(سوال) : اگر با جماعت نماز کی ایک دو رکعت گزر چکی ہوں تو ان کو کس طرح ادا کرنا چاہیے۔اس رکعت کو ہی پہلی رکعت تصور کیا جائے یا جو رکعت جماعت کی ہو؟

(جواب) : مسبوق آدمی امام کے ساتھ نماز کا جو حصہ پاتا ہے، وہ اس کی پہلی رکعت سمجھی جائے گی۔ حدیث میں ہے:«فَمَا أَدرَكتُم فَصَلُّوا وَمَا فَاتَكُم فَأَتِمُّوا.»[2]

یعنی ''جتنی نماز امام کے ساتھ پاؤ پڑھو اور جتنی فوت ہو جائے پوری کرو۔''

یہاں فائت نماز کے لیے لفظ ''اتمام'' استعمال ہوا ہے۔جس کے معنی اخیر سے پورا کرنے کے ہیں اور اخیر سے پورا کرنا اسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ جو امام کی فراغت کے بعد پڑھے وہ اس کی اخیر ہو۔ اگر کہا

① سنن أبی داود، بَابُ الْإِمَامِ يُحْدِثُ بَعْدَ مَا يَرْفَعُ رَأْسَهُ مِنْ آخِرِ الرَّكْعَةِ، رقم:٦١٨

② صحيح البخاری، بَابُ قَوْلِ الرَّجُلِ: فَاتَتْنَا الصَّلَاةُ، رقم:٦٣٥ مع فتح الباری:١/١١٧

جائے کہ بعض روایات میں لفظ ''قضاء'' وارد ہے جو ''اداء'' کی ضد ہے، تو اس کا جواب یہ ہے، کہ ''قضاء'' کے معنی پورا کرنے کے بھی ثابت ہیں۔ لہٰذا یہاں ''قضا'' بمعنی ''اداء'' ہے۔ جیسے قرآن مجید میں ہے:

﴿ فَإِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ فَانْتَشِرُوْا فِي الْاَرْضِ ﴾ (الجمعة:١٠)

یعنی جب نماز پوری ہو جائے، تو پھر روزی کی تلاش کے لیے زمین میں پھیل جاؤ۔

اور اس سے بھی واضح ترین دلیل یہ ہے کہ نمازی پر واجب ہے کہ ہر صورت نماز کے اخیر میں تشہد پڑھے۔ اگر وہ رکعت جو مسبوق نے امام کے ساتھ پائی ہے آخری ہو، تو تشہد کے اعادہ کی ضرورت باقی نہیں رہ جاتی۔ مزید آنکہ اہلِ علم کا اجماع ہے کہ ''تکبیر تحریمہ'' کا تعلق صرف پہلی رکعت سے ہے۔

ان دلائل و شواہد سے معلوم ہوا، کہ مسبوق آدمی امام کے ساتھ جو نماز پاتا ہے، وہ اس کی پہلی نماز ہی سمجھی جائے گی۔ ملاحظہ ہو! فتح الباری: ۲/ ۱۱۹۔

باجماعت نماز میں شامل ہونے کا طریقہ کیا ہے؟

سوال : باجماعت نماز میں شامل ہونے کا طریقہ کیا ہے؟ پہلی، دوسری، تیسری یا چوتھی رکعت میں مقتدی شاملِ نماز ہو تو باقی نماز کس طرح ادا کرے؟

جواب : جماعت میں شامل ہونے والا مسبوق صف میں قبلہ رُخ کھڑا ہو کر دونوں ہاتھ کندھوں تک اٹھا کر تکبیرِ تحریمہ کہے اور جس حالت (رکوع، سجود، تشہد وغیرہ) میں امام ہے، اس میں چلا جائے۔ حدیث میں ہے:

« فَلْيَصنَع كَمَا يَصنَعُ الإِمَامُ »[1]

یعنی ''مقتدی ویسے ہی کرے جیسے امام کرتا ہے۔''

حدیث ہذا میں اگرچہ ضعف اور انقطاع ہے، لیکن اس کا شاہد حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کی دوسری حدیث بسندِ متصل موجود ہے۔ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

« لَا أَرَاهُ عَلٰى حَالٍ إِلَّا كُنتُ عَلَيهَا قَالَ: فَقَالَ: إِنَّ مُعَاذًا قَد سَنَّ لَكُم سُنَّةً كَذٰلِكَ فَافعَلُوا » (رواه ابو داؤد، والبيهقى، ٣/ ٩٣)[2]

اسی طرح دیگر بعض شواہد ''مصنف ابن ابی شیبہ'' اور ''سنن سعید بن منصور'' میں بھی موجود ہیں، جو اس

---

[1] سنن الترمذى، بَابُ مَا ذُكِرَ فِي الرَّجُلِ يُدرِكُ الإِمَامَ وَهُوَ سَاجِدٌ كَيفَ يَصنَعُ، رقم:٥٩١

[2] سنن أبى داود، بَابُ كَيفَ الأَذَانُ، رقم:٥٠٦، السنن الكبرىٰ للبيهقى، بَابُ مَن كَرِهَ أَن يَفتَتِحَ الرَّجُلُ الصَّلَاةَ ......الخ، رقم:٥١٤٧

کے مؤید ہیں۔ واضح ہو کہ تکبیرِ تحریمہ چونکہ نماز کا رکن ہے، اس لیے اس کے بغیر کوئی شخص داخلِ نماز نہیں سمجھا جا سکتا۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے: « تَحرِيمُهَا التَّكبِيرُ ، وَ تَحلِيلُهَا التَّسلِيمُ » ①

علامہ البانی نے اس حدیث کو صحیح قرار دیا ہے۔ ②

امام خطابی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

« فِي هٰذَا الحَدِيثِ بَيَانٌ أَنَّ التَّسلِيمَ رُكنٌ لِلصَّلَاةِ ، كَمَا أَنَّ التَّكبِيرَ رُكنٌ لَّهَا » ③

یعنی ''اس حدیث میں اس بات کا بیان ہے کہ سلام پھیرنا نماز کا رکن ہے جس طرح کہ تکبیر اس کا رکن ہے۔''

صاحب ''مرعاۃ'' مزید وضاحت کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

''نماز میں شامل ہونے والے کو چاہیے کہ تکبیر تحریمہ کہہ کر امام کی موافقت میں قیام یا رکوع وغیرہ میں چلا جائے۔ فوت شدہ حصہ کی ادائیگی میں امام کی مخالفت نہ کرے، بلکہ اسی فعل میں داخل ہو جائے جس میں امام کو پائے۔ قیام، قعود، رکوع اور سجود میں امام کی پیروی کرے۔ اس بات کا منتظر نہ رہے کہ جب امام قیام میں لوٹ کر آئے گا تب اس کے ساتھ ملوں گا جس طرح کہ عوام کی عادت ہے۔'' ④

نیز علامہ شوکانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

« وَالظَّاهِرُ أَنَّهُ يَدخُلُ مَعَهُ فِي الحَالِ الَّتِي أدرَكَهُ عَلَيهَا مُكَبِّرًا مُعتَمِدًا بِذٰلِكَ التَّكبِيرِ وَ إِن لَّم يَعتَدَّ بِمَا أَدرَكَهُ مِنَ الرَّكعَةِ ، كَمَن يُدرِكُ الِامَامَ فِي حَالِ سُجُودِهٖ أَو قُعُودِهٖ » ⑤

''ظاہر یہ ہے کہ مسبوق جس حالت میں امام کو پائے، اس میں شامل ہو کر تکبیر کو شمار میں لائے گا۔ اگر چہ رکعت کا مدرک حصہ (جو حصہ اس نے پا لیا ہے) شمار میں نہ آئے۔ جیسے کوئی شخص امام کو سجدہ یا قعدہ کی حالت میں پاتا ہے۔''

مسبوق امام کے ساتھ نماز کا جو حصہ پاتا ہے وہ اس کی پہلی ہوگی اور امام کی فراغت کے بعد جو پڑھتا

① سنن أبي داود، بَابُ الْإِمَامِ يُحدِثُ بَعدَ مَا يَرفَعُ رَأسَهُ مِنْ آخِرِ الرَّكعَةِ، رقم: ٦١٨

② إرواء الغليل ٢/٩ ③ معالم السنن مع المختصر ٢/٣١٨

④ مرعاة المفاتيح ٢/١٢٨ ⑤ نيل الأوطار ٣/١٦٢

ہے وہ اس کی پچھلی نماز ہے۔

حدیث میں ہے: « فَمَا أَدرَكتُم فَصَلُّوا وَمَا فَاتَكُم فَأَتِمُّوا »[1]

یعنی ''جو حصہ نماز کا امام کے ساتھ پاؤ پڑھو اور جو فوت ہو جائے پورا کرو۔''

حدیث ہذا میں فوت شدہ نماز کے لیے اِتمام کا لفظ استعمال ہوا ہے، جس کے معنی اخیر سے پورا کرنے کے ہیں۔ اخیر سے نماز اسی صورت پوری ہوگی جب مسبوق اِمام کے فارغ ہونے کے بعد جو پڑھے وہ اس کی اخیر ہو۔ اور بعض روایات میں لفظ اِتمام کے بجائے قضاء بھی وارد ہوا ہے تو ان میں کوئی منافات (مخالفت) نہیں اس لیے کہ قضاء کے معنی پورا کرنے کے بھی ثابت ہیں، جیسے ارشاد باری تعالیٰ:

﴿ فَإِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ فَانْتَشِرُوْا فِي الْاَرْضِ ﴾ (الجمعة:۹)

اور دوسری جگہ ہے:

﴿ فَإِذَا قَضَيْتُمْ مَّنَاسِكَكُمْ ﴾ (البقرة:۲۰۰)

اِمام خطابی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

« قُلتُ فِي قَولِهِ: ﴿ فَأَتِمُّوا ﴾ دَلِيلٌ عَلٰى أَنَّ الَّذِي أَدرَكَهُ المَرأُ مِن صَلَاةِ إِمَامِهِ، هُوَ أَوَّلُ صَلَاتِهِ، لِأَنَّ لَفظَ الِاتمَامِ وَاقِعٌ عَلٰى بَاقٍ مِن شَيءٍ قَد تَقَدَّمَ سَائِرُهُ »[2]

اس سے معلوم ہوا کہ باقی نماز پچھلی سمجھ کر ادا ہوگی۔ (هذا ما عندي والله أعلم بالصواب)

مسبوق کی کونسی رکعت پہلی ہوگی؟

سوال: نمازِ ظہر یا عصر یا مغرب میں دوسری یا تیسری یا چوتھی رکعت میں مقتدی شامل ہوتا ہے۔ تب مقتدی کی کونسی رکعت ہوگی۔ دوسری، تیسری یا چوتھی رکعت میں شمولیت کی صورت میں سلام پھیرنے کے بعد اٹھ کر مقتدی کونسی رکعت ادا کرے گا۔ پہلی یا دوسری رکعت کی صورت میں سورت فاتحہ کے بعد کوئی سورت قرآن سے پڑھ کر رکوع کیا جائے گا یا صرف سورۃ فاتحہ پڑھے گا؟

جواب: مسبوق امام کے ساتھ جو رکعت پاتا ہے وہ اس کی پہلی ہوگی۔ حدیث میں آتا ہے:

« فَمَا أَدرَكتُم فَصَلُّوا وَمَا فَاتَكُم فَأَتِمُّوا.»[3]

---

① صحيح البخاري، بَابُ قَولِ الرَّجُلِ: فَاتَتنَا الصَّلَاةُ، رقم:۶۳۵

② معالم السنن مع المختصر ۱/۲۹۸

③ صحيح البخاري، بَابُ قَولِ الرَّجُلِ: فَاتَتنَا الصَّلَاةُ، رقم: ۶۳۵ مع فتح الباري ۱/۱۱۷

یعنی ''جتنی نماز امام کے ساتھ پاؤ پڑھو اور جتنی فوت ہو جائے پوری کرو۔''
حدیث ہذا میں فوت شدہ کی بابت فقط اتمام (مکمل کرنا) وارد ہوا ہے۔ جس کے معنی اخیر سے پورا کرنے کے ہیں اور یہ اس صورت میں ہوگا جب مقتدی نے جو نماز امام کی فراغت کے بعد پڑھی ہے وہ اس کی اخیر کی ہو۔ بناء بریں معہود (اس بناء پر پائی جانے والی) ترتیب قائم رکھنا ہوگی۔

مسبوق کی امامت:

سوال: آج کل علاقہ راجن پور میں ایک مسئلہ موضوعِ سخن بناء ہوا ہے اور بڑی شد و مد کے ساتھ ایک دوسرے پر فتوے جڑے جا رہے ہیں۔ مسئلہ مسبوق کی امامت والا ہے۔ کیا یہ جائز ہے یا نہیں؟ جواز کی صورت میں کیا پوزیشن ہوگی؟ جب کہ صحیح مسلم، نیل الأوطار، اور ابن خزیمہ میں الفاظ ملتے ہیں جن سے جواز ثابت ہوتا ہے۔

جواب: مسبوق کی امامت سے مقصود غالباً آپ کا یہ ہے کہ جماعت کا کچھ حصہ گزرنے کے بعد امام کی اقتداء میں شریک ہونے والے افراد امام کے سلام پھیرنے کے بعد اپنے میں سے کسی ایک کو امام بناء کر بقیہ نماز بصورتِ جماعت مکمل کرلیں۔ کسی ایک بھی روایت میں واضح طور پر اس کا ثبوت موجود نہیں۔ بلکہ غزوہ تبوک کے سفر میں جب آپ ﷺ فجر کی جماعت سے قبل حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ کی معیت میں قضاءِ حاجت کے لیے تشریف لے گئے تھے، واپسی پر صرف ایک رکعت باجماعت کو پا سکے تھے۔ دوسری رکعت کی تکمیل حضرت عبد الرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کے سلام پھیرنے کے بعد اکیلے کی۔ جس طرح کہ قصہ کے سیاق و سباق سے ظاہر ہے۔ حالانکہ امکان موجود تھا کہ آپ ﷺ حضرت مغیرہ رضی اللہ عنہ کو ساتھ ملا کر فوت شدہ رکعت باجماعت پڑھ سکتے تھے۔ بوقتِ ضرورت اس شکل کو اختیار نہ کرنا عدمِ جواز کی دلیل ہے۔ نفس مسبوق کے بارے میں چند ایک صورتیں اور بھی ہیں، جن کا تذکرہ ''مشکوٰۃ المصابیح'' میں زیرِ عنوان "باب ما على المأموم من المتابعة وحكم المسبوق" موجود ہیں۔ یہاں مؤلف نے متنوع (مختلف) قسم کی روایات بیان کی ہیں اور صاحب "منتقى الاخبار" نے متذکرہ قصہ پر یوں تبویب قائم کی ہے۔ "باب المسبوق يقضي ما فاته إذا سلم إمامه من غير زيادة" اور اس سے پہلے عنوان بایں الفاظ ہے۔ 'باب المسبوق يدخل مع الإمام على أيِّ حالٍ كان' اور صحیح مسلم و نیل الأوطار وغیرہ میں جن صورتوں کا تذکرہ ہے وہ اس کے علاوہ ہیں بوقتِ ضرورت ان پر بھی گفتگو ہو سکتی ہے۔ فی الحال اسی پر اکتفاء کرتا ہوں۔

امام دونوں طرف سلام پھیرے تو پھر مسبوق اٹھ کر بقیہ نماز مکمل کرے:

(سوال): بعض لوگ کہتے ہیں کہ امام کے ایک طرف سلام پھیرنے کے بعد مسبوق اپنی نماز کے لیے کھڑا ہو اور بعض کہتے ہیں کہ امام دونوں طرف سلام پھیر کر نماز سے فارغ ہوتا ہے۔ لہٰذا دوسری طرف سلام پھیرنے سے ہی مقتدی متابعت وپیروی سے الگ ہوتا ہے، لہٰذا امام دونوں طرف سلام پھیر چکے تب مسبوق کھڑا ہو اپنی نماز مکمل کرنے کے لیے۔کون سی بات درست ہے؟

(جواب): امام دونوں طرف سلام پھیرے تو پھر مسبوق کو اٹھ کر بقیہ نماز مکمل کرنی چاہیے۔ کیونکہ نماز سے فراغت تک مسبوق امام کی اقتداء میں رہتا ہے۔

فجر کی دوسری رکعت میں ملنے والا مقتدی بعد از سلام فوت شدہ رکعت میں صرف فاتحہ ہی پڑھے؟

(سوال): صبح کی جماعت ہو رہی ہے آدمی ایک رکعت لیٹ ہو گیا جو رکعت وہ جماعت کے ساتھ پڑھے گا اس میں صرف سورہ فاتحہ پڑھے گا اور دوسری رکعت اکیلے پڑھے گا کیا اس میں فاتحہ کے بعد کوئی اور سورت پڑھنی چاہیے کہ نہیں؟

(جواب): فجر کی نماز میں ایک رکعت کے بعد ملنے والا مقتدی بعد از سلام جو رکعت اکیلا پڑھے گا اس میں فاتحہ کے ساتھ کوئی اور سورت بھی ملا سکتا ہے کیونکہ اس رکعت کی ادائیگی انفرادی حیثیت میں ہے۔

کیا امام کی غلطی پر مسبوق تکمیلِ نماز کے بعد سجدہ سہو کرے گا؟

(سوال): اگر مسبوق کے شامل ہونے سے پہلے امام کو سہو ہوا تھا اور امام نے سلام کے بعد سجدۂ سہو کیا۔ مسبوق اپنی نماز مکمل کرنے کے بعد اکیلا سجدۂ سہو کرے گا یا نہیں۔مقتدی اس وقت تک امام کی اقتداء کا پابند ہوتا ہے جب تک وہ سلام نہ پھیرے۔

(جواب): مسبوق اگر فوت شدہ نماز کی قضائی کے آغاز میں ہو تو پھر بھی احوط یہی ہے، کہ امام کے ساتھ مل کر سجدۂ سہو کرے۔ بایں صورت ''جرِ جوار'' کے قاعدہ کا انطباق ہوگا۔ ہاں البتہ امام اگر تاخیر سے سجدۂ سہو کرتا ہے تو پھر مسبوق کو بعد از فراغت سجدۂ سہو کرنے کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ مسبوق انفرادی نماز میں امام کی سابقہ غلطی کا متحمل نہیں ہوتا۔

سلام کے بعد مسبوق ثناء سے آغاز کرے یا فاتحہ سے:

(سوال): ایک شخص مغرب کی جماعت میں دوسری رکعت کے ساتھ شامل ہوا یعنی دوسری اور تیسری رکعت

جماعت کے ساتھ ادا کی۔ امام کے سلام پھیرنے کے بعد وہ کھڑا ہو گیا۔ کیا وہ قیام میں ثناء، سورہ فاتحہ اور کوئی سورت پڑھے گا یا صرف فاتحہ۔ یاد رہے کہ یہ شخص جماعت کی پہلی رکعت میں حاضر نہیں تھا؟

جواب: بعد میں جماعت کے ساتھ ملنے والے کی پہلی رکعت ہوتی ہے۔ راجح مسلک یہی ہے۔ لہٰذا انفرادی یعنی بعد میں ادا کی جانے والی نماز میں ثناء نہ پڑھے۔ البتہ ''سورۃ فاتحہ'' کا پڑھنا ضروری ہے۔ کیونکہ اس کے بغیر نماز نہیں ہوتی اور ساتھ دوسری کوئی سورت ملائے یا نہ ملائے دونوں طرح جائز ہے۔

سلام پھیرنے کے بعد مسبوق اپنی بقیہ رکعات میں کیا کیا پڑھے؟

سوال: جماعت کی دوسری، تیسری یا چوتھی رکعت میں ملنے کی صورت میں تکبیر اولیٰ فوت ہو جاتی ہے تو ہماری پہلی رکعت کونسی ہوگی؟ نیز جو بعد میں پڑھیں گے ان میں کیا کیا پڑھنا پڑے گا؟

جواب: جماعت میں بعد میں ملنے والے کی وہی رکعت پہلی ہوگی، جہاں سے اس نے نماز شروع کی۔ حدیث میں ہے:« فَمَا أَدرَكتُم فَصَلُّوا وَمَا فَاتَكُم فَأَتِمُّوا »[1] یعنی ''جماعت کا جو حصہ تمہیں مل جائے وہ پڑھ لو اور جو رہ جائے اسے پورا کرلو۔''

اس حدیث میں فوت شدہ کی بابت ''اتمام'' کا لفظ استعمال کیا گیا ہے، جس کے معنیٰ اخیر سے پورا کرنے کے ہیں اور اخیر سے پورا کرنا اسی صورت میں ہو سکتا ہے، کہ جو امام کی فراغت کے بعد پڑھے وہ اس کی اخیر ہو۔

دو آدمیوں کی باجماعت نماز کے تشہد میں تیسرے آدمی کے شامل ہونے کا طریقہ:

سوال: دو آدمی باجماعت نماز پڑھ رہے ہیں اور تشہد میں بیٹھے ہیں کہ ان کے ساتھ تیسرا آدمی جماعت میں شامل ہونا چاہے تو وہ کس طرح شامل ہو؟ کیا تشہد میں بیٹھے ہوؤں میں سے کسی کو اٹھائے؟

جواب: تیسرا آدمی بحالتِ تشہد امام کے بائیں طرف آ کر بیٹھ جائے کسی کو اٹھائے مت۔

دو افراد کی جماعت میں تیسرے آدمی کا شامل ہونا:

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ کے بارے میں کہ دو آدمیوں نے مل کر نماز شروع کی، اب تیسرا شخص جماعت میں داخل ہوا تو امام کو حرکت کر کے آگے جانا چاہیے یا مقتدی کو پیچھے ہونا چاہیے۔ جب کہ امام کے لیے آگے اور مقتدی کے لیے پیچھے جگہ ہے۔ اگر تیسرا آدمی آخری قعدہ میں ملے تو پھر کیا کرے؟

---

[1] متفق علیه، صحیح البخاری، بَابُ قَوْلِ الرَّجُلِ: فَاتَتْنَا الصَّلَاةُ، رقم:٦٣٥

جواب: بظاہر مسئلہ ہذا میں وسعت ہے۔ البتہ بہتر یہ ہے کہ مقتدی پیچھے ہٹے۔ اس لیے کہ نبی اکرم ﷺ جب قبیلہ بنی عمرو بن عوف میں صلح کی غرض سے تشریف لے گئے تھے، واپسی پر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ امامت کے مصلیٰ پر کھڑے تھے۔ آپ کی آمد کے احساس کے فوری بعد اقتداء کی صورت میں وہ پیچھے ہٹ گئے۔ اصل الفاظ ملاحظہ فرمائیں!

« ثُمَّ اسْتَأْخَرَ اَبُوبَكْرٍ حَتّٰى اسْتَوٰى فِي الصَّفِّ، وَ تَقَدَّمَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَصَلّٰى »[1]

یعنی ’’پھر ابوبکر رضی اللہ عنہ پیچھے ہٹ گئے حتی کہ صف میں برابر ہو گئے اور رسول اللہ ﷺ نے آگے بڑھ کر نماز پڑھائی۔‘‘

نیز بعد میں آنے والا تیسرا شخص نماز میں داخل ہو کر امام کے بائیں جانب اس حالت میں بیٹھ جائے جس میں امام کو پائے۔ اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ یہ آدمی جماعت کے اجر وثواب سے محروم نہیں رہے گا۔ اگرچہ ’’مِن كُلِّ الوُجُوه ‘‘ تمام اعتبار سے، شریک امام نہیں سمجھا جائے گا۔

دو آدمیوں کی باجماعت نماز میں تیسرا کیسے شامل ہو؟

سوال: اگر دو آدمی نماز پڑھ رہے ہوں، ایک امام ہو اور دوسرا مقتدی۔ تیسرا شخص آنے کی صورت میں امام آگے بڑھے یا مقتدی پیچھے ہٹے؟

جواب: مسئلہ ہذا میں بظاہر دونوں طرح وسعت ہے۔ حسب حال کسی بھی صورت کو اختیار کیا جا سکتا ہے۔

دو کی جماعت میں تیسرا حالت تشہد میں کیسے ملے؟

سوال: کیا اگر دو آدمی جماعت کروا رہے ہوں تو تیسرے آدمی کے آنے پر اگر وہ دو آدمی رکوع یا التحیات میں ہوں تو اس صورت میں کیا کیا جائے گا برائے مہربانی قرآن وحدیث کی روشنی میں اس مسئلہ کی وضاحت فرمائیں۔

جواب: جب جماعت دو سے ہو، تو مقتدی کا مقام دائیں طرف ہے۔ جس طرح کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کو رسول اللہ ﷺ نے حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا کے گھر رات کی نماز میں اپنے دائیں طرف کھڑا کیا تھا اور جب

[1] صحيح البخاري، بَابُ مَنْ دَخَلَ لِيَؤُمَّ النَّاسَ، فَجَاء......الخ، رقم: ٦٨٤ مع فتح الباري ١٦٧/٢، صحيح مسلم، رقم: ٤٢١، سنن أبي داود، رقم: ٩٤٠

جماعت تین افراد یا زیادہ پر مشتمل ہو، تو مقتدیوں کا مقام ''خلف الامام'' ہے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

«وَ صَفَفتُ اَنَا، وَالیَتِم وَرَآئَہٗ. وَالعَجُوزُ مِن وَرَآئِنَا. فَصَلّٰی لَنَا رَکعَتَینِ، ثُمَّ انصَرَفَ» ①

''اور ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے علقمہ اور اسود کو دائیں بائیں کھڑا کر کے جماعت کرائی۔ پھر کہا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اسی طرح کرتے دیکھا ہے۔''

لیکن اس کی سند میں راوی ہارون بن عنترہ متکلم فیہ ہے۔ ابن عبد البر رحمہ اللہ نے حدیث کے موقوف ہونے کو صحیح قرار دیا ہے۔ ابن سیرین رحمہ اللہ نے اس کا جواب یہ دیا ہے، کہ ممکن ہے فعل ہذا محل کی تنگی کی بناء پر ہو۔ اسی طرح بایں صورت تشہد میں ملنے والا ضرورت کی بناء پر امام کے بائیں طرف بیٹھ جائے۔ سو مقام میں تنگی کی بناء پر امام کے دائیں طرف بیٹھ جائے۔ کیونکہ اصل یہی ہے۔ البتہ رکوع کی صورت میں مقتدی یا امام کا آگے پیچھے ہونا ممکن ہے۔ دونوں شکلوں کا جواز ہے۔

منفرد نماز پڑھنے والا اگر دوسری جماعت کی اقامت سنے تو کیا کرے؟

سوال: جماعت ختم ہونے کے بعد آنے والا فرض نماز پڑھ رہا ہو اور جماعت ثانیہ کی اقامت سنائی دے تو اسے جماعت میں شامل ہونا فرض ہے یا اپنی نماز جاری رکھے؟

جواب: بہتر یہ ہے کہ ایسا شخص اپنی انفرادی فرض نماز جاری رکھے۔ کیونکہ جماعت ثانیہ کا صرف جواز ہے، اس کی پہلی جماعت جیسی تاکید نہیں، پھر جماعت ثانیہ کے جواز میں اختلاف بھی اس امر کا مؤید ہے۔ اگرچہ ہمارے نزدیک اصل جواز ہے۔ ملاحظہ ہو! (فتاوی مولانا شمس الحق عظیم آبادی ص ۱۷۳)

مقتدی امام کے ساتھ جس رکعت میں شامل ہوتا ہے وہ اس کی کونسی رکعت ہوگی؟

سوال: مقتدی امام کے ساتھ جس رکعت میں شامل ہوگا وہ اس کی پہلی رکعت ہوگی، یا وہی رکعت شمار کی جائے گی جو امام کی ہوگی؟

جواب: صحیح حدیث میں ہے کہ: «فَمَا أَدرَکتُم فَصَلُّوا وَمَا فَاتَکُم فَأَتِمُّوا» ②

''نماز کا جتنا حصہ امام کے ساتھ پاؤ پڑھو اور جو فوت ہو جائے وہ پورا کرلو۔''

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ بعد میں شامل ہونے والا شخص امام کی فراغت کے بعد جتنی نماز پڑھتا ہے

---

① سنن أبی داؤد، بَابُ إِذَا کَانُوا ثَلَاثَۃً کَیفَ یَقُومُونَ، رقم: ۶۱۲، صحیح البخاری، رقم: ۳۸۰، صحیح مسلم، رقم: ۶۵۸

② صحیح البخاری، بَابُ قَولِ الرَّجُلِ: فَاتَتنَا الصَّلَاۃُ، رقم: ۶۳۵

وہ اس کی پچھلی نماز ہے اور جو امام کی اقتداء میں پڑھی وہ اس کی پہلی ہے۔ کیونکہ حدیث ہذا میں فوت شدہ کے بارے میں اِتمَام کا لفظ استعمال کیا گیا ہے جس کے معنی اخیر سے پورا کرنے کے ہیں اور اخیر سے پورا کرنا اسی صورت میں ہوسکتا ہے، کہ امام کی فراغت کے بعد پڑھی جانے والی نماز اخیر کی ہو۔

تفصیل کے لیے ''فتح الباری'' (۲/ ۱۱۸۔۱۱۹) کا مطالعہ مفید رہے گا۔

سلام پھر جانے کے بعد با جماعت نماز پڑھنے کے لیے دوسری مسجد کا رخ کرنا:

سوال: ایک شخص مسجد میں نماز پڑھنے گیا، جماعت میں شامل ہونے سے پہلے ہی امام صاحب نے سلام پھیر دیا۔ کسی قریبی مسجد میں اسے جماعت ملنے کی امید ہے تو کیا وہ دوسری مسجد میں جا کر نماز ادا کر لے یا اسی مسجد میں آنے سے جماعت کا فرض ادا ہو گیا۔ صحابہ سے اس بارے میں کچھ ثابت ہے یا نہیں؟

جواب: ''صحیح بخاری کے ''ترجمۃ الباب'' میں ہے کہ اسود بن یزید نخعی (جو کبار تابعین میں سے ہیں) جب ان سے جماعت فوت ہو جاتی، تو دوسری مسجد میں چلے جاتے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ ایک مسجد میں آئے۔ وہاں جماعت ہو چکی تھی، تو اذان اور اقامت کہہ کر انھوں نے باجماعت نماز پڑھی۔

اس سے معلوم ہوا کہ باجماعت نماز کی کوشش کرنی چاہیے، اسی مسجد میں ہو یا دوسری میں۔

باجماعت نماز میں تاخیر سے شامل ہونے والا کیا کرے؟

سوال: ایک آدمی نماز میں جماعت کے ساتھ آ کر ملتا ہے۔

۱۔ تکبیر تحریمہ کے بعد ثناء پڑھے گا؟ یا اپنی رکعت الگ مکمل کرتے ہوئے اس کے شروع میں پڑھے گا؟

۲۔ اپنی رکعت مکمل کرنے کے لیے امام کے سلام کے بعد اُٹھا تو رفع الیدین کرے گا یا نہیں؟

۳۔ جماعت جاری ہے، امام رکوع میں ہے، ایک شخص آ کر شامل ہوتا ہے، تکبیر تحریمہ کہہ کر شامل ہوا۔ کیا کچھ دیر کے لیے ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو؟ یا سیدھا رکوع میں چلا جائے؟

جواب: (ا) تاخیر سے جماعت کے ساتھ ملنے والا آدمی سری نماز میں اگر موقع میسر آ جائے تو ثناء پڑھ لے، ورنہ صرف فاتحہ پر اکتفاء کرے۔ کیونکہ ثناء مستحب ہے اور فاتحہ واجب ہے۔ بعد میں کسی رکعت میں ثناء نہ پڑھے۔ اس لیے کہ ثناء کا تعلق صرف پہلی رکعت سے ہے، اور جہاں تک جہری نماز کا تعلق ہے، سو اس میں صرف سورہ فاتحہ پر اکتفاء کرے۔

(ب) امام کے سلام پھیرنے کے بعد مقتدی اگر دو رکعت مکمل کر کے اٹھا ہے، تو رفع یدین کرے گا ورنہ

نہیں۔حدیث میں ہے:« وَ اِذَا قَامَ مِنَ الرَّكعَتَينِ فَعَلَ مِثلَ ذٰلِكَ »[1]

(ج) ایسی حالت میں مقتدی کو اختیار ہے ہاتھ باندھ کر رکوع میں جائے یا بلا باندھے سیدھا چلا جائے۔ بظاہر ترجیح دوسری صورت کو ہے، لیکن ہاتھ باندھنے کی صورت میں مزید کھڑا رہنے کی قطعاً ضرورت نہیں، کیونکہ یہ قیام کا موقع و محل نہیں۔ ہاتھوں کو باندھنا محض نماز میں داخل ہونے کے اظہار کے لیے ہے۔بعدازاں فوراً امام کی موجودہ حالت کو اختیار کرلے۔

نمازِ جمعہ کا تشہد پانے والا:

سوال: فتاویٰ اہلِ حدیث میں صحابہ کا مسلک یہ لکھا ہے کہ نمازِ جمعہ کا تشہد پانے والا مسبوق ظہر کی چار رکعتیں ادا کرے گا۔مقیم کی اقتداء میں تشہد پانے والے مسافر پر قیاس کرتے ہوئے صحابہ کا فتویٰ ترک کرنا کیا صحیح ہے؟

جواب: میرے خیال میں اس باب میں اختلاف کی بناء پر موصوف نے حکم مختلف لگایا ہے۔کیونکہ جمعہ میں نماز جمعہ کا شمار مقصود ہے، جب کہ یہاں محض دوگانے کی نیت ہے۔میری نظر میں ایسی صورت میں دوگانہ کی نیت نہیں ہونی چاہیے، کیونکہ سلام پھرنے تک آدمی امام کی اقتداء میں شمار ہوتا ہے۔
عمومِ حدیث« فَمَا أَدرَكتُم فَصَلُّوا وَمَا فَاتَكُم فَأَتِمُّوا »[2] اسی بات کا متقاضی ہے۔

نمازِ جنازہ میں دوسری یا تیسری تکبیر میں ملنے والا آدمی:

سوال: نمازِ جنازہ میں دوسری یا تیسری تکبیر میں ملنے والا آدمی، امام کے ساتھ ہی سلام پھیرے گا یا فوت شدہ تکبیریں پڑھ کر سلام پھیرے گا؟

جواب: جنازہ میں مسبوق تکبیریں مکمل کرکے پھر سلام پھیرے۔
صحیح حدیث میں ہے:« فَمَا أَدرَكتُم فَصَلُّوا وَمَا فَاتَكُم فَأَتِمُّوا »[3] یعنی ''جتنی نماز امام کے ساتھ پاؤ پڑھو اور جتنی فوت ہوجائے پوری کرو۔'' یہ حدیث اپنے عموم کے اعتبار سے نمازِ جنازہ کو بھی شامل ہے۔

---

[1] سنن ابوداؤد مع عون المعبود:١/٢٦٩ ، سنن أبی داؤد،بَابُ افْتِتَاحِ الصَّلَاةِ،رقم:٧٣٨ ، رقم: ٧٣٠ و رقم: ٧٤٤

[2] صحیح البخاری،بَابُ قَولِ الرَّجُلِ : فَاتَتنَا الصَّلَاةُ،رقم:٦٣٥

[3] صحیح البخاری،بَابُ قَولِ الرَّجُلِ : فَاتَتنَا الصَّلَاةُ،رقم:٦٣٥

قضاء نمازوں کے احکام و مسائل

جان بوجھ کر فرض نمازِ قضاء کرنے والا:

سوال: گزارش ہے کہ ایک شخص جان بوجھ کر فرض نمازِ قضاء کرتا ہے۔کیا وہ بعد میں اس کو پڑھ سکتا ہے؟

جواب: جس فرض نماز کو جان بوجھ کر قضاء کر دیا جائے اس کی بھی قضاء ضروری ہے۔صحیح مسلم میں حدیث ہے:

« لَيسَ فِي النَّومِ تَفرِيطٌ. إِنَّمَا التَّفرِيطُ عَلَى مَن لَّم يُصَلِّ الصَّلٰوةَ حَتّٰى يَجِيئَ وَقتُ الصَّلٰوةِ الْاخرٰى. فَمَن فَعَلَ ذٰلِكَ فَليُصَلِّهَا حِينَ يَنتَبِهُ لَهَا ، فَإِذَا كَانَ الغَدُ فَليُصَلِّهَا عِندَ وَقتِهَا »[1]

''یعنی نیند کی صورت میں آدمی کی کوتاہی تصور نہیں ہوتی۔کوتاہی تو اس کی ہے جو جان بوجھ کر نماز نہیں پڑھتا یہاں تک کہ دوسری نماز کا وقت داخل ہو جاتا ہے۔جو شخص یہ فعل کر گزرے اسے چاہیے کہ جب وہ اس کے لیے آگاہ ہو تو اُسے پڑھے اور دوسرے روز اسے وقت پر ادا کرنا چاہیے۔''

واضح ہو کہ جس نماز کو جان بوجھ کو ترک کیا گیا ہو اس کی صرف قضاء ہی نہیں بلکہ اس کوتاہی پر ساتھ ساتھ اللہ سے معافی کی درخواست بھی کرنی چاہیے۔

سوتے ہوئے نماز فوت ہو جانا:

سوال: اگر سوتے ہوئے نماز فوت ہو جائے تو پھر (نماز کے وقت کے بعد) اس کو ادا کرتے ہوئے پوری نماز ادا کرنا ہو گی یا صرف فرض ادا کرنے ہوں گے اور دل میں نیت کیا کرنا ہو گی؟

جواب: فوت شدہ نماز کی نیت کر کے پوری پڑھے۔ایک دفعہ نبی کریم ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی سوئے ہوئے فجر کی نماز فوت ہو گئی تو سورج طلوع ہونے کے بعد انھوں نے سنتوں سمیت پوری پڑھی تھی۔(فصل رابع مشکوٰۃ) اور سنن ابوداؤد میں الفاظ یوں ہیں:

« فَصَلُّوا رَكعَتَيِ الفَجرِ ، ثُمَّ صَلُّوا الفَجرَ ، وَ رَكِبُوا »[2]

'العون' میں ہے:

« وَفِيهِ قَضَاءُ السُّنَّةِ الرَّاتِبَةِ.»

---

[1] صحيح مسلم،بَابُ قَضَاءِ الصَّلَاةِ الْفَائِتَةِ، وَاسْتِحْبَابِ تَعْجِيلِ قَضَائِهَا ،رقم:٦٨١

[2] سنن أبي داود،بَابٌ فِي مَنْ نَامَ عَنِ الصَّلَاةِ، أَوْ نَسِيَهَا،رقم:٤٣٧، عون المعبود :١٦٨/١

یعنی اس حدیث میں دلیل ہے کہ سنن رواتب کی قضاء ہے۔ مزید دلائل کے لیے ملاحظہ ہو! (إعلام أهل العصر بأحكام ركعتي الفجر، الفصل العاشر في قضاء السنن والنوافل. (ص:٢٣٤)

قضاء نماز پڑھنے کا طریقہ:

سوال : قضاء نماز پڑھنے کا طریقہ، بدلیل وضاحت فرمائیں؟

جواب : جس طرح اداء نماز پڑھی جاتی ہے، اسی طرح قضاء نماز ہے، حدیث میں ہے:

« مَن نَسِیَ صَلَاۃً فَلیُصَلِّ إِذَا ذَکَرَهَا، لَا کَفَّارَۃَ لَهُ إِلَّا ذٰلِكَ » [1]

نماز کی قضاء کا طریقہ، نماز پڑھنے سے پہلے یا بعد میں؟

سوال : نماز کی قضاء کس طرح دی جاسکتی ہے، نماز پڑھنے سے پہلے یا بعد میں؟

جواب : سوال غیر واضح ہے۔ غالباً سائل کا مقصود یہ ہے، کہ فوت شدہ نماز کی قضاء حاضر نماز کی ادائیگی سے پہلے دی جائے یا بعد میں؟ تو اس کا جواب یہ ہے، کہ فوت شدہ نماز کی قضاء پہلے دی جائے، بعد میں موجود نماز کو ادا کیا جائے۔ مسئلہ ہذا پر ''صحیح بخاری میں بایں الفاظ تبویب قائم کی ہے:

« بَابُ قَضَاءِ الصَّلوٰتِ الأُولٰی فَالْأُولٰی » یعنی ''فوت شدہ نمازوں کی قضاء بالترتیب ہے۔''

پھر مصنف رحمہ اللہ نے قصۂ خندق سے استدلال کیا ہے کہ آپ ﷺ کی نمازِ عصر قضاء ہوگئی تھی۔ غروبِ شمس کے بعد آپ ﷺ نے پہلے عصر پڑھی۔ پھر نماز مغرب کو ادا کیا۔ [2]

یاد رہے کسی معقول عارضہ کی بناء پر تقدیم و تاخیر ہوسکتی ہے مثلاً: حاضر نماز کا وقت تنگ ہے یا جماعت کھڑی ہوچکی ہے وغیرہ وغیرہ۔ تو ایسی صورتوں میں حاضر نماز پہلے پڑھی جائے اور قضاء شدہ نماز کی قضاء بعد میں دی جائے۔

ظہر کی نماز سے رہ جانے والا اگر عصر کی باجماعت نماز میں شامل ہو تو......؟

سوال : (ا) اگر ظہر کی نماز رہ جائے اور مسجد میں آدمی اس وقت پہنچے جب عصر کی جماعت ہو رہی ہو تو کیا وہ پہلے ظہر کی نماز ادا کرے گا یا جماعت کے ساتھ شامل ہو کر نماز عصر ادا کرے گا اور اس کے بعد نماز ظہر ادا

---

[1] صحيح البخاري، بَابُ مَنْ نَسِيَ صَلَاةً فَلْيُصَلِّ إِذَا ذَكَرَ، وَلَا يُعِيدُ إِلَّا تِلْكَ الصَّلَاةَ، رقم:٥٩٧

[2] صحيح البخاري، بَابُ مَنْ صَلَّى بِالنَّاسِ جَمَاعَةً بَعْدَ ذَهَابِ الوَقْتِ، رقم:٥٩٦، مع فتح الباري: ٧٢/٢

کرے گا اس طرح حدیث « لَا صَلٰوةَ بَعدَ العَصرِ »[1] کے خلاف تو نہ ہوگا؟

(۲)......اگر کسی شخص کی نماز مغرب رہ گئی ہے اور جب مسجد میں پہنچا تو عشاء کی جماعت ہو رہی ہو۔ تو کیا وہ پہلے نماز مغرب ادا کرے گا یا جماعت کے ساتھ شامل ہو جائے گا؟ اور وِتر ادا کرنے کے بعد نماز مغرب ادا کرے گا۔ اس طرح «لَا صَلَاةَ بَعدَ الوِترِ» کے خلاف تو نہیں ہوگا؟ ہمارے ہاں اس بارے میں علماء کے تین اقوال ہیں۔

① پہلے نماز مغرب پڑھے پھر جماعت میں شامل ہو، وہ نماز مسجد میں پڑھ لے یا گھر جا کر پڑھے پھر مسجد میں آجائے۔ اس طرح اگر مسجد میں پڑھے گا تو امام کی آواز آئے گی اور نماز نہ ہوگی۔ اگر گھر جائے گا تو عشاء کی جماعت ختم ہو جائے گی اور جماعت کے ثواب سے محروم ہوگا۔

② پہلے جماعت میں شامل ہو اور سنتوں سے فارغ ہو کر وتروں سے پہلے نماز مغرب ادا کرے اور پھر وِتر ادا کرے۔ اس طرح نماز عشاء کی ترتیب ٹوٹ جائے گی۔

③ نماز عشاء مکمل ادا کرنے کے بعد نماز مغرب کی قضاء دے۔ کیا اس طرح " لَا صَلٰوةَ بَعدَ الوِترِ" کے خلاف نہ ہوگا؟ کیونکہ وہ نماز فرضی تھی اور وہ اگلے دن سورج نکلنے سے پہلے ادا نہیں کر سکتا۔ جیسا کہ «لَا صَلٰوةَ بَعدَ صَلٰوةِ الفَجرِ»[2] سے ظاہر ہوتا ہے۔ کیا اسے یقین ہے کہ وہ اتنا وقت زندہ رہ سکے گا؟

جناب محترم! ان تین اقوال میں سے کون سا قول اقرب الی السنۃ ہے؟ اور اگر اس سے بہتر کوئی حل ہو تو بیان فرما کر احسان فرمائیں!

جواب: ایسی حالت میں مقتدی پہلے [illegible] نماز ادا کرے۔ بعد میں ظہر پڑھے۔ حدیث میں ہے:

« اِذَا اُقِيمَتِ الصَّلٰوةُ فَلَا صَلٰوةَ اِلَّا الَّتِی اُقِيمَت .»[3]

یعنی "جب اقامت ہو جائے تو کوئی نماز نہیں مگر وہی جس کی اقامت ہوئی ہے۔"

جہاں تک اس پر اعتراض کا تعلق ہے، کہ عصر کے بعد ظہر کی نماز پڑھنے میں بعض قباحتیں نظر آتی ہیں۔ مثلاً حدیث «لَا صَلٰوةَ بَعدَ العَصرِ» کے منافی ہے۔ دوسرا، ترتیب معکوس ہو جاتی ہے۔ سو اس اِشکال کا جواب یوں ہے، کہ شرع میں فوت شدہ نماز کا کوئی وقت متعین نہیں۔ حسبِ توفیق قطع نظر ممنوعہ اوقات کے ہر

---

① سنن ابن ماجه،بَابُ النَّهيِ عَنِ الصَّلَاةِ بَعْدَ الفَجْرِ وَبَعْدَ الْعَصْرِ،رقم:١٢٤٩

② صحيح مسلم،بَابُ الْأَوْقَاتِ الَّتِي نُهِيَ عَنِ الصَّلَاةِ فِيهَا، رقم:٨٢٧

③ مسند أحمد،رقم:٨٦٢٣، شرح مشكل الآثارللطحاوى ، رقم:٤١٢٨،٤١٢٩ ، و قال الشوكانى فى "نيل الأوطار" قال العراقى: إسناده حسن

وقت پڑھی جا سکتی ہے۔ مزید آنکہ رسول اللہ ﷺ سے عصر کے بعد ظہر کے نوافل کی قضائی بھی ثابت ہے، اور فجر کے فرائض کے بعد پہلی دو رکعتیں پڑھنے کا جواز بھی منقول ہے۔ جب ممنوع وقت میں نوافل کی قضائی دی جا سکتی ہے تو فوت شدہ فرضوں کی قضاء بطریقِ اُولیٰ جائز ہونی چاہیے۔ دوسرا، ترتیب کا اہتمام وہاں ہوگا، جہاں کوئی عارضہ (رکاوٹ) لاحق نہ ہو۔ زیرِ بحث محل و مقام میں مذکور حدیث کی بناء پر پہلے حاضر نماز ادا کی جائے۔ پھر فوت شدہ۔ اسی طرح مغرب کی نماز بھی عشاء کے فرضوں کے بعد اور وتروں سے پہلے ادا کی جائے تاکہ وِتر رات کی آخری نماز بن سکیں۔ ''صحیح مسلم میں حدیث ہے:

« اِجعَلُوا آخِرَ صَلٰوتِکُم بِاللَّیلِ وِترًا » [1] یعنی رات کی آخری نمازِ وِتر بناؤ۔

آپ کے درج کردہ الفاظ قریباً اسی حدیث کا مفہوم ہیں۔ یہ بھی یاد رہے کہ عشاء کے فرض اور وِتر میں ترتیب ضروری نہیں بلکہ رات کی ساری نماز سے وتروں کو مؤخر کرنا ہی اُفضل الامور ہے۔

اس مقام پر علماء کا دوسرا گروہ اس بات کا بھی قائل ہے، کہ عصر اور عشاء کے امام کی اقتداء میں بالترتیب ظہر اور مغرب کی نیت بھی ہو سکتی ہے۔ گویا کہ ان کے نزدیک دونوں طرح اختیار ہے۔ ان کے پیشِ نظر بھی بعض دلائل ہیں جن کا ماحصل یہ ہے کہ ایک تو ترتیب ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔ دوسرا اگر کوئی شخص اس حالت میں مَر جائے تو فوت شدہ نماز کے بارے میں ذمہ دار ٹھہرے گا، جب کہ حاضر فرض ساقط ہو جائے گا۔ ان کا کہنا یہ بھی ہے کہ اس طرح انسان مکروہ وقت میں قضائی سے بھی بچ جاتا ہے۔ جو مستحسن فعل ہے۔

لہٰذا عصر کے امام کی اِقتداء میں ملنے والا پہلے ظہر پڑھے پھر عصر کی نماز ادا کرے گا اور عشاء کے امام کی اقتداء میں مغرب کی تیسری رکعت میں تشہد بیٹھ جائے۔ جب امام عشاء کی چوتھی رکعت سے فارغ ہو تو اس کے ساتھ اکٹھے سلام پھیرے یا پہلے ہی سلام پھیر کر اپنے کو فارغ کرلے۔ لیکن اس میں امام کی مخالفت لازم آتی ہے جو درست بات نہیں۔

اس طرح پہلے قول پر تعمیل کی صورت میں مذکورۃ الصدر حدیث کی مخالفت لازم آتی ہے اور گھر لوٹ کر نماز پڑھنے سے اپنے کو جماعت کے اجر و ثواب سے محروم کرنا ہے، جو عاقل فہیم کے شایانِ شان نہیں۔ تیسرے قول میں بھی جواز کا پہلو غالب ہے، کیونکہ فوت شدہ نماز کی قضائی کا کوئی وقت مقرر نہیں۔ ہر وقت دی جا سکتی ہے۔ حدیث میں ہے:

---

[1] صحیح مسلم،بَابُ صَلَاۃُ اللَّیلِ مَثنَی مَثنَی، وَالوِترُ رَکعَۃٌ مِن آخِرِ اللَّیلِ،رقم:۷۵۱، سنن ابی داؤد،رقم:۱۴۳۸

« فَإِذَا سَهٰى أَحَدُكُم عَن صَلٰوةٍ، فَليُصَلِّهَا حِينَ يَذكُرُهَا، وَ مِنَ الغَدِ لِلوَقتِ »[1]

صاحب ''العون'' رقمطراز ہیں:

« مَعنَاه أَنَّهُ يُصَلِّي الصَّلٰوةَ الفَائِتَةَ حِينَ يَذكُرُهَا فَإِذَا كَانَ الغَدُ يُصَلِّي صَلٰوةَ الغَدِ فِي وَقتِهَا المُعتَاد » (۱/۱۶۸)

''اس حدیث کا مفہوم یہ ہے، کہ فوت شدہ نماز جب بھی کسی کو یاد آئے پڑھ لے اور دوسرے دن اپنے مقررہ وقت پر پڑھنی چاہیے۔''

سوال کے اخیر میں آپ کے مقرر کردہ مفروضے کی کوئی حقیقت نہیں کیونکہ شرع میں قضائی کا جواز ہر وقت موجود ہے۔ مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو! کتاب ''صلوٰۃ الرسول ﷺ'' تعلیقات حافظ عبد الروف حفظہ اللہ ص (۳۵۰، ۳۵۱) اور فتاویٰ اہلحدیث (۶۱/۳)

عصر کی نماز میں شامل قضا شدہ ظہر کی نماز ادا کرے گا یا عصر کی؟

سوال: ظہر کی نماز ادا نہیں کی۔ عصر کی جماعت ہو رہی ہو تو پہلے عصر کی ادا کریں گے یا ظہر کی؟ جماعت کے ساتھ کونسی نماز کی نیت کریں گے؟

جواب: دونوں طرح جائز ہے۔ تاہم بہتر معلوم ہوتا ہے، کہ موجودہ نماز پہلے پڑھے۔ پھر فوت شدہ کی قضائی دے لے۔

سوال: جس نے ابھی ظہر کی نماز ادا نہیں کی، اس نے عصر کی جماعت پائی تو وہ ظہر کی نماز کی نیت سے جماعت میں شامل ہوسکتا ہے یا نہیں؟ جب کہ اقامت ہو جائے تو ''المکتوبة'' کے سوا دوسری نماز نہیں ہوتی۔ علامہ احمد شاکر کہتے ہیں کہ ''المکتوبة'' معرف باللاّم سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے وہی فرضی نماز مراد ہے جس کے لیے اس وقت تکبیر کہی گئی ہے (نہ کہ عام فرض نماز)۔

(دیکھئے ''المحلی'' مترجم اردو جلد دوم، باب مقتدی عذر کے بغیر امام سے پہلے سلام نہیں پھیر سکتا، عنوان: ۳۱۲، ص: ۲۹۶ حاشیہ)

جواب: ایسی صورت میں امام عصر کے ساتھ ظہر کی نیت کرے یا عصر کی دونوں طرح اختیار ہے۔ علامہ احمد شاکر رحمہ اللہ کی توضیح عمومی حالت پر محمول ہے، جب کہ یہاں حتمی فیصلے سے وجوبِ ترتیب مانع ہے۔

---

[1] سنن أبي داود، باب مَن نَامَ عَن صَلَاةٍ أو نَسِيَهَا، رقم: ۴۳۷، سنن الترمذي، بَابُ مَا جَاءَ فِي النَّومِ عَنِ الصَّلٰوة، رقم: ۱۷۷

ظہر کی نماز رہ گئی ہو تو کیا اس کو عصر کی نماز کے بعد پڑھنا:

(سوال) : اگر ظہر کی نماز رہ گئی ہو تو کیا اس کو عصر کی نماز کے بعد پڑھا جا سکتا ہے؟

(جواب) : فوت شدہ نماز کا کوئی وقت مقرر نہیں۔ ظہر کی نماز عصر کے بعد پڑھی جا سکتی ہے۔ حدیث میں ہے:

« فَإِذَا سَهَى أَحَدُكُمْ عَنْ صَلَاةٍ فَلْيُصَلِّهَا حِينَ يَذْكُرُهَا »[1]

عشاء کی نماز میں شامل شخص مغرب کے تین فرض پڑھے یا عشاء کی نماز؟

(سوال) : عشاء کے فرض پڑھنے والے امام کی اقتداء میں مغرب کے تین فرض کس طرح ادا کیے جائیں؟

(جواب) : ایسی صورت میں پہلے باجماعت عشاء پڑھے، پھر بعد میں اکیلا مغرب پڑھ لے۔

نمازی کو اگر قضا شدہ نماز یاد آ جائے تو......؟

(سوال) : اگر بھولے سے حاضر نماز شروع کر دی اور اسی دوران پہلی قضاء شدہ نماز یاد آئی تو سلام پھیرنے کے بعد قضاء شدہ نماز ادا کرنے کے بعد حاضر نماز جو خلافِ ترتیب پہلے پڑھ لی ہے، دہرانی چاہیے یا نہیں؟ مؤطا امام مالک میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کا قول ہے، کہ جو شخص قضاء شدہ نماز ادا کرنا بھول جائے اور امام کی اقتداء میں نماز ادا کرتے ہوئے اسے یاد آئے تو سلام پھیرنے کے بعد جب قضاء شدہ نماز پڑھ چکے امام کی اقتداء میں ادا کی ہوئی نماز کا اعادہ کرے۔

(جواب) : ایسی صورت میں ترتیب ضروری نہیں رہتی، حاضر نماز کے بعد فوت شدہ نماز پڑھ لے۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کی سابقہ گفتگو میں بھی اسی بات کی طرف اشارہ ہے۔ ترتیب والی احادیث کا جواب یہ ہے کہ حدیث «لَا صَلَاةَ اِلَّا الَّتِیْ أُقِیمَت لَهَا»[2] سے معلوم ہوا کہ جب اقامت ہو جائے، تو ترتیب ملحوظ رکھنا ضروری نہیں۔ ہاں اور وقتوں میں ترتیب سے پڑھے۔ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت جو مؤطا میں ہے وہ اُن کا قول ہے جو سابقہ مرفوع حدیث کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔

اکیلا نمازی قضا شدہ نماز یاد آنے پر نماز جاری رکھے یا توڑ دے؟

(سوال) : اگر اکیلے نماز پڑھنے والے کو قضاء نماز یاد آئے تو نماز توڑ کر پہلے قضاء نماز پڑھے یا یہ نماز مکمل

[1] سنن أبی داؤد، باب مَن نَامَ عَن صَلَاةٍ اَو نَسِیَهَا، رقم: ٤٣٧، سنن الترمذی، بَابُ مَا جَاءَ فِی النَّومِ عَنِ الصَّلٰوۃِ، رقم: ١٧٧

[2] مسند أحمد، رقم: ٨٦٢٣، شرح مشکل الآثار للطحاوی، رقم: ٤١٢٨، ٤١٢٩

کر لے اور قضاء نماز کے بعد اس کا اعادہ نہ کرے؟

(جواب): وسعتِ وقت کی صورت میں نماز توڑ کر پہلے پہلی پڑھے اور تنگی وقت کی صورت میں پہلے موجود پڑھے پھر فوت شدہ۔ جیسے ایک شخص نے عشاء کی نماز پڑھنی ہے، سورج نکلنے کے قریب یاد آیا، ایسی صورت میں پہلے فجر پڑھے پھر عشاء کیونکہ اس کے لیے وقت متعین ہے۔

اسی بناء پر فقہاء نے کہا ہے کہ: «فَإِنْ خَشِيَ فَوَاتَ الْحَاضِرَةِ سَقَطَ التَّرتِيبُ» یعنی حاضر نماز کے فوت ہونے کا ڈر ہو تو ترتیب ساقط ہو جاتی ہے۔

دو چار روز کی قضا شدہ نمازوں کی قضا بالترتیب یا بلا ترتیب؟

(سوال): اگر کسی انسان کی کسی بھی وجہ سے دو چار روز کی نمازیں ادا کرنے سے رہ گئی ہوں تو ان کی قضاء کس طرح ادا کرنی چاہیے؟

(جواب): فوت شدہ نمازوں کی قضائی بالترتیب دینی چاہیے۔ غزوۂ خندق کے موقع پر آپ ﷺ نے قضاء شدہ نمازوں کی قضائی بالترتیب دی تھی۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی ''صحیح'' میں باب قائم کیا ہے:

« قَضَاءُ الصَّلَوَاتِ الْأُولٰى فَالْأُولٰى.»

کیا مریض آدمی دس دن کی نمازوں کی قضائی دے گا؟

(سوال): ایک آدمی دس دن اتنا بیمار یا مصروف رہا کہ کوئی نماز نہ پڑھ سکا۔ اب اُسے ان فوت شدہ نمازوں کو پڑھنا چاہیے یا نہیں؟ وضاحت فرمائیں۔ شکریہ

(جواب): دس دن کی قضاء شدہ نمازوں کی قضائی دینی چاہیے۔ اگر بیماری کی شدت کی وجہ سے غشی طاری رہی تو بایں صورت صرف قریبی پانچ نمازوں کی قضائی دے۔[1]

ایک عرصہ بعد رہ جانے والی نمازیں یاد آئیں تو قضاء کا طریقہ:

(سوال): ایک آدمی کی کئی نمازیں کسی وجہ سے چھوٹ گئیں۔ کیا وہ اب ایک سال بعد دوہرا لے یعنی پڑھ لے یا صرف توبہ کرے؟

(جواب): قضاء شدہ نمازیں عرصہ بعد یاد آنے کی صورت میں اگر کم ہوں تو آدمی قضائی دے لے۔ بصورتِ دیگر رب کے حضور توبہ و استغفار کر لے کافی ہے: ﴿ لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ﴾ (البقرۃ:۲۸۶)

[1] مؤطا

قضائے عمری ادا کرنا:

(سوال) : میری عمر پچیس سال ہے، اب میں نے نماز با قاعدہ پڑھنا شروع کر دی ہے، اس سے پہلے میں نے کبھی نماز نہیں پڑھی تھی۔ کیا اب پہلی نمازوں کو ادا کرنے کا کوئی طریقہ ہے؟ قرآن و حدیث سے وضاحت کریں۔

(جواب) : زندگی کے ایک حصے کی ترک شدہ نمازوں کی قضاء ضروری نہیں۔ صرف توبہ و استغفار کرنا ہی کافی ہے۔ قرآن میں ہے:

﴿قُل لِّلَّذِينَ كَفَرُوٓا۟ إِن يَنتَهُوا۟ يُغْفَرْ لَهُم مَّا قَدْ سَلَفَ﴾ (الانفال: ۳۸) ''اے نبیؐ! کفار سے کہہ دو کہ اگر وہ (اپنے افعال سے) باز آ جائیں تو جو ہو چکا وہ انہیں معاف کر دیا جائے گا۔''

دوسری جگہ فرمایا:

﴿وَإِنِّى لَغَفَّارٌ لِّمَن تَابَ وَءَامَنَ وَعَمِلَ صَـٰلِحًا ثُمَّ ٱهْتَدَىٰ﴾ (طٰہٰ: ۸۲) ''اور جو توبہ کرے اور ایمان لائے اور عمل نیک کرے پھر سیدھے رستے پر چلے اس کو میں بخشنے والا ہوں۔''

شریعت میں قضاء عمری کا کوئی ثبوت نہیں، حدیث میں ہے کہ «اَلتَّوبَۃُ تَجُبُّ مَا كَانَ قَبلَهَا.» یعنی ''توبہ سابقہ گناہ مٹا دیتی ہے۔'' نیز فرمایا کہ «اَلتَّائِبُ مِنَ الذَّنبِ كَمَن لَا ذَنبَ لَهٗ» [1] ''گناہ سے توبہ کرنے والا ایسا ہو جاتا ہے کہ اس نے گناہ کیا ہی نہیں۔''

قضاء شدہ نمازیں ترتیب سے پڑھنا:

(سوال) : ایک دو نمازیں قضاء ہو جائیں تو ان نمازوں کی ادائیگی میں ترتیب ملحوظ رکھنا اس کے ادا ہونے کی شرط ہے، یا واجب ہے، یا سنت؟

(جواب) حتی المقدور قضاء شدہ نمازوں کو ترتیب سے پڑھنا ضروری ہے۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

«وَالْأَكثَرُ عَلٰی وُجُوبِهٖ مَعَ الذِّكرِ، لَا مَعَ النِّسيَانِ» [2]

''اکثر علماء کا کہنا ہے کہ یاد کی صورت میں ترتیب ضروری ہے۔ بھول کی صورت میں نہیں۔'' تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو! (مجموع فتاویٰ سماحۃ الشیخ ابن باز: ۴/ ۴۳۸۔۴۴۳) فتاویٰ اہل حدیث: ۲/ ۸۶۔

---

[1] سنن ابن ماجه،بَابُ ذِكرِ التَّوبَةِ، رقم:۴۲۵۰

[2] فتح الباری: ۲/ ۷۰

قضاء شدہ نماز کی سنتوں کا حکم:

(سوال): اگر ایک آدمی کسی مجبوری یا سو جانے کی بناء پر نماز ادا نہ کر سکے تو اگلی نماز کے ساتھ وہ اس نماز کی مکمل ادائیگی کرے یا کہ صرف فرض پڑھے؟

(جواب): قضاء شدہ نماز کا کوئی ٹائم نہیں۔ بوقتِ فرصت اسے فوراً پڑھ لینا چاہیے۔ قضائی میں سنتوں کی ادائیگی کا اختیار ہے۔ البتہ صبح کی سنتوں کا اہتمام ہونا چاہیے۔

نمازِ فجر کی قضائی دیتے ہوئے سنتیں بھی ساتھ پڑھیں؟

(سوال): کیا صبح کی نماز قضاء پڑھنے کی صورت میں سنتیں بھی ساتھ پڑھی جائیں گی یا صرف فرض پڑھنا ہوں گے اور اسی طرح مغرب کی نماز قضاء پڑھیں تو کیا سنتیں بھی ساتھ پڑھیں گے؟

(جواب): صبح کی نماز کی قضائی کی صورت میں سنتیں بھی ساتھ پڑھنی چاہئیں۔ نبی ﷺ نے حضر اور سفر میں ان کو ترک نہیں کیا۔(احکام رکعتی الفجر) [1] مغرب کی سنتیں پڑھنے کا بھی جواز ہے۔ [2]

نمازِ تہجد قضاء پڑھنا اور مسئلہ وتر:

(سوال): کیا نمازِ تہجد قضاء پڑھی جا سکتی ہے؟

(جواب): نمازِ تہجد قضاء پڑھی جا سکتی ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ « كَانَ إِذَا نَامَ مِنَ اللَّيلِ مِن وَجَعٍ، أَو غَيرِهِ فَلَم يُصَلِّ بِاللَّيلِ صَلّٰى مِنَ النَّهَارِ اثنَتَى عَشرَةَ رَكعَةً » یعنی رسول اللہ ﷺ جب بیماری وغیرہ کی وجہ سے رات کو سوئے رہتے اور نماز تہجد نہ پڑھ پاتے تو صبح کے وقت بارہ رکعت پڑھتے۔ [3]

تہجد رہ جانے کی صورت میں قضائی کا طریقہ:

(سوال): اگر صلوٰۃ اللیل (تہجد) کسی وجہ سے رہ جائے اور فجر کی نماز کا وقت ہو جائے تو یہ تہجد کی نماز کس وقت پڑھی جا سکتی ہے اور کتنی رکعتیں پڑھنی ہوں گی، نیز وتروں کی کیا صورت ہو گی؟ اُسی طرح پڑھیں گے

---

(1) السنن الکبریٰ للبیهقی، بَابُ الْإِكْتِفَاءِ بِأَذَانِ الْجَمَاعَةِ وَإِقَامَتِهِم، رقم: ۱۹۱۳

(2) ترمذی، ص: ۷۲

(3) قیام اللیل، بَابُ ذِكْرِ قَضَاءِ الرَّجُلِ مَا يَفُوتُهُ مِنْ قِرَاءَةِ اللَّيْلِ فِي صَلَاةِ النَّهَارِ، ص: ۱۳۵، السنن الکبریٰ للبیهقی، بَابُ مَنْ أَجَازَ قَضَاءَ النَّوَافِلِ عَلَى الْإِطْلَاقِ، رقم: ۴۲۳۷

جیسے معمول ہے یا کوئی اور طریقہ ہوگا؟

(جواب): تہجد اگر کسی وجہ سے رہ جائے، تو صبح کے وقت دن میں بارہ رکعت ادا کرنے کا جواز ہے۔

صحیح مسلم میں حدیث ہے:

« وَكَانَ إِذَا غَلَبَهُ نَوْمٌ، أَوْ وَجَعٌ عَنْ قِيَامِ اللَّيْلِ صَلَّى مِنَ النَّهَارِ ثِنْتَيْ عَشْرَةَ رَكْعَةً » [1]

یعنی ''جب کبھی آپ ﷺ پر نیند یا بیماری غالب آ جاتی تو آپ ﷺ دن کو بارہ رکعت پڑھ لیا کرتے۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ علیحدہ بصورتِ وِتر قضاء کی ضرورت نہیں۔''

تعاقب اور جوابِ تعاقب:

(سوال): ہفت روزہ الاعتصام (ص:۷، مطابق ۲۸ ہجری، جمادی الثانیہ، ۱۴۱۸ھ۔ ۳۱ تا ۶ نومبر ۱۹۹۷ء کے شمارہ میں آپ کا فتویٰ نظر سے گزرا جو دل میں کھٹکتا ہے۔ لہٰذا اصلاح نامہ پیش خدمت کر رہا ہوں اگر درست ہو تو تائید فرما کر الاعتصام میں شائع فرما دیں اور اگر میری بات محل نظر ہو اور آپ کا نظریہ مختلف ہو مع دلائل دوبارہ الاعتصام میں وضاحت فرما دیں۔ تہجد رہ جائے تو اس کی قضاء کے بارے میں صحیح مسلم کی روایت نقل فرما کر آپ نے نبی ﷺ کا بوجہ تکلیف اور نیند کے تہجد نہ پڑھ سکنے کا طرزِ عمل لکھا ہے کہ آپ ﷺ صبح کو بارہ رکعات ادا فرماتے تھے۔ پھر آگے آپ تحریر کرتے ہیں کہ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ علیحدہ بصورتِ وِتر قضاء کی ضرورت نہیں۔ (انتہیٰ)

راقم کو آپ کی اس بات سے اتفاق نہیں بلکہ مؤدبانہ درخواست ہے کہ تہجد والا آدمی جب بیدار ہو یا اسے یاد آئے یا اس کی تکلیف رفع ہو جائے تو پہلے وہ اسی وقت وِتر کی قضاء دے لے اور جو اس کا نمازِ فجر سے قبل کا وظیفہ نوافل یا تلاوت وغیرہ اذکار ہوں، ان کی جگہ پر بارہ رکعات ادا کرے تو اس کا اجر وثواب مطابق حدیث وہی ملے۔ میرے اس موقف کی تائید اس حدیث سے ہوتی ہے:

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

« مَن نَامَ عَن وِترِهِ او نَسِيَهُ فَلْيُصَلِّهِ اِذَا ذَكَرَهُ.» [2]

''جو اپنے وِتر سے سو گیا یا بھول گیا وہ جب بیدار ہو یا جب یاد آئے اسی وقت پڑھ لے۔'' (انتہیٰ) (علامہ شوکانی رحمہ اللہ اس کو صحیح قرار دیتے ہیں۔)

---

[1] صحيح مسلم، بَابُ جَامِعِ صَلَاةِ اللَّيْلِ، وَمَنْ نَامَ عَنْهُ أَوْ مَرِضَ، رقم: ٧٤٦

[2] سنن أبي داؤد، بَابٌ فِي الدُّعَاءِ بَعْدَ الْوِتْرِ، رقم: ١٤٣١

اور نیز امام شوکانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

« اَلحَدِیثُ یَدُلُّ عَلٰی مَشرُوعِیَّةِ قَضَاءِ الوِترِ اِذَا فَاتَ » [1]

''جب وِتر رہ جائیں تو یہ حدیث ان کی قضاء دینے پر دلالت کرتی ہے۔''

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وتروں کی قضاء علیحدہ حکم رکھتی ہے۔ علاوہ ازیں اورادو وظائف رہ جائیں تو ان کی جگہ بارہ رکعات کفایت کرتی ہیں۔ وتروں کی قضاء کے بارے میں پیارے پیغمبر حضرت محمد رسول اللہ ﷺ نے باقاعدہ قضاء کا حکم دیا ہے اگر یہ بھی عام نوافل یا وظائف کی حیثیت رکھتے ہوتے تو ان کا علیحدہ حکم ضروری نہ تھا۔ واللہ اعلم۔

جواب: محترم مولانا حافظ محمد عباس صاحب آنجناب کا ملفوف ملا۔ بندہ کو کلمۂ خیر سے یاد کرنے کا شکریہ۔ اپنی نیک دعاؤں میں ہمیشہ یاد رکھیں۔ (جزاکم اللہ خیراً)

علمائے سلف و خلف کے ہاں یہ بات معروف ہے کہ قضاء وِتر کا مسئلہ سخت اختلافی مسائل میں سے ایک ہے۔ جانبین کے دلائل مطولات میں مرقوم ہیں۔ جن کا اس مختصر میں احاطہ کرنا ممکن نہیں۔ سرِ دست مسئلہ ہذا میں جو موقف آپ نے اختیار کیا ہے۔ اس سے کلی اتفاق کرنا مشکل ہے۔ رات کی نماز فوت ہونے کی صورت میں صبح کے وقت بارہ رکعت پڑھنے کے بارے میں جو توجیہ آپ نے پیش کی ہے۔ یہ محلِ نظر ہے۔ کیونکہ یہ امر مسلمہ ہے کہ نبی ﷺ رات کو گیارہ رکعت یا تیرہ رکعت سے زیادہ نماز نہیں پڑھتے تھے۔ وِتر بھی اس میں شامل ہوتے تھے۔ بایں صورت وتروں کو اس سے مستثنیٰ قرار دینا بلا دلیل ہے اور جہاں تک حضرت ابوسعید رضی اللہ عنہ کی روایت کا تعلق ہے، سو بفرضِ صحت اہلِ علم نے اس کی مختلف توجیہات بیان کی ہیں۔

حضرت وکیع راویٔ حدیث کے فہم کے مطابق اس روایت کا تعلق اسی متعلقہ رات سے ہے جس میں یہ عوارض لاحق ہوئے۔ یعنی آدمی کو چاہیے کہ وِتر کا وقت ختم ہونے سے قبل ہی وتروں سے فارغ ہو جائے۔ اس تشریح سے امام شوکانی رحمہ اللہ کے استدلال کی بھی کمزوری ظاہر ہوتی ہے اور دوسری روایت سے بھی اس امر کی تائید ہوتی ہے:

« مَن اَدرَكَ الصُّبحَ وَ لَم یُوتِر، فَلَا وِترَ لَهٗ » (اخرجه الحاكم(۳۰۲/۱) و عنه البيهقي و قال صحيح على شرط مسلم و وافقه الذهبي) [2]

---

[1] نیل الأوطار: ۲/۵۵۔۵۴

[2] المستدرك على الصحيحين للحاكم، كِتَابُ الْوِتْرِ، رقم: ۱۱۲۵، السنن الكبرىٰ للبيهقي، بَابُ وَقْتِ الْوِتْرِ، رقم: ۴۱۹۲

اگر چہ امام بیہقی نے روایت ہذا کو معلول قرار دینے کی سعی کی ہے۔لیکن علامہ البانی رحمہ اللہ نے ان سے موافقت نہیں کی۔فرماتے ہیں:

« وَلَا وَجهَ لِهٰذَا الِاعلَالِ بَعدَ صِحَّةِ الِاسنَادِ وَ هُوَ بِمَعنَى الحَدِيثِ الاَوَّلِ بَل هُوَ اَصرَحُ مِنهُ، وَ اَقرَبُ اِلَى التَّوفِيقِ بَينَهُ، وَ بَينَ حَدِيثِ ابنِ مُطَرِّفٍ : لِاَنَّهُ صَرِيحٌ اَدرَكَ الصُّبحَ ، وَ لَم يُوتِرُ، فَهٰذَا لَا وِترَ لَهُ ، وَ اَمَّا الَّذِى نَسِىَ اَو نَامَ حَتّٰى الصُّبحِ فَاِنَّهُ يُصَلِّى (كَمَا تَقَدَّمَ) » ①

اور (ص:۱۵۳) پر فرماتے ہیں:

« قُلتُ وَ لَا تَعَارُضَ بَينَهُ، وَ بَينَ الحَدِيثِ الَّذِى قَبلَهُ خِلَافًا لِمَا اَشَارَ اِلَيهِ مُحَمَّدُ ابنُ يَحيٰى ذَالِكَ ، لِاَنَّهُ خَاصٌّ بِمَن نَامَ ، اَو نَسِىَ فَهٰذَا يُصَلِّى بَعدَ الفَجرِ اَى وَقتٍ يَذكُرُهُ الذَّاكِرُ ، فَينتَهِى وَقتُ وِترِهِ بِطَلُوعِ الفَجرِ. وَ هٰذَا بَيِّنٌ ظَاهِرٌ.»

علامہ البانی کی تشریح سے معلوم ہوتا ہے کہ جو جان بوجھ کر وتر چھوڑ دے اس کے لیے قضاء نہیں اور جو بھول جائے یا صبح تک سویا رہے، وہ وتر پڑھے اور صاحب ''المرعاۃ'' تطبیقی صورت میں صرف جوازِ قضاء کے قائل ہیں، ضروری کے نہیں۔ جس طرح کہ عطاء اور اوزاعی وغیرہ کا مسلک ہے اور حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

« وَاختَلَفَ السَّلَفُ فِى مَشرُوعِيَةِ قَضَائِهِ فَنَفَاهُ الاَكثَرُ. وَ فِى مُسلِمٍ، وَغَيرِهٖ عَن عَائِشَةَ اَنَّهُ ﷺ كَانَ اِذَا نَامَ مِنَ اللَّيلِ مِن وَجعٍ، اَو غَيرِهٖ ، فَلَم يَقُم مِنَ اللَّيلِ صَلّٰى مِنَ النَّهَارِ ثِنتَى عَشَرَةَ رَكعَةً، وَ قَالَ مُحَمَّدُ بنُ نَصرٍ: لَم نَجد عَنِ النَّبِىِّ ﷺ فِى شَىءٍ مِنَ الاَخبَارِ اَنَّهُ قَضَى الوِترَ ، وَ لَا اَمَرَ بِقَضَائِهِ ، وَ مَن زَعَمَ اَنَّهُ ﷺ فِى لَيلَةِ نَومِهِم عَنِ الصُّبحِ فِى الوَادِى قَضَى الوِترَ فَلَم يُصِبه .» ②

یعنی سلف کا وتروں کی قضائی کی مشروعیت میں اختلاف ہے۔ اکثر اہلِ علم کے نزدیک قضائی نہیں۔صحیح مسلم وغیرہ میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ جب کبھی آپ ﷺ بیماری وغیرہ کی وجہ سے رات کو سوئے رہتے تو آپ ﷺ دن کو بارہ رکعت پڑھ لیا کرتے اور امام محمد بن نصر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ کسی حدیث میں ہمیں نبی ﷺ سے معلوم نہیں ہو سکا کہ آپ نے وتر کی

---

① إرواء الغليل:۲/۱۵٤

② فتح الباری:۲/٤٨٠

قضائی دی ہو اور نہ وِتر کی قضائی کا حکم ہی دیا ہے اور جو یہ سمجھتا ہے کہ نبی ﷺ رفقاء سمیت جس رات وادی میں سوئے رہے آپ ﷺ نے وِتر کی قضائی دی ہے، وہ غلطی پر ہے۔''

پھر وِتر کی قضائی کو ضروری قرار دینا عقل ونقل کے بھی منافی ہے۔ کیونکہ راجح مسلک کے مطابق وِتر واجب نہیں۔ صرف امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ وجوب کے قائل ہیں۔ لیکن ان کے شاگردوں نے ان کی موافقت نہیں کی۔ غور فرمایئے! جو شئی بذاتِ خود واجب نہیں، اس کی قضائی کیسے واجب ہو سکتی ہے۔ اس میں زیادہ سے زیادہ جواز کا قول ممکن ہے۔ جس طرح کہ صاحب ''المرعاۃ'' نے احتیاطی پہلو اختیار کیا ہے۔

مسئلہ قضاء وِتر پر مزید تحقیق کے لیے ملاحظہ ہو! فتاویٰ اہلحدیث: ۲/ ۳۰۸ تا ۳۱۷۔ لشیخنا محدث روپڑی۔ رحمہ اللہ تعالی رحمۃ واسعۃ

دو تین دن بعد حالتِ جنابت کا علم ہو تو ادا شدہ نمازوں کا حکم:

سوال اگر دو تین نمازوں کے بعد آدمی کو پتہ چلے کہ وہ حالتِ جنابت میں تھا تو کیا ادا شدہ نمازوں کا اعادہ کرنا ہوگا؟

جواب حالتِ جنابت میں پڑھی ہوئی نمازوں کا اعادہ ضروری ہے۔

صحیح مسلم وغیرہ میں حدیث ہے: «لَا تُقبَلُ صَلَاۃٌ بِغَیرِ طُھُورٍ.»[1] یعنی ''بلا طہارت نماز قبول نہیں ہوتی۔'' اور امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی ''صحیح'' میں انہی لفظوں کے ساتھ تبویب بھی قائم کی ہے۔ یہ طہارت وضو اور غسل سب کو شامل ہے۔

فرضی غسل نہ کرنا اور نماز پڑھ لینا:

سوال کسی پر غسل واجب ہو اور اس نے غسل نہ کیا ہو یا غسل نہ کر سکے تو کیا ایسے اس کی نماز ہو جائے گی۔ نیز غسل واجب ہونے کی صورت میں قرآن کی تلاوت کر سکتا ہے؟

جواب بلا غسل نماز نہیں ہو گی۔ ہاں البتہ جنگل میں اگر پانی میسر نہ آئے تو تیمّم کر کے نماز پڑھی جا سکتی ہے۔ بلا غسل قرآن کی تلاوت سے اجتناب کرنا چاہیے۔

---

[1] صحیح مسلم، بَابُ وُجُوبِ الطَّھَارَۃِ لِلصَّلَاۃِ، رقم:۲۲٤

عورت اور مرد کی نماز کے احکام

عورت اور مرد کی نماز میں کیا فرق ہے؟

سوال: عورت اور مرد کی نماز میں کیا فرق ہے؟ ایک کتاب ہاتھ لگی ہے جس میں ایک عنوان رکھا ہے (خواتین کا طریقۂ نماز) جس میں انھوں نے اُمّ درداء والی حدیث:«أَنَّ أُمَّ الدَّرداءِ ، کَانَت تَجلِسُ فِی الصَّلَاۃِ کَجِلسَۃِ الرَّجُلِ»[1] کہ اُمّ درداء نماز میں مردوں کی طرح بیٹھتی تھی۔'' کے بارے میں کہا ہے کہ اس حدیث سے عورت کی نماز مرد کے برابر ہونے پر استدلال کرنا کئی وجہ سے درست نہیں ہے:

۱۔ اگرچہ حافظ مزی رحمہ اللہ نے ان کو صحابیہ کہا ہے لیکن دوسرے محدثین نے ان کو تابعیہ کہا ہے۔ لہٰذا یہ صحابیہ نہیں تابعیہ ہے اور ایک تابعی کا عمل اگرچہ اصول کے مطابق ہو تب بھی اس سے استدلال نہیں کیا جا سکتا۔

۲۔ اگر صحابیہ بھی شمار کیا جائے تب بھی ان کی اپنی رائے ہے انھوں نے کسی صحابیہ کو دعوت نہیں دی۔ انھوں نے اس فعل پر نہ ہی رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور نہ ہی خلیفہ راشد کا فتویٰ نقل کیا ہے۔

دراصل سوال یہ ہے کہ مولانا عبد الجبار غزنوی رحمہ اللہ کے ''فتاویٰ غزنویہ''، ''فتاویٰ علمائے اہل حدیث'' میں یہ بات درج ہے کہ عورت اور مرد کی نماز میں فرق ہے۔ جامعہ دار العلوم کراچی اشرف المدارس والوں نے لکھا ہے کہ غیر مقلد اہل حدیثوں کو عبد الجبار غزنوی رحمہ اللہ کا فتویٰ نظر نہیں آتا؟ ''بیہقی'' اور ''کنز العمال'' میں حدیث ہے:

« عَن یَزِیدَ بنِ أَبِی حَبِیبٍ اَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ مَرَّ عَلٰی امرَأَتَینِ فَقَالَ اِذَا سَجَدتُمَا فَضُمَّا بَعضَ اللَّحمِ اِلَی الاَرضِ فَاِنَّ المَرأَۃَ لَیسَت فِی ذٰلِكَ کَالرَّجُلِ »[2]

« عَن عَبدِ اللّٰهِ بنَ عُمَرَ رَضِیَ اللّٰهُ عَنهُمَا قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ : اِذَا جَلَسَتِ المَرأَۃُ لِلصَّلٰوۃِ وَضَعَت فَخِذَهَا عَلٰی فَخِذِهَا الٗاخرٰی وَ اِذَا سَجَدَت اِلصَقَت بَطنَهَا فِی فَخذَیهَا کَاَسترِ مَا یَکُونَ لَهَا وَ اِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰی یَنظُرُ اِلَیهَا وَ یَقُولُ یَا مَلَائِکَتِی اُشهِدُکُم اِنِّی قَد غَفَرتُ لَهَا.»[3]

---

[1] مصنف ابن ابی شیبۃ،فِی المَرأَۃِ کَیفَ تَجلِسُ فِی الصَّلَاۃِ؟، رقم: ۲۷۸۵،صحیح البخاری،بَابُ سُنَّۃِ الجُلُوسِ فِی التَّشَهُّدِ، قبل رقم:۸۲۷

[2] السنن الکبریٰ للبیهقی ،بَابُ مَا یُستَحَبُّ لِلمَرأَۃِ مِن تَرك ،رقم:۳۲۰۱

[3] السنن الکبریٰ للبیهقی ،بَابُ مَا یُستَحَبُّ لِلمَرأَۃِ مِن تَركِ التَّجَافِی فِی الرُّکُوعِ ،رقم:۳۱۹۹

علماءِ اہلِ حدیث کے اکابر اس حدیث کے ساتھ فتویٰ دیتے رہے ہیں۔مولانا عبد الجبار مرحوم اس بارے میں فرماتے ہیں کہ اسی پر تعامل اہل سنت و مذاہب اربعہ وغیرہ چلا آیا ہے۔غرض یہ کہ عورتوں کا انضمام اور انخفاض احادیث اور تعامل جمہور اہلِ علم از مذاہب اربعہ وغیرہ سے ثابت ہے اور اس کا مُنکر کتب احادیث اور تعامل اہلِ علم سے بے خبر ہے۔ واللہ اعلم (عبد الجبار غزنوی) (فتاویٰ غزنویہ،ص:۲۷۔۲۸۔فتاویٰ علمائے اہلِ حدیث ج:۳،ص:۱۴۸)

(جواب): شرع میں مرد اور عورت کا طریقہ نماز ایک جیسا ہے۔دونوں میں کوئی فرق نہیں۔

صحیح بخاری میں حدیث ہے:« صَلُّوا كَمَا رَأَيْتُمُونِي أُصَلِّي »[1] (اے میری امت اس طرح نماز پڑھو) جس طرح تم مجھے نماز پڑھتے دیکھتے ہو،یعنی ہو بہو میرے طریقے کے مطابق نماز پڑھو۔حدیث ہذا کا عموم امت کے سب مردوں اور سب عورتوں کو شامل ہے اور جن بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے، کہ عورت اور مرد کی نماز میں فرق ہے وہ ضعیف ہیں۔قابلِ حجت واستدلال نہیں۔مثلاً ایک روایت میں ہے، کہ عورت کو سجدہ میں پیٹ وغیرہ ملا کر رکھنا چاہیے۔اس کے بارے میں علامہ البانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: کہ یہ مرسل غیر صحیح ہے۔اسے ابوداؤد نے ''مراسیل'' میں یزید بن ابی حبیب سے روایت کیا ہے۔(صفة الصلاة)

مشہور مصنف مولانا محمد صادق سیالکوٹی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: کہ بہت عورتیں سجدہ میں بازو بچھا لیتی ہیں، پیٹ کو رانوں سے ملا کر رکھتی ہیں اور دونوں قدموں کو بھی زمین پر کھڑا نہیں کرتیں۔واضح ہو کہ یہ طریقہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان اور سنت پاک کے خلاف ہے۔سنیے! حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت سے صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں ہے، کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« لَا يَبْسُطُ أَحَدُكُم ذِرَاعَيهِ اِنبِسَاطَ الكَلبِ »[2]

یعنی ''نہ بچھائے کوئی تمہارا (مرد یا عورت) دونوں بازو اپنے (سجدے میں) جس طرح کتا بچھاتا ہے۔''

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضور کے اس فرمان سے صاف عیاں ہے، کہ نمازی (مرد یا عورت) کو اپنے دونوں ہاتھ زمین پر رکھ کر دونوں کہنیاں، یعنی بازو زمین سے اُٹھا کر رکھنے چاہئیں، پیٹ بھی رانوں سے جدا رہے اور

---

[1] صحيح البخاري، بَابُ الأَذَانِ لِلمُسَافِرِ، إِذَا كَانُوا جَمَاعَةً، وَالإِقَامَةِ، وَكَذَلِكَ بِعَرَفَةَ وَجَمعٍ...... الخ، رقم:٦٣١

[2] صحيح البخاري، بَابُ لَا يَفتَرِشُ ذِرَاعَيهِ فِي السُّجُودِ، رقم:٨٢٢ وصحيح مسلم، بَابُ الِاعتِدَالِ فِي السُّجُودِ، وَوَضعِ الكَفَّينِ عَلَى ......الخ، رقم:٤٩٣

سینہ بھی زمین سے اونچا ہو۔ (صلوٰۃ الرسول ﷺ) نیز علامہ شوکانی ''نیل الأوطار'' میں رقمطراز ہیں، کہ یہ جاننا چاہیے، کہ اس سنت (رفع یدین) میں مرد اور عوت برابر کے شریک ہیں اور کوئی ایسی دلیل نہیں ہے جس سے دونوں کے مابین فرق ثابت ہو۔ اس طرح دونوں کے ہاتھ اٹھانے کی مقدار کوئی دلیل نہیں ہے۔ احناف سے مروی ہے، کہ مرد کانوں تک ہاتھ اٹھائیں اور عورتیں کندھوں تک کیونکہ اس میں ان کے لیے سَتر (پردہ) ہے، مگر اس پر بھی کوئی دلیل نہیں ہے۔ (1)

صحیح بخاری کے ''ترجمۃ الباب'' میں اُمّ الدرداء کے اُثر کے اصل الفاظ یوں ہیں:

« وَ كَانَت أُمُّ الدَّرْدَاءِ تَجلِسُ فِي صَلَاتِهَا جَلسَةَ الرَّجُلِ. وَ كَانَت فَقِيهَةً » (2)

یعنی ''اُمّ درداء اپنی نماز میں مردوں کی طرح بیٹھتی اور وہ فقیہ تھی۔''

بلاشبہ اُمّ درداء تابعیہ ہے، کیونکہ مکحول راوی کا سماع تابعیہ صغریٰ سے ہے۔ کبریٰ صحابیہ سے نہیں۔ اس اعتبار سے یہ اثرِ تابعیہ ہوا، جو جمہور کے نزدیک حجت نہیں، لیکن حیران کن بات یہ ہے، کہ حنفیہ، جنھوں نے اس کو موجود علت کی بناء پر ردّ کیا ہے، ان کے نزدیک تو مرسل تابعی قابلِ حجت ہے۔ ان کا انکار فہم سے بالاتر ہے۔ اپنے معروف قاعدہ کی بناء پر حنفیہ کا عمل تو اثر ہذا کے مطابق ہونا چاہیے تھا۔ دراصل یہ سب تقلیدی جمود کی کرشمہ سازی ہے۔ جس سے اللہ تعالیٰ سب کو محفوظ رکھے۔ آمین!

واضح ہو کہ امام بخاری رحمہ اللہ نے اثر ہذا کو بطورِ دلیل پیش نہیں کیا، بلکہ ان کا طریقہ کار یہ ہے، کہ جب دلیل عام ہو اور اس عموم کے مطابق بعض علماء کا عمل ہو، تو اس اثر کے ساتھ وہ دلیل کو ترجیح دیتے ہیں، اگرچہ وہ اثر اکیلا قابلِ حجت نہیں ہوتا۔ اس بناء پر حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

« وَلَم يُورِدِ البُخَارِيُّ اَثرَ أُمِّ الدَّرْدَاءِ لِيَحتَجَّ بِهٖ، بَل لِلتَّقوِيَةِ » (3)

یعنی بخاری نے اُمّ درداء کا اثر بطورِ دلیل و حجت کے ذکر نہیں کیا، بلکہ مقصود اس سے (عمومی دلائل سے ثابت شدہ مسئلہ کو) تقویت دینا ہے۔

ہمارے شیخ کے شیخ امام عبدالجبار غزنوی رحمہ اللہ کا فتویٰ واقعی فتاویٰ علمائے حدیث (۳/۱۴۸۔۱۴۹) پر درج ہے۔ لیکن انھوں نے جن روایات پر مسئلہ ہذا کی بنیاد رکھی ہے، وہ کمزور اور ناقابلِ حجت ہیں۔ (کما سبق)

دوسری بات یہ ہے، کہ مسلک اہلِ حدیث کتاب و سنت سے تمسّک کا نام ہے، قطع نظر اس بات کے،

(1) بحوالہ تخریج صلوۃ الرسول ﷺ، ص: ۲۲۷۔۲۲۸

(2) صحیح البخاری، بَابُ سُنَّةِ الجُلُوسِ فِي التَّشَهُّدِ، قبل رقم: ۸۲۷

(3) فتح الباری: ۲/ ۳۰۶

کہ مذاہب اربعہ کی اس میں موافقت ہو یا مخالفت۔ اسی بناء پر محققین اہلِ علم جیسے: امام بخاری، شیخ الاسلام ابن تیمیہ، ابن قیم، علامہ شوکانی اور صنعانی رحمہم اللہ وغیرہ نے مسائل کی تحقیق میں دلائل کی روشنی میں آزادانہ طریقۂ کار کو اختیار کیا ہے، جوامت مسلمہ کے لیے بیش بہا خزانہ ہے۔

مختصراً سابقہ مستندات کی رُو سے میرے نزدیک محقق مسلک یہ ہے، کہ عورت اور مرد کے طریقۂ نماز میں کوئی فرق نہیں۔

عورت اور مرد کے ہاتھ باندھنے کی کیفیت:

سوال کیا رسولِ کریم ﷺ نے حکم دیا تھا کہ مرد ناف کے نیچے ہاتھ باندھے اور عورت ناف کے اوپر باندھے؟

جواب: ایسی تفریق کی کوئی دلیل نہیں۔ بلا تفریق تمام مرد و زن کو نماز میں ہاتھ سینے پر باندھنے چاہئیں۔
ملاحظہ ہو: ابوداؤد۔ صحیح ابن خزیمہ، مسند احمد وغیرہ۔

عورت کا نماز میں پاؤں ڈھانپنا:

سوال: میں انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی اسلام آباد میں اصول الدین کی طالبہ ہوں، دورانِ تعلیم میں نے اپنے غیر ملکی اساتذہ کرام اور ساتھی طالبات کا پاؤں کے اوپر والے حصے کو ڈھانپنے کے بارے میں موقف جانا کہ عورت کے پاؤں کا پردے میں ہونا بالخصوص نماز میں بے حد ضروری ہے، بعد ازاں میں نے "فتاویٰ المرأة المسلمة" کا مطالعہ کیا جس کے باب "کتاب لباس المرأة فی الصلاة" میں شیخ ابنِ باز رحمہ اللہ کی رائے اس طرح درج ہے:

« وَ أَمَّا الْقَدَمَانِ فَيَجِبُ سَتْرُهُمَا عَلٰى كُلِّ حَالٍ فِي الصَّلٰوةِ وَ لَو لَم يَكُن عِندَهَا رِجَالٌ لِأَنَّ الْمَرأَةَ كُلَّهَا عَورَةٌ فِي الصَّلَاةِ إِلَّا وَجهَهَا »

اس سلسلے میں حوالہ سنن ابی داؤد، کتاب الصلاة ، تحفة ٨٥ حديث ٦٣٩ ، ٦٤٠ کا درج ہے۔ برائے مہربانی اس سلسلہ میں رہنمائی فرمائیں کہ کیا عورت کو اپنے پاؤں ڈھانپنے چاہئیں اور بالخصوص نماز میں اس کا کیا حکم ہے؟

جواب: دورانِ نماز عورت کے لیے پاؤں کی پُشت ڈھانپنے کے بارے میں "سنن ابی داؤد" وغیرہ میں جو روایت ہے، وہ سنداً مرفوع اور موقوف دونوں طرح ضعیف ہے۔ لہٰذا قابلِ حجت نہیں۔ اس کو مرفوع بیان کرنا عبدالرحمٰن بن عبداللہ بن دینار کی غلطی ہے، جب کہ موقوف بھی درست نہیں، کیونکہ اس کا مدار "ام محمد" پر ہے

اور وہ مجہولہ ہے۔ حاکم کی روایت میں ''عن أمه'' کی بجائے ''عن أبيه'' کے الفاظ ہیں، لیکن اس کے باپ کا ذکر کتابوں میں نہیں ملتا، شاید یہ حاکم یا ناقلین میں سے کسی کا وَہم ہے۔ بہر صورت اس بارے میں بطورِ نص کوئی صحیح حدیث موجود نہیں۔

جو لوگ عورت کے لیے پاؤں ڈھانپنے کے وجوب کے قائل ہیں، ان کا انحصار اس کمزور دلیل پر ہے، جو ناقابلِ التفات ہے۔ لہٰذا اگر کوئی خاتون اس کا اہتمام کر لے تو بہتر ہے، ورنہ مسئلہ ہذا میں تشدد اختیار کرنا درست نہیں۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو! إرواء الغليل لشيخنا المحدث ناصر الدين الالبانی رحمہ اللہ (۱/۳۰۴)

تعاقب مولانا ارشاد الحق اثری۔ عورت کے لیے پاؤں ڈھانپنے کا حکم:

''الاعتصام'' شمارہ نمبر۱۰، جلد نمبر۵۷، کے ص:۱۴، پر اسلامک یونیورسٹی کی طالبہ کا استفتاء اور اس کا جواب شائع ہوا۔ سوال میں جن دو باتوں کے بارے میں استفسار تھا، اس کے ایک پہلو کا جواب تو محترم شیخ الحدیث حضرت مولانا ثناء اللہ خان صاحب مدنی حفظہ اللہ نے دیا۔ مگر اس کے دوسرے پہلو کے جواب کی طرف انھوں نے توجہ نہیں فرمائی۔ حالاں کہ جواب کا وہ پہلو بنیادی اور اوّلیت کا حامل ہے اور اس پر دوسرے حصے کا جواب متفرع ہوتا ہے۔ اسی بناء پر جو جواب دیا گیا وہ بھی مخدوش اور محلِ نظر ہے۔

سوال کا خلاصہ خود طالبہ سمیہ عزیز صاحبہ کے الفاظ میں یہ ہے: ''کیا عورت کو اپنے پاؤں ڈھانپنے چاہئیں، اور بالخصوص نماز میں اس کا حکم کیا ہے؟''

چنانچہ سوال کے آخری حصہ کے بارے میں جو کچھ فرمایا گیا، اس کے مختصراً الفاظ یوں ہیں:

> ''دورانِ نماز عورت کے لیے پاؤں کی پشت ڈھانپنے کے بارے میں ''سنن ابی داؤد'' وغیرہ میں جو روایت ہے، وہ سنداً مرفوع اور موقوف دونوں طرح ضعیف ہے۔ لہٰذا قابلِ حجت نہیں۔ جو لوگ عورت کے لیے پاؤں ڈھانپنے کے وجوب کے قائل ہیں، ان کا انحصار اس کمزور دلیل پر ہے، جو ناقابلِ التفات ہے۔ لہٰذا اگر کوئی خاتون اس کا اہتمام کرے تو بہتر ہے ورنہ مسئلہ ہذا میں تشدد اختیار کرنا درست نہیں۔''

ظاہر ہے کہ اس میں پہلے حصے: ''کیا عورت کو اپنے پاؤں ڈھانپنے چاہئیں'' کا جواب نہیں۔ حالانکہ اس کی بابت راجح اور صحیح موقف یہی ہے کہ عورت کی پُشتِ پاؤں بھی سَتر ہے۔ چنانچہ حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''جو شخص تکبراً اپنا کپڑا لٹکاتا ہے، قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اس کی طرف نظرِ رحمت سے نہیں دیکھے گا۔''

یہ سُن کر حضرت اُمّ سلمہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا: عورتیں اپنے کپڑوں سے کیا کریں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''مردوں سے بالشت برابر مزید لٹکا لیا کریں۔'' ①

انھوں نے عرض کیا، کہ یوں تو ان کے قدم ننگے ہو جائیں گے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ایک ہاتھ کے برابر لٹکا لیا کریں اس سے زیادہ نہیں۔'' یہ روایت ترمذی (۳/ ۴۷) اور ''نسائی'' وغیرہ میں سند صحیح سے مروی ہے اور امام بیہقی رحمہ اللہ نے لکھا ہے:

« وَفِي هٰذَا دَلِيلٌ عَلٰى وُجُوبِ سَتْرِ قَدَمَيهَا » ②

''یہ حدیث دلیل ہے کہ عورت کے لیے قدموں کو ڈھانپنا واجب ہے۔''

علامہ البانی رحمہ اللہ نے اس موضوع پر مختصراً نفیس بحث کی ہے۔ شائقین اس کے لیے ''حجاب المرأة المسلمة'' (۳۶۔۳۷) ملاحظہ فرمائیں! لکھتے ہیں:

« وَ عَلٰى هٰذَا جَرَى العَمَلُ مِنَ النِّسَآءِ فِي عَهدِهٖ ﷺ، وَ مَا بَعدَهٗ » ③

''عورتوں کے لیے پاؤں ڈھانپنے پر ہی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہدِ مبارک میں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد عمل رہا ہے۔''

مزید تشفی کے لیے عرض ہے۔ حضرت محدث روپڑی رحمہ اللہ سے دریافت کیا گیا، کہ سَتر کی تفصیل کیا ہے؟ انھوں نے فرمایا:

''سترِ عورت شرط ہے۔ یعنی ناف سے گھٹنوں تک مرد کے لیے اور عورت کے لیے سارا وجود، منہ اور ہاتھ کے سوا، پشت پاؤں تک ڈھانکنا ضروری ہے۔'' (فتاویٰ اہل حدیث: ۲/ ۲۰، ۲۱)

لہٰذا عورت کے لیے ضروری ہے، کہ عام حالات میں بھی پاؤں کی پشت ڈھانپ کر رکھے، کیونکہ یہ بھی ''سَتر'' میں شامل ہے اور جب عام حالت میں بھی یہ حکم ہے تو نماز میں بھی یہی حکم ہے، کہ عورت کے پاؤں کی پُشت ڈھکی ہوئی ہو۔ اس بارے میں ابوداؤد کی روایت تو بلاشبہ ضعیف ہے۔ جیسا کہ محترم حافظ صاحب حفظہ اللہ نے ارواء الغلیل کے حوالے سے نقل کیا ہے، مگر اجماع صحابہ رضی اللہ عنہم اس روایت کا مؤید ہے۔ علامہ ابن عبدالبر رحمہ اللہ نے تو کہا ہے کہ:

---

① سنن الترمذی، بَابُ مَا جَاءَ فِي جَرِّ ذُيُولِ النِّسَاءِ، رقم: ۱۷۳۱

② السنن الکبرٰی للبیهقی بَابُ مَا تُصَلِّي فِيهِ المَرأَةُ مِنَ الثِّيَابِ: ۲/ ۲۳۳، رقم: ۳۲۵۳

③ حجاب المراة، ص: ۳۷

« وَالِاجمَاعُ فِي هٰذَا البَابِ اَقوٰى مِنَ الخَبَرِ فِيهِ » [1]

''اس بارے میں اجماع، حدیث سے زیادہ قوی دلیل ہے۔''

مزید فرماتے ہیں:

« لَا خِلَافَ عَلِمتُهُ بَينَ الصَّحَابَةِ فِي سَترِ ظُهُورِ قَدَمَيِ المَرأَةِ فِي الصَّلَاةِ. وَحَسبُكَ بِمَا جَاءَ فِي ذٰلِكَ عَن اُمَّهَاتِ المُسلِمِينَ » [2]

''میں، صحابہ رضی اللہ عنہم کے ہاں عورت کے پاؤں ڈھانپنے کے بارے میں اختلاف نہیں جانتا۔ تمہارے لیے اس بارے میں امہات المسلمین رضی اللہ عنہن کے آثار کافی ہیں۔''

اس حوالے سے انھوں نے آثار کی طرف اشارہ بھی فرمایا ہے، کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم «درع سابغ» میں نماز کا حکم دیتے تھے اور ''درع سابغ'' اسے کہتے ہیں، جو عورت کے پاؤں کو ڈھانپے۔ علامہ شوکانی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

« هُوَ قَمِيصُ المَرأَةِ الَّذِي يُغَطِّي بَدَنَهَا، وَ رِجلَيهَا، وَ يُقَالُ لَهَا سَابِغٌ. » [3]

''درع عورت کی اس قمیص کو کہتے ہیں جس سے اس کا بدن اور پاؤں چھپ جائیں اور اسے ''سابغ'' کہا جاتا ہے۔''

یہاں یہ بات بھی ملحوظ خاطر رہے، کہ علامہ البانی رحمہ اللہ نے ابو داؤد کی مذکورہ روایت کو ''إرواء الغلیل'' میں اگر ضعیف کہا ہے، تو اس کے یہ معنی قطعاً نہیں، کہ وہ عورت کے لیے نماز میں پاؤں ڈھانپنے کے وجوب کے بھی قائل نہیں، کیونکہ امر واقعہ یہ ہے، کہ وہ اسے واجب قرار دیتے ہیں، اور ان کا استدلال حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی مذکورہ روایت پر ہے، جسے ہم امام ترمذی اور نسائی رحمہما اللہ وغیرہ کے حوالے سے نقل کر آئے ہیں۔ بلکہ وہ تو اس حوالے سے آزاد اور غلام عورت کے بارے میں بھی فرق درست نہیں سمجھتے، ان کے الفاظ ہیں:

« وَالحَدِيثُ يَدُلُّ عَلٰى وُجُوبِ سَترِ قَدَمَيِ المَرأَةِ. وَ هُوَ مَذهَبُ الشَّافِعِيِّ، وَغَيرِهٖ وَأَعلَم أَنَّهٗ لَا فَرقَ فِي ذٰلِكَ بَينَ الحُرَّةِ، وَالأَمَةِ لِعَدَمِ وُجُودِ دَلِيلِ الفَرقِ » الخ [4]

''یہ حدیث عورت کے قدم ڈھانپنے کے وجوب پر دلالت کرتی ہے اور یہ امام شافعی رحمہ اللہ وغیرہ کا مذہب ہے اور یہ بھی جان لو، کہ اس بارے میں آزاد اور غلام عورت کا کوئی فرق نہیں، کیونکہ دونوں میں فرق کی کوئی دلیل نہیں۔''

اور جو اس فرق کے بارے میں بعض احادیث ہیں، وہ ضعیف ہیں، امام مالک رحمہ اللہ تو فرماتے ہیں: کہ

---

[1] التمهيد ٢/٣٦٨ [2] الاستذكار: ٥/٤٤٤

[3] نيل الأوطار: ٢/٧٠ [4] الثمر المستطاب في فقه السنة والكتاب: ١/٣٢٤

اگر عورت کے پاؤں ننگے ہوں تو نماز دوبارہ پڑھے۔

مزید عرض ہے کہ اس مسئلہ میں استحباب و وجوب کی بحث سے قطع نظر دیکھا یہ جائے، کہ صحابیات رضی اللہ عنہن کا معمول کیا تھا اور وہ اس پاکیزہ معاشرے میں پاؤں ننگے رکھ کر چلتی اور نماز پڑھتی تھیں، یا ڈھانپ کر؟ حافظ ابن عبد البر رحمہ اللہ کے بیان اور حضرت اُمّ سلمہ رضی اللہ عنہا کے استفسار سے تو اسی کی تائید ہوتی ہے، کہ ان کے پاؤں بہر حال ننگے نہیں ہوتے تھے۔ لہٰذا مسلمان عورتوں کو امہات المسلمین رضی اللہ عنہن کی پیروی کرنی چاہیے اور مادر پدر آزاد معاشرے کی نقالی سے اجتناب کرنا چاہیے۔ اس لیے صحیح یہی ہے، کہ عورت کے پاؤں بھی ''ستر'' ہیں اور ان کا ڈھانپنا بھی واجب اور ضروری ہے۔ ابوداؤد کی مرفوع روایت گو ضعیف ہے، مگر اجماع اس کا مؤید ہے۔ جیسا کہ علامہ ابن عبد البر رحمہ اللہ نے کہا ہے، بلکہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت سے بھی وجوب ہی مترشح (واضح) ہوتا ہے۔

مولانا اثری حفظہ اللہ کے تعاقب پر ایک نظر

کیا دورانِ نماز عورت کے لیے پاؤں ڈھانپنے ضروری ہیں؟

۱۸/ مارچ ۲۰۰۵ء کے ہفت روزہ ''الاعتصام'' میں ''راقم الحروف'' کا یہ فتویٰ شائع ہوا، کہ دورانِ نماز عورت کے لیے پاؤں کی پشت ڈھانپنے کے بارے میں ''سنن ابی داؤد'' وغیرہ میں جو روایت ہے، وہ سنداً مرفوع اور موقوف دونوں طرح ضعیف ہے۔ ہمارے فاضل محقق دوست مولانا ارشاد الحق اثری حفظہ اللہ نے اس پر تعاقب فرمایا ہے۔

حدیث ہذا کا ضعف تو خیر انھوں نے بھی تسلیم کیا ہے، لیکن نفس مسئلے سے اتفاق نہیں کیا۔ سطورِ ذیل میں اس پر ایک جائزہ پیش کرنا مقصود ہے، موصوف فرماتے ہیں:

''حالانکہ اس کی بابت راجح اور صحیح موقف یہی ہے، کہ عورت کی پُشتِ پاؤں بھی ستر ہے۔'' (الاعتصام: ۱۳/ ۵۷، ص: ۱۵)

حقیقت یہ ہے، کہ انھوں نے اپنے دعوے پر جس قدر دلائل پیش کیے ہیں، تقریباً ان سب کا تعلق عورت کے گھر سے باہر قدم رکھنے کے ساتھ ہے، کہ اس وقت پردے کی یہ کیفیت ہونی چاہیے، جس سے کوئی اختلاف نہیں، جب کہ متنازع فیہ مسئلہ ''عورت کا نماز میں ستر'' ہے، جو اپنی چار دیواری کے اندر نماز ادا کرنا چاہتی ہے، کیا وہ اپنے قدموں کی پشت کو ڈھانپے؟

مولانا اثری ﷾ کی طویل بحث وتمحیص میں مجھے اس کا مستند جواب نظر نہیں آیا، تاہم قیاس ورائے کا سہارا لیتے ہوئے وہ رقمطراز ہیں:

''لہٰذا عورت کے لیے ضروری ہے، کہ عام حالات میں بھی پاؤں کی پشت ڈھانپ کر رکھے، کیونکہ یہ بھی ''ستر'' میں شامل ہے اور جب عام حالت میں بھی یہ حکم ہے، تو نماز میں بھی یہی حکم ہے، کہ عورت کے پاؤں کی پُشت ڈھکی ہوئی ہو''

مسئلے کی جو شق ''راقم الحروف'' نے عمداً حذف کردی تھی، اس کے بیان کی ضرورت انھیں اس لیے پیش آئی کہ ان کی نگاہ میں دونوں صورتیں باہم مربوط (ملی ہوئی) اور حکماً ایک جیسی ہیں۔ حالانکہ دونوں میں بڑا واضح فرق ہے، جس کی تفصیل آگے امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کے کلام میں آئے گی۔ موصوف بنیادی طور پر خلطِ مبحث کا شکار ہو گئے ہیں، حالانکہ مباحث کو اپنے اپنے مقام پر رکھنا ہی اصحاب علم کی ذمہ داری ہے، مگر اس فرق تک ان کی رسائی نہ ہوسکی، مزید برآں کہ ضعیف روایت کو سہارا دینے کے لیے انھوں نے فرمایا ہے: کہ ''اجماع صحابہ رضی اللہ عنہم اس روایت کا مؤید ہے۔ علامہ ابن عبد البر رحمہ اللہ نے تو کہا ہے: کہ: «وَالإجمَاعُ فِي هٰذَا البَابِ أَقوٰى مِنَ الخَبَرِ فِيهِ » [1] ''اس بارے اجماع حدیث سے زیادہ قوی دلیل ہے۔''

مزید فرماتے ہیں: ''میں، صحابہ رضی اللہ عنہم میں عورت کے پاؤں ڈھانپنے کے بارے میں اختلاف نہیں جانتا۔ تمہارے لیے اس بارے میں امہات المسلمین رضی اللہ عنہن کے آثار کافی ہیں۔'' انتھی۔

اجماع کی حقیقت:

اب دعویٰ اجماع کا جائزہ لینا بھی عدل وانصاف کے لیے ضروری ہے، تاکہ صحیح صورتِ حال واضح ہو سکے۔ امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''قرآنی آیت: ﴿ وَلاَ يُبدِينَ زِينَتَهُنَّ اِلَّا مَا ظَهَرَ مِنهَا ﴾ (النور:۳۱) ''اپنی آرائش (یعنی زیور کے مقامات) کو ظاہر نہ ہونے دیا کریں، مگر جو اس میں سے کھلا رہتا ہے، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے ظاہری زینت سے مراد قدم لیے ہیں۔'' [2]

صحیح بخاری کے (ترجمۃ الباب) میں فقیہ مکہ عکرمہ، مولیٰ ابن عباس رضی اللہ عنہ کا قول درج ہے، کہ

« لَو وَارَت جَسَدَهَا فِي ثَوبٍ لَأَجزَأَتهُ .»

---

[1] التمھید: ۳۶۸/۲

[2] حجاب المراۃ المسلمۃ ولباسھا فی الصلاۃ، ص: ۷

یعنی (نمازی عورت) اگر ایک کپڑے میں اپنے جسم کو ڈھانپ لے، تو اس کے لیے کافی ہے۔

نیز علامہ عینی نے ابن عباس رضی اللہ عنہما کا اثر نقل کیا ہے، کہ

« لَا بَأسَ بِالصَّلَاةِ فِی القَمِیصِ الوَاحِدِ إِذَا كَانَ صَفِیقًا.»

یعنی ایک ہی موٹی قمیص میں نماز پڑھنے میں کوئی حرج نہیں۔

حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا سے بیان کیا گیا ہے، کہ انھوں نے چھوٹے کُرتے اور دوپٹے میں نماز پڑھی، ایک صحیح طریق میں ہے، کہ حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا نے ایک کُرتی میں نماز پڑھی اور آستین کا بڑھا ہوا کچھ حصہ اپنے سَر پر رکھ لیا۔''

ان آثار واقوال کو علامہ موصوف نے صحیح بخاری کے «بَابٌ فِی كَم تُصَلِّی المَرأَةُ فِی الثِّیَابِ» کے تحت نقل کی ہے۔[1]

نیز امام بخاری رحمہ اللہ نے حدیث ''الالتفاع'' سے استدلال کیا ہے، کہ عورت محض ایک کپڑے کو لپیٹ کر نماز پڑھ لے، تو درست عمل ہے۔ حدیث ہذا سے مأخوذ مسائل کے بارے میں علامہ عینی فرماتے ہیں:

« مِنهَا: هُوَ الَّذِی تَرجَمَ لَهُ، وَ هُوَ أَنَّ المَرأَةَ إِذَا صَلَّت فِی ثَوبٍ وَاحِدٍ بِالِالتِفَاعِ جَازَت صَلَاتُهَا.»

یعنی مسائل میں سے ایک مسئلہ یہ بھی ہے، جس کے لیے مصنف نے باب قائم کیا ہے، کہ عورت جب ایک کپڑے کو لپیٹ کر نماز پڑھ لے، تو اس کی نماز درست ہے۔

مزید فرمایا:

« وَ قَالَ أَبُو حَنِیفَةَ، وَالثَّورِیُّ: قَدَمُ المَرأَةِ لَیسَت بِعَورَةٍ . فَإِن صَلَّت، وَ قَدَمُهَا مَكشُوفَةٌ صَحَت صَلَاتُهَا.»

''عورت کا قدم پردے (ستر) میں شامل نہیں ہے۔ پس عورت اگر ننگے قدم نماز پڑھے تو نماز درست ہے۔''

مذکورہ آثار واقوال سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے، کہ حافظ ابن عبدالبر کے دعوئے اجماع صحابہ رضی اللہ عنہم کی کوئی حیثیت نہیں۔ یہ محض مالکی مسلک کی حمایت میں ان کی ایک کوشش ہے۔ اس کے سوا عملاً اس کا وجود نہیں۔

اب شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ کی تحقیق بغور ملاحظہ فرمائیں! وہ فرماتے ہیں:

---

[1] عمدة القاری:۳/۳۰۷

« وَ فِي الصَّلَاةِ نَوعٌ ثَالِثٌ: فَإِنَّ المَرأَةَ لَو صَلَّت وَحدَهَا كَانَت مَأمُورَةً بِالِاختِمَارِ. وَ فِي غَيرِ الصَّلَاةِ يَجُوزُ لَهَا كَشفُ رَأسِهَا، فَأَخذُ الزِّينَةِ فِي الصَّلٰوةِ حَقُّ اللّٰهِ، فَلَيسَ لِأَحَدٍ أَن يَّطُوفَ بِالبَيتِ عُريَانًا، وَ لَو كَانَ وَحدَهُ بِاللَّيلِ، وَ لَا يُصَلِّي عُريَانًا، وَ لَو كَانَ وَحدَهُ. فَعُلِمَ أَنَّ أَخذَ الزِّينَةِ لَم يَكُن فِي الصَّلَاةِ لِتَحتَجِبَ عَنِ النَّاسِ فَهٰذَا نَوعٌ. وَ هٰذَا نَوعٌ.»

''نماز میں سَتر وحجاب کی ایک تیسری قسم ہے: چنانچہ عورت اگر اکیلی نماز پڑھے، تو اسے دوپٹہ لینے کا حکم ہے، جب کہ نماز کے علاوہ اسے گھر میں سَر ننگا رکھنے کی اجازت ہے۔ تو اس طرح نماز میں زینت اپنانا اللہ کے حق کی وجہ سے ہے۔ اسی بناء پر کسی کو برہنہ حالت میں بیت اللہ کا طواف کرنے کی اجازت نہیں، خواہ وہ بوقتِ شب اکیلا ہو اور نہ برہنہ نماز پڑھنے کی ہی اجازت ہے، خواہ اکیلا ہو۔ اس سے معلوم ہوا، کہ نماز میں زینت اپنانے کا مقصد لوگوں سے پردہ کرنا نہیں ہے۔ پردے کی یہ صورت اور ہے اور جب کہ عام حالات میں پردہ کرنا دوسری صورت ہے۔''

چنانچہ نماز کی حالت میں نمازی وہ اعضاء بھی ڈھانپتا ہے، جن کا نماز کے علاوہ ظاہر کرنا جائز ہے۔ اسی طرح نماز ہی میں بعض اُن اعضاء کو ظاہر کرتا ہے، جن کا مردوں سے بھی ڈھانپنے کا حکم ہے۔

پہلی صورت کی مثال کندھے ہیں۔ چنانچہ نبی کریم ﷺ نے ایک آدمی کو ایک کپڑے میں اس طرح نماز پڑھنے سے منع فرمایا: کہ اس کے کندھے پر چادر کا کوئی حصہ ہی نہ ہو تو یہ نماز کے حق کی وجہ سے ہے، مگر نماز کے سوا اسے مردوں کے سامنے کندھے ننگے کرنا جائز ہے۔ اسی طرح آزاد عورت کو نماز میں دوپٹہ اوڑھنے کا حکم ہے، جیسا کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

« لَا يَقبَلُ اللّٰهُ صَلٰوةَ حَائِضٍ اِلَّا بِخِمَارٍ.»[1]

''بالغ عورت کی نماز، اللہ دوپٹے کے بغیر قبول نہیں کرتا۔''

حالانکہ اسے خاوند اور محرم مردوں کے پاس دوپٹہ لینا ضروری نہیں، بلکہ وہ ان لوگوں کے پاس باطنی زینت کو ظاہر کرسکتی ہے، لیکن نماز کی حالت میں نہ وہ ان لوگوں کے سامنے سَر ننگا کرسکتی ہے، نہ دوسروں کے سامنے، جب کہ چہرہ، ہاتھ اور پاؤں کا حکم اس کے برعکس ہے۔ دو اقوال میں سے صحیح ترین قول کے مطابق وہ

---

[1] سنن ابن ماجه، بَابُ فَضلِ اللّٰهُمَّ رَبَّنَا لَكَ الحَمدُ ،رقم:٦٥٥، سنن أبي داود، رقم:٦٤١، سنن الترمذي، بَابٌ: مَا جَاءَ لَا تُقبَلُ صَلَاةُ الحَائِضِ إِلَّا بِخِمَارٍ ،رقم:٣٧٧

ان اعضاء کو غیروں کے سامنے ظاہر نہیں کر سکتی۔صرف ظاہری لباس ظاہر کر سکتی ہے۔تاہم حکم کی منسوخی سے قبل صورتِ حال اس کے خلاف تھی۔

« وَأَمَّا سَترُ ذَلِكَ فِي الصَّلٰوةِ ، فَلَا يَجِبُ بِاتِّفَاقِ المُسلِمِينَ ، بَل يَجُوزُ لَهَا كَشفُ الوَجهِ بِالإِجمَاعِ، وَ إِن كَانَ مِنَ الزِّينَةِ البَاطِنَةِ. وَ كَذَالِكَ اليَدَانِ يَجُوزُ إِبدَاءُ هُمَا فِي الصَّلٰوةِ عِندَ جَمهُورِ العُلَمَاءِ، كَأَبِي حَنِيفَةِ، وَالشَّافِعِيّ، وَغَيرِهِمَا. وَ هُوَ إِحدٰى الرِّوَايَتَينِ، عَن أَحمَدِ، وَ كَذٰلِكَ القَدَمُ يَجُوزُ إِبدَاءُهُ عِندَ أَبِي حَنِيفَةِ. وَ هُوَ الأَقوٰى. فَإِنَّ عَائِشَةَ جَعَلَتهُ مِنَ الزِّينَةِ الظَّاهِرَةِ. قَالَت: ﴿وَلَا يُبۡدِينَ زِينَتَهُنَّ إِلَّا مَا ظَهَرَ مِنۡهَا﴾ (النور:۳۱)

''جہاں تک نماز میں ان اعضاء کو ڈھانپنے کا تعلق ہے،تو مسلمانوں کا اس بات پر اتفاق ہے، کہ یہ واجب نہیں، بلکہ اس بات پر اجماع ہے، کہ وہ نماز میں چہرہ ننگا کر سکتی ہے،۔اگر چہ اس کا شمار باطنی زینت میں ہوتا ہے۔اسی طرح جمہور علماء کے نزدیک وہ نماز میں ہاتھ بھی کھلے رکھ سکتی ہے، جیسا کہ امام ابوحنیفہ، اور شافعی اور دیگر علماء سے منقول ہے، اور امام احمد سے بھی ایک روایت یہی ہے۔اسی طرح امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک پاؤں ننگے کرنا جائز ہے اور یہ نقطۂ نظر قوی تر ہے۔ چنانچہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے اسے ظاہری زینت میں شمار کیا ہے، اور اس پر یہ آیت پڑھی'' اور وہ اپنی زینت کو ظاہر نہ کریں مگر جو (از خود) ظاہر ہو۔''

نیز فرماتی ہیں کہ

فتخ سے مراد بہ روایت ابن ابی حاتم چاندی کے وہ چھلے ہیں، جو پاؤں کی انگلیوں میں ڈالے جاتے ہیں۔ یہ اس بات کی دلیل ہے، کہ عورتیں شروع شروع میں اپنے پاؤں ظاہر کرتی تھیں، جس طرح چہرے اور ہاتھوں کو ظاہر کرتی تھیں۔ چنانچہ وہ اپنے دامن لٹکا کر رکھتی تھی۔عورت جب پیدل چلتی، تو کبھی اس کا پاؤں ظاہر ہو جاتا تھا۔ کیونکہ وہ موزے اور جوتے پہن کر نہیں چلتی تھیں، جب کہ نماز میں ان اعضاء کا ڈھانپنا تو نہایت تنگی اور مشکل کا باعث ہے۔

ام سلمہ رضی اللہ عنہا کا کہنا ہے، کہ عورت اتنے لمبے کپڑے میں نماز پڑھے جس سے اس کے پاؤں کا ظاہری حصہ چھپ جائے۔البتہ جب سجدے میں جائے گی، تو اس کے پاؤں کا اندرونی حصہ از خود ظاہر بھی ہو سکتا ہے۔

« وَ بِالجُملَةِ فَقَد ثَبَتَ بِالنَّصِّ، وَالإِجمَاعِ أَنَّهُ لَيسَ عَلَيهَا فِي الصَّلٰوةِ أَنَّ تَلبِسَ

الجِلبَابَ الَّذِي يَستُرُهَا إِذَا كَانَت فِي بَيتِهَا ، وَ إِنَّمَا ذٰلِكَ إِذَا خَرَجَت ، وَ حِينَئِذٍ فَتُصَلِّي فِي بَيتِهَا. وَ إِن بَدَا وَجهُهَا. وَ يَدُهَا، وَقَدَمَاهَا، كَمَا كُنَّ يَمشِينَ اَوَّلًا قَبلَ الْأمرِ بِإِدنَاءِ الجَلَابِيبِ عَلَيهِنَّ ، فَلَيسَتِ العَورَةُ فِي الصَّلٰوةِ مُرتَبِطَةً بِعَورَةِ النَّظرِ لَا طَردًا وَ لَا عَكسًا.»

''خلاصہ یہ ہے کہ نص اور اجماع سے یہ ثابت ہو چکا ہے، کہ عورت جب گھر میں ہو، تو اس کے لیے یہ ضروری نہیں، کہ نماز میں ایک بڑی چادر سے اپنا سارا بدن ڈھانپ لے۔ یہ حکم اس وقت ہے جب وہ گھر سے باہر جائے۔ وہ گھر میں نماز پڑھ سکتی ہے، خواہ اس کا چہرہ، ہاتھ اور پاؤں کھلے ہوئے ہوں۔ جیسے وہ جلباب (بڑی چادر) لٹکانے کے حکم سے پہلے پیدل چلتی تھیں۔ چنانچہ نماز میں ستر کا حکم نگاہوں سے ستر حاصل کرنے کے حکم سے مربوط نہیں، نہ موافق میں اور نہ مخالف میں۔''

حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے جب یہ فرمایا: کہ ظاہری زینت سے مراد لباس ہے، تو انھوں نے بھی یہ نہیں فرمایا کہ عورت تمام کی تمام پردہ کے لائق ہے، حتی کہ ناخن بھی۔ بلکہ یہ تو امام احمد رحمہ اللہ کا قول ہے۔ ان کی مراد یہ ہے کہ نماز میں عورت اسے ڈھانپے۔ چنانچہ فقہاء اسے ''سترۃ العورۃ'' کے نام سے موسوم کرتے ہیں، جب کہ یہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ نہیں، نہ کتاب وسنت ہی میں کوئی ایسی نص ہے جس سے یہ معلوم ہو کہ نمازی جن اعضاء کو ڈھانکتا ہے، اسے عورۃ (لائق پردہ چیز) کا حکم حاصل ہے۔ بلکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿خُذُوا زِينَتَكُم عِندَ كُلِّ مَسجِدٍ﴾ (الاعراف:۳۱) ''ہر مسجد کے پاس اپنی زینت کو اپناؤ۔''

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے برہنہ بدن آدمی کو بیت اللہ کا طواف کرنے سے منع فرمایا، تو اس حالت میں نماز بالاُولیٰ ممنوع ہوگی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک کپڑے میں نماز پڑھنے کے حکم کے بارے میں دریافت کیا گیا، تو آپ نے فرمایا: «أَوَ لِكُلِّكُم ثَوبَانِ؟» [1] ''کیا تم میں سے ہر ایک کے پاس دو دو کپڑے ہیں؟''

آپ نے ایک کپڑے کے بارے میں فرمایا: کہ اگر وہ وسیع ہو تو اسے پورے بدن پر اوڑھ لو اور اگر تنگ ہو تو اس کا تہہ بند بناء لو اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات سے منع فرمایا، کہ کوئی ایک کپڑے میں اس طرح نماز پڑھے، کہ اس کے کندھے پر اس میں سے کچھ بھی نہ ہو، تو یہ اس بات کی دلیل ہے، کہ آدمی کے لیے یہ حکم ہے، کہ وہ نماز میں پردے کے لائق اعضاء کو ڈھانپے، جیسے ران وغیرہ۔ اگرچہ ہم دوسرے مرد کے لیے ان

[1] صحيح مسلم، بَابُ الصَّلَاةِ فِي ثَوبٍ وَاحِدٍ وَصِفَةِ لُبسِهِ، رقم:۵۱۵

اعضاء کا دیکھنا جائز قرار دیتے ہیں۔

مزید آگے چل کر فرماتے ہیں:

« وَهٰذَا كَمَا أُمِرَ الْمُصَلِّي بِالطَّهَارَةِ، وَالنَّظَافَةِ، وَالطِّيبِ، فَقَد أَمَرَ النَّبِيُّ ﷺ اَن تُتَّخَذَ الْمَسَاجِدُ فِي الْبُيُوتِ، وَ تُنَظَّفَ، وَ تُطَيَّبَ ، وَ عَلٰى هٰذَا فَيَستَتِرُ فِي الصَّلٰوةِ أَبلَغَ مِمَّا يَستَتِرُ الرَّجُلَ مِنَ الرَّجُلِ ، وَالْمَرأَةُ مِنَ الْمَرأَةِ......»

''یہ ایسے ہی ہے جیسے نماز کے لیے طہارت، صفائی اور خوشبو لگانے کا حکم ہے، نبی کریم ﷺ نے اس بات کا حکم دیا ہے، کہ گھروں میں مسجدیں بنائی جائیں، ان کی صفائی، پاکیزگی اور خوشبو کا خیال رکھا جائے۔ اس بناء پر نماز میں سترِ اعضاء کا اہتمام اس سے بھی زیادہ ہونا چاہیے، جتنا مرد مرد سے اور عورت عورت سے کرتی ہے۔''

یہی وجہ ہے کہ عورت کو نماز میں دوپٹہ اوڑھنے کا حکم ہے۔ جہاں تک چہرہ، ہاتھ اور پاؤں کا تعلق ہے، تو عورت کو ان اعضاء کو غیروں کے سامنے ظاہر کرنے سے منع کیا گیا ہے، جب کہ عورتوں اور محرم مردوں کے سامنے ظاہر کرنے سے منع نہیں کیا گیا۔

پس معلوم ہوا، کہ ستر کی یہ قسم وہ نہیں جو مرد کا مرد سے اور عورت کا عورت سے ستر ہوتا ہے، جس سے بے حیائی اور اعضاء کو ننگا کرنے کی قباحت کی وجہ سے منع کیا گیا ہے۔ بلکہ یہ بے حیائی کی طرف لے جانے والے ابتدائی امور میں سے ہے۔ تو ان کے ظاہر کرنے سے ممانعت بے حیائی کے ابتدائی امور سے ممانعت ہے جیسے کہ اس آیت میں اللہ نے فرمایا: ﴿ ذٰلِكَ اَزْكٰى لَهُمْ ﴾ کہ یہ ان کے لیے زیادہ پاکیزگی کی بات ہے اور ''آیۃ الحجاب'' میں فرمایا: ﴿ ذٰلِكُمْ اَطْهَرُ لِقُلُوْبِكُمْ وَ قُلُوْبِهِنَّ ﴾ (الاحزاب:۵۳) کہ یہ تمہارے اور ان کے دلوں کے لیے زیادہ طہارت کا باعث ہے۔

چنانچہ اس سے ممانعت ''سَدِّ ذریعہ'' کے قبیل سے ہے، اس لیے نہیں، کہ یہ مطلق پردے کے لائق چیز ہے، نہ نماز میں نہ نماز کے علاوہ۔ تو یہ ہے اس کی اصلی حقیقت۔

نماز میں عورت کو ہاتھ ڈھانپنے کا حکم دینا انتہائی بعید از قیاس بات ہے، ہاتھ بھی ویسے ہی سجدہ کرتے ہیں جیسے چہرہ سجدہ کرتا ہے۔ نبی کریم ﷺ کے زمانے میں عورتوں کی قمیصیں ہوتیں اور وہ انھیں قمیصوں میں کام کاج کرتی تھیں۔ چنانچہ عورت آٹا پیستے، گوندھتے اور روٹیاں پکاتے وقت اپنے ہاتھ کھلے رکھتی تھی۔

« وَ لَو كَانَ سَترُ الْيَدَيْنِ فِي الصَّلٰوةِ وَاجِبًا لَبَيَّنَهُ النَّبِيُّ ﷺ ، وَ كَذٰلِكَ الْقَدَمَانِ ،

وَإِنَّمَا أُمِرَ بِالْخِمَارِ فَقَط مَعَ الْقَمِيصِ، فَكُنَّ يُصَلِّينَ فِي قَمِيصِهِنَّ، وَ خُمُرِهِنَّ ، وَأَمَّا الثَّوبُ الَّذِي كَانَتِ الْمَرأَةُ تُرخِيهِ ، وَ سَأَلْنَ عَن ذٰلِكَ النَّبِيَّ ﷺ فَقَالَ: «شِبرًا، فَقُلنَ إِذًا تَبدُو اَسوُقُهُنَّ! فَقَالَ: «ذِرَاعٌ لَا يَزِدنَ عَلَيهِ، وَ قَولُ عُمَرِ بنِ رَبِيعَةَ.

كُتِبَ الْقَتلُ وَالْقِتَالُ عَلَينَا وَ عَلَى الْغَانِيَاتِ جَرُّ الذُّيُولِ

یعنی اگر نماز میں ہاتھوں کا ڈھانپنا واجب ہوتا، تو نبی کریم ﷺ اس کی وضاحت فرما دیتے۔ یہی حکم قدموں کا ہے، انھیں قمیض کے ساتھ محض دوپٹے کا حکم دیا گیا ہے۔ تو عورتیں اپنی قمیضوں اور دوپٹوں میں نماز پڑھا کرتی تھیں۔

جہاں تک اس کپڑے کا تعلق ہے، جسے عورت لٹکا کر رکھتی ہے اور اس کے متعلق صحابیات نے نبی کریم ﷺ سے دریافت بھی کیا تھا، کہ وہ کتنا کپڑا لٹکائیں، تو آپ ﷺ نے فرمایا: ایک بالشت۔ عورتوں نے کہا، کہ اس صورت میں تو پنڈلیاں ظاہر ہوں گی، آپ ﷺ نے فرمایا: ایک کلائی کی مقدار (تک لٹکا لیں) اور اس سے زیادہ نہ لٹکائیں۔ عمر بن ربیعہ کا شعر ہے کہ ''ہم پر جنگ و جدال فرض کیا گیا ہے اور عورتوں پر دامن کا لٹکانا۔''

یہ اس وقت حکم ہے، جب وہ گھروں سے باہر جائیں۔ یہی وجہ ہے کہ آپ ﷺ سے پوچھا گیا، کہ عورت اگر گندی جگہ سے دامن گھسیٹ کر گزرے تو کیا حکم ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا:

«يُطَهِّرُهُ مَا بَعدَهُ»[1] ''صاف جگہ سے گزرنا اسے پاک کر دیتا ہے۔''

مگر گھر کی چار دیواری میں تو عورتیں اس قسم کا لباس نہیں پہنتی تھیں، جس طرح بعد میں عورتوں نے پنڈلیاں ڈھانپنے کے لیے گھر سے باہر موزے پہننے شروع کر دیے تھے، جب کہ گھروں میں وہ موزے نہیں پہنتی تھیں۔ اسی بناء پر انھوں نے کہا تھا، کہ اگر ایک بالشت دامن لٹکانے سے پنڈلیاں ظاہر ہوں تو؟ گویا ان کا مقصود پنڈلیوں کا ڈھانپنا تھا (نہ کہ قدموں کا)۔ کیونکہ کپڑا جب ٹخنوں سے اوپر ہو گا، تو پیدل چلتے وقت پنڈلی ظاہر ہو گی۔

روایت کیا گیا ہے: «أَعرُوا النِّسَاءَ يَلزَمنَ الحِجَالَ»[2] ''عورتوں کو برہنہ کرو تا کہ وہ گھروں میں ٹھہرنا لازم کر لیں۔'' یعنی اگر اس کے پاس باہر جانے کے لیے مناسب لباس ہی نہیں ہو گا، تو وہ گھر میں

---

(1) سنن ابن ماجه، بَابُ الْأَرضِ يُطَهِّرُ بَعضُهَا بَعضًا ،رقم:٥٣١

(2) المجعم الكبير للطبراني، رقم:١٠٦٣، المعجم الاوسط، رقم:٣٠٧٣

ٹھہرنا لازم کرلے گی۔

مسلمانوں کی عورتیں گھروں میں نماز پڑھا کرتی تھیں، جب کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

« لَا تَمنَعُو إِمَاءَ اللّٰهِ مَسَاجِدَ اللّٰهِ، وَ بُيُوتُهُنَّ خَيرٌ لَهُنَّ » (1)

''اللہ کی باندیوں کو اللہ کی مسجدوں (میں نماز پڑھنے) سے مت روکو، البتہ ان کے گھر ان کے لیے زیادہ بہتر ہیں۔''

انھیں قمیضوں کے ساتھ صرف دوپٹے اوڑھنے کا حکم تھا، انھیں ایسی چیز پہننے کا حکم نہیں دیا گیا، جس سے وہ اپنے پاؤں ڈھانپیں، نہ موزے کا حکم دیا گیا نہ جراب کا اور نہ ہاتھوں کو ڈھانپنے کے لیے دستانے وغیرہ پہننے کا حکم دیا گیا۔ تو یہ اس بات کی دلیل ہے، کہ عورت کے لیے نماز میں ان اعضاء کا ڈھانپنا واجب نہیں ہے، جب وہاں غیر مرد نہ ہوں۔'' (انتہیٰ)

ان دلائل کی روشنی میں مولانا اثری (حفظہ اللہ) کو میرا مشورہ ہے، کہ اپنے موقف پر نظر ثانی فرمائیں۔ ساری خیر و برکت اسی میں ہے۔ عورت کے پورے جسم کو جس قید و بند میں آپ جکڑنا چاہتے ہیں شرعاً و عملاً اس کا کوئی وجود نہیں۔

جس دور کی عورتوں کو بمشکل ایک چادر میسر آتی تھی، انھیں ہر وقت دستانوں اور جرابوں کا پابند کرنا قرین قیاس نہیں۔ اللہ رب العزت ہم سب کی راہنمائی فرمائے۔ (آمین)

عورت کے لیے نماز میں پاؤں کا ڈھانپنا:

سوال: کیا عورت کے لیے نماز میں پاؤں کا ڈھانپنا شرط ہے یا کہ نہیں؟

جواب: نماز میں عورت کے لیے پاؤں کا ڈھانپنا شرط نہیں۔ ہاں البتہ ''سنن ابوداؤد'' کی ایک روایت میں پاؤں کی پشتوں کو ڈھانپنے کا ذکر موجود ہے، لیکن ثقہ راویوں نے اس کو حضرت اُمّ سلمہ پر موقوف قرار دیا ہے۔ ان کی مخالفت صرف عبد الرحمن بن عبد اللہ بن دینار نے کی ہے۔ اس نے اس کو ''عن محمد بن زید، عن أم سلمة'' مرفوع بیان کیا ہے۔ ثقات کی مخالفت کی وجہ سے زرقانی نے اس کی روایت کو شاذ کہا ہے۔ یہ راوی اگرچہ صدوق ہے، لیکن غلطی کر جاتا ہے، ممکن ہے اس حدیث کے مرفوع بیان کرنے میں بھی اس سے غلطی سرزد ہوگئی ہو۔ عبد الحق نے بھی اس کو معلول کہا ہے، کیونکہ مالک رحمہ اللہ اور دیگر لوگوں نے اس کو

(1) صحیح البخاري، بَابُ هَل عَلَى مَن لَم يَشهَدِ الجُمُعَةَ ......الخ، رقم: ۹۰۰، صحیح مسلم، بَابُ خُرُوجِ النِّسَاءِ إِلَى المَسَاجِدِ إِذَا لَم يَتَرَتَّب ......الخ، رقم: ٤٤٢

موقوف بیان کیا ہے۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے اس کو درست قرار دیا ہے، لیکن حاکم نے اس روایت کو ذکر کرنے کے بعد کہا ہے، کہ اس کا مرفوع ہونا صحیح ہے۔ یہ بخاری کی شرط پر ہے۔ نیز امام شوکانی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس روایت کا مرفوع ہونا زیادتی ہے، اسے چھوڑنا نہیں چاہیے۔ جس طرح کہ مصطلح الحدیث میں معروف ہے اور یہی بات حق ہے۔

اور امیر یمانی نے ''سبل السلام'' میں کہا ہے۔ روایت ہذا اگرچہ موقوف ہے، لیکن حکماً مرفوع ہے، کیونکہ اس میں اجتہاد کی گنجائش نہیں۔ [1]

ائمۂ حدیث کی اس فنی بحث کی روشنی میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں، کہ عورت کو چاہیے کہ نماز میں پاؤں کی پشتوں کو ڈھانپنے کا اہتمام کرے، اگرچہ بطورِ شرط قرار دینا مشکل امر ہے۔

عورت کا رکوع اور سجود سمٹ کر کرنا:

سوال : میں رکوع اور سجدے میں بازو پہلوؤں سے ملا کر رکھتی ہوں، سمٹ کر سجدہ کرتی ہوں اور کولہے زیادہ اوپر نہیں اٹھاتی، باقی ساری نماز مردوں ہی کی طرح پڑھتی ہوں، کیا یہ طریقہ ٹھیک ہے؟

جواب : رکوع اور سجود سمٹ کر نہیں کرنا چاہیے۔ بلکہ مردوں کی طرح بازوؤں کو کھول کر رکھنا چاہیے۔ عورت اور مرد کی نماز میں کوئی فرق نہیں۔

---

[1] المرعاۃ : ۱/۵۰۲

نفل نمازیں وسنن مؤکدات

فجر کی سنتیں

نمازِ فجر کی سنتوں کا وقت:

سوال: نمازِ فجر کی سنتوں کا وقت کیا ہے؟، جماعت کے بعد سنتیں پڑھی جا سکتی ہیں؟ بعض حضرات کہتے ہیں کہ جب سورج طلوع ہو جائے یا ظہر کی سنتوں سے پہلے دو سنتیں فجر کی ادا کریں؟

جواب: فجر کی سنتیں پو پھٹنے کے بعد پڑھنی چاہئیں۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: پو پھٹنے کے بعد کوئی نماز نہیں مگر دو رکعت فجر یعنی سنتیں۔ [1]

اور وہ رہ جائیں تو جماعت کے بعد ادا ہو سکتی ہیں۔ چنانچہ امام شوکانی، ''نیل الأوطار'' (جز۳،ص:۳۸) پر رقمطراز ہیں۔ یعنی ابن حزم نے محلّٰی ابن حزم میں روایت کیا ہے، کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو فجر کے بعد سنتیں پڑھتے دیکھا، اس نے کہا، یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! میں نے سنتیں فجر کی نہیں پڑھی تھیں اب پڑھی ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو کچھ نہیں کہا۔ اس حدیث کی اسناد اچھی ہے۔ نیز سورج بلند ہونے کے بعد بھی فجر کی سنتوں کو پڑھا جا سکتا ہے۔ یہ بات بھی بعض احادیث میں وارد ہے۔ امام ثوری۔ ابن المبارک، شافعی، احمد اور اسحاق رحمہم اللہ اسی بات کے قائل ہیں۔ [2]

لہٰذا بعض حضرات کا نظریہ بھی دوسرے قول کی بناء پر درست ہے۔

جماعت کھڑی ہو تو فجر کی دو سنتیں کب پڑھیں؟

سوال اگر فجر کی جماعت کھڑی ہو تو فجر کی سنتیں کب پڑھی جائیں؟ کیا جماعت میں شامل ہونے سے پہلے پڑھنا ضروری ہیں یا فرض پڑھنے کے بعد بھی سنتیں پڑھی جا سکتی ہیں؟

جواب فجر کی جماعت کھڑی ہونے کی صورت میں صبح کی نماز کے بعد سنتیں پڑھی جا سکتی ہیں۔ سنن ترمذی میں باب ہے: ماجاء فیمن تفوته الرکعتان قبل الفجر یصلیهما بعد صلاة الصبح اور

[1] بلوغ المرام باب المواقیت

[2] نیل الأوطار: ۲۷/۳

سورج طلوع ہونے کے بعد بھی پڑھنا درست ہے جیسا کہ سنن ترمذی میں عنوان ہے:ماجاء في إعادتهما بعد طلوع الشمس.

فجر کی سنتوں کی ادائیگی کا اصل وقت کونسا ہے؟

سوال: ایک آدی سفر میں جا رہا ہے صبح کی نماز کا وقت ہو جاتا ہے چند آدمی اور بھی اس کے ساتھ نماز پڑھنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں اب جلدی جلدی وضو کر کے جماعت کھڑی کرتے ہیں تو وہ آدمی کہتا ہے کہ پہلے سنتوں کو ادا کر لیں وہ کہتے ہیں بعد میں پڑھ لیں اس نے روک دیا۔سنتوں کا وقت پہلے ہے سنتیں پڑھو۔ پھر جماعت کریں گے کیا اس آدمی کا ایسا کرنا صحیح ہے یا بعد میں بھی سنت ادا کر سکتے ہیں؟

جواب: اصل یہ ہے کہ فجر کی سنتیں فرضوں سے پہلے ادا کی جائیں۔تنگیٔ وقت کی بناء پر بعد میں بھی ادا ہو سکتی ہیں۔جن لوگوں نے بلا وجہ ان کو معرض التواء میں ڈالنے کا مشورہ دیا ہے۔ان کا طرزِ عمل درست نہیں۔ جب وقت ہو،تو سنت فرض سے پہلے ادا کرنی چاہیے۔

فجر کی سنتیں پڑھنے کے بعد دائیں کروٹ لیٹنا:

سوال: (الف) فجر کی سنتیں پڑھنے کے بعد دائیں کروٹ لیٹنا واجب ہے یا مستحب؟

(ب) اگر جماعت کھڑی ہونے میں صرف ایک آدھ منٹ باقی ہو تو اس صورت میں لیٹے یا نہ؟

(ج) یہ حکم صرف رات کو قیام کرنے والوں کے لیے ہے کہ وہ کچھ دیر ستا لیں یا ہر شخص کے لیے خواہ رات کو قیام کیا ہو یا نہ کیا ہو؟ یہ دو رکعت سنت فجر گھر میں پڑھے یا مسجد میں، ہر دو جگہ لیٹنے کا حکم کیا یکساں ہے؟

جواب: (الف) فجر کی سنتوں کے بعد لیٹنا راجح مسلک کے مطابق صرف مستحب ہے، واجب نہیں۔ اور دائیں کروٹ پر لیٹنا چاہیۓ۔امام شوکانی نے نیل الاوطار میں اسی بات کو اختیار کیا ہے۔تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو اعلام اہل العصر:ص ۶۸ اور ۷۴ اور بخاری شریف کا باب یوں ہے:

اور بخاری شریف کا باب ہے:باب الضجعة على الأيمن بعد ركعتي الفجر

(ب)......اس وقفہ میں بھی لیٹا جا سکتا ہے۔کوئی حرج نہیں۔کیوں کہ اس وقت صف بندی ضروری نہیں۔

(ج) اہل علم کے ایک گروہ کا یہی خیال ہے کہ یہ حکم صرف رات کو قیام کرنے والے کے لئے ہے کہ وہ کچھ ستا لے اور کتاب اعلام اہل العصر کے ص ۷۱ پر چھٹا مذہب یہی بیان ہوا ہے لیکن راجح مسلک یہی ہے

کہ ایسا کرنا سب کے لئے مستحب ہے۔ امام بخاری نے باب بایں الفاظ قائم کیا ہے:

باب من تحدث بعد الرکعتین ولم یضطجع ''فجر کی سنتیں پڑھ کر باتیں کرنا اور نہ لیٹنا''

فجر کی سنتیں رہ جائیں تو کیا نماز کے فوراً بعد ادا کی جاسکتی ہیں؟

سوال: اگر فجر کی سنتیں رہ جائیں تو کیا نماز کے فوراً بعد ادا کی جاسکتی ہیں؟

جواب: اور اگر فجر کی سنتیں رہ جائیں تو فرضوں کے بعد ادا ہوسکتی ہیں۔ حدیث میں ہے قیس بن عمرو کو نبی ﷺ نے صبح کی نماز کے بعد نماز پڑھتا ہوا پایا، تو دریافت کیا: « یَا قَیْسُ! أَ صَلَاتَانِ مَعًا » ''کیا ایک فرض کے وقت میں دو فرض پڑھنا چاہتا ہے؟'' انھوں نے عرض کیا: یا رسول اللہ! میں نے فجر کی دو رکعتیں نہیں پڑھی تھیں۔ فرمایا: « فَلَا اِذَنْ » یعنی جب معاملہ اس طرح ہے، تو دو رکعتوں کو پڑھنے میں کوئی حرج نہیں۔ [1] حدیث ہذا کو اگرچہ امام ترمذی رحمہ اللہ نے منقطع اور مرسل قرار دیا ہے۔

تاہم امام شوکانی رحمہ اللہ نے ''نیل الأوطار'' میں اس بات سے اتفاق نہیں کیا۔ وہ فرماتے ہیں:

''یہ روایت صحیح ابن خزیمہ اور ابن حبان میں یحییٰ بن سعید، عن ابیہ، عن جدہ، قیس متصل موجود ہے۔ بلکہ اس کے علاوہ طریق میں بھی اتصال (سند کا متصل ہونا ثابت) ہے۔''

نیز امام بیہقی رحمہ اللہ نے بھی اپنی ''سنن'' میں اس کو عن یحییٰ بن سعید، عن ابیہ، عن جدہ قیس، ذکر کیا ہے۔

اور علامہ مبارکپوری رحمہ اللہ نے بھی اس بارے میں امام شوکانی رحمہ اللہ سے اتفاق کا اظہار کیا ہے۔ [2]

صبح کی دو سنتیں گھر میں ادا کرنے والا مسجد میں تحیۃ المسجد ادا کرے گا؟

سوال: صبح کی دو سنتیں گھر میں ادا کرنے کے بعد اگر مسجد جائیں اور ابھی جماعت کھڑے ہونے میں چند منٹ باقی ہوں تو دو رکعت تحیۃ المسجد ادا کرلیں؟ اگر سنتیں رہ جائیں تو کیا نماز کے فوراً بعد ادا کی جاسکتی ہیں؟

جواب: اگر صبح کی دو رکعتیں گھر میں پڑھ کر مسجد میں آئیں، جماعت کھڑی ہونے میں وقفہ ہو، تو عموم حدیث ''اِذَا جَاءَ اَحَدُکُمُ المَسجِدَ ......الخ'' کی بناء پر تحیۃ المسجد کی دو رکعتیں پڑھنی چاہئیں۔

اور اگر فجر کی سنتیں رہ جائیں تو فرضوں کے بعد ادا ہوسکتی ہیں۔ حدیث میں ہے قیس بن عمرو رضی اللہ عنہ کو نبی ﷺ نے صبح کی نماز کے بعد نماز پڑھتا ہوا پایا، تو دریافت کیا: یَا قَیسُ ! اَصَلَاتَانِ مَعًا یعنی ''کیا ایک

---

[1] سنن الترمذی، بَابُ مَا جَاءَ فِیمَن تَفُوتُهُ الرَّکعَتَانِ قَبلَ الفَجرِ یُصَلِّیهِمَا بَعدَ صَلَاةِ الفَجرِ، رقم: ٤٢٢

[2] تحفة الأحوذی: ٢/ ٤٩٠ طبع مصری

فرض کے وقت میں دو فرض پڑھنا چاہتا ہے؟ انھوں نے عرض کی۔ یارسول اللہ! میں نے فجر کی دو رکعتیں نہیں پڑھی تھیں۔ فرمایا: ''فَلَا اِذَن'' یعنی ''جب معاملہ اس طرح ہے، تو ان دو رکعتوں کو پڑھنے میں کوئی حرج نہیں۔'' ①

حدیث ہذا کو اگرچہ امام ترمذی رحمہ اللہ نے ''منقطع'' اور ''مرسل'' قرار دیا ہے۔ تاہم امام شوکانی رحمہ اللہ نے ''نیل الأوطار'' میں اس بات سے اتفاق نہیں کیا۔ وہ فرماتے ہیں: یہ روایت صحیح ابن خزیمہ'' اور ''ابن حبان'' میں یحییٰ بن سعید، عن ابیہ، عن جدہ قیس متصل موجود ہے، بلکہ اس کے علاوہ طریق میں بھی اتصال ہے۔ نیز امام بیہقی نے بھی اپنی ''سنن'' میں اس کو عن یحییٰ، بن سعید، عن ابیہ، عن جدہ قیس ذکر کیا ہے اور علامہ مبارک پوری رحمہ اللہ نے بھی اس بارے میں امام شوکانی رحمہ اللہ سے اتفاق کا اظہار کیا ہے۔ ②

ظہر کی نماز سے قبل دو رکعات:

سوال: ظہر کی نماز سے قبل دو رکعت سنت پڑھنا یا چار رکعت پڑھنا بہتر ہے؟ تشفی بخش جواب دیں۔

جواب: صحیح بخاری کے باب ''اَلرَّکعَتَانِ قَبلَ الظُّهرِ'' کے تحت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت میں دو کا ذکر ہے جب کہ اس کے بعد حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت میں چار کا ذکر ہے۔ لہٰذا دونوں طرح جائز ہے۔ البتہ افضل یہ ہے کہ ہر دو رکعتوں پر سلام پھیرا جائے۔ صحیح بخاری (قبل رقم:۱۱۶۷) کے ''ترجمۃ الباب'' میں ہے:

« بَابُ مَا جَاءَ فِی التَّطَوُّعِ مَثنٰی، مَثنٰی. وَ یُذکَرُ ذٰلِكَ عَن عَمَّارٍ، وَ اَبِی ذَرٍّ، وَاَنَسٍ، وَ جَابِرِ بنِ زَیدٍ، وَ عِکرَمَةِ، وَالزُّهرِیَّ، وَ قَالَ یَحیٰی بنُ سَعِیدِنِ الاَنصَارِیِّ: مَا اَدرَکتُ فُقَهَاءَ اَرضِنَا اِلَّا یُسَلِّمُونَ فِی کُلِّ اِثنَتَینِ مِنَ النَّهَارِ.»

ظہر کی پہلی چار رکعت اکٹھی پڑھنا اور آخری دو رکعتوں میں فاتحہ کے علاوہ سورت ملانا:

سوال: کیا ظہر کی نماز سے قبل پڑھی جانے والی چار رکعت سنت (جو ایک سلام کے ساتھ ہوں) کی آخری دو رکعتوں میں فاتحہ کے ساتھ کوئی اور سورت ملانی جائز ہے؟ حوالہ تحریر فرمائیں۔

جواب: صحیح مسلم کی بعض روایات سے واضح ہوتا ہے، کہ فرضوں کی آخری دو رکعتوں میں فاتحہ کے ساتھ

① سنن الترمذی،بَابُ مَا جَاءَ فِیمَن تَفُوتُهُ الرَّکعَتَانِ قَبلَ الفَجرِ یُصَلِّیهِمَا بَعدَ صَلَاةِ الفَجرِ،رقم:٤٢٢

② تحفة الاحوذی، ج:٢، ص:٤٩٠، طبع مصری

مزید قرأت کا اضافہ جائز ہے اور جو حکم فرض کا ہے، وہی سنتوں اور نوافل کا بھی ہے۔ اصلاً دونوں نمازوں میں کوئی فرق نہیں۔ صحیح بخاری وغیرہ میں اُمّ المومنین سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی نمازِ تراویح والی روایت میں ہے، کہ:

« يُصَلِّي أَرْبَعًا، فَلَا تَسْئَلْ عَنْ حُسْنِهِنَّ، وَ طُولِهِنَّ . ثُمَّ يُصَلِّي أَرْبَعًا. فَلَا تَسْئَلْ عَنْ حُسْنِهِنَّ، وَ طُولِهِنَّ » ①

یعنی "آپ ﷺ چار رکعت نماز ادا فرماتے تھے۔ تم ان کے حسن اور طوالت کا تو کچھ پوچھو ہی مت۔....."

اس حدیث شریف کے مطابق بظاہر چار رکعتوں میں مساوات ہی ہے۔ لہٰذا یہ چار رکعت نوافل میں فاتحہ کے علاوہ مزید قرأت کے جواز کی دلیل ہے۔ مؤطا میں ابن عمر رضی اللہ عنہما کے فعل سے بھی منقول ہے، کہ

« كَانَ إِذَا صَلَّي وَحدَهُ يَقرَأُ فِي الاَربَعِ جَمِيعًا فِي كُلِّ رَكعَةٍ بِأُمِّ القُراٰنِ، وَ سُورَةٍ مِّنَ القُراٰنِ » ②

"ابن عمر رضی اللہ عنہما جب اکیلے نماز پڑھتے، تو چار رکعتوں میں سے ہر رکعت میں فاتحہ اور قرآن کی کوئی دوسری سورت پڑھتے۔"

یہ بھی اگرچہ فرض نماز کا ذکر ہے۔ تاہم مذکورہ بالا وجہ کی بناء پر ظہر کی سنتیں وغیرہ بھی اس میں شامل ہیں۔

ظہر کے فرض سے پہلے کتنی رکعات؟

سوال: ایک آدمی ظہر کی نماز ادا کرنے آیا۔ مسجد میں اذان ہو جانے کے بعد فرضوں سے پہلے چار رکعت پڑھے یا وہ زیادہ بھی پڑھ سکتا ہے؟

جواب: ظہر کے فرض سے پہلے صرف چار رکعات پڑھنی چاہئیں۔ دو رکعتوں کا بھی جواز ہے۔ بہتر ہے چار رکعتوں کو دو دو کرکے پڑھا جائے اور اکٹھی چار پڑھنے کا بھی جواز ہے۔ دونوں صورتوں کی وضاحت صحیح بخاری میں موجود ہے۔

ظہر کی پہلی چار رکعت اکٹھی پڑھنا:

سوال: یہاں سعودی عرب میں اکثر لوگ ظہر کی پہلی چار رکعت اکٹھی نہیں پڑھتے بلکہ دو دو رکعت پڑھتے ہیں اور ہمیں تو کہتے ہیں کہ اکٹھی چار رکعت کا حدیث میں ثبوت نہیں۔ وضاحت فرمائیں۔

---

① صحیح البخاری، بَابُ فَضلِ مَن قَامَ رَمَضَانَ، رقم: ۲۰۱۳، صحیح مسلم، بَابُ صَلَاةِ اللَّيلِ، وَعَدَدِ رَكعَاتِ النَّبِيِّ ﷺ فِي اللَّيلِ......الخ، رقم: ۷۳۸

② مؤطا امام مالك، القِرَاءَةُ فِي المَغرِبِ وَالعِشَاءِ، رقم: ۲۶۰

(جواب): صحیح بخاری (کتاب التہجد) میں ابن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت میں قبل از ظہر دو رکعتوں کا ذکر ہے۔ جب کہ اس کے متصل بعد حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت میں چار کی صراحت ہے۔ الفاظ یوں ہیں:

« كَانَ لَا يَدَعُ اَربَعًا قَبلَ الظُّهرِ » (1)

اس حدیث میں بظاہر ''وصل'' کا جواز ہے۔

اس طرح عبداللہ بن سائب رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ظہر سے پہلے یعنی فرضوں سے پہلے زوال شمس کے بعد چار رکعت پڑھتے تھے۔ (2)

صاحب مرعاۃ نے اس حدیث کو صحیح قرار دیا ہے۔ (ج:۲،ص:۱۵۰)

اس حدیث میں بھی چار رکعت اکٹھی پڑھنے کا جواز ہے۔ یہاں فصل کا ذکر نہ ہونا وصل کی دلیل ہے۔

علامہ ملا علی قاری حنفی نے اس سے مراد ظہر کی چار سنتیں ہی لی ہیں۔ اگرچہ بعض نے ان کا نام ''سنۃ الزوال'' رکھا ہے۔ نیز حضرت ابوایوب الانصاری کی روایت میں « أَربَعٌ قَبلَ الظُّهرِ ، لَيسَ فِيهِنَّ تَسلِيمٌ » (ابوداود وابن ماجه) (3) کے مصرح الفاظ بھی ہیں۔ لیکن روایت ضعیف ہے۔ (واللہ اعلم)

''تحیۃ المسجد'' کا حکم عام ہے، فجر کی سنتیں جماعت کے فوراً بعد پڑھی جا سکتی ہیں۔

ظہر اور عصر سے قبل چار رکعت سنت ایک سلام سے پڑھنا:

(سوال): ظہر اور عصر سے قبل چار رکعت سنت ایک سلام سے پڑھنا کیسا ہے جب کہ حدیث میں ہے کہ

صَلٰوةُ اللَّيلِ وَالنَّهَارِ مَثنٰى مَثنٰى » (4)

دوسری حدیث ہے کہ

« كَانَ النَّبِيُّ ﷺ يُصَلِّي قَبلَ العَصرِ اَربَعَ رَكعَاتٍ يَفصِلُ بَينَهُنَّ بِالتَّسلِيمِ » (5)

کیا کسی حدیث میں چار رکعت اکٹھی پڑھنے کا بھی ذکر ہے؟

(جواب): ظہر اور عصر سے پہلے چار رکعات کو اکٹھا پڑھنا جائز ہے۔ چنانچہ ''سنن ابی داؤد''، ''نسائی'' اور

---

(1) صحيح البخاری، بَابُ الرَّكعَتَينِ قَبلَ الظُّهرِ، رقم:١١٨٢

(2) سنن الترمذی، بَابُ مَا جَاءَ فِي الصَّلَاةِ عِندَ الزَّوَالِ، رقم:٤٧٨

(3) سنن أبی داؤد، بَابُ الأَربَعِ قَبلَ الظُّهرِ وَبَعدَهَا، رقم:١٢٧٠

(4) سنن الترمذی، بَابٌ: أَنَّ صَلَاةَ اللَّيلِ وَالنَّهَارِ مَثنَى مَثنَى، رقم:٥٩٧، سنن أبی داؤد بَابٌ فِي صَلَاةِ النَّهَارِ، رقم:١٢٩٥، سنن ابن ماجه، بَابُ مَا جَاءَ فِي صَلَاةِ اللَّيلِ وَالنَّهَارِ مَثنَى مَثنَى، رقم:١٣٢٢

(5) سنن الترمذی، بَابُ مَا جَاءَ فِي الأَربَعِ قَبلَ العَصرِ، رقم:٤٢٩ وحسنه والالبانی

''ابن ماجہ'' میں حضرت اُمّ حبیبہ رضی اللہ عنہا سے مروی، کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

''جس نے ظہر سے قبل چار رکعات اور اس کے بعد چار رکعات پر محافظت کی، اللہ اسے آگ پر حرام کر دیتا ہے۔''

حدیث ہذا مجموعے کے اعتبار سے صحیح ہے۔ صحیح بخاری میں بَابُ الرَّکعَتَانِ قَبلَ الظُّهرِ کے تحت حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے، کہ « أَنَّ النَّبِیَّ ﷺ لَا یَدَعُ أَربَعًا قَبلَ الظُّهرِ »[1]

''نبی ﷺ ظہر سے پہلے چار رکعتیں نہیں چھوڑتے تھے۔''

ظاہر یہ ہے، کہ آپ ﷺ چار رکعتیں اکٹھی پڑھتے تھے۔ جب کہ سوال میں مشارٌ الیہ حدیث میں ہے، کہ رات اور دن کی دو رکعتیں ہیں اور صحیح بخاری میں امام بخاری رحمہ اللہ نے بھی اسی پر زور دیا ہے۔ اس بارے میں اولیٰ (زیادہ بہتر) بات یہ ہے کہ ان مختلف احادیث کو دو مختلف حالتوں پر محمول کیا جائے۔ یعنی بعض دفعہ آپ ﷺ دو پڑھتے اور بعض دفعہ چار۔ چنانچہ ''فتح الباری'' (۵۸/۳) میں ہے:

« وَالْاَولٰی اَن یُحمَلَ عَلٰی حَالَینِ. فَکَانَ تَارَةً یُصَلِّی ثِنتَینِ. وَ تَارَةً یُصَلِّی اَربَعًا.»

عصر اور عشاء کی چار چار سنتیں فرضوں سے پہلے پڑھنے کا حکم:

سوال: کیا ظہر کی چار سنتوں کی طرح عصر اور عشاء کی چار چار سنتیں فرضوں سے پہلے پڑھنا ثابت ہیں؟ اگر ثابت نہیں تو پھر فرضوں سے پہلے کیا پڑھنا چاہیے؟

جواب: عصر سے پہلے چار رکعات نوافل پڑھنے ثابت ہیں۔ ابن عمر رضی اللہ عنہما کی مرفوع روایت میں ہے:

« رَحِمَ اللّٰهُ اِمرَأً صَلَّی قَبلَ العَصرِ اَربَعًا » (رواہ احمد)[2]

علامہ البانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: «سندہ حسن» اس کی سند حسن درجہ کی ہے اور حدیث علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں بھی فرماتے ہیں: «سندہ حسن» ملاحظہ ہو! حواشی مشکوٰۃ: ۱/ ۳۶۷-۳۶۸) اور صاحب المرعاۃ نے بھی حدیث علی رضی اللہ عنہ کو قابلِ حجت قرار دیا ہے۔ (۱۵۱/۲)

اور ابن القیم رحمہ اللہ نے ''زاد المعاد'' (۸۰/۱) میں حدیثِ ابن عمر رضی اللہ عنہما دن اور رات میں دس اور بارہ رکعتوں والی روایت، جس انداز میں نقل کی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا کوئی اصل ہے۔ عشاء سے پہلے چار رکعت پڑھنا سنت صحیحہ سے ثابت نہیں۔ البتہ اس وقت ''تحیۃ المسجد'' یا

---

(1) صحیح البخاری، بَابُ الرَّکعَتَینِ قَبلَ الظُّهرِ، رقم: ۱۱۸۲

(2) سنن الترمذی، بَابُ مَا جَاءَ فِی الأَربَعِ قَبلَ العَصرِ، رقم: ۴۳۰

''تحیۃ الوضوء'' پڑھی جاسکتی ہے۔«بَینَ کُلِّ اَذَانَینِ صَلٰوۃ » پرعمل ہوسکتا ہے۔

نمازعصر کے بعدنوافل پڑھنے کا حکم:

سوال : نمازعصر کے بعدنوافل پڑھنے کا کیا حکم ہے؟

جواب : اس موضوع سے متعلقہ دلائل کا تتبع اور استقراء کرنے سے معلوم ہوتا ہے، کہ بعد از عصر نماز کے بارے میں وارد احادیث متعدد اقسام پر مشتمل ہیں:

۱۔ مطلقاً منع

۲۔ عصر کے بعد نماز ممنوع ہے، اِلَّا یہ کہ سورج سفید اور بلند ہو۔

۳۔ عین غروب کے وقت نماز کا قصد کرنا منع ہے۔

احادیث کے بظاہر تعارض و اختلاف کی بناء پر ائمہ کرام کے مذاہب و مسالک بھی مختلف ہیں۔ میرے خیال میں ان روایات کی تطبیق و توفیق اور وجہ جمع یوں ہوسکتی ہے، کہ اصلاً عصر کے بعد غروبِ آفتاب تک کا وقت مکروہ وقت کہلاتا ہے۔ تاہم جب تک سورج بلند ہو اور سفید و زرد رہے، تب تک کراہت خفیف (ہلکی) ہے۔ جس میں رواتب (مؤکدہ سنتیں) وغیرہ کی قضاء کا جواز ہے۔ جن احادیث یا صحابہ رضی اللہ عنہم کے عمل سے مطلقاً جواز کا پہلو مترشح ہوتا ہے، وہ بھی اسی پر محمول ہوں گی۔

یاد رہنا چاہیے، کہ کسی بھی معاملے میں جواز یا عدمِ جواز کا نظریہ اختیار کرتے وقت سبب کو ملحوظ رکھنا بہت اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔ فرعی مسائل کو اس اساس پر پرکھنا چاہیے، کہ آیا ان میں بھی اس قسم کی وجوہات پائی جاتی ہیں یا نہیں؟ واضح ہو کہ وجہ جمع میں ادنیٰ سی مناسبت ہی کافی ہوتی ہے، جو تعارض و اختلاف دور کرنے میں ممد و معاون ثابت ہوتی ہے۔

عین غروبِ آفتاب کے وقت نماز کا قصد کرنا بلاشبہ شدید ترین کراہت ہے، یہاں تک کہ بعض اہلِ علم سببی نماز (تحیۃ المسجد وغیرہ) کے جواز کے قائل ہونے کے باوجود، اس وقت انتظار میں کھڑے رہنے کو ترجیح دیتے ہیں، تاکہ آدمی کراہت کی شدت سے بچ سکے۔ شیخنا علامہ البانی رحمہ اللہ کا اسی پر عمل تھا۔ ویسے بھی نہی کو جواز پر مقدم سمجھا جاتا ہے۔ اس بناء پر مطلقاً جواز کی بجائے، سابقہ شروط و قیود سے مقید کر دیا جائے، تو درست ہے۔ بہر صورت علی الاطلاق عصر کے بعد نوافل کا قائل ہونا میرے نزدیک محلِ نظر ہے۔

مغرب کی نماز سے پہلے دو نفل پڑھنا:

سوال : مغرب کی نماز سے پہلے دو نفل پڑھے جاتے ہیں اگر سنت ہے تو حدیث کا مکمل حوالہ دے کر لکھیں۔

جواب: مغرب کی نماز سے پہلے دو رکعت نفل پڑھنا سنت سے ثابت ہے۔ نبی ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے۔«صَلُّوا قَبلَ صَلَاۃِ المَغرِبِ»[1]

اورابوداؤد کی روایت میں ہے:«صَلُّوا قَبلَ المَغرِبِ رَکعَتَینِ »[2] (الاعتصام،لاہور:٦ دسمبر١٩٩٦ء)

مغرب کی نماز سے پہلے دو رکعت:

سوال: مغرب کی نماز سے پہلے دو رکعت نماز پڑھنے کی کیا دلیل ہے اور مخالفت کرنے والوں کے پاس کیا دلیل ہے؟

جواب: مغرب کی نماز سے پہلے دو رکعت پڑھنا صحیح بخاری میں ثابت ہے۔[3] مخالفت کرنے والوں کے پاس مذہبی تعصب کے علاوہ کوئی دلیل نہیں۔

مغرب کی سنت کے بعد ''اوابین'' کے نام سے چھ رکعتیں پڑھنا:

سوال: مسئلہ یہ ہے کہ یہ جو مغرب کی سنت کے بعد ''اوابین'' کے نام سے چھ رکعتیں پڑھی جاتی ہیں کیا یہ مسنون ہیں؟

جواب: نمازِ مغرب کے بعد چھ رکعتیں پڑھنے والی روایت سخت ضعیف ہے۔امام ترمذی رحمہ اللہ نے اپنی جامع میں امام بخاری رحمہ اللہ سے نقل کیا ہے۔عمر بن عبداللہ بن ابی خثعم ''منکر الحدیث'' اور سخت ضعیف ہے۔

« بَابُ مَا جَاءَ فِی فَضلِ التَّطَوُّعِ سِتُّ رَکعَاتِ بَعدَ المَغرِبِ .»

امام ذہبی نے بھی میزان الاعتدال میں فرمایا: اس کی حدیث منکر ہے۔مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو!''مرعاۃ المفاتیح''(١٥٢،١٥١/٢)

یاد رہے کہ یہ رکعات ''صلوٰۃ الأوابین'' کے نام سے موسوم نہیں، بلکہ ''صلوٰۃ الاوابین'' چاشت کی نماز کو کہا جاتا ہے۔چنانچہ صحیح مسلم میں حدیث ہے:« صَلٰوۃُ الاَوَّابِینَ حِینَ تَرمُضُ الفِصَالُ»[4] اللہ کی طرف رجوع کرنے والوں کی نماز اس وقت ہے، جب اونٹنیوں کے بچوں کے پاؤں سخت گرمی سے سڑنے لگیں اور حاکم میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی مرفوع روایت میں ہے:

---

[1] صحیح البخاری،بَابُ الصَّلَاۃِ قَبلَ المَغرِبِ

[2] سنن أبی داؤد،بَابُ الصَّلَاۃِ قَبلَ المَغرِبِ، رقم:١٢٨١ ، بحواله فتح الباری:٥٩/٣

[3] سنن أبی داؤد،بَابُ الصَّلَاۃِ قَبلَ المَغرِبِ، رقم:١٢٨١

[4] صحیح مسلم، بَابُ صَلَاۃِ الاَوَّابِینَ حِینَ تَرمَضُ الفِصَالُ،رقم:748

« لَا يُحَافِظُ عَلٰى صَلَاةِ الضُّحٰى اِلَّا اَوَّابٌ. قَالَ وَ هِيَ صَلَاةُ الْاَوَّابِيْنَ » [1]

یعنی ''چاشت کی نماز پر مداومت صرف اللہ کی طرف رجوع کرنے والا ہی کرتا ہے فرمایا۔ اسی کا نام اوابین کی نماز ہے۔'' جب حدیث ضعیف ہے تو مسنون ہونا ثابت نہ ہوا۔ اگرچہ امام شوکانی رحمہ اللہ نے ''نیل الأوطار'' میں کثرتِ طُرق کی بناء پر فضائلِ اعمال میں قابلِ عمل سمجھا ہے۔

مغرب کی سنتوں کے بعد اوّابین:

سوال: مغرب کے بعد اکثر احناف اور راقم بھی ماضی میں ۶ نوافل ''صلاۃ الاوابین'' کے پڑھتا رہا ہے ان کی حدیث کی روشنی میں کیا حقیقت ہے؟

جواب: مغرب کے بعد چھ رکعتیں پڑھنے والی روایت سخت ضعیف ہے۔ اس میں راوی عمر بن ابی خشعم کو امام بخاری رحمہ اللہ نے ''منکر الحدیث'' قرار دیا ہے۔ اس روایت کے دیگر طُرق بھی ضعیف ہیں۔ اصلاً احادیث میں ''صلاۃ الاوابین'' چاشت کی نماز کو کہا جاتا ہے۔ اس نام کا اطلاق اس نماز پر نہیں ہوا۔

نمازِ عشاء میں پہلے دو یا چار رکعت سنت ہیں؟

سوال مولانا عبدالسلام بستوی کی کتاب ''تعلیم الاسلام'' کی جلد نمبر ۱ ص: ۲۹۱ پر لکھا ہے کہ ''نمازِ عشاء میں پہلے دو یا چار رکعت سنت ہیں۔'' البتہ اس کا انھوں نے کئی حوالہ نہیں دیا، کیا یہ صحیح ہے اور کس حوالے سے؟

جواب اس بارے میں کوئی صحیح حدیث میری نظر سے نہیں گزری۔

جمعہ کے بعد رکعات:

سوال: آپ نے ''الاعتصام'' کی قریبی اشاعت میں تحریر فرمایا ہے کہ جمعہ کی نماز میں فرض کے بعد مسجد میں چار رکعت پڑھی جائیں۔ خواہ کوئی شخص خطبہ شروع ہونے کے بعد ہی آئے اور اس نے ''تحیۃ المسجد'' ہی ادا کی ہو۔ حل طلب مسئلہ یہ ہے کہ یہ چار رکعت سنت ہیں یا دو رکعت سنت اور دو نفل؟

جواب: یہ سب نوافل (فرض سے زائد) ہیں۔ محدثین کے نزدیک تفریق کا تصور نہیں۔ تفریق کی اصطلاح حادث ہے، یعنی بعد میں فقہائے کرام کی ایجاد ہے۔

نوافل میں قرآن سے دیکھ کر پڑھنا:

سوال: نوافل میں قرآن سے دیکھ کر پڑھنے کی اجازت ہے کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا غلام ان کے

---

[1] المستدرك على الصحيحين للحاكم: ۱/۴۵۷، رقم: ۱۱۸۲

لیے دیکھ کر پڑھتا تھا لیکن بار بار ورق گردانی کرنی پڑتی ہے جو عمل کثیر ہے کیا ایسا کرنا جائز ہے؟ مصحف سے دیکھ کر پڑھنے کا صحیح طریقہ کیا ہے؟

جواب : عمل ہذا میں چونکہ تسلسل قائم نہیں رہتا۔ اس لیے یہ عمل کثیر میں داخل نہیں۔ پھر نبی ﷺ کی صلوٰۃ کسوف میں حرکات بھی ہمارے لیے نمونہ ہیں اور امامہ بنت ابو العاص کو اٹھا کر امامت کرایا کرتے تھے۔ رکوع اور سجود کی حالت میں اس کو بٹھا دیتے اور قیام میں اٹھا لیتے۔ اسی طرح بوقتِ قیام قرآن مجید ہاتھ میں پکڑ لیا جائے۔ رکوع اور سجود کے وقت قریب کوئی مناسب جگہ ہو، تو وہاں رکھ لیا جائے۔ بصورتِ دیگر ہاتھ میں پکڑ کر ہی رکوع سجود کر سکتا ہے۔

کیا ہم چار نوافل بھی اکٹھے پڑھ سکتے ہیں؟

سوال : نوافل کی ادائیگی کا مسئلہ ہے کہ کیا ہم چار نوافل بھی اکٹھے پڑھ سکتے ہیں؟

جواب : صحیح بخاری وغیرہ میں تہجد کے بیان میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے « كَانَ يُصَلِّي أَرْبَعًا » کہ نبی ﷺ چار رکعات پڑھتے تھے۔[1] اور ظہر کے فرض سے پہلے بھی صحیح بخاری میں چار رکعات کی تصریح ہے۔[2]

اس سے معلوم ہوا کہ چار نوافل اکٹھے پڑھنے کا جواز ہے۔ دوسری حدیث کی بناء پر اگرچہ افضل یہ ہے، کہ نوافل دو دو کرکے پڑھے جائیں۔

کیا غیر موکدہ سنتیں چھوڑنا جائز ہے؟

سوال مالکیہ کے نزدیک ایک ہی نماز کی تین غیر موکدہ سنتیں ترک کرنے سے نماز باطل ہو جاتی ہے۔ کیا اس پر فتویٰ دینا درست ہے جب کہ غیر موکدہ سنتیں چھوڑنا جائز ہے؟

جواب صحیح بخاری کتاب الزکاۃ کے آغاز میں حدیث الاعرابی کے تحت امام قرطبی رحمہ اللہ مالکی رقمطراز ہیں:

> ''یہ حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے، کہ نفلی کام ترک کرنے جائز ہیں۔ لیکن ہمیشہ سنتوں کا چھوڑنا دین میں نقص کا باعث ہے، جب کہ انہیں کم تر سمجھ کر اور بے رغبتی سے چھوڑنے والا آدمی

---

① صحیح البخاری، بَابُ قِيَامِ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِاللَّيْلِ فِي رَمَضَانَ وَغَيْرِهِ، رقم: ۱۱۴۷

② صحیح البخاری، بَابُ الرَّكْعَتَيْنِ قَبْلَ الظُّهْرِ، رقم: ۱۱۸۲، سنن الترمذی، بَابُ مَا جَاءَ فِي الصَّلَاةِ عِنْدَ الزَّوَالِ، رقم: ۴۷۸

فاسق و فاجر ہے، کیونکہ اس پر نبی اکرم ﷺ سے وعید وارد ہے:

« مَن رَغِبَ عَن سُنَّتِي فَلَيسَ مِنِّي » [1]

''جو میری سنت سے بے رغبتی کرے وہ مجھ سے نہیں۔''

شروع میں صحابہ اور تابعین وغیرہ سنتوں پر اسی طرح ہمیشگی کرتے تھے۔ جس طرح وہ فرائض کا اہتمام کرتے تھے۔ دونوں کے ثواب کو غنیمت سمجھتے ہوئے ان میں تفریق نہیں کرتے تھے۔ یہ صرف فقہاءِ کرام کا طریقہ کار ہے، کہ انہوں نے یہ تفریق کر دی، کہ کس چیز کا لوٹانا واجب ہے؟ کس کا نہیں اور کس کام کا مرتکب سزا کا مستحق ہے اور کس کا نہیں؟'' [2]

مذکورہ تصریح سے یہ بات ظاہر ہو رہی ہے، کہ بعض امور کو محض ہلکا سمجھ کر ترک کر دینا نقصان دہ اور اپنے کو ہلاکت میں ڈالنا ہے۔ لہٰذا موقع اور عمل کے تقاضوں کے مطابق اگر کسی وقت ایسا فتویٰ صادر کر دیا جائے تو بظاہر گنجائش ہے۔

نفلی نماز با جماعت پڑھنے کا حکم:

سوال: کیا نفلی نمازوں کی نماز با جماعت جائز ہے؟ ہم اکثر اپنی شب بیداریوں میں درسِ قرآن وحدیث وغیرہ کے بعد دو رکعت نفلی نماز با جماعت ادا کرتے ہیں۔ اس کی شریعت میں اجازت ہے؟ میری نظر میں بخاری شریف کی ایک حدیث میں اس کی اجازت ہے؟

جواب: نفلی نماز کو با جماعت ادا کرنا درست ہے۔ ''صحیحین'' کی روایات میں جواز کی صراحت موجود ہے۔ امیر المومنین فی الحدیث امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی ''صحیح'' میں بایں الفاظ تبویب منعقد کی ہے۔

« بَابُ صَلٰوةِ النَّوَافِلِ جَمَاعَةً. ذَكَرَهُ اَنَسٌ، وَعَائِشَةُ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيهِ وَسَلَّمَ » (ج:۱، ص:۱۵۸)

یعنی ''نفلی نماز با جماعت پڑھنے کا جواز، اسے حضرت انس رضی اللہ عنہ اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے نبی کریم ﷺ سے بیان فرمایا ہے۔''

علاوہ ازیں قصۂ عتبان بن مالک رضی اللہ عنہ میں ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

«أَينَ تُحِبُّ اَن اُصَلِّيَ لَكَ مِن بَيتِكَ. قَالَ فَاَشَرتُ لَهُ اِلٰى مَكَانٍ، فَكَبَّرَ النَّبِيُّ صَلَّى

---

[1] صحيح البخاري، بَابُ التَّرغِيبِ فِي النِّكَاحِ، رقم:٥٠٦٣

[2] فتح الباري : ٣/ ٢٦٥

اللّٰهُ عَلَيهِ وَسَلَّمَ، وَصَفَّنَا خَلفَهُ. فَصَلّٰى رَكعَتَينِ »[1]

یعنی ''اے عتبان! تو کہاں پسند کرتا ہے، کہ میں تیرے گھر میں تیرے لیے (تیری وجہ سے) نماز پڑھوں؟ عتبان رضی اللہ عنہ کہتے ہیں۔ میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے گھر میں ایک جگہ کی طرف اشارہ کیا۔ پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تکبیر کہی، اور ہمیں اپنے پیچھے صف میں کھڑا کیا۔ پھر دو رکعتیں پڑھیں۔''

پھر نمازِ تراویح بھی از قسم نوافل ہے ...... نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس نماز کو چند راتیں جماعت کے ساتھ پڑھا ہے۔ اس بناء پر حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے کتاب بلوغ المرام میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی گیارہ رکعت والی روایت ''صلوة التطوع'' کے عنوان کے تحت نقل کی ہے۔ جب کہ امام بخاری رحمہ اللہ نے اسے کتاب التہجد میں ذکر کیا ہے اور بایں الفاظ باب قائم کیا ہے۔

« بَابُ قِيَامِ النَّبِيِّ ﷺ بِاللَّيلِ فِي رَمَضَانَ، وَغَيرِهِ » (ج:١، ص:١٥٤)

مذکورہ بالا دلائل سے نوافل کی باجماعت مشروعیت روزِ روشن کی طرح عیاں ہے۔ لہٰذا آپ حضرات شب بیداری میں درس کے اختتام پر نوافل باجماعت ادا کر سکتے ہوں، تو جائز ہے، لیکن اس فعل کو طریقہ مسلوکہ نہیں بنانا چاہیے۔ خطرہ ہے، کہ کہیں ابتدع کے زمرہ میں داخل نہ ہو جائے۔

نمازی ''تشہد'' کے اخیر میں ہو، اور جماعت کھڑی ہو جائے:

سوال: « اِذَا اُقِيمَتِ الصَّلٰوةُ » والی حدیث کی روشنی میں اگر ایک شخص تشہد اخریٰ میں بیٹھا ہوا ہے درود شریف اور مسنون دعا پڑھنا باقی ہے، تو اس دوران میں جماعت کھڑی ہو جاتی ہے تو کیا تشہد پڑھنے کے بعد سلام پھیر کر جماعت میں شریک ہو جائے تو کیا اُس کے نفل کامل ہوں گے یا وہ درود اور مسنون دعا پڑھ لے اسی طرح تو « اِذَا اُقِيمَتِ الصَّلٰوةُ » والی حدیث کے خلاف تو نہیں ہوگا؟

جواب: اگر کوئی نمازی ''تشہد'' کے اخیر میں ہو، اور جماعت کھڑی ہو جائے، تو اذکار کو مکمل کر کے سلام پھیر کر جماعت کے ساتھ مل جائے۔ یہ فعل حدیث « اِذَا اُقِيمَتِ الصَّلٰوةَ »[2] کے منافی نہیں، کیونکہ شرع میں نماز کا اطلاق کم از کم ایک رکعت پر ہے اور یہ کم ہے، لہٰذا جائز ہے۔ (ایضاً)

چار رکعات سنت کی آخری دو رکعتوں میں سورۃ فاتحہ کے بعد قرأت:

سوال: چار رکعات سنت میں پچھلی دو رکعتوں میں سورۃ فاتحہ کے بعد اور قرأت بھی کی جا سکتی ہے؟

[1] صحيح البخاري، بَابُ إِذَا دَخَلَ بَيتًا يُصَلِّي حَيثُ شَاءَ أَو حَيثُ أُمِرَ وَلَا يَتَجَسَّسُ، رقم: ٤٢٤

[2] مسند أحمد، رقم: ٨٦٢٣، شرح مشكل الآثار للطحاوي، رقم: ٤١٢٨، ٤١٢٩

(جواب): چار رکعات نوافل اور سنن کی صورت میں پچھلی دو رکعتوں میں سورہ فاتحہ کے علاوہ بھی سورتوں کی قرأت کا جواز ہے۔ چنانچہ ''صحیحین'' میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا بیان ہے:

« يُصَلِّي أَرْبَعًا، فَلَا تَسْئَلْ عَنْ حُسْنِهِنَّ، وَ طُولِهِنَّ . ثُمَّ يُصَلِّي أَرْبَعًا. فَلَا تَسْئَلْ عَنْ حُسْنِهِنَّ، وَ طُولِهِنَّ »[1]

یعنی رسول اللہ ﷺ پہلے چار رکعت پڑھتے ان کی کیفیت کے متعلق کچھ نہ پوچھو۔ کتنی اچھی اور کتنی لمبی ہوتی تھیں۔ پھر اس کیفیت کے ساتھ چار رکعت اور پڑھتے۔

ظاہر ہے چار رکعت لمبی تب ہی ہوں گی، جب فاتحہ کے ساتھ مزید سورتوں کو ملایا جائے۔

فرض اور سنتوں کی ادائیگی میں وقفہ:

(سوال): میں دکان بند کر کے ظہر کی نماز کے لیے مسجد میں جاتا ہوں فرض نماز ادا کرنے کے بعد سنتیں دکان پر ادا کرنے کے لیے آ جاتا ہوں اور راستے میں کھانا کھانے کے بعد دکان پر آتا ہوں۔ بعض اوقات گاہکوں کو ادویات دینے کے بعد سنتوں کی ادائیگی کرتا ہوں یعنی فرض نماز اور سنتوں کی ادائیگی میں آدھ گھنٹے سے ایک گھنٹے تک کا وقفہ ہو جاتا ہے جواب طلب بات یہ ہے کہ کیا ایسا کرنا جائز ہے یا پہلے سنتیں ادا کروں اور پھر کھانا کھاؤں۔ یعنی فرضوں اور سنتوں میں زیادہ لمبا وقفہ نہ کروں یا پھر سنتیں مسجد میں ہی ادا کر آؤں۔ (جب کہ افضل یہ ہے کہ سنتیں اور نفل گھروں (دکانوں) میں ادا کریں) اور بعض اوقات مسجد میں جاتے ہی جماعت کھڑی ہو جاتی ہے اس طرح پہلی چار سنتیں بھی رہ جاتی ہیں۔ ان کو بھی ادا کرنا ہوتا ہے تو کیا ایسا معمول بناء لینا درست ہے۔؟ جواب تفصیل سے دیں۔

(جواب): عام حالات میں فرض اور سنتوں کی ادائیگی میں زیادہ وقفہ نہیں ہونا چاہیے۔ کسی وقت ہو جائے تو کوئی حرج نہیں، کوشش کریں کہ دکان پر پہلے سنتیں پڑھیں۔ پھر کھانا کھائیں یا پھر مسجد میں ہی پڑھ لیا کریں۔ پہلی سنتیں کسی وقت رہ جائیں، تو بعد میں ادا ہو سکتی ہیں لیکن عادت نہیں بنانی چاہیے کیونکہ اصل ان کا محل پہلے ہی ہے۔ اذان سنتے ہی کاروبارِ زندگی چھوڑ دیا کریں اسی میں خیر و برکت ہے۔

سنن ابوداؤد باب «لَغْوِ الْيَمِينِ» کے تحت ابراہیم الصائغ کے بارے میں لکھا ہے:

« كَانَ إِذَا رَفَعَ الْمِطْرَقَةَ فَسَمِعَ النِّدَاءَ سَيَّبَهَا »[2]

---

[1] صحيح البخاري، بَابُ فَضْلِ مَنْ قَامَ رَمَضَانَ، رقم: ٢٠١٣، صحيح مسلم، بَابُ صَلَاةِ اللَّيْلِ، وَعَدَدِ رَكَعَاتِ النَّبِيِّ ﷺ فِي اللَّيْلِ ......الخ، رقم: ٧٣٨

[2] عون المعبود: ٣/٢٤٢

''وہ ہتھوڑا چلاتے اذان سن کر فوری چھوڑ دیتے تھے۔''

آپ کو بھی ایسا ہی کرنا چاہیے۔ ﴿ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِيْنُ ﴾(الذاریات:۵۸) کوشش کریں کہ سنتیں دکان پر دلجمعی سے ادا کریں۔ کمی کوتاہی اللہ معاف کردے گا۔(ان شاء اللہ) ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَ اِنِّيْ لَغَفَّارٌ لِّمَنْ تَابَ وَ اٰمَنَ وَ عَمِلَ صَالِحًا ثُمَّ اهْتَدٰى ﴾ (طٰهٰ:۸۲)

سنتوں میں چار کی نیت کے بعد دو رکعات پر سلام پھیرنا:

سوال: نوافل اور سنتیں دو دو کر کے پڑھنا افضل ہے۔ ایک نمازی نے چار کی نیت سے ظہر کی سنتیں شروع کر دیں، لیکن دورانِ نماز خیال آیا، کہ وقت تھوڑا ہے، دو ہی پڑھ لوں یا اس کے برعکس بھی۔ کیا یہ درست ہے؟ اس میں حرج تو نہیں؟

جواب: نوافل اور سنتیں دو دو کر کے پڑھنا افضل ہے چار کا صرف جواز ہے۔ چنانچہ ''صلوٰۃ التراویح'' کے سلسلے میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا بیان ہے:« يُصَلِّي اَرْبَعًا »[1] ''آپ ﷺ چار رکعات پڑھا کرتے تھے۔''

اس طرح ظہر سے قبل بھی تصریح ہے، کہ «اَنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ لَا يَدَعُ اَرْبَعًا قَبْلَ الظُّهْرِ »[2]

لیکن شیخ ابن باز رحمہ اللہ نے چار کے عدد کو حدیث «صَلٰوةُ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ مَثْنٰى، مَثْنٰى »[3] کی بناء پر دو دو رکعت پر محمول کیا ہے، جو ظاہر کے خلاف ہے۔ (واللہ اعلم)

نوافل میں نیت عام حالات میں تبدیل نہیں کرنی چاہیے البتہ کوئی عارضہ پیش آجائے، تو پھر جواز ہے۔

فرض پڑھنے کے بعد سنتوں کی قضاء پڑھنے کا حکم:

سوال: جمعہ یا کسی اور فرض نماز کی مؤکدہ سنتیں پڑھنے والے نے اقامت کی آواز سن کر نماز توڑ دی اور جماعت میں شریک ہو گیا۔ فرض پڑھنے کے بعد ان سنتوں کی قضاء پڑھنے کی کیا تاکید ہے؟

جواب: بالاصورت میں قضاء دینی چاہیے۔ صحیح احادیث سے یہ بات ثابت ہے، کہ نبی ﷺ نے ظہر کی بعد والی دو رکعتوں کی قضاء عصر کے بعد دی۔ شرح مسلم میں امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

« وَ مِنْهَا أَنَّ السُّنَنَ الرَّاتِبَةَ إِذَا فَاتَت يُسْتَحَبُّ قَضَائُهَا. وَ هُوَ الصَّحِيحُ عِنْدَنَا.»

---

[1] صحیح البخاری، بَابُ فَضْلِ مَنْ قَامَ رَمَضَانَ، رقم:۲۰۱۳، صحیح مسلم، بَابُ صَلَاةِ اللَّيْلِ، وَعَدَدِ رَكَعَاتِ النَّبِيِّ ﷺ فِي اللَّيْلِ......الخ ،رقم:۷۳۸)

[2] صحیح البخاری، بَابُ الرَّكْعَتَيْنِ قَبْلَ الظُّهْرِ، رقم:۱۱۸۲

[3] سنن الترمذی، بَابٌ: أَنَّ صَلَاةَ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ مَثْنَى مَثْنَى ،رقم:۵۹۷

طیبی ''شرح مشکوۃ'' میں فرماتے ہیں:

« فِي الحَدِيثِ دَلَالَةٌ عَلٰی اَنَّ النَّوَافِلَ المَؤَقَّتَةَ تُقضٰی، كَمَا تُقضٰی الفَرَائِضُ.»

اور زینی شرح المصابیح میں فرماتے ہیں:

« اِنَّ مِنَ السُّنَّةِ اَنَّ النَّافِلَةَ المُوقَّتَةَ تُقضٰی كَمَا تُقضٰی الفَرَائِضُ.»

اور امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے "منتقى الاخبار" میں تبویب قائم کی ہے، کہ فوت شدہ سنن مؤکدہ کی قضاء (مشروع) ہے۔

سنت مؤکدہ کی قضاء دینی چاہیے یا نہیں؟

سوال: فرض نماز سے پہلے سنتِ مؤکدہ پڑھ رہے ہوں اور اقامت کی آواز سن کر نماز توڑ دیں تو بعد میں توڑی ہوئی سنت مؤکدہ کی قضاء دینی چاہیے یا نہیں؟

جواب: سنتوں کی قضا جائز بلکہ مستحسن ہے۔ چنانچہ ''سنن ابن ماجہ'' میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے:

« كَانَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا فَاتَتْهُ الْاَربَعُ قَبلَ الظُّهرِ، صَلَّاهَا بَعدَ الرَّكعَتَينِ، بَعدَ الظُّهرِ »[1]

''رسول اللہ ﷺ سے ظہر کی پہلی چار رکعتیں جب فوت ہو جاتیں، تو ظہر کی دو رکعتوں کے بعد آپ ان کو پڑھتے۔''

لہٰذا مؤکدہ سنتوں کی قضاء کو ہی معمول بنانا چاہیے۔ مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو! كِتَاب: إعلَامُ اَهلِ العَصرِ بِاَحكَامِ رَكعَتَي الفَجرِ.

کیا نبی کریم ﷺ فجر سے قبل دو سنتیں اور عصر کے بعد دو رکعتیں پڑھا کرتے تھے؟

سوال: بخاری شریف کی یہ حدیث کہ ''نبی پاک ﷺ دو رکعت فجر سے پہلے اور دو رکعت عصر کے بعد کبھی نہیں چھوڑتے تھے؟ کیا بخاری میں یہ حدیث آتی ہے؟

جواب: مشارٌ الیہ حدیث صحیح بخاری کے (بَابُ مَا يُصَلِّى بَعدَ العَصرِ مِنَ الفَوَائِتِ وَ نَحوِهَا) کے تحت بیان ہوئی ہے۔

---

[1] سنن ابن ماجه، بَابُ مَن فَاتَتهُ الأَربَعُ قَبلَ الظُّهرِ، رقم:۱۱۵۸

نمازِ تراویح کے احکام و مسائل

آٹھ رکعت تراویح پر زیادہ نوافل کا حکم:

سوال ہماری مسجد اہل حدیث میں ہمارے واجب الاحترام امام صاحب اور دوسرے اہل حدیث بھائی رمضان المبارک کے آخری عشرے کی طاق راتوں میں گیارہ رکعت نمازِ تراویح کے علاوہ باجماعت نوافل ادا کرتے ہیں۔ کتاب وسنت کی روشنی میں درج ذیل امور پر روشنی ڈال کر عنداللہ ماجور ہوں:

۱۔ باجماعت نوافل ادا کیے جا سکتے ہیں یا نہیں؟

۲۔ صورتِ مسئولہ میں گیارہ رکعت سے زاید جماعت نوافل ادا کیے جا سکتے ہیں۔

۳۔ بعض اہل حدیث بھائی امام محترم کے ان نوافل پڑھانے کی وجہ سے ان کے پیچھے نمازِ فرض ادا نہیں کرتے، کیا ان کا یہ اقدام درست ہے؟

۴۔ اگر جماعت میں اختلاف اور فتنہ کا ڈر ہو تو امام محترم کو ان نوافل کو چھوڑ دینا چاہیے یا نہیں؟

جواب اَقُوْلُ وَ بِاللّٰہِ التَّوْفِیْقِ جہاں تک نفلی نماز کی باجماعت ادائیگی کا تعلق ہے، اس سلسلہ میں صحیح بخاری ومسلم وغیرہ کی روایات میں جواز کی صراحت موجود ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے بایں الفاظ تبویب قائم کی ہے: «بَابُ صَلٰوةِ النَّوَافِلِ جَمَاعَةً ذَکَرَہُ اَنَسٌ وَّ عَائِشَةُ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ» یعنی نفلی نماز باجماعت پڑھنے کا جواز، اسے حضرت انس رضی اللہ عنہ اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے بیان فرمایا ہے۔'' (جلد اوّل ۱۵۸)

علاوہ ازیں قصہ عتبان بن مالک رضی اللہ عنہ میں ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

'اَیْنَ تُحِبُّ اَنْ اُصَلِّیَ لَكَ مِنْ بَیْتِكَ قَالَ فَاَشَرْتُ لَهٗ اِلٰی مَکَانٍ فَکَبَّرَ النَّبِیُّ صلی اللہ علیہ وسلم وَ صَفَّنَا خَلْفَهٗ فَصَلّٰی رَکْعَتَیْنِ' (ج:۱، ص ۶۰)[1]

''یعنی اے عتبان، تو کہاں پسند کرتا ہے کہ میں تیرے گھر میں تیرے لیے (تیری وجہ سے) نماز پڑھوں؟ عتبان رضی اللہ عنہ کہتے ہیں میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے گھر میں ایک جگہ کی طرف اشارہ کیا۔ پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تکبیر کہی اور ہمیں اپنے پیچھے صف میں کھڑا کیا۔ پھر دو رکعتیں پڑھیں!''

نمازِ راویح بھی از قسم نوافل ہے۔ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس نماز کو چند راتیں جماعت کے ساتھ پڑھا

---

(1) (صحیح البخاری، بَابُ إِذَا دَخَلَ بَیْتًا یُصَلِّی حَیْثُ شَاءَ أَوْ حَیْثُ أُمِرَ وَلَا یَتَجَسَّسُ، رقم: ٤٢٤

ہے۔اسی بنا پر امام ابن حجر رحمہ اللہ نے بلوغ المرام میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی گیارہ رکعت والی روایت «صَلٰوۃُ التَّطَوُّعِ» کے عنوان کے تحت نقل کی ہے، جب کہ امیر المومنین فی الحدیث، امام بخاری رحمہ اللہ نے اسے «کِتَابُ التَّھَجُّد» میں ذکر کیا ہے اور بایں الفاظ باب منعقد کیا ہے:

«بَابُ قِیَامِ النَّبِیِّ ﷺ بِاللَّیْلِ فِیْ رَمَضَانَ وَغَیْرِہٖ» (۱/۱۵٤)

واضح ہو کہ تراویح، تہجد، قیام اللیل، صلوٰۃ اللیل چاروں ایک ہی نماز کے مختلف نام ہیں۔تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: انوارِ مصابیح ص:۹۰۔اگر چہ ماہِ رمضان میں تراویح کی جماعت کا اہتمام خاص ہے جو عام حالات سے استثنائی شکل ہے، تاہم مذکورہ بالا دلائل سے نوافل کی باجماعت مشروعیت روزِ روشن کی طرح عیاں ہے۔آپ ﷺ نے اس کی جماعت کو صرف فرضیت کے ڈر سے ترک کیا تھا۔

آپ ﷺ نے فرمایا تھا:«اِنِّیْ خَشِیْتُ اَنْ یُّکْتَبَ عَلَیْکُمْ» [1] ''یعنی مجھے خطرہ لاحق ہوا کہ کہیں یہ نماز تم لوگوں پر فرض نہ ہو جائے۔'' [2]

اپ ﷺ کے انتقال سے چونکہ وحی کا سلسلہ منقطع ہو گیا اور فرضیت کا متوقع خدشہ زائل ہو گیا۔لہٰذا حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اسی مسنون کام کو نئے سرے سے دوبارہ شروع کر دیا۔اس پر بدعت کا اطلاق صرف لغوی اعتبار سے ہے۔اصطلاحی اعتبار سے نہیں!

پھر یہ بات بھی مسلّم ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے ان چند رتوں میں وتر کے علاوہ آٹھ رکعات پڑھائی تھیں۔اسی بناء پر اہل علم کا کہنا ہے کہ مسنون رکعات صرف آٹھ ہیں۔

۲۔ باقی رہا یہ مسئلہ کہ اگر کوئی آٹھ سے زائد پڑھنا چاہے تو اس کا کیا حکم ہے؟

تو اس سلسلہ میں اہل علم کے مشہور دو قول ہیں:

(۱) آٹھ سے زیادہ مطلقاً ناجائز۔

(۲) آٹھ رکعت سے زائد عام نوافل کی حیثیت میں جائز ہیں، کوئی حرج نہیں۔جو لوگ مطلقاً آٹھ رکعات سے زائد کے ناجائز ہونے کے قائل ہیں۔

ان کا استدلال حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے ان الفاظ سے ہے:«مَا کَانَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ یَزِیْدُ فِیْ رَمَضَانَ وَ لَا فِیْ غَیْرِہٖ عَلٰی اِحْدٰی عَشَرَۃَ رَکْعَۃً» ''رسول اللہ ﷺ چاہے رمضان کا مہینہ ہو یا

---

[1] صحیح ابن حِبّان، ذِکْرُ خَبَرٍ سَادِسٍ یَدُلُّ عَلَی أَنَّ الْوِتْرَ غَیْرُ فَرْضٍ، رقم:۲٤۱۵

[2] صحیح البخاری، بَابُ تَحْرِیضِ النَّبِیِّ ﷺ عَلَی صَلاَۃِ اللَّیْلِ وَالنَّوَافِلِ مِنْ غَیْرِ إِیجَابٍ، رقم۱۱۲۹

غیر رمضان، گیارہ رکعتوں سے زیادہ نہیں پڑھتے تھے۔''[1]

لیکن یہ حصر غیر دائمی ہے، اس لیے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ہی کی دوسری روایت میں تیرہ رکعتوں کا تذکرہ بھی موجود ہے۔ مزید آنکہ کبھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم چار چار رکعتیں، ایک سلام سے پڑھتے، جیسے اس حدیث سے ظاہر ہے اور کبھی دو دو رکعتوں پر سلام پھیرتے۔ کئی ایک اہل علم کے نزدیک یہ دوسری صورت افضل ہے اور پہلی صورت جائز!۔

اسی طرح کبھی وتر کی تین رکعتیں ایک ہی سلام سے پڑھتے اور کبھی دو سلام سے۔[2]

یعنی رمضان کے آخری عشرہ میں بنسبت پہلے دھاکوں کے آپ صلی اللہ علیہ وسلم عبادت میں بہت زیادہ منہمک

---

① صحیح مسلم، بَابُ صَلَاةِ اللَّيلِ، وَعَدَدِ رَكَعَاتِ النَّبِيِّ ﷺ......الخ، رقم:۷۳۶، ابوداؤد، بَابٌ فِي صَلَاةِ اللَّيلِ، رقم:۱۳۳۶، سنن ابن ماجه، بَابُ مَا جَاءَ فِي كَم يُصَلِّي بِاللَّيلِ، رقم:۱۳۵۸

② حضرت الاستاذ محدث روپڑی رحمہ اللہ اپنی کتاب ''اہلحدیث کے امتیازی مسائل'' کے صفحہ:۹۷،۹۸ پر رقمطراز ہیں: ''اب ان سب کے ملانے سے یہ مسئلہ نکلتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تراویح یا تہجد جو کچھ تھی یہی تھی، کیونکہ عشاء سے فجر تک ساری نماز، رمضان غیر رمضان کی یہی ہے۔ یہاں تک کہ بعض روایتوں میں فجر کی سنتیں بھی شامل کرلی ہیں۔ اگر محض تہجد بتلانی مقصود ہوتی تو فجر کی سنتوں کی ضرورت نہ تھی، ہاں شاذ و نادر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فجر کی سنتوں کے بغیر بھی تیرہ پڑھی ہیں اور اخیر عمر میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کمزوری کی وجہ سے گیارہ سے بھی کم کردی تھیں۔ مگر اکثری حالت رمضان، غیر رمضان میں گیارہ کی تھی۔ اس لیے گیارہ ہی پر اکتفاء کیا۔ اسی طرح حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ مجھے معلوم نہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی رات صبح تک قیام کیا ہو؟ اور حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ ایک ہی آیت میں صبح کردی۔'' چنانچہ یہ دونوں روایتیں مشکوٰۃ میں موجود ہیں۔ اور بعض ایسی اور بھی ہیں۔ تو ان میں بھی موافقت کی یہی صورت ہے کہ شاذ و نادر ہی آپ صلی اللہ علیہ وسلم صبح تک جاگے ہیں۔ ورنہ اکثری حالت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہی تھی کہ کچھ سوتے اور کچھ جاگتے۔ اس قسم کے واقعات کی مثال ایسی ہے جیسے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سارا شعبان روزے رکھتے تھے اور دوسری روایت میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ہی سے آیا ہے کہ رمضان کے سوا کسی ماہ کے سارے روزے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں رکھے۔ تو علماء نے ان دونوں حدیثوں میں موافقت (یوں) کی ہے کہ شعبان کے چونکہ بہت تھوڑے دن (آپ صلی اللہ علیہ وسلم) افطار کرتے تھے، اس لیے پہلی روایت میں مبالغہ کے لیے کہہ دیا کہ سارا شعبان روزے رکھتے تھے۔ ورنہ درحقیقت رمضان کے سوا کسی مہینہ کے سارے روزے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں رکھے۔ ملاحظہ ہو، ترمذی، ص:۱۳۰، بَابُ مَا جَاءَ فِي وِصَالِ شَعْبَانَ بِرَمَضَانَ۔

پھر استاذی المکرّم نے صفحہ ۱۰۴ پر لکھا ہے: ''پس ثابت ہوا کہ اصل تراویح آٹھ ہی ہیں۔ ہاں اگر کوئی نوافل زیادہ پڑھنا چاہے تو اس پر کوئی انکار نہیں، بلکہ خیر قرون میں بیس سے زیادہ پڑھی گئی ہیں۔'' (رواہ احمد و مسلم)

رہتے۔'' دوسری روایت میں ہے:«كَانَ اِذَا دَخَلَ الْعَشْرُ الاَوَاخِرَ اَحْيَا اللَّيْلَ وَ اَيْقَظَ اَهْلَهٗ وَ شَدَّ الْمِئْزَرَ» (متفق علیه) [1] یعنی ''حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں جب رمضان کا آخری عشرہ آجاتا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم ساری رات خود بھی جاگتے، اپنے اہل کو بھی بیدار رکھتے اور عبادت میں مصروف رہتے۔''

تیسری روایت میں ہے:

«فَاَعِنِّیْ عَلٰی نَفْسِكَ بِكَثْرَةِ السُّجُوْدِ» [2] یعنی نوافل کثرت سے پڑھ۔''

ان احادیث سے دوسرے گروہ کے لیے استدلال ہوسکتا ہے کہ آٹھ رکعات تراویح کے علاوہ عام نوافل کی حیثیت سے اضافہ کا کوئی حرج نہیں۔ زائد رکعات کی کوئی حد بندی نہیں، جس طرح کہ جمعہ سے پہلے نوافل کی کوئی حد بندی نہیں:«فَصَلّٰی مَا كُتِبَ لَهٗ» [3] اسی بناء پر سلف صالحین سے مختلف عدد منقول ہیں۔ اور جو انتالیس تک بیان کیے جاتے ہیں۔ اسی لیے یہ کہنا درست ہے کہ آٹھ رکعت مسنون ہیں اور مذکورہ نصوص کی بناء پر مزید پر جواز کا اطلاق ہے۔ نہ کہ سنیت کا۔ اس کے باوجود احتیاط کا تقاضا یہی ہے کہ مسنون رکعت پر اکتفاء کی جائے اور قیام اللیل کو لمبا کردیا جائے۔ چنانچہ ایک موقعہ پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا گیا کہ کونسی نماز افضل ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس کا قیام لمبا ہے۔'' [4]

۳۔ صرف اس فعل کی بنا پر امام مذکور کی اقتداء میں فرض نماز ادا نہ کرنا غیر درست ہے۔

۴۔ امام صاحب کے اس فعل سے اگر فتنہ کا ڈر ہو تو انھیں وہی کردار ادا کرنا چاہیے جو رحمتِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے خانہ کعبہ کی ترمیم کے سلسلہ میں ادا کیا تھا۔ یعنی عزم کے باوجود بناء کعبہ میں تصرف کا ارادہ ترک کردیا اور فرمایا:

«يَا عَائِشَةُ لَوْ لَا اَنَّ قَوْمَكِ حَدِيْثٌ عَهْدِهِمْ قَالَ ابْنُ الزُّبَيْرِ بِكُفْرٍ لَنَقَضْتُ الْكَعْبَةَ فَجَعَلْتُ لَهَا بَابَيْنِ» [5]

یعنی اے عائشہ رضی اللہ عنہا! اگر تیری قوم نئی نئی مسلمان نہ ہوئی ہوتی ...... ابن الزبیر نے کہا، یعنی کفر سے

---

[1] صحیح البخاری، بَابُ العَمَلِ فِي العَشْرِ الأَوَاخِرِ مِنْ رَمَضَانَ، رقم:٢٠٢٤، صحیح مسلم، بَابُ الِاجْتِهَادِ فِي الْعَشْرِ الْأَوَاخِرِ مِنْ شَهْرِ رَمَضَانَ، رقم:١١٧٤

[2] صحیح مسلم، بَابُ فَضْلِ السُّجُودِ وَالْحَثِّ عَلَيْهِ، رقم:٤٨٩

[3] صحیح البخاری، بَابٌ: لاَ يُفَرِّقُ بَيْنَ اثْنَيْنِ يَوْمَ الجُمُعَةِ، رقم:٩١٠

[4] صحیح مسلم، بَابُ أَفْضَلُ الصَّلَاةِ طُولُ الْقُنُوتِ، رقم:٧٥٦، سنن ابن ماجه، رقم:١٤٢١

[5] صحیح مسلم، بَابُ نَقْضِ الْكَعْبَةِ وَبِنَائِهَا، رقم:١٣٣٣

اسلام میں نئی نئی داخل نہ ہوئی ہوتی، تو میں کعبہ کے دو دروازے بنا دیتا!''

اس پر امام بخاری رحمہ اللہ نے بایں الفاظ تبویب قائم کی ہے:

«بَابُ مَنْ تَرَكَ الْاِخْتِيَارِ مَخَافَةَ اَنْ يَّقْصُرَ فَهْمُ النَّاسِ فَيَقَعُوْا فِيْ اَشَدَّ مِنْهُ» (ج:۱،ص:۲٤)

یعنی بعض ایسی چیزوں کو چھوڑ دینے کا باب، جو لوگوں کی سمجھ نہ آ سکنے کی بناء پر ان کے لیے فتنہ کا باعث بن جائیں۔''

رہے مقتدی، تو ان کو چاہیے کہ اپنے لیے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے فعل کو نمونہ بنائیں، جب کہ خلیفۂ ثالث حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے منیٰ میں رباعی (چار رکعتی) نماز کو قصر کی بجائے مکمل پڑھا تو حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے اس مقام پر قصر کے قائل ہونے کے باوجود حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی اقتداء میں نماز مکمل پڑھی۔ لیکن فرمایا: «فَلَيْتَ حَظِّيْ مِنْ اَرْبَعِ رَكَعَاتٍ رَكْعَتَانِ مُتَقَبَّلَتَانِ» [1] یعنی ''کاش، میرا حصہ یہ ہو کہ چار رکعات میں سے میری دو رکعات ہی قبول ہوں۔'' اس پر کسی نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ یہ کیوں؟ آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: «اَلْخِلَافُ شَرٌّ» [2] ''اختلاف بری شئے ہے۔''

اسی کے مشابہ قصہ، صحیح بخاری، میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے بھی منقول ہے۔ [3]، حالانکہ آپ رضی اللہ عنہ کا یہ عقیدہ تھا کہ: «صَلٰوةُ الْمُسَافِرِ رَكْعَتَانِ مَنْ خَالَفَ السُّنَّةَ كَفَرَ» ''مسافر کی نماز دو رکعتیں ہی ہے۔ جس نے سنت کی مخالفت کی، اس نے کفر کیا۔''

پس ان واقعات کی روشنی میں امام و مقتدی، دونوں ہی کو اس مسئلہ پر شدت اختیار نہ کرتے ہوئے اختلاف سے باز رہنا چاہیے۔ دعا ہے اللہ تعالیٰ جملہ مسلمانوں میں اتفاق و اتحاد پیدا فرمائے۔ آمین هٰذَا مَا عِنْدِيْ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِالصَّوَاب

ائمہ اربعہ اور آٹھ رکعت نمازِ تراویح:

سوال: ائمہ اربعہ میں سے کس کس کے نزدیک آٹھ رکعت تراویح پڑھنا ہی درست ہے؟

جواب: حضرت امام مالک رحمہ اللہ نے اپنے لیے آٹھ رکعت تراویح کو پسند فرمایا ہے۔ [4]

---

① صحيح البخاري،بَابُ الصَّلَاةِ بِمِنًى،رقم:١٠٨٤

② سنن أبي داؤد،بَابُ الصَّلَاةِ بِمِنًى،رقم:١٩٦٠)

③ صحيح البخاري،بَابُ الصَّلَاةِ بِمِنًى،رقم:١٠٨٤

④ المصابيح فى صلاة التراويح، لعلامه جلال الدين سيوطى

رکعات تراویح کی تعداد:

سوال: ماہ رمضان کے آتے ہی آٹھ اور بیس کا جھگڑا کھڑا ہو جاتا ہے خصوصاً جن مساجد میں اہلِ حدیث اور احناف مل جل کر نماز پڑھتے ہیں۔ دونوں طرف سے دلائل دیے جاتے ہیں لیکن مانتا کوئی نہیں کہا جاتا ہے کہ نوافل پر کوئی پابندی نہیں۔ بیس رکعت اس طرح پڑھ لی جائیں کہ آٹھ رکعت سنت اور باقی نفل کیا یہ درست ہے۔ کیا نوافل کی تعداد اس طرح مقرر کر لینا کہ نہ ان میں کمی کی جائے نہ زیادتی تو کیا وہ نفل ہی رہیں گے ان کی حیثیت فرائض یا سنت کی ہو جائے گی۔ مسجد نبوی ﷺ اور بیت اللہ میں بھی۔ ۲۰ رکعت تراویح پڑھی جاتی ہیں جو دو امام پڑھاتے ہیں۔

ان کا کہنا یہ ہے کہ جب ہم اس کے دو حصے کرتے ہیں تو پھر ان کی حیثیت سنت کی نہیں رہتی بلکہ یہ نوافل بن جاتے ہیں۔ صرف احناف ہی ۲۰ رکعت تراویح سنت کر کے پڑھتے ہیں۔ برائے مہربانی سب پہلوؤں پر روشنی ڈالیں۔ جزاکم اللہ احسن الجزاء۔

جواب: اصل یہ ہے کہ نمازِ تراویح صرف آٹھ رکعات ہیں۔ چنانچہ صحیح بخاری میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت میں تصریح موجود ہے کہ:

« مَا كَانَ يَزِيدُ فِي رَمَضَانَ وَ لَا فِي غَيْرِهِ عَلٰى اِحدَى عَشَرَةَ رَكعَةً »[1]

''نبی ﷺ رمضان اور غیر رمضان میں گیارہ رکعات (وِتر سمیت) سے زیادہ نہیں پڑھتے تھے۔''

اور حافظ ابن حجر رحمہ اللہ رقمطراز ہیں:

« وَ اَمَّا مَا رَوَاهُ اِبنُ اَبِي شَيبَةَ مِن حَدِيثِ ابنِ عَبَّاسَ كَانَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ يُصَلِّي فِي رَمَضَانَ عِشرِينَ رَكعَةً وَالوِترَ فَاِسنَادُهُ ضَعِيفٌ وَ قَد عَارَضَهُ حَدِيثُ عَائِشَةَ هٰذَا الَّذِي فِي الصَّحِيحَينِ مَعَ كَونِهَا اَعلَمَ بِحَالِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَيلًا مِن غَيرِهَا » وَاللّٰهُ أَعلَمُ.[2]

حاصل یہ کہ بیس رکعت والی روایت ضعیف ہے اور آٹھ والی صحیح ہے۔

باقی رہا آٹھ سے زائد بطورِ نوافل پڑھنے کا مسئلہ، جائز تو ہے لیکن آپ ان کے ساتھ اس طرح شریک نہ ہوں کہ دیکھنے والے کو شبہ ہو کہ شاید یہ بھی بیس کی سنیت کے اعتقاد سے پڑھ رہے ہیں۔ بہتر ہے کہ آٹھ

---

[1] صحيح البخاري، بَابُ فَضلِ مَن قَامَ رَمَضَانَ، رقم:٢٠١٣

[2] فتح الباري:٤/٢٥٤

سے فارغ ہو کر آپ گھر لوٹ جائیں۔

اور جہاں تک ائمہ حرمین کے عمل کا تعلق ہے۔ سو اس کی بنیاد غالباً مطلق نوافل پر ہے۔ اس لیے رمضان کے آخری عشرہ میں قیام اللیل کے نام پر رکعات میں اضافہ کر لیا جاتا ہے۔

یاد رہے سعودی عرب کی کئی ایک مسجدوں میں آٹھ رکعات کا بھی اہتمام ہوتا ہے۔ بالخصوص وہ مسجد جس میں سعودی عرب کے مفتی اعظم سماحۃ الشیخ ابن باز رحمہ اللہ تراویح کا اہتمام کرتے ہیں۔

مسئلہ ہذا پر رکعات تراویح اور تعامل صحابہ اور آٹھ رکعات سے زائد نوافل کا کیا حکم ہے؟ بالتفصیل میرے فتوے ماہنامہ ''محدث'' لاہور میں عرصہ سے چھپے ہوئے ہیں ان کی طرف مراجعت مفید ہے۔

اور بطورِ تصنیف لطیف ''انوار مصابیح'' مؤلفہ مولانا نذیر احمد رحمہ اللہ کا مطالعہ فرمائیں۔ موضوع ہذا پر منفرد تالیف ہے۔ محقق مؤلف نے واقعی ناقدانہ نظر سے بحث مباحث کا حق ادا کر دیا۔ جزاہ اللہ احسن الجزاء و جعل الجنۃ مثواہ۔

بیس رکعت تراویح پڑھنے والوں کے پیچھے آٹھ رکعت تراویح:

سوال: زید اہلِ حدیث مسلک سے تعلق رکھتا ہے لیکن بعض مجبوریوں کے باعث بیس رکعت تراویح پڑھنے والوں کے پیچھے آٹھ رکعت تراویح پڑھتا ہے حل طلب مسائل درج ذیل ہیں:

۱۔ اپنی مجبوری کے باعث اس کو ایسا کرنا صحیح ہے؟

۲۔ وہ شروع کی آٹھ رکعت با جماعت ادا کرے یا اخیر کی یا درمیان میں جہاں سے چاہے جماعت میں شامل ہو کر آٹھ پوری کر لے؟

۳۔ کیا وہ اپنی مجبوری کے باعث جماعت چھوڑ کر تنہا کسی طرف اپنی الگ تراویح ادا کر سکتا ہے؟

جواب: بوقتِ ضرورت مرقوم تمام امور کا جواز ہے۔ البتہ الگ پڑھنے کی صورت میں بہتر ہے گھر جا کر پڑھے کیونکہ نفلی نماز گھر میں پڑھنا افضل ہے۔

کیا بیس رکعت تراویح وہاں پڑھانا سنت ہے یا کہ نہیں؟

سوال: ماہِ رمضان المبارک کے دوران خانہ کعبہ کی مسجد حرام اور مدینہ منورہ کی مسجد نبوی میں وہاں کے امام صاحبان بیس رکعت تراویح پڑھاتے ہیں۔ کیا بیس رکعت تراویح وہاں پڑھانا سنت ہے یا کہ نہیں؟ اگر سنت نہیں ہے تو پھر وہاں آٹھ کی بجائے بیس تراویح کیوں پڑھی جاتی ہیں؟

جواب: نمازِ تراویح مسنون صرف آٹھ رکعات ہیں جس طرح کہ ''صحیحین'' میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت میں تصریح ہے۔ [1] حرمین شریفین میں اس پر اضافہ صرف عام نوافل کی حیثیت سے کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ رمضان کے آخری عشرہ میں اور رات کے آخری حصہ میں آٹھ رکعات کا مزید اضافہ کر لیتے ہیں۔

ان کا یہ عمل عمومی احادیث کی بناء پر ہے، جن میں مطلقاً نفلی نماز پڑھنے کی ترغیب وارد ہے۔ اس کے باوجود ہمارے نزدیک أقرب إلی الصواب (سب سے صحیح) بات یہ ہے، کہ صرف آٹھ رکعات پر اکتفاء کیا جائے جس طرح کہ حدیث عائشہ رضی اللہ عنہا میں وضاحت ہے۔ [2]

مسئلہ ہذا پر میرا ایک تفصیلی فتویٰ ماہنامہ محدث میں کئی سال پہلے بعنوان رکعات تراویح میں سنت نبوی اور تعامل صحابہ شائع ہو چکا ہے۔ جو سولہ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں مختلف اعتراضات کا بھی خوب جائزہ لیا گیا ہے اور کتاب "أنوار المصابیح" بھی لائقِ مطالعہ ہے۔ جو نامور محقق مولانا نذیر احمد مرحوم کا عظیم شاہکار ہے۔

ثواب کی نیت سے بیس تراویح پڑھنے میں کوئی حرج تو نہیں؟

سوال: مسجدِ حرام میں بیس تراویح باجماعت ادا کی جاتی ہیں۔ انسان اگر ثواب کی نیت سے بیس تراویح پڑھ لے تو اس میں کوئی حرج تو نہیں؟

جواب: سُنّیت کے اعتقاد سے صرف آٹھ تراویح ہیں۔ عام نوافل کی حیثیت سے انسان بلاقید زیادہ بھی پڑھ لے تو کوئی حرج نہیں۔ حدیث میں ہے:

« فَاَعِنِّی عَلٰی نَفْسِكَ بِكَثْرَةِ السُّجُودِ» [3] ''یعنی نوافل کثرت سے پڑھ۔''

بیس تراویح نماز:

سوال: ہم اہل الحدیث اس پورے علاقے میں چند ایک ہی ہیں اور ہر جگہ ہمیں اپنی پانچوں وقت کی نمازیں برادرانِ احناف کے ساتھ اُن کی مسجدوں میں جا کر پڑھنی ہوتی ہیں۔ رمضان شریف میں یہ حضرات بیس رکعت تراویح پڑھتے ہیں اور وِتر پڑھنے کا بھی اُن کا طریقہ الگ ہے جب کہ ہماری تراویح کی رکعتوں کی تعداد مسنون (آٹھ رکعات) اور وِتر کا طریقہ بھی بحمد اللہ مسنون ہے لہٰذا عشاء کی نماز اُن کے ساتھ

---

1. صحیح البخاری، بَابُ فَضلِ مَن قَامَ رَمَضَانَ ، رقم: ۲۰۱۳
2. صحیح البخاری، بَابُ فَضلِ مَن قَامَ رَمَضَانَ ، رقم: ۲۰۱۳
3. صحیح مسلم، بَابُ فَضلِ السُّجُودِ وَالحَثِّ عَلَیهِ، رقم: ۴۸۹

باجماعت پڑھنے کے بعد ہم کیا کریں، کیا گھر آ کر تراویح اور نمازِ وتر اپنی پڑھ سکتے ہیں یا تراویح کی شروع کی آٹھ رکعتیں اُن کے ساتھ پڑھ کر نکل آئیں اور نمازِ وتر اپنی پڑھ لیں؟

(جواب): کوشش کریں کہ سنت کے مطابق نماز کی ادائیگی کے لیے مسجد علیحدہ بن جائے اور نمازِ تراویح کی ادائیگی کا انتظام کسی گھر میں کرلیں، تو زیادہ مناسب ہے، بہتر یہی ہے بایں صورت وِتر بھی سنت کے مطابق ادا کرسکیں گے۔ بوقتِ ضرورت آٹھ رکعت باجماعت پڑھ کر وِتر علیحدہ پڑھ لیے جائیں تو یہ بھی درست ہے۔

حرم مکی یا مدنی میں صلوٰۃ التراویح بیس رکعت پڑھا جانا دلیل بن سکتا ہے؟

(سوال): حرم مکی یا مدنی میں صلوٰۃ التراویح بیس رکعت پڑھی جاتی ہیں۔ وہاں کے مفتی صاحب فرما رہے تھے کہ امام کے ساتھ پوری نماز پڑھنا ضروری ہے اور یہ بھی کہ صحابہ رضی اللہ عنہم کے دور میں بیس رکعت پڑھی گئی ہیں اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: «عَلَیکُم بِسُنَّتِي وَ سُنَّةِ الخُلَفَاءِ الرَّاشِدِینَ المَهدِیِّینَ »[1]

(جواب): جب اصل کے اعتبار سے نمازِ تراویح فرض نہیں، تو پھر امام کے ساتھ ساری پڑھنی کیسے ضروری ہوگی۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے دور بالخصوص عہدِ فاروقی میں بیس رکعت پڑھنا ثابت نہیں۔ البتہ موطا امام مالک میں بیس رکعت کے بجائے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے گیارہ رکعت کا پڑھنا بسند صحیح ثابت ہے۔[2]

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ ہی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا طریقہ تھا۔ نصاً ہو یا استنباطاً ان کا طریقہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے قطعاً مختلف نہ تھا۔ اس لیے بعد میں ضمیر مفرد کے ساتھ فرمادیا:

« تَمَسَّکُوا بِهَا وَ عَضُّوا عَلَیهَا بِالنَّوَاجِذِ »[3]

اگر صحابہ اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ علیحدہ علیحدہ ہوتا تو حدیث میں 'بھما'، اور 'علیھما' تثنیہ کی ضمیر ہوتی۔

جملہ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو، صلوٰۃ التراویح علامہ البانی رحمہ اللہ۔

رکعاتِ تراویح میں سنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم اور تعامل صحابہ:

(سوال) رمضان المبارک میں نمازِ تراویح کتنی رکعت سنت نبوی ہیں؟ اور بیس تراویح کی کیا حقیقت ہے؟ اور کیا حضرت عمرؓ بن خطاب یا کسی دیگر صحابی سے بیس رکعت کا ثبوت ملتا ہے؟ بعض لوگ حضرت عمرؓ کی طرف نسبت کہتے ہیں کہ انہوں نے بیس رکعت کا حکم دیا تھا یا ان کے زمانے میں پڑھی گئی ہیں۔ براہِ کرم وضاحت

---

1. سنن ابن ماجه، بَابُ اتِّبَاعِ سُنَّةِ الخُلَفَاءِ الرَّاشِدِینَ المَهدِیِّینَ، رقم: ٤٢
2. مؤطا امام مالك، مَا جَاءَ فِي قِیَامِ رَمَضَانَ، رقم: ٣٧٩
3. سنن أبي داؤد، بَابٌ فِي لُزُومِ السُّنَّةِ، رقم: ٤٦٠٧

فرما کر مشکور فرمائیں۔ (محمد شعیب پاکپتن، ماہنامہ محدث، نومبر ۱۹۷۱)

جواب الجواب بعون الملك العزيز الوهاب: نمازِ تراویح آٹھ رکعت سنت نبوی ہیں۔

حدیث: ا۔ صحیحین [1] میں حضرت ابو سلمہ بن عبد الرحمن سے مروی ہے:

« إِنَّه سَاَلَ عَائِشَةَ رَضِيَ اللهُ عَنْهَا كَيْفَ كَانَتْ صَلٰوةُ رَسُوْلِ اللهِ ﷺ فِيْ رَمَضَانَ؟ قَالَتْ مَاكَانَ يَزِيْدُ فِيْ رَمَضَانَ وَلَا فِيْ غَيْرِهِ [2] عَلٰى إِحْدٰى عَشَرَةَ رَكْعَةً يُصَلِّيْ اَرْبَعًا فَلَا تَسْاَلْ عَنْ حُسْنِهِنَّ وَطُوْلِهِنَّ ثُمَّ يُصَلِّيْ اَرْبَعًا فَلَا تَسْاَلْ عَنْ حُسْنِهِنَّ وَطُوْلِهِنَّ ثُمَّ يُصَلِّيْ ثَلَاثًا قَالَتْ عَائِشَةُ:قُلْتُ:يَا رَسُوْلَ اللهِ ﷺ اتَنَامُ قَبْلَ انْ تُوْتِرَ فَقَالَ: يَاعَائِشَةُ إِنَّ عَيْنَيَّ تَنَامَانِ وَلَا يَنَامُ قَلْبِيْ» [3]

حضرت ابو سلمہ بن عبد الرحمن نے ام المومنین عائشہ (رضی اللہ عنہا) سے رسول اللہ ﷺ کی رمضان المبارک میں نماز کی کیفیت کے متعلق دریافت کیا۔ آپ فرماتی ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کا معمول رمضان اور غیر رمضان میں گیارہ رکعت سے زیادہ نہ تھا۔ چار رکعت خوب اچھی طرح (خشوع خضوع سے) اور لمبی پڑھتے پھر چار رکعت خوب اچھی طرح اور لمبی پڑھتے پھر تین رکعت وتر پڑھتے۔ حضرت عائشہ (رضی اللہ عنہا) فرماتی ہیں۔ میں نے کہا یا رسول اللہ ﷺ کیا آپ وتر پڑھنے سے پہلے سو جاتے ہیں۔ فرمایا اے عائشہ میری آنکھیں سوتی ہیں اور دِل جاگتا ہے۔"

اس حدیث کو امام المحدثین محمد بن اسماعیل بخاری (رحمہ اللہ) اپنی جامع میں تین مقامات پر لائے ہیں۔ کتاب التہجد۔ کتاب صلوۃ التراویح [4]۔ کتاب المناقب۔

مقصود اس سے مختلف مسائل کا استنباط و استخراج ہے جیسا کہ بخاری کی عادت ہے۔ حافظ ابن حجر (رحمہ اللہ) فتح الباری جز۳ صفحہ۳۳ مذکورہ حدیث کے تحت یوں رقم طراز ہیں: فِيْ الْحَدِيْثِ دَلَالَةٌ عَلٰى انَّ صَلَاتَه ﷺ كَانَتْ مُتَسَاوِيَةً فِيْ جَمِيْعِ السَّنَةِ یعنی اس حدیث میں اس بات پر دلالت ہے کہ آپ کی (رات کی) نماز سارا سال برابر تھی۔

---

(1) روایت موطأ امام مالک، ابوداود، ترمذی، بیہقی، مسند امام احمد اور ابوعوانہ وغیرہ میں بھی موجود ہے۔

(2) بخاری میں ایک دوسرے مقام پر وَلَا غَيْرِهِ یعنی لفظ "فی" کے بغیر ہے۔

(3) صحيح البخاري، بَابُ فَضلِ مَن قَامَ رَمَضَانَ، رقم:٢٠١٣، صحيح مسلم، بَابُ صَلَاةِ اللَّيلِ، وَعَدَدِ رَكَعَاتِ النَّبِيِّ ﷺ فِي اللَّيلِ ......الخ، رقم:٧٣٨

(4) عنوان کتاب صلوۃ التراویح صرف نسخہ مستملی میں ہے۔

فضیلۃ الشیخ علامہ ابوالحسن عبید اللہ بن علامہ محمد عبد السلام مبارک پوری حفظہ اللہ تعالیٰ فی الدارین اپنی محققانہ تالیف مرعاۃ المفاتیح شرح مشکوٰۃ المصابیح میں تحریر فرماتے ہیں:

« فَهٰذَا الْحَدِيْثُ نَصٌّ فِيْ اَنَّهُ ﷺ إِنَّمَا صَلَّى التَّرَاوِيْحَ فِيْ رَمَضَانَ ثَمَانَ رَكَعَاتٍ فَقَطْ لَمْ يُصَلِّ بِاَكْثَرَ مِنْهَا »

''یعنی یہ حدیث اس بات پر نص ہے کہ نبی ﷺ نے رمضان میں صرف آٹھ رکعت ہی پڑھی ہیں اس سے زیادہ نہیں پڑھیں۔''

مولانا انور شاہ کشمیر رحمہ اللہ حنفی عرف الشذی (۳۰۹) میں فرماتے ہیں:

'فِيْهِ تَصْرِيْحٌ اَنَّه حَالُ رَمَضَانَ فَاِنَّ السَّائِلَ سَأَلَ عَنْ حَالِ رَمَضَانَ وَغَيْرِه كَمَا عِنْدَ التِّرْمِذِيِّ وَمُسْلِمٍ وَّلَا مَنَاصَ مِنْ تَسْلِيْمِ اَنَّ تَرَاوِيْحَه عَلَيْهِ السَّلَامُ كَانَتْ ثَمَانِيَةَ[1] رَكَعَاتٍ لَمْ يَثْبُتْ فِيْ رِوَايَةٍ مِّنَ الرِّوَايَاتِ اَنَّهُ عَلَيْهِ السَّلَامُ صَلَّى التَّرَاوِيْحَ وَالتَّهَجُّدَ عَلٰى حِدَةٍ فِيْ رَمَضَانَ بَلْ طَوَّلَ التَّرَاوِيْحِ، وَبَيْنَ التَّرَاوِيْحِ وَالتَّهَجُّدِ فِيْ عَهْدِه عَلَيْهِ السَّلَامُ لَمْ يَكُنْ فَرْقٌ فِي الرَّكَعَاتِ'

''حضرت عائشہ (رضی اللہ عنہا) کی حدیث میں تصریح ہے کہ یہ (گیارہ رکعات) بحالت رمضان ہیں کیونکہ سائل کا سوال رمضان وغیر رمضان سے ہے جیسا کہ ترمذی اور مسلم میں ہے، اور یہ ماننا ہی پڑتا ہے کہ نبی ﷺ کی نمازِ تراویح آٹھ رکعات تھیں اور روایتوں میں سے کسی روایت میں یہ ثابت نہیں ہوتا کہ آپ نے رمضان میں تراویح اور تہجد علیحدہ علیحدہ پڑھی ہوں بلکہ آپ نے تراویح ہی کو لمبا کیا اور آنحضرت ﷺ کے عہد مبارک میں تراویح اور تہجد کی رکعات میں کوئی فرق نہیں تھا۔''

گیارہ رکعات کی حکمت:

رکعات تراویح میں گیارہ رکعات کی حکمت یہ ہے کہ تہجد (تراویح) اور وتر رات کی نماز ہیں جس طرح ظہر، عصر اور مغرب دن کی نماز ہیں، جب دن کی نماز ظہر ۴، عصر ۴ اور مغرب ۳ کل گیارہ رکعات فرض ہیں۔ رات کی نماز بھی عدد میں (گیارہ رکعات) ان کے برابر مناسب ہے اور اگر فجر کے دو فرض بھی دن کی

[1] صحیح ثمان رکعات یا ثمانی رکعات ہے یعنی تاء کے بغیر، کیونکہ تین سے نو تک عدد معدود میں تذکیر و تانیث کا اختلاف ہوتا ہے۔

نمازوں میں شامل کر لیے جائیں تو تیرہ رکعات کی حکمت بھی حاصل ہو جاتی ہے۔[1]

اگر کوئی کہے کہ عائشہؓ کی یہ روایت ان کی ایک دوسری روایت کے خلاف ہے جو یوں ہے:

« إِنَّه كَانَ (ﷺ) إِذَا دَخَلَ الْعَشْرُ الْاَوَاخِرُ يَجْتَهِدُ مَا لَا يَجْتَهِدُ فِيْ غَيْرِهِ»[2]

''رمضان المبارک کا جب آخری دھاکا آتا تو آنحضرت ﷺ عبادت میں اتنی محنت کرتے جو اس سے دوسرے دنوں میں نہ ہوتی۔''

یعنی آپ ﷺ نفل نوافل بہت پڑھتے تھے۔

اس کے جواب میں صاحب مرعاۃ المفاتیح مولانا رحمانی فرماتے ہیں:

« قُلْتُ:اَلْمُرادُ بِالْاِجْتِهَادِ تَطْوِيْلُ الرَّكَعَاتِ لَا الزِّيَادَةُ فِيْ الْعَدَدِ .»

یعنی ''محنت سے مراد رکعات کا لمبا کرنا ہے نہ کہ عدد میں زیادتی۔''

اور علامہ عینی رحمہ اللہ حنفی فرماتے ہیں:

« إِنَّ الزِّيَادَةَ فِيْ الْعَشْرِ الْاَوَاخِرِ يُحْمَلُ عَلَى التَّطْوِيْلِ دُوْنَ الزِّيَادَةِ فِي الْعَدَدِ »

''آخری عشرہ میں زیادتی (محنت) کو رکعات کے لمبا کرنے پر محمول کیا جائے گا نہ کہ زیادتی عدد پر۔''

حدیث ۲۔ معجم الصغیر اور قیام اللیل مروزی[3] میں حضرت جابر بن عبداللہ سے مروی ہے۔

«قَالَ صَلّٰى بِنَا رَسُوْلُ اللهِ ﷺ فِيْ شَهْرِ رَمَضَانَ ثَمَانَ رَكَعَاتٍ »

جابر بن عبداللہ فرماتے ہیں: رسول اللہ ﷺ نے ماہِ رمضان میں ہمیں آٹھ رکعت تراویح پڑھائیں۔

امام ذہبی اس حدیث کو میزان الاعتدال، ج:۲،ص:۳۱۱ میں عیسی بن جاریہ مدنی راوی حدیث کے ترجمہ (بیان احوال) میں ذکر فرماتے ہیں: اسنادہ وسط یعنی اس حدیث کی ندرمیانہ درجہ کی ہے۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے فتح الباری میں اس حدیث کو بیان کر کے اس کی سند پر کوئی جرح نہیں کی۔ گویا مقدمہ فتح الباری (ہدی الساری) میں ذکر کردہ شرط کی بناء پر حافظ صاحب کے نزدیک اس کی سند صحیح یا کم از کم حسن درجہ کی ہے۔

ایسے ہی حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے اس حدیث پر تلخیص الجیر فی تخریج احادیث الرافعی الکبیر (فقہ شافعی) میں سکوت کیا ہے۔

اور علامہ عینی حنفی بھی عمدۃ القاری شرح بخاری میں اس حدیث کو لائے ہیں اور ابن خزیمہ اور ابن حبان

---

[1] یہی حکمت حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے فتح الباری جلد ۳ میں بیان فرمائی ہے۔

[2] صحیح مسلم، بَابُ الْاِجْتِهَادِ فِي الْعَشْرِ الْاَوَاخِرِ مِنْ شَهْرِ رَمَضَانَ، رقم: ۱۱۷۵

[3] یہ روایت صحیح ابن خزیمہ، صحیح ابن حبان اور مسند ابویعلی وغیرہ میں بھی موجود ہے۔

سے اس کی تصحیح نقل کی ہے اور اس پر کوئی اعتراض نہیں کیا۔

ہاں البتہ مولوی شوق نیموی نے آثار السنن میں امام ذہبی کے کلام پر تنقید کی ہے چنانچہ لکھا ہے۔ اس حدیث کا مدار عیسیٰ بن جاریہ پر ہے۔ اس میں ابن معین، ابوداود اور نسائی وغیرہ نے جرح کی ہے اس بناء پر اس کی اسناد لین (کمزور) ہے لہٰذا دلیل کے قابل نہیں۔

اس کا جواب یہ ہے کہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ شرح نخبۃ الفکر میں فرماتے ہیں:

اَلذَّهْبِيُّ مِنْ اَهلِ الِاسْتِقْرَاءِ التَّامِّ فِي نَقْدِ الرِّجَالِ ''امام ذہبی رواۃ کی جرح وتعدیل میں اہل استقراء تام سے ہیں۔'' بحر العلوم صفحہ ۱۴۱ طبع نول کشور شرح مسلم الثبوت (اصول فقہ حنفی) میں ذہبی کے متعلق ذکر ہے:« هُوَ مِنْ اَهْلِ الْاِسْتِقْرَاءِ التَّامِّ فِيْ نَقْلِ حَالِ الرِّجَالِ »

یعنی ''اس کا (ذہبی کا) استقراء اسماء الرجال میں بہت کامل ہے۔''

صاحب تحفۃ الاحوذی جز ۳ ص ۵۲۵ (طبع جدید مصری) میں فرماتے ہیں۔

« فَلَمَّا حَكَمَ الذَّهْبِيُّ بِاَنَّ اِسْنَادَه وَسَطٌ بَعْدَ ذِكْرِ الْجَرْحِ وَالتَّعْدِيْلِ فِيْ عِيْسٰى بْنِ جَارِيَةَ وَ هُوَ مِنْ اَهْلِ الْاِسْتِقْرَاءِ التَّامِّ فِيْ نَقْدِ الرِّجَالِ فَحُكْمُهٗ بِاَنَّ اِسْنَادَه وَسَطٌ وَهُوَ الصَّوَابُ وَيُؤَيِّدُه إِخْرَاجُ ابْنِ خُزَيْمَةَ وَابْنُ حِبَّانَ هٰذَا الْحَدِيْثَ فِيْ صَحِيْحَيْهِمَا فَلَا يُلْتَفَتُ إِلٰى مَا قَالَ النِّيْمَوِيُّ وَيَشْهَدُ لِحَدِيْثِ جَابِرٍ هٰذَا حَدِيْثُ عَائِشَةَ الْمَذْكُوْرُ مَا كَانَ يَزِيْدُ فِيْ رَمَضَانَ وَلَا فِيْ غَيْرِه عَلٰى إِحْدٰى عَشَرَةَ رَكْعَةً .»

''جب امام ذہبی رحمہ اللہ نے عیسیٰ بن جاریہ میں جرح وتعدیل کے بعد اس حدیث کی سند پر وسط (درمیانہ درجہ) کا حکم لگایا ہے۔ وہی صحیح ہے کیونکہ ذہبی نقد رجال میں اہل استقراء تام سے ہیں اور اس کی تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ ابن خزیمہ اور ابن حبان [1] اپنی اپنی صحیح میں اس

[1] اگر کوئی کہے کہ ابن حبان تصحیح میں متساہل ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں ابن خزیمہ اور ابو زرعۃ، عیسیٰ بن جاریہ کی توثیق میں ابن حبان کے موید ہیں۔ ابن حبان تصحیح میں منفرد نہیں لہٰذا ابن حبان کی تصحیح قابل اعتماد ہوئی۔ صحیح ابن خزیمہ کے بارہ میں حضرت الاستاد حماد بن محمد الانصاری (مدینہ منورہ) کو فرماتے سنا: صحیح ابن خزیمہ کی احادیث علی الاقل حسن درجہ کی ہے۔ حاصل یہ ہے کہ امام ذہبی کا اس حدیث کے متعلق ''اسنادہ وسط'' فرمانا درست ہے۔ صحیح ابن خزیمہ ابھی تک قلمی ہے جس کا فوٹو میں نے مدینہ منورہ میں دیکھا ہے جو دار العلوم برلن (جرمنی) کے کتب خانہ میں موجود قلمی نسخہ سے لیا گیا ہے۔ مدینہ منورہ کا ایک تاجر اسے طبع کرانے کی کوشش میں مصروف ہے۔ خدا کرے جلد از جلد منظر عام پر آجائے تاکہ علماء وطلباء مستفید ہوسکیں۔

حدیث کو لائے ہیں۔ پس نیموی کا قول قابل التفات نہیں ہے۔ نیز حضرت جابر کی اس حدیث کی مؤید (شاہد) حضرت عائشہ کی حدیث ہے یعنی رسول اللہ ﷺ کا معمول رمضان اور غیر رمضان میں گیارہ رکعت سے زیادہ نہیں تھا۔"

حدیث ۳۔ تحفۃ الاحوذی میں بحوالہ ابویعلی جابر بن عبداللہ سے روایت ہے۔

جَاءَ اُبَیُّ بْنُ کَعْبٍ اِلٰی رَسُولِ اللهِ ﷺ فَقَالَ:یَا رَسُوْلَ اللهِ ﷺ إِنَّه کَانَ مِنِّیْ اللَّیْلَۃَ شَیٌٔ یَعْنِیْ فِیْ رَمَضَانَ قَالَ:وَمَا ذَاکَ یَا اُبَیُّ، قَالَ:نِسْوَۃٌ فِیْ دَارِیْ قُلْنَ:إِنَّا لَا نَقْرَءُ الْقُرْاٰنَ فَنُصَلِّیْ بِصَلَاتِكَ قَالَ:فَصَلَّیْتُ بِهِنَّ ثَمَانَ رَکَعَاتٍ اَوْتَرْتُ فَکَانَتْ سُنَّۃَ الرِّضَا وَلَمْ یَقُلْ شَیْئًا:

قَالَ الْهَیْثَمِیُّ فِیْ مَجْمَعِ الزَّوَائِدِ: إِسْنَادُه حَسَنٌ

"ابی بن کعب رسول اللہ ﷺ کے پاس حاضر ہوئے۔ عرض کی یا رسول اللہ ﷺ رمضان میں آج رات مجھ سے ایک (عجیب) کام ہوا، آپ نے فرمایا وہ کیا؟ عرض کی ہمارے گھر کی عورتوں نے مجھ سے کہا کہ ہم قرآن نہیں پڑھ سکتیں اس لئے ہم تیرے ساتھ نماز پڑھیں گی۔ پس میں نے انہیں آٹھ رکعات (تراویح) پڑھائیں اور ور پڑھے۔ پس راوی کا بیان ہے کہ یہ طریقہ پسند کیا گیا اور آپ نے کوئی اعتراض نہ کیا۔"

حافظ ہیثمی فرماتے ہیں: اس حدیث کی سند حسن ہے۔

مندرجہ بالا تین احادیث سے ثابت ہوا کہ نماز تراویح آٹھ رکعت ہی سنت ہے۔

بیس تراویح کی حقیقت:

بیس تراویح رسول اللہ ﷺ یا کسی صحابی مثلاً عمر بن خطابؓ وغیرہ سے ثابت نہیں اس سلسلہ میں جو احادیث پیش کی جاتی ہیں اس کی حقیقت ملاحظہ فرمائیں۔

اس سلسلہ میں سنن کبریٰ بیہقی [1] کی ایک روایت عبداللہ بن عباس سے مرفوعا بیان کی جاتی ہے جو یہ ہے: «اِنَّ النَّبِی ﷺ کَانَ یُصَلِّی فِی رَمَضَانَ عِشْرِیْنَ رَکْعَۃً سِوٰی الْوِتْرِ »

[1] یہ روایت مصنف ابن ابی شیبہ، عبد بن حمید فی المنتخب من المسند، طبرانی فی المعجم الکبیر وفی المعجم الاوسط والمنتقی منه للذهبی والجمع بینه وبین الصغیر لغیر الطبرانی وابن عدی فی الکامل والخطیب فی الموضح

نبی ﷺ کا معمول رمضان میں بیس رکعات وتر کے سوا تھا۔اس پر صاحب مرعاۃ المفاتیح لکھتے ہیں:

فَهُوَ ضَعِيفٌ جِدًّا لَّا يَصْلُحُ لِلْاِسْتِدْلَالِ ولا للاستشهادِ وَلَا لِلْاِعْتِبَارِ فَاِنَّ مَدَارَه عَلٰى اَبِيْ شَيْبَةَ اِبْرَاهِيْمَ بْنِ عُثْمَانَ وَهُوَ مَتْرُوْكُ الْحَدِيْثِ كَمَا فِي التَّقْرِيْبِ

یعنی عبداللہ بن عباس کی حدیث سخت ضعیف ہے جو نہ تو دلیل بنانے کے قابل ہے اور نہ ہی تائید وتقویت کے قابل ہے کیونکہ اس کا مدار ابو شیبہ ابراہیم بن عثمان (دادا امام ابن ابی شیبہ) پر ہے اور وہ متروک الحدیث ہے جیسا کہ تقریب التہذیب میں ہے۔

اور علامہ زیلعی حنفی اسی حدیث کے متعلق نصب الرایہ فی تخریج احادیث الہدایۃ میں فرماتے ہیں:

هُوَ مَعْلُوْلٌ بِاَبِيْ شَيْبَةَ إِبْرَاهِيْمَ بْنِ عُثْمَانَ مُتَّفَقٌ عَلٰى ضَعْفِه وَلَيَّنَه ابْنُ عَدِيٍّ فِي الْكَامِلِ ثُمَّ إِنَّه مُخَالِفٌ لِلْحَدِيْثِ الصَّحِيْحِ عَنْ اَبِيْ سَلَمَةَ بْنِ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ اَنَّه سَاَلَ عَائِشَةَ كَيْفَ كَانَتْ صَلٰوةُ رَسُوْلِ اللهِ ﷺ فِيْ رَمَضَانَ؟ قَالَتْ: مَا كَانَ يَزِيْدُ فِيْ رَمَضَانَ وَلَا فِيْ غَيْرِه عَلٰى إِحْدٰى عَشَرَةَ رَكْعَةً ،الْحَدِيْثَ

عبداللہ بن عباس کی حدیث ابو شیبہ ابراہیم بن عثمان کے سبب سے ضعیف ہے۔جس (ابی شیبہ) کے ضعف پر اتفاق ہے اور ابن عدی نے کامل میں اسے لین (کمزور) کہا ہے۔پھر یہ روایت ابوسلمہ بن عبد الرحمن کی صحیح حدیث کے مخالف ہے جس میں انہوں نے حضرت عائشہ (رضی اللہ عنہا) سے سوال کیا کہ رسول اللہ ﷺ کی رمضان کی نماز کیسی تھی؟ فرمایا: آپ کا معمول رمضان غیر رمضان میں گیارہ رکعت سے زیادہ نہ تھا۔

اور ابن الہمام حنفی فتح القدیر شرح ہدایۃ میں اس حدیث کو بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

هُوَ ضَعِيْفٌ بِاَبِيْ شَيْبَةَ إِبْرَاهِيْمَ بْنِ عُثْمَانَ مُتَّفَقٌ عَلٰى ضَعْفِه مَعَ مُخَالَفَتِه لِلصَّحِيْحِ

یہ روایت ابو شیبہ ابرہیم بن عثمان کی وجہ سے ضعیف ہے جس کے ضعف پر علماء کا اتفاق ہے جب کہ وہ صحیح حدیث کے بھی مخالف ہے۔

اور علامہ عینی حنفی عمدۃ القاری شرح صحیح بخاری میں تحریر فرماتے ہیں:

« اَبُوْ شَيْبَةَ إِبْرَاهِيْمُ ابْنُ عُثْمَانَ عَبْسِيٌّ كُوْفِيٌّ قَاضِيُ وَاسِطَ جَدُّ اَبِيْ بَكْرِ بْنِ اَبِيْ شَيْبَةَ كَذَّبَه شُعْبَةُ وَضَعَّفَه اَحْمَدُ فِيْ مَنَاكِيْرِه ،اِنْتَهٰى »

''امام شعبہ نے ابراہیم بن عثمان کو کذاب کہا ہے اور امام احمد، ابن معین، بخاری اور نسائی وغیرہ نے اسے ضعیف کہا ہے اور اس حدیث کو ابن عدی نے کامل میں ابراہیم بن عثمان کی منکر احادیث

میں شامل کیا ہے۔''

اور امام بیہقی فرماتے ہیں: تَفَرَّدَ بِهِ أَبُوْ شَيْبَةَ إِبْرَاهِيْمُ بْنُ عُثْمَانَ الْعَبسِيُّ الْكُوْفِيُّ وَهُوَ ضَعِيْفٌ اس حدیث میں ابو شیبہ ابراہیم بن عثمان عبسی کوفی متفرد ہے اور وہ ضعیف ہے۔

فتح الباری جز۴ میں حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔

وَأَمَّا مَا رَوَاهُ ابْنُ أَبِيْ شَيْبَةَ مِنْ حَدِيْثِ ابْنِ عَبَّاسٍ كَانَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ يُصَلِّيْ فِيْ رَمَضَانَ عِشْرِيْنَ رَكْعَةً وَالْوِتْرَ فَإِسْنَادُه ضَعِيْفٌ۔

وَقَدْ عَارَضَه حَدِيْثُ عَائِشَةَ هٰذَا الَّذِيْ فِي الصَّحِيْحَيْنِ مَعَ كَوْنِهَا أَعْلَمَ بِحَالِ النَّبِيِّ ﷺ لَيْلًا مِنْ غَيْرِهَا

ابن ابی شیبہ نے (مصنف میں) ابن عباس سے جو روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ رمضان میں بیس رکعت اور وتر پڑھتے۔ اس کی سند ضعیف ہے۔ نیز حضرت عائشہ (رضی اللہ عنہا) کی صحیحین والی حدیث اس کے خلاف ہے۔ حالانکہ عائشہؓ نبی ﷺ کے رات احوال سے دوسروں کی نسبت زیادہ باخبر ہیں۔ اور حضرت الشیخ علامہ ناصر الدین البانی محدث شام اپنی تالیف صلوٰۃ التراویح میں فرماتے ہیں: میں نے اس حدیث کے مصادر کا تتبع کیا۔ جمیع طرق میں ابراہیم بن عثمان عن الحکم عن مقسم عن ابن عباس مرفوعا ہے۔

امام طبرانی فرماتے ہیں:

یہ روایت حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے صرف اسی اسناد سے منقول ہے۔ اور حافظ نور الدین ہیثمی کا قول ہے۔ انه ضعیف عبد اللہؓ بن عباس کی حدیث ضعیف ہے۔

اور علامہ البانی فرماتے ہیں:

وَالْحَقِيْقَةُ أَنَّه ضَعِيْفٌ جِدًّا كَمَا يُشِيْرُ إِلَيْهِ قَوْلُ الْحَافِظِ الْمُتَقَدِّمِ (مَتْرُوْكُ الْحَدِيْثِ) وَهٰذَا هُوَ الصَّوَابُ فَقَدْ قَالَ ابْنُ مَعِيْنٍ: لَيْسَ بِثِقَةٍ وَقَالَ الْجَوْزَ جَانِيُّ: سَاقِطٌ وَقَالَ الْبُخَارِيُّ: سَكَتُوْا عَنْهُ

حقیقت یہ ہے کہ حضرت ابن عباس کی روایت بہت ضعیف ہے جیسا کہ تقریب التہذیب میں حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کے قول (متروک الحدیث میں) اشارہ ہے اور یہی درست ہے۔ امام الجرح والتعدیل ابن معین نے کہا: ابراہیم ثقہ نہیں اور جوز جانی نے کہا ہے: اعتبار سے گرا ہوا ہے اور امام

بخاری فرماتے ہیں: سَکَتُوْا عَنْهُ (امام بخاری) کے نزدیک یہ کلمہ متروک الحدیث کے شبیہ ہے۔

ملاحظہ ہو: اختصار علوم الحدیث للحافظ ابن کثیر ص ۱۱۸)

پھر شیخ البانی اپنے رسالہ ''صلوۃ التراویح'' میں فرماتے ہیں۔

وَلِذَالِكَ فَإِنِّيْ اریٰ انَّ حَدِيْثَه هٰذَا فِيْ حُكْمِ الْمَوْضُوْعِ لِمُعَارَضَتِه لِحَدِيْثِ عَائِشَةَ وَجَابِرٍ كَمَا سَبَقَ عَنِ الْحَافِظَيْنِ الزَّيْلَعِيِّ وَالْعَسْقَلَانِيِّ

''اور اسی لئے میری رائے یہ ہے کہ ابن عباس سے روایت موضوع کے حکم میں ہے کیونکہ یہ عائشہ اور جابر کی احادیث کے بھی معارض ہے جیسا کہ حافظ زیلعی اور حافظ عسقلانی کے اقوال میں گزرا ہے۔''

خلاصہ کلام یہ ہے کہ مذکورہ بالا روایت قابل احتجاج و اعتبار نہیں ہے اس لئے حضرت عائشہ اور جابر کی روایت پر عمل کیا جائے گا جس میں آٹھ رکعت کا ذکر ہے۔

حضرت عمر بن خطاب (رضی اللہ عنہ) سے بیس تراویح ثابت نہیں اور نہ ہی ان کے دورِ خلافت میں یہ صحابہ کا معمول رہا بلکہ حضرت عمرؓ نے سب کو جمع کر کے ابی بن کعب اور تمیم داری کو گیارہ رکعات پڑھانے کا حکم دیا تھا جیسا کہ موطا امام مالک[1] میں ہے۔

عَنْ مُّحَمَّدَّ بْنِ يُوْسُفَ عَنِ السَّائِبِ بْنِ يَزِيْدَ انَّه قَالَ امَرَ عُمَرُبْنُ الْخَطَّابِ اُبَيَّ بْنَ كَعْبٍ وَّتَمِيْمًا الدَّارِيَّ انْ يَّقُوْمَا لِلنَّاسِ بِإِحْدٰى عَشَرَةَ رَكْعَةً قَالَ وَقَدْ كَانَ الْقَارِءُ يَقْرَءُ بِالْمِئِيْنِ حَتّٰى كُنَّا نَعْتَمِدُ عَلَى الْعِصِيِّ مِنْ طُوْلِ الْقِيَامِ وَمَا كُنَّا نَنْصَرِفُ إِلَّا فِيْ فُرُوْعِ الْفَجْرِ

''سائب بن یزید فرماتے ہیں خلیفۃ المسلمین حضرت عمر بن خطاب (رضی اللہ عنہ) نے ابی بن کعب اور تمیم داری کو حکم دیا تھا کہ لوگوں کو گیارہ رکعت پڑھایا کریں۔ راوی کا بیان ہے کہ قاری مئین سورتیں پڑھتا یہاں تک کہ ہم طول قیام کی وجہ سے لاٹھیوں پر ٹیک لگاتے اور ہم پو پھٹنے کے قریب (گھروں کو) واپس ہوتے۔''

محدث شام شیخ البانی فرماتے ہیں:

قُلْتُ:هٰذَا سَنَدٌ صَحِيْحٌ جِدًّا فَإِنَّ مُحَمَّدَ بْنَ يُوْسُفَ شَيْخ مَالِكٍ ثِقَةٌ اِتِّفَاقًا وَّاحْتَجَّ

[1] یہ حدیث ابوبکر نیشاپوری نے فوائد میں اور بیہقی نے سنن کبریٰ میں اور فریابی نے بھی روایت کی ہے۔

بِهِ الشَّيْخَانِ وَالسَّائِبُ بْنُ يَزِيْدَ صَحَابِيٌّ حَجَّ مَعَ النَّبِيِّ ﷺ وَهُوَ صَغِيْرٌ

''اس روایت کی سند بہت صحیح ہے کیونکہ محمد بن یوسف شیخ امام مالک بالاتفاق ثقہ ہے اور شیخین (بخاری مسلم) نے اس سے حجت لی ہے اور سائب بن یزید صحابی ہے جس نے بچپن میں نبی ﷺ کے ساتھ حج کیا تھا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ فرمان حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا و جابر رضی اللہ عنہ کی پہلے بیان کردہ احادیث کے عین موافق ہے جس سے ثابت ہوا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے نزدیک مسنون گیارہ رکعت ہی ہیں جس پر آپ نے لوگوں کو جمع کیا۔ باقی رہا کہ حضرت عمرؓ کے عہد خلافت میں لوگوں کا معمول کیا تھا؟ سو وہ بھی بیس تراویح کسی صحیح طریق سے ثابت نہیں اور حضرت عمرؓ کے عہد میں لوگوں کا باجماعت گیارہ رکعت پڑھنا صحیح روایت سے ثابت ہو چکا ہے۔ بیس رکعت والی روایات ضعیف ہیں۔ ملاحظہ فرمائیے۔

روایت ا: موطا امام مالک میں یزید بن رومان سے مروی ہے۔

كَانَ النَّاسُ يَقُوْمُوْنَ فِيْ زَمَانِ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ فِيْ رَمَضَانَ بِثَلٰثٍ وَّعِشْرِيْنَ رَكْعَةً

حضرت عمرؓ کے عہد میں لوگ رمضان میں تئیس رکعت پڑھا کرتے تھے۔ اس روایت کو امام بیہقی سنن کبریٰ اور المعرفۃ (معرفۃ السنن والآثار) میں لائے ہیں۔ پھر فرماتے ہیں یزید بن رومان لم یدرک عمر۔ اس روایت کے راوی یزید بن رومان نے حضرت عمرؓ کو نہیں پایا لہٰذا یہ روایت منقطع ہے جو ضعیف کی قسم ہے اور حافظ زیلعی حنفی نے نصب الرایہ میں اس (جرح) پر کوئی اعتراض نہیں کیا بلکہ اسے برقرار رکھا ہے۔

روایت ۲۔: علامہ عینی نے عمدۃ القاری میں ایک روایت حافظ ابن عبدالبر سے نقل کی ہے۔

قَالَ:وَرَوٰى الْحَارِثُ بْنُ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ بْنِ اَبِیْ ذُبَابٍ عَنِ السَّائِبِ بْنِ يَزِيْدَ قَالَ:كَانَ الْقِيَامُ عَلٰى عَهْدِ عُمَرَ بِثَلَاثٍ وَّعِشْرِيْنَ رَكْعَةً

سائب بن یزید روایت کرتے ہیں کہ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں تئیس رکعت کا رواج تھا۔

اس اثر میں بھی ضعف ہے۔

علامہ البانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

هٰذَا سَنَدٌ ضَعِيْفٌ لِاَنَّ ابْنَ اَبِیْ ذُبَابٍ هٰذَا فِيْهِ ضَعْفٌ مِنْ قَبْلِ حِفْظِه قَالَ ابْنُ اَبِیْ حَاتِمٍ فِی الْجَرْحِ وَالتَّعْدِيْلِ:قَالَ اَبِیْ:يَرْوِیْ عَنْهُ الدَّرَاوَرْدِیُّ اَحَادِيْثَ مُنْكَرَةً وَّلَيْسَ بِذَالِكَ الْقَوِیِّ يُكْتَبُ حَدِيْثُه قَالَ اَبُوْ زُرْعَةَ:لَا بَاسَ بِهِ

''اِس اثر کی سند ضعیف ہے کیونکہ ابن ابی ذباب حافظہ کمزور ہونے کی وجہ سے ضعیف ہے۔ ابن ابی حاتم ''الجرح والتعدیل'' میں فرماتے ہیں۔ میرے والد نے کہا دراوردی نے اس سے منکر احادیث نقل کی ہیں اور یہ با اعتماد نہیں کہ اس کی حدیث لکھی جائے۔ ابو زرعہ نے کہا لا بَأْسَ بِهٖ ① اور حافظ ابن حجر رحمہ اللہ تقریب میں فرماتے ہیں صدوق یھم اور تہذیب التہذیب میں ہے امام مالک اس پر اعتماد نہیں کرتے تھے۔''

الف جارح محدثین بہت ہیں اور ابو زرعہ کی تعدیل ''لا باس بہ'' مبہم، خفیف اور چوتھے درجہ کی ہے۔

ب جرح مفسر ہے اس لئے مقدم ہے: إِذَا اجْتَمَعَ فِي شَخْصٍ جَرْحٌ وَّتَعْدِيْلٌ فَالْجَرْحُ مُقَدَّمٌ الخ ②

روایت ۳۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فتح الباری میں ایک اثر لائے ہیں فرماتے ہیں:

رَوَاهُ عَبْدُ الرَّزَّاقِ مِنْ وَّجْهٍ اٰخَرَ (اَیْ مِنْ طَرِيْقِ دَاوٗدَ بْنِ قَيْسٍ) عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ يُوْسُفَ فَقَالَ إِحْدٰی وَعِشْرِيْنَ

''اور عبد الرزاق نے اسے ایک دوسرے طریق سے روایت کیا ہے یعنی داود ابن قیس کے طریق سے جو محمد بن یوسف سے روایت کرتے ہیں: فرمایا: اکیس۔''

یہ اثر بجائے اس کے کہ حنفیہ اس سے دلیل پکڑیں بلکہ ان کے مخالف ہے کیونکہ وہ ایک رکعت وتر کے قائل نہیں۔

شیخ ناصر الدین البانی فرماتے ہیں۔ اس اثر میں کلام دو طرح سے ہے ایک تو یہ اثر گیارہ رکعت والے صحیح اثر کے مخالف ہے (شاذ ہونے کی وجہ سے ضعیف ہوا)

دوسرا سبب اس میں بذات خود عبد الرزاق ہے جس کے متعلق تقریب میں ہے: وقد کان عمی فی آخر عمرہ فتغیر آخری عمر میں آنکھوں کی بینائی زائل ہونے کے بعد حافظہ جاتا رہا تھا۔

اور حافظ ابو عمرو بن الصلاح نے علوم الحدیث ص ۳۵۵ میں ان کا شمار مختلطین میں کیا ہے اور امام نسائی فرماتے ہیں: ''نُظِرَ لِمَنْ كَتَبَ عَنْهُ بِاٰخِرَةٍ''

جس نے عبد الرزاق سے آخری عمر میں لکھا ہے اس کی اچھی طرح جانچ پڑتال کی جائے۔ مختلطین کے متعلق علماء اصول الحدیث کا قانون یہ ہے کہ جس نے اختلاط سے پہلے ان سے حدیث لی قبول کی جائے گی

① لَا بَأْسَ بِهٖ وَفِي تَهْذِيْبِ التَّهْذِيْبِ (جلد ۲ ص ۱۴۸) بِلَفْظِ قَالَ اَبُوْ زُرْعَةَ: لَيْسَ بِهٖ بَأْسٌ۔ جرح اور تعدیل کے قواعد کے مطابق ابن ابی ذباب مندرجہ ذیل وجوہات سے ضعیف ہے۔

② مقدمة ابن الصلاح جلد: ۳ ص ۹۹ طبع جدید

اور جس نے اختلاط کے بعد لی رد کر دی جائے گی۔ اگر معلوم نہ ہو سکے کہ آیا یہ روایت قبل از اختلاط ہے یا بعد از اختلاط تو پھر بھی رد کر دی جائے گی۔ اور زیر بحث اثر اسی قبیل سے ہے۔ وَاللّٰهُ تَعَالٰى اَعْلَمُ

روایت ۴۔ :سنن کبریٰ بیہقی جلد۲ص ۴۹۶ میں یزید بن خصیفہ کے طریق سے ہے۔

عَنِ السَّائِبِ ابْنِ يَزِيْدَ قَالَ:كَانُوْا يَقُوْمُوْنَ عَلٰى عَهْدِ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ (رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ) فِيْ شَهْرِ رَمَضَانَ بِعِشْرِيْنَ رَكْعَةً قَالَ:وَكَانُوْا يَقْرَءُوْنَ بِالْمِئِيْنِ وَكَانُوْا يَتَوَكَّئُوْنَ عَلٰى عِصِيِّهِمْ فِيْ عَهْدِ عُثْمَانَ بْنِ عَفَّانَ (رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ) مِنْ شِدَّةِ الْقِيَامِ

''حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں لوگ ماہ رمضان میں بیس رکعت پڑھا کرتے تھے۔ راوی کا بیان ہے کہ مئین سورتیں پڑھتے اور حضرت عثمانؓ کے عہد میں شدت قیام کی وجہ سے اپنی لاٹھیوں پر ٹیک لگاتے۔''

یہ اثر کئی وجہ سے ضعیف ہے۔

الف۔ اس کی سند میں ابوعبداللہ محمد بن حسین بن فنجو یہ دینوری ہے اس کی ثقاہت ثابت نہیں ہو سکی فَمَنِ ادَّعٰى الصِّحَّةَ فَعَلَيْهِ بِالدَّلِيْلِ

ب۔ دوسرے راوی یزید بن خصیفہ کو امام احمد نے منکر الحدیث کہا ہے جس کا معنی امام احمد کے نزدیک یہ ہے کہ وہ راوی غریب احادیث بیان کرتا ہو۔ اس حدیث میں یزید اپنے سے اوثق (محمد بن یوسف) کی مخالفت کرتا ہے جس نے عمرؓ بن الخطاب سے صحیح سند سے گیارہ رکعات بیان کی ہیں اس لئے یزید بن خصیفہ کی روایت شاذ[1] ہونے کی وجہ سے۔

ج۔ یہ روایت مضطرب ہے۔ شیخ ناصر الدین البانی اپنی کتاب ''صلاۃ التراویح'' میں روایت نقل فرماتے ہیں:

فَقَالَ إِسْمٰعِيْلُ بْنُ أُمَيَّةَ:إِنَّ مُحَمَّدَ بْنَ يُوْسُفَ ابْنَ أُخْتِ السَّائِبِ بْنِ يَزِيْدَ اِخْبَرَه (قُلْتُ:فَذَكَرَ مِثْلَ رِوَايَةِ مَالِكٍ عَنِ ابْنِ يُوْسُفَ ثُمَّ قَالَ ابْنُ أُمَيَّةَ): قُلْتُ:اَوَ اَحِدٍ وَّعِشْرِيْنَ؟ قَالَ (يَعْنِيْ مُحَمَّدَ بْنَ يُوْسُفَ):لَقَدْ سَمِعَ ذٰلِكَ مِنَ السَّائِبِ بْنِ يَزِيْدَ

---

[1] حافظ ابن کثیر نے امام شافعی سے شاذ کی تعریف یہ نقل کی ہے۔ وَهُوَ اَنْ يَرْوِي الثِّقَةُ حَدِيْثًا يُخَالِفُ مَا رَوٰى النَّاسُ اور تقریب نووی میں ہے۔ فَإِنْ كَانَ بِتَفَرُّدِه مُخَالِفًا اَحْفَظَ مِنْهُ اَضْبَطَ كَانَ شَاذًّا مَّرْدُوْدًا

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ تقریب التھذیب میں محمد بن یوسف کو ثقہ ثبت اور یزید بن خصیفہ کو صرف ثقہ کہتے ہیں۔ ان کے تقابلی الفاظ میں محمد بن یوسف کا زیادہ ثقہ ہونا واضح ہے۔

ابْنُ خَصِيْفَةَ، فَسَأَلْتُ (السَّائِلُ هُوَ إِسْمَاعِيْلُ بْنُ أُمَيَّةَ) يَزِيْدَ بْنَ خَصِيْفَةَ؟ قَالَ: حَسِبْتُ أَنَّ السَّائِبَ قَالَ: أَحَدٍ وَّعِشْرِيْنَ. قُلْتُ: وَسَنَدُه صَحِيْحٌ

یعنی ''جب اسماعیل بن امیہ نے یزید بن خصیفہ سے پوچھا تو اس نے کہا کہ مجھے گمان[1] ہے (یعنی یقین نہیں) کہ سائب بن یزید نے اکیس رکعات کہا ہے (سند صحیح ہے) یہ حنفیہ پر حجت ہے کیونکہ تین وتر کی صورت میں رکعات تراویح اٹھارہ ۱۸ رہ جائیں گی۔ اس طرح یزید بن خصیفہ کی روایت میں بیس ۲۰ اور اٹھارہ ۱۸ کی وجہ سے اضطراب ہوگا۔''

دیگر کئی آثار حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی طرف نسبت کئے جاتے ہیں لیکن وہ سب متکلم فیہ ہیں۔ ایسے ہی بعض آثار حضرت علی، ابی بن کعب اور عبداللہ بن مسعود کی طرف منسوب ہیں لیکن کوئی بھی جرح وقدح سے خالی نہیں۔

اس لئے اقرب إلی الصواب یہی ہے کہ نماز تراویح گیارہ رکعت ہیں جیسا کہ حضرت عائشہؓ و جابرؓ وغیرہ کی صحیح احادیث میں گزر چکا ہے۔

حافظ جلال الدین سیوطی رسالہ ''المصابیح فی صلوۃ التراویح'' میں امام مالک سے نقل کرتے ہیں۔

قَالَ الْجُوْرِيُّ[2] مِنْ أَصْحَابِنَا عَنْ مَّالِكٍ أَنَّه قَالَ الَّذِيْ جَمَعَ عَلَيْهِ النَّاسَ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ أَحَبُّ إِلَيَّ وَهُوَ إِحْدٰى عَشَرَةَ رَكْعَةً وَّهِيَ صَلٰوةُ رَسُوْلِ اللهِ ﷺ قِيْلَ لَه: إِحْدٰى عَشَرَةَ رَكْعَةً بِالْوِتْرِ قَالَ: وَلَا أَدْرِيْ مِنْ أَيْنَ أُحْدِثَ هٰذَا الرُّكُوْعُ الْكَثِيْرُ

''ہمارے اصحاب میں سے جوری مالک سے نقل کرتے ہیں کہ وہ فرماتے ہیں۔ جس شی پر حضرت عمر بن الخطاب نے لوگوں کو جمع کیا تھا۔ وہ میرے نزدیک زیادہ محبوب ہے اور وہ گیارہ رکعت ہیں۔ یہی رسول اللہ ﷺ کی نماز ہے۔ امام مالک رحمہ اللہ سے پوچھا گیا کیا گیارہ رکعت بمعہ وتر؟ فرمایا: ہاں اور تیرہ رکعت بھی قریباً اور فرمایا میں نہیں جانتا کہ یہ کثرت تعداد رکعت کہاں سے بدعت نکال لی ہے۔''

---

[1] اس روایت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اکیس رکعات وتر سمیت (۲۰+۱) اور بیس رکعات وتر بغیر یزید بن خصیفہ کا صرف گمان ہے جب کہ محمد بن یوسف کو گیارہ پر یقین ہے۔ اسمٰعیل ابن امیہ (سائل) نے بھی ابن یوسف پر ہی اعتماد کیا ہے جیسا کہ اس کی گیارہ رکعت والی روایت (عند النیسابوری) سے ظاہر ہے۔

[2] بعض ناقلین نے جوزی بالزا اور بعض نے ابن الجوزی لکھا ہے حالانکہ صحیح جوری بالراء المہملۃ ہے۔ چنانچہ طبقات الشافعیہ ابن سبکی میں ہے: اَلْجُوْرِيُّ بِضَمِّ الْجِيْمِ ثُمَّ الْوَاوِ السَّاكِنَةِ ثُمَّ الرَّاءِ نِسْبَةٌ إِلٰى جُوْرٍ بَلْدَةٌ مِّنْ بِلَادِ فَارِسَ.

مندرجہ بالا ساری بحث سے ثابت ہوا کہ رکعات تراویح میں سنت نبوی اور تعاملِ صحابہ [1] آٹھ رکعت ہے۔

بعض علماء نے سنت نبوی آٹھ رکعت تسلیم کر لینے کے باوجود صحابہ سے بیس رکعات ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان روایات کا ضعف ناظرین ملاحظہ فرما چکے ہیں، نیز یہ بات قابل غور ہے کہ آٹھ رکعت سنت نبوی ثابت ہو جانے کے بعد بعض صحابہ کا عمل [2] اگر بالفرض وہ زیادہ ثابت کر بھی دیں تو اس کی کیا پوزیشن ہوگی؟ انہیں إِنَّ خَيْرَ الْهَدْيِ هَدْيُ مُحَمَّدٍ ﷺ مدنظر رکھنا چاہئے۔ صحابی شارع نہیں ہوتا کہ وہ مستقلاً قابل اتباع ہو۔ هٰذَا مَا عِنْدِيْ وَاللهُ اَعْلَمُ بِالصَّوَابِ۔

نمازِ تراویح کا باجماعت اہتمام کرنا کیسا ہے؟

سوال: نمازِ تراویح کا اہتمام ماں، باپ، نہ صرف خود کرتے ہیں بلکہ اپنے بچوں کو بھی تلقین کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ سیر اور ورزش کرنے کی اسلام میں ممانعت نہیں۔ مولانا صاحب اس بارے میں جواب تحریر کریں۔ شکریہ

جواب: بلا ریب نمازِ تراویح کا اہتمام ہونا چاہیے۔ اسلام میں سیر جہادی تربیت کا حصہ ہے۔ سوال غیر واضح ہونے کی بناء پر یہی جواب بن پایا ہے۔

نمازِ تراویح باجماعت پڑھنا بدعت ہے؟

سوال: مکرمی حافظ صاحب !السلام علیکم ورحمۃ اللہ، امابعد! میری طرف سے دو سوالات پر مشتمل ایک رجسٹری آپ کو ملی ہوگی، اس میں سوال نمبر۲ میں غالباً یہ شق میں نے نہیں لکھی کہ جس خطیب صاحب نے تراویح کے بدعت ہونے کا فتویٰ دیا ہے۔ وہ پورا سوال اس طرح ہے کہ نمازِ تراویح باجماعت بدعت ہے اور یہ نماز عشاء سے متصل نہیں بلکہ رات کے آخری حصہ میں باجماعت ادا کی جائے۔ اس طرح کے مسائل کی

---

[1] فقہ حنفی کی معتبر کتاب ہدایہ کے شارح امام الحنفیہ ابن الہمام فرماتے ہیں: إِنَّ مُقْتَضَى الدَّلِيْلِ كَوْنُ الْمَسْنُوْنِ فِيْهَا مِنْهَا ثَمَانِيَةً (فتح القدیر ج ۲ ص ۳۲) یعنی دلیل شرعی سے مسنون رکعات تراویح آٹھ ہی ہیں۔

[2] واضح رہے کہ یہ ساری بحث سنیت کا اعتقاد رکھتے ہوئے رکعات کی تعداد مسنون کے متعلق ہے ورنہ اگر کوئی شخص سنت مؤکدہ کے ارادہ سے آٹھ پڑھ کر بہ نیت نوافل جس قدر زیادہ پڑھنا چاہے اس کے لئے جائزہ ہے جن کا اجر اسے الگ ملے گا مگر ان نوافل کے کوئی تعداد مقرر (نبی ﷺ) یا صحابہ سے ثابت نہیں بلکہ صحابہ سے مختلف تعداد میں نوافل نقل کئے جاتے ہیں۔ مثلاً چھتیس اور چالیس۔ چنانچہ امام ابن الہمام فرماتے ہیں وَالْبَاقِيْ مُسْتَحَبًّا یعنی آٹھ سے زیادہ مستحب رکعات ہیں۔ (ادارہ)

وجہ سے مسجد اہلِ حدیث میں ہر روز جھگڑے ہو رہے ہیں۔ ہماری مسجد سے تقریباً متصل اہل بدعت کی مسجد ہے جذباتی نوجوانوں کو ذرا احساس نہیں کہ خطیب اور ہماری ان حرکات سے جماعتی وقار مجروح ہو رہا ہے۔

جواب: نمازِ تراویح باجماعت پڑھنا بدعت نہیں، یہ تو رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہے کہ آپ ﷺ نے تین چار راتوں تک اس کی جماعت کروائی تھی۔ پھر محض اس وجہ سے جماعت ترک کی کہ کہیں فرض نہ ہو جائے۔ آپ ﷺ کے بعد جب یہ خدشہ زائل ہو گیا، تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس نیک کام کو دوبارہ شروع کر دیا۔ عشاء کے بعد کسی وقت بھی ''قیام اللیل'' ہوسکتا ہے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت اس امر پر واضح دلیل ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے لوگوں کی سہولت کے پیشِ نظر اس کو رات کے پہلے حصہ میں مقرر کر دیا۔ یہ کوئی بدعت کا کام نہیں۔ جملہ مسائل کی تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو(کتاب قیام اللیل) از امام محمد بن نصر مروزی۔

نبی کریم ﷺ کا تین دن نمازِ تراویح پڑھانا سنتِ مؤکدہ کہلائے گی یا غیر مؤکدہ؟

سوال: نبی ﷺ نے نمازِ تراویح تین دن پڑھائی۔ اس کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور سے نمازِ تراویح بہت التزام سے ادا کی جاتی رہی۔ اسے سنت مؤکدہ کہیں گے یا غیر مؤکدہ۔

جواب: نبی ﷺ نے تین روز نمازِ تراویح پڑھائی پھر فرضیت کے ڈر سے اس کو ترک کر دیا۔ جب آپ ﷺ کی وفات کی وجہ سے علت زائل ہوگئی تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے دوبارہ اس عملِ خیر کو شروع کر دیا۔ نبی ﷺ کے قصد وارادہ اورشوقِ تراویح سے معلوم ہوتا ہے کہ تراویح کی ادائیگی سنت مؤکدہ ہے۔

نمازِ تراویح میں ختم قرآن کا حکم:

سوال: ① مسلمانوں میں قرآن شریف کو حفظ کرنا صرف اس لیے کہ رمضان المبارک میں تراویح میں پڑھا جائے جیسا کہ آج کل مروّج ہے، شریعت کی رُو سے کیسا ہے؟

②۔ اگر حافظ صاحبان تراویح میں پورا قرآن ختم نہ کریں تو خدا کے ہاں جوابدہ ہوں گے؟ یعنی حافظ ہوتے ہوئے اگر کوئی روزانہ نصف یا ربع سپارہ تراویح میں سنائے حتی کہ رمضان ختم ہو جائے اور اس کا قرآن ختم نہ ہوا ہو۔

③۔ کیا نبی آخر الزمان ﷺ کی ایسی کوئی حدیث ہے جس میں مسلمانوں سے کہا گیا ہو کہ تراویح میں پورا قرآن پڑھو! اور بقایا لوگ سنیں۔ اگر نہیں تو جب ہمارے علمائے کرام روزہ کھولنے کی دعا میں دو الفاظ کے اضافے کو بدعت قرار دیتے ہیں تو حفاظ کرام کا یہ عمل کیسا ہے؟

④۔آج کل ایک ہی مسجد میں تین تین یا چار چار حفاظ تراویح پڑھاتے ہیں۔ان کا ایسا کرنا شریعت کی روشنی میں کیسا ہے۔کیونکہ سوائے ایک یا دو صاحبان کے بقایا کے پیچھے چار یا پانچ نمازی ہی ہوتے ہیں؟ یعنی اجتماعیت ختم ہوکر انفرادیت معلوم ہوتی ہے؟

(جواب): ① بلا ریب (بلاشبہ) قرآن مجید حفظ کرنا ایک عظیم سعادت ہے جیسا کہ بعد از حفظ گیارہ ماہ تلاوت ترک کیے رکھنا بھی سخت ترین جرم ہے اور پھر صرف نمازِ تراویح میں سنا کر اپنے آپ کو فارغ سمجھ لینا بے معنی شے ہے، جو اس کی گیارہ ماہ کی سُستی و کاہلی کا نِعمُ البَدَل نہیں بن سکتا۔ بلکہ حفظ اس بات کا متقاضی ہے، کہ اہلِ قرآن کی عملی زندگی ہر شعبہ میں عام لوگوں سے ممتاز اور نمایاں ہو۔

②۔متعدد صحیح احادیث میں ہر مومن مرد و زن کو قرآن مجید سے خصوصی تعلق اور تلاوت کی ترغیب دلائی گئی ہے، تاکہ خطا کار انسان دینی و دنیاوی سعادتوں سے بہرہ ور ہو سکے۔سلف صالحین سے بکثرت اقوال و آثار ملتے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے، کہ وہ نہایت قلیل مدت میں اختتام منزل کو پہنچ جاتے تھے۔حضرت عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا تھا:

« صُم كُلَّ شَهرٍ ثَلَاثَةَ أَيَّامٍ. وَ اقرَأ القُرآنَ فِي كُلِّ شَهرٍ » [1]

’’ہر ماہ تین روزے رکھ! اور ہر ماہ قرآن ختم کر!‘‘

اور رمضان میں تو تلاوت کا مزید اہتمام ہونا چاہیے۔ چنانچہ ’’مشکوۃ‘‘ باب الاعتکاف میں حدیث ہے۔رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہر رمضان میں جبریل علیہ السلام سے قرآن مجید کا دَور کرتے تھے اور وفات کے سال دو دفعہ دَور کیا۔ علاوہ ازیں رمضان میں ’’قیام اللیل‘‘ کا زیادہ اہتمام ہوتا ہے اور اس کی ترغیب بھی زیادہ وارد ہے اور قیام قرآن مجید کے ساتھ ہوتا ہے۔اس لیے کوشش ہونی چاہیے کہ کم از کم ایک دفعہ رمضان میں قرآن ختم ہو جائے۔ جِدُّ و جہد کے باوجود اگر ختم نہ بھی ہو سکے تو کوئی حرج نہیں۔

﴿ لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفسًا اِلَّا وُسعَهَا ﴾ (البقرۃ:۲۸۶)

③۔اگر کوئی خود نہ پڑھ سکے تو سننے کی سعی کرے۔حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو شخص کتاب اللہ کی ایک آیت کی طرف کان لگائے اس کے لیے دوگنی نیکی لکھی جاتی ہے اور جو کتاب اللہ کی ایک آیت پڑھے اس کے لیے قیامت کے دن نور ہوگا۔ [2]

---

① صحیح البخاری، بَابٌ: فِي كَم يُقرَأُ القُرآنُ ،رقم:۵۰۵۲ ، مشکوٰۃ، باب صیام التطوع

② شعب الایمان، رقم:۱۸۲۸، کنز العمال:۱/۱۲۰، رقم:۲۳۱۶، بحوالہ مسند احمد

علامہ سیوطی رحمہ اللہ نے ''دُرِمنثور'' میں ''سورۃ الاعراف'' کے اخیر میں اس حدیث پر تحسین کا حکم لگایا ہے۔

اسی طرح حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: روزہ اور قرآن قیامت کے دن بندے کی سفارش کریں گے۔ روزہ کہے گا: یااللہ! میں نے اس کو کھانے اور شہوت سے روکا۔ اس کے حق میں میری سفارش قبول کر۔ قرآن مجید کہے گا: میں نے اس کو رات میں سونے سے روکا۔ اس کے حق میں میری سفارش قبول کر۔ پس ان کی سفارش قبول کی جائے گی۔[1]

مذکور حدیث میں روزہ کے مقابلہ میں قرآن کا تذکرہ اس کے ساتھ قیام کی وجہ سے ہوا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ رمضان میں تلاوتِ قرآن کا اہتمام زیادہ ہونا چاہیے۔ یہ بدعت کے زمرہ میں نہیں آتا جیسا کہ سائل نے سمجھا ہے۔

④۔ حفاظ کی آوازوں کا اگر باہمی ٹکراؤ ہو۔ پھر تو ناجائز ہے۔ بصورتِ دیگر جائز ہے۔ نفلی نماز میں اگر اجتماعیت برقرار نہ بھی رہے تو کوئی حرج نہیں۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو! (فتاویٰ اہل حدیث:۲/۳۴۴۔۳۴۵)

امام کا نماز میں قرآنِ کریم دیکھ کر قرأت کرنا:

سوال بعض اہل حدیث مساجد میں دیکھنے میں آیا ہے کہ امام قرآن کریم سے دیکھ کر تراویح پڑھاتے ہیں۔ کیا یہ جائز ہے: بینوا توجروا!

جواب اقول و باللہ التوفیق نماز میں قرآنِ کریم کی زیادہ سے زیادہ قراءت کرکے قیام کو طویل کرنا امرِ مستحب ہے۔ نیز آنحضرت علیہ السلام نے طویل قیام والی نماز کو افضل قرار دیا ہے۔ چنانچہ صحیح ابن خزیمہ (ج:۲،ص:۱۸٦) حدیث نمبر:۱۱۵۵، اور السنن الکبریٰ للبیہقی (ج:۳،ص:۸) اور قیام اللیل للمروزی،ص:۵۱، میں ہے:

« عَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ قَالَ سُئِلَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اَیُّ الصَّلٰوةِ اَفْضَلُ؟ قَالَ طُوْلُ الْقُنُوْتِ »[2]

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا گیا کہ: ''کونسی نماز افضل ہے۔'' تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواباً فرمایا: لمبا قیام۔''

---

① مشکوٰۃ کتاب الصوم،صحیح الترغیب والترھیب:۹۳۷،المعجم الکبیر للطبرانی،،رقم:۸۸،مسند احمد،رقم:٦٦٢٦

② صحیح مسلم،بَابُ أَفْضَلُ الصَّلَاۃِ طُولُ الْقُنُوتِ،رقم:٧٥٦،سنن ابن ماجه،رقم:١٤٢١

نیز احادیث میں آیا ہے کہ آنحضرت ﷺ نماز میں اس قدر طویل قیام فرمایا کرتے کہ آپ ﷺ کے قدم مبارک متورم ہو جاتے۔

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ: کَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ یَقُوْمُ حَتّٰی تَوَرَّمَ قَدَمَاهُ۔ فَقِیْلَ لَهٗ، اَیْ رَسُوْلَ اللّٰهِ! اَتَصْنَعُ هٰذَا وَ قَدْ جَآءَ كَ مِنَ اللّٰهِ اَنَّ قَدْ غَفَرَ لَكَ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِكَ وَ مَا تَاَخَّرَ. قَالَ: اَفَلَا اَکُوْنُ عَبْدًا شَکُوْرًا؟» [1]

''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ اللہ کے رسول ﷺ اتنا طویل قیام فرماتے کہ آپ ﷺ کے قدم مبارک متورم ہو جاتے۔ عرض کیا گیا: اے اللہ کے رسول! آپ کو تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اگلے پچھلے گناہوں کی معافی کی بشارت آئی ہے۔ پھر آپ ﷺ اتنی مشقت کیوں اٹھاتے ہیں؟'' فرمایا: کیا میں اللہ کا شکر گزار بندہ نہ بنوں؟''

معلوم ہوا کہ نمازوں میں حسب استطاعت طویل قیام کرنا چاہیے۔ چنانچہ جس شخص کو اللہ تعالیٰ نے حفظِ قرآن کی نعمتِ عظمیٰ سے نوازا ہو تو بہت بہتر ہے اور جو شخص حافظ قرآن نہ ہو، لیکن طویل قیام کرنا چاہتا ہو، وہ قرآنِ کریم سے دیکھ کر قراءت کر سکتا ہے۔ ذخیرۂ احادیث میں اس سے منع کی کوئی روایت موجود نہیں بلکہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور اسلافِ امت کا تعامل اسی پر ملتا ہے کہ وہ قرآنِ کریم سے دیکھ کر قراءت کیا کرتے تھے۔ مثلاً: ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے غلام، جنابِ ذکوان قران کریم سے دیکھ کر ان کی امامت کراتے تھے۔ ملاحظہ ہو! صحیح بخاری، باب امامة العبد والمولیٰ۔ مؤطا امام مالك، باب قیامِ رمضان، السنن الکبریٰ للبیهقی، ج:۲،ص:۵۳، قیام اللیل للمروزی،ص:۱۶۲، مسند الشافعی، مصنف ابن ابی شیبه، بحواله فتح الباری، ج:۲،ص:۱۵۸، و تلخیص لحبیر، ج:۳،ص::۴۳، و نیل الاوطار، ج:۲،ص:۱۸۳۔

امام کا نمازِ تراویح میں قرآن سے دیکھ کر جماعت کروانا:

سوال: کیا امام تراویح میں قرآن سے دیکھ کر جماعت کرا سکتا ہے یہاں اکثر لوگ حافظ نہیں، لہٰذا یہی طریقہ رائج ہے؟ بعض کا خیال ہے کہ ایسا جائز نہیں، سامع تو قرآن کھول سکتا ہے لیکن امام نہیں۔

جواب: ''ابن ابی شیبہ'' میں ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا مدبّر غلام (وہ غلام جسے آقا یہ کہہ دے کہ تو میرے

---

[1] صحیح ابن خزیمه، بَابُ اسْتِحْبَابِ الصَّلَاةِ وَكَثْرَتِهَا، وَطُولِ الْقِيَامِ فِيهَا......الخ: ج:۲، ص:۲۰۱، رقم: ۱۱۸٤، السنن الکبریٰ للبیهقی، ج:۲،ص:۱٦،رقم: ٤۲۹٤

مرنے کے بعد آزاد ہے) ''ذکوان'' رمضان میں مصحف سے دیکھ کران کی امامت کراتا تھا۔[1]

بخاری کے ''ترجمۃ الباب'' میں الفاظ یوں ہیں:

« وَ كَانَت عَائِشَةُ يَؤُمُّهَا عَبدُهَا ذَكوَانُ مِنَ المُصحَفِ »[2]

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ رقمطراز ہیں:

« اُستُدِلَّ بِهٖ عَلٰى جَوَازِ قِرَاءَةِ المُصَلِّي مِنَ المُصحَفِ.»

یعنی اس سے استدلال کیا گیا ہے کہ نمازی قرآن سے دیکھ کر پڑھ سکتا ہے۔ (حوالہ مذکور، ص:۱۵۸)

اس سے معلوم ہوا کہ قرآن سے دیکھ کر اِمامت کرانے میں کوئی حرج نہیں۔ سامع اور اِمام کی تفریق کی کوئی وجہ نہیں۔

تراویح کے علاوہ فرض نماز میں مقتدی کا قرآنِ مجید سے دیکھ کر امام کا قرآنِ مجید سننا:

سوال: تراویح کے علاوہ فرض نماز میں مقتدی قرآنِ مجید سے دیکھ کر امام کا قرآنِ مجید سن سکتا ہے یا نہیں۔ از روئے قرآن وحدیث جواب سے نوازیں۔ براہِ کرام مسئلہ مدلل بیان فرمائیں۔ اللہ تعالیٰ جزائے خیر عطا فرمائے۔

جواب: میرے خیال میں شرع میں اس عمل کے جواز کا ثبوت مشکل امر ہے۔ لہٰذا اس سے احتراز کرنا چاہیے۔ قدرے تفصیل کے لیے مجموع فتاویٰ شیخ ابن باز (۳۱۰/۴) دیکھنا چاہیے۔

اور نمازِ تراویح میں بھی اولیٰ ترک ہے۔ سعودی عرب کی اِفتاء کی دائمی کمیٹی کا فتویٰ رمضان وغیر رمضان میں امام کے لیے بوقتِ ضرورت جہری نماز میں جواز ہے۔[3]

لیکن فرض نماز میں امام کے لیے قرآن سے دیکھ کر قرأت کرنے کا مسئلہ میرے نزدیک محل نظر ہے۔ کیونکہ اس سلسلہ میں امام احمد رحمہ اللہ سے سوال ہوا کہ کیا امام فرضوں میں بھی قرآنِ مجید دیکھ کر امامت کرا سکتا ہے؟ تو انھوں نے فرمایا: فرضوں میں یہ ہوتا ہے؟ یعنی فرضوں میں لمبے قیام کی کیا ضرورت ہے ایک آدھ سورت ہی کافی ہے۔ ملاحظہ ہو قیام اللیل مروزی وغیرہ۔

اگر تراویح نمازِ تہجد ہے تو پھر غیر رمضان میں باجماعت کیوں ادا نہیں کی جاتی؟

سوال: اگر تراویح نماز تہجد ہے تو پھر غیر رمضان میں باجماعت کیوں ادا نہیں کی جاتی؟

---

1. مصنف ابن ابی شیبۃ، رقم:۷۲۱۷، ۸۲۱۸
2. صحیح البخاری، فَمَن جَاءَ بَعدَ ذٰلِكَ فَإِنَّمَا يَجِيءُ بِحَقٍّ إِلَى الصَّلَاةِ، فتح الباری، ۱۸٤/۲
3. فتاویٰ: ٦/ ۳۹٦

(جواب) : اولاً: رسول اکرم ﷺ کی عملی زندگی سے اسی طرح ثابت ہے۔

ثانیاً: نوافل کی جماعت کا صرف جواز ہی ہے۔ضروری نہیں۔

ہر دو یا چار تراویح کے بعد تسبیحات پڑھنے کے لیے وقفہ کرنا:

(سوال) : کیا ہر دو یا چار تراویح کے بعد تسبیحات پڑھنے کے لیے وقفے کا اہتمام کرنا جائز ہے؟

(جواب) : نمازِ تراویح کے دوران تسبیحات پڑھنے کے لیے وقفے کا اہتمام کرنا کسی بھی مرفوع متصل صحیح روایت سے ثابت نہیں۔ البتہ امام ابن قیم رحمہ اللہ نے ''بدائع الفوائد'' (۱۱۰/۴) میں امام احمد رحمہ اللہ سے نقل کیا ہے کہ وہ وقفوں میں درج ذیل کلمات پڑھا کرتے تھے:

« لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحدَهُ لَا شَرِيكَ لَهُ، وَ أَستَغفِرُ اللّٰهَ الَّذِی لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ. »

فرض نماز کے لیے نمازِ تراویح کی جماعت میں شامل ہوں یا اکیلے پڑھ لیں؟

(سوال) : تراویح کی جماعت ہوتے ہوئے کوئی شخص فرض نماز تنہا پڑھ سکتا ہے یا جماعت میں شریک ہونے کا پابند ہوگا؟

(جواب) : ایسی صورت میں جماعت میں شریک ہو کر جماعت کے اجر وثواب کو پا لے گا۔ ان شاء اللہ اور تنہا پڑھنے کی صورت میں فرض ادا ہو جائے گا۔ اگرچہ جماعت کے اجر سے محروم ہے۔ حدیث میں ہے:

« صَلَاةُ الجَمَاعَةِ أَفضَلُ مِن صَلَاةِ الفَذِّ بِسَبعٍ وَعِشرِينَ دَرَجَةً » (متفق علیه)[1]

یعنی اکیلے کی نسبت باجماعت نماز کا درجہ ستائیس گنا زیادہ ہے۔

روزوں میں نمازِ تراویح کے بعد آدمی نفلی نماز پڑھ سکتا ہے؟

(سوال) : روزوں میں نمازِ تراویح کے بعد آدمی نفلی نماز پڑھ سکتا ہے؟ دو کا تو ذکر آتا ہے اس کے علاوہ قیام کر سکتا ہے۔ کیونکہ نبی ﷺ سے مروی ہے کہ آپ رمضان اور غیر رمضان میں ۱۱ رکعات پڑھاتے۔ اس لیے اگر کوئی ثبوت ہو تو اس کا حوالہ ضرور دیں۔

(جواب) : بہتر یہی ہے کہ ۸ تراویح پر ہی کفایت کی جائے۔ تاہم اگر کوئی مزید نوافل پڑھنا چاہے تو جائز ہے۔

رمضان المبارک میں تراویح کے بعد مزید نفل نماز ادا کرنا:

(سوال) : رمضان المبارک میں تراویح کے بعد مزید نفل نماز ادا کی جا سکتی ہے اس میں کوئی حرج تو نہیں ہے؟"

[1] صحیح مسلم، بَابُ فَضلِ صَلَاةِ الجَمَاعَةِ، وَبَيَانِ التَّشدِيدِ ......الخ ،رقم: ۶۵۰

(جواب): کوشش کرنی چاہیے کہ نمازِ تراویح کو طول قیام (لمبا قیام) کے ساتھ پڑھا جائے۔ اگر کسی وقت بعد میں نوافل پڑھے جائیں تو جواز ہے۔

نمازِ تراویح اور نمازِ وِتر کے علاوہ مزید نوافل یا تہجد ادا کی جاسکتی ہے؟

(سوال): کیا رمضان المبارک میں تراویح اور وِتر کے علاوہ مزید نوافل یا تہجد ادا کی جاسکتی ہے؟

(جواب): مسئلہ ہذا میں اہلِ علم کا اختلاف ہے۔ بعض عدمِ جواز کے قائل ہیں جب کہ دیگر جواز کے قائل ہیں۔ بظاہر جواز ہے۔ حدیث میں ہے کہ ایک صحابیٔ رسول نے جنت میں آپ کی ہمسائیگی کا سوال کیا تھا، تو آپ نے انھیں فرمایا: « فَأَعِنِّي عَلٰی نَفسِكَ بِكَثرَةِ السُّجُودِ »[1] نمازِ تراویح دراصل تہجد ہی ہے۔ علیحدہ پڑھنے کی ضرورت نہیں۔

آٹھ تراویح کے بعد نفل نماز پڑھنا:

(سوال) رمضان المبارک کی طاق رات ۲۳ویں شب) کو شب بیداری اور تلاش لیلۃ القدر کے اشتیاق میں مسجد میں معتکفین اور بعض اہل محلّہ نے آٹھ رکعات نمازِ تراویح ادا کرنے کے بعد کچھ دیر توقف کیا اور پھر دوبارہ قیام اللیل کی نیت سے باجماعت نوافل ۲۲ رکعات) اور تین وتر ادا کیے۔ اگلے روز انہوں نے سے بھی آئندہ طاق رات ساتھ رہنے پر اصرار کیا۔ تو میں نے اُنہیں کہا کہ قیام اللیل، تہجد اور تراویح ایک ہی عبادت کے مختلف نام ہیں اور نبی اکرم ﷺ نے تاحیات مابین نمازِ عشاو فجر گیارہ سے زائد رکعات ادا نہیں فرمائیں لہٰذا اسی پر اکتفا کرنا اولیٰ اور اوثق ہے، نیز مسنون عمل بہتر ہے ایک کثیر مگر غیر ثابت شدہ عمل سے۔

ساتھیوں کا یہ بھی کہنا ہے کہ نوافل کی کوئی تعداد مقرر نہیں اور یہ کہ بعض صحابہؓ سے چالیس رکعات تک ثابت ہیں۔ میرا موقف یہ ہے کہ اگر کوئی انفرادی طور پر مزید ادا کرنا چاہے تو بات اور ہے مگر جہاں تک باجماعت قیام اللیل کی بات ہے تو رسول اللہ ﷺ اور خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم (جملہ صحابہ کرامؓ) سے زائد ثابت نہیں ہے۔ کتاب وسنت کی روشنی میں مسئلہ کی وضاحت فرمادیں نیز ۴۰ رکعات تک والی روایات کی اسنادی حیثیت بھی واضح فرمادیں۔

(جواب) زیادہ محتاط مسلک یہ ہے کہ صرف ثابت شدہ گیارہ رکعات پر اکتفا کیا جائے اور تعداد میں اضافہ کے بجائے ان کو لمبے قیام کی صورت میں ادا کیا جائے جس طرح کہ احادیث سے ثابت ہے۔ البتہ وتر کے

---

[1] صحیح مسلم، بَابُ فَضلِ السُّجُودِ وَالحَثُّ عَلَیهِ، رقم: ٤٨٩

بعد بسا اوقات انفرادی نوافل کا جواز ہے، جس طرح کہ صحیح مسلم وغیرہ میں رسول اللہ ﷺ کے عمل سے ثابت ہے۔ عام حالات میں باجماعت نوافل کو سنتِ مسلوکہ بنانے سے احتراز کرنا چاہیے۔ صحابہ کرامؓ کے عمل سے زیادہ تعداد کا اثبات محلِ نظر ہے۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو کتاب صلاۃ التراویح از علامہ البانی رحمہ اللہ

مسجدِ نبوی میں تراویح کی نماز باجماعت:

سوال: مسجدِ نبوی میں تراویح کی نماز کی جماعت کب شروع ہوئی اور رکعات کی تعداد کتنی تھی۔ آٹھ یا بیس۔ دلیل حدیث سے دیں۔ اگر ۸ رکعات تھی تو پھر بیس رکعات کا اختلاف کب شروع ہوا اور سب سے پہلے کس امام یا صحابی نے اختلاف کیا؟ اور کس مسجد سے اختلاف شروع ہوا اور کس دور میں؟ حنفی لوگ آج بھی مسجد نبوی کی دلیل دیتے ہیں کہ وہاں بیس رکعات پڑھی جاتی ہیں اور مکہ مکرمہ مسجد حرام میں بھی ۲۰ رکعات پڑھائی جاتی ہیں۔

جواب: آٹھ رکعات تراویح عہدِ نبوی میں شروع ہوئیں۔ آپ زندگی بھر آٹھ ہی پڑھتے رہے، جس طرح کہ صحیح بخاری وغیرہ میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث میں واضح ہے۔[1]

اور حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی روایت میں بھی اس امر کی تصریح موجود ہے۔ بیس رکعات کی نسبت لوگوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی طرف کی ہے لیکن یہ بات درست نہیں، کیونکہ بسندِ صحیح حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے بھی آٹھ رکعات ہی ثابت ہیں اور حرمین شریفین میں عام نوافل کے طور پر اضافہ کیا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آخری عشرہ میں مزید اضافہ کر لیتے ہیں اور ائمہ بھی بدلتے رہتے ہیں، جب کہ سعودی عرب میں حرمین شریفین کے علاوہ اکثر و بیشتر آٹھ رکعات پر ہی اکتفا کرتے ہیں۔ مسئلہ ہذا میں تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو! ''انوار المصابیح'' مؤلفہ مولانا نذیر احمد رحمہ اللہ تعالیٰ۔

داڑھی کٹوانے والے حافظ کے پیچھے نمازِ تراویح:

سوال: ایک حافظِ قرآن نے مسجد میں تین یا چار سال تراویح میں مکمل قرآن سنایا۔ مگر اس دوران نماز میں کچھ سستی کرتا رہا نیز شعبان میں داڑھی کچھ زیادہ کر لیتا ہے بعد میں پھر چھوٹی کرتا ہے۔

اس کی یہ دو خامیاں دیکھ کر چند لوگوں نے اُس کو مسجد میں تراویح پڑھانے سے روک دیا۔ لوگوں نے اُسے سمجھایا بھی مگر وہ نہ سمجھا۔ دو سال بعد اب پھر یہ حافظ قرآن کہتا ہے کہ میں ان شاء اللہ داڑھی بھی پوری

[1] صحيح البخاري، بَابُ فَضلِ مَنْ قَامَ رَمَضَانَ، رقم: ٢٠١٣

کروں گا نمازیں بھی پابندی کے ساتھ ادا کروں گا، میں سچا وعدہ کرتا ہوں۔

آپ سے جواب طلب یہ ہے کہ کیا ایسے آدمی کو موقع دینا چاہیے یا کہ نہیں؟ آپ کے جواب پر جماعت کا فیصلہ ہے۔

(جواب): قرآنِ مجید میں قصۂ خضر اور موسیٰ علیہ السلام سے راہنمائی ملتی ہے، کہ جب معاملہ بندوں کے درمیان ہو تو تین دفعہ عذر اور معذرت کو کافی سمجھا جا سکتا ہے اور جب معاملہ اللہ اور بندے کے درمیان ہو، تو اس میں مزید نرمی کی گنجائش ہوتی ہے، جس طرح کہ احادیث میں وارد ہے۔ کہ سب سے آخر میں جہنم سے نکالا جانے والا آدمی بار بار وعدہ کر کے توڑ دے گا۔ آخر کار رحمتِ الٰہی کے جوش سے اس کو بھی جنت میں داخل کر دیا جائے گا۔ [1]

اب حافظ صاحب کی متعدد مرتبہ وعدہ خلافی کے پیشِ نظر اصحاب جماعت کو چاہیے کہ اس کا خوب جائزہ لیں، کہ یہ وعدہ وفائی کرے گا یا نہیں۔ اگر قلبی اطمینان حاصل ہو جائے، تو مزید موقع دینے میں کوئی حرج نہیں۔ بصورتِ دیگر اس کا معاملہ ایک سال کے لیے ملتوی کر دیا جائے تا کہ عملاً توبہ کا ظہور ہو جائے، کیونکہ شرع میں پرکھنے کی مدت ایک سال ہے۔ صحیح بخاری کے تراجم ابواب میں اس امر کی تصریح موجود ہے۔

عورت نمازِ تراویح پڑھانا:

(سوال) کیا عورت نمازِ تراویح پڑھا سکتی ہے؟ جواز کی صورت میں کہاں کھڑی ہو۔

(جواب) سنن ابوداود میں ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے اُمّ ورقہ بنت عبداللہ بن الحارث کو حکم دیا تھا کہ «أَنْ تَؤُمَّ أَهْلَ دَارِهَا» [2] یعنی ''اپنے گھر والوں کی امامت کرائے''

عون المعبود (۲/۲۱۲) میں ہے کہ

> ''اس حدیث سے ثابت ہوا کہ عورتوں کی امامت اور ان کی جماعت رسول اللہ ﷺ کے فرمان سے صحیح ثابت ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور اُمّ سلمہ رضی اللہ عنہا نے عورتوں کی امامت فرض اور تراویح میں کرائی تھی''

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ تلخیص الحبیر میں فرماتے ہیں: ''حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے عورتوں کی

[1] صحيح البخاري، بَابُ الصِّرَاطُ جِسرُ جَهَنَّمَ، حديث: ٦٥٧٣ و باب فضل السجود، رقم: ٨٠٦

[2] سنن أبي داؤد، بَابُ إِمَامَةِ النِّسَاءِ، رقم: ٥٩٢، السنن الكبرى للبيهقي، بَابُ إِثْبَاتِ إِمَامَةِ الْمَرْأَةِ، رقم: ٥٣٥٣

امامت کرائی، پس ان کے درمیان میں کھڑی ہوئیں۔ (1)

ان کے طریق سے دارقطنی اور بیہقی میں ابوحازم عن لائطة الحنفیة حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے منقول ہے کہ انہوں نے فرض نماز میں عورتوں کی امامت کرائی اور وہ ان کے درمیان تھیں۔ ابن ابی شیبہ اور حاکم میں ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا عورتوں کی امامت کراتیں اور صف میں ان کے ساتھ کھڑی ہوتیں اور اُمّ سلمہ کی حدیث میں ہے کہ انہوں نے عورتوں کی امامت کرائی اور درمیان میں کھڑی ہوئی تھیں۔ (2)

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے ''الدرایہ'' میں ذکر کیا کہ ''عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا رمضان کے مہینے میں عورتوں کی امامت کراتی تھیں اور ان کے درمیان کھڑی ہوتی تھیں''۔

علامہ شمس الحق فرماتے ہیں: ''ان احادیث سے معلوم ہوا کہ عورت جب عورتوں کی امامت کرائے تو ان کے درمیان کھڑی ہو، آگے کھڑی نہ ہو۔'' اور سبل السلام میں ہے: ''یہ حدیث اس امر کی دلیل ہے کہ عورت کا اپنے گھر والوں کی امامت کرنا درست ہے، اگرچہ ان میں آدمی ہو۔ کیونکہ روایت سے یہ ثابت ہے کہ اُمّ ورقہ کا مؤذّن ایک بوڑھا آدمی تھا۔ ظاہر یہ ہے کہ اُم ورقہ اس کی اور اپنے غلام اور لونڈی سب کی امام تھی۔ (3)

ابوثور، مزنی اور طبری کے نزدیک عورت کی امامت درست ہے، البتہ جمہور اس کے مخالف ہیں۔ ان دلائل سے معلوم ہوا کہ عورت کو فرض نماز کے علاوہ تراویح اور نوافل میں بھی امامت درمیان میں کھڑے ہوکر کرانی چاہیے۔ واللہ اعلم!

تراویح کے بعد وِتر پڑھنے کا طریقہ:

سوال: یہاں سعودی عرب میں تراویح کے بعد وِتر پڑھنے کا طریقہ ہمارے ہندوستان کے طریقہ سے مختلف ہے۔ خاص طور پر حرم مکی و حرم مدنی میں وِتر کی نماز دو پھر ایک رکعت پڑھی جاتی ہے۔ ہوتا یہ ہے کہ لوگ تراویح کے بعد فوراً مسجد سے نکل پڑتے ہیں یا مسجد میں ہی ایک طرف تین رکعت ایک سلام اور تشہد سے پڑھتے ہیں۔ بعض اہلِ علم سے سنا ہے کہ اس طرح امام کے پیچھے نمازیں پڑھتے پڑھتے اور پھر یہ سمجھ کر وِتر نہ

---

(1) مصنف عبدالرزاق، بَابُ الْمَرْأَةِ تَؤُمُّ النِّسَاءَ، رقم: ٥٠٨٧

(2) المستدرك للحاكم، بَابٌ فِي فَضْلِ الصَّلَوَاتِ الْخَمْسِ، رقم: ٧٣١

(3) سنن أبي داؤد، بَابُ إِمَامَةِ النِّسَاءِ، رقم: ٥٩٢، السنن الكبرى للبيهقي، بَابُ إِثْبَاتِ إِمَامَةِ الْمَرْأَةِ، رقم: ٥٣٥٣

پڑھنا کہ یہ طریقہ صحیح نہیں ہے تو یہ عمل غلط ہے۔ ان لوگوں کو چاہیے کہ امام ہی کی قیادت میں جس طرح یہ وِتر پڑھتے ہیں اسی طرح پڑھیں۔ یہ طریقہ بھی ثابت ہے دوسری طرف سے کچھ لوگ کہہ دیتے ہیں کہ یہ طریقہ صحیح نہیں۔ تراویح تو صحیح ہے لیکن وِتر نہیں۔ برائے کرم وضاحت فرمائیں کہ یہاں پر رہنے والوں کو کونسا عمل کرنا چاہیے۔ تاکہ وہ عند اللہ ماجور ہوں۔

(۲) ۱۳۸۲ھ۔ بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ الجواب: و فی اشتراط عدم فصله کما فی الارشاد من انه لا یجوز اصلا باجماع اصحابنا الخ (شامی، ج:۱، ص:۴۴۹) کی رُو سے عند الاحناف نمازِ وِتر کی ادائیگی کا مذکور فی السوال طریقہ سے درست نہیں۔ احناف کو چاہیے کہ وِتر الگ پڑھیں۔

الجواب صحیح۔ کفیل الرحمن نائب مفتی دارالعلوم دیوبند۔ حبیب الرحمن عفا اللہ عنه، محمد طاهر عفا اللہ عنه۔

جواب: دارالعلوم دیوبند کا فتویٰ تنگ نظری پر مبنی ہے مسجد الحرام اور مسجد نبوی میں وتر پڑھانے کا مروّج عمل عین سنت کے مطابق ہے۔ بلکہ افضل یہ ہے کہ وتروں میں دو رکعت اور ایک رکعت میں فاصلہ کر لیا جائے۔ چنانچہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ رات کو گیارہ رکعت پڑھتے اور ہر دو رکعت کے بعد سلام پھیرتے اور ایک وِتر پڑھتے۔[1]

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ آپ ایک رکعت وِتر پڑھا کرتے تھے۔ دو رکعت اور ایک رکعت کے درمیان بات چیت بھی کیا کرتے تھے۔[2] علامہ البانی نے کہا ہے کہ اس کی سند بخاری و مسلم کی شرط پر صحیح ہے۔[3] ''صحیح ابن حبان'' میں ابن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ دو اور ایک رکعت کے درمیان میں سلام سے فصل کیا کرتے تھے۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے اس کی سند کو قوی قرار دیا ہے۔[4]

امام محمد بن نصر مروزی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ سے اکٹھے وِتر پڑھنے بھی ثابت ہیں۔ مگر ہمیں پسند یہ ہے کہ ہر دو رکعت کے بعد سلام پھیرا جائے۔ اس لیے کہ آپ ﷺ نے سائل کو یہی جواب دیا تھا اور اس

---

① صحیح مسلم، بَابُ صَلَاةِ اللَّيلِ، وَعَدَدِ رَكَعَاتِ النَّبِيِّ ﷺ......الخ، رقم:۷۳۶، ابوداؤد، بَابٌ فِي صَلَاةِ اللَّيلِ، رقم:۱۳۳۶، سنن ابن ماجه، بَابُ مَا جَاءَ فِي كَم يُصَلِّي بِاللَّيلِ، رقم:۱۳۵۸

② مصنف ابن ابی شیبه:۲/۲۹۱

③ إرواء الغليل:۲/۱۵۰

④ فتح الباری:۲/۳۸۶

لیے بھی کہ فصل والی احادیث زیادہ ثابت ہیں اور بہت سے طُرق سے مروی ہیں۔[1]

صلوٰۃ التہجد (تہجد کی نماز)

نماز تہجد کیسے اور کتنی رکعتیں پڑھی جائیں؟

سوال : نماز تہجد کیسے پڑھی جائے اور اس میں کتنی رکعتیں ہوتی ہیں؟

جواب : نمازِ تہجد، نماز عشاء اور فجر کے درمیانے وقت میں پڑھی جاتی ہے، اگر رات کے آخری تہائی حصے میں پڑھی جائے، تو زیادہ افضل ہے۔ اس کی رکعات کی تعداد وتروں سمیت گیارہ ہے، نبی اکرم ﷺ سے اُمّ المؤمنین سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے رمضان وغیر رمضان میں یہی تعداد نقل کی ہے۔[2] البتہ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ایک روایت میں تیرہ تعداد بھی منقول ہے۔

نمازِ تہجد کا آخری وقت:

سوال : ''محدث'' (جون ۲۰۰۱ء) میں آپ نے فرمایا تھا کہ نماز تہجد بروقت ادا نہ کرنے والا نماز فجر کے بعد بارہ رکعت پڑھے۔ اس میں اشکال یہ ہو رہا ہے کہ بارہ کے عدد میں تین وِتر یا ایک وِتر کی رکعت نہیں پڑھی جاسکتی تو کیا وِتر قضاء پڑھنے کی صورت میں وِتر نہیں رہتا؟ دوسری دریافت طلب بات یہ ہے کہ کیا تہجد نماز فجر کی اذان سے متصل پڑھی جاسکتی ہے یا فجر کی اذان سے پہلے پہلے ادا کر لی جائے؟ اگر نمازِ تہجد پڑھنے کے دوران اذان فجر ہو جائے تو نماز جاری رکھے یا ختم کر دے؟

جواب : صورتِ مذکورہ واقعی وِتر کی قضاء نہیں۔ اس حدیث سے معلوم ہوا، کہ عدمِ قضاء کی رخصت ہے۔ تاہم بارہ رکعتوں سے ''قیام اللیل'' کا تدارک ہو جائے گا۔

پَو پھوٹنے (صبح صادق ہونے) سے پہلے تہجد ختم کر دینی چاہیے۔ اس کے بعد صرف نمازِ وِتر پڑھی جاسکتی ہے۔ اگر نماز تہجد کے دوران فجر کی اذان شروع ہو جائے تو شروع کی ہوئی رکعتیں پڑھ کر سلام پھیر دے، پھر وِتر پڑھ لے۔ ویسے ٹائم دیکھ کر پہلے سے احتیاط کرنی چاہیے تاکہ تہجد پہلے ہی مکمل ہو جائے۔

---

[1] قیام اللیل: ۲۰۴

[2] صحیح مسلم، بَابُ صَلَاةِ اللَّيْلِ، وَعَدَدِ رَكَعَاتِ النَّبِيِّ ﷺ......الخ، رقم: ۷۳۶، ابوداؤد، بَابٌ فِي صَلَاةِ اللَّيْلِ، رقم: ۱۳۳۶

ایک حدیث کی اسنادی حیثیت:

(سوال): تہجد کے اٹھنے کے وقت ورد یعنی دس دس مرتبہ ''اَللّٰهُ اَكبَرُ، سُبحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمدِهٖ''وغیرہ پڑھنے والی ابوداؤد کی حدیث کی اسنادی حیثیت درکار ہے؟

(جواب): ''سنن ابی داؤد'' کی جس روایت کی سائل نے نشاندہی کی ہے، اس کو امام موصوف نے ''بَابُ مَا يَقُولُ إِذَا أَصبَحَ'' کے تحت بیان فرمایا ہے۔ صاحب ''العون'' اس کی تشریح میں رقمطراز ہیں:

« قَالَ المُنذِرِيُّ: وَ أَخرَجَهُ النِّسَائِيُّ، وَ فِي إِسنَادِهٖ بَقِيَّةُ بنُ الوَلِيدِ. وَ فِيهِ مَقَالٌ. »

یعنی امام منذری نے کہا ہے: اس روایت کو نسائی نے بھی بیان کیا ہے۔ اس کی سند میں ''بقیہ بن ولید'' راوی ہے اور وہ متکلم فیہ ہے۔''

لہٰذا یہ روایت ضعیف ٹھہری۔ لیکن واضح رہے کہ نسائی کی روایت اس عِلّت سے خالی اور صحیح الإسناد ہے، اس لیے وہ قابلِ حجت والتسلیم ہے۔ ملاحظہ ہو! النسائی: باب ذکر ما یستفتح به القیام) اسی بناء پر علامہ ابن قیم رحمہ اللہ یہ دعا اور مختلف اُدعیہ ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں:

« فَكُلُّ هٰذِهِ الاَنوَاعُ صَحَّت عَنهُ ﷺ . » [1]

یعنی یہ تمام مختلف الأنواع دعائیں رسول اللہ ﷺ سے صحیح سندوں سے ثابت ہیں۔

لہٰذا اس دعا کا پڑھنا بھی مسنون ثابت ہو گیا اور علامہ البانی رحمہ اللہ نے اس پر حسن صحیح کا حکم لگایا ہے۔ [2]

صلوٰۃ الوتر اور قنوتِ نازلہ

وتر کا مسنون طریقہ:

(سوال): یہاں سعودیہ میں وِتر دو رکعت سلام پھیرنے کے بعد پھر الگ سے پڑھا جاتا ہے، جب کہ ہم عام طور پر اکٹھے تین رکعت ادا کرتے ہیں۔ ایک ہی سلام میں۔ ان میں کونسا طریقہ مسنون ہے؟

(جواب): وِتر پڑھنے کے دونوں طریقے درست ہیں، تاہم موصول طریقہ زیادہ بہتر ہے۔ صحیح احادیث کے

---

(1) زاد المعاد، جز:۱، ص:۵۱

(2) سنن أبی داؤد، بَابُ مَا يُستَفتَحُ بِهِ الصَّلَاةُ مِنَ الدُّعَاءِ، رقم:۷۶۶، و رقم۶۹۳

مطابق وِتر موصول اور مفصول (ملا کر اور الگ) دونوں طرح پڑھنے درست ہیں۔[1]

وِتر کیسے پڑھنے چاہئیں؟

سوال : وِتر کیسے پڑھنے چاہئیں؟

جواب : نمازِ وِتر میں ''فصل'' اور ''وصل'' دونوں طرح جائز ہے۔ لیکن افضل ''فصل'' ہے۔ اس کی صورت یوں ہے، کہ دو رکعتیں یا دو دو رکعتیں علیحدہ علیحدہ پڑھ کر، اخیر میں ایک وِتر علیحدہ پڑھا جائے اور ''وصل'' یہ ہے کہ بلا سلام تمام رکعتوں کو ملا کر پڑھا جائے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے، کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم رات کو گیارہ رکعت پڑھتے، ہر دو رکعت کے بعد سلام پھیرتے اور ایک وِتر پڑھتے۔[2]

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے: '' اَلوِترُ رَکعَةٌ مِن آخِرِ اللَّیلِ ''[3]

اور امام محمد بن نصر مروزی فرماتے ہیں:

« فَالَّذِی نَختَارہ لِمَن صَلّٰی بِاللَّیلِ فِی رَمَضَانَ، وَ غَیرِہٖ أَن یُسَلِّمَ بَینَ کُلِّ رَکعَتَینِ، حَتّٰی اِذَا أَرَادَ أَن یُّوتِرَ صَلّٰی ثَلَاثُ رَکعَاتٍ. یَقرَأُ فِی الرَّکعَةِ الاُولٰی بِ﴿سَبِّحِ اسمَ رَبِّكَ الاَعلٰی﴾ وَ فِی الثَّانِیَةِ بِ ﴿قُل یَآاَیُّهَا الکَافِرُونَ ﴾. وَ یَتشهد فِی الثَّانِیَةِ. وَ یُسَلِّمُ. ثُمَّ یَقُومُ فَیُصَلِّی رَکعَةً ، یَقرَأُ فِیهَا بِفَاتِحَةِ الکِتَابِ،وَ ﴿قُل هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ﴾، وَالمُعَوِّذَتَینِ »[4]

وِتر کی حیثیت کیا ہے؟

سوال : وِتر کی حیثیت کیا ہے؟ یعنی فرض، واجب، سنت یا نفل وغیرہ کیا ہے؟

جواب : وِتر فرض، واجب نہیں بلکہ سنت مؤکدہ ہے۔ شاہ ولی اللہؒ ''حجة الله البالغه'' میں فرماتے ہیں:

---

1. المحلّی ابن حزم، ج:۲/۴۶،۴۸
2. صحیح مسلم، بَابُ صَلَاةِ اللَّیلِ، وَعَدَدِ رَکعَاتِ النَّبِیِّ ﷺ فِی اللَّیلِ، ......الخ، رقم: ۷۳۶ ، سنن أبی داؤد، بَابُ فِی صَلَاةِ اللَّیلِ ،رقم: ۱۳۳۶ ،سنن ابن ماجه، بَابُ مَا جَاءَ فِی کَم یُصَلِّی بِاللَّیلِ ،رقم: ۱۳۵۸
3. صحیح مسلم، بَابُ صَلَاةُ اللَّیلِ مَثنٰی مَثنٰی، وَالوِترُ رَکعَةٌ مِن آخِرِ اللَّیلِ برقم: ۷۵۲
4. قیام اللیل، ص: ۲۰۴

«وَالحَقُّ اَنَّ الوِترَ سُنَّةٌ. هُوَ أَوكَدُ السُّنَنِ. بَيَّنَهُ عَلِيٌّ، وَ ابنُ عُمَرَ، وَ عُبَادَةُ بنُ الصَّامِتِ رَضِيَ اللّٰهُ عَنهُم» [1]

رمضان میں نمازِ وتر کی تعداد:

سوال : رمضان المبارک میں بعض اہلِ حدیث مساجد میں نمازِ تراویح باجماعت کے بعد کبھی ایک وِتر کبھی تین وِتر کبھی پانچ وِتر باجماعت پڑھے جاتے ہیں۔ بعض دوستوں کا خیال ہے کہ ایک وِتر باجماعت پڑھنے کا رمضان المبارک کے اندر کوئی ثبوت نہیں ہے۔ لہٰذا یہ ناجائز ہے۔ وِتر صرف تین باجماعت ہیں۔ اس مسئلہ کی وضاحت فرما کر عنداللہ ماجور ہوں۔

جواب : جب عام حالات میں ایک وِتر پڑھنا ثابت ہے، باجماعت ہو یا بلا جماعت تو رمضان میں بھی جائز ہے۔ تخصیص کی کوئی دلیل نہیں۔ بلکہ اولیٰ یہی ہے کہ ایک وِتر علیحدہ پڑھا جائے، جس طرح کہ آج کل ایامِ رمضان میں حرمین شریفین میں باجماعت ایک وِتر علیحدہ پڑھنا معمول ہے۔ جس رات حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے نمازِ تہجد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اپنی خالہ میمونہ کے گھر میں باجماعت پڑھی تھی، اس میں علیحدہ ایک وِتر پڑھنے کا بیان ہے۔ امام محمد نصر مروزی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

« غَيرَ اَنَّ الاَخبَارَ الَّتِي رُوِيَت عَنهُ ﷺ اَنَّهُ اَوتَرَ بِوَاحِدَةٍ هِيَ اَثبَتُ، وَ اَصَحُّ، وَاَكثَرُ عِندَ اَهلِ العِلمِ بِالاَخبَارِ » [2]

یعنی محدثین کے نزدیک ایک وِتر پڑھنے کی احادیث زیادہ پختہ، زیادہ صحیح اور تعداد کے اعتبار سے زیادہ ہیں۔

مزید آنکہ امام مالک رحمہ اللہ سے تصریح موجود ہے کہ امام نمازِ تراویح کے بعد ایک وِتر پڑھائے، فرماتے ہیں: « ثُمَّ يُوتِرُ بِهِم بِوَاحِدَةٍ وَ هٰذَا العَمَلُ بِالمَدِينَةِ » [3] یعنی پھر امام ایک رکعت وِتر پڑھائے۔ مدینہ نبویہ میں عمل اسی پر ہے۔

ایک وِتر پڑھنے کی دلیل کیا ہے؟

سوال : وِتر ایک یا تین یا پانچ ہیں؟ صرف ایک وِتر کا ازراہِ کرم حوالہ دے دیں؟

---

[1] المرعاة: ٢/٢٠٧

[2] قیام اللیل، ص: ٢٠٤

[3] قیام اللیل: ١٥٩

جواب: حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ سے مروی مرفوع روایت میں ہے:

« اَلْوِتْرُ حَقٌّ ، فَمَنْ شَاءَ أَوْتَرَ بِخَمْسٍ. وَ مَنْ شَاءَ بِثَلَاثٍ. وَ مَنْ شَاءَ بِوَاحِدَةٍ.»[1]

''وتر حق ہیں، جو چاہے پانچ پڑھے۔ جو چاہے تین پڑھے اور جو چاہے ایک پڑھے۔''

صحیح بخاری کتاب المغازی میں ہے: « إِنَّ سَعدًا أَوتَرَ بِرَكعَةٍ.»

''حضرت سعد نے ایک رکعت وتر پڑھا۔''

''بخاری کے (باب المناقب) میں ہے:

''حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے ایک رکعت وتر پڑھا، اور ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اس کو درست قرار دیا۔[2] طرح ایک رات حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ایک ہی رکعت میں سارا قرآن پڑھا۔ اس کے علاوہ کوئی نماز نہیں پڑھی۔''[3]

اگر وتر کی تعداد ایک ہے تو پڑھنے کا طریقہ:

سوال: وتر ایک ہے یا نہیں اگر ایک ہے تو پڑھنے کا طریقہ بتائیں؟

جواب: ایک وتر پڑھنا بھی درست ہے۔ طریقہ وہی ہے۔ جس طرح عام حالات میں رکعت پڑھی جاتی ہے۔ البتہ اس میں قنوت کا اضافہ ہے۔

کیا ایک وتر پڑھنا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت نہیں؟

سوال: بعض کا خیال ہے کہ وتر صرف ایک پڑھنا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت نہیں۔ صرف حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا عمل ہے۔ مگر اہلِ حدیث حضرات نے اس کو بہت اپنایا ہوا ہے۔ کیا یہ بات درست ہے؟

جواب: یہ بات غیر درست ہے۔

وتر صرف ایک پڑھنا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی مرفوعاً ثابت ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« وَ مَنْ شَاءَ فَلْيُوتِر بِوَاحِدَةٍ »[4] یعنی جو چاہتا ہے۔ ایک وتر پڑھ لے۔

---

[1] سنن أبي داؤد، بَابُ كَمِ الوِترُ؟، رقم:١٤٢٢، سنن النسائي، بَابُ ذِكرِ الِاختِلَافِ عَلَى الزُّهرِيِّ فِي حَدِيثِ أَبِي أَيُّوبَ فِي الوِترِ، رقم:١٧١٠

[2] صحيح البخاري بَابُ ذِكرِ مُعَاوِيَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنهُ، رقم:٢٧٦٤

[3] فتح الباري: ٢/ ٤٨٢

[4] قيام الليل، ص: ٢١٠

اور ''جامع ترمذی'' میں ہے: « وَ یُوتِرُ بِرَکعَةٍ »[1]

یعنی ''نبی ﷺ ایک رکعت وِتر پڑھتے تھے۔''

اس پر عمل اکیلے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا ہی نہیں، بلکہ صحابہ اور تابعین سے بکثرت ایک وِتر پڑھنا ثابت ہے۔ حافظ زین الدین عراقی لکھتے ہیں:

'' خلفاء اربعہ، سعد بن ابی وقاص، معاذ بن جبل، ابیّ بن کعب، ابوموسیٰ اشعری، ابو الدرداء، حذیفہ، ابن عمر، معاویہ، تمیم داری، ابو ایوب انصاری، ابو ہریرہ، فضالہ بن عبید، عبد اللہ بن زبیر، معاذ بن حرث القاری، (رضی اللہ عنہم) سب ایک رکعت وِتر پڑھا کرتے تھے اور تابعین میں سے سالم بن عبد اللہ بن عمر اور عبد اللہ بن عباس بن ابی ربیعہ، حسن بصری، محمد بن سیرین، عطاء بن ابی رباح، عقبہ بن عبد الغافر، سعید بن جبیر، جابر بن زید، زہری، ربیعہ بن عبد الرحمن (رحمہم اللہ) وغیرہ، ایک ایک رکعت وِتر کے قائل ہیں اور ائمہ میں سے امام شافعی، اوزاعی، احمد، اسحاق، ابوثور، داؤد، ابن حزم (رحمہم اللہ) سب ایک رکعت وِتر کے قائل ہیں۔

امام شوکانی رحمہ اللہ نے بھی اس طرح نقل کیا ہے۔[2]

وِتروں کی تعداد ایک سے نو تک ہے تو کیا ایک وتر صرف مجبوری کے تحت پڑھ سکتے ہیں؟

سوال: عشاء کے وِتر ''الاعتصام'' میں ایک سے نو تک بتائے گئے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ کیا ایک وِتر صرف مجبوری کے تحت پڑھ سکتے ہیں؟ یا کہ ویسے ہی سنت سمجھ کر بھی ایک یا تین پڑھنے سے ثواب میں بھی کمی بیشی ہوتی ہے؟

جواب: عام حالات میں بھی ایک وِتر پڑھنے کا جواز ہے۔ ظاہر ہے زیادہ عمل کرنے سے زیادہ ثواب ملے گا، اور کم کی صورت میں کم۔ بشرطیکہ وہ دائرۂ سنت کے اندر ہو۔

تین وِتر اکٹھے پڑھنے کی صورت:

سوال: دعائے قنوت کا ''الاعتصام'' رسالہ (شمارہ نمبر:۱۱، ۱۹۹۵ء سوال نمبر:۲، ص:۲۸۸) میں کئی دفعہ ذکر آیا ہے کہ رکوع سے قبل اور ہاتھ باندھ کر کرنی چاہیے لیکن اس بارے میں تسلی کریں کہ دو رکعت کے بعد التحیات بیٹھنا ہوتا ہے؟ کیا التحیات پڑھنا درست ہے یا نہیں۔ جیسے حنفی بھائی کرتے ہیں یا نہیں پڑھنا چاہیے؟

---

[1] سنن الترمذی، بَابُ مَا جَاءَ فِی الوِترِ بِرَکعَةٍ، رقم:٤٦١

[2] فتاویٰ عظیم آبادی، ص:٣٦٦

(جواب): تین وِتر اکٹھے پڑھنے کی صورت میں درمیانی تشہد نہیں بیٹھنا چاہیے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی مرفوع روایت میں ہے:

« لَا تُوتِرُوا بِثَلَاثٍ. تَشَبَّهُوا بِالْمَغرِب » (قیام اللیل) [1]

یعنی ''تین وِتر اس طرح نہ پڑھو، کہ نماز مغرب سے مشابہت لازم آئے۔''

تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو! ''المرعاۃ'' (۲/۲۰۱)

کیا عشاء کے وِتر میں دو رکعت پڑھ کر درمیان میں تشہد بیٹھنا چاہیے؟

(سوال): عشاء کے وِتر میں دو رکعت پڑھ کر درمیان میں تشہد بیٹھنا چاہیے کہ نہیں؟ کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ یہ پڑھنے سے وِتر نفل بن جاتے ہیں۔

(جواب): تین وِتر اکٹھے پڑھنے کی صورت میں درمیان میں ''التحیات'' نہیں پڑھنا چاہیے، کیونکہ حدیث میں وِتر کو مغرب کی نماز سے مشابہ کرنے سے منع کیا گیا ہے۔ [2] اور اگر کوئی درمیانی رکعت میں تشہد بیٹھے، تو سلام پھیر کر تیسری رکعت علیحدہ پڑھنی چاہیے۔ امام محمد بن نصر مروزی نے ''قیام اللیل'' میں اسی طریقہ کو اختیار کیا ہے۔ وتروں کے درمیان ''التحیات'' پڑھنے کی صورت میں یہ نفل نہیں بنتے بلکہ مغرب کے فرضوں کے ساتھ مشابہت ہوتی ہے جس سے روکا گیا ہے۔

تین وِتر میں دو رکعت کے بعد التحیات پڑھنا ہے یا نہیں؟

(سوال): دعائے قنوت رکوع کے بعد ثابت ہے یا رکوع سے قبل؟ تین وِتر پڑھنے کا طریقہ بھی بتائیں۔ درمیانی التحیات پڑھنا ہے یا نہیں؟

رسالہ ''الاعتصام'' مؤرخہ ۱۵/ اکتوبر/۱۹۹۲ء میں بیان ہوا ہے کہ وِتر کی دعا رکوع سے قبل مانگنی چاہیے کیا بعد میں مانگنا بدعت ہے یا نہیں؟

(جواب) دعائے قنوت قبل از رکوع اور بعد از رکوع دونوں طرح درست ہے۔ البتہ اَولیٰ بات یہ معلوم ہوتی ہے، کہ قبل از رکوع مانگی جائے۔ تین وِتر کی صورت میں ''فصل'' اور ''وصل'' دونوں طرح درست ہے۔ بہتر یہ

[1] السنن الکبریٰ للبیهقی، بَابُ مَن أَوتَرَ بِثَلَاثٍ مَوصُولَاتٍ بِتَشَهُّدَینِ وَتَسلِیمٍ، رقم:۴۸۱۶، شرح معانی الآثار، رقم:۱۷۳۹

[2] السنن الکبریٰ للبیهقی، بَابُ مَن أَوتَرَ بِثَلَاثٍ مَوصُولَاتٍ بِتَشَهُّدَینِ وَتَسلِیمٍ، رقم:۴۸۱۶، شرح معانی الآثار، رقم:۱۷۳۹

ہے، کہ ''فصل'' کیا جائے، یعنی دو رکعت پر سلام پھیر کر، تیسری علیحدہ پڑھی جائے۔ تین رکعت اکٹھی کی صورت میں درمیانی تشہد نہ پڑھا جائے۔ کیونکہ اس سے نمازِ مغرب کے ساتھ مشابہت پیدا ہو جاتی ہے، جس کی حدیث میں ممانعت آئی ہے۔

کیا وتروں کی دوسری رکعت کے بعد تشہد ہے؟

سوال: نماز وِتر کے دوران دوسری رکعت میں عام نمازوں کی طرح تشہد پڑھنا چاہیے یا کہ نہیں نیز اس میں دعائے قنوت پڑھنے کا طریقہ بھی بیان کریں۔

جواب: وتروں کی دوسری رکعت میں تشہد نہیں، کیونکہ نبی ﷺ نے وتروں میں مغرب کی مشابہت سے منع فرمایا ہے۔ ''دعائے قنوت'' تیسری رکعت میں رکوع سے پہلے پڑھی جائے، تو اَولیٰ ہے اور رفع یدین کرنے کا اختیار ہے۔ بطورِ نص نبی ﷺ سے رفع یدین ثابت نہیں۔ البتہ صحابہ رضی اللہ عنہم کے اقوال میں ثبوت ملتا ہے۔ ملاحظہ ہو: (قیام اللیل)

ایک رات میں دو دفعہ وِتر پڑھنا:

سوال: کیا ایک رات میں دو دفعہ وِتر پڑھے جا سکتے ہیں، خاص کر آج کل آخری عشرہ میں تمام مساجد میں قیامُ اللیل ہوتا ہے۔ اگر انسان کسی وجہ سے پہلے بھی وِتر ادا کر چکا ہو تو کیا دوبارہ وتر پڑھے یا چھوڑ دے؟ نیز وِتر کے بعد جو دو رکعت ادا کی جاتی ہیں۔ (نفل کے طور پر) اس کا کیا جواز ہے؟

جواب: صحیح احادیث کے مطابق وِتر موصول (اکٹھے) اور مفصول (علیحدہ) دونوں طرح پڑھنے درست ہیں۔ [1]

مسئلہ ہذا میں اہلِ علم کا اختلاف ہے۔ بعض نقض (ایک رکعت نفل پڑھ کر پہلے پڑھے ہوئے وِتر کو جفت بنانا، اور پھر دوبارہ وِتر پڑھنے) کے قائل ہیں۔ ان میں سے امام اسحاق بن راہویہ ہیں اور دوسرا گروہ عدمِ نقض (پہلے وِتر کو جُفت نہ بنانا مذکورہ وضاحت کے برعکس) کا قائل ہے۔ یہ مذہب سفیان ثوری، مالک بن انس، احمد اور عبداللہ بن مبارک رحمہم اللہ کا ہے۔ اس کے بارے میں امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

« وَ هٰذَا اَصَحُّ ، لِاَنَّهُ قَد رُوِیَ مِن غَیرِ اَوجُهٍ ، اَنَّ النَّبِیَّ ﷺ صَلّٰی بَعدَ الوِترِ » [2]

---

[1] المحلّٰی لابن حزم، ۲/ ۴۲۔ ۴۸

[2] سنن الترمذی، بَابُ مَا جَاءَ لَا وِترَانِ فِی لَیلَةٍ ،رقم: ۴۷۹ ، مع تحفة الاحوذی، ۲/ ۵۷۶ ، طبع مصری

یعنی یہی مسلک زیادہ صحیح ہے۔ اس لیے کہ کئی طرق سے وارد ہے کہ نبی ﷺ نے وِتر کے بعد نماز پڑھی ہے۔

اور صاحب ''تحفہ'' فرماتے ہیں:

« وَ هٰذَا هُوَ الْمُخْتَارُ عِنْدِي. وَ لَمْ اَجِدْ حَدِيثًا مَّرْفُوعًا صَحِيحًا، يَدُلُّ عَلٰى ثُبُوتِ نَقْضِ الْوِتْرِ. »

(میرے نزدیک یہی بات درست ہے۔ کیونکہ میں نے کوئی صحیح مرفوع حدیث نہیں پائی جو وِتر کو توڑنے کرنے پر دلالت کرتی ہو۔) واللہ تعالیٰ اُعلم (صفحہ مذکور)

وتر کے بعد نوافل جائز ہیں۔ قولی حدیث میں ہے:

« اِجْعَلُوا آخِرَ صَلٰوتِكُمْ بِاللَّيْلِ وِتْرًا » ①

یعنی ''رات کی آخری نماز وِتر بناؤ۔''

اور فعلی حدیث میں ہے:

« ثُمَّ يُوتِرُ، ثُمَّ يُصَلِّي رَكْعَتَيْنِ، وَ هُوَ جَالِسٌ » ②

یعنی ''پھر آپ وِتر پڑھتے۔ پھر دو رکعتیں بیٹھے ہوئے ادا کرتے۔''

فعل میں چونکہ خاصے کا احتمال ہے، اس لیے بہتر یہ ہے کہ وِتر کے بعد نوافل نہ پڑھے جائیں اور اگر کوئی پڑھ لے تو جائز ہے۔

کیا رسول اللہ ﷺ نے امت کی سہولت کے لیے وِتر نوافل میں ضم کر دیے؟

سوال: بعض علماء کا کہنا ہے کہ وِتر صرف ایک رکعت ہی ہے، رسول اللہ ﷺ نے امت کی سہولت کے لیے بعض اوقات وِتر نوافل میں ضم کر دیا کیا یہ قول درست ہے؟

جواب: صحیح مسلم میں ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی حدیث میں ہے: «اَلْوِتْرُ رَكْعَةٌ مِنْ اٰخِرِ اللَّيْلِ» ③ یعنی ''وِتر ایک رکعت ہے، آخر رات کو۔'' دوسری روایت میں ہے، کہ ''وِتر حق ہے ہر مسلمان پر، پس جو شخص وِتر

① صحیح مسلم، بَابُ صَلَاةُ اللَّيْلِ مَثْنَى مَثْنَى، وَالْوِتْرُ رَكْعَةٌ مِنْ آخِرِ اللَّيْلِ، رقم: ۷۵۱، سنن ابی داؤد، رقم: ۱۴۳۸

② صحیح مسلم، بَابُ صَلَاةِ اللَّيْلِ، وَعَدَدِ رَكَعَاتِ النَّبِيِّ ﷺ ...... الخ، رقم: ۷۳۸

③ صحیح مسلم، بَابُ صَلَاةُ اللَّيْلِ مَثْنَى مَثْنَى، وَالْوِتْرُ رَكْعَةٌ مِنْ آخِرِ اللَّيْلِ، رقم: ۷۵۲

پانچ رکعت پڑھنا چاہے، وہ پڑھے اور جو کوئی وِتر تین رکعت پڑھنا چاہے، پڑھے اور جو کوئی وِتر ایک رکعت پڑھنا چاہے۔ وہ پڑھے''

اس سے معلوم ہوا، کہ وِتر پانچ بھی ہیں۔ تین بھی ہیں اور ایک بھی۔ جملہ صورتوں کا آدمی کو اختیار ہے، سب کا نام وِتر ہے، صرف ایک پر اصرار کرنا درست نہیں۔

''تورّک'' دو رکعتی یا ایک رکعتی نماز کے قعدہ میں؟

سوال: فجر کی نماز میں دوسری رکعت کے بعد اور ایک وِتر پڑھتے ہوئے قعدہ میں تورک اختیار کرنا ہوگا یا ایک پاؤں کھڑا کر کے بائیں پاؤں پر بیٹھیں گے جیسے دونوں سجدوں کے درمیان بیٹھتے ہیں؟

جواب: مسئلہ ہذا میں اگرچہ اہلِ علم کا اختلاف ہے، لیکن ظاہر یہ ہے کہ دو رکعتی یا ایک رکعتی نماز کے قعدہ میں بھی ''تورک'' ہے۔ کیونکہ حدیث کے الفاظ «فی الركعة الأخيرة» عام ہیں۔ امام شافعی رحمہ اللہ کا بھی یہی مسلک ہے۔[1]

رات کو وِتر رہ جائیں تو:

سوال: آدمی کے رات کو وِتر رہ جائیں اور صبح بھی دیر سے اُٹھے تو کتنے وِتر پڑھے؟

جواب: حسب موقعہ ایک رکعت پر بھی اکتفا ہوسکتا ہے۔

سوال: اگر کسی کے وِتر رہ جائیں تو وہ کب ادا کرے۔ نماز فجر سے پہلے یا سورج نکلنے کے بعد؟

جواب: جب چاہے قضائی دے لے۔ کسی وقت نہ بھی دے سکے تو کوئی حرج نہیں۔

وتر کی قضائی:

سوال نمازِ وتر کی قضا دی جاسکتی ہے یعنی کیا آدمی اسے نمازِ فجر کے فوراً بعد پڑھ سکتا ہے جبکہ وہ نمازِ تہجد کے لئے نہ اُٹھ سکا ہو؟

جواب اس کی بہتر صورت یہ ہے کہ دن کے وقت بارہ رکعت پڑھ لی جائیں۔ چنانچہ مشکوٰۃ شریف میں حدیث ہے کہ جب کبھی نبی ﷺ بیماری یا غلبہ نیند کی وجہ (نماز تہجد کے لئے نہ اٹھ سکتے) تو دن کو بارہ رکعت پڑھ لیا کرتے۔ امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے المنتقی میں اس حدیث پر ان الفاظ سے عنوان قائم کیا ہے: باب قضاء بالفوت من الوتر و السنن الراتبة والاوراد ''وتر، سنتوں اور وظائف کی قضا کا باب''۔

[1] فتح الباری: ۲/۳۰۹

اور نمازِ فجر کے بعد بھی قضا دے لی جائے تو جواز ہے۔ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی میں ہے کہ ''جو شخص سو گیا یا بھول گیا تو وہ صبح کرے یا جب یاد آئے وتر پڑھ لے''۔

یہ روایت ترمذی میں ہے لیکن اس کی سند میں ایک راوی عبدالرحمٰن بن زید بن اسلم ائمہ حدیث کے نزدیک قابل حجت نہیں، البتہ اس کا ایک متابع (مؤید) محمد بن مطرف سنن ابوداد، دارقطنی اور حاکم میں موجود ہے۔ اس لیے یہ حدیث قابل حجت ہے۔

کیا وِتر کی نماز کے بعد بیٹھ کر دو نفل پڑھنا

سوال: کیا وِتر کی نماز کے بعد بیٹھ کر دو نفل پڑھنا جائز ہے؟

جواب: وتروں کے بعد دو رکعتیں پڑھنے کا صرف جواز ہے۔ تاکید نہیں۔ چنانچہ صحیح مسلم میں ہے:

« ثُمَّ يُوتِرُ، ثُمَّ يُصَلِّي رَكْعَتَيْنِ، وَ هُوَ جَالِسٌ »[1]

یعنی پھر نبی ﷺ وِتر پڑھتے۔ بعد ازاں بیٹھ کر دو رکعتیں ادا کرتے۔

یہ بھی یاد رہے! بلا عذر بیٹھ کر نماز پڑھنے میں نبی ﷺ کے لیے پورا ثواب تھا، جب کہ ایک امتی کے لیے آدھا ثواب ہے۔ ملاحظہ ہو! صحیح مسلم: ۱/ ۲۵۳۔

لہٰذا اجر کی تکمیل کے پیشِ نظر اگر کوئی ان دو رکعتوں کو پڑھنا چاہے تو کھڑا ہو کر پڑھے۔ اگرچہ اُولیٰ (بہتر) نہ پڑھنا ہے، تاکہ وِتر رات کی آخری نماز بن سکے۔ جس طرح کہ نص حدیث میں بصیغۂ اَمر موجود ہے۔

« اِجعَلُوا آخِرَ صَلٰوتِكُم بِاللَّيلِ وِترًا »[2]

اصول فقہ کا قاعدہ ہے کہ ''فعل'' پر ''اَمر'' مقدم ہوتا ہے۔ اس لیے کہ فعل میں خاصہ (خصوصیت) کا احتمال ہوتا ہے، جب کہ ''اَمر'' میں یہ شے نہیں۔[3]

---

[1] صحیح مسلم، بَابُ صَلَاةِ اللَّيلِ، وَعَدَدِ رَكَعَاتِ النَّبِيِّ ﷺ ...... الخ، رقم: ۷۳۸

[2] صحیح مسلم، بَابُ صَلَاةُ اللَّيلِ مَثنَى مَثنَى، وَالوِترُ رَكعَةٌ مِن آخِرِ اللَّيلِ، رقم: ۷۵۱، سنن ابی داؤد، رقم: ۱۴۳۸

[3] الاعتصام...... وِتر کے بعد دو رکعت پڑھنے میں علمائے اہلحدیث کا اختلاف ہے۔ بعض علماء تو اس موقف کے حامی ہیں جو حضرت مفتی صاحب (مولانا حافظ ثناء اللہ مدنی) ﷾ نے سطور بالا میں اختیار فرمایا ہے، کہ یہ دو رکعتیں نہ پڑھنا اُولیٰ ہے۔ نیز اگر پڑھی جائیں تو کھڑے ہو کر پڑھی جائیں۔
دوسرا موقف علمائے اہلحدیث کا یہ ہے، کہ نبی ﷺ سے چونکہ بسندِ صحیح، یہ ثابت ہے کہ آپ ﷺ نے وِتر کے بعد دو رکعتیں بیٹھ کر پڑھی ہیں۔ اسی لیے آپ ﷺ کی متابعت میں یہ دو رکعت بیٹھ کر پڑھنا سنت ہے

وتر نماز کے بعد مزید نوافل پڑھنا:

سوال: وِتر رات کی آخری نماز ہونی چاہیے یا وتروں کے بعد نوافل ادا کر سکتے ہیں؟ چند احباب کہتے ہیں کہ وِتر آخری نماز ہونی چاہیے اور جو دو رکعت ثابت ہیں وہ حضور ﷺ کا خاصہ ہے کیا تراویح اور وِتر ادا کرنے کے بعد نوافل ادا کر سکتے ہیں؟

جواب: وِتر کے بعد دو رکعت پڑھنا سنت سے ثابت ہے۔ چنانچہ صحیح مسلم میں حدیث ہے:« ثُمَّ یُوتِرُ، ثُمَّ یُصَلِّی رَکعَتَینِ، وَ ھُوَ جَالِسٌ »[1] ''پھر آپ وِتر پڑھتے۔ پھر بیٹھ کر دو رکعتیں پڑھتے۔''

شارح مسلم امام نووی فرماتے ہیں:

« قُلتُ: اَلصَّوَابُ اِنَّ ھَاتَینِ الرَّکعَتَینِ فَعَلَھُمَا بَعدَ الوِترِ جَالِسًا، لِبَیَانِ جَوَازِ الصَّلٰوۃِ بَعدِ الوِترِ.»

''میں کہتا ہوں درست بات یہ ہے، کہ یہ دو رکعتیں وتروں کے بعد جو آپ ﷺ نے بیٹھ کر پڑھی ہیں، وِتر کے بعد نماز پڑھنے کا جواز بیان کرنے کے لیے ہے۔''

اس سے معلوم ہوا کہ شارحینِ حدیث نے ان دو رکعتوں کو نبی ﷺ کا خاصہ نہیں سمجھا۔ البتہ بعض اہلِ علم نے کہا ہے، کہ وِتر کو رات کی آخری نماز بنانے والی حدیث قولی ہے، جب کہ وِتر کے بعد نماز والی حدیث فعلی ہے۔ فعل میں چونکہ خاصے کا احتمال ہوتا ہے، بخلاف قول کے، اس لیے بہتر ہے کہ وِتر کے بعد کوئی نماز نہ پڑھی جائے۔

عشاء کے ساتھ وتر پڑھ لیے تو آخر رات نفل کیسے پڑھیں؟

سوال: اگر نماز عشاء کے ساتھ ہی وِتر پڑھ لیے جائیں تو آخر رات نفل پڑھنے کے لیے کیا طریقہ کار ہے؟

= اس میں پورا ثواب ملے گا۔ نیز یہ علماء وِتر کے بعد دو رکعت پڑھنے کو « اِجعَلُوا آخِرَ صَلٰوتِکُم بِاللَّیلِ وِترًا » (صحیح مسلم،بَابُ صَلَاۃِ اللَّیلِ مَثنٰی مَثنٰی، وَالوِترُ رَکعَۃٌ مِن آخِرِ اللَّیلِ ،رقم:٧٥١، سنن ابی داؤد، رقم: ١٤٣٨) (اپنی رات کی آخری نماز وِتر کو بناؤ) کے معارض یا منافی نہیں سمجھتے، کیونکہ وہ کہتے ہیں کہ یہاں امر وجوب کے لیے نہیں، استحباب کے لیے ہے۔ اس طرح دونوں کے درمیان کوئی تعارض نہیں رہتا (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو! مرعاۃ المفاتیح، ٢/ ٢٠٤، طبع قدیم)

دونوں موقف اپنے لیے شرعی بنیاد رکھتے ہیں، اس لیے اس میں تشدد کی بجائے توسع اختیار کرنے کی ضرورت ہے، کہ جو جس موقف پر عمل کرے، جواز کی گنجائش ہے۔ (واللہ اعلم بالصواب)۔ (ص۔ ی) (١٧۔ اپریل ١٩٩٢ء)

[1] صحیح مسلم،بَابُ صَلَاۃِ اللَّیلِ، وَعَدَدِ رَکعَاتِ النَّبِیِّ ﷺ ...... الخ ٢٥٤/١٠، رقم:٧٣٨

کیا ایک رکعت پڑھ کر سجدۂ سہو کرے یا ویسے نوافل ادا کرے؟

جواب: اس بارے میں اکثر اہلِ علم کا مسلک یہ ہے، کہ آدمی جتنے نوافل وغیرہ پڑھنے چاہے پڑھ سکتا ہے۔ نقضِ وِتر کی ضرورت نہیں۔ نبی ﷺ کے اس فرمان پر عمل پیرا ہوتے ہوئے، کہ « لَا وِتْرَانِ فِي لَيْلَةٍ.»[1] یعنی ''ایک رات میں دو دفعہ وِتر نہ پڑھے جائیں۔''

روایت ہذا حسن درجہ کی ہے جس کو امام احمد، ترمذی، ابوداؤد اور نسائی رحمہم اللہ وغیرہ نے ذکر کیا ہے۔ بعض اہل علم نقض وتر کے قائل ہیں کہ وتر کے ساتھ ایک رکعت ملا کر اسے جفت بنا لیا جائے بعد ازاں جتنی نماز پڑھنا چاہے پڑھ لے آخر میں پھر وتر پڑھ لے لیکن سجود کی ضرورت نہیں...... پہلا مسلک راجح ہے کیونکہ نبی اکرم ﷺ سے کئی روایتوں سے ثابت ہے کہ آپ نے وتر کے بعد نماز پڑھی ہے۔ علامہ مبارکپوری شرح ترمذی میں فرماتے ہیں: ''میرے نزدیک مختار بات یہ ہے کہ پہلے پڑھے ہوئے وتر کو توڑا نہ جائے کیونکہ مجھے مرفوع کوئی صحیح روایت نہیں مل سکی جس میں نقض وتر کا ثبوت ملتا ہو۔ امام ترمذی نے بھی اپنی جامع میں اسی مسلک کو اصح قرار دیا ہے اور صاحب مرعاۃ المفاتیح کے نزدیک بھی یہی مذہب راجح ہے، ملاحظہ ہو: المرعاۃ: ۲/۴،۲۰۴۔

امام دعائے قنوت جہراً پڑھے یا سرّی، مقتدی صرف آمین کہے یا دعا بھی کر سکتا ہے؟

سوال: ہم نمازِ تراویح کے بعد وِتر باجماعت ادا کرتے ہیں۔ حنفی دعائے قنوت سراً پڑھتے ہیں۔ امام کو دعائے قنوت جہراً پڑھنی چاہیے یا سراً۔ مقتدی صرف آمین کہیں گے یا دعا بھی کر سکتے ہیں؟

جواب: امام قنوت اونچی آواز سے پڑھے۔ حضرت حسن کا بیان ہے۔ ابی بن کعب قنوت لوگوں کو سناتے تھے۔ الفاظ یوں ہیں:

« حَتّٰی يُسْمِعَهُمُ الدُّعَاءَ.»[2]

امام کی دعا کے سماع کی صورت میں مقتدی صرف آمین کہے اور عدمِ سماع کی صورت میں دعا پڑھے۔

''قیام اللیل'' میں امام احمد رحمہ اللہ سے اس طرح نقل ہوا ہے اور امام اسحاق کا کہنا ہے۔

« يَدْعُوا الْإِمَامُ وَ يُؤَمِّنُ مَنْ خَلْفَهُ.»

---

(1) سنن أبي داؤد، بَابٌ فِي نَقْضِ الْوِتْرِ، رقم: ۱۴۳۹، سنن الترمذی، بَابُ مَا جَاءَ لَا وِتْرَانِ فِي لَيْلَةٍ، رقم: ۴۷۰

(2) كِتَابُ قِيَامِ اللَّيْلِ، بَابُ رَفْعِ الصَّوْتِ فِي الدُّعَاءِ فِي الْقُنُوتِ' مختصر قیام اللیل: ۱/۳۲۶

''امام دعا کرے اور مقتدی آمین کہے۔''

امام محمد بن نصر مروزی نے قیام اللیل میں اسی بات کو اختیار کیا ہے۔[1]

دعائے قنوت کا بیان

ہاتھ اٹھا کر دعائے قنوت کرنا:

سوال: نماز کی آخری رکعت میں رکوع سے کھڑے ہو کر ہاتھ اٹھا کر دعائے قنوت مانگنی چاہیے یا نہیں؟ اگر سنت ہے تو مکمل حدیث اور حوالہ لکھ کر وضاحت کریں۔

جواب: ''قنوتِ وِتر'' میں ہاتھ اٹھانا رسول اللہ ﷺ سے صراحتاً ثابت نہیں۔ البتہ سلف سے ہاتھ اٹھانے کے آثار موجود ہیں۔ کتاب "قیام اللیل" امام محمد بن نصر مروزی (باب رفع الایدی عند القنوت) بظاہر دونوں طرح جواز ہے۔

جواب: دعائے قنوت قبل از رکوع اور بعد از رکوع دونوں طرح درست ہے۔ البتہ اُولیٰ بات یہ معلوم ہوتی ہے، کہ قبل از رکوع مانگی جائے۔ تین وتر کی صورت میں ''فصل'' اور ''وصل'' دونوں طرح درست ہے۔ بہتر یہ ہے، کہ ''فصل'' کیا جائے، یعنی دو رکعت پر سلام پھیر کر، تیسری علیحدہ پڑھی جائے۔ تین رکعت اکٹھی کی صورت میں درمیانی تشہد نہ پڑھا جائے۔ کیونکہ اس سے نمازِ مغرب کے ساتھ مشابہت پیدا ہو جاتی ہے، جس کی حدیث میں ممانعت آئی ہے۔

قنوتِ وِتر یا قنوتِ نازلہ میں ہاتھ اٹھانا اور ہاتھ منہ پر پھیرنا:

سوال: قنوتِ وِتر یا قنوتِ نازلہ میں ہاتھ اٹھانا کیسا ہے؟ نیز ہاتھ منہ پر پھیرنا سنت ہے یا بدعت یا جائز؟

جواب: ''قنوتِ نازلہ'' رکوع کے بعد ہے اور اس میں ہاتھ بھی اٹھائے جائیں گے۔ ملاحظہ ہو! (صحیح مسلم(۲۱۷/۶) علامہ البانی رحمہ اللہ نے ان احادیث کو "الإرواء" (۱۶۰/۲۔۱۶۳) میں جمع کیا ہے۔ البتہ قنوتِ وِتر رکوع سے پہلے اَولیٰ (بہتر) ہے، جب کہ رکوع کے بعد بھی جواز ہے، کیونکہ صحیح ابن خزیمہ (۱۱۰۰) میں عہدِ عمر رضی اللہ عنہ میں ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کی امامتِ نمازِ تراویح کے قصے سے معلوم ہوتا ہے، کہ وہ وتروں میں ''دعائے قنوت'' بعد از رکوع کرتے تھے، اس کی سند صحیح ہے۔ (نماز میں) دعا کے بعد منہ پر ہاتھ

---

[1] بَابُ تَأْمِينِ الْمَأْمُومِ خَلْفَ الْإِمَامِ إِذَا دَعَا فِي الْقُنُوتِ

پھیرنا کسی سنت صحیحہ سے ثابت نہیں۔

قنوتِ وِتر میں ہاتھ اٹھانے چاہئیں یا نہیں؟

سوال : نمازِ وِتر میں دعائے قنوت رکوع سے پہلے پڑھنی چاہیے یا بعد میں؟ نیز یہ بھی فرمائیں کہ قنوتِ وِتر میں ہاتھ اٹھانے چاہئیں یا نہیں؟

جواب : جملہ دلائل کی روشنی میں راجح بات یہ ہے، کہ وتروں میں ''دعائے قنوت'' رکوع سے پہلے ہو۔ تاہم اگر کوئی رکوع کے بعد کرلے، تو کوئی حرج نہیں۔ یہ بھی جائز ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عہد میں ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کی نمازِ تراویح کی امامت کے قصے سے معلوم ہوتا ہے، کہ وہ وِتر میں دعائے قنوت بعد از رکوع کرتے تھے۔ ملاحظہ ہو! صحیح ابن خزیمہ (۱۱۰۰) نیز ہاتھ اٹھانے میں بھی کوئی حرج نہیں۔

کیا قنوتِ نازلہ ہاتھ اٹھا کر پڑھنا ثابت ہے؟

سوال : کیا قنوتِ نازلہ ہاتھ اٹھا کر پڑھنا ثابت ہے؟ آخر میں منہ پر ہاتھ پھیرنا درست ہے یا نہیں؟

جواب : ہاتھ اٹھا کر ''قنوتِ نازلہ'' پڑھنا صحیح مسلم میں ثابت ہے۔ لیکن دعا کے بعد منہ پر ہاتھ پھیرنے والی روایت ضعیف ہے۔ اس موضوع پر تفصیل دیکھنے کے لیے ملاحظہ فرمائیں! ''الاعتصام'' جلد ۴۸ (۱۹۹۶ء) شمارہ: ۶ (۱۹رمضان ۱۴۱۶ھ/۹فروری) (از مولانا ارشاد الحق اثری)

وتر کی دعائے قنوت قبل از رکوع پڑھی جائے تو کیا ہاتھ اٹھائے جائیں گے؟

سوال : اگر وتر کی دعائے قنوت قبل از رکوع پڑھی جائے تو کیا ہاتھ اٹھائے جائیں گے؟

جواب : وِتر میں ہاتھ اٹھا کر دعا کرنا کسی مرفوع متصل روایت میں ثابت نہیں۔ البتہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے ''التلخیص'' میں حضرات ابن مسعود، عمر، انس اور ابو ہریرہ رضی اللہ عنہم سے ہاتھ اٹھانا نقل کیا ہے۔

وِتر میں ہاتھ اٹھا کر دعا مانگنا:

سوال : وِتر میں ہاتھ اٹھا کر دعا مانگنا درست ہے یا نہیں؟

جواب : بعض سلف ''قنوتِ وِتر'' میں ہاتھ اٹھاتے تھے۔ [1] اور بعض علماء قنوت نازلہ پر قیاس کرتے ہوئے

---

[1] مصنف ابن ابی شیبہ و قیام اللیل للمروزی

بھی ''رفع الایدی'' (ہاتھ اٹھانے) کے قائل ہیں۔ کیونکہ ''قنوتِ نازلہ'' میں ہاتھ اٹھانا مرفوعاً صحیح مسلم وغیرہ میں ثابت ہے۔ تاہم وِتر میں مرفوعاً ہاتھ اٹھانا ثابت نہیں۔ لہٰذا مرجح (راجح قول) عدم رفع (ہاتھوں کا نہ اٹھانا) ہے۔

قنوتِ وِتر میں ہاتھ اٹھانا:

سوال: کیا وِتروں کی دعا قنوت میں ہاتھ اٹھانا ثابت ہے؟

جواب: قنوتِ وِتر میں ہاتھ اٹھانا بعض سلف صالحین سے ثابت ہے۔ امام محمد بن نصر مروزی نے اپنی تصنیف ''قیام اللیل'' میں باقاعدہ عنوان قائم کیا ہے:''بَابُ رَفعِ الاَیدِی فِی القُنُوتِ'' پھر اس کے تحت آثار و اقوال نقل کیے ہیں، جو ''رفع الأیدی'' (ہاتھ اٹھانے) پر نص ہیں اور صاحب ''المرعاۃ'' فرماتے ہیں، ان آثار پر عمل کرتے ہوئے ''قنوتِ وِتر'' میں ہاتھ اٹھانا جائز ہیں۔ جس طرح کہ وِتروں کے ما سوا ''قنوت نازلہ'' میں ہاتھ اٹھانا نبی ﷺ سے ثابت ہے۔ ہمارے شیخ الشیوخ حسین بن محسن انصاری ''مجموعہ فتاویٰ'' (ص:۱۶۰) میں رقمطراز ہیں۔

''نبی ﷺ کے فعل سے ''قنوت'' میں ہاتھ اٹھانا ثابت ہے۔ پس ''قنوتِ وِتر'' بھی اس کی مثل ہے۔ دونوں قنوتوں میں کوئی فرق نہیں اس لیے کہ دونوں دعا ہیں۔''

اسی بناء پر قاضی ابو یوسف نے کہا ہے، کہ نمازی اپنے دونوں ہاتھوں کو قنوتِ وِتر میں سینے تک اٹھائے اور ہتھیلیاں آسمان کی طرف کرے۔ طحاوی اور کرخی رحمہما اللہ نے اسی مسلک کو پسند کیا ہے۔ شامی نے کہا ہے، کہ ظاہر یہ ہے، کہ اس روایت کی بناء پر ہمہ تن پوری دعا میں ہاتھ اٹھائے رکھے۔ انتہی۔

حاصل اس کا یہ ہے، کہ ''قنوتِ وِتر'' میں ''رفع یدین'' حضرت ابن مسعود، حضرت عمر، حضرت انس، حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہم کے فعل سے ثابت ہے۔ جس طرح حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے ''التلخیص'' میں ذکر کیا ہے۔ ان لوگوں کی اقتداء ہمیں کافی ہے اور نبی ﷺ سے وِتر کے علاوہ ثابت ہے۔ [1]

واضح ہو کہ حنفی ائمہ قاضی ابو یوسف، طحاوی، کرخی وغیرہ کی مذکورہ تصریحات سے معلوم ہوا، کہ وِتر کی دعا ''قنوت'' میں ہاتھ اٹھانا ثابت ہے۔ اس لیے حنفیوں کو اس سے انکار کی چنداں گنجائش نہیں۔ مزید آنکہ اس کا اثبات حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے بھی وارد ہے، جن پر حنفی فقہ کی بنیاد ہے۔ گویا کہ اس کا انکار حنفی فقہ کے اصل کی نفی کرنا ہے۔

---

[1] مرعاۃ المفاتیح،۲/۲۱۹

پھر یہی بات حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے منقول ہے۔ جن کے متعلق حنفیہ بڑے شدّ و مد سے مسئلہ ''بیس تراویح'' میں (بفرضِ صحت) فعل عمر رضی اللہ عنہ کو حجت تسلیم کرتے ہوئے تائید میں حدیث: «عَلَيْكُم بِسُنَّتِي وَ سُنَّةِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِينَ»[1] پیش کیا کرتے ہیں۔ مقامِ غور ہے، کہ اس قاعدے کا انطباق تو زیرِ بحث مسئلہ پر بھی ہوتا ہے۔ پھر اس سے انکار کیوں؟ امید ہے جذبات کی رو سے بالاتر ہو کر حنفیہ موضوع بحث مسئلہ پر غور فرمائیں گے۔

جہاں تک اصل مسئلہ کا تعلق ہے، سو اس بارے عرض ہے، کہ مذکورہ آثار کی بناء پر اگر کوئی شخص وِتر کی دعا قنوت میں ہاتھ اٹھالے تو جائز ہے اور اگر کوئی نہ اٹھائے، تو اس پر بھی نکیر نہیں۔

مسئلہ ہذا میں دونوں پہلوؤں پر عمل کرنا درست ہے۔ جسے کوئی چاہے اختیار کرے، اگرچہ جانب رجحان عدمِ رفع ہے۔ (واللّٰہ اعلم بالصواب و علمه أتم)

سوال: ہمارے شہر میں کافی عرصہ سے یہ مسئلہ اختلاف کا باعث ہے کہ نمازِ وِتر میں رکوع سے پہلے یا بعد میں ہاتھ اٹھا کر دعا مانگنا کیسا عمل ہے؟ آیا ہم اس کو بدعت کہہ سکتے ہیں؟ اگر بدعت نہیں تو اس کے جواز پر مفصل دلائل ارشاد فرمائیں۔

جواب: قنوتِ وِتر میں ہاتھ اٹھانا بعض سلف صالحین سے ثابت ہے۔ امام محمد بن نصر مروزی نے ''قیام اللیل'' میں باقاعدہ بایں الفاظ عنوان قائم کیا ہے: ''بَابُ رَفْعِ الأَيْدِي فِي الْقُنُوتِ'' پھر اس کے تحت آثار و اقوال نقل کیے ہیں، جو ''رفع الأيدي'' پر نص ہیں۔ جہاں تک اصل مسئلہ کا تعلق ہے، سو اس بارے میں عرض ہے، کہ مذکورہ آثار کی بناء پر اگر کوئی شخص وِتر کی دعائے قنوت میں ہاتھ اٹھالے، تو جائز ہے اور اگر کوئی نہ اٹھائے، تو اس پر بھی نکیر نہیں۔ مسئلہ ہذا میں دونوں پہلوؤں پر عمل کرنا درست ہے۔ جسے کوئی چاہے اختیار کرے۔ لیکن رفع کو بدعت قرار دینا مشکل امر ہے۔ اگرچہ جانب رجحان عدمِ رفع ہے۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو! (الاعتصام ۲۴ ذوالقعدہ ۱۴۱۴ھ)

قنوتِ نازلہ اور قنوتِ وِتر میں دعا کے بعد ہاتھ چہرے پر ملنا:

سوال: قنوتِ نازلہ اور قنوتِ وِتر میں دعا کے بعد ہاتھوں کو چہرے پر ملنا چاہیے یا نہیں؟

جواب: ''قنوتِ نازلہ'' یا ''غیر نازلہ'' میں ہاتھوں کو چہرے پر ملنا بالعموم کسی صحیح حدیث میں ثابت نہیں۔

---

[1] سنن ابن ماجه، بَابُ اتِّبَاعِ سُنَّةِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِينَ الْمَهْدِيِّينَ، رقم: ۴۲

دعائے قنوت ترک کرنا اور رکوع سے پہلے دعا کرنا:

سوال: عشاء کے بعد ایک شخص ایک وِتر پڑھتا ہے اس میں ''دعائے قنوت'' کبھی پڑھتا ہے اور کبھی نہیں پڑھتا اور جب دعا قنوت پڑھتا ہے تو سورہ فاتحہ اور ایک اور سورت کی تلاوت کرنے کے بعد ہاتھ باندھے باندھے ہی پڑھ لیتا ہے، اور پھر رفع یدین کرکے رکوع میں چلا جاتا ہے۔ کیا اس کا یہ عمل قرآن وحدیث کے مطابق ہے؟ ناصر الدین البانی صاحب نے اپنی کتاب ''صلوٰۃ النبی ﷺ'' میں رکوع سے پہلے دعائے قنوت کا لکھا ہے اور ہاتھ اٹھانے کا ذکر نہیں کیا۔ نیز لکھا ہے کہ حضور ﷺ اسے کبھی کبھی پڑھتے تھے اور جمہور علماء کے مطابق یہ واجب نہیں ہے۔

جواب: قنوتِ وِتر میں یہ (ہاتھ نہ اٹھانے) کا عمل درست ہے اور اگر کوئی شخص ہاتھ اٹھاتا ہے، تو محض بعض آثار کی بناء پر جو ''قیام اللیل'' مروزی وغیرہ میں منقول ہیں۔ اس بارے میں نبی ﷺ سے نصِ صریح ثابت نہیں۔ قبل از رکوع قنوت وِتر کرنا درست ہے۔ علامہ البانی نے ہاتھ اٹھانے کا ذکر اس لیے نہیں کیا، کہ نبی ﷺ سے کسی نص صریح میں ثابت نہیں۔

نیز علامہ موصوف نے کبھی کبھی ''دعائے قنوت'' پڑھنے کا ذکر اس لیے کیا ہے، کہ عموم بلویٰ (عام پیش آنے والی چیز) کے باوجود عام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے یہ بات نبی ﷺ سے نقل نہیں کی، جو اس کے عدمِ استمرار (ہمیشہ نہ ہونے) کی دلیل ہے۔

قنوتِ وتر رکوع سے پہلے یا بعد میں؟

سوال: قنوتِ وتر قبل الرکوع افضل ہے یا بعد الرکوع، نیز قبل الرکوع میں ہاتھ نہ اٹھانا کیسا ہے؟

جواب: ''قنوت'' قبل الرکوع افضل ہے۔ ہاتھ اٹھانا رسول اللہ ﷺ سے ثابت نہیں۔ البتہ بعض آثار میں اٹھانے کا ذکر ہے۔ ملاحظہ ہو! ''قیام اللیل'' ان کی بناء پر کوئی اٹھالے تو نکیر نہیں۔

قنوت رکوع سے پہلے پڑھنا:

سوال: آپ نے کسی گزشتہ شمارہ میں ایک سوال کے جواب میں فرمایا تھا کہ قنوت قبل الرکوع پڑھنا افضل ہے اور جب ایک مقامی عالم سے دریافت کیا گیا تو اس نے بھی یہی فرمایا تھا اب سوال یہ ہے کہ اہلِ حدیث اس مسئلہ میں غیر افضل پر عمل کیوں کرتے ہیں؟

جواب: جو لوگ غیر افضل پر عامل ہیں، ان کے نزدیک یا تو دونوں جہتیں (صورتیں) برابر ہیں یا پھر

افضلیت کا انشراح نہیں۔ بلکہ علامہ البانی رحمہ اللہ کے نزدیک قبل از رکوع قنوتِ وِتر پڑھنا متعین ہے۔ ملاحظہ ہو! ''إرواء الغلیل'' جب کہ صاحب ''مرعاۃ المفاتیح'' کے نزدیک دونوں طرح کا جواز ہے۔ لیکن جانبِ رجحان قبل از رکوع ہے۔ (۲/۲۱۴) میرا میلان بھی اسی طرف ہے اور ہمارے شیخ محدث روپڑی بعد از رکوع کے قائل ہیں۔ (فتاویٰ اہلِ حدیث: ۲/۲۹۶)

کیا نبی کریم ﷺ سے دعائے قنوت رکوع سے پہلے ثابت ہے؟

سوال: آپ نے ایک دو مرتبہ الاعتصام میں جواباً تحریر فرمایا تھا کہ رکوع سے قبل دعائے قنوت افضل ہے اور میں نے اس کی تصدیق بھی کر لی کہ واقعی آنحضور ﷺ عرصہ تک قبل از رکوع دعا فرماتے رہے۔ کیا احناف کی طرح رفع یدین کر کے یا ہاتھ باندھے ہی دعائے قنوت پڑھنی چاہیے؟ اور اہلِ حدیث حضرات کبھی بھی رکوع سے قبل نہیں پڑھتے۔؟

جواب: واقعی دعائے قنوت قبل از رکوع افضل ہے، اس پر عمل ہونا چاہیے۔ البتہ حنفیہ کا طریقۂ دعا صحیح احادیث سے ثابت نہیں۔ ''قنوت'' میں رفع یدین مرفوعاً ثابت نہیں۔ البتہ آثار میں وارد ہے۔ چنانچہ مقتدی جس حالت میں ہے، اسی میں دعا پڑھ لے۔ مزید تصرف کی ضرورت نہیں۔

''دعائے قنوت'' رکوع سے پہلے پڑھنی چاہیے؟

سوال: کیا ''دعائے قنوت'' رکوع سے پہلے اسی طرح ہاتھ باندھے ہوئے پڑھنی چاہیے۔ سورہ فاتحہ اور دوسری سورہ کے بعد اسی طرح دعائے قنوت شروع کر دیں یا سورہ اور دعائے قنوت میں فصل کے لیے ''اللہ اکبر'' بھی کہہ سکتے ہیں۔؟

جواب: ''قنوت وِتر'' میں رفع یدین اور تکبیر کہنا کسی مرفوع متصل روایت میں ثابت نہیں۔ البتہ بعض سلف ابن مسعود، عمر، انس، ابوہریرہ رضی اللہ عنہم کے افعال سے ثابت ہے۔ لہٰذا اصل یہ ہے، کہ موجود حالت میں ہی قنوت پڑھ لی جائے۔ آثار کی پیروی میں دوسری شکل کا بھی جواز ممکن ہے۔ (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو! ''مرعاۃ المفاتیح'' (۲/ ۲۱۹)

دعائے قنوت رکوع سے پہلے پڑھیں تو فاتحہ یا سورۃ کے بعد رفع الیدین کرنا چاہیے؟

سوال: وِتر میں دعائے قنوت قبل از رکوع پڑھنا بہتر ہے، تو کیا فاتحہ اور سورۃ کے بعد رفع الیدین کر سکتے ہیں جیسا کہ احناف کرتے ہیں؟

جواب: ''قنوتِ وِتر'' میں حنفیہ کے رفع الیدین کی نبی ﷺ سے کوئی حدیث بسند صحیح ثابت نہیں۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو! ''مرعاۃ المفاتیح" (۲/ ۲۱۹)

دعائے قنوت سے پہلے تکبیر کہنا:

سوال: دعائے قنوت سے پہلے تکبیر کہنا بعض اسلاف سے ثابت ہے لیکن کیا کسی صحابی سے صحیح سند کے ساتھ تکبیر کہنا ثابت ہے؟ یا کبار تابعین میں سے کسی ایسے تابعی سے جو ثقہ ہی سے روایت کرتا ہے غیر ثقہ کی طرف التفات نہ کرتا ہو۔ (وقار علی، کریم پارک لاہور)

جواب: ''قیام اللیل'' مروزی (ص:۲۲۹) پر "بَابُ التَّكبِيرِ لِلقُنُوتِ" کے عنوان کے تحت حضرت عمر، علی، ابن مسعود رضی اللہ عنہم وغیرہ کے آثار ہیں۔ جن میں اس امر کی تصریح موجود ہے۔ "الاستیعاب" ابن عبدالبر (۲/ ۱۹۴۶، ۴۱۸) میں، ایک مرفوع روایت بھی ہے۔ لیکن نہایت ضعیف ہے۔

دعائے قنوت کے لیے تکبیر کہنا:

سوال: کیا کسی صحابی یا تابعی سے، جس کے بارے میں ثابت ہو کہ وہ صرف ثقہ راوی ہی کی حدیث قبول کرتا ہے، دعائے قنوت کے لیے تکبیر کہنا ثابت ہے؟ صحیح یا حسن سند کے ساتھ۔ ایک شمارے میں آپ نے لکھا تھا کہ آثار کی حالت مشکوک ہے۔

جواب: مرسل صحابی قابلِ حجت ہے۔ شاذ و نادر واقعات کے ماسوا۔ ظاہر ہے، کہ تابعی کسی صحابی سے بیان کرے گا۔ صحابہ رضی اللہ عنہم کے بارے میں مشہور ہے، کہ سب عدول ہیں اور مرسل تابعی کے بارے میں کلام ہے۔ کیونکہ بسا اوقات ایک تابعی کئی ایک تابعین کے واسطوں سے روایت کرتا ہے، جن کے حالات معلوم نہیں۔ اس بناء پر مرسل تابعی (ضعیف) ٹھہرتی ہے۔ ہاں! البتہ اگر کسی کے بارے میں معلوم ہو، کہ وہ صرف ثقہ سے روایت کرتا ہے۔ ایسی صورت میں امام شافعی رحمہ اللہ وغیرہ نے اعتماد کا اظہار کیا ہے۔ جیسے مرسل سعید بن المسیب ہے نیز وِتر میں دعائے قنوت کے لیے تکبیر کہنے کے بارے میں بعض اقوال و آثار موجود ہیں۔ ملاحظہ ہو! ''قیام اللیل'' (ص:۲۲۹)

وِتروں میں دعا کس طرح پڑھنی چاہیے تکبیر کہہ کر یا بغیر تکبیر کے؟

سوال: وِتر میں دعا کس طرح پڑھنی چاہیے تکبیر کہہ کر یا بغیر تکبیر کے اور دُعاء ہاتھ اٹھا کر کرنی چاہیے یا چھوڑ کر یا سینے پر باندھ کر؟

جواب: دعاِ قنوت سے قبل تکبیر کی بابت نبی اکرم ﷺ سے کوئی شئی ثابت نہیں۔ البتہ امام محمد بن نصر مروزی کی کتاب ''الوتر'' (ص:۲۲۹) میں بعض آثار واقوال ایسے ملتے ہیں، جو جواز پر دلالت کرتے ہیں۔ ان میں سے کئی ایک کا اثبات بھی مشکوک ہے۔ لہٰذا اصل یہی ہے، کہ تکبیر نہ کہی جائے۔ بالخصوص ''رفع الأیدی'' میں تکبیرِ تحریمہ کی طرح کا انداز، جسے حنفیہ اختیار کرتے ہیں، اس کی تو کوئی اصل ہی نہیں۔

نمازی قبل از رکوع دعا کی صورت میں چونکہ اپنے دونوں ہاتھ سینے پر باندھے، رب کے حضور کھڑا ہوتا ہے، اس لیے دعا بھی اسی حالت میں ہونی چاہیے اور جہاں تک ''دعاِ قنوت'' میں ہاتھ اٹھانے کا تعلق ہے، سو نبی اکرم ﷺ سے کچھ ثابت نہیں۔ البتہ امام محمد بن نصر مروزی کی کتاب ''الوتر' (ص:۲۳۰) میں کئی ایک آثار واقوال ایسے موجود ہیں، جو جواز پر دال ہیں۔ صاحب "تحفة الأحوذی" اور صاحب ''المرعاۃ'' اور علامہ حسین بن محسن انصاری ''مجموعہ فتاویٰ'' (ص:۱۶۰) میں، اور اسی طرح شیخنی محدث روپڑی رحمہ اللہ ''فتاویٰ اہلِ حدیث'' (۲/۲۹۲) میں "رفع الأیدی" کے جواز کے قائل ہیں۔ ان کا استدلال اس بات سے ہے کہ "رفع الأیدی" آدابِ دعا سے ہے۔ پھر ''قنوتِ نازلہ'' پر قیاس کیا ہے۔ مزید آنکہ بعض آثار بھی اس کے مؤید ہیں۔

اور حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے بھی "التلخیص" میں اُسوہ صحابہ رضی اللہ عنہم کو کافی قرار دیا ہے۔ اس کے باوجود یہ بات مُسلّمہ ہے، کہ رسولِ اکرم ﷺ سے ایسی کوئی واضح نص موجود نہیں، جو موضوع ہذا پر فیصلہ کُن ہو۔ لہٰذا اصل عدمِ رفع (ہاتھوں کا نہ اٹھانا) ہے۔ (ھذا ما عندی واللہ تعالیٰ أعلم بالصواب، وعلمه أتم)

وِتروں کے اندر قنوت کا بلند آواز سے پڑھنا اور مقتدیوں کا آمین کہنا

سوال: وِتروں کے اندر قنوت کا بلند آواز سے پڑھنا اور مقتدیوں کا آمین کہنا کیا نبی ﷺ سے ثابت ہے؟

جواب: وِتروں میں ''قنوت'' باواز بلند پڑھنا، اور پھر مقتدیوں کا امام کے پیچھے (آمین) کہنا، بطورِ خاص کسی حدیث میں وارد نہیں۔ ہاں البتہ بعض اہلِ علم اس کو ''قنوت نازلہ'' پر قیاس کرتے ہوئے جواز کے قائل ہیں، کیونکہ قنوت نازلہ میں دونوں چیزیں بالتصریح ثابت ہیں۔ (ملاحظہ ہو! صحیح بخاری وصحیح مسلم وغیرہ)

دعاء اور قنوتِ نازلہ میں غیر مسنون دعائیں پڑھنا:

سوال: قنوت نازلہ کے متعلق ایک استفسار پہلے بھی بھیجا تھا جس کا جواب مل گیا تھا۔ جزاکم اللہ خیراً۔ اب ایک صاحب نئے سرے سے اس بات پر معترض ہیں کہ آپ مسنون دعاؤں کے ساتھ غیر ماثور دعائیں نہ کیا

کریں۔ مثلاً میں یہ مندرجہ ذیل دعائیں بھی مانگتا ہوں جو میں نے مختلف علماء ہی سے سنی ہیں۔

- اَللّٰهُمَّ عَلَيكَ بِحُكَّامِنَا المُنَافِقِينَ .
- اَللّٰهُمَّ دَمِّرهُم تَدمِيرًا .
- اَللّٰهُمَّ بَدِّدهُم تَبدِيدًا .
- اَللّٰهُمَّ خُذهُم أَخذَ عَزِيزٍ مُقتَدِرٍ .
- اَللّٰهُمَّ عَلَيكَ بِاليَهُودِ وَالهُنُودِ وَالمُشرِكِينَ .
- اَللّٰهُمَّ انصُرِ المُجَاهِدِينَ فِي سَبِيلِكَ فِي كُلِّ مَكَانٍ .
- اَللّٰهُمَّ انصُرهُم نَصرًا عَزِيزًا .
- اَللّٰهُمَّ افتَح لَهُم فَتحًا مُبِينًا . اَللّٰهُمَّ افتَح لَهُم فَتحًا قَرِيبًا .
- اَللّٰهُمَّ انجِ إِخوَانَنَا المُسلِمِينَ .
- اَللّٰهُمَّ اكفِنَا شُرُورَ اَعدَائِنَا بِمَا شِئتَ .

اوران کے ساتھ ایک آدھ دعا اور بھی حسب موقع ملا لیتا ہوں۔ اس بارے میں وضاحت فرمادیں۔ کہ ان دعاؤں کی گنجائش ہے یا نہیں؟ معترض مذکور کا کہنا ہے، کہ مسنون دعائیں ہی جامع مانع ہیں۔ ان کے ہوتے ہوئے کسی زائد دعا کی حاجت نہیں۔

جواب: دعا کے سلسلہ میں اصل یہ ہے کہ منقول وماثور کا اہتمام کیا جائے۔ لیکن ''قنوت نازلہ'' کے بارے میں کچھ وسعت معلوم ہوتی ہے۔ منصوص کے علاوہ حسب حال، جو بھی دعا یہ کلمات اختیار کر لیے جائیں درست ہیں۔ کیونکہ قنوت نازلہ سے مقصود یہ ہوتا ہے، کہ مقہور ومظلوم مسلمانوں کی فتحیابی اور درندہ صفت سفاک خونخوار دشمنوں اور ظالموں کی تباہی و بربادی کے لیے دعا کی جائے۔ جس دعا سے یہ مقصد حاصل ہو، ''قنوتِ نازلہ'' میں پڑھی جاسکتی ہے۔

صاحب ''المرعاۃ'' فرماتے ہیں:

« وَاعلَم أَنَّهُ لَم يَثبُت فِي الدُّعَاءِ فِي قُنُوتِ النَّازِلَةِ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ ، وَ لَا عَنِ السَّلَفِ، وَالخَلَفِ دُعَاءٌ مَخصُوصٌ مُتَعَيِّنٌ لِقُنُوتِ الوِترِ، لِأَنَّهُ مِنَ المَعلُومِ أَنَّ الصَّحَابَةَ كَانُوا يَقنُتُونَ فِي النَّوَازِلِ. وَ هٰذَا يَدُلُّ عَلٰى أَنَّهُم مَا كَانُوا يُحَافِظُونَ عَلٰى قُنُوتٍ رَاتِبٍ. وَ لِذٰلِكَ قَالَ العُلَمَاءُ: إِنَّهُ يَنبَغِي الدُّعَاءُ فِي ذٰلِكَ بِمَا يُنَاسِبُ الحَالَ،

كَمَا صَرَّحَ بِهِ فُقَهَاءُ الشَّافِعِيَّةِ، وَالعَلَامَةُ الْأَمِيرُ اليَمَانِيُّ فِي شَرحِ بُلُوغِ المَرَام.
فَبِأَيِّ دُعَاءٍ وَقَعَ. كَفٰى. وَ حَصَلَ بِهِ المَقصُودُ » (۲/۲۲۰، ۲۲۱)

بعض اہلِ علم نے مشہور دعا" اَللّٰهُمَّ اهدِنِي فِيمَن هَدَيتَ "کوقنوتِ نازلہ میں ضروری قرار دیا ہے۔
لیکن امام نووی رحمہ اللہ نے ''شرح مسلم میں فرمایا ہے:
صحیح بات یہ ہے، کہ مشارٌ الیہ دعا کا پڑھنا مستحب ہے۔شرط نہیں۔''اصل الفاظ ملاحظہ ہوں:

« وَالصَّحِيحُ أَنَّه لَا يَتَعَيَّنُ فِيهِ دُعَاءٌ مَخصُوصٌ، بَل يَحصُلُ بِكُلِّ دُعَاءٍ. وَ فِيهِ وَجهٌ أَنَّهُ لَا يَحصُلُ إِلَّا بِالدُّعَاءِ المَشهُورِ. اَللّٰهُمَّ اهدِنِي فِيمَن هَدَيتَ إِلٰى آخِرِهٖ . وَالصَّحِيحُ أَنَّ هٰذَا مُستَحَبٌّ ، لَا شَرطٌ » (۵/۱۷٦)

اور ''سُبُل السَّلام" میں الفاظ یوں ہیں:

« وَ مِن هُنَا قَالَ بَعضُ العُلَمَاءِ : يُسَنُّ القُنُوتُ فِي النَّوَازِلِ، فَيَدعُوا بِمَا يُنَاسِبُ الحَادِثَةَ . » (۱/۱۸۵)

یعنی ''اسی بناء پر بعض علماء نے کہا ہے، کہ حوادث میں دعائے قنوت کرنا مسنون ہے۔ انسان حادثہ کے مناسب دعا کرے۔''

اور صحیح مسلم (۵/۱۷۸) میں ہے:« وَ يَدعُوا لِلمُؤمِنِينَ ، وَ يَلعَنُ الكُفَّار»[1]
حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی میں قنوتِ نازلہ میں مومنوں کے لیے دعا کرتے اور کفار پر لعنت بھیجتے تھے۔'' دیگر عمومات کے علاوہ روایت ہذا کا اطلاق بھی اس امر کا مؤید ہے۔

وتروں میں غیر مسنون دعاء:

سوال : کیا آدمی وتروں میں دعائے قنوت " اَللّٰهُمَّ اهدِنِي فِيمَن هَدَيتَ......" کے بعد اور بھی کوئی دعا پڑھ سکتا ہے یا کہ نہیں؟ ایک عالم نے شبہ ڈال دیا ہے کہ اور دعا نہیں پڑھ سکتا۔

جواب : اصلاً تو رُدعا پر اکتفا کرنا چاہیے، اور اگر کسی وقت بسبب خاص مسنون دعاؤں کا اضافہ کرلیا جائے، تو بظاہر جواز ہے جس طرح کہ ''قنوتِ نازلہ'' میں حالات کے اعتبار سے دعاؤں کو اختیار کیا جا سکتا ہے۔

---

[1] صحيح مسلم، بَابُ استِحبَابِ القُنُوتِ فِي جَمِيعِ الصَّلَاةِ إِذَا نَزَلَت بِالمُسلِمِينَ نَازِلَةٌ ،رقم: ٦٧٦ ،صحيح البخاري،بَابُ فَضلِ اللّٰهُمَّ رَبَّنَا لَكَ الحَمدُ ،رقم:٧٩٧

نماز کے رکوع اور سجود اور قنوت وتر میں غیر عربی دعائیں کرنا:

سوال (۱) نماز میں رکوع، سجدہ کے دوران اور تشہد میں سلام سے پہلے غیر عربی زبان میں دعا کی جا سکتی ہے یا نہیں؟

(۲) قنوت نازلہ میں عربی یا غیر عربی زبان میں اپنی طرف سے دعائیں کی جا سکتی ہیں؟ کیا عربی زبان میں اپنی طرف سے قنوت نازلہ کی دعائیں '' کلام الناس '' میں داخل نہیں؟

(۳) کیا مندرجہ بالا تمام جگہوں پر غیر عربی زبان میں دعائیں کرنے یا نہ کرنے کے بارے میں فرض نماز یا نفلی نماز عاجز یا غیر عاجز کا کوئی فرق ہے؟

(۴) آپ نے گزشتہ کسی شمارے میں بعد از رکوع ہاتھ نہ باندھنے کے بارے میں فرمایا تھا کہ قبل از رکوع پر لفظ قیام کا اطلاق ہوا ہے اور بعد از رکوع پر اعتدال کا اطلاق ہوا ہے جب کہ صحیح مسلم میں بعد از رکوع پر «حَتّٰی یَستَوِی قَائِمًا» کا اطلاق ہوا ہے اس کا کیا جواب ہو سکتا ہے؟

جواب: (۱) نماز کے دوران دین و دنیا کی بہتری کے لیے کوئی سی دعا بھی ہو سکتی ہے۔ بشرطیکہ زبان عربی ہو اور بامعنی مرتب کلمات ہوں۔ کہیں ایسا نہ ہو، کہ کلمات کی تبدیلی سے معانی منقلب ہو کر نماز باطل ہو جائے اور ثواب کی بجائے سزا کا مستحق ٹھہرے۔ (أَعَاذَنَا اللّٰهُ مِنهَا)

حدیث میں ہے: «صَلُّوا کَمَا رَأَیتُمُونِی أُصَلِّی»[1]

'' نماز (ٹھیک) اس طرح پڑھو، جس طرح تم نے مجھے پڑھتے ہوئے دیکھا ہے۔''

یہ بات اظہر من الشمس ہے، کہ آج تک نبی ﷺ سے ثابت نہیں ہو سکا کہ بحالتِ نماز غیر عربی میں کوئی دعا کی ہو۔ دوسری زبانوں میں نماز کے دوران دعا کرنا ''مداخلت فی الدین'' (دین میں دخل اندازی) کے زمرے میں آتا ہے، جو کسی کے لیے جائز نہیں۔ پھر تعامل امت بھی اسی کے مطابق ہے۔

(۲) ''قنوتِ نازلہ'' کی صورت میں حسب موقع دعا اور مناجات کا اظہار کرنا نبی ﷺ سے ثابت ہے۔

چنانچہ صحیح بخاری میں صلاۃ الکسوف کے منظر میں ہے:

«و دَنَت مِنِّی النَّارُ حَتّٰی قُلتُ :أَی رَبِّ، وَ أَنَا مَعَهُم؟»[2]

'' آگ میرے اتنے قریب ہوگئی کہ میں نے کہا: اے پروردگار! کیا میں ان کے ساتھ ہوں۔''

---

[1] صحیح البخاری، بَابُ الأَذَانِ لِلمُسَافِرِ، إِذَا کَانُوا جَمَاعَةً، وَالإِقَامَةِ، وَکَذٰلِكَ بِعَرَفَةَ وَجَمعٍ......الخ، رقم:۶۳۱

[2] صحیح البخاری، بَابُ مَا یَقُولُ بَعدَ التَّکبِیرِ، رقم:۷۴۵، فتح الباری:۱/۲۳۱

اس حدیث سے معلوم ہوا، کہ کیفیت نازلہ عمومِ حدیث «لَا تَصلُحُ فِیهَا مِن کَلَامِ النَّاسِ» سے مستثنیٰ ہے۔ لیکن بحالتِ نماز غیر عربی میں دعا اور التجا کرنا ثابت نہیں۔ دلیل پہلے گزر چکی۔

(۳) جس چیز کا نام نماز ہے، اس میں غیر عربی میں دعا نہیں ہوسکتی۔ (و قد تقدم دلیله)

(۴) شریعت میں علی الاطلاق قیام کا اطلاق صرف پہلے قیام پر ہے۔ رکوع کے بعد والی کیفیت پر، اگرچہ بعض احادیث میں قیام کا اطلاق ہوا ہے، لیکن یہ بعد الرکوع کے ساتھ مقید ہے۔ مطلق قیام والے احکام اس پر جاری نہیں ہوتے۔ مثلاً:

۱۔ پہلے میں قرأت ہے دوسرے میں قرأت نہیں۔

۲۔ یہ رکوع اور سجدہ میں فرق کرنے کے لیے ہے، جب کہ پہلے قیام کا نام صرف قیام ہے۔

۳۔ اگر کسی سے کہا جائے، کہ ایک رکعت میں سجدے کتنے ہیں، تو فوراً کہے گا: ''دو'' اور رکوع کتنے ہیں؟ ''ایک'' اور قیام کتنے ہیں؟ یقیناً ایک کا اظہار کرے گا۔ یہ طبعی اور عادی دلیل ہے، جب کہ بعد والے کے دوسرے ناموں میں سے اعتدال، رفع بعد الرکوع اور فقہاء کے نزدیک قومہ بھی ہے۔ پہلے کا صرف ایک ہی نام ''قیام'' ہے۔ اس طرح دونوں قیاموں میں فرق واضح ہوگیا۔ اس بناء پر حضرت البراء سے مروی ہے:

« كَانَ رُكُوعُ النَّبِيِّ ﷺ وَ سُجُودُهُ، وَإِذَا رَفَعَ رَأْسَهُ مِنَ الرُّكُوعِ، وَ بَيْنَ السَّجدَتَينِ مَا خَلَا القِيَامَ، وَالقُعُودَ. قَرِيبًا مِنَ السَّوَاءِ »[1]

''نبی ﷺ کا رکوع، سجود اور رکوع کے بعد اور دو سجدوں کے درمیان کا وقفہ (دورانیہ) برابر ہوتا تھا، سوائے قیام اور قعود کے۔''

اس حدیث سے معلوم ہوا، کہ ''علی الاطلاق'' قیام کا لفظ صرف پہلے قیام پر بولا جاتا ہے اور دوسرے پر قیام کا اطلاق بطریقِ الحاق ہے۔

قنوت کی دعا میں نَستَغفِرُكَ وَ نَتُوبُ اِلَيكَ کا اضافہ:

(سوال): قنوت کی دعا «اَللّٰهُمَّ اهدِنِي فِيمَن هَدَيتَ......» میں الفاظ « نَستَغفِرُكَ وَ نَتُوبُ اِلَيكَ......» کا اضافہ سندھو صاحب کی تحقیق کے مطابق ثابت نہیں۔ (صلوٰۃ الرسول محققہ: ۳۹۶) کیا حافظ سندھو صاحب کی تحقیق درست ہے؟

[1] صحيح البخاري، بَابُ حَدِّ إِتمَامِ الرُّكُوعِ وَالِاعتِدَالِ فِيهِ وَالطُّمَأنِينَةِ، رقم: ۷۹۲

جواب: ظاہر یہی ہے، کہ مذکورہ زیادتی ثابت نہیں۔ مشارٌ الیہ محقق موصوف میرے شاگرد ہیں۔ اللہ رب العزت ان کی کاوش کو شرفِ قبولیت سے نوازے۔ آمین!

نماز وِتر میں دعائے قنوت کے آخر میں درود شریف پڑھنا

سوال: نماز وِتر میں دعائے قنوت کے آخر میں درود شریف پڑھنا کیسا ہے؟

جواب: وَ صَلَّى اللّٰهُ عَلَى النَّبِيِّ کے الفاظ ''سنن نسائی'' کی روایت میں ہیں۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ ''تلخیص'' (۱/۲۴۸) میں فرماتے ہیں: کہ اس کی سند منقطع ہے، جب کہ صحیح ابن خزیمہ'' (۱۱۰۰) میں حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے ثابت ہے، کہ وہ ''قنوتِ وِتر'' میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر درود وصلوٰۃ بھیجا کرتے تھے۔ ''قیام اللیل'' (ص:۲۳۳) میں ہے، کہ ابوحلیمہ معاذ انصاری کا بھی اس پر عمل تھا۔ لہٰذا یہ کلمات کہنے کا جواز ہے۔

قنوتِ نازلہ اگر قیام میں بھول جائے تو کیا تشہد میں پڑھ لی جائے؟

سوال: قنوتِ نازلہ اگر قیام میں بھول جائے تو کیا تشہد میں پڑھ لی جائے؟

جواب: قنوتِ نازلہ کا محل رکوع کے بعد ہے اور تشہد میں بھی دعائیں پڑھی جاسکتیں ہیں۔

وتروں میں ''دعائے قنوت'' رہ جائے تو سجدۂ سہو کریں گے؟

سوال: وتروں میں ''دعائے قنوت'' رہ جانے سے سجدۂ سہو ہوتا ہے یا نہیں؟

جواب: وتروں میں دعائے قنوت میں ذہول (بھولنے) کی صورت میں سجدۂ سہو نہیں۔ [1]

علامہ البانی تو ویسے ہی بعض دفعہ ترک کے قائل ہیں۔ یعنی التزام ضروری نہیں۔

قنوت نازلہ کا اہتمام کن حالات میں اور کونسی نماز میں کرنا چاہیے؟

سوال: قنوت نازلہ کن حالات میں اور کونسی نماز میں پڑھنا چاہیے؟

جواب: مسلمانوں کو کوئی فتنہ لاحق ہو تو اس صورت میں ''قنوت'' سب نمازوں میں یا بعض نمازوں میں پڑھی جاسکتی ہے۔

قنوتِ نازلہ کا اہتمام:

سوال: موجودہ ملکی اور ملی حالات کے پیشِ نظر ہم نے نمازِ فجر میں قنوتِ نازلہ کا اہتمام عرصہ تقریباً ۲ ماہ سے

(1) قیام اللیل ،امام محمد بن نصر مروزی

کر رکھا ہے۔ ایک دوست کا خیال ہے کہ آپ ﷺ سے تو ایک بار ثابت ہے لہٰذا غیر محدود مدت کے لیے اس کا التزام درست نہیں۔ التماس ہے کہ رہنمائی فرمائیں۔

جواب: حالات اور واقعات کے مطابق ''دعائے قنوت'' کا سلسلہ جاری وساری رہنا چاہیے۔ یہاں تک کہ مقصود بالذات فتنہ کا قلع قمع ہو اور مسلمانانِ عالم کے مصائب و مشکلات میں تخفیف ہو۔ چنانچہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ رسولِ اکرم ﷺ کا معمول تھا، کہ آپ ﷺ برابر ایک ماہ تک نمازِ عشاء کی رکعت میں رکوع کے بعد اور سجدہ کرنے سے پہلے ولید بن ولید، سلمہ بن ہشام، عیاش بن أبی ربیعہ رضی اللہ عنہم اور دیگر ستم رسیدہ کمزور مسلمانوں کے حق میں نجات کی دعا مانگتے، اور کفار کے لیے سخت نقمت (سزا) کی۔ جو یوسف علیہ السلام کے زمانہ کی سی قحط سالی کی صورت میں ہو، التجا کرتے۔ ایک دن آپ نے عشاء کی نماز پڑھائی اور دعائے قنوت نہ کی۔ میں نے اس کا سبب پوچھا، تو آپ ﷺ نے فرمایا: «وَ مَا تَرَاهُم قَد قَدِمُوا»[1] ''تم نے دیکھا نہیں، کہ اللہ تعالیٰ نے ہماری دعا کو شرفِ قبولیت بخشا ہے اور وہ سب نجات پا کر مدینہ میں آ گئے ہیں۔''

سنن ابوداؤد کے اصل الفاظ یوں ہیں:

« فقَالَ أَبُوهُرَيرَةَ : وَأَصبَحَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ ذَاتَ يَومٍ ، فَلَم يَدعُ لَهُم . فَذَكَرتُ ذٰلِكَ لَهُ . فَقَالَ: وَ مَا تَرَاهُم قَد قَدِمُوا » (۵۴۱/۱) مع عون المعبود۔[2]

اور صحیح مسلم کے الفاظ اس طرح ہیں:

« قَالَ أَبُو هُرَيرَةَ : ثُمَّ رَأَيتُ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ تَرَكَ الدُّعَاءَ بَعدُ. فَقُلتُ: أُرٰى رَسُولَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيهِ وَسَلَّمَ قَد تَرَكَ الدُّعَاءَ لَهُم، قَالَ: فَقِيلَ: وَ مَا تَرَاهُم قَد قَدِمُوا ؟ » (۲۳۷/۱)[3]

اس واقعہ سے معلوم ہوا، کہ اصلاً ترک دعا مصائب و تکالیف سے نجات پر موقوف ہے۔ ایک مہینہ بعد جو آپ ﷺ نے ''دعائے قنوت'' چھوڑی، وہ محض حالات کے پیشِ نظر تھی۔ اس سے مقصود تحدیدِ مدت نہیں۔ جس طرح کہ اصل قصہ بھی اس بات پر دال ہے۔

---

① صحيح مسلم، بَابُ استِحبَابِ القُنُوتِ فِي جَمِيعِ الصَّلَاةِ إِذَا نَزَلَت بِالمُسلِمِينَ نَازِلَةٌ،رقم:٦٧٥

② سنن أبي داؤد،بَابُ القُنُوتِ فِي الصَّلَوَاتِ ،رقم:١٤٤٢

③ صحيح مسلم، بَابُ استِحبَابِ القُنُوتِ فِي جَمِيعِ الصَّلَاةِ إِذَا نَزَلَت بِالمُسلِمِينَ نَازِلَةٌ،رقم:٦٧٥

قنوت نازلہ پڑھنے کی کوئی خصوصی مدت مقرر ہے؟

سوال: قنوت نازلہ پڑھنے کی کوئی خصوصی مدت مقرر ہے؟ کیا صرف اجتماعی مصائب پر قنوت پڑھنی چاہیے یا کوئی شخص اپنے ذاتی مصائب پر بھی قنوت نازلہ پڑھ سکتا ہے؟

جواب: جب فتنہ شدت میں ہو، تو ''قنوتِ نازلہ'' پڑھی جائے۔ اس کی کوئی مدت مقرر نہیں، لیکن اگر فتنہ مسلسل جاری ہو، تو پھر ''قنوت نازلہ'' ترک کر دینی چاہیے۔

عام حالات میں اجتماعی مصائب پر قنوت پڑھی جائے۔ احادیث میں اس کی تصریح ہے۔ ذاتی مشکلات ومصائب کی نہیں۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

« أَنَّ الْمَطْلُوبَ مِن قُنُوتِ النَّازِلَةِ اَن يُّشَارِكَ الْمَأْمُومُ الِامَامَ، وَ لَو بِالتَّامِينِ. ثُمَّ اتَّفَقُوا عَلٰى اَنَّهٗ يَجهَرُ بِهٖ » [1]

''قنوتِ نازلہ کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ مقتدی بھی امام کی دعا میں شریک ہو جائیں، خواہ آمین، کی صورت میں ہی ہو۔ اہلِ علم کا اتفاق ہے، کہ ''قنوت'' بلند آواز میں ہو۔''

کیا قنوتِ نازلہ منسوخ ہو چکی ہے؟

سوال: تفسیر ابن کثیر میں قصہ اُحد کے ضمن میں ذکر کردہ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی ﷺ نے آیت کریمہ ﴿لَيسَ لَكَ مِنَ الأمرِ شَيءٌ﴾(آل عمرٰن:۱۲۸) کے نزول کے بعد قنوتِ نازلہ ترک کر دی تھی، تو کیا آج بوقتِ ضرورت نمازوں میں قنوتِ نازلہ پڑھی جا سکتی ہے یا نہیں؟ وضاحت فرمائیں؟

جواب: جمہور کے قول کے مطابق ''غزوۂ احد'' ماہِ شوال سن تین ہجری میں ہوا ہے۔ جب کہ واقعہ ''بئر معونہ'' سن چار ہجری کے شروع میں پیش آیا۔ صحیح بخاری میں حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے:

''وَذٰلِكَ بَدءُ القُنُوتِ'' ''قنوت'' کا آغاز اس واقعے کی وجہ سے ہوا۔''

اس سے معلوم ہوا، کہ آیت ﴿لَيسَ لَكَ مِنَ الأمرِ شَيءٌ﴾(آل عمرٰن:۱۲۸) کا تعلق نبی ﷺ کے ''غزوۂ احد'' میں زخمی ہونے سے ہے۔ جس طرح کہ روایات میں بھی تصریح موجود ہے، کہ یہی قصہ آیت کا سببِ نزول ہے۔ جن روایات میں آیت مذکورہ کی شانِ نزول قصۂ ''بئر معونہ'' یا ''قصہ رِعل'' و ''ذکوان'' کو بتایا گیا ہے۔ وہ درست نہیں، کیونکہ یہ واقعات اُحد کے بعد پیش آئے ہیں اور یہ کیسے ممکن ہے، کہ سبب

[1] فتح الباری، ۲/ ۴۹۱

بعد میں پیدا ہو، اور آیت کا نزول پہلے ہو چکا ہو؟ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: درست بات یہ ہے، کہ اس آیت کی شانِ نزول، وہ لوگ ہیں جن پر آپ ﷺ نے ''قصہ اُحد'' کے سبب بددعا کی تھی۔ (1)

اصل بات یہ ہے، کہ اس حدیث میں ''ادراج'' ہے، یعنی ''حتّٰی أنزل اللّٰه'' کے الفاظ زُہری کی روایت میں ''عمّن بَلَغه'' (یعنی جس سے ان کو یہ روایت پہنچی ہے) ''منقطع'' ہے، امام مسلم نے یونس کی روایت میں اس بات کی تصریح کی ہے، زہری کا یہ کہنا، کہ ''ہمیں یہ بات پہنچی ہے، کہ جب یہ آیت نازل ہوئی، تو آپ ﷺ نے ''قنوت'' پڑھنا ترک کر دی۔'' یہ بلاغ درست نہیں۔ وجہ وہی ہے، جو پہلے گزر چکی ہے۔ ملاحظہ ہو! فتح الباری: ۸/ ۲۸۶۔

ان دلائل سے معلوم ہوا، کہ بوقتِ ضرورت نمازوں میں ''قنوتِ نازلہ'' پڑھی جا سکتی ہے۔ ممانعت کی کوئی دلیل نہیں۔

وضاحت: مطلب یہ ہے، کہ جب ''غزوۂ اُحد'' میں رسول اللہ ﷺ کا سرِ مبارک زخمی ہوا، تو آپ ﷺ نے ''قنوت'' نہیں کی تھی، بلکہ یہ فرمایا: کہ « كَيفَ يُفلِحُ قَومٌ شَجُّوا رَأسَ نَبِيِّهِم» (2) یعنی ''وہ قوم کبھی فلاح نہیں پا سکے گی، جس نے اپنے پیغمبر کا سر زخمی کیا۔''

اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا:

﴿ لَيسَ لَكَ مِنَ الأَمرِ شَيءٌ أَو يَتُوبَ عَلَيهِم ﴾(آل عمرٰن:۱۲۸) کہ معاملات کا اختیار آپ ﷺ کے پاس نہیں۔ اللہ چاہے تو اُن کی توبہ بھی قبول کر سکتا ہے۔ یعنی جب اس موقعے پر آپ نے قنوت کی ہی نہیں، تو منع کرنے کا کیا مطلب؟ آپ نے تو قنوت کا آغاز ہی بعد میں، یعنی سن چار ہجری میں کیا۔

---

(1) فتح الباری: ۷/ ۳۶۶

(2) صحیح مسلم، بَابُ غَزوَةِ أُحُدٍ، رقم: ۱۷۹۱

سببی نمازیں اور غیر سببی نمازیں

صلوٰۃ الاستخارۃ

نمازِ استخارہ کا مفصل طریقہ:

سوال: ''نمازِ استخارہ'' کا مفصل طریقہ احادیث سے ثابت شدہ بتا دیں۔ نیز یہ کہ استخارہ کن کن کاموں کے لیے کیا جا سکتا ہے؟ اور کیا اس کے کرنے کے بعد باتیں کرنے کی اجازت ہوتی ہے؟ کیا اس کے لیے کوئی وقت مقرر ہے یا نہیں؟

جواب: دو رکعتیں نفل پڑھ کر «اَللّٰهُمَّ اِنِّی أَستَخِیرُكَ بِعِلمِكَ......الخ»[1] دعا پڑھیں اور اپنی ضرورت کا اظہار بھی کریں۔

جملہ مباح اور جائز کاموں میں استخارہ ہو سکتا ہے۔ اس کے بعد باتیں کرنے کی اجازت ہے، کسی حدیث میں ممانعت وارد نہیں۔ نیز اس کے لیے کوئی خاص وقت بھی مقرر نہیں۔

استخارہ کی نماز میں قراءت:

سوال: استخارہ کی نماز میں کون سی آیتیں پڑھنی چاہیے اور یہ نماز کس طرح پڑھی جاتی ہے؟

جواب: استخارے کے لیے کوئی مخصوص آیتیں نصِ صریح میں وارد نہیں ہیں۔

نمازِ استخارہ کا درست طریقہ یہ ہے، کہ نفلی دو رکعتیں پڑھی جائیں۔ تشہد کے اخیر میں یا سلام پھیر کر مشہور دعا «اَللّٰهُمَّ إِنِّی أَستَخِیرُكَ بِعِلمِكَ......الخ»[2] پڑھیے اور جو ضرورت درپیش ہو۔

اثنائے دعا میں اس کا نام بھی لیں۔ پھر جس کام پر شرح صدر حاصل ہو، وہ کر گزریں۔ خواب آنے کا کوئی مسئلہ نہیں۔ جس طرح کہ عوام کا اعتقاد ہے۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو! فتح الباری: ۱۰/ ۱۸۳ تا ۱۸۷۔

---

[1] صحیح البخاری ،بَابُ الدُّعَاءِ عِندَ الاِستِخَارَةِ، رقم:٦٣٨٢،سنن ابن ماجه،بَابُ مَا جَاءَ فِی صَلَاةِ الاِستِخَارَةِ،رقم:١٣٨٣

[2] أیضًا

تحیۃ المسجد

تحیۃ المسجد کا حکم

سوال: تحیۃ المسجد کا کیا حکم ہے اور ممنوع اوقات میں تحیۃ المسجد پڑھنا کیسا ہے؟

جواب: جب کوئی شخص مسجد میں آئے تو اس کے لئے تحیۃ المسجد کی دو رکعتیں پڑھنا تاکیدی حکم ہے۔ فرمانِ نبوی ﷺ ہے: «إِذَا دَخَلَ أَحَدُكُمُ الْمَسْجِدَ فَلْيَرْكَعْ رَكْعَتَيْنِ قَبْلَ أَنْ يَجْلِسَ»[1]

''جب تم میں سے کوئی شخص مسجد میں داخل ہو تو بیٹھنے سے پہلے دو رکعتیں پڑھے۔''

اس کے جواز میں کسی کو کلام نہیں، تاہم اس بارے میں اہل علم کا اختلاف ہے کہ ممنوع اوقات میں اس کی ادائیگی ہوسکتی ہے یا نہیں؟ راجح بات یہ ہے کہ ان اوقات میں سببی نماز کا جواز ہے اور بلا سبب ناجائز ہے۔ شیخ ابن باز رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

« هذا القول هو اصح الاقوال وهو مذهب الشافعي وإحدى الروايتين عن احمد واختاره شيخ الإسلام ابن تيمية وتلميذه العلامة ابن القيم وبه تجتمع الاخبار، والله اعلم.»[2]

''یہ صحیح ترین قول ہے اور یہی امام شافعی رحمہ اللہ اور ایک روایت کے مطابق امام احمد رحمہ اللہ کا قول ہے۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ اور ابن قیم رحمہ اللہ نے بھی یہی مسلک اختیار کیا ہے اور اسی سے احادیث کے درمیان بھی تطبیق ہو جاتی ہے۔''

تحیۃ المسجد کی دو رکعتیں فرض ہیں؟

سوال: کیا تحیۃ المسجد کی دو رکعتیں فرض ہیں؟ کیا اوقاتِ مکروہ میں پڑھی جاسکتی ہیں؟

جواب: ''تحیۃ المسجد'' کی دو رکعتیں اگرچہ فرض نہیں ہیں، کیونکہ فرض صرف پانچ نمازیں ہیں، لیکن ان کی اہمیت اس قدر ہے کہ خطبۂ جمعہ کے دوران آنے والا بھی دو رکعت پڑھ کر ہی بیٹھے گا۔ حالانکہ اس وقت، استماع اور انصات (سننے اور خاموش رہنے) کی بطورِ خاص تاکید وارد ہے۔ کتبِ احادیث میں قصۂ سلیک غطفانی اس امر کی واضح دلیل ہے۔ ''تحية المسجد'' چونکہ انشائی (بنیادی طور پر مستقل) نماز نہیں بلکہ...

---

① صحيح البخاري، بَابُ إِذَا دَخَلَ أَحَدُكُمُ الْمَسْجِدَ فَلْيَرْكَعْ رَكْعَتَيْنِ قَبْلَ أَنْ يَجْلِسَ، رقم: ٤٤٤

② حاشيه فتح الباري: ٢٥٩

سببی ہے۔ اس لیے اس کو مکروہ اوقات میں پڑھنا بھی درست ہے، جس طرح کہ نمازِ جنازہ وغیرہ ہے، بطورِ استدلال حدیث "كُرَيب عَن أُمّ سَلَمَةَ" پیش کی جاتی ہے۔

« سَمِعتُكَ تَنهَى عَن هَاتَينِ، وَأَرَاكَ تُصَلِّيهِمَا، فَإِن أَشَارَ بِيَدِهِ، فَاستَأخِرِي عَنهُ، فَفَعَلَتِ الجَارِيَةُ، فَأَشَارَ بِيَدِهِ، فَاستَأخَرَت عَنهُ، فَلَمَّا انصَرَفَ قَالَ: يَا بِنتَ أَبِي أُمَيَّةَ، سَأَلتِ عَنِ الرَّكعَتَينِ بَعدَ العَصرِ، وَإِنَّهُ أَتَانِي نَاسٌ مِن عَبدِ القَيسِ، فَشَغَلُونِي عَنِ الرَّكعَتَينِ اللَّتَينِ بَعدَ الظُّهرِ فَهُمَا هَاتَانِ» (متفق علیه)①

تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو! مرعاۃ المفاتیح (ج:۲،ص:۵۱۔۵٦)

تحیۃ المسجد پڑھنا فرض ہے یا مستحب؟

سوال: مسجد میں داخل ہونے کے بعد بیٹھنے سے پہلے دو رکعت پڑھنی فرض ہیں یا مستحب؟ کیا جمعہ کے علاوہ بغیر پڑھے بیٹھنا جائز ہے؟

جواب: عموم حدیث کا تقاضا یہ ہے کہ آدمی جب بھی مسجد میں آئے دو رکعت نماز پڑھ کر بیٹھے، جمعہ کے ساتھ مخصوص نہیں۔ نبی ﷺ کا فرمان ہے:

« اِذَا دَخَلَ اَحَدُكُمُ المَسجِدَ فَلَا يَجلِس حَتّٰى يُصَلِّي رَكعَتَينِ »②

یعنی تم میں سے کوئی شخص مسجد میں داخل ہو تو وہ دو رکعتیں نماز پڑھے بغیر نہ بیٹھے۔ ممنوعہ اوقات میں بھی سببی نماز کا جواز ہے۔ (فتاویٰ اسلامیہ:۱/۳۴۲)

حج سے واپسی پر مسجد میں جاتے ہی دو رکعت تحیۃ المسجد یا شکرانے کے نوافل:

سوال: ایک آدمی حج یا عمرہ سے واپس گھر آیا، محلّہ کی مسجد میں گیا، عصر کی نماز کے بعد پہنچا، اس نے خود بھی عصر پہلے پڑھی ہوئی ہے۔ کیا وہ اب "تحية المسجد" پڑھ سکتا ہے؟ اور کیا وہ نفل شکرانہ جو کہ حج سے واپسی پر پڑھی جاتی ہیں، پڑھ سکتا ہے؟ یا مندرجہ دونوں نوافل کو اکٹھا پڑھ سکتا ہے؟ یا مغرب کی نماز کے بعد پڑھے۔

جواب: ایسی صورت میں بہتر ہے، حاجی مسجد میں داخل ہونے کے بجائے سیدھا اپنے گھر چلا جائے اور

① صحيح البخاری،بَابٌ إِذَا كُلِّمَ وَهُوَ يُصَلِّي فَأَشَارَ بِيَدِهِ وَاستَمَعَ ،رقم:۱۲۳۳ ،صحيح مسلم،رقم: ۸۳٤

② صحيح مسلم، [illegible] الخ،رقم:۷۱٤

مسجد میں داخلہ کی صورت میں صرف دو رکعت "تحیۃ المسجد" پڑھنے کی اجازت ہے۔ مزید نہیں۔ یاد رہے! حج سے واپسی کے بعد بطورِ خاص شکرانے کے نوافل ادا کرنے شرع میں ثابت نہیں۔ ہاں البتہ بلا قید سفر سے واپسی کے بعد رسول اللہ ﷺ دو رکعت مسجد میں ادا کرتے تھے۔ ①

اذان کے دوران تحیۃ المسجد:

سوال : نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ مسجد میں آؤ تو بیٹھنے سے پہلے دو رکعت پڑھو۔ اگر مسجد میں کوئی آئے اور اذان ہو رہی ہو تو پہلے نماز پڑھے یا اذان ختم ہونے کا انتظار کرے۔

جب امام خطبہ جمعہ کے لیے منبر پر بیٹھ جائے اس وقت اذان دی جاتی ہے۔ اگر کوئی اس وقت مسجد میں داخل ہو تو کیا اذان کا جواب دے اور خطبہ جمعہ کے وقت نماز پڑھے یا اذان کے دوران میں ہی دو رکعت پڑھ لے؟

جواب : کھڑے کھڑے پہلے اذان کا جواب دے کر پھر تحیۃ المسجد کی دو رکعت پڑھنی چاہیے۔

حدیث میں ہے: « فَقُولُوا مِثْلَ مَا يَقُولُ الْمُؤَذِّنُ » ②

''جمعہ کی منبری اذان کے وقت بھی پہلے اذان کا جواب دے پھر تحیۃ المسجد ادا کرے۔''

جمعہ کی نماز کھڑی ہونے پر چھوڑی ہوئی تحیۃ المسجد کی قضاء ضروری ہے؟

سوال : خطبۂ جمعہ کے وقت نماز پڑھ رہے ہوں اور جماعت کھڑی ہو جائے تو نماز جمعہ کے بعد یہ دو رکعت نماز تحیۃ المسجد جو توڑی گئی اس کی قضاء ضروری ہے؟

جواب : اس صورت میں ادھوری نماز کی قضاء ضروری نہیں۔

فجر کی دو سنتیں گھر میں ادا کرنے کے بعد مسجد میں تحیۃ المسجد ادا کرنا؟

سوال : صبح کی دو سنتیں گھر میں ادا کرنے کے بعد اگر مسجد جائیں اور ابھی جماعت کھڑے ہونے میں چند منٹ باقی ہوں تو دو رکعت "تحیۃ المسجد" ادا کریں؟

جواب : اگر صبح کی دو رکعتیں گھر میں پڑھ کر مسجد میں آئیں، جماعت کھڑی ہونے میں وقفہ ہو تو عمومِ حدیث «اِذَا جَاءَ كُمُ الْمَسْجِدَ......الخ» کی بناء پر ''تحیۃ المسجد'' کی دو رکعتیں پڑھنی چاہئیں۔

---

① تحفة الذاكرين، ص: ١٦٧، صحيح البخاری، بَابُ الصَّلَاةِ إِذَا قَدِمَ مِنْ سَفَرٍ، قبل رقم: ٤٤٣

② صحيح البخاری، بَابُ مَا يَقُولُ إِذَا سَمِعَ الْمُنَادِي، رقم: ٦١١، صحيح مسلم، رقم: ٣٨٣

صبح کی دو سنتیں تحیۃ المسجد کی متبادل ہو سکتی ہیں؟

سوال: صبح کی اذان کے بعد سنتوں سے پہلے دو رکعت نفل نماز ''تحیۃ الوضوء'' یا ''تحیۃ المسجد'' کا کوئی ثبوت ہے، کوئی اگر پڑھنا چاہے تو پڑھ سکتا ہے یا نہیں؟

جواب: صبح کی اذان کے بعد دو رکعتوں کی ادائیگی ''تحیۃ المسجد'' وغیرہ سے بھی کافی ہو جاتی ہے۔ لہٰذا علیحدہ پڑھنے کی ضرورت نہیں یہ اس طرح ہے جیسے ''حجۃ الوداع'' کے موقع پر نبی ﷺ نے کعبہ میں داخل ہو کر طواف شروع کر دیا تھا۔ ''تحیۃ المسجد'' کی نماز بھی اس میں شامل ہو گئی تھی۔ البتہ اگر کوئی شخص صبح کی دو رکعتیں گھر میں ادا کر کے مسجد میں آتا ہے اور اقامتِ صلوٰۃ میں ابھی کچھ وقفہ ہے تو وہ عمومِ حدیث «اِذَا دَخَلَ اَحَدُکُم المَسجِدَ......»[1] کی بناء پر دو رکعت پڑھ کر بیٹھے۔ اگر کہا جائے کہ نبی اکرم ﷺ سے فجر کی اذان کے بعد قبل از فرائض صرف دو رکعت ثابت ہیں۔ (تحیۃ المسجد کے نوافل کا جواز اس پر اضافہ ہوگا۔ جو درست نہیں) اس کا جواب یہ ہے کہ یہ اس صورت میں ہے جب ''اِنشَاءً'' یعنی مسجد میں بیٹھا ہوا کھڑے ہو کر نوافل پڑھنے لگ جائے۔ لیکن اگر سببی طور پر ادا کیے جائیں تو پھر جائز ہے، جیسے باہر سے آنے والا ''تحیۃ المسجد'' ادا کرتا ہے۔ (واللہ اعلم بالصواب)

فجر کی دو سنتیں گھر میں ادا کرنے والا مسجد میں تحیۃ المسجد ادا کرے گا؟

سوال: جب آدمی صبح کی سنتیں گھر میں پڑھ کر مسجد کو چلا جائے اور جماعت کھڑی ہونے میں ابھی ٹائم باقی ہو تو کیا آدمی تحیۃ المسجد کی دو رکعتیں پڑھ سکتا ہے یا نہیں؟ مفصل جواب ارشاد فرمائیں۔

جواب: صبح کی سنتیں آدمی گھر میں پڑھ کر آئے اور مسجد میں جماعت کھڑی ہونے میں ابھی کچھ وقت ہو تو عمومِ حدیث «اِذَا دَخَلَ اَحَدُکُم المَسجِدَ فَلَا یَجلِس حَتّٰی یُصَلِّی رَکعَتَینِ»[2] ''تم میں کوئی شخص جب مسجد میں داخل ہو تو بیٹھنے سے پہلے دو رکعت ادا کرے، کی بناء پر ''تحیۃ المسجد'' پڑھنی چاہیے'' اور جس حدیث میں منع ہے اس سے مقصود انشائی (بلا سبب) نماز ہے۔ تاہم سببی نماز پڑھنی چاہیے۔

تحیۃ المسجد اوقاتِ مکروہ میں ادا کرنا:

سوال: تحیۃ المسجد اوقاتِ مکروہ میں بھی پڑھی جا سکتی ہے؟

---

[1] صحیح البخاری، بَابُ إِذَا دَخَلَ أَحَدُکُمُ المَسجِدَ فَلیَرکَع رَکعَتَینِ قَبلَ أَن یَجلِسَ، رقم: ٤٤٤

[2] صحیح مسلم، بَابُ استِحبَابِ تَحِیَّۃِ المَسجِدِ بِرَکعَتَینِ، وَکَرَاھَۃِ الجُلُوسِ ......الخ، رقم: ٧١٤

(جواب): اوقاتِ مکروہہ میں ''تحیۃ المسجد'' نماز پڑھی جا سکتی ہے، کیونکہ حدیث میں حکم عام ہے۔ اہلِ علم نے سببی نماز کو مستثنیٰ قرار دیا ہے۔ مکروہ اوقات میں انشائی (قصداً بلا سبب) نماز ناجائز ہے۔

(سوال): تَحِيَّةُ الْمَسجِد مکروہ اوقات میں پڑھنے کا بارے میں علمائے حدیث میں اختلاف ہے؟ افضل صورت تحریر فرمادیں۔

(جواب): تَحِيَّةُ الْمَسجِدِ چونکہ سببی (یعنی مسجد میں داخل ہونے کے سبب پڑھی جانے والی) نماز ہے۔ لہٰذا مکروہ اوقات میں پڑھی جا سکتی ہے۔ صحیح حدیث کا عموم بھی اسی بات کا متقاضی ہے۔

مسجد میں عید کی نماز سے پہلے تحیۃ المسجد ادا کرنا کیسا ہے؟

(سوال): عید کی نماز کسی وجہ سے مسجد میں پڑھی جائے تو تحیۃ المسجد پڑھنی چاہیے یا نہیں؟

(جواب): نمازِ عید اگر مسجد میں پڑھی جائے تو عمومِ حدیث کے پیشِ نظر ''تحیۃ المسجد'' پڑھنی چاہیے۔

صلوٰۃ الاستسقاء) نمازِ استسقاء

صلوٰۃ الاستسقاء میں دعاء کے وقت ہاتھوں کی کیفیت:

(سوال): بارش کے لیے جو نماز (استسقاء) پڑھی جاتی ہے اس کی دعا ہاتھ آسمان کی طرف اٹھا کر مانگی جاتی ہے یا زمین کی طرف ہاتھ کر کے مانگی جاتی ہے؟

(جواب): نبی ﷺ نے بارش کی دعا اُلٹے ہاتھ کی ہے۔ چنانچہ صحیح مسلم میں بروایت ثابت عن انس رضی اللہ عنہ مروی ہے:

«أَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ استَسقٰى فَاَشَارَ بِظَهرِ كَفَّيهِ إِلَى السَّمَآءِ »[1]

یعنی ''رسول اللہ ﷺ نے بارش طلب کی، تو اپنی دونوں ہتھیلیوں کی پُشت سے آسمان کی طرف اشارہ کر کے دعا فرمائی۔''

اور سنن ابوداؤد میں بھی حضرت انس رضی اللہ عنہ سے ہی روایت ہے، بیان کرتے ہیں کہ:

« كَانَ يَستَسقِي هٰكَذَا، وَ مَدَّ يَدَيهِ. وَ جَعَلَ بُطُونَهُمَا مِمَّا يَلِي الاَرضَ، حَتّٰى رَأَيتُ بَيَاضَ إِبطَيهِ »[2]

---

(1) صحیح مسلم، بَابُ رَفعِ الیَدَینِ بِالدُّعَاءِ فِی الِاستِسقَاءِ، رقم: ۸۹۵

(2) سنن ابی داؤد،بَابُ رَفعِ الیَدَینِ فِی الِاستِسقَاءِ، رقم: ۱۱۷۱

''رسول اللہ ﷺ اس طرح بارش طلب کرتے تھے اور پھر انھوں نے خود اپنے دونوں ہاتھ پھیلائے اور ہتھیلیوں کو زمین کی طرف کرلیا یہاں تک کہ میں نے آپ کی دونوں بغلوں کی سفیدی دیکھی۔''

گویا کہ ہاتھوں کی اس کیفیت سے حالات کے منقلب ہونے (بدلنے) کی طرف اشارہ ہے یا مسئول کی صفت کی طرف اشارہ ہے، کہ بادل زمین کی طرف اُتر جائیں۔

امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''رفعِ بلاء کی ہر دعا میں سنت طریقہ یہ ہے، کہ داعی فوراً دونوں ہاتھوں کی پشتوں کو آسمان کی طرف کرے اور جب کسی شے کا طالب ہو، تو اس صورت میں ہتھیلیاں آسمان کی طرف ہوں۔''

لیکن بظاہر احادیث سے ایسا معلوم ہوتا ہے، کہ مندرجہ بالا کیفیت اس صورت میں اختیار کی جائے، جب کہ ''صلوٰۃ استسقاء'' کا اہتمام ہو۔ عام حالات میں مثلاً خطبۂ جمعہ وغیرہ میں بارش کی دعا کی جائے، تو ہاتھ اُلٹے کرنے کی ضرورت نہیں، کیونکہ ''قصۃ الاعرابی'' ''دیہاتی کے معبد'' میں اس امر کی تصریح موجود نہیں، کہ آپ ﷺ نے خطبہ کے دوران اُلٹے ہاتھ دعا کی ہو۔

اس بارے میں امام بخاری رحمہ اللہ کے تراجم وابواب بھی عام ہیں:

« بَابُ رَفعِ النَّاسِ أَيدِيَهُم مَعَ الِامَامِ فِي الِاستِسقَاءِ، اور «بَابُ رَفعِ الِامَامِ يَدَهُ فِي الِاستِسقَاءِ »

صلوٰۃ الحاجۃ

صلوۃ الحاجۃ پڑھنے کا طریقہ:

سوال: صلوۃ الحاجۃ پڑھنے کا طریقہ کیا ہے اور اس میں کیا کچھ پڑھا جاتا ہے؟

جواب: ''صلوۃ الحاجۃ'' المعروف ''صلاۃِ اِستخارہ'' پڑھنے کا طریقۂ کار یہ ہے کہ آدمی کو جب کوئی ضرورت درپیش ہو، تو دو رکعت نماز غیر مکروہ اوقات میں فرضوں کے علاوہ بہ نیت استخارہ پڑھے۔ امام نووی رحمہ اللہ کا کہنا ہے، کہ دونوں رکعتوں میں (فاتحہ کے بعد) بالترتیب ''سورۃ الکافرون'' اور ''سورۃ الاخلاص'' کی تلاوت کرے۔ غالبًا اس کی وجہ یہ ہے، کہ ان میں توحید و اِخلاص کا بیان ہے، اور مستخیر (استخارہ کرنے والا) اس شے کا محتاج ہے۔ لیکن حافظ عراقی فرماتے ہیں: مجھے اس اَمر کی دلیل معلوم نہیں ہوسکی۔ ممکن ہے انھوں نے فجر

کی سنتوں یا مابعد مغرب کی دو رکعتوں پر قیاس کیا ہو۔ پھر حافظ عراقی کا کہنا ہے: مناسب یہ بھی ہے، کہ آیت کریمہ: ﴿ وَ رَبُّكَ يَخْلُقُ مَا يَشَاءُ وَ يَخْتَارُ...... ﴾ اور آیت ﴿وَ مَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَ لَا مُؤْمِنَةٍ ﴾ کی تلاوت کی جائے۔ (واللہ اعلم) بظاہر اختیار ہے، کیونکہ تقیید کی کوئی واضح مستند دلیل نہیں ہے۔ پھر بعد از فراغت یا تشہد کے آخر میں یہ دعا پڑھے:

« اَللّٰهُمَّ اِنِّى أَستَخِيرُكَ بِعِلمِكَ، وَأَستَقدِرُكَ بِقُدرَتِكَ ، وَ أَسأَلُكَ مِن فَضلِكَ العَظِيمِ ، فَاِنَّكَ تَقدِرُ، وَلَا أَقدِرُ ، وَ تَعلَمُ وَ لَا أَعلَمُ، وَ أَنتَ عَلَّامُ الغُيُوبِ. أَللّٰهُمَّ اِن كُنتَ تَعلَمُ اَنَّ هٰذَا الأَمرَ (اس مقام پر ضرورت کا اظہار بول کر یا دل میں ہونا چاہیے) خَيرٌ لِّى فِى دِينِى، وَ مَعَاشِى، وَ عَاقِبَةِ أَمرِى، فَاقدُرهُ لِى، وَ يَسِّرهُ لِى، ثُمَّ بَارِك لِى فِيهِ، وَ إِن كُنتَ تَعلَمُ أَنَّ هٰذَا الأَمرَ (اس مقام پر بھی ضرورت کا اظہار کرے) شَرٌّ لِّى، فِى دِينِى، وَ مَعَاشِى، وَ عَاقِبَةِ أَمرِى، فَاصرِفهُ عَنِّى، وَاصرِفنِى عَنهُ، وَاقدُر لِىَ الخَيرَ حَيثُ كَانَ.ثُمَّ أَرضِنِى بِهٖ» [1]

پھر (دلی) میلان کے مطابق عمل کر گزرے۔ مزید خواب یا انشراحِ صدر کے انتظار کی ضرورت نہیں ہے۔ علماء کے اختلافات میں سے بظاہر ترجیح اس بات کو معلوم ہوتی ہے (واللہ اعلم) اور بالخصوص ''صلوة الحاجة'' کی صراحت ایک دوسری روایت میں یوں ہے، کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس کو اللہ تعالیٰ یا کسی انسان سے کوئی حاجت ہو، تو اسے چاہیے، کہ کامل مکمل وضو کر کے دو رکعت نماز ادا کرے، بعد ازاں اللہ عزوجل کی تعریف وثناء اور نبی ﷺ پر درود پڑھے، پھر درج ذیل دعا پڑھے:

« لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ الحَلِيمُ الكَرِيمُ، سُبحَانَ اللّٰهِ رَبِّ العَرشِ العَظِيمِ، وَالحَمدُ لِلّٰهِ رَبِّ العَالَمِينَ. أَسأَلُكَ مُوجِبَاتِ رَحمَتِكَ ، وَ عَزَائِمَ مَغفِرَتِكَ، وَالغَنِيمَةَ مِن كُلِّ بِرٍّ، وَالسَّلَامَةَ مِن كُلِّ اِثمٍ، لَا تَدَع لِى ذَنبًا إِلَّا غَفَرتَهُ ، وَ لَا هَمًّا إِلَّا فَرَّجتَهُ ، وَلَا حَاجَةً هِىَ لَكَ رِضًا إِلَّا قَضَيتَهَا، يَا اَرحَمَ الرَّاحِمِينَ.» [2]

---

[1] صحيح البخارى ،بَابُ الدُّعَاءِ عِندَ الاِستِخَارَةِ، رقم:٦٣٨٢ ،سنن ابن ماجه،بَابُ مَا جَاءَ فِى صَلَاةِ الاِستِخَارَةِ،رقم:١٣٨٣

[2] سنن ابن ماجه،بَابُ مَا جَاءَ فِى صَلَاةِ الحَاجَةِ ،رقم: ١٣٨٤ ،سنن الترمذى، بَابُ مَا جَاءَ فِى صَلَاةِ الحَاجَةِ،رقم:٤٧٩ و قال الترمذى: هذا حديث غريب

لیکن حدیث ہذا کی سند میں راوی فائد بن عبد الرحمٰن بن أبي الورقاء ضعیف ہے۔ امام ذہبی رحمہ اللہ نے حاکم کے تعاقب میں فرمایا ہے:" بِأَنَّهُ مَتْرُوكٌ- فَالحَدِيثُ ضَعِيفٌ" البتہ امام شوکانی رحمہ اللہ نے ''تحفۃ الذاکرین'' میں اور حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے ''أمالی'' میں اس کے دیگر طُرق بھی ذکر کیے ہیں، لیکن وہ بھی کمزور ہیں۔ ہاں یہی روایت ''مسند احمد'' میں حضرت ابو الدرداء سے مختصر بیان ہوئی ہے۔ اس کی سند صحیح ہے۔ اس کے الفاظ ملاحظہ فرمائیں۔

« قَالَ سَمِعتُ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ يَقُولُ : مَن تَوَضَّأَ فَأَسبَغَ الوُضُوءَ، ثُمَّ صَلّٰى رَكعَتَينِ يُتِمُّهُمَا. أَعطَاهُ اللّٰهُ عَزَّوَجَلَّ مَا سَأَلَ مُعَجَّلًا ، او مُؤَخَّرًا»[1]

یعنی ''حضرت ابو الدرداء رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں، کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا: کہ جس نے کامل وضو کیا۔ پھر دو رکعتیں مکمل کیں۔ جلدی یا بدیر اللہ عزوجل اس کی طلب پوری کرے گا۔''

صلوٰۃ الإشراق (نمازِ اشراق)

نمازِ فجر کے بعد نمازِ اشراق کے لیے اسی جگہ خاموش بیٹھنا ضروری ہے؟

سوال : نمازِ اشراق کے لیے نمازِ فجر کے بعد اسی جگہ خاموشی سے بیٹھے رہنا کیا لازمی ہے؟

جواب : نمازِ اشراق کی ادائیگی کے لیے اسی جگہ خاموشی سے بیٹھے رہنا ضروری نہیں۔ کلماتِ خیر کے ساتھ نُطق (کلام کرنا) کا جواز ہے۔ حضرت معاذ بن انس الجہنی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

« مَن قَعَدَ فِي مُصَلَّاهُ حِينَ يَنصَرِفُ مِن صَلَاةِ الصُّبحِ، حَتَّى يُسَبِّحَ رَكعَتَيِ الضُّحَى، لَا يَقُولُ إِلَّا خَيرًا، غُفِرَ لَهُ خَطَايَاهُ، وَإِن كَانَت أَكثَرَ مِن زَبَدِ البَحرِ »[2]

''یعنی جو صبح کی نماز پڑھ کر جائے نماز میں بیٹھا رہا حتی کہ سورج طلوع ہونے کے بعد دو رکعت ادا کرے، زبان سے صرف کلمۂ خیر نکلا، تو اللہ اس کی سب خطائیں معاف کر دیتے ہیں، اگرچہ وہ سمندر کی جھاگ سے بھی زیادہ ہوں۔''

ابوداؤد نے اگرچہ اس پر سکوت اختیار کیا ہے، لیکن روایت سنداً کمزور ہے۔ امام منذری رحمہ اللہ نے کہا ہے،

---

[1] مسند احمد ،رقم:٢٧٤٩٧

[2] سنن أبي داؤد،بَابُ صَلَاةِ الضُّحَی،رقم:١٢٨٧

کہ اس میں سہل بن معاذ اور زبان بن فائدہ، دو ضعیف راوی ہیں۔

صلوٰۃ التسبیح

کیا عام حالات میں صلوٰۃ التسبیح پڑھنا سنت سے ثابت ہے؟

سوال: مکرمی و محترمی، جناب مولانا حافظ ثناء اللہ مدنی صاحب حفظہ اللہ ''الاعتصام (ج:۵۱، شمارہ ۱۸، مجریہ ۱۴، مئی ۹۹ء میں ''احکام ومسائل'' کے تحت "صلوٰۃ التسبیح" کے متعلق آپ نے فرمایا ہے کہ'' عام حالات میں صلوٰۃ التسبیح پڑھنا سنت سے ثابت ہے......الخ''(ص:۸) حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ حدیث سنداً ضعیف ہے۔ خود رسول اللہ ﷺ سے اس کا پڑھنا ثابت نہیں ہے۔ امام ابن خزیمہ رحمہ اللہ نے اس کی اسناد کے بارے میں ''کھٹک'' کا اشارہ فرمایا ہے اگرچہ اس کے متعدد موصول و مرسل طُرق موجود ہیں لیکن بقول حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ حاکم کی تصحیح اور ابن الجوزی کے دعویٰ وضع میں تساہل ہے۔ حاکم، ذہبی، ابن حجر اور البانی وغیرہم رحمہم اللہ نے تعدد طُرق وشواہد کی بناء پر اس کی جو تحسین کی ہے وہ محدثین کے محض اس گمان پر مبنی ہے کہ چونکہ یہ حدیث متعدد طُرق سے وارد ہے۔ لہٰذا ایسا محسوس ہوتا ہے، کہ اس کی کوئی نہ کوئی اصل ضروری ہے۔ حالانکہ اگر اس مفروضہ کو تسلیم کیا جائے، تو متعدد ضعیف؟ بلکہ موضوع احادیث متعدد طُرق کی بناء پر حسن قرار پاجائیں گی۔ مثلاً حدیثِ طیر۔ حالانکہ امام ابن الجوزی رحمہ اللہ نے "العلل المتناهية" میں اس کے سولہ طُرق بیان کیے ہیں اور ابن مردویہ نے بیس طرق، مگر ابن طاہر نے اسے موضوع قرار دیا ہے۔ دوسری مثال «مَن كُنتُ مَولَاہُ فَعَلِيٌّ مَولَاہُ»، اور « طَلَبُ العِلمِ فَرِيضَةٌ »[1] وغیرہ بھی موجود ہیں۔ لہٰذا اس مہلک مفروضہ کی بناء پر صلوٰۃ التسبیح کو ''حسن'' ہی نہیں سنت ثابتہ قرار دینا کہاں تک درست ہے؟ بینوا توجروا۔

جواب: نمازِ تسبیح کی صحت میں اہل علم کا اختلاف ہے، علماء کی ایک جماعت نے اس حدیث کو ضعیف قرار دیا ہے جن میں سے ابن العربی، نووی نے شرح المهذب میں، ابن قیم، ابن عبد الہادی، مزی، ابن حجر نے التلخیص میں اور ابن جوزی نے اس کو موضوعات میں شمار کیا ہے اور کہا ہے کہ اس میں موسیٰ بن عبد العزیز مجہول ہے۔ جب کہ دوسرے گروہ نے اس کو صحیح یا حسن کہا ہے ان میں سے ابوبکر الآجری، ابو محمد عبد الرحیم مصری، حافظ ابو الحسن مقدسی، ابوداؤد صاحب سنن، مسلم صاحب صحیح، حافظ صلاح الدین اعلائی، خطیب، ابن صلاح، سبکی، سراج الدین بلقینی، ابن مندہ، حاکم، منذری، ابو موسیٰ مدینی، زرکشی اور نووی نے تہذیب

[1] سنن ابن ماجه، بَابُ العِلمِ العَامِّ الَّذِي لَا يَسَعُ البَالِغَ العَاقِلَ جَهلُهُ، رقم:۳۲۵

الاسماء واللغات میں، ابوسعید سمعانی، حافظ ابن حجر نے فی الخصال المکفرۃ اور اُمالی الاذکار میں، ابومنصور دیلمی، بیہقی، دارقطنی اور دیگر اہل علم رحمہم اللہ نے بھی اس پر صحت یا تحسین کا حکم لگایا ہے۔

علامہ ابوالحسن عبید اللہ مبارکپوری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ''میرے نزدیک حق اور درست بات یہ ہے کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث ضعیف نہیں چہ جائیکہ اس پر من گھڑت یا جھوٹی ہونے کا حکم لگایا جائے، بلکہ بلاشبہ میرے نزدیک یہ حسن درجہ سے کم نہیں بلکہ یہ بھی بعید نہیں کہ شواہد کی بنا پر اس حدیث کو صحیح لغیرہ قرار دیا جائے۔'' پھر آپ نے معترضین کے اعتراضات کا جائزہ پیش کر کے اس کو قابلِ حجت قرار دیا ہے۔(مرعاۃ المفاتیح:۲/۲۵۳) حدیث ہذا پر تفصیلی گفتگو کے لیے ملاحظہ ہو کتاب اللآلی المصنوعۃ از علامہ سیوطی اور تحفۃ الاحوذی۔

علامہ البانی رحمہ اللہ ''مشکوٰۃ'' کے حاشیہ پر فرماتے ہیں:

«فان للحديث طرقا و شواهد كثيرة ، يقطع الواقف عليها. فان للحديث أصلا أصيلا خلافا لمن حكم عليه بالوضع أو قال إنه باطل»

''اس حدیث کے بہت سارے طُرق اور شواہد ہیں۔ ان پر مطلع ہونے والا اس نتیجہ پر پہنچتا ہے، کہ یقیناً اس حدیث کی اصل ہے۔ بخلاف اس کے جس نے اس پر من گھڑت ہونے کا حکم لگایا ہے یا کہا، کہ یہ حدیث باطل ہے۔''

پھر فرماتے ہیں:

''علامہ ابوالحسنات لکھنوی نے « الآثار المرفوعة فی الاخبار الموضوعة » (ص: ۳۵۳/۳۷٤) میں کافی تحقیق کی ہے۔ جو بسط و تفصیل چاہتا ہے۔ اسے اس کی طرف مراجعت کرنی چاہیے۔

« فَإِنَّهُ يُغنِي عَن كُلِّ مَا كَتَبَ فِي هٰذَا المَوضُوعِ » (۱/٤۱۹)

''اس مسئلہ پر جو کچھ لکھا گیا ہے۔ وہ سب سے کافی ہے۔''

اس ساری بحث سے معلوم ہوا، کہ جن علماء نے ''صلاۃ التسبیح'' کو بدعت قرار دیا ہے۔ ان کا نظریہ مرجوح ہے۔ بلکہ اس کا مسنون ہونا بدلائل قویہ ثابت ہوتا ہے۔ مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو! « أَجوِبَةُ الحَافِظِ عَن اَحَادِيثِ المَصَابِيحِ فِي آخِرِ المِشكٰوةِ بِتَحقِيقِ الألبَانِي.»

صلوٰۃ التسبیح کے متعلق روایات کی استنادی حیثیت کیا ہے؟

سوال: صلوٰۃ التسبیح کے بارے میں محققین فرماتے ہیں کہ احادیث ابن ماجہ اور بیہقی وغیرہ میں آئی ہیں صحیح

نہیں ہیں۔ بعض علماء اس کے قائل بھی ہیں اور اکثر اس کی رغبت دلائی جاتی ہے۔ براہِ کرم اس کے بارے میں بھی مفصل جواب درکار ہے۔ صحیح احادیث کی روشنی میں۔ (محمد عاقل، نزیل جدہ)

جواب: صلوٰۃ التسبیح کے بارے میں وارد، روایت کثرتِ طُرق کی بناء پر کم از کم حسن درجہ کی ہے۔ اس مسئلہ میں تفصیلی بحث ''الاعتصام'' میں شائع ہو چکی ہے۔

نمازِ تسبیح پڑھنے کا طریقہ اور نوافل کی جماعت کا حکم:

سوال: ① نمازِ تسبیح پڑھنے کا طریقہ وضاحت سے بیان کریں۔

② حضور ﷺ نے نمازِ تسبیح کی جماعت کروائی ہے یا اکیلے ہی نمازِ تسبیح پڑھی ہے؟

③ نمازِ تسبیح میں تیسرا کلمہ پورا پڑھنا ہے یا نہیں؟

جواب: ① نمازِ تسبیح کا طریقہ ملاحظہ فرمائیں!

تعداد رکعت۔۴، ہر رکعت میں فاتحہ کے بعد کوئی سورت ملائی جائے۔ قرأت سے فراغت کے بعد بحالتِ قیام پندرہ دفعہ تسبیح ''سُبحَانَ اللّٰہِ، وَالحَمدُ لِلّٰہِ، وَ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ ، وَاللّٰہُ اَکبَرُ'' پڑھے۔ پھر رکوع کیا جائے۔ اس حالت میں مذکور تسبیح دس بار پڑھی جائے۔ پھر بحالتِ اعتدال مذکور ذکر دس بار۔ پھر سجدہ میں دس دفعہ۔ پھر ما بین السجدتین دس بار۔ پھر دوسرے سجدہ میں دس بار۔ پھر سجدہ سے سَر اٹھانے کے بعد یعنی جلسۂ استراحت میں دس بار۔ پس یہ تسبیحات پچھتر (۷۵) بار ہوئیں۔

چار رکعتوں کو اسی انداز سے ادا کیا جائے۔ کثرتِ تسبیحات کی بناء پر، اس نماز کا نام ''صلوٰۃ تسبیح'' رکھا گیا ہے۔ واضح رہے مذکور تسبیح ہر مقام پر معمول کے مطابق ذکر اذکار (نماز کے اندر مسنون اذکار) کے بعد پڑھی جائے گی۔

نیز اس بارے میں وارد حدیث کی صحت اور ضعف میں اہلِ علم کا اختلاف ہے۔ حق بات یہ ہے، کہ روایت ہذا درجۂ حسن سے کم نہیں، بلکہ شواہد کی بناء پر اس کو ''صحیح لغیرہٖ'' بھی قرار دیا جا سکتا ہے۔ لہٰذا حدیث ہذا بلا شبہ قابلِ عمل واستدلال ہے۔ مزید تفصیل کے لیے: ''اللآلی المصنوعة فی الأحادیث الموضوعة للسیوطی'' (۲/۳۷ تا ۴۵، مرعاۃ المفاتیح: ۲/۲۵۳)

②۔ نبی اکرم ﷺ سے نوافل کی جماعت ثابت ہے۔ نمازِ تسبیح بھی نوافل کی قبیل سے ہے۔ لہٰذا اس کی بھی جماعت جائز ہے۔ تاہم اُولیٰ وافضل یہ معلوم ہوتا ہے، کہ اس کو انفرادی طور پر ادا کیا جائے۔ تاکہ اطمینان وتسلی سے تسبیحات کی گنتی پوری ہو سکے۔ (واللہ اعلم)

③۔ صلوٰۃِ تسبیح میں صرف مذکور ذکر مسنون و مستحب ہے، اس کا نام جو مرضی رکھ لیں۔(لَا مَشَاحَةَ فِي الإصطلاح)(اصطلاحی مفہوم مراد لینے میں کوئی مضائقہ نہیں۔)

کیا صلوٰۃ التسبیح باجماعت ادا کرنا صحیح حدیث سے ثابت ہے؟

سوال: صلوٰۃ التسبیح باجماعت صحیح حدیث سے ثابت ہے؟

جواب: صلوٰۃ تسبیح چونکہ نوافل کی قبیل سے ہے۔ جب نوافل کی جماعت ثابت ہے، تو از بس تسبیح کی جماعت بھی ثابت ہوگئی۔

کیا عید کے موقع پر عورتیں باجماعت صلوٰۃ التسبیح باجماعت ادا کرسکتی ہیں؟

سوال: کیا صلوٰۃ التسبیح پڑھنا خاص کر عورتوں کے لیے عید کے موقع پر جماعت کی صورت میں جائز ہے؟

جواب: عام حالات میں صلوٰۃ التسبیح پڑھنا سنت سے ثابت ہے اور عید کے موقع پر بالخصوص باجماعت پڑھنا سنت سے ثابت نہیں۔

کیا عورتوں کی عورتوں کے پیچھے نمازِ تسبیح ہو جاتی ہے؟

سوال: ایک آدمی نے کہا ہے کہ عورتوں کی عورتوں کے پیچھے تسبیح نماز نہیں ہوتی، جواب کتاب وسنت کی روشنی میں درکار ہے؟

جواب شریعت میں نوافل کی جماعت کا جواز ہے۔ تسبیح نماز بھی تو نفل ہی ہے۔ اس حیثیت سے مرد وزن کی جماعت میں تفریق کی کوئی وجہ نہیں۔ بلا تردّد (بغیر شک) تسبیح نماز میں عورت عورتوں کی جماعت کرا سکتی ہے۔

صلوٰۃ التسبیح اکیلے ادا کریں یا باجماعت؟

سوال: صلوٰۃ التسبیح اکیلے ادا کرنا کیسا عمل ہے؟ اور یہ روایت صحیح ہے یا ضعیف؟

جواب: صلوٰۃ التسبیح اصلاً اکیلے کی نماز ہے۔ جماعت کا صرف جواز ہے۔ روایت ہذا کی صحت اور ضعف میں سخت اختلاف ہے۔ بظاہر جواز ہے۔ (واللہ اعلم بالصواب)

صلوٰۃ القصر (قصر نماز)

سفر میں پوری نماز پڑھنے کا حکم:

سوال: اگر کوئی شخص سفر میں پوری نماز پڑھے تو کیا وہ بدعت تو نہ ہوگی؟ کیونکہ نبی پاک ﷺ نے سفر میں سفری نماز ہی پڑھی ہے۔

جواب: راجح مذہب کے مطابق سفر میں ''صَلاۃِ قصر'' افضل ہے واجب نہیں۔ اس لیے کہ نبی اکرم ﷺ نے ''صلاۃِ قصر'' کو صدقہ قرار دیا ہے۔ یہ بات معروف ہے کہ صدقہ قبول کرنا واجب نہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ قصر بھی واجب نہیں۔ باقی رہا رسول اللہ ﷺ کا سفر میں قصر پر مداومت اختیار کرنا۔ تو جمہور ائمۂ اصول کے نزدیک یہ وجوب کی دلیل نہیں۔ اس کی مثال یوں سمجھئے کہ مثلاً: خطبۂ جمعہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیشہ ارشاد فرمایا کبھی ترک نہیں کیا۔ دوسری طرف آپ ﷺ نے فرمایا ہے: کہ جس نے امام کے ساتھ نماز پائی اُس نے جمعہ پا لیا۔ یعنی فرض ادا ہو گیا، اگرچہ وہ فضیلت مَوعُودَہ سے محروم ہے۔ اسی طرح ''رکوع'' کے بعد ''رفع الیدین'' پر آپ ﷺ کی ہمیشگی کے باوجود فقہاءِ محدثین عظام نے اس پر "استحباب" اور ''سنت مؤکدہ'' جیسے اطلاقات کیے ہیں۔ کیونکہ یہ سنن فعلیہ کی قبیل سے ہیں۔

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ رقمطراز ہیں:

« إِنَّ أَفعَالَهُ بِمُجَرَّدِهَا لَا تَدُلُّ عَلَى الوُجُوبِ » [1]

دورانِ سفر مکمل نماز پڑھنے کا حکم:

سوال: محلّٰی ابن حزم جلد نمبر۴، ص:۲۶۶، میں حدیث ہے:

« عَن نَافِعٍ عَنِ ابنِ عُمَرَ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: صَلٰوۃُ السَّفرِ رَکعَتَانِ ، مَن تَرَكَ السُّنَّةَ فَقَد كَفَرَ.»

''سفر کی نماز دو رکعت ہے جس شخص نے یہ طریقہ شرعیہ چھوڑا (اور نماز پوری پڑھی) تو وہ کافر ہوا۔''

اس حدیث اور دیگر احادیث سے ثابت ہوتا ہے کہ نمازِ سفر صرف دو رکعت ہے سوائے مغرب کے۔ اب جو شخص اس نماز کو ناقص تصور کر کے پوری پڑھتا ہے، وہ قانون شرعی کو بدلتا ہے اور یہ کفر ہے، ہمیشہ دوگانہ پڑھو۔

---

[1] فتح الباری: ۱۰/۳۴۲

اس حدیث کی استنادی حیثیت کیا ہے، نیز کیا دورانِ سفر مکمل نماز پڑھنے والا واقعی کافر ہے؟ کیا محدثین کی یہی رائے ہے؟ حضرت عثمان اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہما کا سفر میں قصر نہ کرنا ثابت ہے یا نہیں؟ نیز کیا مولانا عبدالقادر حصاروی مرحوم کا یہ بیان درست ہے کہ نماز دوگانہ ہی پڑھنی چاہیے۔ تفصیلی جواب سے نوازیں۔

جواب: مذکورہ بالا حدیث میں لفظ «کفر» محض ڈانٹ اور سختی پر محمول ہے۔ کتاب وسنت میں اس کے بہت سے شواہد ہیں۔ چنانچہ صحیح بخاری میں «بَابُ خَوفِ المُومِنِ مِن أَن یَحبَطَ عَمَلُهٗ وَ هُوَ لَا یَشعُرُ» کے تحت حدیث ہے کہ « سِبَابُ المُسلِمِ فُسُوقٌ، وَ قِتَالُهٗ کُفرٌ »①

''مسلمان کو گالی گلوچ کرنا فسق وفجور اور اس سے لڑائی کرنا کفر ہے۔''

اس کی تشریح میں حافظ ابن حجر رحمہ اللہ رقمطراز ہیں:

« وَلَم یُرِد حَقِیقَةَ الکُفرِ الَّتِی هِیَ الخُرُوجِ عَنِ المِلَّةِ، بَل أُطلِقَ عَلَیهِ الکُفرُ مُبَالَغَةً فِی التَّحذِیرِ مُعتَمِدًا عَلٰی مَا تَقَرَّرَ مِنَ القَوَاعِدِ أَنَّ مِثلَ ذٰلِكَ لَا یُخرِجُ عَنِ المِلَّةِ »②

''اس سے مقصود ملت سے خارج کر دینے والا کفر نہیں، بلکہ تحذیر اور وعید میں مبالغے کے لیے اس پر کفر کا اطلاق ہوا ہے۔ معتمد قواعد (قواعد پر اعتماد کرنے) کی بناء پر اس طرح کے اعمال سے آدمی ملت سے خارج قرار نہیں پاتا۔''

اسی طرح « "صَحِیحُ البُخَارِی" بَابُ الاِنصَاتِ لِلعُلَمَاءِ' کے تحت الفاظ حدیث یوں ہیں:

« لَا تَرجِعُوا بَعدِی کُفَّارًا یَضرِبُ بَعضُکُم رِقَابَ بَعضٍ »③

''میرے بعد کفر کی طرف مت لوٹنا کہ ایک دوسرے کی گردنیں مارنے لگ جاؤ۔''

اس کی توضیح میں حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

« وَالمَعنٰی لَا تَفعَلُوا فِعلَ الکُفَّارِ فَتَشبَهُوهُم فِی حَالَةِ قَتلِ بَعضِهِم بَعضًا »④

مفہوم اس کا یہ ہے کہ ایک دوسرے کے قتل میں کفار سے مشابہت مت اختیار کرنا۔

ان روایات سے مسئولہ روایت کی وضاحت ہو جاتی ہے۔ پھر علمائے سلف سے کوئی بھی اس بات کا قائل نہیں کہ سفر میں اِتمام (نماز پوری پڑھنے) کی صورت میں کفر لازم آتا ہے۔ حدیث ہذا کے راوی

① صحیح البخاری، بَابُ خَوفِ المُؤمِنِ مِن أَن یَحبَطَ عَمَلُهٗ وَهُوَ لَا یَشعُرُ، رقم:۴۸

② فتح الباری:۱/۱۱۲

③ صحیح البخاری، بَابُ الإِنصَاتِ لِلعُلَمَاءِ، رقم:۱۲۱

④ فتح الباری:۱/۲۱۷

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو لیجیے ان سے کسی نے دریافت کیا کہ مسافر، مقیم امام کی اقتداء میں دو رکعتیں پالیتا ہے تو کیا اس کو دو رکعتیں کافی ہو سکتی ہیں یا پوری پڑھے؟ انھوں نے مسکراتے ہوئے فرمایا: کہ پوری پڑھے۔[1] بسندِ صحیح ثابت ہے کہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے منیٰ میں حضرت عثمان کی اقتداء میں نماز پوری پڑھی تو فرمایا:

« فَلَیتَ حَظِّی مِن أَربَعِ رَکعَاتٍ رَکعَتَان »[2]

''کاش چار رکعتوں سے دو رکعتیں ہی میرے حصے میں آجائیں۔''

اس پر حافظ ابن حجر رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

« وَ ھٰذَا یَدُلُّ عَلٰی أَنَّہٗ کَانَ یَرَی الإِتمَامَ جَائِزٌ وَ إِلَّا لَمَا کَانَ حَظٌّ مِنَ الَاربَعِ وَ لَا مِن غَیرِھَا ، فَإِنَّھَا کَانَت فَاسِدَۃٌ کُلُّھَا »[3]

ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا یہ قول دلالت کرتا ہے کہ ان کے نزدیک پوری نماز پڑھنا جائز تھا، بصورتِ دیگر ساری فاسد ہوتی تھی۔ (مسند احمد: ۲/ ۱۰۸) میں ابن عمر رضی اللہ عنہ سے مرفوع روایت میں ہے:

« إِنَّ اللّٰہُ یُحِبُّ أَن تُوتٰی رُخصَۃٌ کَمَا یَکرَہُ اَن تُؤتٰی مَعصِیَتُہٗ.»[4]

''اللہ کو پسند ہے کہ اس کی رخصتوں پر عمل کیا جائے، جس طرح اسے اپنی نافرمانی ناپسند ہے۔''

اس حدیث میں قصر کا نام ''رخصت'' رکھا گیا ہے، جو ''عزیمت'' کی ضد ہے۔ اس بناء پر زیرِ بحث حدیث کی سابقہ تاویل درست ہے۔ بالخصوص جب کہ دونوں روایتوں کے راوی ابن عمر رضی اللہ عنہما ہیں۔ حضرت عائشہ اور عثمان رضی اللہ عنہما سے بحالتِ سفر نماز پوری پڑھنا صحیح بخاری میں ثابت ہے: «بَابٌ یَقصُرُ إِذَا خَرَجَ مِن مَوضِعِہٖ.» مسئلہ ہذا کی مزید وضاحت کے لیے ملاحظہ ہو! تفسیر اضواء البیان (۱/ ۳۱۷۔۳۲۱)

سوال میں مشارٌ الیہ روایت حافظ نور الدین ہیثمی رحمہ اللہ " مجمع الزوائد"(۲/ ۱۵٤، ۱۵۵) میں بطریقِ مورق ذکر کرکے فرماتے ہیں: «رِجَالُہٗ رِجَالُ الصَّحِیحِ.» اس حدیث کے سب راوی صحیح کے راوی ہیں۔

یعنی صحیح کے راویوں کی صفات کے حامل ہیں۔

اَلمُحَلّٰی کی روایت کے بارے میں علامہ احمد محمد شاکر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

---

[1] السنن الکبریٰ للبیھقی، بَابُ المُقِیمِ یُصَلِّی بِالْمُسَافِرِینَ وَالْمُقِیمِینَ، رقم: ۵۵۰۳

[2] صحیح البخاری، بَابُ الصَّلاَۃِ بِمِنًی، رقم: ۱۰۸٤

[3] فتح الباری: ۲/ ۵٦٤

[4] مسند احمد، رقم: ۵۸٦٦

« أَمَّا هٰذَا الحَدِيثُ بِهٰذَا اللَّفظِ مَرفُوعًا لَم أَجِدهُ إِلَّا فِى هٰذَا المَوضِعِ. وَ هُوَ أَشبَهُ بِأَن يَّكُونَ مِن كَلَامِ ابنِ عُمَرَ ، كَمَا سَيَأتِي مَوقُوفًا . وَ يَحتَمِلُ أَنَّ الخَطَأَ فِي رَفعِهِ مِن مُحَمَّدِ بنِ الصَّبَّاحِ ، أَو مِن شَيخِهِ عَبدِ اللّٰهِ بنِ رَجَاءَ.»

''یہ حدیث ان لفظوں کے ساتھ مرفوعاً مجھے نہیں مل سکی ما سوائے اس مقام کے۔ قرینِ قیاس ہے کہ یہ ابن عمر رضی اللہ عنہما کا کلام ہو، جس طرح موقوف روایت عنقریب آ رہی ہے۔ یہ بھی احتمال ہے کہ اس کے رفع میں محمد بن الصباح یا اس کے شیخ عبداللہ بن رجاء کی غلطی ہو۔''

علامہ احمد شاکر رحمہ اللہ حاشیہ نمبر۳ میں فرماتے ہیں: کہ عبداللہ بن رجاء مکی ثقہ ہے۔ تاہم امام احمد رحمہ اللہ نے فرمایا ہے: کہ اہلِ علم نے کہا ہے: اس کی کتابیں ضائع ہوگئیں۔ پھر اپنے حافظے سے لکھا کرتا تھا۔ اس بناء پر اس کی کئی روایات منکر ہیں۔

جہاں تک مولانا حصاروی مرحوم کے نقطۂ نظر کا تعلق ہے تو اس سے موافقت مشکل امر ہے۔ تفصیل اضواء البیان کے سابقہ حوالہ میں ملاحظہ فرمائیں!

دورانِ سفر مکمل نماز:

سوال: کیا اس میں احتیاط نہیں کہ سفر میں قصر لازمی کر لیا جائے۔ احادیث سے تو وجوب ہی ثابت ہوتا ہے۔ مثلاً حدیث ابن عباس رضی اللہ عنہما کہ اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے سفر میں دو رکعت نماز فرض کی ہے۔ [1] (مسلم) نواب صدیق حسن خاں بھوپالی بھی وجوب کے قائل ہیں۔ [2]

جواب: جملہ دلائل کو جمع کیا جائے تو نتیجہ یہی اخذ ہوتا ہے، کہ قصر واجب نہیں۔ مطوّلات (مفصل کتب) میں تفصیل دیکھی جا سکتی ہے۔

مسافر امام کے پیچھے مقیم مقتدی کی نماز:

سوال: اگر کوئی شخص سفر میں امامت کرا رہا ہے اور وہ ظہر کی نماز میں دو رکعت پڑھ کر سلام پھیر دیتا ہے تو کیا مقتدی حضرات کی باقی نماز باجماعت سمجھی جائے گی؟

جواب: مسافر امام کے دو رکعت پر سلام پھیرنے کے بعد مقیم مقتدی کی باقی نماز بلاشبہ انفرادی ہے۔ لیکن وہ اپنی نیت کے اعتبار سے جماعت کے اجر و ثواب سے محروم نہیں۔

① صحیح مسلم، بَابُ صَلَاةِ الْمُسَافِرِينَ وَقَصْرِهَا ، رقم: ٦٨٧

② دلیل الطالب ص ٣٧٨، ٣٧٩

مسافر مقامی امام کے پیچھے آخری دو رکعت میں شامل ہو تو کیا کرے؟

سوال: کیا مسافر مقیم کے پیچھے آخری دو رکعت میں شامل ہو تو امام کے ساتھ ہی دو رکعت پر سلام پھیر کر نماز ختم کر دے تو جائز ہے؟

جواب: مسافر مقامی امام کی اقتداء میں پوری نماز پڑھے، قصر نہ کرے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے دریافت ہوا:

« مَا بَالُ الْمُسَافِرِ يُصَلِّي رَكْعَتَيْنِ إِذَا انْفَرَدَ وَ أَرْبَعًا إِذَا ائْتَمَّ بِمُقِيمٍ فَقَالَ تِلْكَ السُّنَّة » (رواہ احمد)[1]

یعنی مسافر کا کیا حال ہے جب اکیلا ہو تو دو رکعتیں پڑھتا ہے اور جب مقیم کی اقتداء میں ہو تو چار، جواباً فرمایا کہ سنت طریقہ ہے۔''

بروایتِ ''طحاوی'' امام ابوحنیفہ اور صاحبین کا مسلک یہی ہے۔ نیز امام شافعی، ثوری اور احمد رحمۃ اللہ علیہم بھی اسی بات کے قائل ہیں۔[2]

سوال: کیا مسافر مقیم امام کے پیچھے دوگانہ پڑھ سکتا ہے؟ جب کہ چار رکعت نماز میں دوسری رکعت کے بعد شامل ہوا ہے۔ (قاری عبدالغفار سلفی شیخوپوری)

جواب: مسافر کو مقیم امام کی اقتدا میں نماز پوری پڑھنی چاہیے خواہ امام نماز کے آخری مراحل میں کیوں نہ ہو، کیونکہ اس کی نماز کی بنا امام کی تکبیر تحریمہ پر ہے۔ اسی طرح اگر مسافر امام نماز پوری پڑھے تو مقتدی مسافر کو بھی اس کے ساتھ پوری نماز پڑھنی چاہیے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ مسافر کے لئے چار رکعت کے قائل نہیں تھے لیکن حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی اقتدا میں انہوں نے حالتِ سفر میں پوری نماز پڑھی تھی۔ اس سے معلوم ہوا کہ مقیم امام کی اقتدا میں بطریق اولیٰ پوری نماز پڑھنی چاہیے۔

کیا مسافر مقیم امام کے ساتھ دو رکعت ادا کر کے سلام پھیر سکتا ہے؟

سوال: مسافر اگر مقیم امام کے پیچھے آخری دو رکعت پڑھتا ہے تو آیا وہ امام کے ساتھ سلام پھیر سکتا ہے؟ کیونکہ اس پر دو رکعت نماز ہی فرض تھی جو اُس نے پڑھ لی ہے۔

جواب: مقامی امام کی اقتداء میں مسافر کو پوری نماز پڑھنی چاہیے، کیونکہ اس کی بناء امام کی تکبیرِ تحریمہ پر ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ راجح مسلک کے مطابق قصر واجب نہیں۔ بلکہ صرف افضل ہے۔ اس کا بھی

---

[1] صحيح ابن خزيمه، بَابُ إِبَاحَةِ قَصْرِ الْمُسَافِرِ الصَّلَاةَ ......الخ، رقم: ٩٥١، ٩٥٢

[2] المغنی: ٢٨٤/١

تقاضا ہے کہ مقیم امام کی اقتداء میں پوری نماز پڑھی جائے۔

سوال : آپ نے اپنے ایک فتویٰ میں ارشاد فرمایا تھا کہ مقیم امام کے پیچھے مسافر مقتدی کو پوری نماز پڑھنی چاہیے۔خواہ امام نماز کے اخیر میں کیوں نہ ہو۔ (الاعتصام ۵۳/۲۷)

اب سوال یہ ہے کہ کوئی ایسا طریقہ بھی ہے جس سے معلوم ہو جائے کہ امام مقیم ہے یا مسافر؟ جماعت ہو رہی ہے، نمازی مسجد میں آ کر شامل جماعت ہوتا ہے، وہ کیسے معلوم کرے گا کہ امام صاحب نے دو پڑھی ہیں یا چار؟ جیسا کہ بڑے جلسوں اور اجتماعات میں ہوتا ہے کہ اکثر لوگ مسافر ہوتے ہیں مگر امام صاحب کا پتہ نہیں ہوتا کہ کون ہیں۔ مقیم یا مسافر؟ کہیں احناف والی بات تو نہیں کہ جماعت میں بعد میں شامل ہونے والے آدمی کی رکعت وہی شمار ہوگی جو امام صاحب کی ہے یعنی دوسری، تیسری یا۔۔۔؟

جواب : مقتدی کو اگر امام کی نیت کے بارے میں علم نہ ہو کہ وہ نماز پوری پڑھنا چاہتا ہے یا قصر، تو ایسی حالت میں مقتدی پوری نماز پڑھے گا، کیونکہ اصل حکم تو یہی ہے، قصر کرنا صرف افضل ہے، واجب نہیں۔ واضح رہے کہ جمہور اہلِ علم کا مسلک یہ ہے کہ بعد میں جماعت میں شامل ہونے والے کی ابتدائی رکعت ہی پہلی ہے۔ دلائل کی رُو سے یہی مسلک راجح ہے، بخلاف حنفیہ کے۔

مقامی امام کے پیچھے مسافر مقتدی کی نماز:

سوال : ایک شخص سفر کے لیے نکلتا ہے۔ سفر کے دوران اس کا گزر ایک مسجد سے ہوتا ہے۔ مسجد میں نمازی تیسری رکعت کے لیے کھڑے ہو گئے ہوں تو کیا مسافر امام کے ساتھ دو رکعت پڑھ کر سلام پھیر سکتا ہے؟

جواب : مسافر کو مقیم امام کی اقتداء میں نماز مکمل پڑھنی چاہیے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت میں اس امر کی تصریح موجود ہے۔ اگرچہ اہلِ علم کا ایک گروہ بایں صورت قصر کا قائل ہے۔ لیکن دلیل کے اعتبار سے پہلا مسلک راجح ہے۔ دوسری بات یہ بھی ہے کہ راجح مذہب کے مطابق قصر کرنا واجب نہیں بلکہ افضل ہے۔ اس سے بھی سابقہ موقف کی تائید ہوتی ہے۔

بیت الحرام میں قصر نماز کا حکم:

سوال : طائف سے بیت الحرام تقریباً ۹۰ کلومیٹر ہے کیا وہاں جا کر ہمیں نماز قصر ادا کرنی چاہیے یا پوری؟ بعض لوگ کہتے ہیں کہ وہاں ایک نماز کا لاکھ درجہ ثواب ملتا ہے۔ اس لیے پوری نماز ادا کرنا زیادہ قابلِ ثواب ہے۔

جواب: راجح مذہب کے مطابق سفر میں ''نمازِ قصر'' افضل ہے واجب نہیں۔ لہٰذا آپ کو بھی افضل فعل کا اہتمام کرنا چاہیے۔ نبی اکرم ﷺ مختلف اسفار میں مدینہ منورہ سے جب کبھی مکہ مکرمہ تشریف لائے تو قصر پڑھتے رہے۔ حالانکہ آپ ﷺ کے پیشِ نظر بھی تو یہ بات تھی کہ مسجد الحرام میں ثواب زیادہ ہے۔ اس کے باوجود آپ نے صلوٰۃِ قصر ہی پڑھی ہے۔

﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ﴾(الاحزاب:۲۱)

اجر میں کمی وبیشی کا تعلق روزِ جزاء سے ہے، جس کے نتائج نیتوں کے مطابق برآمد ہوں گے۔ دنیا میں اس کا فیصلہ کرنا ممکن نہیں۔ ہاں البتہ اگر مقیم امام کی اقتداء میں نماز ادا کی جائے تو اس کا اتمام (مکمل کرنا) ضروری ہے۔ چاہے خانہ کعبہ ہو، یا اس کے علاوہ کوئی اور مقام۔

اقامت کا ارادہ نہ رکھنے والے مسافر کا بلاتحدید قصر کرنا:

سوال: مکرمی ومحترمی حافظ ثناء اللہ صاحب مدنی..... ہفت روزہ ''الاعتصام'' مؤرخہ ۱۷۔ مارچ۔ ۱۹۹۵ء کے صفحہ ۱۱، کالم:۲ میں نمازِ قصر کے متعلق مرقوم ہے کہ میکے اور سسرال کے ہاں جہاں عورت کا حقِ ملکیت موجود ہو احتیاط کا تقاضا ہے کہ وہاں قصر نہ کرے بصورتِ دیگر جواز ہے۔

غالباً ملکیت سے مراد غیر منقولہ جائیداد ہوگی۔ اس ضمن میں ہمیں اصولی طور پر تو یہی معلوم ہو سکا ہے کہ نمازِ قصر کا تعلق بلحاظِ فاصلہ معروف سفر اور حضر سے ہی ہے۔ حقِ ملکیت والی بات سنت نبوی سے معلوم نہیں۔ اگر ایسی کوئی حدیث موجود ہے تو آگاہ فرما کر ممنون فرمائیں! اس سلسلے میں درج ذیل مختلف پہلوؤں سے مسئلہ پر غور فرما کر محاکمہ صادر فرمائیں!

۱۔ مسافر کے لیے قصر وہاں ہوگی جہاں مستقل رہائش نہیں ہوگی اِلا یہ کہ قیام کا حدیث میں مذکور وقت حد سے زیادہ کا ارادہ ہو یا وقتِ حد سے تجاوز کر جائے۔

۲۔ ایک شخص کی مستقل رہائش لاہور میں ہے مگر اس کی غیر منقولہ ملکیت پشاور، راولپنڈی، حیدرآباد، کراچی وغیرہ (بشمول سسرال اور میکے) میں ہے تو وہاں کے سفر میں قصر ہونی چاہیے، پوری نماز کا بھی جواز ہے۔ مگر احتیاط والی بات محلِ نظر ہے۔

۳۔ ایک شخص کی غیر منقولہ ملکیت کوئی نہیں مگر اس کی ملکیت ایک کار ہے، وہ اس پر سفر کرتا ہے تو کیا ہر سفر میں اسے پوری نماز ادا کر کے احتیاط والا پہلو اختیار کرنا ہوگا؟

۴۔ ایک شخص لاہور کا مستقل رہائشی ہے۔ میری معلومات کے مطابق وہ کراچی کے سفر کے لیے روانہ ہوتے

ہی (ریل، بس یا ہوائی جہاز سے) چند میل سے قصر کر سکتا ہے؟

۵۔ بڑے شہر، بیسیوں میل وسیع ہیں۔ کوئی شخص اپنی رہائش گاہ سے دوسری جگہ بیس میل کے فاصلے پر (اسی شہر میں) پہنچتا ہے تو کیا وہاں قصر کر سکے گا؟ اگر ایسا نہیں تو اس شہر میں سفر کہاں سے شروع تصور ہوگا؟ آج کل بڑے شہروں کے مضافات دُور دُور تک پھیلے ہوئے ہیں اور بلدیہ کی حدود بھی کئی دفعہ بدل دی جاتی ہے اور ایسا بھی ہے کہ لاہور شہر اور اس کے مضافات دو اضلاع۔ (لاہور اور شیخوپورہ) میں منقسم ہیں۔

جواب: ہوتا یوں ہے کہ سائلین بعض مسائل متعدد دفعہ دریافت کرتے ہیں تو ہر دفعہ تشریح و تفصیل بیان کرنی مشکل ہوتی ہے، اس لیے بسا اوقات جواب بالاختصار دیا جاتا ہے۔ زیرِ بحث مسئلہ میں بھی صورت حال کچھ اسی طرح ہے۔ چنانچہ ''الاعتصام ۱۲/ اکتوبر/ ۱۹۹۰ء میں مسئلہ ہذا کی وضاحت شائع ہو چکی تھی۔ اس لیے بعد میں شائع ہوا تو مختصر جواب پر اکتفا کیا گیا۔

اسی تشریح کو اب دوبارہ ملاحظہ فرمائیں! حبرالامۃ اور ترجمان القرآن حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے: '' فَإِذَا قَدِمتَ عَلٰی أَهلٍ أَو مَاشِیَةٍ فَاَتِمّ ''

یعنی جب تیرا اپنے اہل یا مال میں آنا ہو تو نماز پوری پڑھ۔ ①

اور امام زہری رحمہ اللہ فرماتے ہیں: '' إِذَا مَرَّ بِمَزرَعَةٍ لَهٗ أَتَمَّ ''

یعنی ''جب کسی کا گزر اپنی زمین سے ہو تو وہ نماز پوری پڑھے۔'' اور فقہائے اسلام میں سے امام احمد اور امام مالک بھی قریباً اسی بات کے قائل ہیں کہ جہاں کسی کا گھر ہو یا مال وغیرہ ہو وہاں نماز پوری پڑھی جائے۔ مزید وضاحت کے لیے ملاحظہ ہو! (مغنی ابن قدامہ: ۲/ ۱۳۵) اور صاحب المنتقی نے بایں الفاظ تبویب قائم کی ہے: « بَابُ مَنِ اجتَازَ فِي بَلَدٍ فَتَزَوَّجَ فِیهِ ، أَولَهٗ فِیهِ زَوجَةٌ فَلیُتِمَّ » یعنی ''جس کا گزر اس شہر سے ہو جہاں اس نے شادی کی ہے یا وہاں اس کی بیوی ہے تو وہ نماز پوری پڑھے۔''

اس تبویب کے ضمن میں ایک مرفوع روایت بیان ہوئی ہے۔ جس کے الفاظ یوں ہیں:

« مَن تَأَهَّلَ فِي بَلَدٍ فَلیُصَلِّ صَلَاةَ المُقِیمِ » ②

یعنی ''جس نے کسی شہر میں نکاح کیا اُسے چاہیے کہ مقیم کی نماز پڑھے۔''

① مصنف ابن ابی شیبہ، فِي مَسِیرَةِ کَم یَقصُرُ الصَّلَاةَ ، رقم: ۸۱۴۰ ،مصنف عبدالرزاق، ،بَابُ :فِي کَم یَقصُرُ الصَّلَاةَ، رقم: ۴۲۹۷ ، سنن کبریٰ للبیهقي: باب المسافر ینتهي الی المواضع الذی یرید المقام، رقم: ۵۴۹۴

② مسند امام احمد، رقم: ۴۴۳

لیکن امام بیہقی رحمہ اللہ نے اس حدیث پر انقطاع کے حکم کے علاوہ عکرمہ بن ابراہیم راوی کو ضعیف قرار دیا ہے۔ اسی بناء پر حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

« هٰذَا الحَدِيثُ لَا يَصِحُّ، لِأَنَّهُ مُنقَطِعٌ : وَ فِي رُوَاتِهِ مَن لَا يُحتَجُّ بِهِ » [1]

انہی دلائل اور دیگر بعض کے پیشِ نظر میں نے اپنے بعض فتووں میں لفظ احتیاط کا استعمال کیا ہے۔ ورنہ یہ بات تو بدیہی ہے کہ قصر کا تعلق سفر سے ہے لیکن یہاں جو شیئ محلِ تردّد ہے وہ یہ ہے کہ بایں صورت اس شخص پر لفظ مسافر کا اطلاق ہوتا ہے یا نہیں؟ کیونکہ وہ ایک ایسے مقام پر پہنچ چکا ہے جہاں بعض کے نزدیک مسافر کے بجائے مقیم کہلانے کا زیادہ حق دار ہے اس بناء پر ان کے نزدیک اسے پوری نماز پڑھنی چاہیے اور جہاں تک دورانِ سفر قصر کا جواز ہے تو بلا ریب قصر درست ہے۔ منقولہ جائیداد گاڑی وغیرہ کا اعتبار سلف سے ثابت نہیں ہے اور آغازِ سفر کے بارے میں اصل یہ ہے کہ جب انسان محسوس کرے کہ اب وہ مسافر بن گیا ہے تو قصر شروع کردے۔ امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ وغیرہ کے مسلک کے مطابق قصر کے لیے سفر کی کوئی حد بندی نہیں۔ صرف عرف ہی کافی ہے، اور امام ابن حزم رحمہ اللہ صرف ایک میل پر قصر کے قائل ہیں جب کہ نبی ﷺ سے ثابت ہے کہ آپ ﷺ نے مدینہ سے مکہ کا قصد کیا تو ذوالحلیفہ میں قصر کی تھی۔ اس کی مسافت میں لوگوں کے مختلف اقوال ہیں بعض نے تین میل ذکر کیا ہے۔ دوسری طرف حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے تین میل یا تین فرسخ (۹ میل) بیان فرمایا۔ یہاں بطورِ احتیاط بعض اہل حدیث کا مسلک ہے کہ اگر کسی نے نو میل سفر کرنا ہو تو وہ قصر کرسکتا ہے کم میں نہیں۔ تین کا عدد بھی نو کے اندر داخل ہے جب کہ تین کو لینے کی صورت میں نو کا عدد چھوٹ جاتا ہے جو درست نہیں۔

الحاصل: مسافر جب تک سفر میں کسی جگہ اقامت کا ارادہ نہ کرے تو بلا تحدید وہ قصر کرسکتا ہے۔ امام ترمذی فرماتے ہیں:

« ثُمَّ اَجمَعَ أَهلُ العِلمِ عَلٰى أَنَّ لِلمُسَافِرِ أَن يَقصُرَ مَا لَم يَجمَع إِقَامَةً ، وَ إِن أَتٰى عَلَيهِ سِنُونَ » [2]

یعنی سب اہلِ علم کا اس پر اجماع ہے کہ مسافر جب تک اقامت کی نیت نہ کرے اگرچہ کئی سال گزر جائیں اسے قصر کی اجازت ہے۔

---

[1] فتح الباری:۲/ ۵۷۰

[2] سنن ترمذی، بَابُ مَا جَاءَ فِي كَم تُقصَرُ الصَّلَاةُ ، رقم:۵۴۸ مع تحفۃ الاحوذی:۳/ ۱۱۴

عازمِ سفر انسان جب تک محلِ اقامت میں واپس نہیں آجاتا وہ مسافر ہی شمار ہوگا۔

اس ساری بحث میں نقطۂ تأمل یہ ہے کہ آدمی کب مسافر بنتا ہے؟ اور کب سفری حالت سے فارغ سمجھا جاتا ہے؟ خلاصہ یہ ہے کہ باعتبارِ عرف اس پر سفر کا اطلاق ہوگا۔ دورانِ سفر بعض حالتیں ایسی ہیں کہ اس سے لفظ سفر کا اطلاق زائل ہو جاتا ہے۔ بالخصوص راجح مسلک کے مطابق جب کسی جگہ چار دن سے زائد اقامت (ٹھہرنے) کی نیت کرلے تو وہ مقیم قرار پائے گا کیونکہ ''حجۃ الوداع'' کے موقع پر نبی ﷺ بہ نیت اقامت چار ذوالحجہ کو مکہ میں داخل ہوئے اور آٹھ تاریخ کو منیٰ کی طرف روانہ ہوئے تاکہ مناسکِ حج کی تکمیل کریں۔

یا وہاں اس کی غیر منقولہ جائیداد یا سسرال ہو تو بایں صورت بھی احتیاط کا تقاضا یہ ہے کہ قصر نہ کرے، کیونکہ ایسا شخص مسافر نہیں مقیم کہلائے گا۔ واضح ہو کہ یہ امر ان لوگوں کے نزدیک ہے جو اس بات کے قائل ہیں اور جن اہلِ علم نے اس علت کی طرف التفات نہیں فرمایا، ان کے نزدیک یہ بدستور مسافر ہی کہلائے گا۔ بہر صورت نبی ﷺ سے کوئی نص صریح صحیح ثابت نہ ہونے کی بناء پر مسئلہ ہذا اجتہادی ہے۔ جس پر کسی کو اطمینان ہو اس پر عمل کی گنجائش ہے۔ اجتہادی مسائل میں محدثین کا مسلک تلطّف (نرمی) کا ہے تَصَلُّب (سختی) کا نہیں۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی ''صحیح'' میں جا بجا اس مسلک کو اختیار کیا ہے۔

والد اور بھائی کا اپنی بیٹی اور بہن کے ہاں جا کر نمازِ قصر ادا کرنے کا کیا حکم ہے؟

سوال: لڑکی میکے آئے یا اس کا والد/ بھائی اس کے ہاں جائیں۔ جہاں انھیں گھر کی سہولت حاصل ہو تو لڑکی یا اس کا والد/ بھائی نماز قصر کریں یا پوری پڑھیں؟

جواب: لڑکی میکے نماز پوری پڑھے کیونکہ وہ حکماً مقیم ہے۔ جب کہ اس کا والد اور بھائی قصر کر سکتے ہیں۔

کیا والدین اپنے بچوں کے ہاں نمازِ قصر ادا کر سکتے ہیں؟

سوال: کسی شخص کا بیٹا دوسرے شہر میں کرائے کے مکان میں بیوی بچوں کے ساتھ رہائش پذیر ہے، اس کی ملاقات کو جانے والے والدین وہاں اپنے بیٹے کے ہاں نمازِ قصر ادا کریں گے یا پوری نماز پڑھیں گے۔؟

جواب: اس صورت میں قصر کرنے کا جواز ہے۔

سوال: میرا مستقل رہائشی مکان میرے ڈیوٹی سٹیشن سے ۹۰ کلومیٹر ہے اور میرا زیادہ تر قیام ڈیوٹی سٹیشن پر ہی ہوتا ہے۔ یہاں رہائش سرکاری ہے اور تقریباً تمام سہولیات موجود ہیں اور نماز پوری ادا کرتا ہوں۔ تقریباً

پندرہ روز بعد مستقل گھر (جو والد صاحب کی ملکیت ہے) ایک رات کے لیے جاتا ہوں۔ کیا وہاں نماز قصر کی جا سکتی ہے؟

جواب: جب والد صاحب کی زیارت کے لیے جائیں تو وہاں نماز پوری پڑھیں۔ احتیاط کا تقاضا یہی ہے۔

میکے اور سسرال میں عورت کا نماز قصر پڑھنا:

سوال: ایک عورت کے میکے اور سسرال الگ الگ شہروں میں ہیں، جب کہ اس کی اپنی رہائش خاوند کے ہمراہ کسی اور شہر میں ہے۔ ان تینوں شہروں میں کس کس شہر میں یہ عورت قصر اور دیگر سفری رخصتوں کی مستحق ہے؟

جواب: عورت اپنے خاوند کے ساتھ جس جگہ رہائش پذیر ہے وہاں یقیناً قصر نہیں کرے گی، اس لیے کہ وہ مقیم ہے۔ البتہ میکے اور سسرال کے ہاں جہاں عورت کا حق ملکیت موجود ہو، احتیاط کا تقاضا یہ ہے کہ وہاں بھی قصر نہ کرے۔ بصورتِ دیگر جواز ہے۔

سسرال میں نمازِ قصر کا حکم کیا ہے؟

سوال: حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے ایک روایت پڑھنے میں آئی ہے کہ سسرال میں نماز قصر کی بجائے پوری پڑھنی چاہیے۔ (مسند احمد) وضاحت فرما دیں!

جواب: مشارٌ الیہ روایت ضعیف ہے۔ امام بیہقی رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ اس میں انقطاع ہے اور اس کی سند میں راوی عکرمہ بن ابراہیم ضعیف ہے۔[1]

اس سلسلے میں مرفوع متصل کوئی روایت ثابت نہیں۔ البتہ ابن ابی شیبہ وغیرہ کے بعض آثار و اقوال سے معلوم ہوتا ہے کہ جائے ملکیت پر نماز پوری پڑھنی چاہیے۔ حضرت ابن عباس، حضرت عثمان رضی اللہ عنہم، امام مالک، امام ابوحنیفہ اور امام احمد رحمہم اللہ کا مذہب یہ ہے کہ جہاں کوئی نکاح کر لے یا اس کی بیوی کسی شہر میں ہو اور وہاں سے شوہر کا گزر ہو تو پوری نماز پڑھے۔ کیونکہ ان کے نزدیک بیوی کی قیام گاہ وطن کے حکم میں ہے۔ ان آثار کی بناء پر نماز قصر کا صرف جواز ہے لیکن ضروری نہیں۔ (واللہ اعلم)

سفر میں رہی ہوئی نماز قصر یا مکمل:

سوال: میں سفر میں جاتا ہوں مجھے یہ معلوم ہوتا ہے کہ میری فلاں نماز سفر میں رہ جائے گی تو میں وہ نماز پوری پڑھوں یا آدھی؟ اور سفر میں رہی ہوئی نماز گھر میں آ کر پوری پڑھوں یا آدھی؟

[1] اضواء البیان: ۱/ ۳۳۱

جواب : اگر سفر کا آغاز نہیں کیا تو نماز پوری پڑھیں، کیونکہ فی الوقت آپ مقیم ہیں، اور حالتِ سفر میں فوت شدہ نماز کے متعلق احتیاط کا تقاضا ہے کہ بحالتِ اقامت پوری پڑھیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سفر میں دوگانہ پڑھنا راجح مذہب کے مطابق افضل ہے۔ واجب نہیں۔ حدیث میں ہے:« إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ اَن تُؤتٰى رُخصَةٌ »[1] یعنی ''اللہ عزوجل پسند فرماتا ہے کہ اس کی رخصت قبول کی جائے۔''

سفر میں رہ جانے والی نماز گھر میں قصر یا مکمل:

سوال سفر کے دروان رہ جانے والی نماز اگر گھر میں آکر پڑھی جائے تو پوری پڑھی جائے یا قصر ہی پڑھنا ہو گی؟ (عبدالستار، ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول، گوجرانوالہ)

جواب سفر میں فوت شدہ نماز بحالتِ اقامت پوری پڑھنی چاہیے، کیونکہ راجح مسلک کے مطابق سفر میں قصر کرنا صرف افضل ہے، واجب نہیں۔

سوال : اگر سفر میں نماز فوت ہو جائے تو واپس گھر آنے پر مکمل نماز ادا کرنی ہوگی یا قصر کی نماز ادا کریں؟

جواب : حالت سفر میں فوت شدہ نماز کی قضائی حضر میں مکمل نماز کی صورت میں ہو گی۔ اس لیے کہ راجح مسلک کے مطابق قصر کرنا افضل ہے واجب نہیں۔

سفر میں فوت شدہ نماز:

سوال : حضر میں چھوڑی ہوئی نماز اگر سفر میں ادا کی جائے تو کیا مکمل ہوگی یا قصر؟

جواب : حضر میں قضاء شدہ نماز کی قضائی سفر میں قصر کے بجائے مکمل پڑھنی چاہیے۔ کیونکہ بحالتِ اقامت نماز مکمل فرض ہوئی تھی۔

سوال : سفر میں رہ جانے والی نماز اگر حضر میں ادا کی جائے تو کیا قصر ہوگی یا مکمل؟

جواب : سفر میں رہ جانے والی نماز حضر میں مکمل پڑھنی چاہیے۔ کیونکہ راجح مسلک کے مطابق قصر واجب نہیں، صرف افضل ہے۔

سوال سفر کے دوران رہ جانے والی نماز اگر گھر آ کر پڑھی جائے تو پوری پڑھی جائے گی یا قصر بھی پڑھ سکتے ہیں؟

جواب : سفر میں فوت شدہ نماز بحالتِ اقامت پوری پڑھنی چاہیے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ راجح مسلک کے مطابق سفر میں قصر کرنا صرف افضل ہے۔ واجب نہیں۔

---

[1] صحیح ابن خزیمة،بَابُ استِحبَابِ قَصرِ الصَّلَاةِ فِي السَّفَرِ لِقَبُولِ الرُّخصَةِ الَّتِي رَخَّصَ اللّٰهُ ......الخ، رقم:٩٥٠

کیا سفر میں فوت شدہ نماز حضر میں پوری پڑھیں؟

سوال: ''الاعتصام'' مؤرخہ ۵ جون پر ایک سوال کے جواب میں لکھا ہے'' سفر کی رہی نماز حضر میں مکمل پڑھنی چاہیے کیونکہ راجح مسلک کے مطابق قصر واجب نہیں صرف افضل ہے۔'' اس کی مزید وضاحت طلب ہے۔
شروع سفر سے پہلے جمع تقدیم کی صورت یا بعد اختتام سفر یعنی حضر میں جمع تاخیر کی صورت میں اگر پہلی نماز کا وقت ختم نہ ہوا ہو تو مکمل نمازیں ادا کرنی بجا معلوم ہوتی ہیں۔ لیکن اگر جمع تاخیر میں پہلی نماز کا وقت سفر میں گزر گیا یا کسی صورت نمازِ سفر میں رہ گئی اور اس نماز کا وقت ختم ہو گیا۔ دوسری نماز کا وقت حضر میں آ گیا تو باوجود اس کے کہ قصر واجب نہیں صرف افضل ہے۔ افضلیت کی رعایت سے فائدہ اٹھانا مناسب کیوں نہیں؟ حالانکہ جو نماز رہ گئی اس کے تمام وقت میں مکمل نماز واجب نہ تھی بلکہ قصر افضل تھی۔ اس لیے قصر کی قضاء کا جواز قصر تک محدود ہونا بھی قرین قیاس ہے۔ رہنمائی فرما کر عنداللہ ماجور ہوں۔

جواب: عرض ہے افضلیت ایک ایسا انعام ہے جس کا تعلق مخصوص حالت سے ہے۔ اس حالت کے ختم ہونے سے صفت بھی ساتھ ہی زائل ہو جاتی ہے۔ جب کہ وجوب ہر صورت قائم و دائم رہتا ہے۔ پھر قصر کے افضل ہونے کا مفہوم یہی ہے کہ اصلاً اتمام کا وجوب ہے، چاہے حالتِ سفر میں ہو یا حضر میں۔

نماز قصر کہاں کریں؟ ذاتی مکان میں عارضی رہائش گاہ میں:

سوال: ایک صاحب کی اصل رہائش یعنی ذاتی مکان کوٹ اڈو میں ہے۔ ملازمت پرانی چیچہ وطنی میں ہے۔ عارضی رہائش یہاں پرانی چیچہ وطنی میں ہے۔ یہ صاحب نماز قصر کہاں ادا کریں؟

جواب: محترم رہائش اور جائے ملازمت میں نماز پوری ادا کریں۔ البتہ اثناء سفر (دورانِ سفر) میں قصر کر سکتے ہیں۔ مسئلہ ہذا پر تفصیلی گفتگو ''الاعتصام'' میں کئی دفعہ شائع ہو چکی ہے۔

جائے ملکیت میں نمازِ قصر کرنے کا کیا حکم ہے؟

سوال: زید کا اپنے آبائی گاؤں (واقع ضلع میانوالی) میں اپنا ذاتی مکان ہے۔ وہیں ساتھ ہی اس کے والدین کا بھی گھر ہے۔ زید کے والدین وفات پا چکے ہیں۔ زید بسلسلۂ ملازمت گھر سے دُور رہا اور اب وہ لاہور میں اپنے بیٹے کے ساتھ مقیم ہے۔ میانوالی والا مکان مقفل پڑا ہے۔ زید اور اس کے بچوں کا اس آبائی گاؤں میں جا کر رہنے بسنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ البتہ خوشی یا غمی کے موقع پر جب کبھی میانوالی جانا ہو تو وہ اس مکان میں قیام کرتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ ایسی صورت میں زید اور اس کے اہل خانہ میانوالی میں (اس

مکان یا گاؤں میں) نماز قصر پڑھیں یا پوری۔ مزید برآں زید کا ایک مکان ضلع بھکر میں بھی ہے۔ جہاں بالآخر (جلد یا بدیر) جا کر رہنے کا خیال ہے وہاں نماز کے بارے میں کیا حکم ہوگا؟ مزید یہ کہ نماز قصر کتنے دن تک پڑھی جاسکتی ہے؟

(جواب): احتیاط کا تقاضا یہ ہے کہ جائے مِلک (اپنی ملکیت والی جگہ یا مقام) میں نماز کا اتمام کیا جائے۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو! (الاعتصام، شمارہ:۴۱، جلد نمبر:۴۲ ۱۹۹۰ء) مستقل کسی جگہ ٹھہرنے کے عزم کے ساتھ قریباً چار یوم تک قصر پڑھی جاسکتی ہے۔ اس لیے کہ نبی ﷺ حجۃ الوداع کے موقع پر ۴ ذی الحجہ کو مکہ مکرمہ میں داخل ہوئے اور ۸ تاریخ کو منیٰ کی طرف روانہ ہو گئے۔ ان اَیام میں آپ دوگانہ پڑھتے رہے اور یہ قیام بہ نیت عزم وجزم تھا۔ اس سے زیادہ دنوں کی فیصلہ کُن دلیل نہیں مل سکی۔ البتہ حالت تردّد میں بلاعزم اور پختہ ارادہ کے بغیر جب تک انسان سفر میں ہے بلاتحدید اَیام قصر ہو سکتی ہے۔

ملکیت والے مقام پر نماز:

(سوال): ہمارے والد محترم اپنا آبائی گاؤں چھوڑ کر سیالکوٹ میں مستقل رہائش اختیار کر چکے ہیں گاؤں میں ان کی اب ذاتی رہائش کوئی نہیں ہے ایک دینی ادارہ قائم کر رکھا ہے۔ ہفتہ عشرہ بعد دو یوم کے لیے ادارہ کا نظم ونسق دیکھنے جاتے ہیں۔ ان کے لیے کیا حکم ہے کہ گاؤں میں نمازِ قصر پڑھیں یا مکمل؟ حدیثِ رسول ﷺ سے واضح فرمائیں۔

(جواب): صورتِ مرقومہ میں آپ کے والد محترم نمازِ قصر پڑھ سکتے ہیں۔ پہلی بات یہ ہے کہ وہ مسافر ہیں اور مسافر کے لیے صلوۃِ قصر مشروع ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ یہاں ملکیتِ ارضی کا مسئلہ بھی مفقود ہے جس کی بناء پر بعض سلف اتمامِ صلوٰۃ (نمازِ مکمل کرنے) کے قائل ہیں۔ ''مصنف ابن ابی شیبہ'' میں اس امر کی تصریح موجود ہے۔

کیا اپنی زرعی زمین پر نمازِ قصر ہو سکتی ہے؟

(سوال): ایک شخص کا گھر میانوالی میں ہے اس کی زرعی زمین ڈیرہ وغیرہ بھکر میں ہے۔ وہ خود لاہور اپنے لڑکے کے پاس رہتا ہے۔ کیا اس کی نماز میانوالی اور بھکر میں سفری ہوگی یا پوری پڑھنی ہوگی؟ اس شخص نے کبھی کبھار میانوالی یا بھکر جانا ہوتا ہے۔

(جواب): صورتِ مسئولہ میں جس شخص کا ذکر ہے یہ میانوالی اور بھکر میں نماز پوری پڑھے۔ احتیاط کا تقاضا

یہی ہے۔اس بارے میں "حِبرُ الاُمَّۃ" اور "تَرجُمانُ القرآن" حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے:

« فَإِذَا قَدِمتَ عَلٰی أَھلٍ أَو مَاشِیَۃٍ فَأَتِمَّ » (1)

یعنی "جب تیرا اپنے اہل یا مال میں آنا ہو تو نماز پوری پڑھ۔"

اور امام زہری رحمہ اللہ فرماتے ہیں: « إِذَا مَرَّ بِمَزرَعَۃٍ لَہٗ أَتَمَّ »

یعنی "جب کسی کا گزر اپنی زرعی زمین سے ہو تو وہ نماز پوری پڑھے۔"

اور فقہائے اسلام میں سے امام احمد اور امام مالک رحمہما اللہ بھی قریباً اسی بات کے قائل ہیں کہ جہاں کسی کا گھر ہو یا مال وغیرہ ہو وہاں نماز پوری پڑھی جائے۔مزید وضاحت کے لیے ملاحظہ ہو! (مغنی ابن قدامہ:۲/۱۳۵)

اور صاحب المنتقٰی نے بایں الفاظ تبویب قائم کی ہے:

« بَابُ مَنِ اجتَازَ فِی بَلَدٍ فَتَزَوَّجَ فِیہِ أَولَہٗ فِیہِ، زَوجَۃٌ، فَلیُتِمَّ »

"جس کا گزر اس شہر سے ہو جہاں اس نے شادی کی ہے یا وہاں اس کی بیوی ہے تو وہ نماز پوری پڑھے۔"

اس تبویب کے ضمن میں ایک مرفوع روایت بیان ہوئی ہے،جس کے الفاظ یوں ہیں:

« مَن تَأَھَّلَ فِی بَلَدٍ فَلیُصَلِّ صَلَاۃَ المُقِیمِ » (2)

یعنی "جس نے کسی شہر میں نکاح کیا اُسے چاہیے کہ مقیم کی نماز پڑھے۔"

لیکن امام بیہقی نے اس حدیث پر انقطاع کا حکم لگانے کے علاوہ عکرمہ بن ابراہیم راوی کو ضعیف قرار دیا ہے۔اسی بناء پر حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

« ھٰذَا الحَدِیثُ لَا یَصِحُّ، لِأَنَّہٗ مُنقَطِعٌ. وَ فِی رُوَاتِہٖ مَن لَا یُحتَجُّ بِہٖ » (3)

ملازمت والی جگہ پر نمازِ قصر پڑھنا:

سوال: ایک شخص سرکاری ملازمت اختیار کرتا ہے اور اسے گھر سے اتنے فاصلے پر تعینات کیا جاتا ہے کہ وہ قصر نماز پڑھے لیکن اگر وہ جائے ملازمت پر رہائش پذیر ہو جاتا ہے اور اسے یہ بھی معلوم ہے کہ اس کا تبادلہ

(1) مصنف ابن ابی شیبۃ،فِی مَسِیرَۃٍ کَم یَقصُرُ الصَّلَاۃَ:۲/۴۴۵،رقم:۸۱۴۰،مصنف عبد الرزاق: ۲/۵۲۴،سنن الکبرٰی للبیھقی،بَابُ المُسَافِرِ یَنتَھِی إِلَی المَوضِعِ الَّذِی یُرِیدُ المَقَامَ بِہٖ:۳/۱۵۵، رقم:۵۴۹۴

(2) مسند احمد، رقم:۴۴۳

(3) فتح الباری:۲/۵۷۰

یہاں سے کسی وقت بھی ہوسکتا ہے تو اس صورت میں اسے قصر نماز ادا کرنی چاہیے یا مکمل نماز؟ دوسری صورت یہ ہے کہ ایک شخص گھر سے اتنے فاصلے پر ملازمت کر رہا ہے کہ وہ قصر نماز پڑھ سکتا ہے لیکن روزانہ کا سفر طے کرکے آتا جاتا ہے اور کبھی کبھار جائے ملازمت پر رہائش پذیر ہو جاتا ہے تو کیا اس دوران میں وہ قصر نماز پڑھے یا مکمل نماز؟ تیسری صورت یہ ہے کہ ایک افسر کو مختلف مقامات کے دورے کرنے پڑتے ہیں اور دفتر سے جائے دورہ تک اتنا فاصلہ ہے کہ قصر پڑھی جائے لیکن عام حالات میں اسے خانگی سہولیات سے بڑھ کر سہولیات ہیں اور وہ علاقہ اُس کا گھر تصور کیا جاتا ہے۔تو کیا وہ افسر اس دوران قصر نماز ادا کرے یا مکمل؟ چوتھی صورت یہ ہے کہ ایک ڈرائیور یا کنڈیکٹر اور اسی طرح ریل گاڑی کا عملہ جسے باقاعدگی سے اپنی گاڑی کے ساتھ پشاور تا کراچی آنا جانا پڑتا ہے تو کیا اسے ان فرائض کی انجام دہی کے دوران قصر نماز پڑھنی پڑے گی یا مکمل؟

جواب: صورت نمبر:۱۔ایسی صورت میں نماز مکمل پڑھے گا۔کیونکہ یہ مقیم ہے مسافر نہیں۔

صورت نمبر:۲۔قصر کرسکتا ہے اور جائے ملازمت میں پوری نماز پڑھے گا۔

صورت نمبر:۳۔قصر کی اجازت ہے۔

صورت نمبر:۴۔دورانِ سفر قصر کی اجازت ہے۔''علت مشترک'' سفر ہے۔

ہر روز گوجرانوالہ سے لاہور آنے والا شخص اپنی نمازیں کس طرح ادا کرے؟

سوال: ۱۔ایک شخص ہر روز گوجرانوالہ سے لاہور آتا ہے وہ اپنی نمازیں کس طرح ادا کرے؟

۲۔ کیا ہر روز ظہر اور عصر کی نماز دوگانہ (قصر) ادا کرسکتا ہے؟

۳۔ کیا یہ نمازیں پوری ادا کرنی پڑیں گی؟

۴۔ کیا بندہ ظہر کی نماز کو لیٹ کرکے عصر کی نماز پہلے ادا کرسکتا ہے؟ یعنی ظہر کی نماز ایک بجے ادا کی جائے اور ڈیڑھ بجے عصر ادا کی جائے؟ کتاب وسنت کی روشنی میں جواب دیں۔مہربانی

جواب: (۱) ہر روز مسافت طے کرنے والا دورانِ سفر نماز قصر کرسکتا ہے۔تاہم لاہور میں اگر کسی مخصوص جگہ قیام رہتا ہے تو وہاں نماز پوری پڑھے گا کیونکہ حکماً یہ اقامت ہے۔بصورتِ دیگر قصر پڑھ سکتا ہے۔اگرچہ روزانہ آمدورفت ہو۔

(۲) اگر آدمی سفر میں ہے تو روزانہ ظہر اور عصر کا دوگانہ ہوسکتا ہے۔دوگانے کا تعلق صرف چار رکعتی نماز سے ہے۔باقی نمازیں پوری پڑھنی چاہئیں۔

(۳) اصل یہ ہے کہ ہر نماز کو اپنے وقت پر ادا کیا جائے۔تاہم سفری صعوبت (مشکلات) کی بناء پر جمع تقدیم

اور تاخیر کا جواز ہے۔

پنجاب سے گدون نوکری پر جانے والا نماز قصر کہاں کرے؟

سوال : ایک آدمی پنجاب سے نوکری کے لیے گدون امازئی آتا ہے۔اس کی نوکری پکی ہو اور وہ ہفتہ وار گھر کو جاتا ہے اس کی گدون میں نمازیں قصر کی ہوں گی یا وہ پوری نمازیں پڑھے گا؟

جواب : ایسے شخص کو گھر جا کر نماز پوری پڑھنی ہوگی کیونکہ اب یہ مسافر نہیں رہا بلکہ مقیم بن گیا ہے البتہ دورانِ سفر قصر کرے گا جس طرح کہ محل ملازمت میں بھی نماز پوری پڑھنی ہوگی اس لیے کہ یہ بھی حکماً اقامت ہے۔

چکوال سے ۲۴۰ کلومیٹر کے فاصلے پر فیکٹری میں نماز قصر یا مکمل؟

سوال : مسئلہ یہ ہے کہ ہماری فیکٹری میں ایک آدمی چکوال سے کام کرنے کے لیے آتا ہے۔نوکری کرنے کی غرض سے وہ ۹۲ء میں گدون آ گیا تھا اور اب یہاں پر مستقل نوکری کر رہا ہے۔اس کی رہائش فیکٹری کے اندر ہے اور اس کے بیوی بچے چکوال میں مقیم ہیں۔گدون سے چکوال تک تقریباً ۲۴۰ کلومیٹر کا فاصلہ ہے۔وہ ہر ہفتہ گدون سے چکوال کو جاتا ہے اور اپنے اس سفر کے دوران نماز قصر ادا کرتا ہے۔جبکہ فیکٹری میں قیام کے دوران پوری نماز ادا کرتا ہے اور تا حال فیکٹری میں قیام کے دوران امامت بھی کراتا ہے۔اس کا یہ عمل ٹھیک ہے یا غلط؟ قیام کا ارادہ ایک ہفتہ سے زیادہ کبھی نہیں ہوتا۔

جواب : مذکور امام کا عمل درست ہے اسی پر کاربند رہنا چاہیے۔موصوف امام کی اپنی اور مقتدیوں کی نماز بلا تردّد درست ہے اعادہ کی قطعاً ضرورت نہیں۔

سوال : جن لوگوں نے ان کی امامت میں نمازیں اس عرصہ میں ادا کی ہیں کیا ان کی نمازیں ادا ہوئی ہیں یا نہیں؟

جواب : جن لوگوں نے ایسے امام کی اقتداء میں نمازیں پڑھیں ہیں ان کی نمازیں ہوگئیں ہیں۔

کتنی مسافت اور کتنے دن نماز قصر ہو سکتی ہے؟

سوال : ایک صاحب جو کہ فیکٹری سے ۱۱۴ کلومیٹر کے فاصلہ پر رہتا ہے اور وہ ہر ہفتہ کے بعد اپنے گاؤں جاتا ہے۔یعنی کبھی بھی پندرہ دن کے قیام کے ارادہ فیکٹری میں نہیں رہا۔کیا یہ صاحب فیکٹری میں امامت کرا سکتا ہے یا نہیں؟

جواب : فیکٹری میں یہ صاحب بھی امامت کرا سکتا ہے۔اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ دورانِ سفر یہ لوگ مسافر ہیں، اس لیے قصر کریں گے اور فیکٹری میں قیام اقامت کے حکم میں ہے۔لہٰذا یہاں پوری نماز پڑھی جائے گی

اور اسی طرح سے واپس اپنے گھر پہنچنے پر بھی نماز پوری پڑھنی ہوگی۔

کیا طلبہ یا ملازم کا پندرہ دن کسی جگہ ٹھہرنے پر نماز قصر ادا کرنا جائز ہے؟

سوال : میں الدعوۃ ماڈل سکول سرگودھا میں پڑھاتا ہوں، ہمارا گاؤں سکول سے یعنی سرگودھا سے ۳۰ کلو میٹر دور ہے، میں روزانہ گھر آجاتا ہوں، سرگودھا شہر میں میری رہائش نہیں ہے، اب سکول میں مجھے پوری نماز پڑھنی چاہیے یا قصر؟ ایک دو دفعہ میں نے جماعت کراتے ہوئے قصر نماز ہی پڑھائی۔ جب کہ اب میں جماعت نہیں کرا رہا۔

جواب : جائے ملازمت میں نماز پوری پڑھا کریں کیونکہ حکماً آپ مقیم ہیں۔

سوال : اگر کوئی آدمی اپنے گھر سے کافی دور کسی کورس وغیرہ پڑھائی یا ملازمت کے سلسلے میں رہتا ہے اور ہر ہفتے گھر جاتا ہے تو کیا وہ وہاں رہتے ہوئے قصر نماز ادا کرے یا پوری نماز پڑھے؟

جواب : محلِ اقامت میں قصر نہیں ہوسکتی۔ البتہ سفر کے دوران قصر کا جواز ہے۔

سوال : ایک مدرس یا طالب علم مدرسہ میں رہائش پذیر ہے یا خطیب اور امام، مسجد کے مکان میں رہائش پذیر ہے جبکہ آبائی گھر کسی اور جگہ ہے، یا کوئی شخص سرکاری وغیر سرکاری ملازمت کی وجہ سے دور دراز علاقے یا بیرون ملک رہ رہا ہے، اسی طرح کوئی شخص کسی دوسرے شہر میں رہتے ہوئے کاروبار کرتا ہے، ان میں سے کوئی شخص دو ماہ بعد، کوئی دو سال یا اس سے کم وبیش عرصے بعد گھر جاتا ہے۔ کیا یہ لوگ اپنی عارضی قیام گاہ پر نماز قصر پڑھیں گے یا مکمل نماز؟ کتاب وسنت کی روشنی میں وضاحت فرما دیں۔

جواب : اصلاً شریعت میں حقیقی مسافر کے لئے اجازت ہے کہ چار رکعتی نماز میں قصر کر سکتا ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد باری تعالی ہے:

﴿وَ اِذَا ضَرَبْتُمْ فِي الْاَرْضِ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَقْصُرُوْا مِنَ الصَّلٰوةِ اِنْ خِفْتُمْ اَنْ يَّفْتِنَكُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا﴾ (النساء: ۱۰۱)

"جب تم سفر کو جاؤ تو تم پر کچھ گناہ نہیں کہ نماز کو کم کر کے پڑھو بشرطیکہ تم کو خوف ہو کہ کافر لوگ تم کو ایذا دیں گے۔"

یعلی بن امیہ نے اسی آیت کے بارے میں سیدنا عمر رضی اللہ عنہ سے دریافت کیا کہ اب تو لوگ امن میں ہیں، پھر بھی قصر کا جواز ہے؟ انہوں نے فرمایا: جس سے تجھے تعجب ہوا ہے اس سے مجھے بھی تعجب ہوا تھا۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا تو آپ نے فرمایا:

«صَدَقَةٌ تَصَدَّقَ اللهُ بِهَا عَلَيكُم، فَاقبَلُوا صَدَقَتَهُ» [1]

''نماز قصر اللہ کی طرف سے صدقہ ہے، اس کا صدقہ قبول کرو۔''

چنانچہ حالت سفر میں مسافر کا قیام اگر کسی جگہ چار روز سے کم ہے تو اس کیلئے قصر کرنا افضل ہے۔ حجۃ الوداع کے موقع پر نبی ﷺ ذوالحجہ کی چار تاریخ کو مکہ میں داخل ہوئے اور آٹھ تاریخ کو منیٰ کی طرف روانہ ہوئے۔ یہ وہ دن ہیں جن میں آپ ﷺ نے عزم بالجزم کے ساتھ قیام فرمایا اور نماز قصر ہی ادا فرمائی۔ البتہ اگر قیام کی مدت متعین نہ ہو تو اس صورت میں بلاتحدید قصر کرسکتا ہے۔ جنگی مہموں میں جو آپ ﷺ کا مختلف مقامات پر مختلف مدت کے لئے قیام تھا وہ اسی قبیل سے ہے۔ صورتِ سوال میں جن لوگوں کا ذکر ہے، وہ سب مقیم ہی ہیں۔ لہٰذا نماز پوری پڑھیں۔

سفر سے واپسی پر گاؤں میں داخل ہونے پہلے کسی مقام پر قصر نماز پڑھے گا یا پوری؟

سوال : ایک آدمی سفر سے واپسی پر اپنے گاؤں میں داخل ہونے سے پہلے کسی قریبی گاؤں میں قیام کرتا ہے، تو کیا اس صورت میں وہ قصر نماز پڑھے گا یا پوری؟

جواب : جب تک مسافر اپنی بستی کی حدود میں داخل نہ ہو نماز قصر کرسکتا ہے، اس لیے کہ حکم سفر اس سے ابھی تک زائل نہیں ہوا۔

سوال : جب آدمی سفر سے واپس آئے تو سفر والی نماز گھر میں مکمل ادا کرے گا یا قصر کرے گا؟

جواب : مسافر آدمی جب گھر واپس پہنچ جائے تو سفر میں فوت شدہ نماز پوری پڑھنی چاہیے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سفر میں قصر کرنا راجح مسلک کے مطابق افضل ہے۔ واجب نہیں۔

۶۵ کلو میٹر کے قریب روزانہ سفر کرنے والا نمازِ قصر ادا کرسکتا ہے؟

سوال : ایک ملازم اپنے گھر سے تقریباً ۶۵ کلو میٹر کے قریب روزانہ ایک طرفہ سفر کرتا ہے۔ کیا وہ اپنے مقامِ ملازمت پر دوگانہ ادا کرسکتا ہے یا نہیں؟ اگر نہیں تو کیا یہ سفر قصر نماز کے لیے کافی نہیں؟

جواب : مسافر ملازم کا اپنے مقامِ ملازمت میں دوگانہ پڑھنا درست نہیں، کیونکہ ایسا شخص حکماً مقیم ہی کہلاتا ہے۔ علامہ ابن الہمام نے ''فتح القدیر شرح ہدایہ'' میں اس کا نام وطن اقامت رکھا ہے، ہاں البتہ اگر دورانِ سفر کہیں نماز کا وقت ہوگیا تو وہاں دوگانہ پڑھنے کی اجازت ہے۔ اس لیے کہ یہ مسافر ہے۔

---

[1] صحیح مسلم، کِتَابُ صَلَاةِ الْمُسَافِرِينَ وَقَصْرِهَا، بَابُ صَلَاةِ الْمُسَافِرِينَ وَقَصْرِهَا، رقم: ۶۸۶

پندرہ دن کے بعد ایک رات اپنے گھر پر آنے والا نمازِ قصر کہاں ادا کرے؟

سوال میرا مستقل رہائشی مکان میرے ڈیوٹی سٹیشن سے ۹۰ کلومیٹر دور ہے، اور میرا زیادہ تر قیام ڈیوٹی سٹیشن پر ہی ہوتا ہے۔ یہاں رہائش سرکاری ہے اور تقریباً تمام سہولیات موجود ہیں اور نماز پوری ادا کرتا ہوں۔ تقریباً پندرہ روز بعد مستقل گھر میں جو کہ والد صاحب کی ملکیت ہے، ایک رات کے لئے جاتا ہوں۔ آیا یہاں نماز قصر کی جاسکتی ہے؟ (ڈاکٹر حق نواز، راولپنڈی)

جواب جب والد صاحب کی زیارت کیلئے جائیں تو وہاں نماز پوری پڑھیں، احتیاط کا تقاضا یہی ہے۔

رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام نے کتنے کلومیٹر پر نمازِ قصر ادا کی ہے؟

سوال : میں روزانہ اپنے کاروبار کے سلسلے میں اپنے گھر سے تقریباً ۲۵ کلومیٹر فاصلہ طے کر کے شام کو واپس گھر آتا ہوں۔ کیا اس دوران میں قصر نماز ادا کروں یا نماز کو پورا پڑھوں؟ اس کے بارے میں قرآن اور شریعت سے آگاہ کریں۔ یہ بھی بتائیں کہ رسولِ کریم ﷺ اور صحابہ رضی اللہ عنہم نے کتنے کلومیٹر پر نمازِ قصر ادا کی ہے؟

جواب : مذکورہ مسافت پر آپ قصر کر سکتے ہیں۔ صحیح مسلم میں حضرت انس رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ رسولِ اکرم ﷺ جب تین کوس یا تین فرسخ (نو کوس) نکلتے یعنی سفر کرتے تو دوگانہ پڑھتے۔

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ ''فتح الباری'' میں اس حدیث کے بارے میں رقمطراز ہیں:

حدیثِ ہذا اس بارے میں بہت صحیح اور بہت صریح ہے، لیکن اس حدیث میں تین کوس یا تین فرسخ بصیغۂ شک بیان ہوا ہے۔ اس بناء پر بعض اہلِ علم نے کہا ہے کہ احتیاطاً دوگانہ نو کوس پر پڑھنا چاہیے کیونکہ نو کے بڑے عدد میں تین بھی شامل ہے۔

۲۰۰ کلومیٹر سفر کرنے والے کے لیے مسافت کی مقدار کتنی ہوگی؟

سوال : میرے شوہر روزانہ ملازمت کے سلسلے میں آنے جانے کا ۲۰۰ کلومیٹر سفر طے کرتے ہیں۔ صبح نمازِ فجر کے بعد روانہ ہوتے ہیں اور عصر سے پہلے گھر پہنچتے ہیں۔ ظہر کی نماز قضاء ادا کرتے ہیں۔ اب آپ یہ واضح کریں کہ وہ نمازِ ظہر اور عصر قصر کر کے پڑھیں؟ رسالہ میں آپ نے ایک سائل کو ۲۵ کلومیٹر پر نمازِ قصر کرنے کا فرمایا ہے، لیکن جو یہ کہا جاتا ہے کہ پندرہ دن کی نیت ہو تو قصر کر سکتے ہیں؟

جواب : محترمہ اپنے سوالات کے جوابات بالاختصار ملاحظہ فرمائیں!

۱۔ آپ کے شوہر سفر کے دوران نمازِ ظہر قصر کر سکتے ہیں۔ اور عصر کے وقت وہ چونکہ گھر تشریف لے

آتے ہیں اس لیے نماز عصر وہ پوری ادا کریں گے اور اگر کسی وقت راستے میں عصر کا وقت بھی آ جائے تو ظہر کی طرح اسے بھی دوگانہ پڑھا جا سکتا ہے۔ بوقتِ ضرورت ظہر و عصر میں جمع تقدیم و تاخیر کا بھی جواز ہے۔ یہ بھی یاد رہے کہ ایک جگہ مستقل اقامت کے بغیر جب تک آدمی سفر میں ہے وہ قصر کر سکتا ہے۔ اگرچہ کئی سال گزر جائیں۔ [1] اور اگر کسی جگہ بہ نیت و ارادۂ مستقل چند یوم ٹھہرنے کا پروگرام ہو تو کتنے روز قصر ہو سکتی ہے؟ اس بارے میں اہلِ علم کے بہت سارے اقوال ہیں۔ ان میں سے ایک قول پندرہ روز کا بھی ہے، لیکن سنداً یہ حدیث کمزور ہے۔ [2]

صحیح بات یہ ہے کہ بایں صورت قریباً چار روز تک قصر ہو سکتی ہے، کیونکہ ''حجۃ الوداع'' کے موقع پر رسول اللہ ﷺ چار ذوالحجہ کو مکہ میں داخل ہوئے تھے اور آٹھ تاریخ کو نکل گئے تھے۔ پھر جب تک آدمی حالتِ سفر میں ہو وہ قصر کر سکتا ہے۔ میلوں سے اس کی کوئی حد بندی نہیں۔ البتہ بعض اہلِ علم نے حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت کی بناء پر ابتداءِ قصر کے لیے احتیاطاً نوکوس بیان کیے ہیں۔ ۲۵ کلومیٹر کا ذکر میرے جواب میں نہیں تھا۔ بلکہ یہ سائل کے سوال میں تھا۔ میں نے صرف اتنی مسافت پر قصر کا جواز بیان کیا ہے۔ حصر (تحدید) مقصود نہیں تھا۔

مسافر کتنے دن تک قصر کر سکتا ہے؟

سوال : مسافر کتنے دن تک قصر کر سکتا ہے؟ اور قصر، سفر کا ارادہ کرتے ہی یعنی گھر سے نکلنے کے بعد ہی شروع ہو جاتی ہے یا اس کی کوئی حد ہے کہ اتنے میل سے شروع ہو گی؟ کتنے دن تک سفر میں قصر کر سکتے ہیں؟ قرآن و حدیث کی روشنی میں بتا دیں نوازش ہو گی۔

جواب : مسافر جب کسی جگہ چار دن سے زیادہ ٹھہرنے کا عزم رکھتا ہو تو نماز پوری پڑھے۔ جمہور اہلِ علم کا یہی مسلک ہے، کیونکہ رسول اللہ ﷺ ''حجۃ الوداع'' کے موقع پر ۴/ ذی الحجہ کو مکہ مکرمہ میں داخل ہوئے اور آٹھ کو منیٰ کی طرف روانہ ہوئے اور ان ایام میں آپ دوگانہ پڑھتے رہے۔ یہ قیام نیت اور عزم و جزم کے ساتھ طے شدہ تھا۔ اس سے کم قیام کی صورت میں قصر کرنا افضل ہے، اگر پوری نماز پڑھ لے تو بھی کوئی حرج نہیں۔

اگر کسی نے لمبے سفر پر جانا ہو تو اپنی رہائشی حدود سے نکل کر دوگانہ شروع ہو جاتا ہے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث کی بناء پر۔ اگر کسی نے نوکوس کی مسافت تک جانا ہو تو وہ قصر کر سکتا ہے۔ اس حدیث میں

---

[1] سنن ترمذی، بَابُ مَا جَاءَ فِي کَمْ تُقْصَرُ الصَّلَاۃُ، رقم: ٥٤٨

[2] سنن أبی داؤد، بَابُ مَتَى يُتِمُّ الْمُسَافِرُ؟، رقم: ١٢٣١

اگر چہ تین کوس اور نو کوس شک کے ساتھ آیا ہے، لیکن احتیاطاً نو کوس پر نمازِ دوگانہ پڑھنی چاہیے۔ کیونکہ نو کوس میں تین کوس آ جاتے ہیں۔

مسافر کی مستقل طور پر اگر کسی جگہ ٹھہرنے کی نیت نہ ہو تو کسی حد بندی کے بغیر قصر ہو سکتی۔ امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اہلِ علم کا اس بات پر اجماع ہے کہ مسافر جب تک اقامت کی پختہ نیت نہ کرے۔ قصر کر سکتا ہے، خواہ کئی سال گزر جائیں۔

نمازِ قصر کی مدت

نمازِ قصر کی مدت کتنی ہوگی؟:

سوال : میرا بھائی محمد اصغر میرے ساتھ رہتا ہے اور کراچی شہر میں کام (ملازمت) کرتا ہے اور کراچی شہداد پور سے بذریعہ ٹرین تقریباً ۴ گھنٹے کا سفر ہے۔ جب بھائی جان کراچی جاتے ہیں تو کبھی ان کا ارادہ ۱۵ دن رہنے کا ہوتا ہے، کبھی ایک مہینہ اور کبھی دس دن کا، تو کیا بھائی جان کراچی میں نمازِ قصر ادا کریں گے یا مکمل؟ کراچی میں ذاتی مکان نہیں بلکہ نیت ملازمت کرنے کی ہوتی ہے۔

جواب : صورتِ مسئولہ میں آپ کے بھائی صاحب محلِ ملازمت اور شہر کراچی میں نماز کا اتمام (پوری پڑھیں) کریں گے۔ احتیاط کا تقاضا یہی ہے۔ اس بارے میں مزید وضاحت ''سنن کبریٰ بیہقی'' اور ''مصنف ابن ابی شیبہ'' وغیرہ میں دیکھی جا سکتی ہے۔ کچھ عرصہ قبل اس موضوع پر میرے دو فتوے بھی ''الاعتصام'' میں دلائل کے ساتھ شائع ہو چکے ہیں۔ ان کا رجوع کرنا بھی مفید ہے۔

کیا طلبہ کا اقامتی جگہ پر نمازِ قصر کرنا درست ہے؟

سوال : ہمارے کچھ اہلِ حدیث بھائی جو کہ طالبِ علم ہیں۔ ایک مسجد میں عرصہ سے رہتے ہیں اور قصر نماز پڑھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم مسافر ہیں۔ ان کی مدتِ اقامت چھ ماہ سے زیادہ ہے۔ جب مسجد میں امام بن کر نماز پڑھتے ہیں تو بھی قصر پڑھتے ہیں۔ جس کی وجہ سے مقامی لوگوں میں تشویش پیدا ہوتی ہے کہ یہ لوگ کیوں چار کی بجائے دو رکعت ہی مسلسل پڑھتے ہیں؟ تراویح کی طرح نماز کو بھی کم کرتے ہیں۔ وغیرہ وغیرہ سفر کے لیے مدت کا کوئی تعین ہے یا نہیں؟

جواب : اہلِ علم کا اس بارے میں اختلاف ہے کہ مسافر کتنے روز کسی جگہ اقامت اختیار کر کے قصر پڑھ سکتا

ہے۔ مختلف اقوال میں سے احتیاطی بات یہ ہے کہ مسافر تین یا چار روز تک قصر کرے اور اگر زیادہ مدت قیام کی نیت ہو تو پوری پڑھے۔ اس کی واضح دلیل یہ ہے کہ ''حجۃ الوداع'' کے موقع پر چار ذوالحجہ کو نبی ﷺ مکہ میں داخل ہوئے اور آٹھ تاریخ کو یہاں سے نکلے ان دنوں مکہ میں آپ ﷺ کا قیام عزم و جزم (پختہ ارادے) سے تھا۔ اس کے علاوہ دیگر روایات جن میں مختلف اعداد کا ذکر ہے، یہ تردّد (غیر یقینی حالت) پر محمول ہیں۔ ان سے عزم و جزم کے ساتھ کسی ایک جگہ قیام کا اظہار نہیں ہوتا۔ اس صورت میں بلا تحدیدِ ایام (دنوں کی تعیین کے بغیر) قصر پڑھی جا سکتی ہے۔ لہٰذا بلا معقول عارضہ بحالتِ اقامت (بغیر کسی عذر کے مقیم ہونے کی حالت میں) فعل قصر کو اختیار کیے رکھنا شکوک و شبہات سے خالی نہیں جب کہ حدیث میں ہے:

« دَعْ مَا يُرِيبُكَ إِلَى مَا لَا يُرِيبُكَ » [1]

یعنی شکی شئی کو چھوڑ کر غیر شکی کو اختیار کرنا چاہیے۔

کتنے دن نمازِ قصر ادا کی جاسکتی ہے؟

سوال: سفر میں کتنے دن نمازِ قصر ادا کی جاسکتی ہے؟

جواب: عزم و جزم کی صورت میں تین چار دن مسافر قصر کر سکتا ہے۔ نبی ﷺ حجۃ الوداع کے موقع پر ۴/ ذوالحجہ کو مکہ میں داخل ہوئے اور آٹھ کو منیٰ کی طرف روانہ ہوئے۔ آپ ﷺ کا یہ قیام بہ نیت عزم و جزم تھا اور تردّد کی صورت میں بلا تعیین اَیام قصر پڑھنا درست ہے۔ امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اہل علم کا اس بات پر اجماع ہے کہ مسافر جب تک اقامت کی پختہ نیت نہ کرے قصر کر سکتا ہے خواہ کئی سال گزر جائیں۔ [2]

مسافر کتنی مدت تک نماز قصر ادا کرے گا؟

سوال: کتنی مدت تک مسافر نمازِ قصر ادا کرے گا؟

جواب: مسافر جب تک چار دن سے زیادہ بلا جزمِ اقامت سفر (بغیر پختہ عزم) میں ہو تو وہ قصر کر سکتا ہے۔ اس حالت میں چاہے کئی سال گزر جائیں۔ [3]

---

[1] صحیح البخاری، بَابُ تَفْسِيرِ الْمُشَبَّهَاتِ، سنن الترمذی، رقم: ۲۵۱۸، سنن النسائی، بَابُ الْحَثُّ عَلَى تَرْكِ الشُّبُهَاتِ، رقم: ۵۷۱۱

[2] سنن ترمذی، بَابُ مَا جَاءَ فِي كَمْ تُقْصَرُ الصَّلَاةُ، رقم: ۵۴۸

[3] سنن ترمذی، بَابُ مَا جَاءَ فِي كَمْ تُقْصَرُ الصَّلَاةُ، رقم: ۵۴۸

(سوال): مسافر آدمی کتنے دن تک قصر نماز پڑھ سکتا ہے؟

(جواب): احادیث میں قصر کے لیے کوئی دن مقرر نہیں۔ جب تک آدمی مسافر ہے قصر کر سکتا ہے۔ امام ترمذی فرماتے ہیں:

« أجمَعَ أَهلُ العِلمِ أَنَّ لِلمُسَافِرِ اَن يَّقصُرَ مَا لَم يَجمَع اِقَامَةً ، وَ إِن اَتَى عَلَيهِ سِنُون »[1]

''اہلِ علم کا اس بات پر اجماع ہے کہ مسافر آدمی جب تک اقامت کی نیت نہ کرے، وہ قصر کر سکتا ہے، اگرچہ اس پر کئی سال گزر جائیں۔''

تاہم اگر اس کی نیت کسی ایک جگہ چار دن سے زیادہ ٹھہرنے کی ہے تو وہ نماز پوری پڑھے گا۔ کیونکہ ''حجۃ الوداع'' کے موقع پر نبی ﷺ سے یہی مدت ثابت ہے۔

کیا مدتِ قصر پندرہ دن ہے؟

(سوال): نمازِ قصر کے متعلق بعض علماء کا کہنا ہے کہ اس کی رخصت پندرہ دن تک ہے، بعض کی رائے میں اس کی رخصت تین دن ہے، جب کہ بعض کا خیال یہ ہے کہ قرآن وحدیث میں اس کی مقدار مقرر ہی نہیں ہے، ہمیں اس کے بارے میں ٹھوس اور تفصیلی جواب فراہم فرمائیں۔

(جواب): اہلِ علم کا اس بارے میں اختلاف ہے کہ مسافر کتنے روز تک کسی جگہ اقامت اختیار کر کے قصر نماز پڑھ سکتا ہے۔ مختلف اقوال میں سے راجح بات یہ ہے کہ مسافر قریباً چار روز تک قصر کرے، اگر زیادہ مدت قیام کی نیت ہو تو پوری نماز ادا کرے۔ اس کی واضح دلیل یہ ہے کہ حجۃ الوداع کے موقعے پر چار ذوالحجہ کو نبی ﷺ مکہ مکرمہ میں داخل ہوئے اور آٹھ تاریخ کو نکلے۔

ان دنوں مکہ میں آپ ﷺ کا قیام عزم بالجزم (پختہ ارادے سے) تھا، اس کے علاوہ دیگر روایات جن میں مختلف اعداد کا ذکر ہے، وہ تردد (شک) پر محمول ہیں۔ ان سے عزم وجزم کے ساتھ کسی ایک جگہ قیام کا اظہار نہیں ہوتا، اس لیے ایسی صورت میں (یعنی جب قیام کی مدت متعین نہ ہو) بلاتحدید ایام (دنوں کی تعیین کے بغیر) قصر پڑھی جا سکتی ہے۔ لہٰذا کسی معقول عارضے کے بغیر بہ حالتِ اقامت قصر نماز پڑھے جانا شکوک وشبہات سے خالی نہیں، جب کہ حدیث میں ہے: « دَع مَا يُرِيبُكَ إِلٰى مَا لَا يُرِيبُكَ.»[2]

یعنی مشکوک کام چھوڑ کر یقینی کو اختیار کرنا چاہیے۔

[1] سنن ترمذی، بَابُ مَا جَاءَ فِي كَم تُقصَرُ الصَّلَاةُ ، رقم: ۵۴۸

[2] صحیح البخاری، بَابُ تَفسِيرِ المُشَبَّهَاتِ، سنن الترمذی، رقم: ۲۵۱۸، مصنف ابن ابی شیبہ: ۱۳۳۶

معسکرات میں نمازِ قصر کا کیا حکم ہے؟

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ معسکرات جہاں جہادی ٹریننگ دی جاتی ہے۔ ہمارے جامعات کے طلباء وہاں ٹریننگ کے لیے جاتے ہیں انھوں نے وہاں اکیس دن قیام کرنا ہوتا ہے۔

ہمارے عزیز طلباء بلوغ المرام سے لے کر بخاری شریف تک اپنے اساتذہ سے محدثین کا راجح مسلک پڑھتے اور سنتے ہیں کہ تین دن سے زیادہ قیام کرنا ہو تو نماز پوری پڑھنی چاہیے لیکن معسکرات میں ان کو زبردستی نمازِ قصر پڑھائی جاتی ہے اور وہاں کے استاد جو دس دس اور پندرہ پندرہ سال سے وہاں مقیم ہیں نماز قصر ادا کر رہے ہیں اور دلیل دیتے ہیں کہ جب تک مسافر اقامت کی نیت نہ کرے ''نمازِ قصر'' پڑھ سکتا ہے۔

قرآن وسنت کی رو سے محدثین کا مسلک با دلائل واضح فرمائیں۔

جواب: راجح قول کے مطابق مسافر کا اگر کسی جگہ چار دن سے زیادہ ٹھہرنے کا عزم بالجزم ہو تو اس صورت میں نماز پوری پڑھنی چاہیے۔ ''حجۃ الوداع'' کے موقعہ پر عمل نبوی اس بات کا مؤید (تائید کرنے والا) ہے۔ بصورتِ دیگر قصر کی اجازت ہے۔ چاہے کئی سال گزر جائیں۔ امام ترمذی فرماتے ہیں:

« ثُمَّ اَجمَعَ أَهلُ العِلمِ عَلٰی أَنَّ لِلمُسَافِرِ أَن يَقصُرَ مَا لَم يَجمَع إِقَامَةً ، وَ إِن أَتٰی عَلَيهِ سِنُونَ »[1]

''اہلِ علم کا اس بات پر اجماع ہے کہ مسافر جب تک اقامت کی نیت نہ کرے۔ قصر کر سکتا ہے۔ اگرچہ اس پر کئی سال گزر جائیں۔''

قدرے تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو! میری تالیف ''جائزۃ الاحوذی فی التعلیقات علی سنن الترمذی'' (۱/ ۵۵۸) مذکورہ بالا صورت سے ظاہر ہے کہ یہاں چوں کہ چار دن سے زائد اقامت کا ارادہ ہے۔ لہٰذا اکیس روزہ جہادی ٹریننگ حاصل کرنے والے اور مستقل رہائش پذیر اساتذہ کرام کو چاہیے کہ معسکرات میں نماز پوری پڑھیں۔

باقی رہا، بعض حضرات کا یہ دعویٰ کہ ہماری یہاں ٹھہرنے کی نیت نہیں۔ عملاً واقعہ کے خلاف ہے، جس کی شرعاً کوئی حیثیت نہیں۔ واضح ہو کہ امام موصوف کے بالا قول میں عدمِ نیت سے مقصود ایسی مہم ہے جس میں آدمی جنگی امور وغیرہ میں متردد ہو یا پھر دوسرے کے تابع ہو۔ معلوم نہیں کس وقت کیا حکم ہو جائے۔ جب کہ مشارٌ الیہ شکل میں یہ کیفیت نہیں۔

---

[1] سنن ترمذی، بَابُ مَا جَاءَ فِی کَم تُقصَرُ الصَّلَاۃُ ، رقم: ۵۴۸ مع تحفۃ الاحوذی: ۳/ ۱۱۴

کتنی مسافت پر نمازِ قصر کی ابتداء ہو گی؟

نمازِ قصر کے لیے مسافر کا آغاز:

سوال : ایک شخص شہر سے دو میل دور گاؤں میں رہتا ہے۔ ریلوے اسٹیشن/ لاری اڈا شہر میں ہے۔ اس کا سفر کہاں سے شروع ہو گا اور کہاں ختم ہو گا۔ اپنے گاؤں سے یا شہر سے؟

جواب : گاؤں کی حدود سے تجاوز کرنے پر یہ شخص مسافر سمجھا جائے گا اور واپس گاؤں کی حدود میں داخل ہونے پر یہ مقیم شمار ہو گا۔

سفر میں قصر کی مسافت:

سوال : حضور ﷺ نے سفر کی نماز مکہ میں چار رکعت، ذی الحلیفہ میں دو رکعت پڑھی، کتبِ احادیث میں فاصلہ تین میل لکھا ہے جس سے جواز تو مل گیا۔ مگر حضور ﷺ کی منزلِ مقصود مکہ مکرمہ تھا نہ کہ ذی الحلیفہ، پوری تفصیل سے بیان فرمائیں؟

جواب : نبی اکرم ﷺ نے مکہ میں بھی سفری نماز کے چار فرض کے بجائے دو ہی ادا کیے تھے جس طرح کہ ذوالحلیفہ میں دو رکعت ادا کی تھی بلاریب رسول اللہ ﷺ کی منزل مقصود مکہ تھا۔ اس بناء پر جب آپ ﷺ مسافر بن گئے تو قصر کا آغاز کر دیا۔ غالباً اس سے سائل کا مقصد یہ معلوم ہوتا ہے کہ اگر کسی نے صرف تین میل تک جانا ہو تو کیا وہ بھی قصر کرے۔ اس کی وضاحت یوں ہے کہ مسئلہ ہذا مختلف فیہ ہے۔ بعض اہلِ علم کا تین میل کے لیے استدلال حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت سے ہے جس میں تین میل یا تین فرسخ بصیغہ شک استعمال ہوا ہے۔ جب کہ دیگر کئی ایک اہلِ علم احتیاط کی بناء پر تین فرسخ (نو میل) کے قائل ہیں۔ دوسری طرف ایک گروہ کا یہ بھی خیال ہے کہ قصر کے لیے سفر کی کوئی حد بندی نہیں۔ بلکہ عرف میں جب آدمی مسافر بن جائے تو وہ قصر کر سکتا ہے۔ امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ وغیرہ کا یہی موقف ہے۔ بظاہر اس کو ترجیح معلوم ہوتی ہے۔ (واللہ اعلم)

عارضی رہائش کی صورت میں نمازِ قصر کا حکم کیا ہو گا؟

سوال : نمازِ سفر کی حضور ﷺ نے مدینہ منورہ میں چار رکعت اور ذوالحلیفہ میں دو رکعت ادا کیں۔ لیکن حضور ﷺ کا منزل مقصود تو خانہ کعبہ تھا۔ اس کے علاوہ کوئی مصدقہ خبر کہ حضور نے تین میل یا تین فرسخ پر سفر

کی نماز ادا کی اور ان کا منزل مقصود بھی اتنا ہی فاصلہ ہو۔ [1]

جواب: صحیح مسلم میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب تین کوس یا تین فرسخ (نو کوس) نکلتے یعنی سفر کرتے تو دوگانہ پڑھتے۔

''فتح الباری'' میں اس حدیث کے بارے میں وارد ہے کہ یہ حدیث اس بارے میں بہت صحیح اور بہت صریح ہے۔ ہمارے شیخ محدث روپڑی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: میری تحقیق بھی یہی ہے کہ یہ حدیث فیصلہ کن ہے۔ پھر فرماتے ہیں: کہ اس لیے اس پر مسئلہ کی بناء رکھنی چاہیے۔ مگر چونکہ اس حدیث میں تین کوس اور نو کوس شک کے ساتھ آیا ہے، اس لیے احتیاطاً نو کوس پر دوگانہ پڑھنا چاہیے، کیونکہ نو کوس میں تین کوس آجاتے ہیں۔ (فتاویٰ اہل حدیث: ۲/ ۲۴۸)

کیا ۵۰ کلومیٹر پر نمازِ قصر ادا کی جا سکتی ہے؟

سوال: اگر ایک آدمی روزانہ ۵۰ کلومیٹر کا فاصلہ طے کرتا ہے اور عصر کے وقت واپس گھر آجاتا ہے تو کیا وہ نمازِ ظہر قصر ادا کر سکتا ہے؟

جواب: سفر کے دوران قصر کر سکتا ہے۔ لیکن محلِ اقامت (رہائش کی جگہ) یا ملازمت میں نہیں۔

سفر میں قصر کی مسافت کی مقدار:

سوال: سفر میں قصر کی مسافت کی مقدار حدیث میں ذکر ہے کہ حضور ﷺ نے مدینہ سے ذی الحلیفہ تک ۳ میل کی مسافت پر نماز قصر کی۔ لیکن حضور ﷺ کی منزل مقصود تو مکہ معظمہ تھا۔ آج کل کے عام حالات میں پبلک گاڑیوں میں سفر کی کیا مقدار ہے؟

جواب: جب انسان محسوس کرے کہ اب میں مسافر ہوں تو وہ قصر کر سکتا ہے۔ بعض اہلِ علم احتیاطاً نو میل کے قائل ہیں۔ ذرائع آمد و رفت کی تیز رفتاری سے کوئی فرق نہیں پڑتا جب کہ ہر دو صورت میں سفر سفر ہی ہے۔

سوال: نماز قصر کتنی مسافت سے شروع ہوتی ہے اور کتنے دن تک آدمی مسافر ہو کر قصر نماز ادا کرے؟

جواب: جب آدمی مسافر بن جائے تو نمازِ قصر ہو سکتی ہے۔ بعض اہلِ علم نے حضرت انس رضی اللہ عنہ کی حدیث کے پیشِ نظر نو کوس (اٹھارہ کلومیٹر) بیان کی ہے۔

عزم بالجزم (پختہ عزم کی وجہ) سے قریباً چار روز تک قصر ہو سکتی ہے۔ کیونکہ رسول اللہ ﷺ حجۃ الوداع

---

[1] صحيح مسلم، بَابُ التَّلبِيَةِ وَصِفَتِهَا وَوَقتِهَا، رقم: ١١٨٤

کے موقع پر ۴ ذوالحجہ کو مکہ مکرمہ داخل ہوئے اور آٹھ ذوالحجہ کو منیٰ کی طرف روانہ ہوئے اور آپ ان ایام میں دو گانہ پڑھتے رہے اور یہ قیام بہ نیت عزم بالجزم تھا اور تردّد (شک) کی صورت میں بلا حصر (مسلسل) دوگانہ درست ہے۔ امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اہلِ علم کا اس بات پر اجماع ہے کہ مسافر جب تک اقامت کی پختہ نیت نہ کرے، قصر کرسکتا ہے۔ خواہ کئی سال گزر جائیں۔ ①

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کتنی مسافت پر قصر کرتے تھے؟

سوال تعلیم الاسلام از مولانا عبدالسلام بستوی کے صفحہ پر رقم ہے کہ ''سفر کی ادنیٰ مسافت کم از کم ۴۸ میل ہے، اس سے کم درست نہیں کیونکہ ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ مکہ والو! تم ۴۸ میل سے کم میں قصر مت کرنا۔ ② اور جن روایات میں نو یا تین میل کا ذکر ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ نو یا تین میل سفر تک گئے تھے کہ نماز کا وقت ہوگیا۔ اُنیس دن ٹھہرنے کی روایت (بحوالہ بخاری باب مقام النبی: ۸/ ۸۷ صفحہ: ۴۲۰) پر لکھتے ہیں کہ ''قصر ہی کرتا رہے جب تک کہ اکٹھے ہی اُنیس دن سے زیادہ کی نیت کرے۔ اس کی دلیل حضرت عباسؓ والی حدیث ہے جو ابھی گذری۔'' صحیح موقف کیا ہے؟

جواب صحیح حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تین کوس یا تین فرسخ (۹ کوس) نکلتے، یعنی سفر کرتے تو قصر پڑھتے۔ اس حدیث کو لمبے سفر پر محمول کرنا ظاہر کے خلاف ہے۔ پھر ابن عباسؓ کے قول سے فعلی حدیث مقدم ہے۔ اگر سفر میں کسی ایک جگہ ٹھہرنے کی نیت ہو تو بلا تحدید قصر ہوسکتی ہے اور اگر چار دن سے زیادہ کسی ایک جگہ ٹھہرنے کی نیت ہو تو نماز پوری پڑھے۔ (تفصیل کے لئے ''الاعتصام'': ۲۴ مئی ۱۹۹۶ء)

دورانِ سفر مسافر جمعہ کی نماز کے بدلے ظہر کی نماز ادا کرنا:

سوال: کیا دورانِ سفر مسافر جمعہ کی نماز کے بدلے ظہر کی نماز اس وقت ادا کرسکتا ہے جس وقت وہ عام دنوں میں پڑھتا ہے؟ اور کیا وہ باجماعت پڑھ سکتا ہے؟

جواب: جمعہ اور ظہر کا وقت زوال کے بعد ہے۔ اگر مسافر حالتِ سفر میں رخصت پر عمل کرتے ہوئے جمعہ ادا نہ کرے تو پھر معمول کے مطابق ظہر کی نماز ادا کرے گا۔ باجماعت ادائیگی اجر و ثواب میں اضافہ کی موجب ہے۔ لہٰذا حتی المقدور کوشش ہونی چاہئیے کہ نماز باجماعت ادا ہو۔

---

① سنن ترمذی، بَابُ مَا جَاءَ فِي كَمْ تُقْصَرُ الصَّلَاةُ، رقم: ٥٤٨

② مصنف ابن ابی شیبه، دارقطنی: جلد ١ ص ٣٨٧ باب قدر المسافة التی تقصر فی مثلها صلاة ، فتح الباری ٢/ ٥٦٦ فی شرح باب فی کم یقصر الصلاة

دورانِ سفر نماز کی سنتیں پڑھی جائیں یا چھوڑی جائیں:

سوال: قصر نماز کے لیے آج کے میلوں/کلومیٹر کے حساب سے کتنی مسافت ضروری ہے۔ دورانِ سفر نماز کی سنتوں کے بارے میں آنحضرت ﷺ کی سنت شریف کیا ہے۔ پڑھی جائیں یا چھوڑ دی جائیں۔ کیا مسافر کے لیے جماعت کو چھوڑ کر انفرادی نماز کی رخصت ہے؟

جواب: بعض اہلِ علم اس بات کے قائل ہیں، کہ کم از کم نو کوس (۹) کی مسافت پر دوگانہ پڑھا جائے، اور کلو میٹر کے حساب سے قریباً اٹھارہ کلو میٹر بنتے ہیں۔ جب کہ دیگر علماء کے نزدیک یہ ہے کہ عرف میں جس مسافت پر سفر کا اطلاق ہو، اس میں نمازِ قصر ہو سکتی ہے۔ اظہر یہی ہے۔

اور سفر میں سنتیں پڑھنا اور چھوڑنا دونوں طرح درست ہے۔ البتہ فجر کی دو سنتیں پڑھنے کا اہتمام مؤکد (تاکیدی) ہے۔

باجماعت نماز ادا کرنے کا اہتمام ہر صورت ہونا چاہیے، چاہے کوئی مقیم ہو یا مسافر، اِلَّا یہ کہ مسافر کو کسی اضطراری حالت کا سامنا ہو، اس صورت میں انفرادی نماز پڑھنے کی رخصت ہے۔ مثلاً: ہوائی جہاز یا ریل گاڑی پر سفر کی جلدی ہے وغیرہ وغیرہ۔

مریض آدمی کو فرض نمازیں قصر کرلینی چاہیے؟

سوال: کیا بیمار آدمی فرض نمازوں کو قصر کر سکتا ہے؟

جواب: مریض انسان بلا علتِ سفر نماز قصر نہیں کر سکتا۔ البتہ اگر مریض کے لیے نماز کی ادائیگی بروقت مشکل ہو تو ظہر اور عصر، مغرب اور عشاء کو جمع کر کے پڑھ سکتا ہے: "حديث المستحاضة" اس امر کی واضح دلیل ہے۔[1]

سفر والی نماز گھر میں اور گھر والی نماز سفر میں کیسے پڑھیں؟

سوال: سفر والی نماز گھر میں اور گھر والی نماز سفر میں کس طرح ادا کرنی چاہیے؟ اگر وقت پر ادا نہ کی گئی ہو۔

جواب: راجح مسلک کے مطابق قصر واجب نہیں افضل ہے۔ لہٰذا سفر نماز گھر میں پوری پڑھے، نیز گھر والی قضاء شدہ نماز میں سفر میں پوری پڑھے گا۔ کیونکہ اصل یہی ہے۔

---

[1] سنن أبی داود، بَابُ مَن قَالَ تَجمَعُ بَينَ الصَّلَاتَينِ وَتَغتَسِلُ لَهُمَا غُسلًا، رقم: ۲۹٤ مع عون المعبود: ۱/۱۱۹

دو نمازیں جمع کر کے پڑھنا

موسم کی خرابی کی بنا پر نمازوں کو جمع کرنا:

سوال ۱۔ موسم کی خرابی کی بنا پر اذان میں کون سے لفظ اور کتنی مرتبہ کہنے چاہئیں؟

۲۔ دورانِ بارش کی صورت میں دو نمازیں جمع ہو سکتی ہیں یا نہیں؟

۳۔ جمع کی اس صورت میں سنتیں ادا کرنا پڑیں گی یا نہیں؟

۴۔ عورتیں گھر میں مردوں کی طرح مذکورہ مسئلہ پر عمل کر سکتی ہیں یا نہیں؟

جواب ۱۔ ایسی صورت میں الصلاة فی الرحال یا «اَلَا صَلُّوْا فِي الرِّحَالِ»[1] یا «صَلُّوا فِيْ بُيُوْتِكُمْ»[2] جیسے الفاظ کہے جائیں۔ حَیَّعَلتین کا بدل یا اس سے ملحق ہونے کی بنا پر بظاہر گنتی ان جیسی ہوگی، یعنی دو دو دفعہ۔ ابن عمر رحمہ اللہ کی حدیث کے مطابق اذان کے بعد بھی یہ کلمات کہنے کا جواز ہے، البتہ ایسی شکل میں بظاہر ایک دفعہ ہی کافی ہے۔

۲۔ ہمارے شیخ محدث روپڑی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ بارش کی وجہ سے جمع جائز ہے۔ نیل الاوطار میں اس پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ عبداللہ بن عمرؓ بھی جمع کر لیتے تھے جو سنت کے بڑے متبع تھے۔ جہاں شرعاً جمع کرنے کی اجازت ہو وہاں سنتیں معاف ہیں، چنانچہ ابن عباسؓ کی حدیث میں مدینہ میں جمع کرنے کا ذکر ہے اور سنتیں نہیں پڑھیں، صرف ظہر وعصر کی آٹھ رکعتیں پڑھیں اور مغرب وعشا کی سات رکعتیں پڑھی ہیں اور اس حدیث سے بارش میں جمع کرنے کا استدلال کیا جاتا ہے۔[3]

۳۔ اس کا جواب پہلے گزر چکا ہے۔

۴۔ بارش میں نمازیں جمع کرنا ایک شرعی عذر ہے جس کے لئے مسجد کا وجود شرط نہیں لہٰذا ایسی صورت میں عورتیں بھی گھر میں نمازیں جمع کر سکتی ہیں۔ ملاحظہ ہو، مجموع فتاویٰ شیخ عبدالعزیز بن عبداللہ بن باز رحمہ اللہ (ج۴ص۴۲۷)

---

[1] صحیح البخاری، بَابُ الرُّخصَةِ فِي المَطَرِ وَالعِلَّةِ أَن يُصَلِّيَ فِي رَحلِهِ، رقم: ٦٦٦

[2] صحیح البخاری، بَابُ الرُّخصَةِ إِن لَم يَحضُرِ الجُمُعَةَ فِي المَطَرِ، رقم: ٩٠١

[3] فتاوی اهلحدیث: جلد۲ ص۲۷۸

جمع تقدیم کرنے والا عشاء کی نماز مغرب کے وقت پڑھے تو وِتر کب پڑھے؟

(سوال) جمع تقدیم کرنے والا عشاء کی نماز مغرب کے وقت پڑھے تو وِتر اسی وقت پڑھ سکتا ہے یا غروبِ شفق کے بعد پڑھنا ضروری ہے۔ (ابوعبدالرحمٰن سلفی، مسجد قدس، ٹاؤن شپ)

(جواب) اس مسئلہ میں اہل علم کا اختلاف ہے۔ شافعیہ اور حنابلہ اس بات کے قائل ہیں کہ عشاء کی جمع تقدیم کی صورت میں شفق غائب ہونے سے قبل وتر پڑھے جا سکتے ہیں جب کہ مالکیہ اس بات کے قائل نہیں اور حنفیہ کے نزدیک عشاء کی جمع تقدیم ویسے ہی غیر درست ہے۔ اس کا تقاضا ہے کہ وقت سے پہلے میرے نزدیک وِتر بطریق جائز نہ ہوں۔[1]

اس صورت میں بظاہر جواز ہے کیونکہ عام حالات میں وتر عشاء کے تابع ہیں۔ واللہ اعلم بالصواب

بارش کی وجہ سے مسجد میں مغرب اور عشاء کی نمازیں جمع کرنا:

(سوال): کیا زیادہ بارش ہونے کے باعث مسجد میں مغرب اور عشاء کی نماز کو جمع کرنا جائز ہے اگر شرعی لحاظ سے جائز ہے تو مغرب اور عشاء کی سنتوں کا کیا حکم ہے؟ دلیل دے کر واضح کریں۔

(جواب): بارش کی صورت میں دو نمازوں کو جمع کرنا شرعی صریح نص سے ثابت نہیں۔ البتہ بعض نصوص سے مفہوم ہے اور بعض آثار و اقوال بھی اس امر کے مؤید ہیں۔ اس بناء پر اگر کوئی جمع کرے تو جواز ہے، لیکن اولیٰ نہیں۔ بایں صورت سنتوں کی بھی رخصت ہے۔ یہ بات ابن عباس رضی اللہ عنہما کی مشہور حدیث: «صَلَّيْتُ مَعَ رَسُولِ اللّٰهِ ﷺ بِالْمَدِينَةِ ثَمَانِيًا جَمِيعًا......الخ»[2] سے مأخوذ ہے۔ نص صریح سے ثابت ہے، کہ ایسے موقعہ پر اذان میں «اَلَا صَلُّوا فِي الرِّحَالِ»[3] کہا جائے۔ لہٰذا اسی عمل کو اختیار کرنا چاہیے۔

بارش کے بعد مغرب اور عشاء کی نمازیں جمع کرنا:

(سوال): جب بارش ہو رہی ہو یا بارش ہو چکی ہو تو مغرب اور عشاء کی دونوں نمازیں مغرب کی نماز کے وقت میں اکٹھی پڑھ لی جاتی ہیں کیا ایسا کرنا شریعت میں جائز ہے؟

جواب میں لکھا ہے کہ بارش کی صورت میں جمع کرنے کا جواز ہے۔ اگر جواز ہے تو حدیث سے ثابت

---

(1) مرعاة المفاتيح :٢/٢٠٥

(2) المعجم الكبير للطبراني، رقم:١٢٥٤٩

(3) صحيح البخاري، بَابُ الرُّخْصَةِ فِي المَطَرِ وَالعِلَّةِ أَنْ يُصَلِّيَ فِي رَحْلِهِ، رقم:٦٦٦

کریں حالانکہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا ہے کہ:«اَلَا صَلُّوا فِي رِحَالِكُم»① تم اپنے گھروں میں نماز ادا کرو۔ جزاکم اللہ احسن الجزاء۔

جواب: بعض اہلِ علم کے نزدیک بارش کی وجہ سے دو نمازوں کو جمع کیا جا سکتا ہے۔ ان کا استدلال صحیح حدیث کے مفہوم سے ہے:«مِن غَيرِ خَوفٍ وَ لَا مَطَرٍ»② یعنی ''رسول اللہ ﷺ نے خوف اور بارش کے بغیر ظہر، عصر اور مغرب اور عشاء کی نماز مدینہ میں جمع کرکے پڑھی۔'' اس سے معلوم ہوا، کہ مذکورہ عذر شرع میں معتبر ہیں، کیونکہ اگر معتبر نہ ہوتے، تو ان کی نفی کا کچھ معنی نہیں۔

صاحب المنتقیٰ نے اس پر بایں الفاظ تبویب قائم کی ہے:« بَابُ جَمعِ المُقِيمِ لِلمَطَرِ، أَو غَيرِهٖ.» پھر فرماتے ہیں کہ یہ حدیث اپنے مفہوم سے بارش، خوف اور بیماری کی وجہ سے نمازوں کے جمع کرنے پر دلالت کرتی ہے اور موطا امام مالک رحمہ اللہ میں نافع سے روایت ہے، کہ جب اُمراء مغرب اور عشاء کی نماز بارش کی وجہ سے جمع کرتے تو ابن عمر رضی اللہ عنہما بھی ان کے ساتھ جمع کرتے اور امام اثرم نے اپنی ''سنن'' میں ابوسلمہ بن عبدالرحمن سے روایت کیا ہے، کہ جب بارش کا دن ہو، تو مغرب وعشاء جمع کرنا یہ سنت میں سے ہے اور امام ترمذی رحمہ اللہ اپنی ''جامع'' میں فرماتے ہیں:

« قَالَ بَعضُ اَهلِ العِلمِ يُجمَعُ بَينَ الصَّلٰوتَينِ فِی المَطَرِ . وَ بِهٖ يَقُولُ الشَّافِعِی وَاَحمَدُ، وَ اِسحَاقُ »③

''بعض اہلِ علم کہتے ہیں کہ بارش میں نماز جمع کی جا سکتی ہے، امام شافعی، امام احمد اور امام اسحاق رحمہم اللہ بھی اس کے قائل ہیں۔''

نیز مذکور جمع کے بارے میں ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا:« أَرَادَ اَن لَا يُحرِجَ أُمَّتَهٗ»④ یعنی ''آپ ﷺ نے جمع اس لیے کی کہ امت کو مشقت نہ ہو۔''

اس بناء پر علامہ احمد شاکر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: کہ اس حدیث پر عمل کرنے سے بہت سے ان لوگوں سے مشقت رفع ہو جاتی ہے، جنھیں ان کے اعمال اور سخت قسم کے ظروف کبھی جمع کرنے پر مجبور کرتے ہیں، مگر

---

① صحیح البخاری، بَابُ الرُّخصَةِ فِی المَطَرِ وَالعِلَّةِ أَن يُصَلِّيَ فِی رَحلِهِ، رقم:٦٦٦

② سنن أبی داؤد، بَابُ الجمعِ بَينَ الصَّلَاتَينِ، رقم:١٢١١

③ سنن الترمذی، بَابُ مَا جَاءَ فِی الجَمعِ بَينَ الصَّلَاتَينِ، رقم:١٨٨

④ صحیح مسلم، بَابُ الجَمعِ بَينَ الصَّلَاتَينِ فِي الحَضَرِ، رقم:٧٠٥

شرط یہ ہے، کہ جیسا کہ ابن سیرین رحمہ اللہ نے کہا ہے: کہ عادت نہ بنائی جائے۔[1]

ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول بھی اس بات کا مؤید ہے، کہ بارش وغیرہ کے سبب نمازوں کو جمع کیا جا سکتا ہے، کیونکہ علت عدمِ مشقت بیان ہوئی ہے۔

بوجہ بارش دو نمازیں جمع کرنا:

سوال: ہمارے ہاں مسلک اہلِ حدیث کی دوسری مسجد میں بارش کے دن مغرب کے وقت جب بارش ہو چکی ہوتی ہے یا ہو رہی ہوتی ہے تو مغرب اور عشاء کی دونوں نمازیں مغرب کی نماز کے وقت میں اکٹھی پڑھ لی جاتی ہیں کیا ایسا کرنا شریعت میں جائز ہے؟

جواب: بارش کی صورت میں جمع کرنے کا جواز ہے۔ افضل یہ ہے کہ نمازیں جمع نہ کی جائیں۔

سوال: بارش اور آندھی کی صورت میں شام کی نماز کے ساتھ عشاء کو ملا کر پڑھا جا سکتا ہے؟ کیونکہ آج کل راستے میں بہت سا پانی اور کیچڑ جمع ہونے کی صورت میں مسجد میں آنا مشکل ہو جاتا ہے؟

جواب: بارش وغیرہ کے موقع پر مؤذن کو چاہیے، کہ اذان میں «صَلُّوا فِي بُيُوتِكُم»[2] کہہ کر لوگوں کو گھر میں نماز پڑھنے کی اجازت دے۔ ایسے موقع پر دو نمازوں کو جمع کرنے کا بھی جواز ہے۔ صحیح حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خوف اور بارش کے بغیر ظہر اور عصر کی نماز اور مغرب اور عشاء کی نماز مدینہ میں جمع کر کے پڑھی۔

امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ صاحب ''منتقی الاخبار'' فرماتے ہیں: کہ یہ حدیث اپنے مفہوم سے بارش، خوف اور بیماری کی وجہ سے نمازوں کے جمع کرنے پر دلالت کرتی ہے: باب جمیع المقیم للمطر، او غیرہ.

اور امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

«قَالَ بَعضُ اَهلِ العِلمِ: يُجمَعُ بَينَ الصَّلٰوتَينِ فِي المَطَرِ، وَبِهٖ قَالَ الشَّافِعِيُّ، وَ اَحمَدُ.»

یعنی ''بعض اہلِ علم بارش میں دو نمازیں جمع کرنے کے قائل ہیں۔ امام شافعی اور امام احمد نے اسی مسلک کو اختیار کیا ہے۔''

بواسیر والا شخص جمع و تقدیم کے ساتھ نمازیں ادا کر سکتا ہے؟

سوال: ایک شخص کو ایک موذی بیماری بواسیر ہے۔ جس کی وجہ سے کبھی وضو کے بعد اسی نماز میں وضو اور

① تحقیق الترمذی: ۲/۳۵۸

② صحیح البخاری، بَابُ الرُّخصَةِ إِن لَم يَحضُرِ الجُمُعَةَ فِي المَطَرِ، رقم: ۹۰۱

کپڑے میں شک ہو جاتا ہے۔ بوجہ مجبوری امامت بھی کرانی پڑتی ہے اور مجبوری بھی رہتی ہے کہ دوسرا کوئی امام بھی نہیں۔ کیا ایسا شخص نماز جمع کر کے پڑھ سکتا ہے یا نہیں؟ جمع تقدیم بھی جائز ہے یا نہیں؟ پھر ان مقتدیوں کا کیا ہوگا؟ نیز نماز جمع کرتے ہوئے سنت کا کیا حکم ہے؟ مقامی کے لیے اور مسافر کے لیے پوری تفصیل بحث ہو۔

(جواب): بواسیر میں مبتلا انسان مستحاضہ پر قیاس کرتے ہوئے جمع تاخیر کر سکتا ہے۔ اس امر کی تصریح سنن ابوداود کے «بَابُ مَن قَالَ تُجمَعُ بَینَ الصَّلٰوتَینِ » میں موجود ہے۔

جمع تقدیم کی اجازت نہیں۔ علامہ صنعانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

« وَ فِی الحَدِیثِ دَلِیلٌ عَلٰی أَنَّهٗ لَا یُبَاحُ جَمعُ الصَّلَاتَینِ فِی وَقتِ أَحَدِهِمَا لِلعُذرِ. إِذ لَو أُبِیحَ لِلعُذرِ لَکَانَتِ المُستَحَاضَةُ أَولٰی مَن یُبَاحُ لَهَا ذٰلِكَ. وَ لَم یُبَح لَهَا ذٰلِكَ بَل أَمرَهَا بِالتَّوقِیتِ کَمَا عَرَفتَ.» [1]

اس حالت میں مقتدیوں کو چاہیے کہ اپنا کوئی اور امام مقرر کرلیں جو ان کو بروقت نماز پڑھائے۔ جہاں شرعاً نمازوں کو جمع کرنے کی اجازت ہو وہاں سنتیں معاف ہیں۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت جس میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ میں نمازوں کو جمع کیا تھا، سے استدلال کیا گیا ہے۔

دو نمازیں جمع تقدیم و تاخیر کے ساتھ:

(سوال): مجھے لاہور سے کراچی جانا ہے ٹرین کا ٹائم تین بجے ہے میں دو بجے گھر سے ظہر و عصر جمع کر کے نکل سکتی ہوں؟ یا اگر میں اسٹیشن پر جا کر ادا کروں تو کیا جمع تقدیم ہو سکتی ہے اور قصر بھی یا نہیں؟

(جواب): بایں صورت دو نمازوں کی جمع تقدیم و تاخیر دونوں طرح درست ہے اور سفر شروع ہونے پر دوگانہ بھی ہو سکتا ہے۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو! بُلُوغُ المَرامِ ، بَابُ صَلَاةِ المُسَافِرِ وَالمَرِیضِ مَعَ سُبُلِ السَّلَامِ:۲/ ٤١-٤٢ ،اور فتح الباری: ۲/ ۵۸۳۔

[1] سبل السلام:۱/ ۲/ ۱۰۱

صلوٰۃ الجمعہ اور خطبۃ الجمعہ کے متعلق احکام و مسائل

جمعہ کے دن پہلی گھڑی:

سوال: حدیث میں جمعہ کے لیے جلدی جانے کی جن ساعات کا ذکر ہے، ان میں پہلی ساعت کب شروع ہوتی ہے؟ جزاک اللہ خیراً

جواب: راجح قول کے مطابق پہلی گھڑی چاشت کے وقت سے لے کر ہے۔ علامہ ابن قیم نے ''الہدیٰ'' میں فرمایا ہے: راجح قول یہ ہے کہ پہلی گھڑی کا آغاز شروع دن سے ہو جاتا ہے۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو! مرعاۃ المفاتیح: (۲/۲۹۴)

جمعہ کے دن فرشتوں کا نمازیوں کے نام درج کرنا:

سوال: صحیح بخاری جلد:۱، کِتَابُ الجُمُعَۃِ میں '' بَابُ الِاستِمَاعِ اِلَی الخُطبَۃِ '' کے تحت امام بخاری رحمہ اللہ نے یہ حدیث نقل کی ہے:

« عَن اَبِی ھُرَیرَۃَ قَالَ: قَالَ النَّبِیُّ : إِذَا کَانَ یَومُ الجُمُعَۃِ وَقَفَتِ المَلَائِکَۃُ عَلٰی بَابِ المَسجِدِ یَکتُبُونَ الْاَوَّلَ فَالْاَوَّلَ وَ مَثَلُ المُھَجِّرِ کَمِثلِ الَّذِی یَھدِی بَدَنَۃً ثُمَّ کَالَّذِی یَھدِی بَقَرَۃً ثُمَّ دَجَاجَۃً ثُمَّ بَیضَۃً فَإِذَا خَرَجَ الاِمَامُ طَوَوا صُحُفَھُم وَ یَستَمِعُونَ الذِّکرَ » [1]

اس حدیث میں لفظ ''طووا صحفھم'' کی توضیح مطلوب ہے۔ ابتدا خطبہ کے بعد آنے والے کے عدمِ اندراج سے نام کا عدمِ اندراج مراد ہے یا کہ ثواب کا؟

جواب: ابونعیم کی ''الحلیۃ'' میں ابن عمر رضی اللہ عنہما کی مرفوع روایت میں صحیفوں کی صفت یوں بیان ہوئی ہے:

« اِذَا کَانَ یَومَ الجُمُعَۃُ بَعَثَ اللّٰہُ مَلَائِکَۃً بِصُحُفٍ مِن نُورٍ وَ اَقلَامٍ مِن نُورٍ » الحدیث [2]

یعنی جمعہ کے روز اللہ تعالیٰ فرشتوں کو نورانی قلمیں اور نورانی صحیفے دے کر روانہ فرماتے ہیں۔

اس روایت سے معلوم ہوا کہ یہ فرشتے محافظ فرشتوں کے علاوہ ہیں اور طیِ صحف سے مراد وہ صحیفے ہیں

---

(1) صحیح البخاری، بَابُ الِاستِمَاعِ إِلَی الخُطبَۃِ، رقم: ۹۲۹

(2) حلیۃ الاولیاء: ۶/۳۵۱

جن کا تعلق جمعہ کی طرف جلدی آنے کی فضیلت سے ہے۔اس کے علاوہ سماعِ خطبہ اور ادراک صلاۃ، ذکر، دعا اور خشوع وغیرہ کے صحیفوں کو محافظ فرشتے قطعی طور پر لکھتے رہتے ہیں۔

چنانچہ ابن ماجہ کی ایک روایت میں ہے:« فَمَن جَآ بَعدَ ذٰلِكَ فَإِنَّمَا يَجِيءُ بِحَقٍّ إِلَى الصَّلَاةِ »①

یعنی''جو اس کے بعد آتا ہے وہ صرف ادائیگی نماز کے لیے آتا ہے۔''

ایک دوسری روایت میں ہے:

« ثُمَّ إِذَا استَمَعَ وَ اَنصَتَ غُفِرَ لَهُ مَا بَينَ الجُمعَتَينِ وَ زِيَادَةَ ثَلَاثَةِ اَيَّامٍ »②

اور ابن خزیمہ کی روایت میں ہے:

« فَيَقُولُ بَعضُ المَلَائِكَةِ لِبَعضٍ: مَا حَبَسَ فُلَانًا؟ فَتَقُولَ: اللّٰهُمَّ إِن كَانَ ضَالًّا فَاهدِهِ وَ إِن كَانَ فَقِيرًا فَاغنِهِ وَ إِن كَانَ مَرِيضًا فَعَافِهِ »③

یعنی فرشتے ایک دوسرے سے کہتے ہیں: فلاں کو کس چیز نے مسجد میں آنے سے روک لیا۔اے اللہ! اگر وہ سیدھی راہ سے برگشتہ ہے تو اسے ہدایت دے اور اگر وہ فقیر ہے تو اسے مالدار کردے اور اگر بیمار ہے تو اسے عافیت دے۔④

جمعہ قائم کرنے کا وقت کونسا ہے؟

سوال جمعہ قائم کرنے کا وقت کونسا ہے؟

جواب اقامتِ جمعہ زوالِ شمس کے بعد ہونا چاہیے۔امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی صحیح میں بایں الفاظ باب قائم کیا ہے:«باب وقت الجمعة اذا زالت الشمس» یعنی''جمعہ کا وقت آفتاب ڈھلنے کے بعد ہے''، حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

« أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ يُصَلِّي الجُمُعَةَ حِينَ تَمِيلُ الشَّمْسُ»⑤

① سنن ابن ماجه،بَابُ مَا جَاءَ فِي التَّهجِيرِ إِلَى الجُمُعَةِ،رقم:۱۰۹۲

② المعجم الاوسط،،رقم: ۷۳۹۹

③ صحيح ابن خزيمة،بَابُ ذِكرِ دُعَاءِ المَلَائِكَةِ لِلمُتَخَلِّفِينَ عَنِ الجُمُعَةِ بَعدَ طَيِّهِمُ الصُّحُفَ، رقم:۱۷۷۱

④ فتح البارى:۲/۳۶۷-۳۶۸

⑤ صحيح البخارى،بَابُ وَقتُ الجُمُعَةِ إِذَا زَالَتِ الشَّمسُ،رقم:۹۰٤

یعنی ''نبی ﷺ زوالِ شمس کے بعد جمعہ پڑھتے تھے۔'' امام موصوف نے دیگر احادیث کے علاوہ اس سے بھی استدلال کیا ہے کہ جمعہ زوال کے بعد پڑھنا چاہیے اور قبل از زوال جمعہ پڑھنے کی کوئی صحیح صریح حدیث موجود نہیں۔ [1]

آج ۹/ اپریل کو زوال نصف النہار بارہ بج کر پانچ منٹ پر ہے۔ آپ کا نقل کردہ وقتِ زوال درست نہیں۔ دوبارہ نقشوں کی طرف مراجعت کریں۔ غرض ساڑھے بارہ بجے جمعہ کا آغاز درست وقت ہے بلکہ اس سے قبل بھی ہوسکتا ہے کیونکہ آج کل زوال بارہ بج کر پانچ منٹ پر ہے۔

جمعہ کے دن زوال سے تو انکار نہیں ہوسکتا وہ تو ایک حتمی اور یقینی شے ہے۔ اس کا وقوع لازمی امر ہے ہاں کئی ایک اہل علم کے نزدیک نوافل کی بلا استثناء عمومی اجازت ہے، زوال کا اعتبار نہیں۔ اسی طرح جمعہ کی فضیلت کی گھڑیوں میں جو نماز کی ترغیب ہے وہ جواز کی واضح دلیل ہے۔ مشار الیہ روایت ابوقتادہ اگرچہ منقطع ہے کیونکہ ابو الخلیل کا ابوقتادہ سے سماع نہیں، پھر اس میں لیث بن ابی سلیم راوی ضعیف ہے لیکن بعض نے شواہد کی بنا پر اس کو بھی قابل عمل سمجھا ہے۔ [2]

بہر صورت نوافل پہلے پڑھ لیے جائیں۔ زوال کے بعد امام جمعہ کا آغاز کرے گا، صرف دو رکعت نماز ہی نہیں بلکہ خطبہ جمعہ دے گا جس طرح سنت سے ثابت ہے۔

جمعہ کے انعقاد کا وقت:

سوال: جمعۃ المبارک کے متعلق احادیث صحیحہ سے ثابت ہے کہ جمعہ بہت جلد ادا کیا جاتا تھا جب کہ بخاری شریف ''باب التبكير بالجمعة'' میں ہے کہ ہم دوپہر کا کھانا اور سونا جمعہ سے فارغ ہو کر کھاتے اور سوتے۔ ابوداؤد کی حدیث میں ہے کہ ہم جمعہ سے فارغ ہوتے تو دیواروں کا سایہ نہیں ہوتا تھا۔ آج کل بہت جگہ اہلِ حدیث حضرات بھی جمعہ ڈیڑھ بجے تا دو بجے پڑھاتے ہیں، جو مذکورہ احادیث کے خلاف ہے۔ کیا ان لوگوں کا جمعہ صحیح ہو جاتا ہے؟ بصورتِ دیگر بذریعہ تحریر عوام کو ہدایت کی جائے کہ جمعہ ایک بجے سے پہلے پہلے ادا کیا جائے۔ بینوا بالدليل توجروا من الله۔

جواب: واقعی جمعہ کا انعقاد ظہر کے ٹائم کے اندر ہونا چاہیے۔ اسے لیٹ کرنا خلاف سنت ہے۔ ائمہ وخطباء کرام کو اس امر کا التزام کرنا چاہیے۔ مقامِ خطر ہے کہیں ایسا نہ ہو حصولِ اجر دادائیگیٔ فرض کے بجائے اسے

---

[1] مرعاة المفاتيح: ۲/ ۳۰۶

[2] المرعاة: ۲/ ۵۹

ضائع کر بیٹھیں۔ أعاذنا اللہ منہا۔ باقی رہا ایک بجے کی پابندی تو یہ ضروری نہیں ہے کیونکہ اوقاتِ نماز میں کمی بیشی ہوتی رہتی ہے۔

نماز جمعہ ادا کرنے کا درست وقت کیا ہے؟

سوال نماز جمعہ ادا کرنے کا درست وقت کیا ہے؟ ہمارے ہاں جمعۃ المبارک کا خطبہ تقریباً ایک یا سوا گھنٹے کا دیا جاتا ہے اور پھر جمعۃ المبارک کی نماز دو بجے دوپہر پڑھائی جاتی ہے۔ کیا اتنا طویل خطبہ شریعت کے مطابق ہے؟

جواب جمعہ بعد از زوال ہونا چاہیے اور خطبہ مختصر ہو۔ بے جا طوالت خلافِ سنت ہے بلکہ ضائع ہونے کا اندیشہ ہے۔

جمعہ کے دن زوال:

سوال: کیا جمعہ کے دن زوال ہے یا نہیں؟

جواب: جمعہ کے دن زوال کا اعتبار نہیں۔ اس کی دلیل وہ صحیح احادیث ہیں جن سے بدونِ اعتبار زوالِ اقامت جمعہ کا جواز ملتا ہے۔ ملاحظہ ہو!"إرواء الغلیل (۳/۶۲)، عون المعبود (۱/ ۴۲۱ تا ۴۲۳)

نیز سنن ابو داؤد کی ایک روایت میں ہے:

« أَنَّهُ كَرِهَ الصَّلٰوةَ ۔ نِصفَ النَّهَارِ إِلَّا يَومَ الجُمُعَةِ وَ قَالَ إِنَّ جَهَنَّمَ تُسْجَرُ إِلَّا يَومَ الجُمُعَةِ، قَالَ أَبُو دَاؤدَ: وَ هُوَ مُرسَلٌ مُجَاهِدٌ اكبر من ابى الخليل و ابو الخليل لم يسمع عن ابى قتادة » ①

یعنی "نبی ﷺ نے ماسوا جمعہ کے نصف النہار کو نماز پڑھنا مکروہ سمجھا ہے۔ فرمایا جمعہ کے ماسوا جہنم کی آگ کو بھڑکایا جاتا ہے۔"

روایتِ ہذا اگرچہ ضعیف ہے لیکن المعروفہ میں دیگر روایات اس کی مؤید ہیں۔ ان میں بھی ضعف ہے لیکن سابقہ روایت کے ساتھ ملانے سے قوت حاصل ہو جاتی ہے۔ حافظ ابن قیم نے "زاد المعاد" میں جمعہ کے خصائص بیان کرتے ہوئے فرمایا ہے۔ جمعہ کا خاصہ یہ ہے کہ زوال کے وقت نفل نماز امام شافعی اور ان کے موافقین کے نزدیک جائز ہے اور ہمارے شیخ ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے اسی کو پسند فرمایا ہے اور ابو داؤد کی مرسل روایت کو دیگر دلائل سے تائید حاصل ہے اور امام شافعی نے اس کو اس سے تقویت دی ہے۔ ثعلبہ ابی مالک سے منقول ہے کہ نبی ﷺ کے عام اصحاب جمعہ کے دن نصف النہار کو نماز پڑھتے تھے۔

---

① سنن أبی داؤد، بَابُ الصَّلَاةِ يَومَ الجُمُعَةِ قَبلَ الزَّوَالِ، رقم: ۱۰۸۳

صاحب ''العون'' نے مسئلہ پر تفصیلی گفتگو کرتے ہوئے اختتام پر فرمایا ہے:

« وَالحَاصِلُ أَنَّ صَلَاةَ الجُمُعَةِ بَعدَ الزَّوَالِ ثَابِتَةٌ بِالْاَحَادِيثِ الصَّحِيحَةِ الصَّرِيحَةِ غَيرُ مُحتَمِلِ التَّاوِيلِ وَ قَوِيَّةٌ مِن حَيثُ الدَّلِيلِ وَ أَمَّ قَبلَ الزَّوَالِ فَجَائِزٌ أَيضًا » (وَاللّٰهُ أَعلَم) (۴۲۲/۱)

''حاصل بحث یہ ہے کہ نمازِ جمعہ زوال کے بعد صحیح صریح غیر محتمل اور قوی روایات سے دلیل کے اعتبار سے ثابت ہے اور جہاں تک زوال سے پہلے کا تعلق ہے سو یہ بھی جائز ہے۔ (واللہ اعلم)

غیر مسجد میں جمعہ کا حکم:

سوال : کیا جمعہ کے لیے ضروری ہے کہ مسجد ہی میں ادا کیا جائے یا غیر مسجد میں بھی اس کی اقامت ہو سکتی ہے؟

جواب : اقامت جمعہ ہر جگہ جائز و درست ہے۔ کیونکہ آیت ''سورۃ الجمعہ'' ہر مکلّف (جس پر شریعت کے احکامات کی پابندی لازم ہو) کو عام ہے اور بلا تخصیص ہر مقام کو شامل ہے۔ خواہ مسجد ہو یا غیر مسجد۔

''مرقاۃ'' شرح مشکوٰۃ میں ہے: ''دَلِيلُ الإفتِرَاضِ عَلَى العُمُومِ فِي الْأَمكِنَةِ''

اور سنن ابوداؤد میں حدیث ہے:

« اَلجُمُعَةُ حَقٌّ وَاجِبٌ عَلٰى كُلِّ مُسلِمٍ فِي جَمَاعَةٍ اِلَّا اَربَعَةٌ: عَبدٌ مَّملُوكٌ، أَوِ امرَأَةٌ، أَو صَبِيٌّ أَو مَرِيضٌ »[1]

یعنی نبی کریم ﷺ نے فرمایا: نماز جمعہ باستثناء، غلام، عورت، بچے اور مریض کے جماعت کی صورت میں ہر مسلمان پر حق اور واجب ہے۔

اور بعض دیگر روایات میں مسافر کو بھی مستثنیٰ قرار دیا گیا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ اقامت جمعہ کے لیے محض جماعت کا ہونا ضروری ہے (جس کا اطلاق دو یا اس سے زیادہ پر ہوتا ہے) حدیث میں ہے: « اَلاِثنَانِ فَمَا فَوقَهُمَا جَمَاعَةٌ . »[2] لہٰذا مسجد کا وجود شرط نہیں اور لفظ جمعہ بھی اسی بات کا متقاضی (تقاضا کرتا) ہے۔ مزید آنکہ جب روزانہ فرضی نمازوں کے لیے مسجد کا وجود شرط نہیں ہے تو ادائیگی جمعہ کے لیے بھی شرط نہیں ہونا چاہیے۔ بالخصوص اس قول کے مطابق جب یہ کہا جائے

---

① سنن أبی داود، بَابُ الجُمُعَةِ لِلمَملُوكِ وَالمَرأَةِ، رقم: ۱۰۶۷

② صحیح البخاری، باب: اثنَانِ فَمَا فَوقَهُمَا جَمَاعَةٌ، قبل رقم: ۶۵۸، سنن ابن ماجه، بَاب الِاثنَانِ جَمَاعَةٌ، رقم: ۹۷۲

کہ جمعہ ظہر کا بدل ہے۔ حدیث میں ہے:

« وَ جُعِلَت لِیَ الاَرضُ مَسجِدًا وَّ طَھُورًا فَاَیُّمَا رَجُلٍ مِّن اُمَّتِی اَدرَکَتهُ الصَّلٰوةُ فَلیُصَلِّ » (متفق علیه)[1]

یعنی میرے لیے ساری زمین سجدہ گاہ اور پاک کرنے والی ہے۔ پس جو شخص میری امت میں سے موجود ہو اور وقت آ جائے نماز کا تو پس پڑھ لے اسی جگہ نماز۔

نیز حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمان جاری کیا تھا: « جَمِّعُوا حَیثُ کُنتُم »[2] ''لوگو! جہاں کہیں ہو جمعہ پڑھو!'' اس سے معلوم ہوا، اقامتِ جمعہ کے لیے مسجد کی شرط نہیں۔

کیا جمعہ کی نماز کسی مکان میں ہو سکتی ہے؟

سوال: ڈنگہ شہر (ضلع گجرات) میں اہلِ حدیث کی مسجد نہ ہونے کی وجہ سے ہم فی الحال جمعہ کی نماز ایک مکان میں پڑھ رہے ہیں۔ کچھ لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ جہاں پنجگانہ نماز نہ پڑھی جائے وہاں جمعہ کی نماز نہیں ہوتی۔ کیا ہمارا جمعہ درست ہے یا نہیں؟

جواب: کسی جگہ جمعہ کی اقامت کے لیے پانچ وقتی نماز کا پایا جانا ضروری نہیں ہے بلکہ جس طرح ہر جگہ عام نماز پڑھی جا سکتی ہے اسی طرح ہر جگہ جمعہ بھی پڑھا جا سکتا ہے۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے مسئلہ ہذا کو عام بیان فرمایا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿یٰۤاَیُّھَا الَّذِینَ اٰمَنُوۡۤا اِذَا نُودِیَ لِلصَّلٰوةِ مِن یَّومِ الجُمُعَةِ فَاسعَوا اِلٰی ذِکرِ اللّٰهِ وَذَرُوا البَیعَ﴾ (الجمعة:۹)

''اے ایمان والو! جب جمعہ کے دن اذان دی جائے تو ذکر الٰہی کی طرف دوڑو اور خرید و فروخت چھوڑ دو!''

نیز حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمان جاری کیا تھا: « جَمِّعُوا حَیثُ کُنتُم »[3] ''لوگو! جہاں ہو جمعہ پڑھو'' اس سے معلوم ہوا کہ اقامتِ جمعہ کے لیے نہ کسی جگہ کی تخصیص ہے نہ اس بات کی کہ وہاں پانچ وقتی نماز

---

[1] صحیح البخاری، بَابُ قَولِ النَّبِیِّ ﷺ: جُعِلَت لِی ......الخ، رقم:۴۳۸، صحیح مسلم، باب جُعلت لی الأرض مسجدًا وطهورًا، رقم: ۵۲۱

[2] تلخیص الحبیر، مصنف ابن ابی شیبة، بَابُ مَن کَانَ یَرَی الجُمُعَةَ فِی القُرَی وَغَیرِھَا، رقم:۵۰۶۸

[3] تلخیص الحبیر، مصنف ابن ابی شیبة، بَابُ مَن کَانَ یَرَی الجُمُعَةَ فِی القُرَی وَغَیرِھَا، رقم:۵۰۶۸

پڑھی جاتی ہو۔ کیونکہ عادۃً ہر جگہ پانچ وقتی نماز کا وجود محال ہوتا ہے، لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا حکم عام ہے جو جواز کی دلیل ہے۔ لہٰذا مذکور مکان میں آپ کا جمعہ پڑھنا درست ہے۔

جمعہ فرض ہونے کی شرائط:

سوال: جمعہ فرض ہونے کی شرائط قرآن وسنت کی روشنی میں واضح کریں؟

۲۔ کون لوگ جمعہ کی فرضیت سے مستثنیٰ ہیں؟

۳۔ جہاں جمعہ فرض ہے اس کے قرب وجوار میں کتنی دور کی آبادی اس میں شامل ہے جو جمعہ کی نماز میں نہ آئیں تو گناہ گار ہوں گے؟

۴۔ اہل بادیہ کون لوگ ہیں اور ان کی آبادی کتنی ہوتی ہے جن پر جمعہ فرض نہیں ہوتا؟ اور اگر وہ لوگ نمازِ جمعہ میں نہ آئیں تو گناہ گار نہ ہوں گے۔

جواب: اقامتِ جمعہ کے لیے بنیادی شرط یہ ہے کہ وہاں جماعت کا وجود ہو۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ چار کے سوا ہر مسلمان پر جماعت میں جمعہ ادا کرنا حق اور واجب ہے۔ صرف غلام، عورت، بچہ، بیمار اس حکم سے خارج ہیں اور جماعت کا اطلاق کم از کم دو افراد پر ہوتا ہے۔

سنن ابن ماجہ میں حدیث ہے: « اِثنَانِ فَمَا فَوقَهُمَا جَمَاعَةٌ. »[1] یعنی ''دو اور دو سے زیادہ جماعت ہیں۔'' امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی صحیح'' کی تبویب میں بھی اسی بات کو ثابت کیا ہے۔[2]

۲۔ غلام عورت، بچہ اور بیمار جمعہ کے حکم سے مستثنیٰ ہیں۔ جس طرح کہ طارق بن شہاب کی سابقہ روایت میں منصوص (واضح ذکر) ہے۔ ملاحظہ ہو! مشکوٰۃ وغیرہ، باب وجوبها. "نیل الأوطار" میں امام شوکانی رحمہ اللہ نے اسی مسلک کو ترجیح دی ہے۔

۳۔ جمہور اہلِ علم اس بات کے قائل ہیں کہ ہر اس شخص پر جمعہ فرض ہے جسے آواز سنائی دے یا سامع (سننے والے) کی قوت میں آتا ہو۔ شہر کے اندر ہو یا باہر۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

« وَالَّذِی ذَهَبَ إِلَیهِ الجَمهُورُ أَنَّهَا تَجِبُ عَلٰی مَن سَمِعَ النِّدَاءَ أَو کَانَ فِی قُوَّةِ السَّامِعِ سَوَاءٌ کَانَ دَاخِلَ البَلَدِ وَ خَارِجَهُ وَ مَحَلُّهُ، کَمَا صَرَّحَ بِهِ الشَّافِعِیُّ أَمَّا إِذَا کَانَ المُنَادِی صَیِّتًا وَالأَصوَاتُ هَادِیَةٌ وَالرَّجُلُ سَمِیعًا »[3]

---

[1] سنن ابن ماجه، بَاب الِاثنَانِ جَمَاعَةٌ، رقم: ۹۷۲

[2] صحيح البخارى، بابٌ: اثنَانِ فَمَا فَوقَهُمَا جَمَاعَةٌ، قبل رقم: ۶۵۸

[3] فتح البارى (۳۸۵/۲)

سنن ابوداؤد میں حدیث ہے: " إِنَّمَا الجُمُعَةُ عَلٰی مَن سَمِعَ النِّدَاءَ "[1] ''جمعہ صرف اس پر ہے جس کو اذان سنائی دے۔'' لیکن روایتِ ہذا کے رفع اور وقف میں اختلاف ہے۔

لیکن اس کی تائید اُمّ مکتوم کی روایت سے ہوتی ہے۔

«هَل تَسمَعُ النِّدَاءَ بِالصَّلَاةِ؟ قَالَ: نَعَم، قَالَ: فَاَجِب» [2]

۴۔ جنگل کے رہائشی کو اہل بادیہ کہا جاتا ہے۔ راجح مسلک کے مطابق صرف ایک فرد پر جمعہ فرض نہیں اس سے زائد افراد کو جمعہ پڑھنا چاہیے۔

نماز جمعہ کے لیے مسجد اور خطبہ جمعہ شرط ہے؟

سوال نماز جمعہ کے لیے مسجد اور خطبہ جمعہ شرط ہے یا بوقتِ ضرورت ان کے بغیر بھی نماز جمعہ ادا ہوسکتی ہے؟

جواب: جمعہ کے لیے خطبہ شرط ہے۔ نبی اکرم ﷺ دو خطبے ارشاد فرمایا کرتے تھے۔ صحیح احادیث میں اس کی تصریح موجود ہے۔ البتہ مسجد کا وجود ضروری نہیں۔ فقیہ ابن قدامہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

« وَلَا يُشتَرَطُ لِصِحَّةِ الجُمُعَةِ إِقَامَتُهَا فِي البُنيَانِ. وَ يَجُوزُ فِيمَا قَارَبَهُ مِنَ الصَّحرَاءِ.»

''جمعے کی اقامت کے لیے عمارت شرط نہیں قریبی جنگل میں بھی جائز ہے۔''

حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ نے پہلا جمعہ انصار کو "هزم النبيت" وادی میں پڑھایا تھا۔ جو ''نقیع الخضمات'' میں واقع ہے۔[3]

نمازِ جمعہ کی جماعت کے لیے امام کے علاوہ ایک آدمی کافی ہے یا دو؟

سوال: جمعے کی جماعت کے لیے امام کے علاوہ ایک آدمی کافی ہے یا دو ہونے چاہییں؟ شیخ ابن باز رحمہ اللہ وغیرہ اہل علم تین افراد کے جو قائل ہیں اس کی کیا حیثیت ہے؟

جواب: صحیح بات یہ ہے، کہ اقامتِ جمعہ کے لیے کسی عدد کی شرط نہیں، شرع میں جماعت کا قیام کم از کم امام اور مقتدی سے چوں کہ حاصل ہو جاتا ہے، اس لیے اسی عدد سے جمعہ کی اقامت بھی جائز ہے۔

---

[1] سنن أبي داؤد، بَابُ مَن تَجِبُ عَلَيهِ الجُمُعَةُ، رقم: ١٠٥٦

[2] صحيح مسلم، بَابُ يَجِبُ إِتيَانُ المَسجِدِ عَلٰی مَن سَمِعَ النِّدَاءَ، رقم: ٦٥٣، سنن النسائي، بَابُ المُحَافَظَةُ عَلَى الصَّلَوَاتِ حَيثُ يُنَادَى بِهِنَّ، رقم: ٨٥٠

[3] المغني: ٣/٢٠٩

امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی ''صحیح'' میں بایں الفاظ باب قائم کیا ہے:'' بَابُ اثنَان فَمَا فَوقَهُمَا جَمَاعَةٌ '' پھر مالک بن حویرث رضی اللہ عنہ کی روایت: « إِذَا حَضَرَتِ الصَّلَاةُ فَاذِّنَا ، وَ أَقِيمَا ، ثُمَّ لِيَؤُمَّكُمَا أَكبَرُكُمَا »[1] سے استدلال کیا ہے، کہ جماعت کا وجود امام اور مقتدی سے حاصل ہو جاتا ہے۔حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:''اس حدیث سے استدلال کیا گیا ہے، کہ جماعت کم از کم امام اور مقتدی سے حاصل ہو جاتی ہے۔مقتدی چاہے آدمی ہو یا بچہ یا عورت۔''[2]

علامہ شوکانی رحمہ اللہ رقمطراز ہیں:

« وَ لَم يَأتِ نَصٌّ مِن رَسُولِ اللّٰهِ ﷺ بِأَنَّ الجُمُعَةَ لَا تَنعَقِدُ إِلَّا بِكَذَا. وَ هٰذَا القَولُ هُوَ الرَّاجِحُ عِندِی »[3]

''اقامت جمعہ کے لیے بطورِ نص رسول اللہ ﷺ سے کوئی عدد ثابت نہیں۔ میرے نزدیک یہی قول راجح ہے۔''

سماحۃ الشیخ ابن باز رحمہ اللہ نے جو عدد ذکر فرمایا ہے، اس کی بناء اس بات پر ہے، کہ استماعِ خطبہ کے لیے سامعین کا عدد ہونا چاہیے۔لیکن ظاہرِ نصوص پہلے مسلک کا مؤید ہے۔ (كَمَا تَقَدَّمَ)

جمعہ کی ادائیگی کا مسنون طریقہ:

سوال: عرض ہے کہ بندہ کو ایک اہلحدیث مسجد میں نماز جمعہ پڑھنے کا موقع ملا، ساڑھے بارہ بجے پہلی اذان ہوئی پونے ایک بجے امام صاحب نے تقریر شروع کردی۔ساتھ ہی لوگوں نے سنتیں قبل از جمعہ والی پڑھ کر تقریر سننا شروع کردی دو بجے اذان ہوئی۔امام صاحب نے صرف ایک ہی خطبہ پڑھا یعنی درمیان میں بیٹھے نہیں بعد میں ایک آدمی نے اقامت کہی مگر الفاظ وہرائے نہیں بلکہ ''اللہ اکبر'' کے سوا تمام الفاظ صرف ایک ہی بار ادا کیے، بعد میں جماعت کھڑی ہوگئی کیا یہ طریقہ صحیح ہے؟ اگر صحیح ہے تو ثبوت کے ساتھ جواب دیں۔کیا خطبہ دو حصوں میں نہیں ہونا چاہیے؟ کیا اقامت کے الفاظ کو لوٹایا نہیں جاتا اگر نہیں تو کیا جو ایسے کرتے ہیں وہ کس دلیل کی بناء پر کرتے ہیں؟

جواب: جمعہ کی ادائیگی کا مسنون طریقہ یہ ہے کہ خطیب کے منبر پر جلوہ افروز ہونے کے وقت اذان کہی جاتی

---

[1] صحيح البخاری، باب :اثنَانِ فَمَا فَوقَهُمَا جَمَاعَةٌ، رقم:٦٥٨

[2] فتح الباری:١٤٢/٢

[3] نيل الأوطار:٢٤٧/٣

ہے، پھر خطیب دو خطبے پڑھتا ہے۔ دونوں کے درمیان بیٹھ کر وقفہ کیا جاتا ہے۔ جس کا اندازہ بعض اہلِ علم نے سورۂ اخلاص کی تلاوت کے بقدر کیا ہے۔ بعد از فراغت خطبۂ ثانیہ اور پھر اقامت کہی جاتی ہے۔ راجح مسلک کے مطابق اس کے تمام کلمات اکہرے ہیں سوائے ''اللہ اکبر'' اور ''قد قامت الصلوة'' کے۔ وہ دو دو دفعہ ہیں، پھر امام دو رکعت نماز پڑھاتا ہے جن میں مخصوص سورتوں "الأعلى، الغاشيه يا الجمعه، المنافقون" کا بالترتیب اہتمام ہونا چاہیے۔

یاد رہے اگر منبری اذان سے قبل عثمانی اذان کا اضافہ کرلیا جائے تو یہ بھی جائز ہے، اس کا مقصود قبل از وقت لوگوں کو اطلاع دینا ہے۔ تاکہ نمازی جمعہ کے لیے بروقت مسجد میں پہنچ سکیں اور جہاں تک پہلی سنتوں کا تعلق ہے تو جمعہ سے قبل مخصوص سنتیں نہیں، البتہ مطلق نوافل حسبِ استطاعت پڑھے جاسکتے ہیں۔

یہ ہے رسول اللہ ﷺ کے خطبے اور نماز کی کیفیت۔ اس کے علاوہ مزعومہ (غیر مسنون) طریقہ جو بھی ہو وہ مردود ہے۔ اس کا مرتکب مبتدع (بدعتی) ہے۔

صحیح حدیث میں ہے: « مَن اَحدَثَ فِی اَمرِنَا هٰذَا مَا لَیسَ مِنهُ فَهُوَ رَدٌّ .»[1]

''جو دین میں اضافہ کرے وہ مردود ہے''

خطبہ جمعہ سے قبل نوافل پڑھنا:

سوال: بعض مساجد میں لوگ سستی سے وقت کا انتظار کرتے رہتے ہیں کہ دوسری اذان میں پہنچ جائیں گے کہ اگر کوئی جواز ہو کہ پہلے اذان دے کر لوگ نوافل سنتیں ادا کرتے رہیں پھر دوسری اذان دے کر خطبہ مسنونہ شروع کیا جائے، آنے والا دو رکعت بھی پڑھ لے۔ اس کے مشروع ہونے یا غیر مشروع ہونے کی بحث تفصیلی شائع فرما کر عنداللہ ماجور ہوں؟

جواب: جمعہ کی اذان اصلاً ایک ہے اذانِ عثمانی کا محض جواز ہے، اور خطبہ جمعہ سے قبل نوافل پڑھنے کا تعلق اذان سے نہیں۔ جب بھی انسان مسجد میں آئے حسب مقدور نوافل پڑھ سکتا ہے۔ موضوع ہذا پر تفصیلی فتویٰ ''الاعتصام'' میں پہلے شائع ہو چکا ہے۔

موذن اور خطیب منبری اذان کے بعد دو رکعت کب پڑھیں؟

سوال: موذن اور خطیبِ جمعہ منبری اذان کے بعد دو رکعت پڑھیں گے یا کب پڑھیں گے کہ ان کا عمل اس

[1] صحيح البخاري بَابُ إِذَا اصطَلَحُوا عَلَى صُلحِ جَورٍ فَالصُّلحُ مَردُودٌ، رقم: ٢٦٩٧

حدیث کے مطابق ہو کہ ''ہر اذان اور اقامت کے درمیان دو رکعت ہے۔''

جواب منبری اذان کے بعد دو رکعتیں پڑھنا کتاب و سنت سے ثابت نہیں، البتہ اس موقعہ پر اگر کوئی آدمی باہر سے آئے تو وہ دو رکعتیں تحیۃ المسجد پڑھ کر بیٹھے۔

مسجد میں موجود شخص کے لیے اذانِ منبری کے بعد دو رکعت پڑھنا ضروری ہے؟

سوال: جو شخص پہلے سے مسجد میں موجود ہو، وہ اس حدیث پر عمل کرنے کی غرض سے اذانِ منبری کے بعد دو رکعت پڑھے گا یا نہیں؟

جواب خطبہ جمعہ چونکہ نماز کے قائم مقام ہے، اس لئے نئے سرے سے نماز کی ضرورت نہیں سمجھی گئی۔

لوگوں کو اکٹھا کرنے کے لیے خطبہ شروع کرنے سے پہلے ٹیپ لگانا:

سوال: جمعہ سے پہلے لوگوں کو اکٹھا کرنے کے لیے کیا خطبہ شروع کرنے سے پہلے ٹیپ لگا کر کسی عالم کی تقریر سنانا یا تلاوت اور نعت لگانا جائز ہے؟ اسی طرح عیدین کی نماز سے پہلے ٹیپ لگانا وغیرہ یا تقریر کرنے کا کیا حکم ہے؟

جواب: اقامت جمعہ یا عیدین سے قبل کسی قسم کی محفل نہیں جمانی چاہیے۔

کیا مسنون خطبہ میں ونومن به ونتوکل علیه کے الفاظ صحیح سند سے ثابت ہیں؟

سوال: مسنون خطبہ میں الفاظ ونومن به ونتوکل علیه صحیح سند سے ثابت ہیں؟ لفظ اشهد صرف واحد کے صیغہ سے ہی ہے یا جمع سے بھی؟ لفظ یُضْلِلْ کے ساتھ ضمیر ''ہ'' کا اضافہ ثابت ہے؟

جواب مسنون خطبہ میں ونومن به ونتوکل علیه کے اَلفاظ ثابت نہیں۔ یہ الفاظ ''تاریخ بغداد'' میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی روایت میں ہیں لیکن سند کے اعتبار سے سخت ضعیف ہیں۔

اور لفظ اَشْهَدُ مفرد کے صیغہ سے ہی ثابت ہے، بطورِ صیغہ جمع نہیں۔

لفظ یُضْلِلْ کے ساتھ ''ہ'' ضمیر کا اضافہ ثابت نہیں، مذکورہ روایت صحیح مسلم (۱۱/۳)، سنن نسائی (۲۳۴/۱)، سنن بیہقی (۲۱۴/۳) اور مسند احمد (۳۱۹/۳، ۳۷۱) میں موجود ہے۔

جمعہ کے دونوں خطبوں میں برابری یا کمی بیشی کی کوئی دلیل ہے؟

سوال کیا جمعۃ المبارک کے دونوں خطبوں کا مساوی ہونا طریق نبوی ہے یا ہمارا موجودہ رواج (پہلا

خطبہ طویل اور دوسرا مختصر) سنت ہے۔صحیح احادیث سے جواب دیں۔

(جواب) جمعہ کے دونوں خطبوں میں برابری یا کمی بیشی کی کسی حدیث میں تصریح موجود نہیں۔ظاہر یہ ہے کہ جس پر خطبہ کا اطلاق ہو وہ کافی ہے، اگرچہ آپس میں ان کی مساوات نہ ہو۔راجح مسلک کے مطابق خطبہ کا اطلاق اللہ کی تعریف اور وعظ وتذکیر پر ہوتا ہے۔ [1]

دونوں خطبوں کی برابری کا حکم:

(سوال) : رسول اللہ ﷺ کی سنت ہے کہ خطبہ جمعہ دو ہوتے ہیں لیکن ہمارے علماء اس سنت پر اس طرح عمل کرتے ہیں کہ پون گھنٹہ کے خطبہ میں ۴۲ منٹ میں ایک خطبہ اور بقیہ تین منٹ میں دوسرا مکمل خطبہ اور کبھی کبھی تو صرف اضافی دو تین منٹ میں مکمل کرتے ہیں۔کیا یہ بنی اسرائیل کی ہفتہ کے دن کی تاویل کی مماثلت نہیں؟

(جواب) : بلاریب صحیح احادیث سے جمعہ کے دو خطبے ثابت ہیں۔لیکن دونوں خطبوں کی برابری کسی حدیث سے ثابت نہیں۔ بظاہر مطلق احادیث کی بناء پر دونوں خطبوں میں کمی بیشی کا جواز ہے۔البتہ اتنا ضرور ہے کہ عرف میں انھیں خطبے کہا جا سکے۔خطبہ کے بنیادی عناصر اللہ تعالیٰ کی حمد وثناء اور وعظ ونصیحت ہے اس کی تکمیل جتنے منٹوں میں بھی ہو سکے درست ہے۔نیز چھوٹے خطبہ کو یہود کے فعل کے مماثل قرار دینا درست نہیں۔کیونکہ یہودیوں نے حیلہ سے حرام کو حلال کرنے کی سعی کی تھی۔جب کہ زیرِ بحث مسئلہ میں قطعاً ایسی کوئی صورت موجود نہیں۔مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: مرعاۃ المفاتیح:۲/ ۳۰۸، ۳۰۹.

جمعہ کے روز امام کا تین خطبے سنانا:

(سوال) : ایک مسجد میں جمعہ کے روز امام تین خطبے سناتے ہیں، پہلے خطبے کو تقریر کہتے ہیں۔جو تقریباً ڈیڑھ بجے تک جاری رہتا ہے اور دو خطبے کھڑے ہو کر پڑھتے ہیں اور نماز میں بہت چھوٹی سورت پڑھتے ہیں اور نماز جلدی جلدی ختم کرتے ہیں۔بیٹھ کر ایک خطبہ اور دو خطبے کھڑے ہو کر پڑھنا،اس کا جواب قرآن وحدیث کے مطابق ارسال فرمائیں؟

(جواب) : دراصل بات یہ ہے کہ حنفی مذہب میں خطبۂ جمعہ غیر عربی زبان میں ناجائز ہے اور عامۃ الناس چونکہ عربی زبان کو سمجھنے سے قاصر ہیں۔اس بناء پر انھوں نے خطبۂ جمعہ سے قبل مقامی زبان میں تقریر نامی بدعت

---

[1] المرعاۃ:۱/ ۳۱۰

جاری کی، جس کا شریعتِ اسلامیہ میں قطعاً کوئی وجود نہیں۔ اس کے ایجاد کا سبب یہ تھا، کہ اہلِ حدیث مساجد میں مقامی زبانوں میں خطبہ ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ عوام کا رُجحان اس کی طرف ہو گا جس کی بات کو وہ سمجھ پائیں اور حنفیوں کے ہاں خطبۂ جمعہ غیر عربی میں غیر درست ہے، لہٰذا لوگوں کی دلجوئی اور توجہ کو اپنی طرف مرکوز کرنے کے لیے تقریر کی بدعت کو شروع کیا گیا۔ جمعے کے خطبے صرف دو ہیں۔ تیسرے کا کوئی وجود نہیں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو دین میں تفقہ کی توفیق بخشے۔ (آمین)

پھر جمعہ کی نماز میں قرأتِ مسنونہ یعنی مخصوص سورتوں کی تلاوت کا اہتمام ہونا چاہیے۔ جس طرح کہ صحیح روایات میں تصریح ہے۔ حنفی مذہب میں اس کا بھی التزام نہیں۔ نیز نبی ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے:

« إِنَّ طُولَ صَلَاةِ الرَّجُلِ، وَقِصَرَ خُطْبَتِهِ، مَئِنَّةٌ مِنْ فِقْهِهِ» [1]

یعنی ''آدمی کا نماز کو لمبا کرنا اور خطبہ چھوٹا کرنا، اس کی فقاہت کی علامت ہے۔''

اس سے معلوم ہوا نماز کو مختصر کرنے کے بجائے قرأت میں طوالت ہونی چاہیے۔ پھر قیام، رکوع، سجود اعتدال وغیرہ نہایت اطمینان سے ادا ہونے چاہئیں۔ نہایت افسوس سے کہنا پڑھتا ہے، کہ حنفی مذہب میں نماز میں اطمینان بھی ضروری نہیں۔

اصل بات یہ ہے، کہ جب تک انسان دائرۂ تقلیدِ شخصی سے آزاد نہ ہو، اتباعِ سنت کا صحیح جذبہ موجزن ہونا محال ہے۔

یہ بھی یاد رہے اصل یہی ہے، کہ جمعہ کا خطبہ کھڑے ہو کر دیا جائے۔ حنفی بیٹھ کر تقریر اس لیے کرتے ہیں کہ یہ جمعہ سے غیر متعلقہ شے ہے۔ ﴿وَاللّٰهُ يَهْدِي مَن يَشَاءُ إِلَىٰ صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ﴾(البقرۃ:۱۴۲)

کیا خطبہ جمعہ میں سورۃ ''ق'' مکمل یا اس کی کچھ آیات پڑھنا ضروری ہے؟

سوال کیا خطبہ جمعتہ المبارک میں سورۃ ''ق'' مکمل یا اس کی کچھ آیات پڑھنا ضروری ہیں۔ کیا اس کے بغیر خطبہ جمعہ خلافِ سنت ہوگا؟ صحیح حدیث کی روشنی میں وضاحت فرمائیں؟ صحیح مسلم میں اُم ہشام بنت حارثہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے: « يَقْرَؤُهَا كُلَّ يَوْمِ جُمُعَةٍ عَلَى الْمِنْبَرِ، إِذَا خَطَبَ النَّاسَ» [2] کہ نبی کریم ﷺ ہر جمعہ جب لوگوں کو خطبہ دیتے تو اس سورۃ کی تلاوت فرماتے، اس حدیث کا مفہوم کیا ہوگا؟

جواب اس حدیث کے تحت علامہ صنعانی رحمہ اللہ ''سبل السلام'' میں فرماتے ہیں کہ ''اس میں اس امر کی

---

[1] صحیح مسلم، بَابُ تَخْفِيفِ الصَّلَاةِ وَالْخُطْبَةِ، رقم: ۸۶۹

[2] صحیح مسلم، بَابُ تَخْفِيفِ الصَّلَاةِ وَالْخُطْبَةِ، رقم: ۸۷۳

دلیل ہے کہ ہر جمعہ کے خطبہ میں سورۃ قٓ کی تلاوت کرنا مشروع ہے۔ علماء نے کہا کہ اس سورۃ کو اختیار کرنے کا سبب یہ ہے کہ اس میں بعث، موت، سخت قسم کے مواعظ اور شدید تنبیہات کا بیان ہے۔ اس سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ خطبہ میں قرآن کا کچھ حصہ پڑھنا چاہے اور اس پر اجماع ہے کہ سورۃ ''ق'' مکمل یا اس کا بعض حصہ خطبہ میں پڑھنا واجب نہیں'' (۱۳۹/۳)

اور آپ ﷺ کا اس سورۃ کی عادت اپنانا وعظ و نصیحت میں دل پسند انداز کو اختیار کرنے کی بنا پر ہے۔ اس میں اس بات کی بھی دلیل ہے کہ وعظ کو بار بار لوٹایا جا سکتا ہے۔ لہٰذا اس حدیث میں ''جمعہ'' سے مراد وہ جمعے ہیں جن میں اُمّ ہشام شریک تھیں۔[1] اس کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ عورت پر ویسے بھی جمعہ فرض نہیں اور ماہواری کے ایام میں رکاوٹ کا سبب بن جاتے ہیں۔ اس لئے وہ تمام جمعوں میں شرکت ہی نہیں کر سکتی۔

خطباء کے لیے لمبے لمبے القابات کے ساتھ اعلان کرنا کیسا ہے؟

سوال خطبہ جمعہ کے لئے صبح شام خطبا حضرات کا لمبے لمبے القابات کے ساتھ بار بار اعلان کرنا شرعی لحاظ سے کیسا ہے؟

جواب: بلاشبہ ہر صاحب علم کا اِحترام و اکرام مسلم ہے۔ حقدار کو اس کا حق ملنا چاہئے، لیکن واقعہ کے خلاف فضول اَلقابات سے کسی کو نوازنا یا مبالغہ آرائی سے کام لینا اپنے کو ہلاکت میں ڈالنا ہے۔ مثلاً یوں کہا جائے خطیبِ مشرق و مغرب یا خطیبِ ارض و سماء وغیرہ۔ بہرصورت اس میں کوئی شک نہیں کہ ہمارے ہاں جوشیلی اور حواس باختہ فضاء میں اِصلاح کی شدید ضرورت ہے۔ مصلحین کو آگے بڑھ کر یہ فرض ادا کرنا چاہئے۔ ہر دو کا اس میں ہی بھلا ہے۔

معاشرہ میں اس حد تک بگاڑ پیدا ہو چکا ہے کہ بعض حریص اور رلالچی مولوی اپنے پسندیدہ القاب لکھ کر لوگوں کے حوالے کرتے ہیں کہ ان آداب کے ساتھ جلسہ کا اشتہار شائع کراؤ جس میں میرا نام سب سے اوپر یا درمیان میں موٹا اور سب سے نمایاں ہونا چاہئے اور بعض حضرات جلسوں میں مخصوص اَفراد مقرر کرتے ہیں تاکہ وہ دورانِ تقریر حسبِ منشا پسندیدہ نعروں سے ان کا پیٹ بھر سکے۔ اس طرزِ عمل پر جتنا بھی افسوس کا اظہار کیا جائے کم ہے۔ ہمارے مقابلہ میں عربوں کا مزاج آج بھی سادگی پسند ہے، مبالغہ آرائی سے بے حد نفرت کرتے ہیں اور فضول اَلقاب سے کوسوں دور ہیں۔ اللہ ربّ العزت ہم میں بھی صحیح سمجھ پیدا فرمائے تاکہ ہم

[1] المرعاۃ: ۲/ ۳۱۰

دنیا و آخرت میں سرخرو ہو سکیں۔

کیا خطیب وعظ، نصیحت، سیاسی گفتگو غیر عربی زبان میں پڑھ سکتا ہے؟

سوال: کیا نمازِ جمعہ سے قبل وعظ و نصیحت و سیاسی گفتگو اور تقریر کو صحیح خطبہ جمعہ قرار دینا کسی صحیح دلیل سے ثابت ہے؟ جب کہ نبی ﷺ سے اور سلف صالحین سے خطبہ جمعہ صرف عربی زبان میں ثابت ہے۔ اپنی اپنی مختلف زبانوں میں خطبہ جمعہ دینا کیونکر جائز و سنت ہے؟ جب کہ پوری دنیا میں نماز صرف عربی میں ہوتی ہے اس کے علاوہ جائز نہیں تو یہاں ردّ و بدل کس دلیل سے؟

جواب: جمعہ کا خطبہ غیر عربی زبان میں دینا جائز و درست ہے۔ چنانچہ صحیح مسلم میں حضرت جابر بن سمرۃ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

« كَانَت لِلنَّبِيِّ ﷺ خُطبَتَانِ ، يَجلِسُ بَينَهُمَا يَقرَأُ القُرآنَ، وَ يُذَكِّرُ النَّاسَ.»[1]

یعنی نبی ﷺ کے دو خطبے ہوتے تھے۔ ان کے درمیان بیٹھتے۔ ان میں آپ قرآن مجید پڑھتے اور لوگوں کو وعظ و نصیحت فرماتے تھے۔

ظاہر ہے کہ تذکیر اسی زبان میں ہوگی جس کو سامع سمجھتا ہو۔ اسی حکمت و مصلحت کے پیشِ نظر اللہ عزوجل نے انبیاء علیہم السلام کو ہم زبان لوگوں میں مبعوث فرمایا۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَ مَآ اَرسَلنَا مِن رَّسُولٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَومِهٖ لِيُبَيِّنَ لَهُم ﴾ (ابراھیم: ٤)

''اور ہم نے کوئی پیغمبر نہیں بھیجا مگر اپنی قوم کی زبان بولتا تھا۔ تاکہ انھیں (احکامِ الٰہی) کھول کھول کر بتا دے۔''

مزید آنکہ لفظِ خطبہ بھی خطاب کا متقاضی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ خطیب کے بالمقابل ایسے لوگ ہونے چاہئیں جو اس کی بات اور گفتگو کا اِدراک و شعور رکھتے ہوں۔ ورنہ ساری بات چیت لاحاصل، اور بے فائدہ اور جانور کے گلے میں ڈھول لٹکانے کے مترادف ہے۔ یہ اسی صورت میں ممکن ہے جب خطیب مقامی لوگوں کی زبان کو محوِ گفتگو بنائے۔ یہی وجہ ہے کہ فرد کا تصورِ خطبہ بلا سامع (خطبہ کا تصور بغیر سننے والے کے) ناممکن ہے۔ اس میں عدد وہی شرط ہے جو اقامتِ جماعت میں ہے۔

«اَلِاثنَانِ فَمَا فَوقَهُمَا جَمَاعَةٌ»[2] یعنی دو فما فوق (اور دو سے اوپر) جماعت ہے۔ بالفرض

[1] صحیح مسلم، بَابُ ذِكرِ الخُطبَتَينِ قَبلَ الصَّلَاةِ وَمَا فِيهِمَا مِنَ الجَلسَةِ، رقم: ٨٦٢

[3] صحیح البخاری، بابٌ: اِثنَانِ فَمَا فَوقَهُمَا جَمَاعَةٌ، قبل رقم: ٦٥٨

اگر کوئی خطیب اپنے سامنے چوپائے باندھ کر جوہرِ خطابت دکھاتا رہے تو اس کا نام خطبہ نہیں رکھا جا سکتا کیونکہ فہم مفقود ہے۔ پھر حالتِ خطبہ میں نبی ﷺ کی صفات میں وارد ہے کہ آواز بلند ہو جاتی، غصہ سخت ہو جاتا اور آنکھیں سرخ ہو جاتیں۔ گویا آپ فوجِ دشمن سے ڈرانے والے ہیں۔ یہ اس صورت میں ہوتا ہے جب خطیب کی توجہ کا مرکز سامع فہیم ہو۔

نیز خطبہ جمعہ کو نماز پر قیاس کرنا بھی صحیح نہیں کہ جیسے نماز بغیر عربی کے نہیں پڑھی جاسکتی اسی طرح خطبہ بھی بلا عربی نہیں ہونا چاہیے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ نماز میں مناجات مقصود ہے جب کہ خطبہ تذکیر کے لیے ہوتا ہے۔ صحیح مسلم میں حدیث ہے:

« إِنَّ هٰذِهِ الصَّلَاةَ لَا يَصِحُّ فِيهَا مِن كَلَامِ النَّاسِ إِنَّمَا هِيَ التَّسبِيحُ وَالتَّكبِيرُ وَ قِرَاءَةُ القُرآنِ » [1]

یعنی ''نماز میں بات چیت درست نہیں کیونکہ نماز صرف تسبیح، تکبیر اور قرأتِ قرآن کا نام ہے۔''

باقی رہا سلف صالحین کا عمل تو اس بارے میں عرض ہے کہ سلف میں مختلف قسم کے نظریے پائے جاتے ہیں۔ بعض عدمِ جواز کے قائل ہیں اور بعض بامر مجبوری جواز کے قائل ہیں اور اگر بالفرض عمل نہ بھی ہو تو بھی کوئی حرج نہیں۔ اس کے نظائر (مثالیں) موجود ہیں مثلاً: خیر القرون کی جملہ تصانیف بزبان عربی تھیں مدت بعد یہ سلسلہ مختلف زبانوں میں منتقل ہو گیا۔ حتی کہ کلامِ الٰہی کے تراجم و تفاسیر غیر عربی میں ہونے لگ گئے۔ لہٰذا دلائل کا اصل محور کتاب وسنت ہے نہ کہ عمل کرنے والے کا عمل۔ سو اس کی وضاحت ہو چکی، مزید آنکہ اس کے کچھ عوامل بھی ہو سکتے ہیں۔ مثلاً:

① اسلامی سلطنت کے غلبہ کی وجہ سے لوگوں نے زیادہ تر عربی زبان ہی اختیار کر لی تھی یا کم از کم اگر نطق نہیں تو فہم ضرور رکھتے تھے۔ اس بناء پر سلف نے غیر عربی میں تالیفات کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی، یہی وجہ خطبۂ جمعہ کی بھی ہو سکتی ہے۔

② اس زمانے میں امامِ جمعہ اور عید چونکہ امراء ہوتے تھے۔ ممکن ہے ان کے خیال میں بہتر یا ضروری خطبہ عربی میں ہو اور جس کے نزدیک مخاطب کا لحاظ ضروری ہے ان کو امارت (حکومت کرنے) کا اتفاق نہ ہو سکا ہو۔

③ عربی زبان کا تحفظ مقصود تھا کہ کہیں غیر زبانوں سے مل کر اپنا مقام نہ کھو جائے اور جب قواعد وضوابط

[1] صحیح مسلم، بَابُ تَحرِيمِ الكَلَامِ فِي الصَّلَاةِ، وَنَسخِ مَا كَانَ مِن إِبَاحَتِهِ، رقم: ٥٣٧

تالیفی شکل میں منضبط ہو گئے تو اجازت کی صورت نکل آئی۔

خطبات جمعہ میں دو مختلف موضوع ہونا:

(سوال) خطبات جمعہ میں دو مختلف موضوع ہونا بہتر ہے یا دونوں خطبوں کو صرف وقفہ کر کے دو کر دینا کافی ہے؟

(جواب): یہ خطیب کی مرضی پر منحصر ہے۔ شرع میں ایسی کوئی پابندی نہیں کہ خطبہ کا موضوع ایک ہو یا مختلف دونوں طرح مساوی طور پر جائز ہے، بہتر کا کوئی مسئلہ نہیں۔

خطبہ یا تقریر بیٹھ کر یا کھڑے ہو کر؟

(سوال): خطبہ یا تقریر بیٹھ کر یا کھڑے ہو کر کرنی چاہیے؟ بعض حضرات بیٹھ کر خطبہ اور تقریر کرتے ہیں۔

(جواب): جمعہ کا خطبہ کھڑے ہو کر دینا چاہیے۔ صحیح مسلم میں حضرت جابر بن سمرة رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے:

« كَانَ ﷺ يَخطُبُ قَائِمًا، ثُمَّ يَجلِسُ، ثُمَّ يَقُومُ فَيَخطُبُ قَائِمًا، فَمَن نَبَّأَكَ أَنَّهُ كَانَ يَخطُبُ جَالِسًا فَقَد كَذَبَ، فَقَد وَاللهِ صَلَّيتُ مَعَهُ أَكثَرَ مِن أَلفَى صَلَاةٍ »[1]

یعنی ''نبی ﷺ کھڑے ہو کر خطبہ ارشاد فرماتے تھے، پھر بیٹھ جاتے، پھر کھڑے ہو کر خطبہ دیتے۔ پس جس نے تجھے خبر دی کہ آپ ﷺ بیٹھ کر خطبہ دیتے تھے، اس نے جھوٹ بولا۔ اللہ کی قسم! میں نے آپ ﷺ کے ساتھ دو ہزار سے زیادہ نمازیں پڑھی ہیں۔''

اور صحیح مسلم کی دوسری روایت میں ہے کہ کعب بن عجرہ نے (کوفہ کی) مسجد میں داخل ہو کر دیکھا کہ حاکمِ کوفہ عبدالرحمٰن بن اُمّ الحکم بیٹھ کر خطبہ دے رہا تھا۔ کہا: اس خبیث کو دیکھو خطبہ بیٹھ کر دے رہا ہے اور اللہ تعالیٰ کا قرآن میں فرمان ہے: ''سو یہ لوگ سودا بکتا یا تماشا ہوتا دیکھتے ہیں، تو اُدھر بھاگ جاتے ہیں اور تمھیں (کھڑے کا) کھڑا چھوڑ جاتے ہیں۔''[2]

ان نصوص سے معلوم ہوا کہ جمعے کا خطبہ کھڑے ہو کر پڑھنا چاہیے، بیٹھ کر پڑھنا خلافِ سنت ہے۔ بلکہ امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

« اِنَّهُ شَرطٌ فِی صِحَّةِ الخُطبَةِ، وَ اِنَّهُ مَتٰی خَطَبَ قَاعِدًا لِغَیرِ عُذرٍ، لَم تَصِح »[3]

---

[1] صحیح مسلم،بَابُ ذِكرِ الخُطبَتَینِ قَبلَ الصَّلَاةِ وَمَا فِیهِمَا مِنَ الجَلسَةِ،رقم:٨٦٢، صحیح البخاری،بَابُ الخُطبَةِ قَائِمًا،رقم:٩٢٠

[2] صحیح مسلم،بَابٌ فِی قَولِهِ تَعَالَی:﴿وَإِذَا رَأَوا تِجَارَةً أَو لَهوًا انفَضُّوا ......الخ﴾ ،رقم:٨٦٤

[3] المرعاة:٢/٣٠٨

یعنی صحتِ خطبہ کے لیے شرط ہے، کہ کھڑے ہو کر دیا جائے اور بلا عذر کسی نے بیٹھ کر خطبہ دیا تو جمعہ درست نہیں ہو گا۔ لہٰذا حنفی حضرات کا عمل خلافِ سنت ہے۔ اس کو سنت کے مطابق بنانا ضروری ہے، ورنہ خطرہ ہے کہ جمعہ برباد ہو جائے۔

خطیب کے دعائیہ جملوں پر سامعین کا ''آمین'' کہنا:

سوال جمعہ کے خطبے میں خطیب دعائیہ جملے کہے تو کیا سامعین ''آمین'' کہہ سکتے ہیں؟

اسی طرح اگر آدمی خطبہ شروع ہونے کے بعد گھر سے نکلے اور خطبہ کی آواز سنائی دے رہی ہو تو کیا رستے میں کوئی ذکر یا کسی سے کوئی ضروری بات کر سکتا ہے؟

جواب خطبہ کے دوران آمین کہنے میں کوئی حرج نہیں کیونکہ اس سے خطبہ کا سماع فوت نہیں ہوتا--- دور سے محض خطبہ سننے سے خاموش رہنا لازم نہیں آتا بلکہ جب اس کے لئے تیار ہو کر باقاعدہ سماع کرے تب وہ ''سننے والا'' شمار ہو گا اور تب اس پر وہ احکام لاگو ہوں گے۔

دورانِ خطبہ خطیب کا عوام الناس کو سبحان اللہ کہلوانا:

سوال: دورانِ خطبہ خطیب «سبحان اللّٰہ» ، «ﷺ» اور آمین بلند کہنے کے لیے بلا سکتا ہے یا نہیں؟

جواب: آدابِ خطبہ جمعہ کے منافی ہے، کہ بلند آواز کے ساتھ سامعین کو ذکر کی ترغیب کی جائے۔

خطبہ جمعہ میں خطیب کوئی دعایہ جملے کہے تو کیا آمین کہیں گے یا نہیں؟

سوال: خطبہ جمعہ میں خطیب کوئی دعایہ جملے کہے تو کیا آمین کہیں گے یا نہیں؟

جواب: خاموشی اختیار کی جائے، کیونکہ خطبہ میں سکوت کا حکم ہے۔

سوال: جمعہ کے خطبے میں خطیب اگر دعائیہ جملہ کہے تو کیا سامعین آمین کہہ سکتے ہیں؟ جمعے کی نماز کے لیے نکلیں اور سپیکر سے جمعے کے خطبے کی آواز سنائی دے رہی ہو تو مسجد پہنچنے سے پہلے (خطبہ سننے کی حالت میں) آدمی کوئی ذکر یا ضروری بات کر سکتا ہے یا نہیں؟

جواب: خطبہ کے دوران آمین کہہ دے، تو کوئی حرج نہیں۔ کیونکہ اس سے خطبے کا سماع متاثر نہیں ہوتا۔ دور سے محض خطبے کے سماع سے خاموشی لازم نہیں۔ بلکہ جب اس کے لیے تیار ہو کر باقاعدہ سماع کرے، تو پھر مستمع شمار ہو گا۔

خطباتِ جمعہ میں مقامی اعلانات:

سوال: خطبات جمعہ میں مقامی اعلانات کو عادت بناء لینا جب کہ نماز کے بعد وہی اعلانات دوبارہ کیے جاتے ہیں، کیسا ہے؟

جواب: مسجد میں اعلانات سے احتراز ہونا چاہیے۔ بالخصوص گم شدہ جانور وغیرہ کا اعلان تو سخت منع ہے۔ حدیث میں وعید وارد ہے۔

خطبہ کے دوران مستمع کے لیے بیٹھنے کی کوئی خاص کیفیت:

سوال: جب خطیب خطبہ دے رہا ہو یعنی "اَلحَمدُ لِلّٰہِ نَحمَدُہٗ وَ نَستَعِینُہٗ وَ نَستَغفِرُہٗ" پڑھ رہا ہو تو بعض لوگ اس طرح بیٹھ جاتے ہیں جس طرح التحیات میں بیٹھا جاتا ہے اس بات کے جواز میں کوئی حدیث پاک سے ثبوت ملتا ہے یا نہیں؟

جواب: خطبہ کے دوران مستمع (سننے والے) کے لیے بیٹھنے کی کوئی خاص کیفیت حدیث میں وارد نہیں۔ ہر ممکنہ جائز صورت میں بیٹھنا جائز ہے۔ اس میں "التحیات" کی ظاہر کیفیت بھی داخل ہے۔

البتہ «نَھٰی عَنِ الحِبوَۃَ یَومَ الجُمُعَۃِ وَالإِمَامُ یَخطُبُ» خطبہ کے دوران گوٹھ مار کر بیٹھنے سے آپ ﷺ نے منع فرمایا ہے۔[1]

گوٹھ مارنا اس نشست کو کہتے ہیں کہ ہاتھ یا کپڑے کے ساتھ رانوں کو پیٹ سے ملا کر بیٹھیں۔ اس طرح بیٹھنے سے عموماً نیند آجاتی ہے، پھر آدمی خطبہ نہیں سن سکتا اور ایسا آدمی اکثر گر بھی پڑتا ہے۔ (صلوٰۃ الرسول ﷺ)

جمعہ وعید کے بعد جماعتِ ثانیہ:

سوال: جمعہ کی جماعت نکل جائے تو بعد میں آنے والے "جماعتِ ثانیہ" نہیں کروا سکتے، ظہر پڑھتے ہیں تو کیا عید گاہ میں جانے پر پتہ چلے کہ نماز عید ہو چکی ہے تو اگر زیادہ آدمی جماعت سے رہ گئے ہوں وہ تمام اپنی اپنی نماز پڑھیں، دوبارہ جماعت نہیں کروا سکتے؟

جواب: بوقتِ ضرورت جماعت ثانیہ کا جواز ہے۔ حدیث المتصدق اس امر کی واضح دلیل ہے اور صحیح بخاری کے باب " فَضلُ صَلاۃِ الجَمَاعَۃِ " میں ہے: "وَ جَاءَ اَنَسٌ اِلٰی مَسجِدٍ قَد صُلِّیَ فِیہِ فَاَذَّنَ وَ

---

[1] سنن ترمذی، بَابُ مَا جَاءَ فِی کَرَاھِیَۃِ الاِحتِبَاءِ وَالإِمَامُ یَخطُبُ، رقم: ۵۱۴

اَقَامَ وَصَلّٰى جَمَاعَةً "[1] حضرت انس رضی اللہ عنہ ایک مسجد میں آئے وہاں جماعت ہو چکی تھی انھوں نے اذان اور اقامت کہہ کر باجماعت نماز پڑھی۔ امام عید سے فوت شدہ نماز عید باجماعت پڑھی جا سکتی ہے۔ البتہ سلف میں سے بعض اس بات کے قائل ہیں کہ دو رکعتوں کے بجائے بایں صورت چار رکعتیں پڑھی جائیں۔ دیگر نے کہا ہے کہ باجماعت دو رکعتیں اور اکیلا پڑھے تو چار۔[2]

لیکن ظاہر یہ ہے کہ صرف دو رکعتوں پر اکتفاء کی جائے۔ عید کو جمعہ پر قیاس نہیں کیا جا سکتا۔ اس لیے کہ جمعہ کا بدل ظہر ہے جب کہ عید کا کوئی بدل نہیں۔

جمعہ کے دن عید ہونے پر جمعہ یا نمازِ ظہر کا حکم:

سوال: عرض ہے کہ ہمارے خطیب محترم نے فتویٰ دیا ہے کہ عید اور جمعہ جمع ہونے کی صورت میں عید پڑھنے کے بعد جمعۃ المبارک کا خطبہ مع نماز جمعہ یا نمازِ ظہر معاف ہے۔ پڑھنے یا نہ پڑھنے کا اختیار ہے۔ قرآن وحدیث کی روشنی میں رہنمائی فرمائیں۔ نوازش ہوگی۔

جواب: عید اور جمعہ کے اجتماع کی صورت میں بلاشبہ ترکِ جمعہ کی اجازت ہے۔ لیکن اس کے ترک کی صورت میں نمازِ ظہر ہر صورت پڑھنی ہوگی، اس لیے کہ ظہر اصل ہے اور جمعہ اس کا بدل ہے۔

امام شوکانی رحمہ اللہ "الدرر البهية" میں فرماتے ہیں: کہ جمعہ کا وقت ظہر کا وقت ہے۔ "الروضة الندية" (١/ ١٣٧) میں ہے کیونکہ جمعہ ظہر کا بدل ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ " نیل الأوطار" میں امام شوکانی رحمہ اللہ کا یہ نظریہ کہ ترکِ جمعہ کی صورت میں ظہر بھی معاف ہے، مرجوح مسلک ہے۔ جب کہ ترکِ ظہر پر صریح کوئی نص موجود نہیں ماسوائے اس کے کہ "سنن ابی داؤد" وغیرہ میں عبد اللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما کے بارے میں منقول ہے، کہ ان کے عہد میں عید اور جمعہ اکٹھے ہو گئے تو انھوں نے نمازِ عید پڑھائی اور اس کے بعد عصر تک گھر سے نہیں نکلے۔[3]

لیکن یہ ایک خاص واقعہ ہے۔ امام شوکانی رحمہ اللہ نے "نیل الأوطار" میں اصول بیان فرمایا ہے، کہ خاص واقعہ سے عام استدلال نہیں ہو سکتا۔ اس واقعہ میں احتمال ہے کہ شاید گھر میں اکیلے یا باجماعت نماز پڑھ لی ہو۔ اس بناء پر علامہ محمد بن اسماعیل الامیر رقمطراز ہیں:

---

[1] صحيح البخاری، بَابُ فَضْلِ صَلَاةِ الْجَمَاعَةِ وَكَانَ الْأَسْوَدُ......الخ، قبل رقم: ٦٤٥

[2] فتح الباری: ٢/ ٤٧٥

[3] سنن أبي داود، بَابٌ إِذَا وَافَقَ يَوْمُ الْجُمُعَةِ يَوْمَ عِيدٍ، رقم: ١٠٧٢

« قُلتُ وَ لَا یَخفٰی اَنَّ عَطَائًا اَخبَرَ اَنَّهٗ لَم یَخرُج اِبنُ الزُبَیرِ لِصَلٰوةِ الجُمُعَةِ، وَلَیسَ بِذَالِكَ نَصٌّ قَاطِعٌ اَنَّهٗ لَم یُصَلِّ الظُّهرَ فِی مَنزِلٍ. فَالجَزمُ ، فَاِنَّ مَذهَبَ ابنِ الزُّبَیرِ سُقُوطُ صَلٰوةِ الظُّهرِ فِی یَومِ الجُمُعَةِ یَکُونُ عَلٰی مَن صَلّٰی صَلٰوةَ العِیدِ لِهٰذِهِ الرِّوَایَةِ غَیرُ صَحِیحٍ ، لِاحتِمَالِ اَنَّهٗ صَلَّی الظُّهرَ فِی مَنزِلِهٖ، بَل فِی قَولِ عَطَاءٍ اَنَّهُم صَلُّوا وُحدَانًا، اَی الظُّهرَ مَا یُشعِرُ بِاَنَّهٗ لَا قَائِلَ سُقُوطِهٖ، وَ لَا یُقَالُ اَنَّ مُرَادَهٗ صَلٰوةُ الجُمُعَةِ وُحدَانًا: فَاِنَّهَا لَا تَصِحُّ اِلَّا جَمَاعَةً اِجمَاعًا، ثُمَّ القَولُ بِاَنَّ الاَصلَ فِی یَومِ الجُمُعَةِ صَلٰوةُ الجُمُعَةِ الظُّهرُ بَدَلٌ عَنهَا قَولٌ مَرجُوحٌ، بَل اَلظُّهرُ هُوَ الفَرضُ اَلاَصلِی اَلمَفرُوضُ لَیلَةَ الاِسرَاءِ . وَالجُمُعَةُ مُتَاَخِّرٌ فَرضُهَا، ثُمَّ اِذَا فَاتَت وَجَبَ الظُّهرُ اِجمَاعًا. فَهِیَ البَدَلُ عَنهُ. وَ قَد حَقَّقنَاهُ فِی رِسَالَةٍ مُستَقِلَّةٍ.» [1]

اس عبارت سے معلوم ہوا، کہ ظہر اصل ہے اور جمعہ اس کا بدل ہے۔ جمعہ کی اجازت سے ظہر کی اجازت لازم نہیں آتی۔ پھر عطاء کا کہنا ہے، کہ تمام اسلافِ امت جو اس وقت جمعہ کے لیے حاضر ہوئے تھے، سب نے نمازِ ظہر فرداً فرداً پڑھی۔ نیز جن لوگوں پر جمعہ فرض نہیں۔ جیسے عورت، مسافر اور غلام وغیرہ ان کو بھی ظہر پڑھنے کا حکم ہے اور یہ صرف اس بناء پر ہے کہ ظہر اصل ہے۔

اور ''فتح الباری'' (۳۷۲/۲) میں بروایت عبداللہ بن عمرو ہے:

« فَمَن تَخَطّٰی اَو لَغَا کَانَت لَهٗ ظُهرًا » [2]

چوکیدار جمعہ کی دو رکعت پڑھے گا یا ظہر؟

سوال: خطبہ جمعہ المبارک کے وقت چوکیداری کرنے والا شخص بعد میں جمعہ کی دو رکعت ادا کرے گا یا ظہر پوری پڑھے گا؟

جواب: جمعہ کے وقت چوکیداری کرنے والا من وجہ چونکہ جمعہ میں شریک ہوتا ہے، لہٰذا دو رکعت پڑھے گا اس موضوع پر ''الاعتصام'' میں پہلے بھی میرا ایک فتویٰ چھپا ہوا موجود ہے۔

کیا چوکیدار جمعہ کی نماز ادا کرے گا؟

سوال: گن مین (پہرے دار) جو اذان اور خطبہ جمعہ تو سنے مگر نماز بعد میں تنہا ادا کرتا ہے، آیا دو رکعت

---

[1] سبل السلام: ۵۳/۲

[2] سنن أبی داؤد باب فِی الغُسلِ یَومَ الجُمُعَةِ، رقم: ۳۴۷

نماز پڑھے یا نماز ظہر ادا کرے؟

جواب: ظاہر یہ ہے کہ اس صورت میں چوکیدار دو رکعت پر اکتفا کرے گا، کیونکہ ایک لحاظ سے وہ جمعہ میں شریک ہے۔

جمعہ کی جماعت سے رہ جانے والے پر بعد میں دو رکعت فرض ہیں یا چار؟

سوال: جمعہ کی جماعت سے رہ جانے والے پر بعد دو رکعت فرض ہیں یا چار؟ نیز جو تشہد میں ملے اس کے متعلق بھی آگاہ فرمائیں کہ وہ کتنی نماز پڑھے گا، دو رکعت یا چار؟ قرآن وحدیث کے واضح دلائل سے آگاہ فرمائیں۔

جواب: جمعے کی نماز جماعت سے رہ جانے پر چار رکعتیں پڑھنی ہوں گی۔ کیونکہ اصل نماز ''ظہر'' ہے۔ ملاحظہ ہو! (فتاویٰ اہل حدیث: ۲/ ۳۳۹) تشہد میں ملنے کی صورت میں راجح مسلک کے مطابق دو رکعتیں ہی پڑھے گا۔

کیونکہ حدیث میں ہے: « فَمَا أَدرَكتُم فَصَلُّوا وَمَا فَاتَكُم فَأَتِمُّوا »[1]

''جتنی نماز تمھیں (امام کے ساتھ) مل جائے وہ پڑھ لو اور جو (جماعت سے) رہ جائے وہ پوری کر لو۔''

اس مذہب کو تقویت اس بات سے بھی ملتی ہے کہ مسافر اگر مقامی امام کے آخری تشہد میں ملتا ہے، تو اس کو پوری نماز پڑھنی ہوتی ہے۔ کیونکہ اس کی نماز کی بناء امام کی تکبیر تحریمہ پر ہے۔ اسی طرح نمازِ جمعہ کے تشہد میں ملنے والے کی نماز بھی امام جمعہ کی تکبیرِ تحریمہ پر ہوگی۔ ملاحظہ ہو! مرعاة المفاتیح: ۲/ ۳۱۳

شدید بارش کی وجہ سے جمعہ چھوٹ جائے تو گھر میں نمازِ ظہر پڑھنا درست ہے:

سوال: مسجد الفرقان اہل حدیث میں نماز جمعہ سوا ایک بجے ادا کی جاتی ہے۔ اس وقت شدید بارش ہو رہی تھی، جس کی وجہ سے میں نمازِ جمعہ میں شریک نہ ہو سکا۔ ڈاکٹر مسعود الدین عثمانی کے پیروکاروں کی مسجد توحید میں جمعہ کی نماز دو بجے ہوتی ہے۔ بارش تھمنے کے باوجود میں نے مسجد توحید میں دانستہ نمازِ جمعہ اس لیے ادا نہ کی کہ میں نے ان کے بارے میں آپ کا تفصیلی فتویٰ پڑھا تھا، سو میں نے گھر میں نمازِ ظہر پڑھ لی۔ بعد میں خیال گزرا کہ نمازِ جمعہ ترک نہیں کرنی چاہیے کیا میں نے واقعی غلطی کی ہے؟

جواب: شدید بارش کی وجہ سے آپ کا گھر میں نمازِ ظہر پڑھنے کا فعل درست ہے۔ سنن ابوداود وغیرہ میں حدیث ہے کہ یوم حنین کو بارش ہو رہی تھی تو رسول اللہ ﷺ نے اپنے منادی کو حکم دیا کہ آج اپنے خیموں میں

[1] صحیح البخاری، بَابُ قَولِ الرَّجُلِ: فَاتَتنَا الصَّلاَةُ، رقم: ٦٣٥

نماز پڑھنے کا اعلان کرو اور وہ جمعہ کا دن تھا۔[1]

جمعہ کی فرض نماز کے بعد چار سنتیں اکٹھی یا دو دو؟

سوال جمعہ کے دن جمعہ کی فرض نماز کے بعد سنتیں چار اکٹھی پڑھنا زیادہ افضل ہے یا دو دو پڑھنا افضل ہے؟

جواب: جملہ سنن اور نوافل دو دو کر کے پڑھنا زیادہ افضل و اولیٰ ہے، چاہے ان کا تعلق نمازِ جمعہ سے ہو یا کسی اور نماز سے۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی "صحیح" میں بایں الفاظ تبویب قائم کی ہے: " باب التطوع مَثنی مَثنی " پھر سلف صالحین کے آثار واقوال اور بعض احادیث سے اس امر کو ثابت کیا ہے۔

جمعہ کے بعد کتنی سنتیں پڑھیں، گھر میں یا مسجد میں؟

سوال: نمازِ جمعہ کے فوراً بعد کتنی سنتیں ادا کرنی چاہئیں مسجد میں یا گھر میں؟

جواب: صحیح مسلم میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے:

«مَن كَانَ مِنكُم مُصَلِّيًا بَعدَ الجُمُعَةِ، فَليُصَلِّ اَربَعًا.»[2]

یعنی تم میں سے جو جمعہ کے بعد نماز پڑھنا چاہتا ہے پس چاہیے کہ وہ چار رکعت پڑھے۔

اور صحیح مسلم کی دوسری روایت میں ہے: «اِذَا صَلّٰى اَحَدُكُمُ الجُمُعَةَ، فَليُصَلِّ بَعدَهَا اَربَعًا.»[3]

نیز صحیح بخاری میں ابن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم جمعہ کے بعد گھر جا کر دو رکعت پڑھتے تھے۔[4] لیکن یہ آپ کا فعل ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت قوی ہے۔ ائمہ اصول کے ہاں قول بہر صورت فعل پر مقدّم ہے۔ اس لیے اولیٰ یہ ہے کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث کے اِطلاق (مطلق ہونے) کی بناء پر جمعہ کے بعد چار رکعتیں پڑھی جائیں۔ چاہے کوئی مسجد میں پڑھے یا گھر میں صاحب "مرعاۃ" نے بھی اس بات کو اولیٰ قرار دیا ہے۔[5]

سوال اگر کوئی شخص خطبہ جمعہ کے وقت دو رکعت نماز شروع کرے۔ اسی دوران نماز کھڑی ہو جائے اور وہ نماز توڑ دے تو کیا ان دو رکعتوں کی قضا ضروری ہے؟

---

1. سنن ابوداؤد، الجمعة، باب الجمعة فی الیوم المطیر، رقم: ١٠٥٧، ١٠٥٩
2. صحیح مسلم، بَابُ الصَّلَاةِ بَعدَ الجُمُعَةِ، رقم: ٨٨١
3. صحیح مسلم، بَابُ الصَّلَاةِ بَعدَ الجُمُعَةِ، رقم: ٨٨١)
4. صحیح البخاری، بَابُ الصَّلَاةِ بَعدَ الجُمُعَةِ وَقَبلَهَا، رقم: ٩٣٧
5. مرعاۃ المصابیح، ج: ٢، ص: ١٤٨

جواب ایسی حالت میں اُدھوری چھوڑی ہوئی نماز کی قضا ضروری نہیں۔

نمازِ جمعہ کی سنتیں:

سوال: نماز جمعہ کی سنتوں کے بارے میں معلوم کرنا ہے کہ کل کتنی ہیں؟ فرض سے قبل کتنی اور بعد میں کتنی؟ اس میں سنت مؤکدہ اور غیر مؤکدہ کون سی ہیں؟ براہِ کرام بحوالہ حدیث رکعتوں کا شمار اور تاکید اور غیر تاکید کی پوری تحقیق کے ساتھ وضاحت فرما کر عنداللہ ماجور اور عندالناس مشکور ہوں۔

جواب: شرعی اصطلاح میں فرضوں کے علاوہ سب نوافل ہیں۔ مؤکدہ غیر مؤکدہ فقہائے کرام کی اصطلاح ہے۔ نمازِ جمعہ سے قبل نوافل کی کوئی تعداد مقرر نہیں۔ جتنے ممکن ہو پڑھے جا سکتے ہیں۔

حدیث میں ہے: ''ثُمَّ يُصَلِّي مَا كُتِبَ لَهُ'' [1]

اور صحیح مسلم میں ہے ''فَصَلّٰى مَا قدر له'' اور نمازِ جمعہ کے بعد چار رکعات ہیں۔ [2] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو! ''القول المقبول'' (ص:٦٢٥)

مسافر یا مدرسہ کے ہوسٹل میں مقیم طلبہ کا نمازِ جمعہ ادا کرنا:

سوال: جو لوگ کسی جگہ کے مستقل رہائشی نہ ہوں مثلاً: مسافر یا مدرسہ کے ہوسٹل میں مقیم طلبہ، اگر وہ اس جگہ مقیم لوگوں کے بغیر خود جمعہ کی نماز ادا کریں تو کیا یہ درست ہے؟ ابن باز کہتے ہیں کہ اگر یہ خود نماز جمعہ کا اہتمام کریں تو نماز جمعہ کی صحت محل نظر ہے۔ جمعہ تو ان پر واجب ہے جو کسی علاقے کے مستقل رہنے والے ہوں۔ ابن باز مزید کہتے ہیں کہ نبی کریم نے مسافروں اور بادیہ نشین لوگوں کو جمعے کا حکم نہیں دیا۔ نبی کریم ﷺ نے حجۃ الوداع کے موقع پر جمعہ کے دن وقوف فرمایا تو ظہر کی نماز پڑھائی جمعہ نہیں پڑھایا۔

جواب: مسافر جب کسی جگہ آیا ہو اور وہاں اس کا کچھ دیر قیام ہو، تو اس پر جمعہ واجب ہے یا نہیں؟ اس میں اہلِ علم کا اختلاف ہے۔ بعض علماء وجوب کے قائل ہیں جب کہ دیگر عدمِ وجوب کے۔ یہ بات زیادہ درست معلوم ہوتی ہے، کہ اس پر جمعہ واجب نہیں، کیونکہ اس کے لیے احکامِ سفر موجود ہیں۔ اسی بناء پر یہ بات نقل نہیں ہو سکی، کہ نبی ﷺ نے حجۃ الوداع کے موقع پر عرفات میں جمعہ پڑھا ہو۔ اس لیے کہ آپ مسافر تھے، اسی طرح مسافر سے عید بھی ساقط ہو جاتی ہے۔ ملاحظہ ہو! (سُبُلَ السَّلام:٢/ ١٦١) اس بارے میں سماحۃ الشیخ ابن باز کا موقف

---

[1] صحيح البخاري، بَابُ الدُّهنِ لِلْجُمُعَةِ، رقم: ٨٨٣

[2] صحيح مسلم، بَابُ فَضلِ مَنِ استَمَعَ وَأنصَتَ فِي الخُطبَةِ، رقم: ٨٥٧

درست ہے۔ نیز بادیہ نشین بھی حکماً مسافر ہیں۔لہٰذا دونوں کے احکام ایک جیسے ہیں۔

جہاں تک ہوسٹل میں مقیم طلبہ کا تعلق ہے، وہ نماز جمعہ پڑھیں گے، کیونکہ وہ حکماً مقیم ہیں۔ اس حالت میں ان کے لیے نماز میں نہ قصر ہے اور نہ نمازوں کو جمع کرنا۔ رمضان کے روزے بھی رکھیں گے، کیونکہ ان پر سفر کا اطلاق نہیں ہوتا، بلکہ وہ حکماً مقیم ہیں۔

جمعہ کے متعلق مسائل بیان کرنے کے لیے احناف کی کون سی کتاب مفید ہے؟

سوال : اگر ہم جمعہ کے خطبہ میں نماز کے مسائل بیان کریں تو احناف کی کتب میں سے کونسی کتابیں سامنے ہونی چاہئیں تاکہ کسی بھی مسئلہ کو بیان کرتے ہوئے دونوں طرف کے دلائل دیے جائیں اور پھر ترجیح دیتے ہوئے صحیح مسلک بیان کیا جائے۔ تو نماز اور دیگر مسائل کے لیے احناف کی کون کونسی کتابیں ہونی چاہئیں؟

جواب : اس سلسلہ میں جملہ مسائل کے لیے کتاب ''مفید الاحناف'' کافی اچھی اور مفید ہے۔

صلوٰۃ العیدین

عید الفطر اور حکومتی اعلان

سوال ماہنامہ ''محدث'' لاہور کا مستقل اور دیرینہ قاری ہوں۔ ماہنامہ محدث میں جو فتاویٰ شائع ہوتے رہتے ہیں، ان پر خود بھی یقین رکھتا ہوں اور میرے ساتھ دوسرے مدرّسین ساتھی اور گاوں کے دیگر لوگ بھی ماہنامہ محدث کے فتاویٰ کو کافی وشافی سمجھتے ہیں ___ امسال عید الفطر کے بارے میں شدید اختلافات کا سامنا کرنا پڑا، اس لئے کہ یہی عید ہمارے اکثر اہل حدیث بزرگ جو کہ صوبہ سرحد میں مانے ہوئے شیخ القرآن والحدیث ہیں، نے بھی مقامی (پشاور) کمیٹیوں کی شہادتوں پر عید الفطر بروز جمعرات مورخہ ۳ نومبر ۲۰۰۵ء کو منائی جبکہ ہم نے اگلے روز بروز جمعہ بتاریخ ۴ نومبر کو عید منائی، حالانکہ ہمارے ہاں وادی پشاور میں بدھ کی شام مورخ ۲ نومبر کو آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے مگر جمعرات کی رات ۱۱ بجے عید کا اعلان کیا گیا۔ اس کے برعکس جمعرات کی شام آسمان بالکل صاف تھا۔ کوشش کے باوجود (دو دن کا چاند) گاوں والے اور نزدیکی علاقے کے لوگوں نے نہ دیکھا، جمعہ کی شام سات بجے ریڈیو پر اعلان کیا گیا کہ کراچی میں چاند نظر آگیا ہے اور یوں بندہ نے کچھ دیگر ساتھیوں (حنفی، اہل حدیث) کے ہمراہ اگلے روز بروز جمعہ مورخہ 4 نومبر کو عید منائی۔ اس سلسلہ میں چند سوالات کے جوابات درکار ہیں:

۱۔ جمعرات مورخہ ۳ نومبر کو عید الفطر منانا مقامی کمیٹیوں کے اعلان کے مطابق درست تھا؟

۲۔ بروز جمعہ مورخہ ۴ نومبر کو رویتِ ہلال کمیٹی کے اعلان کے مطابق عید الفطر درست تھی؟

۳۔ اگر جمعرات کے روز عید غلط تھی تو اسی دن کے روزے کی قضا واجب ہوگی؟

جواب بالاصورت میں رویتِ ہلال کے سلسلہ میں حکومت کی قائم کردہ کمیٹی کے اعلان پر اعتماد کرنا چاہئے کیونکہ ان کے ہاں ذرائع رویت بآسانی میسر ہیں جو دیگر لوگوں کی استطاعت میں نہیں۔ جنہوں نے جمعرات کے روز عید کی، اُنہیں آئندہ احتیاط کرنی چاہئے، کیونکہ اگر ایک یا زیادہ مسلمان خود چاند دیکھ بھی لیں تو وہ اکیلے عید نہیں کر سکتے صرف خفیہ طور پر روزہ چھوڑ سکتے ہیں، کیونکہ عید کی عبادت مسلمانوں کی اجتماعی شان وشوکت کا اظہار ہے، لہٰذا سب کو ایک ہی دن عید کرنی چاہیے۔

نبی ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: ''عید کا دن وہ ہے جس دن تمام مسلمان عید کریں۔''[1] لیکن اگر کچھ لوگوں نے کسی کی اطلاع پر روزہ چھوڑ دیا اور عید کر لی تو ان کا یہ عمل خلافِ سنت ہوگا اور چھوڑے ہوئے روزے کی قضا ضروری ہوگی۔ تاہم قضا واجب نہیں کیونکہ اجتہادی تساہل ہے۔

روئیتِ ہلال میں جدید آلات اور اختلافِ مطالع

سوال : گذشتہ عید الفطر میں ہمارے ہاں کچھ اختلاف پیدا ہوا کیونکہ حکومت نے چاند دیکھنے کا اعلان تقریباً نو بجے کے قریب کیا اور تقریباً ڈیڑھ دوسو افراد نے پیر کو عید نماز ادا کی۔ ساتھیوں کے اطمینان کے لئے چند مسائل سے آگاہی مطلوب ہے:

۱۔ جیسا کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''چاند دیکھ کر روزہ رکھو اور اس کو دیکھ کر افطار کرو، اگر تم پر ابر کیا جائے تو شعبان کے ۳۰ دن پورے کرو۔''[2]

اب جیسا کہ اس متفق علیہ حدیثِ مبارکہ سے ثابت ہو رہا ہے، اس کے پیش نظر کیا دوربین اور خلائی سیاروں سیٹلائٹ کے ذریعے سے حکومتی ادارے اور رویتِ ہلال والے جو چاند دیکھتے ہیں، ان کی بات درست تسلیم کی جائے یا نہیں؟

۲۔ حدیثِ مبارکہ ہے: ''بے شک اللہ تعالیٰ نے چاند کی رویت میں تاخیر کردی (یعنی نظر نہ آنے دیا) لہٰذا وہ اسی رات کا مانا جائے جس رات کو تم نے اسے دیکھا''[3] تو اگر ہم دوربین یا خلائی سیاروں سیٹلائٹ

---

[1]

[2] صحیح مسلم، بَابُ وُجُوبِ صَوْمِ رَمَضَانَ لِرُؤْيَةِ الْهِلَالِ، وَالْفِطْرِ لِرُؤْيَةِ الْهِلَالِ، رقم: ۱۰۸۰

[3] صحیح مسلم، بَابُ بَيَانِ أَنَّهُ لَا اعْتِبَارَ بِكُبْرِ الْهِلَالِ وَصِغَرِهِ، ......الخ، رقم: ۱۰۸۸

سے چاند دیکھیں تو کیا اس حدیث پر عمل ہوسکتا ہے۔

۳۔ صحیح مسلم میں ہے کہ حضرت کریب رحمہ اللہ ایک مرتبہ شام گئے جب وہ واپس مدینہ منورہ آئے تو حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے ان سے پوچھا: تم نے چاند کب دیکھا تھا؟ اُنہوں نے کہا: ہم نے جمعہ کو دیکھا تھا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے پوچھا: کیا تم نے بھی دیکھا تھا؟ اُنہوں نے کہا: ہاں (میں نے بھی دیکھا تھا) اور لوگوں نے بھی دیکھا تھا، تمام لوگوں نے روزہ رکھا اور (خلیفہ وقت) امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے بھی روزہ رکھا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے کہا: لیکن ہم نے تو ہفتہ کی رات کو دیکھا تھا، لہٰذا ہم تو روزہ رکھتے رہیں گے جب تک ۳۰ دن پورے نہ کرلیں یا ہم ۲۹ کو چاند نہ دیکھ لیں۔ حضرت کریب رحمہ اللہ نے کہا: کیا آپ کے لئے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی رویئت اور ان کا روزہ رکھنا کفایت نہیں کرتا؟ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا: نہیں، ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا ہی حکم دیا ہے۔[1] تو حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے فرمان کو سامنے رکھتے ہوئے لاہور والے کراچی کی یا کراچی والے پشاور کی یعنی ملک کے دور ترین علاقے والے ایک دوسرے کی شہادت پر عید کریں یا نہ کریں؟

۴۔ احادیث میں ہے کہ دو عادل مسلمان گواہی دیں تو روزہ رکھو یا موقوف کرو۔[2]

تو کیا کسی مشرک، بدعتی و مقلد کی گواہی پر روزہ رکھا یا موقوف کیا جاسکتا ہے۔ قرآن وحدیث سے واضح فرمائیں۔ اور آپ علمائے کرام سے ہی ہمیں علم ہوا کہ محدثین کرام رحمہم اللہ اس آدمی کی روایت اور شہادت قبول نہیں کرتے تھے جس نے زندگی میں ایک جھوٹ بھی بولا ہوتا۔

۵۔ اگر طاغوتی حاکم وقت عوام پر کوئی فیصلہ قرآن وحدیث کے خلاف پیش کرے تو اسے ماننا چاہئے یا نہیں؟ قرآن وحدیث سے واضح فرمائیں۔ (خالد محمود سلفی، اوکاڑہ)

جواب: احادیث سے جو بات ثابت ہے وہ یہ ہے کہ اثباتِ رمضان کے لئے ایک عادل مسلمان کی شہادت کافی ہے اور خروجِ رمضان وغیرہ کے لئے دو عادل گواہوں کی گواہی ضروری ہے۔ اس سے یہ بات کھل جاتی ہے کہ چاند کو دیکھنے سے مقصود ہر ایک کا دیکھنا نہیں بلکہ شرعی طور پر اس کا اثبات ہے۔ کسی اسلامی ملک میں شرعی شرائط کے ساتھ رویتِ ہلال کا اعلان چاہے نئی ایجادات کے ذریعہ ہو، بشرطیکہ اصل رویت میں شبہ نہ ہو تو وہ قابل اعتماد ہے۔ جس کی سب لوگوں کو تعمیل کرنی چاہئے اور اعلان میں تاخیر نزاع کا باعث نہیں ہونی

---

[1] صحیح مسلم، بَابُ بَيَانِ أَنَّ لِكُلِّ بَلَدٍ رُؤْيَتَهُمْ وَأَنَّهُمْ إِذَا رَأَوُا الْهِلَالَ بِبَلَدٍ ......الخ ، رقم: ۱۰۸۷

[2] سنن النسائی، بَابُ قَبُولِ شَهَادَةِ الرَّجُلِ الْوَاحِدِ عَلَى هِلَالِ شَهْرِ رَمَضَانَ ......الخ ، رقم: ۲۱۱۶

چاہئے۔ بعض اوقات کوئی معقول وجہ بھی ہو سکتی ہے۔ سعودی عرب میں بھی ایک بار ایسے ہوا اور سب علمائے کرام نے اسے تسلیم کیا تھا۔

۲۔ اگر چاند نظر نہ آئے تو واقعی یہی حکم ہے اور جدید ایجادات کے ذریعہ رویت کی صورت میں بھی رویت قابل اعتبار ہے۔

۳۔ سوال میں مذکور حدیث کی شرح میں اہل علم نے بہت کچھ لکھا ہے، مگر راجح بات یہ ہے کہ ایک ملک کی رویت دوسرے ملک کے لئے کافی نہیں کیونکہ شام دوسرا ملک ہے۔ ظاہر یہی ہے کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے دوسرا ملک ہونے کی وجہ سے اعتبار نہیں کیا، رہا صوبہ سرحد کا معاملہ تو بسببِ قرب کے وہ ایک ہی ہیں۔ جب ایک جگہ دوسری جگہ سے اتنی دور ہو کہ رویت ہلال میں فرق پڑھ سکتا ہو تو اس صورت ایک جگہ کی رویت کا دوسری جگہ اعتبار نہیں۔ لاہور کراچی یا پشاور کراچی کا رویت کے اعتبار سے زیادہ تفاوت نہیں، اس میں چنداں تردد کی ضرورت نہیں۔ سعودی عرب رقبہ کے حجم میں پاکستان سے بڑا ملک ہے لیکن اس میں ایسا کبھی اختلاف نمودار نہیں ہوا، اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے جملہ اُمور مرتب اور علمی قیادت کے ہاتھ میں ہیں۔ زادھا اللہ عزا و شرفا

۴۔ اثبات اور خروجِ رمضان کے لئے واقعی عادل مسلمانوں کی شہادت ہونی چاہئے، محدثین نے جن شرائط کے تحت اہل بدعت کی روایت کا اعتبار کیا ہے، وہی قریباً رویتِ ہلال میں بھی ہونی چاہئیں۔ ملاحظہ ہو: توضیح الافکار: ۲/ ۱۹۹ تا ۲۱۲۔

۵۔ طاغوتی حاکم کا حدیث من رایٰ منکم منکرًا کی روشنی میں معارضہ ہونا چاہئے۔

تکبیراتِ عیدین تعداد؟

سوال: عیدین کی تکبیریں چھ ہیں یا بارہ۔ وضاحت فرمائیں؟ بارہ تکبیروں کے راوی کثیر بن عبداللہ کے متعلق بعض کہتے ہیں کہ یہ جھوٹا ہے۔

جواب: عید الفطر اور عید الاضحیٰ کی نماز میں بارہ تکبیریں کہنا مسنون ہے۔ بیہقی میں ''ابن وھب، عن ابن لهيعة، عن يزيد، عن ابن شهاب، عن عروة'' کے طریق سے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے، کہ رسول اللہ ﷺ عیدین میں بارہ تکبیریں کہا کرتے تھے۔[1] یہ حدیث صحیح ہے کیونکہ ابن وہب کا سماع ابن لہیعہ سے کتابیں جلنے سے قبل ہے۔ ملاحظہ ہو! ''إرواء الغليل'' (۳/ ۱۰۷۔۱۰۸)

[1] السنن الكبرىٰ للبيهقي، بَابُ التَّكبِيرِ فِي صَلَاةِ العِيدَين، رقم: ٦١٧٤

حدیث ہذا حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے دیگر طُرق سے بھی مروی ہے۔ اس حدیث کے راویوں میں سے عبد اللہ بن عمرو، ابن عمر، جابر، ابو واقد اور عمرو بن عوف مزنی رضی اللہ عنہم بھی ہیں۔ ان کے طُرق جید ہیں۔

جملہ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو! ''إرواء الغلیل'' (۳/ ۱۰۷ تا ۱۱۲)

اور جہاں تک تعلق ہے راوی ''کثیر بن عبد اللہ'' کا، یہ واقعی ضعیف ہے۔ امام ترمذی رحمہ اللہ نے اس حدیث کو حسن قرار دیا ہے۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اہلِ علم کی ایک جماعت نے ترمذی کی تحسین کا انکار کیا ہے، کیونکہ کثیر بن عبد اللہ سخت ضعیف ہے، حتی کہ امام شافعی رحمہ اللہ نے فرمایا:

« هُوَ رُكْنٌ مِّن أَرْكَانِ الْكَذِبِ » [1]

لیکن اس حدیث کو جو قابلِ حجت اور صحیح قرار دیا گیا ہے، وہ دیگر طُرق و روایات کے اعتبار سے ہے۔

لہٰذا اصل مسئلہ بلا تردّد (یعنی بغیر شک کے) ثابت ہے۔ نیز ''کثیر بن عبد اللہ'' اور امام ترمذی رحمہ اللہ کی تصحیح اور تحسین پر طویل ترین ناقدانہ بحث کے لیے ملاحظہ ہو! توضيح الأفكار لمعاني تنقيح الانظار للصنعانی (۱/ ۱۶۹-۱۸۰)

عید کے دو خطبے یا ایک......؟

سوال: عید کے دو خطبے دینے جائز ہیں یا نہیں؟

جواب: عموی صحیح احادیث کے ظواہر کی بناء پر اصلاً خطبۂ عید صرف ایک ہے۔ اضافہ کی ضرورت نہیں۔ البتہ بعض علماء بعض ضعیف آثار کے پیشِ نظر اور جمعہ پر قیاس کرتے ہوئے، دو خطبوں کے قائل ہیں اور صاحب ''المرعاۃ'' فرماتے ہیں:

« ثُمَّ خَطَبَ. فِيهِ دَلِيلٌ عَلَى مَشْرُوعِيَّةِ خُطْبَةِ الْعِيدِ. وَ لَيْسَ فِيهِ خُطْبَتَانِ، كَالْجُمُعَةِ، وَ أَنَّهُ يَقْعُدُ بَيْنَهُمَا. وَ لَمْ يَثْبُتْ ذٰلِكَ مِنْ فِعْلِهِ ﷺ بِسَنَدٍ مُعْتَبَرٍ » (۲/ ۳۳۰)

نمازِ عید مسجد میں پڑھنا:

سوال: کیا بغیر کسی عذر اور وجہ کے نمازِ عید مسجد میں پڑھی جا سکتی ہے؟

جواب: بلا عذر اور بلا وجہ مسجد میں نماز عید ادا کرنا درست نہیں۔ اگر کوئی اس کی خلاف ورزی کر کے بلا سبب نمازِ عید مسجد میں پڑھتا ہے۔ نماز تو ہو جائے گی، لیکن فضیلت سے محروم ہے۔ مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو!

[1] تلخيص الحبير: ۲/ ۸٤

''المرعاۃ'' (۲/ ۳۴۵)

ہمارے شیخ محدث روپڑی رحمہ اللہ کے شیخ امام عبد الجبار غزنوی رحمہ اللہ اپنے فتاویٰ میں رقمطراز ہیں: ہر چند سنت وافضل عید کی نماز صحراء میں ہے، مگر مسجد میں پڑھنے کا جواز بلا خلاف ہے۔ لہٰذا حرمین شریفین میں قدیم الأیام، سے یہی متعارف ہے۔

عورتوں کا مسجد میں نمازِ عید باجماعت ادا کرنا:

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ کے بارے میں، آج کل عورتیں عید کے اجتماع کے لیے مسجد میں جمع ہو جاتی ہیں اور ایک عورت پہلی صف کے درمیان میں کھڑی ہو کر تمام عورتوں کو نماز پڑھاتی ہے جب کہ مرد حضرات گاؤں سے باہر جمع ہو کر عید کی نماز پڑھتے ہیں۔

جواب: نمازِ عید کا مسنون طریقہ عورتوں کے لیے بھی یہی ہے، کہ باہر مردوں کی جماعت کے ساتھ شریک ہو کر عید ادا کریں۔ عہدِ نبوت میں اس پر عمل تھا۔

چنانچہ حدیث میں ہے، حضرت اُمّ عطیہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں، کہ ہمیں حکم دیا گیا، کہ ہم (سب عورتوں کو گھر سے) نکالیں (حتی کہ) حیض والیوں اور پردہ والیوں کو (بھی) دونوں عیدوں میں، تا کہ (سب) حاضر ہوں مسلمانوں کی جماعت (نماز) اور ان کی دعا میں اور (فرمایا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے) الگ رہیں، حیض والیاں اپنے مصلّی سے (یعنی وہ نماز نہ پڑھیں)، لیکن مسلمانوں کی دعاؤں اور تکبیروں میں شامل رہیں، تا کہ اللہ کی رحمت اور بخشش سے حصہ پائیں۔ ایک عورت نے عرض کیا، کہ اگر ہم میں سے کسی کے پاس چادر نہ ہو؟ (تو پھر وہ کیسے عید گاہ جائے) حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: چاہیے کہ اس (بے چادر والی) کو اس کے ساتھ والی عورت چادر اوڑھا دے (یعنی چادر کسی دوسری عورت سے عاریۃً لے لے)[1]

مصنف مرحوم پھر فرماتے ہیں: نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا کی بھولی، بسری کشتنی اور زندہ درگور عورت پر مردوں کی طرح تعلیم فرض قرار دی فرمایا: « طَلَبُ العِلمِ فَرِیضَةٌ عَلٰی کُلِّ مُسلِمٍ ...... »[2]

یعنی ہر مسلمان (مرد وعورت پر علم حاصل کرنا فرض ہے۔)

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عورت کے لیے نمازوں اور جمعہ کے خطبے سننے کے لیے مسجد کا دروازہ کھول دیا۔

---

① صحیح البخاری، بَابُ إِذَا لَم یَکُن لَهَا جِلبَابٌ فِی العِیدِ، رقم: ۹۸۰، صحیح مسلم، رقم: ۸۹۰، بحوالہ صلوٰۃ الرسول صلی اللہ علیہ وسلم

② سنن ابن ماجه، بَابُ العِلمِ العَامِّ الَّذِی لَا یَسَعُ البَالِغَ العَاقِلَ جَهلُهُ ، رقم: ۳۲۵

عیدوں کے اہم اجتماعوں میں رسول اللہ ﷺ کے خطاب علم و ہدایت کا دریا ہوتے تھے۔ حضور انور ﷺ نے ان اجتماعوں میں بھی عورتوں کو مردوں کے ساتھ برابر شریک کیا۔ بلکہ حائضہ عورتوں تک کو حاضری کا حکم دیا، تاکہ مردوں کے ساتھ ساتھ ان کی تعلیم اور ہدایت کا سلسلہ بھی جاری رہے۔ غور کریں، کہ رسول اکرم ﷺ نے عورت کی بہبودی کے لیے کیسے اچھے انتظام کر رکھے تھے۔

تکبیرات میں رفع الیدین کا حکم:

سوال: عیدین کی زائد تکبیرات میں رفع الیدین کا کیا حکم ہے؟

جواب: تکبیراتِ عیدین میں رفع الیدین کی کوئی مرفوع صریح صحیح یا ضعیف روایت وارد نہیں۔ البتہ ابن عمر رضی اللہ عنہما کی عمومی حدیث: ''اِذَا قَامَ اِلَی الصَّلٰوۃِ رَفَعَ یَدَیہِ'' کے اخیر میں ہے: « وَ یَرفَعُھُمَا فِی کُلِّ رَکعَۃٍ، و تَکبِیرَۃٍ، کَبَّرَھَا قَبلَ الرُّکُوعِ حَتّٰی تَنقَضِیَ صَلٰوتُہٗ » [1]

اور بعض اقوال جو عمر، ابن عمر اور زید بن ثابت رضی اللہ عنہم سے ماثور ہیں، کے پیشِ نظر اگر کوئی رفع یدین کرے، تو جواز ہے۔

عید کے موقع پر تکبیرات:

سوال: عید کے موقع پر جو تکبیرات کہتے ہیں مثلاً ''اَللّٰہُ اَکبَر، اَللّٰہُ اَکبَرُ، لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَاللّٰہُ اَکبَرُ'' اس کے علاوہ '' اَللّٰہُ اَکبَرُ کَبِیرًا، وَالحَمدُ لِلّٰہِ کَثِیرًا، وَ سُبحَانَ اللّٰہِ بُکرَۃً وَّ اَصِیلًا''

محترم! کیا دونوں تکبیرات حدیث سے ثابت ہیں یا ایک؟ اس کے بارے میں ''الاعتصام'' میں کئی بار تکبیرات شائع ہوئی ہیں جن میں صرف پہلی تکبیر ہی لکھی گئی ہے، دوسری تکبیر کا ذکر نہیں ہے۔ بندہ کی تسلی کریں۔ کیا دونوں کہنی چاہئیں یا ایک۔ حوالہ رسالہ ''الاعتصام'': ۲۳، جولائی ۱۹۸۲ء۔

جواب: عید کے موقع پر تکبیرات کا جواز علی الاطلاق کتاب و سنت سے ثابت ہے۔ البتہ الفاظ کے بارے میں مختلف آثار و اقوال وارد ہیں۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: سب سے صحیح ترین الفاظ وہ ہیں، جن کو عبدالرزاق نے بسند صحیح سلمان سے بیان کیا ہے: « اَللّٰہُ اَکبَرُ اَللّٰہُ اَکبَرُ اَللّٰہُ اَکبَرُ کَبِیرًا » [2]

---

[1] سنن أبی داؤد، بَابُ رَفعِ الیَدَینِ فِی الصَّلَاۃِ، رقم: ۷۲۲، دارقطنی، السنن الکبریٰ للبیهقی، بَابُ السُّنَّۃِ فِی رَفعِ الیَدَینِ کُلَّمَا کَبَّرَ لِلرُّکُوعِ، رقم: ۲۵۴۱

[2] فتح الباری، لابن حجر: ۴۶۲/۲

بعض نے "وَ لِلّٰهِ الحَمدُ" کی زیادتی بیان کی ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے، کہ تین دفعہ تکبیر کہے اور لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحدَهٗ لَا شَرِيكَ لَهٗ......الخ کا اضافہ کرے اور یہ بھی کہا گیا، کہ دو دفعہ تکبیر کہے۔ اس کے بعد کہے " لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاللّٰهُ اَكبَرُ اَللّٰهُ اَكبَرُ وَ لِلّٰهِ الحَمدُ" یہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے اور ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے اسی کی طرح منقول ہے۔ "فتح الباری" (۴۶۲/۲) اور ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے بحوالہ سعید بن منصور اور ابن ابی شیبہ کے الفاظ یوں ہیں: « اللّٰهُ اَكبَرُ، وَاللّٰهُ اَكبَرُ، لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ، اَللّٰهُ اَكبَرُ، اَللّٰهُ اَكبَرُ، وَ لِلّٰهِ الحَمدُ » ①

علامہ قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: امام مالک رحمہ اللہ اور دیگر اہلِ علم کی ایک جماعت کے ہاں لفظ تکبیر یوں ہیں: « اَللّٰهُ اَكبَرُ، اَللّٰهُ اَكبَرُ، اَللّٰهُ اَكبَرُ »

علماء میں سے بعض اثناء، تکبیر، تہلیل اور تسبیح کے قائل ہیں اور بعض وہ ہیں، جو اس طرح پڑھتے ہیں: «اَللّٰهُ اَكبَرُ كَبِيرًا، وَالحَمدُ لِلّٰهِ كَثِيرًا، وَ سُبحَانَ اللّٰهِ بُكرَةً وَّاَصِيلًا » ②

فقیہ ابن قدامہ فرماتے ہیں:

"مذکورہ الفاظ کا نمازِ عید کی تکبیرات کے دوران پڑھنا اچھا ہے، لیکن بات یہ ہے کہ تکبیرات کے دوران نبی ﷺ اور سلف صالحین سے بسند صحیح، یہ ذکر ثابت نہیں ہو سکا۔ لہٰذا خاموشی اختیار کرنی چاہیے۔ بعض نے یہ الفاظ بھی نقل کیے ہیں: «سُبحَانَ اللّٰهِ، وَالحَمدُ لِلّٰهِ، وَ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاللّٰهُ اَكبَرُ» جونسا کوئی ذکر کرنا چاہے، کرسکتا ہے۔ ③

"ابن ابی شیبہ" میں بسند صحیح ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے بایں الفاظ ذکر مروی ہے:

« أَللّٰهُ اَكبَرُ، اَللّٰهُ اَكبَرُ ، لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ، وَاللّٰهُ اَكبَر ، اَللّٰهُ اَكبَرُ، وَ لِلّٰهِ الحَمدُ » ④

جابر کی ایک مرفوع روایت میں بھی، یہی الفاظ ہیں، لیکن وہ سخت ضعیف ہے۔ حاصل یہ کہ بموقعۂ عید الفاظ ذکر مرفوعاً بسند صحیح نبی ﷺ سے ثابت نہیں ہو سکے، اور بعض صحیح آثار میں، جو بعض الفاظ ثابت ہیں۔ انہی پر اکتفاء کرنا چاہیے، جب کہ سائل کے ذکر کردہ اذکار میں سے پہلا ثابت ہے، دوسرا محلِ نظر ہے۔ غالباً اسی بناء پر دوسرے ذکر کو "الاعتصام" میں قابلِ التفات نہیں سمجھا گیا۔ (واللہ اعلم)

① نیل المرام، ص: ۲۲

② أحكام القرآن: ۳۰۷/۲

③ المرعاة: ۳٤۲/۲

④ مصنف ابن ابی شیبہ ،(۲۱۲/۲) بحوالہ إرواء الغليل: ۱۲۵/۲

منیٰ میں حاجی کے لیے نمازِ عید کا حکم:

سوال: آپ کے ہفت روزہ ''الاعتصام'' شمارہ ۱۳۔۱۹۹۵ء میں لکھا ہے کہ ''حاجی آدمی مزدلفہ سے واپسی پر ممکن ہو تو نمازِ عید پڑھ لیں۔'' کیا نبی ﷺ نے عید کی نماز حج کے وقت پڑھی تھی؟ آج جو آدمی عید کی نماز پڑھتا ہے وہ نبی ﷺ کا نافرمان تو نہ ہوگا؟ کیا حاجی نمازِ قصر بھی ایامِ منیٰ میں پڑھ سکتا ہے خواہ وہ منیٰ میں ہو یا حرم میں کیا وہ نافرمان تو نہ ہوگا؟

جواب: مسئلہ ہذا میں اہلِ علم کا کچھ اختلاف ہے، لیکن راجح بات یہ ہے، کہ منیٰ میں حاجی کے لیے نمازِ عید نہیں۔ اس بات کی واضح دلیل صحیح مسلم میں وارد حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی طویل روایت ہے، جس میں نبی اکرم ﷺ کے حج کی صفت و کیفیت بیان ہوئی ہے۔اس میں الفاظ یوں ہیں:

« أَتَى الجَمرَةَ الَّتِی عِندَ الشَّجَرَةِ، فَرَمَاهَا بِسَبعِ حَصَیَاتٍ. یُکَبِّرُ مَعَ کُلِّ حَصَاةٍ مِنهَا مِثلَ حَصَی الخَذفِ. رَمٰی مِن بَطنِ الوَادِی . ثُمَّ انصَرَفَ اِلَی المَنحَرِ، فَنَحَرَ ثَلَاثًا وَّ سِتِّینَ بَدَنَةً بِیَدِہٖ.»[1]

یعنی ''رسول اللہ ﷺ اس جمرہ کے پاس آئے، جو درخت کے قریب ہے۔اس کو چھوٹے سات کنکر مارے، جو دو انگلیوں سے مارے جاتے ہیں۔ پھر قربان گاہ کی طرف لوٹ آئے اور پس تریسٹھ اونٹ اپنے ہاتھ سے قربان کیے۔''

اس حدیث میں اس امر کی دلیل ہے، کہ حاجی پر نمازِ عید نہیں، کیونکہ حاجی پر اگر عید ہوتی، تو جمروں سے فارغ ہو کر نمازِ عید پڑھ کر، پھر قربانی کرنی چاہیے تھی۔اس لیے کہ قربانی نمازِ عید کے بعد ہوتی ہے۔ نبی ﷺ کا رمیٔ جمار سے فارغ ہو کر سیدھا قربان گاہ میں تشریف لے جانا، اس بات کی واضح دلیل ہے، کہ ''حجۃ الوداع'' کے موقع پر آپ ﷺ نے نمازِ عید نہیں پڑھی۔

ایامِ منیٰ میں حاجی نماز صرف ''قصر'' کرے، جمع نہ کرے کیونکہ حجۃ الوداع میں نبی اکرم ﷺ نے اسی طرح نماز پڑھی تھی۔ (ملاحظہ ہو! صحیح بخاری وغیرہ)

نمازِ عید میں فوت شدہ تکبیرات کا حکم:

سوال: نمازِ عید میں مقتدی کے شامل ہونے سے پہلے جو تکبیرات امام ادا کر چکا ہو مقتدی امام کی اقتداء

---

[1] صحیح مسلم،بَابُ حَجَّةِ النَّبِیِّ صَلَّی اللهُ عَلَیهِ وَسَلَّمَ،رقم:۱۲۱۸

میں تکبیرات کہہ کر اُن گزری ہوئی تکبیرات کو نظر انداز کر دے کیونکہ اس پر اس وقت قرأت سننا اور فاتحہ پڑھنا فرض ہوتا ہے یا تکبیرات مکمل کرے؟

جواب : ظاہر یہی ہے، کہ مقتدی اس فوت شدہ تکبیرات کو ترک کردے۔ لیکن ''المغنی لابن قدامہ'' میں ہے، کہ مسبوق بعد میں ان تکبیرات کی قضائی بھی دے۔ فرماتے ہیں:

« وَالمَسبُوقُ بِبَعضِ الصَّلٰوةِ یُکَبِّرُ، إِذَا فَرَغَ مِن قَضَاءِ مَا فَاتَهٗ . نَصَّ عَلَیهِ. وَ هٰذَا قَولُ أَکثَرِ أَهلِ العِلمِ » (٢٥٧/٢)

یعنی جس کی نماز کا کچھ حصہ فوت ہو جائے وہ فوت شدہ کی قضائی کے بعد تکبیر کہے۔''

امام احمد رحمہ اللہ نے اس کی تصریح کی ہے اور اکثر اہلِ علم کا قول یہی ہے اور حدیث «وَمَا فَاتَکُم فَأَتِمُّوا.» [1] سے بھی یہ استدلال ممکن ہے۔

عید کے خطبے کتنے ہیں نیز عید کا خطبہ بیٹھ کر یا کھڑے ہو کر؟

سوال : کیا عید کے خطبہ میں خطیب ایک خطبہ دے کر بیٹھ کر پھر کھڑا ہو کر دوسرا خطبہ دے گا یا کہ درمیان میں نہیں بیٹھے گا بلکہ ایک ہی خطبہ دے گا؟ نیز جو علماء عید کے خطبہ کو جمعہ کے خطبہ پر قیاس کرتے ہیں ان کے اس قیاس کی کیا حیثیت ہے؟ اس سوال کا تفصیلی جواب ارشاد فرما کر عند اللہ ماجور ہوں۔

جواب : اصلاً عید کے لیے خطبہ ایک ہے۔ دو خطبے کسی صحیح حدیث سے ثابت نہیں۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی ''صحیح'' میں بایں الفاظ باب قائم کیا ہے: «بَابُ الخُطبَةِ بَعدَ العِیدِ» پھر اپنی سند سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کرتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ، ابوبکر، عمر اور عثمان رضی اللہ عنہم کا عمل نقل کیا ہے:

«فَکُلُّهُم کَانُوا یُصَلُّونَ قَبلَ الخُطبَةِ.» [2]

پھر دوسری روایت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے نقل کی ہے:

« کَانَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ، وَ أَبُو بَکرٍ، وَ عُمَرُ رَضِیَ اللّٰهُ عَنهُمَا یُصَلُّونَ العِیدَینِ قَبلَ الخُطبَةِ .» [3]

ان روایات میں وارد لفظ '' اَلخُطبَةِ '' سے معلوم ہوا، کہ عید کا صرف ایک خطبہ ہے۔ دو نہیں اور جو لوگ

---

[1] صحیح البخاری، بَابُ قَولِ الرَّجُلِ: فَاتَتنَا الصَّلاَةُ، رقم: ٦٣٥

[2] صحیح البخاری، بَابُ الخُطبَةِ بَعدَ العِیدِ، رقم: ٩٦٢

[3] صحیح البخاری، بَابُ الخُطبَةِ بَعدَ العِیدِ، رقم: ٩٦٣

دو خطبوں کے قائل ہیں، ان کا استدلال بعض ضعیف روایات سے ہے۔ اسی طرح وہ خطبۂ عید کو جمعہ کے خطبہ پر قیاس کرتے ہیں۔ بعض اہلِ علم نے اس مسلک کو اختیار کیا ہے۔ لیکن یہ مذہب مرجوح ہے۔ راجح بات پہلی ہے۔ کیونکہ ثانی الذکر کی دلیل کمزور ہے، اور اس پر قیاس کی بھی کوئی حیثیت نہیں۔ اس لیے کہ عبادات میں اصل ''عدمِ قیاس'' ہے۔

کیا عید کا ایک خطبہ ہی ہونا چاہیے یا دو:

سوال کیا عید کا ایک خطبہ ہی ہونا چاہیے یا دو خطبے دینے کی گنجائش بھی ہے؟ جبکہ امام نسائی نے ایک عام حدیث سے دو خطبوں کے جواز پر استدلال کیا ہے؟

جواب صحیح روایات کے مطابق عید کا خطبہ ایک ہی ہے اور جن روایات میں دو کا ذکر ہے، ان میں کلام ہے۔ (ملاحظہ ہو: مرعاۃ المفاتیح ۳۳۰/۲)

اور سوال میں نسائی کی ذکر کردہ روایت صحیح تو ہے لیکن اس میں دو خطبوں کی تصریح نہیں اور ابن ماجہ کی روایت میں تصریح تو ہے لیکن وہ ضعیف ہے، اس میں راوی اسماعیل بن مسلم بالاجماع ضعیف ہے اور دوسرا راوی ابوبکر بھی ضعیف ہے۔

اس سلسلہ میں ایک روایت مسند بزار میں بھی ہے لیکن وہ بھی ضعیف ہے۔ [1]

عیدین کے خطبے کتنے ہیں؟

سوال : عیدین کے خطبے کتنے ہیں؟

جواب : راجح مسلک کے مطابق عید کا صرف ایک ہی خطبہ ہے۔ کیونکہ صحیح احادیث میں صرف ایک ہی خطبے کا ذکر ہے۔ جن روایات میں دو کا ذکر ہے، وہ صحیح نہیں۔

عید کے دن نمازِ عید کے بعد بغلگیر ہوں یا مصافحہ کریں؟

سوال : عید کے دن بعد نمازِ عید بغلگیر ہونا جائز ہے یا صرف مصافحہ ہی کیا جائے؟

جواب : سنت میں دونوں امور میں سے کوئی بھی ثابت نہیں۔

نمازِ عید کے بعد مصافحہ یا معانقہ؟

سوال : اخبار کا تراشہ پیش خدمت ہے جس میں بحوالہ بخاری شریف آپ ﷺ کا بعد عیدین مصافحہ و

[1] مجمع الزوائد: ۲۰۳/۲

معانقہ منقول ہے، اور معاشرے میں اس کا رواج بھی ہے۔ جب کہ ہمارے محلے کی مسجد کے امام جو عیدین کی امامت بھی کرتے ہیں، ان کا کہنا ہے کہ عید کے موقع پر گلے ملنا مناسب نہیں ہے۔ بلکہ رسم دنیا ہے۔ اس کو دین کی بات سمجھنا، اور نہ کرنے والے کو لائقِ ملامت سمجھنا، بدعت ہے۔ آپ سے درخواست ہے، کہ واضح فرمائیں، کہ اخبار میں دیا جانے والا حوالہ کتب دین میں موجود ہے یا نہیں؟ اور بات کہنا امام کا درست ہے یا اخبار مضمون کے مصنف کا؟

جواب: کتاب وسنت کی صحیح نصوص سے نمازِ عید کے بعد مصافحہ اور معانقہ کرنا ثابت نہیں۔ مضمون نگار کے بیان کردہ بعض مسائل صحیح بخاری میں ہیں۔ سب نہیں۔ ان میں مشارٌ الیہ مسئلہ شامل نہیں۔ البتہ بعض ضعیف آثار میں عید، مہینہ اور سال کے موقع پر پیغامِ تہنیت کا ذکر ہے۔ مجموعۂ آثار کو بعض اہلِ علم نے قابلِ عمل سمجھا ہے۔ اس بناء پر وہ مندوب ہونے کے قائل ہیں۔ ان میں سے شارح صحیح بخاری حافظ ابن حجر رحمہ اللہ بھی ہیں۔ جب کہ دیگر بعض نے اس کو بدعت کہا ہے اور بعض نے کہا ہے کہ یہ عمل مباح ہے نہ سنت ہے اور نہ بدعت۔ ①

عید کے موقع پر گلے ملنا اور ''عید مبارک'' کہنا:

سوال: عید کے موقع پر گلے ملنے اور ''عید مبارک'' کہنے کی کتاب وسنت سے کوئی دلیل ہے؟ ایک مولانا صاحب نے فرمایا کہ عید کے موقع پر گلے ملنا بدعت ہے مہربانی فرما کر کتاب وسنت کی روشنی میں جواب سے مطلع فرما دیں۔

جواب: عید کا دن مسلمانوں کے لیے خوشی اور باہمی مؤدت ومحبت کے اظہار کا دن ہے۔ لہٰذا اس میں خوشی کا اظہار ہونا چاہیے۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ بسند حسن جبیر بن نفیر سے بیان کرتے ہیں، کہ نبی ﷺ کے اصحاب عید کے روز جب آپس میں ملاقات کرتے تو تَقَبَّلَ اللّٰهُ مِنَّا وَ مِنكَ (اللہ ہماری اور تمہاری عید قبول فرما لے!) کہہ کر ایک دوسرے کو مبارک باد پیش کرتے۔ ②

امام احمد فرماتے ہیں۔ کہ اس میں کوئی حرج نہیں، کہ ایک آدمی دوسرے کو عید کے دن ''تَقَبَّلَ اللّٰهُ مِنَّا وَ مِنكَ'' کہے۔ حرب نے کہا، کہ امام احمد سے سوال ہوا کہ عیدین میں لوگ یہ کہتے ہیں ''تَقَبَّلَ اللّٰهُ مِنَّا وَ

① الابداع فی مضار الابتداع، ص: ۲۶۳

② فتح الباری ۲/ ۴۴۶، السنن الکبریٰ للبیهقی، بَابُ مَا رُوِیَ فِی قَوْلِ النَّاسِ یَوْمَ العِیدِ بَعضُهُم لِبَعضٍ: تَقَبَّلَ ......الخ، رقم: ۶۲۹۴، الجامع الصحیح للسنن والمسانید، اَلتَّهنِئَة بِالعِیدِ

مِنکُم'' اس کا کیا حکم ہے؟ فرمایا: کوئی حرج نہیں۔ یہ بات اہلِ شام نے ابوامامہ سے نقل کی ہے۔(المغنی ۳/ ۲۹٤) ابوامامہ کا یہ اُثر ترکمانی نے سنن کبریٰ بیہقی کے حاشیے پر ذکر کیا ہے (۳/۳۲۰)۔امام احمد نے اس کی سند کو جید قرار دیا ہے۔البتہ خصوصی گلے ملنے کی کسی روایت میں صراحت نہیں، لہٰذا اس سے اجتناب کرنا چاہیے۔

(عید کے دن ایک دوسرے سے گلے ملنا کوئی مسنون اور ثابت شدہ عمل نہیں۔البتہ عام اظہارِ محبت کے لیے اگر معانقہ کر بھی لیا جائے، تو اس میں کوئی حرج معلوم نہیں ہوتا۔(واللہ اعلم)

مختلف علاقوں میں روزہ اور عید ایک دن ہوں یا الگ الگ؟

سوال: صوبہ سرحد میں قدیماً یہ روایت چلی آرہی ہے کہ پشتون علاقوں میں عیدین ایک روز پہلے مناتے ہیں۔دیکھا دیکھی دوسرے لوگوں نے بھی یہی کرنا شروع کر دیا ہے حتی کہ اہلِ حدیث علماء بھی اسی رَو میں بہہ گئے ہیں اور جب سے افغان مہاجرین آئے ہیں عیدین دو کے بجائے تین بلکہ کبھی کبھی چار بھی ہو جاتی ہیں آپ سے گزارش ہے کہ آپ اپنے فتویٰ میں اہلِ حدیث عوام اور علماء پر زور دیں کہ اپنے قدیمی معیار پر غور کریں۔اب تو حال یہ ہو گیا ہے ایک ایک گھر میں دو دو عیدیں ہونے لگی ہیں۔

جواب: عیدین کو اپنی مرضی سے منانا یا روزوں میں جان بوجھ کر تقدیم و تاخیر کرنا سخت منع ہے۔نبی ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے:« صُومُوا لِرُؤيَتِهٖ وَ اَفطِرُوا لِرُؤيَتِهٖ.»[1] یعنی ''چاند دیکھ کر روزہ رکھو! اور دیکھ کر افطار کرو!''

امام بخاری رحمہ اللہ نے جملہ احادیث کے ساتھ اس حدیث پر دوسری ایک حدیث کے ساتھ بایں الفاظ باب قائم کیا ہے:« بَابُ قَولِ النَّبِيِّ ﷺ اِذَا رَأَيتُمُ الهِلَالَ فَصُومُوا، وَ اِذَا رَأَيتُمُوهُ، فَافطِرُوا.»

''جب تمھیں چاند نظر آئے تو روزہ رکھ لو! اور جب اُسے دیکھ لو، تو روزہ افطار کر دو۔''

پھر تعلیقاً حضرت عمار رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے، کہ'' جس نے شک کے دن کا روزہ رکھا، اُس نے ابوالقاسم ﷺ کی نافرمانی کی۔'' جب شک کے دن کا روزہ رکھنا نبی ﷺ کی نافرمانی ہے، تو جو شخص عمداً تقدیم و تاخیر کا مرتکب ہے یہ یقیناً بڑا مجرم ہے۔ایسی عبادت کی قبولیت کی امید نہیں رکھنی چاہیے۔کیونکہ جملہ عبادات کی قبولیت کا انحصار کتاب و سنت کی پیروی پر ہے ایسے لوگوں کو اپنی غلطی کا احساس کرنا چاہیے۔کہیں ایسا نہ ہو، کہ روزِ جزاء اپنا بوجھ اٹھانے کی بجائے، لوگوں کا بوجھ بھی اٹھانا پڑ جائے۔

﴿وَ لَیَحۡمِلُنَّ اَثۡقَالَهُمۡ وَ اَثۡقَالًا مَّعَ اَثۡقَالِهِمۡ﴾(العنکبوت:١٣) کا مصداق بننا بُری کمائی ہے۔

---

[1] صحیح البخاری، بَابُ قَولِ النَّبِيِّ ﷺ إِذَا رَأَيتُمُ الهِلَالَ فَصُومُوا، وَإِذَا رَأَيتُمُوهُ فَأَفطِرُوا، رقم:١٩٠٩

اللہ رب العزت ہم میں فہم و فراست اور شعور پیدا کر کے صراطِ مستقیم کی رہنمائی فرمائے۔ آمین!

عید قربان کی تکبیرات کے شروع اور ختم ہونے کا وقت:

سوال: عید قربان کی تکبیرات کے شروع اور ختم ہونے کا وقت کونسا ہے؟

جواب: اس بارے کوئی مرفوع متصل روایت نہیں ہے۔ البتہ آثارِ صحابہ حضرت علی اور ابن مسعود رضی اللہ عنہما وغیرہ سے ثابت ہے، کہ تکبیرات یوم عرفہ، یعنی نو ذوالحجہ کی صبح سے لے کر ۱۳ ذوالحجہ تک ہیں۔ (فتح الباری ۲/ ۴۶۲) یہی بات ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی ''ابن ابی شیبہ'' وغیرہ میں ثابت ہے۔

نماز کے بعد آواز بلند تکبیرات کہنے سے کسی کی نماز میں خلل کا حکم:

سوال: کیا ہر نماز کے بعد آواز بلند تکبیرات کہنی چاہئیں؟ خواہ کسی کی نماز میں خلل ہی پڑتا ہو؟

جواب: فرض نماز کے بعد آوازِ بلند تکبیریں کہنا جائز ہے۔ صحیح بخاری کے باب ''اَلتَّكْبِيرُ اَيَّامَ مِنٰى'' کے تحت حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے بالعموم اور ابن عمر رضی اللہ عنہما سے بالخصوص جواز منقول ہے۔ البتہ کسی کی نماز میں خلل سے بچنا چاہیے۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو! ''المغنی'' (۲/ ۲۹۱)

نمازِ عیدین کی تکبیرات:

سوال: نماز عیدین کی پہلی رکعت میں سات تکبیریں ہیں جو کہ تکبیر تحریمہ کے علاوہ ہیں یا تکبیر تحریمہ سمیت سات تکبیریں ہیں؟ اور کیا دوسری رکعت میں تکبیر قیام کے علاوہ پانچ تکبیریں ہیں؟

جواب: نماز عیدین میں بارہ تکبیریں تکبیر تحریمہ اور دوسری رکعت میں انتقالی تکبیر (جو سجدے کے بعد کھڑے ہوتے ہوئے کہی جاتی ہے) کے علاوہ ہیں۔ ''دارقطنی'' کی روایت میں ہے:

« سِوَى تَكْبِيرَةِ الِافْتِتَاحِ »[1]

اور ابوداؤد کی روایت میں ہے: «سِوَى تَكْبِيرَتَي الرُّكُوعِ.»[2]

تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو! (التحفہ: ۳/ ۸۳)

نماز عید کی زائد تکبیرات کے درمیان فاصلہ:

سوال: نماز عید کی زائد تکبیرات کے درمیان کس قدر فاصلہ ہونا چاہیے؟ زائد تکبیرات کہنے کے

[1] سنن الدارقطني، كِتَابُ العِيدَينِ، رقم: ۱۷۲۰

[2] سنن أبي داود، بَابُ التَّكْبِيرِ فِي العِيدَينِ، رقم: ۱۱۵۰

درمیان ہاتھ بندھے ہونے چاہئیں یا کھلے چھوڑ دے؟ تکبیرات کے دوران کوئی ذکر کیا جا سکتا ہے؟ عبدالجبار غزنوی قائل ہیں۔

(جواب): ظاہر ہے کہ زائد تکبیرات کے درمیان اتنا فاصلہ ہی ہوگا، جس میں دوبارہ تکبیر کہی جا سکے۔ ہاتھوں کو باندھا جائے، کیونکہ اصل حالت ہاتھ باندھنے کی ہے۔ فقیہ ابن قدامہ فرماتے ہیں: کہ تکبیرات کے دوران ذکر کرنا سنت ہے۔ واجب نہیں۔ اگر آدمی عمداً یا سہواً چھوڑ دے تو اس سے نماز باطل نہیں ہوگی۔ [1]

تکبیراتِ زوائد رہ جائیں یا رکعت تو ادائیگی کا طریقہ کیا ہے؟

(سوال): عید کی نماز میں تکبیرات اضافی کے بعد بحالتِ قیام ملنے والا آدمی دونوں رکعات امام کے ساتھ ادا کرتا ہے وہ اپنی تکبیرات جو امام کے ساتھ ادا نہ کر سکا ان کی ادائیگی کیسے کرے گا۔ جب کہ قیام کی حالت میں ملنے سے اس کی رکعات تو پوری ہو چکی ہیں۔

(جواب): بایں صورت فوت شدہ تکبیرات کی قضائی کی ضرورت نہیں، کیونکہ زوائد تکبیرات واجب نہیں۔ امام شوکانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

« وَالظَّاهِرُ عَدَمُ وُجُوبِ التَّكبِيرِ، كَمَا ذَهَبَ اِلَيهِ الجَمهُورُ، لِعَدمِ وَجدِ انِ دَلِيلٍ يَدُلُّ عَلَيهِ » [2]

''ظاہر یہ ہے کہ تکبیر واجب نہیں، جس طرح کہ جمہور نے عدمِ دلیل وجوب کی بناء پر، اس مسلک کو اختیار کیا ہے۔''

عید کی نماز میں فوت شدہ رکعت کی قضائی:

(سوال): اگر عید کی دوسری رکعت پالے تو کیا وہ اپنی پہلی رکعت کی ادائیگی فرض عام نمازوں کی طرح امام کے سلام کے بعد پوری کرے گا یا کہ امام کے ساتھ ہی سلام پھیر لے گا۔

(جواب): مقتدی فوت شدہ رکعت کی عام نمازوں کی طرح قضائی دے گا اور اگر کوئی چاہے تو امام کی طرز پر قضائی بھی دے سکتا ہے۔ [3]

---

① المغنی: ۳/ ۳۷۵

② نیل الأوطار: ۳/ ۳۱۹

③ المرعاۃ: ۲/ ۳٤۹

خطبہ عید سننے کا حکم:

سوال جمعہ کے خطبہ کی طرح عید کا خطبہ سننا بھی ضروری ہے یا جو اُٹھ کر جانا چاہے، جا سکتا ہے؟

جواب عید کے خطبے کا سننا جمعہ کے خطبہ کی طرح ضروری نہیں بلکہ خطبہ نماز کے تابع ہے (یعنی چونکہ نماز عیدین سنت مؤکدہ ہے لہٰذا خطبہ سننا بھی واجب نہیں)۔ (فتح الباری:۲/۴۴۶) بوقتِ ضرورت اٹھ کر جانے کا جواز ہے۔

سوال: خطبہ عید سننا ضروری ہے یا نہیں؟

جواب: خطبہ عید سننا ضروری نہیں۔ سنن ابی داؤد وغیرہ میں حدیث ہے، کہ نبی ﷺ نے فرمایا:

« إِنَّا نَخطُبُ، فَمَن أَحَبَّ أَن يَجلِسَ لِلخُطبَةِ فَليَجلِس، وَمَن أَحَبَّ أَن يَذهَبَ فَليَذهَب »[1]

''ہم عید کا خطبہ دیں گے، جو خطبے کے لیے بیٹھنا چاہے۔ بیٹھ جائے اور جو جانا چاہے۔ چلا جائے۔''

علامہ البانی فرماتے ہیں: کہ اس کی سند ''شیخین'' کی شرط پر صحیح ہے۔

عید کا خطبہ سننا، خطبہ جمعہ کی طرح ضروری ہے؟

سوال: عید کا خطبہ سننا، خطبہ جمعہ کی طرح ضروری ہے یا جو جانا چاہے جا سکتا ہے؟ نیز کیا سامعین بوقتِ ضرورت ایک دوسرے سے بات کر سکتے ہیں یا نہیں؟

جواب: عید کا خطبہ سننا ضروری نہیں۔ چنانچہ نسائی (رقم: ۱۸۵) ابن ماجہ (رقم: ۱۲۹۰) ابوداؤد (رقم: ۱۱۵۵) میں عبداللہ بن سائب کی حدیث میں ہے، کہ نماز عید کے بعد نبی ﷺ نے فرمایا:

« فَمَن اَحَبَّ اَن يَجلِسَ لِلخُطبَةِ فَليَجلِس. وَ اِن اَحَبَّ اَن يَّذهَبَ، فَليَذهَبُ.»

''جو خطبہ کے لیے بیٹھنا چاہے بیٹھ جائے اور جو جانا چاہے، چلا جائے۔''

لیکن ابو داؤد نے اس کو ''مرسلِ عطاء'' قرار دیا ہے۔ شیخ عبدالقادر ارنؤوط نے جامع الاصول (٦/ ١٤٦) کی تحقیق میں کہا ہے، کہ اسی طرح اس حدیث میں ابن جریج کا ''عنعنہ'' بھی ہے۔ لیکن علامہ البانی الإرواء (۳/ ۹۷) میں فرماتے ہیں: کہ ابن جریج کی عطاء سے تمام روایات سماع پر محمول ہیں۔ سوائے اس کے جس میں تدلیس واضح ہو جائے۔ سنن کبریٰ کے حاشیہ پر ابن ترکمانی (۳/۳۰۱) نے بڑے

[1] سنن أبي داود، بَابُ الجُلُوسِ لِلخُطبَةِ، رقم: ۱۱۵۵

ٹھوس موقف اور مضبوط نقد کے ساتھ ''ابوداؤد'' کے کلام کی تردید کی ہے۔ بلاشبہ حدیث ہذا صحیح ہے جس طرح حاکم نے (۱/۲۹۵ میں) کہا اور ذہبی نے ان کی موافقت کی ہے۔ علامہ صنعانی سبل السلام (۲/۱۸۴) میں فرماتے ہیں:

« وَ قَد نُقِلَ الِاجمَاعُ عَلٰی عَدَمِ وُجُوبِ الخُطبَةِ فِی العِیدَینِ.»

''عیدین کے خطبہ کے عدمِ وجوب پر اجماع منقول ہے۔''

عیدین کے موضوع پر لکھی گئی کتب

سوال: عیدین کے موضوع پر لکھی گئی کتب کے بارے میں اگر آپ کو علم ہے تو براہ کرم ان کتب کا نام لکھ دیں تاکہ میں ان کا مطالعہ کرسکوں۔

جواب: اس موضوع پر مستقل تصنیف ''سَوَاطِعِ القَمرَینِ فِی تَخرِیجِ أَحَادِیثِ أَحکَامِ العِیدَینِ'' ہے بازار کی طرف رجوع فرمائیں! اس موضوع پر کئی ایک کتب دستیاب ہیں۔

عید کی نماز کھلے میدان میں:

سوال: آج کل اکثر شہروں اور دیہات میں رواج ہے کہ عیدین پڑھنے کے لیے گاؤں کے باہر یا کہیں مناسب جگہ پر کچھ زمین حاصل کر کے اسے عید گاہ کے طور پر مخصوص کرلیا جاتا ہے اور اس کے اردگرد چار دیواری کرلی جاتی ہے۔ وہ سارا سال بیکار پڑی رہتی ہے صرف سال میں دو دفعہ اس میں عید پڑھی جاتی ہے کیا یہ جائز ہے؟ کیا کھلی جگہ پر عید پڑھنا لازمی ہے؟

جواب: نماز عید کھلی جگہ جنگل میں یا ایسی جگہ جہاں چار دیواری نہ ہو، کھلے میدان میں پڑھنے کی سعی کرنی چاہیے۔ بصورتِ دیگر جیسے بھی ممکن ہو، نمازِ عید پڑھی جاسکتی ہے۔ لیکن سال بھر مخصوص ایام کے لیے جگہ روکے رکھنا غیر درست فعل ہے۔

صدقہ فطر کے بعض مسائل

امریکہ میں مسلمانوں کے بعض علاقوں میں، اور ملک کے بعض دوسرے حصوں میں بعض اوقات وہ خوردنی اشیا دستیاب نہیں ہوتی جن کا ذکر شرعی نصوص میں کیا گیا ہے۔ اسی طرح بعض اوقات بہت سے غریب مسکین مسلمانوں کو یہ معلوم نہیں ہوتا کہ وہ ان اشیاءِ خوردنی سے کیسے استفادہ کر سکتے ہیں، اس صورتِ حال میں کئی سوالات پیدا ہوتے ہیں:

صدقہ فطر میں معینہ غذائی جنس کی بجائے مالیت وغیرہ ادا کرنا:

سوال: کیا ''طعام'' (غذائی اشیا) کے مفہوم میں وسعت پیدا کی جاسکتی ہے، تاکہ ہر وہ چیز اس حکم میں شامل ہوجائے جس کو ''طعام'' کہا جاسکتا ہے۔ مثلاً تیل، سبزی، پھل، چاول، گوشت، مٹھائی وغیرہ یا ان میں سے بعض اشیاءِ خوردنی کا جواز صرف اس صورت میں ہوگا، جب یقینی طور پر معلوم ہو کہ ان فقراء و مساکین کیلئے طویل عرصے تک یہ غذائی اشیا استعمال کرنا مشکل ہے؟

جواب: صدقہ فطر کے لئے حدیث میں جن غذائی اشیا کا نام لیا گیا ہے وہ یہ ہیں: کھجور، جو، منقیٰ، پنیر اور گندم۔ صحیح بخاری میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے فرمایا:

> ''اللہ کے رسول ﷺ نے مسلمانوں میں سے ہر غلام، آزاد، مرد، عورت، چھوٹے اور بڑے پر ایک صاع کھجور یا ایک صاع جو صدقہ فطر مقرر کیا ہے۔ اور حکم دیا ہے کہ وہ لوگوں کے نماز کی طرف نکلنے سے پہلے ادا کر دیا جائے۔''[1]

صحیح بخاری میں حضرت ابوسعید خدری کا یہ فرمان مروی ہے:

> ''ہم لوگ صدقہ فطر کے طور پر ایک صاع غلہ، یا ایک صاع جو یا ایک صاع کھجوریں، یا ایک صاع پنیر یا ایک صاع منقیٰ نکالتے تھے۔''[2]

نبی علیہ السلام کے زمانہ میں یہی چیزیں زیادہ استعمال ہوتی تھیں۔ ابوسعید خدری کی ایک اور حدیث میں ہے: ''رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں ہم لوگ صدقہ فطر میں ایک صاع کھانا دیا کرتے تھے۔''[3]

---

(1) صحیح البخاری، بَابُ: صَدَقَةُ الفِطرِ عَلَى الحُرِّ وَالمَملُوكِ، رقم: ١٥١١، ١٥١٢

(2) صحیح البخاری، بَابُ صَاعٍ مِن زَبِیبٍ، رقم: ١٥٠٨

(3) صحیح البخاری، بَابُ الصَّدَقَةِ قَبلَ العِیدِ، رقم: ١٥٠٩

ابو سعید خدری فرماتے ہیں: ''ہمارا کھانا جو، منقیٰ، پنیر اور کھجوریں ہوتا تھا۔''[1]

علمائے کرام نے اس پر قیاس کر کے ہر اس چیز کو اس حکم میں شامل کیا ہے جسے لوگ خوراک کے طور پر استعمال کرنے لگیں مثلاً چاول، دالیں وغیرہ۔ وہ کہتے ہیں: صدقہ فطر ادا کرنے والے کو چاہیئے کہ اس چیز کا ایک صاع ادا کرے جو علاقے کی عام غذا ہو۔

لیکن کیا غذائی اجناس کے بجائے ان کی قیمت درہم و دینار کی صورت میں ادا کی جا سکتی ہے؟ اس کے جواب میں علما کی مختلف آرا ہیں۔ اکثر علمائے کرام اس کی اجازت نہیں دیتے۔ وہ کہتے ہیں کہ صدقہ فطر میں غذائی اجناس ادا کرنا ہی اصل مقصود ہے۔ بالخصوص اس لئے بھی کہ نقد رقم کا غلط استعمال کیا جا سکتا ہے۔ بعض غریب لوگ رقم کو حرام اِخراجات میں خرچ کر سکتے ہیں۔ جبکہ اُحناف اور ان کی رائے سے اتفاق کرنے والے دیگر علما مقصود کا لحاظ رکھتے ہیں، وہ کہتے ہیں: صدقہ فطر کا مقصد یہ ہے کہ محتاجوں کو اس دن سوال کرنے کی ضرورت نہ رہے۔ یہ مقصد جس طرح غلہ دینے سے حاصل ہوتا ہے، اسی طرح دوسری چیز سے بھی حاصل ہو جاتا ہے۔ بلکہ بعض اوقات قیمت ادا کرنا زیادہ بہتر ہوتا ہے۔ اس لئے کہ اس سے اس کی حاجت زیادہ پوری ہوتی ہے، اور وہ اس کے لئے زیادہ مفید ہوتا ہے۔

بعض علماء فرماتے ہیں: جو چیز غریب آدمی کے لئے زیادہ مفید، اور اس کی ضرورت کو بہتر طور پر پورا کرنے والی ہو، اس کا لحاظ رکھا جائے، وقت اور مقام کی تبدیلی سے یہ چیز بھی تبدیل ہو جاتی ہے۔ محمد بن سلمہ کہتے ہیں: ''خوشحالی کے ایام میں قیمت ادا کرنا مجھے زیادہ پسند ہے، اور سختی (غذائی قلت) کے ایام میں گندم ادا کرنا مجھے زیادہ پسند ہے۔''

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے بیان کیا ہے کہ بغیر حاجت کے اور بغیر راجح فائدہ کے قیمت (نقد رقم) ادا کرنا ممنوع ہے۔ لیکن ان کے نزدیک حاجت، فائدہ اور انصاف کو مدنظر رکھتے ہوئے قیمت ادکرنا بھی جائز ہے۔ (دیکھئے: مجموع الفتاویٰ: ۲۵/۸۲،۸۳)

اس لئے متاخرین میں سے اکثر علما نے اس مسئلہ میں امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے قول کو ترجیح دی ہے کیونکہ نقد رقم سے ضرورت جس طرح پوری ہوتی ہے، دوسری اشیا سے نہیں ہوتی، اور غریبوں کو صرف خوراک ہی کی ضرورت نہیں ہوتی، بعض اوقات انہیں کھانے پینے سے زیادہ لباس یا دوا کی ضرورت ہو سکتی ہے۔

صدقہ فطر کی جگہ غذائی اشیا کے کوپن تقسیم کرنا؟

سوال: کیا غذائی اشیا دینے کے بجائے یہ جائز ہے کہ اسلامی مرکز مسلمانوں سے ایک اندازے کے

[1] صحیح البخاری، بَابُ الصَّدَقَةِ قَبْلَ العِیدِ، رقم: ۱۵۱۰

مطابق صدقہ فطر کی نقد رقم وصول کر لے۔ پھر غذائی اشیا کے دکان داروں کے تعاون سے ایسے کارڈ یا کوپن جاری کرے جو غریبوں اور مسکینوں کو دے دیے جائیں، تاکہ وہ ان کے ذریعے جب چاہیں اپنی ضرورت کے مطابق غذائی اشیا حاصل کر سکیں؟

جواب: اس تصور میں غالباً دو اجتہاد جمع ہو گئے ہیں جو اس مسئلہ میں وارد ہیں۔ اس سے یہ تسلی بھی ہو جاتی ہے کہ صدقہ فطر کی رقم صرف غذائی اشیا پر صرف ہو جیسے اکثر فقہا کا قول ہے، اس کے ساتھ ساتھ غذائی اشیا کے انتخاب کی اور ضرورت کے وقت میسر آنے کی سہولت بھی حاصل ہو جاتی ہے۔ بجائے اس کے کہ غریب آدمی کے پاس غلے کا ڈھیر لگ جائے جس کی اس کو ضرورت نہ ہو، یا ضرورت ہو لیکن دوسری اشیا سے کم ضرورت ہو، اور بجائے اس کے غریب آدمی کے پاس اتنا غلہ جمع ہو جائے جسے سنبھالنا اور سٹور کرنا اس کے لئے مشکل ہو، اس تصور سے یہ موقع ملتا ہے کہ غلہ اُٹھائے پھرنے کی بجائے وہ یہ کوپن لے لے جن سے وہ اپنی مرضی کے مطابق، اور ضرورت کے وقت کھانے پینے کی چیز حاصل کر سکتا ہے۔ اس طرح وہ نہ ان غذائی اشیا کو وصول کرنے پر مجبور ہوتا ہے جن کی اسے ضرورت نہیں، نہ اس وقت وصول کرنے پر مجبور ہوتا ہے جب اسے ضرورت نہیں ہوتی۔ اور پھر غذائی اشیا کے دائرہ سے باہر بھی نہیں نکلتا، جبکہ صدقہ فطر کے مسئلہ میں اکثر فقہا اس دائرہ تک محدود رہتے ہیں۔ اس طرح صدقہ فطر کا مقصود کامل ترین انداز سے پورا ہو جاتا ہے۔ اور کسی معاملہ میں جب شارع کا مقصود معلوم ہو، تو اس کو حاصل کرنے کے لئے وہ راستہ اختیار کرنا چاہئے جس سے اس کا حصول زیادہ ممکن ہو۔ واللہ اعلم

صدقہ فطر کے مال سے کپڑوں کی تقسیم کر دینا؟

سوال: کیا صدقہ فطر کی رقم سے کپڑے خرید کر ان افراد یا خاندانوں کو دیے جا سکتے ہیں جن کے پاس ضرورت کے مطابق لباس نہیں ہے؟

جواب: اگر امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ اور ان کے ہم خیال علما کا قول پیش نظر رکھا جائے، جو صدقہ فطر میں قیمت ادا کرنا جائز سمجھتے ہیں اور اس مقام پر اس اجتہاد کا اعتبار کیا جا سکتا ہے تو اس کی یہ صورت بھی ہو سکتی ہے کہ غریب آدمی کو اس رقم کا مالک بنا دیا جائے اور وہ اپنی مرضی سے حسبِ ضرورت اسے خرچ کرے۔ سوائے اس صورت کے کہ یہ غریب لوگ یتیم بچے ہوں یا کم عقل ہوں اور صدقہ فطر کا منتظم ہی ان کا سرپرست ہو۔ لیکن یہ فرض کر لینا کہ تمام حاجت مند کم عقل ہیں، جن کے معاملات کے نگران اور ان کی طرف سے ان کے مال میں تصرف کرنے والے وہی ہیں جو صدقہ فطر ادا کرنے والے ہیں، تو یہ سوچ درست نہیں، واللہ اعلم

صدقہ فطر کو عید سے چند روز قبل تقسیم کرنا؟

سوال: کیا یہ جائز ہے کہ صدقہ فطر شریعت کی طرف سے مقرر کردہ وقت سے پہلے ہفتہ وار چھٹی کے دن تقسیم کر دیا جائے۔ کیونکہ اس دن رضا کارانہ کام کرنے والے افراد زیادہ تعداد میں مل سکتے ہیں، جو کسی دوسرے وقت دستیاب نہیں ہوتے؟

جواب: صدقہ فطر کا اصل مقصد یہ ہے کہ عید کے دن غریبوں کو مانگنے کی ضرورت نہ رہے، لہٰذا یہ صدقہ ان تک اس انداز سے پہنچنا چاہیئے کہ یہ مقصد حاصل ہو جائے۔ اسے نمازِ عید سے موخر کرنا جائز نہیں کیونکہ نبی ﷺ نے حکم دیا ہے کہ وہ نمازِ عید کے لئے نکلنے سے پہلے ضرور ادا کر دیا جائے اور فرمایا: ''جس نے اسے نماز سے پہلے ادا کیا تو یہ مقبول صدقہ ہے، اور جس نے نمازِ (عید) کے بعد ادا کیا، تو وہ صدقوں میں سے ایک (عام) صدقہ ہے۔''[1]

اس کی ادائیگی نمازِ عید سے متصل پہلے یعنی فجر کی نماز اور عید کی نماز کے درمیان بھی ہو سکتی ہے بلکہ عید کی رات کو بھی ہو سکتی ہے۔ اسے عید سے ایک دو دن پہلے بھی ادا کیا جا سکتا ہے جیسے ابن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے اور یہی عام فقہا کی رائے ہے۔ بعض علما کے قول کے مطابق آدھا مہینہ پہلے بلکہ مہینے (رمضان) کے شروع میں بھی درست ہے۔ میرے خیال میں اس امر کا تعلق صدقہ فطر کے شرعی مقصد سے ہے اور وہ مقصد ہے عید کے دن حاجت مندوں کو مانگنے کی ضرورت نہ رہنے دینا۔ چونکہ عید سے پہلے ادا کرنے سے بھی یہ مقصد حاصل ہو جاتا ہے، اس لئے اس معاملے میں گنجائش ہے۔ واللہ اعلم

صلوٰۃ الجنائز (نمازِ جنازہ)

غیر محرم عورت کے جنازے کو کندھا دینا:

سوال: غیر محرم عورت کے جنازے کو غیر مرد اٹھا سکتا ہے یا نہیں؟

جواب: امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی ''صحیح'' میں تبویب قائم کی ہے: «بَابُ حَمْلِ الرِّجَالِ الْجَنَازَةَ دُونَ النِّسَآءِ» یعنی جنازہ صرف مرد اٹھائیں۔ عورتیں نہ اٹھائیں۔ پھر اس کے تحت مشہور حدیث بیان کی ہے کہ

''رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب جنازہ تیار ہو جاتا ہے اور مرد اُسے اپنی گردنوں پر اٹھا لیتے ہیں، تو وہ واویلا کرتا ہے کہ مجھے کہاں لے چلے ہو؟ میت کی اس آواز کو انسان کے ماسوا ہر شی سنتی ہے

---

[1] سنن ابن ماجه، بَابُ صَدَقَةِ الْفِطْرِ، رقم: ۱۸۲۷، سنن أبي داؤد، بَابُ زَكَاةِ الْفِطْرِ، رقم: ۱۶۰۹

اور اگر زندہ انسان اس آواز کو سن لے تو وہ مر جائے۔''

اس حدیث میں جنازہ کو اٹھانے والے مَردوں میں مَحرم اور غیر محرم کی تفریق روا نہیں رکھی گئی۔

لہٰذا عمومِ حدیث کے اعتبار سے غیر محرم کے جنازے کو اٹھانے کا جواز معلوم ہوتا ہے۔ مصنف امام بخاری رحمہ اللہ کا فہم بھی یہی معلوم ہوتا ہے۔ (واللہ أعلم بالصواب)

غیر محرم عورت کے جنازے کو کندھا دینا اور قبر میں اتارنا جائز ہے؟

سوال: کیا شرعی طور پر کوئی ایسا حکم ہے کہ عورت کے جنازے کو غیر محرم کندھا نہیں دے سکتا اور نہ قبر میں ہی اتار سکتا ہے۔؟

جواب: عورت کے جنازے کو غیر محرم کندھا دے سکتا ہے۔ شرعاً اس میں کوئی پابندی نہیں۔ حدیث کے الفاظ «وَاحتَمَلَهَا الرِّجَالُ عَلٰی أَعنَاقِهِم» سب کو شامل ہیں۔ [1]

اسی طرح قبر میں محرم یا کوئی دوسرا نیک صالح آدمی اتار سکتا ہے۔ ملاحظہ ہو! (صحیح بخاری) [2]

نمازِ جنازہ میں ثناء پڑھنی چاہیے یا نہیں؟

سوال: نمازِ جنازہ میں ثناء پڑھنی چاہیے یا نہیں؟

جواب: نمازِ جنازہ میں ثناء پڑھنی ثابت نہیں۔ (ملاحظہ ہو: احکام الجنائز علامہ البانی رحمہ اللہ)

سوال: آدھی نمازِ جنازہ سری اور آدھی جہری پڑھنے کی وضاحت؟

جواب: امام شوکانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

« وَالظَّاهِرُ اَنَّ الجَهرَ، وَالِاسرَارَ بِالدُّعَاءِ جَائِزَانِ » [3]

''ظاہر یہ ہے کہ جہری اور سری دعا دونوں طرح جائز ہے۔''

نمازِ جنازہ میں سورہ فاتحہ کی قراءت پر اعتراضات کا جائزہ

ماہنامہ ''محدث'' اور ہفت روزہ ''الاعتصام'' مؤرخہ ۱۵/ دسمبر ۲۰۰۰ء میں جنازہ کے بعد مروّجہ دعا کے سلسلہ میں حنفی، بریلوی فتویٰ کے تعاقب میں میرا ایک فتویٰ شائع ہوا۔ اس میں ضمناً جنازہ میں سورۂ فاتحہ کی

---

[1] صحیح بخاری، بَابُ حَملِ الرِّجَالِ الجِنَازَةَ دُونَ النِّسَاءِ، رقم: ۱۳۱٤

[2] صحیح البخاری، بَابُ مَن یَدخُلُ قَبرَ المَرأَةِ، رقم: ۱۳٤۲

[3] نیل الأوطار: ٤/ ۷۰

قرات کا مسئلہ بھی زیر بحث آیا۔اس پر اسلام آباد سے محترم ابوبکر صدیق صاحب بایں الفاظ معترض ہیں:

''بخاری میں اس سلسلہ کی کوئی مسند روایت کہاں ہے؟ اس بات کے ضعف کا آپ کو اندازہ تھا، اس لئے گول مول الفاظ استعمال کر کے قارئین کو یہ تاثر دیا گیا گویا بخاری میں کوئی مرفوع حدیث اس سلسلہ میں موجود ہے۔ اگر اس باب میں مرفوع حدیث ہوتی تو بحوالہ ابن حجر رحمہ اللہ حضرت ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ اور ابن عمر رضی اللہ عنہ جیسے جلیل القدر صحابہ قراءتِ فاتحہ کیوں نہ کرتے؟''

قارئین کرام! اس وقت بنیادی طور پر اس بات کا جائزہ لینا مقصود ہے کہ کیا نمازِ جنازہ میں قراءۃ فاتحہ ثابت ہے یا نہیں؟

(۱) پہلے صحیح بخاری میں باب قراءۃ فاتحۃ الکتاب علی الجنازۃ کے تحت مشارٌ الیہ حدیث ملاحظہ فرمائیں۔حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ

''انہوں نے ایک جنازہ پر نماز پڑھی، جس میں سورۃ فاتحہ پڑھی اور فرمایا (میں نے فاتحہ اس لئے پڑھی ہے) تاکہ تم جان لو کہ جنازہ میں سورہ فاتحہ پڑھنا سنت ہے''[1] --- اور حاکم کی روایت میں ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے ایک جنازہ میں الحمد جہر سے پڑھی، پھر فرمایا: میں نے جہر سے اس لئے پڑھا ہے تاکہ تم لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ جنازہ میں الحمد پڑھنا سنت ہے۔''[2]

(۲) اور حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نمازِ جنازہ میں سنت یہ ہے کہ نمازی سورۂ فاتحہ پڑھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجے، پھر میت کے واسطے اِخلاص کے ساتھ دعا کرے اور قراءت صرف ایک ہی مرتبہ کرے، پھر سلام پھیرے۔ ملاحظہ ہو کتاب فضل الصلاۃ علی النبی صلی اللہ علیہ وسلم اور المنتقی ابن جارود۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس حدیث کے راوی صحیحین کے رواۃ ہیں: کذا فی النیل۔

(۳) امام عبدالرزاق اور نسائی رحمہما اللہ نے حضرت ابواُمامہ رضی اللہ عنہ سے بیان کیا ہے کہ ''نمازِ جنازہ میں سنت طریقہ یہ ہے کہ نمازی اللہ اکبر کہے پھر سورۂ فاتحہ پڑھے۔ اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجے۔ پھر میت کے لئے اِخلاص کے ساتھ دعا کرے اور قراءت صرف پہلی تکبیر میں کرے''۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ إسنادہ صحیح ''اس کی سند صحیح ہے''۔[3]

---

[1] صحیح البخاری، الجنائز، بَابُ قِرَاءَۃِ فَاتِحَۃِ الکِتَابِ عَلَی الجَنَازَۃِ، رقم: ۱۳۳۵

[2] مستدرک علی الصحیحین للحاکم، کِتَابُ الْجَنَائِزِ، رقم: ۱۳۲۳

[3] مصنف عبدالرزاق، بَابُ الْقِرَاءَۃِ وَالدُّعَاءِ فِي الصَّلَاۃِ عَلَی الْمَیِّتِ، رقم: ۶۴۲۸، سنن النسائی، الدُّعَاءُ، رقم: ۱۹۸۹

(۴) سنن ترمذی میں مروی ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے ایک جنازہ پڑھایا تو فاتحہ پڑھی۔ طلحہ بن عبداللہ بن عوف کہتے ہیں کہ میں نے اس کے متعلق دریافت کیا تو انہوں نے فرمایا: إنه من السنة او من تمام السنة ''کہ نمازِ جنازہ میں فاتحہ سنت ہے، یا اس سے سنت کی تکمیل ہوتی ہے۔'' (1)

پھر یہ مسلمہ حقیقت ہے کہ جنازہ کو نماز سے موسوم کیا گیا ہے جس کی دلیل نبی اکرم ﷺ کے یہ فرامین ہیں: من صلی علی الجنازة۔۔۔ ، صلوا علی صاحبکم، صلوا علی النجاشی امام بخاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ''رسول اللہ ﷺ نے اسے نماز کہا ہے حالانکہ اس میں رکوع ہے نہ سجود، اس میں کلام نہ کرے اور اس میں تکبیر اور تسلیم ہے۔''

پھر یاد رہے کہ حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ کی صحیح حدیث لا صلاة لمن لم یقرا بفاتحة الکتاب کا عموم نمازِ جنازہ کو بھی شامل ہے۔

اس بحث میں جو اہم شے قابل التفات ہے، وہ یہ ہے کہ صحابی کا کسی فعل یا عمل کو سنت قرار دینے سے کیا وہ واقعی سنتِ نبوی قرار پائے گا؟ اس سے متعلق امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

« واصحاب النبی لا یقولون بالسنة والحق إلا لسنة رسول الله ﷺ ، إن شاء الله»

''نبی اکرم ﷺ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سنت اور حق کا اطلاق صرف سنت رسول ﷺ کے لیے ہی کرتے تھے''

اور امام نووی نے المجموع (۲۲۴/۵) میں اسی کو صحیح مذہب قرار دیا اور کہا ہے کہ اصول میں ہمارے اصحاب میں سے جمہور علماء اور دیگر اُصولی اور محدثین اسی بات کے قائل ہیں۔ محقق علامہ ابن ہمام رحمہ اللہ حنفی نے التحریر میں اسی بات کو قطعی قرار دیا ہے۔ اس کے شارح ابن امیر حاج کہتے ہیں: ہمارے متقدمین اصحاب کا یہی قول ہے۔ صاحبِ میزان، رافع اور جمہور محدثین نے اسی کو اختیار کیا ہے۔ (۲۲۴/۲)

پھر تعجب کی بات یہ ہے کہ اثباتِ سنت کے باوجود حنفیہ کا اس صحیح حدیث پر عمل نہیں حالانکہ ان کے اصول کے مطابق ہے۔ موطا امام محمد میں ہے: لاقراء ة علی الجنازة وھو قول ابی حنیفة جنازہ میں عدمِ قراءت ہے اور امام ابوحنیفہ کا یہی قول ہے۔ متاخرین حنفیہ نے جب بنظر غائر اسی کو صحیح پایا اور صحیح حدیث کے مقابلہ میں اپنے مسلک کو مرجوح دیکھا تو اس کی تاویل انہوں نے اس طرح کی کہ فاتحہ کی

(1) سنن الترمذی، بَابُ مَا جَاءَ فِی الْقِرَاءَةِ عَلَی الْجَنَازَةِ بِفَاتِحَةِ الْکِتَابِ، رقم: ۱۰۲۷، مصنف عبدالرزاق، بَابُ الْقِرَاءَةِ وَالدُّعَاءِ فِی الصَّلَاةِ عَلَی الْمَیِّتِ، رقم: ٦٤٢٧

قراءت کا جواز تو ہے بشرطیکہ نمازی دعا اور ثنا کی نیت کرے۔ یہ محض اس زعم کی بنا پر ہے کہ حدیث اور قولِ امام میں تطبیق ہو سکے۔ گویا کہ امام صاحب کا قول دوسری ایک حدیث ہے حالانکہ یہ شرط (تاویل) فی نفسہ باطل ہے۔ جب ایک حدیث ثابت ہے تو پھر عمل اسی پر ہونا چاہیے۔

دوسری عجیب بات یہ ہے کہ حنفیہ کے ہاں تکبیر اولیٰ کے بعد نمازِ جنازہ میں ثنا پڑھنا جنازہ کی سنتوں میں شمار ہوتا ہے حالانکہ سنت میں اس کی کوئی اصل نہیں۔ ملاحظہ فرمایئے کہ جو شے ثابت ہے، احناف اس کا انکار کرتے ہیں اور جو ثابت نہیں، اس کے اثبات کی ناکام سعی کرتے ہیں تلك إذا قسمة ضيزى! علامہ ابن ہمام فتح القدیر (۱/۴۵۹) میں لکھتے ہیں کہ

''جنازہ میں فاتحہ نہ پڑھی جائے اِلا یہ کہ ثنا کی نیت ہو، قراءت رسول اللہ ﷺ سے ثابت نہیں۔''

عجب تضاد ہے، خود ہی اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ صحابی کا قولِ ''سنت'' مسند مرفوع کے حکم میں ہے جس کا نبی ﷺ تک اتصال ہوتا ہے جیسا کہ ابھی گزرا ہے پھر خود ہی اس قاعدہ کو مقامِ بحث میں ترک کر دیا ہے۔

نیز ہدایہ میں ہے کہ میت کی چارپائی اُٹھاتے ہوئے چاروں اَطراف سے پکڑا جائے۔ سنت میں اسی طرح آیا ہے۔ علامہ ابن ہمام نے اس پر دلیل یہ قائم کی ہے کہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: جو جنازہ کے پیچھے لگا، اسے چاہیے کہ سب طرفوں سے پکڑے: فإنه من السنة ، فوجب الحكم بان هذا هو السنة ''سنت طریقہ یہی ہے۔[1] یعنی اس طریقہ کار کو اختیار کرنا ہی سنت ہے۔

غور فرمایئے کہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے قول من السنة کو یہاں مرفوع کے حکم میں قرار دیا ہے جبکہ ابن عباس رضی اللہ عنہ کے قول إنها سنة سے عدمِ اعتناء کا مظاہرہ کیا ہے۔ اسے مذہبی تعصب کے علاوہ اور کیا نام دیا جا سکتا ہے؟ جبکہ اثر ابن مسعود رضی اللہ عنہ منقطع ہے اور ابن عباس رضی اللہ عنہما کا اثر صحیح بخاری وغیرہ میں۔

محترم! اب آپ خود ہی فیصلہ کیجئے کہ اتنے بڑے محقق کی بات پر تعجب کا اظہار نہ کیا جائے تو اور کیا جائے؟ مجھے اس بات کا اعتراف ہے کہ قلم سے بعض سخت جملے صادر ہوئے۔ عافاني الله۔ لیکن بنظر انصاف حقائق تک رسائی حاصل کرنا سب کا فرض ہے۔ حنفی علماء میں علامہ عبدالحیٔ لکھنوی رحمہ اللہ کافی حد تک انصاف پسند گزرے ہیں۔ عمدۃ الرعایہ (۱/۲۵۳) میں انہوں نے جنازہ میں فاتحہ پڑھنے کے مسلک کو دلیل

---

[1] سنن ابن ماجه، بَابُ مَا جَاءَ فِي شُهُودِ الْجَنَائِزِ، رقم:۱۴۷۸، السنن الكبرىٰ للبيهقي، بَابُ مَنْ حَمَلَ الْجِنَازَةَ فَدَارَ عَلَى جَوَانِبِهَا الْأَرْبَعَةِ، رقم:۶۸۳۴

کے اعتبار سے قوی قرار دیا ہے اور موطا امام محمد کے حاشیہ میں رقم طراز ہیں کہ

''فاتحہ پڑھنا ہی اولیٰ ہے کیونکہ یہ رسول اللہ ﷺ اور آپ کے صحابہ رضی اللہ عنہ سے ثابت ہے۔''

بلکہ انہوں نے یہاں تک کہا ہے کہ متاخرین علماءِ احناف نے جو جنازہ میں فاتحہ پڑھنے کو مکروہ لکھا ہے تو علامہ حسن الشرن بلالی نے اس کی تردید میں ایک مستقل رسالہ لکھا ہے جس کا نام ہے:

«النظم المستطاب بحكم القراء ة فى صلاة الجنازة بام الكتاب» ①

اور جن علماءِ احناف نے فاتحہ پڑھنے کی تاویل یوں کی ہے کہ بطورِ ثنا فاتحہ پڑھی جائے، ان کی تردید میں مولانا لکھنوی فرماتے ہیں کہ اگر اس قسم کی تاویلات کا دروازہ کھول دیا جائے تو بہت سی مسنون قراءات بھی ختم ہو کر رہ جائیں گی۔ پھر یہ دعویٰ فی نفسہ باطل ہے کیونکہ نیت کا تعلق تو باطن سے ہے جس پر نیت کرنے والے کے بتلائے بغیر مطلع ہونا ممکن نہیں۔ ②

دوسری طرف حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ اور ابن عمر رضی اللہ عنہ بلاشبہ جلیل القدر صحابہ ہیں۔ لیکن مسند روایات کے مقابلہ میں ان کے اقوال کو اختیار کرنا دن کی روشنی میں چراغ جلانے کے مترادف ہے۔ ویسے بھی صحابہ کرام کئی طرح سے عنداللہ معذور ہیں لیکن واضح دلائل ثابت ہونے کے بعد ہمارے لئے کوئی عذر باقی نہیں رہ جاتا۔

تعجب خیز بات یہ ہے کہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ جن پر فقہ حنفی کا انحصار ہے، وہ بھی جنازہ میں سورہء فاتحہ پڑھنے کے قائل ہیں۔ ان کے قول پر تو عمل نہیں کرتے دوسری طرف احناف حضرت ابوہریرہ کو تو غیر فقیہ قرار دیتے ہیں (جیسا کہ نورالانوار میں ہے) اس کے باوجود جنازہ میں فاتحہ پڑھنے کے سلسلہ میں ان کی بات کو تسلیم کرتے ہوئے ان کا ''غیر فقیہ'' ہونا انہیں نظر نہیں آتا۔ احناف کے ہاں ان دو صحابہ کی اگر اتنی ہی عظمت ہوتی جتنی ظاہر کر رہے ہیں تو وہ انکی روایات کو کبھی ردّ نہ کرتے حالانکہ واقعات اس کے خلاف ہیں۔ حدیث المصراۃ، حدیث التسبیع اور احادیث رفع الیدین وغیرہ اس امر کے واضح شواہد ہیں۔

احناف کی نماز جنازہ کو 'جھٹکا' سے تعبیر کرنا اگرچہ کسی حد تک سخت جملہ ہے لیکن امر واقعہ یہی ہے کہ نمازِ جنازہ میں یہ طرزِ عمل جہاں خلافِ سنت ہے وہاں میت سے عدم اعتنائی کا مظہر بھی ہے۔

اب آخری بات یہ ہے کہ میرا تعاقب چونکہ ایک خاص مکتبِ فکر کے حاملین سے متعلق تھا۔ ظاہر ہے اس

---

① التعليق الممجد: ص: ١٦٥

② غيث الغمام: ص: ٣١٨

کے حقیقی مخاطب وہ لوگ ہیں جو اس بدعت کے موجد ہیں نہ کہ جملہ اَحناف، اگرچہ فقہی مسلک میں دیوبندی اور بریلوی سب متفق ہیں۔ مجھے قوی اُمید ہے کہ یہ چند گزارشات آپ کی تشفی کے لئے کافی ہوں گی۔ اللہ ربّ العزت ہم سب کو صراطِ مستقیم پر چلنے کی توفیق مرحمت فرمائے۔ آمین!

نمازِ جنازہ میں سورۃ فاتحہ کا پڑھنا:

سوال (۱) نمازِ جنازہ میں سورۃ فاتحہ کا پڑھنا۔ (۲) نمازِ جنازہ میں دوسری نمازوں کی طرح سورۂ فاتحہ کے بعد کوئی اور سورت ملانا۔ (۳) اور جنازے کی دعائیں بلند آواز سے پڑھنا۔ کیا یہ تینوں باتیں قرآن و حدیث سے ثابت ہیں؟ اگر ایسا نہیں تو کیا ایسے امام کے پیچھے نمازِ جنازہ پڑھنا درست ہے؟ اور یہ جنازہ ادا ہو گیا یا اس کا اعادہ ضروری ہے؟

جواب: (۱) نمازِ جنازہ میں فاتحہ پڑھنی مسنون ہے۔ حدیث میں ہے:« وَاِذَا صَلّٰی عَلَیهِ کَبَّرَ، ثُمَّ قَرَأَ الفَاتِحَة» یعنی جب آپ میت پر نماز پڑھتے تو تکبیر کہتے پھر فاتحہ پڑھتے۔[1]

اس کی سند صحیح ہے۔ پھر صحیح حدیث کا عموم بھی ہے «لَا صَلٰوةَ لِمَن لَّم یَقرَأ بِفَاتِحَةِ الکِتَاب»[2] یعنی ''جس نے نماز میں فاتحہ نہ پڑھی، اس کی کوئی نماز نہیں۔'' یہ بھی اس کی مشروعیت پر دالّ ہے۔ کیونکہ شریعت نے جنازہ کا نام بھی نماز ہی رکھا ہے اور کسی بھی نماز کا وجود بلا فاتحہ نہیں۔ اسی طرح طلحہ بن عبد اللہ بن عوف کا بیان ہے، کہ میں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی اقتداء میں ایک جنازہ پڑھا، تو انھوں نے ''سورۃ فاتحہ'' پڑھی اور فرمایا: کہ تم کو معلوم ہونا چاہیے یہ سنت طریقہ ہے۔[3]

(۲) سورہ فاتحہ کے بعد جنازہ میں سورت ملانے کا جواز ہے۔ چنانچہ زید بن طلحہ سے مروی ہے، کہ میں نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے سنا:« قَرَأَ عَلٰی جَنَازَةٍ فَاتِحَةَ الکِتَابَ وَ سُورَةً وَ جَهَرَ بِالقِرَاءَةِ »[4]

یعنی ''انھوں نے جنازہ میں فاتحہ اور ایک سورت پڑھی اور قرأت جہری کی۔''

---

[1] اخرجه الطیالسی: ۱/۱۶۳، ابن ابی شیبه: ۳/۲۱۲، ابوداؤد: ۳۱۹۴، سنن الترمذی، بَابُ مَا جَاءَ فِی القِرَاءَةِ عَلَی الجَنَازَةِ بِفَاتِحَةِ الکِتَابِ، رقم: ۱۰۲۷، سنن ابن ماجه، بَابُ مَا جَاءَ فِی القِرَاءَةِ عَلَی الجَنَازَةِ، رقم: ۱۴۹۵

[2] صحیح البخاری، بَابُ وُجُوبِ القِرَاءَةِ لِلإِمَامِ وَالمَأمُومِ ......الخ، رقم: ۷۵۶

[3] صحیح البخاری، الجنائز، بَابُ قِرَاءَةِ فَاتِحَةِ الکِتَابِ عَلَی الجَنَازَةِ، رقم: ۱۳۳۵

[4] المنتقی لابن الجارود، کِتَابُ الجَنَائِزِ، رقم: ۵۳۶، مصنف ابن ابی شیبة، مَن کَانَ یَقرَأُ عَلَی الجَنَازَةِ بِفَاتِحَةِ الکِتَابِ، رقم: (۱۱۴۰۰)

اسی طرح طلحہ بن عبداللہ کے طریق سے ہے، کہ میں نے ابن عباس رضی اللہ عنہما کے پیچھے نمازِ جنازہ پڑھی:

« فَقَرَأَ بِفَاتِحَةِ الكِتَابِ وَ سُورَةً، فَجَهَرَ حَتّٰی سَمِعنَا » (1)

یعنی ''ابن عباس رضی اللہ عنہما نے جنازہ میں سورۃ فاتحہ اور ایک سورت پڑھی۔ پس اسے جہری پڑھا، حتی کہ ہم نے سنا۔''

اور صاحب ''عون المعبود'' فرماتے ہیں:

« وَهٰذِهِ الأَحَادِيثُ فِيهَا دَلَالَةٌ وَاضِحَةٌ عَلٰی مَشرُوعِيَّةِ فَاتِحَةِ الكِتَابِ فِي صَلَاةِ الجَنَازَةِ. وَ فِيهَا دَلَالَةٌ أَيضًا عَلٰی جَوَازِ قِرَاءَ ةِ سُورَةٍ مَعَ الفَاتِحَةِ فِي صَلَاةِ الجَنَازَةِ.»(۱۹۱/۳)

یعنی ان احادیث میں واضح طور پر دلالت ہے کہ نمازِ جنازہ میں فاتحہ پڑھنی مشروع ہے اور ان میں یہ بھی ہے کہ نمازِ جنازہ میں فاتحہ کے ساتھ سورت ملانی بھی جائز ہے۔

نیز امام ابن حزم "المحلّٰی" میں فرماتے ہیں:

« صَلّٰی المِسوَرُ بنُ مَخرَمَةَ ، فَقَرَأَ فِي التَّكبِيرَةِ الأُولٰی بِفَاتِحَةِ الكِتَابِ ، وَسُورَةً قَصِيرَةً ، وَ رَفَعَ بِهِمَا صَوتَهُ.»

یعنی مسور بن مخرمہ نے نمازِ جنازہ پڑھائی۔ پہلی تکبیر کے بعد میں فاتحہ اور چھوٹی سی سورت پڑھی، اور ان دونوں کو بلند آواز سے پڑھا۔

(۳) پہلے گزر چکا ہے کہ فاتحہ اور سورت کو بآواز بلند پڑھا گیا اور جہاں تک دیگر دعاؤں کا تعلق ہے۔ سو اس بارے میں حضرت عوف بن مالک رضی اللہ عنہ کا بیان ہے، کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک جنازہ پڑھایا:

« فَحَفِظتُ مِن دُعَائِهِ ، وَ هُوَ يَقُولُ: اَللّٰهُمَّ اغفِر لَهُ وَ ارحَمهُ......» الخ (2)

''پس میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا سے یاد کیا، کہ آپ فرما رہے تھے:«اَللّٰهُمَّ اغفِر لَهُ وَارحَمهُ ......الخ »

ظاہر ہے کوئی شے دوسرے سے تب ہی یاد ہو سکتی ہے جب اسے بلند آواز سے پڑھا جائے اور لفظ "يَقُولُ" بھی اس بات کا متقاضی ہے، کیونکہ اس کا اطلاقِ عام بلا قرینہ صارفہ بالجھر پر ہوتا ہے (اس کے

(1) المنتقی لابن الجارود، كِتَابُ الجَنَائِزِ ،رقم:۵۳۷

(2) صحیح مسلم،بَابُ الدُّعَاءِ لِلمَيِّتِ فِي الصَّلَاةِ،رقم:۹۶۳

عام حکم سے پھیرنے والی کوئی دلیل موجود نہ ہو، تو پھر بلند آواز سے پڑھنا مراد ہوتا ہے)، نیز دیگر بعض روایات میں لفظ "فَهِمتُ" اس کے منافی نہیں ہے، کیونکہ فہم کی بناء حفظ پر ہے۔

"اَلمُنتقٰی" میں حضرت عوف بن مالک رضی اللہ عنہ کی روایت میں لفظ «سَمِعتُ النَّبِیَّ ﷺ» ہے جب کہ واثلہ بن الاسقع رضی اللہ عنہ کی روایت میں "فَسَمِعتُهُ" کے الفاظ ہیں۔ علامہ شوکانی رحمہ اللہ اس پر رقمطراز ہیں:

« جَمِیعُ ذٰلِكَ یَدُلُّ عَلٰی أَنَّ النَّبِیَّ ﷺ جَهَرَ بِالدُّعَاءِ » [1]

"یہ تمام الفاظ اس بات پر دلالت کرتے ہیں، کہ نبی ﷺ نے دعا کو بلند آواز سے پڑھا ہے۔"

اور امام بخاری رحمہ اللہ نے بایں الفاظ تبویب قائم کی ہے:

«بَابُ قِرَاءَةِ فَاتِحَةِ الکِتَابِ عَلَی الجَنَازَةِ. وَ قَالَ الحَسَنُ: یَقرَأُ عَلَی الطِّفلِ بِفَاتِحَةِ الکِتَابِ»

"جنازے پر سورہ فاتحہ پڑھنے کا بیان۔ حضرت حسن نے کہا کہ آپ ﷺ بچے کی نمازِ جنازہ میں سورۂ فاتحہ پڑھتے تھے۔"

یاد رہے اس بحث کا تعلق صرف جوازِ جہر سے ہے لا غیر (نہ کہ کوئی اور) مذکورہ تینوں مسئلوں میں بالاختصار شریعت کی روشنی میں وضاحت ہو چکی، جو راہنمائی کے لیے کافی ہے۔ تاہم امام ایسا شخص مقرر کرنا چاہیے جس میں اتباعِ سنت کا جذبہ موجزن ہو۔ واللہ ولی التوفیق۔

نمازِ جنازہ میں سورۃ فاتحہ پڑھنا:

سوال: نمازِ جنازہ میں سورۃ فاتحہ پڑھنا۔

(۱) ...... صحیح بخاری میں حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

« لَا صَلَاةَ لِمَن لَم یَقرَأ بِفَاتِحَةِ الکِتَابِ » [2]

"جس نے نماز میں فاتحہ نہ پڑھی اس کی نماز نہیں۔"

وجہِ استدلال یہ ہے کہ حدیث ہذا عموم کے اعتبار سے نمازِ جنازہ کو بھی شامل ہے، اس لیے کہ نبی ﷺ نے اس کا نام بھی نماز رکھا ہے۔ چنانچہ فرمایا: «مَن صَلّٰی عَلَی الجَنَازَةِ » نیز فرمایا: « صَلُّوا عَلٰی

---

[1] نیل الأوطار: ٤/٦٩

[2] صحیح البخاری، باب وُجُوبِ القِرَائَةِ لِلإِمَامِ وَالمَامُومِ فِی الصَّلٰوةِ کُلِّهَا ...... الخ، رقم: ٧٥٦، صحیح مسلم: ٣٩٤

صَاحِبِكُم» اور دوسری روایت میں ہے:« صَلُّوا عَلَى النَّجَاشِي » امام بخاری رحمہ اللہ اپنی 'صحیح' کے (ترجمۃ الباب) میں رقمطراز ہیں:« سَمَّاهَا صَلَاةً لَيسَ فِيهَا رُكُوعٌ، وَلَا سُجُودٌ»

یعنی نمازِ جنازہ میں رکوع اور سجود نہ ہونے کے باوجود اللہ کے رسول ﷺ نے اس کا نام نماز رکھا ہے۔

②...... صحیح بخاری میں طلحہ بن عبداللہ بن عوف کا بیان ہے:

« صَلَّيتُ خَلفَ ابنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنهُ عَلٰى جَنَازَةٍ، فَقَرَأَ بِفَاتِحَةِ الكِتَابِ .قَالَ: لِتَعلَمُوا أَنَّهَا سُنَّةٌ »[1]

''میں نے ابن عباس رضی اللہ عنہ کی اقتداء میں نمازِ جنازہ پڑھی تو انھوں نے ''سورہ فاتحہ'' کی تلاوت کی۔فرمایا، یہ اس لیے کیا ہے تاکہ تمھیں اس کے سنت ہونے کا علم ہو جائے۔''

صحابہ کا کسی فعل کو'من السنۃ'، کہنا اکثر علماء کے نزدیک مرفوع حدیث کے حکم میں ہے۔امام شافعی رحمہ اللہ ''کتاب الام'' میں لکھتے ہیں کہ آنحضرت کے صحابہ رضی اللہ عنہم جب کسی فعل کو سنت کہتے ہیں، تو اس سے آپ ﷺ کی سنت مراد ہوتی ہے۔

''فتح الباری''(۲۰۴/۳) میں ہے:« وَقَد أُجمَعُوا عَلٰى اَنَّ قَولَ الصَّحَابِي سُنَّةٌ »

حدیث مسند ہے علمائے حنفیہ نے بھی متعدد فروع اسی اصل پر قائم کی ہیں مثلاً: ہدایہ میں ہے''اور جب میت کی چارپائی اٹھائیں تو اس کے چار پائے پکڑ کر اٹھائیں۔اس کے ساتھ سنت وارد ہے۔امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: سنت طریقہ یہ ہے کہ چارپائی کو دو شخص اٹھائیں۔اگلا شخص اپنی گردن پر رکھے اور پچھلا اپنے سینہ پر۔شارح ہدایہ ابن الہمام رحمہ اللہ امام شافعی رحمہ اللہ پر ردّ کرتے ہوئے لکھتے ہیں: امام شافعی کا یہ قول سنت کے خلاف ہے۔حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

« مَنِ اتَّبَعَ الجَنَازَةَ فَليَأخُذ بِجَوَانِبِ السَّرِيرِ كُلِّهَا فَاِنَّهُ مِنَ السُّنَّةِ »[2]

''جو شخص جنازے کے ساتھ جائے وہ باری باری اس کے سب جوانب سے پکڑ کر اٹھائے۔بے شک یہ مسنون ہے۔'' لہٰذا اس سنت پر عمل ضروری ہے۔

③...... ابوامامہ بن سہل بن حنیف رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نمازِ جنازہ میں سنت طریقہ یہ ہے، کہ امام پہلے تکبیر کہے، پھر فاتحہ پڑھے۔

---

① صحیح البخاری، بَابُ قِرَاءَةِ فَاتِحَةِ الكِتَابِ عَلَى الجَنَازَةِ،رقم: ۱۳۳۵

② سنن ابن ماجه،بَابُ مَا جَاءَ فِي شُهُودِ الْجَنَائِزِ ،رقم:۱۴۷۸

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: " إسناده صحيح" اس حدیث کی سند صحیح ہے۔ (۲۰۴/۳) نیز صحیح بخاری کے (ترجمۃ الباب) میں حضرت حسن سے منقول ہے: « يَقرأُ عَلَى الطِّفلِ بِفَاتِحَةِ الكِتَابِ» [1] بچے کی نمازِ جنازہ میں سورۃ فاتحہ پڑھی جائے۔

ابن المنذر نے حضرت عبداللہ بن مسعود، حسن بن علی، ابن زبیر اور مسور بن مخرمہ سے نمازِ جنازہ میں فاتحہ کی مشروعیت نقل کی ہے۔ نیز امام شافعی، امام احمد اور دیگر اہلِ علم نمازِ جنازہ میں فاتحہ اور ایک دیگر سورت کی قرأت کی مشروعیت کے قائل ہیں۔ حضرت مجاہد کہتے ہیں:

« سَأَلتُ ثَمَانِيَةَ عَشَرَ صَحَابِيًا، فَقَالُوا : يَقرَأُ » [2]

یعنی ''میں نے اس کے بارے میں اٹھارہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے دریافت کیا تو انھوں نے کہا: ''فاتحہ'' پڑھی جائے۔''

دوسری طرف علمائے حنفیہ ہیں، جو نمازِ جنازہ میں قرأت کے قائل نہیں ہیں۔ چنانچہ امام محمد ''الموطأ'' میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کا اثر نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

« وَ بِهٰذَا نَاخُذُ لَا قِرَاءَةَ عَلَى الجَنَازَةِ. وَ هُوَ قَولُ أَبِي حَنِيفَةِ » [3]

نیز صاحبِ ''ہدایہ'' صفت نمازِ جنازہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

« وَالبِدَاءَةُ بِالثَّنَاءِ، ثُمَّ بِالصَّلٰوةِ لِأَنَّهَا سُنَّةُ الدُّعَاءِ .»

یعنی پہلے ثناء اور پھر درود شریف پڑھے۔ کیونکہ دعا کا یہ مسنون طریقہ ہے۔

امام محمد رحمہ اللہ کے قول کی وضاحت کرتے ہوئے مولانا عبدالحی حاشیہ مؤطا پر لکھتے ہیں:

''ہوسکتا ہے کہ اس سے کراہت کی طرف اشارہ ہو جیسا کہ متاخرین میں سے اکثر حنفیہ نے تصریح کی ہے...... اور لکھا ہے کہ اگر دعا کے طور پر ''سورۃ فاتحہ'' پڑھ لی جائے تو کچھ حرج نہیں اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ امام محمد کی مراد لزوم کی نفی ہو، اور وہ جواز قرأت کے قائل ہوں۔ چنانچہ ہمارے متاخرین علماء میں سے حسن شرنبلالی نے اس کو اختیار کیا ہے اور انھوں نے اپنے رسالہ "النظم المستطاب" میں اس کی خوب وضاحت کی ہے اور جو علماء کراہت کے قائل ہیں، ان کی تردید کی ہے، اور لکھا ہے:

« وَ هٰذَا هُوَ الأَولٰى لِثُبُوتِ ذٰلِكَ عَن رَسُولِ اللّٰهِ ﷺ .»

---

[1] صحيح البخاري، بَابُ قِرَاءَةِ فَاتِحَةِ الكِتَابِ عَلَى الجَنَازَةِ

[2] رواه الاثرم حاشيه موطأ امام محمد

[3] مؤطا امام مالك، بَابُ: الصَّلَاةِ عَلَى المَيِّتِ وَالدُّعَاءِ رقم: ۳۱۱

''اور یہی بات اولیٰ ہے، کیونکہ رسول اللہ ﷺ اور آپ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے ثابت ہے۔''

مولانا عبدالحی نے ''التعلیق الممجد'' میں بھی ایسے ہی خیالات کا اظہار فرمایا ہے۔ قاضی ثناء اللہ حنفی مجددی بھی اپنے ''وصیت نامہ'' میں اس بات کے قائل ہیں۔ ①

امام طحاوی رحمہ اللہ وغیرہ نے بھی اپنے مسلک کی حمایت کے لیے احادیث قرأت کی تاویل کو ضروری خیال کیا ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

« مَن قَرَأَهَا مِنَ الصَّحَابَةِ يَحتَمِلُ أَن يَكُونَ عَلٰى وَجهِ الدُّعَاءِ، لَا التِّلَاوَةِ .»

''ممکن ہے جن صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے جنازے میں سورۂ فاتحہ پڑھی انھوں نے تلاوت وقرأت کی بجائے بطورِ دعا پڑھی ہو۔''

حالانکہ اس تاویل کی تردید کے لیے یہی کافی ہے، کہ احادیث میں تو ''فاتحہ الکتاب'' کی قرأت کے ساتھ ایک سورت کا بھی ذکر ہے، جس میں علی وجہ الدعا والی تاویل ممکن نہیں، اور پھر یہ محض دعویٰ ہے، جس پر کوئی دلیل نہیں۔ چنانچہ امام ابن حزم رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

« وَهٰذَا بَاطِلٌ لِأَنَّهُم ثَبَتَ عَنهُمُ الاَمرُ بِالقِرَائَةِ وَ اِنَّهَا سُنَّتُهَا فَقَولُ مَن قَالَ : لَعَلَّهُم قَرَائُوهَا دُعَائًا كَذِبٌ بُحتٌ .»

یعنی ''بطورِ دعا والا نظریہ باطل ہے۔ کیونکہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے قرأت کا حکم ثابت ہے اور یہ نمازِ جنازہ میں مسنون ہے۔ پس جن لوگوں نے کہا ہے، کہ ممکن ہے انھوں نے فاتحہ کو بطورِ دعا پڑھا ہو سفید جھوٹ ہے۔''

ان اصحابِ قیاس پر تعجب ہے کہ ایک طرف تو نمازِ جنازہ کو نماز کہتے ہیں، اس میں تکبیر، استقبالِ قبلہ، امامتِ رجال، طہارت، سلام واجب قرار دیتے ہیں، اور پھر قرأت کو ساقط کرتے ہیں۔ حالانکہ حدیث «لَا صَلَاةَ اِلَّا بِفَاتِحَةِ الكِتَابِ » ② اپنے عموم کے اعتبار سے نمازِ جنازہ کو بھی شامل ہے۔ لہٰذا سابقہ دلائل کے بعد ان بے اصل تاویلات کی قطعاً کوئی اہمیت نہیں۔ اب جنازے میں سورۃ الفاتحہ کا پڑھنا جائز کی بجائے واجب ماننا ضروری معلوم ہوتا ہے۔

پھر یہاں اس بات کا ذکر بھی ضروری ہے کہ حنفیہ کے نزدیک سُبحَانَكَ اللّٰهُمَّ پڑھنا مسنون ہے۔

① فتاویٰ مفید الاحناف، ص:٢

② صحیح البخاری، باب وُجُوبِ القِرَائَةِ لِلاِمَامِ وَالمَامُومِ فِی الصَّلٰوةِ كُلِّهَا ...... الخ، رقم:٧٥٦، صحیح مسلم:٣٩٤

حالانکہ جنازے میں اس کا اصلاً ثبوت ہی نہیں ہے (جیسا کہ امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ وغیرہ نے تصریح کی ہے) اورقرأت کی نفی کرتے ہیں جو کہ احادیث وآثار سے ثابت ہے۔(کتاب احکام جنائز)

لہٰذا ابن عباس رضی اللہ عنہ کی روایت کے صحیح طرق سے صرفِ نظر کرکے محض ضعیف طریق پر اعتماد کر بیٹھنا سراسر بے انصافی اور مسلک پروری ہے۔ امید ہے راہِ حق کے متلاشی کے لیے یہ چند دلائل کافی ہوں گے۔(والتوفیق بید اللہ)

نمازِ جنازہ میں رفع الیدین:

سوال نمازِ جنازہ میں رفع الیدین ثابت ہے یا نہیں؟

جواب: نمازِ جنازہ کی تکبیرِ اولیٰ میں رفع الیدین پر جملہ اہلِ علم متفق ہیں۔ باقی تکبیرات میں اختلاف ہے۔

چنانچہ امام نووی رحمہ اللہ بحوالہ کتاب "الاشراف والاجماع" لابن المنذر فرماتے ہیں:

«أَجمَعُوا عَلٰی أَنَّهٗ يُرفَعُ فِي أَوَّلِ تَكبِيرَةٍ، وَاختَلَفُوا فِي سَائِرِهَا »[1]

"پہلی تکبیر پر رفع الیدین تو بالاجماع مشروع ہے۔لیکن باقی تکبیرات پر رفع الیدین میں اختلاف ہے۔"

البتہ امام ترمذی نے اپنی "جامع" میں باقی تکبیرات میں رفع الیدین کو اکثر اہلِ علم کی طرف منسوب کیا ہے۔فرماتے ہیں:

« وَاختَلَفَ أَهلُ العِلمِ فِي هٰذَا، فَرَأٰی أَكثَرُ أَهلِ العِلمِ مِن أَصحَابِ النَّبِيِّ ﷺ، وَغَيرِهِم أَن يَرفَعَ الرَّجُلُ يَدَيهِ فِي كُلِّ تَكبِيرَةٍ عَلَی الجَنَازَةِ، وَ هُوَ ابنُ المُبَارَكِ وَالشَّافِعِيُّ، وَأَحمَدُ، وَإِسحٰقُ. وَ قَالَ بَعضُ أَهلِ العِلمِ: لَا يَرفَعُ يَدَيهِ إِلَّا فِي أَوَّلِ مَرَّةٍ، وَ هُوَ قَولُ الثَّورِي، وَ أَهلِ الكُوفَةِ.»

یعنی اہلِ علم کا اس مسئلہ میں اختلاف ہے۔صحابہ کرام رضی اللہ عنہم وغیرہم میں سے اکثر اہلِ علم اس بات کے قائل ہیں کہ جنازہ میں ہر تکبیر پر رفع الیدین کی جائے۔ یہی قول ابن المبارک،امام شافعی،احمد اور اسحاق کا ہے۔بعض اہلِ علم صرف پہلی تکبیر میں رفع الیدین کے قائل ہیں۔ یہ قول امام ثوری رحمہ اللہ اور اہلِ کوفہ کا ہے۔

جو لوگ تمام تکبیرات میں رفع الیدین کے قائل ہیں، وہ حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث سے استدلال کرتے ہیں:

---

[1] المجموع:۵/۲۳۲

« اَنَّ النَّبِیَّ ﷺ کَانَ إِذَا صَلّٰی عَلَی الجَنَازَةِ، رَفَعَ یَدَیهِ فِی کُلِّ تَکبِیرَةٍ » ①

یعنی ''نبی ﷺ جب نمازِ جنازہ پڑھاتے تو ہر تکبیر میں رفع یدین کرتے۔''

حدیث ہذا کی سند کو حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے ضعیف قرار دیا ہے۔ اس کو ''طبرانی اَوسط'' کے علاوہ ''دارقطنی'' نے بھی اپنی ''العلل'' میں ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مرفوعاً بیان کیا ہے۔ پھر اس کے موقوف ہونے کو درست قرار دیا ہے۔ وجہ یہ بیان کی ہے کہ عمر بن شبّہ کے علاوہ کسی نے اس کو مرفوع ذکر نہیں کیا۔ لیکن شیخ ابن باز رحمہ اللہ ''فتح الباری'' پر تعلیقات میں فرماتے ہیں:

« وَالْاَظهر عَدَمُ الِالتِفَاتِ إِلٰی هٰذِهِ العِلَّةِ ، لِأَنَّ عُمَرَ المَذکُورِ ثِقَةٌ، فَیُقبَلُ رَفعُهٗ ، لِأَنَّ ذٰلِكَ زِیَادَةٌ مِّن ثِقَةٍ. وَ هِیَ مَقبُولَةٌ عَلَی الرَّاجِحِ عِندَ أَئِمَّةِ الحَدِیثِ، وَ یَکُونُ ذٰلِكَ دَلِیلًا عَلٰی شَرعِیَّةِ رَفعِ الیَدَینِ فِی تَکبِیرَاتِ الجَنَازَةِ . (وَاللّٰهُ أَعلَم) » ②

یعنی ''زیادہ واضح بات یہ ہے کہ یہ علت نا قابلِ التفات ہے، کیونکہ عمر مذکور ثقہ ہے۔ اس کا رفع قابلِ قبول ہے۔ راجح قول کے مطابق ائمہ حدیث کے ہاں ثقہ راوی کی زیادتی مقبول ہوتی ہے۔ لہٰذا حدیث ہذا اس بات کی دلیل ہے کہ نمازِ جنازہ کی تکبیرات میں رفع یدین مشروع ہے۔'' (واللہ اَعلم)

دوسری طرف حنفیہ وثوری کے علاوہ حافظ ابن حزم، امام شوکانی اور علامہ البانی رحمہم اللہ وغیرہ تکبیرِ اُولیٰ میں رفع یدین کے ماسوا باقی تکبیروں میں عدمِ رفع کے قائل ہیں۔ وجہ یہ بیان کی ہے کہ کوئی قابلِ حجت مرفوع دلیل نہیں مل سکی۔ یاد رہے شیخ ابن باز رحمہ اللہ کی بات بھی محلِّ نظر ہے، کیونکہ راوی عمر بن شبّہ بقول ابن حجر رحمہ اللہ ''صدوق''، ''درجۂ رابعہ'' سے ہے۔ اس کی زیادتی ثقات کے خلاف قابلِ قبول نہیں۔ البتہ ابن عمر رضی اللہ عنہما اور ابن عباس رضی اللہ عنہما سے صحیح سندوں سے رفع یدین ثابت ہے۔ اس بناء پر امام عبدالجبار رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ہاتھ اٹھانا، نہ اٹھانے سے بہتر ہے۔ ③

مولانا محمد عبدہٗ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ان دلائل کی روشنی میں ہم رفع الیدین کو غیر مشروع نہیں کہہ سکتے۔ ③

---

① معرفة السنن والآثار، بَابُ التَّکْبِیرِ عَلَی الْجَنَائِزِ وَغَیْرِ ذٰلِكَ، رقم:۷۶۱۳

② فتح الباری:۳/۱۹۰

③ فتاویٰ غزنویه:ص:۹۹، ۱۰۰

④ أحکام جنائز، ص:۱۷۹

ایک روایت کے مطابق امام ابوحنیفہ بھی تمام تکبیروں میں رفع یدین کے قائل ہیں۔ اکثر ائمہ ٔ بلخ نے اسی کو اختیار کیا ہے۔ ملاحظہ ہو! ''المبسوط'' للسرخسی (۲/۶۴) حنفیہ کے اس قول کو علامہ البانی رحمہ اللہ نے حدیث ''أُسکُنُوا فِی الصَّلاۃِ'' کے جواب میں استعمال کیا ہے۔ ملاحظہ ہو! حاشیہ ''التنکیل'' (۲/۳۸)

جنازہ میں ہر تکبیر کے ساتھ رفع الیدین کرنا:

سوال: نمازِ جنازہ میں ہر تکبیر کے ساتھ رفع الیدین کرنے کا کیا حکم ہے؟

جواب: ابن عمر اور ابن عباس رضی اللہ عنہما سے جواز منقول ہے بلکہ امام ترمذی نے اکثر علما کا اس پر عمل نقل کیا ہے۔ اگرچہ مرفوعاً کوئی روایت ثابت نہیں۔

جنازہ سرّی یا جہری؟

سوال: جنازہ سری پڑھانا جائز ہے؟

جواب: سرّی جنازہ درست ہے۔ نمازِ جنازہ میں سنت یہ ہے کہ پہلی تکبیر کے بعد ''سورۃ فاتحہ'' آہستہ پڑھی جائے۔[1] بلکہ امام شوکانی رحمہ اللہ نے ''نیل الأوطار'' میں جمہور کا مسلک سری نقل کیا ہے۔ (۴/۶۶)

نمازِ جنازہ بلند آواز میں پڑھنا جائز ہے؟

سوال: نمازِ جنازہ بلند آواز میں پڑھنا جائز ہے؟ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود پڑھایا ہے؟ حوالہ سے وضاحت فرمائیں۔

جواب: بلند آواز سے جنازہ پڑھانے کا جواز ہے۔ چنانچہ صحیح مسلم میں عوف بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

« صَلَّی رَسُولُ اللّٰہِ ﷺ عَلٰی جَنَازَۃٍ فَحَفِظتُ مِن دُعَائِہٖ، وَ ھُوَ یَقُولُ : اَللّٰھُمَّ اغفِرلَہٗ وَارحَمہُ »[2]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک جنازہ پڑھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا سے میں نے یاد کیا۔ آپ فرما رہے تھے: اے اللہ! اس میت کو معاف کردے اور اس پر رحم فرما! الخ۔''

اخیر میں کہتے ہیں کہ « حَتّٰی تَمَنَّیتُ اَن اَکُونَ اَنَا ذٰلِکَ المَیِّتُ » ''یہاں تک کہ (دعا پر تاثیر ہونے

---

[1] سنن النسائی، الدُّعَاءُ، رقم: ۱۹۸۹

[2] صحیح مسلم، بَابُ الدُّعَاءِ لِلمَیِّتِ فِی الصَّلَاۃِ، رقم: ۹۶۳

کی بناء پر) مجھے آرزو پیدا ہوئی کہ میں ہی یہ میت ہوتا۔" اور نسائی کی روایت میں سماع کی تصریح بھی موجود ہے اور واثلہ بن الاسقع رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے۔

« فَسَمِعتُهُ يَقُولُ : اَللّٰهُمَّ اِنَّ فُلَانَ بنَ فُلَانٍ فِي ذِمَّتِكَ......الخ » ①

''میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا، فرما رہے تھے: اے اللہ! فلاں بن فلاں تیرے ذمے ہے......''

اسی طرح حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت میں بھی سماع کی تصریح ہے، جس میں مذکور ہے کہ آپ نے دعا کرتے ہوئے فرمایا: '' اَللّٰهُمَّ أَنتَ رَبُّهَا...... الخ''②

علامہ شوکانی رحمہ اللہ رقمطراز ہیں:

« جَمِيعُ ذٰلِكَ يَدُلُّ عَلٰى اَنَّ النَّبِيَّ ﷺ جَهَرَ بِالدُّعَاءِ، وَ هُوَ خِلَافُ مَا صَرَّحَ بِهٖ كَجَمَاعَةٍ مِن استِحبَابِ الاسرَارِ بِالدُّعَاءِ . وَ قَد قِيلَ : اِن جَهرَهُ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِالدُّعَاءِ لِقَصدِ تَعلِيمِهِم. قَالَ: وَالظَّاهِرُ اَنَّ الجَهرَ، وَالاسرَارَ بِالدُّعَاءِ جَائِزَانِ، اِنتَهٰى » ③

مندرجہ بالا روایات میں خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جہری جنازہ پڑھانے کا تذکرہ ہے، کیونکہ سماع بلا جہر ناممکن ہے۔

نمازِ جنازہ کا سلام ہاتھ چھوڑ کر پھیرنے کی وضاحت:

سوال: ایک شخص کہتا ہے کہ نمازِ جنازہ کا سلام ہاتھ چھوڑ کر پھیرنا چاہیے۔ جب کہ دوسرا شخص کہتا ہے کہ اگر سلام سے قبل ہاتھ چھوڑ دیے جائیں تو پھر نماز نہیں ہوگی۔ اس لیے سلام کے بعد ہاتھ چھوڑنا چاہیے۔

ان دونوں میں سے کس کا قول کتاب و سنت سے ثابت ہے۔ بحوالہ تفصیل جواب عنایت فرمائیے۔

جواب: نماز کی کیفیت سے فراغت انسان کو اس وقت ہوتی ہے۔ جب وہ سلام پھیر لیتا ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ ہاتھ باندھنا ہے۔ چھوڑنا نہیں۔ حدیث میں ہے:

« تَحرِيمُهَا التَّكبِيرُ، وَ تَحلِيلُهَا التَّسلِيمُ » ④

---

① سنن ابن ماجه، بَابُ مَا جَاءَ فِي الدُّعَاءِ فِي الصَّلَاةِ عَلَى الجِنَازَةِ، رقم:١٤٩٩، سنن أبي داؤد، بَابُ الدُّعَاءِ لِلمَيِّتِ، رقم:٣٢٠٢

② سنن أبي داؤد، بَابُ الدُّعَاءِ لِلمَيِّتِ، رقم:٣٢٠٠

③ المرعاة:٢/٤٧٨

④ سنن أبي داؤد، بَابُ الإِمَامِ يُحدِثُ بَعدَ مَا يَرفَعُ رَأسَهُ مِنْ آخِرِ الرَّكعَةِ، رقم:٦١٨

نمازِ جنازہ میں تاخیر سے شریک ہونے والا کیا کرے؟

سوال: نمازِ جنازہ میں ایک یا دو تکبیرات کے بعد ملنے والا شخص امام کے ساتھ سلام پھیرے گا یا بعد میں اپنی نماز مکمل کرے گا۔ جب کہ وہ فاتحہ اور درود سے محروم رہا۔

جواب: بعد میں زوائد مکمل کرے چنانچہ علامہ عبدالرحمٰن مبارک پوری فرماتے ہیں:

جنازہ کی نماز پوری نہ ملے تو دیگر نمازوں کی مثل جس قدر امام کے ساتھ ملے، اس کو امام کے ساتھ پڑھ لے اور جس قدر فوت ہوگئی ہو، اس کو امام کے سلام پھیرنے کے بعد پوری کر لے۔ کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: « فَمَا أَدرَكتُم فَصَلُّوا وَمَا فَاتَكُم فَأَتِمُّوا.» ①

یعنی جو امام کے ساتھ پاؤ اس کو پڑھ لو اور جو فوت ہو اس کو پوری کر لو۔

سو آپ کا یہ حکم نمازِ جنازہ کو بھی شامل ہے۔ ''موطا'' امام مالک میں ہے۔ امام مالک نے زہری سے پوچھا کہ کوئی شخص نمازِ جنازہ کی بعض تکبیروں کو پالے اور بعض تکبیریں فوت ہو جائیں تو کیا کرے۔ انہوں نے فرمایا: کہ جو تکبیر فوت ہو جائے اس کو قضاء کر لے۔ (کتاب الجنائز، ص:۶۲)

نماز جنازہ کے بعد میت کے لئے دعا مانگنا شرعاً کیسا ہے؟

سوال: نماز جنازہ سے فارغ ہو چکنے کے بعد میت کے لئے دعا مانگنا شرعاً کیسا ہے؟ کیا حدیث إذا صليتم علىٰ الميت فاخلصوا له الدعاء (جب تم میت کی نماز جنازہ پڑھو تو اس کے لئے خصوصی طور پر دعائیں کرو) اور ابن شیبہ کی حضرت علیؓ سے روایت کہ ''انہوں نے نماز جنازہ پڑھی پھر میت کے لئے دعا'' کی، سے اس کا جواز نکلتا ہے؟

جواب: بحث طلب مسئلہ یہ ہے کہ آیا نماز جنازہ سے فارغ ہو چکنے کے فوراً بعد میت کے لئے دعا کی دعا کا جواز ہے یا نہیں؟......نمازِ جنازہ کے بعد دعا مانگنے کی دلیل کے طور پر، سوال میں مذکور دو روایات پیش کی جاتی ہیں لیکن درست بات یہ ہے کہ میت کے لئے دعا نماز جنازہ کے دوران مانگی جائے۔ پہلی حدیث کی تشریح بقول علامہ مناوی رحمہ اللہ یوں ہے:

''میت کیلئے اخلاص کے ساتھ دعا کرو کیونکہ اس نماز سے مقصود صرف میت کیلئے سفارش کرنا ہے جب دعا میں اِخلاص اور عاجزی ہوگی تو اسکے قبول ہونے کی امید ہے'' ②

① صحيح البخاری، بَابُ قَولِ الرَّجُلِ: فَاتَتنَا الصَّلَاةُ، رقم: ٦٣٥

② عون المعبود: ۱۸۸/۳

اور مستدرک حاکم میں حضرت ابوامامہ کی روایت میں ہے: ویخلص الصلاۃ فی التکبیرات الثلاث یعنی جنازہ کی تین تکبیروں کے دوران اِخلاص سے دعا کرے۔ مستدرک حاکم کی اس حدیث سے اس امر کی وضاحت ہوگئی کہ دعا کا تعلق خالصۃً حالتِ نماز کے ساتھ ہے نہ کہ بعداز نماز سے۔

اصولِ فقہ کا معروف قاعدہ ہے کہ الاحادیث یفسر بعضھا بعضا 'احادیث ایک دوسری کی تفسیر کرتی ہیں''، اس بنا پر اس حدیث کا مفہوم یہ ہے کہ جب تم نمازِ جنازہ پڑھنا چاہو تو میت کے لئے خلوص کے ساتھ دعا کرو۔ یہ إقامة المسبب مقام السبب (سبب بول کر مسبّب مراد لینا) کی قبیل سے ہے، ارادہ سبب اور نماز مسبّب ہے۔ حدیث کے الفاظ فَاَخْلِصُوْا میں ''فاء'' کے ترتیب و تعقیب بلا مہلت ہونے کا یہی مطلب ہے۔۔۔ اگر مقصود یہاں نماز جنازہ سے فراغت کے بعد دعا ہوتی تو پھر فاء کی بجائے لفظ ثُمَّ ہونا چاہئے تھا جو عام حالات میں ترتیب اور تراخی کا فائدہ دیتا ہے۔ احناف کی یہ توجیہ غلط ہے کہ فاء تعقیب کا یہ مطلب ہے کہ نماز کے بعد دعا کی جائے۔

علاوہ ازیں یہ حدیث سنن ابوداود اور سنن ابن ماجہ وغیرہ میں ہے اور امام ابوداود نے اس حدیث کو جنازہ کے دوران دعا پڑھنے کے ضمن میں ذکر کیا ہے انہوں نے اس پر عنوان یوں قائم کیا ہے: باب الدعا للمیت اور اس حدیث پر امام ابن ماجہ کی تبویب بھی ملاحظہ فرمائیں اور بار بار غور سے پڑھیں:

باب ماجاء فی الدعاء فی الصلاۃ علی الجنازۃ یعنی نمازِ جنازہ میں دعا کے بارے میں جو کچھ آیا ہے، اس کا بیان۔۔۔ اس سے معلوم ہوا کہ محدثین اور احناف کے فہم میں زمین آسمان کا فرق ہے لہٰذا اس تحریف پر انہیں ندامت کا اظہار کرکے حق کی طرف رجوع کی فکر کرنی چاہئے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قول ہے "مراجعة الحق خیر من التمادی فی الباطل" باطل پر اصرار سے بہتر ہے کہ آدمی حق کی طرف رجوع کرلے۔ (إعلام الموقعین)

اس کی مثال یوں سمجھیں جیسے قرآنِ مجید میں ہے ﴿فَاِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ﴾ (النحل:۹۸) ''جب تم قرآن پڑھنے لگو تو شیطان مردود سے اللہ کی پناہ مانگ لیا کرو۔''

ائمہ لغت زجاج وغیرہ نے اس کا معنی یوں بیان کیا ہے: إذا اردت ان تقرا القرآن فاستعذ باللہ ولیس معناہ استعاذ بعد ان تقرا القرآن ''جب آپ قرآن کی تلاوت کا ارادہ کریں تو اللہ سے پناہ مانگ لیا کریں، اس کا یہ معنی نہیں کہ تلاوتِ قرآن کے بعد اعوذ باللہ پڑھا کرو۔''

اسی کی مثل قائل کا قول ہے: إذا اکلت فقل بسم اللہ یعنی جب تو کھانے کا ارادہ کرے تو بسم اللہ

پڑھ، اس کا قطعاً یہ معنی نہیں کہ کھانے سے فراغت کے بعد بسم اللہ پڑھنی چاہیے"--- امام واحدی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "فقہاء کرام کا اس بات پر اجماع ہے کہ استعاذہ قراءت سے پہلے ہے"۔ [1]

بلاشبہ شرع میں دعا کی بالعموم تاکید ہے۔ غالباً اس بنا پر فقہاء حنفیہ نے جنازہ میں قراءت سے استغنائی پہلو اختیار کرکے اس کا نام دعاء وثناء وغیرہ رکھا ہے۔ مؤطا امام محمد میں ہے :لا قراء ة علی الجنازة وھو قول ابی حنیفة اور یہ قول المبسوط للسرخسی رحمہ اللہ میں بھی ہے (۶۴/۲)--- البتہ محقق ابن الہمام فتح القدیر (۴۸۹/۱) میں فرماتے ہیں:

"فاتحہ نہ پڑھے تاہم بہ نیتِ ثنا پڑھی جاسکتی ہے۔ کیونکہ قراءت رسول اللہ ﷺ سے ثابت نہیں"

علامہ ابن الہمام جیسے محقق کی یہ بات انتہائی مضحکہ خیز ہے، اس لئے کہ فاتحہ کی قراءت کا اثبات تو صحیح بخاری میں موجود ہے: باب قراء ة فاتحة الکتاب علی الجنازة۔ تو پھر کیا یہ بات معقول ہے کہ اثناء جنازہ میں اخلاصِ دعا کی تاکید تو نہ ہو، لیکن سلام پھیرنے کے بعد کہا جائے کہ اب اِخلاص سے دعا کرو۔ غالباً اس دھوکہ کے پیش نظر حنفی بھائی نمازِ جنازہ کا تو جھٹکا کرتے ہیں، بعد میں لمبی لمبی دعائیں کی جاتی ہیں جس کی شریعت میں کوئی اصل نہیں۔

اصولِ فقہ کا قاعدہ معروف ہے کہ "عبادات میں اصل حظر (ممانعت) ہے، جواز کے لئے دلیل کی ضرورت ہوتی ہے"۔ عہدِ نبوت میں کتنے جنازے پڑھے گئے، کسی ایک موقع پر بھی ثابت نہیں ہے کہ نبی ﷺ نے نماز جنازہ کے بعد دعا کی ہو۔

صحیح بخاری میں حدیث ہے: «مَنْ أَحْدَثَ فِي أَمْرِنَا هَذَا مَا لَيْسَ فِيهِ، فَهُوَ رَدٌّ» [2]

"جو دین میں اضافہ کرے وہ مردود ہے۔"

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: علیك بالاثر وطریقة السلف وإیاك وکل محدثة فإنها بدعة "آثار اور طریقہ سلف کو لازم پکڑو، اپنے آپ کو دین میں اضافہ سے بچاؤ وہ بدعت ہے۔" [3]

ابن الماجشون نے کہا کہ میں نے امام مالک سے سنا، وہ فرماتے تھے:

"جو دین میں بدعت ایجاد کرکے، اسے اچھا سمجھے تو گویا وہ یہ باور کراتا ہے کہ محمد ﷺ نے رسالت میں خیانت کی ہے، اس لئے کہ اللہ کا فرمان ہے ﴿اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ﴾ جو

---

① تفسیر فتح القدیر: ۱۹۳/۳

② صحیح البخاری، بَابُ إِذَا اصْطَلَحُوا عَلَى صُلْحِ جَوْرٍ فَالصُّلْحُ مَرْدُودٌ، رقم: ۲۵۹۷

③ ذمّ التاویل از ابن قدامه ......

شے اس وقت دین نہیں تھی، وہ آج بھی دین نہیں بن سکتی''

امام شافعی فرماتے ہیں: ''جس نے بدعت کو اچھا سمجھا اُس نے نئی شریعت بنالی'' (السنن والمبتدعات)

رہا حضرت علیؓ کا اثر (فعل صحابی) تو اس کا تعلق نمازِ جنازہ کے متصل بعد سے نہیں بلکہ اس کا تعلق دفن میت کے بعد سے ہے کیونکہ مصنف نے اس اثر پر جو عنوان قائم کیا ہے اور اس کے تحت مذکورہ جملہ آثار اسی بات پر دلالت کرتے ہیں کہ اس دعا کا تعلق تدفین میت کے بعد سے ہے، عنوان کے الفاظ ملاحظہ فرمایئے: «---فی الدعاء للمیت بعد مایدفن ویسوی علیه» قبر پر مٹی برابر کرکے میت کے لئے دعا کرنے کا بیان۔ اور تدفین کے بعد میت کے لئے دعا کرنا ثابت شدہ امر ہے جس میں کسی کا کوئی اختلاف نہیں جیسا کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے:

''میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو عبداللہ ذی نجادین کی قبر پر دیکھا، جب دفن سے فارغ ہوئے تو قبلہ رُخ ہاتھ اٹھا کر دعا کی''[1]

تمام خیر سنت نبوی کی پیروی میں ہے، اور بدعت میں شر ہی شر ہے۔ اللہ ربّ العزت جملہ مسلمانوں کو صراطِ مستقیم پر چلنے کی توفیق بخشے۔ آمین!

نمازِ جنازہ کے بعد میت کے پاس اکٹھے ہو کر دعا کرنا:

سوال: نمازِ جنازہ کے بعد جمع ہو کر دعا کرنے کا کیا حکم ہے؟

جواب: کتاب وسنت سے ثابت نہیں لہٰذا بدعت ہے۔

قبر پر قبلہ رخ ہو کر دعا کرنا:

سوال: کیا دعا قبر کی بجائے قبلہ کی طرف منہ کرکے کرنی چاہیے؟

جواب: اصل یہی ہے کہ دعا کے وقت قبروں کی طرف متوجہ نہ ہوا جائے، بلکہ قبلہ رو کھڑے ہو کر دعا کی جائے۔ اس لیے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے قبر کی طرف متوجہ ہو کر نماز سے منع فرمایا ہے اور دعا ہی نماز کا لب لباب ہے۔ لہٰذا دعا بھی قبلہ رُخ ہو کر کی جائے۔ اس بناء پر علماء محققین کا یہ فیصلہ ہے کہ دعا کے وقت بھی اس جانب متوجہ ہونا مستحب ہے جس جانب کہ نماز ادا کی جاتی ہے۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو! اقتضاء الصراط المستقیم۔

---

[1] اخرجه ابوعوانة فی صحیحه، فتح الباری، ۱۱/ ۱۴۴

جوتوں سمیت قبرستان میں جانا:

(سوال): کیا جوتے قبرستان کے باہر اتارنے چاہئیں؟

(جواب): راجح مسلک یہ ہے کہ قبروں میں جوتے مطلقاً اتار دیئے جائیں۔ ہاں البتہ چلنے میں کانٹوں وغیرہ سے بچاؤ کی خاطر پہنا جاسکتا ہے۔ ملاحظہ ہو! ''تہذیب السنن'' ابن قیم اور ''فتاویٰ لجنة دائمه'' (۹/۱۲۳)

''النہایہ'' میں ہے:

«اِنَّمَا اَمَرَهٗ بِالْخَلْعِ اِحْتِرَامًا لِلْمَقَابِرِ، لِاَنَّهٗ كَانَ يَمْشِي بَيْنَهَا.»

تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو! (احکام الجنائز مولانا محمد عبدہ رحمہ اللہ)

اہل میت کے گھر میں کھانا:

(سوال): مردے کی تجہیز و تکفین کے بعد میت والے گھر میں جوٹینٹ وغیرہ لگتے ہیں اور پھر وہاں پر موجود لوگوں کو کھانا وغیرہ ملتا ہے کیا اس کا قرآن وحدیث سے کوئی ثبوت موجود ہے۔

(جواب): مردے کی تجہیز و تکفین کے بعد اہلِ میت کے ہاں اجتماع کا شرع میں کوئی ثبوت نہیں۔ بلکہ حدیث جریر میں اس کو نوحہ کی قبیل سے شمار کیا گیا ہے۔

مسجد میں نمازِ جنازہ پڑھی جاسکتی ہے؟

(سوال): کیا مسجد میں نمازِ جنازہ پڑھی جاسکتی ہے؟ جواب مطلقاً مکروہ ہے بعذر بارش مکروہ نہیں اور شارع عام اور دوسرے کی زمین پر بھی مکروہ ہے۔ (شامی کبیری)

(جواب): نمازِ جنازہ مسجد میں پڑھی جاسکتی ہے۔ صحیح مسلم میں اس امر کی تصریح موجود ہے۔[1] حنفی مفتی کا فتویٰ محل نظر ہے۔

نمازِ جنازہ سے پہلے فرض نماز کا پڑھنا:

(سوال) نمازِ جنازہ سے پہلے فرض نماز کا پڑھنا کیا ضروری ہے اور اگر فرض نہیں پڑھ سکتا تو جنازہ میں شامل نہ ہو؟

(جواب): فرضی نماز سے قبل یا بعد ہر دو صورت میں نمازِ جنازہ میں شمولیت کا جواز ہے۔ اس لیے کہ کسی حدیث میں نہی وارد نہیں۔

---

[1] صحیح مسلم، بَابُ الصَّلَاةِ عَلَی الْجَنَازَةِ فِي الْمَسْجِدِ، رقم:۹۷۳

بے نمازی کا نمازِ جنازہ:

(سوال): پچھلے ہفتہ ہماری مسجد رحمانیہ اہلِ حدیث محمد حسین گوٹھ عرفات ٹاؤن میں ایک واقعہ ظہور پذیر ہوا جس سے طبیعت بہت الجھ گئی ہے۔ چونکہ میں نے الحمدللہ سعودی عرب میں بھی کچھ وقت گزارا۔لیکن وہاں پر بھی ایسا نہیں ہوا۔ ہوا یہ کہ ہماری مسجد میں ایک جنازہ لایا گیا جس کی نمازِ جنازہ امام صاحب نے یہ کہہ کر پڑھانے سے انکار کردیا کہ یہ شخص بے نمازی تھا۔ امام صاحب عالم دین ہیں لیکن ایک خلجان جو پیدا ہوگیا قرآن وسنت کی روشنی میں اس کی وضاحت فرمائیں۔

(جواب): بے نماز کی نمازِ جنازہ نہیں پڑھنی چاہیے۔ آپ کے امام صاحب نے بصورتِ انکار درست موقف اختیار کیا ہے۔ چنانچہ حدیث میں ہے:« مَن تَرَكَ الصَّلٰوةَ مُتَعَمِّدًا فَقَد كَفَر »[1] یعنی ''جو شخص دیدہ دانستہ نماز چھوڑ دے وہ کافر ہے۔'' جملہ تفاصیل کے لیے ملاحظہ ہو! ہمارے شیخ محدث روپڑی رحمہ اللہ کا ''فتاویٰ اہل حدیث'' (۲/ ۳۸ تا ۵۷)

(سوال): قرآن وحدیث کے واضح دلائل ہیں کہ بے نماز کافر ہے اور امام ابن قیم رحمہ اللہ نے بے نماز کے کافر ہونے پر صحابہ کا اجماع بھی نقل کیا ہے۔ سوال یہ ہے کہ اگر بے نماز کافر ہے تو کیا اس کی نماز جنازہ پڑھنی جائز ہے کہ نہیں جب کہ اللہ تعالیٰ نے نبی ﷺ کو منافق پر نمازِ جنازہ پڑھنے سے روکا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ بے نماز کا نکاح پڑھنا درست ہے کہ نہیں جب کہ قرآن نے روکا ہے کہ مومن مرد مشرک عورت سے نکاح نہ کرے اور نہ مومنہ عورت کا نکاح مشرک مرد سے کیا جائے اور جب کہ اللہ تعالیٰ نے نماز چھوڑنا مشرکوں کا فعل قرار دیا ہے۔ کیا بے نماز کا نکاح پڑھنے والا گناہگار ہوگا؟ براہ کرم ان سوالوں کا قرآن وحدیث کی روشنی میں جواب عنایت فرمائیں۔

(جواب): دلائل کی رُو سے صحیح بات یہی ہے، کہ بے نماز کافر ہے۔ چنانچہ حدیث میں ہے:«مَن تَرَكَ الصَّلٰوةَ مُتَعَمِّدًا فَقَد كَفَرَ »[2] یعنی ''جو شخص دیدہ دانستہ نماز چھوڑ دے وہ کافر ہے۔'' جب اس کا کفر ثابت ہوگیا تو اس سے معلوم ہوا، کہ بے نماز کا جنازہ اور نکاح بھی نہیں پڑھنا چاہیے اور اگر کوئی شخص (واضح) نصوص کی خلاف ورزی وغیرہ کرکے بے نماز کا جنازہ یا نکاح وغیرہ پڑھا دے، تو وہ بنظرِ شرع مجرم ٹھہرتا ہے۔

---

[1] المعجم الأوسط، رقم: ۳۳۴۸، صحیح مسلم، کتاب الصلاۃ، بَابُ بَيَانِ إِطْلَاقِ اسْمِ الْكُفْرِ عَلَى مَنْ تَرَكَ الصَّلَاةَ، رقم: ۸۲

[2] مصنف ابن ابی شیبہ، رقم: ۳۰۴۳۸، مسند البزار، رقم: ۴۱۴۸، معجم الاوسط، رقم: ۳۳۴۸

مسئلہ ہذا پر بسط و تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو! ''فتاویٰ اہل حدیث''(۲/۲۹ تا ۵۷) لشیخنا محدث روپڑی رحمہ اللہ

دیوانی بالغ لڑکی کا نمازِ جنازہ کا حکم:

سوال: ہمارے گاؤں میں ایک دیوانی لڑکی فوت ہوگئی۔ یہ لڑکی بالغ تھی لیکن جنازہ پڑھانے والے مولوی صاحب نے کہا کہ اس کی نمازِ جنازہ نابالغ بچوں کی طرح ادا کریں کیونکہ یہ دیوانی ہے اور اس کی مثال بچوں کی طرح ہے۔قرآن وسنت کی روشنی میں اس کی وضاحت کردیں۔

جواب: ظاہر ہے کہ دیوانہ بالغ کے جنازہ میں بالغ عاقل جیسی دعاؤں کو پڑھا جائے۔کیونکہ یہ بالغ ہے۔ اگرچہ عاقل نہیں، اسے نابالغ بچوں کے ساتھ ملحق کرنے کی کوئی معقول وجہ نظر نہیں آتی۔

کیا بچے کی نمازِ جنازہ میں دعا خاص وقت کے لیے ہے؟

سوال: کیا بچہ کی نمازِ جنازہ میں دعا« اَللّٰھُمَّ اجعَلهُ لَنَا سَلَفًا وَ فَرَطًا »خاص نہیں بلکہ عام وقت میں دعا کرنے کے لیے ہے؟

جواب: مشارٌ الیہ دعا صحیح بخاری کی تبویب باب قراءة فاتحة الكتاب على الجنازة کے تحت حسن سے منقول ہے۔حسن کے اثر میں بچہ کی نمازِ جنازہ کی تصریح موجود ہے۔

ناقص الخلقت بچے کی نمازِ جنازہ پڑھنے کا کیا حکم:

سوال: علامہ ناصر الدین البانی رحمہ اللہ اپنی مایہ ناز کتاب ''مختصر احکام الجنائز'' (مترجم:شبیر بن نور، نظر ثانی سید بدیع الدین راشدی رحمہ اللہ) کے ص:۱۲۶، پر حضرت زید بن خالد الجہنی رضی اللہ عنہ کی روایت ذکر کرتے ہیں کہ خیبر کے دن ایک صحابی وفات پاگیا، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے رسول اللہ ﷺ سے تذکرہ کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا:«صَلُّوا عَلٰی صَاحِبِكُم» یہ سن کر لوگوں کے چہرے اتر گئے۔آپ ﷺ نے فرمایا: «اِنَّ صَاحِبَكُم غَلَّ فِی سَبِیلِ اللّٰهِ » جب اس کے سامان کی تلاشی لی گئی تو اس کے سامان سے ایک موتی نکلا جس کی قیمت دو درہم تھی۔ [1]

اس حدیث سے نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ اس حکم سے دو طرح کے آدمی مستثنیٰ ہیں۔ ان کی نمازِ جنازہ ادا کرنا فرض نہیں۔

[1] موطا امام مالك، كتاب الجهاد، باب ما جاء في الغلول، ص: ۲۷۰۔ سنن نسائي: كتاب الجنائز، باب الصلوة على من غسل، ج:۱، ص:۲۷۸

①...... نابالغ بچہ: اسی لیے رسول اللہ ﷺ نے اپنے فرزند ابراہیم کی نمازِ جنازہ ادا نہیں کی جب کہ ان کی عمر اٹھارہ ماہ تھی۔ [1]

ابراہیم بن محمد ﷺ نے کون سی خیانت کی تھی جس بناء پر جنازہ نہ پڑھایا گیا۔ حالانکہ اس حدیث کے ذیل میں حضرت وائل بن داؤد کی روایت میں ہے کہ

« لَمَّا مَاتَ اِبرٰهِيم بنُ النَّبِيِّ صَلّٰى عَلَيهِ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ فِي المَقَاعِدِ. الحديثِ» [2]

②...... سنن ابن ماجہ میں بروایت حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ مذکور ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے فرزند ابراہیم کا جنازہ پڑھایا اور فرمایا:

« اِنَّ لَهُ مُرضِعًا فِي الجَنَّةِ وَ لَو عَاشَ لَكَانَ صَدِّيقًا نَبِيًّا » [3]

پھر ص: ۱۲۷، پر ارقام فرماتے ہیں کہ حسب ذیل افراد کی نمازِ جنازہ ادا کرنا شرعاً ثابت ہے۔

بچہ اگر چہ اس کی ناتمام ولادت ہوئی ہو اس کی نمازِ جنازہ ادا کی جائے گی۔ [4]

ناتمام وہ بچہ ہے جس کے چار ماہ مکمل ہو چکے ہوں اور اس میں روح پھونکی گئی ہو پھر وفات پائے۔ پھر اس کی وضاحت اور تائید کے لیے تخلیق انسانی کے مدارج کی حدیث (کہ انسان اپنی ماں کے پیٹ میں چالیس دن تک نطفے کی شکل میں رہتا ہے، پھر اتنے ہی دن لوتھڑے کی شکل میں، پھر اتنے ہی دن بوٹی کی طرح رہتا ہے، پھر اس میں روح پھونکی جاتی ہے۔) الحدیث

ارقام فرماتے ہیں۔ [5]

حالاں کہ حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

« اِذَا استَهَلَّ الصَّبِيُّ صُلِّيَ عَلَيهِ » [6]

اور سنن الترمذی میں بروایت حضرت جابر رضی اللہ عنہ مذکور ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

---

① سنن ابوداؤد، کتاب الجنائز باب فی الصلوۃ علی الطفل، ج:۲، ص:۴۵۴

② حوالہ مذکور

③ سنن ابن ماجه، کتاب الجنائز، باب ما جاء فی الصلوۃ علی ابن رسول الله ﷺ وذکر وفاته، ص:۱۰۸

④ سنن ابوداؤد کتاب الجنائز، باب المشی امام الجنازة، ج:۲، ص:۴۵۳۔ وسنن ابن ماجه، کتاب الجنائز، باب ما جاء فی الصلوۃ علی الطفل، ص:۱۰۸

⑤ صحیح بخاری، کتاب القدر، ج:۲، ص:۹۷۵۔ صحیح مسلم، کتاب القدر، ج:۲، ص:۳۳۲

⑥ سنن ابن ماجه، کتاب الجنائز، باب ما جاء فی الصلوۃ علی الطفل، رقم:۱۵۰۸

« اَلطِّفلُ لَا یُصَلّٰی عَلَیهِ وَ لَا یَرِثُ وَ لَا یُورَثُ حَتّٰی یَستَهِلَّ »[1]

اور صحیح بخاری میں ہے:

« اِذَا استَهَلَّ صَارِخًا صُلِّیَ عَلَیهِ وَ لَا یُصَلّٰی عَلٰی مَن لَا یَستَهِلُّ مِن اَجلِ أَنَّهٗ سِقطًا»[2]

ان ہر دو مسائل میں تعارض ہے اقرب الی الصواب کون سی صورت ہے؟

جواب: واضح ہو کہ علامہ البانی کا مقصود محض نمازِ جنازہ کے حکم سے استثناء ہے، نہ کہ ان کی طرف کسی خیانت کی نسبت ہے۔ حاشا وکلا نہیں۔

اور جن روایات میں یہ ہے، کہ آپ نے اپنے صاحبزادے ابراہیم کی نمازِ جنازہ پڑھی ہے، ان میں کلام ہے یہ مقال سے خالی نہیں۔ نبی ﷺ کا اس کا جنازہ نہ پڑھنا محض جواز بیان کرنے کے لیے تھا، ورنہ آپ سے بچے کی نمازِ جنازہ پڑھنا بحق ثابت ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں:

« اُتِیَ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ بِصَبِیٍّ مِن صِبیَانِ الاَنصَارِ، فَصُلِّیَ عَلَیهِ ...... »[3]

پھر وہ بچہ جس کی تخلیق مکمل ہو چکی ہو اور ماں کے شکم میں وفات پا جائے، اس کی نمازِ جنازہ مشروع ہے جیسا کہ علامہ موصوف کا کہنا ہے اور شیخ ابن باز ''فتح الباری'' کے حاشیہ پر رقم طراز ہیں:

« اَلقَولُ بِعَدَمِ الصَّلَاةِ عَلَی السَّقطِ ضَعِیفٌ. وَالصَّوَابُ شَرعِیَّةُ الصَّلَاةِ عَلَیهِ اِذَا سَقَطَ بَعدَ نَفخِ الرُّوحِ فِیهِ. وَ کَانَ مَحکُومًا بِاِسلَامِهٖ، لِاَنَّهٗ مَیِّتٌ مُسلِمٌ فَشُرِعَتِ الصَّلَاةُ عَلَیهِ، کَسَائِرِ مَوتَی المُسلِمِینَ ، وَ لِمَا رَوَی اَحمَدُ ، وابوداؤد ، والترمذی والنسائی، عن المغیرة بن شعبة اَنَّ النَّبِیَّ ﷺ قَالَ : وَالسَّقطُ یُصَلّٰی عَلَیهِ ، وَ یُدعٰی لِوَالِدَیهِ بِالمَغفِرَةِ ، وَالرَّحمَةِ (واسناده حسن) (والله اعلم) » (۳/ ۲۰۱)

اس کے مقابلہ میں جابر کی روایت ضعیف ہے۔ ملاحظہ ہو! ''نصب الرایه''(۲/ ۲۷۷)، ''تلخیص (۵/ ۱٤٦، ٤۷)، ''المجموع''(۵/ ۲۵۵) اور علامہ کی کتاب ''نقد التاج الجامع'' (رقم: ۲۹۳) فرمایا: وَ اِنَّمَا صَحِیحُ الحَدِیثِ بِدُونِ ذِکرِ الصَّلَاةِ فِیهِ'' جیسا کہ موصوف نے ''إرواء

---

[1] سنن الترمذی، کتاب الجنائز، باب ترك الصلوة علی الطفل حتی یستهل، رقم:۱۰۳۲

[2] صحیح بخاری، کتاب الجنائز، باب اذا اسلم الصبی، رقم: ۱۳۵۸

[3] صحیح مسلم، بَابُ مَعنَی کُلِّ مَولُودٍ یُولَدُ عَلَی الفِطرَةِ وَحُکمِ مَوتِ ......الخ ،رقم:۲٦٦۲، سنن النسائی ،الصَّلَاةُ عَلَی الصِّبیَانِ،رقم:۱۹٤۷ ،مسند احمد

الغلیل" (۱۷۰۴) میں اس امر کی تحقیق کی ہے۔

اور "سنن ترمذی" کی حدیث کی وضاحت کے لیے ملاحظہ ہو! إرواء الغلیل (٦/ ١٤٨) اور اخیر میں بخاری کے حوالہ سے جو عبارت نقل کی ہے، یہ زہری کا قول ہے۔ مرفوع روایت نہیں۔ یہاں محقق قول وہی ہے، جو پہلے گزر چکا۔ لہٰذا مرویات میں کوئی تعارض نہیں۔

غائبانہ نمازِ جنازہ

شہید معرکہ کی نمازِ جنازہ:

سوال محترم یہ تین سوالات درپیش ہیں، جو صحیح تحقیق نہ ہونے کی وجہ سے میرے لیے بہت الجھ گئے ہیں، لہٰذا آپ ان کی شرع متین کے حوالے سے دلیل کے ساتھ ہر مسئلے کی صحیح سورت واضح فرمادیں۔

۱۔ نبی کریم ﷺ یا خلفائے راشدین میں سے کسی نے شہید معرکہ کا جنازہ پڑھا ہے یا نہیں؟

۲۔ آپ نے اپنے شاگرد عزیز مولانا خالد سیف شہید کا جنازہ نہیں پڑھا تھ، نہ پڑھنے کی کیا وجہ تھی؟

۳۔ کسی کا غائبانہ نمازِ جنازہ پڑھنے کی کون سی شرائط ہیں؟ نیز کسی شہید کے غائبانہ جنازہ کی اطلاع دینے کے لیے اشتہار چھپوانے، بینرز لگوانے اور وال چاکنگ کرنے کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ (مبشر علی، نائب خطیب، جامع مسجد ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ، لاہور)

جواب سائل نے جو سوالات کیے ہیں ان کے بارے میں مندرجہ ذیل باتیں زیرِ غور رہیں تو مسئلہ کھل کر سامنے آجاتا ہے۔

۱۔ شہید معرکہ کی نمازِ جنازہ شریعت میں ہے یا نہیں؟

۲۔ آج کل کشمیر وغیرہ میں شہید ہونے والوں کی غائبانہ نمازِ جنازہ کے جو اعلانات اشتہارات وغیرہ کے ذریعہ سے کیے جاتے ہیں، کیا وہ شریعت کے منافی ہیں؟

۳۔ تحریک مجاہدین اسلام کے امیر مرحوم مولانا خالد سیف شہید کی نمازِ جنازہ کیوں نہ پڑھی گئی صرف دعاء پر اکتفاء کیوں کیا گیا تھا؟

سوال نمبر ① کا جواب شہید معرکہ کے بارے میں نمازِ جنازہ اگرچہ اختلافی مسئلہ ہے لیکن اس بارے میں وارد تمام احادیث جمع کرکے دیکھا جائے تو راجح رائے یہی ہے کہ رسولِ کریم ﷺ نے شہید معرکہ کی نمازِ جنازہ نہیں پڑھی۔ مختصر طور پر احادیث درجہ ذیل ہیں:

عَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُمَا، قَالَ :كَانَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَجْمَعُ بَيْنَ الرَّجُلَيْنِ مِنْ قَتْلٰی أُحُدٍ فِی ثَوْبٍ وَاحِدٍ، ثُمَّ يَقُولُ :أَيُّهُمْ أَكْثَرُ أَخْذًا لِلْقُرْآنِ، فَإِذَا أُشِيرَ لَهُ إِلٰی أَحَدِهِمَا قَدَّمَهُ فِی اللَّحْدِ، وَقَالَ :أَنَا شَهِيدٌ عَلٰی هٰؤُلَاءِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ، وَأَمَرَ بِدَفْنِهِمْ فِی دِمَائِهِمْ، وَلَمْ يُغَسَّلُوا، وَلَمْ يُصَلِّ عَلَيْهِمْ»[1]

’’نبی اکرم ﷺ شہداء احد کی تکفین کے لیے دو دو آدمیوں کو ایک کپڑے میں جمع کرتے تھے پھر پوچھتے کہ ان میں سے کس کو قرآن زیادہ آتا تھا پھر جس کے بارے میں بتایا جاتا، اسے لحد میں آگے رکھتے اور کہتے کہ قیامت کے دن ان لوگوں پر گواہ ہوں گا۔اسی طرح آپ ﷺ نے ان کی تدفین خون میں لتھڑے ہوئے کرنے کا حکم صادر فرمایا، انھیں غسل دیا گیا اور نہ اسے کی نمازِ جنازہ پڑھی گئی۔‘‘

اس کی تائید حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کے بیان سے بھی ہوتی ہے کہ شہداء احد کو بغیر غسل خون میں لتھڑے ہوئے دفن کیا گیا تھا اور ان کی نماز جنازہ نہیں پڑھی گئی تھی۔(احمد، ابوداؤد، ترمذی) شہداء احد کے بارے میں نمازِ جنازہ کی عدم ادائیگی پر دلالت کرنے والی احادیث اتنی زیادہ ہیں کہ امام شافعی رحمہ اللہ نے انھیں متواتر قرار دیا ہے۔[2]

خلافتِ راشدہ اور بعد کے ادوار مین شہدائے معرکہ کی نمازِ جنازہ کا رواج نہیں ہوا۔کجا یہ کہ غائبانہ جنازہ ہو۔امام ابن قیم فرماتے ہیں کہ’’رسولِ کریم ﷺ نے احد کے شہداء پر نمازِ جنازہ نہیں پڑھی اور یہ بھی معروف نہیں کہ آپ ﷺ نے دیگر غزوات میں اپنے کسی ساتھی شہید ہونے والے کی نمازِ جنازہ پڑھی ہو۔ اسی طرح بعدازاں خلفائے رشدین اوران کے ماتحت حکام کا طرزِعمل رہا ہے۔‘‘[3]

حاصل یہ ہے کہ مسلمانوں کو سنت رسول ﷺ اور خلفائے راشدین کو ہی اپنا رواج بنانا چاہیے۔حنفیہ اور بعض حنابلہ جو شہید معرکہ کی نمازِ جنازہ کی مشروعیت کے قائل ہیں، ان کے دلائل کا جائزہ سطور ذیل میں ملاحظہ فرمائیں:

(۱) عَنْ شَدَّادِ بْنِ الْهَادِ، أَنَّ رَجُلًا مِنَ الْأَعْرَابِ جَاءَ إِلَی النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ

---

① فتح الباری، ج:۳،ص:۲۰۹، صحیح البخاری،بَابُ الصَّلَاةِ عَلَی الشَّهِيدِ، رقم: ۱۳۴۳

② فتح الباری، ج:۳،ص:۲۱۰، بحوالہ کتاب الام للشافعی

③ زاد المعاد، ج:۲،ص:۹۸

وَسَلَّمَ فَآمَنَ بِهِ وَاتَّبَعَهُ، ثُمَّ قَالَ :أُهَاجِرُ مَعَكَ، فَأَوْصَى بِهِ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَعْضَ أَصْحَابِهِ، فَلَمَّا كَانَتْ غَزْوَةٌ غَنِمَ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سَبْيًا، فَقَسَمَ وَقَسَمَ لَهُ، فَأَعْطَى أَصْحَابَهُ مَا قَسَمَ لَهُ، وَكَانَ يَرْعَى ظَهْرَهُمْ، فَلَمَّا جَاءَ دَفَعُوهُ إِلَيْهِ، فَقَالَ :مَا هَذَا؟، قَالُوا :قِسْمٌ قَسَمَهُ لَكَ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، فَأَخَذَهُ فَجَاءَ بِهِ إِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، فَقَالَ :مَا هَذَا؟ قَالَ :قَسَمْتُهُ لَكَ، قَالَ :مَا عَلَى هَذَا اتَّبَعْتُكَ، وَلَكِنِّي اتَّبَعْتُكَ عَلَى أَنْ أُرْمَى إِلَى هَاهُنَا، وَأَشَارَ إِلَى حَلْقِهِ بِسَهْمٍ، فَأَمُوتَ فَأَدْخُلَ الْجَنَّةَ فَقَالَ :إِنْ تَصْدُقِ اللَّهَ يَصْدُقْكَ، فَلَبِثُوا قَلِيلًا ثُمَّ نَهَضُوا فِي قِتَالِ الْعَدُوِّ، فَأُتِيَ بِهِ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُحْمَلُ قَدْ أَصَابَهُ سَهْمٌ حَيْثُ أَشَارَ، فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ :أَهُوَ هُوَ؟ قَالُوا :نَعَمْ، قَالَ :صَدَقَ اللَّهَ فَصَدَقَهُ، ثُمَّ كَفَّنَهُ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي جُبَّةِ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، ثُمَّ قَدَّمَهُ فَصَلَّى عَلَيْهِ، فَكَانَ فِيمَا ظَهَرَ مِنْ صَلَاتِهِ :اللَّهُمَّ هَذَا عَبْدُكَ خَرَجَ مُهَاجِرًا فِي سَبِيلِكَ فَقُتِلَ شَهِيدًا أَنَا شَهِيدٌ عَلَى ذَلِكَ.» [1]

''شداد بن ہاد سے روایت ہے کہ ایک دیہاتی آدمی نبی اکرم ﷺ کے پاس حاضر ہو کر ایمان لایا اور آپ ﷺ کا پیروکار بن گیا، پھر کہا کہ میں آپ ﷺ کے ساتھ ہجرت کرتا ہوں۔ آپ ﷺ نے اس کے بارے میں دھیان رکھنے کا ارشاد فرمایا پھر جب وہ معرکہ پیش آیا جس میں نبی اکرم ﷺ کو مالِ غنیمت حاصل ہوا تو آپ ﷺ نے اس کا حصہ اس کے ساتھیوں کے ہاتھ دیا، کیونکہ وہ ان کے جانور چروایا کرتا تھا جب صحابہ اسے غنیمت میں حصہ دینے کے لیے آئے تو اس نے پوچھا یہ کیسا مال ہے؟ انھوں نے جواب دیا کہ نبی اکرم ﷺ نے تجھے بھی مالِ غنیمت سے حصہ دیا ہے۔ چنانچہ وہ اسی حصہ کو لیے ہوئے اللہ کے رسول ﷺ کے پاس آیا، کہنے لگا کہ یہ مال کیسا ہے؟ آپ ﷺ نے مالِ غنیمت میں سے حصہ دینے کی بات کہی تو کہنے لگا کہ میں اس بنا پر آپ ﷺ کی پیروی نہیں کر رہا۔ بلکہ میں چاہتا ہوں کہ مجھے حلق میں تیر لگے اور موت آئے تو جنت میں داخل ہو جاؤں، آپ ﷺ نے فرمایا اگر تو اللہ سے مخلص ہے تو اللہ اسے سچ کر دے گا۔ صحابہ تھوڑی دیر ٹھہرے پھر دشمن سے لڑنے کے لیے نکل کھڑے ہوئے، کچھ دیر بعد اس شخص کو

[1] سنن النسائی،الصَّلَاةُ عَلَى الشُّهَدَاءِ ،رقم:۱۹۵۳(مترجم،ج:۱،ص:۲۲۳۔۲۲۴

اٹھائے ہوئے نبی اکرم ﷺ کے پاس حاضر ہوئے کہ اسے حلق میں ہی تیر لگا ہوا تھا۔ آپ ﷺ نے فرمایا کیا یہ وہی شخص ہے۔ صحابہ نے ہاں میں جواب دیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا وہ اللہ سے مخلص تھا اور اللہ نے سچ کر دیا۔ پھر آپ ﷺ نے اسے اپنے چوغے میں کفن دیا اور آگے رکھ کر نمازِ جنازہ پڑھی جس میں یہ الفاظ بھی کہے: اے اللہ یہ تیرا بندہ تیرے رستے میں ہجرت کرتے ہوئے نکلا، پھر شہادت حاصل کی، میں اس پر گواہ ہوں۔''

(جواب) امام بیہقی نے صحیح متواتر احادیث کے بالمقابل اس دیہاتی کی نمازِ جنازہ کے بارے میں مروی حدیث کے بارے میں یہ احتمال پیش کیا ہے کہ اس کی وفات معرکہ کے بعد ہوئی تھی، اسی لیے، اس کی نمازِ جنازہ پڑھی گئی۔ (مرعاۃ، ج:۲،ص:۴۸۶)

اس کی تائید اس قرینہ سے بھی ہوتی ہے کہ رسول ﷺ معرکہ کے بعد مالِ غنیمت بھی تقسیم کر چکے تھے، پھر اس کی شہادت ہوئی ہے۔

« عَنْ عُقْبَةَ بْنِ عَامِرٍ: أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ خَرَجَ يَوْمًا، فَصَلَّى عَلَى أَهْلِ أُحُدٍ صَلَاتَهُ عَلَى المَيِّتِ، ثُمَّ انْصَرَفَ إِلَى المِنْبَرِ، فَقَالَ: إِنِّي فَرَطٌ لَكُمْ، وَأَنَا شَهِيدٌ عَلَيْكُمْ، وَإِنِّي وَاللَّهِ لَأَنْظُرُ إِلَى حَوْضِي الآنَ، وَإِنِّي أُعْطِيتُ مَفَاتِيحَ خَزَائِنِ الأَرْضِ .أَوْ مَفَاتِيحَ الأَرْضِ . وَإِنِّي وَاللَّهِ مَا أَخَافُ عَلَيْكُمْ أَنْ تُشْرِكُوا بَعْدِي، وَلَكِنْ أَخَافُ عَلَيْكُمْ أَنْ تَنَافَسُوا فِيهَا» [1]

''عقبہ بن عامر سے روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ ایک دن باہر آئے اور آپ نے احد میں شہید ہونے والوں پر وہی نماز پڑھی جو میت پر پڑھی جاتی ہے پھر آپ نے منبر کی طرف رخ کیا......الخ

یہاں حنفیہ کی رائے کے مطابق اگرچہ ترجمہ ''شہداء احد پر نمازِ جنازہ پڑھنے'' کا کیا گیا ہے لیکن ''صلاۃ علیٰ'' کا مفہوم صرف نماز جنازہ نہیں ہوتا بلکہ دعاء بھی ہوتا ہے جیسا کہ قرآن مجید میں ہے: ﴿وَ صَلِّ عَلَيْهِمْ اِنَّ صَلٰوتَكَ سَكَنٌ لَّهُمْ﴾ (التوبۃ:۱۰۳) ''یعنی نبی اکرم ﷺ کو صدقہ دینے والوں پر دعاء خیر کی تلقین کی گئی ہے اس آیت میں وارد ''صَلِّ عَلَيْهِمْ'' کے الفاظ سے کسی کے نزدیک بھی نمازِ جنازہ مراد نہیں لہٰذا یہ کہنا غلط ہے کہ ''صلاۃ علیٰ'' کی اصطلاح نمازِ جنازہ کے لیے مخصوص ہوگئی ہے۔

واضح رہے کہ مذکورہ حدیث میں جس نماز یا دعاء کا ذکر ہے وہ واقعہ متفقہ طور پر جنگِ احد کے تقریباً آٹھ

---

[1] صحيح البخاري، رقم:۱۳۴٤، فتح الباري، ج:۳، ص:۲۰۹

سال بعد کا ہے، اس لیے وہاں مراد نمازِ جنازہ نہیں بلکہ وہی الفاظ دعا ہیں جو عموماً نمازِ جنازہ میں پڑھے جاتے ہیں، اس کی تائید حدیث مذکورہ میں واردان الفاظ سے بھی ہوتی ہے کہ اس دعاء کے بعد رسول اللہ ﷺ نے منبر کا رُخ کیا جو اس بات کی دلیل ہے کہ واقعہ مسجد نبوی کا ہے نہ کہ مقامِ احد پر جا کر نماز پڑھنے کا۔

(۳) ان صحیح احادیث کے علاوہ بعض دیگر روایات حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی بہتر (۷۲) مرتبہ نماز جنازہ کا پڑھنے کے بارے میں ذکر کی جاتی ہیں جن کے ساتھ ان روایات کو ملایا جائے جن میں شہداء احد کی نمازِ جنازہ میں نو نو یا دس دس اکٹھے شہداء کی نمازِ جنازہ کا ذکر ہے تو بات یہی کھلتی ہے کہ حضرت حمزہ کی بہتر (۷۲) مرتبہ نمازِ جنازہ والی روایت درست نہیں کیونکہ کل شہداء احد ہی بہتر (۷۲) تھے حالانکہ اس طرح لازم آئے گا کہ شہداء احد سینکڑوں کی تعداد میں ہوں۔ نیز جو لوگ عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ کی صحیح بخاری والی روایت سے آٹھ سال بعد نمازِ جنازہ ثابت کرتے ہیں، ان کو غور کرنا چاہیے کہ شہدائے احد کی معرکہ سے متصل نمازِ جنازہ والی روایات کی کیا حیثیت رہ جاتی ہے؟ اہل مدینہ، امام شافعی، اور بیہقی نے ایسے تمام معارضات نقل کر کے شہید کی نمازِ جنازہ کی بجائے دعائے خیر کا مسلک اختیار کیا ہے اور وہی راجح ہے۔

اہل حدیث کو تمام احادیث جمع کر کے صحیح مسلک اختیار کرنا چاہیے۔ احادیث کا ٹکراؤ پیدا کر کے اپنا مطلب نکالنا درست نہیں۔

سوال نمبر (۲) کا جواب: آج کل بعض جماعتیں اپنے مخصوص گروہی مقاصد کے لیے کشمیر وغیرہ میں شہید ہونے والوں کی غائبانہ نمازِ جنازہ کے لیے وہ تمام اشتہاری وسائل اختیار کرتی ہیں جو سیاستدان انتخابی سیاست میں استعمال کرتے ہیں۔ حالانکہ کسی کی موت پر یہ انداز اعلان اس جاہلیت کی مذموم نعی (موت کا اشتہار دینا) میں شامل ہے جس کی ممانعت احادیث میں صراحتاً آئی ہے۔ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ اسی احتیاط کے پیش نظر موت کی اطلاع اقرباء تک کو بھی نہ دیتے تھے کہ کہیں نعی نہ بن جائے۔ کسی کی موت کی خبر کی حد تک اس کے رشتے داروں اور قریبی احباب کو اطلاع دینے کا جواز تو موجود ہے لیکن اس طرح کی اشتہار بازی شریعت میں سخت ناپسندیدہ ہے۔ غائبانہ نمازِ جنازہ کے بارے میں اگرچہ دلائل کا رجحان جواز کی طرف ہی ہے لیکن اگر نعی کی مذکورہ بالا صورت دیکھی جائے تو ایسے غائبانہ نماز جنازہ کی بھی حوصلہ شکنی ہونی چاہیے۔ شریعت کے مسائل میں مقاصد شریعت کی بڑی اہمیت ہے۔ فتویٰ ان کی روشنی میں ہی دینا جانا چاہیے۔

سوال نمبر (۳) کا جواب: مرحوم مولانا خالد سیف شہید کی شہادت قابلِ رشک تھی، ان کی میت بھی جامعہ رحمانیہ لاہور میں پہنچ گئی تھی۔ اس موقع پر ہائی کورٹ کے کئی جج اور دیگر اہم شخصیات موجود تھیں۔

سنت کے مطابق ان کو نہ تو غسل دیا گیا اور نہ ان کی نمازِ جنازہ پڑھی گئی۔ احباب کے اکٹھے ہونے کی بناء پر دعا کر لی گئی تھی۔

انسان کی موت برحق ہے اور شہادت ایک اعزاز بھی تاہم رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کی شہادت پر کبھی خوشی نہیں منائی بلکہ جعفر طیار رضی اللہ عنہ کے حادثہ کے بعد ایک عرصہ تک آپ کے چہرے پر غمی کے آثار نمایاں رہے۔ جو لوگ شہداء کی موت پر خوشیاں مناتے ہیں، انھیں غور کرنا چاہیے کہ آج اگر کسی دوسرے کا بھائی بیٹا شہید ہوا تو کل یہی واقعہ ان کے ساتھ بھی پیش آ سکتا ہے، ان کا ایمان نبی ﷺ اور ان کے صحابہ سے زیادہ نہیں ہے کیونکہ موت کا صدمہ ایک فطری امر ہے۔ «اِنَّمَا یَرْحَمُ اللّٰہِ مِنْ عِبَادِہِ الرُّحَمَاءِ»۔ مذکور بالا نکات کی روشنی میں ہمارا طرزِ عمل درست سمت نہیں جا رہا، اس سے اجتناب کرنا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ ہمارے حال پر رحم فرمائے۔ آمین

کسی شخصیت کی مختلف شہروں میں غائبانہ نمازِ جنازہ ادا کرنا:

سوال: میرے مشاہدے میں یہ بات آئی ہے کہ بعض دفعہ جب کوئی بااثر شخص فوت ہو جاتا ہے تو اس کی میت پر نمازِ جنازہ پڑھی جانے کے بعد مختلف شہروں میں اس کی غائبانہ نمازِ جنازہ بھی پڑھی جاتی ہے۔ کیا حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہما جیسی بزرگ ہستیوں کے لیے بھی کسی شہر میں ایسی غائبانہ نمازِ جنازہ پڑھی گئی تھی؟ اور اگر نہیں پڑھی گئی تھی تو کیوں نہیں پڑھی گئی؟

براہِ مہربانی ایسی غائبانہ نمازِ جنازہ کے بارے میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے طرزِ عمل کی وضاحت فرمائیں۔ یعنی سوال یہ ہے کہ کیا کوئی ایک بھی ایسی مثال موجود ہے جس سے ثابت ہوتا ہو کہ کسی وفات یافتہ کی میت پر نمازِ جنازہ پڑھی جانے کے بعد دوسرے شہر یا گاؤں میں کسی صحابی نے اس کی غائبانہ نمازِ جنازہ پڑھائی ہو؟

جواب: اسلامی تاریخ میں واقعی اس کی کوئی نظیر نہیں ملتی۔ خلفائے راشدین، مشاہیر صحابہ وغیرہم فوت ہوئے، لیکن کسی مسلمان نے ان پر غائبانہ نمازِ جنازہ ادا نہیں کی۔ کیونکہ اگر کسی نے ادا کی ہوتی تو ان سے تواتر کے ساتھ منقول ہوتا، بلکہ علامہ ناصر الدین البانی تو اس رواج کو بدعت سے تعبیر کرتے ہیں۔ چنانچہ احکام الجنائز میں اس پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

« اِنَّھَا مِنَ الْبِدَعِ الَّتِی لَا یَمتَرِی فِیھَا عَالِمٌ بِسُنَّتِهٖ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ وَمَذھَبِ السَّلَفِ رَضِیَ اللّٰهُ عَنھُم.»[1]

[1] احکام جنازء لشیخنا مفتی محمد عبدہ، ص: ٤٧

یعنی ''یہ وہ بدعت ہے جس میں سنت اور مذہب سلف صالحین سے باخبر کوئی عالم بھی شبہ نہیں کر سکتا۔''

حافظ ابن قیم رحمہ اللہ نے ''زاد المعاد'' میں امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کی رائے یوں نقل کی ہے، کہ غائب میت اگر ایسی سر زمین میں فوت ہوئی جس پر نمازِ جنازہ نہ پڑھی گئی ہو تو اس پر غائبانہ نمازِ جنازہ پڑھی جائے جیسا کہ آنحضرت ﷺ نے نجاشی پر غائبانہ نمازِ جنازہ پڑھی۔ اگر نمازِ جنازہ پڑھی جاچکی ہو تو اس پر غائبانہ نمازِ جنازہ نہ پڑھی جائے۔[1]

کیا شہید فی المعرکہ کی نمازِ جنازہ ہے؟

سوال: شہید کی غائبانہ نمازِ جنازہ کے بارے میں محدثین کرام اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور آپ ﷺ کے زمانہ میں کیا عمل تھا۔ کیا شہداء کی غائبانہ نمازِ جنازہ جس طرح آج پڑھائی جارہی ہے اور اس کو سنت قرار دیا جاتا ہے کیا یہ ٹھیک ہے یا نہیں؟ وضاحت فرمائیں اور جنگ اُحد کا جو حوالہ دیا جاتا ہے اس کی بھی وضاحت فرمائیں۔

جواب: راجح مسلک کے مطابق ''شہید فی المعرکہ'' کی نمازِ جنازہ نہیں۔ صحیح بخاری میں حضرت جابر اور انس رضی اللہ عنہما کی روایات میں اس امر کی تصریح موجود ہے۔ موضوع ہذا پر میرا تفصیلی فتویٰ الاعتصام وغیرہ میں شائع شدہ ہے۔ اس کی طرف مراجعت فرمائیں! امید ہے کہ باعث اطمینان و تشفی ثابت ہوگا۔ مذکورہ بالا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی روایات میں شہدائے احد کی نمازِ جنازہ کی نفی ہے۔

میت کی آمد سے قبل جنازہ ادا کرنا:

سوال: جنازہ کراچی سے نتھیا گلی کے لیے بذریعہ جہاز روانہ ہوا۔ لوگ نتھیا گلی جمع ہوئے قبر تیار ہوئی اطلاع ملی کہ جہاز بوجہ خرابیٔ موسم واپس کراچی مع جنازہ چلا گیا ہے اور واپسی لیٹ ہوگی۔ کیا وہاں جمع لوگ جنازہ پڑھ سکتے ہیں۔ جب کہ میت ابھی دوران سفر میں ہے اور یہ بھی احتمال ہے کہ میت دوسرے دن یا رات آبائی گاؤں پہنچے گی۔ کیا اس طرح غائبانہ نمازِ جنازہ جائز ہے۔

جواب: غائبانہ جنازہ کا جواز تو ہے۔ نجاشی کے بارے میں نبی ﷺ نے فرمایا تھا:

« اِنَّ اَخَاکُم قَد مَاتَ بِغَیرِ اَرضِکُم ، فَقُومُوا فَصَلُّوا عَلَیهِ »[2] ''تمہارا بھائی غیر زمین میں فوت

---

[1] بحوالہ مذکور، ص: ١٤٦

[2] مسند ابوداؤد الطیالسی، رقم: ١١٦٤، سنن ابن ماجہ، بَابُ مَا جَاءَ فِي الصَّلَاةِ عَلَى النَّجَاشِيِّ، رقم: ١٥٣٦، ١٥٣٧

ہو گیا۔ اٹھو، اس کی نمازِ جنازہ پڑھو۔'' اور صحیح بخاری و صحیح مسلم میں ہے: «قَد تُوُفِّی الیَومَ» [1] آج فوت ہوا ہے۔

امام شافعی علیہ رحمہ فرماتے ہیں کہ میت پر نمازِ جنازہ اس کے لیے دعا ہے اور یہ میت کے کفن میں ملفوف ہونے کی صورت میں جائز ہے تو غائبانہ یا قبر پر اس کے لیے کیوں جائز نہیں۔ (فتح الباری ۳/ ۳۱)

اور شوکانی رحمہ اللہ ''الدرر البھیة'' میں فرماتے ہیں: کہ صلوۃِ جنازہ قبر پر پڑھی جائے اور غائب میت پر بھی۔ یہ بھی یادر ہے کہ میت کے دفن یا عدمِ دفن سے اصل مسئلہ کی نوعیت میں کوئی فرق نہیں پڑتا معاملہ دونوں کا ایک جیسا ہے۔ قصۂ نجاشی عموم کی دلیل ہے۔ لیکن موجودہ صورت میں میت کی آمد کا انتظار کرنا چاہیے کیونکہ اس کی آمد متوقع ہے۔

غائبانہ نمازِ جنازہ کے لیے اشتہاری مہم:

سوال: آج کل شہید کی غائبانہ نمازِ جنازہ باقاعدہ اشتہاری مہم کے ذریعہ تشہیر کے بعد پڑھی جاتی ہے۔ رکشوں پر اعلانات کر کے دھوم دھام سے اپنی جہادی کارکردگی کو مبالغہ آمیز انداز سے بیان کیا جاتا ہے، لوگوں میں اپنا حلقہ وسیع اور اثر و رسوخ پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ سوال صرف اتنا ہے کہ تعزیت مسنون کی بجائے غائبانہ نمازِ جنازہ اور وہ بھی شہید کا...... اس فعل کی شرعی حیثیت کیا ہوگی؟

جواب: راجح مسلک کے مطابق ''شہید فی المعرکہ'' کی نمازِ جنازہ نہیں۔ پھر اس مہم جوئی کا رکشوں وغیرہ پر اعلان کرنا جاہلی رُسوم کا حصہ ہے۔ اس بُری رسم سے احتراز کرنا ضروری ہے۔

[1] صحیح البخاری، بَابُ الصُّفُوفِ عَلَی الجِنَازَةِ، رقم ۱۳۲۰

حافظ ثناء اللہ مدنی ﷾ کی دیگر عربی اردو کتب